"جوہر" اسپیشل سیریز

JAF & CO.
Plot # 43/4, Q-2, Block 6,
PECHS, Near Jheel Park
Karachi.

کلیاتِ ادراک

مرتبہ:

سید رئیس احمد جعفری

محمد علی اکیڈمی

لاہور

جملہ حقوق محفوظ

طبع اوّل دسمبر ۱۹۶۳ء

قیمت : [redacted]

طابع و ناشر:
زیڈ۔ اے۔ فاروقی
سکریٹری محمد علی اکیڈمی ۱۵۔ نیلہ گنبد۔ لاہور

مطبوعہ: اشرف پریس۔ لاہور

سول ایجنٹ

بساطِ ادب چوک انارکلی پوسٹ بکس ۶۳ لاہور

: ناشرانِ و تاجرانِ کتب :

JINNAHABAD UNION COMMITTEE NO. 42
BOOK NO. 613
LIBERARY

معاونینِ خصوصی

۱: مسٹر جسٹس الٰہی بخش خمیسانی۔ کراچی
۲: مسٹر اے، کے بروہی، سابق وزیرِ قانون حکومتِ پاکستان کراچی
۳: مسٹر انور عادل۔ سی، ایس پی کمشنر کوئٹہ
۴: مسٹر منظور قادر سابق وزیرِ خارجہ حکومت پاکستان۔ لاہور
۵: مسٹر ظفر احمد فاروقی۔ (ندوی)

۷۰۲۱
۲۰/۹/۰۹

ارکانِ دوامی

۱: حکیم نصیر الدین ندوی، نظامی دواخانہ کراچی

۲: رئیس احمد جعفری (ندوی)

۳: بشیر احمد مالک نذیر پرنٹنگ پریس۔ کراچی

۴۔ علاء الدین خالد مالک اردو اکادمی، کراچی

۵: شیخ نیاز احمد مالک شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور

۶: کموڈور خالد جمیل۔ کراچی

۷: فقیر وحید الدین۔ کراچی، لاہور

۸: سید طیّب فضلی، مالک فضلی فلمز۔ لاہور

۹: حکیم عبد الواسع ندوی مالک دہلی دواخانہ پشاور

۱۰: آلم ملک بی اے ایل ایل بی ایڈوکیٹ۔ کوئٹہ

۱۱: ڈاکٹر محمد ایوب۔ پرنس روڈ۔ کوئٹہ

۱۲: سید فصیح اقبال مالک روزنامہ "زمانہ"، کوئٹہ

۱۳: نواب مشتاق احمد خاں ایجنٹ جنرل حیدرآباد پاکستان لاہور

۱۴: سید علی نواز گردیزی ڈائریکٹر سیمن کمپنی لاہور

۱۵: پیرزادہ سید شریف الدین ایڈوکیٹ سپریم کورٹ کراچی

۱۶: ذوالفقار علی مالک ذوالفقار سوپ فیکٹری کراچی

۱۷: حبیب احمد ندوی۔ پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی

۱۸: شیخ عنایت اللہ مینیجنگ ڈائریکٹر تاج کمپنی لمیٹڈ۔ کراچی

۱۹: حافظ سلطان احمد۔ ایڈوکیٹ۔ کراچی

۲۰: میر خلیل الرحمٰن مالک روزنامہ "جنگ"، کراچی

۲۱: عبد الوحید خاں وزیر ریلوے حکومت مغربی پاکستان

۲۲: حاجی متین احمد۔ لاہور

۲۳: محمد یوسف کتھوریہ مالک کے بی جوزف اینڈ کمپنی لاہور

۲۴: نواب مشکور احمد مالک شاہین ہوٹل کراچی

۲۵: ایس ایم یوسف بانیتی ایشیا سیمنٹ۔ لاہور

۲۶: شمشیر علی خاں مالک لیڈیز اون چوائس لاہور

۲۷: آفتاب بیگم جعفری

۲۸: رانا ظفر اللہ خاں ایم۔ اے

ممتاز حسن

پاکستان کے اعلیٰ سرکاری حلقوں میں ایک ہستی ایسی ہے جو ادیب بھی ہے ادب نواز بھی اور ادیب دوست بھی یہ شخصیت ہے مسٹر ممتاز حسن کی جن کے دم سے نہ جانے کتنے ادارے قائم ہیں، جو نہ جانے کتنی انجمنوں کی روح رواں ہیں اور جو خود اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں!

ممتاز صاحب کی ذات ہمیشہ میرے لیے مایوسی کے اندھیرے میں امید کی روشنی ثابت ہوئی ہے، اُن کے دل میں اُردو کا درد ہے، ملک کا درد ہے، قوم کا درد ہے، انھیں اپنے ماضی سے محبّت ہے اپنی تاریخ سے محبّت ہے، اپنے اسلاف اور اکابر سے محبّت ہے۔

قوم کے اکابر کی یہ داستان، قوم کی تاریخ کا فراموش شدہ یہ باب ممتاز صاحب کی وساطت سے قوم کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

رئیس احمد جعفری

سپاس وتشکر!

ایک ایسے شخص کے لیے جس کے کشکول میں حوصلے اور آرزو کے سوا کچھ نہ ہو، جس کی رسائی نہ سرمایہ داروں کے آستانے تک ہو نہ حکام والامقام کی بارگاہ میں، اتنے بڑے کام کا بیڑا اٹھالینا اور اسے اتمام تک پہنچادینا صرف فضلِ ربی ہی کہا جاسکتا ہے۔ اس معرکے کو سر کرنے میں یہ عقیدہ اور زیادہ محکم اور استوار ہوگیا کہ اللہ پر بھروسہ اگر کیا جائے تو ناکامی نہیں ہوتی، جو مشرکوں، کافروں، ملحدوں اور قوانینِ الٰہی کے باغیوں تک کو اپنے رحم وکرم سے محروم نہیں کرتا وہ اس شخص کو کیوں مایوس کردیتا جو اس کے ایسے بندے کے کارنامے اجاگر کرنا چاہتا تھا جو اپنے رب کے لیے ساری خدائی سے لڑتا رہا۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لیے ہے

اور کون کہہ سکتا ہے کہ محمد علی نے زندگی کی آخری سانس تک دوعالم سے جنگ صرف خدا کے لیے نہیں کی۔؟

اس نیک اور قومی کام میں جن حضرات نے پورے خلوص کے ساتھ تعاون کیا وہ محمدؐ علی اکیڈیمی کے لائف ممبر صاحبان ہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں جن سے میرے دیرینہ، دوستانہ، عزیزانہ یا نیازمندانہ تعلقات ہیں۔ ان سے میں نے کہا اور انھوں نے بغیر کوئی سوال کیے میری بات مان لی۔ مجھ جیسے بے مایہ شخص پر ان اصحاب کا یہ اعتماد خدا کی بہت بڑی نعمت ہے، جس کا شکر ادا کرنے سے زبان قاصر ہے۔

اس سلسلے میں اصحابِ ذیل کا شکریہ خاص طور پر واجب ہے جنھوں نے نہ صرف میری ہمت افزائی کی بلکہ اس راہ کی بہت سی دشواریوں کے حل کرنے میں دل وجان سے میرے شریک رہے۔

جسٹس خمیسانی

سب سے پہلا نام مسٹر جسٹس الٰہی بخش خمیسانی کا ــــ میں جانتا ہوں وہ اسے پسند نہیں کریں گے ــــ لینے پر مجبور ہوں۔ اگر ان کی توجہ شامل نہ ہوتی تو یہ مرحلہ صعب کسی طرح طے نہیں ہوسکتا تھا۔

حکیم نصیر الدین ندوی
حکیم نصیر الدین ندوی مالک نظامی دواخانہ کراچی میرے ندوہ کے ساتھیوں میں ہیں۔ ہم دونوں کی محبت اور خلوص کا سلسلہ بچپن سے آج تک قائم چلا آرہا ہے اس کتاب کی طبع و اشاعت کے سلسلے میں انھوں نے سرگرم حصہ لیا۔

مسٹر اے۔ کے بروہی
پاکستان کے سابق وزیر قانون مسٹر اے کے بروہی بھی، گو ان سے میری کوئی خاص شناسائی نہ تھی، اپنے ایک دوست کی وساطت سے میرے لیے خضرِ راہ ثابت ہوئے، ان کا بھی دل سے شکر گزار ہوں۔

مسٹر انور عادل
مسٹر انور عادل سی۔ ایس۔ پی کمشنر کوئٹہ ڈویژن میرے مخصوص کرم فرماؤں میں ہیں۔ ان کی محبت، شرافت اور خلوص کا یہ عالم ہے کہ خود کرید کرید کر میری مشکلات معلوم کرتے اور انھیں حل کرنے کی سعی و تدبیر میں حصہ لیتے رہتے ہیں۔ اس پر مجھے ناز بھی ہے اور فخر بھی!

ظفر احمد فاروقی ندوی
ظفر احمد فاروقی میرے ندوے کے ساتھیوں میں ہیں، ندوے کے بعد ہم دونوں میں جدائی ہو گئی۔

او بہ صحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم!

تقریباً تیس سال کی جدائی کے بعد ایک روز دفعتہً لاہور میں ملاقات ہوئی۔ اور ایسا معلوم ہوا جیسے ہماری جدائی کو تین گھنٹے بھی نہیں گزرے ہیں ان سے ملتے ہی عہدِ ماضی واپس آ گیا۔

فاروقی صاحب نے میری دشواریوں کا بوجھ اس طرح اپنے اوپر اٹھا لیا جیسے یہ بوجھ میرا نہیں ان کا تھا!

مسٹر ثناء اللہ بھٹہ
مسٹر ثناء اللہ بھٹہ مالک بساطِ ادب لاہور نے جس خلوص سے ہر دشوار مرحلے پہ میرا ہاتھ بٹایا وہ ایک ناقابلِ فراموش واقعہ ہے!

م۔ ع۔ سلام
مکتبہ آئینہ ادب لاہور کے مالک م۔ ع۔ سلام میرے پرانے دوستوں اور کرم فرماؤں میں ہیں۔ عین ایسے وقت جب کہ یہ گاڑی چلتے چلتے رک گئی تھی وہ آگے بڑھے اور مجھے بہت بڑی زحمت سے نجات دلائی۔

ابن انشا
اپنے دوست اور بھائی ابن انشا کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ ان سے میرے تعلقات کی نوعیت عزیزانہ حد تک پہنچ چکی ہے۔ یہی کیفیت ان کے (اور میرے بھی) دونوں بھائیوں سردار محمود اور محمود ریاض کی ہے۔ ان کے نزدیک میرا ہر کام انہی کا ہے، بلکہ صرف ان کا!

علاء الدین خالد
پیارا، اچھا اور کھرا دوست:

خاموشی از ثنائے تو حدِ ثنائے تست!

★

آغازِ سخن

۱۹۳۲ء میں "سیرت محمد علی" کے نام سے میری پہلی کتاب شائع ہوئی تھی، یہ وہ زمانہ تھا جب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں زیرِ تعلیم تھا۔ اس کتاب کے بارے میں قاضی ولی محمد صاحب چیف سیکرٹری ریاست بھوپال (مصنف سفرنامہ اندلس) نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا: "اسے کالجوں کے نصاب میں شامل ہونا چاہیے۔"

کتاب لکھنے کے چند سال بعد میں روزنامہ خلافت کا ایڈیٹر ہو کر بمبئی چلا گیا۔ مولانا شوکت علی کی وفات تک انہی کے دامنِ شفقت سے وابستہ رہا۔ پھر خلافت سے الگ ہو کر روزنامہ ہندوستان اور روزنامہ انقلاب کی ادارت سنبھالی۔ تقسیمِ ہند تک میرا قیام بمبئی میں رہا۔ اس کے بعد بھی میرا ترکِ وطن کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ لیکن بمبئی کے ہوم منسٹر مرارجی ڈیسائی نے ـــــ جو بعد میں بمبئی کے وزیرِ اعظم، پھر حکومتِ ہند کے وزیرِ خزانہ بنے ـــــ مجھے، میری تقسیمِ ہند سے پہلے کی بعض تحریروں پر برافروختہ ہو کر فرمایا، "تمہارا پاکستان بن گیا تم اپنے وطن کیوں نہیں چلے جاتے؟"

میں نے عرض کیا، "پاکستان میرا وطن نہیں ہے، میں اپنے وطن میں ہوں، اور اسے چھوڑنا نہیں چاہتا۔"

فرمایا، "اگر پاکستان تمہارا وطن نہیں ہے تو تم نے اس کی تائید حمایت کے لئے اپنا قلم کیوں وقف کر رکھا تھا؟"

میں نے جواب میں کہا میں نے مسلم اکثریت کے حقِ خود ارادیت کی حمایت کی تھی۔ اور یہ میرا ملی فریضہ تھا۔ اور میں نے یہ اقدام کر کے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ جب طرابلس کے مسلمانوں پر قیامت ٹوٹی، جب بلقان کے مسلمانوں پر حوادث کے تیر پڑے۔ جب ترکوں کو چکی کے دو پاٹوں میں پیسا گیا، جب ایران پر آفت آئی، جب عراق پر کوہِ الم ٹوٹا تو ہم مسلمانوں نے ان مظلوم مسلمانوں کی تائید و حمایت حلقوم و گلو اور کلکِ خوں چکاں کی پوری طاقت سے مظلوم مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا، اور اسلام میں برحق مطالبات کی تائید کی تھی، انگریز نے ہم سے کبھی یہ نہیں کہا کہ طرابلس چلے جاؤ، ترکیہ میں اقامت اختیار کر لو، عراق میں جا بسو۔ ایران کے شہری بن جاؤ، آپ مجھے پاکستان کیوں بھیج رہے ہیں؟"

یہ پریس کمیٹی کا جلسہ تھا، جس میں مرحوم سید عبداللہ بریلوی ایڈیٹر بمبئی کرانیکل، ممبر سر فرانسس لو ایڈیٹر ٹائمز آف انڈیا، اور گجراتی اخبار جنم بھومی کے ہندو ایڈیٹر ـــــ جن کا نام بھول رہا ہوں ـــــ تھے

مرارجی خلافِ معمول اس کمیٹی کے اجلاس شریک ہوئے تھے، اور کرسیٔ صدارت پر رونق افروز ہو گئے تھے۔ انہوں نے میرا جواب سن کر فیصلہ کن لہجہ میں فرمایا۔

"آپ کی جگہ اب ہندوستان میں نہیں ہے، آپ اب بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔"

میں نے بصد ادب دریافت کیا۔ اب مجھ سے کونسا جرم سرزد ہو رہا ہے؟ مرار جی کے سامنے تین پرچے مختلف تاریخوں کے پڑے ہوئے تھے۔ ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک پرچہ اٹھایا اور کہا آپ نے اپنے اداریے میں لکھا ہے کہ جب فتح ہوا تھا تو دنیا کے سب سے بڑے انسان نے ان لوگوں کو جنہوں نے اسے ہجرت پر مجبور کر دیا تھا غیر مشروط رہائی دے دی تھی، اور یہاں یہ حال ہے کہ خلیق الزماں ترنگے جھنڈے کو سلامی دیتے ہیں تو پٹیل صاحب طعنہ دیتے ہیں " ۲۴ گھنٹے کے اندر کوئی شخص اپنے سیاسی معتقدات سے دستبردار ہو سکتا ہے؟ میں اسے نہیں مانتا "! "یہ ان لوگوں کی حالت ہے جنہیں عنان حکومت ہاتھ میں لئے، صرف چند روز ہوتے ہیں، یہ ہم سے وفاداری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور جب ہم اعلان وفاداری کرتے ہیں تو اسے ماننے سے انکار کر دیتے ہیں، حالانکہ اس ملک پر ایک ہزار سال تک ہم نے ہی حکومت کی تھی، اور اس شان سے کی تھی کہ باغیوں کو بار بار معاف کیا، سرکشوں کو نظر انداز کیا امتیاز نسل و قوم کے بغیر سب کے ساتھ عدل کا برتاؤ کیا، یہی چیز تھی جس سے متاثر ہو کر بڑے بڑے رجواڑے، مسلمان بادشاہوں نے رشتہ و پیوند تک کے تعلقات خوشی اور فخر کے ساتھ قائم کرنے لگے"!

میری عبارت کا انگریزی ترجمہ مرار جی کے ہاتھ میں تھا وہ اسے زور زور سے پڑھ رہے تھے اور ان کا سرخ و سفید چہرہ، گلنار ہوتا جا رہا تھا پھر انہوں نے اشتعال کی حالت میں کہا۔!

"آپ نے رشتہ و پیوند والی بات لکھی ہے۔ یہ وہ بات۔ ہے جس کا اب کبھی اعادہ نہیں ہوگا۔ یہ وہ بات ہے جس کا ذکر تلخی کا سبب ہے۔ اور جو ہندو مسلم اختلافات کا سبب بن سکتی ہے۔ آپ نے سردار پٹیل پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور یہ بات ہماری حکومت برداشت نہیں کر سکتی۔

میں نے عرض کیا۔

"لیکن سردار پٹیل آپ سے بڑے وزیر ہیں وہ خود اپنی مدافعت کر سکتے اور مجھے سزا دے سکتے ہیں۔ آپ ان کی طرف سے کیوں وکالت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔"

بغیر کسی جھجک کے مرار جی نے کہا، سردار پٹیل ہندوستان کی سب سے بڑی اور عظیم قوم کے ہیرو ہیں۔ ان کے خلاف کچھ کہنا، ہندو مسلم منافرت پیدا کرنا ہے۔ اور میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔!

اب میں لاجواب ہو گیا۔ اور بالآخر میں پاکستان آ گیا۔

تقسیم ہند سے لے کر اس وقت تک تحریک آزادیٔ ہند سے متعلق مسٹر وی پی مینن وغیرہ کی درجنوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان کتابوں کی اشاعت ہند اور بیرون ہند میں زور شور سے ہو رہی ہے، غیر ملکی صحافی اور مؤرخ انہی کو بنیاد و اساس بنا کر، اور ماخذ قرار دے کر مقالے اور کتابیں لکھتے ہیں ان کتابوں کے مطالعہ سے صرف ایک ہی بات واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ ہندوستان کی تحریک آزادی کا شاندار آغاز اور کامیاب انجام تمام تر رہین منت ہے گاندھی جی، موتی لال جواہر لال، پٹیل اور دوسرے ہندو لیڈروں کا، دنیا اس سفید جھوٹ کو سچ سمجھنے پر مجبور ہے۔ کیونکہ تصویر کا دوسرا رخ اس کے سامنے نہیں ہے۔

ورنہ امر واقعہ یہ ہے کہ وہ علی برادران تھے۔ جنہوں نے مجلس خلافت کے سرمایہ سے گاندھی جی کو مسلمانوں کا زعیم کبیر بنایا، وہ مجلس خلافت تھی جس کے کس بل پر کانگرس برلوں۔ اور باڈر میٹوں کے قبضہ سے نکلی اور حریت خواہوں کے ہاتھ میں آئی۔

آخر تاریخ کا یہ صفحہ سادہ کیوں ہے؟

خوش قسمتی سے میرے پاس اس سلسلے میں ایسا غیر مطبوعہ، نیز مطبوعہ لیکن نایاب مواد موجود تھا جو صحیح معنوں میں تصویر کا دوسرا رخ ہے یہ مواد کچھ میرے پاس تھا۔ زیادہ تر حضرت جمال میاں فرنگی محلی کی کرم فرمائی سے میرے ہاتھ آیا۔

آئندہ اوراق تحریک خلافت، تحریک آزادی ہند، اور ہندوستان کے شعور سیاسی کی تاریخ نہیں ہیں۔ لیکن ان عنوانات پر کوئی تاریخ پایۂ استناد نہیں حاصل کر سکتی جب تک مؤرخ کے سامنے ماخذ کے طور پر یہ اوراق نہ ہوں،

یہ اوراق مشتمل ہیں۔

۱- علی برادران کے ان غیر مطبوعہ خطوط پر جو انہوں نے مہرولی، چھنڈواڑہ، لینڈاؤن اور بیتول جیل سے پانچ سال کی نظر بندی اور قید کے زمانے میں اپنے پیر و مرشد مولانا عبدالباریؒ کو لکھے۔ یہ خطوط تاریخ کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔

۲- کچھ ایسے خطوط بھی ہیں، جو عرصہ ہوا، بعض مجموعوں میں شائع ہو چکے ہیں، لیکن تسلسل کے لئے میں نے انہیں بھی شامل کر لیا ہے۔

۳- آج سے پچاس سال پہلے کے یعنی ۱۹۱۳ء کے ہمدرد سے میں نے وہ اہم مقالات لے لئے ہیں جن سے مسلمانوں کے شعور سیاسی، اور کاروان آزادی کے قدم بہ قدم کوچ کی پوری تاریخ نظر کے سامنے آجاتی ہے، تحریک خدام کعبہ حادثۂ مسجد کانپور، وفد خلافت، یورپ، طبی وفد برائے ترکیہ، یہ ساری وہ چیزیں ہیں۔ جنہوں نے ہندوستان کی اور مسلمانوں کی تاریخ بنائی۔ یہ تاریخ زمانے کے ہاتھوں ختم ہوئی جارہی تھی ہمدرد کا فائل اب کبریت احمر کا حکم رکھتا ہے۔ میں نے یہ مقالات درج کرکے آنے والے موارخ کے لئے بہت قیمتی سرمایہ فراہم کر دیا ہے۔

۴- اردو صحافت میں ہمدرد، سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ پہلا اردو روزنامہ تھا جو ٹائپ میں چھپتا تھا۔ جس میں عربی فارسی، انگریزی کے غیر ملکی بلند پایہ اخبارات کے تراشے شائع ہوتے تھے جس میں سیاست ہند اور سیاسیات بین الاقوام سے متعلق گراں بہا معلوماتی مقالے شائع ہوتے تھے۔ حیف کا مقام تھا، اگر ہمدرد کے اس خصوصی پہلو سے میں آپ کو متعارف نہ کراتا۔

۵- ہمدرد کی بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ رائے عامہ پر چلتا نہیں تھا، بلکہ رائے عامہ پیدا کرتا تھا، وہ اپنے ناظرین کی سنسنی خیز خبروں اور چٹخارے دار مضامین سے تواضع نہیں کرتا تھا، ان کی صحیح سیاسی تربیت کرتا تھا۔ اور ان کے سامنے وہ مواد پیش کرتا تھا جس سے ان میں بصیرت پیدا ہو، خود رائے قائم کرنے کی صلاحیت اور استعداد پیدا ہو، نمونے کے طور پر میں نے اس طرح کی چیزیں بھی شامل کر دی ہیں۔

۶- ہمدرد کے مقالات ادارت، آج سے پچاس سال پہلے جتنے پر مغز، مدلل، معلومات آفریں، اور ساتھ ہی ساتھ سنجیدگی اور شوخی کے حسین امتزاج لطیف کے حامل ہوتے تھے وہ اسی کا حصہ ہوتے تھے، میں نے اسطرح کے اداریے بھی پیش کئے ہیں، تاکہ آج کی صحافت سے آج سے پچاس برس پہلے کی صحافت کا تقابل ہو سکے۔

۷- ایسی دستاویزی چیزیں بھی اس کتاب میں، میں نے شامل کر دی ہیں، جن سے بہت سے واقعات کا پس منظر سمجھنے میں

قارئین کرام کو مدد ملے گی۔

غرض اس اشاعت میں جو مواد پیش کیا جا رہا ہے، وہ کسی نسلوں کے لئے ایک اور انکشاف، معماران پاکستان کے لئے ایک دعوت فکر، اور مستقبل کے مؤرخ کے لئے مستند ترین ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے، میں خوش ہوں کہ خدا نے مجھے یہ کام انجام دینے کی توفیق مرحمت فرمائی۔

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم!

ضرورت اس کی ہے کہ اس مواد سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے، جب تک ہم اپنے ماضی سے، اور اپنے اسلاف و اکابر کے کارناموں سے واقف نہ ہوں۔ نہ ہمارے اندر جذبۂ عمل پیدا ہو سکتا ہے، نہ جوش کردار، آگے بڑھنے بڑھنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ پیچھے مڑ کر بھی دیکھ لیں۔

رئیس احمد جعفری

ترتیب

مقالات ۱۷

۱: مولانا محمد علی جوہر مرحوم ____ مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند، ۱۸
۲: محمد علی - ایک پرانی داستان ____ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، ۲۲
۳: مولانا محمد علی مدرسۃ الاصلاح میں ____ مولانا امین احسن اصلاحی، ۲۶
۴: چند ہفتے محمد علی کے ساتھ ____ سید ہاشمی فرید آبادی، ۲۹
۵: خدا بخشے . . . ____ شاہ محمد جعفر ندوی پھلواری، ۳۶
۶: محمد علی کی نذر ____ مولانا عرشی امرتسری، ۴۸
۷: مولانا محمد علی ____ مولانا عبد القدوس ہاشمی ندوی، ۵۷
۸: مولانا محمد علی جوہر ____ عبد الرؤف عباسی ایڈیٹر روزنامہ "حق" لکھنؤ، ۶۳
۹: محمد علی کی یاد ____ مولانا انتظام اللہ شہابی، ۶۹
۱۰: رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم ____ مسٹر غلام احمد فرقت کاکوروی، ۷۲

اوراقِ پارینہ

۱۱: محمد علی کی یاد میں ____ سید محفوظ علی بدایونی، ۸۲
۱۲: خادم کعبہ مولانا شوکت علی ____ مولانا صبغۃ اللہ شہید فرنگی محلی، ۸۷
۱۳: مولانا محمد علی کے کچھ واقعات ____ " " " " ، ۹۴
۱۴: محمد علی ۔ بچپن اور شباب سید محفوظ علی بدایونی، ۱۰۷
۱۵: محمد علی علیگ ____ مولانا عبد الماجد دریابادی، ۱۲۱
۱۶: مولانا محمد علی ____ قاضی عبد الغفار مرحوم، ۱۲۳
۱۷: دوست کا ماتم سید سجاد حیدر یلدرم، ۱۲۸

شوکت علی

۱۸: ذاتی تاثرات ____ رئیس احمد جعفری، ۱۲۹
۱۹: آہ مولانا شوکت علی ____ یحییٰ اعظمی، ۱۷۹

ھمدرد ۔ سیاست وصحافت، تاریخ وادب، شعروافسانہ کی انجمن

۲۰ : بسم اللہ ، ۱۸۶
۲۱ : سرایڈورڈگرے اور برطانیہ کی مسلمان رعایا ، ۱۸۹
۲۲ : جنوبی افریقہ کے ہندوستانی ، ۱۹۳
۲۳ : سلطنتِ برطانیہ اور اس کی مسلمان رعایا ، ۱۹۵
۲۴ : مدغاسکر میں اسلام —— ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری ، ۱۹۷
۲۵ : سروِیا میں اسلام —— " " ۱۹۹
۲۶ : بلغاریہ میں اسلام " " ۲۰۳
۲۷ : چین میں اسلام اور عیسائیت کا مقابلہ ، ۲۱۳
۲۸ : لارڈ کچنر کی رپورٹ مصر پر ، ۲۱۷
۲۹ : انجمن خدام کعبہ ، ۲۲۱
۳۰ : محاربۂ بلقان —— سید سجاد حیدر یلدرم ، ۲۲۳
۳۱ : ہندو مسلمان اتحاد پر ایک نظر —— پروفیسر مرزا محمد سعید دہلوی ، ۲۲۵

شخصیات

۳۲ : رؤف بے ، کمانڈر جہاز "حمیدیہ" ۲۲۹
۳۳ : مسٹر موہن داس گاندھی ، ۲۳۲

معلومات اور وقائع

۳۴ : کابل کے سیاسی قیدی ، ۲۳۷
۳۵ : تین سال کابل میں ، ۲۳۹
۳۶ : یونان وسروِیا ، ۲۴۱
۳۷ : مذہبِ عیسوی اور خزانۂ ہند ، ۲۴۳

افسانے

۳۸ : دارو ئے تلخ —— منشی پریم چند ، ۲۴۶
۳۹ : افسانۂ دل سلطان حیدر جوش ، ۲۵۲

شعروسخن

۴۰ : آہِ دردمند آرزو لکھنوی ، ۲۵۵
۴۱ : بچپن کی یاد حامد اللہ افسر میرٹھی ، ۲۵۶

ہمدرد کا دورِ ثانی

۴۲ : الوداعِ اوّل ، ۲۵۹
۴۳ : الوداعِ اخیر ، ۲۶۲

ٹرکش میڈیکل مشن

۴۴ : ڈاکٹر انصاری کا خط ، ۲۷۴
۴۵ : ڈاکٹر انصاری کا خط ترکی سے ، ۲۷۵
۴۶ : قسطنطنیہ سے ایک خط ـــــ حافظ محمد یوسف انصاری ، ۲۷۷
۴۷ : درّدانیال سے ایک خط ـــــ قاضی بشیر الدین ، ۲۷۸
۴۸ : ڈاکٹر انصاری کی چٹھی ، ۲۸۰
۴۹ : آل انڈیا میڈیکل مشن کا الوداعی منظر ، ۲۹۰
۵۰ : قسطنطنیہ کی چٹھی ـــــ عبدالرحمٰن صدیقی ، ۳۰۵
۵۱ : ترکوں کے سچے حالات ـــــ منظور محمود لکھنوی ، ۳۱۵
۵۲ : ڈاکٹر انصاری کی مراجعت ـــــ نواب وقار الملک ، ۳۱۸
۵۳ : خیر مقدم وفد انصاری ـــــ شبلی نعمانی ، ۳۲۱
۵۴ : پھیری والے سوداگر کی صدا ! ، ۳۲۲

ہنگامہ زار کانپور

۵۵ : سخن ہائے گفتنی (نظم) ـــــ شبلی نعمانی ، ۳۲۸
۵۶ : کانپور میں مسجد کی شہادت ، ۳۲۹
۵۷ : مچھلی بازار کانپور ، ۳۴۰
۵۸ : کبوتکبیر ـــــ خواجہ حسن نظامی ، ۳۴۷
۵۹ : کانپور کے مسلمانوں کی شہادت ، ۳۴۹
۶۰ : کشکول ، ۳۵۱
۶۱ : سر جیمس مسٹن کی تقریر آگرہ میں ، ۳۵۲
۶۲ : مسلمانوں کا وفد ہز آنر کی خدمت میں ، ۳۵۵
۶۳ : سر جیمس مسٹن سے التجا ، ۳۵۸
۶۴ : سر جیمس مسٹن کی خدمت میں مسلمانوں کا وفد ، ۳۶۰
۶۵ : سر مسٹن کا جواب ، ۳۶۵

۶۶ : کانپوری شہید کے گھر میں پہلی رات ، ۳۶۸
۶۷ : کانپور کے قیدی اور مجروحین کی کیفیت ، ۳۷۱
۶۸ : سر مسٹن کی ضد ، ۳۷۴
۶۹ : کانپور کی عید ، ۳۷۶
۷۰ : سر رضا علی کی تقریر ، ۳۷۹
۷۱ : دہلی کا پُر اسرار جلسہ ، ۳۸۲
۷۲ : نواب رامپور کے کارنامے ، ۳۸۲
۷۳ : پُر اسرار جلسے کی کیفیت ـــــ سر رضا علی ، ۳۸۷
۷۴ : کانپور میں وائسرائے کا ورودِ مسعود ، ۳۸۹
۷۵ : تیرے ہی صدقے میں تو خان بہادر ہوں میں ، (نظم) ۳۹۰
۷۶ : وائسرائے کی تقریر ، ۳۹۱
۷۷ : وائسرائے کی تقریر پر ایک نظر ، ۳۹۴
۷۸ : مسجد سے خطاب ـــــ حامد اللہ افسر میرٹھی ، ۴۰۰
۷۹ : قضیۂ کانپور پر ایک نظر ، ۴۰۱
۸۰ : کانپور کے مشرح حالات ، ۴۰۳
۸۱ : مسلمانوں کی فریاد ، (نظم) ۴۱۲

خطوط و مقالات مولانا شوکت علی

۸۲ : حرفِ آغاز ـــــ مولانا جمال میاں ، ۴۱۴
۸۳ : حرفِ گفتنی ـــــ مولانا صبغۃ اللہ شہید فرنگی محلی ، ۴۱۷
۸۴ : خطوط شوکت علی ، ۴۱۹
۸۵ : شکوہ و شکایت ، ۵۲۶

خطوط و مقالات مولانا محمد علی

۸۶ : علی برادران کی اسیری ـــــ علامہ اقبال ، ۵۴۲
۸۷ : کانگرس سے علیحدگی ، ۵۶۸
۸۸ : کاروانِ آزادی کا کوچ ، ۵۷۴
۸۹ : ترکِ تعلق کا اعلان ، ۵۷۶
۹۰ : بیانِ واقعہ

۹۱: سخن ہائے گفتنی ، ۵۹۵

۹۲: آخری مشورہ ، ۵۹۹

بیگم محمد علی کے خطوط لندن سے ، ۶۱۳

ضمیمے

خلافت اور کانگرس ــــــ رئیس احمد جعفری ، ۶۲۷

تحریکِ خلافت ــــــ سید حسن ریاض ،

★ ═══ ★ ═══ ★

Habib Bank Limited

(پاکستان میں تشکیل شدہ)
قائم شدہ: ۱۹۴۱ء

اپنی بچت حبیب بینک میں جمع کیجئے

روپیہ بچائیے

اور

ان کے مُستقبل کا تحفّظ کیجئے ..

حبیب بینک میں روپیہ جمع کیجئے
اور روپیہ بچانے کی عادت ڈالئے
تاکہ یہ بچت ضرورت پڑنے پر آپ کے
اور آپ کے خاندان کے کام آسکے۔

حبیب بینک میں پس انداز کیجئے

آج ہی فیملی سیونگ اکاؤنٹ کھولئے۔

* حساب صرف ۵ روپے سے کھولا جاسکتا ہے۔
* ۵۰،۰۰۰ روپے تک ۲½ فیصد سود ادا کیا جاتا ہے۔
* رقومات بذریعہ چیک نکالی جاسکتی ہیں۔

حبیب بینک لمیٹڈ

خلافت کا عملۂ ادارت سنہ ۱۹۳۴ء

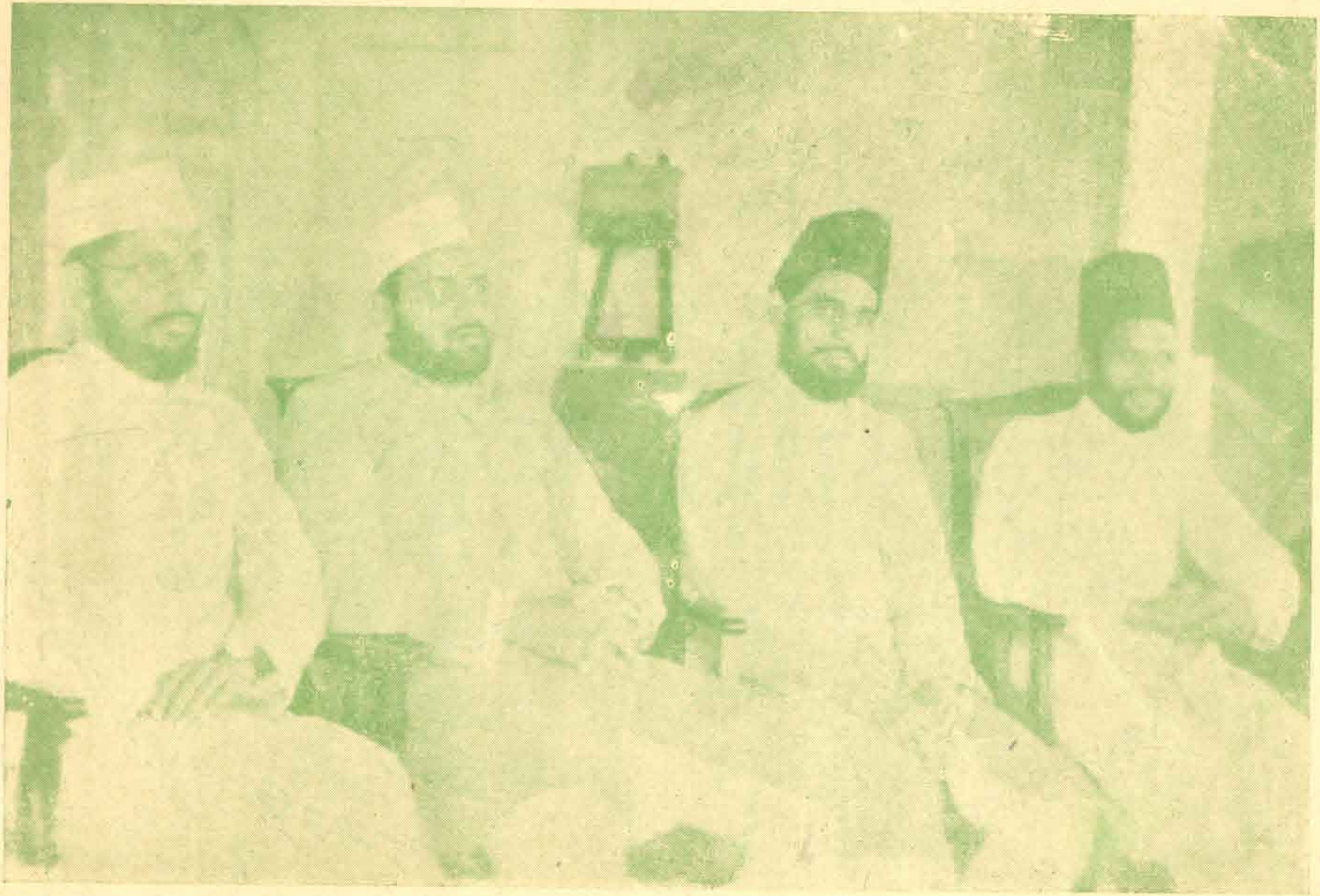

ابراہیم عمادی ندوی، مترجم عربی - حبیب احمد ندوی چیف رپورٹر - رئیس احمد جعفری مدیر اعلیٰ - عبدالسلام قدوائی ندوی سب ایڈیٹر

مقالات

اس عنوان کے ماتحت وہ مقالات درج کیے گئے ہیں
جو اس کتاب کے لیے خاص طور پر تحریر فرمائے گئے ہیں
ان مقالات کے مطالعے سے محمد علی کی زندگی کے
بعض بالکل نئے پہلو سامنے آتے ہیں، جو اب تک
کہیں اور شائع نہیں ہوئے اس لیے ان کی
افادیت اور اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے!

حضرت مولانا محمد طیب صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مولانا محمد علی جوہر (مرحوم)

مولانا محمد علی مرحوم ہندوستان ہی میں نہیں بیرونِ ہند میں بھی محتاجِ تعارف نہیں تھے مسلمانوں اور غیر مسلموں کا بچہ بچہ ان کے نام سے واقف تھا۔ وہ ہندوستان کے مخلص زعیم اور سچے جذبات کے لیڈر تھے۔ تحریکِ خلافت کے اولین بانیوں میں سے تھے۔ اسٹیج اور پلیٹ فارم پر سب سے پہلے انہوں نے ہی برطانیہ کے خلاف ہندوستان کو جگایا۔ اور دلیری کے ساتھ ملک کو ایک ایسی حکومت کے مقابلہ پر دلیر بنا دیا جس کی عملداری میں کسی وقت بھی آفتاب غروب نہ ہوتا تھا۔ مجھے مولانا محمد علی مرحوم سے ملنے جلنے کا اتفاق شاذ و نادر ہی ہوا ہے اور شاید دو ایک بار ہی اس کی نوبت آئی ہے کہ آمنے سامنے ہو کر میں اُن سے ملاقات کا شرف حاصل کروں۔ میری پہلی ملاقات اُن سے بمبئی میں ہوئی ہے۔ میں اپنے والد مرحوم کے ساتھ حضرت مرشدی شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے استقبال کے لیے بمبئی پہنچا جب حضرت مالٹا کی اسیری سے رہا ہو کر ہندوستان عائد ہوئے۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی مرحوم خلافت کمیٹی بمبئی کی جانب سے حضرت شیخ کے استقبال اور جلوس کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ کسی موقعہ پر اچانک آمنا سامنا ہوا اور میں اور میرے چھوٹے بھائی مولوی طاہر مرحوم اُن سے ملے مصافحہ کیا۔ کسی نے ہم دونوں کا تعارف کرایا تو بڑی محبت سے ہم دونوں سے بغلگیر ہوئے اور فرمانے لگے میں حیران تھا کہ یہ لڑکوں کے بچے ہندوستان میں کہاں سے آ گئے؟ یہ اس لیے فرمایا تھا کہ میرے بھائی مرحوم تو بہت ہی سُرخ سفید اور گورے چٹے تھے اور میرا رنگ بھی موجودہ عمر اور حالت کے مقابلہ میں کافی اُجلا اور روشن تھا۔ اُس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ اُن میں بزرگانہ شفقت کے علاوہ اپنے چھوٹوں کو آگے بڑھانے اور حوصلہ افزائی کے خاص جذبات تھے۔

دوسری ملاقات دیوبند ہی میں ہوئی۔ جب کہ وہ تحریکِ خلافت کے سلسلہ میں دورہ کرتے ہوئے دیوبند تشریف لائے والد مرحوم کے مہمان ہوئے اور میرے مکان میں قیام فرمایا جو اُس وقت نیا مکان کہلاتا تھا۔ اولاً دارالعلوم تشریف لائے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نائب مہتمم دارالعلوم نے دارالعلوم کا معائنہ کرا کر بزرگوں کے زمانہ کے کچھ پرانے کاغذات دکھلائے۔ اُن میں حضرت بانی دارالعلوم حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم قدس سرہ کے دستِ مبارک کے لکھے ہوئے وہ آٹھ اصول بھی دکھلائے جو حضرت نے بطور اساس مدرسہ و مدارس ہند تحریر فرمائے تھے۔ مولانا انہیں پڑھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ بے اختیار اُن کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور کہا کہ ان اصول کا عقل سے کیا تعلق یہ تو خالص معرفت اور الہام کے اصول ہیں۔ اور حیرت ہے کہ سو برس پہلے کہا کہ ہم لوگ یہاں آج پہنچے ہیں یہ بزرگ وہاں سو برس پہلے ہی پہنچ چکے تھے جب کہ حالات وہ نہیں تھے جو آج پیش آ رہے ہیں۔

اس سے مولانا مرحوم میں مجھے دو متضاد کیفیات محسوس ہوئیں جو شاذ و نادر ہی کسی میں جمع ہوتی ہیں۔ یعنی شجاعت اور رقتِ قلب

اُن کی بہادری کا تو یہ عالم تھا کہ برطانوی حکومت سے بے جھجک ٹکر لے رہے تھے جب کہ قید و بند جیل اور پھانسی کا تختہ سامنے تھا، اور اس کے ساتھ ہی رقتِ قلب کا یہ عالم کہ تقریروں میں الگ روتے تھے اور کوئی بھی دین و آخرت کی بات سامنے آجاتی تھی تو فوراً اُن کی آنکھیں لبریز ہو جاتی تھیں۔ یہ دو وصف اُسی شخص میں جمع ہو سکتے ہیں جو دنیا کی زندگی کے ساتھ آخرت کو بھی پیشِ نظر رکھتا ہو شجاعت قلب کا یہ عالم تھا کہ طلبِ آزادی کی راہ میں جب اُنھوں نے انگلستان کا آخری سفر کیا اور یہ ملانوی پارلیمنٹ میں تقریر کی تو کنگ جارج کو بے دھڑک خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وکٹوریہ کا بیٹا اگر مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دے سکتا تو مرنے کے لیے ڈیڑھ گز زمین تو انگلستان ہیں دے سکے گا۔ یہ الفاظ کچھ ایسے درد انگیز اور سچے انداز میں قلب کی گہرائیوں سے نکلے کہ پارلیمنٹ تو جس حد تک متاثر ہوئی وہ ہوئی خود اُن کے حق میں وہ الفاظ واقعہ بن گئے۔ اور وہیں انگلینڈ میں غالباً اُسی شب میں وفات پا گئے حق تعالیٰ نے اُنہیں اور اُن کے الفاظ کو ایسا قبول فرمایا کہ ابدی طور پر مقبولین کی معیت اور سرزمین پاک نصیب فرمائی اُن کی نعش انگلستان سے بیت المقدس لائی گئی اور انبیاء علیہم السلام کی مقدس زمین میں انبیاء کے جوار میں دفن کیے گئے۔ یہ جہاں اُن کی قبولیت عند اللہ کی دلیل ہے وہیں اُن کی پاک طینتی کی حجت بھی ہے۔ کیونکہ حدیث نبوی میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو شخص جہاں دفن ہوتا ہے وہی اُس کی مٹی بھی ہوتی ہے جس سے اُس کا خمیر کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مٹی کو قرآن نے "ارضِ مقدس" فرمایا ہے۔ اس لیے اُن کی طینت کا خاکِ مقدس سے لیا جانا واضح ہے جو اُن کی پاک طینتی کی دلیل ہے۔ گو اُس خاکِ مقدس سے کفار بھی پیدا ہوتے ہیں اور وہیں وہ سپرد خاک بھی کیے جاتے ہیں، لیکن ایمانی استعداد کو کھو کر وہ اس کی تقدیس خود زائل کر دیتے ہیں جو خود اُن کا قصور ہے۔ ارضِ مقدس کی تقدیس کا قصور نہیں۔ پانی اپنی ذات سے پاک ہے ناپاکی ملانے والے کا قصور ہے کہ اُسے ناپاک بنا دے، حجرِ اسود بہ نصِ حدیث جنت کا پتھر ہے جس کا رنگ سفید براق تھا بنصِ حدیث بنی آدم کے گناہوں نے اگر اس کا رنگ سیاہ کر دیا تو یہ گناہ گاروں کا قصور ہے نہ کہ حجرِ مقدس کا یا اُس کی شفافی کا۔ بہر حال محمد علی کی طینت پاک تھی جو ارضِ مقدس سے لی گئی تھی ایمان کے جوہر نے اس کی پاکی کو تھامے رکھا اور اُسے وہیں پہنچا دیا جہاں سے وہ اُٹھائی گئی تھی۔

ع۔ پہنچی وہیں یہ خاک، جہاں کا خمیر تھا

بہر حال مولانا محمد علی نے حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے تحریر فرمودہ اصول پر روتے ہوئے اظہارِ خیال کیا اور کہا کہ آج کی دنیا جس مقام پر آج سو برس دھکے کھا کر پہنچی ہے یہ روشن ضمیر بزرگ اس مقام پر سو برس پہلے محض اپنی روشن ضمیری سے پہنچ چکے تھے۔ اسی مجلس میں تمام اساتذۂ دار العلوم کو بھی حضرت والد مرحوم نے جمع فرما لیا تھا۔ یہ احقر بھی اُس مجلس میں موجود تھا۔ مولانا محمد علی مرحوم سے یہ دوسری ملاقات تھی جو بمبئی کے بعد دیوبند میں ہوئی اور اُنہیں زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ مجلس ظہر عصر کے درمیان میں ہوئی۔

بعد نمازِ عصر مسجد دار العلوم میں اُن کی تقریر کا اعلان تھا۔ مولانا نے تقریر شروع کی اور انگریزوں کے ہاتھوں خلافتِ اسلامیہ کی پامالی کی داستان سنائی، درد انگیز لہجہ میں خصوصیت کے ساتھ دار العلوم دیوبند کے اکابر کو متوجہ کیا کہ وہ اس سلسلہ میں آگے بڑھیں۔ دار العلوم کی طرف سے خلافت کی بقا کے سلسلہ میں احتجاجی مضامین پہلے ہی سے شائع ہو چکے تھے اور اکابر دار العلوم اس مسئلہ میں عملی طور پر آگے آ چکے تھے۔ مولانا محمد علی کی اس تحریک کے بعد عملی اقدامات اور زیادہ

بڑھ گئے۔ اور آخر کار اس مسئلہ میں قیادت ہی اُن کی ہو گئی۔ احتجاجی جلسوں میں اکابر دیوبند خود جا جا کر شریک ہونے لگے۔ یہ احقر بھی گنگوہ، کاندھلہ، پور قاضی وغیرہ آس پاس کے قصبات میں طالب علمانہ انداز سے تحریکِ خلافت کے سلسلہ میں جایا کرتا تھا۔

مولانا محمد علی نے اس تقریر میں نہایت ہی درد انگیز لب و لہجہ میں حضرات صحابہ کی ہمت و مستعدی اور اُن کے مجاہدانہ روشِ عملی پر تاریخی حیثیت سے روشنی ڈالتے ہوئے بار بار اس آیت کو روتے ہوئے پیش کیا فما ضعفوا و ما استکانوا اس کا ترجمہ کرتے جاتے تھے کہ یہ حضرات صحابہ اعلائے کلمۃ اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کے راستہ میں نہ کمزور پڑے اور نہ جھکے اور روتے جاتے تھے۔ بہرحال ایک طرف اُن کی شجاعتِ قلب اور ایک طرف رقتِ قلب دو متضاد سی چیزیں تھیں مگر اللہ نے اُن میں جمع فرما دی تھیں جو بڑوں ہی کو نصیب ہوتی ہیں۔ پھر اس کے بعد دوسری تقریر سبزی منڈی میں عشا کے بعد شہر کے جلسۂ عام میں ہوئی جس میں اُنھوں نے قرنِ اول کے مسلمانوں کے مجاہدانہ کارناموں کے ساتھ اُن کی سادگی، بے تکلفی اور لا امتیازی کے جذبات کو بہت ہی اچھے اور مؤثر انداز سے بیان کیا۔ مجھے یاد ہے کہ اُنھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ واقعہ ذکر کیا جس میں وہ مدینہ سے بیت المقدس تشریف لے گئے تھے۔ جب کہ حضرات صحابہ نے بیت المقدس کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ اور حضرت ممدوح کے پہنچنے پر صلحاً بیت المقدس فتح ہو گیا اور مسلمان بیت المقدس میں حضرت عمرؓ کے ساتھ داخل ہو گئے۔ یہ سفر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک اونٹنی پر کیا تھا۔ صرف ایک غلام ساتھ تھا۔ اور وہ بھی اس طرح اترتے چڑھتے سفر طے ہوا ایک مسافت کی حد تک امیر المومنین سوار ہوتے تھے غلام اونٹنی کی نکیل تھام کر چلتا تھا اور ایک مسافت کی حد تک غلام اونٹنی پر سوار ہوتا تھا اور امیر المومنین اونٹنی کی نکیل تھام کر چلتے تھے۔ اس سچی اور حقیقی مساوات کے واقعہ کو مولانا محمد علی نے نظم کیا تھا جس کے اشعار اس جلسہ میں پڑھ کر سنائے۔ مجھے صرف ایک مصرعہ یاد رہ گیا جسے مولانا بڑے والہانہ انداز میں بار بار پڑھ رہے تھے اور درد دل کے ساتھ رو رہے تھے۔ ع

چلے جاتے تھے یوں چڑھتے اُترتے

یہ گویا تیسری ملاقات تھی جو عمومی رنگ سے ہوئی۔

تحریک خلافت اور مولانا محمد علی جوہر کے دیوبند آنے اور ملنے سے علی گڈھ اور دیوبند باہم بہت قریب ہو گئے تھے۔ ایک نے دوسرے کو پہچانا اور وہ بُعد جو اس سے قبل تھا بہت حد تک رفع ہو گیا۔ سر سید کے معتقدات سے اختلاف رہا لیکن ادارہ کی حیثیت سے بُعد باقی نہیں رہا۔ تاآنکہ رفتہ رفتہ وہ وقت بھی آ گیا کہ علی گڈھ یونیورسٹی علماء دیوبند کو عزتیں دے دے کر بلانے لگی اور وہاں کا طبقہ ان کے مواعظ سے بطوع و رغبت استفادہ کرنے لگا۔ مجھے خود بھی بارہا علی گڈھ کی دعوتوں پر جانے آنے اور علی گڈھ کے ہالوں میں تقریریں کرنے کی نوبت آئی جنھیں وہاں کے بزرگوں اور خوردوں نے محبت و خلوص اور شوق و میلان کے ساتھ سنا اور اس ناکارہ کے ساتھ اپنے دلوں کی بڑائی سے وہ معاملہ کیا جو ایک بڑے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ پھر یہ قرب باہمی اس حد تک آگے بڑھا کہ دیوبند کے متعدد فضلاء علی گڈھ کی مجلسِ مشاورت کے ارکان بنا لیے گئے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ اور یہ احقر آج بھی علی گڈھ کی مجلسِ عاملہ کے اراکین میں شامل ہیں۔ میں سمجھتا ہوں

کہ اس طویل و عریض خط کا نقطہ جو مولانا محمد علی مرحوم کی دیوبند میں آمد اور ان کا مجاہدانہ اقدام ہے جو دارالعلوم دیوبند کی طرف جھکنے اور یہاں کے بزرگوں سے میل ملاپ قائم کرنے کی صورت میں نمودار ہوا۔

مولانا محمد علی مرحوم اپنے ابتدائی دور میں جب وہ علی گڑھ سے فارغ ہو کر باہر آئے ہیں مغربی تہذیب کا ایک چلتا پھرتا نمونہ تھے، ان کی اس دور کی تصاویر دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ تہذیب و تمدن کے لحاظ سے اُن میں اور انگلستان کے ایک ٹھیٹ فرنگی میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ ڈاڑھی صاف مونچھیں چڑھی ہوئیں، کوٹ پتلون سے جسم آراستہ۔ لیکن ان کی بنیادی طینت اور خمیر کی پاکیزگی بالآخر رنگ لائی، دین اور دینی جذبات اُبھرے اور وہ مقاصد معینہ کی طرف گویا کشاں کشاں لائے گئے تو پھر یہ ہی مخلوق نے دیکھا کہ کوٹ پتلون کے بجائے اُن کے کندھوں پر عربی عبا رہتی تھی۔ ڈاڑھی سینہ تک آئی ہوئی۔ گورے چٹے پہلے سے تھے۔ اس خاص دینی ہئیت نے اُن کے چہرے پر ایک عجیب نورانیت پیدا کر دی تھی۔ اور وہ انگلستانی ٹائپ کے آدمی ہونے کے بجائے خالص عربستانی باشندے محسوس ہوتے تھے۔ آخر میں اُن کی زندگی نہایت بے تکلف بن گئی تھی۔ قناعت کا رنگ غالب آگیا تھا۔ اور اُن کی مجلس ادیبانہ اور عاصحانہ رنگ کی ہو گئی تھی اور کہا جا سکتا ہے کہ آخر کار مولانا محمد علی کی زندگی اسلام کی نمائندہ زندگی بن گئی تھی اور وہ صحیح معنی میں مسٹر محمد علی کے بجائے اب مولانا محمد علی تھے اور اسی بہترین اور پاکیزہ حالت پر اُن کا خاتمہ ہوا رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃً۔

مجھے مولانا محمد علی کی معیت کی ساعتیں مذکورہ ساعتوں کے سوا زیادہ نہیں ملیں اس لیے اُس کی زندگی کے واقعات پر عبور بھی نہیں ہے۔ یہ وہ تین واقعات سامنے تھے جو رئیس احمد صاحب جعفری کی فرمائش پر معرض تحریر میں آگئے اللہ تعالےٰ قبول فرمائے۔

ص۔

از افادات
مولانا ابوالاعلیٰ مودودی،
امیر جماعت اسلامی پاکستان

مولانا محمد علی: ایک پُرانی داستان

مولانا محمد علی سے میرے روابط کی تاریخ بہت پرانی ہے، میرے سب سے بڑے بھائی ابو محمد صاحب مرحوم جو بھوپال میں مقیم تھے، مولانا مرحوم کے دوستوں میں سے تھے اور دوستی کے یہ روابط خاصے گہرے اور مضبوط تھے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم، ڈاکٹر عبدالرحمان، شعیب قریشی اور عبدالرحمان سندھی (صدیقی) صاحب سے بھی ان کے بڑے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ اور موخرالذکر دونوں حضرات تو بسا اوقات مہینوں ہمارے ہاں مہمان رہے ہیں۔ یہ مخلص لوگ تھے، علی گڑھ کی مخصوص تہذیب اور شائستگی کا نمونہ۔ قومی درد رکھتے تھے۔ ایثار کا جذبہ انہیں یے گھر کیے ہوئے تھا۔ یہ بیرسٹر تھے، انگریزی کے صاحب طرز ادیب تھے، اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں خطابت کے جوہر دکھاتے تھے، ان کی قابلیت اپنے لیے نہیں تھی، قوم کے لیے تھی، خود میرے بھائی ابو محمد صاحب بھی اس حلقہ اخوان الصفا کے ایک رکن تھے، ان لوگوں میں خوب نبھتی تھی، اور اس مجمع رنداں کے پیرِ مغاں محمد علی کو، سب چاہتے بھی تھے، اور ان کی عظمت کے آگے سر بھی جھکاتے تھے۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں جب مولانا محمد علی دوبارہ ہمدرد جاری کرنے کے انتظامات کر رہے تھے، بھائی ابو محمد صاحب مرحوم نے مجھے رائے دی کہ میں اس کے ادارہ سے وابستہ ہو جاؤں۔ اس سے پہلے میں متعدد اخباروں میں کام کر چکا تھا، میں نے بھی اس کو غنیمت سمجھا کہ مجھے مولانا محمد علی جیسے شخص کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملے، چنانچہ میں بھائی صاحب کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔

ایک بزرگ اپنے چھوٹے کے ساتھ جس محبت و شفقت کے ساتھ پیش آسکتا ہے، اس سے کچھ زیادہ ہی محبت و شفقت مجھے محمد علی کی طرف سے ملی، کیونکہ وہ ہر معاملہ میں بالخصوص دوستی و محبت کے معاملہ میں بہت زیادہ انتہاپسند تھے۔ چنانچہ اس کے بعد بارہا اُن کی خدمت میں حاضری کا موقع ملتا رہا اور ہمیشہ یہی محسوس ہوا کہ میں ایک بڑے لیڈر سے نہیں بلکہ اپنے بڑے بھائی سے مل رہا ہوں۔

ابھی ہمدرد کے اجرا کے انتظامات ہی ہو رہے تھے کہ میں نے اس سے وابستہ ہونے کا ارادہ ترک کر دیا۔ دراصل چند ہی روز بعد میں نے محسوس کر لیا تھا کہ فکری ہم آہنگی، جذباتی عقیدت، اور سیاسی معاملات میں تمام تر اتفاق رائے کے باوجود میرا اور اُن کا نباہ نہیں ہو سکتا۔ اُن کی "مہر پدری" میں "پدری" بھی شامل تھا، اور وہ بھی پوری شدت اور انتہاپسندی کے ساتھ۔ میری پرورش جس ماحول میں ہوئی تھی، اُس نے خود میرے مزاج اور افتادِ طبع کا بھی ایک نہ ٹوٹنے والا سانچہ بنا دیا تھا۔ اگر ساتھ رہتا تو اندیشہ تھا کہ یہ سانچہ ٹوٹ نہ جائے۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کر لیا کہ ہمدرد کے عملۂ ادارت سے وابستگی نہیں اختیار کروں گا، البتہ اس سے باہر رہ کر جو خدمت بھی اس بطلِ جلیل کی بن آئے گی کروں گا۔

اتفاق کی بات اُسی زمانہ میں جمعیۃ علمائے ہند کو، اپنے آرگن روزنامہ "الجمعیۃ" کے لیے ایک ایڈیٹر کی ضرورت پیش آئی، ہندوستانی سیاست کا داخلی اور خارجی اعتبار سے یہ بڑا اہم اور نازک دور تھا، اربابِ جمعیۃ کو ایسے ایڈیٹر کی تلاش تھی جو واقعات و مسائل اور حوادث و افکار پر اپنے اداریوں میں جن خیالات کا اظہار کرے، ایک طرف وہ جدید معیارِ صحافت پر اپنے عمق کے اعتبار سے پورے اُترتے ہوں دوسری طرف مذہبی نقطۂ نظر بھی پورے توازن کے ساتھ ان میں سمویا ہوا ہو۔ اس مقصد کے لیے اربابِ جمعیت کی نگاہِ انتخاب مجھ پر پڑی، کیونکہ وہ پہلے سے مجھ پر اعتماد رکھتے تھے۔ اور میں سنہ ۲۲ سنہ ۲۳ء میں اُن کے اخبار "مسلم" کا ایڈیٹر رہ چکا تھا، اور میں نے بھی ہمدرد کے بجائے "الجمعیۃ" کی پیشکش قبول کرنے کو ترجیح دی، کیونکہ یہاں میں خود پرچے کو چلانے کا ذمہ دار تھا، کسی دوسرے کی ماتحتی میں مجھے کام کرنا نہ تھا۔

سنہ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۸ء تک میں یہ ذمہ داری انجام دیتا رہا۔ اس عرصہ میں برابر محمد علی سے استفادے کا، اُن سے فیضِ صحبت حاصل کرنے کا، اور اُن کی شخصیت کو بہت زیادہ قریب سے دیکھنے کا مجھے موقع ملا۔ لیڈروں سے یہ دنیا نہ کبھی خالی رہی ہے، نہ رہے گی، لیکن اس درویش خدامست کی قیادت شان ہی کچھ اور رکھتی تھی، پھر اس کے بعد آج تک مسلمانوں میں کوئی لیڈر ایسا نظر نہیں آیا جو سیاسی بصیرت کے ساتھ ایسا گہرا دینی جذبہ بھی رکھتا ہو اور اپنی دینداری سے اپنی تحریک کے کارکنوں میں بھی دینی روح پھونک سکتا ہو۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ الجمعیۃ نے میرے دورِ ادارت میں ہمیشہ پورے خلوص اور استقلال و استقامت کے ساتھ محمد علی کی ہمنوائی کی، مخالفوں کی یلغار میں اس کا ساتھ دیا، جب اس پر تیروں کی بارش ہوتی تھی تو اس کی ایک ڈھال الجمعیۃ بھی تھا۔

محمد علی کا سا زعیم غلام آباد ہندوستان نے شاید کوئی نہیں پیدا کیا، وہ گدائے بے نوا تھا، لیکن آغا خاں اور مہاراجہ محمود آباد اس کے حضور میں جھک کر آتے تھے، وہ اقلیت کا ایک فرد تھا، لیکن اکثریت کا سب سے بڑا لیڈر — گاندھی — اُس کی جیب میں تھا، اور پٹیل، موتی لال، جواہر لال، راجندر پرشاد وغیرہ تو اس سے دوسرے ہی درجے پر تھے۔ وہ ایک غلام ملک کا باشندہ تھا، لیکن دنیا کی سب سے بڑی سامراجی حکومت اس سے ڈرتی تھی۔ وہ بڑی آسانی سے انگریزی دور میں کم از کم وائسرائے کی اگزیکٹو کونسل کا ممبر تو بن ہی سکتا تھا۔ لیکن ان مناصبِ عالیہ پر اُس نے کبھی نگاہِ غلط انداز ڈالنا بھی گوارا نہ کیا۔ اس کی زندگی کا مقصد منہاجِ خلافتِ راشدہ پر خلافت کا قیام تھا۔ وہ پابندی سے نماز پڑھتا تھا، پابندی سے روزے رکھتا تھا، اور ذاتِ رسالت مآبؐ سے اس کے عشق اور شیفتگی کی یہ کیفیت تھی کہ — جب نام ترا لیجیے تب اشک بھر آوے، اس کی دوستی بھی اللہ کے لیے تھی، اور دشمنی بھی اللہ کے لیے۔ اسی لیے وہ دوستوں کو دشمن اور دشمنوں کو دوست بناتا رہتا تھا، وہ بغاوت کے جرم میں جیل بھی گیا، اور اس جرم میں پھانسی کا مشتاق بھی رہا، خود ہی کہتا ہے

مستحقِ دار کو حکمِ نظر بندی ملا
کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

مولانا محمد علی کا ایک معمول یہ تھا کہ ہر جمعہ کو نماز کے بعد جامع مسجد میں، اُس منبر پر جو صحن میں تھا کھڑے ہو کر حالاتِ حاضرہ پر تقریر کیا کرتے تھے۔ میں اُن کی یہ ہفتہ وار تقریر پابندی سے سنتا تھا، اور مجھے اس حقیقت کے اظہار میں کوئی تامل نہیں کہ ان تقریروں سے میں نے فکری طور پر بہت فائدہ اُٹھایا، اور یہی وجہ تھی کہ ایک سامع کی حیثیت سے شاید ہی اپنے دورانِ قیامِ دہلی میں کوئی تقریر میں نے ناغہ کی ہو۔

۱۹۲۶ء میں سوامی شردھانند کو ایک مسلمان نے قتل کر دیا، یہ بڑا سخت حادثہ تھا، ہندو مسلم اتحاد کی بنیادیں ویسے ہی ایک عرصہ سے ہل رہی تھیں، اب تقریباً منہدم ہو گئیں، ہر طرف سے مسلمانوں پر حملے ہونے لگے کہ یہ متعصب ہیں، وحشی ہیں، خون آشام ہیں، حتیٰ کہ گاندھی جی تک بے ساختہ کہہ اُٹھے کہ مسلمانوں کی سرشت میں خونریزی شامل ہے۔ مولانا محمد علی مسلسل اپنی تقریروں میں اسلام کا دفاع کرتے رہے۔ مستشرقینِ فرنگ اور متعصبینِ ہند کا جواب اپنے مبلغِ علم کے مطابق دیتے رہے۔ ایک روز اُنھوں نے اپنی تقریر میں فرمایا:

"کاش کوئی شخص اسلام کے خلاف ان افترا پردازیوں کا جواب دلائل و براہین کے ساتھ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھ کر، اسلام کے جہاد کی حقیقت دنیا کے سامنے آشکارا کر سکے"!

وہیں بیٹھے بیٹھے میرے دل میں خیال آیا، وہ شخص میں ہی کیوں نہ بن جاؤں؟

واپس آکر میں نے اس موضوع سے متعلق جتنی بھی معتبر اور مستند کتابیں فراہم ہو سکتی تھیں جمع کیں، اور چند روز بعد "الجمعیۃ" میں "الجہاد فی الاسلام" کے عنوان سے ایک سلسلۂ مقالات شروع کر دیا، جب اس کے ۲۲ نمبر شائع ہو چکے تو میں نے محسوس کیا کہ موضوع اتنا اہم ہے کہ مقالات کا متحمل نہیں ہو سکتا، یہ ایک مستقل تصنیف کا طالب ہے، چنانچہ میں نے دو تین سال کی تحقیق و مطالعہ کے بعد اس نام سے ایک کتاب مکمل کر لی جس کا پہلا ایڈیشن دار المصنفین اعظم گڑھ سے مولانا سید سلیمان ندوی نے شائع کیا تھا، بعد میں مزید اضافوں اور نظرِ ثانی کے بعد میں نے خود اسے شائع کیا۔

۱۹۳۰ء میں حق اور سچائی پر ہونے کے باوجود محمد علی بالکل "یکہ و تنہا" رہ گئے تھے، گاندھی جی اور جواہر لال کی قیادت میں کانگریس نے اُن کے خلاف زبردست محاذ قائم کر لیا تھا، زندگی بھر کے ساتھی جنہیں اُنھوں نے لیڈر بنایا تھا، اُن کا ساتھ چھوڑ کر کانگریس سے جا ملے تھے، اور مل ہی نہیں گئے تھے بلکہ محمد علی کی سیاست ہی پر نہیں بلکہ اُن کے خلوص و دیانت پر بھی حملے کر رہے تھے۔ محمد علی ان سب سے لڑ رہے تھے وہ بیمار تھے، دل کے بار بار حملے ہوتے تھے، ذیابیطس نے نڈھال کر دیا تھا، ساتھیوں کی بے وفائی نے زندگی سے بددل کر دیا تھا، اسی حالت میں وہ بھوپال آئے، وزیرِ ریاست شعیب قریشی کے ہاں جو اُن کے داماد بھی تھے ٹھہرے، لیکن نواب حمید اللہ خاں نے انہیں زبردستی اپنا مہمان بنایا۔ میں بھی اسی زمانے میں بیمار ہو کر اپنے بڑے بھائی کے ہاں گیا ہوا تھا، محمد علی بسترِ علالت پر دراز تھے، اور یہی بسترِ علالت اُن کے لیے بالآخر بسترِ مرگ ثابت ہوا۔ میں اکثر اُن کی خدمت میں پہنچ جاتا، اور وہ فسانۂ غم دل لے کر بیٹھ جاتے، یہ فسانۂ غم دل سن کر غیروں کا دل دو نیم ہو جاتا تھا، تو خود اُن پر کیا کچھ نہ گزر رہی ہوگی؟ انہیں اپنی بیماری کی فکر نہ تھی، اپنے چہیتے اور پرانے ساتھیوں کی بیوفائی کا اتنا غم نہ تھا، جتنی یہ فکر، جتنا یہ دھڑکا کہ ملتِ اسلامیہ اس بھنور سے کس طرح صحیح سلامت نکلے گی؟

یہی چیز تھی جس نے انہیں مجبور کر دیا کہ بسترِ مرگ پر لندن جائیں، گئے اور وہاں جاکر اعلان کیا کہ اگر آزادی نہ ملی تو غلام دیس میں تو مُردہ واپس نہیں جائیں گے، آزادی نہیں ملی، اور گو غلام دیس کی خاک نے انہیں اپنی طرف کھینچا۔ لیکن،

خاکِ قدس اورا بآغوشِ تمنّا در گرفت

رفت در فردوس زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

نہ جانے کہ اقبال کا یہ بہترین مرثیہ اُن کے مجموعۂ کلام میں کیوں نہیں شامل کیا گیا؟

محمد علی کی موت پر سب روئے، دوست بھی اور دشمن بھی، اور یہ آنسو سب کی چشمِ دل سے ٹپکے تھے، جن لوگوں کو محمد علی سے، اُن کی سیاست سے، اور اُن کی صحافت سے اختلاف تھا وہ بھی محسوس کرتے تھے کہ محمد علی متحدہ ہندوستان کا انمول ہیرا تھا جسے موت نے چھین لیا،

میرا یہ حال تھا کہ یہ خبر سنی تو ضبطِ گریہ ناممکن ہو گیا، کئی دن تک یہ عالم رہا کہ محمد علی کی یاد آئی اور آنکھوں سے آنسو رواں ہوئے، اور ایسا دن میں کئی کئی مرتبہ ہوتا تھا، بہت دنوں کے بعد طبیعت سنبھلی، لیکن اب تک یہ کیفیت ہے کہ جب محمد علی کا ذکر چھڑتا ہے، اس کا نام سنتا ہوں، اُس کی کوئی تحریر نظر سے گذرتی ہے، تو دل میں عقیدت کا ایک گہرا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے حال پچھلے قدموں دوڑتا ہوا ماضی میں پہنچ گیا ہے، اور وہ مجاہدِ صف شکن مصروفِ جہاد ہے، برطانوی استعمار سے بھی، ہندو سامراج سے بھی اور رفیقانِ گریز پا سے بھی، وہی فگار جسم لیکن وہی تیور، وہی دبدبہ، اللہ اُس پر رحمت کرے، اللہ ہم میں پھر کوئی محمد علی پیدا کر دے کہ جتنی محمد علی جیسے لیڈر کی آج ضرورت ہے، آج سے چالیس برس پہلے نہ تھی۔ ا

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی بذریعہ

مولانا محمد علی مدرسۃ الاصلاح میں

فاضل محترم مولانا رئیس احمد جعفری نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق میں چند تاثرات قلم بند کروں۔ میں اس فرمائش کی تعمیل کے لیے آمادہ تو ہو گیا ہوں لیکن یہ بات مضمون کے پہلے مرحلہ ہی میں واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے مولانا سے صرف نسبت غائبانہ عقیدت ہی کی حاصل ہے، ان سے ملنے جلنے کے مواقع تو درکنار ان کو دور دور سے دیکھ لینے کی سعادت بھی شاید دو تین بار سے زیادہ مجھے حاصل نہیں ہوئی ہے۔ تحریک خلافت کے شباب کے زمانے میں، سن ٹھیک طرح یاد نہیں (غالباً ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء میں) مولانا مدرسۃ الاصلاح، (سرائے میر ضلع اعظم گڑھ یو۔پی بھارت) کے سالانہ جلسہ میں تشریف لائے۔ میں اس وقت مدرسۃ الاصلاح میں آخری درجوں کا طالب علم تھا۔ اس جلسہ میں مجھے یاد ہے کہ مولانا کا نام سن کر مدرسہ کے وسیع میدان میں بے پناہ خلقت جمع ہوئی۔ مولانا کے ساتھ وقت کے بعض دوسرے اکابر و مشاہیر بھی تشریف لائے، میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہی کسی جلسہ میں کبھی مشکل ہی سے شریک ہوتے تھے، لیکن اس جلسہ میں وہ بھی شریک ہوئے۔ بڑا عظیم اجتماع تھا، میں نے اس سے پہلے اس سے بڑا اجتماع کوئی نہیں دیکھا تھا۔ جلسہ کھلے میدان میں تھا۔ ہوا نہایت تند چل رہی تھی۔ اس زمانہ تک لاؤڈ سپیکر کا رواج نہیں ہوا تھا۔ اس وجہ سے اندیشہ تھا کہ مولانا کی تقریر سنی نہ جا سکے گی جس سے جلسہ میں انتشار پیدا ہو جائے گا۔ لیکن جب مولانا تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو اُن کے رُعب و دبدبہ نے ہر شخص کو اس طرح مرعوب و مسحور کر لیا کہ جو شخص جس جگہ کھڑا یا بیٹھا تھا وہیں پیکر تصویر بن کر رہ گیا — مولانا کی بلند اور پرشکوہ آواز ہوا کی تندی اور مجمع کی غیر معمولی وسعت کے باوجود ہر گوشہ میں پہنچنے لگی۔ اور تقریر کے اثر کا عالم یہ ہوا کہ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک آنکھ بھی ایسی نہ تھی جو رو نہ رہی ہو۔ یہ مجمع بالکل دیہاتیوں کا تھا، اس میں پڑھے لکھے لوگ بہت تھوڑے سے تھے، ان دیہاتیوں کے لیے مولانا محمد علی رح جیسے شخص کی کسی تقریر کو سمجھنا کچھ آسان کام نہیں تھا۔ لیکن ان کی تقریر میں ایمان و یقین کی ایسی گرمی اور سوز و درد کی ایسی گھلاوٹ تھی کہ اس سے متاثر ہونے کے لیے شاید اس کو زیادہ سمجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

اس موقع کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے جو قابل ذکر ہے۔ مولانا رح کی تقریر جب ختم ہو گئی تو ہم نے دیکھا کہ مجمع کے ایک کنارے سے ایک بوڑھا دیہاتی اُٹھا اور وہ مجمع کو چیرتا پھاڑتا سیدھا اسٹیج کی طرف چلا۔ اگرچہ اسٹیج تک پہنچنے میں اس کو سخت مزاحمتوں سے سابقہ پیش آیا لیکن وہ اپنی دھن کا ایسا نکلا کہ اس نے مولانا رح کے پاس پہنچ کر ہی دم لیا۔ اور پہنچتے ہی اُن کی ڈاڑھی پر ہاتھ رکھ کر اپنے مخصوص لہجہ میں بولا کہ:

"محمد علی! جو تو نے کیا وہ کسی سے نہ ہو سکا"

یہ کہہ کر جب وہ واپس مڑا تو مولانا نے فرمایا کہ:

"اس طرح کی داد بھی آپ کے سوا مجھے کسی اور سے نہیں ملی"۔

اس موقع پر مولانا کی عظمت کا ایک اور پہلو میرے سامنے اپنے استاذ مولانا فراہی رح کے تاثرات سے واضح ہوا۔ اس جلسہ میں تقریر کر کے، مولانا محمد علی رح اعظم گڈھ شہر کے لیے روانہ ہو گئے جہاں شب میں اُن کو ایک جلسۂ عام میں تقریر کرنی تھی، وہ گئے تو اُن کے ساتھ مدرسۃ الاصلاح کا سارا جلسہ بھی چلا گیا، یہاں تک کہ خود مولانا فراہی بھی جو مدرسہ کے ناظم تھے ان کی تقریر میں شرکت کے لیے اُن کے ساتھ چلے گئے۔ اُنھوں نے چلتے وقت ہمیں یہ ہدایت کی کہ کچھ کٹے ہوئے کاغذ اور چند اچھی پنسلیں اُن کے سامان میں رکھ دی جائیں تاکہ وہ اعظم گڈھ میں ہونے والی مولانا محمد علی رح کی تقریر نوٹ کر سکیں۔ یہ معاملہ میرے لیے نہایت حیرت انگیز تھا، میں اس بات سے تو واقف تھا کہ مولانا فراہی رح، مولانا محمد علی رح اور مولانا آزاد سے محبت کرتے ہیں لیکن ان میں سے کسی کی تقریر سے مولانا کا اس درجہ متاثر ہونا کہ وہ خود اس کے نوٹ کرنے کا اہتمام کریں میرے تصور سے مافوق تھا۔ مولانا نہ تو جذباتی آدمی تھے، نہ کوئی سیاسی آدمی۔ وہ ایک محقق ایک فلسفی اور ایک حکیم تھے، وہ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا وعظ و تقریر کے جلسوں میں، خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیاسی، کبھی مشکل ہی سے شریک ہوتے تھے لیکن مولانا محمد علی رح کی تقریر میں شریک ہونے کے لیے نہ صرف یہ کہ سفر کے لیے آمادہ ہو گئے بلکہ ان کی تقریر کے نوٹ لینے کے لیے یہ اہتمام فرمایا۔ مولانا کے اس اہتمام نے میرے دل میں مولانا محمد علی رح کی عظمت بہت بڑھا دی۔ میں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی ایک عظیم سیاسی لیڈر ہی نہیں بلکہ وہ علمی و عقلی اعتبار سے بھی ایسے بلند پایہ آدمی ہیں کہ مولانا فراہی جیسے لوگ بھی ان کی تقریروں کو یہ درجہ دیتے ہیں کہ ان کے نوٹ لیتے ہیں۔

اس واقعہ کے دوسرے ہی دن مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ مولانا محمد علی رح کی تقریر میں وہ کیا چیز تھی جس سے استاذ مرحوم اس درجہ متاثر ہوئے۔ دوسری صبح کو جب مولانا فراہی رح مدرسہ پر واپس آئے تو منتظمین میں سے بعض نے ان سے دبی زبان سے یہ شکایت کی کہ مولانا محمد علی کے ساتھ اُن کے چلے جانے کے سبب سے خود مدرسہ کا جلسہ درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ مولانا نے اس کا جواب یہ دیا کہ:

"جو کام کی باتیں تھیں، وہ محمد علی نے اپنی تقریر میں کہہ دی تھیں، اس کے بعد کسی اور تقریر کی اب کیا ضرورت باقی رہی تھی"۔

مولانا نے یہ بات اس اعتماد اور یقین کے ساتھ فرمائی کہ ہر شخص پر یہ بات واضح ہو گئی کہ مولانا کو مدرسہ کے جلسہ کے درہم برہم ہو جانے کا ذرہ برابر بھی افسوس نہیں ہے، ان کے نزدیک سننے کی باتیں وہی تھیں جو مولانا محمد علی نے کہہ دی تھیں اور لوگوں نے وہ سُن لی تھیں، اِس کے بعد جلسہ کا جاری رہنا ان کے نزدیک گویا اضاعتِ وقت کے حکم میں تھا۔ مولانا نے اس کے بعد متعدد بار مولانا محمد علی کی تقریر پر اپنی پسندیدگی کا اظہار فرماتے ہوئے یہ بھی کہا کہ:

"محمد علی کی تقریر میں ایمان ہوتا ہے"۔

ایک مرتبہ بطور لطیفہ کے یہ بھی فرمایا کہ:

"چونکہ محمد علی بہت ذہین آدمی ہیں اسی وجہ سے لوگوں کو قرآن کے نظم کی طرح ان کی تقریروں اور تحریروں کے نظم کو سمجھنے میں بھی بسا اوقات زحمت پیش آتی ہے۔"

پھر فرمایا کہ:

"کچھ اسی قسم کا حال مولانا محمد قاسمؒ کی تقریروں اور تحریروں کا بھی ہے۔"

اگرچہ بڑوں کے اس ذکر کے درمیان اپنا بیان کچھ مناسب نہیں لیکن جن کا کل سرمایۂ زندگی صرف وہ چند چھوٹی بڑی نسبتیں ہی ہوں جو بڑوں سے ان کو حاصل ہوئیں وہ اگر ان کو بیان نہ کریں تو آخر اپنے طرۂ افتخار کی آرائش کے لیے سامان کہاں سے لائیں گے۔ اسی وجہ سے مجھے یہ واقعہ ذکر کرنے کی اجازت دیجیے کہ یہی جلسہ جس کا اوپر ذکر ہوا، اول اول مجھے پبلک میں روشناسی کرانے کا ذریعہ بنا۔ وہ اس طرح کہ مجھے مدرسہ کی تعلیم و تربیت کا نمونہ دکھانے کے لیے مدرسہ کے ذمہ داروں کی طرف سے اسی جلسہ میں ایک تقریر کرنے کی ہدایت کی گئی۔ چنانچہ میں نے اس میں ایک تقریر کی۔ یہ تقریر میری اپنی ہی تیار کردہ تھی اور اگرچہ کسی پبلک جلسہ میں یہ میری بالکل پہلی تقریر تھی لیکن میری عمر اور علم کے اعتبار سے نہایت کامیاب رہی۔ مولانا محمد علیؒ اور اسٹیج پر بیٹھے ہوئے دوسرے اکابر نے اس کی بڑی تحسین فرمائی۔ یہاں تک کہ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے بصلۂ حسن تقریر اپنے تفسیری رسائل کا ایک سیٹ اپنے دستخط سے مزین فرماکر مجھے بطور انعام عنایت فرمایا۔ اس کے بعد مجھے دور دور سے جلسوں کی شرکت کے لیے دعوت نامے ملنے لگے۔ اور میں کبھی کبھی جلسوں میں شریک بھی ہونے لگا۔ لیکن میں نے یہ لَے زیادہ بڑھنے نہیں دی، اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے استاذ مولانا فراہی رح زیادہ تقریریں کرنے کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ تو انھوں نے مجھ سے یہاں تک فرمایا کہ زیادہ تقریریں کرنے سے آدمی کا دل سیاہ ہو جایا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس چیز کو وہ اس درجہ ناپسند فرماتے ہوں اس کی طرف زیادہ راغب ہونا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

جناب سید ہاشمی فریدآبادی

چند ہفتے محمد علیؒ کے ساتھ

غالباً ۱۹۱۱ کا واقعہ ہے، الہ آباد کے ایک وقیع اور بلند پایہ انگریزی روزنامے "پانیر" میں کسی انگریز کا ایک مکتوب شائع ہوا، جو ایک سیاح کی حیثیت سے دہلی گیا تھا، مزار غالب کی کس مپرسی دیکھ کر متاثر ہوا اور اپنے مکتوب میں اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ اردو کے سب سے بڑے اور ہندوستان کے بہت بڑے شاعر کا مزار، تصویر عبرت بنا ہوا ہے، گویا

بر مزار ما غریباں نے چراغ و نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

محمد علی یہ مکتوب پڑھ کر بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے کامریڈ میں مزار غالب کی تجدید تعمیر سے متعلق ایک زبردست مقالہ لکھا، انھیں خود بھی غالب سے والہانہ تعلق خاطر تھا، اپنی جیب سے بھی چندہ دیا، اور قارئین کامریڈ سے بھی اور قدر دانان غالب سے بھی اپیل کی کہ اس چندے میں دل کھول کر حصہ لیں، تاکہ غالب کے شایان شان مقبرہ تعمیر ہو سکے، محمد علی کی اس اپیل کا دوسرے اخبارات میں بھی چرچا ہوا، شدہ شدہ یہ بات معظم زمانی بیگم (عرف بگا بیگم صاحبہ) کے کانوں تک بھی پہنچی۔

وہ رشتے میں میری نانی ہوتی تھیں، نواب ضیاء الدین خاں نیّر کی دختر تھیں، مرزا عبدالقادر بیگ سے ان کی شادی ہوئی تھی، اور یہ مرزا عبدالقادر بیگ، جواں مرگ عارف کے بیٹے تھے جن کا مرثیہ غالب نے اشک دل میں قلم ڈبو کر لکھا ہے۔

ہاں اے فلک پیر، جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

مزار غالب کی خستگی اور کس مپرسی کا چرچا سن کر معظم زمانی بیگم بہت ناخوش ہوئیں۔ قبر کے لیے چندے کی تحریک میں انہیں خاندان کی بڑی سبکی نظر آ رہی تھی، میں علی گڑھ میں زیر تعلیم تھا، چھٹی میں فرید آباد آیا تو والدہ صاحبہ نے فرمایا، :

"پھپھی بگا بیگم صاحبہ کئی مرتبہ تمہیں پچھوا چکی ہیں، ان سے جا کر مل لو،!"

میں نے تعمیل حکم کی اور مرحومہ کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ بھری بیٹھی تھیں مجھے دیکھتے ہی برس پڑیں، کہنے لگیں،

"کیوں جی یہ محمد علی کون ہے جو مزار غالب بنا رہا ہے، کیا اس نے غالب کو لاوارث سمجھا ہے؟ ہماری زندگی میں کوئی اور یہ کام کیسے کر سکتا ہے؟ تم ابھی جاؤ اور مزار غالب کی حالت دیکھ کر آؤ۔!"

میں نے انہیں اطمینان دلایا کہ چلا جاؤں گا مگر وہ بضد رہیں کہ ابھی جاؤ، انھوں نے اپنے داروغہ کو حکم دیا کہ گاڑی لاؤ۔ چنانچہ مجھے فوراً جانا پڑا، غالب کی قبر ٹھیک حالت میں تھی، البتہ مقبرے کی صورت نہ تھی، نہ قبہ، نہ چھتری، یہی بات آ کر میں نے معظم زمانی بیگم صاحبہ سے کہہ دی، اور پھر ان کے حسب ایما محمد علی کو اس سلسلے میں ایک مراسلہ بھیج دیا کہ غالب کے ورثا

کو ان کی تحریک چندہ سے ناگواری ہوئی۔

محمد علی نے نوٹ لکھا کہ ایک شخص سید ہاشمی نے ہمیں ایسا مراسلہ لکھا ہے، لیکن ہم انہیں بتانا چاہتے ہیں کہ غالب کے وارث وہی نہیں ہم سب ہیں، پھر کچھ عرصہ بعد اُن کا علی گڑھ آنا ہوا، خاص طور پر مجھے بلوایا، اور اصرار کیا کہ معظم زمانی بیگم صاحبہ کو سمجھاؤں اور اُن تک یہ پیام پہنچا دوں۔

کچھ عرصہ کے بعد محمد علی نے اردو میں 'ہمدرد' نکالنے کا فیصلہ کیا، اس کے لیے اسٹاف کی جستجو ہوئی کسی صاحب نے میرا نام بھی تجویز کر دیا، میر محفوظ علی کے ذریعہ محمد علی نے مجھے بلوایا، طے یہ ہوا کہ ہمدرد کی ادارت کے لیے مولوی عبدالحق کو بلایا جائے، مجھے یہ کام سونپا گیا کہ حیدرآباد جاؤں، اور مولوی صاحب کو لے آؤں،

میں حیدرآباد پہنچا، مسٹر (بعد میں سر) اکبر حیدری ہوم سیکرٹری تھے اور انہی کے دفتر میں مولوی صاحب ان دنوں مترجم کے منصب پر مامور تھے، یہ وہ زمانہ تھا کہ اکبر حیدری مولوی صاحب سے کچھ بدظن سے ہو گئے تھے، بات یہ ہوئی کہ حیدرآباد میں طاعون پھیلا کسی دل جلے نے اکبر حیدری پہ چوٹ کی کہ بمبئی سے ایک طاعونی چوہا حیدرآباد کی محاسبی میں آگیا تھا۔ حیدری صاحب صدر محاسب کے ہوم سیکرٹری ہو گئے۔ نہ جانے کیوں حیدری صاحب کو یقین ہو گیا کہ یہ حرکت مولوی عبدالحق صاحب کی ہے، حیدری صاحب نے تحقیق احوال، اور مولوی صاحب نے بیان صفائی کی ضرورت محسوس نہیں کی لیکن اندر ہی اندر دونوں کے تعلقات میں تلخی پیدا ہوتی گئی، میں نے ہمدرد کی طرف سے پیش کش جو کی تو مولوی صاحب خفیف سے تامل کے بعد راضی ہو گئے، اور یہ تامل اس لیے تھا کہ مولوی صاحب مولانا محمد علی کے مزاج سے ذرا خائف تھے، ڈرتے تھے کہیں ایسا نہ ہو کہ نباہ نہ ہو سکے اور حیدرآباد کی ملازمت بھی ہاتھ سے جائے، کافی غور و فکر اور صلاح مشورے کے بعد طے یہ پایا کہ سردست مولوی صاحب ایک سال چھٹی لے لیں، چنانچہ حصولِ رخصت کی درخواست انھوں نے دیدی،

حیدری صاحب اور مولوی صاحب میں اَن بن ضرور تھی لیکن وہ مولوی صاحب کی صلاحیتوں سے واقف تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ مولوی صاحب حیدرآباد چھوڑ دیں، انھوں نے سراج الحسن صاحب (بعد میں سراج یار جنگ) سے ذکر کیا، یہ سراج الحسن صاحب نواب محسن الملک کے بھانجے تھے، لندن کے تعلیم یافتہ تھے، اور لارڈ نارتھ کلف کے ہم جماعت رہ چکے تھے، چنانچہ حیدری صاحب کے سامنے سراج الحسن صاحب نے پوچھا آخر حیدرآباد چھوڑ کر دلی کیوں جا رہے ہو؟ جواب میں مولوی صاحب نے کہا:

بہ شہر خود روم و شہر یار خود باشم

آخر نواب عماد الملک بلگرامی سے استدعا کی کہ وہ مولوی صاحب کو روک لیں، نواب عماد الملک اس زمانے میں مشیر المہام کے منصب پر فائز تھے۔ اور میر عثمان علی خاں نظام دکن بیک وقت فرماں روا بھی تھے اور وزیر اعظم بھی۔

عماد الملک کے سامنے مولوی صاحب نے ہتھیار ڈال دیے، اور طے یہ پایا کہ سراج الحسن صاحب انہیں محکمۂ تعلیمات میں لے لیں، چنانچہ وہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر تعلیمات کے منصب پر فائز ہو گئے اور میں یہ خبر لے محمد علی کے پاس کلکتے حاضر ہوا۔ اور دو ڈھائی مہینے اُن کے پاس میرا قیام رہا۔

کسی شخص کے اخلاق و کردار، سیرت و شخصیت، اور صفات و خصائص کے سمجھنے کے لیے یہ مدت بہت کم ہے، لیکن محمد علی کو اس سے بھی کم مدت میں سمجھا جا سکتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو چھپا سکنے کی صلاحیت سے یکسر محروم تھے، وہ ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح پڑھے جا سکتے تھے، ان کا مطالعہ بڑی آسانی سے ہر وقت کیا جا سکتا تھا، اس میں نہ کوئی پیچیدگی تھی نہ اغلاق، ان کی دوستی اور دشمنی، خفگی اور خوشی، تکدر اور انبساط، اختلاف اور اتفاق ہر چیز اتنی ہی واضح اور نمایاں ہوتی جتنے وہ خود،

محمد علی نے مجھے سر سلطان احمد کے مکان پر ٹھہرایا تھا، جن کا شمار کلکتہ ہائی کورٹ کے سربرآوردہ اور ممتاز بیرسٹروں میں ہوتا تھا، لیکن وقت کا بڑا حصہ دفتر کامریڈ ہی میں صرف ہوتا تھا، آخر ان کے پاس آیا تھا، اور ان ہی کا بلایا ہوا آیا تھا،

محمد علی بے حد جذباتی آدمی تھے، ایک مرتبہ وہ پہلی منزل پر بیٹھے ہم لوگوں سے باتیں کر رہے تھے، اتنے میں دوسری منزل سے جہاں ان کے اہل خانہ رہتے تھے، کچھ ہنگامے کی آواز آئی، اور پھر ایک دردناک چیخ، معلوم ہوا، محمد علی کی دو بچیوں میں کسی بات پر لڑائی ہوئی، ایک لڑکی نے پوری قوت کے ساتھ دوسری پر سروتا کھینچ مارا جو اگر نشانہ پر پڑتا تو حد درجہ خطرناک ثابت ہوتا، یہ سنتے محمد علی اپنے بھاری بھرکم تن و توش کے باوجود بڑی تیزی اور پھرتی سے اوپر چڑھے مظلوم کی حمایت میں ظالم کو دو تین طمانچے مارے اور ہانپتے ہوئے واپس آ گئے۔

محمد علی کی برہمی، آشفتہ مزاجی اور تلخ نوائی کا ایک اور منظر میں نے کلکتہ میں دیکھا، یہ دلچسپ بھی تھا، اور میرے لیے سبق آموز بھی۔

متحدہ بنگال اسمبلی کے اسپیکر عبد الحکیم صاحب کے بھائی، عبد الرحیم صاحب کامریڈ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے، دبلے پتلے، کمزور سے آدمی تھے، چلتے تھے تو شاخ گل کی طرح لچکتے ہوئے، ان کے بارے میں محمد علی کو اطلاع ملی کہ ایک برہمو سماج لڑکی کو دل دے بیٹھے ہیں، اور ایسے عشق صادق میں مبتلا ہیں کہ ممکن ہے خود برہمو سماج میں داخل ہو جائیں۔

یہ خبر سن کر محمد علی نے یہ نہیں سوچا کہ

عشق ازیں بسیار کرد است و کند
سبحہ را زنار کرد است و کند

آگ بگولہ ہو گئے، فوراً عبد الرحیم صاحب کی طلبی ہوئی، اور جرم عشق پر جواب طلب ہوا۔ وہ بے چارے کیا کہتے؟ محمد علی کے سامنے، اور وہ بھی اس وقت جب وہ بھرے بیٹھے ہوں کچھ کہنا آسان بھی تو نہیں تھا، وہ خاموش تھے، اور محمد علی گرج رہے تھے، برس رہے تھے، سخت سے سخت لہجے میں درشت اور نا ملائم الفاظ کا ایک سیل رواں تھا جس میں عبد الرحیم صاحب تنکے کی طرح بہے چلے جا رہے تھے۔ محمد علی اسے برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے کہ "عشق" کی خاطر مذہب بدل جائے، اور یہ مذہب بدلنے والا اگر مسلمان اور کامریڈ کے عملۂ ادارت کا ایک رکن ہو تو محمد علی کے قہر و جلال کو نقطۂ عروج پر پہنچنا ہی چاہیے تھا۔ چنانچہ وہ پہنچا اور بے چارے عبد الرحیم صاحب پھر کامریڈ کے دفتر میں نظر نہیں آئے۔

عبدالرحیم صاحب کی یہ درگت بنتے دیکھ کر میں سہم گیا، اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میرے اور محمد علی کے مزاج میں اتحاد نہیں ہو سکتا، اس طرح کا سلوک کسی دن میرے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اور یہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گا۔

میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے شاید محمد علی کو کچھ اندازہ ہو گیا، انہوں نے پوچھا،

"کیا بات ہے؟"

میں نے جواب دیا،

"آپ نے عبدالرحیم صاحب کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا، آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا،!"

محمد علی اُٹھے اور لپٹ گئے، بڑی معصومیت کے ساتھ کہنے لگے،

"تجھے تو کچھ نہیں کہا،!"

کہاں وہ برہمی کہ معلوم ہوتا مدمقابل پر بجلی بن کر گر پڑیں گے، کہاں یہ تواضع اور فروتنی کہ معلوم ہوتا تھا مدمقابل کو دل میں رکھ لیں گے، وہ برہمی بھی حد سے بڑھے ہوئے اخلاص کا نتیجہ تھی، اور یہ تواضع اور فروتنی بھی محبت اور شفقت کی ایک دنیا اپنے اندر لیے ہوئے تھی، زمانہ سازی، ملمع کاری، اور ریا کا شائبہ نہ برہمی کی آتش نوائی میں تھا، نہ فروتنی کی گل افشانیٔ گفتار میں، وہ جو کچھ بھی تھے سامنے موجود تھے، جس کا جی چاہے نفرت کرے، جس کا جی چاہے محبت کرنے لگے،

اب وہ کلکتہ چھوڑ رہے تھے، اور حکومتِ ہند کی نئی راجدھانی دلی کو اپنا مرکزِ عمل قرار دینے کا فیصلہ کر چکے تھے، آخر وہ دن آگیا کہ سیکنڈ کلاس کا ایک پورا کمپارٹمنٹ دلی کے لیے مخصوص کرایا گیا، محمد علی کے ساتھی راجہ غلام حسین، مجتبیٰ صاحب، اور مجھ جیسا نو آموز اسی میں تھا، جتنے لوگ جانے والے تھے سب آ گئے، الوداع کہنے کے لیے بھی، دوستوں، مداحوں اور عقیدتمندوں کا ایک جمِ غفیر موجود تھا، لیکن بارات کے دولہا یعنی محمد علی غائب تھے، یہاں تک کہ ٹرین کے روانہ ہونے میں صرف ایک منٹ کی دیر رہ گئی، اتنے میں محمد علی افتاں خیزاں اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف رواں دواں نظر آئے، اسی عالمِ خرام میں کسی سے بغل گیر ہوئے، کسی سے ہاتھ ملایا، کسی سے ایک آدھ بات کہی، کسی کی ایک آدھ بات سنی، اور عین اس وقت جب گاڑی نے رینگنا شروع کیا، وہ کمپارٹمنٹ میں داخل ہو گئے،

ٹرین چل پڑی وہ اطمینان سے اپنی نشست پر بیٹھ گئے، میں نے عرض کیا،

اتنی دیر کہاں لگا دی آپ نے؟

فرمایا، مرکزی حکومت کی انٹیلی جینس کے افسرِ اعلیٰ سر چارلس کلولینڈ سے اُن کے حسبِ ایما ملنے گیا تھا،!"

یہ سر چارلس کلولینڈ محمد علی کے ذاتی دوست بھی تھے، اور دونوں میں اچھے خاصے روابط تھے، سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا،:

"سر چارلس کلولینڈ نے مجھ سے بہت سی باتیں کیں، اور ایک نصیحت بھی کی،!"

میں سراپا گوش ہو گیا کہ وہ نصیحت کیا ہے؟ اتنے میں محمد علی نے فرمایا،

"انہوں نے مجھ سے کہا اب تک تم کامریڈ میں جو کچھ لکھتے تھے وہ ہم انگیز کر لیتے تھے، کیونکہ حکومت کو کسی طرح کا خطرہ

بھی نہیں تھا، لیکن اب تم اُردو میں ہمدرد نکال رہے ہو، اس بات کو فراموش نہ کرنا کہ کامریڈ کے پڑھنے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، فہم و فکر کے جوہر سے مالا مال ہیں، تحسین و نفرین میں کسی حالت میں بھی اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے، ـــــ سوا مخصوص صورتوں کے ـــــ لیکن ہمدرد کی اُردو داں پبلک جواب نہیں ملے گی، وہ اپنے مزاج اور افتادِ طبیعت کے اعتبار سے بالکل مختلف ہوگی، یہ اشتعال جلد قبول کرے گی، جذبات کی رَو میں بہے گی، سوچے گی کم کرے گی زیادہ، اعتدال کے بجائے تشدد کی طرف مائل ہوگی لہٰذا ذرا پھونک پھونک کے قدم رکھنا، !"

پھر مجھے مخاطب ہو کر کہنے لگے،

"انگریز دشمنی میں حدود کا خیال نہیں کرتے، ذرا احتیاط سے کام لینا، !"

میں یہ جواب سُن کر جل گیا، میں نے عرض کیا۔

"انگریز دشمنی ! ـــــ کیا صرف میں انگریز دشمن ہوں آپ نہیں ؟"

بڑے سنجیدہ لہجے میں محمد علی نے جواب دیا،

"میرے دل میں انگریز کی دشمنی نہیں تحقیر ہے، !"

میں کالج کا ایک نوجوان طالب علم، انگریز سے متنفر، انگریزی سامراج کا مخالف، انگریزوں کا دشمن، اُس وقت جوش کے عالم میں، محمد علی کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ بیس سال کے بعد یہ حقیقت ذہن نشین ہوئی کہ محمد علی کتنی اونچی اور سچی بات کہی تھی ؟ واقعی وہ اتنے اونچے آدمی تھے کہ اُن کے دل میں نہ صرف انگریزوں کی بلکہ کسی سامراجی ملک کے خلاف نفرت نہیں تھی، تحقیر تھی، !

بہرحال ہم دہلی پہنچے، ہمدرد کی ادارت کے لیے مولوی عبدالحق سے مایوسی کے بعد اُن کی نظر میر محفوظ علی پر گئی۔ وہ عرصہ سے وطن سے کنارہ کر رہے تھے، کبھی کبھی چند روز کے لیے آ جاتے تھے پھر چلے جاتے تھے مگر اس دفعہ ایسے گئے نہ آتے ہیں نہ خط لکھتے ہیں، محمد علی نے مجھے حکم دیا،

"جاؤ محفوظ علی کو پکڑ لاؤ، بھاگ گیا ہے، !"

میں بدایوں پہنچا، ادھر محمد علی کے تاروں کا تار بندھا ہوا تھا، ہر تار میں ملاجیاں سُناتے تھے۔ اور تاکید کرتے تھے کہ فوراً آؤ۔ میر صاحب نے میری پذیرائی گرم جوشی سے کی، کئی پُر تکلف دعوتیں کیں، پھر آبائی زمین کے سلسلہ میں مقدمات کا ذکر فرمایا۔ اور کہا ان سے فارغ ہوتے ہی دہلی کا رُخ کروں گا۔ میں نے آکر محمد علی کو صورتِ احوال سے مطلع کر دیا۔ میں نے مولانا عبدالحلیم شرر کا نام پیش کیا، یہ نام سُن کر پھڑک اُٹھے فرمایا لکھنؤ جاؤ اور شرر کو لے آؤ، !

مولانا شرر سے میرے ذاتی روابط تو نہیں تھے لیکن وہ میرے والد کے دوست تھے اور مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔

مولانا نے جب سے اپنا مشہور ناول "دربارِ حرام پور" لکھا تھا، وہ نہ صرف نواب صاحب رام پور سے بلکہ رام پور کے ہر باشندے سے کھٹکنے لگے تھے، اپنے کاروبار کا بھی خیال تھا، لیکن بالآخر وہ لکھنؤ سے دہلی آ گئے، تعطیلات کا زمانہ ختم ہو چکا تھا خود میں علی گڑھ چلا آیا۔

بلقان یا طرابلس کی جنگ کے زمانہ میں، ہم نے فرنگی مال کی حرمت کا فتویٰ بعض علماء سے لیا، اور مولانا حسرت موہانی نے پریس میں چھپوایا، یہ علی گڑھ کی مشہور آفاق نمائش کا زمانہ تھا، اور نمائش میں جو دکانیں انگریزی مال کی تھیں اُن پر اپنے ساتھیوں اور ہم مشربوں کے ساتھ ہم نے پکٹنگ کیا، جہاں تک علم ہے بدیشی مال کے خلاف یہ پہلی پکٹنگ تھی، جس کا آغاز علی گڑھ نے کیا تھا۔ اس واقعہ نے اتنی اہمیت حاصل کی کہ صوبہ کا لیفٹیننٹ گورنر سر جیمس مسٹن اپنا پروگرام بدل کر علی گڑھ آیا اور اس کے دور رس اثرات رونما نہ ہوسکیں، اس جدوجہد میں مصروف ہوگیا،

محمد علی نے اسی زمانے میں یہ تحریک ہمدرد کے ذریعہ شروع کر رکھی تھی کہ مسلمان ہمدرد کے جاری کیے ہوئے بانڈز خریدیں، اور جو روپیہ اس طرح جمع ہو وہ ترکوں کو بھیجا جائے، تاکہ وہ سازوسامان جنگ خرید سکیں، اور اپنی فوجی تیاریاں زیادہ محکم طور پر شروع کرسکیں، اُنہوں نے ایک مقالہ افتتاحیہ "بانڈز یا بائیکاٹ" کے عنوان سے لکھا اور اس بات پر زور دیا کہ یہ زمانہ تخریبی سرگرمیوں کا نہیں تعمیری جوش کردار کا طالب ہے، فرنگیوں کو مالی نقصان پہنچاکر، اور اُن کے مال کا بائیکاٹ کرکے ہم ترکوں کی کوئی مدد نہیں کرسکتے، لیکن اگر حسب ضرورت روپیہ ترکوں کی جیب میں ڈال دیں تو وہ اپنے فرنگی حریفوں سے گلہ بہ گلہ جنگ کرسکتے ہیں،

اس مضمون کے خلاف میں نے ایک سخت مضمون لکھ کر زمیندار میں بھیج دیا، جو فوراً شائع ہوگیا، احتیاط یہ کی تھی کہ مقالہ نگار کی حیثیت سے اپنے بھائی سید مطلبی کا نام ڈال دیا تھا، لیکن یہ احتیاط کچھ کام نہ آئی، محمد علی سمجھ گئے کہ مضمون نگار کون ہے۔ چند روز بعد کسی کام سے میرا دہلی جانا ہوا، دریاگنج سے گزر رہا تھا کہ سامنے سے ایک فٹن گزری، نظر اٹھا کر دیکھا تو محمد علی جارہے تھے، مجھے دیکھتے ہی اُنھوں نے فٹن روکی اور فرمایا،

مطلبی ضرور مضمون لکھیں، مگر ہاشمی ملنا نہ چھوڑیں،!"

میں بہت شرمندہ ہوا اور عرض کیا۔

"اب تو جو ہونا تھا ہوگیا، اس جرم کی سزا دے لیجیے، جرمانہ کردیجیے، !"

کہنے لگے ہاں جرمانہ تمھیں دینا پڑے گا، !"

پھر اُنھوں نے ایک رسالہ "نوجوان ترک" مرحمت فرمایا، یہ فرنچ زبان میں پیرس سے نکلتا تھا، میں تھوڑی بہت فرنچ جانتا تھا، حکم ہوا،

"جرمانہ یہ ہے، اس کا ترجمہ پابندی سے کرکے ہمدرد میں بھیجتے رہا کرو،!"

میں نے یہ جرمانہ خوشی سے قبول کرلیا۔

اس زمانے میں "قہر عالمگیر" پر میں نے ایک جذباتی نظم لکھی، محمد علی کو وہ اتنی پسند آئی کہ بڑے اہتمام سے نمایاں طور پر اُسے ہمدرد میں شائع کیا، ترکوں کی مدد کے لیے ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں محمد علی نے جو میڈیکل مشن بھیجا تھا اس موقعہ پر بھی میں نے ایک نظم لکھی تھی، جس کا یہ مصرعہ بہت مشہور ہوا۔

لطف مرنے کا اگر چاہے تو چل بلقان چل'!

یہ بھی ہمدرد میں چھپی اور بہت مقبول ہوئی، میں نے محمد علی پر بھی ایک نظم لکھی تھی جب وہ چھندواڑے میں نظربند تھے، اس

نظم کے کچھ شعر اُڑ کر محمد علی تک بھی پہنچ گئے، مولانا عبدالماجد دریا بادی کو اُنھوں نے خط لکھ کر فرمائش کی کہ پوری نظم انہیں بھیج دی جائے،

مقدمہ کراچی کی سزا یابی کے بعد جب وہ جیل سے رہا ہوئے تو کانگریس کے صدر منتخب ہو چکے تھے جس کا سالانہ اجلاس کوکناڈا میں منعقد ہو رہا تھا، اُنھوں نے ایک بہت ضخیم، طویل، اور معرکہ آرا خطبۂ صدارت انگریزی میں لکھا تھا، انہی دنوں جو میں دلی میں ملا تو مجھے دیکھتے ہی ارشاد فرمایا،

"میں نے طے کر لیا تھا اس کا ترجمہ ہاشمی کرے گا، ۴۸ گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں اس عرصہ میں مکمل ہو جائے،!"

میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر قلم و دوات ہاتھ میں لے کر بیٹھ گیا، اور ۴۸ گھنٹے سے کم مدت میں سارا ترجمہ ختم کر ڈالا، ترجمہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے، گلے سے لگالیا، اور فوراً اس کی طبع و اشاعت کے کام میں مصروف ہو گئے،

زندہ دلی اور شوخی محمد علی کی فطرت میں رچی ہوئی تھی، ابھی چند روز ہوئے لندن سے میرے ایک دوست کا خط آیا ہے، انھوں نے محمد علی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شملہ کی ایک دعوت میں محمد علی بھی مدعو تھے، حاضرین تمام اُونچے اور برسرکار طبقے سے تعلق رکھتے تھے، محمد علی بھی اپنے فقیرانہ لباس میں ایک ملائے مسجد کی طرح رونق افروز تھے، اور اُردو میں باتیں کر رہے تھے، کسی بات میں اُنھوں نے اچھی انگریزی شروع کر دی، اب کون اُن کے سامنے ٹکتا تھا؟ میز پر کوئی ہندو رانی بیٹھی تھیں، اُن سے نہ رہا گیا، پوچھ بیٹھیں،

"آپ نے اتنی اچھی انگریزی کہاں سے سیکھی؟"

محمد علی نے جواب دیا،

"میں نے انگریزی کی تحصیل ایک معمولی سے قصبے میں کی ہے،!"

خاتون نے جوش اشتیاق سے بیتاب ہو کر پوچھا،

"کیا نام ہے اس قصبے کا؟"

محمد علی نے نہایت سادگی سے جواب دیا،

"آکسفرڈ!"

ساری محفل کشت زار زعفران بن گئی، -

خدا بخشے ....

(شاہ محمد جعفر ندوی کے قلم سے)

کسی شاعر کا یہ مصرعہ ہے کہ "غمِ حسینؓ نہیں ہے غمِ حسنؓ سے جدا"۔ مولانا محمد علی جوہر کا جب ذکر آئے گا تو مولانا شوکت علی کو نظر انداز کر دینا بڑا دشوار ہوگا۔ میں ان دونوں کی پوری زندگی کی واقفیت نہیں رکھتا اس لیے پوری سوانح عمری نہیں لکھوں گا۔ صرف چند ملاقاتوں ہی کا ذکر کروں گا۔ ان میں میرے ذاتی تاثرات کا جہاں بھی ذکر ہوگا وہاں یکطرفہ گفتگو نہیں ہوگی۔ تلخی کا بھی ذکر ہوگا اور شیرینی کا بھی۔ ایک بات کی آپ سے معافی بھی چاہتا ہوں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی مصنف کسی اہم شخصیت کا ذکر کرتا ہے تو اس میں وہ مصنف خود زیادہ ہوتا ہے اور وہ بیچاری شخصیت کم ہوتی ہے۔ ممکن ہے آپ کو میری تحریر میں بھی یہ عیب نظر آئے۔ لیکن میں جہاں بھی اپنا ذکر کروں گا اس سے اپنی ذات کی کوئی نمائش مقصود نہیں ہوگی بلکہ وہ ناگزیر ہوگی اور زائد از ضرورت نہ ہوگی۔

مولانا شوکت علی میرے گھر پر

۱۹۱۸ء کا ذکر ہے کہ بنگلور سے میرے بڑے بھائی مولانا شاہ حسین میاںؒ کا خط آیا کہ: "حضرت مولانا شوکت علی فلاں تاریخ کو پھلواری شریف آ رہے ہیں اور وہ سیدھے تمہارے پاس آئیں گے۔ میں اور حضرت قبلہ (والد ماجدؒ) بنگلور میں ہیں اور اس وقت تک گھر نہیں پہنچ سکیں گے۔ حسنین سلمہ پٹنہ سٹی میں اپنی پڑھائی میں لگے ہوئے ہیں۔ اس وقت گھر پر تنہا تم ہی ہو۔ دیکھو ان کے استقبال اور خاطر داری میں کوئی کمی نہ ہو"۔

میری عمر سولہ سال کی تھی۔ ناتجربہ کار ہونے کے باوجود مجھے کوئی گھبراہٹ نہ ہوئی کیونکہ محلے کے بزرگوں اور بستی کے رضاکاروں نے پورے تعاون کا یقین دلایا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے صرف پچاس روپے صرف ہوئے تھے لیکن ناشتے چائے وغیرہ کا جو اہتمام اس وقت اس مختصر سی رقم میں ہوا تھا وہ آج پانچ سو روپے میں بھی نہیں ہو سکتا۔ تقریباً دس بجے دن کے سینکڑوں آدمیوں کے ہجوم اور فلک شگاف نعروں کے ساتھ مولانا شوکت علی اس گلی میں داخل ہوئے جو خانقاہ سلیمانیہؒ سے ہوتی ہوئی ہمارے دوسرے مکان (جماعت خانے) تک آتی ہے میں نعروں کی آواز سن کر جماعت خانے سے باہر نکل آیا۔ میرے ساتھ بھی عوام اور رضاکاروں کا ایک ہجوم تھا۔ شوقِ دیدار نے مجھے سب سے آگے کر دیا اور میری وجہ سے نہیں بلکہ مولانا کی خاطر ہجوم نے ہٹ کر بیچ میں راستہ بنا دیا اور گلی کے وسط میں میرا ان کا سامنا ہوا۔ ایک بزرگ نے تعارف کرایا اور میں آگے بڑھ کر ان سے بڑے ادب سے جھک کر ملا۔ جھکتے ہی ان کے سیاہ بوٹ پر میری نظر پڑی۔ اتنے لمبے چوڑے آدمی کے بعد پہلی بار میں نے اتنا وسیع و عریض بوٹ دیکھا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اگر آنکھ مچولی کھیلتا ہوا ان کے بوٹ میں چھپ جاؤں تو مجھے آسانی سے نہیں ڈھونڈا جا سکے گا۔ گاندھی جی ان کی جیب میں اور میں صرف ایک بوٹ میں۔

مولانا "ہجوم مومنین" اور نعروں کے ساتھ جماعت خانے میں داخل ہوئے اور بڑے ہال میں بیٹھ گئے۔ کچھ فرماتے رہے لیکن میں نے کچھ نہیں سنا کیونکہ مجھے دستر خوان کی سجاوٹ کے علاوہ اس کی فکر بھی کہ کہیں کچھ گھٹ نہ جائے۔ مجھے صرف "حصہ بقدرِ جثہ" کی فکر نہ تھی بلکہ یہ فکر بھی کہ معلوم نہیں کتنے لوگ اندر گھس آئیں گے۔ ذرا دیر بعد مولانا کو دوسرے ہال میں ناشتے کے لیے بلایا گیا۔ ان کے ساتھ خواندہ اور ناخواندہ سب ہی تشریف لے آئے مگر پھر بھی بہت کچھ بچ گیا۔ مولانا کو میں زیادہ غور سے دیکھ رہا تھا۔ اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انہوں نے کسی "تکلف" سے کام نہیں لیا۔

اس کے بعد پورے ہجوم کے ساتھ نعرے لگاتا اور لگواتا ہوا انہیں بازار کے چوراہے تک لے گیا۔ جہاں سے انہیں رخصت کر کے اطمینان کی سانس لیتا ہوا گھر واپس آگیا۔

دوبارہ میرے گھر میں

۱۹۲۱ء میں یہ دوبارہ تشریف لائے۔ اب کے بہت زیادہ ہجوم تھا کیونکہ گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد اور سوامی شردھانند وغیرہ بھی ساتھ تھے۔ کچھ دیر خانقاہ سلیمانیہ میں بیٹھے رہے اور حضرت قبلہ والد ماجدؒ سے گفتگو کرتے رہے۔ گاندھی جی نے کہا کہ آپ کے بچے انگریزی اسکولوں میں نہیں پڑھ سکتے کیونکہ ہم نے آپ سے مل کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ حضرت قبلہؒ نے فرمایا کہ آپ کے کہنے سے بہت پہلے میں اپنے بچوں کو ہٹا چکا ہوں۔ میرا ایک لڑکا (مولانا شاہ غلام حسنین) بی اے میں پڑھتا تھا اور دوسرا (راقم الحروف) میٹریکولیشن میں۔ دونوں نے اپنے کالج اور اسکول چھوڑ دیئے ہیں۔ نیز اپنے ایک دوسرے مکان (جماعت خانے) میں ایک ہائی سکول کھول رہا ہوں۔ اچھا ہے آپ لوگ آگئے ہیں۔ آج ہی اس کا افتتاح کرائے دیتا ہوں"۔ اتنے میں چائے کا ایک دور چلا مولانا ابوالکلام آزاد کتب خانہ دیکھنے لگے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انہوں نے تبریزی کی شرح حماسہ نکالی اور اسی ہجوم میں کنارے بیٹھ کر دیکھنے لگے۔ ذرا دیر بعد مولانا شوکت علی نے جلدی مچائی اور سب لوگ جماعت خانے کی طرف روانہ ہو گئے۔ حضرت قبلہؒ سب سے آگے ہاتھ میں چابی لئے جا رہے تھے اور مولانا آزاد سب سے پیچھے آ رہے تھے جب مولانا دروازے کے قریب آ گئے تو حضرت قبلہؒ نے انہی کے ہاتھ میں چابی دی اور فرمایا۔ ذالک بذالک (یہ اس کا معاوضہ ہے) مولانا سمجھ گئے اور ہنس پڑے۔ یہ قصہ یوں تھا کہ مولانا آزاد جس زمانے میں رانچی میں نظر بند تھے تو وہاں انہوں نے ایک مدرسہ جاری کیا تھا۔ اور اس کے افتتاح کے لئے حضرت قبلہؒ ہی کو مدعو کیا تھا۔ اس کا قدرت نے آج یوں قرض ادا کیا کہ پھلواری شریف کے نیشنل اسکول کا افتتاح مولانا کے ہاتھ سے کرایا گیا۔ یہاں اس وقت بڑا ہجوم تھا۔ ایک تقریر گاندھی جی نے کی اور ایک تقریر مولانا آزاد نے کی۔ چند سال پیشتر پٹنہ کے ایک جلسے میں گاندھی جی نے حضرت قبلہؒ کے گھٹنے پکڑ کر کہا تھا کہ گائے کی قربانی آپ اپنی قوم سے چھڑوا دیجئے کیونکہ اس سے ہندو مسلم منافرت بہت پیدا ہوتی ہے۔ حضرت قبلہؒ نے فرمایا کہ یہ کام میں کر لوں گا اور ایک کام آپ بھی کیجئے اور وہ یہ ہے کہ اپنی قوم سے بت پرستی چھڑوا دیجئے۔ ہندو مسلم میں بڑی وجہ منافرت یہی ہے"۔ گاندھی جی نے کہا یہ بہت مشکل ہے۔ حضرت قبلہؒ نے فرمایا۔ مشکل تو وہ بھی ہے اس کے باوجود حضرت قبلہ نے ایک ضخیم رسالہ قربانی گاؤ پر لکھا کہ حصول آزادی اور قیام خلافت کے لیے کسی دباؤ کے بغیر اگر اپنی خوشی سے مسلمان گائے کی قربانی چھوڑ دیں تو کوئی شرعی قباحت نہیں۔ بعض لوگوں نے اس کی بڑی مخالفت کی لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ آخر اسے جبراً روک دیا جائے گا۔ اب وہی حضرات حکومت ہند کی خوشامد میں اور خوف سے ترک فرما چکے ہیں۔

جو عجیب بات ہوئی وہ یہ تھی کہ مولانا شوکت علی شاید گرمی کی وجہ سے بھیڑ سے الگ ہو کر جماعت خانے کے صحن میں کھڑے

رہے۔ سارا وقت کھڑے کھڑے گزارا۔ البتہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چلنے کی جلدی مچاتے رہے۔

جمعیۃ العلمائے کانپور اور علی برادران

آپ کو یاد ہوگا کہ ۲۲-۲۳ء کے بعد سے جمعیۃ العلمائے دہلی سے تمام لیڈروں کو اختلاف شدید ہوگیا تھا۔ انہیں رقوم کا حساب کتاب نہ پیش کرنے کے علاوہ یہ شکایت بھی تھی کہ اس کی صدارت اور نظامت کو دو شخصوں کی مناپلی اور ذاتی جاگیر بنا لیا گیا ہے۔ نہ کوئی تبدیلی نہ انتخاب۔ یہ تفصیلات اس وقت میرے پیش نظر نہیں۔ بہرحال ان زعمائے ملت کو جمعیۃ العلمائے دہلی سے شکایات پیدا ہوگئی تھیں اور یہ شکایت روز بروز شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اور مولانا عبدالماجد بدایونی پیش پیش تھے۔ یہ ایک بار حضرت قبلہؒ کے پاس کانپور میں تشریف لائے اور دیر تک جمعیۃ العلمائے دہلی کے خلاف گلے شکوے کرتے رہے۔ ان کا ایک جملہ مجھے اب تک یاد ہے۔ اپنے مخصوص انداز سے ہاتھ، گردن، ابرو اور بدن کو جنبش دیتے ہوئے کہا "واللہ ثم باللہ اسی ہزار نقد بالکل ہضم کر گئے ہیں اور آج تک اس کا کوئی حساب کتاب نہیں پیش کیا"۔

اس سلسلے میں پہلا عظیم الشان جلسہ کانپور ہی میں کچھ دنوں بعد منعقد ہوا تھا جس میں بہت سی باتیں اور تجویزیں پیش ہوئی تھیں اور اس کے کچھ دنوں کے بعد جمعیۃ العلمائے کانپور کی بنیاد پڑی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب شاردا ایکٹ کی ہر جگہ زوردار مخالفت ہو رہی تھی اس جلسے کا افتتاح میری تلاوتِ قرآن سے ہوا تھا۔ عین تلاوت کے دوران پنڈال سے باہر ایک زوردار نعرۂ تکبیر بلند ہوا اور سامنے کے دروازے سے مولانا محمد علی جوہر اپنی خاص شان کے ساتھ داخل ہوئے۔ چند قدم چلے تھے کہ مجھے تلاوت کرتے دیکھا اور جہاں تھے وہیں ادب سے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ اس وقت وہ خشوع و خضوع کے ساتھ اپنی آنکھیں بند کئے ہوئے تھے۔ تلاوت ختم ہونے کے بعد وہ تکبیر کے نعروں کے ساتھ ڈائس پر آکر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد مولانا شوکت علی اپنی خلافتی شان و شوکت کے ساتھ اسی طرح نعرہ ہائے تکبیر کی جلو میں پنڈال میں داخل ہوئے۔ ڈائس کے پاس آکر ان کی نظر مولانا محمد علی اور مولانا فاخر الہ آبادی پر پڑی۔ یہ دونوں انہی کی طرح ذیابیطس کے مریض تھے مولانا شوکت علی نے ڈائس پر چڑھتے ہوئے ایک چٹکلا چھوڑ ہی دیا۔ کہنے لگے۔"آج تو ذیابیطیسیوں کی کانفرنس معلوم ہوتی ہے"۔ اس کا استقبالیہ خطبہ صدارت مولانا حسرت موہانی نے پڑھا تھا اور شاید یہ دنیا کا مختصر ترین اور جامع ترین خطبہ تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ مشکل سے دو تین سو الفاظ کا خطبہ تھا۔

مجھے اگرچہ لکھنا تو ہے علی برادران ہی پر لیکن برادر عزیز مولانا رئیس احمد جعفری کا ارشاد ہے کہ اس سلسلے میں جو جو باتیں ذہن میں آئیں لکھتے چلے جاؤ۔ جو کچھ لکھو گے وہ اس دور سے متعلق ایک تاریخی دستاویز ہوگی۔ انھوں نے یہ جملہ بھی ازراہ ظرافت کہا کہ مولانا مناظر احسن گیلانی کی طرح ساری باتوں کو بٹیتے ہوئے چلو۔ خیر ذکر آگیا ہے مولانا فاخر الہ آبادی اور مولانا حسرت موہانی کا۔ ہائے یہ کیا لوگ تھے۔ مولانا فاخر الہ آبادی کے لیے تو صرف ایک شعر پڑھ دینا کافی ہے۔ ان کے جیل جاتے ہی کسی نے کہا تھا کہ؎

فاخر میاں کو آج سنا جیل ہو گئی ہمت کی اک مشین تھی جو فیل ہو گئی

خوب آدمی تھے۔ غالی صوفی اور نڈر لیڈر تھے۔ اعلیٰ واعظ و خطیب اور ساتھ ہی ادیب بھی تھے۔ ان کے ہاں (دائرۂ شاہ اجمل الہ آباد) میں کئی دن ان کا مہمان رہ چکا ہوں۔ یہ پھلواری بھی آچکے ہیں اور اکثر علمی استفسار حضرت قبلہ والد ماجدؒ سے فرمایا کرتے تھے۔ ایک بار ان کا خط آیا کہ لولاک لما خلقت الافلاک والی روایت کہاں ہے؟ حضرت قبلہ نے اسی وقت فرمایا کہ لکھ دو۔ یہ مستدرک حاکم کی روایت ہے یہ دور بڑا دلچسپ تھا۔ بڑے بڑے اسلامی جلسہ ہائے وعظ میں مولانا شاہ احمد اشرف کچھوچھوی، مولانا شاہ فاخر الہ آبادی، مولانا

قطب الدین بہ بہاری، مولانا خلیل داس سیوانی، مولانا نثار احمد صاحب کانپوری، غازی محمود دھرمپال وغیرہ کے طوفانی دورے، مواعظ اور مناظرے ہوتے تھے۔ آخر الذکر کے سوا یہ سب صوفی العقیدہ اور بخدیت کے مخالف تھے۔ ان سبھوں کے ساتھ بے شمار جگہ میرے بھی مواعظ ہوتے رہے ہیں۔ ایک بار تو مجھے سخت حیرت ہوئی! "اُس کا بازار" ضلع گورکھپور میں عظیم الشان جلسہ تھا۔ یہ سارے علما فضلا اور صوفیہ موجود تھے۔ جمعہ کا دن تھا۔ یہ سب حضرات مسجد کے اندر بیٹھے تھے اور میں باہر صحن کی پچھلی صفوں میں بیٹھا تھا یکایک ایک مولانا رغالباً مولانا قمر الدین درھبنگوی) مجمع کو چیرتے ہوئے میرے پاس آئے اور کہا کہ، آپ سے جمعہ پڑھانے کی درخواست کی جا رہی ہے"۔ میں نے عرض کی کہ آخر میں نے کونسا ایسا جرم کیا ہے جو مجھے یہ سزا دی جا رہی ہے"؟ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور سیدھے منبر پر جاکر بٹھا دیا۔ اس وقت علما کی صف میں سامنے ہی مولانا احمد اشرف کچھوچھوی بیٹھے تھے اور ان کا آبنوسی عصا منبر کے پاس ہی رکھا تھا۔ میں نے بلا اجازت وہ عصا پکڑ لیا اور اذان کے بعد خطبۂ جمعہ شروع کر دیا۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی کتاب دیکھ کر خطبہ نہیں پڑھا اور نہ کسی کا لکھا ہوا خطبہ پڑھا۔ ہمیشہ مختلف موضوعات پر اپنے ہی تصنیف کردہ خطبات جمعہ زبانی دیتا رہا۔ یہ سارے خطبے عربی ہی میں ہوتے تھے اور کبھی برجستہ جمعہ پڑھاتے ہیں مجھے ہچکچاہٹ نہیں ہوئی۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد محسوس ہوا کہ اردو (مادری) زبان میں خطبہ دینا زیادہ مفید ہے۔ پھلواری شریف کی ہفت صد سالہ تاریخ میں یہ شرف اللہ تعالےٰ نے صرف مجھے بخشا ہے کہ آج تک میں نے کسی دوسرے کا لکھا ہوا خطبہ نہیں پڑھا اور نہ کبھی کتاب دیکھ کر خطبہ دیا۔ برسوں پھلواری کی جامع مسجد میں جمعہ پڑھایا لیکن ہر جمعے کو اپنا تصنیف کردہ خطبہ دیا۔ اس کے بعد بڑی بڑی مشکلوں کا سامنا کرنے کے بعد یہ نوبت آئی کہ اردو خطبۂ جمعہ بھی پھلواری میں مقبول ہو گیا۔ مجھے اس میں بڑی تدریج اختیار کرنی پڑی۔ اگر کہیں ابتدا ہی میں اردو خطبہ شروع کرتا تو یقیناً قتل کر دیا جاتا "اس کا بازار" کا خطبہ عربی ہی زبان میں تھا۔ اور وہ کچھ ایسا خطبہ ہوا کہ علمائے کرام میں ہر ایک نے گلے لگا کر داد دی کیونکہ انہیں اس سے پہلے یہ گمان بالکل نہ تھا کہ کوئی شخص زبانی اور وہ بھی اپنا تصنیف کردہ خطبہ بھی دے سکتا ہے۔

ہاں تو ذکر ہو رہا تھا کانپور کے جلسے کا۔ مولانا محمد علی ہی نے غالباً شاردا ایکٹ کے خلاف تجویز پیش کی۔ اس وقت کسی کی زبان سے "شاردا بل" کا لفظ زبان سے نکلا۔ مولانا محمد علی نے کہا کہ لوگ "بل" کیوں کہتے ہیں؟ ابھی تو ایکٹ ہے۔ اسمبلی میں پاس ہونے اور حکومت کی منظوری دینے کے بعد وہ "بل" ہو گا۔ دوران تقریر میں ایک صاحب نے اٹھ کر سوال کیا کہ یہ قانون پاس ہونے کے بعد اسے بدلے گا کون؟ بس مولانا کو جلال آ گیا۔ کہنے لگے۔ یہ کیا سوال ہے کہ بدلے گا کون؟ ارے انہی لوگوں کو بدلنا چاہیئے جنہوں نے پیش کیا ہے اور جو اسے پاس کرانا چاہتے ہیں۔ جو خدا ایک آیت نازل کرتا ہے وہی دوسری آیت سے اسے منسوخ بھی کر دیتا ہے۔ جس خدا نے توریت و انجیل بھیجی اسی نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھیج کر قرآن کے ذریعے اپنی ہی کتابوں کو منسوخ کر دیا۔ مولانا کی تقریر سے واہ واہ اور تالیوں کا اتنا شور ہوا کہ تقریر کے بہت سے الفاظ اسی شور میں دب گئے۔ اور سوال کرنے والے صاحب بھی اپنی جگہ مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔

مولانا محمد علی کی تقریر میں روانی کے علاوہ جو مغز مواد، جو برجستگی اور جو عمیق نکتہ آفرینی ہوتی تھی وہ میری نگاہ میں کسی دوسرے کو حاصل نہ ہو سکی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ عملی طور پر تمام قربانیوں میں پیش پیش ہونے کے بعد ایک دور ایسا بھی مسلمانوں پر آیا تھا کہ متحدہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں شریک ہونے اور ثمرہ آزادی حاصل ہونے کے بعد مسلمان قوم اپنے تحفظ کی ضمانت چاہتی تھی۔ مسلمانوں

کے سامنے ایک بہت بڑا خطرہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ آزادیٔ ہند ہمارے لیے صرف آقاؤں کی تبدیلی ثابت ہو۔ انگریز اپنی عقل و سیاست سے حکمرانی کر رہا تھا۔ اور قوموں کو لڑا کر اپنی چودھراہٹ قائم کیے ہوئے تھا۔ لیکن اس کے جانے کے بعد غالب اکثریت رکھنے والی ہندو قوم اپنی اکثریت کے بل بوتے پر ہمیشہ حکومت کرے گی اور بدقسمتی سے یہ اس قدر تنگ دل اور متعصب واقع ہوئی ہے کہ اس سے مسلمانوں کے محفوظ رہنے کی توقع نہیں۔ سوامی شردھانند کی تحریک نے ہندوؤں میں مسلمان دشمنی کی کامیاب تخم ریزی کر دی تھی اور علانیہ یہ کہا جانے لگا تھا کہ مسلمانوں کو ہندوستان سے اس طرح ختم کر دیا جائے گا جس طرح ہسپانیہ سے ختم کیا گیا۔ جب "مورے مولا بلا لے مدینے مجھے" کا ریکارڈ بجتا تھا تو کہا جاتا تھا کہ لو اب مسلمان ہندوستان سے چلے۔ انتہا یہ کہ ایک دریدہ دہن یہ بھی بولا تھا کہ ہم کعبے پر اوم کا جھنڈا گاڑیں گے۔ لیکن یہ تمام باتیں اتنی مضر نہ تھیں بلکہ مسلمانوں کو ہوشیار و بیدار کر رہی تھیں۔ انتہائی خطرناک گاندھی جی کی وہ میٹھی مگر زہر آلود پالیسی تھی جو مسلمانوں کو سلا سلا کر کامل غفلت میں رکھنا چاہتی تھی۔ وہ بلینک چیک تو دینے پر آمادہ تھے لیکن تحفظ کی کوئی ضمانت دینے کو کبھی تیار نہ تھے۔ وائٹ پیپر میں اچھوتوں کو جداگانہ نمائندگی دی جانے لگی تو گاندھی صاحب نے مرن برت شروع کر دیا اور چھ دن تک فاقے کر کر کے نڈھال ہو گئے لیکن مسلمانوں کے تحفظ کے لیے انہوں نے کبھی ایک گھنٹے کا بھی مرن برت نہ رکھا۔ قائد اعظم محمد علی جناح چودہ سال کانگریس میں رہے اور وہاں ان کی پوجا ہوتی تھی۔ انہوں نے ان کے اندر ڈوب کر ہندو ذہنیت کا جائزہ لیا اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ اس قوم سے امید وفا نہیں اس کی تنگ دلی کبھی دور نہیں کی جا سکتی اور اس کے وعدوں پر اعتبار کرنا ایک فریب ہے۔ وہ شروع ہی سے ان تمام باتوں کو محسوس کر رہے تھے اور آخر انہوں نے چودہ نکات قلمبند کیے۔ جو کسی قوم کے تحفظ کی مکمل ضمانت تھے۔ محمد علی جناح نے اسے مرتب کیا اور محمد علی جوہر نے اسے (اجلاس لکھنؤ میں) پیش کیا۔ سب کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کی یہ پیش کش ٹھکرا دی گئی اور ٹھکرانے والوں میں سب سے زیادہ فراخدل ہندو پنڈت موتی لال نہرو بھی تھے۔

اس موقع پر ہم دو شخصیتوں کو فراموش نہیں کر سکتے۔ ایک سبھاش چندر بوس اور دوسرے راجگوپال اچاریہ۔ یہ دونوں مسلمان قوم کے حق میں نسبتاً فراخ دل رہے ہیں۔ بوس کا کہنا تھا کہ مسلمان ۳۳٪ حقوق مانگتے ہیں انہیں پچاس فیصد دے دو۔ آخر وہ بھی ہمارے ہی دیس کے ہیں۔ انہیں یہاں مطمئن کر دو گے تو پھر یہ وہم بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے حقوق کے لیے کوئی بیرونی امداد (افغانستان وغیرہ سے) لیں گے"۔ بوس کی اس فراخ دلی کی سزا انہیں یہ ملی کہ وہ بیک بینی و دو گوش کانگریس سے نکال دیے گئے۔ یہی حال اچاریہ کا ہوا۔ انہوں نے (ایک مختلف فارمولے سے) تقسیم ہند کی سب سے پہلے تائید کی تو انہیں بھی کانگرس سے بے دخل کر دیا گیا۔ ہمیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ اخراج کس با اثر شخصیت کے ایما سے ہوا۔

ایسے ایسے بیسیوں واقعات ہیں جن کی وجہ سے ہندو اکثریت سے سوئے ظن پیدا کرنے میں مسلمان حق بجانب تھے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ قیام پاکستان میں اس قوم کی تنگدلی کو زیادہ دخل ہے۔ اگر ہندو قوم فراخدل ہوتی تو پاکستان کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ مصر کی جنگ آزادی میں بھی انگریزوں نے مصریوں کو پھاڑنا چاہا تھا۔ ان کے اشارے سے وہاں کے عیسائیوں نے سعد زغلول پاشا سامنے اپنا مطالبہ پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم اس وقت تک جنگ آزادی میں شرکت نہیں کریں گے جب تک ہمارے تناسب آبادی کے مطابق ہمیں سات فیصد حقوق کے تحفظ کی ضمانت نہ دے دی جائے۔ زغلول نے کاغذ منگوایا اور ان کی توقع اور مطالبے سے کہیں زیادہ یعنی دس فیصد حقوق کا ضمانت نامہ لکھ کر دے دیا۔ اس کے بعد وہ عیسائی کیا کہہ سکتے تھے؟ وہ خوش خوش واپس چلے گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہل چلاتے ہوئے شخص کے پاس انگریز بہکانے کے لیے جاتے تو وہ یہ دو ٹوک جواب دے دیتا تھا کہ: ہم زغلول

کے ساتھ ہیں"۔ لیکن متحدہ ہندوستان میں یہ معاملہ تھا کہ تحفظ حقوق کا کوئی معاہدہ نہ کرو بلینک چیک لے لو۔ تفصیلات کا فیصلہ آزادی ملنے کے بعد کیا جائے گا۔" گویا ضمانت تینتیس فیصد کی تو الگ رہی ایک فیصد کی بھی نہیں دی جائے گی۔

اس وقت مسلمانوں میں دو گروہ تھے۔ بڑے بڑے کانگریسی علماء کا فتویٰ تھا کہ ہندوؤں سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حقوق کا فیصلہ بعد میں ہوگا اس وقت تو آزادی حاصل کر لو۔" لیکن مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر یوں کے بعد کانگریسی کارپردازوں کے اس فیصلے کے خلاف تھے۔ کمال یہ کہ لوگوں نے علی برادران کو "ٹوڈی بچہ" کہنا شروع کر دیا تھا جس کا جواب ایک جلسے میں شوکت علی نے یہ دیا تھا کہ ہم ٹوڈی بچے ہیں تو تم "دھوتی بچے" ہو۔

اسی اثنا میں امروہے میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس کے مقابلہ میں وہیں اور انہی تاریخوں میں کانگریسی علماء نے بھی اپنا ایک جلسہ کیا جن لوگوں نے ان دونوں جلسوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ان سے پوچھ لیجئے کہ کانگریسیوں کے جلسے کی کتنی حاضری تھی؟ ادھر مسلمانوں کے جلسے میں جہاں بڑے بڑے لیڈر اور علماء مشائخ تھے وہاں مولانا محمد علی جوہر کی بھاری بھر کم شخصیت سب پہ چھائی ہوئی تھی۔ اس جلسے میں مولانا نے جو تقریر کی ہے وہ کبھی دلوں سے محو نہ ہو سکے گی۔ کیونکہ اس نے ایک مسئلے کا ہمیشہ کے لئے ایک فیصلہ پیش کر دیا تھا۔ مولانا اپنی تقریر کے دوران اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر علماء مشائخ، لیڈر اور پوری قوم کی طرف مخاطب ہوئے اور ایک سوال کیا۔

اگر ہم مسلمان ہیں تو کیا ہمیں ہر معاملے میں اسوۂ محمدی ہی کا اتباع نہیں کرنا چاہیئے؟ کیا قرآن نے لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ اسی لیے نہیں کہا ہے کہ ہم دینی، معاشرتی، سیاسی معاشی ہر معاملے میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کو اختیار کریں؟ میں صرف سوال نہیں کرنا چاہتا بلکہ واضح لفظوں میں اسی کا نفی یا اثبات میں اس کا جواب چاہتا ہوں۔"

ہر طرف سے تائید میں ایک شور ہوا کہ بے شک اسوۂ محمدی کا اتباع ضروری ہے۔" لیکن مولانا کیا کہنا چاہتے تھے اس کی طرف کسی کا ذہن بھی نہ گیا تھا۔ ہر طرف سے واضح تائیدی جواب ملنے کے بعد شبر نیستانِ حریت، پیکرِ عشق و محبت تنائے قوم وملت اپنی پوری گرج کے ساتھ تاریخ اسلامی کی ایک فراموش کردہ حقیقت سامنے لایا اور پوچھنے لگا کہ:

کیا پوری سیرتِ محمدی میں کوئی ایک نظیر بھی ایسی ملتی ہے کہ حضورؐ نے کسی قوم سے کبھی اتحادِ عمل فرمایا ہو جب تک پہلے تحریری معاہدہ نہ فرما لیا ہو۔ یہ محمد علی جوہر کا ایک ایسا سوال تھا جس نے پورے مجمعے پر چند منٹ کیلئے سناٹا طاری کر دیا۔ اذہان جلد جلد تاریخ کے ورق الٹنے لگے یہودِ مدینہ کے معاہدے سے لے کر یہودِ خیبر تک کے سارے قومی اتحاد ایک ایک کر کے سامنے آ گئے۔ لیکن ایک مثال بھی ایسی نظر نہ آ سکی کہ حضورؐ نے کسی غیر مسلم قوم کے صرف بلینک چیک کے زبانی وعدے پر اعتماد کر کے اتحاد عمل فرما لیا ہو۔ چند سیکنڈ تک اس سوال کے جواب میں دماغوں نے پوری تاریخ اسلامی کو ٹٹول لیا اور نفی میں جواب پانے کے بعد خاموشی و سکوت کا طلسم دفعتہً ٹوٹا اور دیر تک سارا مجمع اس طرح تحسین و آفرین کی صدائیں بلند کرتا رہا کہ جوہر کے لیے اپنا مزید خطابی جوہر پیش کرنا مشکل ہو گیا۔ مولانا محمد علی کی اس نکتہ رسی کا کوئی شافی جواب آج تک نہ مل سکا۔ اور یہ پہلا دن تھا جب کہ مسلم لیگ کے آئندہ پیش آنے والے موقف میں نئی روح پھونکنے کے لیے ایک لازوال مواد مہیا ہو گیا۔

مولانا محمد علی کی ہر تقریر میں اسی طرح ایسے ایسے نکات ہوتے تھے جو پہلے سننے میں نہ آئے تھے۔ میرے ایک محترم بھائی حافظ

JINNAHASA... LIBRARY BOOK NO....61.3.

سید ناہد حسین مرحوم نے مولانا کی کسی تقریر کا ایک نکتہ اس طرح بیان کیا۔ مولانا نے کہا۔

حضرات! آپ نے یہ بارہا سنا ہو گا کہ سمندر نے جہاز کو ڈبو دیا اور طیارے کو ہوا نے گرا دیا۔ کبھی یہ بھی سنا ہے کہ جہاز نے سمندر کو ڈبو دیا یا طیارے نے ہوا کو گرا دیا؟ اے انگریزو! تمہیں اپنے جہازوں اور بم بار طیاروں کی طاقت پر گھمنڈ ہے اور ہمارا اس خدائے قادر قیوم پر بھروسہ ہے جس کے قبضۂ قدرت میں سمندر کا پانی اور فضا کی ہوائیں ہیں۔ وہ اپنے سمندر کو حکم دے تو وہ جہازوں کو غرق کر دے وہ ہواؤں کو اشارہ کرے تو طیاروں کو زمین پر دے ماریں۔ تمہارے جہاز اور طیارے سمندر اور ہوا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے مگر خدا کا سمندر تمہارے جہازوں کو اور اس کی ہوا تمہارے طیاروں کو آن کی آن میں فنا کر سکتی ہے۔ ہمارا اعتماد تمہارے گھمنڈ سے کہیں زیادہ وزنی ہے"۔

کیا یہ تقریر محمد علی کے ایمان اور اعتماد علی اللہ کی گواہی نہیں دے رہی ہے؟ کیا کہنے اس کی جرأت ایمانی کے جب وہ لندن کے باجبروت مجمعے میں انگریزوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ:

مجھے یہ شکایت نہیں کہ مسٹر ریڈنگ نے مجھے جیل کیوں بھیجا۔ میں تو صرف یہ انسانی حق چاہتا ہوں کہ اگر مسٹر ریڈنگ غلطی کریں تو میں بھی انہیں جیل بھیج سکوں"۔

محمد علی کے سوا کون یہ بات کہہ سکتا تھا؟ وہ بھی اس دور میں جب کہ انگریزی حکومت کی ہیبت دلوں پر چھائی ہوئی تھی۔ خدا اسے غریق رحمت کرے۔ اس نے لندن میں کیا آخری بات کہی تھی۔ یہ اس مرد خدا کی آخری تقریر تھی جس میں اس نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا تھا۔

اب میں لندن سے آزادی لئے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔ یا تخت یا تختہ۔ آزادی یا موت"۔

یہ ایک پیش گوئی تھی جو اس کے دل پر القا ہوئی تھی۔ لندن کے ایک اخبار نے مولانا کی اس تقریر کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھا تھا کہ: برٹش گورنمنٹ آزادی تو نہیں دے گی۔ ہاں محمد علی کے لئے یہاں ایک قبر کی جگہ دے دے گی"۔ مگر محمد علی لندن میں دفن ہونا نہیں چاہتے تھا اس کی موت لندن ہی میں ہوئی اور اس نے مرنے سے پہلے وصیت کی کہ مجھے فلسطین میں دفن کیا جائے۔ تاریخ آئندہ بتائے گی کہ محمد علی نے یہ وصیت کیوں کی تھی۔ بہر حال یہ مرد مجاہد مسٹر بالفور کے اعلان کا ایک جزوی عملی جواب دینا چاہتا تھا۔ یہ فلسطین میں دفن ہوا اور علامہ اقبالؒ نے محمد علی کی اس ادائے دفن پر جو اشعار کہے ہیں اس کا صرف ایک شعر سن لیجئے ؂

خاکِ قدس اورا بآغوشِ تمنا در گرفت   سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

اس شعر کا کبھی کوئی جواب نہ ہو سکے گا۔ لیکن یہ شیدائیانِ اقبال ہی بتا سکتے ہیں کہ اقبال کے یہ اشعار ان کے مجموعہ کلام میں کیوں شائع نہیں کئے گئے۔ کسی کتاب میں اسے جگہ نہ دیجئے لیکن صفحہ اذہان پر جو شعر مرتسم ہو چکے ہیں انہیں کون مٹا سکتا ہے؟

ذکر محمد علی نا تمام رہے گا اگر ان سرگرمیوں کا حال نہ لکھا جائے جو شاہ ابن سعود کے تسلط علی الحجاز کے بعد پیش آئیں۔ انگریزوں نے شریف حسین کو ترکوں کے خلاف بغاوت پر کچھ ایسے وعدے کر کے ابھارا تھا جو بعد میں پورے نہیں کئے۔ شریف حسین انگریزوں کا مخالف ہو گیا اور اس کے

نتیجے میں ابن سعود حجاز پر چڑھ دوڑے۔ شریف حسین وہاں سے بھاگا اور اپنی بقیہ عمر انگریزوں کی قید میں بمقام جزیرہ قبرص گزاری۔ سعودیوں نے حجاز پر تسلط حاصل کرتے ہی اپنے بعض عقائد کا کچھ ایسا عملی مظاہرہ کیا جس سے دنیا کی کثیر "خوش عقیدہ" آبادی میں آگ سی لگ گئی۔ ایک گروہ کو صرف اس لئے ابن سعود سے اختلاف تھا کہ اس نے مزارات کیوں کھدوائے اور قبے کیوں تڑوائے؛ میرا شمار بھی اسی وقت اس گروہ میں تھا۔ ان ایام میں قبروں کے پختہ کرنے اور ان پر کوئی عمارت بنانے کے متعلق بڑی زبردست بحثیں اخباروں میں چلتی رہیں۔ اس سلسلے میں میری کتابیں تلقینِ حق، اثباتِ حق اور باطل شکن بہت مشہور ہوئیں۔ موخر الذکر کتاب نے تو اس سلسلے کی تمام کتابوں میں اولین مقام حاصل کیا بہت سے مضامین مختلف اخباروں میں شائع ہوئے۔ ایک مضمون خاص طور پر مرکزِ توجہ بنا اس کا عنوان تھا شجرۃ الرضوان، اس میں یہ ثابت کیا تھا کہ طبقات ابن سعد کی یہ روایت بالکل غلط ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب نے وہ درخت کٹوا دیا تھا جس کے سائے میں بیٹھ کر چودہ سو مہاجرین و انصار نے حضورؐ کی بیعت کی تھی، بخاری کی روایت کے مطابق وہ درخت دوسرے ہی سال سیلاب سے یا کسی وجہ سے غائب ہو گیا تھا۔ البتہ حضرت عمرؓ نے وہ درخت کٹوا دیا تھا جو دراصل جعلی تھا اور لوگوں نے اسے خواہ مخواہ شجرۃ الرضوان فرض کر لیا۔ یہ مضمون پہلے پھلواری شریف کے نیم روزہ اخبار غریب نواز میں شائع ہوا تھا۔ اس سے لے کر ہفت روزہ "سچ" (جو بعد میں اب صدق جدید ہے) نے شائع کیا۔ پھر بہت سے اخباروں نے اسے نقل کر کے شائع کیا۔

دوسرا گروہ وہ تھا جسے ابن سعود سے اس لئے اختلاف تھا کہ وہ اسے انگریزوں کا پٹھو سمجھتا تھا۔ مولانا حسرت موہانی اسی گروہ کے سربراہ تھے اور آخر تک اس موقف پر قائم رہے حسرت موہانی بھی عجیب شخصیت کے مالک تھے ان کے نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مادرِ گیتی کا کوئی فرزند ایسا نہیں جو حسرت کے خلوص سے انکار کر سکے۔ حسرت نے کبھی قوم کا ایک پیسہ بھی غبن نہیں کیا۔ ہمیشہ تیسرے درجے میں سفر کرتے اور اپنا اسباب خود ہی اٹھا کر چلتے۔ حجاز کانفرنس کے ایک جلسے کی صدارت (استقبالیہ) کی۔ لکھنؤ سے انہیں سو روپے کا منی آڈر خطبہ صدارت اور زادِ راہ کے لئے بھیجا گیا۔ انہوں نے چوبیس روپے کچھ آنے کا حساب لکھ کر باقی رقم واپس کر دی۔ اخراجات میں چارباغ اسٹیشن سے امین آباد تک کا ٹم ٹم کا کرایہ پانچ پیسے بھی درج تھا۔ ایک بار میں اور مولانا حسرت کانپور سے لکھنؤ روانہ ہوئے۔

لکھنؤ پہنچ کر سواری ملنے میں دشواری محسوس ہوئی تو کہنے لگے؛ اسباب نہ میرے پاس ہے نہ آپ کے پاس۔ چلئے پھر ٹہلتے ہوئے چلیں۔ میں تیار ہو گیا اور دونوں روانہ ہوئے۔ مولانا نے اپنی چھتری کھولی اور اس کا زیادہ حصہ مجھ پر سایہ فگن کر دیا۔ میں نے عرض کیا کہ یا تو آپ مجھے چھتری دے دیں کہ میں آپ کو لگاؤں یا پھر مجھ سے الگ ہو کر چلئے۔ مگر اس اللہ کے بندے نے ایک نہ سنی۔ خادموں اور مریدوں کی طرح اسٹیشن سے قیصر باغ تک مجھ پر چھتری تانے چلے آئے اور مجھے گھر پہنچا کر خود راجہ صاحب محمود آباد کے ہاں چلے گئے۔ یہ میری زندگی کا وہ واقعہ ہے جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کتنا بے نفس انسان ہے۔ ایسے شخص کے خلوص میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ جامع الاضداد ہی تو آج تک سمجھ میں نہیں آ سکی کہ ایک طرف تو وہ نظری لحاظ سے کمیونسٹ تھے۔ اور دوسری طرف بعض قیدیوں کو یا شیخ عبد القادر شیئاً للہ کا وظیفہ بھی بتاتے تھے اور خود تہجد گزار بھی تھے۔ اپنی دھن کے جیسے پکے تھے اس کی تفصیلات کے لئے ایک دفتر چاہیئے

بہرحال یہ نجدیوں کے سخت مخالف تھے زیادہ تر اس لئے کہ وہ ابن سعود کو انگریزوں کا پٹھو سمجھتے تھے اور کچھ اس لئے کہ مزارات کھودنے اور قبے توڑنے کے بھی مخالف تھے۔

مولانا محمد علی جوہر ابتدا میں نجدیوں کے حامی تھے اور اس کی دو بڑی وجہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ شریف حسین کی غداری سے اتنے نالاں تھے

کہ ابن سعود ان کو اس کے مقابلے میں غنیمت معلوم ہوا۔ دوسرے اس لیے کہ ابن سعود نے ابتدا میں ایک "موتمر" کا اعلان کیا تھا اور اس اعلان سے یہ توقع تھی کہ حجاز کا نظام حکومت جمہوری انداز کا ہوگا۔ اور غالباً دنیا کے بیشتر ممالک کو اس میں نمائندگی حاصل ہوگی۔ مولانا محمد علی بڑی شدت سے سعودی حکومت کے حامی تھے اور اس اخلاص میں بعض اوقات حدود سے بھی متجاوز ہو گئے تھے۔ چنانچہ سیتاپور کی ایک تقریر میں وہ بولے تھے کہ: مولانا عبدالباری (فرنگی محلی) ڈھولک بجاتے ہیں اور شاہ سلیمان (پھلواروی) ناچتے ہیں: مجھے اس وقت بڑا طیش آیا تھا اس لیے کہ انہوں نے نہ اپنے پیر و مرشد (مولانا عبدالباریؒ) کو چھوڑا نہ میرے پیر و مرشد (شاہ سلیمانؒ) کو۔ میں نے اٹاوے کی ایک تقریر میں جس کے صدر مولانا حسرت موہانی تھے مولانا محمد علی جوہر کے خلاف بڑی تیز و تند تقریر کی۔ مولانا حسرت نے اپنی تقریر میں مجھے سمجھایا کہ مولانا محمد علی کی زبان سے یہ جملہ ضرور نکلا ہے لیکن ان کی نیت کے بارے میں نیک گمان رکھنا چاہئیے۔ بعد میں مولانا حسرت موہانی کی بات کی تصدیق بھی ہو گئی۔

وہ اس طرح کہ ایک طرف تو جناب شعیب قریشی (۱) مولانا محمد علی نے حجاز سے لوٹ کر بڑی بے لاگ رپورٹ دی اور ابن سعود اور نجدیوں کے سخت مخالف ہو گئے دوسرے اعلان موتمر کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد ابن سعود نے ملوکیت کا اعلان کر دیا۔ ان دو باتوں کے بعد مولانا محمد علی کا پارہ چڑھ گیا اور پہلے جس قدر ابن سعود کے حامی تھے اسی قدر اس کے مخالف ہو گئے

یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ جس زمانے میں سارے خوش عقیدہ ہندوستانی مسلمانوں میں ابن سعود کے خلاف آگ بھڑک اٹھی تھی اس وقت بھی مولانا محمد علی پوری قوم کی مخالفت سے بالکل بے پروا تھے اور ان کی یہ ایمانی جرأت بلاشبہ قابل قدر تھی۔ اسی دوران میں پھلواری شریف کے اخبار غریب نواز نے ایک عجیب اداریہ لکھ کر مولانا محمد علی کو ان کی ایک تقریر کی طرف متوجہ کیا تھا۔ یہ تقریر انہوں نے کراچی کی خلافت کانفرنس ۱۹۲۱ء میں کی تھی اور تمام اخباروں میں شائع ہو چکی تھی۔ اس میں مولانا نے یہ انکشاف کیا تھا کہ،

> انگریزوں کی سیاسی پالیسی بڑی دوررس ہے اور "تفریق پیدا کر کے حکومت کرو" کے اصول پر مبنی ہے۔ پہلے تو انہوں نے شریف حسین کو رشوت دے کر ترکوں کے خلاف ابھارا۔ لیکن ان کی پیش بندی دیکھئے کہ وہ شاہ نجد (ابن سعود) کو بھی محض اس لیے پچھتر ہزار روپے کا وظیفہ دے رہے ہیں کہ اگر کسی وقت شریف حسین (انگریزی مواعید پورے نہ ہونے کی وجہ سے) بغاوت کرے تو فوراً ابن سعود کو اشارہ کر دیں اور وہ اس پر چڑھ دوڑے۔

مولانا محمد علی کی معلومات، باخبری اور سیاسی بصیرت کا اس تقریر سے اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ جو کچھ انہوں نے کہا تھا وہ چار سال بعد آخر منصۂ شہود پر آ ہی گیا۔ لیکن خدا جانے کیوں مولانا کو اپنا بیان یاد نہ رہا؟ میرا خیال ہے کہ مولانا کو یہ حقیقت بھولی نہیں تھی۔ لیکن وہ اس لیے اسے پی گئے کہ اولاً تو وہ ابن سعود کو شریف حسین سے بہتر سمجھتے تھے دوسرے ان کا خیال تھا کہ یہ ملوکیت کی بجائے جمہوری حکومت ہوگی لیکن جب ابن سعود نے ملوکیت کا اعلان کیا اور جناب شعیب قریشی کی سچی رپورٹ بھی مل گئی تو مولانا ابن سعود کے سخت مخالف ہو گئے اور انہوں نے اس کی کوئی پروا نہ کی کہ لوگ یہ طعنہ دیں گے کہ کل کچھ کہہ رہے تھے اور آج کچھ کہنے لگے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا کی موافقت بھی خلوص پر مبنی تھی اور مخالفت بھی اخلاص ہی کی بنا پر تھی۔

اس دوران میں دو واقعے اور بھی ہوئے اور دونوں موقعوں پر مولانا محمد علی سے میری ملاقات بھی ہوئی۔ ایک تو یہ کہ علماء اور

لیڈروں کا ایک وفد وائسرائے سے ملا۔ اور یہ کہا کہ: ابن سعود بہرحال برطانیہ کے زیر اثر اور وظیفہ خوار ہے لہذا برطانیہ کو چاہیئے کہ ابن سعود کو قبہ شکنی وغیرہ جیسے دل آزار حرکات سے روکے اور جو دل آزاریاں ہو چکی ہیں ان کی تلافی کرے۔ اس وفد میں حضرت قبلہ والد ماجدؒ بھی تھے اور ملاقات کا انتظام راجہ صاحب محمود آباد مرحوم کی معرفت ہوا تھا۔ ارکان وفد پہلے راجہ صاحب ہی کی عالیشان کوٹھی میں فروکش ہوئے میرا شمار ارکان وفد میں نہ تھا میں حضرت قبلہ کا صرف رفیق سفر تھا۔ یہاں مولانا محمد علی اور مولانا قطب الدین عبدالوالی بھی آگئے تھے لیکن وفد میں کسی مصلحت سے شریک نہ ہوئے تھے۔ اس وقت مولانا محمد علی اور خواجہ حسن نظامی کی مشہور قلمی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ چونکہ سوئے اتفاق سے دونوں اس وقت ابن سعود کے حامی تھے اس لیے مجھے ان دونوں سے کچھ ناراضی وخفگی تھی۔ لہذا میں نے کسی کی حمایت ومخالفت میں کوئی حصہ نہ لیا لیکن میرے بھائی مولانا شاہ غلام حسنین صاحب ندوی بی اے خواجہ صاحب کے حامی تھے اور انھوں نے مولانا محمد علی کے خلاف ایک بڑا ہی سخت مضمون لکھا۔ خود خواجہ صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ اس مضمون نے محمد علی کیمپ میں ایک زلزلہ ڈال دیا تھا۔ یہ خط "جنگِ صفین" نامی کتاب میں اب بھی موجود ہے۔ بہرحال راجہ صاحب کی کوٹھی میں مولانا محمد علی حضرت قبلہؒ سے ملے اور دوران گفتگو فرمایا کہ آپ کے صاحبزادے تو مجھ سے بے حد خفا ہیں حالانکہ خدا کی پناہ میرے دل میں کبھی حضرت فاطمہؓ کی اہانت کا شائبہ بھی نہیں پیدا ہو سکتا۔ میرے جملوں سے آپ کے صاحبزادے کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔ حضرت قبلہؒ نے فرمایا کہ آپ بھی میرے عزیز ہیں اور وہ بھی میرے جگر پارے ہیں اب میں آپ دونوں کے درمیان کیا بولوں۔ وہ میرے فرزند ہیں۔ لیکن آپ کے میرے تعلقات کچھ آج کے نہیں اور آپ کو ان سے کم نہیں . . . . سمجھتا بلکہ احترام ان سے زیادہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس وقت ابن سعود کے بارے میں میرا آپ کا اختلاف رائے ہو گیا تھا: مولانا محمد علی خاموشی سے یہ سب کچھ ادب سے سنتے رہے اور پھر اس موضوع پر کوئی مزید گفتگو یا شکایت نہ کی۔ دوسری باتیں شروع ہو گئیں۔ مولانا محمد علی جوہر میرے والد ماجد کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے کیونکہ یہ علیگ تھے اور وہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے ٹرسٹی سرپرست اور معاون ومددگار تھے اور جس وقت سرسید پر ہر طرف سے کفر کے فتوے ہو رہے تھے اس وقت صوفی علماء میں تنہا حضرت قبلہ والد ماجد ہی نے . . . . سرسید کا ساتھ دیا۔ اس کا اندازہ خود مولانا محمد علی کی ایک تحریر سے ہو سکتا ہے جو انہی کے اخبار کامریڈ میں شائع ہوئی:

. . . .

انڈیا حجاز کانفرنس کا عظیم الشان اجلاس لکھنؤ میں ہونا طے ہوا تو چندے کے لئے مختلف وفود اطراف میں بھیجے گئے۔ ایک وفد میں میں اور مولانا صبغۃ اللہ شہید انصاری فرنگی محلی تھے۔ علی گڑھ اور میرٹھ وغیرہ کا دورہ کرتے ہوئے ہم دونوں دلی بھی پہنچے اور قیام مولانا محمد علی کے ہاں ہوا۔ مولانا بڑے اخلاق سے ملے۔ یہیں مولانا شوکت علی بھی موجود تھے۔ مولانا محمد علی انگریزی اخباروں سے کچھ تراشے دکھاتے رہے۔ سلسلۂ گفتگو تو یاد نہیں رہا مگر خدا جانے کیا گفتگو ہو رہی تھی کہ مولانا محمد علی نے مولانا صبغۃ اللہ سے پوچھا کہ طوطے کو عربی میں کیا کہتے ہیں؟ انہوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں نے کہا کہ عربی میں اسے ببغاء کہتے ہیں۔ مولانا محمد علی سن کر چپ رہے مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے انہیں میرے بتائے ہوئے لفظ میں کچھ شک سا ہے۔ حسن اتفاق سے میرے پاس اس وقت المنجد موجود تھی۔ میں نے اس خیال سے اسے رکھ لیا تھا کہ اوقات فرصت میں اس کے ابتدائی حصے کا ترجمہ کروں گا اور پھر اس سلسلے کو بڑھا کر پوری کتاب کا ترجمہ کر ڈالوں گا۔ میں نے المنجد نکال کر لفظ دکھایا اور کہا کہ لیجئے یہ طوطے کی تصویر بھی دیکھ لیجئے

لکھنؤ میں کچھ دنوں کے بعد آل انڈیا حجاز کانفرنس کا بڑا عالیشان اجتماع ہوا۔ اس میں بڑے بڑے لیڈر اور علماء ومشائخ شریک تھے۔

مولانا سید سلیمان ندوی اگرچہ ابن سعود کے حامیوں میں تھے۔ لیکن اس جلسے میں شریک تھے۔ مولانا محمد علی بھی اپنے بدلے ہوئے تصورات کے ساتھ شریک اجلاس تھے۔ یہ حجاز سے لوٹ کر آئے تھے۔ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ آئے تھے۔ اور ابن سعود کو جلی کٹی بڑی جرأت کے ساتھ سنا آئے تھے۔ حجاز کانفرنس میں انہوں نے بھی تقریر کی جس میں میں نے انہیں روتے ہوئے بھی دیکھا۔ اس تقریر میں انہوں نے وہ سب کچھ یا بہت کچھ بیان کر دیا جو وہ اپنی آنکھوں سے حجاز میں دیکھ کر آئے تھے۔ کھدی ہوئی قبروں اور شکستہ قبوں کے علاوہ انہوں نے ابن سعود کی سیاسی غلطیاں بھی بتائیں۔ تحریک خلافت و ترک موالات کے زمانے میں میں نے مولانا کی بہت سی تقریریں سنی ہیں۔ لکھنؤ کی خلافت کانفرنس میں انہوں نے سات گھنٹے تقریر کی تھی جس میں سیاسی اور علمی معلومات کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ پُر مغزی کے علاوہ خطابت کا بڑا اعلیٰ جوہر رکھتے تھے۔ برجستہ لطائف، فصاحتِ بیان، اور ادبی لطافتیں ایسی ہوتی تھیں کہ ان کا جواب ملنا مشکل تھا۔ اشعار تو وہ ایسا برمحل پڑھتے تھے کہ گویا شاعر نے ٹھیک اسی موقع کے لیے کہے ہیں۔ خلافت کانفرنس لکھنؤ میں وہ انگریزوں کی سفاکیاں بیان کرتے ہوئے نہایت برمحل غالب کا یہ شعر پڑھا تھا کہ ؎

جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہو گا کیوں کر سمجھوں کہ اس میں تلوار نہیں

آل مسلم پارٹیز کانفرنس منعقدہ امرتسر ۱۹۲۸ء میں میں بھی شریک تھا۔ شریف حسین نے اپنے پروپیگنڈے کے لئے ایک وفد طاہر الدباغ کی سرکردگی میں بھیجا تھا جو اس کانفرنس کے موقع پر امرتسر میں موجود تھا۔ مولانا محمد علی نے ان سے بھی ملاقات کی تھی۔ اثنائے گفتگو میں کہیں مولانا ان سے پوچھ بیٹھے کہ "آپ کو پارلیمنٹ کے قواعد و اصول بھی معلوم ہیں؟ دباغ صاحب نے جوش میں آ کے بغیر ہی پوچھا کہ "آپ کس جگہ کی پارلیمنٹ کے بارے میں دریافت کر رہے ہیں؟" اس کے بعد دباغ نے انگلستان، امریکہ، فرانس اور خدا جانے کہاں کہاں کے اصول و قواعد بتانے شروع کئے۔ مولانا ان کی گفتگو اور وسیع معلومات سن سن کر حیران ہو رہے تھے اور وہ جب اٹھے تو یہ اعتراف کر کے اٹھے کہ "میں نے آج پہلی مرتبہ اتنا وسیع المعلومات عرب دیکھا ہے۔"

اس کانفرنس کے کرتا دھرتا تین آدمی تھے میر غلام بھیک نیرنگ، مولانا عبد الماجد بدایونی اور ڈاکٹر کچلو۔ تمام فرقوں اور تمام سیاسی پارٹیوں کے لوگ اس میں شریک تھے۔ علی برادران بھی شریک تھے۔ مولانا شوکت علی اور میر غلام بھیک نیرنگ میں کچھ نوک جھونک بھی ہوئی۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ علی برادران کے ایک سگے بھائی گوہر علی صاحب بھی موجود تھے۔ یہ قادیانی تھے اور یہ علی برادران کی طرح مشہور نہ تھے ڈیل ڈول سے تو واقعی یہ علی برادران کے بھائی ہی نظر آتے تھے لیکن تصورات میں آسمان و زمین کا فرق تھا۔ مولانا محمد علی نے اپنی تقریر میں ان پر بھی ہاتھ صاف کیا اور یہ کہہ اٹھے کہ "یہ ہیں میرے بھائی مگر میں انہیں بالکل گمراہ سمجھتا ہوں۔"

پہلے یا دوسرے اجلاس کے بعد میں باہر آیا۔ میرے ساتھ مولانا صبغۃ اللہ شہید انصاری فرنگی محلی بھی تھے۔ پھاٹک سے باہر نکلے تو دیکھا کہ مولانا محمد علی موٹر پر بیٹھے ہیں اور بہت سے لوگ انہیں گھیرے ہوئے ہیں۔ ہم دونوں نے بھی دیکھا اور علیک سلیک کے بعد انہوں نے پوچھا کہ "آپ لوگ کدھر جا رہے ہیں۔ مولانا صبغۃ اللہ نے کہا۔ نماز عصر ادا کرنے۔ چلئے آپ بھی چلئے۔" مولانا محمد علی نے اس وقت ایک شعر پڑھا جو مجھے اب تک یاد ہے۔ شعر یہ تھا ؎

نہ نماز آتی ہے مجھ کو نہ وضو آتا ہے سجدہ کر لیتا ہوں جب سامنے تو آتا ہے

مولانا محمد علی خود بڑے اچھے شاعر تھے۔ مشکل ہی سے کوئی ایسا آدمی دکھائی دے گا جو مولانا جیسا جامع الصفات ہو۔ تقریر و تحریر، نظم و نثر، انگریزی اردو اور فارسی۔ مذہب اور سیاست غرض ہر لحاظ سے وہ یکساں قابلیت رکھتے تھے۔ اس دور میں متحدہ ہندوستان کے تین آدمی ایسے

تھے جن کی انگریزی زبان کو   خود انگریزوں نے بھی ان کی مادری زبان تسلیم کر لیا تھا۔ ان میں مولانا محمد علی سر فہرست تھے۔ آخری دور میں ان کے اندر بڑی روحانی قسم کی رقت پیدا ہو گئی

کمزوریوں سے کوئی بشر خالی نہیں۔ مولانا کو آخر عمر میں ذیابیطس کی وجہ سے اپنے مزاج پر زیادہ قابو نہ رہا تھا۔ کوئی ناگوار بات خصوصاً مذہبی حملے وہ برداشت ہی نہ کر سکتے تھے۔ اس نازک مزاجی کی وجہ سے آخر عمر میں انہوں نے کسی کو نہ بخشا۔ حتیٰ کہ مولانا سید سلیمان ندوی کو بھی ان کے الفاظ بھی بعض اوقات ایسے ہوتے جو سنجیدگی اور تہذیب و شائستگی سے دور ہوتے۔ چنانچہ اخبار "غریب نواز" پھلواری شریف میں میرے بھائی مولانا شاہ غلام حسین ندوی بی اے نے ایک مضمون میں لکھا کہ

مولانا محمد علی جوہر آج کل ایک اسماء الرجال کی کتاب تیار کر رہے ہیں اور ان کی "تہذیب التہذیب" میں اس وقت تک یہ حضرات شامل کئے جا چکے ہیں۔۔۔

جس وقت مولانا محمد علی کی وفات کی خبر آئی ہے اس وقت میں کپورتھلے میں تھا۔ ذرا دیر میں ایک انبوہ کثیر جمع ہو گیا اور میں نے غائبانہ نماز جنازہ ادا کی۔ اس کے بعد اخباروں سے معلوم ہوا کہ تمام عالم اسلام میں ان کی نماز جنازہ غائبانہ ادا کی گئی۔ حضرت قبلہ والد ماجدؒ نے انہی دنوں فرمایا کہ "جہاں تک میری نظر تاریخ پر جاتی ہے بجز شیخ شہاب الدین سہروردی کے اور کوئی شخص نہیں جس کا اتنا عالمگیر ماتم ہوا ہو جیسا محمد علی کا ہوا ہے۔" "خاتم سلیمانی" کے حصہ چہارم میں تقریباً یہی الفاظ موجود ہیں۔ یہ حصۂ چہارم حضرت قبلہؒ کے ملفوظات پر مشتمل ہے اور معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے۔

ایک بات مجھے ہمیشہ حیرت میں ڈالے رہے گی اور وہ یہ ہے کہ مولانا محمد علی جوہر کی وفات کے بعد ہر قابل ذکر لیڈر نے اپنا بیان دیا۔ ان کی خدمات کو سراہا۔ ان کی قابلیت کا اعتراف کیا۔ اظہار افسوس کیا اور خراج عقیدت پیش کیا۔ لیکن مولانا ابو الکلام آزاد بالکل خاموش رہے لکھنؤ کے ایک شخص نے "ہمدم" اخبار میں ایک مضمون لکھتے ہوئے مولانا آزاد سے یہ سوال کیا کہ "کیا مرنے کے بعد بھی معاصرانہ چشمک باقی رہنی چاہیئے؟" اس کا جواب مولانا آزاد نے یہ دیا کہ "میں تو اس لئے خاموش تھا کہ مرحوم پر ایک مستقل مضمون لکھنے کا خیال تھا۔" لیکن میری نظروں سے وہ مجوزہ مضمون کبھی گزرا نہیں۔ ممکن ہے لکھا ہو اور میری نظروں سے نہ گزرا ہو۔ واللہ اعلم۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

عرشی امرتسری

محمد علیؔ کی نذر

"کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو"

نصف صدی پہلے کا ہندوستان

بول کے سائے ہیں، قلم کاغذ ہاتھ میں لیے چارپائی بچھائے ہوئے بیٹھا ہوں، پاس ہی رہٹ چل رہا ہے۔ ارد گرد گیہوں کے کھیت ہیں، کاشت کار بیلوں کو ہانک رہا ہے اور حقہ بھی پیے جا رہا ہے، خوش گوار ہوا جسم کو سہلاتے ہوئے چلی جا رہی ہے۔ آنکھیں اس صحت اور سکون بخش منظر کو دیکھ رہی ہیں۔ لیکن خیال اپنی غیر زمانی رفتار سے ماضی بعید کے وسیع و بسیط میدانوں میں گھوم رہا ہے —— جسم کہاں ہے اور خیال کہاں۔ ان دونوں کا یہ لانہایت بعد اور انتہائی اتصال بیک وقت ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ دل کی آنکھیں آج تقریباً نصف صدی پیچھے مُڑ کر ہستیٔ ناپائیدار کے ایک ہنگامہ گرم کے نظارے میں محو ہیں۔ غیر منقسم ہندوستان ایک عظیم و ضخیم ہیجان و بحران میں گھر رہا ہے۔ راعی و رعایا کے تعلقات میں کشیدگی نے ہر طرف خطرات کے جال بچھا رکھے ہیں۔ ہنگامہ خیز اجتماعات ہوتے ہیں۔ آتشیں تقریروں سے انگارے برستے ہیں، جلوس نکلتے ہیں۔ گرفتاریاں ہوتی ہیں۔ بیسیوں قسم کے لیڈر اور علما اخلاقی مجرموں سے بھی زیادہ موردِ عتاب ہو کر حکومتِ وقت کی عدالتوں میں پیش ہوتے ہیں۔ اور قید و بند کی سزا کا اٹل فیصلہ سن کر زندانِ فرنگ میں برسوں کے لیے محبوس ہو جاتے ہیں۔ پھر جب اپنی مدتِ اسیری ختم کر کے چھوٹی جیل سے وسیع ملکی جیل خانے میں منتقل ہوتے ہیں تو "اسی جرم" کا پہلے سے زیادہ جوش کے ساتھ اعادہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے دار و رسن کا امتحان دے کر نکلے تھے۔

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب!
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

ملک کے ہر گوشے میں دار و گیر کی آندھیاں چل رہی ہیں۔ کل زید کی گرفتاری کی خبر آئی تھی تو آج عمرو کے وارنٹ نکلے ہوئے ہیں۔ ایک رہا ہوتا ہے تو چار ماخوذ ہو جاتے ہیں۔ ایسی کشاکش کی وادی سے گزرتے ہوئے خیال کا مسافر ۱۹۱۹ء کے آخری مہینے میں جا پہنچتا ہے۔ دسمبر ختم ہونے کو ہے، انڈین نیشنل کانگرس کا اجلاس (مرحوم) امرتسر میں منعقد ہو رہا ہے۔ عین اس وقت علی برادران کی رہائی کی خبر بجلی کی سی سرعت سے ملک بھر میں پھیل جاتی ہے۔ "جعفر و صادق" کی قسم کے غدار کاسہ لیسوں کے سوا ہر قریہ و شہر میں دلوں کے پیمانے مسرت کے شربت سے چھلک رہے ہیں۔ ایسی بے لوث اور ملک گیر مسرت، جس کے سامنے افراد کی ذاتی و انفرادی مسرتیں اسی طرح ہیچ ہیں

ہیں جیسے سورج کے سامنے ستارے ناپید۔ امرتسر کا عروج وزیبائی تمام امصار وبلاد میں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے براتیوں میں نوشہ۔ شمع حریت کے پروانے ہزارہا میل کے فاصلے طے کر کے عاشقانہ بے تابیوں سے لبریز دلوں کے ساتھ یہاں پہنچ رہے ہیں۔

علی برادران

بشری فطرت کا عام تقاضا تو یہ تھا کہ اہل وعیال سے برسوں جدا رہنے کے بعد رہا ہوتے ہی اپنے پیاروں کا منہ دیکھنے کے لیے بے تابانہ وطن کا رخ کرتے۔ لیکن انہیں بلند انسان کے بلند نصب العین اس کی مہلت کہاں دیتے ہیں، علی برادران چھندواڑہ جیل سے نکلتے ہی ہزار بارہ سو میل کا سفر کر کے سیدھے امرتسر پہنچے۔ کانگرس کے اجلاس میں ان کی شرکت گویا ۱۰ کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کی شرکت تھی۔ کانگرس کے پنڈال میں دونوں بھائی نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے داخل ہوئے۔ تو ان کے پیچھے پیچھے عقیدت مندوں کا ایک بڑا لشکر بھی تھا۔ "یا علی" کے نعروں کی گونج ملک بھر میں پھیل رہی تھی۔ (علی" دونوں بھائیوں کے نام کا جزو اہم ہے)

جلیانوالہ امرتسر

جلیانوالہ باغ جو صفحات تاریخ میں انگریز کی ستم آرائیوں اور سیاہ کاریوں پر آخری مہر ثابت ہوا، مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔ ملک کے دور دراز گوشوں سے مختلف بولیاں بولنے والے اشتاقان دید ہجوم در ہجوم اس کی طرف کھنچے چلے آ رہے ہیں۔ اندر داخل ہونے کا کشادہ راستہ بہت تنگ ثابت ہو رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین نے اپنے خزانے اگل دیئے ہیں۔ گذشتہ وموجودہ تمام انسان اسی میدان میں محشور ہو رہے ہیں، ہجوم کے وسط میں دو سر سب سروں سے اونچے دکھائی دے رہے ہیں۔ چہروں پر اسلامیت کا وقار اور عزم ووجاہت کا نور جھلک رہا ہے دور سے دیکھنے والے کو بے حد وشمار پیادہ مخلوقات میں دو گھوڑ سوار نرم رفتار سے بھیڑ کو چیرتے، آگے بڑھتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ قریب پہنچنے پر دیکھا کہ قامت کی بلندی نے گھوڑے کی سوار کا منظر پیدا کر دیا تھا۔ یہ تھے مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی، بڑے بھائی جوہر صاحب سے زیادہ بلند تھے۔

اس رہائی کے موقع پر شاعر مشرق (اقبال) کا دل نور مسرت سے چمک اٹھا۔ اس چمک کی چند کرنیں چند لازوال اشعار کی صورت میں نمودار ہوئیں:۔

ہے اسیری اعتبار افزا جو فطرت ہو بلند
قطرۂ نیساں ہے زندان صدف سے ارجمند   اقبال
شہپر زاغ وزغن پابند صید وقید نیست
ایں سعادت قسمت شہباز وشاہیں کردہ اند   حافظ

حضرت جوہر "قال" کی لفظ آرائیوں سے آگے بڑھ کر "حال" کے معرکے میں سرفروشانہ سبقت کر رہے تھے۔

کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

ان کا نصب العین بن چکا تھا، اقبال کے اعترافِ کمال کے باوجود جوہر کی مجاہدانہ روح ان کی گوشہ گیری اور راحت پسندی پر معترض ہوئی۔ وہ اس اعتراض کی تردید تو کیا کرتے، ان کی دیانت نے اس کی صحت کے اعتراف میں کبھی جھجک محسوس نہ کی ؎

"وہ اک مردِ تن آساں تھا، تن آسانوں کے کام آیا"

؎

"تخم کہ دارے ز خاکِ ما نہ زاد"

یہ اعتراف بھی تو اُس "بے عمل" انسان کا ایک عمل ہی ہے، پھر اس کی "بے عملی" نے اپنی جگر گداز نواؤں سے جتنے باعمل انسان پیدا کیے دنیا کے کسی ایک شاعر کو بھی وہ نصیب نہ ہو سکے۔ اس کا اعتراف خود علی برادران نے بھی کیا کہ ان کے اسلام میں ابوالکلام کی نثر اور اقبال کی نظم کا بڑا حصّہ ہے۔

یہ وہ وقت تھا جب ساری مسلم قوم کے افکار و عزائم کی باگ تنہا محمد علی کی مٹھی میں تھی۔ جدھر چاہتے موڑ دیتے کانگریس میں تھے تو مسلمانوں کا اوڑھنا بچھونا کانگریس تھی، گاندھی جی ان کو اپنے قومی قائد معلوم ہوتے تھے، کانگریس کے رازداروں سے آگاہ ہو کر اس بھری بزم سے الگ ہوئے۔ تو مسلم اکثریت کو ساتھ لے کر اپنا الگ محاذ قائم کیا غلطی پر مطلع ہو جانے کے بعد اس پر جمے رہنا محمد علی کی فطرت کے خلاف تھا۔ جس خلوص اور عزم و جرأت سے وہ کانگریس اور گاندھی جی کے حامی تھے، اسی دلیری سے اس کی مخالفت میں ڈٹ گئے۔ لیکن مشترکہ نصب العین (حصولِ آزادی) سے آخر دم ایک لمحے کے لیے بھی دست کش نہیں ہوئے۔

اینی بیسنٹ، گاندھی، جناح۔

حافظے کے پرانے کباڑ خانے سے ڈھونڈھ ڈھونڈ کر ٹوٹی پھوٹی اور گھسی مٹی ہوئی چیزیں نکال رہا ہوں، اُوپر کانگریس کے جس اجلاس منعقدہ امرتسر دسمبر ۱۹۱۹ء کا ذکر ہوا۔ اسی موقع پر خلافت کانفرنس اور مسلم لیگ کے اجلاس بھی ہوئے۔ انہی مختلف اجلاسوں میں بڑے بڑے لیڈروں کے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ جن کے نام آج تاریخ کی زینت بن چکے ہیں۔ تھیوسوفیکل سوسائٹی (کلکتہ) کی بانی اور صدر مسز اینی بیسنٹ کو دیکھا اور سُنا تھا بڑھاپے میں جوانی کے جوش کے ساتھ بولتی تھیں۔ ان کا قد طول میں کم اور عرض میں زیادہ آج بھی چشمِ تصور کے سامنے ہے۔ گاندھی جی اس زمانے میں تمام اقوامِ ہند کے قائد مانے جاتے تھے۔ کرسی پر بیٹھ کر چادر اوڑھے ہوئے بے تکلفانہ سیدھی سادی اُردو میں تقریر کر رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دور و نزدیک اُن کی آواز یکساں پہنچ رہی ہے۔ مقررانہ کرتب، دست و بازو کی جنبش، آواز کا اتار چڑھاؤ، جوش و جذبات کا اظہار وغیرہ تصنع کی کوئی علامت نظر نہیں آرہی تھی —— قائدِ اعظم جو ان دنوں صرف مسٹر جناح یا محمد علی جناح تھے اپنا دبلا پتلا لانبا قد لیے ہوئے اسٹیج پر نمودار ہوئے۔ اور نہایت رواں دواں انگریزی میں تقریر کی۔ مولانا حسرت موہانی کو بھی (شاید) انہی اجتماعات میں کسی جگہ دیکھا۔ ان کے ظاہر میں کوئی جاذبیت نہ پائی۔ اس لیے بھی کہ وہ ظاہر داری جانتے ہی نہ تھے

اب یاد نہیں ان بزرگ ہستیوں کے علاوہ کس کس کو دیکھا اور کس کس کو سنا۔

مسئلۂ قتلِ مرتد

۲۵-۱۹۲۴ء کا ایک ہنگامہ یاد آگیا (شاید) افغانستان میں دو قادیانیوں کے قتل کی بنا پر مسئلۂ قتلِ مرتد کی بحث چھڑ گئی چھوٹے چھوٹے حلقہ ہائے بحث کے علاوہ دو بڑے اور ملک گیر حلقے قائم ہوئے، دونوں طرف سے دو پہلوان خم ٹھونک کر میدان میں آ گئے۔ "ہمدرد" کا مسلک یہ تھا کہ قتلِ مرتد ناجائز ہے اور "زمیندار" قتلِ مرتد کے وجوب میں دلائل فراہم کر رہا تھا۔ اس طرف محمد علی خود بڑے بڑے لمبے اداریے لکھ رہے تھے۔ ادھر ایڈیٹر کے پردے میں مولانا غلام رسول مہر اپنی جوانی اور مذہبیت کا جوش دکھا رہے تھے۔ اس بحث نے کافی طول اختیار کیا۔ میں دلچسپی سے دونوں حریفوں کے دلائل پڑھتا تھا اور دل ہی دل میں محمد علی کے حلقۂ عقیدت میں شامل ہو رہا تھا۔ مہر صاحب کے پر مغز پر معلومات اور حوالوں سے پر مقالے مجھ پر کچھ اثر نہ کرتے تھے۔ قرآن کریم کی ایک آیت جو محمد علی کی دست آویز تھی ایک طرف اور فقہا کے رنگا رنگ اختلافات و تضادات کی معرکہ آرائیاں دوسری طرف ——— آخر اللہ ہی کو اللہ ماننا پڑے گا۔ چنانچہ پچھلے دنوں میرے سامنے ایک خاص صحبت میں مولانا مہر صاحب نے خود بھی اپنے تبدیلِ موقف کا اعتراف کر لیا۔ میں اس کو ان کی بزرگی اور سلیم الطبعی سمجھتا ہوں۔

حسن نظامی اور محمد علی

حافظے کا ایک اور ورق الٹتا ہوں۔ یہ ۱۹۲۵ء ہی کا واقعہ ہے۔ خواجہ حسن نظامی اور مولانا محمد علی میں ٹھن گئی۔ یہ تو یاد نہیں کہ آغاز کس بات سے ہوا تھا۔ اتنا یاد ہے کہ ذاتیات پر حملے کرنے میں کمی کسی طرف سے نہیں ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ محمد علی خواجہ صاحب کی خواجگی کو ختم کر کے چھوڑیں گے۔ اور خواجہ صاحب محمد علی کی لیڈری کو سپردِ کفن دفن کر دینے کے درپے تھے۔ دونوں طرف سے خوب خوب چلتی رہی۔ میں اس تو تکار کو ان بزرگوں کی شان کے خلاف سمجھنے کے باوجود چٹخارے لے لے کر پڑھتا تھا۔ بعض وقت ایسا نظر آتا تھا کہ بھٹیارنوں کی لڑائی یاد آ جاتی تھی۔

اگر یہ دونوں مجموعہ ہائے مضامین (قتلِ مرتد اور خواجگی و لیڈری) فراہم کر کے شائع کر دیے جائیں تو تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار کر لیں گے۔

حجاز میں قبہ شکنی

ہاں یاد آیا، ابن سعود کی قبہ شکنی بھی انہی دنوں کا واقعہ ہے۔ محمد علی ابن سعود کے زبردست حامیوں میں سے تھے اس لیے کہ اس نے محمد علی کے دشمن انگریز اور انگریز کے پروردہ شریفِ مکہ کے اثر سے سرزمینِ حجاز کو پاک کیا۔ تمام ہندی مسلمان بلا اختلاف ابن سعود کے اس اقدام سے متفق تھے۔ پھر جب سعودی حکومت نے قبوں پر ہاتھ صاف کیا تو دو گروہ ہو گئے۔ اہلِ حدیث کے ہاں تو خوشیاں ہو گئیں۔ لیکن صوفیوں، عام حنفیوں اور شیعوں کے ہاں صفِ ماتم بچھ گئی۔ اس تصادم نے زیادہ سے زیادہ شدت کی صورت اختیار کر لی۔ محمد علی سیاست میں بے شک غالی تھے لیکن مذہب میں اعتدال پسند تھے اور یہ غلو و اعتدال اپنے اپنے محل پر ٹھیک ہی تھا۔ آخر اس قبہ شکنی سے پیدا شدہ صورتِ حال نے محمد علی

بھی متاثر کیا، وہ ابن سعود کے خلاف لکھنے اور بولنے لگے۔ ظفر علی خاں ابن سعود کی حمایت میں سینہ سپر ہو گئے۔ دونوں طرف سے بہت گرما گرم نظم و نثر کے ہنگامے ظہور میں آئے۔ اس موقع پر مجھے ظفر علی خان کی روش اسلامی تعلیم کے موافق معلوم ہوئی۔ میں نے بھی محمد علی کے خلاف ابن سعود کی حمایت میں چند شعر لکھے جو زمیندار میں شائع ہوئے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد ہمدرد میں ایک ایک شعر پر مولانا محمد علی کی تنقید شائع ہوئی۔ انہوں نے حسب عادت بھی تنقید لکھی۔ اس وقت مجھے اپنا ایک مصرعہ بھی یاد نہیں نہ ہی تنقید کا کوئی حصہ ذہن میں رہ گیا۔ اتنا یاد ہے کہ اسی زمانے میں ایک نجدی سیاح توفیق شریف ابن سعود کی طرف سے ہندوستان میں وارد ہوا، اس نے ابن سعود کے حامی علماء و قائدین کی ہمت افزائی کی اور کچھ ہدیے تحفے بھی تقسیم کیے۔ مشہور اہل حدیث مولوی محمد علی میر واعظ مرحوم بھامڑی ثم امرت سری کے خلف الرشید عبدالرحمٰن طالب نے کسی مجلس میں میرے مذکورہ بالا اشعار کا ذکر توفیق شریف کے گوش گزار کیا، تو اُس نے میرے لیے بھی ایک جُبہ تجویز کیا۔ طالب صاحب نے کہا کہ عرشی مولوی ہے نہ صوفی، جُبہ اُس کے کس کام آئے گا؟ اس کے لیے دستار مناسب رہے گی۔ چنانچہ وہ بیش قیمت دستار مدتوں میرے زیر استعمال رہی۔

محمد علی کی فراست

محمد علی کی فراست کا ایک اور واقعہ یاد آگیا۔ امرت سر کا ایک شخص ڈاکٹر م۔ح۔ خالص اشتہاری ڈاکٹر، اشتہاری واعظ اور اشتہاری لیڈر تھا۔ اُس کی زبان میں جادو تھا۔ سامعین کے دل مٹھی میں لے لیتا تھا۔ ان آنکھیں اشک بار ہو جاتی تھیں ان کی جیبیں خالی کرا لیتا تھا۔ لیکن اس کی زندگی کا ہر شعبہ محض فراڈ تھا۔ سگریٹوں کی شکل میں چرس اور مکسچر کی صورت میں شراب جیب میں رکھتا تھا۔ دین اور اخلاق کا اس کی عملی زندگی پر سایہ بھی نہ پڑا تھا۔ ایک مرتبہ وہ اپنا "کاروباری" دورہ کرتے ہوئے محمد علی کے پاس جا پہنچا۔ چند اشتہار اور پمفلٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ امرت سر میں ایک تبلیغی ادارہ بزم توحید کے نام سے قائم ہوا ہے، چند مشاہیر کے نام لیے کہ وہ اس کے صدر و خازن وغیرہ ہیں اور بندہ اس کا سفیر ہے۔ چندہ فراہم کرنے کے لیے شہر بشہر دورہ کر رہا ہے" وغیرہ وغیرہ۔ محمد علی کو اپنی لسانی سے مسحور کرنے کی پوری کوشش کی۔ اُنہوں نے دوسرے وقت آنے کو کہہ کر رخصت کر دیا اور بذریعہ تار مولوی محمد عبداللہ منہاس (مرحوم) مدیر وکیل سے دریافت حال کی۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ "یہاں اس نام کی کوئی انجمن نہیں اور شخص مذکور مشہور جعل ساز ہے، اس سے مناسب برتاؤ کیجیے"۔ اگلے دن ڈاکٹر م۔ح دفتر کامریڈ میں محمد علی سے چندہ بٹورنے کی امید پر پہنچا تو پولیس کو موجود پایا۔ فوراً ہتھ کڑی لگ گئی حوالات میں داخل کیا گیا۔ امرت سر خبر پہنچی تو اس کے رشتہ داروں میں بھگدڑ مچ گئی۔ واقعہ کے جزئیات تو یاد نہیں۔ اتنا خیال ہے کہ کچھ دوڑ دھوپ اور کوشش کے بعد اس کی جان چھوٹی۔ اور پھر اُسی کاروبار میں منہمک ہو گیا۔

تنظیم کمیٹی

۲۵-۱۹۲۶ء کے لگ بھگ ڈاکٹر کچلو نے اپنی تنظیم کمیٹی کا آغاز کیا۔ اور اسی نام کا ایک روزنامہ جاری کیا۔ اس ضمن میں اُنہوں نے امرت سر میں آل مسلم پارٹیز کا ایک اجلاس بلایا جس میں محمد علی بھی شریک ہوئے۔ اجلاس اسلامیہ ہائی سکول کے ہال میں منعقد ہوا۔ میں نے محمد علی کی تقریر اول سے آخر تک سُنی۔ تقریر اُردو میں تھی۔ بہت جلدی جلدی بولتے

تھے ۔ میری سمجھ میں پوری طرح نہیں آرہا تھا کہ کیا کہتے ہیں ۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ میں سٹیج سے دور ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ اسی سلم تنظیم کی وجہ سے پچھلو صاحب گاندھی جی اور کانگریس کی نظریں ایسے معتوب ہوئے کہ پھر وہ پہلا سا مقام حاصل نہ کر سکے ۔

جب محمد علی کانگرس سے بیزار ہو کر خالص اسلامی پلیٹ فارم پر آ گئے تو متحدہ قومیت والے ان سے بیزار ہو گئے احرار آخر تک متحدہ قومیت کے علم بردار رہے ۔ انہوں نے محمد علی کو مسلمانوں کی نظر سے گرانے کی انتہائی کوشش کی۔ اور ان کے جلسوں کو ناکام بنانے اور اپنے حواریوں کی طرف سے ان کی تذلیل میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ۔۔۔۔ پھر جب مسجد شہید گنج کی تحریک میں احرار کا ستارہ غروب ہوا اور عوام میں ان کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی تو ان کے مخالفوں نے ان کو گرانے میں پورا زور صرف کر دیا۔ جا بجا ان پر آوازے کسے جاتے تھے ۔ اسی دوران میں ایک احراری قائد مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے محمد علی کے سامنے دل کا دکھ ظاہر کیا تو انہوں نے برجستہ کہا۔

" یہ لوگ تمہارے ہی سکھائے ہوئے تو ہیں ۔تم نے جو ہتھیار ان کو ہمارے خلاف چلانے کے لیے دیا تھا آج وہی تم پر چلا رہے ہیں ۔"

محمد علی اور مرتبۂ ولایت

خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ (مولد چاچڑاں ۔ مدفن کوٹ مٹھن) اعلیٰ درجہ کے شاعر اور مشہور صوفی ہیں ۔ ان کے دوہے اور کافیاں ملک بھر میں معروف و مقبول ہیں ، ان کے ایک دوہے کا سایہ سا ذہن میں رہ گیا ہے ۔

ڈکھاں دی میں چیج وچھائی ڈکھاں ہار بنائے
یار فرید او دکھ مبارک جنہاں دکھاں یار ملائے

یعنی میں نے دکھوں کا بستر عروسی بچھایا ، دکھوں کے ہار بنا کر گلے میں ڈالے ۔ اے فرید ! وہ دکھ مبارک ہیں جن کے ذریعے سے محبوب کا وصال میسر ہو ۔۔۔۔ نظیری نے بھی کہا ہے :۔

آں را کہ بود بہ سند نا ز
اول در زاریش کشد باز

پیر روم فرماتے ہیں :۔

چوں خدا خواہد کہ ماں یاری کند
میل مارا جانب زاری کند

قرآن مجید کی کئی آیات بھی اسی سوز و گداز کی تائید کر رہی ہیں ۔۔۔۔ علامہ اقبال کی زندگی کے آخری چند سال اسی حقیقت کی مشاہداتی شہادت پیش کرتے ہیں ۔ یہی چیز بدرجۂ کمال محمد علی کے ایام اسیری میں نظر آتی ہے ۔ ان پر

پے در پے مصائب کے پہاڑ ٹوٹے ۔ داخلی اور خارجی، ذاتی اور قومی دکھوں نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن اُن کی روح کے آئینے سے زنگ و غبار دور ہوتا گیا۔ وہ ایسی صاف و شفاف ہوتی گئی کہ عالم بالا کی تجلیات اس میں منعکس نظر آنے لگیں۔ ـــــ وہ ملک و قوم کی مجالس سے دور، احباب و اقارب سے جُدا اور اپنے اہلِ بیت سے مہجور یورپ میں طویل قید فرنگ کی سختیاں جھیل رہے ہیں۔ اولاد نرینہ ان کی قسمت میں نہ تھی۔ چار لڑکیاں تھیں جن سے بے حد محبت کرتے تھے۔ جواں سالی شادی شدہ آمنہ مرضِ دق میں مبتلا ہو گئی ــ کوئی علاج کارگر نہ ہوا۔ آخر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ مجبور و مقید باپ کو جیل کی چار دیواری میں اطلاع پہنچی۔ شاعر محمد علی، دردمند محمد علی، جذبات سے بھرے ہوئے محمد علی کی بے بسی اور اندوہ ناکی کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صدمات و آلام کے زینوں پر چڑھتے ہوئے معراجِ ربانی کی فضا میں رسائی حاصل کر چکے ہیں۔ اس وقت اُن کے قلب پر چند اشعار نازل ہوتے ہیں۔ جو شاعری سے ماورا کسی اور عالم کی خبر دے رہے ہیں۔ ان سطور کا لکھنے والا آج بھی ان میں وہی لذت و تازگی پاتا ہے جو آج سے ۴۳ سال پہلے حاصل ہوئی تھی۔ اور ان اشعار کی یہ روح افروز تازگی ہمیشہ ہی اللہ والوں کے قلوب و ارواح میں انس و عشق الٰہی کی حرارت بھڑکاتی رہے گی۔ اور ساتھ ہی تسلیم و رضا کا بہترین درس دیتی رہے گی۔

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی، وہ تو مگر دور نہیں
امتحاں سخت سہی، پر دلِ مومن ہی وہ کیا
جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں

اللہ اکبر! کیا ثبات اور کتنا استقلال ہے؟ یہ دولتِ سرمدی اولیاء اللہ ہی کا حصہ ہے۔

ہم کو تقدیرِ الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ
اہلِ تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں
تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

امید و رجا پر استقامت دیکھیے :-

تو تو مردوں کو جلا سکتا ہے قرآں میں کیا
تخرج الحی من المیت مذکور نہیں؟

محمد علی کی ولایت کے ساتھ ساتھ اُن کی قدرتِ کلام اور کمالِ فن بھی دیکھتے جائیے :-

تیری قدرت سے خدایا تیری رحمت نہیں کم
آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

آہ وہ دل، جس دل سے یہ شعلے شعروں کا روپ دھار کر نکل رہے ہیں :۔

میری اولاد کو بھی مجھ سے ملا دے یا رب!
تو ہی کہہ دے! تیری رحمت کا یہ دستور نہیں؟

لیکن وہ تو ارحم الراحمین ہونے کے ساتھ احکم الحاکمین اور علیم و حکیم بھی ہیں، ہمارا محدود علم ان کی اتھاہ حکمت کی گہرائیوں کے سامنے کیا حقیقت رکھتا ہے۔ وہاں تو پیغمبرانہ عظمتیں بھی سربسجود اور دم بخود نظر آتی ہیں ۔اس موقع پر شیخ شیراز کی زبان سے محزون و مغموم پیغمبر کنعان کی ایک واردات یاد آ رہی ہے :۔

یکے پرسید ازاں گم کردہ فرزند
کہ اے روشن گہر پیرِ خردمند!
ز مصرش بوئے پیراہن شنیدی
چرا در چاہِ کنعانش نہ دیدی؟
بگفت احوالِ ما برقِ جہان است
دمے پیدا و دیگر دم نہان است
گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینیم
گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینیم
اگر درویش بر حالے بماندے
سرِ دست از دو عالم برفشاندے

محمد علی نے جیل میں رہ کر جو اشعار کہے، وہ جیل سے باہر رہ کر وجود میں آ ہی نہیں سکتے تھے ۔اسی زمانے میں اُن کے اشعار ذیل شائع ہوئے جو ان کی جسمانی قید کے ساتھ روحانی عروج کی شہادت دے رہے ہیں :۔

تنہائی کے سب دن ہیں، تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں اُن سے، خلوت میں ملاقاتیں

"ہمدرد" اور "کامریڈ" کے دفتر میں ۔ ہنگاموں بھری زندگی میں ۔ اعزہ و اقربا اور ارادت مندوں کے ہجوم میں یہ روحانی دولت کہاں میسر آ سکتی ؟ اس کے لیے اُسوۂ یوسفی ہی کی راہوں سے گزرنا ضروری تھا :۔

ہر لحظہ تشفی ہے، ہر آن تسلی ہے
ہر وقت ہے دلجوئی، ہر دم ہیں مداراتیں

سبحان اللہ ۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب ۔ اے قصرِ امارت کے مکینو! اے ناز و نعمت کے پروردو!! تمہیں کیا خبر کہ "صبرِ جمیل" کی دنیا کے باشندے کس فردوسِ عافیت میں نوازے جاتے ہیں :۔

کوثر کے تقاضے ہیں، تسنیم کے وعدے ہیں
ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں

ایک سے ایک شعر قرب و وصال کے زینوں پر چڑھتا ہوا نظر آتا ہے

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں، اور ایسی کراماتیں

احساس عبدیت کی شدت ساتھ نہ رہے تو پھر معراج ہی کیا ــــ سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ الآیہ

بے مایہ ہیں لیکن، شاید وہ بلا بھیجیں
بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

محمد علی کا مرتبۂ شاعری

محمد علی نے شاعری کو اپنا پیشہ نہیں بنایا، لیکن اُنھوں نے جتنے شعر کہے، وہ فنی معیار پر کسی کہنہ مشق شاعر سے کم درجے کے نہیں۔ بالکل علامہ شبلی کی طرح جو مؤرخ تھے، متکلم تھے، فقیہ تھے، ادیب تھے، بہت کچھ تھے لیکن مولانا گرامی اور خواجہ عزیز لکھنوی کی طرح شاعری اُن کا اوڑھنا بچھونا نہیں تھی! تاہم فارسی کی ــــ تھوڑی سی غزلیں جو اُن کے قلم سے نکلیں ان مشہور و مسلّم استادوں کی غزل سے اُن کا پلہ بھاری ہے۔ محمد علی کی مختصر شاعری میں بھی ان کی روداد قلب، واردات زندگی اور فنی کمال ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔ دو ایک شعر اور سنیے :-

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

شاعری کی معراج یہ ہے کہ وہ "جزویست از پیغمبری" کی بلندی تک پہنچ جائے۔ اور یہ مرتبہ بہت کم شاعروں کو نصیب ہوا۔ جوہر بہت کم گو ہونے کے باوجود اس مرتبے پر پہنچے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کا یہ شعر الہامی پیشگوئی کا رتبہ حاصل کر چکا ہے :-

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اُس کی دین ہے جسے پروردگار دے

انبیائے قدیم کے مسلّمہ قبلے اور اسلام کے قبلۂ اول میں دفن ہونے کا شرف آج تک محمد علی کے سوا کسی کو حاصل نہ ہو سکا۔

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

آکسفرڈ کے گریجویٹ

مسٹر معظم علی، محمد علی کے برادر نسبتی ★ مولانا بننے سے پہلے مسٹر محمد علی

باغی عدالت کے کمرے میں

تصویر پر مولانا محمد علی نے دستخط اپنے قلم سے کیئے ہیں -

از مولانا عبدالقدوس ہاشمی (ندوی)
(مرکزی ادارۂ تحقیقات اسلامی (کراچی)

مولانا محمد علی

(ذاتی تأثرات)

مولانا محمد علی جوہر رحمہ اللہ تعالیٰ کو میں نے سب سے پہلی بار ۱۹۲۱ء میں دیکھا، اُس وقت میری عمر دس سال تھی، اور مدرسہ عالیہ مئو ناتھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ میں فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھتا تھا۔ تحریک خلافت اور ترک موالات کے ہنگاموں سے زمین و آسمان گونج رہے تھے شاید اسی سلسلہ کا ایک بڑا ہی عظیم الشان جلسہ ہوا، واقعی عظیم الشان، اتنا عظیم الشان کہ بوڑھے بڑا تے کہتے تھے اتنا بڑا جلسہ اس قصبہ میں تو کیا، اس سارے ضلع میں آج تک کہیں نہیں ہوا۔ یہ جلسہ قصبہ سے باہر ایک بڑے میدان میں منعقد ہوا تھا، بڑے اہتمام سے اس کے لیے اسٹیج بنایا گیا تھا اور بڑے اخلاص کے ساتھ مسلمانوں نے اسے سجایا تھا۔

نماز عشا کے بعد مرحوم علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا محمد علی مرحوم ایک ساتھ ہی جلسہ گاہ میں رونق افروز ہوئے، یہ لوگ چند ہی منٹ پہلے اعظم گڈھ سے مئو پہنچے تھے، اس جلسہ میں ان بزرگوں کو خیر مقدم کہنے کی خدمت جن بچے کے سپرد تھی وہ میں تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمتوں میں جگہ دے استاد مرحوم مولانا عبدالرحمٰن نے چند سطریں لکھ کر مجھے یاد کرا دی تھیں، اور میں نے شہ نشین پر کھڑے ہو کر وہ عبارت سنا دی، جب واپس آنے لگا تو مولانا محمد علی نے دونوں بازو پکڑ کر اُٹھا لیا، اور میری ٹوپی پر لگے ہوئے چاند کو دکھا کر بآواز بلند کہا، "چھوٹا سا خادم کعبہ"۔

اور آخری ملاقات مولانا مرحوم سے ریاست رام پور کے ریلوے اسٹیشن پر ہوئی ۱۹۳۰ء میں جب کہ مولانا گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے روانہ ہو رہے تھے، یہ اُن کا سفر خدمت بھی تھا، اور سفر آخرت بھی، ان کے عزیز و اقارب، شجاعت علی خاں، شاکر علی خاں اور شیخوں کے احاطہ کے بہت سے لوگ ان کو رخصت کرنے آئے تھے۔ ریاستوں کی دنیا بھی عجیب دنیا ہوتی ہے، مولانا محمد علی چونکہ کوئی سرکاری عہدہ دار نہ تھے اس لیے دربار سرکار سے تعلق رکھنے والا شاذ ہی اللہ کا کوئی نیک بندہ رہا ہو، اگرچہ مولانا محمد علی کی شخصیت پر فخر کرنے میں یہ لوگ بھی لذت محسوس کرتے تھے، اور بارہا ان کی محفلوں میں مولانا کے رامپوری ہونے پر اُن کو فخر کرتے ہوئے میں نے خود سنا ہے، لیکن کیا کیا جائے کہ درباری مزاج کی یہ خصوصیت ہے، ایک درباری کا دل کچھ بھی کہتا ہو، زبان اور عمل دربار کی نظر کے تابع ہوا کرتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔

ہر کلیہ کی طرح اس کلیہ میں بھی استثنا ہوتا ہے اور خود مولانا محمد علی سب سے بڑے استثنار تھے، تین پشتوں سے ان کا خاندان دربار رامپور سے وابستہ تھا، خود اُنھوں نے بھی ریاست رام پور کے وظیفہ پر تعلیم حاصل کی تھی، اُن کے سارے ہی عزیز و اقربا رام پور، اندور اور دوسری ریاستوں میں ملازم تھے۔ لیکن باایں ہمہ وہ خود درباریت سے بالکلیہ آزاد بلکہ ہر طرح اس رجس سے طاہر و مطہر تھے۔ ذہنی توازن اس قدر درست تھا کہ وہ بطور ردِ عمل ہر ریاست کے "خواہ مخواہ دشمن" بھی نہ تھے۔

یہ تو دیکھا گیا ہے کہ کسی خاص ماحول کا اثر اگر آدمی پر موافق نہ پڑ سکے تو ایک سخت قسم کا ذہنی ردِ عمل شروع ہو جاتا ہے اور ذہنی توازن باقی نہیں رہتا، یہودی سود خواروں کے ماحول میں پرورش پا کر ایک شخص یا تو لائیڈ جارج ہو سکتا ہے یا پھر اتنا سخت ردِ عمل اُس کے ذہن میں ہوگا کہ کارل مارکس ہو جائے گا، خود اپنے معاصرین میں دیکھیے بیسیوں مثالیں مشاہیر میں مل جائیں گی یا تو ماحول نے اُن پر اس طرح قابو پا لیا ہے کہ وہ اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، یا پھر اتنا سخت ردِ عمل ہوا ہے کہ نفرت نے اعتدالِ ذہنی کو ختم کر کے دوسرے کنارے پر کھڑا کر دیا ہے، ذہنی اعتدال بڑی حد تک مفقود ہو گیا ہے۔
لیکن مولانا محمد علی کا ذہن اس سلسلہ میں بڑا بے مثال تھا نہ وہ درباری اثرات کی وجہ سے اشرافیت کے غلام تھے اور نہ ردِ عمل کی وجہ سے اشتراکیت کے شیدا، وہ ایک مسلمان تھے، اور سراپا مسلمان، سچی بات یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی حقیقی تعریف صرف اسی لفظ سے ہو سکتی ہے کہ وہ افکار و اعمال میں ایک مسلمان تھے، اور یہ بہت بڑی بات ہے صدیوں میں ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جن کی تعریف میں یہ بات کہی جا سکے۔

سنہ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۰ء تک کے عرصہ میں مولانا مرحوم کو دیکھنے اور ایک ادنیٰ رضاکار کی حیثیت سے اُن کی خدمت بجا لانے کے بہت سے مواقع میسر آئے، دو تین بار سفر میں بھی ہمرکابی کا سفر حاصل ہوا، اُن کے افکارِ عالیہ، اُن کی غیر معمولی قابلیت، اُن کی جرأتِ ایمانی، خدام پر شفقت کی نظر، احکامِ شرعی کی پابندی، فراستِ ایمانی، اور ساری دنیا سے خصوصاً دنیائے اسلام سے اُن کی سچی ہمدردی، یہ وہ خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے ہر ملاقات کے بعد عقیدت میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔

مولانا محمد علی مرحوم کو بار بار دیکھنے اور اُن کے اعمال و افکار پر غور کرتے رہنے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ قیادت و زعامت کا ایک معیار ذہن میں قائم ہو گیا، ایسا معیار کہ پچھلے تیس بتیس سال کے عرصہ میں بہت سے مسلم و غیر مسلم قائدین کو دیکھا، اُن کے اعمال و افکار کا جائزہ لیا، نہ صرف جزیرہ نمائے پاک و ہند میں بلکہ دنیا کے بہت سے ممالک میں آنا جانا رہا، مگر اکثر بڑے بڑے نامور قائدین کو دیکھنے کے بعد جب اُن کو اپنے ذہنی معیار پر جانچا تو بے ساختہ یہ کہنا پڑا کہ ؎

جلوہ کوئی آنکھوں میں سماتا ہی نہیں ہے
اوروں کا کوئی ناز بھاتا ہی نہیں ہے

نام بنام تقابل اچھا نہیں، مختصراً یہ کہہ سکتا ہوں کہ سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد سے میری زندگی کا بڑا حصہ اس طرح گزرا ہے کہ کبھی میں سبھاش چندر بوس سے ملاقات کر رہا ہوں، اور کبھی مہاتما گاندھی کے آشرم میں مہمان بنا ہوا ہوں، کبھی نواب بہادر یار جنگ کا رفیقِ کار ہوں اور کبھی حسن البنا (مصری) کی خدمت میں حاضر، اسی طرح چین، ملایا، انڈونیشیا، تونس، الجیریا اور یورپین ممالک کے اکثر زعماء اور قائدین سے ملنے کا بھی موقع ملا۔ ان ممالک کا میں نے سفر کیا، اور اپنی صلاحیت کی حد تک وہاں کے حالات کا مطالعہ بھی کیا۔ کسی کا مرتبہ گھٹانا یا بڑھانا منظور نہیں، مگر میری رائے یہ ہے کہ مولانا محمد علی جوہر اپنے افکار و کردار کے اعتبار سے جس مرتبہ اعلیٰ پر تھے اُس سے قریب نہ پایا تو صرف تین قائدین کو پایا، دو تو ہم سے چھوٹ چکے صرف ایک بزرگ باقی ہیں، خدا بدیر سلامت رکھے، ان کے نام ظاہر کر دینا ضروری ہیں۔

(۱) حسن البنا شہید مصری۔

(۲) نواب بہادر یار جنگ شہید و کئی ۔

(۳) مفتی امین الحسینی متعنا اللہ بطول بقائہ

نہ مولانا محمد علی کوئی معصوم پیغمبر تھے اور نہ یہ لوگ معصوم ہیں، یقیناً نقائص اور کمزوریاں بھی آدمی میں ہوتی ہیں، دیکھنا یہ چاہیے کہ بحیثیت مجموعی ان لوگوں پر خیر اور نیکی کا تسلط کس حد تک ہے ۔ ان کے افکار و اعمال قرآن مجید کے اس پیمانہ پر کس حد تک صحیح ثابت ہوتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے کہ،

" کچھ سارا کمال اسی میں نہیں ہے کہ تم اپنا منہ مشرق کو کر لو
یا مغرب کو، البتہ یہ کمال ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر
قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، (اللہ کی) کتاب پر اور
(اللہ کے) نبیوں پر یقین رکھے اور اللہ کی محبت میں قرابت داروں کو
یتیموں کو، مسکینوں کو، مسافروں کو، سوال کرنے والوں کو
اور گردن چھڑانے کے لیے مال دے، نمازوں کی پابندی کرے
زکوٰۃ ادا کرے، جب عہد کرے تو عہد کو پورا کرے، تنگدستی
بیماری، اور خوف کے مقابلہ میں مستقل مزاج ہو۔ یہ وہ لوگ
ہیں جو سچے ہیں، اور یہی وہ لوگ ہیں جو متقی ہیں۔ "

(سورۃ البقرہ آیت ۱۷۷)

مسلمانوں کے لیے تو کسی فرد بشر کے اعمال و افکار کے جانچنے کا یہ خدائی پیمانہ ہے لیکن ایک غیر مسلم کے نزدیک بھی شائد اس سے بہتر پیمانہ اور کوئی نہ ہو، یہ پیمانہ تمام تر ایجابی امور پر مشتمل ہے، سلبی امور کا اس میں کہیں ذکر نہیں، مثلاً ہمسایہ کو دکھ نہ پہنچائے، کمزوروں کو نہ ستائے، حرام مال نہ کھائے، جاہ طلبی کے مرض میں مبتلا نہ ہو، شہرت کی تمنا میں بے تاب نہ ہوا کرے وغیرہ وغیرہ ۔ یہ وہ امور ہیں جو عموماً ایجابی امور کے ساتھ جمع نہیں ہوتے، اور فطرت انسانی بغیر کسی تعلیم و تربیت کے بھی ان کی برائیوں کی طرف ہر ذی ہوش کو متوجہ کر دیتی ہے، اس لیے ان کے بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہ تھی ۔

میں نے عام طور پر دو خرابیاں مسلم و غیر مسلم قائدین میں محسوس کی ہیں ۔

(۱) ذاتی یا سیاسی مصالح پر حق و صداقت کی قربانی

(۲) قول و عمل کے مابین شدید قسم کا تضاد

ممکن ہے کہ بعض لوگ انہیں خرابی نہیں بلکہ خوبی ہی قرار دیں، ہر شخص کو اپنی رائے کا اختیار حاصل ہے لیکن میری نظر میں یہ ایسی خرابیاں ہیں جو آدمی کو بے اعتبار اور ناقابل اعتماد بنا دیتی ہیں ۔

مثلاً آپ نے ہر عوامی لیڈر کی زبان سے یہ سنا ہوگا کہ اسے اپنی قوم کے دکھ درد سے اضطراب و بے چینی سی رہتی ہے، لیکن کیا یہ حقیقت واقعہ نہیں ہے کہ

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

جلسہ گاہ میں اضطراب و بے چینی کے الفاظ بولنے کے علاوہ شاید ہی کسی کو قوم کے دکھ درد کا احساس رہتا ہو، لیکن مولانا محمد علی مرحوم کا ایک واقعہ سنیے، میرے سامنے یہ واقعہ ہوا ہے۔
ایک دن پچھلی رات کو مولانا کی خواب گاہ سے روتے گڑگڑانے اور ہچکیوں کی آوازیں سنی گئیں، اور جب اس کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کی گئی تو معلوم یہ ہوا کہ مولانا سجدے میں پڑے ہوئے رو رو کر خداوند تعالےٰ سے فریاد کر رہے ہیں، اپنے لیے نہیں، اپنی اولاد کے لیے نہیں، بلکہ لیبیا میں مسلمانوں پر اطالیہ کی طرف سے جو دردناک مظالم ہو رہے ہیں، اس کی فریاد کر رہے ہیں۔
دوسرا واقعہ سنیے، مہاراجہ الور کی طرف سے مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے، مسلمان فریاد کرنے کو دہلی آتے ہیں، پریشان حال، بے خانماں، مولانا محمد علی اپنی بیماری کو بھول کر، مہاراجہ الور سے دوستانہ تعلقات کو نظر انداز کر کے، ہر خطرے سے بے پروا ہو کر، ان مسلمانوں کے دکھ درد میں شریک ہو جاتے ہیں، روتے جاتے ہیں، اپنا سکھ اور اپنا آرام قربان کر کے ان مسلمانوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ مہاراجہ کے مقرر کیے ہوئے لوگ مولانا محمد علی کی توہین کرتے ہیں حتیٰ کہ جان کی دھمکی دیتے ہیں لیکن محمد علی کو حقیقتاً اضطراب ہے اور واقعی بے چینی ہے۔ جلسہ گاہ میں اسٹیج پر بے چینی نہیں بلکہ حقیقی اضطراب و بے چینی، وہ ان دھمکیوں کی پروا نہیں کر سکتے تھے۔
تیسرا واقعہ سنیے، اندھیری رات ہے، بارش ہو رہی ہے، جمنا چڑھی ہوئی ہے، سیلاب، سیلاب، سیلاب! دہلی کے نشیبی حصوں میں قیامت بپا ہے۔ خبر گیری کا فرض تو حکومت پر عائد ہوتا ہے لیکن دہلی کے گشتہ اور کوتوال شہر کو جو شخص بار بار جھنجھوڑ کر امدادی کام پر تیار کر رہا ہے وہ ہے اللہ کا وہ بندہ جس کا نام دو مقدس اور محبوب ناموں کا مرکب ہے۔ محمد علی اور جو شخص شدید بخار میں مبتلا ہونے کے باوجود پانی میں بھیگتا ہوا ایک گروہ کو ساتھ لیے ہوئے سرکاری امداد پہنچنے سے پہلے ہی آفت رسیدہ سیلابیوں کی امداد کے لیے پہنچتا ہے وہ ہے محمد علی!
مولانا محمد علی کی ساری زندگی میں ایسے واقعات نہ جانے کتنے ہوں گے، لیکن ایک واقعہ اپنے ذاتی مفاد کو فراموش کر کے حق گوئی کا اور سن لیجیے، میں خود اس واقعہ کا بھی عینی شاہد ہوں۔
سلطان ابن سعود نے شریف علی کو شکست دے کر جب حجاز پر قبضہ کیا تو نجدیوں نے بہت سے مقبروں اور گنبدوں کو تعمیر ناجائز قرار دے کر مسمار کر دیا۔ ہندوستان میں اس کے خلاف آوازیں اٹھیں اور بڑے زور شور کے ساتھ اٹھیں، لکھنؤ میں ایک حجاز کانفرنس ہوئی۔ ہم لوگ ندوۃ العلماء کے طلبہ بھی تماشائی تھے۔ اس کانفرنس میں یاروں نے التوائے حج کی تحریک پاس کرنے کی کوشش کی، ان کی نظر میں یہ تجویز سلطان ابن سعود کے خلاف ایک مؤثر قدم تھا، مرحوم علامہ سید سلیمان ندوی نے اس تحریک کو ختم کرا دیا، اور اس کے خلاف بڑی سخت تقریر کی "حج ایک دینی فریضہ ہے اور یہ اس وقت تک ملتوی نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ راستہ سے گزرنا ممکن ہے"۔
اس کے بعد مہاراجہ محمود آباد نے شاہ برطانیہ کو تار دے دیا کہ گنبد خضرا کے انہدام کا خطرہ ہے آپ مسلمان رعایا کے

ہونے کی حیثیت سے اس خطرہ کو روکنے کے لیے قدم بڑھائیے۔ اس تار کی اطلاع ملتے ہی مولانا محمد علی نے بڑے ہی سخت الفاظ میں اس کی مخالفت کی، مولانا سے مہاراجہ کے تعلقات بہت اچھے تھے، مولانا کے مالی و ذاتی مفادات اُن سے وابستہ تھے۔ خود مہاراجہ صاحب کو بھی یہ یقین تھا کہ مولانا محمد علی اُن کے خلاف کچھ نہ کہیں گے۔ لیکن معاملہ برعکس نکلا، لکھنؤ میں مہاراجہ کے خلاف ایک جلسۂ عام ہونا قرار پایا، مولانا ظفر علی خاں مرحوم اور مولانا محمد علی سے سخت اختلافات تھے، پھر بھی مولانا محمد علی نے مولانا ظفر علی خاں کا ساتھ دیا، دونوں بزرگ لکھنؤ تشریف لے آئے۔

لکھنؤ شہر میں اور مہاراجہ محمود آباد کے خلاف جلسۂ عام؟ مہاراجہ کے نمک خواروں کی لکھنؤ میں کوئی کمی تھی؟ آستینیں چڑھ گئیں، چیلنج کیا گیا کہ جلسہ نہیں ہونے دیا جائے گا، ہم لوگ یعنی طلبا مولانا محمد علی کے ساتھ تھے، ہم نے جلسۂ عام منعقد کیا اور نہایت کامیاب جلسہ ہوا۔ مولانا محمد علی نے مہاراجہ کی اس حرکت کے خلاف بڑی سخت تقریر کی، اور مولانا ظفر علی خاں نے اپنی وہ فی البدیہہ کہی ہوئی نظم پڑھی جس کا ایک شعر ہے۔

حریم کعبہ پہ تثلیث کا اُڑے پرچم
یہ لکھنؤ سے نصاریٰ کو تار دیتے ہیں

پھر کیا ہوا مولانا محمد علی کو اپنی آمدنی کھونی پڑی۔ تعلقات خراب ہوئے، لیکن اللہ کے بندے کی پیشانی پر بل نہیں آیا۔ مولانا محمد علی مرحوم کی زندگی میں سینکڑوں ایسے مواقع آئے جہاں صادق و کاذب کا فرق ظاہر ہو جاتا ہے اور ان مواقع پر محمد علی صادق دکھائی دیے۔

مرحوم علامہ اقبال کا یہ شعر تو ہم سب نے پڑھا بھی اور سنا بھی

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

جلال و جبروت کے سامنے کھڑے ہو کر حق و بے باکی کو افضل الجہاد بھی کہا گیا ہے۔ لیکن یہ کچھ آسان کام نہیں ہے اچھے اچھے قدس سرہ العزیز حضرات کے لب و لہجہ میں ایسی نرمی پیدا ہو جاتی ہے کہ حق و صداقت کی آنکھوں سے خون کے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں، بے ادبی کی بات ہے ان بزرگوں کے اقوال کو مداہنت نہ کہیے لیکن تسامح اور بے جا لینت تو بہر حال کہا جائے گا۔ حقیقۃً یہ بڑا مشکل کام ہے کہ جلال و جبروت کے منہ پر تھوک کر حق و صدق کو زندہ رکھا جائے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُمتِ اسلامیہ میں ہر زمانہ میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے اور ان شاء اللہ پیدا ہوتے ہی رہیں گے لیکن ان خاصانِ خدا کی تعداد عہدِ صحابہ کے بعد سے روز بروز گھٹتی ہی جاتی ہے، تاریخِ اسلام نے عہدِ صحابہ و تابعین کے بعد چند بزرگوں کے نام اس سلسلہ میں محفوظ رکھے ہیں جن میں تین احمدوں کے اسمائے مبارکہ زیادہ کھلی ہیں۔

(۱) امامِ اہل السنت احمد بن حنبل المتوفی ۲۴۱ھ رحمہ اللہ

(۲) شیخ الاسلام احمد بن عبد الحلیم ابن تیمیہ المتوفی ۷۲۸ھ رحمۃ اللہ

(۳) حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الفِ ثانی المتوفی ۱۰۳۴ھ رحمہ اللہ

مولانا محمد علی جوہر مرحوم کی زندگی میں بھی ایسے چند مواقع آئے جہاں صداقت کا جلالِ شاہی سے مقابلہ پڑ گیا، یہ بڑے امتحان کا وقت تھا لیکن مولانا ان امتحانوں میں ہمیشہ پورے اُترے۔ ایک موقع تو ۱۹۲۶ء میں مکہ مکرمہ میں پیش آیا جب کہ ان کے لیے چپ رہ جانا اعزاز و اکرام کا سبب ہو سکتا تھا، اور حق گوئی و بے باکی میں اگر جان کا نہیں تو اعزاز و اکرام کے ضیاع کا خطرہ تھا ہی، بلکہ ذلت و حقارت کا خطرہ بھی موجود تھا جس سے حقیقتاً مولانا کو گذرنا پڑا، یہ تاریخی تقریر اس قدر مدلل آتی تلخ اور اس طرح حق گوئی کا کمال ہے کہ سارا مجمع انگشت بدنداں رہ گیا۔ دوسرا موقع گول میز کانفرنس کا لندن میں افتتاحی اجلاس ہے جہاں مولانا نے شاہِ برطانیہ کو وکٹوریہ کے پوتے کہہ کر مخاطب کیا ہے اور اپنی زندگی کی آخری تقریر کی ہے۔ یہ تقریر جہاں فصاحت و بلاغت کا بے مثال نمونہ ہے، خطابت اور زورِ بیاں کا شاہکار ہے وہاں حق گوئی و بے باکی کی ایسی مثال ہے کہ ہر زمانہ میں اس سے سبق حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اللہ اپنی رحمتِ فراواں میں جگہ دے، مولانا محمد علی مرحوم ایک اچھے مسلمان تھے، صحیح العقیدہ اور پابندِ اعمال، خوش اخلاق ہنس مکھ اور شفیق۔ وہ بہترین خطیب تھے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے، ایک اعلیٰ درجہ کے انشا پرداز تھے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے۔ ایک بہترین سخن سنج و سخن فہم تھے، اور ایک اچھے شاعر تھے، ایک مرتاض فقیر کا دل رکھتے تھے اور ایک صاحبِ تاج و کلاہ کا دماغ۔ وہ حاتم طائی کی طرح سخی تھے، اور حضرت ابوذر غفاری کی طرح بے درہم و دینار تھے۔ وہ عالموں کی طرح عبا پہنتے تھے، عابدوں کی طرح عبادت کیا کرتے تھے، انھوں نے قرآن مجید جیل میں حفظ کر لیا تھا۔ اور ان ساری خوبیوں کے ساتھ وہ لارڈ میکڈانلڈ سے بہتر انگریزی تقریر کرتے تھے اور ونسٹن چرچل سے بہتر انگریزی تحریر لکھتے تھے۔ انہیں کچھ دنوں تک قریب سے دیکھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ کمال کے پورے ایک شہر کو ایک محمد علی کی ذات میں سمو دیا ہے۔ وما ذٰلک علی اللہ بعزیز ❊

جناب عبدالرؤف صاحب عباسی
ایڈیٹر روزنامہ "حق"، لکھنؤ (بھارت)

مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ

نام کے برکات

سرور کائنات نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کا ارشاد گرامی ہے "کوئی شخص میری کنیت کو اپنے نام میں شامل نہ کرے۔ البتہ اگر اس کے ہاں دو بیٹے ہوں تو کم از کم ایک کے نام میں محمد ضرور ہو"۔

اسی ارشاد کی یہ برکت تھی کہ مولانا ایک مدت تک "مسٹر" رہنے کے باوجود (اپنی زندگی کے کسی دور میں) "محمد" کی برکت سے محروم نہ رہے، اور آخر میں جب مولانا ہوئے تب تو برکات کی بارش ہی ہونے لگی۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں کہ

سرور و کیف لا تحزن کو بشرے سے عیاں پایا
اسیر قید تنہائی کو مست و شادماں پایا

اسی سلسلہ میں اپنی دین داری کا اعلان یہ کہہ کر فرماتے ہیں

دار نے اک سگ دنیا کو دیا ہے یہ عروج
ہے فرشتوں میں بھی چرچا مری دینداری کا

اسی نام کی برکت تھی کہ جس نے اسلام کا شیدائی بنا کر گناہوں کی گرانباری سے گویا کہ بے خوف کر دیا تھا اور رحمت خداوندی سایہ افگن تھی۔ خود فرماتے ہیں۔

ڈر نہیں مجھ کو گناہوں کی گرانباری کا
تیری رحمت ہے سبب میری سبکساری کا

موصوف الصدر کو اتباع سنت کا خیال بدرجۂ اتم تھا، بیماری میں بھی کبھی صوم و صلوٰۃ سے غفلت نہیں برتی۔ علیہ الرحمۃ والرضوان،

مولانا کے نام کے بشمول تخلص تین اجزا ہیں اور تینوں اسم بامسمّٰی۔ نام محمد کی برکت۔ نام علی کی شجاعت، اور جوہر کی چمک آخر عمر تک قائم رہی، "علی" اللہ کا بھی نام ہے۔ اور سیدنا اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہٗ کا اسم مبارک بھی ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب بات کہی ہے۔

جوہرِ اعظم کہ شجاعت ز فضائل باشد
بہ علی آمدہ از فضلِ عمیم رحماں

یہی وہ فضل عمیم بشکل شجاعت و جرأت تھا کہ جس میں سوائے خدا کے خوف کے انسان کا خوف (خواہ وہ کسی مرتبہ کا

ہو) یہ ائے نام بھی نہ تھا، اکی شہادت ان کی زندگی (سیاسی ہو یا غیر سیاسی) پیش کرتی ہے، اور مہرِ دوام ثبت کر گئی ہے۔

دہلی کا قیام اور ہمدرد کا اجرا

اس مقالہ میں مجھے مولانا کی سیاسی زندگی کو پیش نہیں کرنا ہے کیونکہ وہ اظہر من الشمس ہے۔ اس کے علاوہ اس مبحث پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ بقول کہ :-

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں

بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

مجھے اس موقع پر اُن کے ایثار و کردار اور برگزیدہ اعمال کے چند نقوش پیش کرنے ہیں۔

مولانا مغفور کلکتہ کا قیام ترک کر کے جب دہلی آئے اور علاوہ کامریڈ (انگریزی روزنامہ) کے اُنہوں نے ایک اُردو اخبار "ہمدرد" کے نام سے نکالا۔ اس وقت پہلا کام یہ کیا کہ انگریزی لباس کلیۃً ترک کر کے اسلامی لباس اختیار کیا۔ یہ اقدام ایسا نہ تھا کہ آگے نہ بڑھتا، بڑھا، تیزی سے بڑھا اور بڑھتا ہی گیا۔ وضع میں یہ تبدیلی بھی اُن کے مذہبی جذبات کی آئینہ داری کرتی رہی۔

ہمدرد نے دہلی کے بُز قصابیوں کے مطالبہ کو صداقت پر مبنی پا کے۔ اُن کی ہمدردی کا بیڑا اُٹھایا۔ اس سلسلہ میں بُز قصابیوں سے جو ہڑتال کرائی وہ دہلی کی تاریخ میں یادگار رہے گی۔ یہ مکمل ہڑتال کامل ایک ماہ جاری رہی۔ دہلی میں گوشت کبریتِ احمر ہو گیا۔ دہلی والے گوشت کو ترس گئے۔ چند ہی افراد تھے کہ جو غازی آباد اور رہتک اور دیگر مضافات سے چُرا چھپا کے گوشت لے آتے تھے۔ ورنہ بیشتر صبر شکر کر کے بیٹھے رہے۔

عمالِ حکومت خصوصاً دہلی کا ڈپٹی کمشنر کہ جو اس وقت تک بخیال خود دہلی کا ڈکٹیٹر اور فعّال ما یرید تھا۔ اب حواس باختہ تھا۔ اُس نے ارادہ کیا کہ مولانا پر اسی نوعیت کا مقدمہ دائر کر دے کہ جیسا کامریڈ پر چل چکا تھا لیکن اُس کے انگریز قانونی مشیروں نے اُس کو اس غلط اقدام سے باز رکھا۔

آخر کار بُز قصابیوں کے مطالبات پورے کرنا پڑے، ہڑتال کامیابی سے ختم ہوئی اور حالات اعتدال پر آ گئے۔

اَلحُبُّ لِلّٰہِ وَالبُغضُ لِلّٰہِ

مولانا مغفور مغضوب الغضب ضرور تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ الحب للہ والبغض للہ پر کاربند تھے۔ ان کا غصہ و غضب بے سبب نہیں ہوتا تھا لیکن اگر سبب ہوتا تھا تو وہ جذبات سے مغلوب ہو جاتے تھے۔ خود فرماتے ہیں :-

دل و جاں سونپ چکے ہم تمہیں اے جانِ جہاں

اب ہمیں خوف ہے کیا اپنی گرفتاری کا

البغض للہ کی ایک روشن مثال

ہاپڑ کے مشہور پمفلٹ باز کی وہ دوست نوازی ہے کہ جو اُس نے خواجہ حسن نظامی کے خلاف استعمال کی۔ خواجہ صاحب مرحوم کے اور اس پمفلٹ باز کے باہمی تعلقات ایک عرصہ تک اتنے گہرے رہے ہیں کہ خواجہ صاحب اپنے تمام تر کارناموں کی اطلاع

"جوہر" ——— "علی برادران"
کراچی کے قیدی

وفد خلافت یورپ

★ مولانا محمد علی ★ سید حسن ★ سید سلیمان ندوی

وقتاً فوقتاً دیتے رہتے تھے۔ اور وہ اُن کو محفوظ رکھتا گیا۔ اب وہ وقت آیا کہ ایک معاملہ میں خواجہ صاحب سے مخالفت پیدا ہو گئی۔ پمفلٹ باز نے خواجہ صاحب کے کارناموں کی تفصیل جو دستاویزی شکل میں مرتب کر چکا تھا مولانا کو بھیج دی۔ مسئلہ ذاتی نہیں تھا۔ قومی اور ملکی تھا۔ مولانا کسی طرح نہ برداشت کر سکے تو وہ دستاویز کہ جو خواجہ صاحب کے کارناموں کا مرقع تھی، لے کر حکیم مسیح الملک رح کے سامنے رکھ دی اور کہا کہ یہ مراسلات ایسے نہیں ہیں کہ جو نظر انداز کیے جا سکیں۔ حکیم اجمل خاں سلیم الطبع، مرنجاں مرنج، ٹھوس کام کرنے والے بزرگ، اُنہوں نے بہت کچھ سمجھایا کہ لنا اعمالنا ولکم اعمالکم۔ خواجہ صاحب کا کردار ہمارے پیش نظر ہے، تم اس قصہ میں نہ پڑو۔ جو کام تم کر رہے ہو وہ بہت اہم ہے اُسی میں مصروف رہو۔ ترکِ موالات کی تحریک بہت دور رس ہے۔ اس میں پوری ہمت سے لگے رہو۔ لیکن مولانا مغفور نے ایک نہ سُنی اور ہمدرد کے کالموں کو افشائے راز کے لیے وقف کر دیا۔

اس کا جو نتیجہ ہوا وہ دنیا جانتی ہے، یہاں اس کی توضیح مزید بے محل ہے۔

مولانا کا ایک جعلی خط اور سی۔ آئی۔ ڈی

مولانا پر جو الزامات انگریزی حکومت عائد کر رہی تھی وہ روزافزوں تھے۔ الزامات صحیح بھی ہوتے تھے اور غلط بھی ہوتے تھے۔ ان کی تہ میں وہ جعل ہوتا تھا کہ جو سی۔ آئی۔ ڈی تصنیف کرتی رہتی تھی۔

چنانچہ مولانا کا ایک خط بنام حبیب اللہ خاں والی افغانستان پکڑا گیا۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ تحریکِ ترکِ موالات " اور خلافت پورے شباب پر تھی۔ اس خط میں گویا کہ امیر کو دعوت دی گئی تھی کہ ہندوستان پر حملہ کریں۔ اور یہ وعدہ بھی تھا کہ ہندوستانی مسلمان ہر امکانی امداد دیں گے۔

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کا جذبہ اور اس سلسلہ کا جوش و خروش مولانا کا رہینِ منت ہے۔ فرماتے ہیں کہ قید غلامی بدترین قید ہے۔ جذبۂ حصول آزادی کو یوں اُبھارتے ہیں :۔

قید ہے قید غلامی، دو برس کی قید کیا
دیکھو کب ہو خاتمہ اس قیدِ بے میعاد کا

ساتھ ہی ملک کی آزادی سے مایوس نہیں ہیں۔ فرماتے ہیں :۔

حق کے آتے ہی ہوا کعبے سے باطل رخصت
چند دن اَور ہیں دہلی میں بتانِ دہلی

بہر حال وہ خط وائسرائے نے گورنروں کی کونسل میں بغرض مشورہ رکھا اور مجرد سی آئی ڈی کے پیش کردہ خط پر کوئی کارروائی نہیں کی۔ اس کونسل میں پنجاب کا بدنام گورنر اوڈ ائر بھی تھا، اُس نے خط پڑھتے ہی کہہ دیا کہ " محمد علی کی یہ انگریزی نہیں ہے "۔

اسی ایک جملہ سے سی آئی ڈی کی بنائی ہوئی عمارت گر گئی اور اس کے افسر اعلیٰ کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔

اس جعل سازی کے دو مقصد تھے۔ ایک تو یہ کہ مولانا پر بغاوت کا مقدمہ چلے اور وہ دار پر کھینچ دیے جائیں دوسرے

ہندو مسلم اتحاد پر ضرب کاری لگے۔ یہی وہ چیز تھی کہ جس نے ہندوستان میں حکومت برطانیہ کی بنیادیں ہلا دی تھیں

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا۔

کی یہ زندہ مثال تھی۔

کانپور کی مسجد اور شہدائے کانپور

مولانا کا ارشاد ہے :-

سرور خلد میں ہیں شہیدان کانپور — ہوں گے شریک بزم شہیدان کلکتہ

شبلی سا شخص نوحہ گر کانپور تھا — لاریب آج تھا وہی شایان کلکتہ

کانپور کی مسجد کا ہنگامہ معمولی نہ تھا، برطانوی عہد کا یہ خونی واقعہ آج تک دنیا نہیں بھولی ہے۔ حکومت وقت نے اپنی بہیمانہ قوت صرف کر کے مسلمانوں کے اسلامی جذبہ کے ساتھ دل کھول کر ہولی کھیلی۔ نیچے سے اوپر تک سب ہی حکام انگریز تھے اور ایک دوسرے کے حامی و معاون، مسلمانوں کو قصور وار قرار دے دیا تھا، مسجد کی حرمت زیر بحث کیوں ہوتی مسلمین کی حکومت، گویا انصاف پر تلی تھی۔ چنانچہ یو۔ پی کے گورنر مسٹن (بعد میں لارڈ مسٹن) معائنہ موقع اور مشاہدۂ حالات کے لیے کانپور گئے۔ ایک معزز عہدہ دار کی روایت ہے کہ لارڈ صاحب ڈنر کی میز پر تھے کہ ان کے بیرے یا خانساماں نے ان سے کہا کہ "اس وقت کی گاڑی سے مسٹر محمد علی آ گئے ہیں۔ راوی کا بیان ہے کہ یہ سنتے ہی گورنر کے ہاتھ سے چمچہ چھوٹ گیا، گورنر کو اس حد تک مرعوب دیکھ کر خانساماں مسٹر محمد علی کے لیے پریشان ہو گیا۔ اس نے اسی وقت کسی نہ کسی ذریعہ سے مولانا سے یہ واقعہ کہلا کر یہ التجا کی کہ وہ اسی وقت کانپور سے چلے جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ حکومت کوئی حرکت مذبوحی کر گزرے۔ اور مولانا کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔

نفس الامر میں اس وقت تک کوئی عام تحریک حکومت کے خلاف شروع نہیں ہوئی تھی۔ بس اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ حالات عام تحریک کا پیش خیمہ تھے جس کے نتیجہ میں جیل بھر گئے۔ اور جس نے لوگوں کو گولیوں سے بے خوف اور جیلوں کا دلدادہ بنا دیا۔

عمومی تحریک ترک موالات اور تحریک خلافت

عوامی زبان میں مخالفت کو خلافت بھی کہہ دیتے ہیں۔ اس بنا پر تحریک خلافت کو اگر اس مفہوم میں لیا جائے تو دی تحریک ترک موالات ہو جاتی ہے۔ اس میں مبالغہ کا شائبہ بھی نہیں ہے کہ تحریک ترک موالات کو دل پسند عوام بنانے سہرا حضرت مولانا ہی کے سر رہتا ہے۔ انہی کی ذات گرامی تھی کہ جس نے اس کی گونج ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دی۔ اور بہ استثنا بعض اعتدال پسند یا انگریز پسند افراد کے ہر متنفس نے اس تحریک کو اپنا عقیدہ بنا کر انگریزوں کو ملک سے نکالنے کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیل خانے تنگ ہو گئے۔ درس گاہیں خالی ہو گئیں۔ عدالتوں سے وکیل غائب ہو گئے۔ تعلیمی بائیکاٹ کی کامیابی مولانائے مغفور کی رہین منت ہے۔ اس کی زندہ اور ترقی یافتہ یادگار جامعہ ملیہ دہلی دنیا کے سامنے موجود ہے۔

سنہ ۱۹۲۰ء کی ناگپور کی کانگریس اور داس محمد علی میں تبادلہ خیال:-

ہندوستان کی حصولِ آزادی کی جدوجہد کی تاریخ میں ناگپور کے اس اجلاس کانگریس کو ہمیشہ نمایاں جگہ ملے گی۔ اس میں وہ باغیانہ تجویز منظور ہوئی کہ جس میں "سایۂ برطانیہ" کا جنازہ بڑے شدومد سے اٹھایا گیا۔

اس میں بھی مولانا مغفور پہلے شخص تھے کہ جنہوں نے سب سے پہلے جنازہ کو کندھا دیا۔

کانگریس عقیدہ کا بنیادی پتھر "سایۂ برطانیہ" تھا، اس کو ہٹانے کا خیال کسی اعتدال پسند کے دماغ میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ بمبئی اور پونا وغیرہ کے علاوہ بنگال کی بہت بڑی جماعت مسٹر داس آر جہانی کی قیادت میں تبدیلی عقیدہ کی مخالف تھی جو اس کانگریس کے سامنے تھا۔ حکیم مسیح الملک، مولانا محمد علی اور دیگر ممتاز ہندو مسلم رہنمایانِ قوم پہنچ چکے تھے، بنگال کی جماعت کی آمد آمد تھی اور وہ بھی اس شہرت کے ساتھ کہ وہ اس عقیدہ کو بدلنے نہیں دیں گے۔ مسٹر داس و مولانا محمد علی آکسفورڈ یونیورسٹی میں ساتھ پڑھ چکے تھے باہمی تعلقات بہت شگفتہ تھے اس تقریب پر مولانا نے یہ بیڑا اٹھایا کہ وہ داس کو بہکنے نہیں دیں گے۔

مسٹر داس نے ناگپور ریلوے اسٹیشن پر قدم رکھا ہی تھا کہ شیر ہند پہنچ گیا۔ ان کی جادو بھری تقریر کا کرشمہ تھا کہ مسٹر داس مع اپنی جماعت کے مولانا کے ہم خیال ہو گئے۔ یعنی معتقدات کی تبدیلی کے حامی اور تجویز کے لیے اجلاس میں پاس ہو گئی اعتدال پسند افراد یا انگریزی حکومت کے جاں نثار ایک ایک کر کے کانگریس سے کنارہ کش ہو گئے۔

حضرت مولانا کا یہ کارنامہ صفحاتِ تاریخ میں آبِ زر سے لکھا رہے گا اور انصاف پسند افراد کے قلوب پر مرتسم رہے گا۔

گیا کانگریس اور موافق و مخالف جماعتوں کی تشکیل:-

گیا میں کانگریس کا اجلاس پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ کانگریس نے دوسری کروٹ لی جس نے لائحہ عمل میں تبدیلی کا رُخ اختیار کیا یعنی ترکِ موالات مع الموالات
کے نام سے مخالف و موافق جماعتوں کی تشکیل کی۔

مولانا مغفور اپنے مسلک سے ہٹنے والے کہاں تھے۔ انہوں نے اس تحریک کی کہ کونسلوں میں شریک ہو کر گورنمنٹ کی مخالفت کی جائے پوری قوت سے مخالفت کی۔

اسی موقع پر سوراجسٹ پارٹی نے جنم لیا۔ اور یہ جماعت الکشن لڑ کے کاؤنسلوں میں داخل ہوئی۔

دہلی کی سنٹرل اسمبلی کے اجلاس میں مولانا بھی تماش بینوں کی ممتاز گیلری میں موجود تھے۔ لابی میں پنڈت جی سے ملاقات ہوئی۔ مولانا عربی لباس اختیار کر چکے تھے۔

پنڈت جی نے بنظر تفنن کہا کہ مولانا اب تو عرب معلوم ہوتے ہیں" فوراً جواب دیا کہ پنڈت جی میں ایک مدت تک انگریزی لباس پہنتا رہا۔ وہی وضع قطع تھی اور وہی معاشرت۔ لیکن نہ تو کوئی مجھے انگریز سمجھا اور نہ کسی نے انگریز کہا۔ اس لباس کی برکت دیکھیے کہ آپ بھی مجھ کو عرب سمجھے حالانکہ ہوں ہندوستانی۔

لنڈن راؤنڈ ٹیبل کانفرنس، حضرت مولانا کی وفات اور بیت المقدس میں شرفِ تدفین :-

سنہ ۱۹۳۰ء کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لیے با دلِ ناخواستہ لندن جانا پڑا۔ سخت علالت کے باوجود یہ جوہ ناگزیر اس طویل اور آخری سفر کے لیے تیار ہو کر لندن پہنچے۔ جسمانی ضعف و نقاہت جذبات پر اثر انداز نہ ہو سکا۔ تقریر میں وہی قوت تھی، دل میں وہی جوش تھا کہ جو ہمیشہ اس مجاہدِ اعظم کا طرۂ امتیاز تھا۔ دورانِ تقریر میں فرمایا کہ "یا تو ملک کے لیے آزادی لے کر جاؤں گا ورنہ مر جاؤں گا"۔

مولانا کی دونوں باتیں صحیح نکلیں۔ تقدم و تاخر کا فرق رہا۔ یعنی ملک بھی آزاد ہوا اور خود بھی قیدِ عناصر سے آزاد ہو گئے لندن میں انتقال ہوا اور دفن ہوئے بیت المقدس میں اور وہ اپنی اس تمنا کو پہنچے جس کے متعلق کچھ عرصہ قبل فرما چکے تھے۔

چودہ برس جو قبلہ رہا ہے رسول کا
قیمت ہے اپنا خون اسی کی زمین کا

اسی موقع کے لیے اقبال رحہ نے فرمایا :-

خاکِ قدس اورا بآغوشِ تمنّا در گرفت
سوئے جنت رفت از راہے کہ پیغمبر گرفت

مولانا مغفور کی شاعری

مولانا ان شعرا میں تھے کہ جن کے متعلق قرآن پاک میں استثنا رہے اور عملِ صالح کا اعلان۔ موصوف کا رنگ شاعری میں بھی والہانہ ہے۔ اور ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد کا آئینہ دار۔ خلوص اور مذہب پر جاں نثاری کا جذبہ ہر مصرعہ کی جان ہے۔ نظر بندی اور قیدِ فرنگ میں ہر طرح کی تکالیف برداشت کیں لیکن قدم صراطِ مستقیم سے نہ ہٹنا تھا نہ ہٹا۔ چنانچہ پہلی ہی نظر بندی کے موقع پر فرماتے ہیں -

فیض سے تیرے ہی اے قیدِ فرنگ ۔۔۔ بال و پر نکلے قفس کے در کھلے
جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر ۔۔۔ مر کے جوہرؔ آپ کے جوہر کھلے

حدیثِ شریف ہے کہ لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق (جس میں خالق کی معصیت ہو اس میں مخلوق کی اطاعت نہ کرنی چاہیے -

مولانا مغفور کی تمام تر زندگی اس کا ثبوت ہے۔ انہوں نے کبھی مخلوق کے کسی ایسے فرد کی اطاعت نہیں کی کہ جس نے خالق کی معصیت کا ارتکاب کیا

کیا ہے معصیتِ رب میں طاعتِ مخلوق
نہ ہی جفا سے، ہماری وفا سے ہو نہ سکا

رب اغفر وارحم وانت خیر الرّاحمین -

از مولانا انتظام اللہ شہابی

محمد علی کی یاد

مولانا محمد علی اس صدی کے جوہر یگانہ تھے ۱۹۰۹ء سے آج تک ملک کے صدہا اکابر سے ملاقاتیں کیں۔ اکثر سے گہرے مراسم رہے۔ اور اب بھی ہیں۔ مگر مولانا کو پرکھا، بے مثل انسان پایا۔ تاریخ نویسی اور سیرت نگاری میں عمر بتائی صدہا کے احوال لکھے۔ علماء ہوں یا مشائخ۔ سیاست دان ہوں یا صاحب ہنر۔ مگر مولانا کا مختصر تذکرہ "مردم دیدہ" اور مشاہیر جنگ آزادی میں کر چکا ہوں۔ مولانا کی زندگی میں شائع ہوا۔ اور آخر الذکر ان کے وصال کے بعد (قرآن محل) سے۔

مولانا محترم بڑودہ میں ججی کے بعد ابیم کمشنر تھے، یہ ۱۹۰۹ء کا زمانہ تھا۔ اور میرے بھائی مہدی حسین اسسٹنٹ انجینئر اور جی ڈی ڈاگرہ ڈپٹی چیف انجینئر تھے۔ مولانا کی کوٹھی کے قریب مہدی بھائی کا بنگلہ تھا۔ دسمبر ۱۹۰۸ء میں راقم سطور مفتی محمد رمضان صدر مدرس مدرسہ عالیہ جامع مسجد آگرہ شاگرد مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے علوم عربیہ کی تحصیل سے فارغ ہو کر فن انجینیرنگ کی تحصیل کے لیے بڑودہ گیا۔ روڑکی کالج کی طرح "کا ایک ادارہ یہ ریاست میں قائم ہوا تھا۔ یہاں اردو اور گجراتی میں کورس تھا، سر دیر کلاس میں داخل کیا گیا۔

مہدی حسین میرے بہنوئی کے بھائی تھے ان کی والدہ چندہ بیگم نواب وندے خاں کی پوتی تھیں۔ ان کے والد منشی ولایت علی مراد آبادی گوالیار میں اسسٹنٹ انجینئر تھے۔

مہدی حسین نے میرے پہنچنے کے پندرہ یوم بعد اپنے عملے اور مقامی احباب کی تقریب دعوت کی۔ جو لوگ شریک ہوئے ان میں ایک صاحب بہادر نما تھے دوسرے لوگ اپنے اپنے لباس میں تھے۔ میر نواب علی ایم اے نواب صدرالدین حسن خان، نواب قطب الدین خان، سیٹھ آدم جی، حکیم امداد علی، حکیم احتشام علی۔ چھوٹو میاں مہدوی فرقہ کے پیر۔ دادا بھائی پیر جی۔ جو جسٹس طیب جی کے قریبی عزیز تھے۔ صوفی عنایت اللہ۔ غرضیکہ ایک اچھی خاصی یہ صحبت تھی۔ مہدی بھائی نے ہر ایک سے راقم سطور کو ملایا۔ مگر میری کم عمری کی وجہ سے کسی نے بھی منہ نہ لگایا۔ البتہ حکیم امداد علی اور نواب صدرالدین حسن خان نے دو چار رسمی باتیں کیں۔ مگر میں مولانا محمد علی کی طرف دیکھتا اور تمنا کرتا کہ ان سے بھی گفتگو کا موقعہ ملے۔ آخرش دعوت ختم ہوئی۔ سب حضرات رخصت ہو گئے۔ اتوار کے روز نواب صدرالدین خاں نے مدعو کیا۔ مہدی حسن کے ساتھ راقم الحروف بھی گیا۔ وہاں نواب صاحب نے اپنے پاس مولانا محمد علی کے سامنے بٹھایا۔ کھانا کھانے میں بات چیت ہو رہی تھی۔ آدم جی سیٹھ

کا مذاق اڑ رہا تھا۔ عموماً گداگر کو کچھ دیتے تو ارد گرد کے لوگوں پر نظر ڈال لیتے۔ ان کی اس سخاوت کا ذکر چھڑا ہوا تھا میں نے ادباً نواب صاحب سے عرض کیا کہ اس سلسلہ میں ایک واقعہ میں بھی گذارش کردوں۔ یہ سن کر تمام بزرگ میری طرف متوجہ ہو گئے۔ میں نے عرض کیا کہ جس اجڑی نگری کا میں رہنے والا ہوں وہاں ایک بزرگ مرزا حاتم علی بیگ متخلص بہ مہر ناسخ کے شاگرد رہتے تھے ان کے یہاں ماہوار محفل مشاعرہ منعقد ہوتی۔ ایک مشاعرہ کا یہ واقعہ ہے۔ کالے خاں سفلی جن کا معاشی مشغلہ عرضی نویسی تھا اتفاقاً جس دن مشاعرہ تھا اس دن ان کی چلتے وقت تک جیب خالی رہی، مگر مشاعرہ کی شرکت کے دھنی تھے۔ دیوانی کچہری سے مہر کے مکان واقع کنڈہ خان خاناں پہنچے۔ مہر صاحب ہر آنے والے کا خیر مقدم کر رہے تھے ان کو جو دیکھا مغموم پایا۔ ہاتھ پکڑ کر باتوں میں لگا لیا۔ اور ملازم سے کہا قلم دان لاؤ۔ وہ لایا۔ اس میں سے دو روپیہ نکال کر ان کو نذر کیے اور محفل تک ان کو ہمراہ لے گئے۔ ہر ایک کی نظر مرزا مہر پہ پڑنے لگی۔ سفلی بھانپ گئے کہ سخاوت و دریادلی کا مظاہرہ میرے ساتھ کیا گیا ہے۔ محفل میں قدم رکھتے ہوئے سفلی نے بآواز بلند یہ شعر پڑھا ؎

سفلہ نے رکھ کے ہاتھ پہ زر دے دیا تو کیا
اہل کرم کی چلتی ہے مٹھی بندھی ہوئی

تمام محفل میں قہقہہ پڑا۔ مرزا مہر نادم سے ہو گئے۔ اور جو شال اوڑھے ہوئے تھے وہ سفلی کے کندھے پر ڈال دی۔ یہ واقعہ سنا کر آدم سیٹھ سے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ آپ کی طرف روئے سخن نہیں ہے بلکہ لطف صحبت کے لیے بزرگوں کے سامنے یہ واقعہ عرض کیا گیا۔ مگر تمام ہم صحبتوں نے اس سے حظ اٹھایا آدم جی مجھ سے چند سال بڑے تھے وہ تو دوست بن گئے۔ مولانا محمد علی اور نواب صاحب نے اس دن سے ہم پر نوازشیں شروع کر دیں۔ مولانا جب کبھی احباب کی دعوت کرتے خصوصیت سے مدعو فرماتے۔ نواب صدرالدین خاں نے پلیسن روڈ پر اردو کا کتب خانہ قائم کیا تھا۔ اس میں سات ہزار کتب اس وقت تھیں۔ روزانہ شام کو پہنچا کرتا۔ مولانا اور مہدی حسن کلب جاتے۔

ایک دن عنایت اللہ بن ساز نے مدعو کیا۔ مولانا بھی اس صحبت میں شریک تھے۔ ان کا بنگلہ چار دیواری کے اندر تھا۔ درمیان میں حوض تھا۔ ارد گرد باغیچہ۔ دو ہرن کے بچے بھی پلے ہوئے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد حوض کے قریب کرسیاں بچھا دی گئیں۔ اور چوکی پر خود عنایت اللہ بیٹھے، انہوں نے بین بجائی تو ہرن تک چوکڑی بھول گئے۔ ایک طرف حوض پہ آکر کھڑے ہو گئے۔ مہاراجہ گائیکواڑ ان کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ راقم الحروف اتوار کے دن بلانے پر ان کے یہاں اکثر جایا کرتا۔ بڑی شفقت سے پیش آتے۔ ان کے ایک قدیم ملازم جو مجھ کو لینے آیا کرتے ان سے ان کا حال میں نے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ میاں کسی سے کہنا مت۔ ان کے باپ کے زمانہ سے میں ان کی خدمت میں رہتا ہوں۔ ان کے والد کلکتہ میں رہتے تھے۔ اور یہ ٹیپو سلطان کے پرپوتے ہیں۔ معقول ان کی تعلیم ہوئی ہے۔ اوائل عمر ہی سے ستار اور بین کا شوق ہے۔ چنانچہ ایک عرصہ

صوفی عنایت اللہ کے نام سے منادی میں ان کا ذکر پڑھا۔ بلکہ فرانس و انگلستان وغیرہ میں صوفی ازم کے منادتھے۔ آخر عمر میں دلی آ گئے۔ وہیں وفات ہوئی۔

۱۹۱۱ء کے لگ بھگ مولانا محمد علی کلکتہ گئے۔ کامریڈ نکالا۔ جب دہلی میں ہمدرد نکالا میں بھی دلی گیا اور ان سے ملا۔ ہر دو بھائی آخر عمر تک عزیزانہ تعلق رکھتے رہے۔ ایک عرصہ تک کوچہ سعد اللہ میں ڈپٹی محتشم الدین کے مکان میں رہا۔ اس میں میرے چچا مقیم تھے۔ خدام کعبہ اور خلافت کی تحریک میرے سامنے پروان چڑھی۔ مولانا کا دور عروج بھی دیکھا۔ خواجہ حسن نظامی اور مولانا کا قضیہ نامرضیہ بھی میرے سامنے پیش آیا۔ مگر مولانا کا سا استغنا اور قومی خدمت کا ولولہ کسی لیڈر میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ جذباتی بہت تھے۔ آخر عمر میں اللہ اور اس کے رسول کے فداکار بن گئے تھے۔ آگرہ میں مولانا سے ملنے گیا قرول باغ میں قیام تھا۔ جس وقت ان کے دولت کدہ پر پہنچا۔ مولانا آزاد سبحانی بھی اس وقت سواری سے اترے مولانا ورانڈے میں آ گئے۔ مجھے گلے سے لگایا میں نے دیکھا کہ مولانا کا لباس گاڑھے کا اور ملگجا سا تھا۔ میری آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ فرمانے لگے۔ اچھے میاں زندگی میں جو دور آتے اسے خوش وقتی سے گذار دیئے۔ اس کے بعد پھر زیارت کا موقعہ نہ ملا۔ مولانا آزاد سے کہا مولانا آپ کے آنے کے کچھ پہلے پنڈت جواہر لال اور ان کے ساتھ کئی کانگرسی تھے۔ جواہر لال پیر دبا دبا کر اپنی بات منوا رہے تھے لیکن میں نے انکار کر دیا۔ زندگی کے یہ چند واقعہ ہیں۔ جنہیں کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔

انتظام اللہ شہابی

خاک پروانوں کی تھی بس اور لگن میں کچھ نہ تھا
صبح کے ہوتے ہی ہوتے انجمن میں کچھ نہ تھا

(رنشاد)

از غلام احمد فرقت کاکوروی

رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم

رئیس الاحرار مولانا محمد علی کو پہلی بار میں نے ۱۹۲۱ء میں لکھنؤ رفاہ عام کے ایک جلسہ میں دیکھا تھا۔ میں اُس وقت اسکول میں پڑھتا تھا۔ مگر والد صاحب کا انتقال ایسے ناگہانی حالات میں ہوا کہ بھائی بہنوں اور والدہ کی کفالت کے لیے انھوں نے کوئی اثاثہ بھی نہ چھوڑا تھا۔ اس لیے مجھے شہر کے گلی کوچوں میں بطور ہاکر اخبار حقیقت بیچنا پڑتا تھا۔ جس سے میرے تعلیمی اخراجات اور گھر میں کھانے پکانے کا کام چلتا تھا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو نہ پڑھ پاتا اور نہ گھر کا ٹبر چل پاتا۔ اخبار حقیقت یوں تو اس وقت ہفتہ وار تھا۔ مگر جس روز ملک میں کوئی غیر معمولی سیاسی ہنگامہ ہو جاتا اس روز سویرے سے شام اس کا ضمیمہ شایع ہوتا اور کھٹیوں کی طرح ایک ایک پیسہ میں شہر بھر میں بک جاتا۔ انیس احمد عباسی اس کے پروپرائٹر تھے۔ اور حکیم رفیق احمد تسنیم علوی کاکوروی اس کے ایڈیٹر تھے۔ جو انیس احمد صاحب عباسی کے چچا زاد بھائی تھے۔ مجھے چار آنہ روپیہ کمیشن ملتا تھا۔ سویرے ۵ بجے سے ۱۰ بجے دن تک اخبار بیچتا اور اسکول چلا جاتا۔ اور وہاں سے واپسی پر اگر شام کو بھی کوئی ضمیمہ نکلتا تو اُسے دس گیارہ بجے رات تک بیچتا۔ اس میں بھی ڈیڑھ دو روپیہ ل ہی جاتے۔ اس زمانہ کے دو ڈھائی روپیہ اس دور کی گرانی کے پیش نظر بارہ چودہ روپیہ سے کم نہ تھے۔ کیونکہ سولہ سیر گیہوں اور دو آنہ چھ پیسے گز لٹھا بکتا تھا۔ اس زمانہ میں خلافت کا وہ زور تھا کہ ملک کے ذرہ ذرہ سے جان بیٹا خلافت پہ دے دو کی آوازیں بلند ہوتی تھیں۔ رفاہ عام کے جس جلسہ کا میں نے شروع میں ذکر کیا ہے وہ ایک بہت بڑے پنڈال میں ہو رہا تھا۔ اس میں جو محبان وطن شریک تھے۔ ان میں مہاتما گاندھی۔ مولانا شوکت علی محمد علی، بی امان۔ سی۔ آر داس۔ ڈاکٹر انصاری، کستوربا بائی۔ چودھری خلیق الزمان، مولانا عبدالباری فرنگی محلی مرحوم وغیرہ شریک تھے۔ رفاہ عام میں اب بھی وہ املی کا پیڑ موجود ہے۔ جس کے نیچے یہ پنڈال بنا تھا۔ اور اب بھی جب لکھنؤ جاتا ہوں اور اُدھر سے گزرتا ہوں تو بہت سے سیاسی محبان وطن کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ رفاہ عام کے پھاٹک پر جگہ جگہ الاؤ جل رہے تھے جس میں بدیسی کپڑوں کو لوگ اتار اتار کر نذر آتش کرتے اور چہار طرف مجمع کھڑا تالیاں بجاتا۔ دروازہ پر پولیس کے تلنگے کھڑے مسکراتے۔ اُسی دن شام کو میں نے اپنا ایک امریکن پرانا کوٹ جسے میں نے نخاس سے ڈیڑھ روپے میں خریدا تھا مارے جوش کے آگ میں جھونک دیا تھا۔ اس پر مجھے یاد پڑتا ہے کہ بہت سے لوگوں نے از راہ ہمدردی میرے بہت سے پرچے خرید لیے تھے۔ اسٹیج پر بیچ میں بی اماں ایک رومال سر پر باندھے

بیٹھی تھیں۔ ان کے بغل میں کستورا بائی اور گرد و پیش ڈائس پر دوسرے لیڈر بیٹھے تھے۔ میں نے مہاتما گاندھی اور مولانا محمد علی اور شوکت علی کو پہلی بار دیکھا تھا۔ مولانا مرحوم اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی ٹوپیاں پہنے تھے۔ ان پر ہلال بنا ہوا تھا کوئی دس گیارہ بجے رات کا وقت ہوگا کہ اچانک پنڈال سے فلک شگاف نعرہ ہائے تکبیر کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں اور مجمع میں بے حد جوش و خروش بڑھ گیا۔ اس وقت نعروں کی گونج میں مولانا محمد علی مرحوم ڈائس پر تشریف لا رہے تھے۔ اپنی ابتدائی تقریر میں مولانا نے ہندو مسلم اتحاد ان کے روابط پر زور دیا۔ اس کے بعد جب وہ برطانوی سیاست کے تار پود بکھیرنے پر آئے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کسی سنسان جنگل میں ایک شیر دہاڑ رہا ہے۔ درمیان میں مجمع کا جوش و خروش اس منزل پر پہنچ چکا تھا کہ کئی کئی منٹ تک پنڈال نعرہ ہائے تکبیر اور علی برادران زندہ باد کے نعروں سے اس طرح گونجنے لگتا کہ بعض اوقات یہ خطرہ محسوس ہوتا کہ کہیں پنڈال ہوا میں نہ اڑنے لگے۔ جب مولانا کی تقریر اپنے پورے شباب پر تھی تو ایک طرف سے آوازیں آنا شروع ہوئیں کہ ”سنائی نہیں دے رہا ہے“۔ اس پر مولانا نے ڈپٹ کر کہا کہ جن لوگوں تک میری آواز نہیں پہنچ رہی ہے ان کے کانوں میں برطانوی حکومت کی مہریں لگی ہیں۔ وہ میری تقریر کبھی نہ سن سکیں گے۔ لہٰذا خاموش ہوجائیں۔ اس کے بعد پورا پنڈال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ مولانا بار بار اپنے چہرے سے پسینہ پونچھتے جاتے تھے اور آوازیں زیادہ سے زیادہ چڑھاؤ اور کرختگی پیدا ہوتی جاتی تھی۔ انہوں نے کامل سوا گھنٹہ تقریر کی۔ ان کی تقریر کے ایک ایک فقرے کو سی۔ آئی۔ ڈی والے اگلی صف میں اور بعض بیچ جلسے میں بیٹھے نوٹ کر رہے تھے۔ بس یہ پہلی اور آخری تقریر تھی جو میں نے ان کی سنی اور انہیں قریب سے دیکھا اس کے بعد کراچی میں علی برادران اور دوسرے راہ نماؤں کی گرفتاری کے بعد جو رفاہ عام میں جلسے ہوئے ان میں ان دونوں بھائیوں کو کبھی ساتھ نہیں دیکھا۔ مولانا شوکت علی سے بعد میں سنہ ۳۷ء میں بار ہا ملاقاتیں ہوئیں۔ ان سے باتیں بھی ہوئیں۔ اور بحثیں بھی۔ مگر مولانا محمد علی سے میری بالمشافہ کبھی ملاقات نہ ہوئی۔ کیونکہ سنہ ۲۹ء میں جب لندن میں گول میز کانفرنس میں تقریر کرنے کے بعد ان کا انتقال ہوا تو میں اخبار میں تھا۔ البتہ مولانا شوکت علی مرحوم سے باقاعدہ میری ملاقات سنہ ۳۷ء کے جنرل الیکشن کے موقع پر محلہ صجنیا باغ کے ایک جلسہ میں ہوئی۔ مولانا شوکت علی اس وقت نہایت کٹر قسم کے مسلم لیگ کے حامی ہوچکے تھے۔ اور ہم لوگ پورے جوش و خروش کے ساتھ مسٹر رفیع احمد قدوائی کی قیادت میں کانگریس میں شریک تھے۔ سنہ ۳۷ء کا الیکشن ہندوستان کی تاریخ میں ان معنوں میں ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ کہ ملک بھر میں جو الیکشن لڑے جارہے تھے۔ ان کے نتائج سے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت کانگرس کی حامی ہے یا ہندوستانی مسلمانوں کی صحیح نمائندگی مسلم لیگ کر رہی ہے۔ یوں تو اس الیکشن میں متعدد نشستیں ایسی تھیں۔ جن کو حاصل کرنے کے لیے مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ اور نہ صرف ان کے حاصل کرنے کے لیے روپیہ ہی پانی کی طرح لنڈھایا جارہا تھا بلکہ ہر دو فریق کے لیڈروں نے بقول شخصے پوٹے ٹیک دیئے تھے۔ انہیں اہم نشستوں میں ایک زنانی نشست لکھنؤ کی تھی۔ جہاں انیس احمد عباسی ایڈیٹر حقیقت کی حقیقی سالی بیگم ماجدہ بانو اور بیگم حبیب اللہ کا مقابلہ تھا۔ جس کو حاصل کرنے کی زبردست کوشش تھی۔ بیگم ماجدہ بانو کانگرس کے ٹکٹ پر کھڑی ہوئی تھیں اور بیگم حبیب اللہ مسلم لیگ کی امیدوار

نہیں۔ عالم یہ تھا کہ راجہ صاحب محمود آباد۔ اور مولانا شوکت علی اور دوسرے مسلم لیگی رہنما کلام پاک ہاتھوں پہ لیے جلسہ گاہ میں۔ اور لوگوں کے گھروں پر فرداً فرداً جاتے اور کہتے کہ اس وقت الیکشن کا سوال نہیں ہے۔ بلکہ کلام ربانی کی عزت کا سوال ہے۔ جس میں مولانا شوکت علی مرحوم کا تو یہ عالم تھا کہ وہ مولانا محمد علی مرحوم کی روح کا واسطہ بھی مسلمانوں کو دیتے جاتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ محلہ سجدیا باغ میں جب ماجدہ بانو کی حمایت میں ایک زبردست جلسہ ہونے والا تھا۔ اس جلسہ میں مجھے بھی تقریر کرنا تھی۔ جلسہ شروع ہونے سے قبل مولانا شوکت علی بھی پہنچ گئے۔ ان کے گلے میں کلام پاک پڑا تھا۔ وہ میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہنے لگے۔ میرے بھائی! تم مجھے جانتے ہو کہ میں محمد علی کا بڑا بھائی ہوں۔ آج میرے چھوٹے بھائی کی روح عالم بالا سے تمہارے ووٹ کی طالب ہے۔"

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ بات محمد علی مرحوم سے شروع ہوئی تھی اور مولانا شوکت علی کے توسط سے ۱۹۳۷ء کے الیکشن تک پہنچ گئی۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مولانا محمد علی کو صرف میں نے ایک ہی بار دیکھا تھا اور اُن کی تقریر بھی رفاہ عام کے جلسے میں پہلی اور آخری بار سنی تھی۔ مگر اس تقریر سے میں اس درجہ متاثر تھا کہ گھر پر آکر میں اور میرے پھوپھی زاد بھائی حافظ محمد داؤد خلف مولانا ظفر الملک علوی مرحوم دونوں ایک مونڈھے پہ یکے بعد دیگرے ڈٹ کر اُسی انداز میں گھر میں عورتوں کے سامنے اور محلے میں دوکانوں کے سامنے تقریریں کرتے اور مولانا کے لب و لہجہ کی نقل اتارنے کی کوشش کرتے۔

۱۹۳۱ء میں جب میں حقیقت اخبار میں آگیا۔ اور جس اخبار کو گلی کوچوں میں بیچتا تھا اُسی کا جوائنٹ ایڈیٹر ہوگیا۔ تو اس کے بعد نہایت باقاعدگی کے ساتھ میں نے تمام سیاسی لیڈروں کی زندگی کا مطالعہ کیا۔ چونکہ مولانا ظفر الملک علوی مرحوم میرے حقیقی پھوپھا تھے اور وہ مولانا محمد علی مرحوم کی بہت سی باتیں بیان کرتے تھے۔ اس لیے وہ اکثر مولانا کے بارے میں بھی بہت سی دلچسپ باتیں بتاتے تھے۔

مولانا محمد علی مرحوم اگر ایک طرف حد درجہ جذباتی تھے تو دوسری طرف بے حد بذلہ سنج اور خوش مزاج بھی تھے۔ چنانچہ اکثر لیڈروں پر ان کی پھبتیاں بہت مشہور ہیں۔ مولانا ظفر الملک علوی ایک خاص وضع اور مزاج کے انسان تھے مولانا محمد علی مرحوم کو ان کے سیاسی نظریات سے اس وجہ سے اختلاف تھا کہ وہ حد درجہ ضدی واقع ہوئے تھے۔ مقصد یہ کہ جس بات کو وہ ایک بار صحیح سمجھ لیتے تھے اسے آخر دم تک صحیح سمجھتے تھے۔ جن لوگوں نے انہیں قریب سے دیکھا ہے وہ ان کے اس کٹرپن سے بخوبی واقف ہیں۔ چنانچہ مولانا محمد علی ان کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ عام لوگ تو انا الحق کے قائل ہیں مگر مولانا خود الحق مُر ہیں۔ اسی طرح ان کا ایک دوسرا لطیفہ مشہور ہے کہ مولانا ظفر الملک صاحب ایک جلسہ میں جس میں مولانا محمد علی بھی شریک تھے۔ جب سر پہ سبز پگڑی اور روئی کا سبز لبادہ پہنے پہنچے۔ تو مولانا محمد علی نے دیکھتے ہی کہا کہ یہاں یہ ہریل کہاں سے آگیا۔

اسی طرح مسٹر ضیاء الدین برنی نے اپنے ایک مضمون میں مولانا محمد علی کے لطائف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ "حکومت ہند میں ایک زمانہ میں سرڈین برے ہوم ممبر تھے۔ اپنے اخبار کامریڈ میں محمد علی نے لکھا "کون کہتا ہے کہ اسمبلی میں

گدھے نہیں ہوتے۔ وہاں بھی ایک گدھا ہے کیا تم نے اُسے (Bray) یعنی رینگتے نہیں سنا۔ یہ مذاق لندن ٹائمس میں بھی نقل ہوا تھا۔

مولانا کے غیر معمولی حافظہ کے بارے میں مسلم کلب لکھنؤ کے ایک جلسہ میں مولانا صبغت اللہ شہید انصاری فرنگی محلی نے جب سید جالب دہلوی سے درخواست کی کہ وہ حقہ کی ایجاد پر روشنی ڈالیں تو سید صاحب نے اپنی انتہائی انکساری ظاہر کرتے ہوئے حقہ کی ایجاد پر ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کرنے کے بعد اور مختلف وضع کے حقوں کی ایجاد اور کوئلوں کی قسمیں بتاتے ہوئے کہا کہ میرا حافظہ اس قدر کمزور ہے کہ مجھے کچھ یاد نہیں رہتا۔ لیکن حافظہ تو مولانا محمد علی کا ہے۔ جنہیں وہ سب کتابیں حفظ ہی نہیں ہو جاتیں جنہیں وہ ایک مرتبہ پڑھ لیتے ہیں بلکہ اُن کتابوں کے صفحے اور سطریں تک یاد رہتی ہیں۔ چنانچہ فرمایا کہ مولانا نے ایک مرتبہ سید صاحب سے امریکن کول مائنس پر مضمون لکھنے کو کہا تو سید صاحب نے فرمایا کہ امریکہ کی کوئلے کی کانوں کے بارے میں ان کے معلومات بہت محدود ہیں۔ اس پر مولانا محمد علی نے اُنہیں کئی کتابوں کے نام بتاتے ہوئے وہ صفحات بھی بتائے جہاں کوئلوں کی خصوصیات کے بارے میں مصنف نے تفصیل سے لکھا تھا۔

خود مولانا نے جو اپنی سوانح حیات لکھی ہے۔ اس میں بھی اُنہوں نے بڑے دلچسپ انداز میں اپنے بچپن کے واقعات لکھے ہیں۔ جن میں ایک عجیب وغریب بات بی اماں (والدہ محمد علی) کے بارے میں لکھی ہے کہ اُنہوں نے شادی کے بعد اردو کیسے پڑھی۔ اور ان کا کس بلا کا حافظہ تھا۔ مولانا محمد علی مرحوم کے والد ایک پرانی وضع کے انسان تھے۔ جس کی وجہ سے ان کے گھر کا ماحول بھی بے حد رجعت پسندانہ تھا۔ مسلمان گھروں میں اس دور میں لڑکیوں کو صرف عربی میں کلام پاک پڑھا دیا جاتا تھا یا مذہبی باتیں زبانی بتا دی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ ناول یا افسانوں کی اُردو کتاب بھی اُن تک نہیں پہنچ پاتی تھی۔ مولانا محمد علی کے والد باوجود سخت رجعت پسند ہونے کے ہر قسم کی اُردو فارسی، عربی اور انگریزی کی کتابیں پڑھتے تھے۔ اور چونکہ گھر سے خوش حال تھے اس لیے سارا وقت یا تو مطالعہ میں گذرتا تھا یا دوست احباب سے بیٹھک میں مذہبی امور پر بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک دن ایسا ہوا کہ وہ اردو کا کوئی ناول پڑھ رہے تھے کہ پڑھتے پڑھتے شب کی نشست برخاست ہونے کے بعد زنان خانہ میں اس خیال سے لے آئے کہ سونے سے قبل وہ اُسے پڑھ کر ختم کر دیں گے۔ مگر وہ رات میں اُسے پڑھ نہ سکے اور سویرے اپنے ہمراہ اُسے لے جانا بھی بھول گئے۔ دوسرے روز مولانا کے چچازاد بھائی نے جب وہ کتاب دیکھی تو وہ ایک اُردو ناول تھا۔ اُنہوں نے بی اماں کو اُس کے بعض اقتباسات سنائے جو بے حد دلچسپ تھے۔ اور جو بی اماں کو بھی بہت اچھے معلوم ہوئے۔ اس کے بعد رات کو جب بی اماں سو گئیں تو سوتے میں اُن کے منہ سے اُس کتاب کے وہی اقتباسات من وعن نکلنا شروع ہوئے۔ اتفاق سے مولانا کے والد اس وقت جاگ رہے تھے۔ اُنہوں نے جب سوتے میں بیوی کے مُنہ سے اُردو ناول کے وہ اقتباسات سنے تو دنگ ہو کر رہ گئے۔ بعد میں بی۔ اماں نے مولانا کے چچازاد بھائی سے شوہر سے چھپ کر اتنی اُردو پڑھ لی تھی کہ شوہر کی زندگی ہی میں ٹوٹی پھوٹی اُردو

لکھنے پڑھنے لگی تھیں۔ پھر بعد میں تو انہوں نے باقاعدہ اردو پڑھی۔ اور تحریک خلافت میں جب وہ شریک ہوئیں تو ان کا شمار اچھے قسم کے مقرروں میں کیا جاتا تھا۔

محمد علی جتنے بڑے صاحب علم تھے ویسے ہی صاحب کردار بھی تھے۔ چنانچہ جب دلی میں خواجہ حسن نظامی پر گولی چلی اور اتفاقاً اُن کے خسر اس سے شہید ہو گئے تو پولیس نے تحقیقات میں بہت کچھ لیت و لعل سے کام لیا۔ بھیا احسان الحق جو خواجہ حسن نظامی اور مولانا محمد علی دونوں کے دوست تھے۔ سیدھے محمد علی کے پاس پہنچے۔ اور انہیں صورت حال بتائی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب خواجہ صاحب اور محمد علی میں قلمی جنگ ہو رہی تھی۔ لیکن ذاتی تعصبات کو بالائے طاق رکھ کر انہوں نے دہلی کے ڈپٹی کمشنر بیڈن سے ٹیلیفون پہ ایک گھنٹہ تک گفتگو کی۔ اور انہیں معاملے کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا اور زور دیا کہ اس قتل کی پوری پوری تحقیق کی جائے۔ اور مجرموں کو قرار واقعی سزا دی جائے

محمد علی کے کیر کٹر کی اس بلندی کا ذکر آج بھی ان کے ان دوستوں کی زبان پر ہے۔ جو ابھی حیات ہیں۔

افسوس ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں آزادی وطن کے اس مجاہد کو اس طرح فراموش کر رکھا ہے کہ جیسے اس نام کا کوئی انسان ہی نہیں گذرا۔ مگر آج بھی فضاؤں میں اُس کی وہ تقریر محفوظ ہے۔ جس میں اس نے کہا تھا کہ وہ ایک غلام ملک میں اب سانس لینا بھی اپنی توہین سمجھتا ہے۔ اور ایک آزاد ملک میں مرے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ انہوں نے ایک آزاد ہی ملک میں اپنی جان اپنے مالک حقیقی کے سپرد کر دی ۔؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

غلام احمد فرقت کاکوروی
۱۷۰۵ پہاڑی بھوجلہ ۔ دلی
۹ مارچ ۶۳ء

سیونگ بنک اکاؤنٹ (بچت حساب)

شرح منافع : ۳ فی صد

برآمدگی کی رقم : بذریعہ چیک

اپنا بچت حساب کھولیے

اور

دیگر تفصیلات کے لیے

دی پاکستان انڈسٹریل کوآپریٹو بنک لمیٹڈ سے رجوع کریں

(براہ راست حکومت کے محاسبہ میں)

چلت حساب — کرنٹ اکاؤنٹ

میعادی حساب — فکسڈ ڈپازٹ

ہیڈ آفس : سنلائٹ بلڈنگ دی مال لاہور، فون ۴۳۶۸ / ۳۱۶۶

برانچ لاہور : سرکلر روڈ۔ دہلی گیٹ فون ۴۶۳۲

برانچ لائلپور : گول کلاتھ مارکیٹ لائل پور فون ۲۵۴۵

PRESTIGE

مغربی پاکستان کے دار الخلافہ

لاہور سے

صنعتی مرکز سیالکوٹ اور زراعتی مرکز لائل پور

کے لیے

ڈسٹرکٹ ٹرانسپورٹ کوآپریٹو سوسائٹی

کی

نئی اور آرام دہ اور دل کش جہازی بسوں میں وقت کی پابندی اور با اخلاق سٹاف کی رہنمائی اور نگرانی میں پوری دل جمعی کے ساتھ روزانہ سفر کریں۔

یہی بسیں سیالکوٹ کے تمام ضلع تحصیلوں اور مشہور تاریخی قصبات

پسرور، ڈسکہ، نارووال، ظفروال، سمبڑیال، وزیر آباد اور

حافظ آباد میں بھی باقاعدہ پہنچاتی ہیں۔ مفصلہ ذیل ٹیلیفونوں پر سوسائٹی کے ذمہ دار افسران اور کارندے عوام کی خدمت کے لیے موجود ہیں۔

چیئرمین	سکرٹری	منیجر ورکشاپ	ٹریفک منیجر جنرل اسٹینڈ	ٹریفک منیجر گوجرانوالہ	ٹریفک منیجر لائل پور	ٹریفک منیجر ڈسکہ	ٹریفک منیجر سیالکوٹ
3582	2676	2564	2899	2323	2959	55	90

المشتہر

شیخ حسام الدین چیئرمین ڈسٹرکٹ ٹرانسپورٹ کوآپریٹو سوسائٹی بیرون شاہ عالم گیٹ لاہور

نزلہ زکام کھانسی کی زود اثر دوا

جوشاندی

جوشاندی
سالہا سال سے نزلہ زکام کے مریضوں کو فائدہ پہنچا رہی ہے

نہ جوش دینے کی قباحت —— نہ چھاننے کی ضرورت
صرف ایک پیالی تیز گرم پانی میں دو ٹکیاں ملا کر استعمال کریں۔

صدیوں کے آزمودہ جوشاندے کی ترقی یافتہ شکل
جس میں جوشاندے کے تمام تر فوائد موجود ہیں

ہر موسم میں استعمال ہوتی ہے

ہر جگہ ملتی ہے

دواخانہ حکیم اجمل خان لاہور، کراچی، پشاور

اوراقِ پارینہ

اس عنوان کے تحت محمد علی اور کہیں کہیں شوکت علی کے بھی وہ احوال اور واقعات درج کیے جا رہے ہیں جو آج سے تقریباً ۳۵-۴۰ سال پہلے شائع ہوئے تھے، اور اب اتنے نادر ہیں کہ کبریتِ احمر کا حکم رکھتے ہیں، ان میں وہ مقالات بھی شامل ہیں جو محمد علی کے دوستوں اور ساتھیوں نے تحریر فرمائے تھے اور جو نتیجہ تھے ذاتی تاثرات و مشاہدات کا! نیز "سیرتِ محمد علی" کے بعض پہلو جو خصوصی حیثیت رکھتے ہیں شامل ہیں۔

★

محمد علی کی یاد میں

(از سید محفوظ علی بی اے بدایونی)

محمد علی کا اور میرا سامنا سب سے پہلے ۱۸۸۹ء میں ہوا جب ان کی عمر دس برس کی تھی اور وہ ذوالفقار بھائی، نوازش مرحوم اور شوکت، اپنے ان حقیقی بھائیوں اشتیاق اور امجد اپنے عزیزوں کے ساتھ بریلی اسکول میں پڑھنے آئے اور بورڈنگ ہاؤس میں میرے کمرے سے دو کمرے چھوڑ کر مقیم ہوئے۔ دو برس بعد وہ شوکت کی معیت میں علی گڑھ چلے گئے جہاں ۹۴ء میں میں بھی پہنچا۔ اور پھر ساتھ ہوا۔ ۹۵ء میں میں فارغ ہو کر علی گڑھ سے چلا آیا اور دو تین سال بعد انہوں نے بی اے کیا۔ ولایت گئے اور واپس آئے ۱۹۰۲ء میں جب وہ بڑودہ میں تھے، ہم دونوں پھر ملے اور عرصہ تک بمبئی میں ——— دو ایک دن ایک ہی جگہ قیام ہوتا رہا۔ اس کے بعد ستمبر ۱۹۱۲ء سے یعنی جب سے کامریڈ دہلی آیا نظر بندی کے وقت تک ۲۴ گھنٹہ یکجائی رہی للذا میں کہہ سکتا ہوں کہ محمد علی کی کتاب زندگی، لمحہ اول کے دس، اور بیچ کے دس گیارہ اوراق چھوڑ کر میرے پیش نظر ہے بلکہ اس کے اکثر باب میرے سامنے رکھے گئے ہیں۔

لیکن میں یہاں نہ اس کتاب کی تلخیص لکھنا چاہتا ہوں نہ اس پر نقد و تبصرہ بلکہ اپنے ایک نہایت ہی عزیز بھائی کی تربت پر محبت کے پھول چڑھانا چاہتا ہوں۔

محمد علی اوائل عمر میں بظاہر ان جذبات عالم سے بیگانہ نظر آتے تھے جنہوں نے آگے چل کر محمد علی کو محمد علی بنا دیا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ ذرہ جو بیابان اور وہ قطرہ جو سمندر بن کر ساری دنیا کو اپنے حدود کے پنہاں اور اپنے ساحل کی آغوش میں سمیٹ لینے والا تھا شروع ہی سے ان کے دل کے کسی غیر آباد گوشے میں خاموش پرورش پا رہا تھا۔

جب وہ ولایت روانہ ہوئے تو ان کے دماغ پر عقل مآل اندیش کا قبضہ تھا مگر ان کے دل پر عشق مصلحت ناشناس کا غلبہ اور ان کے مستقبل کی تشکیل میں دونوں کی رقابت و منافرت کار فرما تھی۔ عقل کی رائے تھی کہ وہ مسٹر ایم علی آئی سی ایس بنائے جائیں مگر عشق کی صلاح تھی کہ رئیس الاحرار مولانا حاجی محمد علی بنیں۔ عقل کی مرضی تھی کہ وہ انصاف کی کرسی پر بٹھائے جائیں مگر عشق کی خوشی تھی کہ الزام کے کٹہرے میں کھڑے ہوں۔ عقل نے انہیں سزا دینے کا طریقہ بتایا مگر عشق نے انہیں سزا پانے کا سلیقہ سکھا نا چاہا۔ عقل نے ان کے لیے جج کا چغہ اور وزارت کا خلعت مگر عشق نے جیل کا کرتا اور صبح کا احرام پہنانا چاہا۔ عقل کا مشورہ تھا کہ بریڈلا اور رانگر سال کے زمرہ کا شاگردی میں مگر عشق کا حکم کہ اویس رضؓ و بلال رضؓ کے حلقۂ غلامی میں آئیں۔ غرض عقل کا فیصلہ تھا کہ وہ

نہیں مگر عشق کا فتویٰ ہی کہ شہید ہوں، اس کشاکش میں پایان کار عشق ہی کامیاب ہوا - یعنی محمد علی سول سروس کے امتحان میں ناکامیاب ہوئے یہ اس میدان کی پہلی فتح اور اس حکمت کا پہلا سبق تھا۔ آگے آگے دیکھئے۔

اندکے اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

آپ سمجھے کہ یہ کس کا عشق تھا؟ ابتدا میں شاید محمد علی بھی نہ سمجھے ہوں گے۔ یہ عشق تھا اسلام کا، خدمت و نصرت دین کا، امت مرحوم کی حفاظت ناموس کا، ایک مسلمان کی صلاح و فلاح اور سود و بہبود کا، اس کے ایک معمولی اشارہ نے بڑودہ کی ملازمت سے پہلے برداشتہ خاطر اور بیزار کیا۔ مجھے اس کی تفصیل عرض کرنے کی اجازت دیجئے۔ انگریزی گورنمنٹ کے ایک سابق اعلیٰ عہدہ دار اور ملک کے مشہور مصنف، ادیب اور سیاسی مؤرخ برادر وطن، بڑودہ کے رکن حکومت مقرر ہو کر یورپ ویس سے آئے۔ ایک موقع سے دوران گفتگو میں سلطنت مغلیہ کا تذکرہ چھیڑا۔ رکن حکومت نے اسی کوتاہ نظری بلکہ بے بصری سے جو یورپی مؤرخوں کی بنائی ہوئی عینک کا خاصہ ہے مارشمن جین اور الفنسٹن کے (بدعت مطاعن) اورنگ زیب علیہ الرحمۃ کے ظلم و تعصب کے افسانے گنانے شروع کئے۔ محمد علی کہ جو علامہ شبلی مرحوم کے مضامین عالمگیر پڑھ چکے تھے، یارائے ضبط کہاں، فوراً الجھ پڑے اور متکلم و مخاطب کے تفاوت درجات کو ٹھکرا کر وہ دنداں شکن بحث کی کہ مخالف کو نہ صرف خاموش ہونا پڑا بلکہ قبولنا پڑا۔ اس کی دسترس اصل فارسی تاریخوں تک تھی۔ جو اس مبحث پر سب سے زیادہ قابل وثوق و استدلال ہیں (محمد علی نے چاہا تھا کہ اورنگ زیب کے عہد کی مفصل تاریخ یا کم از کم ان کی سوانح عمری لکھیں چنانچہ کچھ مواد بھی فراہم کیا اور نوٹ بھی لکھے مگر سیاسیات کی آندھی میں یہ سب تنکے اڑ گئے۔

بحث کی تلخی سے دونوں میں اس درجہ بدمزگی بڑھ گئی تھی کہ رکن حکومت کی کدورت اور محمد علی کی بددلی میں اضافہ ہی ہوتا رہا جس کا اظہار مرحوم اکثر کیا کرتے تھے۔ میرے پاس ان کے خطوط کا سرمایہ تھا جس کا زیادہ حصہ میری عمر کی طرح بے پروائی کی نذر ہو گیا۔ اب جو تھوڑے سے رہ گئے ہیں وہ بہت زیادہ عزیز اور قابل قدر ہیں۔ ۱۴ جنوری ۱۹۱۰ء کے ایک خط میں فرماتے ہیں۔

"تمہارے جانے کے بعد یہ ہوا کہ کونسل نے باتفاق رائے فیصلہ کیا کہ افیون کی کاشت میں کمی کے مسٹر محمد علی کس طرح جواب دہ نہیں ہیں اس کے بعد میں نے اپنی ترقی کی درخواست دی، ٹالم ٹالا ہوتی رہی۔ اس عرصہ میں مسٹر . . . . (رکن حکومت) کا نزول ہوا۔ (اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ) ان کی رائے میری ترقی کے خلاف ہوئی۔ اس لیے مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ اس عرصہ میں ٹائمز آف انڈیا میں چند مضامین میرے شائع ہوئے جن میں مسلمانوں کے حقوق کی پیروی کی گئی تھی اور مسٹر . . . کی دوستی نما دشمنی کا پردہ فاش کیا گیا تھا مسٹر (رکن حکومت) سخت ناراض ہوئے اور میرا جواب طلب کیا گیا میں نے جواب بقدر دنداں شکن دیا کہ کچھ بن پڑی کونسل میں جواب پیش ہوا اور کچھ نتیجہ نہ نکلا، سوا اس کے کہ ایک عام سرکلر شائع کیا جائے اور وہ بھی تنبیہ کہ سرکاری عہدہ داروں کو ایسے مضامین لکھنا مناسب نہیں ہیں جن کی وجہ سے مختلف مذاہب و اقوام میں مخالفت پیدا ہو . . . .
ریاست سے سخت بیزار ہوں . . . . نوکری سے بیزار ہوں . . . . موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟"

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ریاست سے بیزاری، نوکری سے بیزاری، یہاں تک کہ زندگی سے بیزاری، بالآخر یہ دنیا سے برداشتہ خاطری کیوں؟ کیا صاف نظر نہیں آتا کہ کوئی مصلحت ناشناسی تعلقات کی بیڑیوں کو کاٹ کر معلوم، متعارف و مستعمل شاہراہ سے جبراً ہٹا کر کسی نامعلوم و نادیدہ راستہ پر چلانا اور کسی نئی جگہ پہنچانا چاہتا ہے۔؟

اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

یہ خط مجھے وطن میں ملا تھا چونکہ اصرار اور تقاضے سے بلایا تھا لہٰذا نوساری پہنچا۔ ملاقات ہوئی۔ وہی دکھڑا، وہی ملازمت سے بیزاری اور وہی رکیک حکومت کے خلاف شکوہ مسلم بیزاری، ان جدید کوششوں اور نئی امیدوں کے متعلق بھی گفتگو ہوئی جو نظر کے سامنے پھول کھلا رہی تھیں اور جس کا خط میں تذکرہ تھا۔ نوساری سے بمبئی آئے۔ ٹائمز کے دفتر میں گئے۔ ایڈیٹر نے ان کے مضامین کی داد دے کر کہا "مسٹر محمد علی اب اپنے قلم سے کام لیتے اور ہمیں مدد دیتے رہیں۔ یہ تو ہم کہہ کیسے کہہ سکیں کہ آپ ہمارے اسٹاف میں آجائیں مگر یہ کہہ سکتے ہیں کہ جہاں رہیں ہمیں قلمی امداد دیتے رہیں۔ ہم خدمت کو حاضر ہیں۔" آفس سے باہر نکل کر کہنے لگے "بھائی سنا کیا کہتا تھا؟" میں نے جواب دیا

"ہاں سنا، جب نوکری سے اتنا بیزار ہو تو چھوڑ چھاڑ کر اپنا اخبار کیوں نہیں نکالتے، خدا جانے یہ الفاظ قبولیت کا وقت تک کر اور اجازت وعدہ لے کر آئے تھے۔ ادھر زبان سے نکلے اور ادھر دل میں بیٹھ گئے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے دل میں پہلے ہی سے یہ خیال ہو۔ بہرکیف راستہ بھر یہی باتیں رہیں کہ مذہب اور ملک کی خدمت کا ایک زبردست اور موثر ذریعہ اخبار ہے اور جب قلم پر پوری قدرت بھی اور طبیعت کو مناسبت بھی ہے تو اسی ذریعہ سے خدمت کیوں نہ کی جائے۔ گھر پہنچ کر بھی سونے کے وقت تک یہی باتیں رہیں۔ دوسری صبح کو دروازے سے قدم باہر رکھتے ہی یہ منصوبہ بھی خیال کے احاطہ سے نکل کر عمل کی سرحد میں داخل ہو گیا۔ ابھی ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار کے اخراجات کا اندازہ کرنے کے لیے جان ڈکینسن کمپنی کے یہاں گئے۔ اس شام کو مسٹر محمد علی اپنے عزم راسخ میں، دنیاوی بہشت کو دوزخ میں ڈال کر اپنی ہستی کو اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر چکے تھے۔ کامریڈ تو عرصہ کے انتظار اور پورے انتظام کے بعد کہیں کلکتہ سے نکلا مگر مجھے فخر ہے کہ مذہب و ملک و ملت کی خدمت کے میدان میں محمد علی کا سب سے پہلا قدم جو اٹھا وہ غریب خانہ ہی سے اٹھا یعنی انگریزی اخبار نکالنے کی تصمیم وہیں سے ہوئی۔

اس کے بعد ملازمت سے بوضع تنخواہ رخصت لی۔ جو استعفےٰ کی محض نظر فریب شکل تھی، مذہب و ملک کی خدمت کے لیے کمر باندھی، کلکتے گئے۔ کامریڈ نکالا، دہلی آئے، کامریڈ کے ساتھ ہمدرد جاری کیا۔ جنگ طرابلس میں چندہ فراہم کیا۔ بلقان میں طبی مشن بھیجا، انجمن خدام کعبہ کی بنیاد ڈالی۔ مسجد کانپور کے سلسلہ میں ولایت گئے۔ نظربند ہوئے، قید ہوئے اخبار بند کرایا، گھر بار لٹایا، حاجی ہوئے اور آخر میں دار الکفر میں جان دے کر، دار الایمان اور مدینۃ الانبیاء میں زندگی جاوید پائی۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کس طرح اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را۔

بڑودہ، بمبئی کلکتہ اور دہلی میں مرحوم خفیف سی علالت میں بھی دیار غیر میں مارا وطن سے دور مار کر بے کسی کی شرم رکھ لینے پر غالب کے الفاظ میں خدا کا ہمیشگی شکر ادا کیا کرتے تھے۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ موت دیار غیر ہی میں آئی۔ جہاں بے کسی کی شرم رہ گئی۔ کیونکہ سوائے چند خاص عزیزوں کے نہ وہاں ہم نشین تھے، نہ ہم زبان اور نہ تیمار دار تھے نہ نوحہ خواں۔ مگر اس دیار غیر میں جا کا جنازہ جس دھوم سے نکلا تھا اور شبیہہ کے کفن کے بناؤ پر جس چاؤ سے وہاں حوروں کی آنکھ پڑتی تھی اسے دیکھ کر تو شاید اکثر رشک سخت شکوہ بھی پیدا ہوا کہ جب آئے بن ٹھن رہے گی تو پھر آج ہی کیوں نہ آگئی۔

اسلام کی نصرت کا جذبہ مرحوم کی طبیعت میں پہلے شوق بنا، پھر ولولہ اور آخر میں جنون ایسی جنون تھا جو کامریڈ کے مضمون پر اور جامع مسجد کے ممبر پر قلم اور زبان سے اہل احتساب کو دعوت گیرو دار دیتا تھا۔

طفلان شہر بے خبر انداز جنون ما

با ایں جنوں ہنوز سزاوار سنگ نیست

جنوں کی سرکار سے سب سے بڑا انعام، خلعت سہ پارچہ عطا ہوا اور ادب میں پہاڑ کا سا استقلال، طبیعت میں دریا کا سا بہاؤ اور جذبات میں طوفان کا سا جوش تھا۔ اسی کی بدولت تو تھا کہ خدمت مذہب کے جو ذہن بر آئے اس کی بجا آوری پورے التفات و استقلال، نہایت تیزی و روانی اور شدید جوش و انہماک سے کی۔

قید و بند کی جو سختیاں جھیلنی پڑیں وہ نہ تو کسی دوسرے شخص کے اعمال و افعال کی پاداش تھی نہ ناگہاں افتاد ہیں کہ بلا علم و اطلاع بغتۃً سر پہ آپڑی ہوں بلکہ خود ان کی اپنی ہی تحریروں اور تقریروں کے جرائم کی سزائیں تھیں۔ اور یہ جرم وہ تھے جن کا ارتکاب انھوں نے کسی قدر جوش یا وقتی افعال کی حالت میں نہیں بلکہ خوب سوچ سمجھ کر اور اچھی طرح جان بوجھ کر کیا تھا۔ چنانچہ سزا بھگتنے اور ہر کڑی جھیلنے کے بعد ان کا رونگٹا رونگٹا بھی پکارتا تھا۔

آں قدر زخمے دل من داشت در پیکاں نہ بود

اور یہ میں آج نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ ایک دیوانہ اب سے بارہ برس پہلے ہی الفاظ ان کی رہائی کے دن کہہ چکا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ خود انھوں نے اسی لطیف تر پیرایہ میں ادا کیا ہے ؎

بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد [1]

خدا کے خوف کے ساتھ، دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے بے خوفی ایک مسلمان کی خصوصیت امتیازی اگر آج نہیں تو پہلے کسی زمانہ میں تو تھی۔ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے ان کی بے خوفی کے واقعات تو دنیا بھر کے علم و ذہن میں ہوں گے مگر خدا کے خوف کے متعلق یہ آنکھیں آج اور اس وقت گواہی دینے کو موجود ہیں کہ — ماضی قریب میں نہیں جب کہ محمد علی کی ہیئت کذائی خشوع و خضوع کی قد آدم تصویر بن گئی تھی۔ بلکہ ماضی بعید میں جب کہ سوٹ بوٹ، منڈی ڈاڑھی، اور

---

[1] یہ مصرعہ مولانا حالی کا ہے پورا شعر یہ ہے۔

تعزیر عشق جرم ہے بے صرفہ محتسب

بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

جوہر مرحوم نے اپنی نظر بندی کے زمانہ میں جو غزل اس ضمن میں کہی اس کا شعر یہ ہے۔

لذت ہنوز مائدہ عشق میں نہیں

آتا ہے لطف جرم تمنا سزا کے بعد

فجر کی قضا نماز کے بعد سجدے کی جگہ کو تر ہوتے، دیکھا
قیصر کی مونچھیں بظاہر خدا سے بے خوفی کا پورا مجسمہ پیش کرتی تھیں ———
ساتھ آنکھوں سے آنسو نکلتے دیکھا ہے دل کے اسی
کے لیے اٹھے ہاتھوں کو کانپتے سائل کو دینے کے لیے جیب سے رقم کے ساتھ
گدا نے دکھا دیا کہ دنیا کے خریدار مسٹر محمد علی کو معمورۂ لندن سے خالی ہاتھ لوٹے مگر دین کے طلب گار مولانا محمد علی خزانہ مہرولی سے
جھولی بھر لے گئے۔

بستند رہ جرعہ آب بہ سکندر

دریوزہ گر میکدہ صہبا بہ کدو برد

مولانا محمد علی عجیب خوش نصیب شخص تھے جنہیں جینا بھی خوب آتا تھا اور مرنا بھی خوب آیا۔ جو عملاً دکھلا گئے کہ زندگی چاہیے شروع اپنے ذاتی عیش ہی کے خیال سے کی جائے مگر ختم دوسروں کے آرام کی خاطر ہونی چاہیئے۔ چونکہ قسمت نے اس کے خداپرست مسلمان کی زندگی لکھی تھی اور ایک مجاہد کی موت۔ جو اللہ کے عاشق تھے۔ اللہ کے رسولؐ کے عاشق رسولؐ کی امت کے عاشق تھے۔ امت کے ہر فرد کے عاشق تھے۔ اور اسی لیے ساری دنیا کے محبوب سردار، رسول اللہ کے مخصوص خادم اور اللہ کے مرحوم بندے تھے۔ واللہ یختص برحمۃ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم

خادمِ کعبہ مولانا شوکت علیؒ

(از: مولانا صبغۃ اللہ شہید فرنگی محلی)

۱۹۱۲ء کا ایک ٹھنڈا دن تھا کہ حضرت مولانا عبدالباری قدس سرہ کی نشست گاہ میں ایک جوان کو دیکھا بھاری بھرکم، لمبا قد متاثر کرنے والا بشرہ، پیشانی درخشاں، آنکھیں چمکدار، سر پر بالوں دار ٹوپی، داڑھی بالکل صاف، مونچھیں بڑی، جن کی نوکیں اوپر کو بلند قیمتی سوٹ، اور اعلیٰ درجہ کا بوٹ پہنے ہوئے، نہایت چُست چوڑی دار پاجامہ، رفتار تیز، ہاتھ میں سگار، چہرے پر عجیب دل کشی اور علی گڑھی انداز سے زبان پر "السلام علیکم"۔

یہ تھے "مسٹر شوکت علی بی۔ اے علیگ، علی گڑھ کے انجمن طلبائے قدیم کے نامور سیکرٹری، ہندوستان کے مشہور ترین کرکٹ باز اور باؤلر اور حکومت ہند کے محکمۂ افیون کے ایک اعلیٰ افسر جو اپنی فیشن مآبی، بذلہ سنجی، ظرافت و ذہانت، حسن انتظام، مقبولیت عامہ اور اسی کے ساتھ کسی سے نہ دبنے والے بلکہ انگریز تک کو انتقاماً دھکا دے دینے اور طمانچہ تک مار دینے والے نڈر اور بے باک سپاہی جو مسلم یونیورسٹی کے لئے چندہ جمع کرنے یا لکھنؤ کے اعیان سے تبادلۂ خیالات کرنے تشریف لائے تھے، اور ان کے طالع سعید نے انہیں فرنگی محل پہنچا دیا تھا۔

میں ان کے مختصر حالات سے کچھ واقف تھا اور ابھی دو ہی برس کی بات تھی کہ ایک تقریب عقد میں جو بنارس میں ہوئی تھی میرے چچا مولانا عنایت اللہ نے ان کی بذلہ سنجی، سخن فہمی اور خاموش نہ رہنے دینے والی ذہانت، اور اس سے محفل پر چھا جانے" کے خاص ڈھب کو آنکھوں سے دیکھ کر ہم لوگوں میں کچھ اس طرح ان کا ذکر کر دیا تھا کہ میں ان کا مشتاق ہونے کے ساتھ ان سے مرعوب تھا۔ بہ روح نواز صحبت دیر تک رہی جس میں یونیورسٹی، جنگ طرابلس اور شاہ اٹلی کی اس دھمکی کا بھی ذکر ہوا جو اس نے خانہ کعبہ کو ڈھا دینے کی دی تھی، گفتگو زیادہ تر مذہبی معاملات پر رہی جس سے گفتگو کرنے والوں کی اسلامی تڑپ اور حمیت دینی کا اندازہ ہوتا تھا۔ صحبت برخواست ہونے پر "شوکت" نے حضرتؒ سے ادب کے ساتھ مصافحہ کیا اور ہم حاضرین محفل سے باری باری ہاتھ ملایا، ایک انگریزی تعلیم یافتہ ملکہ سراپا انگریز کے اس پرخلوص برتاؤ نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں دور تک ان کی مشایعت کرتا رہا۔

اس کے بعد لکھنؤ کے مختلف اجتماعات میں ان سے ملاقاتیں ہوئیں اور اس زمانہ کے انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کے دستور کے خلاف انہیں سلام و کلام میں ہمیشہ پیش قدمی ہی کرتے پایا۔ اس کے بعد خدام کعبہ کا باقاعدہ کام شروع ہو گیا اور وہ اس کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے اور اس سلسلہ میں سال میں کئی بار وہ لکھنؤ آئے اور حضرت مولانا عبدالباریؒ کے جو اس انجمن کے خادم الخدام (صدر) تھے مہمان ہوتے اور ان سے بے تکلفانہ ملاقاتیں برابر ہوتی رہتیں، جس سے ان کی بڑھتی ہوئی مذہبی تڑپ کا بھی اندازہ ہوتا اب کوٹ کے اوپر "خادم کعبہ" کا بیج نمایاں ہوتا اور ان کی کلاہ افتخار کا طرّہ بھی خادم کعبہ تھا یعنی ان کی ٹوپی پر بھی بیج نودرانش ہوتا۔

دوسری طرف وہ بسلسلہ مسلم یونیورسٹی سر آغا خان کے سیکرٹری کی حیثیت سے برابر دورے بھی کرتے رہے اور ان خاص صلاحیتوں

اور پرتاثیر شخصیت اور گفتار نے وہاں سے لاکھوں دلائے جہاں سے ہزاروں کی امید ہوتی ایک دن اطلاع ملی کہ علی برادران قانون
تحفظ ہند کے ماتحت نظر بند کر دیے گئے اور مہرولی میں انہیں قیام کرنے کا حکم دیا گیا، اس نظر بندی کے زمانہ میں جب کہ وہ لینسڈاؤن میں
تھے حضرت مولانا عبد الباری سے مشرف بہ بیعت ہوئے اور اب میرے ان کے تعلقات اتنے ہوگئے تھے کہ وہ مجھے گرامی ناموں سے
ممتاز کرتے۔ وہ چھندواڑے میں تھے اور میری ان کی خط و کتابت جاری تھی کہ ایک دن ان کے خط کے ساتھ ایک گروپ بھی آیا جس
میں ایک ضعیفہ سراپا نور خاتون کرسی پر تشریف رکھتی تھیں اور کرسی کے پیچھے دو جوان بہ ادب استادہ تھے جن کی داڑھیاں حادب نظر
اور وہ خود سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود کی ایمان آفریں تصویر تھے ان میں بلند قامت نوجوان ہمارے شوکت بھائی تھے
اور دوسرے مولانا محمد علی اور یہ ضعیفہ بی اماں یعنی ان کی والدہ محترمہ تھیں اور نیچے انگریزی میں لکھا ہوا تھا لائنس اینڈ ہر کبس ...
شیرنی اور اس کے بچے، اس نظر بندی میں ان کی آنکھیں جس طرح کھلی ہیں ان کا صحیح اندازہ ان مکاتیب سے ہوگا جن میں آمد
ہی آمد ہے آورد کا نام ہی نہیں۔

نظر بندی سے دسمبر ۱۹۱۹ء میں رہائی کے بعد وہ اور مولانا محمد علی سیدھے امرتسر پہنچے اور کانگریس کے اس اجلاس میں شریک
ہوئے جو موتی لال کی صدارت میں وہاں ہو رہا تھا اور یہیں یہ دونوں بھائی جمعیتہ علما کے اس بنیادی جلسہ میں آئے جو وہاں
محمد شریف تاجر چرم کے مکان پر ہو رہا تھا، یاد رہے کہ جمعیتہ علما کا پہلا جلسہ امرتسر میں ہوا تھا اور وہیں اس کی بنیاد پڑی
تھی، اور راقم الحروف کو فخر ہے کہ وہ بھی اس جمعیت کا تاسیسی ممبر تھا۔

اب یہ دونوں بھائی کانگریس کے باقاعدہ ممبر تھے اور گاندھی جی کے دو بازو تھے، اس کے بعد ہر تحریک، ہر عمل اور ہر اقدام
دونوں بھائی ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط تھے جیسے ایک جسم میں دماغ اور جوارح، اور اسی لیے ۱۹۱۷ء سے لے کر
محمد علی کی وفات تک ذاتی حالات کو چھوڑ کر دونوں بھائیوں کی سوانح عمری تقریباً ایک ہے، کانگریس میں دونوں ایک ساتھ شریک
ہوئے تحریک خلافت دونوں ہی کا نام ہے، جمعیتہ علما کے دونوں گرنا دھرتا۔ نظر بند اور جیل میں دونوں ایک دوسرے کے قوت
بازو۔ دونوں ایک ساتھ شرف بیعت سے مشرف ہوئے۔ اور دونوں ایک ساتھ مولانا ہوئے، مجھے خوب یاد ہے کہ جس اجتماع
میں ان دونوں بھائیوں کو مولانا کی سند دی گئی اس میں میری ایک نظم بھی پڑھی گئی جس کا ٹیپ کا ایک بند تھا

شوکتِ دینِ محمدؐ کا یہ ساماں کر لو اپنے ساقی سے تم اب بیعتِ رضواں کر لو

تو دونوں بھائیوں کے مہرِ لب رہے تھے اور دونوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ انگریز کے دونوں باغی، انگریزی
میں شمول کی حرمت کے اعلان میں دونوں ہم آواز اور پھر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں دونوں کلمہ حق عند سلطان جائر میں ...
تھے جن سے ایک آواز نکل رہی تھی۔

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری حیات قومی اشاعت اسلامی اور حریت وطنی کے لیے دونوں ان دو آنکھوں کی طرح تھے
ہونے کے باوجود کسی چیز کو دیکھنے میں ایک ہی ہیں ان دونوں بھائیوں میں موازنہ بے ادبی ہونے کے ساتھ مشکل سے ہی مولانا شوکت
اپنے نامور بھائی سے اتنا بڑے تھے کہ محمد علی کی تربیت و تعلیم میں ان کا بڑا حصہ رہا اور چونکہ یہ دونوں بھائی یتیمی میں پروان
اس لیے مولانا شوکت علی مولانا محمد علی کے باپ کے بجائے بھی سمجھے جا سکتے ہیں بہر حال آزادی وطن مسلمانوں میں شعور ا...

★ مولانا عبدالماجد دریا بادی ★

مولانا عبدالماجد دریا بادی محمد علی کے چھوٹے دوست اور میرے سراپا شفقت بزرگ ہیں ۔ ندوۃالعلماء کی طالب علمی کے زمانے سے اب تک میں انکی شفقتوں اور کرم فرمائیوں سے بہرہ ور ہوتا رہا ہوں ۔

جوہر سیریز کی پیش کش ''علی برادران'' کے لئے میری پہلی درخواست پر صاحب موصوف نے علی برادران سے متعلق وہ سارا ذخیرہ مجھے مرحمت فرما دیا جو ان کے پاس موجود تھا ۔

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا

رئیس احمد جعفری

ہر قسم کی چھپائی کے لئے

الیاس پرنٹنگ پریس

فلیمنگ روڈ لاہور

کی خدمات حاصل کریں

فون نمبر ۳۶۶۹

قائم شدہ سنہ ۱۹۰۲

آپکی قدیم اور محبوب دوکان

جہاں آپ کو اعلیٰ قسم کے ڈنر ۔ ٹی کافی ۔ فروٹ سٹ ۔ ٹی ٹرالی پریشر کوکرز اور بہترین قسم کے چولہے اور دیدہ زیب نمائشی سامان بازار سے ارزاں قیمت پر مل سکتے ہیں ۔

چائنہ مارٹ

دھنی رام سٹریٹ انارکلی لاہور ۔ ۲

بک لینڈ

بلوچستان میں اردو کا سب سے بڑا مکتبہ ، ہر قسم کی ادبی علمی ، تاریخی ، مذہبی ، اور فکر آفریں کتابیں آپ بہ آسانی ہم سے حاصل کر سکتے ہیں ۔

بک لینڈ

سورج گنج کوئٹہ

اور ہندوستان میں انگریزی اقتدار کو ختم کرنے کی جو بھی تاریخ کبھی لکھی جائے گی اس میں یہ دونوں بھائی اس شان سے ملیں گے کہ اکثر و بیشتر ایک کے مجاہدات وہی ہیں جو دوسرے کے ہیں یہ ضرور ہے کہ بعض حیثیات سے ایک بھائی کو دوسرے پر فضیلت حاصل ہے مثلاً علمی حیثیت سے چھوٹے بھائی برتر تھے مگر بڑے بھائی بھی عملی حیثیت سے غیر معمولی برتری رکھتے تھے دماغی حیثیت سے اگر مولانا محمد علی کی عظمت مسلم ہے تو تنظیمی قابلیت میں مولانا شوکت علی یکتائے عہد تھے اگر اہم اور پیچیدہ مسائل اور قانونی موشگافیوں میں مولانا محمد علی فردِ تھے تو میدانِ عمل کے یہ بھی مردِ میدان، مولانا محمد علی کی خطابت اور زورِ استدلال اگر بے مثال تھا تو بڑے بھائی کی مختصر گفتگو بھی دل نشینی میں بے نظیر غرض ان دو بھائیوں کے گہرے مطالعہ کے بعد دونوں کا باہمی فرق سیاسی زندگی میں بتاتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ چھوٹے لیڈروں کے لیڈر تھے اور بڑے عوام کے محبوب راہ نما۔

یوں تو جمعیت مرکزیہ خلافت کے ایک رکن اور تحریک خلافت و ترک موالات کے ایک مبلغ کی حیثیت سے مجھے شوکت بھائی کے ساتھ کام کرنے کا فخر کئی سال حاصل رہا لیکن مجھے یہ بھی شرف حاصل ہے کہ کئی مہینے مرکزی خلافت کے دفتر بمبئی میں اس کے شعبہ نشر و اشاعت سے وابستہ رہنے کا اعزازی طور پر تقریباً چھ مہینے مجھے موقع ملا اس عرصے میں مجھے مولانا شوکت علی کا گہرا اور مسلسل مطالعہ کرنے ہی کا موقع نہیں ملا بلکہ مجھے ان کا ہم پیالہ و ہم نوالہ رہنے کا شرف بھی حاصل ہوا ہم دونوں ایک ہی بلڈنگ میں رہتے ایک ساتھ کھانا کھاتے، اس زمانۂ قیام کے چند واقعات اور چند تاثرات ان کی سیرت کی آئینہ نمائی کریں گے۔ وہ مولانا تو تھے ہی اس لیے لوگ انہیں مفتی اور شیخ طریقت بھی سمجھتے نہ معلوم کتنے لوگ ان کے پاس استفتے بھیجتے جو مجھے اور مولانا مظہر الدین شیر کوٹی کو دے دیے جاتے اور ہم لوگ جواب لکھ دیتے۔ لوگ ان سے بیعت کی درخواست کرتے اور تعویذ کے تقاضے بھی آتے ایک دن میں نے پوچھا آپ ان خطوں کے کیا جواب دیتے ہیں؟ فرمانے لگے طلب گاران بیعت کو لکھ دیتا ہوں کہ خلافت کا کام مستعدی سے کرتے رہو تم میرے مرید ہی نہیں خلیفہ بھی ہو اور انگورہ فنڈ کے لیے خوب چندہ جمع کرو یہی میرا نذرانہ ہے،، میں نے پوچھا تعویذ آپ کیا لکھتے ہیں ہنس کے اور عجیب انداز سے بلکہ جھوم کے کہا کسی کاغذ پر اپنا نام اور کسی پر "حضرت قبلہ و کعبہ،، کا نام لکھ کے اور بند کر کے بھیج دیتا ہوں اور تم یقین کرو کہ بعد کو آنے والے بہت سے خطوط بتاتے ہیں کہ یہ تعویذ کارگر ہوئے۔

انہوں نے اپنی جائداد کا زیادہ حصّہ فروخت کر دیا تھا ان کی روئی کی مل بند پڑی ہوئی تھی بظاہر ان کا کوئی ذریعۂ آمدنی نہیں تھا پنشن بھی بند کیا ضبط تھی لیکن میں نے اس بے تنگدستی کے باوجود ان کی زبان سے کبھی عسرت اور مالی پریشانی کا ایک حرف نہیں سنا، آپ کی ٹوپیاں عموماً بوسیدہ ہی ہوتی۔ کھدر کے پائجامے اور کرتے میں عموماً پیوند ہوتے اور قیمتی سگار جن کے وہ عادی تھے اب نظر نہیں آتے، اچھے کھانے اور میووں کے وہ شوقین تھے لیکن اب وہ وہی نصرتی کھانا کھاتے جو تقریباً چار پانچ درجن کارکنان خلافت آفس کے لئے پکتا اور ختم ماہ پر اپنے کھانے کا پورا حساب کر دیتے لیکن دوسرے کارکنان خلافت اور اعیان کار کی ضرورتوں اور جائز و ناجائز مطالبات کو کبھی نہ ٹالتے میں بہت سے ممتاز کارکنان خلافت و کانگرس اور قابل ذکر مبلغین و علما کو جانتا ہوں جن کی وہ برابر امداد و خدمت کیا کرتے تھے ایک دن صبح سے غائب ہونے کے بعد شام کو تھکے ماندے تشریف لائے ان کے آنے کے چند ہی منٹ کے بعد میں ان کے کمرہ میں چلا گیا (یاد رہے کہ یہی مختصر کمرہ ان کا خوابگاہ بھی تھا اور ڈرائنگ روم

بھی اور انہیں وہ کھانا بھی کھالیا کرتے تھے) اور مزاج پرسی کی تو انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھالیا اور رازدارانہ طور پر کہا "فلاں" نے پانچ ہزار روپیہ مانگے ہیں اور یہ شرط کردی ہے کہ اس رقم کا اندراج دفتر کے کسی کاغذ میں نہ ہو اور چیک نہیں نقد کی شکل میں مجھے عجلت کے ساتھ پہنچ جائیں"۔ صبح سے اس رقم کے لیئے سرگرداں تھا، خدا کا شکر ہے کہ اب اس کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہوں اور ہر شخص سے یہ کہہ کر مانگا ہے کہ مجھے اپنی ذات کے لیئے ضرورت ہے۔

اس زمانہ میں روزانہ تارکین وطن اور پریشان حال ترک اور عرب آیا کرتے اور ان سے طالب امداد ہوتے اور اپنا درد دل سناتے مولانا نہ صرف مدعا کو سمجھ لیتے بلکہ عربوں سے عربی میں اور ترکوں سے ترکی میں بات چیت بھی کرتے عربی میں تو انہیں عربوں کے تعلقات اور اس سے زیادہ زمانہ نظربندی میں قرآن مجید کے گہرے مطالعے کی بدولت کچھ استعداد پیدا ہوگئی تھی لیکن خدا معلوم انہوں نے کچھ ترکی الفاظ کہاں سے سیکھ لیئے تھے کہ وہ ترکوں سے اس زبان میں جس میں کچھ ترکی، کچھ عربی اور دو چار الفاظ انگریزی کے ہوتے اپنا مافی الضمیر کسی نہ کسی طرح ظاہر کردیتے اور ان کی امکانی امداد سے کبھی دریغ نہ کرتے، میں ان کی ترکی گفتگو پر آج تک متحیر ہوں۔

دوست نوازی ان کی ضرب المثل تھی، احباب کو آگے بڑھانا، رفقاء کار کو نمایاں ہونے کا موقع دینا اور باعزت گھرانے کے افراد کو دعوتوں، اور اجتماعوں میں ممتاز کرکے دکھانا ان کی بے نفسی کا خاص جوہر تھا۔ میں خود اپنی صلاحیتوں سے خوب واقف ہوں بہرحال فرنگی محل کا ایک فرد ہوں اور ان کے "قبلہ و کعبہ" کا عزیز قریب دعوتوں اور جلسوں میں مجھے ممتاز جگہ پر بٹھاتے اور اپنے طرز عمل ظاہر کرتے کہ یہ فقیر ان کی نگاہ میں بہت محترم ہے، ان کے اور مولانا محمد علی کے ایک فاضل شیدائی کے یہاں ان ہی کے اعزاز میں ام دعوت تھی، میزبان نے انہیں صدر میں بٹھانا چاہا تو انہوں نے مجھے ہاتھ پکڑ کے صدر میں بٹھایا اس کے بعد قوالی شروع ہوئی اور دو ایک شعروں کے بعد وہ اپنے تن و توش کے ساتھ اٹھ کے آئے اور مجھے نذر پیش کی ان کے بعد مولانا محمد علیؒ نے نذر دی حالانکہ یقی ہی دونوں بھائی نذر قبول کرنے کے اہل بھی تھے اور اس مجلس سماع کے میر مجلس بھی۔

خود تو پیکر عمل تھے ہی، لوگوں سے کام لینے کی غیر معمولی قابلیت رکھتے تھے، ہر شہر اور خلافت کمیٹی کی ہر شاخ میں ان کچھ شاگرد تھے جن کو ہمت دلا دلا کے انہوں نے خطیب بنا دیا تھا۔ مولویوں سے کام لینا ان کو خوب آتا تھا اور فرمایا کرتے تھے کہ جن لوگوں نے ٹوٹی چٹائیوں پر بیٹھ کے کچی عمارتوں میں صرف کرتا اور پائجامہ پہن کے اپنی زندگی کے بہت سے سال بسر کئے ہیں وہ انگریزی تعلیم گاہوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے والوں سے زیادہ مجاہدات کرسکتے ہیں چنانچہ آپ ان مکاتیب میں بھی پڑھیں گے تو فلاں مولوی صاحب کا آنا ضروری ہے اور فلاں مولوی صاحب کو لینے آئیے گا، وہ اس لیئے بھی لوگوں سے زیادہ کام لے سکتے تھے کہ وہ اع بہت جلد ایسے دوست بن جاتے تھے جن کے عزیز ان کے عزیز اور جن کے مشکلات خود ان کے مہمات بن جاتے تھے، جب کسی سے ملنے یا کوئی مدعو کرتا تو اس گھر کے ایک ایک فرد کا حال پوچھتے، بچوں سے خوش طبعی فرماتے اور بیماروں کو نفع بخش مشورے دیتے اور جلد صاحب خانہ، شرکائے بزم اور ہر خدمت کار اور حاضر الوقت سے بڑھ کے خود مصافحہ کرتے ہمارے تو وہ عزیز اور بھائی تھے ہی، م بے شمار مقامات پر ان کے ایسے احباب خصوصی کو جانتا ہوں جن کے اندرونی معاملات میں وہ مددگار اور مشیر ہوتے، مجھ سے روداد تو میری بی بی کو بہن کہیں گے اور میرے بچوں کو بیٹا کہہ کے پکاریں گے اور ان کی تعلیمی ترقی اور تدابیر فلاح کے لیئے اچھے مشورے دیں گے بلکہ اگر تعلیمی وظیفے کی ضرورت ہے، کسی کالج میں داخلہ لینا ہے اور نہیں ملتا یا اس کے لیئے فکر معاش ہے تو اس میں اپنے

اور تعلقات سے خاص مدد کرتے اور دوسری ملاقات میں اپنی کوششوں کے نتائج سے بھی آگاہ کرتے۔
معاملات کو سلجھانے کی ان میں بے پایاں صلاحیت تھی مقامی خلافت کمیٹیوں کے اندرونی اختلافات کو چھوڑیئے جن کو معلوم کرنے پر چٹکی بجانے دور کر دیتے تھے، جمعیہ مرکزیہ کے اختلافات آج یہ ٹولی خفا ہے کل فلاں صوبہ یہ تہیہ کر کے آیا، پرسوں فلاں بڑا دوسرے بڑے کے اقتدار کو ختم کر دے گا، مگر مولانا شوکت کے تدبر، عقدہ کشائی، فراست اس سے زیادہ ان کے خلوص اور دیانت پر اعتماد اور ان کی بے مثال محبوبیت کے ہاتھوں یہ گتھیاں سلجھ جاتیں، کچھ وہ بھی تھے جو ان کی وجاہت اور مقبولیت عامہ پر حسد کرتے اور بقول خود بت "شوکت" کو توڑنا چاہتے تھے لیکن ان سب کے ساتھ مولانا کا سلوک اور رویہ کچھ محبت اخلاص کا ہوتا کہ ان کے سامنے سپر انداز ہو جاتے۔
اسی اخلاص اور بے لوثی کا یہ فیض تھا کہ وہ دوسروں کی غلطیوں پر دوسروں کو عجب دلپذیر انداز سے متنبہ کر دینے میں جھجکتے نہیں میں نے کئی بار انہیں مولانا محمد علی کو ٹوکتے اور آگاہ کرتے دیکھا جب کہ وہ مولانا محمد علی کی دماغی برتری کے معترف بھی تھے، اور تو اور ان ہی مکتوبات میں ناظرین دیکھیں گے کہ وہ اپنے پیر و مرشد کی رائے سے بعض معاملات میں اختلاف کرتے ہیں اور بعض دفعہ تو وہ واضح لفظوں میں ان کے کسی طرز عمل کی صحت و معقولیت سے انکار کرتے، اور یہی طرز عمل ان کا مہاتما گاندھی کے ساتھ تھا جن کو یقیناً وہ ہندوستان کا مخلص ترین راہ نما سمجھتے تھے پس بدیگراں چہ رسد
اور یقیناً یہی ان کا خلوص تھا کہ مہاتما گاندھی ایسے مردم شناس کی نگاہ زعمائے مسلمین میں سب سے پہلے ان ہی پر پڑی چنانچہ گاندھی جی کے ابتدائی دوروں میں ہمارے مولانا ان کے رفیق اور قوت بازو نظر آئیں گے گاندھی جی کے تعلقات اعیان مسلمین میں سے اکثر کے ساتھ ان ہی کے تعارف و ارتباط سے ہوئے انتہا یہ ہے کہ حضرت مولانا عبدالباریؒ کی جلالت و اہمیت سے گاندھی جی کو اور گاندھی جی کے اخلاص اور بے غرضی سے انہوں نے حضرتؒ کو آگاہ کیا اور طرفین میں تعلقات خصوصی کے بعد گاندھی جی کو فرنگی محل آنے پر آمادہ کیا گاندھی جی اور مولانا کے درمیان نقطہ اتحاد ہندو و مسلم اتحاد بھی تھا وہ کانگرس کے نہ صرف پرجوش کارکن تھے بلکہ جب کبھی ایماندار مورخ کانگرس کے اندرونی حالات کی پردہ کشائی کرے گا تو اسے لکھنا پڑے گا کہ کانگرس کو مسلمانوں میں مقبول بنانے اور گاندھی جی کو مسلمانوں کا محبوب اور معتمد علیہ بنانے میں ان دونوں بھائیوں کا کتنا ہاتھ ہے، یقیناً گیا (بہار) کے اجلاس میں نان کواپریشن منظور نہ ہوتا اور مہاتما گاندھی کی قیادت کو عام طور پر مسلمان نہ مانتے اگر ان دو بھائیوں کی مسلسل کوششیں اور علما کو اس طرف مائل کرنے کی تدبیریں نہ ہوتیں اور جاننے والے یہ بھی جانتے ہیں کہ کانگرس کے پرچار، نان کواپریشن کی تبلیغ اور ہندو زعما کے دوروں پر خلافت فنڈ کا کتنا روپیہ خرچ ہوا ہے اس کے حاصل کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ مولانا شوکت علی کا ہے۔
یہ دوسری بات ہے کہ خود مہاتما گاندھی فرمایا کرتے تھے کہ "میں مولانا شوکت علی کی جیب میں ہوں" لیکن وہ خود اپنے کو "اللہ کے ایک سپاہی" کعبہ کے ایک خادم اور آزادی وطن کے ایک والنٹیر سے زیادہ نہیں سمجھتے تھے اور ان دوروں میں وہ اپنے لیے ذرا امتیاز پسند نہیں کرتے تھے گاندھی جی کے ایک

نقیب اور زیادہ سے زیادہ لفٹیننٹ بنا رہنا انہیں زیادہ پسند تھا، اسی لیے وہ اجتماعوں میں بہت مخت تقریر کرتے، بہت کم نمایاں ہونے کی کوشش کرتے اور جلسوں کی صدارت کرتے تو شاید ہی ان کو کس نے دیکھا ہوگا۔ اسی بے نفسی اور متطوعانہ شان کے ساتھ وہ ہر تحریک میں شریک ہوئے۔

وہ سپاہی تھے اس لیے کام زیادہ کرتے اور تقریریں کم کرتے لیکن مسلم لیگ کے سلسلہ میں اس کے باوجود ان کی باعظمت شخصیت سے مسلم لیگ نے ابتدائی الیکشنوں اور خصوصاً بجنور کے الیکشن میں غیر معمولی فائدہ اٹھایا وہ لیگ کے لیے اس قدر ضروری اور قیمتی تھے کہ ان کے دفن کے وقت ان تربت کے پاس محمد علی جناح بیٹھے ہوئے آنسو بہا رہے تھے جبکہ جناح صاحب کو کسی کے فراق پ اشک بار نہیں دیکھا گیا۔ اور لیگ ہی کے حکم پر اپنے دستور کے خلاف وہ مرکزی اسمبلی کی ممبری کے لکھنؤ سے کھڑے اور بے زری کے باوجود انہوں نے شاندار کامیابی حاصل کی۔

آخر لمحۂ حیات تک انہوں نے اپنی خصوصیات کو قائم رکھا ان کی سبز عبا پر خادم کعبہ کا بیج برا رہا جب کہ خود یہ تحریک برسوں ہوئے ختم ہو چکی تھی، ہندو مسلم اتحاد کے وہ برابر علمبردار رہے جبکہ ۱۹۲۳ کے بعد سے ان کے یوم وفات تک اس اتحاد کے برقرار رہنے کے حالات و اسباب روز بروز کم ہوتے گئے، جن لوگوں سے ان کے تعلقات جس شان کے اول روز سے انہیں تبدیلی حالات کے باو برابر قائم رکھا۔

تحریکِ خلافت کیا خود ترکی سے خلافت کا خاتمہ ہو چکا تھا لیکن خلافت ہاؤس بدستور ان کے سے آباد رہا اور اسی طرح وہ روزنامہ خلافت بھی ناسازگار حالات کے باوجود چلاتے رہے، کھدر انہوں نے ۱۹۱۹ء سے پہنا تھا آخر وقت تک ان کا ملبوس رہا اور شاید کفن بھی ان کو کھدر کا دیا گ

آخر ۲۸۔ نومبر ۱۹۳۸ء کو اس مجاہد اعظم، اس اللہ کے سپاہی، اس عمل مجسم اور سرتاپا اخلاص محبت نے انتقال فرمایا اور دہلی میں قلعہ اور مسجد شاہ جہانی کے درمیان دفن ہوئے کسی نے خو کہا کہ طبیعت ہنگامہ جو اور عوام سے ارتباط ان کا طرۂ امتیاز رہا اس لیے دفن کے لیے ان کو وہ مقا جہاں ہنگامہ اور اجتماع ہر وقت رہتا ہے، مزار مبارک مرجع خاص وعام ہے اور اس کے قریب ا چھوٹی سی مسجد بھی ہے فاتحہ پڑھنے والوں کا اب بھی ہجوم رہتا ہے اور جمعرات کو قوالی بھی اس حسین کے مزار پر ہوتی ہے۔

جب وہ دفن کیے جا رہے تھے تو ایک سرمست نے سرمدؒ کی یہ رباعی عجب انداز سے پڑھی جس شرکائے بزم ماتم میں ایک عجب قسم کا تاثر ہوا اور حقیقت میں یہ ان کے احوال سے مطابق بھی تھی

سرمد غم عشق بوالہوس را ندہند سوز دل پروانہ مگس نہ دہند
تا عمر نہ دہی بہ سرفرازی نہ رسی ایں دولت سرمد ہمہ کس را نہ دہند

انتقال کے وقت انھوں نے دو صاحبزادے چھوڑے ایک جناب الحاج زاہد شوکت علی سلمہٗ جو ماشاءاللہ بہت سے پدری خصوصیات کے مالک ہیں اخبار خلافت کو بھی چلا رہے ہیں اور خلافت ہاؤس کے دروازے بھی ان کے دم سے کھلے ہوئے ہیں ماشاءاللہ پابند اوقات اور خوش احوال ہیں ان کی عمر تقریباً ساٹھ سال ہے اب تندرستی ٹھیک نہیں رہتی، کئی قلبی دورے پڑ چکے ہیں یہ مولانا محمد علی کے داماد بھی ہیں۔

دوسرے عابد سلمہٗ جن کو بڑے ارمانوں کے ساتھ انھوں نے فرنگی محل میں قرآن حفظ کرایا تھا۔ یہ بنگال میں مشغول کاروبار ہیں اور دنیا سے الگ زندگی بسر کرتے ہیں۔

ان خطوط کے ابتدائی دور میں خدام کعبہ کا بہت ذکر آیا ہے تو اس انجمن کی تاسیس حضرت مولانا عبدالباریؒ کے دولت خانہ پر ۱۹۱۲ء میں ہوئی مقصد نام سے ظاہر ہے بعد کو اس کا صدر دفتر دہلی کوچہ چیلاں میں منتقل ہو گیا، جن خوش نصیبوں نے یوم تاسیس میں خدمت کعبہ کا عہد کیا تھا وہ ارکان اصلی کہلاتے مثلاً خود حضرت مولانا، حکیم عبدالولی مرحوم لکھنوی، مولانا شوکت علی، مولانا احمد اشرف کچھوچھوی (فیض آباد وغیرہم ورحمۃ اللہ علیہم)، اس جمعیۃ کا صدر، صدر نہیں کہلاتا بلکہ "خادم الخدام" ممبران خدام کعبہ میں بعض وہ خوش نصیب بھی تھے جنھوں نے خدمت کعبہ کا زندگی بھر کے لیے عہد کیا تھا یہ لوگ شیدائی کہلاتے ان میں اقبال شیدائی اور ایوب احمد صبر کا ذکر ان مکاتیب میں بھی ہے۔

از حضرت مولانا صبغۃ اللہ شہید فرنگی محل

مولانا محمد علی کے کچھ واقعات

عربی کا ایک مشہور شعر ہے :-

لیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحدٍ

"اس قادر مطلق کے لیے یہ کچھ دشوار اور عجیب بات نہیں ہے کہ وہ ایک دنیا کو فردِ واحد میں جمع فرما دے"۔ یہ شعر کسی تردید کے خوف کے بغیر حضرت مولانا محمد علی رحمۃ اللہ کے ذکر مبارک کے سلسلہ میں پڑھا جا سکتا ہے۔ لاریب کہ اس خلاق عالم نے آں مرحوم میں اتنی خصوصیات اور اتنے مناقب جمع کر دیئے تھے۔ جن کو برسوں سے فرد واحد میں یک جا ہوتے ہم نے نہیں دیکھا۔

حافظ قرآن، کلام پاک پر گہری نظر۔ اس کا برمحل اقتباس اور اس سے استناد صحیح، حاجی و زائر، مولانا مجاہد، مبلغ کلمۂ حق برزبان جاری بلکہ فطرت، آکسفورڈ کے لیے مایۂ نازش، بہترین اخبار نویس، پرتاثیر خطیب، دیوانۂ اسلام، فدائی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)، نغمہ گو شاعر، ذہین و حاضر جواب و نکتہ سنج و نکتہ رس اور عالی دماغ مفکر، مہمان نواز اور متوکل علی اللہ۔

ان کو لکھنؤ میں میں نے قریب سے غالباً ۱۹۱۴ء میں دیکھا۔ جب وہ مسلم یونیورسٹی کی اسٹینڈنگ کمیٹی میں شرکت فرمانے قیصر باغ کی بارہ دری میں تشریف لائے۔ بہت سے زعمائے ملت اور اعیان مسلمین آچکے تھے۔ اور ان کا حسب حیثیت والینٹرز اور منتظمین نے پرجوش استقبال بھی کیا۔ موچھیں اٹھی اور تنی ہوئی، داڑھی صاف، رنگ کھلتا ہوا، ترکی کوٹ زیب بدن۔ جس کے گلو میں دونوں طرف ہلال درخشاں۔ سر پر کلپاک کے قسم کی ٹوپی، جس پر ہلال نور پاش معلوم ہو رہا تھا کہ ایک ترک جنرل تشریف لا رہا ہے۔ رفتار میں متانت اور شان کہ پہلے آہستہ آہستہ پھر بلند آواز سے محمد علی کامریڈ کی آوازیں آنے لگیں۔ عام حاضرین ادب سے محمد علی کو دیکھنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسٹیج والوں کی نگاہیں اٹھنے لگیں۔ اور گویا ہر شخص زبان حال سے کہنے لگا۔

کرم نما و فرود آکہ خانہ خانۂ تست

میں مجاہدین جنگ بلقان کے لیے دروازے پر امدادی صندوق لیے کھڑا تھا۔ میں نے کچھ کہے بغیر اور کہتا کیسے۔ میں تو ان کی شخصیت سے مرعوب و مسحور سا ہو چکا تھا۔ صندوق آگے بڑھا دیا تو انہوں نے فرمایا۔ میں شیخ شاہد حسین کے یہاں

ٹھیرا ہوں۔ آپ پہلی میٹنگ کے بعد وہیں آجائیے۔ میں حاضر ہوا تو انہوں نے ایک گنتی میرے صندوق میں ڈالنے کے بعد مجھ سے میرا تعارف چاہا۔ میرے صندوق میں ڈالے ہوئے سکوں میں یہ سب سے بڑی رقم تھی۔ اس کے بعد ان کی وہ تقریر ہوئی جس کے لیے اجتماع ہمہ تن گوش تھا۔

اٹلی کے طرابلس الغرب پر حملے کے بعد ہندی دردمندان اسلام کو اس لیے بھی خانہ کعبہ کی حفاظت کی زیادہ فکر پیدا ہو گئی تھی کہ عمانوئیل شاہ اطالیہ نے ایک موقع پر یہ بھی کہا تھا کہ ہمارے ہوائی جہاز مسلمانوں کے کعبہ سے بھی نبٹ سکتے ہیں۔ اس اضطراب کے ماتحت ایک انجمن حفاظت کعبہ کے لیے قائم کی گئی تھی جس کا نام تھا خدام کعبہ۔ حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی اس کے خادم الخدام، مولانا شوکت علی (جو اس وقت تک مسٹر شوکت علی تھے) اس کے معتمد عمومی اور اس کا صدر دفتر دہلی میں تھا۔ قطع سخن کرتے یہ کیوں نہ بتادوں کہ ہمارے شوکت بھائی (میں ان کے پیر بھائی بننے کے پہلے ہی سے ان کو بھائی کہتا تھا) کو خادم کعبہ کا لقب اس قدر پسند تھا کہ آخر وقت تک وہ اپنے کو خادم لکھتے اور کہتے رہے اور وہ ہلال بھی ان سے کفن نے جدا کیا جو ان کی سبز عبا اور کلاہ مبارک پر نور بیز رہتا تھا۔

مسٹر محمد علی جمعیتہ خدام کعبہ کے ارکان اعلیٰ میں تھے۔ اور جب اس جمعیتہ کے جلسے لکھنؤ میں ہوتے تو وہ فرنگی محل تشریف لاتے۔ چھپانے کی کیا ضرورت ہے کہ وہ اتنے اونچے اور بلند تھے کہ وہ باوجودیکہ کبھی کبھی فقیر خانے پر عم مرحوم مولانا سلامت اللہ کے پاس تشریف لاتے۔ مگر فرط ادب و مرعوبیت کی وجہ سے میں ان کے سامنے سنّی ہی بنا رہتا۔ یعنی ان کے فرمودات ہی کو آویزہ گوش بناتا۔ مگر اس کے برعکس مولانا شوکت علی ہمارے بھائی بھی تھے اور ایک دوست بھی۔ جن سے شعروشاعری بھی ہوتی اور تفریحی گفتگو بھی۔

ہمدرد شان سے نکل رہا تھا کہ اس پر سنسر بٹھایا گیا۔ جس نے اس پر مقراض زنی شروع کردی۔ یہاں تک کہ ایک "چڑے اور چڑیا" کی کہانی کا اڈیٹوریل بھی اس کی زد میں آگیا۔ پھر چند مہینوں کے بعد یہ دونوں شیران اسلام دہلی کے قریب مہرولی میں نظر بند کردیئے گئے۔ مہرولی کے بعد وہ چھندواڑہ اور بیتول میں رہے۔ اس عرصے میں انہوں نے جو خطوط حضرت مولانا عبدالباری قدس سرہ کو لکھے تھے وہ میں نے ایک فائل میں منضبط کرنے کے لیے حرف بحرف پڑھے ہیں۔ ہر خط دوسرے خط سے زیادہ کاتب محترم کی جلالت شان توکل علی اللہ، حب رسول اور افزوں جذبۂ خدمت اسلام کا آئینہ دار تھا۔ ان ہی خطوں نے بتایا کہ وہ پابندی سے قرآن مجید حفظ کر رہے ہیں۔ سیرت نبوی اور احادیث کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔ انگریزی میں سرور عالم پر ایک کتاب لکھنا شروع کردی ہے۔ اور ماہ ربیع الاول میں ترتیب وار تقریریں فرما رہے ہیں۔ یعنی پہلے ولادت باسعادت، پھر حیات مقدس کے ابتدائی دور، پھر بعثت، پھر مکہ کی زندگی پھر ہجرت۔ غرض اس طرح انہوں نے اپنے والہانہ انداز میں سیرت پاک ومطہر پر ایسی تقریریں مختلف مساجد میں فرمائیں کہ اسلامیت اور حب رسول کی ایک بہار اس بستی میں آگئی۔ جہاں مشکل سے چار فی صد مسلمان تھے۔

میرے پرانے البم میں شاید اب بھی وہ فوٹو محفوظ ہے جو اس زمانے میں شوکت بھائی مرحوم نے مجھے بھیجا تھا۔ اس پر لکھا ہوا ہے LIONESS AND HER CUBS یعنی ببر شیرنی اور اس کے بچے اس کے نیچے "بی اماں" (علی برادران اپنی والدہ معظمہ کو

بی اماں کہتے۔ اور آخر میں آں مرحوم کا بھی نام پڑ گیا تھا، شرعی پردے کے ساتھ ایک کرسی پر تشریف فرما ہیں اور پیچھے بھائی محمد علی اور شوکت علی کھڑے ہیں۔ دونوں کے داڑھیاں۔ مولانا محمد علی کے پٹے بھی اور شیرانہ تیور اور اسد اللہی نور چہرے سے ہویدا بلکہ ... اماں بھی شیرنی ہی تھیں۔ انھوں نے اس ابتلائے شدید اور سخت آزمایش اسلامی میں اپنے دو شیروں کو استوار رہنے میں جو ... روحانی اور ہمت افزائی کا سامان بہم فرمایا تھا وہ خواتین عالم کے لیے درس غیر فانی ہے۔ اور اس سے پہلے ان کی جوانی ہی میں اپنے ان یتیم بچوں کی جو تربیت اسلامی فرمائی وہ خود اپنی مثال ہے۔ لیکن مجھے تو اس "شیرنی" کے ایک خاص واقعہ کا ذکر کرنا ہے۔ نظر بندی کا دور طویل ہو گیا اور ان مجریان عشق اسلام میں روز بروز "شدت علی الکفار" اور پامردی مجاہدانہ میں اور اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ حکومت کو شاید اپنی غلطی کا احساس ہوا یا ندامت جرم کی وجہ سے اس نے چاہا کہ کچھ علی برادران دبیں اور کچھ ہم نرم پڑیں۔ اور نظر بندی بہ حیلہ لطیف ختم ہو جائے۔ اس کے لیے ہوم آفس کے حکم پر ایک اعلیٰ مسلمان افسر پہلے بیگانہ وار علی برادران محترمان سے ملا اور بعد کو ڈورے ڈالنا شروع کیے اور آخر میں کھل کے کہہ گزرا کہ اگر آپ دونوں بھائی دبے لفظوں ہی میں سہی مستقبل میں اپنا طرز عمل بدلنے کا وعدہ کر لیں۔ تو قفس کا در فوراً کھل جائے۔ یہ افسر ہر گفتگو کے بعد ناکام ہی واپس ہوتا۔ کیونکہ ان شیران اسلام کا ہر انداز پکار کے کہتا ہے

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

ظاہر ہے کہ یہ گفتگو مردانے میں ہوتی تھی۔ یہ مفاوضہ بڑھنے کے بعد ایک دن "بچوں نے" مختصر طور پر بی اماں کے ادراک کے مطابق ان سے بھی ان کا ذکر کر دیا۔ شیرنی اس پر بھڑک پڑی۔ اس نے پوچھا تم نے کیا کہا؟ بچوں نے عرض کیا وہی جو تمہارے دودھ کے اثر کے مطابق ہونا چاہیئے تھا۔ ماں نے کہا بیٹا میں نے تمہیں اس لیے پالا تھا کہ تم اسلام کے سپاہی بنو گے۔ بچو! اگر تم نے ذرا لینت یا پست ہمتی دکھائی تو نہ صرف یہ کہ میں دودھ نہیں بخشوں گی۔ بلکہ ایسے کسی قلمی وعدہ پر تمہارے دستخط کے لیے قلم اٹھانے کے پہلے ان بڈھے ہاتھوں سے جن میں اب صرف ہڈیاں ہی رہ گئی ہیں۔ میں تم دونوں کا گلا گھونٹ دوں گی۔"

سنو کہ یہ الفاظ اس بیوہ ضعیفہ کے ہیں جس کے یہ مایہ افتخار ملت اور فخر اسلاف فرزند اس مجازی دنیا میں سب کچھ ہیں اور یہ بچے وہ ہیں کہ جن کو پالنے اور پھر پڑھانے لکھانے کے لیے جوانی میں بیوہ ہو جانے والی خاتون نے کیا کیا کاوشیں کی تھیں۔ فخفر لھا اللہ۔

اسی نظر بندی کے زمانے میں ان دونوں بھائیوں کو بہ "مراحم خسروانہ" اپنے مکانوں کی مرمت کرانے اور دوسرے خانگی معاملات کو طے کرنے کے لیے چند روزہ کی چھٹی ملی۔ اور چند روز رام پور میں قیام کرنے کی اجازت مل گئی، ظاہر ہے ... سے رام پور جانے میں لکھنؤ اسٹیشن کا پڑنا ضروری تھا۔ فرنگی محل میں اطلاع پہنچ گئی۔ اور بعض اور احباب کو علی برادران کے ادھر سے گزرنے کا مژدہ مل گیا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ جب میں اسٹیشن پر پہنچا تو وہاں اچھا خاصا مجمع تھا۔ یہ انسانی مجمع تو خیر۔ کھانے کے بہت سے برتن

نظر آئے۔ گاڑی کے پہنچتے ہی مصافحہ اور معانقہ اور ضروری باتوں کے بعد دسترخوان چنا گیا۔ جلد جلد باتیں بھی ہوتی رہیں اور لطف کے ساتھ کھانا بھی ابھی پوری طرح ہاتھ بھی نہیں دھلے تھے کہ سگنل ڈاؤن ہوگیا۔ مگر انگریز سپرنٹنڈنٹ نے جس نے اس مساوات محبت اور بے تکلفی کا منظر کبھی نہیں دیکھا تھا ٹرین رکوادی اور علی برادران ہر کہ مہ سے اپنے معمول دیرینہ کے مطابق مصافحہ کر کے سلام کرتے ہوئے ٹرین میں بیٹھ گئے۔ اور مخلصوں نے تکبیر کے بعد بلند نعروں کے بعد کہا ۔

دیدہ و سعدی دل ہمراہ تست

تا نہ پنداری کہ تنہا مے روی

چلنے کے پہلے ہی حضرت سے رام پور تشریف لانے اور ہم نوجوانان فرنگی محل سے بھائی تم بھی ضرور آنا کے لفظوں میں حضرت کی ہم رکابی کا وعدہ لے لیا گیا تھا۔ چنانچہ تین ہی چار روز کے بعد فرنگی محل کا قافلہ رام پور کے اسٹیشن پر تھا۔ اور ریاست کی سواریاں باہر ہاتھوں ہاتھ ان کے ہم گھر پہ پہنچے جو بے شک بہت قابل مرمت اور شکستہ مگر مالکان مکان کے دل کی طرح بہت فراخ تھا۔ پرتکلف ناشتے کے بعد شوکت بھائی نے فرمایا محمد علی کو قبلہ وکعبہ سے باتیں کرنے دو یہ دونوں بھائی حضرت کو قبلہ وکعبہ کہتے اور ان ہی لفظوں سے مخاطب بھی کرتے، ہم لوگ اُدھر چلیں یہ کہہ کے انہوں نے دوسرے وسیع کمرہ کی طرف اشارہ کیا اور ہم لوگ ان کے ساتھ اٹھ کر وہاں پہنچے۔ اب تفریحی باتیں بھی اور شوکت بھائی کی بذلہ سنجیاں بھی اور بعض اوقات خوش لحنی کے ساتھ! اشعار بھی۔ غرض ایک بے تکلف ماحول میں پرتکلف مہمان داری کی لذتیں اور دونوں طرف سے بے پایاں خلوص و محبت کے مظاہرے ہوئے۔

مولانا محمد علی کو میں نے جب سے قریب اور گہری نظر سے دیکھنا شروع کیا تھا وہ خوش اور مطمئن تو ضرور تھے مگر خوش حال نہیں تھے اور آخر دور میں تو لنبلونکم بشیٔ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات کے مخاطب صحیح۔ لیکن اندرونی احوال کا تفحص کرنے سے جو حقیقتیں . . . سامنے آتیں ان کی تردید ہمیشہ ان کا دسترخوان کر دیا کرتا۔ میں رام پور کے اس سفر کے بعد بہت بار دہلی میں بھی ان کا مہمان ہوا ہوں مگر دسترخوان کا معیار یکساں بلند ہی پایا اور یہ انداز کہ مہمان کی تواضع جتنی ہو سکے کی جائے۔ ان کو ذیابیطس مدت سے تھا اور ان کے مخلصین کو یہ گلہ تھا کہ محمد علی کتنے ہی پرہیزگار ہوں مگر بڑے بدپرہیز ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس بدپرہیزی میں بڑا دخل ان کی بلند مہمان نوازی کو تھا۔ مہمان کو اچھا کھلانے کے سلسلہ میں انہیں اکثر خود بھی بے اعتدالی کرنی پڑتی۔ اور مہمان داری کا سلسلہ برابر ہی جاری رہتا۔ اس سبب صحیح احتیاط بہت مشکل ہے۔

ان کی اس مہمان داری کے سلسلہ میں ایک واقعہ ایسا ہے جو نہیں بھولتا اور شاید کبھی نہ بھولے ۱۹۲۶ء میں حجاز پر ابن سعود کے تسلط کے بعد ہم کارکنان و حامیان خدام الحرمین اور ذاتی طور پر مجھ سے اور ان سے افسوس ناک علیحدگی بلکہ رنجدہ کشمکش ہو گئی تھی۔ اور ہم نے یعنی حامیان خدام الحرمین نے ان کے ہم خیالوں کے بلائے ہوئے ان دو جلسوں کو بھی ناکام کر دیا تھا۔ جن میں وہ خود بھی شریک تھے۔ اسی زمانہ میں میں ایک بار دہلی گیا۔ دہلی کے اسٹیشن پر پہنچنے کے بعد خیال ہوا کہ ان حالات اور اختلافات کے بعد مولانا کے یہاں جانا کہیں شکر رنجی کو اور نہ بڑھاوے اور خراب نتائج نہ برآمد ہوں۔ مگر پھر خیال آیا کہ ان کو میرے دہلی

آنے کی کسی طرح خبر ہوگئی تو کہیں ان کو رنج و شکایت نہ ہو۔ اور یہ خیال مرحوم کی وسیع القلبی دیرینہ محبت اور پرانے تعلقات کی بناپر تھا۔ میں جھجکتا ہوا کوچہ چیلاں (جہاں ان کا قیام اور ہمدرد کا دفتر تھا) پہنچا۔ دفتر میں تشریف رکھتے تھے۔ اطلاع ہوتے ہی اُٹھے۔ اور پھر حسب معمول وہی معانقہ بھی تھا' وہی استفسار احوال اور وہی احباب۔ فرنگی محل کی دریافت خیریت۔ رات کا کھانا حسب معمول تکلفات سے خالی نہیں تھا۔ کھانے پر بھی دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ اور ان کے ہر انداز سے ظاہر ہو رہا تھا۔ کہ والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس خوب یاد ہے۔

لیجئے بات کرتے **ردسحر** کا زمانہ ختم ہوا اور وہ دور منقضی ہوا جس میں ان سے تنہائی میں برابر ملاقاتیں ہوتی تھیں جس میں ہر آن تسلی، ہر لمحہ تشفی اور ہر وقت اُدھر سے مدارآتیں ہوتی تھیں۔ جس میں ان کے "جوہر" کھل رہے تھے۔ جس میں رحمت دو جہاں نے کئی بار خواب میں ان کے بخت خفتہ کو بیدار فرمایا تھا۔ جس میں بے مائگی کے باوجود درودوں کی سوغاتیں بلائے جانے کی تمنائیں پیش کی جاتی تھیں۔ اور جس میں (بقول خود) ایک "فاجر و فاسق" سے علانیہ کرامتیں صادر ہوتی تھیں۔ جس کی بدولت سجدوں میں معراج کی سی کیفیت حاصل تھی (یاد کیجئے) حضرت مولانا کی وہ بے مثال غزل جس کا ایمان آفرین مطلع ہے :-

تنہائی کے سب دن ہیں' تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

اس غزل میں عشق رسول کا آئینہ دار کتنا روشن و نورانی شعر فرمایا ہے

بے مایہ ہیں ہم لیکن شاید وہ بلا بھیجیں
بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

اور دسمبر ۱۹۱۹ء کا آخری عشرہ آگیا اور کانگریس کے اجلاس کی تیاریاں امرتسر میں مکمل ہوگئیں۔ جہاں اسی سال جلیاں والا باغ میں بیدردی کے ساتھ دفتری اقتدار نے کمال بہیمیت سے اس وقت تک ہندوستانیوں پر گولیاں برسائی ہیں جب تک جنرل ڈائر کا میگزین خالی نہیں ہوگیا تھا۔ اور جہاں مارشل لا نافذ کرکے ہندوستانیوں کی وہ تذلیل کی گئی تھی جس پر ہر شریف انگریز آج بھی پشیمان ہوگا۔ معلوم ہوا کہ اسی عشرہ میں علی برادران کا دور نظربندی ختم ہو اور ... رہائی پاتے ہی وہ امرتسر کے لیے روانہ ہوجائیں گے۔ میں کانگریس کے اجلاس شروع ہونے کے ایک روز قبل ہی کانگریس میں شرکت کرنے سے زیادہ علی برادران کی دست بوسی کے لیے امرتسر پہنچ گیا۔ میرے پہنچنے کے دوسرے روز یہ برادران محترم امرتسر تشریف لائے۔ سکھوں ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتنا شاندار اجتماع امرتسر کے اسٹیشن نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ عقیدت و محبت کے بے مثال مظاہروں میں ان نظربندان اسلام کا عظیم الشان جلوس برابر ان فراخ راستوں میں بڑھتا ہی گیا۔ جدھر سے وہ گزر رہا تھا۔

دن ہی کو اعلان ہوگیا تھا کہ رات کے اجلاس میں مولانا محمد علی کی تقریر ہوگی۔ مغرب کے بعد ہی پنڈال بھرنے لگا۔ یہاں تک کہ جب یہ باعزت بھائی تشریف لائے تو وہاں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ کرسی صدارت (صدر موتی لال نہرو جی تھے) ان کے شایاں شان استقبال و اعتراف خدمات وطنی کے بعد آخر عمر میں گوشہ گیر ہوجانے کے باوجود علامہ اقبال سا... تشریف لائے۔ اور انہوں نے اپنا مشہور قطعہ ختم کرتے ہوئے فرمایا۔

شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست ۔۔۔۔۔ ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

اور "شہباز و شاہین" کہتے ہوئے جب ان دونوں بھائیوں کی طرف اشارہ کیا تو نعرہ ہائے تکبیر کا سلسلہ شروع ہو گیا جو اس وقت ختم ہوا جب یہ "شہباز" منظر عام پر تشریف لے آیا اور محمد علی شوکت علی زندہ باد کے نعرے شروع ہو گئے۔

یاد رہے کہ اس وقت سنگھٹن کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں اور ملکھانوں اور دوسرے ضعیف مسلمانوں کی بستیوں میں اس زمانے میں فتنہ ارتداد اچھا خاصا رونما ہو چکا تھا۔ مولانا محمد علی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا "جب ہم نظربند کیے گئے تھے۔ اس وقت ملک کی بہار شباب پر تھی۔ اب باہر نکلے ہیں تو نفاق و اختلاف کی بادِ سموم چل رہی ہے۔ اگر ملک کی خزاں زدگی کا یہی عالم رہا تو ہم اپنے محبوب وطن میں نہ رہیں گے۔ چاہے بعد کو ہمارے مساجد ویران ہو جائیں۔ ہمارے مدارس اور خانقاہیں سونی ہو جائیں اور ہمارے قبرستان مسمار۔ مگر ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے جانے کے بعد ہندو بھائی ہمارے آثار اور پس ماندہ یادگاروں کی حفاظت کریں گے۔ اس تقریر کے اثنا میں ایک عجیب خاموشی طاری رہی اور بعض آنکھیں آنسو بہاتی رہیں"۔

مولانا ابھی بیٹھنے بھی نہیں پائے تھے کہ نیسی دھر پاٹھک نامی ایک خوش بیاں مقرر اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے مولانا کو مخاطب کر کے عجیب پرسوز آواز میں کہنا شروع کیا یہ آپ نے کیا فرمایا کہ آپ اس غلامستان سے تشریف لے جائیں گے مولانا آپ تنہا نہیں جائیں گے۔ ہم بھی آپ کے ساتھ جائیں گے۔ پھر جہاں مسجدیں مقفل ہوں گی۔ وہاں مندر اور ہماری عبادت گاہوں پر بھی تالے لگ جائیں گے"۔ اس تقریر نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔

میں نے مولانا کے استقبال اور مظاہر عقیدت کے بہت سے شاندار مناظر دیکھے ہیں۔ لیکن امرتسر کے ایسے زریں مناظر کبھی نہیں دیکھے۔

لکھنؤ اس وقت مسلمانانِ ہند کا مرکز سیاسی تھا۔ یہاں ان کے بہت سے احباب اور معتقدین تھے۔ یہاں ان کے پیر و مرشدؒ تشریف فرما تھے۔ اور یہاں کی ایک محل سرا میں وہ اپنے گھر کی ایسی بے تکلفی سے قیام پذیر ہوتے۔ مگر ایک بار ان کی آمد اس محل سرائے (فرنگی محل) میں خاص نوعیت اور روح نوازشان کی تھی۔ آج علی برادران یہاں اس لیے آ رہے تھے کہ انہیں فرنگی محل کی مشہور تعلیم گاہ مدرسۂ عالیہ نظامیہ سے، آخری علمی سند "مولانا" کی ڈگری اعزازی طور پر ملنے والی تھی ان کا اس اعزاز پر شاداں ہونا تو ظاہر ہے۔ مگر ہم سند یافتگان مدرسۂ مذکور آج غیر معمولی افتخار محسوس کر رہے تھے۔ اور میں بے انتہا جذبۂ نازش کے عالم ایک واقعہ یاد کر رہا تھا۔ جو سنۂ یا گیارہ میں پیش آیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت مولانا عبدالباری قدس سرہٗ کے بعض مخلصین کے دو بیٹے لڑکے علی گڑھ کے اسلامیہ سکول میں داخل ہوئے۔ اور بورڈنگ میں قیام پذیر۔ علی گڑھ میں ڈائننگ ہال میں سب بچے یک جا ہو کے میزوں پر کھانا کھاتے۔ حضرت مولانا میز کرسی پر کھانا کھانے کو نہ صرف ناپسند کرتے بلکہ اس کو خلاف سنت بھی سمجھتے۔ حضرت نے اس کے متعلق نواب وقار الملک کو لکھا کہ وہ بچے جو کھانے کے اس انداز کو شرعی نقطۂ نظر سے ناپسند کرتے ہیں انہیں ڈائننگ ہال کی حاضری سے مستثنیٰ کر دیا جائے

اُدھر جواب نفی میں آیا۔ پھر ادھر سے جواب گیا۔ غرض ایک لمبی مراسلت ہوگئی جو آخر میں ٹرسٹیوں کے بورڈ کے سامنے پیش ہوئی
اجتماع میں مولانا محمد علی بھی شریک تھے۔ انہوں نے اس خواہش کو منتزد کرتے ہوئے فرمایا "فرنگیوں کو مسلمان کر لینا سہل ہے
فرنگی محلیوں کو سمجھا لینا سخت مشکل"۔ لیکن آج کا مبارک دن وہ تھا جس میں وہ خود فرنگی محل کی علمی برادری میں شامل ہو رہے
یہ اجتماع بہت پرکیف رہا۔ ایک مختصر تقریر کے بعد مرحوم منصوم صاحب نے انہیں مولانا کی سند دی اور انہوں نے
اعزاز پر آج تک دل کو گرما دینے والی تقریر فرمائی۔ منصوم کی تقریر کے بعد میری ایک نظم ساقی نامہ ہوئی۔ جس کی ایک بیت پر
بھائیوں کے چہروں سے تاثر خاص نمایاں ہو رہا تھا۔ بیت تھی ؎

اپنے ساقی سے تم اب بیعت رضواں کر لو
شوکت دین محمدؐ کا یہ ساماں کر لو

ابھی فرنگی اور فرنگی محلیوں کا ذکر آیا۔ مرحوم کی ذہانت اور بذلہ سنجی بھی ضرب المثل تھی۔ ایک اہم مسئلہ میں مولانا ابو
کی غلط خاموشی پر فرمایا مولانا ابوالکلام اس وقت ابوالسکوت بنے بیٹھے ہیں۔ رام پور ان کا وطن تھا۔ ایک بار سیتا پور کے ذکر
فرمایا۔ سیتا پور ہم رام پوریوں کی سسرال ہے"۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کے یہاں دعوت میں شریفے (سیتا پھل) کھڑے کھڑے
تھے۔ اور اس کے بیج زمین پر گر رہے تھے۔ کسی نے اس کی طرف توجہ دلائی تو فرمایا میں علی گڑھ میں شریفوں کی تخم پاشی کر رہا
اپنے ایک دوست کو تخم الغبی کہتے۔ کیونکہ تحریری صورت میں ان کا نام اس سے مشابہ تھا۔ اسی طرح ایک دریدہ دہن رسا
کو "بلبسوا" بے تکلفی کی محفلوں میں فرماتے۔ ایک لٹھ باز ایڈیٹر کے ذکر میں فرماتے ؎

حبیب خستہ لٹھ باندھے ہوئے پھرتا ہے گلیوں میں۔

اس اڈیٹر کا نام حبیب تھا۔ حجاز کی موتمر اسلامی سے واپس آئے تو اس موتمر میں شریک ہونے والے خاص نمایند
"عضو مخصوص" کہے جانے کو عجب انداز سے بیان کرتے اور اس پر مسکراتے۔ اسی طرح مجاہدی قبائل غط غط اور دخنہ کا تبسم آ
انداز سے ذکر کرتے۔ منادی (دہلی) اور ہمدرد کی وہ جنگ عظیم جس کو بعد میں خواجہ حسن نظامی نے جنگ "صفین" کے نام
کتابی شکل میں شایع کیا، کا ذکر فرماتے کہتے ہیں آج کل "ختم خواجگاں میں مشغول ہوں"۔ انگریزی فوج میں داخلے کو حرام بتان
جرم میں کراچی کے خالق دینا ہال میں ان پر اور ان کے ساتھیوں یعنی اس تجویز کی تائید کرنے والوں پر ۱۹۲۱ء میں وہ مقدمہ چل
تھا جس کی سزا کے متعلق قانون دان یہ سمجھتے تھے کہ کم از کم چودہ سال قید با مشقت ہوگی۔ دوران مقدمہ میں سی۔ آئی۔ ڈی
سب انسپکٹر نے جس کا نام لخت حسنین تھا۔ عدالت کی توجہ ایک کاغذ کی طرف دلاتے ہوئے کہا "حضور یہ کاغذ پن کے ذر
میری پشت پر لگایا گیا ہے۔ اور یہ میرے لیے سخت توہین آمیز ہے۔ کاغذ پر لکھا ہوا تھا ؎

محمد کا دشمن علی کا عدو
نہ کہہ اپنے کو لخت حسنین تو

ظاہر ہے کہ یہ شعر اسی کا ہو سکتا ہے جو شدید سے شدید ابتلا میں ہمالیہ کی طرح ثابت قدم رہا اور جو فرما چکا ہے
ہر حال میں راضی برضا ہو تو مزا دیکھ"۔ کیونکہ توازن دماغی کا برقرار رہنا اور فطری ذہانت کا کارفرما رہنا ان حالات میں ہی

کام نہیں تھا۔

یہ مقدمہ بھی ہندوستان کی تحریک آزادی اور انگریزی اقتدار پہ ضرب کاری لگائے جانے کی اہم ترین یادگار ہے۔ ان بدبخت ہندوستانی مسلمانوں سے جو بقول لارڈ الینبائی فلسطین کو علم اسلامی کے سایہ سے محروم کرنے اور برطانیہ کے پنجہ استبداد میں دے دینے والی فوج کے ۲/۳ تھے۔ اور جنہوں نے ٹرکی، مصر، عراق اور خدا معلوم کن کن اسلامی محاذوں ۲۰ ۲۰ ماہوار پر اپنا ایمان فروخت کیا تھا۔ ان سے برطانیہ کی فوج سے علیحدگی کو کہنا مولانا اور ان کے شیر دل ساتھیوں مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد، سیف الدین کچلو اور شنکر اچاریہ اور مولانا نثار احمد کانپوری کا ہی کام تھا اور آزاد ہندوستان ان کو صدیوں دعائیں دے گا کہ انھوں نے برطانوی فوجی اقتدار پر جس کے رکن رکین ہم بدبخت مسلمان تھے ضرب کاری لگا کے اس کی چولیں ہلا دیں۔ مولانا نے جواب دیتے ہوئے جو مجاہدانہ بیان دیا تھا وہ ایک وہی سچا مسلمان دے سکتا ہے۔ جس کی آنکھوں کے سامنے وہ سب ہو جو حضرت عمر فاروق رضؓ کے ایران بھیجے ہوئے ناظم اسلام نے شاہ ایران کے دربار میں کہا اور کیا تھا ؎

یہ مرتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

میرے حقیقی چچا مولانا عنایت اللہ المغفور جو دینی اور فقہی معاملات میں مشورہ دینے کے لیے اس موقع پر کراچی گئے تھے فرماتے تھے۔ ہندوستان لرزہ براندام تھا کہ اس مقدمہ کا انجام کیا ہوگا۔ مگر ان جلیل القدر اسیران کراچی نے دیو استبداد کی آخری ہچکی اور فرعونی اسٹیج کے ایک سین سے زیادہ اس کو نہیں سمجھا۔ اور چونکہ اس تجویز کے محرک مولانا محمد علی تھے۔ اس لیے خیال تھا کہ ان کو اپنے بہادر ساتھیوں سے بھی کچھ زیادہ سزا ملے گی۔ مگر ان کے تیور وہی شیرانہ تھے۔ ان کی باتیں اتنی ہی دلچسپ تھیں۔ اور ان کے کسی انداز سے ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ابتلائے عظیم اور گویا سولی کے تختے پر ہیں۔ اس کھیل کا ڈراپ سین ہوا ان حق پرستوں کی دو دو سال کی قید پر، اور ہندوستان کی فضا گونج اٹھی ؎

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس

مولانا ابھی قید کے مصائب جھیل رہے تھے کہ ان کی صاحب زادی آمنہ جو اپنے والد ماجد سے صورتاً اور سیرتاً بہت مشابہ تھیں بخار میں مبتلا ہوئیں۔ جس نے بڑھ کے دق (T. B) کی ہولناک شکل اختیار کی۔ دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے۔ ان کے کوئی فرزند نہ تھا۔ لے دے کے یہی بچیاں تھیں جو ان کے قلب کی تسکین اور گھر دگرانہیں گھر میں بیٹھنا کب نصیب ہوا۔ ان کی رونق تھیں۔ جن کا غم زدہ بے بس اور مجبور باپ ہیں تو مجبور ہوں اللہ تو مجبور نہیں" کہہ کے اپنے دل کو تسکین دیا کرتا۔ زیادہ بے چین ہوتا تو اپنے قلب خاشع اور مضطرب کو یہ کہہ کے اطمینان دلا دیتا ؎

تیری قدرت سے خدایا تیری رحمت نہیں کم | آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

مگر مرض بڑھتا ہی گیا، دعائیں کیں تخرج الحی من المیت فرمانے والے سے خدا معلوم کن کن لفظوں میں التماس شفا کی پیسہ پاس ہی کب تھا مگر جیل میں بیٹھے بیٹھے اپنی حیثیت سے دوا علاج کرایا۔ تدبیروں کی ناکامیوں کے عالم میں قید کی میعاد پوری کرکے آزاد ہوئے تو رفتار علاج اور تدابیر صحت اور تیز ہو گئے۔ اسی علالت شدید کے عالم میں آمنہ کو مخاطب کرکے

وہ کہہ گذرے جس نے ان کے ظرف عالی توکل علی اللہ، مالک کلی کی مرضی پر راضی رہنے اور شان تسلیم و بندگی کو عالم آشکار کر دیا۔ ایسے موقعوں پر یعنی دل سے لگی ہوئی تمناؤں کے پورا کرنے کے لیے اوروں کو چھوڑ یئے مسلمان تک بدر... و اعمال مشرکانہ کے ارتکاب اور غیر دینی تدابیر اور غیر شرعی منتوں کے دیوانہ وار مرتکب ہو جاتے ہیں مگر حضرت محمد ر... سے مناسبت رسمی رکھنے اور کروڑوں خدا پرستوں سے زیادہ اس نادر مطلق کو اپنے تئیں اس کے حوالے کر دینے والا فرماتا ہے۔ جو ان کانوں نے کبھی نہیں سنا تھا ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

شئی مطلب کے نہ حاصل ہونے پر صبر کر لینا ہی بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن ہمارا مطلوب اگر اس کا مطلوب نہیں جو ار... الراحمین بھی ہے تو ہم کو بھی مطلوب نہیں منظور" کہنا اور دل سے کہنا اولیاء اللہ اور خاصان خدا ہی کا کام ہے۔ سچ تو یہ ... کہ یہ شعر سیدنا ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان غیر فانی ارشادات کی اردو میں مکمل ترین ترجمانی ہے جو آں حضور نے ا... آخری صاحبزادے سیدنا ابراہیم کے نزع کے عالم میں فرمائے تھے۔ یہ شعر اس دنیا میں صرف وہی کہہ سکتا تھا جس نے اُردو... میں توحید کی یہ مکمل اور بے نظیر تشریح فرمائی ہے ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

ہاں وہ اللہ کے لیے بادشاہوں سے لڑ جاتے۔ وزرائے اعظم سے خفا ہو جاتے۔ دنیا کی سب سے بڑ... حکومت سے بگڑ جاتے، اپنی پارٹی سے روٹھ جاتے۔ اور شاید اسی وجہ سے ان تمام سیاسی جماعتوں میں جن سے ا... تعلق، اقتدار و احترام کے ساتھ رہا آں مرحوم اپنی پارٹی کبھی نہ بنا سکے۔ اور حد یہ ہے کہ جذبہ للھیت انہیں اپنے خاص ... اور رفقاء کی غلط مروت اور طرف داری سے روکتا رہا۔ اسی وجہ سے وہ عوامی لیڈر کبھی نہیں بن سکے۔

کلمہ حق عند سلطان جائر جہاد ہی نہیں افضل الجہاد ہے۔ لیکن مامورین جہاد میں کتنوں کو یہ شرف حاصل ہوا ... ہماری یاد میں اس دور میں تو مولانا اس میدان کے سب سے بڑے سورما تھے۔ یاد کیجیے۔ جب خلافت کمیٹی کا وفد ... کی قیادت میں لندن پہنچا مولانا المغفور اس کے خطیب تھے۔ اس وقت برطانیہ عظمیٰ کے فرعون صفت وزیر اعظم لائڈ جار... سے جس مساویانہ، دلیرانہ بلکہ بے باکانہ انداز سے گفتگو فرمائی اور خلافت اور سلطنت عثمانیہ کے بارے میں انگریزوں ... ابلیسانہ اور بربرانہ پالیسی کے جس طرح چیتھڑے اڑائے ہیں۔ اس کی کوئی مثال نہ اس وقت پیش کی جا سکتی تھی نہ آج ... اس گفتگو کی تفصیل بتاتے ہوئے انھوں نے فرمایا تھا کہ میں نے اس سے کہا سیاسی مطالبات میں لین دین بھی ہوتا ہے۔ دنیا... معاملات میں طرفین تھوڑا بہت دب کے مفاہمت کر لیتے ہیں۔ لیکن خلافت اور جزیرۃ العرب کا مسئلہ خالص دینی ہے۔ الل... حسب ارشاد قرآن دین مکمل اور نعمت الٰہی کا اتمام ہو چکا ہے۔ ہم اپنے مطالبات میں ذرا سی کمی کر کے ... جائیں گے۔

نعمت اللہ نامی ایک بدبخت قادیانیت کے جرم میں شاہ افغانستان کے حکم سے سنگسار کیا گیا۔ علمائے اسلام نے خاص طور پر اور ملت اسلامیہ ہندیہ نے عام طور پر اس سزا کے جواز اور اس کی معقولیت کا اعتراف کیا۔ لیکن مولانا المغفور شاید تمام مدیران جرائد میں تنہا اس فعل کو غیر شرعی اور غلط بتایا۔ یہاں تک کہ کہنے والے کہہ گذرے کہ یہ سب اپنے ایک بڑے بھائی کی محبت کی وجہ سے ہے۔ جو قادیانی تھے۔ مگر ان کے نزدیک جو حق تھا اس کے اظہار میں لومۃ لائم کی ذرہ برابر پروا نہیں کی۔

ملعون راج پال نے ایک شیطانی کتاب میں جس کا نام بھی لیتے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں حضرت رسول طاہر و مطہرؐ کی شان اقدس میں بے انتہا گستاخیاں کیں۔ حکومت پنجاب نے اس پر مقدمہ چلایا اور نیچے کی عدالتوں سے اسے جب سزا ہو گئی تو اس نے ہائی کورٹ میں اپیل کر دی۔ یہاں جسٹس دلیپ سنگھ نے جو اسماً ہندو اور مذہباً عیسائی تھے اسے رہا کر دیا۔ تمام اسلامی دنیا چلا اٹھی کہ دلیپ سنگھ نے مذہبی ہمدردی کی بنا پر رہا کر دیا ہے مگر ایک ہمدرد ہی کا اڈیٹر تھا جو بڑی جسارت کے ساتھ چیخ چیخ کے فرما رہا تھا "نقص قانون کا ہے۔ اس جج پر غصہ کرنے کے بدلے اس دفعہ کو بدلوانے کی کوشش ہونی چاہیئے۔ جس کے ناقص ہونے کی بنا پر یہ ملعون رہا ہو گیا۔"

اسی طرح شاردا ایکٹ کے نفاذ کو اسلامی پرسنل لا میں مداخلت خیال فرماتے تھے۔ جس نے مرد و عورت کیلئے نکاح کی عمر کی کوئی تعیین نہیں فرمائی ہے۔ اس سلسلہ میں نان کو اپریٹر ہونے کے باوجود وہ گورنر جنرل سے ملے اور صداقت بے باک نے اس وقت ان کی زبان سے وہ سب کہلوا دیا جو صرف وہی فرما سکتے تھے۔

یہ سب تو ایک دستوری اور باقاعدہ حکومت کے مقابلہ میں تھا ۲۷ء میں ان کا سامنا شخصی اور خالص استبدادی حکومت سے ہو گیا۔ ابن سعود نے ۲۶ء میں حرمین شریفین پر قبضہ کر لینے کے بعد اعلان کیا کہ میرا قبضہ تو عارضی ہے۔ حجاز تمام عالم اسلامی کا ہے۔ مسلمان جو کچھ اس کا فیصلہ کریں گے وہی نافذ ہو گا۔ اس گھڑی گھڑی اعلان کردہ پالیسی کی لاج رکھنے کے لیے ابن سعود نے آخر ایک موتمر اسلامی مکہ معظمہ میں موسم حج میں طلب بھی کر دی۔ ہمارے مولانا بھی خلافت کمیٹی کے وفد کے ایک رکن تھے۔ اور غالباً وہی ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے زیادہ لڑنے کا حق رکھتے تھے۔ اس لیے کہ انہوں نے اس حکومت کا اس کے اعلانوں کی روشنی میں اچھا خاصا خیر مقدم کیا تھا۔ اور بے غرضی کے ساتھ اس کی حمایت کرتے ہوئے اپنے بہت سے عزیز دوستوں اور مسلمانوں کی ایک خاصی تعداد کی مخالفتوں کی بھی پروا نہیں کی تھی۔ انہوں نے اس حکومت کے تطہیر حجاز کے وعدوں کے خوب خوب پرخچے اڑائے اور اس حکومت کو شخصی اور نسلی حکومت کہتے ہوئے انہیں اس وقت کی حکومت کی روش ذرا خائف نہ کر سکی۔

آخر اس حکومت کی پولیس سے ان کی ٹکر ہو ہی گئی۔ اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ اس موتمر سے فرصت اور حج سے مشرف ہو کے وہ مدینہ منورہ بڑی تمناؤں، آرزوؤں اور مسلسل دعاؤں کے بعد حاضر ہوئے۔ وہاں پہنچتے ہی غسل کر کے اور معطر کپڑے پہن کے وہ سیدھے حرم نبوی میں حاضر ہوئے اور مواجہہ اقدس اور اطہر میں جو کچھ کیا اس کو میں ان کے دماغ نواز اور روح پرور شعروں کے عینک سے گویا یہ دیکھ رہا ہوں کہ انہوں نے آستان پاک پر اپنا سر رکھ دیا۔ نجدی وحشی جندی (کانسٹبل)

واللہ ھن ع بل ھو" کہتا ہُوا انہیں دھکا دے کے ہٹانے کے لیے آگے بڑھا تو انہوں نے صاحب مزار پاک کو مخاطب کرتے ہوئے عرض کیا ؎

عشق خود بدعت و سرمایۂ صد بدعت ہے
رحم کر، رحم کہ عاشق تیرا مجبور ہے آج

پھر کورہ دل نجدی نے کہا ایک گزر جانے والے کے آگے جھکنا شرک ہے۔ تو انہوں نے فرمایا ؎

چھوڑ فقیہی کے لیے مسئلہ موت و حیات
ایک جلوہ ہے، عیاں تھا کبھی مستور ہے آج

یہ حق گوئی ان کی اپنوں اور اپنے محرموں کے سامنے بھی اسی شان کے ساتھ تھی۔ ان کے مرشد برحق حضرت مولانا عبدالباری قدس سرہ کا پہلا عرس تھا۔ جس کی شرکت کے لیے علالت کے باوجود وہ فرنگی محل آئے۔ عرس کے سلسلہ میں وہ قوالی میں بھی شریک ہوئے۔ اور حضرت کے جانشین مولانا قطب میاں المغفور کو برابر نذریں دیتے رہے کہ قوال نے گاتے گاتے یہ شعر گایا ؎

نکیرین آگے پوچھیں گے تو کہہ دونگا کہ بندہ ہوں
قیام الملۃ والدین محمد عبد باری کا

لفظ "بندہ" وہ برداشت نہ کرسکے اور فرمایا "پیرو" کہو اور قوالی کے بعد انہوں نے حضرت کے جانشین حضرت سے بھی اس کے متعلق گفتگو فرمائی۔

کاتب الحروف پورے وثوق سے کہتا ہے کہ مولانا المرحوم کو اپنے مرشد برحق سے بے انتہا محبت تھی اور احترام وادب وعقیدت اور منت پذیری میں وہ اپنے بہت سے برادران طریقت سے آگے تھے۔ وہ حضرت کے علمی و روحانی درجہ بلند کا صحیح اندازہ کرکے مشرف بہ بیعت ہوئے تھے۔ اس لیے وہ حضرت کی خوشنودی اور رضا کو بہت اہم سمجھتے۔ اور ایک والہانہ انداز سے ان کے دعاگو اور خیر سگال تھے۔ حضرت موصوف نے ایک مختصر علالت کے بعد ۴ رجب ۱۳۴۴ھ (۱۹۲۶ء) کو وصال فرمایا۔ اپنی مولانا المرحوم علالت کے باوجود جلد از جلد تعزیت کے لیے فرنگی محل تشریف لائے۔ بے انتہا مغموم، حد سے زیادہ رنجیدہ و بے قابو۔ فاتحہ کے بعد حضرت کی تربت پاک پر پہنچ کے وہ غم سے بدحال ہوگئے۔ حضرت کے سیوم میں بھی وہ برابر اشک بار رہے۔ حضرت کی ذات تو ان کی منتہائے نیاز اخلاص تھی۔ ان کے اعزہ کے ساتھ ان کا تعلق عزیزوں کا سا تھا۔ وہ حضرت سے محبت کرنے والوں سے بھی یگانگی سے ملتے۔ اس محبت اور بے پایاں اخلاص کا اندازہ ہوتا۔ جب دونوں میں اختلاف ہو جاتا۔ یا مرشد برحق کو اپنے مریدوں کے کسی طرز عمل پر ناگواری ہوتی اور وہ اس کا اظہار اپنے معمول کے مطابق مولانا سے صاف صاف کہہ دیتے۔ ایسے دو مواقع خوب یاد ہیں۔ جن میں انہوں نے سرنگوں اور معذرت کا وہ انداز اختیار کیا۔ جس کو محمد علی کو جاننے والے مشکل سے باور کریں گے اور کس قدر قیامت انگیز تھی۔ وہ کش مکش جو دونوں حضرتوں میں نجدی تسلط حجاز کے

تقریباً ایک سال رہی۔ ہمارے مخالفین نے کیا کیا سازشیں، کیا کیا ریشہ دوانیاں اور کیا کیا فتنہ انگیزیاں نہیں کیں۔ مگر مولانا المغفور نے قطع تعلق کرنا کجا اپنے اخبار میں کبھی اس کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ اور کئی بار ان نا ہنجاروں کو سختی سے جھڑک دیا جو "فرنگی محلیت" کو جرم اور قابل استیصال سمجھتے تھے۔

"ہم" سے ان کا تعلق کس انداز کا تھا اس کا اندازہ ایک خاص واقعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ ۲۴ء میں علی برادران کے لیے آم خوری کا ایک پروگرام بنایا گیا۔ آم تو نام کو تھے۔ اصل مقصد اس تحریک خلافت کو ابھارنا تھا جو روز بروز سرد ہوتی جاتی تھی فرنگی محل کی دعوت کے بعد بارہ بنکی کے مختلف مقامات دعوتیں ہوئیں۔ آخر میں علی برادران مولانا عبدالماجد صاحب کے یہاں ان کی دعوت پر دریاباد تشریف لے گئے۔ اس زمانہ میں مولانا عبدالماجد صاحب کو قوالی سے خاصی دلچسپی تھی۔ اور علی برادران کو بھی اس کا ذوق بلند تھا۔ قوالی شروع ہوئی۔ اب نذر کی باری آئی۔ نذر تو بزرگوں کو دی جاتی ہے۔ یہاں جو علی برادران سے زیادہ محترم کون تھا۔ مگر یہ مسئلہ قوالی شروع ہونے کے بعد یوں حل ہو گیا کہ وہ اٹھے اور انہوں نے حضرت مولانا عبدالباری قدس سرہ کے رشتہ کے ایک اس بھتیجے کو نذر دی جس نے بیعت کے باوجود حضرت سے کچھ حاصل نہیں کیا تھا اور جس نے ان سے پڑھنے کے زمانے میں کبھی جی لگا کے نہیں پڑھا تھا۔ اور جس کو عملی بے بضاعتی کی وجہ سے اب بھی حضرت سے اپنے تعلق بیعت و تلمذ کو ظاہر کرتے شرم سی آتی ہے۔

ان کی پریشانیاں بیماریاں، مخالفتیں برابر بڑھتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ وقت قریب آگیا۔ جس میں رب غیور نے ہم ناقدر شناسوں اور محسن کشوں سے اس جوہر گراں قیمت کو واپس لے لینا مقدر فرمایا تھا۔ شدید علالت، بے انتہا افکار اور دیدۂ ظاہر کی بے نوری کے باوجود ؎

انقلابات سپید و سیاہ عالم سے
دل تو روشن تھا مگر دیدۂ ظاہر بے نور (شہید)

وہ ۳۰ء کے آخر میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت فرمانے لندن تشریف لے گئے۔ اس کے اجتماعوں اور کمیٹیوں میں جس انداز سے وہ ہندوستان کے لیے مردانہ وار لڑے ہیں۔ جس ہمت مجاہدانہ کے انہوں نے ثبوت دیئے ہیں۔ اور اپنے تدبر عالی دماغی اور نکتہ رسی کے جو با عظمت و غیر فانی مظاہرے فرمائے ہیں وہ بڑے سے بڑے ہندوستانی کے مقدر میں نہیں تھے۔ لیکن وہ تو کئی سال پہلے اس کی پیشین گوئی فرما چکے تھے۔

یہ مرتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا   ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

یہ تو انہیں کا ظرف، ان ہی کی روشن ضمیری، انہیں کی ہمت، ان ہی کے دل کی لگن تھی کہ وہ یہ فرما دیں

"میں اب غلام ہندوستان میں واپس نہیں جاؤں گا یا تو ہندوستان کو آزادی دیجئے یا مجھے قبر کے لیے دو گز زمین۔

ہائے کہ وہ ہندوستان واپس نہیں آئے اور ۴ جنوری ۳۱ء کو اس رحمٰن کے پاس واپس گئے۔ جس کی آغوش رحمت ان کے لیے تھی۔

تمام اسلامی بستیوں میں جس طرح ان کا ماتم ہوا۔ تعزیتیں کی گئیں، نوحے اور ماتم ہوئے۔ ان کا سوگ منایا گیا۔ اور دنیا کے اخباروں نے جس طرح ان کو خراج عقیدت پیش کیا۔ وہ ان کی ذات گرامی کی طرح فقید المثال و یگانہ تھا۔
ان کی وفات کی خبر آتے ہی ہندوستان کیا؟ اسلامی ملکوں کی طرف سے مولانا شوکت علی سے درخواست کی گئی کہ ہماری زمین کو یہ امانت سراپا جلالت سپرد کی جائے۔ مگر مسلمانوں کے قبلہ اول نے بڑھ کے اس امانت کو اپنی گود میں لے لیا
لہ جنتیں ہوں علامۂ اقبال پہ کہ مرحوم مولانا کا مرثیہ کہتے ہوئے بڑے پتے کی بات کہہ گئے۔

خاک قدس او را بہ آغوش تمنا در گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

مگر غربت میں افضل الجہاد کرنے والے اس شہید نے تو پہلے ہی فرما دیا تھا ؎

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے
پر غیب سے سامان بقا میرے لیے ہے
پیغام ملا تھا جو حسینؓ بن علیؓ کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے

سید محفوظ علی بدایونی

محمد علی

بچپن اور شباب

اللہ تعالیٰ محمد علی کی مغفرت فرمائے۔ ان کے بچپن کی صورت اس وقت میری آنکھ کے سامنے ہے۔ چھریرا بدن ہونے کے باعث قد، باعتبار [illegible] لانبا، پیشانی بالوں سے دبی ہوئی، ناک ستواں، کان کی لویں زیادہ ڈھلکی ہوئیں۔ آنکھیں کسی قدر چھوٹی اور اندر دھنسی ہوئیں۔ ہونٹ پتلے، اوپر کی دونوں کچلیاں دانتوں کی قطار سے نیچے نکلی ہوئیں، جو بولتے یا ہنستے وقت دکھائی دیتی تھیں۔ یہ کچلیاں ولایت میں دندان سازوں سے رتوا کر برابر کرائی گئی تھیں۔ عموماً سپید کرتہ، پاجامہ بہت زیادہ چوڑی گوٹ کی سپید رامپوری وضع کی ٹوپی، آواز بھرائی ہوئی۔ گفتگو میں ضرورت سے زیادہ تیزی جس کے باعث الفاظ زبان سے آدھے پونے ادا ہوتے تھے (شوکت سے تصدیق کی جائے) ضعف مثانہ کی شکایت جس نے ذیابطیس کی شکل میں آخر دم تک ساتھ دیا، بچپن ہی سے تھی۔ چنانچہ اکثر صبح کو بستر کی نمی سخت سرزنش کا باعث ہوا کرتی تھی۔

طبیعت میں نقالی کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ اس وقت دو مثالیں ذہن میں ہیں۔

(۱) بھائی ذوالفقار علی خاں ازل سے حسن پرست دل اور عیش پرور دماغ لے کر آئے تھے۔ ایسے دل و دماغ کو شاعری سے جتنا لگاؤ ہو تھوڑا ہے۔ داغ جیسا یگانہ روزگار شاعر رامپور میں موجود، لہٰذا داغ کے شاگرد ہوئے اور گوہر تخلص کیا۔ محمد علی نے ہوش سنبھالا تو شعر و شاعری کا گھر میں چرچا سنا۔ فوراً بڑے بھائی کی دیکھا دیکھی اور انہیں کے تخلص کی رعایت سے نو دس برس ہی کی عمر میں اپنا تخلص جوہر رکھ لیا۔ بریلی کے بورڈنگ ہاؤس کے بڑی عمر کے طلبہ مذاقاً پوچھتے۔ بھائی محمد علی صاحب آپ کا تخلص کیا ہے، تو لکھنوی شاعرانہ انداز میں جواب دیتے "خاکسار کو جوہر کہتے ہیں" کسی قدر اصرار پر کچھ تکیں بھی سناتے تھے جو افسوس کہ یاد نہیں۔

(۲) بورڈنگ ہاؤس بریلی میں ہم مسلمان طلبہ نے ایک انجمن قائم کی، جس میں انٹرنس کلاس سے بی اے تک کے طلبہ شامل تھے۔ چونکہ اس زمانہ میں بورڈنگ ہاؤس میں آنولہ، گورکھپور اور بجنور کے چھوٹے بچے بھی تھے۔ لہٰذا محمد علی نے اپنے ہم سن بچوں کی ایک جداگانہ انجمن بنائی، جس کے سیکرٹری وہ خود تھے۔

ایک دن صبح کے وقت میں نے دیکھا کہ محمد علی کاغذ کا ایک پرزہ لئے پھاٹک پر کھڑے ہیں۔ کہ اس پرزے کو اونچی جگہ کونہ سے چسپاں کریں۔ میں نے کہا "لاؤ میں لگا دوں"۔ دیکھا تو انگریزی میں انہیں کے ہاتھ کا لکھا ہوا نوٹس تھا۔ جلسہ گیارھویں

تاریخ ہونے والا ہے۔ گیارھویں کو انہوں نے 11 ST لکھا تھا۔ میں نے پوچھا یہ کیا؟ کہنے لگے ٹین فرسٹ N FIRST I
میں نے آہستہ سے کان گرم کئے اور اصلاح کردی۔
جب شوکت نے بنارس سے اولڈ بوائے نکال کر کسی موقع پر مضامین کا تقاضا کرتے ہوئے اپنے قلم کی نوک سے
چبھ کے دئے۔ تو زمانہ طالب علمی کے کچھ حالات بیان کرتے ہوئے اس واقعہ کو فروری 1919ء کے اولڈ بوائے میں بالفا
یاد دلایا گیا تھا۔
"۔۔۔۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گیارھویں تاریخ کو ٹین فرسٹ لکھنے پر محمد علی کی کن پچی ہوئی تھی۔ نہ اب کا زمانہ کہ م
محمد علی بی اے آکسن کلکتہ جیسے ولایت زا شہر میں کامریڈ نکال کر اچھے اچھوں کی گوشمالی کرتے والے ہیں۔"
محمد علی اسے پڑھ کر بہت ہنسے اور کہنے لگے جس نے میرے کان کھینچے تھے میں اس کی داڑھی کھینچوں گا اور وہ فوراً۔
لگے، مگر ویسے ہی جیسے چھوٹے بچے کھینچتے ہیں۔
بھیا یہ بلا کے ذہین مگر کم محنت تھے۔ استاد سب خوش رہتے تھے۔ مزاج میں تیزی اور حاضر جوابی تھی۔ مگر شرا
جس سے بڑوں کی طبیعت کو تکدر ہو، نام کو نہ تھی۔
شوکت خوش گپ اور یار باش ہونے کے ساتھ کاہل اور خوگر حکمران ہو چکے تھے۔ طالب علموں کے مجمع میں بیٹھے "
پالن لاؤ۔ پان لاؤ۔ ہیٹ اٹھاؤ۔ اچکن رکھ آؤ،" کہا کرتے تھے۔ ایک دن خطیب جی مولوی سخاوت حسن مرحوم اسسٹنٹ ا
مدارس نے محمد علی کو سگ باش و برادر خورد مباش کے معنی سمجھائے۔ میں نے کہا ایک دوسرا جملہ بھی ہے۔ خر باش و براد
مباش۔ خطیب جی نے اس کے معنی بھی سمجھا کر کہا تو محمد علی تم سگ ہوئے۔ اور شوکت خر!! محمد علی نے ہانپتی ہوئی آواز اور
ہوئے لہجہ میں فوراً جواب دیا "جناب میں سگ بننا پسند کروں گا۔ مگر شوکت بھائی کا خر بننا پسند نہ کروں گا۔ خطیب ج

علی گڑھ نے محمد علی کو پہلے ایک باادب مراہق اور پھر ایک مہذب نوجوان لکھا جو قابل رشک اہلیت کے سا
ہیں لکچر سنتے۔ فیلڈ میں کرکٹ کھیلتے اور یونین میں تقریر کرتے تھے۔ شوکت کہ لاابالی خوش گذران اور ہنگامہ پسند طبیع
آدمی تھے۔ جنہیں دونوں اپنے کمرہ کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوتی تھی۔ محمد علی کی نگہداشت زیادہ تر کپتان عبداللہ
زیر نظر ہوئی۔ جن کی محبتوں اور خوبیوں کو یاد کر کے محمد علی اکثر ان کی بے وقت موت پر متاسف ہوا کرتے تھے۔
بی اے میں شاید یونیورسٹی بھر میں اول آئے تھے۔ مسٹر گوکھلے کی وفات پر دہلی کے ٹاؤن ہال کے میدان
ہوا کہ پنڈت مدن موہن مالویہ یا سر سریندر ناتھ بنرجی نے بیان کیا کہ گوکھلے نے اکیس سال کی عمر میں بی اے کیا۔ اور یو
امتیازی جگہ حاصل کی۔ مجھے یاد آتا ہے کہ محمد علی نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ گوکھلے علم و قابلیت کا مجسمہ تھے۔ ان
یہ امور باعث فخر نہیں۔ آپ کا یہ نیاز مند جو گوکھلے سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ بیس سال کی عمر میں یونیورسٹی میں او
یہ سنکر حاضرین تکنے لگے تو پہلے مقرر صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

علی گڑھ کالج میں کامیابی کے بعد ۱۸۹۸ء میں محمد علی ولایت گئے۔ جہاں ان کی علمی کوششوں کا ماحصل سول سروس کے امتحان کی تیاریوں اور اس کے بعد آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی اے کی امتیازی سند کا حصول ہی نہیں ہے۔ بلکہ ان کی ہمہ گیر ذہانت نے انگریزی ادب، انشاء، مصطلحات و محاورات، طرز ادا و طریقہ بیان پر اس درجہ تبحر و عبور حاصل کیا کہ ان کے قلم و زبان دونوں کو جاہلوں سے لے کر عالموں، گنواروں سے لے کر شہریوں، فقیروں سے لے کر امیروں اور مزدوروں سے لے کر امیروں تک کے الفاظ و عبارات کے ادا کرنے پر یکساں قدرت و مہارت حاصل تھی۔ ملاحوں کے سرود انہیں یاد تھے۔ اناؤں کی لوریاں انہیں یاد تھیں لیمرک (LIMERICK) وہ ہزلیات (جو THERE WAS سے شروع ہوتی ہیں) انہیں یاد تھیں۔ BALLAD انہیں یاد تھے۔ معمے اور چیستاں انہیں یاد تھے۔ اس کے ساتھ انگریزی متقدمین، متوسطین اور متاخرین، شعراء و مصنفین کے بہترین علمی اور ادبی جواہر پارے ان کی زبان اور ان کی نظر میں تھے۔ انجیل کی کتب عتیق و جدید سے ان کو لگاؤ تھا۔ سینکڑوں علمی لطیفے ان کی نوک زبان تھے۔ طبیعت میں نرمی، بذلہ سنجی، ظرافت و شوخ نگاری کا رنگ غالب تھا۔ لہذا اسی صنف میں ایسا بے ساختہ اور اتنا بہتر لکھ سکتے تھے۔ کہ بسا اوقات ان کے اور لندن پنچ کی ظرافت میں مشکل سے امتیاز خصوصی تھا۔ یہ ایک جاہل اور ہندی ہیچمدان کا والہانہ خیال نہیں بلکہ بڑے بڑے انگریز ادیبوں کی غیر جانبدارانہ رائے ہے۔ جب تک محمد علی کا قلم گورنمنٹ کے معتوبوں کی فہرست میں موٹے حرفوں میں نہ لکھ سکا۔ انگریزوں کی اچھی خاصی تعداد کامریڈ کی خریدار ان کے مضامین کی عاشق اور اس کے طرز نگارش کی مداح تھی۔ وائسرائے کی بیگم صاحبہ وقتاً فوقتاً ٹیلی فون پر دریافت کرتی رہتی تھیں کہ کامریڈ کسی وقت تک چھپ کر ان کے پاس پہنچ جائے گا سر فلیٹ وڈ ولسن SIR FLEET WOOD WILSON ہندوستان کے وزیر مالیات جب ولایت جاتے لگے تو محمد علی ان سے ملنے گئے۔ باتیں کرتے کرتے وہ محمد علی کو اس کمرے میں لے گئے جہاں ان کا سامان سفر بندھ رہا تھا۔ ایک صندوق کہ جس کا اوپر کا تختہ کیلوں سے جڑا ہوا تھا کھلوا کر کہنے لگے "محمد علی دیکھو اس میں کیا ہے"، دیکھا تو کامریڈ کے پرچے تھے، کہنے لگے "میں لندن پنچ کے لئے یہ تحفہ لئے جا رہا ہوں"۔ محمد علی بولے "پنچ کے ایڈیٹر کو تو کامریڈ برابر جاتا ہے"۔ کہنے لگے "وہ اور بات ہے مگر میں اپنے دوست سر اوین سیمن ایڈیٹر پنچ کو ان کے لائق مذاق اس سے بہتر ہدیہ ہندوستان سے نہیں لے جا سکتا۔ تمہاری اور ان کی تحریر میں تمیز کرنا مشکل ہے۔ اس کی داد وہی دے سکتے ہیں۔

محمد علی نے ۱۹۱۱ء میں کامریڈ کے صفحات پر گپ کے نام سے ادب لطیف کا جو اشتہار لگایا تھا۔ بہت کم لوگوں کو شاید اس کا علم ہو کہ اس جنس لطف فروز کا نمونہ وہ ۱۹۰۴ء میں اسی وقت دکھا چکے تھے۔ جب انہوں نے الہ آباد سے ایک چھوٹی تقطیع کا رسالہ "گپ" کے نام سے نکالنا شروع کیا ہے۔ انہوں نے خود فرمایا تھا کہ اس محنت میں کنور جگدیش پرشاد (موجودہ چیف سیکرٹری گورنمنٹ صوبہ متحدہ) ان کے شریک تھے۔ گپ کے صرف دو ہی پرچے نکلے (پہلا پرچہ حاضر خدمت ہے دوسرا باوجود تلاش نہ مل سکا) پہلے صفحہ کے بالائی حصہ پر جو تصویر ہے۔ اس کی دونوں آنکھیں اور ناک مل کر EGG کا املا پیش کرتی ہیں۔ یہ تخیل محمد علی کا ہے۔

افسانہ از افسانہ می خیزد۔ خاکے نقشے اور تصویر کے متعلق ان کا مذاق اس قدر صحیح تھا کہ مجھے تو اپنے جہل کا یہاں بھی اعتراف

ہے۔ بڑے بڑے ماہر اور مبصران کسے مذاق کی صحت کے قائل تھے۔ دہلی کے ایک شہزادے روغنی تصویریں بناتے
غالباً یہ چارے کا ذریعہ معاش بھی تھا۔ محمد علی کو انہوں نے دلی کی جامع مسجد کی تصویر پیش کی۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر
کی موجودگی بھی ایک لازمی بات ہے۔ لہٰذا مصور نے بھی نقل کو اصل کر دکھانے کی غرض سے ایک سیڑھی پر ایک عورت
بنائی جو ایک پھٹا چیتھڑا برقع اوڑھے دو ننگے بچوں کی انگلی پکڑے کھڑی تھی۔ نیچے لکھا تھا، جامع مسجد دہلی"۔ محمد علی نے
کر کہا "میں تصویر لینے اور اپنی طرف سے ہدیہ دینے کو حاضر ہوں۔ بشرطیکہ الفاظ جامع مسجد دہلی مٹا کر جو میں عرض کروں ا
فرما دیں۔ شاہزادہ صاحب نے منظور کیا۔ محمد علی نے پنسل سے ایک کاغذ پر لکھا۔

HER FATHERS BUILT IT

اب یہ تصویر بجائے جامع مسجد کے معمولی نقشے کے اعلیٰ قسم کا ایک مرقع عبرت ہو گئی۔ محمد علی کے ڈرائنگ
جو صاحب نظر اسے دیکھتا تھا۔ ممکن نہ تھا ایک گرم آنسو، ایک ٹھنڈی سانس اسے بطور خراج پیش نہ کرتا۔

دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے ساتھ مسلم لیگ کی بنیاد پڑی۔ اس موقع پر باوجو
میں ہند کی دماغی قابلیت کا عطر موجود تھا۔ مگر مسلم لیگ کے نظام کی درستی اور قواعد و ضوابط کی ساری تیاریوں ک
ہی نے کیا۔

اسی زمانہ میں انہوں نے وقت کے مناسب چند مضامین انگریزی میں لکھ کر اخبار میں چھپوائے تھے۔ ان
غالباً نومبر ۱۹۰۷ء میں خاکسار نے یکجا کر کے بمبئی گزٹ کے مطبع میں HTS ON PRESENT DISCONTENT
کے نام سے چھپوا کر شائع کیا۔ اور اگر اس کی کاپی کہیں مل جائے تو اس سے ناشر کا نام M-A BASHIR-&Co لکھا
یہی خاکسار ہے اور بشیر ایک دوسرا شریک کار۔

بمبئی ہی میں جب اخبار نکالنے کا قصد مصمم ہوا تو یہ بھی طے ہوا تھا کہ محمد علی اڈیٹر ہوں اور میں ہیچ میرز منیجر۔ اس ک
کو براتے چند سے بڑودہ جانا پڑا۔ اور مجھے تجارت کے کاروبار کو آگ لگا کر مستقلاً گھر آنا پڑا اگرچہ ان کی طلبی پر بڑودہ
۱۹۱۰ء کے آخر میں جب کلکتہ سے اخبار نکالنا طے ہو گیا تو محمد علی نے لکھنؤ سے تار دیا "میں فوراً پہنچا"، اور خیال ک
لانے کے لئے مشورہ کیا گیا جس پر عزیز مرزا مرحوم بھی شریک تھے، یہاں مجھے پھر وعدہ کرنا پڑا کہ کلکتہ جا کر شریک خدم
مگر اس عرصہ میں میرے ذاتی معاملات میں اتنا پھیلاؤ ہو گیا تھا۔ میرے ضعیف العمر والد ماجد رح انہیں اکیلے سنبھال نہیں سکت
لہٰذا اس وقت مکان سے غیر حاضری میرے امکان میں نہ تھی۔
۱۴ جنوری ۱۹۱۱ء کو کلکتہ سے کامریڈ کا پہلا پرچہ نکلا۔ طلبی کا تقاضا تو بہت پہلے ہی سے تھا۔ اب اس میں سختی شر
۱۹۱۲ء تک سختی تلخی سے بدلی اور لکھا جانے لگا "پس از آنکہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد"۔ ۵ جولائی ۱۲ء کو تار آیا کہ تیار رہ

گرفتاری کے لیے کل بدایوں آتا ہوں۔ چنانچہ ۷۔ جولائی ۱۹۱۲ء کو بدایوں تشریف لائے۔ جناب والد صاحبؒ سے عرض معروض کی۔ انھوں نے اپنی ضعیفی اور تنہائی کے باعث جائداد کے انتظام کا بار اٹھانے سے مجبوری ظاہر کی۔ مگر محمد علی کب ماننے والے تھے۔ خوشامد کی، ہاتھ جوڑے اور آخر مرحوم و مغفور سے وعدہ لے ہی لیا کہ حالات سازگار ہوئے تو انشاءاللہ اجازت دے ہی دی جائے گی۔

ابتدا ہی سے طے ہوا تھا کہ محمد علی (یا اصلاح) کی آواز مسلمانوں تک پہنچانے کے لیے ایک اردو اخبار اور مسلمانوں کی آواز گورنمنٹ تک پہنچانے کے لیے ایک انگریزی اخبار نکالا جائے گا۔ یہ بھی طے ہوا تھا کہ اردو اخبار کی ایڈیٹری مولوی عبدالحق بی اے (موجودہ سیکرٹری انجمن ترقی اردو) کریں گے۔ اور ان کے مددگار مولوی احتشام الدین دہلوی اور سید ہاشمی فریدآبادی ہوں گے مولوی عبدالحق نے آخر میں ان سے معذوری ظاہر کی اور اپنی جگہ مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی کا نام تجویز کیا۔ چنانچہ میں ۱۲۔ اگست ۱۹۱۲ء کو بدایوں سے لکھنؤ گیا اور انہیں آنے پر رضامند کیا۔

کلکتہ سے کامریڈ کا آخری پرچہ جو ۱۴ ستمبر ۱۹۱۲ء کو نکلا اس کے بعد کا زمانہ دہلی آگیا۔ میں بھی بدایوں سے دہلی پہنچا۔ یہاں سے پہلا پرچہ کامریڈ کا ۱۳۔ اکتوبر کو نکلا۔

اردو اخبار جس کا نام ہمدرد تجویز ہو چکا تھا۔ ابھی نکلنے نہ پایا تھا کہ مولانا شرر مرحوم جو تین مہینے سے مقیم (مشاہرہ یاب) تھے اپنی ضرورتوں سے مجبور ہو کر وطن واپس آ گئے اور اس کے بعد سید ہاشمی بھی چلے گئے۔

ہمدرد کے اجراء میں دیر کا سبب یہ تھا کہ بیروت سے ٹائپ بہت کم مقدار میں آسکا تھا۔ جو پورے اخبار چھاپنے کے لئے کسی طرح کافی نہ تھا۔ ایک روز حکیم اجمل خاں تشریف لائے اور دریافت کیا کہ ہمدرد کے اجراء میں کتنی دیر ہے۔ محمد علی نے کہا ابھی تک پورے اخبار کے لیے ٹائپ نہیں آسکا ہے، فرمانے لگے کہ آج کل خبروں کی بہم رسانی کی سخت ضرورت ہے۔ اگر پورا اخبار نہ نکل سکے تو صرف دو صفحہ ہی کا نکال دیجئے۔ آمدنی بھی ہوگی اور پبلک کی خدمت بھی۔ محمد علی نے اس رائے کو پسند کیا۔ اور ہمدرد کا خاص سلسلہ ۲۴ فروری ۱۹۱۳ء سے جاری ہوا۔ جسے عام طور پر نقیب ہمدرد کہتے ہیں۔ یہ پرچہ روزانہ ایک ورق پر چھپتا اور ہاتھوں ہاتھ بک جاتا تھا۔ ۱۳ مئی ۱۹۱۳ء سے اسے چار صفحہ کا کیا گیا جو ۳۱ مئی ۱۹۱۴ء تک رہا۔

یکم جون ۱۹۱۳ء میں مسجد کانپور کا قصہ شروع ہوا۔ ۸۔ جولائی ۱۹۱۳ء کے ہمدرد میں مسجد کانپور کے متعلق تھا۔ جو افتتاحیہ بھی ہے اور وہ مراسلت بھی جو محمد علی اور سر جیمس میسٹن میں مسجد کانپور کے متعلق ہوئی تھی۔

ڈاکٹر جانسن کے متعلق باسویل یا کہیں اور دیکھا تھا جس کا دھندلا سا خاکہ ذہن میں ہے۔ ایک دن کوٹھی کے برآمدہ میں سر جوشوا اور دوسرے دوستوں بلکہ نیازمندوں کے زمرہ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے، یکایک اٹھ کر کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر سب نے انتظار کیا۔ اس کے بعد فکر ہوئی کہ دفعتہً اٹھ کر کہاں گئے۔ مگر جانسن کے احباب جتنی ان سے محبت کرتے تھے اتنا ہی ڈرتے بھی تھے۔ لہٰذا دفعتہً اندر نہ گئے بلکہ باہر ہی سے کواڑ کے شیشوں سے جھانکنے لگے۔ دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب کمرے کے اندر اکیلے کودتے جاتے ہیں۔ اور کھلکھلا کھلکھلا کر ہنستے جاتے ہیں۔ سب دبے پاؤں لوٹ آئے۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر صاحب بھی آ گئے اور تو کسی کی ہمت نہ پڑی۔ باسویل نے جو بہت منہ چڑھے نیازمند تھے۔ جسارت کر کے پوچھا کہ حضرت یہ کیا حرکت تھی

فرمانے لگے، بھئی ایک بات یاد آگئی تھی۔ جس سے طبیعت کو بہت خوشی ہوئی اور چونکہ ہم اپنے جذبات کو ضبط کرنا نہیں چاہتے
لہذا کمرہ میں جاکر خوب ہنسے اور کودے۔ سب کے سامنے یہ حرکت اس لئے نہیں کی کہ تم کہتے جانسن پاگل ہوگیا۔

محمد علی مرحوم بھی جذبات کا مجموعہ تھے اور اسے خامی کہئے یا پختگی کہ اکثر اوقات وہ اپنے جذبات کو ضبط نہیں کر سکتے تھے
۔ یہ انبساطی اور انقباضی دونوں حالتوں میں دیکھا، کہ اگر وہ اپنے جذبات کو ضبط کرتے تو بڑی کوشش اور سخت طاقت سے
ساتھ۔ آپ ۱۰ اپریل ۱۹۱۱ء والے خط میں دیکھیں گے کہ "خوشی میں خوب ناچا اور کودا" اور منا رآمنہ دختر محمد علی) کو اس میں شریک
آپ فرمائیں گے محض مبالغۃً اور استعارۃً لکھا ہے۔ شاید ایسا ہو مگر میں نے واقعات دیکھے ہیں کہ وہ خوشی کی حالت میں بھی آپے سے
باہر ہو گئے ہیں اور غصہ و رنج کی حالت میں بھی۔ ایک مرقع پیش کرتا ہوں۔ جس میں اتفاق سے دونوں منظر ایک ساتھ کھنچ گئے ہیں
مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں قیصر باغ میں جلسہ ہوا۔ اس وقت یونیورسٹی کے متعلق پنجابی ارباب صحافت کے محاورہ میں
"نرم" اور "گرم" جماعت میں تصادم ہو رہا تھا۔ راجہ صاحب محمود آباد نرم جماعت کے قائد تھے۔ اور محمد علی گرم جماعت کے روح رواں
مگر شب درمیان صبح کو ان کی رائے میں "نرمی" آگئی۔ اس سے الہلال مرحوم نے حدیث الغاشیہ کے عنوان سے ایک دھواں
دھار مضمون لکھا۔ جس میں شب تار اور تاراج متاع کا سماں باندھ کر آخر میں یہ چبھتا ہوا شعر لکھ دیا۔

معشوق ما بمذہب ہر کس مطابق ست با ما شراب خورد بہ زاہد نماز کرد

محمد علی کہیں باہر گئے تھے۔ واپس آکر جب دیکھا تو چونکہ (ان کے خیال سے) واقعات کو الٹ پھیر کر دکھایا گیا تھا، للہ الحمد
سے عجیب حالت تھی۔ کہنے لگے "محفوظ اس کے جواب میں کوئی شعر بتاؤ" میں نہ شاعر ہوں نہ شعراء کے کلام کا حافظ۔ بھلا ایک
منٹ میں شعر کیا کہہ سکتا تھا۔ مگر ان کی حالت دیکھ کر کہہ دیا۔ اچھا ابھی بتاتا ہوں۔ اتفاق کی بات سعدی کا ایک شعر ذہن میں
آگیا۔ اگرچہ بہ تکلف مناسب موقع ہو سکتا تھا مگر اس وقت مقتضائے مصلحت یہی تھا کہ شعر پڑھ ضرور دیا جائے۔ چنانچہ میں نے کہا

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق ہر ہوسنا کے نہ داند جام و سنداں باختن

یا تو وہ حالت تھی کہ غصہ میں آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے یا دفعتاً منہ سے پھول جھڑنے لگے۔ مسکرائے ہنسے
لگایا۔ پھڑک اٹھے اور جوش میں آکر مجھے گود میں اٹھا کر سارے ہال میں گھومتے پھرے۔ لاہور سے کسی جلسہ میں شرکت کی دعوت
آئی تھی۔ جس کا جواب دفتر سے جا رہا تھا کہ کام کی کثرت کے باعث شرکت سے معذوری ہے۔ شعر سننے کے بعد فوراً حکم دیا کہ
جواب نہ دیا جائے۔ بلکہ تار دیا جائے کہ آج شام چل کر کل لاہور پہنچوں گا۔ چنانچہ جلسہ میں پہنچ کر دوران تقریر میں الہلال کے
کا نہایت مشرح و مسکت جواب دیا۔ اپنی بظاہر تبدیلی کی توجیہ کی اور معشوق والا شعر پڑھ کر اس کے جواب میں سعدی کا
نہایت مزے لے لے کر پڑھا اور کہا کہ ہم پر الزام دیا جاتا ہے کہ ہم نے دونوں فریق کا جی رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے جس
دور نگیوں میں تطابق کیا اور جام و سنداں کو لڑا کر ترنم پیدا کیا ہر ہوسناک کا دماغ نہیں کہ اسے سمجھ بھی سکے۔

اس کے ساتھ ارادے کی مضبوطی اور رائے کے استقلال کا عالم یہ تھا کہ جو بات غور و فکر کے بعد اپنے نزدیک صحیح سمجھ کر طے کر لی پھر اس
تجاوز کرنا بعید از امکان تھا۔ اس کی ایک مثال تو ہمہ روکا ہر ٹیڈ کا اجراء ہے کہ کوڑی پاس نہیں مگر اتنے بڑے کام کو شروع کر دیا۔

دو اور مثالیں ذہن میں ہیں۔

(۱) کامریڈ کے دہلی آنے کے بعد ہی جب سید امیر علی اور سر آغا خاں کے بحری تار آنے شروع ہوئے اور ترکوں کی لڑائی (جنگ بلقان میں) سب سے زیادہ ضرورت طبی مدد کی ہے۔ تو ڈاکٹر انصاری نے چاہا کہ وہ ہندوستان سے ایک طبی وفد لے جائیں اور لڑائی میں زخمیوں کی مرہم پٹی کر کے ترکوں کا ہاتھ بٹائیں۔ چنانچہ انہوں نے بطور خود ایک تخمینہ اخراجات بھی تیار کیا۔ اور سید امیر علی اور اپنے ان ہندوستانی احباب (ڈاکٹر عبدالرحمن اور ڈاکٹر فیضی وغیرہ) سے جو ولایت میں طبی تعلیم ختم کر چکے تھے اسی بارے میں مراسلت کی۔ اس دوران میں انہوں نے یہ تجویز محمد علی کے سامنے پیش کی جسے محمد علی نے بہت پسند کیا اور ہر قسم کی مدد دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ دہلی میں ترکوں کی امداد کے لئے ایک انجمن ہلال احمر قائم ہوئی تھی۔ اس کے جلسہ میں محمد علی نے اس تجویز کو پیش کیا۔ انجمن نے اتفاق کیا اور پندرہ ہزار کی رقم جو عثمانی کانسل جنرل مقیم بمبئی کو بھیج دی تھی۔ تار کے ذریعہ واپس مانگی تاکہ طبی وفد کے اخراجات میں لگا دی جائے۔ مگر دوسرے ہفتہ کے جلسہ میں اپنی رائے بدل دی۔ اور طے کیا کہ ان کی رقم کانسل جنرل ہی کے ذریعہ ٹرکی کے وزیر اعظم کی خدمت میں بھیج دی جائے۔ محمد علی نے بہت سمجھایا مگر جب دہلی والوں نے اپنی رائے میں تبدیلی نہ کی تو جلسہ ہی میں مجھ سے پوچھا "ہمارے پاس کتنی رقم ہے" میں نے کہا "اتنے ہزار اتنے سو روپے" کہنے لگے "الحمدللہ! ہمارے پاس کافی رقم ہے۔ انصاری! میں نے طے کر لیا ہے کہ انشاء اللہ مشن جائے گا اور ضرور جائے گا۔ میرے پاس دس روپے ہوتے تب بھی ہمت نہ ہارتا۔ اور اس دہلی سے بھیک شروع کر کے سارے ہندوستان سے رقم فراہم کرتا۔ اب تو خدا کے فضل سے اس قدر موجود ہے۔ تم اللہ کا نام لے کر انتظام کرو۔ رقم کی فراہمی میرے ذمے" اسی رات کو اس عرب شاعر کی طرح جس نے اپنے لڑکے سے کہا تھا "آج ذرا چراغ میں تیل زیادہ ڈال دینا۔ فلاں قبیلہ کی ہجو تیار کرنا ہے۔" انہوں نے اپنے خدمت گار محمد حسین سے کہا "جا کر میرے کمرے میں لیمپ تو جلا دے" (اس وقت تک بجلی کے تار گھروں میں نہ لگ سکے تھے) کمرے میں جا کر کامریڈ کے لئے مضمون لکھا جس میں مسلمانوں سے طبی مشن کے چندہ کے لئے وہ دل ہلا دینے والی اپیل کی جس نے کامریڈ کے دفتر میں روپوں کی بارش شروع کر دی۔ کامریڈ کے فائل گواہ ہیں کہ ایک ایک دن میں دس دس پندرہ پندرہ ہزار روپے وصول ہوتے ہیں۔ اور میں گواہ ہوں کہ منی آرڈروں اور پارسلوں پر دستخط کرتے کرتے میرا ہاتھ شل ہو گیا ہے۔

(۲) لندن ٹائمس میں ایک مضمون "چوائس آف دی ٹرکس" کے عنوان سے شائع ہوا۔ جس میں ترکوں کو دھمکیاں دیکر سمجھایا بلکہ حکم دیا گیا تھا کہ اس جنگ میں جو شروع ہوئی ہے۔ غیر جانبدار رہیں ورنہ ان کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ اس زمانہ میں بیگم محمد علی سخت علیل تھیں محمد علی کو مریضہ کی تیمارداری میں رات بھر جاگتے گذرتی تھی۔ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری بار بار آ کر دیکھتے تھے۔ اسی حالت میں محمد علی نے ٹائمس ہی کے عنوان سے وہ مضمون لکھا جو ان کی زندگی کے دریا کا رخ بدل دینے والا ثابت ہوا۔ محمد علی کے مدراسی زود نویس (اسٹینوگرافر) مسٹر آئیسر نے راجہ غلام حسین مرحوم سب ایڈیٹر کامریڈ سے چپکے سے کہہ دیا۔ کہ محمد علی صاحب ایک نہایت سخت اور تلخ مضمون لکھوا رہے ہیں راجہ مرحوم نے مضمون دیکھ حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب سے اس کا تذکرہ کیا اور کہا کہ کیا کیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی مضمون پڑھ کر اور حکیم صاحب نے اس کا مطلب سن کر یہی رائے دی کہ مضمون اس وقت ہرگز شائع نہ کیا جائے مگر محمد علی کب ماننے والے تھے۔ راجہ بے چارے نے گھبراہٹ میں مجھے بدایوں کا تار دیا کہ فوراً آؤ۔ میں پہنچا اور نرم الفاظ میں اپنی ہیچ میرز رائے دی۔ مگر محمد علی نے ایک نہ سنی۔ جب میں نے زیادہ کہا کہنے لگے "میں جانتا ہوں کہ میں نے اپنی موت کے وارنٹ پر دستخط کئے ہیں۔ مگر اب میں

رائے قائم کر چکا ہوں جو ہونا تھا وہ ہو چکا اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

محمد علی بالطبع سست نہ تھے مگر کاہل ضرور تھے۔ وہ خود تو اپنے آپ کو کام چور کہتے تھے، لیکن کام چور نہ تھے تو کام ٹال تو یقین تھے۔ منٹوں کا کام دنوں بلکہ ہفتوں میں کرتے تھے۔ مگر جب کرنے پر آجاتے تھے تو مہینوں کا کام منٹوں میں نہیں تو گھنٹوں میں تو ضرور کر ڈالتے تھے۔

دہلی آکر کامریڈ کبھی وقت پر نہ نکلا۔ صبح کا ناشتہ کرنے کے بعد محمد علی سنجیدگی اور سچی نیت کے ساتھ کام کرتے یعنی مضمون لکھنے بیٹھتے ہی تھے کہ چپراسی نے اطلاع کی کہ فلاں صاحب تشریف لائے ہیں، وہ صاحب آ کے بیٹھے ہی تھے کہ مسٹر فلاں بھی تشریف لے آئے اب مجلس گرم ہوئی۔ دوپہر ہو گئی کبھی کھانے میں شریک ہوئے کبھی ویسے ہی چلے گئے۔ دوپہر کا کھانا شروع ہوا۔ کوئی سلسلہ چھڑ گیا تو سہ پہر کی چائے پر ختم ہوا۔ باہر جانے کا وقت ہوا۔ غالب کے الفاظ میں "فلاں صاحب کا ایک آنہ دینا ہے"، تشریف لے گئے۔ اور کھانے کے وقت واپس تشریف لائے۔ ہم غصہ میں بھرے منہ بنائے بیٹھے ہیں۔ پہلے تو خیال نہ ہوا پھر فرمانے لگے، "بھائی صاحب یہ آج مزاج کا پارہ کیوں چڑھا ہے۔ کس پر خفگی ہے۔ کسی نے زبان چلائی ہے۔ زبان نکال لوں۔ آنکھ دکھائی آنکھ پھوڑ دوں۔ ناک چڑھائی ہو ناک توڑ دوں۔ کان ہلائے ہوں "کان کاٹ لوں"۔ اب ہمارے ضبط کا پیالہ چھلک گیا اور جو کچھ منہ میں آیا بکنا شروع کیا۔ "محمد علی تم کاہل ہو، باتونی ہو، بے کار ہو، کمپازیٹر اور پریس میں مفت کی تنخواہ پا رہے ہیں۔ تمہارا نقصان ہو رہا ہے۔ کامریڈ کے وقت سے نہ نکلنے کی بدنامی ہو رہی ہے۔ آخر او ور ٹائم دے کر پرچہ چھاپنا پڑے گا"۔ اسی سلسلہ میں زبان سے نکل گیا "کام وام تو کرتے نہیں، آرام کرسی پر پڑے انگڑائیاں لیتے رہتے ہو۔ انگڑائی کا لفظ سنتے ہی کہنے لگے "ہمارا نظام رامپوری کہتا ہے، دیکھو کیسا بانکا شعر ہے۔ ۔۔

انگڑائی بھی وہ نہ لینے پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دئے مسکرا کے ہاتھ

ہائے ظالم نے کیا تصویر کھینچ دی ہے۔

ہم "بھاڑ میں جائے تمہارا ہاتھ"، کہتے ہوئے جلے بھنے اٹھ آئے اور اپنے کمرے میں جا کر سو رہے۔ صبح کو ناشتے پر بلائے گئے۔ "بھائی جان کچھ غصہ کم ہوا، خاک کم ہوا۔ دھواں کم ہوا اب ہم بدایوں جانتے ہیں" بھائی خفا کیوں ہوتے ہو۔ یہ لو مضمون کسی کی جان ہو گے۔ یہ کہہ کر ایک پلندا پھینک دیا، دیکھا تو کامریڈ کے لئے "گپ" کا ایک نہایت ہی لچھے دار مضمون تھا۔

کامریڈ کی ضبطی ضمانت کے سلسلہ میں محمد علی نے دہلی کی عدالت میں خود بحث کی۔ دوران بحث میں دہلی کے وکیلوں اور بیرسٹروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے اور ہر شخص دم بخود تقریر کا حرف حرف دل کے کانوں سے سن رہا تھا۔ باہر نکلے تو ہندو مسلمان بیرسٹر کے منہ سے بیک یہی جملہ نکلا کہ "مسٹر محمد علی کاش آپ بیرسٹر ہوتے"۔ محمد علی نے جواب دیا کہ "اب بھی جو کچھ ہوں اس کی اتنی قدر ہو رہی ہے جو بیرسٹری میں ہوتی"۔

○ ادب منزل کے فکر آفریں اور تحقیقی مطبوعات کا سلسلہ ○

کاروانِ اسلام

آغاز دعوت اسلام سے لے کر قیام پاکستان تک کی مستند، جامع اور مکمل تاریخ۔

اس تاریخ میں فاضل مصنف نے کاروانِ اسلام کے ان تمام مقامات کا ذکر کیا ہے، جہاں اس نے پڑاؤ کیا اور اپنے آثار و نقوش ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا۔

ضخامت:
بڑے سائز کے تقریباً
(۱۲۰۰) بارہ سو صفحات

طباعت شروع ہو چکی ہے۔ عنقریب منظرِ عام پر آنے والی ہے

تاریخ معتزلہ

اسلام کی تاریخ میں معتزلہ نے جو فکری انقلاب برپا کیا۔ وہ دنیائے علم و تحقیق کا ایک ناقابلِ فراموش اور لازوال کارنامہ ہے بدقسمتی سے معتزلہ کے بارے میں اردو کیا عربی تک میں کوئی ایسی مفصل کتاب نہیں تھی جسے ان کے افکار کا مرقع اور ائمہ معتزلہ کے افکار و عقائد کا آئینہ کہا جا سکے۔ مصر کے دار الفکر العربی سے ڈاکٹر زہدی حسن جار اللہ کی ایک نہایت مستند اور تحقیقی کتاب اس موضوع پر شائع ہوئی ہے۔ رئیس احمد جعفری نے اسے اردو کا جامہ پہنایا ہے معلومات کا بیش بہا گنجینہ زیور طباعت سے آراستہ ہو کر بہت جلد منظرِ عام پر آ رہا ہے۔

طباعت : فوٹو آفسٹ
کاغذ : سفید کرنا فلی

احمد شاہ درانی کے مہمات و فتوحات

جب ہندوستان میں مغل حکومت کا چراغِ اقبال ٹمٹما رہا تھا۔ اور مرہٹوں کی ایک نئی طاقت ابھر رہی تھی۔ جس نے مغربی ہندوستان سے اٹھ کر شمالی ہند کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند ڈالا تھا۔ جس نے لال قلعہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور بادشاہ کو اپنا زیر دست کر لیا تھا۔ جس کی فوجیں دریائے اٹک تک پہنچ چکی تھیں اور دوآبہ گنگ و جمن کو پامال کر رہی تھیں۔

اس وقت احمد شاہ درانی ایک طوفان بن کر اٹھا اور اس نے مرہٹہ ایمپائر کے خواب شیریں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خواب پریشاں بنا دیا۔

درانی کے مہمات اور فتوحات کی یہ دلچسپ اور مکمل و مستند تاریخ ڈاکٹر گنڈا سنگھ نے بڑی تحقیق سے لکھی ہے اور رئیس احمد جعفری نے بڑی خوبی سے اس کا ترجمہ کیا ہے طباعت کے آخری مراحل سے گزر رہی ہے۔

چند اور اہم مطبوعات

قرآن شریف

قرآن مجید مترجم بدو ترجمہ موسوم بہ:-
اولا المقصوب غیر مجلد ھدیہ (۱۲ روپے)
قرآن مجید معریٰ (۱۶ ا مہری)
ہدیہ گلیز کاغذ پر (۶ روپے)
ہدیہ رف کاغذ پر (۴ روپے)
قرآن مجید لائن دار بطرز تاج ۱۳۰ غیر مجلد
کاغذ گلیز ھدیہ (۸ روپے)
کاغذ رف ھدیہ (۶ روپے)
یازدہ سورہ شریف (دو روپے پچاس پیسے)

اخبار و سیر

اسوۃ الصالحین (۶ روپے)
(قصص القرآن انبیاء علیہم السلام)
(قرآن پاک سے مرتب کیے گئے قصے)
حضرت ابراہیم علیہ السلام (۳۷ پیسے)
حضرت موسیٰ علیہ السلام (" ")
حضرت یوسف علیہ السلام (" ")
حضرت عیسیٰ علیہ السلام (" ")
سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم (۵۰ ")
ذوالقرنین (قرآن کی عظیم شخصیت) (۳۱ ")
(باقی ساتھ والے کالم میں)

۱
۲
۳
۴

لغات

لغات سعیدی
عربی و فارسی جدید بید قسم۔
مجلد مع ڈسٹ کور (۱۵ روپے)
سعیدی ڈکشنری کلاں مجلد (۱۵ روپے)
" مختصر (۷ روپے ۵۰ پیسے)

بقیہ اخبار و سیر

امم القرآن (۳۷ پیسے)
قرآنی جواہر ریزے (۵۰ ")

نظم فارسی

بوستان مترجم و محشی (پانچ روپے ۵۰ پیسے)
کلید مثنوی مولانا روم۔ از مولانا تھانوی
دفتر اول حصہ اول (۵ روپے ۵۰ پیسے)
دفتر اول حصہ دوم (۵ " ۵۰ ")
دفتر دوم حصہ اول (۴ روپے)
دفتر دوم حصہ دوم (۴ ")
دیوان حافظ محشی و مترجم (زیر طبع)
دیوان شمس تبریز " (" ")
دیوان سعدی " (" ")

○ دینی، اسلامی، تاریخی اور تحقیقی تصانیف و تراجم کے لیے ادب منزل، کراچی کا نام یاد رکھیے ○

مینیجر: ایچ ایم سعید کمپنی ناشران و تاجران کتب ادب منزل پاکستان چوک کراچی

صرف ۴ سال کی قلیل مدت میں

تقریباً ستو بلند پایہ، فکر آفریں، تاریخی، تحقیقی، علمی اور مذہبی کتابیں شایع کرنے والا ادارہ

مقبول اکیڈمی

۴۔ اے شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

تمدن ہند	تمدن عرب	عبرت نامۂ اندلس	قائد اعظم اور ان کا عہد	سیرت ابن ہشام

جیسی طویل و ضخیم کتابیں شایع کرنے کا فخر تنہا اسی ادارے کو حاصل ہے

: بہترین اور معیاری ناول : دلگداز اور اثر انگیز افسانے

: اعلیٰ درجہ کے تاریخی ناول : ادبیات عالیہ اور شعر و سخن کے مجموعے

اس ادارے کا ایک امتیازی وصف ہے

+ مکمل اور مفصل فہرست صرف ایک کارڈ لکھ کر مفت طلب فرمائیے

+ لائبریریوں کے ساتھ خصوصی رعایت

مقبول اکیڈمی ۴ اے شاہ عالم مارکیٹ لاہور

اکیڈمی لائبریری

کلاسیکی، معیاری ادب اور ارزاں قیمت

اردو میں "پینگوین سیریز" کا نقش اول جس کی ابتدا جون ۱۹۶۰ء میں کی گئی تھی۔ اور جو سستی کتابوں کے کئی سلسلے نکل آنے کے باوجود متنوع مضامین اور معیاری انتخاب کی وجہ سے آج بھی نمایاں، ممتاز اور منفرد ہے۔

تین سیٹ شائع ہو چکے ہیں ═══ چوتھا سیٹ زیر طبع ہے

پہلا سیٹ

نمبر	کتاب	قیمت
(۱)	مثنوی گلزار نسیم، از دیا شنکر نسیم، مقدمہ: وقار عظیم	۱ - ۲۵
(۲)	فسانۂ مبتلا، مع فرہنگ، از مولوی نذیر احمد	۲ - ۵۰
(۳)	مضامین سرسید، تبصرہ: مولوی عبدالحق، سوانح: ڈاکٹر اعجاز حسین	۱ - ۲۵
(۴)	افادات مہدی، تبصرہ: مولوی عبدالحق، از: مہدی حسن افادی	۰ - ۷۵
(۵)	انتخاب مقالات شبلی، از شبلی نعمانی	۱ - ۲۵
(۶)	دلی کا ایک یادگار مشاعرہ، از مرزا فرحت اللہ بیگ	۲ - ۰۰
(۷)	نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی، کچھ اپنی زبانی، مرزا فرحت اللہ بیگ	۱ - ۲۵
(۸)	آزادی و تہذیب: از جان ڈیوی، مترجم ڈاکٹر عبادت بریلوی	۲ - ۵۰
(۹)	اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر، از علامہ شبلی نعمانی	۱ - ۲۵
(۱۰)	الفوز الکبیر، از شاہ ولی اللہ، تذکرہ سلیم عبداللہ	۲ - ۲۵
(۱۱)	احمق الذین (مزاحیہ ناول)، از سجاد حسین	۱ - ۲۵
(۱۲)	خطبات اقبال، مرتبہ رضیہ فرحت بانو	۱ - ۲۵

دوسرا سیٹ

نمبر	کتاب	قیمت
(۱)	شاہد رعنا (ناول)، از قاری سرفراز حسین	۲ - ۰۰
(۲)	توبۃ النصوح (ناول)، از مولوی نذیر احمد	۲ - ۰۰
(۳)	ضدی (ناول)، از عصمت چغتائی	۱ - ۲۵
(۴)	چوٹیں - پیش لفظ کرشن چندر، از عصمت چغتائی	۱ - ۷۰
(۵)	باغ و بہار، از میر امن دہلوی، تذکرہ و تبصرہ سید ابوالخیر کشفی	۲ - ۰۰
(۶)	شریف زادہ، از محمد ہادی رسوا، مقدمہ ڈاکٹر احسن فاروقی	۱ - ۵۰
(۷)	مریم مجدلانی، مصنف مارس ماترلنگ، مترجم وحشی محمود آبادی	۱ - ۲۵
(۸)	دیوان غالب، مطابق طاہر ایڈیشن	۱ - ۲۵
(۹)	امراؤ جان ادا، از مرزا محمد ہادی رسوا، تنقید و تبصرہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	۳ - ۰۰
(۱۰)	اختری بیگم (ناول)، از مرزا محمد ہادی رسوا	۲ - ۵۰
(۱۱)	بوڑھا اور سمندر، مصنف ارنسٹ ہیمنگ وے، ترجمہ و تعارف ابن سلیم	۲ - ۰۰
(۱۲)	حالی اور نیا تنقیدی شعور، از پروفیسر اختر انصاری	۱ - ۵۰

تیسرا سیٹ

نمبر	کتاب	قیمت
(۱)	دیوان خواجہ میر درد، مرتبہ: عبدالباری آسی	۱ - ۵۰
(۲)	مقدمہ شعر و شاعری، از خواجہ الطاف حسین حالی	۱ - ۷۵
(۳)	نیرنگ خیال، محمد حسین آزاد، مقدمہ و تبصرہ از ڈاکٹر اسلم فرخی	۱ - ۷۵
(۴)	یادگار غالب - حصہ اول، خواجہ الطاف حسین حالی	۱ - ۷۵
(۵)	یادگار غالب (جلد دوم)، خواجہ الطاف حسین حالی	۲ - ۲۵
(۶)	زاد راہ (افسانے)، از منشی پریم چند	۲ - ۷۰
(۷)	موازنہ - انیس و دبیر، از علامہ شبلی نعمانی	۳ - ۰۰
(۸)	ایک ملکہ، ایک محبوبہ، مترجم: ابن عامر (نپولین اور اس کی محبوبہ کے خطوط)	۱ - ۵۰
(۹)	چھوئی موئی (افسانے)، از عصمت چغتائی	(زیر طبع)
(۱۰)	قصص ہند (تاریخی واقعات)، محمد حسین آزاد	(زیر طبع)
(۱۱)	عود ہندی، از مرزا غالب	(زیر طبع)
(۱۲)	کلیات آتش، مرتبہ و مقدمہ سید وقار عظیم	(زیر طبع)

ناشر: **اردو اکیڈمی سندھ**

آفس: ۱۶ر بہادر شاہ مارکیٹ - بندر روڈ - کراچی

سیلز ڈپو: رحمت بلڈنگ (نزد مسافر خانہ) بندر روڈ - کراچی

تاریخی، تحقیقی اور اسلامی

ایمان افروز • سبق آموز • ولولہ انگیز اور • حیات آفریں کتابیں

سید نصیر احمد جامعی

•

مہاجرین وانصار مہاجرین وانصار کے احوال وسوانح اور جذبۂ اسلامی وحمیت ملی کا ایمان افروز مرقع۔ قیمت چھ روپے

مسلمان سپہ سالار اور فاتح جو عرب کے ریگ زار سے نکلے اور آن کی آن میں جنھوں نے آدھی سے زیادہ دنیا فتح کر لی۔ حیرت انگیز لیکن مستند اور تاریخی واقعات کا آئینہ۔ قیمت سات روپے

مشہور اسلامی جنگیں جو دنیا میں ایک بہت بڑے انقلاب کا ذریعہ بنیں۔ جنھوں نے انسانیت کو پامال نہیں کیا بلکہ اس کا مرتبہ اور زیادہ اونچا کر دیا۔ اسلامی جنگیں جنھوں نے دنیا کو امن کا پیام دیا۔ قیمت ۵٫۵۰ روپے

مشہور تاریخی واقعات جو سبق آموز بھی ہیں، ولولہ انگیز بھی اور حیرت آفرین بھی۔ تاریخ کے ہر طالب علم کے لیے گنجینۂ معانی۔
قیمت ساڑھے پانچ روپے

سلطان محمود غزنوی دنیا کے بہت بڑے فاتح، اولوالعزم، کشورکشا اور زبردست مجاہد کے ناقابل فراموش کارناموں کی تاریخی تفصیل۔
قیمت تین روپے

رشید اختر ندوی

•

صلاح الدین ایوبی ملتِ اسلامیہ کا وہ مجاہد جس نے پرستار
صلیب کے لشکر گراں کو شکستِ فاش دے کر تاریخ میں اپنا نام
کے لیے زندہ کر لیا۔ قیمت نو روپے

مسلمان اندلس میں یورپ کے اس خطے — اندلس — میں م
جب پہنچے تو یہ ایک پسماندہ علاقہ تھا لیکن ان کے پہنچتے ہی علم وہنر
بن گیا۔ جہاں سے وہ کرنیں پھوٹیں جنھوں نے سارے یورپ کو منور کر دیا۔ قیمت

مسلمان حکمران فاتح ہمیشہ مفتوح کو کچلتا ہے، حاکم ہمیشہ محکوم کو
لیکن مسلمان حکمرانوں نے مفتوحوں کا جسم نہیں دل جیت لیا۔ مسلمان حا
عدل وانصاف اور رواداری کی وہ مثال پیش کی جس کا نمونہ پیش کرنے
قاصر ہے۔ قیمت پندرہ روپے

عمر بن عبدالعزیز تاریخ اسلام کی مایۂ صد ناز ہستی جس کی شخصیت
کردار، سیرت اور عمل، زہد اور رواداری حضرت عمر بن الخطابؓ کی یاد تازہ کر

اورنگ زیب "ترکش ما را خدنگ آخریں" صوفی، عابد، اور زاہد با
کے مستند احوال وسوانح۔ قیمت نو روپے

احسن برادرز، تاجران وناشران کتب، ۲۔المنار مارکیٹ، چوک انارکلی لاہور ۲

بیگم

ایک کہانی ——— ایک ایسی کہانی جو آدم کے وقت سے شروع ہوئی اور اب تک جاری ہے۔ اور قیامت تک جاری رہے گی۔ محبت کی کہانی! ——— لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت! کتابِ دل کی یہ تفسیریں ازل سے لکھی جا رہی ہیں اور ابد تک لکھی جاتی رہیں گی۔ کتابِ دل کی یہ داستان لکھتے وقت کبھی قلم کا کلیجہ شق ہوتا ہے، کبھی اس سے الفاظ کے بجائے پھول ٹپکتے ہیں۔

اس داستان میں آنسو بھی ہیں اور آہیں بھی، خوشی کے نغمے بھی اور نشاط کے ترانے بھی۔ اور ملاپ کی مسرت بھی، بدگمانی کا غبار بھی۔ اور اعتماد کا نکھار بھی۔

یہ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جس کے بارے میں جگرؔ نے کہا ہے:

"یہ شاخِ گُل بھی ہے تلوار بھی ہے۔"

اس میں شاخِ گل کی لچک بھی تھی اور تلوار کی کاٹ بھی۔ پہاڑ کا وقار بھی اور سمندر کی گہرائی بھی ——— عزم و استقلال، وفا اور استقامت کی غیر فانی کہانی۔ رئیس احمد جعفری کے قلم سے۔

ضخامت ۴۰۰ صفحے

قیمت چھ روپے

لارک پبلشرز، اورنگزیب مارکیٹ
کراچی ۱۰

اچھے انسانوں کے لیے اچھی کتابیں

اپنی لائبریری

تذکرہ حضرت خواجہ اجمیری	طالب ہاشمی	۳/۰۰
تذکرہ حضرت غوث الاعظمؒ	〃	۳/۲۵
حضرت ابو ایوب انصاریؓ	〃	۳/۰۰
حضرت عبداللہ بن زبیرؓ	〃	۲/۵۰
یہ تیرے پُراسرار بندے	〃	۳/۰۰
تذکرہ حضرت علی ہجویریؒ	سید امین الدین	۱/۷۵
ام الکتاب	مولانا آزاد	۲/۷۵
سید اعظمؒ	〃	۱/۰۰
اصحاب کہف	〃	۱/۲۵
کیرو کی ہاتھ کی بات	ترجمہ کمال احمد رضوی	۲/۷۵

دیگر کتب

انتخاب کلام داغ	داغ	
درد و درماں	علام	
انوار صوفیہ۔ ترجمہ اخبار الاخیار، از شیخ عبدالحق محدث دہلوی		دس ر
مجدد اعظم۔ سوانح حیات حضرت مجدد الف ثانیؒ مرتبہ محمد حلیم		تین ر
معراج المومنین		
نادر بلند پایہ تصانیف سے اقتباسات		ساڑھے سات ر
کلیات جامی۔ از مولانا جامیؒ		ساڑھے سات
تذکرہ حضرت خواجہ تونسویؒ۔ ترجمہ نافع السالکین		ساڑھے پانچ ر

ناشر: **شعاعِ ادب** مسلم مسجد، چوک انارکلی لاہور ۸

نفیس ترین لٹریچر

بدگمانی	عذرا جمال	چھ روپے بارہ آنے	داغِ تمنّا	زاہدہ یونس	چھ روپے بار
رقیب	〃	چھ روپے	خطا	قیسی رام پوری	چار ر
مسیحا	〃	چھ روپے آٹھ آنے	سزا	〃	تین روپے بار
ہمدردی	〃	چھ روپے	دھوپ	〃	چار ر
غلط فہمی	〃	چھ روپے	عداوت ہی سہی	عابدی جعفر	چار روپے چا
بیگانہ	〃	چھ روپے	بے غیرت	یحییٰ صدیقی	تین روپے

نفیس اکیڈمی، بلاسس اسٹریٹ کراچی ۱

عبدالماجد دریابادی

محمد علی (علیگ)

محمد علی کے نام کے ساتھ آکسن اس کثرت سے لکھا گیا۔ کہ گویا ان کے نام کا جزو بن گیا۔ یہاں تک کہ ان کے وطن رام پور کے ایک تار بابو نے ان کے نام کے تار کے پتہ پر (OXON) پڑھ کر اور اسے آکسن (OXEN) سمجھ کر اس کا ترجمہ بھی "بیل والا" کر ڈالا لیکن سچ یہ کہ محمد علی کو فخر اپنے آکسن ہونے پر نہیں۔ اپنے علیگ ہونے پر تھا۔ علی گڑھ سے انہیں بے پناہ محبت تھی۔ اسلام کے بعد انہیں عشق اگر کسی سے تھا تو علی گڑھ سے۔ اور یہ تو یقینی ہے۔ کہ عشاق علی گڑھ یا شیدائیان علی گڑھ کی اگر کبھی کوئی مختصر سی مختصر فہرست بھی تیار ہوئی تو سر سید اور محسن الملک کے بعد اور آفتاب احمد خاں اور ضیاء الدین احمد کی صف میں لکھنے والے کو ایک نام محمد علی کا بھی رکھنا ہوگا۔

یہ میں آپ کے میگزین کے علی گڑھ نمبر کے لیے کوئی مضمون لکھنے نہیں بیٹھا ہوں (وقت اس کے لیے کہاں سے لاؤں) صرف ایک، آدھ بات بطور اشارہ یا نکتہ کے لکھے بھیجتا ہوں۔ اس کی روشنی میں کسی صاحب توفیق و صاحب ہمت کو پکڑیے۔ اور اس سے مستقل مضمون محمد علی اور علی گڑھ پر لکھوا لیجیے۔

علی گڑھ وہ اپنے بچپن میں جب سے آئے اسکول اور کالج کی ہر تحریک اور ہر شوخی و شرارت میں اپنی عمر و بساط بھر بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ پھر جب سے انگریزی لکھنا آگئی۔ میگزین میں لکھنے بھی لگے۔ اور کچھ نہ سہی تو کالج کے کھیل کود ہی پر، علی گڑھ کے کرکٹ ہی پر۔ پھر جب آکسفورڈ گئے۔ تو وہاں سے بھی میگزین کے نقش ثانی (منتھلی) کے لیے لکھ لکھ کر بھیجتے رہے۔ لکھنے والے کو تھوڑی بہت ریسرچ کرنا ضروری ہے۔ اس وقت کا جتنا بھی مطبوعہ و قلمی ذخیرہ لٹن لائبریری میں یونین کے کاغذات میں، اولڈ بوائز کے دفتر میں۔ جہاں کہیں بھی مل جائے سب کا ایک ایک ورق چھانٹنا پڑے گا۔

مذہبیات میں سر سید کے ہم عقیدہ کبھی نہ رہے۔ اور نہ کبھی نیچری کہلائے۔ باوجود اس کے انھیں سر سید سے محبت و عقیدت ہی نہیں عشق تھا۔ اور اگر محمدی ہونے کے بعد" وہ کسی بھی نسبت پر فخر کرتے تو اپنے کو شاید "سید احمد خانی" ہی کہلاتے۔ ۱۹۰۷ء میں علی گڑھ کے پہلے اور مشہور اسٹرائک کے بعد جب ان کا سن پورے ۳۰ سال کا بھی نہ تھا، سر سید کی برسی کے موقع پر ایک نظم کہی۔ اس میں اپنی روداد قلب سناتے ہیں :-

بیاں کس طرح ہو اے سید احمد خاں کہ کیا تم ہو
ہمارے عاشق دلداده، تم ہو، دل ربا تم ہو
خبر لو قوم کی کشتی کی گو کشتی سے باہر ہو
ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا، ہمارے نا خدا تم ہو
یہاں مانا کہ تا شب دعا میں تنگ رہا تم کو
وہاں ضائع نہ ہو گی پھر بھی مشغول دعا تم ہو
کرو اس قوم کے حق میں دعا اے سید احمد خاں
کہ معتوب الٰہی ہم ہیں، مقبول خدا تم ہو

بہت تھے باخدا دنیا میں جب تم ایک کافر تھے — مگر دار الجزاء میں شک نہیں اک باخدا تم ہو

ساری نظم انھیں جذبات سے گداز ہے۔

محمد علی نے اپنی زندگی میں بے شمار دکھ جھیلے اور صدمے اٹھائے اور ان کی عمر ہی کہنا چاہیے کہ مجاہدات اختیاری اضطراری کی نظر رہی۔ لیکن ان کے اختیاری مجاہدوں میں شاید سب سے بڑے مجاہدہ کا دن وہ تھا۔ جب وہ علی گڑھ کو توڑنے کے لیے سنہ ۱۹۲۰ء میں علی گڈھ میں داخل ہوگئے ہیں۔ محمد علی اور علی گڈھ کو توڑیں! آہ، تاریخ کی غلط اندیشیاں اور کج فہمیاں۔

کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہوگیا۔

خیر محمد علی تو علی گڈھ کے پرستار تھے۔ فدائی تھے۔ ان کے دل سے تو یہ لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح ان کا علی گڈھ بھی انہی کی طرح تحریک خلافت و ترک موالات کا علم ہاتھ میں لے کر سب کی رہنمائی کرنے لگے۔ ان کا دل اس کے لیے تڑپ رہا تھا کہ جس مقصد کو وہ اپنے عقیدہ میں ملک و ملت کا بہترین و برترین مقصد سمجھے ہوئے ہیں۔ اس کے لیے جدوجہد میں ان کے علی گڈھ کا بھی قدم کسی سے پیچھے نہ رہنے پائے۔ بس یہی دھن۔ یہی چاہ تھی جو انہیں علی گڈھ لے گئی۔ اور اس نے ان سے جامعہ کو علی گڈھ سے باہر نہیں خاص علی گڈھ میں قائم کرایا۔ انہیں امید تھی کہ علی گڈھ والوں کا دل کچھ دنوں میں پسیجے گا۔ اور جب مسلم یونیورسٹی جامعہ کے قریب آجائے گی تو وہ جامعہ کو ختم کر کے اسے اپنے قدیم علی گڈھ (مسلم یونیورسٹی) سے ملا دیں گے۔

یہ ایک الگ سوال ہے کہ ان کی یہ امید بھی ان کی سینکڑوں دوسری امیدوں اور آرزوؤں کی طرح سرسبز ہوئی۔ لیکن جو شے ان کے ذہن میں کام کر رہی تھی وہ تھی یہی اور یہیں سے اس راز کی گرہ کھل جاتی ہے کہ وہ جامعہ کو علی گڈھ سے ہٹانے اور دہلی لے جانے پر کسی طرح رضامند نہیں ہوتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں جیسے مخلص دوستوں کے اصرار کے باوجود بھی جامعہ کے انتقال مکان پر آمادہ نہیں ہو رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ دہلی منتقل ہوکر پھر کوئی امکان جامعہ کا مسلم یونیورسٹی سے ادغام کا باقی نہ رہ جائے گا۔ سنہ ۲۴ء تک وہ برابر یہی خواب دیکھتے رہے۔

"محمد علی کی زندگی اور موت، دونوں

انکی انفرادی اور شخصی افتاد طبع کی ایک جلوہ گری

تھی اور شخصیت کی اسی جلوہ گری کا نام 'آرٹ' ہے

صحیح اور گراں مایہ"۔ — رشید احمد صدیقی

قاضی عبدالغفار

مولانا محمد علی

جاڑوں کی رات اور وہ بھی دہلی کے جاڑے اور وقت صبح کے ۵ بجے شوکت بھائی (یعنی مولانا شوکت علی) چند ماہ پہلے مجھے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دلا کر زبردستی دہلی لے آئے تھے۔ اب دسمبر ۱۲ء کی اس صبح کو ۶ بجے کلکتے کی سکونت ترک کر کے محمد علی پہلی دفعہ دہلی آ رہے تھے۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا اور میں جھیلوں کے کوچے سے بھاگم بھاگ چاندنی چوک تک پہنچا۔ اس وقت کوئی تانگہ بھی میسر نہ آیا۔ اس لیے ریلوے اسٹیشن تک کا فاصلہ بھاگتے بھاگتے طے کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میری عمر ۲۳ سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس لیے دلی کی کڑکڑاتی سردی میں ایک جوان جسم پر پسینہ کا لطف دوبالا ہو گیا تھا۔ اس وقت میں مولانا شوکت علی سے تو خوب واقف تھا۔ اس لیے کہ میری شادی کے دن وہ میری سسرال میں (یعنی سر محمد یعقوب مرحوم) کے مکان پر دفعتاً اس وقت تشریف لائے تھے۔ جب میں دولہا بنا بیٹھا تھا۔ اور پہلا کام انہوں نے یہ کیا تھا۔ کہ میرے سامنے سلامی کا جس قدر روپیہ رکھا تھا۔ وہ سب اٹھا کر مسلم یونیورسٹی کے چندے میں شامل کر لیا تھا۔ مگر محمد علی کو ایک دو مرتبہ میں نے دور ہی سے دیکھا تھا۔ البتہ اب دسمبر کی اس ٹھنڈی صبح سے میرا ان کا وہ رابطہ شروع ہوتا تھا۔ جو ان کی زندگی کے غروب آفتاب تک قائم رہا۔ کامریڈ والے محمد علی سے اس قدر قریب آنے کا شوق میری جوانی کو بے تاب کر رہا تھا۔ مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ اسٹیشن کے اس پلیٹ فارم پر دسمبر کی وہ صبح میری زندگی کا ایک نیا باب شروع کر رہی ہے۔ ہاوڑہ ایکسپریس اپنے مقررہ وقت کے چند منٹ بعد پلیٹ فارم پر پہنچا۔ ٹرین کی آخری گاڑی سے ایک سرمئی رنگ کا شاندار اور اپٹوڈیٹ سوٹ پہنے ہوئے مسٹر محمد علی برآمد ہوئے۔ میری جوانی بھی اس زمانہ میں لباس و فیشن کی ترغیبات سے ہم آغوش تھی۔ اس لیے پہلی چیز جس کا رعب مجھ پر پڑا۔ وہ محمد علی کے انگریزی لباس کی تراش اور موزونیت تھی۔ آج تک یاد ہے۔ کہ ان کے سرمئی سوٹ کے ساتھ ان کے جوتے اور موزے بھی سرمئی تھے۔ اور ٹائی بھی۔ زندگی کے اس دور میں جوتوں اور موزوں اور رومالوں کی رنگ آمیزی ہم نوجوانوں کی معاشرت کا گویا ایک بہت ہی اہم عنصر تھا۔ علی گڑھ میں ہم اس جامہ زیبی کا سبق پڑھتے تھے۔ اور اس کو اپنی تعلیم و تربیت کا ایک امتیازی نشان سمجھا کرتے تھے۔ زندگی کی یہ قدریں ہمارے لیے اس وقت نہ بدلیں جب تک کہ مسٹر محمد علی بھی اپنی عبا و ردا کے ساتھ "مولانا" محمد علی نہ بن گئے۔ اس زمانے کا علی گڑھ بانڈہ اسٹریٹ کے کسی درزی کی دوکان تھا۔ جامہ زیبی کے میدان میں جو بڑے بڑے مجاہد تھے ان کے تو سوٹ بھی لندن سے سل کر آتے تھے۔ محمد علی میرے کالج میں داخل ہونے سے کچھ ہی پہلے علی گڑھ سے گئے تھے۔ وہ اور شوکت علی (یعنی بعد کو نمودار ہونے والے علی برادران) دونوں علی گڑھ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ بلکہ تحریک خلافت کے لیڈر بننے سے پہلے علی گڑھ میں فیشن کے لیڈر تھے مختصر یہ کہ اس دن صبح کو دلی کے ریلوے اسٹیشن پر جب میں نے اس شخص کو دیکھا جس سے میری زندگی کو سالہا سال وابستہ رہنا تھا تو میری نظر صرف اتنی ہی

وسیع تھی کہ سب سے پہلے آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ محمد علی کے سوٹ کی تراش اور سوٹ کے ساتھ موزوں اور جوتوں کے رنگ سے مانوس ہوئی۔ باقی جو کچھ دیکھا وہ بعد میں دیکھا۔ اس وقت میری ۲۳ سال کی عمر تھی جس کا ایک حصہ سرکاری ملازمت میں گزر یہ زمانہ اس قدر مختصر تھا کہ میں سرکاری ملازمت کے سانچے میں ڈھل نہ سکا ابھی اپنی نظر کا زاویہ کسی طرف بھی قائم نہ کامریڈ کے مضامین پڑھا کرتا تھا اور ان مضامین کے مطلب سے زیادہ انگریزی زبان پر محمد علی کے قلم کی قدرت کو دیکھ کر جھو میرا دل اور میری طرح اس زمانہ کے ہزارہا نوجوانوں کا دل جدید افکار کی وسعتوں اور خیالات کی بلندیوں سے ناآشنا تھا۔ کے شعبہ ادارت میں جب میں ایک ادنیٰ شاگرد بن کر محمد علی کے سامنے بیٹھا تب کہیں میں نے ان چنگاریوں کی محسوس کی جو کامریڈ کے جوان سال اور بے باک ایڈیٹر کی شخصیت سے نکل کر ان کے نوجوان شاگردوں کو اذیت کوش کی دعوت دیتی تھیں۔ ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء کو ہمدرد کا ایک ورقہ نقیب ہمدرد کے نام سے شائع ہوا۔ اس وقت تک سے ٹائپ کی کافی مقدار وصول نہ ہوئی تھی۔ اس لیئے یکم جون ۱۹۱۳ء سے پہلے ہمدرد اپنے پورے حجم کے ساتھ ش ہو سکا۔ یکم جون ۱۹۱۳ء کے بعد سے شعبہ ادارت کا پورا کام شروع ہوا اور میں نے پہلی دفعہ محمد علی کے مددگار کی حیثیت صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ جب تک ۱۹۱۴ء کی جنگ کا ہنگامہ شروع نہ ہوا اور محمد علی کی مدیرانہ حیثیت قومی کے کاموں میں منتقل نہ ہو گئی وہ ہمدرد کے شعبہ ادارت کی نگرانی کرتے رہے یہی زمانہ وہ تھا کہ ایک ایسے استاد جو بہ یک وقت شفیق بھی تھا اور سخت گیر بھی انہوں نے صحافت کے ابتدائی اصول اپنے نوجوان مددگاروں کو بتائے یہ تھا کہ ہفتہ میں صرف ایک دو مضامین لکھوائے جاتے تھے۔ ہر روز شام کو شعبہ ادارت کے اراکین کی ایک مجل چیف ایڈیٹر کے کمرے میں منعقد ہوتی تھی۔ اس مجلس میں مرحوم اپنے ہر مددگار کے لیئے ایک مضمون تجویز کرتے تھ اس اصول کو ذہن نشین کرایا کرتے تھے کہ لکھنے سے پہلے اور لکھنے سے زیادہ پڑھنے کی ضرورت ہے بعض دفعہ د کتابیں پڑھنے کے بعد ایک اداریہ لکھنا ہوتا تھا۔ میرا پہلا اداریہ ہمدرد کی پہلی جلد کے آٹھویں پرچے میں ۱۰ ر جون کو شائ اس کا عنوان "مصر" تھا۔ یہ اداریہ کئی قسطوں میں شائع ہوا تھا لیکن میں کیا بتاؤں کہ وہ لکھا کس طرح گیا تھا۔ اور فن صحافت محمد علی کے شاگرد کس طرح تربیت حاصل کرتے تھے۔ دس بارہ کتابیں مجھے دی گئی تھیں تاکہ میں ان سب کو پڑھ لوں کچھ نو محمد علی نے لکھائے تھے۔ آٹھ دس دن میں لکھنے کی تیاری کرتا رہا پھر جب ایک حصہ لکھ لیا تو مسودہ ان کے پاس لایا مجھے یاد چند ہی سطریں پڑھنے کے بعد انہوں نے منہ بنایا اور یہ کہہ کر مسودہ پھینک دیا کہ "یہ کیا فضولیات گھسیٹ کر لائے ہو" کہوں کہ اس دن ایک خام کار نوجوان کی کس قدر دل شکنی ہوئی۔ جس کو اپنے خیال میں بڑا ناز تھا۔ اس بات پر کہ وہ ہمدرد ادارتی شعبہ میں بغیر اپنی خواہش کے اصرار کے ساتھ شریک کیا گیا ہے۔ حالانکہ عمر اور تجربہ میں وہ محمد علی کے تمام دوس مددگاروں سے کم تھا۔ اب اگر چیف ایڈیٹر کی رائے میں اس کے پہلے ہی مضمون کا مسودہ فضولیات قرار پایا تو ظاہر کہ اس نوجوان کی خود بینی کو جس قدر بھی صدمہ پہونچا ہو وہ کم ہے۔ بڑی ذلت اور شرمندگی محسوس ہوئی۔ کچھ غصہ بھی آیا گر تا نہ تھی کہ اس غصہ کا ذرا بھی اظہار کیا جاتا۔ پھر ایک گھنٹہ تک ان کا لکچر پیا۔ پھر بہت کوشش کر کے ان کے خیالات کے مطاب وہ مضمون لکھا پھر بھی وہ ناپسند ہوا مگر اتنا زیادہ نہیں جتنا کہ پہلی دفعہ۔ ہدایت ہوئی کہ ایک دفعہ پھر لکھو۔ رات بھر بیٹھ کر پھر لک

صبح کو پیش کیا۔ پورا مضمون پڑھا اور گلے سے لگالیا۔ تعریفوں کے پل باندھ دیئے پہلے جس قدر ان کی تنقید سے شرمندہ ہوا تھا اب ان کی توصیف سے شرمندہ ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ تنقید کی تلخی ہی میں شہد اور دودھ کی لبریز نہریں بہا کرتی ہیں۔ ہفتوں میرے مضامین کی تعریف ہوتی رہی۔ جو ملنے والا آتا اس سے سوال ہوتا دیکھا آپ نے ہمدرد کا مضمون غفار نے لکھا ہے۔ قلم توڑ دیے ہیں۔ چنانچہ حوصلہ بڑھا اور خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ اب ان کی بات سمجھ میں آنے لگی۔ ان کا سا حافظہ یا ان کی سی ذہانت تو نصیب نہ ہوئی تھی، اس لئے بلا مبالغہ سینکڑوں اور ہزاروں کتابیں اس طرح پڑھیں کہ پنسل اور نوٹ بک پاس رکھی ہے۔ کام کی باتیں نوٹ کرتا جاتا ہوں۔ ہر مسئلہ کے متعلق حاصل کردہ معلومات کو ایک علیحدہ فائل میں محفوظ کر دیتا ہوں اور ضرورت کے وقت اس سے کام لیتا ہوں۔ مضمون لکھتا ہوں تو زیادہ کوشش اس بات کی کرتا ہوں کہ وہ معلومات سے پر ہو اور معلومات بھی ایسی جو صحیح ہو۔

خود محمد علی کو جب کوئی اہم مضمون لکھنا ہوتا تھا تو راتوں کو اس طرح جاگتے تھے کہ ان کے بستر پر کتابیں اخباروں رسالوں اور تراشوں کا ایک انبار ہوتا تھا۔ اور سرخ پنسل ہاتھ میں ہوتی تھی۔ ان تیاریوں کے بعد لکھنے بیٹھتے تھے تو اپنے طرز نگارش کے ساتھ اپنی بے پناہ معلومات سے دلائل کے وزن میں اضافہ کرتے تھے اور بعض اوقات تو میں سمجھتا تھا کہ وہ بال کی کھال نکال رہے ہیں۔ لیکن بعد کو معلوم ہوتا تھا کہ انہیں چھوٹی چھوٹی تفصیلات سے بڑے بڑے دلائل مستحکم کیے جاتے ہیں۔

ہر شریک کارکو ان کے خلوص اور محبت سے بھرے ہوئے دل میں جگہ ملتی تھی۔ ظاہری عتاب اور غصہ (جو آخر میں اعصابی امراض کی وجہ سے بہت زیادہ ہوگیا تھا) محض عارضی ہوتا تھا۔ ایک دفعہ ان کے ایک مضمون کا ایک پروف میں نے دیکھا تھا اس میں کوئی غلطی رہ گئی مزاج برہم ہوگیا۔ دفتر میں آکر مجھ پر برس پڑے میں بھی کچھ برسا اور اس وقت اپنا استعفیٰ دے کر گھر چلا آیا۔ دوسرے دن شوکت بھائی زبردستی پکڑ کر لے گئے اور میں گیا بھی تو یہ سن کر کہ کل سے محمد علی نے کھانا نہیں کھایا ہے اور بہت مغموم ہیں۔ اُن کے سامنے پہونچا تو شکایت حکایت تو کجا لپٹ کر اس طرح رونے لگے کہ مجھ پہ ہزاروں گھڑے پانی پڑگیا۔ میری شکایت ندامت بن گئی۔ اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں کی محبت کے جواب میں وہ محبت مانگا کرتے تھے اور اگر ہم اپنی کم فہمی سے ان کی کسی شکایت اور غصے کو ناروا قرار دے کر خفا ہو جاتے تھے تو ان کے قلب صافی کی سادگی ایسی تھی کہ وہ خود بھی حیران ہو جاتے تھے کہ میں نے کیا کیا۔ صحافت ان کی زندگی کا کوئی واحد مقصد نہ تھا۔ ہمدرد کے اجراء کے چند ہی روز بعد ان کی قومی مصروفیت نے اپنے لئے بڑے بڑے میدان اور خارزار پیدا کر لئے۔ اسی لئے صحافت کو وہ اب اپنی نظر میں اس سے زیادہ کچھ نہ سمجھتے تھے کہ۔

"مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موج خون یہ بھی"

چنانچہ رفتہ رفتہ کامریڈ اور ہمدرد کے کاموں سے ان کا تعلق بہت کم ہوگیا۔ اور "ہمدرد" کی ذمہ داریاں بڑی حد تک مجھ پہ اور کامریڈ کی ذمہ داریاں مرحوم راجہ غلام حسین پہ عائد ہوگئیں ان کی نظربندی کے بعد بھی کچھ عرصہ تک میں "ہمدرد" سے وابستہ رہا۔ لیکن بعد میں میں کلکتہ جاکر وہاں سے روزنامہ "جمہور" جاری کیا۔ اسی طرح میں ان سے دور ہوگیا میری صحافت کلکتہ میں بھی بہت کامیاب رہی اور جو کچھ محمد علی سے سیکھا تھا وہی کام آیا۔

یہ تھے محمد علی علی گڑھ کے ایک قابل فخر سپوت ان کی صحیفہ نگاری نے اردو صحافت کا ایک نیا دور شروع کیا تھا اور وہ
کی پس ماندہ صحافت میں بعض اہم اصلاحات کے بانی تھے۔ مثلاً "ہمدرد" پہلا روزنامہ تھا جو لیتھو کے بجائے ٹائپ میں چھاپا گیا
پہلا روزنامہ تھا جس کے مضامین کا معیار اس زمانہ کی عام صحافت سے بہت زیادہ بلند تھا۔ بہت سے مشہور شعراء اور ادیب
جو صحافت سے دور رہتے تھے محمد علی کی شخصیت نے پہلی دفعہ ہمدرد کے صحافت پہ پیش کیا۔ حالی۔ اور اقبال اور شبلی۔ کی
اور پریم چند کے افسانے غالباً پہلی دفعہ اسی اردو روزنامہ میں شائع ہوئے۔ اور مزاح نگاری کا ایک ایسا معیار ہمدرد
قائم کیا جس کا اس سے پہلے اردو صحافت میں کوئی وجود نہ تھا بوتی اور محفوظ علی (دونوں علی گڑھ کے) اس فن کے استاد مانے
اور آج بھی جو اچھے مزاح نگار یا طنز نگار ہیں انہوں نے ہمدرد کی روایات سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ یہ سب محمد علی کی
کا کرشمہ تھا۔ میں سوچا کرتا ہوں کہ وہ اگر سیاسی اختلافات کی الجھنوں میں نہ پھنس گئے ہوتے اور صحافت اور تصنیف و تالیف
طرف زیادہ رجوع ہوتے تو خدا جانے وہ کیا ہوتے۔

علی گڈھ کے سلسلے میں ان کا ذکر کرنا میرے لئے اس وجہ سے مشکل ہے کہ وہ میرے ہم عصر نہ تھے لیکن بعد میں
سے اور علی گڈھ کے مسائل سے ان کی شخصیت بار بار ٹکرائی۔ اس تصادم کا ایک نتیجہ جامعہ ملیہ کا قیام تھا۔ اس داستان کا
بہت زیادہ سیاسی ہو جاتے گا۔ اس لئے اس زمانہ کے حالات کا کچھ زیادہ ذکر نہیں کرتا سوائے اس کے کہ علی گڈھ کی تحریک
بہت بڑے حامی ہوتے ہوئے وہ علی گڈھ کے بڑے بڑے لیڈروں سے ٹکراتے رہے۔ محسن الملک اور وقار الملک
کے جانشین اور انگریز اسٹاف سب ہی ان کی تنقید کی زو میں آئے لیکن تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون کے ہنگامہ
علی گڈھ سے گذر کر دوسرے میدانوں میں چلے گئے۔ تاہم آخر تک ان کے دل کو علی گڈھ کی یاد بہت عزیز رہی۔

علی گڈھ کے کھنڈروں کے سردار تو شوکت علی تھے لیکن محمد علی اس زمانے کے نوجوان دانشوران علی گڈھ کی
میں تھے۔ وہ عرصہ تک سر سید کے مسلک کے حامی رہے لیکن سر سید کے جانشینوں سے ان کی ترقی پسندی بار بار ٹکرائی
زمانہ تو وہ آیا کہ ان کا بس چلتا تو علی گڈھ کا سارا نقشہ بدل دیتے جس وقت علی گڈھ کا انگریزی اسٹاف حکومت کا نمائندہ
اپنے اقتدار کو علی گڈھ پر مسلط کر رہا تھا تو محمد علی، علی گڈھ کے قدیم در و بست سے بغاوت کی تبلیغ کر رہے تھے۔
کی آواز عوامی زندگی میں وزن رکھتی تھی اور جب بلند ہوتی تھی تو بہت گونجتی تھی۔ مزاج۔ قلم اور زبان کی شدت حدت
بہت اضافہ ہو گیا۔ اس کی ایک مثال ان کے وہ خطوط ہیں جو اس زمانے میں وہ علی گڈھ کے ارباب کار کو لکھتے تھے
وقت نواب محسن الملک مرحوم پر انگریز اسٹاف اور حکومت کا دباؤ بڑھ رہا تھا تو محمد علی اس بات پر زور دے رہے
اسٹاف بورڈ اور ٹرسٹیز اور سکریٹری سے سرتابی کرے تو اسے نکال دینا چاہیئے۔ چنانچہ ایک خط میں نواب محسن الملک
لکھتے ہیں کہ۔

اب آپ عمر کی اس منزل پر آ گئے ہیں کہ ذرا گردن اٹھا کر (عالم) جزا کی بھی سیر کیجئے آپ کی نظر میں یہاں کے
انعام سلے پتے اور جھوٹے سلے ستارے سے زیادہ وقعت نہ رکھیں گے۔ جو راستہ آپ نے اختیار کیا ہے
وہ آپ کو منزل مقصود تک ہرگز نہ پہنچائے گا یہ کعبہ کی راہ نہیں ہے ترکستان کا راستہ ہے۔ غلطی آپ کے

دل کی نہیں دماغ کی ہے۔" (خطوط محمد علی مرتبہ پروفیسر سرور)
قائد ملت محمد علی کے متعلق تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن نہ تو صحیفہ نگار محمد علی کے متعلق ابھی کچھ لکھا گیا اور نہ علی گڈھ کی تحریک سے محمد علی کی آویزش کی تفصیلات قلمبند ہوئی ہیں جب کبھی وہ یاد آتے ہیں تو اس عہد رفتہ کے بہت سے مردے گڑے میں بولتے ہیں۔ علی گڈھ والوں کے لئے آج بھی ان کا نام اپنے اندر ایک بے پناہ جاذبیت رکھتا ہے۔ علی گڈھ کا محمد علی اس وقت کیا تھا اس کا تصور کیجئے جس طرح میں آج ۱۹۱۱ء کے زمانے کو دیکھتا ہوں اور پھر آج ۱۹۴۸ء پر نظر کرتا ہوں ۲۲ سال کے نوجوان کو یاد کرتا ہوں۔ اور پھر ۶۰ سال کے بوڑھے کے احساسات کا تجزیہ کرتا ہوں۔ محمد علی تو خواب ابد ہیں اور علی گڈھ بوڑھا ہو چلا ہے۔ چھوٹے ہو چکا اور کس طرح اس راہ پر قافلے گذرے چلے جاتے ہیں۔ اب جو دیکھتا ہوں تو اس دور کے تمام نقش قدم مٹے جا رہے ہیں۔ دس بیس سال بعد ہماری نئی نسلوں کو شاید یہ معلوم بھی نہ ہو کہ محمد علی کون تھے اور کیا تھے انصاری کون تھے۔ اجمل خاں کون تھے۔ اس گذرے ہوئے قافلہ کے جو شکستہ پا مسافر باقی رہ گئے ہیں ان کا حال یہ ہے کہ

بصحرائے عدم آباد بر ہر نقش پا محوی
بیاد کارواں ہائے گذشتہ نالہائے کرد

"عقل کی مرضی تھی کہ محمد علی انصاف کی کرسی پر بٹھاتے جائیں مگر عشق کی خوشی کہ الزام کے کٹہرے میں کھڑے ہوں۔ عقل نے انہیں سزا دینے کا طریقہ مگر عشق نے سزا پانے کا سلیقہ سکھانا چاہا۔ عقل نے ان کے لئے ججی کا چغہ اور وزارت کا خلعت مگر عشق نے جیل کا کرتا اور حج کا احرام بنانا چاہا۔ عقل کا مشورہ تھا کہ وہ بریڈلا اور انگرسال کے زمرۂ شاگردی میں مگر عشق کا حکم کہ ادیس و بلال کے حلقۂ غلامی میں آئیں۔ غرض کہ عقل کا فیصلہ تھا کہ وہ یزید مگر عشق کا فتویٰ کہ شہید ہوں۔ اس کشاکش میں پایانِ کار عشق ہی کامیاب ہوا۔"

(میر محفوظ علی)

دوست کا ماتم

(اسٹیٹ سجاد حیدر بی اے (علیگ) اڈپورٹ بلیر)

"اس کشتہ تغافل ملت کہ اب یاد کیا جارہا ہے۔ اس کی زندگی میں اس پر بدگمانیاں تھیں، طعنے تھے، سرد مہری تھی، مخالفت تھی، اب ایک سیلاب عقیدت ہے کہ چاروں طرف سے اُمڈ آرہا ہے۔

غالب کا شعر ؎

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

کسی پر اتنا صادق نہیں آیا جتنا بے چارے محمد علی پر

مرحوم میرا کالج فیلو ہی نہ تھا، مجھے یہ فخر ہے کہ میرا کلاس فیلو بھی تھا اور وہ باوجود اس کے کہ دنیا کی بزرگ ترین ہستیوں میں شمار ہوتا تھا، اپنے پرانے ہیچ میرز کلاس فیلو سے آخر رات تک اس پرانے ارتباط اور بے تکلفی سے ملا کیا۔ آہ اب ہمارا مایۂ ناز کلاس فیلو کہاں ہے"

LOU PIDOU
SAINT MATHIEU
GRASSE A.-M.

17. 11 32

My dear Sir

I met Mohammed Ali on several occasions & liked him very much personally. But I don't think I could produce anything very illuminating to tell about him. We differed & argued about all sorts of things but we sympathised acutely about the British "governing class"

Very sincerely yours

H. G. Wells

ایچ جی ویلز کے
خط کا عکس محمد علی
کے متعلق۔

جارج برنارڈ شا کے خط
کا عکس محمد علی کے
بارے میں۔

یہ دونوں خط
مولانا عبدالماجد دریابادی
کے نام ہیں۔

GRAMS, SOCIALIST, PARL-LONDON.
TELEPHONE, WHITEHALL 3160.

4, WHITEHALL COURT, LONDON, S.W.1

6th May 1932.

Dear Sir,

My acquaintance with Mohammed Ali was limited to a conversation at my house at which we discussed the possibility of a Reformation in Islam somewhat like the Christian reformation led by Martin Luther. We agreed, I think, that a Back to Mahomet movement was needed to rescue Islam from the ruts which it has been digging for itself for some centuries past. I found M.A's company very congenial; and as your letter encourages me to believe that mine was not altogether disagreeable to him, I flatter myself we parted friends.

His personality left such an impression on me that when the news of his death came I felt that Islam had lost a very valuable living force.

That is all I can say about him from personal knowledge.

Faithfully

G. Bernard Shaw

Mr Abdul Majid.
P.O.Daryabad
[illegible]

مولانا شوکت علی

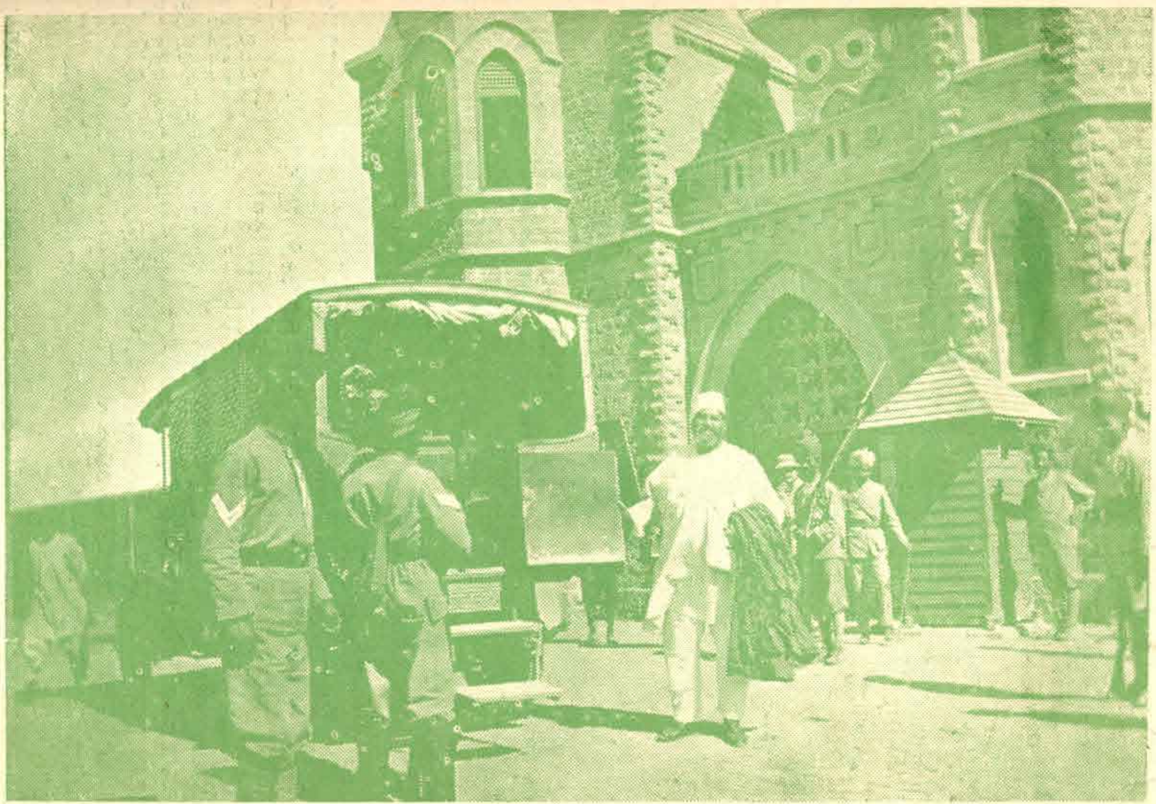

کراچی جیل سے نکل کر پولیس وین (Van) کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جو انہیں عدالت پہنچائے گی۔ جہاں ان کے خلاف مقدمہ بغاوت کی سماعت ہو رہی ہے۔

شوکت علی

ذاتی تاثرات و مشاہدات کی روشنی میں

جس جائے سراپا پہ نظر جائے ہے اس کے،
آوے ہے یہی جی میں یہیں عمر بسر کر

ایک انوکھی، البیلی اور پیاری شخصیت کا مرقع

از
رئیس احمد جعفری

یکم دسمبر ۱۹۳۳ء !

مرکزی خلافت کمیٹی بمبئی کے سیکریٹری غازی صاحب عرصہ سے کوشش کر رہے تھے کہ میں روزنامہ خلافت
ہو جاؤں ۔ یہ پیش کش میرے لیے بڑی سحر طراز تھی ۔

بمبئی !

خوابوں کی دنیا !

کس کا جی نہ چاہے گا بمبئی جانے کا !

لیکن شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین (جواب جمہوریہ ہند کے نائب صدر ہیں) کی اجازت اور ایما کے بغیر میں یہ پیش کش
نہیں کر سکتا تھا، اور وہ کسی طرح اجازت دینے پر تیار نہیں تھے ۔ اس پر تیار تھے کہ وہ خود دہلی سے اخبار نکالیں
ایڈیٹر بنا دیں ۔ لیکن اس وقت جب میں تعلیم مکمل کر لوں ۔

محبت اور شفقت کا یہ بندھن ایسا نہیں تھا جسے غازی صاحب کی خاطر —— گو ان کی خاطر مجھے عزیز تھی ——
غازی صاحب کے ہر خط کے جواب میں میرا معذرت نامہ چلا جاتا ۔ ایک مرتبہ وہ خود بمبئی سے دہلی آئے اور ڈاکٹر صاحب
" مانگا "۔ لیکن بے انتہا با مروّت ہونے کے باوجود انہوں نے صاف انکار کر دیا ۔ میں دروازے کے پیچھے دونوں کی باتیں
ذاکر صاحب کے انکار نے غازی صاحب کو مایوس کر دیا ۔ پھر انہوں نے مجھ سے بمبئی چلنے کو نہیں کہا ۔

ذاکر صاحب کے مجھ پر بڑے احسانات تھے ۔ ایک دفعہ وہ ندوۃ العلماء تشریف لائے ۔ طلبہ کی طرف سے ان
گیا ۔ میں نے خیر مقدمی تقریر کی ۔ انہیں میری تقریر کچھ ایسی پسند آئی کہ اسی تقریر نے جامعہ کے دروازے میرے لیے
تمام دشواریاں ختم ہو گئیں ۔ جو سہولتیں ندوے میں حاصل تھیں اس سے کہیں زیادہ ذاکر صاحب کی کرم فرمائیوں سے
میرے لیے کس طرح ممکن تھا کہ میں ان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھاتا ؟

لیکن انسان سوچتا کچھ ہے ہوتا کچھ ہے ۔ ۱۹۳۳ء کی آخری ششماہی میرے لیے مصیبتوں کا ایک طوفان
کے حالات دگرگوں ہو گئے اور مجھے سنجیدگی سے بار بار سوچنا پڑا کہ تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے زندگی کے سمندر میں جلد از جلد
میری خواہش تھی کہ دہلی میں مجھے کوئی کام مل جائے ۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا ۔ قاضی عبد الغفار —— مصنف لیلیٰ کے
نے ذاکر صاحب کی سفارش پر حیات اجمل کے لیے مجھے عربی کے بہت سے خطوط اور بعض مقالات کا ترجمہ کرنے کو دیا تھا لیکن
بلا میں گرفتار تھے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے تو ان کی مدد —— ترجمہ کر کے —— کر دی ۔ مگر وہ میری مدد —— معاوضہ ادا
نہ کر سکے ۔

اسی اثناء میں بڑے دن کی تعطیل میں میرا لکھنؤ جانا ہوا۔ اتفاق کی بات اسی زمانے میں وہاں سید مرتضیٰ بہادر کی زیر صدارت آل انڈیا خلافت کمیٹی کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ میں نے دو روز کے لیے خیرآباد جانا ملتوی کیا، اور ندوے میں ٹھہر گیا کہ اجلاس کی بہار دیکھ کر وطن جاؤں گا۔

کانفرنس کے پنڈال میں پہنچا تو غازی صاحب سے ملا۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور بڑے داعیہ سے کہا

"دیکھنا ہے اب تم کیسے بچ کر جاتے ہو!"

یہ کہہ کر وہ مجھے مولانا شوکت علی کی خدمت میں لے گئے۔ اور کہا۔

"یہ سیرت محمد علی کے مصنف جعفری صاحب ہیں۔ میری بات تو یہ بار بار ٹھکرا چکے ہیں۔ اب آپ حکم دے کر دیکھ لیجیے"۔

شوکت صاحب نے مجھ پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور فرمایا

"خلافت میں نے بند کر دیا ہے۔ سب نالائق لوگ تھے۔ نکمے! بمبئی آؤ اور خلافت جاری کرو"۔

پھر دفعتہً اپنی بڑی بڑی دل میں اتر جانے والی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور کہا

"ہمیں تم جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے ——!"

پھر سوال کیا: "کب آ رہے ہو؟"

میں ذاکر صاحب کو سپر نہ بنا سکا۔ کوئی عذر نہ پیش کر سکا۔ مرعوب اور مبہوت ہو کر جواب دیا

"جب آپ فرمائیں!"

غازی صاحب سے فرمایا "انہیں کرایہ دے دو!"

مجھ سے ارشاد ہوا "ایک ہفتہ کے اندر پہنچ جاؤ"۔

کرایہ لے کر ندوے آیا۔ وہاں سے خیرآباد پہنچا، اور ضروری تیاریاں کر کے بمبئی روانہ ہو گیا۔

یکم جنوری ۱۹۳۲ء کو میں بمبئی پہنچا۔ خلافت کمیٹی کے اکاؤنٹنٹ مسٹر جعفر علی خاں بوری بندر پر میرے استقبال کے لیے موجود تھے۔ کھدر کے سفید لباس سے میں نے، اور ایک بوکھلائے ہوئے مسافر کی حیثیت سے انہوں نے مجھے پہچان لیا۔ میں ان کے ساتھ ساتھ باہر آیا۔ خلافت کی کار کھڑی تھی۔ سامان رکھوایا۔ اور ہم دونوں کوئی پندرہ منٹ میں خلافت ہاؤس پہنچ گئے۔

مجھ سے پہلے خلافت کی کرسی ادارت پر بڑے بڑے لوگ متمکن ہو چکے تھے۔ مسٹر عبدالغنی بی۔ اے (علیگ)، قمر احمد بی۔ اے ایل ایل بی (علیگ) اور آج اسی کرسی پر ۲۱ سال کا ایک نوجوان جس نے ابھی کالج کی تعلیم بھی ختم نہیں کی تھی، اور جس نے کسی اخبار میں ایک دن بھی کام نہیں کیا تھا، بیٹھا تھا —— انقلابات ہیں زمانے کے!

میرے آنے سے پہلے غازی صاحب نے کاتبوں کا انتظام کر لیا تھا، لیکن اسٹاف کا انتظام نہیں کر پائے تھے۔ نہ کوئی مترجم تھا، نہ سب ایڈیٹر۔ نہ رپورٹر نہ پروف ریڈر۔ مصر کے اخبارات میں الاہرام، المقطم، البلاغ وغیرہ تبادلے میں آتے تھے۔ بغداد سے "الاوقات العراقیہ" اور حجاز سے "ام القریٰ" آتے تھے۔ صبح صبح ان اخبارات کو لے کر میں بیٹھا۔ اور "عالم اسلام" کے نام سے ایک "خبرنامہ" تیار کر لیا۔ ٹائمز آف انڈیا، فری پریس جرنل، اور بمبئی کرانیکل سے بعض اقتباسات لے لیے۔ "شذرات" کے عنوان

سے چند چھوٹے چھوٹے نوٹ لکھے، اور مقالۂ افتتاحیہ بھی تیار کر ڈالا۔ اس طرح دو صفحے تیار ہو گئے۔ تقریباً ایک صفحے کے اشتہا
چوتھا صفحہ بیرون بمبئی کے اردو اخبارات کی چیدہ چیدہ خبروں سے بھر دیا۔ یہ سارا کام میں نے بارہ بجے تک ختم کر ڈالا۔ ا
میں اطلاع ملی کھانا تیار ہے۔ ڈائننگ ہال پہنچا۔ وہاں سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ بہت تھک گیا تھا۔
میں اطلاع ملی کہ کاتب صاحبان قلم دوات لے کر آگئے ہیں۔ پہلے پھر دفتر پہنچا۔ ہیڈ کاتب خواجہ قیام الدین صاحب کو سارے م
دیدیے۔ انہوں نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا میٹر تو کافی ہے لیکن چار صفحے اس سے پورے نہیں ہوں گے۔ آدھے
سے کچھ کم مضمون اور دیدیں۔ سامنے مراسلات کا ڈھیر رکھا تھا۔ مراسلات کے پڑھنے اور چھانٹنے میں کافی وقت صر
بہر حال چار صفحے پورے کر دیے۔ جو مضمون ختم ہوتا تھا تصحیح کے لیے میرے پاس آجاتا تھا۔ ساتھ ساتھ میں تصحیح بھی کرتا ج
پانچ بجے کے قریب مولانا عرفان فنانس سیکریٹری خلافت کمیٹی میرے کمرے میں آئے اور فرمایا۔

"چلو تمہیں سیر کرا لائیں!"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، فوراً اٹھا اور ان کے ساتھ ہو لیا۔

مولانا عرفان صوبۂ سرحد کے رہنے والے تھے۔ بہت بڑے عالم تھے۔ فلسفہ ان کا خاص موضوع تھا۔ عربی زبان عربو
طرح بولتے تھے۔ تحریک خلافت میں پورے جوش وخروش سے حصہ لیا۔ جیل کی تکلیفیں سہیں، مصیبتیں جھیلیں، کلفتیں بر
کیں لیکن ماتھے پر بل نہ آیا۔ چیف کمشنر نے صوبۂ سرحد میں داخلہ بند کر دیا۔ مگر پروا نہ کی۔ علی برادران کے شیدائی تھے۔
دوستی میں مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید جیسے رفقائے قدیم سے ناتہ توڑ لیا۔ بے انتہا بے تکلف اور بے جھجک قس
آدمی تھے۔ چند منٹ میں تفاوت عمر وعلم کے باوجود اس طرح گھل مل گئے جیسے پرانے اور بے تکلف دوست ہیں لیکن
حدِّ ادب سے باہر قدم نہیں نکالا۔

مولانا نے ورلی کا ساحل دکھایا، اپالو بندر کی سیر کرائی، چوپاٹی کا نظارہ کرایا۔ بڑی اچھی ڈرائیونگ کرتے تھے۔
مرحلوں سے فراغت پانے کے بعد اب ہماری کار فراٹے بھرتی ساحل جوہو کی طرف بھاگ رہی تھی —— یہ ایک دنیا تھی
کی، حسن وجمال کی، عشوہ وادا کی، جذب وسحر کی یہودی، عیسائی، ہندو، مسلمان، ارمنی، جرمنی، جاپانی، امریکی، انگریزی
برمی، ہر ملک اور ہر قوم کے معیار حسن کی نمائندگی یہاں موجود۔

اس دنیا نے مجھے اپنے دامن میں سمیٹ لیا، کتنی عجیب، کتنی سحر طراز، اور کتنی کشش انگیز تھی یہ دنیا

کنارِ آبِ انبوہِ حسیناں
ہر اک جانب ہجومِ مہ جبیناں
سنہری تھالیاں چونک سے روشن
بتاسے، دوبا، تلسی، دھوپ، چندن
مٹھائی، ناریل، پھول اور چاول
گودڑی، کالے تل، سیندور، کوگل

چڑھاتی ہیں نہانے میں لبِ آب
جہاں دیکھو وہاں پوجا کا اسباب
فلک پر ڈوبتے دیکھتے ستارے
لبِ ساحل چمکتے چاند تارے
کوئی گوری ہے کوئی سانولی ہے
کہیں جمنا، کہیں گنگا جلی ہے
نہانے دھونے میں بھی چھب لائن
ٹپکتا تھا سبھی ان آب جوبن
بھرے مانگوں میں سیندور اور صندل
گلابی مدبھری آنکھوں میں کاجل
گندھی زلفیں، بندھے جوڑے، کھلے بال
کہیں سمٹا، کہیں پھیلا ہوا جال
نشیلی انکھڑیاں، نیچی نگاہیں
پھنسا لینے کی، بہکانے کی راہیں
ادا سے بوٹی بوٹی کا پھڑکنا
بگڑنا خود بخود رکنا، جھجکنا
ہنسی میں آپ ہی وہ لوٹ جانا
پھر اپنی شرم سے گردن جھکانا

یہ دنیا تھی یا قیامت؟

۸ بجے رات کو خلافت ہاؤس میں واپس آیا۔ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں ۹ بجے کے قریب خاموشی سے آکر بیٹھ گیا۔ اس وقت اردو اخبارات میں خلافت وہ پہلا روزنامہ تھا جو ایسوسی ایٹڈ پریس اور رائٹر سے خبریں خریدتا تھا۔ ٹیلی پرنٹر کا استعمال ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ ہر ایک گھنٹے کے بعد چپڑاسی سائیکل پر جاتا تھا اور خبروں کا ایک پلندہ لے کر واپس آتا تھا۔ یہ سلسلہ سات بجے شام سے شروع ہوتا تھا اور رات کے دو بجے تک جاری رہتا تھا۔

خبروں کے کئی پلندے میرے سامنے رکھے تھے۔

جوہو کی ساری سحر طرازیاں فراموش ہو چکی تھیں۔ خبروں کے اس ڈھیر میں کون سی خبر قابلِ اشاعت ہے، کون سی قابلِ رد، کسے مختصر کرنا چاہیے اور کسے تمام و کمال دینا چاہیے؟ یہ گتھی کسی طرح سلجھ ہی نہیں رہی تھی کہ اتنے میں ایک اور پلندہ آگیا۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکلی جا رہی تھی، میرا سر گھوم رہا تھا، میری آنکھیں پُرنم تھیں۔

یہ آج معلوم ہوا کہ خبروں کا پڑھ لینا اور سمجھ لینا آسان ہے۔ ترجمہ کرنا مشکل۔ اور تیزی سے ترجمہ کرنا تو بہت ز
مشکل ہے۔ وہ بھی اس شخص کے لیے جو کلاس کی کتابیں بند کرکے ایڈیٹر کی کرسی پر آبراجا ہو۔

آج میرا امتحان تھا۔

آنے والے چند گھنٹے میرے مستقبل کے لیے فیصلہ کن تھے۔

خلافت ہاؤس میں آئے ہوئے ابھی مجھے ۲۴ گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ مختلف قسم کی افواہوں اور خبرو
جو خلافت کے رضاکار اور کارکن شہر سے لالا کر پہنچا رہے تھے، مجھے حواس باختہ کر دیا تھا۔

خلافت کا برخاست شدہ عملہ مجھے ذلیل کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جامعہ کا یہ نوخیز طالب علم جس
کا کوئی تجربہ نہیں ہے اور جس کا کوئی ساتھی نہیں ہے ہرگز آٹھ صفحے کا اخبار تن تنہا نہیں مرتب کر سکے گا۔ اور اتنے دنوں تک
رہنے کے بعد اگر اخبار آٹھ صفحے پر نہ نکلا یا پھیکا نکلا، یا کوئی اہم خبر رہ گئی تو اخبار پٹ جائے گا۔

صرف چھ گھنٹے باقی تھے۔ اس مدت میں مجھے ۴ صفحوں کے بقدر خبروں کا ترجمہ کر ڈالنا چاہیے تھا۔

قلم ہاتھ میں تھا۔ خبریں سامنے تھیں، دماغ کہیں اور تھا۔

دن بھر مولانا شوکت علی سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ وہ کسی کام سے احمد آباد گئے تھے۔ رات کو واپس آئے اور سی
میرے کمرے میں پہنچے۔ خیریت دریافت کی اور پھر میرے سامنے خبروں کا انبار دیکھ کر فرمایا۔

"ڈٹے رہو!"

اور چلے گئے۔

"ڈٹے رہو" یہ دو لفظ تھے۔ لیکن ان میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ میرا سارا اضطراب رفع ہو گیا۔ شوکت صاحب کے
ہی میں "ڈٹ" گیا اور سر جھکا کر خبروں کا بے تکان ترجمہ شروع کر دیا۔ جیسے کسی نے میرے قلم میں بجلی بھر دی تھی۔ ایک ایک
تھوڑے تھوڑے وقفہ سے کاتبوں کے کمرے میں پہنچ رہی تھی۔ اور تبرک کی طرح تقسیم ہو رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا
خبریں ترجمہ کیں؟ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ترجمہ کیسا کیا ہے؟ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کتنی دیر سے ترجمہ کر رہا ہوں۔ یکایک
کیا کوئی شخص میز کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا ہے۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو خواجہ قیام الدین ہیڈ کاتب تھے۔ انہوں نے میرا
لیا اور کہا

"بس" آخری کاپی (دو دو صفحے کی کاپی چھپتی تھی) بھی پوری ہو گئی"۔

خواجہ صاحب کی آنکھوں میں محبت اور خلوص کی چمک تھی۔ میں نے قلم روک لیا۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو چار بج رہے
صبح ہونے والی تھی۔ میں گھبرا گیا۔ میں نے کہا۔

لیکن کاپی تو لیٹ ہو گئی۔ اسے ۳ بجے جانا چاہیے تھا۔

خواجہ صاحب نے مجھے دلاسا دیتے ہوئے کہا

خلافت پریس کا مشین مین بڑا ہوشیار آدمی ہے اطمینان رکھیے وہ پرچہ لیٹ نہیں ہونے دے گا!" ——

نے کمال کر دیا۔ منہ دیکھ کر رہ جائیں گے سارے مخالف کل۔"

ان حوصلہ افزا الفاظ سے میری کچھ زیادہ تسلی نہیں ہوئی۔ لیکن تھک کر چُور ہو چکا تھا۔ اپنے کمرے میں آیا۔ بستر پر لیٹا۔ اور لیٹتے ہی سو گیا۔ اس کمرے کے دو مکین تھے۔ ایک مولانا عرفان دوسرا میں۔ مولانا عرفان بڑھاپے میں جوانی کی نیند سو رہے تھے۔

میرے بالاخانے کے بالکل سامنے ایک دوسرا بالاخانہ تھا جو مولانا شوکت علی کا مسکن تھا۔ دونوں بالاخانوں کی کھڑکیاں آمنے سامنے تھیں۔ اور فاصلہ اتنا کم تھا کہ نیچے اترے بغیر ایک بالاخانے کا آدمی دوسرے بالاخانے کے آدمی سے بات کر سکتا تھا۔ اور ایک دوسرے کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

صبح آٹھ بجے کے قریب مولانا شوکت علی کی آواز آئی۔

"عرفان، عرفان!"

میں کچھ کچھ جاگ گیا۔ مولانا عرفان نے وہیں سے جواب دیا

"فرمائیے ——"

مولانا شوکت علی نے پوچھا

"جعفری کہاں ہیں؟"

مولانا عرفان نے فرمایا

"خوابِ شیریں کے مزے لوٹ رہے ہیں"

مولانا شوکت علی کی آواز گونجی،

"جب اٹھیں تو میری طرف سے مبارکباد دینا ماشاءاللہ ماشاءاللہ پرچہ بہت کامیاب نکالا ہے۔ جی خوش ہو گیا۔"

جاگ تو میں گیا ہی تھا لیکن سوتا بنا پڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اٹھا تو مولانا عرفان نے اپنی طرف سے چند حوصلہ افزا الفاظ بڑھا کر مولانا شوکت علی کا پیام مجھ تک پہنچا دیا۔

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر پھر اپنے کمرے میں جا رہا تھا کہ میں نے دیکھا خلافت ہاؤس کے صحن میں "سلیپنگ" سوٹ پہنے مولانا شوکت علی ایک بنچ پر بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی آواز دی۔

"جعفری، جعفری ——"

میں ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ شفقت اور محبت کی نظروں سے مجھے دیکھا اور وہی الفاظ دہرائے جو مولانا عرفان نے کہے تھے پھر تسلی دیتے ہوئے کہا

"اتنی زیادہ محنت تمہیں صرف چند روز کرنا پڑے گی۔ تمہاری مدد کے لیے میں آدمیوں کا انتظام کر رہا ہوں۔"

پھر فرمایا "پنسل کاغذ لے آؤ میں کچھ لکھواؤں گا۔"

میں پنسل کاغذ لے کر پہنچا اور مولانا نے ایک مضمون لکھوانا شروع کر دیا۔ اب میری ایک ڈیوٹی یہ بھی تھی کہ مولانا کے مضامین املا کیا کروں۔

غرض اس ایک دن کے کام نے میری جھجک دُور کر دی۔ مولانا کی حوصلہ افزائی نے میرے اندر ایک نیا ولولہ، ا
ایک نئی امنگ اور ایک نیا جوش پیدا کر دیا۔ میری سراسیمگی اور دہشت دُور ہو چکی تھی۔ مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی۔
چند روز تک مجھے تن تنہا سارا اخبار مرتب کرنا پڑا۔ لیکن رفتہ رفتہ میرا بوجھ ہلکا ہوتا گیا۔ میں نے ندوے کے ایک
اور ساتھی عبدالسلام صاحب قدوائی کو (جو اب جامعہ میں شیخ التفسیر ہیں) شوکت صاحب سے اجازت لے کر بمبئی
وہ سب ایڈیٹر ہو گئے۔ ایک اور ندوی دوست ابراہیم عمادی کو بھی ادارے میں شریک کر لیا۔ یہ عربی اخبارات کے تراجم
ندوے کے سفیر کی حیثیت سے حبیب احمد ندوی میرے ساتھ لکھنو سے آئے تھے اور میرے ہی ساتھ مقیم تھے۔ میں نے انھ
صاحب کے پی اے کی حیثیت سے نتھی کرا دیا۔ عبدالعلیم نامی علی گڑھ کے گریجویٹ تھے۔ تلاش روزگار میں بمبئی آئے تھے
نے رات کی خبروں پر لگا دیا۔ لیکن یہ چار صفحے کی خبروں کا ترجمہ ایک آدمی کے بس کا روگ نہ تھا۔ لہذا بہار کے ایک صاحب
ایوبی کو بھی جو انگریزی سے برجستہ ترجمہ کرنے کی اچھی صلاحیت رکھتے تھے رکھ لیا۔ مشہور افسانہ نگار رفیعی اجمیری جنھوں نے
اپنا نام اعظمی اجمیری رکھ لیا تھا مزاحیہ کالم لکھنے لگے۔ رپورٹنگ کا کام خلافت کے ایک رضا کار غلام جیلانی کے سپرد ک
کام اب صرف یہ تھا کہ اگر کسی دن کوئی مترجم غیر حاضر ہو تو رات کی خبروں کے ترجمے میں شریک ہو جاؤں۔ ورنہ مقا
اور شذرات لکھ کر باقی وقت مطالعۂ کتب، سیر و تفریح اور اخبار کی عام نگرانی میں صرف کروں۔

اب میں بہت مطمئن تھا اور بڑے اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔

لیکن بہت جلد، بلکہ کہنا چاہیے رفتہ رفتہ مگر تھوڑی ہی مدت میں، خلافت ہاؤس کے بہت سے اسرار سربستہ
ہونا شروع ہو گئے۔

مجھے سارے خلافت ہاؤس میں ایک دو کے سوا کوئی ایسا آدمی نظر نہیں آیا جو دل سے خلافت اور شوکت صاحب ک
ہو۔ سب اپنی غرض کے بندے تھے۔ اور جب غرض پوری نہیں ہوتی تھی تو مخالفوں سے ساز باز کرنے میں بھی تامل نہیں کر
خلافت کی مالی حالت سقیم تھی۔ پریس نقصان سے چل رہا تھا۔ اخبار میں بھی گھاٹا تھا۔ خلافت اب عوامی تحریک نہیں ر
لہذا عام چندوں کا سلسلہ بھی بند تھا۔ شوکت صاحب اس درگاہ کے مجاور بنے بیٹھے تھے۔ کشکول گدائی لے کر نکلتے تھے۔ جو ک
پر صرف کر دیتے تھے۔ لیکن حالت یہ تھی کہ کئی کئی مہینے تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ کاغذ والے کی خاصی رقم چڑھ گئی تھی۔ وہ بھی آنا کا
جس سے بعض دفعہ اخبار کی اشاعت رُک جاتی تھی۔ روشنائی والے کی خاصی رقم چڑھ گئی تھی۔ ان کے تقاضے پر تقا
تھے۔ بے پروائی، فرض ناشناسی، اور بددلی کا ہر شخص شکار تھا۔ میرے جوش اور ولولے کو دیکھ کر یہ لوگ مذاق اڑ
ایک روز تو ایک صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرما ہی دیا

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیماں کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے

دیکھیں گے کب تک ثابت قدم رہتے ہو

ظاہر ہے میں حالات سے مجبور ہو کر یہاں آیا تھا۔ کئی کئی مہینے تک تنخواہ نہ ملنے سے اضطراب اور تشویش کا

مولانا شوکت علی

کنبہ کے تحفظ کے لئے ....

دی مسلم
کمرشل
بینک لمیٹڈ

طریقہ نہایت آسان ہے:

* پانچ روپے سے اکاؤنٹ کھولا جا سکتا ہے۔
** پچاس ہزار روپے تک آپ اور آپ کے کنبے کا ہر فرد اپنے اکاؤنٹ میں رکھ سکتا ہے۔
*** سال میں تین دفعہ اکاؤنٹ سے بذریعہ چیک رقم نکالی جا سکتی ہے۔
**** جمع شدہ رقم پر ۲½ فیصد سالانہ منافع ملتا ہے۔

مکمل تفصیلات کے لئے ہماری کسی بھی شاخ سے رجوع کیجئے

ہیڈ آفس
کراچی

جنرل منیجر

MCB—367

تھا۔ لیکن شوکت صاحب کو دیکھ کر اپنی ہر بپتا بھول جاتا تھا۔ دوسرے لیڈروں اور مالکان اخبار کی طرح شوکت صاحب کا یہ رویہ نہیں تھا کہ خود تر مال اڑائیں اور اسٹاف فاقہ کرے۔ اگر ہم فاقہ کرتے تھے تو وہ بھی فاقہ کرتے تھے۔ ہم پھٹے کپڑے پہنتے تھے تو ان کے لباس میں بھی پیوند لگتے تھے۔ ہماری جیب اگر خالی تھی تو شوکت صاحب کی جیب میں بھی کچھ نہ تھا۔ لیکن ہم میں اور ان میں فرق یہ تھا کہ ہم مایوس تھے، دل برداشتہ تھے، وہ مگن تھے، خوش تھے۔ ایک روز کا واقعہ تو میں کسی طرح نہیں بھول سکتا۔ صبح کو ناشتہ کے لیے نہ انڈا تھا نہ مکھن۔ نہ ٹوسٹ نہ چائے۔ میں صبح ۷ بجے ڈکٹیشن لینے ان کے پاس پہنچ جایا کرتا تھا۔ وہ بار بار ناشتے کا تقاضہ کر رہے تھے مگر ناشتہ نہ اب آتا ہے نہ جب۔ آخر سمجھ گئے ماجرا کیا ہے۔ اپنے ذاتی خدمت گار لڈن سے فرمایا

"رات کا بچا ہوا کچھ ہے؟"

اس نے ایک باسی روٹی، اور تھوڑی سی کھٹی مسور کی باسی دال لاکر سامنے رکھ دی۔ شوکت صاحب نے پہلا لقمہ توڑتے ہی باسی روٹی اور باسی دال کی لذت پر قصیدہ پڑھنا شروع کر دیا۔ تعریف کرتے جاتے تھے اور کھاتے جاتے تھے جیسے واقعی من و سلویٰ ہو۔

میں یہ منظر دیکھ رہا تھا اور میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

یہ باسی روٹی اور باسی دال وہ شخص کھا رہا تھا کبھی جس کے کتوں کے لیے ہر روز نہ جانے کتنا گوشت آیا کرتا تھا جو انگریزوں کی طرح رہتا تھا اور ان سے زیادہ ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتا تھا۔ جو ہزاروں روپے ماہوار کماتا تھا اور کھانے کھلانے پر صرف کر دیتا تھا۔ جس کی خوش خوراکی اور خوش ذوقی کا دور دور چرچا تھا۔ جو ہندوؤں اور مسلمانوں کا بہت بڑا لیڈر رہ چکا تھا۔ جو مسلمانانِ ہند کا سرتاج تھا۔ جس کی "جیب" میں رہنا گاندھی جی اپنے لیے باعث فخر" سمجھتے تھے۔ کیا قوم بے لوث اور سچی خدمت کا صلہ اسی طرح دیتی ہے؟ شوکت نے بعض دوسرے لیڈروں کی طرح قوم کے روپے سے اپنا گھر بھر لیا ہوتا۔ تو آج اس کا ایک بیٹا (عابد صاحب) کلکتہ میں اور دوسرا بیٹا (زاہد صاحب) دہلی میں خود کفیل بننے کی جدوجہد میں مصروف نہ ہوتا۔ زاہد صاحب سے شوکت صاحب کو عشق تھا۔ زمیندار نے ان کا نام "پرنس آف سیوری" رکھا تھا۔ لیکن باپ کی چاہت بھی بیٹے کی مالی حالت درست نہ کر سکی۔

پنسل میرے ہاتھ میں تھی۔ سادہ کاغذ سامنے تھا۔ دماغ کہیں اور تھا ـــــ میں اپنی پریشانیاں بھول گیا۔ خلافت ہاؤس کے کچن میں ہفتوں سے صرف دال روٹی پک رہی تھی۔ گوشت کا ذائقہ فراموش ہوتا جا رہا تھا۔ بلیاں تک خلافت ہاؤس چھوڑ گئی تھیں۔ اور اس کا ردعمل حد درجہ تلخ اور ناگوار صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ لیکن شوکت صاحب کا یہ ناشتہ اور اس ناشتے کے ساتھ ان کا والہانہ شغف دیکھ کر ساری تلخی اور ناگواری فراموش ہو گئی۔ اور دل نے جیسے عزم سا کر دیا کہ خلافت میں رہنا ہے اور تنگی ترشی کی زندگی بسر کر کے کام کرنا ہے۔ اتنی دیر میں شوکت صاحب ناشتہ سے فارغ ہو چکے تھے اور انہوں نے مضمون لکھانا شروع کر دیا تھا۔

شوکت صاحب سے اب میں روز بروز قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ ان کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح میرے سامنے تھی۔ جس کا ہر صفحہ بخط جلی مرقوم تھا۔ وہ حد درجہ دوست پرور تھے بے انتہا دریا دل اور لکھ لٹ تھے۔ انتہا بے خوف، نڈر

خلافت اخبار نکال کے، اردو کو بمبئی کی دوسری بڑی زبان بنا دیا۔ اگر بمبئی میں مجلس خلافت کا صدر دفتر نہ ہوتا، اور خلافت اخبار وہاں سے نہ نکلتا تو اردو کا وہاں کوئی خاص مقام نہیں تھا۔ یہ مولانا شوکت علی کا طفیل ہے کہ آج دلی کے ویران ہونے، حیدرآباد کے مٹ جانے اور لکھنؤ سے جلا وطن ہونے کے باوجود بمبئی میں اردو نہ صرف موجود ہے بلکہ بہت زیادہ شان و تجمل کے ساتھ موجود ہے۔

میرے زمانے میں بمبئی سے خلافت کے علاوہ اردو کے کئی اخبار نکل رہے تھے۔ اور یہ سب خلافت اور شوکت صاحب کے مخالف تھے۔

روزنامہ اجمل کے ایڈیٹر معین الدین حارث تھے۔ یہ جامعہ کے گریجویٹ تھے۔ ان کی اردو صحافت کا آغاز خلافت سے ہوا تھا۔ خلافت سے الگ ہو گئے اور کانگریس کی حمایت میں اجمل جاری کر دیا۔ یہ مخالف تھے مگر شریف۔ ان کی مخالفت اصولی ہوتی تھی۔

دوسرا روزنامہ ہلال تھا۔ اس کے ایڈیٹر حافظ علی بہادر خاں تھے۔ یہ ایک عرصے تک خلافت کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ قابل اور منجھے ہوئے صحافی اور کارکن تھے لیکن کچھ واقعات ایسے ہوئے کہ انہیں خلافت کی ادارت سے الگ ہونا پڑا۔ بمبئی جو آجائے پھر اس کا واپس جانے کو جی نہیں چاہتا۔ یہیں رہ پڑے اور اپنا اخبار روزنامہ "ہلال" نکالا۔ جو کانگریس کا زبردست نقیب اور خلافت کا زبردست مخالف اور شوکت صاحب کا بدترین دشمن تھا۔ اس اخبار کی مخالفت اصول اور آداب صحافت کو بالائے طاق رکھ کر بالکل ذاتی ہوتی تھی۔ اور انداز بیان سوقیانہ اور عامیانہ۔ غلام احمد خاں آرزو اس اخبار کے سب ایڈیٹر تھے۔ جو کمی حافظ صاحب سے رہ جاتی تھی یہ پوری کر دیتے تھے۔

ایک اور اخبار "الہلال" تھا۔ اس کے ایڈیٹر احسن صاحب تھے۔ یہ مرادآباد کے رہنے والے تھے۔ ان کے چچا سے اور شوکت صاحب سے علی گڑھ سے مراسم چلے آرہے تھے۔ یہی وجہ انہیں خلافت میں لانے کی ہوئی تھی۔ لیکن نہ انہیں خلافت سے دلچسپی تھی نہ شوکت صاحب سے عقیدت۔ خلافت ہاؤس میں بیٹھ کر، خلافت کی برائیاں کرتے اور شوکت صاحب کی لیڈری کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ یہی وجوہ تھے کہ شوکت صاحب انہیں مع ان کے عملہ کے خلافت سے علیحدہ کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ میں انہی کا جانشین بن کر آیا تھا۔ خلافت میں یہ کانگریس کی مخالفت کرتے تھے۔ الہلال کے ایڈیٹر بنتے ہی کانگریس کے قصیدے پڑھنے لگے۔ اب کراچی میں ہیں۔ ان کی بھانجی کا عقد ثانی بہاول پور کے حسن محمود ری پبلکن لیڈر سے ہوا ہے۔ وہیں رہتے ہیں۔

بمبئی کرانیکل خالص کانگریسی اخبار تھا۔ اس کے ایڈیٹر سید عبداللہ بریلوی نہایت شریف اور بااصول آدمی تھے۔ وہ بے لوث اور دیانت داری کے ساتھ کانگریس کے ہم نوا، اور خلافت کے مخالف تھے۔ ذاتیات سے انہیں کوئی دلچسپی ہی نہ تھی صرف اصولی بحث پر اکتفا کرتے تھے۔ لیکن اسی کرانیکل میں ایک سابق خلافتی باسط صاحب تھے۔ یہ پرانے خلافتی تھے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کے عزیز قریب تھے۔ اور اس تعلق سے ان کے اور شوکت صاحب کے تعلقات خورد اور بزرگ کے تھے۔ کرانیکل کا مزاحیہ کالم یہی لکھتے تھے۔ اور شوکت صاحب اور خلافت کا جب ذکر کرتے تھے تو چھچھورے پن اور گھٹیا طرز تحریر کا ریکارڈ قائم کر دیتے تھے۔

بمبئی کے باہر کے اخبارات میں "زمیندار" لاہور مولانا شوکت علی پر اکثر برسا کرتا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں کی پھڑکتی ہوئی

نظموں کا سلسلہ بھی برابر جاری تھا۔ لاہور ہی کا ایک دوسرا اخبار انقلاب تھا۔ اس کے ایڈیٹر سالک مرحوم اور مہر صا تھے۔ مہر صاحب اپنے مقالات ادارت میں شوکت صاحب پر بے رحمی اور بے انصافی کے ساتھ بھرپور حملے کرتے تھے حوادث میں سالک صاحب کی بھی گل افشانیاں جاری رہتی تھیں۔ روزنامہ سیاست بھی لاہور سے نکلتا تھا۔ اس کے سید حبیب مرحوم تھے۔ انہوں نے تو مستقل طور پر شوکت صاحب کو ہدف مطاعن بنا رکھا تھا۔ لکھنؤ سے روزنامہ ہمدم تھا۔ اس کے ایڈیٹر عبداللہ خاں کسمنڈوی تھے۔ بڑے شیوہ طراز بزرگ تھے۔ لیکن مجلس خلافت اور شوکت صاحب کھائے ہوئے تھے۔ کلکتہ سے مولانا عبدالرزاق ندوی ملیح آبادی روزنامہ ہند نکال رہے تھے۔ جن کے مربی اور سرپرست ابوالکلام آزاد تھے۔ ملیح آبادی صاحب مستقل اور مسلسل نکتہ چینی مجلس خلافت اور مولانا شوکت علی پر انتہائی تلخ اور لب ولہجہ میں کرتے تھے۔ دہلی سے روزنامہ الجمعیۃ نکلتا تھا جس کے ایڈیٹر ہلال احمد زبیری تھے ــــ جواب پاک آچکے ہیں اور ممتاز حسن قزلباش کی عنایت سے خیرپور میں بڑے اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں ــــ الجمعیۃ کانگریس کا زبردست نقیب اور مبلغ تھا، بلکہ مجلس خلافت اور شوکت صاحب کا پرجوش مخالف اور نکتہ چین بھی تھا۔ حسن نظامی کا منادی بھی اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا تھا۔ حیدرآباد سے قاضی عبدالغفار نے کچھ ہی عرصہ پہلے روز پیام جاری کیا تھا۔

قاضی عبدالغفار ہمدرد کے عملۂ ادارت میں برسہا برس رہ چکے تھے۔ "شوکت بھیا" کے تو خاص طور پر والا و شیدا لیکن جب طبیہ کالج کی سیکریٹری شپ سے حکیم جمیل خاں نے انہیں الگ کیا اور طبیہ کالج کے سرمایہ سے جو "حیات اجم انھوں نے لکھی تھی اسے لے کر وہ دہلی سے رخصت ہوئے۔ تو ان کا ارادہ بمبئی میں اقامت گزین ہونے کا ہوا، اور وہاں " بھیا" کے علاوہ کوئی سہارا نہ تھا۔ لیکن حالات اتنے دگرگوں تھے کہ شوکت صاحب، قاضی صاحب کو خلافت میں رکھ کر ان مصارف کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ داغ ایسا لگا کہ پھر قاضی صاحب نے شوکت بھیا کو ان کے جیتے جی معاف نہیں کیا۔ مزاحیہ کالم "سر راہے" میں حد درجہ عامیانہ اور سوقیانہ لب ولہجہ میں وہ شوکت صاحب کی "دھجیاں" اڑایا کرتے تھے۔ ج ہوتی تھی کہ "نقش فرنگ" اور "لیلیٰ کے خطوط" کا شائستہ اور شستہ مصنف اپنے درجے سے جوش انتقام میں اتنا بھی گر سکتا ہندو اخبارات تیج، ملاپ، پرتاپ وغیرہ کو تو مخالف ہونا ہی چاہیے تھا۔

شوکت صاحب کا لمبا چوڑا سینہ ان تیروں سے چھد رہا تھا۔ مگر وہ مسکرا مسکرا کر یہ حملے جھیل رہے تھے۔ ان کے کسی کے خلاف نفرت نہیں تھی، وہ اپنی دھن میں مست تھے۔ اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔

جب خلیفۃ المسلمین نہ رہے تو خلافت سے عوام کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ پھر جب کہ خلافت کے خلاف ہر طرف یورش اور یلغار ہو رہی ہو، عام چندہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ خواص سے کوئی مدد نہ پہلے کبھی ملی تھی۔ (الا ماشاء اللہ)۔ نہ سوال تھا۔ مالی حالت روز بروز ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ ملازمین اور اسٹاف کی تنخواہیں چڑھتی جا رہی تھیں۔ کاغذ والے روشنائی والے کے قرض میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میونسپلٹی کے ٹیکس کی رقم کے بار بار تقاضے آ رہے تھے۔ بجلی کمپنی اور ٹیلیفو کافی رقمیں چڑھی ہوئی تھیں۔ لوگوں کو امید تھی خلافت پریس قرق ہو جائے گا۔ خلافت ہاؤس نیلام ہو جائے گا۔ اسٹا

لوگ بے ٹکٹ اپنے اپنے گھر واپس جائیں گے۔ یقیناً یہ سب کچھ ہوتا، اگر شوکت صاحب نہ ہوتے۔ شوکت صاحب میں یہ عجیب صفت تھی کہ وہ مایوس ہونا نہیں جانتے تھے۔ شکست قبول کرنا اور ہار ماننا بھی ان کا شیوہ نہ تھا۔ چندہ وصول کرنے کے فن میں وہ یکتا تھے۔ سارے ہندوستان میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ وہ جس کی جیب میں ہاتھ ڈال دیتے جو کچھ ہوتا نکال لاتے۔ وہ چار آنے کا چندہ بھی اس خوشی سے قبول کرتے تھے جیسے چار ہزار مل گئے ہوں۔ دوستوں سے قرض لے کر، عقیدت مندوں کی جیب پر ڈاکہ ڈال کر، اپنے بے تکلف علیگ اور غیر علیگ دوستوں سے عطایا وصول کرکے وہ اس خرابے کو آباد کیے ہوئے تھے۔ اس بھاری بوجھ کو کھینچے جا رہے تھے۔ دل دو نیم تھا۔ بازو شل تھے۔ پاؤں زخمی تھے۔ لیکن ہمت جوان تھی۔ عزم جوان تھا۔ جوش کار جوان تھا۔ ایک کھلاڑی کی طرح وہ چوٹ کھاتے تھے۔ مگر کھیل کے میدان سے بھاگتے نہیں تھے۔ وہ تھے بھی تو بہت اچھے اور بہت بڑے کھلاڑی۔ اپنے وقت کے کرکٹ کے مانے ہوئے ہیرو۔

مسلمانوں کو سوشلزم اور کمیونزم کی دعوت دی جا رہی تھی۔ انھیں روٹی اور محنت کے نام پر آمادۂ عمل کیا جا رہا تھا۔ وطن اور قوم کی وفاداری اور جاں نثاری کی دعوت دی جا رہی تھی۔ تمام بڑے بڑے مسلمان لیڈر یا کانگرس کے کیمپ میں تھے، یا کانگرس سے مرعوب ہو کر خاموش بیٹھے تھے، یا انگریزوں کے ثنا خواں اور مدّاح تھے۔

شوکت صاحب کی دعوت ان سب سے الگ تھی۔ وہ منہاج خلافت راشدہ پر احیاء خلافت کے لیے سرگرم کار تھے۔ ان کا مذہب سیاست نہ تھا۔ ان کی سیاست مذہب کے زیر نگین تھی۔ حریف اور حلیف، ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ انھیں گالیاں دیتے تھے۔ ان کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہوتے تھے۔ لیکن وہ ان سب سے بے پروا، ان سب سے بے نیاز، اپنی راہ چل رہے تھے۔ خود ان کے بقول "محمد علی ان کا بیٹا بھی تھا، بھائی بھی، دوست بھی اور ساتھی بھی"، لیکن قوم کے غم میں وہ محمد علی کا غم بھول گئے تھے۔ وہ ہر وقت مرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ لیکن اپنے کام میں اس طرح منہمک تھے جیسے کبھی نہیں مریں گے۔

شوکت صاحب کی ایک اور بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ "انسان ساز" تھے۔ بہت سے کام کے آدمی ان سے بچھڑ گئے، کچھ اصولی اختلاف کے باعث، کچھ ذاتی کدورتوں کے سبب، لیکن جو گیا اس سے اچھا کارکن انھوں نے اپنی من موہن آنکھوں کے جادو سے پیدا کر لیا، اور آگے بڑھا دیا۔

شوکت صاحب میں وہ خطابت نہ تھی جو مولانا ابوالکلام آزاد میں تھی۔ وہ سیاسی بصیرت نہ تھی جو جواہر لال نہرو میں تھی۔ وہ فصاحت و بلاغت نہ تھی جو گاندھی جی میں تھی۔ وہ دولت نہ تھی جو مہاراجہ محمود آباد کے پاس تھی۔ وہ قلم نہ تھا جو ظفر علی خاں کے پاس تھا۔ وہ شعریت نہ تھی جس کے حسرت موہانی مالک تھے۔ وہ طلاقت لسانی نہ تھی جو صرف مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا حصہ تھی۔ وہ علم نہ تھا جو مفتی کفایت اللہ کے پاس تھا۔ وہ قدوسیت نہ تھی جو مولانا حسین احمد کے لیے خاص تھی۔ وعظ و تذکیر کا وہ جوہر نہ تھا جو مولانا احمد سعید کی خصوصیت تھی۔ وہ صلاحیت نہ تھی جو ڈاکٹر انصاری میں تھی۔ وہ داؤں پیچ نہ تھے جن کے ڈاکٹر ضیاء الدین ماہر خصوصی تھے۔ لیکن ایک چیز ایسی تھی جو صرف شوکت صاحب کے پاس تھی۔ اور مذکورہ بالا اکابر میں سے کسی کے پاس نہ تھی۔ وہ تھی اسلام کے راستے میں اور مسلمانوں کے لیے ان کا خلوصِ بے پروا، ان کی دیوانگی اور آشفتہ سری۔ یہی ایک چیز تھی جسے لے کر وہ میدان میں آئے اور سب پر غالب رہے۔ مخالف مجمعوں میں

پہنچے اور چھا گئے۔ ہر معرکہ میں جیتے اور ہر جنگ میں فتحیاب ہوئے۔ وہ نہ ہوں تو ان کے خلاف سازشیں ہوتی تھیں۔ ان کے خ
دھواں دھار تقریریں ہوتی تھیں۔ ان پر سنگین الزامات لگائے جاتے تھے۔ مگر وہ پہنچے اور انہوں نے ہاری ہوئی بازی جیت لی
سے بڑا مخالف مجمع ان کے ہاتھ چومنے لگتا تھا۔ زندہ باد کے نعرے لگانے لگتا تھا۔ ان کے اشارے پر مرنے اور مارنے کو
جاتا تھا۔ کیا یہ شخص جادوگر نہیں تھا؟

ان تمام باتوں کے ساتھ حد درجہ بھولے بھی تھے۔ بہار کے قیامت آفریں زلزلے (۱۹۳۴ء) کی خبر ان پر بجلی بن کر گری
کام چھوڑے اور صوبہ بہار کے دورے پر روانہ ہو گئے۔ جس شہر اور جس جگہ جاتے وہاں کے حالات و تاثرات ایک خط میں مجھے
میں وہ خط خلافت میں شائع کر دیتا۔ پٹنہ میں عزیز ملت سید عبدالعزیز بیرسٹر کے ہاں قیام کیا۔ وہاں سے بھی مجھے ایک
اس خط میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ میں نے اسے شائع نہیں کیا۔

کافی عرصے کے بعد جب دورے سے واپس آئے تو حسب معمول بمبئی سے غیر حاضری کے زمانے کا سارا فائل خلافت کا
گیا۔ وہ خلافت کا ایک ایک حرف پڑھتے تھے۔ دوسرے دن مجھے بلایا اور کہا

"میں نے پٹنہ سے ایک خط تمہیں لکھا تھا وہ شایع نہیں کیا؟"

اندازِ گفتگو میں کچھ شکایت بھی تھی، کچھ خفگی بھی۔ میں گھبرا گیا۔ میں نے کہا غلطی سے رہ گیا۔ اسی لہجہ میں فرمایا

"بہت ضروری خط تھا۔ ضرور شایع ہونا چاہیے تھا۔"

واپس آکر میں نے کاغذات میں تلاش کیا تو خط ندارد۔ بہت تلاش کیا مگر کہیں نہ ملا۔ میرے اوپر سراسیمگی اور دہشت
کیفیت طاری تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کل کیا جواب دوں گا؟ آخر قلم دوات لے کر بیٹھ گیا اور انہی کے انداز میں اپنے
خط ڈیڑھ کالم کا گھسیٹ ڈالا، اور کاتب کو کتابت کے لیے دیدیا۔ سونے کے لیے لیٹا تو دل دھڑک رہا تھا کہ دیکھیے
"جعل سازی" کا انجام کیا ہوتا ہے؟

دوسرے روز معمول کے مطابق پنسل کاغذ لے کر صبح صبح [illegible] خدمت ہوا کہ کچھ لکھانا ہو تو لکھا دیں۔ دیکھتے ہی مسکر
اور فرمایا

"کتنا اہم خط تھا جو تم نے نہیں چھاپا تھا۔ ایسے خط ضرور چھاپ دیا کرو۔"

اس خط میں جو ان کے نام سے چھپا تھا ایک حرف بھی ان کا نہ تھا۔ لیکن اپنا خط باور کر کے بالکل مطمئن ہو گئے۔ اور
خفگی دور ہو گئی تھی۔ میں بڑی سعادت مندی سے بیٹھا پروانۂ خوشنودی حاصل کر رہا تھا۔

کبھی کبھی شوکت صاحب سینما بھی دیکھ لیا کرتے تھے۔ ایک روز رات کے کھانے کے بعد مولانا عرفان نے فرمائش کی

"چلیے سینما دیکھ آئیں آج!"

تیار ہو گئے۔ میری طرف دیکھتے ہوئے فرمایا

"تم بھی تیار ہو جاؤ"

ہم لوگ لیمنگٹن سینما پہنچے۔ منیجر نے دیدہ و دل فرش راہ کر دیے۔ ایک بکس میں لے جا کر ہمیں بٹھا دیا۔

اس فلم میں عیسائیوں پر یہودیوں کی برتری دکھائی گئی تھی۔ عیسائی مظلوم یہودیوں پر سفاکانہ مظالم توڑتے تھے۔ وہ یہ ظالم سمجھتے تھے اور امداد غیبی سے ہر معرکہ میں کامیاب ہوتے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا (۱۹۳۵ء) کہ فلسطین پر یہودیوں نے ہلّہ بول رکھا تھا۔ وہاں کے عرب ان نو وارد یہودیوں کی وجہ سے اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا تھے۔ ــــــ جو بالآخر صحیح ثابت ہوئے اور حکومت اسرائیل کی صورت میں موجود ہیں ــــــ شوکت صاحب یہودیوں سے سخت متنفر تھے۔ فلم میں یہودیوں کی یہ روحانی برتری دیکھ کر بولے تو "جھوٹ"، "لغو"، "مہمل"، "واہیات" اور نہ جانے کیا کیا کہتے رہے۔ میں اور مولانا عرفان داہنے بائیں بیٹھے یہ ریمارک سن رہے تھے، اور لطف لے رہے تھے۔ اتنے میں یہودیوں کی ایک نہایت نمایاں کامیابی کا سین آیا جو کلائمکس کی حیثیت رکھتا تھا۔ دفعۃً اپنا ڈنڈا سنبھال کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ہم دونوں سے کہا۔

"کہاں لے آئے وقت ضایع کرنے کو چلو!"

بادلِ نخواستہ ہم دونوں بھی پیچھے پیچھے ہو لیے۔ نیچے اترے تو انٹرول ہو چکا تھا۔ اور تھرڈ کلاس کے تماشائی جوق جوق ہال سے چائے پینے، بیڑی خریدنے، پان کھانے کے لیے باہر نکل رہے تھے۔ اور آپس میں باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔

مولانا نے موٹر پر بیٹھنے سے قبل مولانا عرفان سے کہا

"دیکھ لو ان بھائیوں کو بھی فلم پسند نہیں آئی، سب واپس چلے آئے۔"

مولانا سے یہ کہنے کی ہمت ہم میں سے کسی کی نہ پڑی کہ یہ "بھائی" انٹرول میں باہر نکلے ہیں فلم سے بیزار اور متنفر ہو کر نہیں۔ لیکن ہنسی کا ضبط کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ خلافت ہاؤس واپس آکر مولانا اپنے بالاخانے چلے گئے۔ پھر مجھے اور مولانا عرفان کو جی کھول کر ہنسنے کا موقع ملا۔ ضبط کا بند اتنی دیر میں ٹوٹا تھا اس لیے بغیر کوئی بات کیے مسلسل ہم دونوں ہنستے جا رہے تھے۔

خلافت اخبار اور خلافت پریس کا نقصان اب حد سے تجاوز کر چکا تھا۔ کئی کئی مہینوں کی تنخواہیں چڑھ گئی تھیں۔ نہ بقایا وصول ہونے کی توقع تھی نہ آئندہ کی امید۔ اسٹاف کے لوگ اور [illegible] صاحب کے دامن سے چمٹے ہوئے تھے۔ وہ فاقے کر رہے تھے پھٹے پرانے کپڑے پہن رہے تھے۔ ان کے بال بچے ایک ایک چیز کو ترس رہے تھے۔ مگر کسی نے اسٹرائک نہیں کی۔ کسی نے مقدمہ نہیں کیا۔ کسی نے لیبر کمشنر سے رجوع نہیں کیا۔ کسی نے مخالفت میں ہینڈ بل اور پوسٹر شایع نہیں کیے ــــــ کسی نے استعفا نہیں دیا۔

ہر شخص مقروض تھا۔ ہر شخص کے لیے قرض کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ ہر شخص گھر کی چیزیں رہن رکھ کر اور بیچ کر گزارہ کر رہا تھا۔ میرا حال بھی بہت ابتر تھا۔ لیکن میرا کام کسی نہ کسی طرح چل جاتا تھا۔ پشاور کے ایک تاجر عبدالمجید ساول صاحب کی بمبئی میں کوٹھی تھی۔ ان صاحب کے دفاتر لندن، پیرس، نیویارک، برلن، ہر جگہ تھے۔ عبدالمجید صاحب زیادہ تر یورپ میں رہتے تھے۔ بمبئی میں ان کے کاروبار کے منتظم حکیم محمد امین ندوی، ــــــ مشہور کانگرسی لیڈر حکیم عبدالجلیل ندوی ــــــ کے بڑے بھائی تھے۔ عہدِ اوّل کے ندوی تھے۔ مولانا شوکت علی کے سخت مخالف۔ خلافت کا پڑھنا گناہ سمجھتے تھے۔ لیکن ندویت کا رشتہ اتنا مستحکم ہوتا ہے کہ مجھ سے ایک بڑے بھائی کی طرح ملتے تھے۔ مگر سیاسی مسائل پر کبھی گفتگو نہیں کرتے تھے۔ ایک روز ہم سیر سپاٹے کے لیے بمبئی بندر گئے۔ مغرب کا وقت ہو گیا تو گیٹ وے آف انڈیا کے ایک گوشے میں کچھ مسلمان جماعت بنا کر نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ میں بھی شریک جماعت ہو گیا۔ میرے بعد ایک صاحب آئے تو وہ بھی میرے پہلو میں کھڑے ہو گئے۔ سلام پھیرا تو یہ حکیم امین صاحب نکلے۔

نماز کے بعد حکیم صاحب نے مجھ سے فرمایا

"کل تم مجھ سے ملو آکر۔ کچھ باتیں کرنی ہیں"

دوسرے روز میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کے پاس ۱۳-۱۴ برس کا ایک نہایت خوب صورت اور مہذب

تھا۔ حکیم صاحب نے مجھ سے پوچھا

"خلافت کا کیا حال ہے؟ سنا ہے لوگوں کو کئی کئی مہینے کی تنخواہیں نہیں ملی ہیں؟"

میں نے کہا جی ہاں خلافت کی مالی حالت بہت کمزور ہے۔

"تم کیسے گزارہ کر رہے ہو؟"

"جس طرح دوسرے کر رہے ہیں"

"کوئی اور کام کیوں نہیں کرتے؟"

"جب تک شوکت صاحب خود رخصت نہ کر دیں میں انہیں چھوڑ نہیں سکتا۔ میں ان سے محبت کرتا ہوں۔

لیڈر ہیں"

حکیم صاحب مسکرائے۔ کہنے لگے۔ "ابھی لڑکے ہو سمجھتے سمجھتے سمجھو گے"

پھر اس لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

یہ ہمارے عبدالمجید ساول کا لڑکا ہے۔ ابھی لندن سے آیا ہے۔ انگریزی بولتا ہے۔ اردو بالکل نہیں جانتا۔

بھی صرف بولنا جانتا ہے نہ لکھ سکتا ہے نہ پڑھ سکتا ہے۔ ایسا کرو روز صبح صبح۔ بس نماز فجر کے بعد ایک گھنٹے کے

اسے اردو بولنا سکھا دو۔ اور انگریزی کی گرامر سکھا دو۔ اور دو چار ریڈریں پڑھا دو۔ چالیس روپے ماہوار

اندھا کیا چاہے [illegible] بغیر کسی پس و پیش کے میں نے یہ پیش کش قبول کر لی۔ حکیم صاحب معاملے کے

تھے کہ مہینہ کی پہلی تاریخ کو بے مانگے میری فیس ادا کیا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں حکیم علی محمد خاں مالک اجمل میڈیکل

مینشن نے —— اب سرگودھا میں مقیم ہیں —— ایک ہفتے وار اخبار نکالا۔ ایڈیٹری میں نام ان کا تھا لیکن ا

سپرد کر دی۔ پچاس روپے ماہوار دہ دیتے رہے تھے۔ یہ بھی معاملے کے بڑے کھرے تھے۔ مہینہ پورا ہوا اور انہوں

پر رکھی۔

ایک روز شام کو میں باہر نکلا تو شوکت صاحب اپنے بالاخانے کی کھڑکی پر دونوں ہاتھ ٹیکے کھڑے تھے۔ مجھ

"جعفری یہاں آؤ میرے پاس"

میں حاضر خدمت ہوا تو فرمایا

ہر مہینے قرض کا بوجھ بڑھتا جاتا ہے۔ تنخواہیں چڑھتی جاتی ہیں۔ میں اب تھک گیا ہوں۔ یہ گھٹا میرے بھر

جاتا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اخبار اور پریس بند کر دوں"

میرے چہرے سے انہوں نے نہ جانے کیا پڑھا کہ دفعتہً فرمایا:

جناب قطب الدین صدیقی مرحوم

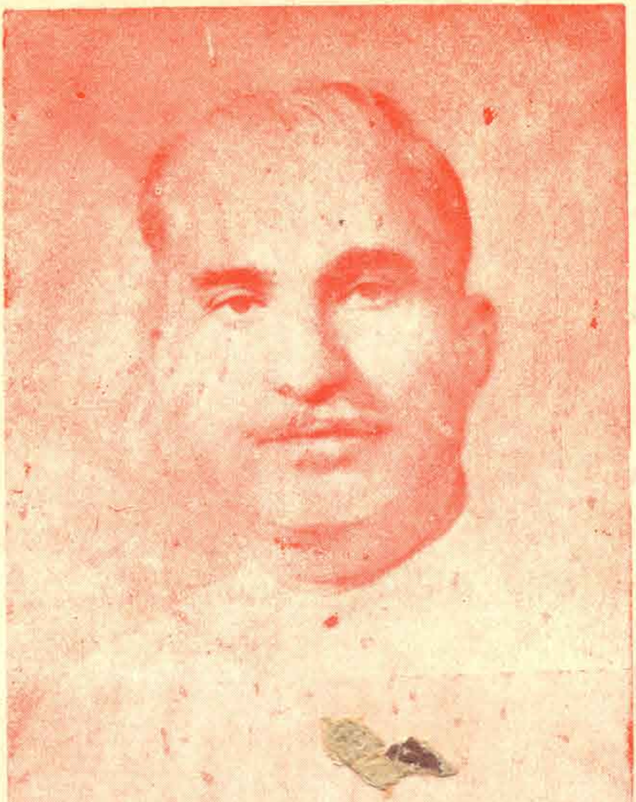

علی گڑھ کے گریجویٹ ، ڈاکٹر انصاری کے عزیز ، علی برادران کے شیدائی ، تحریک خلافت کے مجاہد ، کئی مرتبہ جیل گئے ، آخری وقت تک " خلافتی " رہے گزشتہ سال بمبئی میں وفات پائی ۔

رئیس احمد جعفری (ندوی)

سابق ایڈیٹر روزنامہ خلافت و انقلاب بمبئی

نینی تال کا ایک منظر

۱- جناب قطب الدین صدیقی کی صاحبزادی آفتاب بیگم جعفری

۲- رفیع احمد جعفری ۳- در شہوار جعفری

"لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ سّو روپے تمہاری تنخواہ ہے۔ تمہیں اپنا پرائیویٹ سیکریٹری بنالوں گا۔ اور بھی تنخواہ دیتا رہوں گا۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

"کیا آپ ایک تجربہ کرنے کو تیار ہیں؟"

فرمایا "تجربہ کیسا؟"

میں نے کہا "درحقیقت نہ پریس خسارے میں ہے نہ اخبار۔ یہ خسارہ صرف بدانتظامی، طوائف الملوکی اور تنظیم کا نہ ہونے کے سبب ہے۔ آپ اخبار میرے حوالے کر دیں۔ نفع ہو تو آپ کا، نقصان ہو تو میں تنخواہ کا مطالبہ نہیں کروں گا۔ نہ اسٹاف کے لوگ۔ لیکن شرط یہ ہے کہ میرے معاملات میں کوئی ــــ آپ بھی ــــ دخل نہ دے۔ بلوں پر میرے دستخط ہوں گے۔ وصول یابی میرے ذمّہ ہوگی۔ اور ایک پائی بھی کیشیر بغیر میری اجازت کے کسی کے حکم سے بھی کسی کو ادا نہیں کرے گا۔ خلافت اخبار، خلافت پریس میں چھپتا ہے میں اس کی چھپائی بھی بازار کے نرخ سے ادا کرتا رہوں گا۔ اگر آپ تک شکایت پہنچے کہ کسی کو وقت پر تنخواہ نہیں ملی یا کسی کا بل ادا نہیں ہوا تو فوراً مجھے برخاست کر دیجیے۔" ــــ میں اخبار کو انہی اصول پر چلاؤں گا جس اصول پر ڈاکٹر صاحب جامعہ کو چلا رہے ہیں۔

شوکت صاحب خاموشی سے یہ باتیں سنتے رہے۔ پھر انہوں نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا

"میں یہ تجربہ کروں گا۔"

اسی وقت دفتر سے انہوں نے آرڈر بک منگوائی، اور ایک حکم لکھ کر خلافت کے تمام انتظامی معاملات کا مجھے واحد منتظم بنا دیا۔

یہ بڑی نازک اور کٹھن ذمّے داری تھی جسے میں نے قبول کر لیا۔ لیکن اپنے حق میں کانٹے بو لیے۔ جن لوگوں کا مفاد اس نئی تنظیم سے مجروح ہو رہا تھا۔ وہ میرے بدترین مخالف بن گئے۔ جو لوگ مجھ سے عمر میں کہیں بڑے تھے، اور برسوں سے کام کر رہے تھے، انہوں نے میری بالادستی کو اپنی شکست اور توہین سمجھا۔ لیکن شوکت صاحب کے سامنے دم مارنے کی کسی کو مجال نہ تھی۔

میں نے کام شروع کر دیا

روزانہ کی سیل، فرموں اور کمپنیوں کے چیک براہِ راست بنک میں بھیجے جانے لگے۔ جو لوگ صرف اس لیے ملازم تھے کہ کام کچھ نہ کریں۔ صرف تنخواہ وصول کیا کریں، انہیں جواب مل گیا۔ روزانہ کی آمدنی جس بے پروائی سے دوسرے غیر متعلق مصارف میں صرف کر دی جاتی تھی، اس کا سلسلہ یک قلم منقطع ہو گیا۔ فرموں اور کمپنیوں کے بلوں کی وصول یابی پر کوئی خاص توجہ نہیں کی جاتی تھی، میں نے براہِ راست ربط پیدا کیا۔ اور تقاضے شروع کر دیے۔ ضرورت ہوتی تو خود بھی جاتا۔ اس طرح ایک بڑی رقم وصول ہوگئی۔ اور آئندہ باقاعدگی سے وصول ہونے لگی۔ ہر مہینے کافی ردّی اردو انگریزی، اور غیر ملکی اخبارات کی جمع ہو جاتی تھی اور غائب ہو جاتی تھی۔ میں نے ضروری اخبارات کے فائل مرتب کیے اور باقی ردّی فروخت کر کے ہر ماہ اس کی آمدنی دفتر میں داخل کرنے لگا۔ کاغذ اندھا دھند ادھار آجاتا تھا جس کا کوئی حساب کتاب نہیں تھا۔ میں نے کاغذ کی آمد و خرچ کا باقاعدہ رجسٹر

مرتب کیا اور کڑی نگرانی رکھی کہ ایک شیٹ بھی ضایع نہ ہونے پائے۔ اخبار جتنا بکتا تھا اس سے زیادہ مفت جاتا تھا۔ میں نے اعزازی لسٹ بنائی، باقی سب نام قلم زد کر دیے۔ ڈاک خانے سے بڑی تعداد میں کافی رقم کے ٹکٹ خرید لیے جاتے جن کا کوئی حساب کتاب نہ تھا۔ میں نے ڈاک کا رجسٹر الگ کھولا اور صحیح مقصد و ضرورت کے سوا ایک پیسہ کا ٹکٹ بھی ادھر ادھر نہیں ہونے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے ہی مہینے میں اسٹاف کی پوری تنخواہ ایک عرصۂ دراز کے بعد یک مشت ادا ہوگئی۔ اور کچھ روپے بچ بھی رہے۔ شوکت صاحب میری اس کامیابی سے بہت خوش ہوئے۔ کئی مہینے گزر گئے اور شوکت صاحب کے پاس اخبار کے سلسلے میں نہ کوئی تقاضہ آیا نہ مطالبہ۔ تو انہوں نے پریس کا انتظام بھی میرے حوالے کر دیا۔ پریس میں بھی بدنظمی کا وہی عالم تھا جس کا جی چاہا آیا، جس کا جی چاہا نہ آیا۔ نہ رخصت کی درخواست نہ غیر حاضری کی معذرت۔ جو کام سپرد کیا گیا اس کی تعمیل میں مہینے اور مہینے لگ جاتے۔ روزانہ کا کام بھی ہمیشہ لیٹ ہوتا۔ مدراس کے سیٹھ یعقوب حسن نے شوکت صاحب سے ذاتی تعلقات کی بنا پر اپنی تفسیر قرآن خلافت پریس میں چھپوانے کا انتظام کیا۔ کئی برس گزر گئے مگر کام میں ہاتھ بھی نہ لگایا گیا۔ کاپیاں دیمک چاٹ گئی۔ کاغذ تھوڑا تھوڑا کرکے بازار میں فروخت ہوگیا۔ یہ کاغذ سیٹھ صاحب نے ولایت سے منگوایا تھا۔ اور بڑا قیمتی تھا۔ کوئی شخص یہ بتانے کو تیار نہیں تھا کہ ہزاروں روپے کا کاغذ کس طرح غائب ہوگیا؟ میں نے اخبار کی طرح پریس کی بھی تنظیم کی۔ اس تنظیم نو کا نتیجہ حسب دل خواہ برآمد ہوا۔ پریس کے اسٹاف سے باقاعدہ کام لیا جانے لگا۔ اور وقت پر اسے تنخواہ ملنے لگی۔

میری ان کامیابیوں نے شوکت صاحب کی نظر میں مجھے بہت محبوب بنا دیا۔ وہ بڑے کھلے دل کے آدمی تھے۔ کئی مرتبہ اخبار میں نوٹ لکھ کر انہوں نے پبلک طور پر میرے خدمات کو سراہا۔ اور میری حوصلہ افزائی کی۔

میں نے جب چارج لیا تو بجلی سپلائی کمپنی کی کافی رقم باقی تھی جو کئی متفرق بلوں کی صورت میں تھی۔ کمپنی کی طرف سے بار بار تقاضے ہو رہے تھے کہ ساری رقم یک مشت جلد از جلد ادا کر دی جائے ورنہ سلسلہ منقطع کر دیا جائے گا۔ میں ان ساری باتوں سے بے خبر تھا۔ پہلے مہینے کے بعد جب میں نے اسٹاف کی تنخواہیں ادا کیں، اور دوسرے مطالبات بیباق کیے تو بجلی کمپنی کا بل بھی جو دو سو روپے کا تھا ادا کر دیا۔ باقی بلوں کے بارے میں مجھے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔

چند روز بعد مولانا شوکت علی نے اپنے بعض دوستوں کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ شام کو بعد مغرب جب میں گارڈن سے واکنگ کرکے واپس آیا تو خلافت ہاؤس اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ مشینیں بند، کمرے تاریک، معلوم ہوا کہ بقایا رقوم کے سلسلے میں بجلی کٹ گئی ہے۔ شوکت صاحب بھی باہر سے ابھی آئے ہیں اور پیکر غضب بنے بیٹھے ہیں۔ انہیں بتایا گیا کہ جعفری صاحب خود رائی سے جس طرح چاہتے ہیں صرف کرتے ہیں اور ایسے ضروری بلوں کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ کسی اور موقع پر میری شکایت شوکت صاحب سے کی جاتی تو شاید وہ پروا نہ کرتے لیکن گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے میں مہمان آنے والے تھے، وہ یہ منظر دیکھ کر کیا کہیں گے۔ اور کیا رائے قائم کریں گے۔ یہ سوچ سوچ کر شوکت صاحب کا پارہ چڑھتا جاتا تھا۔ وہ بار بار مجھے نام لے لے کر پکار رہے تھے۔ مگر ہر مرتبہ یہ اطلاع ملتی تھی

"سیر کرنے تشریف لے گئے ہیں"

کمپنی کا دفتر بند ہوچکا تھا۔ اب رقم بھی ادا نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس کے معنی یہ تھے کہ دوسرے دن سے پہلے بجلی

نہیں آسکتی۔ یہ میری اتنی بڑی "ناکامی" تھی جو شوکت صاحب کی نظر میں مجھے ذلیل کرنے اور نااہل ثابت کرنے کے لیے ضرورت سے زیادہ تھی۔ دم بدم ان کا غصہ بڑھ رہا تھا اور وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح گرج رہے تھے۔

یہ ساری باتیں عین اس وقت جب خلافت ہاؤس کے پھاٹک پر میں پہنچا ایک دوست نے جو شاید اسی لیے وہاں ٹہل رہے تھے کہ مجھے قبل از وقت مطلع کردیں، بتائیں۔ یہ موقع بحث و گفتگو کرنے یا صفائی پیش کرنے کا نہ تھا۔ میں وہیں سے واپس ہوا اور ٹیکسی کرکے سیدھا بجلی کمپنی کے دفتر پہنچا جو قلابہ میں تھا۔ دفتر بند تھا صرف ایک پٹھان چپراسی موجود تھا۔ میں نے پوچھا منیجر صاحب کہاں ملیں گے؟ میرا خیال تھا وہ کمپنی کے آس پاس رہتے ہوں گے۔ اسی لیے ٹیکسی رخصت کردی تھی۔ چپراسی نے جو جگہ بتائی وہ نصف میل سے کم نہ تھی۔ اب دفعتہً موسلا دھار بارش شروع ہو چکی تھی۔ ٹیکسی ندارد۔ میں بھیگتا ہوا مسٹر تھامکنسن والا جنرل منیجر کے دولت کدے پر پہنچا۔ وہ موجود نہ تھے۔ پھر بھیگتا ہوا کمپنی کے دفتر واپس آیا۔ چپراسی سے نائب منیجر کا مکان پوچھا۔ یہ کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ پھر بھی ایک فرلانگ سے کم نہ تھا۔ لت پت وہاں پہنچا۔ ان صاحب کا نام مسٹر کانگا تھا۔ یہ اپنے بنگلے کے برآمدے میں اپنی بیوی اور لڑکیوں کے ساتھ بیٹھے بمبئی کی سحر طراز بارش کا لطف لے رہے تھے۔ ایک اجنبی شخص کو پانی میں شرابور اپنی طرف آتے دیکھا تو کچھ گھبرائے، کچھ حیران ہوئے، پوچھا

"آپ کون ہیں؟ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا "میں خلافت اخبار کا ایڈیٹر اور خلافت پریس کا منیجر ہوں، مسٹر کانگا سے ملنا چاہتا ہوں۔"

انہیں یقین نہ آیا کہ ایک بڑے اخبار کا ایڈیٹر اور ایک بڑے پریس کا منیجر، بایں حال زار ان کے دولت خانے پر اتنے ناوقت حاضر ہوسکتا ہے۔ مشتبہ نظروں سے مجھے گھورا، پھر سوال کیا۔

"آپ کیا چاہتے ہیں؟"

میں نے انہیں بتایا کہ گو پچھلی رقومات باقی ہیں لیکن دو سو روپے ابھی دو تین دن ہوئے ادا کرچکا ہوں پھر بھی بجلی کٹ گئی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اخبار نہ نکل سکے گا اور اس طرح بڑا نقصان ہوجائے گا!

مسٹر کانگا پارسی تھے۔ مسلمانوں سے ہمدردی اور دلچسپی رکھتے تھے۔ خلافت کا عہدِ شباب دیکھ چکے تھے۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ مسلمانوں کے قومی ادارے مالی اعتبار سے کتنے کمزور ہیں۔ کچھ یہ سوچ کر کچھ میری حالت پر رحم کھا کر انہوں نے مجھے عزت کے ساتھ بٹھایا۔ چائے کی پیالی پیش کی۔ اور فون کرکے کسی شخص کو طلب کیا۔ پھر مجھ سے کہا

"آپ ایسا کیجیے۔ میں اس وقت کنکشن لگوائے دیتا ہوں۔ لیکن باقی رقم کل ادا کردیجیے۔"

میں نے کہا "یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ مجھے کم از کم ایک ہفتہ کی مہلت دیجیے۔ اس عرصے میں ساری رقم بیباق کردوں گا۔"

میرے وعدے میں انہیں صداقت کی جھلک نظر آئی۔ کہنے لگے

"دس روز ہی سہی۔ لیکن قطعاً۔"

میں انہیں اطمینان دلا رہا تھا کہ ایک شخص آیا۔ اس سے مسٹر کانگا نے کہا

"خلافت پریس کی بجلی کا کنکشن ابھی بحال کردو۔ اور دس روز تک اگر رقم بیباق نہ ہو تو مجھے رپورٹ کردو۔"

وہ شخص سائیکل پر آیا تھا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ پیدل چلے۔ کانگا صاحب نے کہا "ٹھہریے" پھر مجھ سے کہا

"لگاتار بارش ہو رہی ہے۔ سواری ملنا مشکل ہے میری کار پر چلے جایئے!"

میں اس شخص کے ساتھ کار میں بیٹھا۔ دفتر سے اس نے الیکٹریشن کو جو رات کی ڈیوٹی پر تھا ساتھ لیا۔ تھوڑی دیر
خلافت ہاؤس پہنچ گئے۔ پریس بند تھا۔ کمرے تاریک تھے۔ باورچی خانے میں چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ شوکت صاحب کے بالاخانے پر
جل رہا تھا۔ میری اس طویل غیر حاضری نے انہیں اور زیادہ چراغ پا کر رکھا تھا۔ مجھے ڈانٹ لیتے تو شاید یہ دل کی کچھ بھ
جاتی۔ میں نے بھی ڈرامہ کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کانگا صاحب کی کار باہر رکوائی۔ الیکٹریشن کو لے کر چپکے سے پریس میں
سے بالکل متصل تھا داخل ہوا۔ ایک منٹ کے اندر خلافت ہاؤس بقعۂ نور بن گیا۔ میں نے الیکٹریشن کو پانچ روپے انعام
اور شوکت صاحب کے بالاخانے پر بھیگے ہوئے کپڑوں کے ساتھ پہنچا۔ شوکت صاحب نے مجھے دیکھا اور فرمایا

"یہ کیا ہو گیا تھا۔ بجلی کیوں کٹ گئی تھی؟"

شاید وہ کچھ اور کہتے میں نے دو روز پہلے کی دو سو روپے کی رسید دکھائی۔ رسید دیکھ حیرت سے پوچھا

"پھر بجلی کیوں کاٹی گئی؟"

میں نے ساری کتھا از اول تا آخر سنا دی۔ دفتر کے کلرک کا بلوں کو چھپائے رکھنا سب مجھے تقاضے کی اطلاع بھ
پھر مسٹر مہالکشمی والا کے ہاں جانا، وہاں سے کانگا صاحب کے پاس پہنچنا۔ وہاں سے الیکٹریشن کو لے کر آنا، سب
اب شوکت صاحب کی کیفیت دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ سمجھ گئے میں سازش اور مخالفت کا ہدف بنایا جا رہا ہو
تو صرف یہ کہا

"جاؤ کپڑے بدل کر آؤ۔ مہمان اب آتے ہوں گے۔"

اور پھر جو شکایت کرنے والوں کی خبر لی ہے تو اللہ دے اور بندہ لے۔

طوفان کے بادل چھٹ گئے تھے۔

لیکن ابھی ایک دوسرا طوفان میرے سر پر منڈلا رہا تھا۔

مئی ۳۵ء میں کوئٹہ ایک ہولناک زلزلے کی زد میں آیا۔ کوئٹہ مٹ گیا۔ زمین کے برابر ہو گیا۔ ہزاروں آدمی
آدمی مجروح ہو گئے۔ شاید ہی کوئی گھر سلامت رہا ہو۔ فوج نے شہر کو اپنے چارج میں لے لیا۔ جو لوگ ابھی زندہ
نیچے سسک رہے تھے۔ انہیں نکالا جا رہا تھا۔ جو مر گئے تھے ان کی لاشیں دفن کی جا رہی تھیں۔ زلزلے کے فوراً بع
لٹیروں نے زخمیوں اور لاشوں کی جیبیں ٹٹولنا، اور کھنڈرات سے مال و دولت، از قبیل زر نقد و زیورات وغیرہ
کیا۔ اس سلسلہ میں فوج کے سپاہی بھی متہم کیے گئے کہ وہ بھی اس لوٹ میں برابر کے شریک ہیں۔

میں نے اس واقعہ پر ایک ادارتی نوٹ لکھا اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ اگر یہ خبر غلط ہے تو واضح الفاظ میں
اور اگر صحیح ہے تو ان سپاہیوں کو عبرت انگیز سزا دے تاکہ لوگوں میں جو تباہ و برباد ہو چکے ہیں اعتماد کی فضا پیدا ہو
کے ہوم ممبر سر رابرٹ بیل تھے۔ انہوں نے تین ہزار روپے کی ضمانت اخبار سے اور تین ہزار کی ضمانت پریس سے

ضمانت طلبی کے واقعہ نے میرے مخالفوں کو ایک زریں موقعہ فراہم کر دیا۔ وہ پھر شوکت صاحب کی خدمت میں پہنچے، اور میرے متعلق کہا یہ شخص خلافت کو تباہ کر دے گا۔ آخر آپ نے اسے کیوں اتنی بڑی ذمہ داری سونپ رکھی ہے؟ خلافت کے پرانے پرانے، عمر رسیدہ، کار آزمودہ، کارکن موجود ہیں، انہیں نظر انداز کر کے آپ نے ایک نوجوان کو سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا ہے۔ اس موقعہ پر زاہد صاحب اور یٰسین نوری صاحب ——— جو بعد میں کانگرس میں شریک ہو گئے اور وزیر بنے ——— بھی موجود تھے۔ ان دونوں نے میری حمایت کی۔ اور شوکت صاحب سے کہا جعفری نے جس خوبی سے کام سنبھالا ہے وہ ہر طرح سے ہمت آزمائی کا مستحق ہے نہ کہ تعزیر و ملامت کا۔ شوکت صاحب کی خود بھی یہی رائے تھی۔ انہوں نے کہا میں خود بھی اس واقعہ پر اگر لکھتا تو وہی لکھتا جو جعفری نے لکھا ہے۔ حکومت تو خلافت پر وار کرنے کے بہانے ڈھونڈتی رہتی ہے۔ اگر ہمدرد سے "چڑیا چڑے" کی کہانی پر ضمانت طلب کی جا سکتی تھی تو خلافت سے کوئٹہ کے اس دلفگار حادثہ پر کیوں نہیں طلب کی جا سکتی؟ رہے وہ پرانے اور کار آزمودہ کارکن جن کا تم ذکر کرتے ہو تو ان سے مایوس ہونے کے بعد ہی میں نے اس نوجوان کو یہ ذمہ داری سونپی ہے۔ اور جب سے اس نے کام سنبھالا ہے مجھے ایک پیسہ بھی اخبار یا پریس کے سلسلے میں باہر سے لا کر نہیں دینا پڑا ہے۔

۱۹۳۵ء ہی میں شہنشاہ جارج پنجم کی سلور جوبلی ہوئی۔ بمبئی کے سرکار پرست لوگوں نے بڑی دھوم دھام سے جشن مسرت منانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ان میں پیش پیش سر سلیمان قاسم مٹھا تھے جو شوکت صاحب کے دوست، خلافت کے مالی معاون اور بمبئی کے کروڑپتی تاجر تھے۔ انہیں انگریزوں سے عشق تھا۔ گو صادق نہ تھا کیونکہ کانگرس وزارت قائم ہوتے ہی کانگرسی بن گئے اور اب تک کانگرسی ہیں۔ سرکاری حکام دعائی اور وزراء بھی جشن کو کامیاب بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے۔

میں نے اس جشن کی تیاریوں کے سلسلے میں جو اعلانات موافقانہ یا مخالفانہ آئے شائع کر دیئے۔ اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا۔ شوکت صاحب دورے پر باہر گئے ہوئے تھے۔ سر سلیمان وغیرہ کی مخالفت کرنا مجھے منظور نہ تھا۔ میں نے سوچا شوکت صاحب آجائیں تو وہ خود ہی اس سلسلے میں پالیسی متعین کریں گے۔

لیکن اسی اثنا میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے میری مہر سکوت توڑ دی۔ اور میں نے مسلسل کئی پُر زور مقالات جشن جوبلی کے سلسلے میں لکھ ڈالے۔ بات یہ ہوئی کہ سر سلیمان اور سر شاہ نواز بھٹو نے جو سندھ کے نمائندے کی حیثیت سے ممبر لوکل سیلف گورنمنٹ تھے، متولیان اوقاف کو راضی کر لیا کہ اپنی اپنی مسجدوں میں چراغاں بھی کریں اور جامع مسجد میں بھی چراغاں کی تیاریاں ہونے لگیں۔ سر سلیمان اور سر شاہ نواز بھٹو کی طرف سے میرے پاس پیام پہنچا کہ میں خاموش رہوں۔ اور اس مسئلے پر لب کشائی نہ کروں۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ شوکت صاحب چونکہ کانگرس سے الگ ہو چکے ہیں اور بیک وقت حکومت اور کانگرس سے مخالفت مول لینا پسند نہیں کریں گے۔ میں نے اپنا کام جاری رکھا یعنی ایڈیٹوریل مخالفت میں لکھتا رہا۔ اور متولیوں کو توجہ دلاتا رہا کہ وہ اپنے گھر پر تو چراغاں کر سکتے ہیں لیکن خانۂ خدا کو اس کام کے لیے نہیں استعمال کر سکتے۔ اور اگر انہوں نے ایسا کیا تو مسلمان کوئی عملی اقدام کرنے پر مجبور ہوں گے۔

جب میں نے اپنی روش میں کوئی تبدیلی نہیں کی تو شوکت صاحب کو تار دے کر بلایا گیا۔ تیسرے روز وہ بمبئی پہنچے۔ پوری بندر

خلافت میں کئی مضامین اپنی زبان اور میرے قلم سے لکھوائے۔ لارڈ برابورن بمبئی کے گورنر تھے۔ بڑے شریف اور نیک طبع شخص تھے۔ اور شوکت صاحب کی بہت عزت کرتے تھے۔ ان مقالات کے بعد انہوں نے شوکت صاحب کو ملاقات کے لیے طلب کیا۔ ظاہر ہے ملاقات کا مقصد اسی مسئلے پر گفتگو کرنا تھا۔ ملاقات چونکہ پرائیویٹ تھی، دل کھول کر دونوں نے گفتگو کی۔ شوکت صاحب نے صاف صاف اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ گورنر نے ذاتی طور پر ان کی کئی باتوں کو درست تسلیم کیا۔ واپس آکر شوکت صاحب نے اپنے دربار میں مجھے پھر پنسل کاغذ کے ساتھ حاضر ہونے کا حکم دیا۔ اور ایک مضمون "لارڈ برابورن سے میری ملاقات" لکھوایا۔ اور وہ ساری باتیں لکھ دیں جو ان سے اور گورنر سے ہوئی تھیں۔

لارڈ برابورن کی خدمت میں اخبار کا یہ تراشہ جب پیش کیا گیا تو بھنّا گئے۔ وہ اخبار میں اس ملاقات کا ذکر ہی نہیں پسند کرتے تھے نہ کہ پوری گفتگو کی تفصیلی اشاعت۔ انہوں نے شوکت صاحب کو ایک خط لکھا جس میں شکایت کی کہ آپ کو وہ پرائیویٹ گفتگو نہیں شایع کرنی چاہیے تھی جو ہمارے مابین ہوئی تھی۔ خط پڑھ کر شوکت صاحب کو بھی جلال آگیا۔ انہوں نے فوراً جواب لکھا۔ ہماری یہ ملاقات ذاتی نہیں تھی۔ ایک قومی مسئلہ سے متعلق تھی۔ اسے راز رکھ کر میں عامۂ مسلمین سے خیانت کا مرتکب ہوتا۔ یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھیے کہ گورنر، وائسرائے، وزیر، کسی سرکاری آدمی سے بھی مجھے ذاتی حیثیت سے ملنے کی ضرورت نہیں۔ میں جب بھی ملوں گا، کسی قومی کام کے سلسلے میں ملوں گا، اور قوم کو اس سے باخبر بھی رکھوں گا۔"

شوکت صاحب خود بھی پٹھان تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سرحد کے پٹھانوں سے انہیں غیر معمولی تعلق خاطر تھا۔ اور یہ پٹھان بھی ان پر جان فدا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ بمبئی میں بچوں کے اغوا کی وارداتیں بکثرت ہونے لگیں۔ افواہ یہ اڑی کہ بچوں کا اغوا پٹھان کرتے ہیں۔ اس افواہ نے ایسی شدت اختیار کی کہ ہندو پٹھانوں سے کھٹکنے لگے۔ پریل اور دادر میں پٹھانوں کی خاصی آبادی تھی۔ پہلے تو اکا دکا پٹھانوں کی پٹائی ہوئی، پھر باقاعدہ فساد ہوا اور بے تحاشہ وہ مارے جانے لگے۔ شوکت صاحب اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر تن تنہا کار میں بیٹھ کر پریل اور دادر کے علاقے میں پہنچے۔ بعد میں مولانا عرفان اور خلافت کے کچھ رضاکار بھی گئے۔ پولیس افسر نے کہا اس خطرناک علاقے میں آپ حضرات صرف اپنی ذمہ داری پر جا سکتے ہیں۔ ہم حفاظت جان کی ضمانت نہیں دے سکتے۔ شوکت صاحب نے کہا ہمیں ضمانت نہیں چاہیے۔ وہ فسادی علاقے میں پہنچے۔ گو وہ کانگریس سے الگ ہو چکے تھے۔ لیکن ان کی بھاری بھرکم شخصیت کے نقوش اب تک ہندوؤں کے دلوں پر بھی قائم تھے۔ انہیں دیکھ کر مشتعل مجمع چھنٹ گیا، اور وہ ان تمام پٹھانوں کو جو اپنی چالوں میں خوف جان سے دبکے ہوئے تھے۔ صحیح سلامت خلافت ہاؤس لے آئے۔ خلافت ہاؤس کے کمرے، برآمدے، صحن ہر جگہ پٹھان ہی پٹھان نظر آرہے تھے۔ اور ان سب کی باقاعدہ خلافت فنڈ سے، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں شوکت صاحب کی جیب سے مہمانداری ہو رہی تھی۔ ۲۰-۲۵ دن تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب حالات دوبارہ ہو گئے تو یہ مہمان رخصت ہو گئے۔

ایک مرتبہ اور بمبئی میں خوں ریز ہندو مسلم فساد ہوا۔ وہاں کے مسلمانوں پر جب بھی کوئی آفت آتی تھی، خلافت کمیٹی، خلافت کا عملہ، خلافت کے رضاکار اور خود شوکت صاحب ان کی امداد و اعانت کے لیے وقف ہو جاتے تھے۔ اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ مسٹر سدانند ایک کٹر مہاسبھائی شخص تھا۔ یہ فری پریس جرنل کا مالک بھی تھا اور ایڈیٹر بھی۔ اس نے پہلے صفحہ پر ایک خبر چھاپی

کہ خلافت کے رضاکاروں کے پاس سے خون آلود چھرے برآمد ہوئے ہیں۔ اور یہ رضاکار شوکت صاحب کی تہہ ... میں عملی حصہ لیتے ہیں۔ اسی روز بمبئی کارپوریشن کے میئر نے ایک مجلس امن طلب کی جس میں ہندو مسلم لیڈر مدعو تھے ... صاحب بھی تشریف لے گئے۔ وہاں مسٹر پرشوتم داس ٹھاکر داس نے فری پریس جرنل کی وہ خبر پڑھ کر کہا۔ ایک طرف ... پھیلاتے ہیں۔ پھر امن کی باتیں کرتے ہیں۔ یہ چوٹ شوکت صاحب پر تھی وہ بھلا کب چپ رہنے والے تھے۔ انہوں نے ... ہو کر کہا فسادی تم ہو۔ تم غنڈوں کو روپے دے کر مسلمانوں کو قتل کراتے ہو۔ میں تم پر اور تمہاری اس امن کمیٹی پر لعنت ... یہ کہہ کر واک آؤٹ کر گئے۔ اور دوسرے روز سدانند پر انہوں نے ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا۔ سدا... بھی دولت مند تھا اور اس کی پشت پناہی تمام بڑے بڑے سرمایہ دار کر رہے تھے۔ شوکت صاحب کے پاس وکیل کو ... کے روپے بھی نہیں تھے۔ یاسین نوری صاحب بیرسٹر سے شوکت صاحب کے عزیزانہ تعلقات تھے، اور وہ خلافت کے ... کارکن اور علی برادران کے شیدائی تھے۔ احمد آباد میں پریکٹس کرتے تھے۔ فیس کا تو سوال ہی نہ تھا۔ البتہ کرایہ آمد و رفت ... میں شوکت صاحب ہر پیشی پر ان کی جیب میں کچھ ڈال دیا کرتے تھے۔ یہ مقدمہ بہت دن تک چلا۔ بعد میں سعید حسن ... بیرسٹر جو جنوبی افریقہ میں پریکٹس کرتے تھے بمبئی میں بودوباش اختیار کرنے آ گئے۔ قیام خلافت ہاؤس میں رہا۔ ان سے ... تعلقات تھے۔ یہ مسٹر غلام حسین بٹ ـــــ جو بعد میں سپریم کورٹ آف انڈیا کے جج ہوئے ـــــ کے قریبی عزیز ... ان سے شوکت صاحب کے گہرے مراسم تھے جو عزیزانہ حد سے بھی آگے بڑھے ہوئے تھے۔ آخر یہ مقدمہ سعید حسن نے ... بڑی قابلیت سے لڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سدانند کو تابرخاست عدالت قید اور جرمانے کی سزا ہوئی۔ شوکت صاحب کی ... نے سدانند کا چراغ گل کر دیا، اور مسٹر پرشوتم داس ٹھاکر داس بناسپتی کی طرح بیٹھ گئے۔

مراد آباد سے شوکت صاحب مرکزی اسمبلی کی ممبری کے لیے کھڑے ہوئے۔ اس حلقہ سے سر یعقوب ہمیشہ سے ممبر ہوتے ... تھے۔ وفادار سرکار تھے۔ حکام و عمال سے گاڑھی چھنتی تھی۔ پہلے تو انہوں نے ایک حد درجہ نیازمندانہ خط لکھ ... کی وہ کوئی اور حلقہ منتخب کر لیں مگر شوکت صاحب کیوں مانتے؟ آخر انہوں نے ریٹرننگ آفیسر کو ملا کر کاغذات نامزدگی ... کی کوشش کی۔ شوکت صاحب فوراً بذریعہ کار دہلی پہنچے اور سر ہنری کریک سے ـــــ بعد میں پنجاب کے گورنر ... گورنمنٹ آف انڈیا کے ہوم ممبر تھے شکایت کی۔ سر ہنری کریک نے پندار کے ساتھ جواب دیا،

"میں اپنے آفیشلس کی شکایت نہیں سننا چاہتا۔"

شوکت صاحب نے اپنا آبنوسی ڈنڈا اس کے سر کی طرف گھماتے ہوئے کہا،

"سنو گے کیسے نہیں؟ پھر تو ہے کس مرض کی دوا؟"

اگر سر ہنری کریک "ارے رے مولانا صاحب" کہتے ہوئے فوراً کھسک نہ جائیں، تو پھر "یا میر اگر یہاں چاک ... چاک" کا منظر ساری دنیا دیکھ لیتی۔ لیکن شوکت صاحب نے اس پرائیویٹ کارنامے کو بھی راز نہیں رکھا۔ دوسرے ... میں ان کا بیان شائع ہوا جس میں یہ ساری تفصیل درج تھی۔

پناہ دینے کے معاملے میں شوکت صاحب خالص "عرب" تھے۔ رامپور کے ایک صاحب ارشاد علی بمبئی ...

بستہ نمبر ۱۲۱ قیمت ایک آنہ
Regd. No. 1644 T. 41706

KHILAFAT DAILY.

خلافت

اتحاد اسلامی اور سیاست ہند کا حقیقی ترجمان

بانی شوکت علی (خادم کعبہ)
رئیس احمد جعفری (ندوی)

جلد ۱۶ بمبئی چہارشنبہ ۲۹ ربیع الاول ۱۳۵۶ھ ہجری مطابق ۹ جون ۱۹۳۷ء نمبر ۳۸

مدح صحابہ کمیٹی کی رپورٹ پر دستخط لکھنؤ میں لو سے ۱۲ اموات

مدراس میں ایک بیرسٹر پر قاتلانہ حملہ

[illegible]

لکھنؤ میں لو سے ۱۲ اموات

[illegible]

نیوگنی میں کوہ آتش فشاں پھٹ گیا
بہت سے آدمی ہلاک ہوئے

[illegible]

پشاور میں زمینداروں کی گرفتاری

[illegible]

کراچی میں دو ٹراموں کی ٹکر
۲ آدمی سخت مجروح ہوئے

کراچی ۷ جون ۔ آج صدر اور نمبر روڈ کے جنکشن پر مقامی کمپنی کی دو ٹراموں میں ٹکر ہو گئی ۔ دو آدمی سخت مجروح ہوئے ۔ جو فوراً ہسپتال پہونچائے گئے ۔ ٹراموں کو کافی نقصان پہونچا اور تقریباً ادھ گھنٹہ تک ٹرام لائن بند رہی ۔

ہسپانیہ میں جنگ جاری ہے

[illegible]

وزیریوں سے دوبارہ گفتگو
حکومت کی طرف سے منظوری دی گئی

[illegible]

چھپائی کا کام اپنے اسلامی چھاپے خانہ خلافت پریس سے کرائیے

لاہور کے قریب ریل کا حادثہ
ایک مسافر مجروح ہوا

[illegible]

مسٹر کرپلانی کے مقابلے پر دو غیر کانگریسی

[illegible]

گمشدہ ہوائی جہاز کئی ماہ کے بعد ملا

[illegible]

EG. B 1644

TLP. 41700

KHILAFAT WEEKLY.

خلافت

ہفتہ وار بمبئی

باتصویر

ادارۂ تحریر

شوکت علی (خادم کعبہ) رئیس احمد جعفری (ندوی)

Vol. 15 BOMBAY-SUNDAY, 9th AUGUST 1936. No. 15.

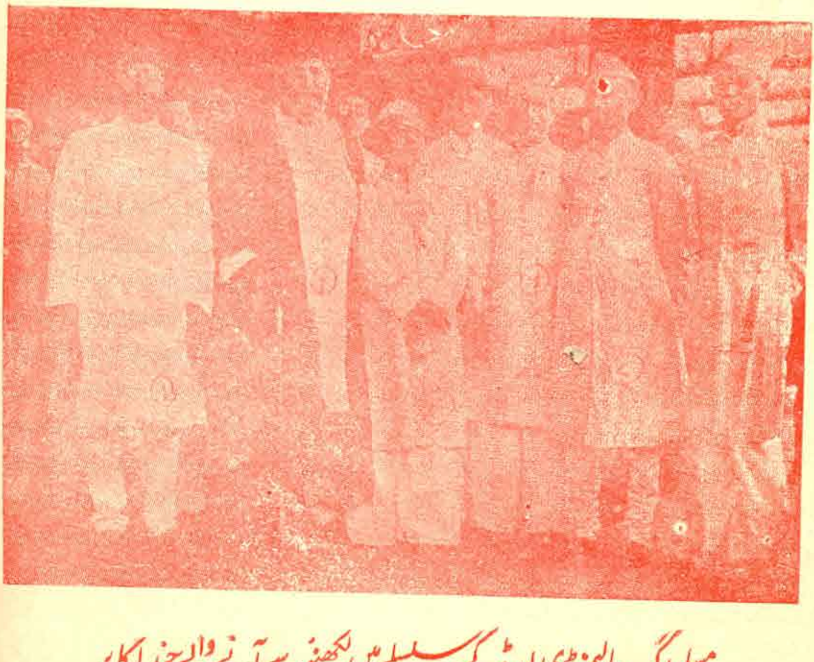

مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے سلسلے میں لکھنؤ سے آنے والے چند اکابر

(۱) مولانا عرفان (۲) مولانا شوکت علی (۳) عبدالرحمن صدیقی (۴) راجہ صاحب محمود آباد (۵) عثمان تو بانی (۶) چوہدری خلیق الزماں (۷) سید عبداللہ بریلوی - ایڈیٹر بمبئی کرانیکل - مولانا عرفان اور مولانا شوکت علی کے کندھے کے پاس رئیس احمد جعفری اور حبیب احمد ندوی

تھے۔ خلافت ہاؤس میں اکثر آمد و رفت رہتی تھی۔ زاہد صاحب ان کی سرپرستی کیا کرتے تھے۔ شوکت صاحب ان سے کچھ زیادہ خوش نہ تھے۔ ان کا ایک پارسی لڑکی سے عشق چل رہا تھا۔ لڑکی نے اسلام قبول کر لیا۔ اور دونوں نے باہمی رضامندی سے شادی کر لی۔ بپھرے ہوئے پارسیوں سے نمٹنا، اور قید و بند، گرفتاری و ضمانت، عدالت اور مقدمہ کے مراحل سے گزرنا ان کے بس سے باہر تھا۔ اپنی بیوی کو لے کر سیدھے خلافت ہاؤس پہنچے۔ اور سارا واقعہ گوش گزار کر کے امداد کے طالب ہوئے۔ شوکت صاحب نے لڑکی کا بیان سنا اور جب مطمئن ہو گئے کہ لڑکی واقعی دل سے مسلمان ہو گئی ہے اور واقعی اپنے شوہر سے محبت کرتی ہے تو ارشاد صاحب سے ان کی خفگی دور ہو گئی۔ انہوں نے اپنی بہو کی طرح لڑکی کو خلافت ہاؤس میں رکھا۔ چھوٹے بڑے پارسیوں کا خلافت ہاؤس میں تانتا لگ گیا۔ لڑکی کے والدین بھی آئے۔ دھمکیاں بھی دیں۔ خون خرابے کی نوید بھی سنائی۔ لیکن شوکت صاحب جسے پناہ دے چکے تھے اس کے لیے سینہ سپر ہو گئے۔ کسی کی نہیں سنی، کسی کی نہیں چلنے دی۔ ارشاد صاحب کو صرف ایک خوبصورت اور خوب سیرت بیوی ہی نہیں ملی۔ ایک قلعہ بھی مل گیا جہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ ایک سرپرست بھی مل گیا جو ہر بڑی سے بڑی طاقت سے پنجہ آزمائی کو تیار تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ روز کے بعد مخالفت کا طوفان دب گیا۔ اور ارشاد صاحب دن عید اور رات شبرات کے مزے لوٹنے لگے۔

۴۷ء کا واقعہ ہے کہ میرے ندوے کے ساتھی حافظ عمران خاں ازہر یونیورسٹی مصر میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ وہ بضد تھے کہ میں مصر آ جاؤں اور سند فراغت لے لوں۔ وہ اتنے ایثار پر آمادہ تھے کہ انہوں نے لکھ دیا تھا کہ مجھے اپنی جیب سے مصر میں ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ وظیفہ کا بندوبست کر چکے ہیں۔ میرا کام صرف یہ ہے کہ جہاز پر بیٹھوں اور مصر پہنچ جاؤں۔ میری خود بھی آرزو یہی تھی۔ میں نے پاسپورٹ بنوایا۔ ٹکٹ کا بندوبست کیا۔ جہاز سے سیٹ بک کرا لی۔ اور شوکت صاحب کو جو مرکزی اسمبلی کے اجلاس کے سلسلے میں دہلی گئے تھے اپنا استعفا لکھ کر بھیج دیا۔

شوکت صاحب نے میرے خط کے جواب میں تار دے کر مجھے دہلی طلب کیا۔ میں پہنچا اور قرول باغ میں بیگم محمد علی کی قیام گاہ پر شوکت صاحب کے پاس ٹھہرا۔ پہلے دن انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ دوسرے روز جب اسمبلی جانے لگے تو مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ خود ایوان میں جا کر بیٹھ گئے۔ مجھے پریس گیلری کا پاس دیدیا۔ میں وہاں جا کر بیٹھ گیا اور کارروائی دیکھنے لگا۔ لنچ کے وقت اپنے دو دوستوں مسٹر حسن علی (مشہور کرکٹیر) اور مسٹر مصباح العثمان (ڈپٹی کمشنر ناگپور) کے ساتھ وہ صنوبر خاں کے ہوٹل میں پہنچے۔ میں بھی ساتھ تھا کھانے کے ساتھ ساتھ گپ شپ ہوتی رہی۔ میں خاموشی سے ان بڑوں کی دلچسپ اور پرلطف باتیں سنتا رہا۔

سہ پہر کو امپیریل ہوٹل تشریف لے گئے۔ ضمیمہ کی طرح میں بھی ساتھ تھا۔ یہاں بھولا بھائی ڈیسائی نے ایک پارٹی دی تھی۔ سر شاہ سلیمان جج فیڈرل کورٹ کو سب سے پہلے میں نے یہیں دیکھا۔ اس پارٹی سے فارغ ہو کر شوکت صاحب مجھے لیے ہوئے مسٹر غلام محمد (سابق گورنر جنرل پاکستان) کے بنگلے پر لے گئے جن سے ان کے دیرینہ تعلقات تھے۔ کچھ دیر وہاں بیٹھے، ان پر فقرے سر کرتے رہے ان کی بیماری کا مذاق اڑاتے رہے۔ وہاں سے اٹھے تو میاں غیاث الدین ممبر اسمبلی کے ہاں پہنچے۔ اب رات ہو چلی تھی یہاں میں نے دیکھا سر سکندر حیات نہایت مضمحل اور اداس بیٹھے ہیں۔ سر ضیاء الدین وغیرہ تشریف فرما تھے۔ شوکت صاحب کے پہنچتے ہی مجلس باغ و بہار بن گئی۔ سر سکندر کا موڈ بھی بدل گیا۔ میاں غیاث الدین نے سر سکندر کے تدبر اور فہم و فراست کا قصیدہ پڑھنا شروع کیا حاضرین میں سے کسی نے کہا

"سر سکندر کے تدبّر اور فہم و فراست کا اس سے بڑھ کر ثبوت کیا ہو گا کہ پنجاب کی (عارضی) گورنری تک کے منصب پر فائز ہوئے۔"

شوکت صاحب نے برجستہ کہا

"ہاں، اور انگریز کے عدم تدبّر اور بے عقلی کا اس سے بڑھ کر ثبوت کیا ہو گا کہ اس نے چھانٹ چھانٹ کے نالائق کو یہ منصب عطا کیا۔ پنجاب میں سر سکندر کو اور یو پی میں چھتاری کو۔"

سر سکندر بھی ہنس دیے۔ اور دوسرے حضرات نے بھی ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ پھر سر ضیاء الدین سے چوٹیں رہیں۔ اس مجلس میں مجھے اندازہ ہوا کہ سر ضیاء الدین بھی بہ سکندر زندہ دل اور بذلہ سنج تھے۔ انہوں نے بھی اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جواب باصواب دینے میں یہ دوسری بات ہے کہ "بڑے بھیا" خود جتنے بھاری بھرکم تھے، ویسے ہی ان کے دلائل بھی اٹھائے نہیں اٹھتے تھے۔ اور ضیاء الدین جتنے "المختصر" تھے ویسے ہی ان کے جوابات بھی ہلکے پھلکے ہوتے تھے۔ اس مجلس کی یہ خصوصیت بڑی دلچسپ تھی کہ میدان سیاست کے حریف اور رقیب اپنے سارے اختلافات فراموش کر کے علی گڑھ کے نظر آ رہے تھے۔

سر سکندر کی افسردگی اور اضمحلال کا سبب یہ تھا کہ مسلم لیگی ممبر برکت علی نے اسمبلی میں ایک تجویز پیش کرنے کا نوٹس دیا تھا جس کی رو سے مسجد شہید گنج مسلمانوں کو واپس مل جانی چاہیے تھی۔ سر سکندر نے بہ حیثیت وزیر اعظم گورنر کو مشورہ دیا کہ اپنے اختیارات خصوصی سے کام لے کر یہ تجویز پیش کرنے کی اجازت نہ دیں۔ گورنر نے وزیر اعظم کے مشورے پر عمل کیا۔ سر سکندر کی مخالفت میں ایک طوفان برپا ہو گیا۔ اب ڈر رہے تھے کہیں قائد اعظم ملک برکت علی کی تائید نہ کر دیں۔ مولانا شوکت علی خاص طور پر اس لیے طلب کیے گئے تھے کہ وہ جناح صاحب کو ہموار کریں۔ سر سکندر کے استدلال میں وزن تھا۔ وہ کہتے تھے اگر اس طرح مسجد شہید گنج واپس لی گئی تو ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں نہ جانے کتنی مسجدیں مسلمانوں سے چھین لی جائیں گی۔ بات شوکت صاحب کی سمجھ میں آ گئی اور انہوں نے وعدہ کر لیا کہ پوری کوشش کریں گے۔ اور اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہوئے۔ واقعہ یہ ہے کہ قائد اعظم کے دل میں مولانا شوکت علی کی بڑی عظمت تھی۔ وہ صحیح معنی میں شوکت صاحب پر بھروسہ اور ان کے اخلاص کی قدر کرتے تھے۔ وہ شوکت صاحب ہی تھے جنہوں نے قائد اعظم سے اصرار کیا کہ اپنی ورکنگ کمیٹی میں، خلیق الزمان، عبد الرحمن صدیقی، ناگپور کے رؤف اور شیخ عبد المجید سندھی کو ضرور شامل کریں۔ اور ان کے اس اصرار کو قائد اعظم رد نہ کر سکے۔ حالانکہ ان میں سے بعض کو وہ دل سے پسند نہیں کرتے تھے۔

شوکت صاحب کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ذہنی تحفظ کے قائل نہیں تھے۔ انہوں نے جب محسوس کیا کہ قائد اعظم مسلمانوں کے سفینے کو صحیح سلامت ساحل مراد تک لے جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو انتہائی ایثار و اخلاص سے کام لے کر اپنی عظیم و جلیل شخصیت کو پس پشت ڈال کر قائد اعظم کی قیادت تسلیم کر لی۔ میرا مشاہدہ ہے کہ کارکنانِ خلافت انفرادی طور پر اور وفد کی صورت میں آ کر شوکت صاحب سے لڑا کرتے تھے کہ آپ نے کیوں مسٹر جناح کی قیادت قبول کر لی ہے؟ اور کیوں ہمیں ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر رہے ہیں؟ حالانکہ انہوں نے تحریکِ خلافت میں مسلمانوں کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ اور مولانا شوکت علی جواب میں فرماتے

تھے۔اگر تم مجھے اپنا لیڈر مانتے ہو تو میرے لیڈر کو بھی لیڈر مانو۔ خلافت کے زمانے میں اگر جناح نے غلطی کی تھی تو اب اس کی تلافی بھی کر رہا ہے۔ یاد رکھو یہی شخص مسلمانوں کا بیڑا پار کر سکتا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اگر شوکت صاحب قائداعظم کی قیادت عظمیٰ کو چیلنج کرتے تو اس میں بڑے رخنے پڑتے اور مسلم لیگ کی وہ مرکزیت قائم نہ ہو پاتی جو شوکت صاحب کے تعاون سے قائم ہو گئی تھی۔ خود قائداعظم بھی اسے محسوس فرماتے تھے۔ ان کی واضح ہدایت تھی کہ مسلم لیگ کا ممبر کسی دوسری سیاسی جماعت کا ممبر نہیں بن سکتا۔ لیکن جو لوگ خلافت کے ممبر، کارکن اور عہدیدار تھے ان سے کبھی بازپرس نہیں ہوئی۔

اس مجلس سے فارغ ہو کر کوئی گیارہ بجے شوکت صاحب اپنی قیام گاہ پر پہنچے۔ بہت تھک گئے تھے جاتے ہی بستر پر دراز ہو گئے۔ میں بھی سونے کی تیاری کرنے لگا۔ اتنے میں شوکت صاحب نے آواز دے کر مجھے بلایا۔ میں حاضر ہوا۔ انہوں نے پوچھا

"کیا واقعی تم نے مصر جانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟"

میں نے عرض کیا" اگر آپ اجازت دیں گے تو جاؤں گا!"

فرمایا، "میرا ساتھ نہ چھوڑو، کچھ اور صبر کرو، میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر مصر جاؤں گا۔ اور تمہارے لیے بہت اچھا بندوبست کر دوں گا۔"

میں خاموش ہو گیا۔ ان کے سامنے زبان کھولنے کا یارا نہ تھا۔ پھر فرمایا

"جاؤ سو رہو، اور کل بمبئی واپس جاؤ، جی لگا کر کام کرتے رہو۔"

پریس کا انتظام جب میں نے اپنے ہاتھ میں لیا تو اس کا سختی سے لحاظ رکھا کہ جاب ورک زیادہ سے زیادہ آئے۔ کام اچھا چھپے۔ اور وعدہ خلافی کبھی نہ ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مقامی ہفتے وار اخبارات خلافت پریس میں چھپنے لگے۔ جی آئی پی ریلوے، بی بی اینڈ سی آئی ریلوے۔ فلم کمپنیوں اور سینما ہاؤسوں کے ہینڈ بل اور پوسٹر چھپنے کے لیے آنے لگے۔ مغل لائن کے ڈائرکٹر مسٹر براؤن سے شوکت صاحب کے بڑے گہرے روابط تھے۔ لیکن اس کا اردو کا کام ہمیشہ دوسرے پریسوں میں چھپتا تھا۔ میں نے یہ کام بھی حاصل کیا۔ میری اس کامیابی سے شوکت صاحب بہت خوش تھے۔ لیکن میرے کرم فرمایانِ خصوصی اتنے ہی ناخوش تھے۔ یہ لوگ زاہد صاحب کو تو میرے خلاف نہ توڑ سکے۔ لیکن مولانا عرفان کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر انہیں ہموار کر لیا۔ مولانا بڑے مخلص، بڑے نیک، بڑے ایماندار آدمی تھے۔ لیکن کانوں کے کچے تھے۔ چونکہ میری کامیابیوں کا ان کے اقتدار پر براہِ راست اثر پڑتا تھا اس لیے مجھ سے خوش بھی نہ تھے۔ اس چیز نے دراندازوں کا حوصلہ بڑھا دیا اور وہ میرے خلاف انہیں استعمال کرنے لگے۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو بظاہر مجھ سے بڑے تپاک اور گرم جوشی سے ملتے تھے۔ میرے کاموں کی داد دیتے تھے لیکن پیٹھ پیچھے زک دینے کی تدبیریں سوچتے رہتے تھے۔

خلافت پریس کا کام اب بڑھ گیا تھا۔ چھپائی پتھروں پر ہوتی تھی۔ پتھر اب ضرورت سے کم تھے۔ پندرہ بیس برس پہلے ایک مترجم قرآن مجید خلافت پریس میں چھپا تھا۔ اس کے پتھر محفوظ تھے لیکن نامکمل۔ کئی پاروں کے پتھر غائب تھے۔ یہ پتھر سائز میں چھوٹے تھے۔ مجھے بڑے پتھروں کی ضرورت تھی۔ یہ کافی گھس چکے تھے۔ میں نئے پتھر چاہتا تھا۔ میں نے عرفان صاحب سے ایک روز برسبیل تذکرہ کہا "کیوں نہ یہ پتھر فروخت کر کے نئے پتھر خرید لیے جائیں؟" مولانا نے جواب دیا تمہیں پورا اختیار ہے۔

حجازی پریس کے مالک مولانا عطاء اللہ قرآن چھاپنا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں آمادہ کیا کہ یہ پتھر خرید لیں۔ جو بارے کم ان کا اپنے طور پر انتظام کر لیں۔ اس طرح ان کا کام جلد ہو سکتا تھا، اور وہ بہت سی زحمتوں سے بچ سکتے تھے۔ وہ فوراً آمادہ ہو بڑے متدین اور برگزیدہ شخص تھے۔ انہوں نے آکر پتھروں کا معائنہ کیا۔ جو قیمت لگائی وہ اگرچہ نامناسب نہ تھی مگر میرے اصرار سے انہوں نے اپنی پیش کش میں میرے حسب دل خواہ اضافہ کر دیا۔ اور کراس چیک دیدیا۔ میں نے پتھر ان کے حوالے کر دیئے۔ شوکت صاحب دہلی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔

کوئی ڈیڑھ ماہ کے بعد واپس آئے۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ میری طلبی ہوئی۔ میں نے دیکھا مرکزی دفتر میں شوکت صاحب تشریف فرما ہیں اور دفتر کی ساری کرسیوں پر میرے مہربانانِ قدیم متمکن ہیں۔ مولانا عرفان بھی تشریف رکھتے تھے۔ یہ ایک وفد تھا اور بلاشبہ یہ سب شوکت صاحب کے اور خلافت کے فدائی تھے۔ اس وفد نے مجھ پر سنگین الزامات عائد کئے تھے۔ جو خود رائی اور خود مختاری کی شکایت پر مبنی تھے۔ ان الزامات میں سرِ فہرست پتھروں کی فروخت کا معاملہ تھا گویا میں نے تختِ طاؤس کوڑیوں کے دام فروخت کر دیا تھا۔

میں نے جواب میں ساری تفصیل سنا دی۔ اور کہا اگر کوئی صاحب ان پتھروں کو زیادہ قیمت پر فروخت کر سکتے ہیں تو وہ گاہک لائیں۔ میں مولانا عطاء اللہ سے ان کی قیمت واپس کر کے پتھر واپس لے آؤں گا۔ رہی میری خود سری اور خود مختاری تو مولانا عرفان بیٹھے ہیں ان سے دریافت کر لیجیے۔ یہ اقدام کرنے سے پہلے میں نے ان سے مشورہ کر لیا تھا یا نہیں؟ مولانا میرے سامنے میرے اس دعوی کی تردید نہیں کر سکتے تھے خاموش رہے۔

شوکت صاحب نے میری صداقت محسوس کر لی، اور حاضرین کرام کے سامنے مجھے مخاطب کر کے فرمایا

"بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے نہ خود کام کر سکتے ہیں نہ دوسروں کو کرنے دیتے ہیں"

اور پھر ممبرانِ وفد سے مخاطب ہو کر فرمایا

"جس روز سے اس نے کام سنبھالا ہے میرے پاس کوئی تقاضہ کرنے والا نہیں آیا۔ دفتر کے حسابات کا گوشوارہ ہر مہینے میرے سامنے پیش ہوتا ہے۔ اخبار یا پریس پر کوئی قرض نہیں ہے۔ سب کی تنخواہیں وقت پر ادا ہوتی ہیں۔ میں ہزاروں روپے بھیک مانگ کر دوستوں سے لاتا تھا مگر قرضہ کسی طرح ادا نہیں ہوتا تھا۔ اگر میں اسے نکال دوں تو کون ذمہ لیتا ہے کہ مجھے ہر خرخشے سے الگ رکھ کر کام اسی طرح چلاتا رہے گا؟ مجھے کام چاہیے باتیں نہیں چاہیے۔"

سب کے منہ اُتر گئے۔ بڑے بڑے "جبار" سرنگوں تھے۔ جنہیں اپنے ارشاد "ناطق" کی قطعیت پر بھروسہ تھا وہ گنگ ہو گئے۔ آرہے تھے۔ جنہیں یہ "افتخار" حاصل تھا کہ شوکت صاحب کے سامنے بے جھجک جو چاہیں کہہ سکتے ہیں، وہ پہلو بدل رہے تھے۔ کر یہ تھے شوکت صاحب۔

جس آدمی پر اعتماد کر لیں۔ دنیا کی کوئی طاقت ان کی رائے اس کے بارے میں نہیں بدل سکتی تھی، کوئی نہیں بدل سکتا تھا کے فدائی، ساتھی، اور جاں نثار بھی نہیں۔

مولانا عرفان کی قیادت سے مایوس ہو کر ان حضرات نے ایک مرتبہ زاہد صاحب کو بھی مجھ سے فرنٹ کر دیا۔

بمبئی کے جرمن قونصل مسٹر کپ تھے۔ ان کے پاس ہر ہفتے چھوٹے چھوٹے "رائٹ اپ" برلن سے آیا کرتے تھے۔ جو جرمنی کی اقتصادی، صنعتی اور اختراعی ترقیوں کی تفصیل پر مشتمل ہوتے تھے۔ مسٹر کپ ان مضامین کو "ورناکیولر اخبارات" یعنی گجراتی، مرہٹی اور اردو میں بطور مراسلات یا مقالات چھپوایا کرتے تھے۔ گجراتی اور مرہٹی کے مترجم تو انہیں حاصل تھے کوئی اردو مترجم نہیں تھا۔ ٹائمز آف انڈیا کے مسٹر امیر حسن نے مجھے مسٹر کپ سے متعارف کرایا۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا

"ان مضامین میں سے جو ہر ہفتے آپ کو ملا کریں گے۔ جو آپ کو پسند آجائے یا جسے آپ اردو دان پبلک کے لیے مناسب سمجھیں، کسی بھی اردو اخبار میں اشاعت کے لیے دیدیا کریں۔ ترجمے کا معاوضہ فی مضمون تیس روپے ہوگا۔"

میں نے کام شروع کر دیا۔ مسٹر جگتیانی ایک سندھی ہندو مسٹر کپ کے سیکریٹری تھے۔ وہ ہر ہفتے مجھے مضمون دے دیتے ان میں سے کوئی معلوماتی مضمون ترجمہ کرکے کچھ خلافت میں کچھ دوسرے اخباروں میں اپنے نام سے شایع کرا دیتا۔

ایک روز شوکت صاحب نے مجھے کچھ لکھوانے کے لیے بلایا۔ میں پنسل کاغذ لے کر سامنے بیٹھ گیا۔ ابھی انہوں نے مضمون بولنا شروع نہیں کیا تھا کہ زاہد صاحب تشریف لے آئے اور انہوں نے آتے ہی کہا

"سنا ہے آپ جرمن قونصل خانے کے مضمون ترجمہ کرکے شایع کرتے ہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ سوال کس طوفان کی تمہید ہے۔ شوکت صاحب نے بات ٹالنا چاہی مگر میں نے پنسل میز پر رکھ دی اور کہا

"اس مسئلہ کا فیصلہ ہو جانا چاہیے! زاہد صاحب آپ کو کیا اعتراض ہے؟"

انہوں نے فرمایا "ان مضامین کا جو معاوضہ ملتا ہے وہ خلافت فنڈ میں داخل ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مضامین خلافت میں نہیں شایع ہو سکتے۔ میں مان لوں گا۔ میرے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ خلافت ہی میں چھپیں۔ ہندوستان کے متعدد دوسرے اخبارات میں بھی بھیجتا ہوں اور یہ چھپتے ہیں۔ جنھیں نہیں بھیجتا، ان میں سے کئی معلوماتی ہونے کے باعث انہیں نقل بھی کرتے ہیں۔ آئندہ سے میں خلافت کو کوئی مضمون نہیں دوں گا۔ دوسرے اخبارات کو بھیجتا رہوں گا۔"

زاہد صاحب نے کہا "لیکن آپ خلافت کے پورے وقت کے ملازم ہیں، دوسرے اخبارات میں بھی نہیں بھیج سکتے۔"

میں نے کہا "اگر آپ کا یہ خیال ہے تو میں استعفا دینے کو تیار ہوں۔ اپنی ڈیوٹی ادا کرنے کے بعد جو کام چاہوں کروں، یہ میرا حق ہے۔"

شوکت صاحب خاموشی سے یہ باتیں سنتے رہے۔ پھر انہوں نے فرمایا

"زاہد تم چپ رہو۔ یہ بے چارہ اپنی ہمت سے بہت زیادہ کام کرتا ہے۔ اور ہم اسے تنخواہ کیا دیتے ہیں؟ صرف

سَو روپے۔ یہ مطالبہ اس سے ہم اس وقت بھی نہیں کرسکتے تھے جب اس کی محنت کے مطابق تنخواہ دے سکتے
پھر انہوں نے مضمون لکھنا شروع کردیا۔ میں لکھنے لگا۔

یہ تھے شوکت صاحب! جو اپنے محبوب اور چہیتے بیٹے کے مقابلے میں بھی ایک بالکل غیر اور سراسر غیر معر
حمایت اس شان سے کرتے تھے۔

جلا وطن خلیفۃ المسلمین سے مولانا شوکت علی کو بڑی گہری عقیدت تھی۔ اب وہ نیس (فرانس) میں غریب
بسر کررہے تھے۔ مصطفےٰ کمال کی حکومت نے انہیں بالکل تہی دست کردیا تھا۔

شوکت صاحب راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے زمانے میں ان سے مل چکے تھے۔ اور بہت متاثر تھے۔ سر اکبر ح
مخالفت کے باوجود انہوں نے نظام کو آمادہ کرلیا کہ اعظم جاہ کی شادی خلیفۃ المسلمین کی صاحبزادی شہزادی دُرِّ شہ
معظم جاہ کی ان کی بھانجی شہزادی نیلوفر سے کردیں۔ یہ شادی ہوئی اور بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔

شوکت صاحب نے یہ رشتہ محض جذبۂ اخلاص سے کرایا تھا۔ لیکن نظام ممنون تھے۔ اعظم جاہ اور معظم
صاحب کی پنشن مقرر کرنے کا نظام سے مطالبہ کیا۔ کاغذات سر اکبر حیدری کے سامنے پیش ہوئے۔ ان کے نو
کو فیصلہ کرنا تھا۔

اس اثنا میں مسلم یونیورسٹی کورٹ کا طوفانی اجلاس ہوا۔ وائس چانسلری کے ڈاکٹر سر ضیاء الدین امیدوار
صاحب سر ضیاء الدین اور ان کی ریاست کے سخت مخالف تھے۔ وہ کسی قیمت پر بھی ان کی تائید وحمایت نہیں ک
دہلی کے دورانِ قیام میں — سر سکندر والی مجلس کے بعد جس کا میں تذکرہ کرچکا ہوں — میں نے دیکھا ایک روز صبح
صاحب شوکت صاحب کی قیام گاہ پر پہنچے۔ میں نے اطلاع کی ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔ فرمایا۔ بلا لاؤ۔ وہ نا
تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی شریک کرلیا۔ ناشتے کے دوران میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی "کنویسنگ" شروع ک
صاحب سب کچھ سنتے رہے۔ پھر بے جھجک کہہ دیا

"نہیں بھائی یہ نہیں ہوسکتا میں اسماعیل خاں کو ووٹ دوں گا۔"

ڈاکٹر صاحب کی پشت پناہی حکومت ہند کررہی تھی۔ سر اکبر حیدری، حیدرآباد کے ممبرانِ کورٹ کو اپنے س
علی گڑھ ڈاکٹر صاحب کی تائید کرنے پہنچے۔ نواب رامپور بھی ڈاکٹر صاحب کے حامی تھے۔ شوکت صاحب کے
نازک موقعہ تھا۔ اگر اپنی رائے پر قائم رہتے ہیں تو حیدرآباد کی پنشن جاتی ہے۔ اور نواب رضا علی خاں سے تعلقا
ہوجاتے ہیں۔ لیکن اس امتحان سے وہ کامیابی سے گزر گئے۔ انہوں نے نہ صرف ڈاکٹر صاحب کی مخالفت کی
بھرے اجلاس میں سر اکبر حیدری اور نواب صاحب رامپور پر بھی سخت نکتہ چینی کی کہ یہ لوگ مسلمانوں کی آزاد تعلیم گا
عطایا اور امداد کی دھونس جما کر اس کے انتظامات میں ناروا قسم کی مداخلت کرتے ہیں۔ پھر اسی طرح کا پبلک بیان
اور سر اکبر حیدری کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ بمبئی واپس آکر نظام اور رامپور کو ایک طویل خط مجھے بول کر لکھایا۔ اس
سے زیادہ سخت الفاظ میں سر اکبر حیدری کی روش اور ڈاکٹر صاحب کی نااہلیت پر اظہار خیال کیا۔ کاش میں نے ا

ہوتی - بڑا دلچسپ اور تاریخی خط تھا۔

مہاراجگان کشمیر، پٹیالہ اور الور سے شوکت صاحب کے بڑے گہرے روابط تھے۔ مہاراجہ کشمیر نے کئی مرتبہ انھیں ت تحفے دیے۔ مہاراجہ پٹیالہ نے انہیں اپنا بھائی بنا لیا تھا۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا کی مخالفت سے بے پروا ہو کر ناہد اپنا پرائیویٹ سیکریٹری بنا لیا تھا۔ مہاراجہ الور کے دل میں جو محبت مولانا محمد علی کی تھی وہ اب شوکت صاحب کی طرف ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود جب الور میں مسلمانوں پر مظالم کا سلسلہ شروع ہوا۔ جب کشمیر میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات ہوا۔ جب پٹیالہ کی حکومت سے مسلمانوں کو شکایت پیدا ہوئی، میں نے بڑے آتشیں مقالات ان ریاستوں اور ان کے رداؤں کے خلاف بار بار اور تواتر و تسلسل کے ساتھ لکھے۔ مگر شوکت صاحب نے مجھ سے کبھی یہ بھی نہیں کہا کہ لب و م کر دو، —— وہ سب سے پہلے اپنی قوم کے دوست تھے۔ پھر کسی اور کے۔ قوم پر دوستی قربان کر سکتے تھے، دوست وم کا سودا نہیں کر سکتے تھے۔

مرکزی اسمبلی کے انتخاب کے وقت سر شفاعت احمد خاں ایک مرتبہ بمبئی آئے، اور شوکت صاحب سے استدعا کی وہ ے حق میں دست بردار ہو جائیں۔

شوکت صاحب نے ڈاکٹر شفاعت احمد کو ایک مرتبہ اپنی اُن آنکھوں سے جن کے بارے میں غالب نے کہا ہے ——
نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار !" انہیں دیکھا۔ پھر فرمایا

"بازی بازی باریش با باہم بازی ؟"

یہ بات انھوں نے کچھ ایسے لب و لہجہ میں کہی کہ سر شفاعت احمد خاں سٹ پٹا کر رہ گئے۔ بلکہ کھسیانے ہو گئے۔ پھر کچھ نہ کہہ سلام کیا اور رخصت!

آغا خاں کے مسلک میں اور شوکت صاحب کے مسلک میں کسی طرح ہم آہنگی نہ تھی۔ بلکہ کہنا چاہیے بعد المشرقین لیکن وہ شوکت صاحب کے خلوص کے دل سے معترف تھے۔ مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے آغا خاں جب قوم کے سامنے ل کے کر بھیک مانگنے نکلے تو شوکت صاحب نے اپنی اعلیٰ سرکاری ملازمت سے بے تنخواہ رخصت لے لی تھی۔ اور ان ساتھ سیکریٹری کی حیثیت سے سارے ہندوستان کا دورہ کیا تھا۔ نام آغا خاں کا تھا۔ کام شوکت صاحب کا۔ یہ الفاظ نہیں ہیں خود آغا خاں کے ہیں۔ انہوں نے اپنے "میمائرس" میں جو لندن سے شایع ہو چکے ہیں شوکت صاحب خلوص، جذبۂ کار، عزم و ثبات اور جوش و استقلال کو خراج تحسین پیش کرنے کے بعد تقریباً یہی الفاظ لکھے ہیں۔ ان الفاظ ے جہاں شوکت صاحب کی بے پناہ صلاحیت و استعداد کار کا اندازہ ہوتا ہے، وہاں آغا خاں کی شرافت کا بھی کہ ں نے شوکت صاحب کے کام کو اپنے کارناموں کے کھاتے میں نہیں ڈالا، یہ عالی ظرفی کی انتہا ہے۔

یہ کچھ معمول سا بن گیا تھا آغا خاں جب بمبئی آتے شوکت صاحب سے ملاقات ضرور کرتے۔ کبھی اپنی قیام گاہ پر کبھی وں کے کسی اجتماع میں، کبھی کبھی خلافت کی مالی امداد بھی کر دیا کرتے تھے۔ ملاقات کے وقت ایک دفعہ وہ بڑی سنجیدگی کے ہو جاتے تھے۔ یعنی ایک ہزار کا نوٹ شوکت صاحب کی لمبی چوڑی جیب میں چپکے سے پہنچا دیتے تھے۔

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ سے پہلے اور راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے کافی عرصے بعد لندن میں جوائنٹ
پارلیمنٹری کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں ہندو و مسلم مندوب مدعو کیے گئے۔ مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے حک
نے جن لوگوں کو مدعو کیا ان میں حسین شہید سہروردی بھی تھے۔

سہروردی صاحب ہمیشہ سے شوکت صاحب کے چہیتوں کی فہرست میں داخل تھے۔ نہرو رپورٹ کے سلسلہ
اور کانگرس کے مابین نہ صرف مکمل ترک تعلق ہو چکا تھا بلکہ سخت و شدید مخالفت بھی شروع ہو چکی تھی۔ دسمبر ۲۸
کا سالانہ جلسہ کلکتہ میں ہوا جس کے روح رواں سوباش چندر بوس تھے۔ صدر اجلاس پنڈت موتی لال نہرو منتخب
اس وقت تک مسلم لیگ بھی نہرو رپورٹ کی اگر حامی نہیں تو مخالف بھی نہیں تھی۔ البرٹ ہال میں اس
اجلاس ہو رہا تھا۔ صدارت کے لیے قرعۂ فال مہاراجہ محمود آباد کے نام پڑا تھا نیشنل کنونشن کا اجلاس ڈاک
کی صدارت میں ہو رہا تھا۔ اس کے کرتا دھرتا بھی بوس اور گپتا تھے۔ کنونشن کا مقصد نہرو رپورٹ کی توثیق
مہا سبھائی، لبرل، سارے ہندو نہرو رپورٹ کے موید تھے۔ نشنلسٹ مسلمانوں کی پوری جماعت جس میں خلیق ا
قدوائی، ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر سید محمود، عبدالمجید خواجہ، تصدق احمد خاں شروانی، ڈاکٹر کچلو، مولانا ظفر علی خ
عالم وغیرہ سب نہرو کے ہم نوا اور گاندھی کے رفیق اور کانگرس کے ساتھ تھے۔ اس موقع پر سہروردی صاحب
کا سالانہ اجلاس —— جس کے صدر منتخب مولانا محمد علی تھے —— کلکتہ میں منعقد کرنے کا بیڑا اٹھا
دن رات ایک کر کے ہالیڈے پارک میں —— جو بعد میں محمد علی پارک سے موسوم ہوا —— ایسے شاندا
کا اجلاس منعقد کیا کہ سارے مسلمان اسی میں سمٹ آئے۔ علی برادران کی شخصیت اور سہروردی کی ہمت نے
کے اثر و نفوذ کا طلسم باطل کر دیا۔ میں ندوۃ العلماء میں پڑھتا تھا۔ لیکن قومیات سے دلچسپی رکھتا تھا۔ اس قو
لیے اپنے دو منچلے دوستوں حبیب احمد عثمانی اور مطلوب الرحمن نگرامی کے ساتھ کلکتہ جا براجا تھا۔ یہ سار
چشم دید ہیں۔ داستان طویل ہے تفصیل کا موقع نہیں۔ مختصر یہ کہ اجلاس کامیاب ہوا۔ سارے ہندوستا
گئی اور مسلمانوں نے من حیث القوم نہرو رپورٹ کو مسترد کر دیا۔ مولانا ظفر علی خاں نے اسی زمانے میں اور اسی مو

کلکتہ کے افق میں کچھ ایسا ہوا غروب
ان دونوں بھائیوں کا ستارا کہ ہائے ہائے

لیکن صورت حال بالکل برعکس تھی۔ تنہا خلافت کمیٹی نے ہندو امپیریلزم، اور مسلم نیشنلزم کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ا
اور بالآخر ۲۹ء کے اجلاس لاہور میں کانگرس کو یہ رپورٹ "زائد المیعاد" قرار دے کر واپس لینی پڑی۔

سہروردی صاحب کے ان خدمات کا شوکت صاحب پر بہت گہرا اثر تھا۔ وہ لندن جانے کے لیے
خلافت ہاؤس میں ٹھہرے۔ خلافت کی مالی حالت بے حد سقیم تھی۔ اس معزز مہمان کو بھی تقریباً ہفتہ بھر دال دلیا

سامنے مہمان کے جو تھا میسر رکھ دیا

چلتے وقت سہروردی صاحب نے خلافت فنڈ کے لیے ایک نوٹ شوکت صاحب کو دیا۔ یاد نہیں

خلافت ہاؤس

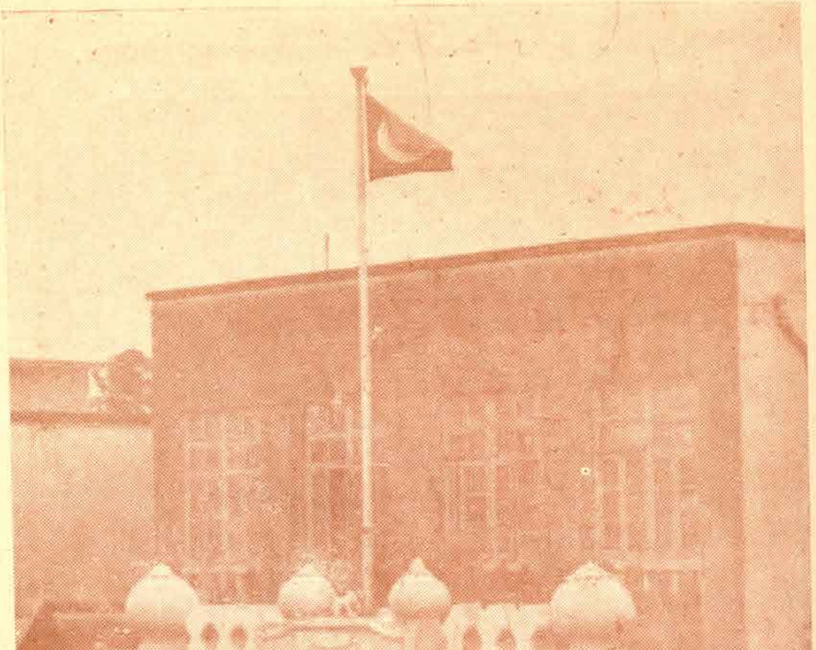

ہندوستان کی سیاسی جماعتوں میں مجلس خلافت پہلی جماعت تھی جس کیلئے یہ شاندار عمارت مولانا شوکت علی نے خریدی تھی ۔

باغی عدالت کے کمرے میں

تصویر پر مولانا شوکت علی نے دستخط اپنے قلم سے کیئے ہیں

وہ نوٹ لے کر بالاخانے کی کھڑکی میں جا کھڑے ہوئے۔ نیچے مولانا عرفان بیٹھے تھے۔ نوٹ لہراتے ہوئے انہوں نے فرمایا
"عرفان یہ دیکھیے!"
نوٹ کی ایک جھلک دکھائی اور ان کی طرف پھینک دیا۔ پھر بڑے محبت بھرے لہجہ میں کہا
"یہ سہروردی کا چندہ ہے۔"
انہوں سے قومی کام کے لیے جب کوئی مدد ملتی تھی خواہ وہ کتنی ہی حقیر ہو، وفور مسرت سے ان کے بندِ قبا ٹوٹنے لگتے تھے۔ یہی کیفیت اس موقع پر ہوئی۔

نہرو رپورٹ کا ذکر آگیا ہے تو مختصر سی داستان اس کی بھی سن لیجیے۔ لارڈ برکن ہیڈ نے —— جنہیں مولانا محمد علی "بروکن ہیڈ" کہا کرتے تھے —— طعنہ دیا کہ ہندوستانی ایک متفقہ دستور تو بنا نہیں سکتے آزادی کیا لیں گے؟
اس چیلنج کا جواب دینے کے لیے کانگرس نے نہرو کمیٹی کی تشکیل کی جس کے مسلمان ممبر شوکت صاحب کے اصرار سے شعیب قریشی رکھ گئے۔ شعیب قریشی ایک زمانے میں گاندھی جی کے اتنے چہیتے تھے کہ جب وہ جیل گئے تو اپنے اخبار "ینگ انڈیا" کی ایڈیٹری شعیب صاحب کو سونپ گئے۔ مگر اب ان سے خفا تھے۔ ان کا خیال تھا شعیب متعصب مسلمان ہیں۔ لیکن مولانا شوکت کے خلاف بھی نہیں جا سکتے تھے۔ شعیب کو رکھنا پڑا۔ شعیب صاحب کے موتی لال اور جواہر لال سے بڑے گہرے اور عزیزانہ و برادرانہ تعلقات تھے۔ لیکن ان کا نیشنلزم مسلم مفاد سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھا۔ انہوں نے چاہا کہ نہرو رپورٹ مسلمانوں کے کم از کم وہ مطالبات منظور کرلے جو گزشتہ سال کے صدر کانگرس سری نواس آئنگر منظور کر چکے تھے۔ یعنی سندھ کی بمبئی سے علیحدگی اور جداگانہ صوبے کی حیثیت سے قیام، سرحد کو چیف کمشنر کا صوبہ رہنے دینے کے بجائے گورنر کا صوبہ بنایا جائے۔ اور وہاں مجلس آئین ساز قائم کی جائے۔ مرکزی مجلس آئین ساز میں مسلمانوں کی نشستیں ۳۳ فی صدی ہوں۔ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی عددی اکثریت کا تحفظ اس طرح کیا جائے کہ تناسب آبادی کے اعتبار سے ان کی نشستیں محفوظ کر دی جائیں۔ پھر جداگانہ کے بجائے مخلوط انتخاب رائج کر دیا جائے۔ مگر موتی لال نے یہ ساری تجویزیں مسترد کر دیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ سندھ خود کفیل صوبہ نہیں بن سکتا۔ سرحد میں بھی صوبائی خود مختاری چلانے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی۔ مسلمان ہندوستان میں ۲۵ فی صد ہیں انہیں ۳۳ فی صد نشستیں نہیں دی جا سکتیں۔ پنجاب و بنگال میں مخلوط انتخاب ہوگا۔ لیکن مسلمانوں کی نشستیں محفوظ نہیں کی جا سکتیں۔ کیونکہ یہ بات نیشنلزم کے خلاف ہے۔ شعیب صاحب نے احتجاج اور اختلاف کیا۔ اور کہا پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت اتنی کم ہے اور وہ سیاسی اعتبار سے اتنے پسماندہ ہیں، اور وہاں کی تمام سرکاری اسامیوں، صنعتوں اور کاروبار پر ہندو اور سکھ اس طرح قابض ہیں کہ بڑی آسانی سے چھوٹی سی مسلم اکثریت کو مخلوط انتخاب کی صورت میں بے دریغ روپیہ صرف کر کے اقلیت میں تبدیل کر دیں گے۔ موتی لال نے ایک نہ سنی اور جب دیکھا کہ شعیب کسی طرح رام نہیں ہوتے تو اپنے اختیارات خصوصی سے کام لے کر خلیق الزمان کو نہرو کمیٹی کا ممبر بنا لیا۔ رپورٹ پر شعیب نے احتجاجی نوٹ لکھا۔ موتی لال نے اسے بھی شائع نہیں کیا۔ خلیق صاحب نے تائید کے دستخط ثبت کر دیے۔

اگست ۱۹۲۸ء میں لکھنؤ کی قیصر باغ بارہ دری میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا انعقاد، نہرو رپورٹ پر غور کرنے کے لیے

منعقد ہوا۔ جس میں تمام سیاسی پارٹیاں مدعو تھیں۔ مولانا محمد علی علاج کے سلسلے میں یورپ گئے ہوئے تھے۔ شوکت صاحب اجلاس ہوئے۔ لوگوں کا خیال تھا شوکت صاحب محمد علی کے بغیر کچھ نہیں ہیں۔ نہ ان کے پاس دماغ ہے نہ زبان، نہ قلم۔ ہمارے پاس ہیں وہ رنجوری تن کا علاج کرنے جرمنی گیا ہوا ہے۔ لہذا بالا مار لیتے ہیں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ ادھر مولانا آ پنجاب کے مندوبین ڈاکٹر عالم وغیرہ کو توڑ لیا۔ یہ سب ہی نہرو رپورٹ کے ایک دم ان میں حامی بن گئے۔ پنجاب کی کے بعد شوکت صاحب کی پوزیشن بڑی نازک ہوگئی۔ لیکن انہوں نے سوچا اگر وہ محمد علی کا انتظار کرتے ہیں اور پنجاب کی حقیر مسلم اقلیت کو ہندو سیاست کا محکوم اور دست نگر کر دیتے ہیں تو بہت بڑے قومی جرم کے مرتکب ہوں گے

آل پارٹیز کانفرنس کا ایوان اطراف و اکناف ہند کی سیاسی پارٹیوں کے مندوبین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کوندوۃ العلماء کے طلبا رضاکار کی صورت میں ہمیشہ بڑی آسانی سے دستیاب ہو جاتے تھے۔ اس مرتبہ بھی ندوی طلبہ جماعت رضاکار کی حیثیت سے مصروف خدمت تھی۔ میری ڈیوٹی ڈائس پر زعمائے کرام کو پانی پلانے کی تھی۔

کرسی صدارت پر ڈاکٹر انصاری متمکن تھے۔ ایک طرف مہاراجہ محمود آباد دوسری جانب پنڈت مالوی کرسیوں پر، موتی لال، جواہر لال، بپن چندر پال، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، سوباش چندر بوس سین گپتا، سر تیج بہادر سپرو، مسز اینی بسنت، مسز سروجنی نائیڈو، ٹھاکر نواب علی، مسٹر محمد علی کریم چھاگلا ——— میں حکومت ہند کے وزیر تعلیم بنے ہیں ——— اور دوسرے اکابر موجود تھے۔

سب سے پہلے پنڈت نہرو کے "شکریہ" کی تجویز پیش ہوئی۔ یہ رسمی سی تجویز تھی اس کے بعد اصل رپورٹ پر گفتگو ہونی تھی۔

نہرو رپورٹ پر بحث و گفتگو کے دوران میں ڈاکٹر عالم نے مندوبین پنجاب کی طرف سے غیر مشروط مخلوط اور نہرو رپورٹ کو منظور کر لینے کا اعلان کیا۔ اب خلافت کمیٹی کی طرف سے مولانا شوکت علی کی باری آئی۔ نشست ہے۔ ایم سین گپتا اور سوباش چندر بوس کے بیچ میں تھی۔ مولانا کیا کرنے والے ہیں ان دونوں نے تھا۔ یہ منظر بھلائے نہیں بھولتا کہ بوس اور گپتا ہاتھ جوڑ جوڑ کر مولانا سے مخالفت نہ کرنے کی استدعا کر رہے کہہ رہے تھے آپ نے مخالفت کی تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ مولانا نے بپھرے ہوئے لہجے میں جواب دیا

"میں مسلمانوں کو بیچ نہیں سکتا"

مولانا، ہمالہ کی عظمت، اور ہمالہ کا جسم لیے ہوئے اسٹیج پر تشریف لائے۔ وہ آئے تو حاضرین نے دیر تک چیرز سے ان کا خیر مقدم کیا۔ سب کو یقین تھا کہ وہ تائید کرنے آئے ہیں۔ لیکن انہوں نے نہ صرف مخالفت کی بلکہ جنگ کر دیا کہ مسلمان کبھی اور کسی حالت میں اسے قبول نہیں کر سکتے۔ جب تک سندھ اور سرحد کو مستقل صوبہ نہ بنا اور پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی عددی اکثریت کا تحفظ نہ کیا جائے۔

ڈاکٹر عالم کھڑے ہوئے اور انہوں نے مولانا کا مذاق اڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا

"مولانا پنجاب کے نمایندے رپورٹ منظور کر چکے ہیں"

مولانا نے انہیں ایسا ڈانٹا کہ ان کی سٹی گم ہو گئی۔ انہوں نے کہا

"تم پنجاب نہیں ہو، تم مسلمانان پنجاب کے نمایندے نہیں ہو۔ تم پنجاب کے مسلمانوں کو فروخت کرنے کا حق نہیں رکھتے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو تو چلو میرے ساتھ پنجاب کا دورہ کرو۔ پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا پنجاب کس کے ساتھ ہے؟

ڈاکٹر عالم بتاشے کی طرح بیٹھ گئے۔

اس کے بعد مولانا نے خلافت میں ایک سلسلہ مضامین لکھا جس کا آغاز اس شعر سے کیا

کس کس طرح ستاتے ہیں یہ بت ہمیں نظام
ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو

ر نہرو رپورٹ کی اور اس کے حامیوں کی دھجیاں بکھیر دیں۔

مولانا کے ان مضامین کا جواب مولانا ابوالکلام آزاد نے 'زمیندار' کے کئی نمبروں میں دیا۔ اور خطابت و انشاء، طنز و ن، فصاحت و بلاغت، اور تشبیہات و استعارات کی پوری ہنرمندی کے ساتھ دیا۔ ڈاکٹر انصاری جو ہندوستان کے ن سرجن تھے، انہوں نے بھی قلم اٹھایا اور اس سے نشتر کا کام لیا۔ تصدق احمد خاں شیروانی، خلیق الزمان، ڈاکٹر محمود نے ی سنانیں اور زبان کی تلواریں سنبھالیں۔ شوکت صاحب کے جو ساتھی اور دوست تھے، مولانا محمد علی کے انتظار رہیں وہ خاموش تھے۔ جو مخالف اور معاند تھے وہ مدت کے اس ناقابل تسخیر قلعہ پر تسلسل اور تواتر کے ساتھ گولہ باری کر رہے ۔ لیکن کوئی بھی اس قلعہ کو سر نہ کر سکا۔

پھر شوکت صاحب نے ملک گیر دورہ کیا اور رائے عامہ کو بڑی حد تک اپنا موافق بنا لیا۔ اور دوست دشمن سب نے راف کر لیا کہ وہ حقیقی معنیٰ میں Big Brother ہیں۔ محمد علی کے بغیر بھی وہ بہت کچھ ہیں۔ ان کی قوت تنظیم اور ان کا جذبۂ وص، ابوالکلام کی خطابت، ظفر علی خاں کی شاعری، ڈاکٹر انصاری کی قلم کاری —— اور محمد علی کی کمی پر جو بہت بری طرح سوس ہو رہی تھی غالب آ گیا۔

لکھنؤ سے مولانا شوکت علی جب بمبئی پہنچے تو سر کاؤس جی جہانگیر ہال میں ایک جلسہ نہرو رپورٹ کی حمایت میں منعقد ہوا۔ نے یہاں بھی زبردست مخالفت کی۔ اس جلسہ میں مسلمان خال خال اور ہندو زیادہ تھے۔ ایک ہندو نے جوش سے بے قابو ولانا کے منہ پر تھوک دیا۔ مولانا نے اس سے کوئی انتقام نہیں لیا۔ لیکن بمبئی کے مسلمانوں میں آگ لگ گئی۔ وہ اپنے اس زعیم کی جو ہر آڑے وقت میں ان کے کام آتا رہا تھا توہین نہیں برداشت کر سکتے تھے۔ ہر ہر محلے میں جلسے ہوئے اور نہرو بمبئی کے مسلمانوں نے یکسر مسترد کر دی۔ یہی دوسرے شہروں میں بھی ہوا۔

گاندھی جی فخریہ کئی مرتبہ 'ینگ انڈیا' میں لکھ چکے تھے، اور پبلک جلسوں میں کہہ چکے تھے مولانا شوکت علی کی لمبی چوڑی جیب لکن ہے۔

ایک دفعہ مولانا بمبئی سے لکھنؤ جا رہے تھے۔ اسی گاڑی میں گاندھی جی بھی بھوپال جا رہے تھے۔ ٹرین ایک تھی کمپارٹمنٹ لگ تھے۔ گاندھی جی کو جب معلوم ہوا کہ شوکت صاحب بھی اسی ٹرین سے جا رہے ہیں تو ایک اسٹیشن پر وہ شوکت صاحب کے

کیپ رٹمنٹ میں آئے۔ اس طرح آئے جیسے کوئی مخالفت ہی نہیں تھی۔ باتیں کرتے کرتے انہوں نے مولانا شوکت علی
ہاتھ ڈالا۔ کچھ روپے نکلے، وہ انہوں نے نکال لیے اور کہا
"آپ کی جیب میں میرے سوا کچھ اور نہ ہونا چاہیے۔ آخر آپ نے کیوں مجھے اپنی جیب سے نکال پھینکا ہے
مولانا نے جواب دیا" میں نے نہیں نکالا، آپ خود نکل بھاگے۔"
گاندھی جی بڑی دیر تک شوکت صاحب کو رام کرنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن وہ مرد زیرک اس دا

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

خلافت اردو کا پہلا روزنامہ تھا جس نے ۱۹۴۵ء میں خاص طور پر ایسے معلوماتی مقالات کا سلسلہ معقول
کر شروع کیا جس کا رواج اردو صحافت میں بالکل نہیں تھا۔
بہار کے ایک سابق خلافتی کارکن عبدالباری ساقی بمبئی آئے ہوئے تھے۔ اور تلاش معاش میں سرگرداں تھے
کے زمانے میں خلافت سے کٹ کر پروفیسر عبدالباری کے زیر اثر کانگرس میں شریک ہو گئے تھے۔ کلکتہ جاتے ہو
محمد علی نے پٹنہ کے ایک خلافتی اجتماع میں تقریر کی تو پروفیسر باری اور عبدالباری ساقی نے علی برادران کی سیاست
کی روش پر کچھ لایعنی اعتراضات کیے جس پر مولانا محمد علی نے کہا " یہاں یہ تماشہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ" باری باری "
جاتا ہے۔ وہ قہقہہ پڑا کہ محفل کشت زار زعفران بن گئی۔ بہرحال عبدالباری ساقی کو بمبئی میں خلافت ہاؤس کے سوا
ملی۔ میں نے ان سے سیاسی مضامین لکھوائے اور معاوضہ دیا۔ یہ سب باتیں مولانا شوکت علی کے علم میں تھیں لیکن
آشفتہ' روزگار باغی، اور خود غرض قومی کارکن کی مدد کیے جانے پر بعض لوگوں کے اعتراض کے باوجود کوئی دخل نہ
دیا۔ بعد میں ساقی صاحب پھر بھٹک گئے۔ جس پر مجھے ایک مفصل مقالہ لکھنا پڑا جس کا عنوان تھا " ساقی نامہ"۔
شوکت صاحب نماز پابندی سے پڑھتے تھے۔ خلافت ہاؤس میں مغرب کی نماز با جماعت کا خاص اہتما
جماعت میں شریک ہوتے تھے۔ غیر معمولی موٹاپے کی وجہ سے رکوع و سجود ممکن نہ تھا۔ بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ رکوع و سجو
حرکت سے کرتے تھے۔ جمعہ کی نماز بالالتزام بائیکلہ کی مسجد میں پڑھتے تھے۔ ایک مرتبہ شدید بارش ہو رہی تھی۔ کار مو
اس میں کوئی خرابی تھی۔ موسلا دھار بارش میں برساتی پہن کر خلافت ہاؤس سے بائیکلہ مسجد تک پا پیادہ تشریف
نماز کے لیے وہ مصلے کے بھی قائل نہ تھے۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے پڑھ لیتے تھے۔ کار میں کہیں جا رہے ہوتے ا
نماز قضا ہوتی جا رہی ہے۔ وہیں ڈرائیور کے پاس —— وہ ہمیشہ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے ——
نیت باندھی اور نماز شروع کر دی۔ جب ذہنی طور پر بہت پریشان ہوتے تو کبھی کبھی نماز دو ایک دن تک
اور صاف کہہ دیتے آج کل میرا نماز میں بھی جی نہیں لگتا ہے۔
دو دلوں کے جوڑنے میں شوکت صاحب بڑے شوق سے حصہ لیتے تھے۔ شہزادی درِ شہوار اور نیلوفر
نے اعظم جاہ اور معظم جاہ سے کرائی تھی۔ ایک دوسری ترک شہزادی سلمٰی کی شادی بھی انہوں نے راجہ ساجد

گوارہ سے کرائی تھی۔ نواب پٹوڈی جب نواب صاحب بھوپال کی صاحبزادی پر —— جواب اپنے باپ کی جانشین ہیں —— فریفتہ ہوئے تو انہوں نے کوشش کی نواب صاحب بھوپال انہیں داماد بنالیں۔ مگر نواب صاحب کسی طرح اس پر تیار نہیں تھے۔ نواب بھوپال کا جتنا انکار بڑھ رہا تھا اتنا ہی نواب صاحب پٹوڈی کے عشق میں اضافہ ہو رہا تھا۔ گتھی کسی طرح سلجھتی نظر نہیں آتی تھی۔ آخر ان کی نظر شوکت صاحب پر گئی کہ اسی در سے گوہر مقصود حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ بمبئی آئے اور تاج محل ہوٹل میں ٹھہرے۔ حالت یہ تھی کہ رات کو چلے آرہے ہیں منہ اندھیرے۔

علی الصباح چو مردم بکار و بار روند
بلاکشانِ محبت بہ کوئے یار روند

فجر کے وقت خلافت ہاؤس میں موجود، شوکت صاحب کو ترس آگیا وہ بیچ میں پڑے۔ نواب صاحب بھوپال ان کا اپنے بزرگوں کی طرح ادب کرتے تھے۔ آخر انہیں شوکت صاحب کی سفارش مان لینی پڑی۔ شادی ہو گئی —— حوریاں رقص کناں ساغرِ مستانہ زدند۔

مولانا شوکت علی بوڑھے تھے۔ ذیابیطس کے مریض تھے۔ ضرورت سے زیادہ موٹے تھے۔ لیکن تھکنا نہیں جانتے تھے۔ دن ہو یا رات۔ دوپہر ہو شام۔ ریل ہو یا لاری۔ کار ہو یا تانگہ، مسہری ہو یا چٹائی، قورما اور شیرمال ہو، یا باسی دال اور سوکھی روٹی، جیب نوٹوں سے بھری ہو یا ایک جھنجی کوڑی بھی نہ ہو، وہ ہر حال میں مگن رہتے تھے۔ ہمہ وقت مصروف عمل، سراپا جدوجہد، تمام تر جوش کردار، اپنے کارکنوں سے بھی یہی توقع رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ دورے پر گئے۔ وہاں سے ایک خط ایڈیٹر خلافت کو لکھا۔ صرف ایک سطر تھی اور تین لفظ۔

"کام، کام، کام۔"

ایک مرتبہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے علی برادران کو دریاباد آکر آم کھانے کی دعوت دی۔ دعوت قبول کر لی گئی۔ عین وقت پر کسی وجہ سے مولانا محمد علی نہ جا سکے۔ لیکن شوکت صاحب پہنچے اور آم بھی کھائے۔ دریاباد اور اودھ کے دوسرے شہروں سے چندہ بھی وصول کیا۔ اور تنظیم خلافت پر بھی توجہ کی۔ واپسی پر ایک دلچسپ مضمون خلافت میں لکھا۔ جس کا عنوان تھا

"آم، کام، دام۔"

مسلمانوں کی غلامی اور بے بسی شوکت صاحب کے دل پر داغ تھی۔ اور یہ داغ کرمک شب تاب کی طرح چمکتا رہتا تھا۔ ایک آزاد ملک —— افغانستان —— کا فرماں روا امان اللہ خاں ہندوستان کے دورے پر آیا۔ بمبئی بھی پہنچا۔ مسلمانانِ بمبئی نے عظیم الشان استقبال کیا۔ شوکت صاحب نے مسلمانانِ شہر کی طرف سے سپاس نامہ پیش کیا۔ جب وہ اس جملے پر پہنچے:

"ما مسلمانانِ ہند غلام ہستیم، بجز خدائے تعالیٰ ہیچ وسیلہ نداریم۔"

تو ان کی آواز بھرا گئی۔ امان اللہ خاں اتنے متاثر ہوئے کہ فوراً اٹھ کر شوکت صاحب کے رخسار پر بوسہ دیا اور کہا

"لا تقنطوا من رحمۃ اللہ۔"

دونوں نے ایک دوسرے کو سمجھ لیا تھا۔

پھر بچہ سقہ کی بغاوت کے بعد جب امان اللہ خاں تختِ خلافت سے دست بردار ہوکر وطن سے رخصت ہو
جنرل نادر خاں ــــــ موجودہ شاہِ افغانستان کے والد ــــــ بچہ سقہ کو شکست دینے کے لیے جرمنی سے
سفیر تھے، ہندوستان آئے تو مولانا شوکت علی نے ان کی ہر طرح سے مدد کی۔ انہیں خلافت ہاؤس میں مدعو کیا اور ان
دل فرشِ راہ کر دیے جس کی یاد بادشاہ ہونے کے بعد بھی ممنونیت کے ساتھ نادر شاہ کے دل میں قائم رہی۔

شوکت صاحب کی ایک عجیب اور بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ بڑے سے بڑے دشمن کو بھی اگر سر ندامت
آئے تو معاف کر دیتے تھے۔

روزنامہ ہلال کے ایڈیٹر حافظ علی بہادر خاں بڑی خوبیوں اور صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ بے انتہا قابل، اردو
لکھنے اور بولنے پر یکساں قدرت، کئی مرتبہ خلافت اور کانگرس کی تحریک میں جیل بھی گئے۔ شوکت صاحب نے انہیں
رکھا۔ لیکن بعد کو بعض سنگین الزامات کے ماتحت انہیں الگ کرنا پڑا۔ انہوں نے اپنا اخبار نکال لیا اور زور شور سے شوکت
کی اور مجلس خلافت کی مخالفت شروع کر دی۔ یہ مخالفت گھٹیا قسم کی تھی۔ اصولی بالکل نہیں تھی۔ سراسر ذاتی تھی۔ رکیک
حملے ہر روز کیا کرتے تھے۔ میں بھی اینٹ کا جواب پتھر سے خلافت میں دیتا تھا۔ لیکن شوکت صاحب نے کبھی جواب
وہ اس جنگ میں حصہ لینا اپنی شان سے فروتر سمجھتے تھے۔

حافظ صاحب نے اخبار کو جس ڈھنگ سے چلایا، وہ خود ان کی علمیت اور قابلیت کے شایانِ شان نہ تھا۔
خبریں شایع کرتے تھے جن کی سرخی پڑھ کر لوگ اخبار پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ لیکن وہ خبریں صرف ذہن و دماغ کی اختر
تھیں۔ حقیقت اور واقعہ سے انہیں دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا تھا۔

حافظ صاحب کی آمدنی اخبار سے بہت کافی تھی۔ لیکن خرچ اس سے کہیں زیادہ تھا۔ یہ خرچ پورا کر
وہ طرح طرح کی حرکتیں کیا کرتے تھے۔ چندو لال شاہ نے ایک فلم بنائی "ستمگر"۔ ہیرو کا نام تھا "جبار"۔
نے مورچہ قائم کر دیا کہ مسلمانو دوڑو۔ چندو لال نے خدا کی توہین کی ہے۔ جبار خدا کا نام ہے، اور اس فلم میں
ہے۔ ایک ہنگامۂ رستخیز برپا ہو گیا۔ یہ طوفان اس وقت تھا جب چندو لال کی جیب ہلکی اور حافظ صاحب کی جیب

جدّن بائی نے اپنی پہلی فلم "تلاشِ حق" بنائی۔ 'ہلال' کو اشتہار نہیں دیا۔ حالانکہ حافظ صاحب کو ہر روز ایک
کی توقع تھی۔ مایوسی کے عالم میں انہوں نے فلم پر ریویو کرتے ہوئے لکھا۔ جدّن بائی جب گاتی ہیں تو ان کے حلق
نظر آتا ہے جس سے طبیعت میں تنغص پیدا ہوتا ہے۔ پھر کچھ مذہبی ــــــ بے بنیاد ــــــ اعتراضات
کی راتوں کی نیند اڑ گئی۔ یہ محاذ اس وقت سر ہوا جب 'ہلال' کے لیے ضمنی بجٹ" انہوں نے منظور کر لیا۔

عبدالرحمٰن کابلی نے ایک فلم "امیر زادی" بنائی۔ حافظ نے پہلے صفحے پر جلی سرخیوں کے ساتھ بھرپور حملہ
"امیر" حضرت علی کو کہتے ہیں۔ امیر زادی کا مطلب ہوا حضرت علی کی صاحبزادی۔ مسلمانوں جہاد کے لیے تیار
صاحب کابلی ہونے کے باوجود ایسے سہمے کہ حواس باختہ ہو گئے۔ جان اسی وقت چھٹی جب نذرانہ پیش کر دیا۔

ایسٹ انڈیا فلم کمپنی نے ایک فلم "درۂ خیبر" بنائی۔ اس کے ڈائریکٹر مشہور اور مرحوم کیریکٹر ایکٹر گل حمید تھے۔ حافظ صاحب نے پٹھانوں کو ——— جن کی تعداد بمبئی میں بہت زیادہ تھی ——— اکسایا کہ لو درۂ خیبر بھی ہاتھ سے گیا۔ یہ فلم گلوب سینما میں چل رہی تھی۔ بارہ بجے رات کو خلافت ہاؤس میں فون آیا کئی ہزار پٹھانوں نے سینما کو گھیر لیا ہے اور آگ لگانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ پولیس بھی بھاری تعداد میں آگئی ہے۔ گولی چل جانے کا اندیشہ ہے۔ میں نے فوراً ڈرائیور کو جگایا اور کار سے کر موقعہ واردات پر پہنچا۔ اس سے قبل یہ فلم میں دیکھ چکا تھا۔ اس میں قطعاً کوئی قابلِ اعتراض بات نہ تھی۔ میں نے ہجوم کے سامنے ایک تقریر کی اور کہا اس فلم میں کوئی ایسی بات نہیں جو قابلِ اعتراض ہو۔ چند آدمی جن پر آپ حضرات کو اعتماد ہو میرے ساتھ فلم دیکھ لیں۔ انہوں نے اگر کوئی بات قابلِ اعتراض بتائی تو فوراً وہ کاٹ دی جائے گی۔"

بپھرے ہوئے مجمع کی سمجھ میں بات آگئی۔ مجمع کے چند لیڈر فلم دیکھنے پر آمادہ ہو گئے۔ فلم دیکھ کر خوش خوش واپس آئے۔ اور سب کو مطمئن کر دیا۔ پٹھان اتنے مشتعل تھے کہ جب تک یہ لوگ فلم دیکھ کر واپس نہیں آگئے۔ وہ اپنی جگہ چٹان کی طرح کھڑے رہے۔

بمبئی کے ایک بگڑے ہوئے رئیس کریمی پریس کے مالک تھے۔ یہ پریس کبھی زمانے میں بمبئی کا نولکشور پریس تھا۔ بہت اچھی اور بہت زیادہ تعداد میں مذہبی اور اسلامی کتابیں اس نے چھاپی تھیں۔ کئی قسم کے قرآن بھی چھاپے تھے۔ نئے وارث نے اس کی ساری آمدنی ریس پر خرچ کرنا شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پریس کی آمدنی گھٹتے گھٹتے بکرے کی ماں سے جو نئے کم آپ ہو کر رہ گئی۔

کریمی پریس کا قاعدہ یہ تھا کہ دورانِ طباعت میں قرآن کریم کے جو فرمے خراب ہو جاتے تھے۔ وہ پتھر میں باندھ کر غرقِ سمندر کر دیئے جاتے تھے تاکہ بے حرمتی نہ ہو۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ نہ جانے کس وجہ سے وہ کنارے پر آ لگے۔ نہ جانے کس طرح یہ خبر حافظ صاحب کو پہنچی انہوں نے پہلے صفحے پر جلی قلم سے "قرآن کی توہین"، "مسلمانوں کی غیرتِ دینی اور حمیتِ مذہبی کا امتحان" کے عنوان سے ایک خبر چھاپی اور تفصیل کل کے لیے کریمی پریس کا نام لیے بغیر اٹھا رکھی۔

کریمی پریس کے مالک کو بھی یہ واقعہ معلوم ہوا۔ دوسرے دن 'ہلال' میں یہ چمکتی ہوئی تلوار دیکھی تو حواس باختہ ہو گئے۔ ابھی حواس درست نہیں ہوئے تھے کہ ان سے دو ہزار کا مطالبہ ہوا ورنہ "تفصیل" شایع کرنے کی دھمکی۔ بیچارے روتے ہوئے خلافت ہاؤس آئے۔ خلافت والوں سے کریمی پریس والوں کے دیرینہ تعلقات رہ چکے تھے۔ مولانا عرفان نے اطمینان دلایا اور تجویز پیش کی کہ انڈیا کافی ہاؤس میں حافظ صاحب کو بلاؤ اور نشان زدہ نوٹ دے دو۔ سادہ لباس میں پولیس موجود ہوگی فوراً دھر لیے جائیں گے۔ بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ کہیں سے دو ہزار قرض لیے۔ اور اطلاع دے دی کہ کل انڈیا کافی ہاؤس میں تشریف لائیے اور روپے لے لیجیے۔ مگر خدا کے لیے تفصیل نہ شایع کیجیے۔ دوسرے روز کا اخبار اس ذکر سے خالی تھا۔ وقت مقررہ پر حافظ صاحب انڈیا کافی ہاؤس پہنچ گئے۔ ادھر انہوں نے نوٹ جیب میں رکھے، ادھر دھر لیے گئے۔ اب تو سٹی گم ہوگئی۔ لینے کے دینے پڑ گئے۔ ان کی سزا یابی استحصال بالجبر کے سلسلے میں یقینی تھی۔ نہ جانے کس کس کی سفارش سے رہا ہوئے۔ لیکن مقدمہ تیار تھا۔ آخر ایک روز رات کو دس بجے حافظ صاحب خلافت ہاؤس

آئے اور شوکت صاحب کے قدموں پر گر پڑے۔ شوکت صاحب ان کی تمام گستاخیاں اور بدزبانیاں بھول گئے۔ انہوں
مولانا عرفان کو فوراً طلب کیا اور ان سے کہہ کر کرمی پریس والوں کو آمادہ کر دیا کہ مقدمہ نہ کریں۔ لیکن عرفان صاحب
یہ رکھی کہ تین روز تک مسلسل پہلے صفحے پر جلی قلم سے حافظ صاحب اپنی غلط بیانی کا اعتراف کرتے ہوئے معافی مانگ
حافظ صاحب کو یہ شرط ماننی پڑی۔ معاملہ ختم ہو گیا۔

دل فتح کرنے میں شوکت صاحب کو کمال حاصل تھا۔

مولانا عبدالرزاق خاں ملیح آبادی ندوی، خدا ان کی مغفرت فرمائے، شوکت صاحب اور خلافت کمیٹی کے شد
تھے۔ ہر روز اخبار میں نہایت درشت اور غیر مہذب انداز میں کچھ نہ کچھ لکھا کرتے تھے۔ میں بھی خلافت میں ترکی بہ ترکی
دیا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ شوکت صاحب کلکتہ گئے۔ اور سیدھے ہند کے دفتر میں پہنچے۔ انہیں دیکھ کر مولانا ملیح آبادی ہکا
گئے۔ شوکت صاحب نے ان سے معانقہ کیا۔ گلے سے لگایا اور ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ فرمایا

"مجھے تم پر ترس آتا ہے۔ تم اپنا کاغذ ضایع کرتے ہو، قلم گھستے ہو۔ وقت صرف کرتے ہو، انرجی برباد
ہو۔ کیوں؟ صرف مجھے برا بھلا کہنے کے لیے۔ ان تحریروں کی وجہ سے بہت سی کام کی تحریریں اشاعت سے محروم ر
ہیں۔ لو میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ ایک گھنٹہ بیٹھوں گا۔ جتنی گالیاں چاہو دے لو۔ جب کلکتہ آؤں گا۔ گ
گھنٹہ دو گھنٹے کے لیے ضرور تمہارے پاس آجایا کروں گا۔"

مولانا ملیح آبادی بڑے جذباتی اور خالص پٹھان آدمی تھے۔ مولانا شوکت علی کو اتنی سخت مخالفت کے باوجود ا
دیکھ وہ ویسے ہی ساری مخالفت بھول گئے تھے۔ یہ باتیں سن کر عرق انفعال میں غرق ہو گئے۔
پیچھے دو ٹوٹے ہوئے دل جڑ گئے۔ دوسرے دن ملیح آبادی صاحب نے کئی کالم کا مضمون مولانا شوکت علی کی
توصیف میں پورے خلوص اور جوش محبت کے ساتھ لکھا۔ ساری لڑائی ختم ہو گئی۔

ایک طرف تو شوکت صاحب کی یہ حالت تھی۔ دوسری طرف اگر کوئی اپنی دولت و ثروت یا شخصیت کی و
جتاتا تھا تو شوکت صاحب قضائے مبرم بن جایا کرتے تھے۔

بمبئی میں وقف ایکٹ نافذ ہوا۔ جس کی رو سے متولیانِ اوقاف کے لیے واجب تھا کہ ہر سال آڈٹ شدہ
حکومت کے سامنے پیش کریں۔ ملا طاہر سیف الدین بوہرہ فرقہ کے پیشوا نے اپنے آپ کو اس دلیل سے مستثنیٰ
کی کوشش کی امام غیر مسئول ہوتا ہے، اور میرے فرقے کے لوگ مجھے امام مانتے ہیں۔ جب میں اپنے فرقہ کے
جواب دہ نہیں ہوں تو حکومت کے سامنے کیونکر جواب دہ ہو سکتا ہوں؟

مولانا شوکت علی کے اگرچہ ملا صاحب سے کوئی خاص تعلقات نہیں تھے۔ نہ انہوں نے کبھی شوکت صاحب
خلافت کی کوئی خاص مدد کی تھی۔ لیکن ملا صاحب کے اس اعتراض میں شوکت صاحب کو وزن نظر آیا۔ انہوں نے
ایک نوٹ لکھا کہ جب حکومت عدم مداخلت فی الدین کی پالیسی پر عامل ہے اور بوہرے اپنے امام کو غیر مسئول

ضیغم اسلام مولانا شوکت علی

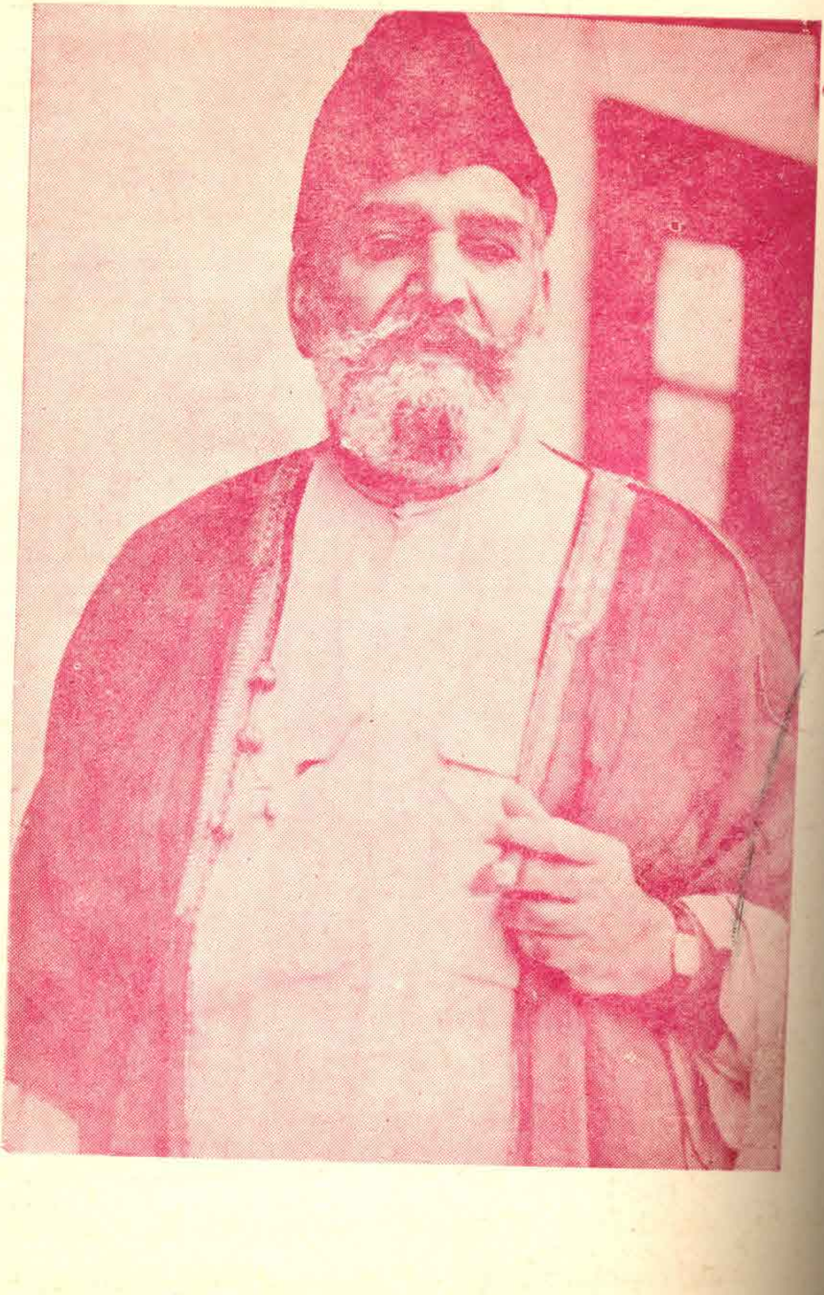

جوہر ... علی برادران

ILAF T DAILY.
1706

Registered No. B:—1644.
SUNDAY EDITION.
سنڈے اڈیشن
قیمت (ایک آنہ)

خلافت

اتحاد اسلامی اور سیاست ہند کا حقیقی ترجمان

جلد ۱۷ — بمبئی یکشنبہ 15 جنوری سن 1939 ع

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے!

تاریخ وفات: ۲۸ نومبر ۱۹۳۸ء

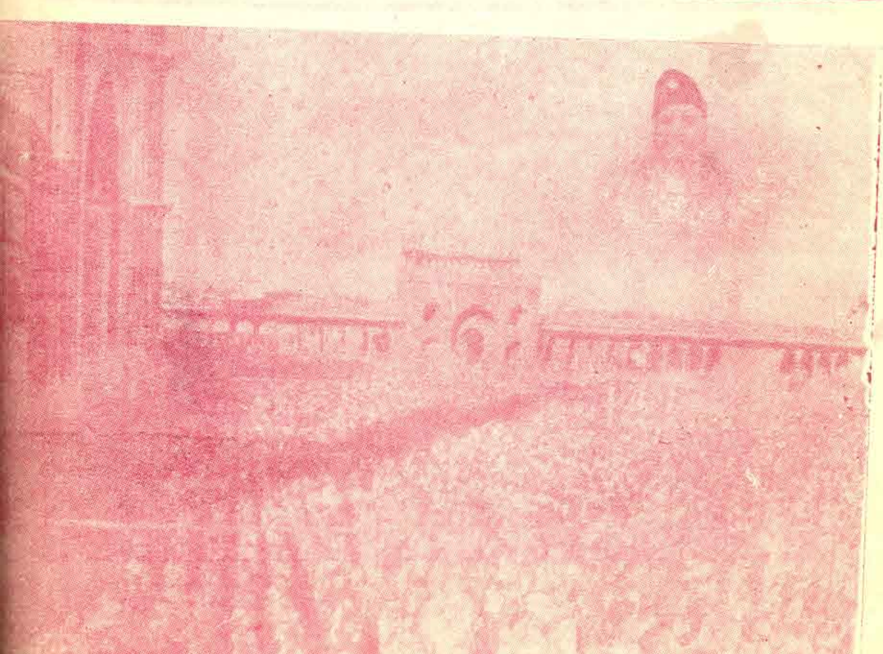

جامع مسجد دہلی میں مولانا شوکت علی مرحوم کے جنازہ کی نماز -

اسے چاہیے کہ انہیں مستثنے کر دے۔

بمبئی کے کروڑپتی سر سلیمان قاسم مٹھا ملاّ صاحب کے سخت مخالف اور شوکت صاحب کے ذاتی دوست تھے۔ اور ہزاروں روپے سے خلافت کی مدد بار ہا کر چکے تھے۔ انہیں شوکت صاحب کا یہ نوٹ ناگوار گزرا۔ خلافت پڑھتے ہی اپنی شاندار کار میں خلاف ہاؤس تشریف لائے۔ شوکت صاحب شب خوابی کا لباس پہنے ابھی ابھی بالاخانے سے اترے تھے۔ اور صحن میں تشریف فرما تھے۔ بمبئی اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اس میں شرکت کے لیے کراچی سے شیخ عبدالمجید سندھی اور میر محمد بلوچ بھی آئے تھے۔ اور حسب معمول خلافت ہاؤس میں ٹھہرے تھے۔ یہ دونوں بھی شوکت صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ پنسل کاغذ لیے میں بھی حاضر تھا۔ سر سلیمان نے اترتے ہی شوکت صاحب سے کہا

"تم نے ملاّ کا ساتھ دیا۔ وہ بڑا بے ایمان ہے۔ تم بھی بے ایمان ہے۔ اس نے جرور روپیہ دیا۔ تم روپیہ لیا۔ وہ رسوت دیا۔ تم لالچی ہو رسوت لے لیا۔ اس نے ہجار دیا ہے ہم سے تم دس ہجار لے لیتا۔ مگر تم نے اس سے روپیہ لے کر ایسا مضمون لکھ دیا۔"

پہلے تو شوکت صاحب ہنس ہنس کر ٹالتے رہے۔ لیکن سر سلیمان کا پارہ چڑھتا گیا وہ اور زیادہ تند اور تلخ لب و لہجہ میں یہ الفاظ دوہراتے گئے۔ سر سلیمان اپنی کار کے پاس ہی کھڑے یہ باتیں کر رہے تھے، دفعتہً شوکت کا بھرپور ہاتھ پوری قوت سے سر سلیمان کے رخسار گلعذار پر جا چپکا۔ وہ سنبھل نہ سکے اور حواس باختہ ہو کر ڈرائیور کی گود میں پکے ہوئے پھل کی طرح گر پڑے۔ شوکت صاحب اب کھڑے ہو چکے تھے۔ انھوں نے سر سلیمان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"رشوت لینے والے اور رشوت لے کر کسی کی حمایت کرنے والے کی . . . . مجھے نہ تیری پروا ہے نہ ملاّ کی۔"

سر سلیمان کا ڈرائیور ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے تیزی سے کار بیک کی اور سلیمان عالی شان کو تختِ رواں پر لے کر اڑ گیا۔

گو سر سلیمان کروڑپتی تھے۔ بہت سے غنڈوں کے سرپرست تھے۔ سارے شہر میں ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی جس کی بگڑی چاہتے تھے دم بھر میں اچھال دیتے تھے۔ لیکن آج جس شخص سے ٹکرائے تھے اس نے ایک ہی ضرب میں انہیں آبگینے کی طرح چکنا چور کر دیا تھا۔ یہ سر سلیمان وہ تھے جنھوں نے آج سے کئی برس قبل مسٹر جناح کو بمبئی میں مسلم لیگ کا جلسہ نہیں کرنے دیا تھا۔ ان کے آدمیوں نے چند سیکنڈ میں جلسہ درہم برہم کر دیا۔ یہ بڑا اہم جلسہ تھا جس کی صدارت کے لیے مظہر الحق پٹنہ سے آئے تھے۔ آخر اسے تاج محل ہوٹل کے ایک بند کمرے میں منعقد کرنا پڑا تھا سلیمان کا دبدبہ اور طنطنہ آج بھی وہی تھا۔ اس کی ثروت و سطوت میں بھی آج بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ آج بھی گورنر اس سے لپکتا تھا۔ اور وائسرائے اسے مدعو کرتا تھا لیکن اس نے غلطی کی تھی کہ تلوار کی دھار سے ٹکرایا تھا۔ آخر لہو لہان ہو گیا۔

سر سلیمان پیر ابراہیم بغدادی کے مرید تھے۔ پیر صاحب شوکت صاحب کے دوست تھے۔ انہوں نے ایک روز مالا بار ہل پر اپنی بارگاہِ قدس میں دونوں کو مدعو کیا۔ سر سلیمان کی طرف سے خود معافی مانگی اور دونوں کو گلے ملوا دیا۔

ایک دفعہ بابائے اردو انجمن ترقی اردو کے لیے سرمایہ فراہم کرنے اورنگ آباد سے حیدرآباد آئے۔ اتفاق سے ان

اس زمانے میں شوکت صاحب بھی وہاں موجود تھے ۔ جس کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا گوہر مقصود نکال لائے ۔ یہ غارت گری دیکھ عبدالحق نے اپنی اسکیم ملتوی کر دی اور مایوسی کے عالم میں سید ہاشمی فرید آبادی کو لکھا یہ شخص چندہ وصول کرنے کے فن کمال رکھتا ہے ۔ ہر جگہ ڈاکے ڈال رہا ہے ۔

اور یہ غلط بھی نہ تھا قوم کی بے حسی اور بے زری کے باوجود وہ شوکت صاحب ہی تھے جو خلافت جیسے عظیم الشان ٹ کو چلا رہے تھے ۔ چندہ وصول کرنے کا ڈھب جیسا انہیں آتا تھا واقعی کسی کو نہ آتا تھا ۔

ایک مرتبہ انہوں نے " دوشنبہ فنڈ " کا اجرا کیا ۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ ہمدردان خلافت ہر دوشنبہ کو گوشت وغیرہ بجائے صرف دال روٹی کھائیں ۔ اس کفایت سے جو دام بچیں وہ خلافت فنڈ میں دے دیا کریں ۔ ہم ندوے کے طلبا بھی اس صدا پر لبیک کہا اور دوشنبہ فنڈ جاری کر دیا ۔ سو، سوا سو روپیہ ہر مہینے ندوۃ العلماء لکھنؤ سے بمبئی جانے لگا ۔ او سلسلہ کافی عرصے تک جاری رہا ۔ اسی سے دوسروں کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے ۔

بمبئی میں کانگرس کا سالانہ جلسہ (دسمبر ۱۹۳۴ء) ہوا ۔ بابو راجندر پرشاد کانگرس کے صدر تھے ۔ اس اجلاس کی رپورٹنگ کے لیے میں خود جاتا تھا ۔ دو سائکلسٹ میرے پیچھے بیٹھے رہتے تھے ۔ میں تقریریں زیادہ تر اصل الفاظ میں لکھتا جاتا تھا سائکلسٹ کو دو دو، تین تین سلپیں دیتا جاتا تھا ۔ وہ فوراً دفتر جا کر کاتب کے حوالے کر دیتا تھا ۔ ختم اجلاس تک سلسلہ جاری رہا ۔ بمبئی کے کسی کانگرسی اردو اخبار میں اجلاس کانگرس کی اتنی مفصل اور صحیح رپورٹ شایع نہیں ہوئی کانگرس کا مخالف تھا ۔ میں کانگرس کے خلاف مسلسل لکھتا رہتا تھا ۔ لیکن خبروں کو " سپرس " کرنے کا قائل نہ تھا ۔

صبح کوئی آٹھ بجے کے قریب کسی کام سے میں خلافت ہاؤس کے پھاٹک کے پاس کھڑا تھا کہ ایک باریش بزرگ لائے فرمایا

" میں خلافت کے ایڈیٹر سے ملنا چاہتا ہوں ۔ "

میں نے عرض کیا " وہ آپ کے سامنے حاضر ہے ۔ "

لپک کر مجھے گلے لگا لیا ۔ اور کہا میں ' ہلال ' بھی پڑھتا ہوں ۔ ' اجمل ' بھی ، لیکن کسی میں کانگرس کے اجلاس کی اتنی مفصل مکمل رپورٹ شایع نہیں ہوئی جتنی آپ نے مخالف ہونے کے باوجود کی ہے ۔ میں آپ کو مبارکباد دینے آیا تھا ۔ بس جاتا ہوں ۔ "

یہ ملا جان محمد تھے جو پہلے خلافت کے شیدائی اور علی برادران کے جاں نثار تھے ۔ اب کانگرس میں شریک تھے ۔ بعد میں پھر کٹر خلافتی ہو گئے ۔ اور اب تک ہیں ——————

میں نے اس واقعہ کا شوکت صاحب سے ذکر کیا ۔ فرمایا

" بالکل ٹھیک کرتے ہو ۔ مجھے تمہاری یہ روش پسند ہے ۔ اظہار خیال کے لیے اداریہ کالم کافی ہے ۔ خبروں کو گول مول کر کے قارئین اخبار کو تاریکی میں نہ رکھنا چاہیے ۔ "

خلافت ہاؤس کے دوران قیام میں صرف ایک واقعہ ایسا ہوا جس کے باعث مجھے شرمندہ ہونا پڑا ۔ اور میں

ت شوکت صاحب سے نہ متواتر کا۔ اس کا کئی دن تک مجھ پر اثر رہا۔ دن کی بھوک اور رات کی نیند اڑ گئی۔ حالانکہ حماقت
ری ہی تھی۔

ندوہ کے درجہ اوّل میں میرے میزان منشعب کے ساتھی بھوپال کے عبدالقدوس بھی تھے —— جو اب قدوس
صہبائی کے نام سے معروف ہیں اور پشاور میں مقیم ہیں —— کچھ دن ندوے میں تعلیم حاصل کر کے یہ واپس چلے گئے۔ پھر واپس
ہیں آئے۔ انگریزی تعلیم میں لگ گئے۔ اب یہ گریجویٹ ہو چکے تھے۔ اور بمبئی میں بہ تلاش روزگار آئے ہوئے تھے۔ کئی جگہ
وشش کی مگر ناکام ہوئے اور مایوس ہو کر بھوپال واپس چلے گئے۔ وہاں سے مجھے خط لکھا۔ میں نے سب ایڈیٹر کی حیثیت
ے ان کا تقرر کر لیا۔ یہ بمبئی آ گئے اور کام کرنے لگے۔

شوکت صاحب بمبئی سے باہر تشریف رکھتے تھے۔ کئی روز کے بعد واپس آئے۔ ایک روز وہ صحن میں بیٹھے تھے۔ میں بھی
حاضر تھا کہ قدوس صہبائی آئے اور انہیں سلام کر کے دفتر میں چلے گئے۔ شوکت صاحب نے پوچھا۔

"یہ کون صاحب ہیں؟"

میں نے کہا قدوس صہبائی ہیں۔ میں نے انہیں سب ایڈیٹر مقرر کیا ہے؟"

شوکت صاحب نے پوچھا

"بھوپال والے تو نہیں؟"

میں نے عرض کیا" جی ہاں وہی —— !"

شوکت صاحب کہنے لگے" نہیں بھئی، انہیں ابھی رخصت کر دو، یہ شخص کمیونسٹ ہے" —— شوکت صاحب
کمیونسٹوں کے سخت مخالف تھے۔

میں نے کہا" لیکن ——

شوکت صاحب نے میری بات نہیں سنی، فرمایا

"یہ نواب بھوپال کا بھی سخت مخالف ہے۔ نواب صاحب سے ہمارے عمر بھر کے تعلقات ہیں۔ یہ شعیب کا جی مخالف
ہے اور وہ میرا دست و بازو ہے۔ یہ خلافت کا بھی مخالف ہے، ہمیشہ خلافت کی مخالفت کرتا رہا ہے" ——

بڑی لمبی چوڑی تقریر کر کے شوکت صاحب نے حکم دیا" ابھی حساب صاف کر دو"

یہ فرد جرم سُن کر میں لاجواب ہو گیا۔ واقعی ان صفات کے شخص کا برداشت کرنا شوکت صاحب کے لیے ناممکن تھا۔
غلطی میری تھی کہ یہ سب باتیں میں نے کیوں نہ سوچ لیں؟

میں دفتر پہنچا، اور الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا کہ حساب کرتے وقت میری اور ان کی دونوں کی کیا کیفیت ہوئی۔ اب
بھی سوچتا ہوں تو شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔

ایک روز میں دفتر میں بیٹھا تھا کہ چپراسی نے ایک وزیٹنگ کارڈ میرے سامنے لا کر رکھا۔

"امین حزیں"

میں نے کہا "فوراً بلا لاؤ!"

اور مشہور شاعر امین حزیں کے استقبال کے لیے تیار ہو گیا۔ اتنے میں "امین حزیں" صاحب تشریف لے آ

یہ شاعر امین حزیں نہ تھے۔ یہ بہاول پور کے رہنے والے تھے۔ تخلص انہوں نے بھی امین حزیں رکھ لیا تھا۔ ملازمت کی

آئے تھے۔ آتے ہی درخواست پیش کر دی۔

میں یقیناً انہیں رکھ لیتا لیکن ان کی یہ حرکت مجھے ناپسند ہوئی۔ میں نے معذرت کر دی، پھر یہ کہیں اور ملازم

لیکن بعد میں مجھے افسوس ہوا۔ میں نے کبھی کسی کو مایوس نہیں کیا تھا۔ ملازمت دینے سے انکار نہیں کیا تھا۔ کوئی نہ کوئی

پیدا کر ہی لیتا تھا۔ لیکن وقتی برہمی کے سبب مجھ سے یہ حرکت سرزد ہو گئی۔ کافی عرصے تک مجھ پر اپنی اس بے رخی کا اث

بعد میں جب شوکت صاحب کے انتقال کے بعد میں نے اپنا ذاتی اخبار روزنامہ ہندوستان نکالا تو تلافی بھی کر دی

کو سب ایڈیٹر کی حیثیت سے رکھ لیا۔

اب امین حزیں صاحب کراچی میں ہیں اور ایک کامیاب تاجر ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا میں ان سے ملا تھا۔ ان کی گفت

ہوا کہ وہ میری باتیں ہی نہیں اپنا ماضی بھی فراموش کر چکے ہیں۔ مجھے ان سے پہلے بھی ہمدردی تھی اور اب پہلے سے بھی ز

شوکت صاحب بے انتہا موٹے ہونے کے باوجود بڑے جامہ زیب، خوب صورت، شاندار، اور وجیہہ و شکیل

جب وہ چلتے تھے تو یہ معلوم ہوتا ہمالہ محوِ خرام ہے۔ جب بات کرتے تو ایسا لگتا تھا، پہج کو زبان مل گئی ہے۔ جب تقر

تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے خلوص کو خدا نے قوتِ گفتار عطا کر دی ہے۔ جب وہ گورنر یا وائسرائے سے ملتے تھے تو ی

تھا جیسے فرعون کے دربار میں ——— بلا تشبیہہ ——— موسیٰ کے قدم پہنچ گئے ——— حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

شوکت صاحب جامہ زیب بھی حد سے زیادہ تھے۔ انگریزی لباس میں وہ پورے صاحب بہادر معلوم ہوتے تھے۔ ت

میں بھی ان کی پھبن دیکھنے کے قابل تھی۔ لمبے کھدر کے سفید کرتے اور عبا قبا میں تو یہ معلوم ہوتا تھا فرشتہ آسمان سے ات

رنگ۔ اور ہر لباس میں اچھے لگتے تھے۔

مولانا عبدالباری مغفور کے وہ مرید تھے۔ اور بعض سیاسی امور میں اختلاف کے باوجود حد درجہ ان کے عقیدت

مولانا مرحوم کے جانشین قطب میاں جب کبھی بمبئی تشریف لاتے اور خلافت ہاؤس آتے تو جس والہانہ انداز میں وہ ان کے ہاتھ چو

منظر اب تک نظر کے سامنے پھر رہا ہے۔

مولانا مرحوم کے فرزند ارجمند جمال میاں سے تو شوکت صاحب کو عشق تھا۔ حاضر و غائب ان کی ثنا و صفت میں تر ز

جمال میاں بمبئی آتے تو اکثر خلافت ہاؤس میں ٹھہرتے۔ مجھ پر بہت مہربان تھے۔ اور مجھے فخر ہے کہ یہ سلسلہ اب تک قائم

گو شوکت صاحب کا عالم قومیات میں آنے کے بعد یہ تھا کہ ——— ہوس سیر و تماشا سودہ کم ہے ہم کو ——— پھر بھی کبھی

تھیٹر دیکھ لیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ بین الاقوامی شہرت رکھنے والے مشہور رقاص اودے شنکر کا طائفہ بمبئی آیا۔ فورٹ کے اکسلسیر تھیٹر میں

مے دو پروگرام ہونے لگے۔ شوکت صاحب کے پاس بھی دعوت نامہ پہنچا۔ تیار ہو گئے۔ یہ نادر موقعہ میں کیوں چھوڑتا۔ میں

ین نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور پہلی رو میں صوفے پر ہم دونوں کو بٹھا دیا۔ کیا کہنا کمال کا رقص تھا۔ اس طائفہ کی ایک رقاصہ س عذرا بھی تھیں۔ یہ مراد آباد کی رہنے والی تھیں اور ان کے خاندان سے شوکت صاحب واقف بھی تھے۔ مس عذرا کو اودے کے ساتھ رقص کرتے دیکھ کر شوکت صاحب بے مزہ ہوئے۔ ایک شریف خاندان کی مسلمان لڑکی کو یوں برسرِ عام ناچتے اور کتے دیکھ کر وہ برداشت نہ کر سکے۔ شو ختم ہونے سے پہلے واپس آ گئے۔

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے ماتحت جب صوبائی خود مختاری کا نفاذ ہوا تو مسلم لیگ نے بھی اپنے امیدوار ہر صوبے میں کھڑے کیے ت صاحب نے سارے ملک کا دورہ اس سلسلے میں کیا۔ گرمی کا موسم۔ ذیابیطس کے مریض لیکن ریل، موٹر، تانگہ، یکہ حتیٰ کہ بیل گاڑی پر ہر صبح سفر، ہر شام سفر، پر عامل رہے۔ بندیل کھنڈ میں جھانسی کے الیکشن کو جواہر لال نہرو نے "ٹسٹ" بنا لیا تھا۔ کانگرس کا سارا زور، سارا روپیہ اور سارا اثر یہاں صرف ہو رہا تھا۔ مولانا شوکت علی نے اپنے چند رفقاء کے ساتھ یہ کڑی مہم بے سروسامانی اور بے زری کے باوجود شاندار طور پر فتح کی۔

مولانا مسلم لیگ کے ساتھ تھے۔ لیکن مولانا عرفان آزاد ٹکٹ پر شوکت صاحب کے علم و استصواب کے بغیر بمبئی اسمبلی کے لیے سردار پٹیل کی شہ سے کھڑے ہو گئے۔ چونکہ خلافت کی تائید انہیں حاصل نہ تھی ہار گئے۔ یہ سارا واقعہ شوکت صاحب کے دورے کے زمانے کا ہے۔ شوکت صاحب بمبئی واپس آئے تو مولانا عرفان پر بہت بگڑے۔ اور کہا تم میرے رفیق کار رہو اور دشمنوں کے آلۂ کار بھی۔ میں یہ نہیں برداشت کر سکتا۔ تمہیں خلافت یا کانگرس میں سے کسی ایک کو منتخب کر لینا چاہیے۔ اور خلافت مسلم لیگ کے ساتھ ہے۔"

مولانا عرفان ساری دنیا کو چھوڑ سکتے تھے لیکن شوکت صاحب کو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ انہوں نے پھر مسلم لیگ میں شرکت کر لی۔ اور ہر مرحلے پر نمایاں کارنامے انجام دیے۔

انتخاب کے بعد کچھ عرصے کی کشمکش کے بعد صوبوں میں کانگرسی وزارتیں بنیں۔ یاسین نوری صاحب خلافتی یعنی مسلم لیگی تھے۔ اپنے انتخابی منشور میں انہوں نے ووٹروں سے وعدہ کیا تھا کہ مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام پر عمل کریں گے۔ نمایاں اکثریت سے اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ لیکن سردار پٹیل نے انہیں وزارت کی پیش کش کر کے توڑ لیا۔ اور یہ ۲۴ گھنٹے کی مختصر مدت میں نیا لباس سلوا کر کھدر پوش اور کانگرسی بن گئے اور پی ڈبلیو ڈی کے وزیر بنا لیے گئے۔

شوکت صاحب کو اس واقعہ کا بہت صدمہ ہوا۔ اسی زمانے میں ناسک میں تقریر کرتے ہوئے نوری صاحب نے مسلم لیگ کا ذکر کرتے ہوئے کہا

"کھانا پکائے کانگرس، اور کھانے کے وقت مسلم لیگ بھی موجود، آزادی کی جدوجہد کانگرس نے کی اور مسلم لیگ اس جدوجہد میں شریک ہوئے بغیر اپنا حصہ مانگ رہی ہے۔"

یہ بیان پڑھ کر شوکت صاحب آگ بگولہ ہو گئے۔ شامت کے مارے نوری صاحب دو تین روز کے بعد دورے سے واپس بمبئی آئے اور شوکت صاحب سے ملنے خلافت ہاؤس تشریف لائے۔ شوکت صاحب نے ان کی بڑی طرح خبر لی۔ فرمایا

"تم نے ناسک میں کیا کہا تھا۔ کھانا کانگرس نے پکایا ہے؟ آزادی کی جدوجہد کانگرس نے کی ہے؟ وہ ہم تھے جنھوں نے ہندوؤں میں سیاسی شعور بیدار کیا۔ گاندھی کو گاندھی بنایا۔ کانگرس کو لبرلوں کے پھندے سے چھڑا کر آزادی کے راستے پر چلایا۔ مسلمانوں

کے نانا فرنویس بن کر یہ باتیں کرتے تمہیں شرم نہیں آتی؟"

نوری صاحب کا ایک رنگ آرہا تھا ایک جا رہا تھا لیکن اپنے لیڈر کے سامنے تابِ گفتار نہیں رکھتے تھے۔ بالکل خاموش

علی گڑھ کے ارباب کار سے شوکت صاحب کو سنگین اور شدید اختلاف تھا۔ لیکن علی گڑھ سے عشق تھا۔ علی گڑھ کے ذرّے ذرّے سے عشق تھا۔ کوئی علیگ ہو، شوکت صاحب کا دروازہ اس کے لیے کھلا ہوا تھا۔ شوکت صاحب اس کی ہر مدد کے لیے سیاسی تلخیوں اور معرکہ آرائیوں میں بھی وہ علیگیت کے رشتے کو قائم رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ علی گڑھ کی ایک کرکٹ ٹیم بمبئی آئی۔ یہ لوگ کسی ہوٹل میں ٹھہرے۔ بھلا کیونکر ممکن تھا کہ علی گڑھ کے پلیر اور اس شخص سے جو اپنے وقت میں ہندوستان کا بہترین اور علی گڑھ کا مایۂ ناز کرکٹیر رہ چکا تھا ملنے نہ آئیں۔ پوری ٹیم شوکت صاحب ہر ایک سے بغلگیر ہوئے۔ پوچھا "کہاں ٹھہرے ہو؟" ہوٹل کا نام سن کر خفا ہو گئے۔ اسی وقت سب کو کیا اور کہا جاؤ سامان لے کر ابھی آؤ۔ یہ لیجیے صاحب خلافت ہاؤس کا سارا زیریں حصہ علی گڑھ ٹیم کے لیے وقف، ناشتہ جائے، ہر قسم کی تواضع ہو رہی ہے۔ بہت سی ذاتی اور سیاسی سرگرمیاں معطل۔ وقت کا بڑا حصہ اسی ٹیم کے ممبروں میں گزر رہا ہے۔ خود قبلۂ حاجات اور پیر مغاں بنے بیٹھے ہیں۔ اردگرد علی گڑھ کے کھلنڈرے جمع ہیں۔ خود داستانِ ماضی مزے لے کر سنا رہے ہیں، اور ان نو واردوں سے ان کی کہانیاں سن رہے ہیں۔ یہ چند روز ایسی سرخوشی میں گزرے جیسے پچھلا زمانہ لوٹ آیا ہے، اور شوکت صاحب علی گڑھ میں براجمان ہیں۔

سرحد میں ڈاکٹر خاں صاحب کی وزارت قائم تھی۔ مولانا مسلم لیگ کا پروپیگنڈا کرنے کے لیے سرحد پہنچے۔ سارے صوبے کا دورہ کیا۔ چارسدہ بھی جو خان عبدالغفار خاں کا گڑھ تھا پہنچے۔ اور عبدالغفار خاں کی کانگرس نوازی کے لتے لے ڈالے۔ تقریر میں کہا

"عبدالغفار خاں میرا رضاکار تھا۔ اسے اس پر فخر تھا کہ وہ میرا رضاکار رہے۔ اب وہ گاندھی کا رضاکار ہے اور اسے فخر ہے کہ گاندھی کا رضاکار ہے۔ گاندھی بہت عرصے تک میری جیب میں رہا۔ پھر وہ میری جیب سے نکل بھاگا۔ اب گاندھی کی جیب میں عبدالغفار پہنچ گیا ہے۔ گاندھی کو گاندھی ہم نے بنایا۔ کانگرس، کانگرس ہمارے دم سے بنی۔ ہم نے دیکھا کہ گاندھی اور کانگرس مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق دینے میں بھی بنیا پن دکھاتے ہیں تو میں نے گاندھی اور دونوں سے کنارہ کشی کر لی۔ عبدالغفار نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ سرحدی گاندھی بن گیا۔ تم اسلام کے مجاہد ہو۔ یہ تمہیں بنیا بنا دینا چاہتا ہے۔"

دوستوں نے شوکت صاحب کو چارسدہ جانے سے منع کیا تھا۔ لیکن شوکت صاحب گئے۔ جلسۂ عام میں تقریر کی اور واپس آ گئے۔ بجا طور پر وہ کہہ سکتے تھے "میں آیا، میں نے دیکھا، میں نے فتح کر لیا۔"

پشاور میں ڈاکٹر خاں صاحب نے دوپہر کے کھانے پر شوکت صاحب کو مدعو کیا۔ شوکت صاحب نے دعوت قبول کر لی، اور تشریف لے گئے۔ کھانے کے دوران میں اور اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ کانگرس کے تھے یہ مسلم لیگ کے داعی۔ جب رخصت ہونے لگے تو ڈاکٹر خاں صاحب موٹر تک پہنچانے آئے۔ گرمی کا زمانہ

ت، تیز دھوپ، لو کے جھکڑ، خاں صاحب نے کہا۔ اس تیز دھوپ اور لو میں نہ جائیے۔ دوپہر کو یہاں آرام کیجیے۔
م کو چلے جائیے گا۔

شوکت صاحب نے کہا "مجھے دھوپ اور لو سے ڈراتے ہو، خود جہنم کی آگ سے نہیں ڈرتے؟"
بے چارے خاں صاحب کا چہرہ تمتما اٹھا لیکن خاموش رہے۔ شوکت صاحب بے پروائی سے موٹر میں بیٹھے اور
خصت ہو گئے۔

زاہد صاحب سے شوکت صاحب کو عشق تھا۔ کسی باپ کو اپنے بیٹے سے اتنی والہانہ محبت کرتے میں نے نہیں دیکھا۔
نی شوکت صاحب زاہد صاحب سے کرتے تھے۔ زندگی کے اس دور میں کئی مرتبہ زاہد صاحب کی بعض باتوں سے وہ
خفا ہوئے۔ انہیں رنج پہنچا۔ بگڑے۔ لیکن زاہد صاحب کا سامنا ہوا اور سب کچھ بھول گئے۔ اس دبدبے اور جاہ و
لال کا آدمی مہر پدر کے سامنے اتنا بے بس تھا۔

صوبوں میں کانگرسی وزارتیں بننے کے بعد کانگرس کا زور بہت بڑھ گیا تھا۔ بہت سے مسلمان جاہ و منصب کی تلاش
میں اس ایوانِ زرنگار کا رخ کر رہے تھے۔ شوکت صاحب پر ہر چہار طرف سے یورش ہو رہی تھی۔ اور وہ جو کبھی جنگ
ڑ رہے تھے۔

اسی زمانے میں ڈاکٹر عبدالحمید بھی دفعتہً بڑے کٹر کانگرسی بن گئے۔ یہ مشہور جرمن دوا "اوکاسا" کے ہندوستان
میں سول ایجنٹ تھے۔ جب یہ صرف ایک اٹیچی کیس لے کر تلاش روزگار میں بمبئی میں مارے مارے پھر رہے تھے اور کہیں سے
کامیابی کی صورت نہیں پیدا ہو رہی تھی۔ اس زمانے میں شوکت صاحب نے ان کی کافی مدد کی تھی۔ لیکن اب کانگرسی بن
کر شوکت صاحب کے خلاف بیان بازی کرنے لگے۔ میں نے ایک مقالۂ افتتاحیہ لکھا "اوکاسا کا زور" اور ان
کی کانگرسیت کا پردہ فاش کر دیا۔ بہت تلملائے۔ اوکاسا کا اشتہار فوراً بند ہو گیا۔ مگر شوکت صاحب نے پروا بھی نہ کی۔
الہ آباد میں جواہر لال نے "مسلم رابطۂ عوام" "Muslim mass Contact" کی تحریک آنند بھون سے شروع
کر رکھی تھی۔ ڈاکٹر اشرف اس شعبہ کے انچارج تھے۔ یہ بھی شوکت صاحب کے خلاف نکتہ آفرینیاں کرتے رہتے تھے۔ میں
نے ایک مرتبہ جل کر بہت مفصل اداریہ "بخدمت اشرف" کے عنوان سے لکھا۔ اس زمانے میں مسٹر معظم علی بیرسٹر ایٹ لا
مولانا محمد علی کے برادر نسبتی تھے خلافت ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ انہیں یہ مضمون بہت پسند آیا۔ شوکت صاحب
سے انہوں نے میری بڑی تعریف کی۔ شوکت صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا یہ ہمارا انتخاب ہے۔ چند روز بعد ڈاکٹر اشرف
کسی کام سے بمبئی آئے۔ خلافت ہاؤس مجھ سے ملنے آئے۔ اور دل کھول کر میرے طرز انشا کی داد دی۔ اور از راہ مزاح
فرمایا

"آپ آنند بھون آجایئے!"

مفتی امین الحسینی سے شوکت صاحب کے عزیزانہ تعلقات تھے۔ وہ مفتی صاحب ہی تھے جنہوں نے مسجد عمر
(بیت المقدس) میں اصرار کر کے محمد علی کی تدفین کی تھی۔ وہ اس غرض سے ہندوستان آئے کہ یہودی تیزی سے فلسطین

کی زمینیں غریب عربوں سے خرید رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ فلسطین وطن الیہود بن جائے گا۔ لہذا ہندوستان کے اربا
وہاں زمینیں خریدلیں اور فائدہ اٹھائیں۔ شوکت صاحب دل وجان سے ان کے ساتھ ہوگئے۔ اور اس مقصد
ایک ایک دریہ دریہ دستک دی۔ لیکن چونکہ وائسرائے اور گورنر مخالف تھے لہذا شوکت صاحب کی شبانہ روز کی سرگر
کوئی خاص نتیجہ نہ نکلا۔

مفتی صاحب کے قیام بمبئی کا زمانہ بڑا دلچسپ گزرا۔ وہ اپنا زیادہ وقت شوکت صاحب کے ساتھ ص
تھے۔ خطوط، اعلانات، بیانات عربی میں لکھ لکھ کر شوکت صاحب کو دیتے تھے۔ وہ مجھے فوری اردو ترجمے کا
تھے۔ اردو ترجمے کے بعد فوراً چھاپنے کا حکم دیتے تھے۔ شوکت صاحب عربی نہیں جانتے تھے۔ لیکن انگریزی، ا
عربی کے الفاظ بیک وقت استعمال کرکے، اور زیادہ تر اشاروں سے کام لے کر مفتی صاحب کو اپنا مطلب
سمجھا دیتے تھے۔

طبعاً شوکت صاحب بہت نفاست پسند تھے۔ مالی حالت نہایت سقیم تھی۔ باسی روٹی اور باسی دال تک
کر لیتے تھے۔ لیکن کپڑے دن میں دو مرتبہ بدلتے تھے۔ صبح اٹھ کر غسل کرتے اور دھلے ہوئے کپڑے پہن کر برآ
دوپہر کے قیلولہ کے بعد غسل کرتے اور پھر تازہ دھلا ہوا لباس زیب تن کرکے باہر جاتے تھے۔ کپڑے پرانے تھ
پیوند بھی ہوتا تھا، لیکن وہ کہا کرتے تھے غربت انسان کو میلا اور گندا رہنے پر مجبور نہیں کرتی۔ آدمی اگر چا
خود اپنے کپڑے دھو کر اجلا رہ سکتا ہے۔

قائداعظم شوکت صاحب پر حد درجہ اعتماد کرتے تھے۔ ذاتی امور میں بھی ان سے صلاح مشورہ کرتے تھے
فون آیا۔ یہ قائداعظم کا فون تھا۔ اور انہوں نے فوراً شوکت صاحب کو ملاقات کی زحمت دی تھی۔ وہ اس وق
کام سے میرے ساتھ باہر جا رہے تھے۔ چنانچہ پہلے ہم دونوں مالابارہل قائداعظم کے بنگلے پر پہنچے۔ قائداعظم کے
تشویش، اضطراب، اور افسردگی کے گہرے نقوش نظر آ رہے تھے۔

قائداعظم نے ایک کروڑپتی پارسی کی اکلوتی لڑکی رتن بائی کو مسلمان کرکے اس سے باقاعدہ نکاح کیا تھا
ہوا۔ لیکن وفادار بیوی نے ہر مرحلے پر شوہر کا ساتھ دیا۔ رتن کا انتقال عین عالم شباب میں ہوا۔ دونوں کی محب
صرف ایک بچی تھی۔ قائداعظم اسے بہت چاہتے تھے۔ لیکن سیاسی مصروفیتوں کے باعث اس کی تعلیم و تربیت
توجہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ زیادہ تر نانی کے ہاں رہتی تھی۔ وہاں رہ کر وہ اسلام سے دور ہوتی چلی گئی۔ اور
اسی پارسی خاندان کے ایک کروڑپتی مل اونر نوجوان سے وہ شادی کر رہی ہے۔ انہوں نے شوکت صاحب
بلایا تھا اور باچشم پرنم ان سے استدعا کی تھی کہ وہ اس لڑکی کو اسلام سے آشنا کرنے کے لیے کسی ایسے تعلیم یافت
کر دیں جو اس کی غلط فہمیاں دور کر دے اور سچا مسلمان بنا دے۔

لیکن اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ چند ہی روز بعد لڑکی نے باپ کی مرضی کے خلاف شادی کر لی۔
عاق کر دیا۔ اور پھر مرتے دم تک نہ اسے اپنے گھر میں آنے دیا نہ اس کی صورت دیکھی۔

مولانا شوکت علی

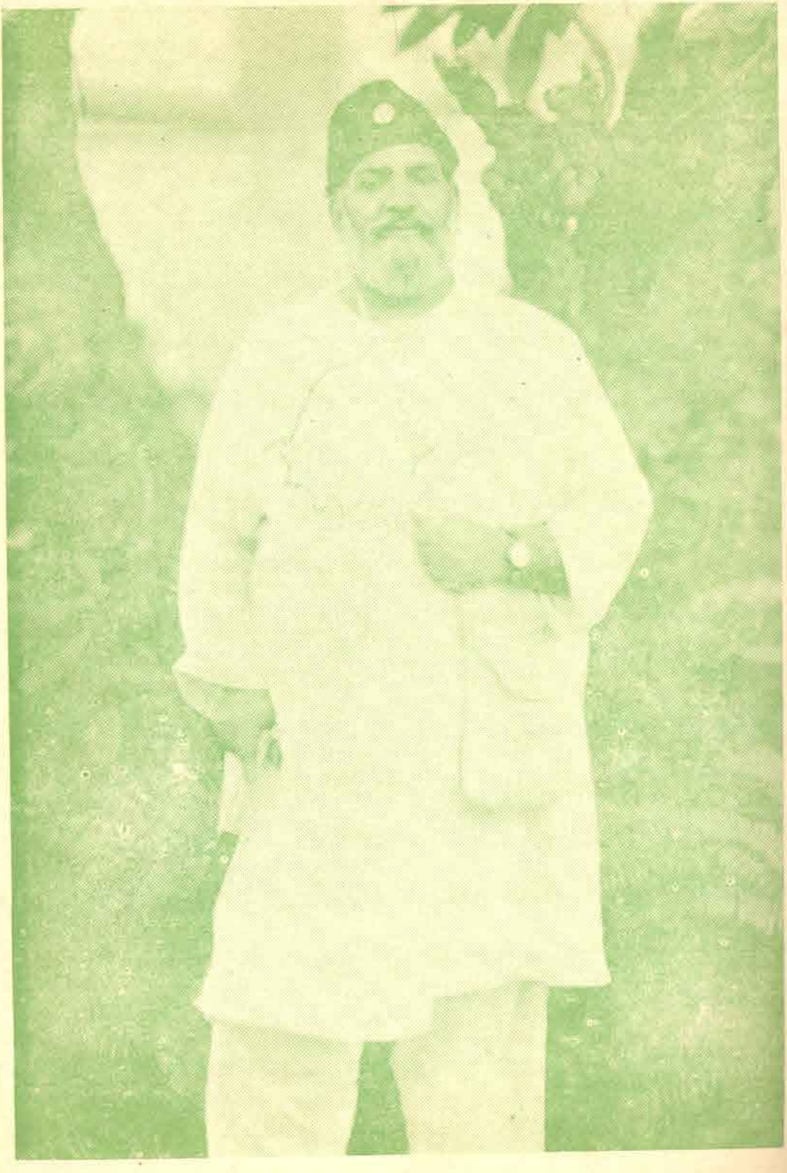

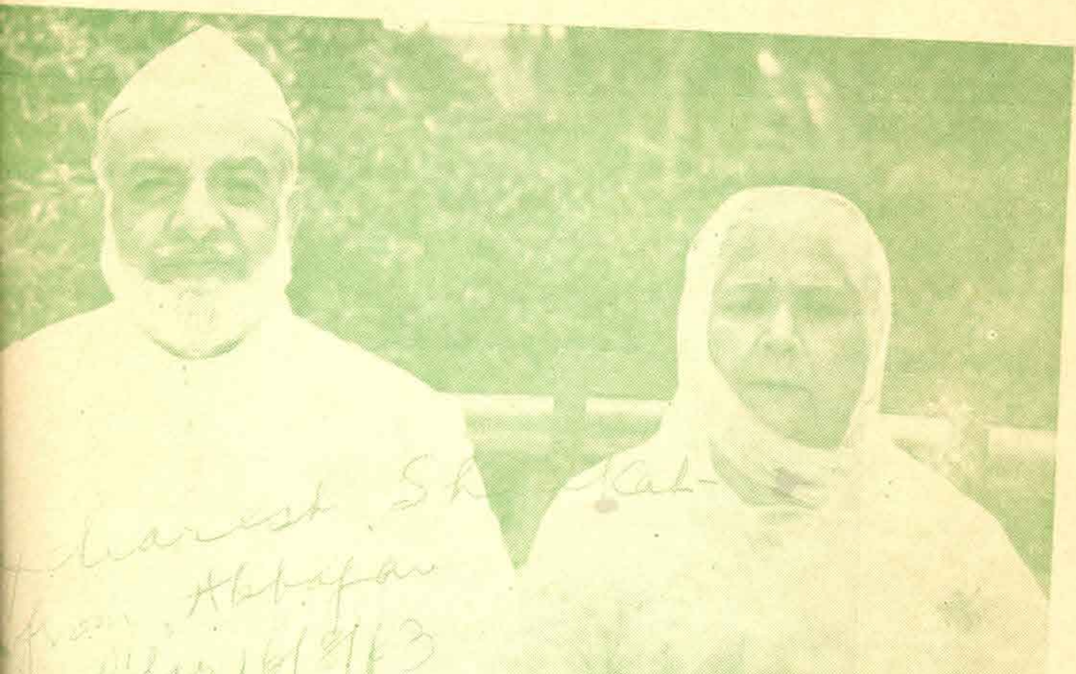

زہرہ بیگم بنت محمد علی — زاہد شوکت علی

وائسرائے ہند لارڈ ولنگڈن مولانا شوکت علی کا بہت پاس ولحاظ کرتا تھا۔ ایک مرتبہ مرکزی اسمبلی میں حکومت کے
خلاف کسی تجویز پر کانگریس اور مسلم لیگ میں باہمی اختلاف کے باوجود اتفاق ہوگیا۔ اس زمانے میں نظام دکن بھی دہلی آئے
ہوئے تھے، اور شاہانہ جاہ وجلال کے ساتھ نظام پیلس میں جو وائسرائگل لاج سے کسی طرح کم شاندار نہیں تھا ٹھہرے
ہوئے تھے۔

حکومت نے کئی ممبروں کو توڑنے کی کوشش کی۔ لارڈ ولنگڈن نے اپنے اصول اور مرتبے کے خلاف خود "کنویسنگ"
کی۔ مولانا کو چائے پر مدعو کیا۔ اور باتوں باتوں میں کہا۔

"مولانا آپ کو تو کانگریس کا ساتھ نہ دینا چاہیے، جب کہ آپ کو اس سے اتنی سنگین شکایتیں ہیں!"

مولانا نے برجستہ جواب دیا۔ مجھے انگریزوں سے بھی بڑی سنگین شکایتیں ہیں۔ انہوں نے کبھی اور کسی موقع پر مسلمانوں
سے وعدہ نہیں کی۔ اب بھی اگر آپ فلسطین پر عربوں کی غیر مشروط حاکمیت تسلیم کرلیں تو میں اپنی جماعت سے غداری کرنے
کو تیار ہوں۔ وہ مسکرا کر خاموش ہو رہا۔ پھر کچھ نہیں بولا۔ لیکن نظام کو اشارہ کر دیا۔ نظام نے دوسرے دن شوکت صاحب
کو لنچ پر مدعو کیا۔ اس نے بھی شوکت صاحب کو ہموار کرنے کی کوشش کی۔ شوکت صاحب نے کہا۔ اعلیٰ حضرت اگر لارڈ ولنگڈن
صاحب کو واپس کر دیں تو میں تعمیل ارشاد کو ہر طرح کی بدنامی مول لے کر تیار ہوں، ورنہ میرا ووٹ تو حکومت کے خلاف
جائے گا!"

نظام نے بھی پھر کچھ نہیں کہا۔ مولانا اسمبلی گئے اور اپنا ووٹ حکومت کے خلاف دے آئے۔

بات میں بات نکلتی ہے۔ ایک اور واقعہ یاد آگیا۔ میں ندوۃ العلماء میں پڑھتا تھا۔ لکھنؤ کے گنگا پرشاد میموریل ہال
میں ایک جلسہ اس وقت کے صدر خلافت سر عبداللہ ہارون کی صدارت میں منعقد ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خلافت اور کانگریس
میں ٹھن گئی تھی۔ ظاہر ہے تقریر صدارت کانگریس کے خلاف ہوئی۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے چند طلبا مصطفیٰ کامل قدوائی کی رہنمائی
میں ہلڑ بازی کرنے لگے۔ بیچارے عبداللہ ہارون اس یورش کی کیا تاب لاتے۔ کرسی صدارت حاضر تھی بیٹھ گئے۔ اب مولوی
محمد داؤدی کی شامت آئی۔ یہ بڑے مخلص، ایماندار اور باوضع خلافتی زعیم تھے۔ لیکن ہلڑ بازی کا مقابلہ کرنے کی سکت ان
میں نہ تھی۔ چند جملے بہ مشکل کہہ سکے۔ پھر ہار مان لی اور بیٹھ گئے۔ اب لکھنؤ یونیورسٹی کے یہ مسلم نیشنلسٹ طلبا ہال پر چھا چکے
تھے۔ مصطفیٰ کامل قدوائی، علی برادران کے چہیتے دوست ولایت علی بمبوق مرحوم کے صاحبزادے تھے۔ اب شوکت
صاحب کھڑے ہوئے۔ ذرا دیر کے لیے ہلڑ بازی رکی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے "اک شیر گونجتا ہوا نکلا کچھار سے!"
شوکت صاحب نے تقریر شروع کی تھی کہ مصطفیٰ کامل پھر کھڑے ہوئے اور کہنے لگے
"ہندو آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ قربانیاں دے رہے ہیں۔ اور مسلمان انگریزوں کے ہاتھ مضبوط کر رہے
ہیں"

شوکت صاحب گرجے۔ انہوں نے کہا
"کیا کہا ہندو آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ قربانیاں دے رہے ہیں اور ہم انگریزوں کے ہاتھ مضبوط کر رہے

ہیں ؟ وہ خلافت کمیٹی تھی جس کے سرمایہ سے گاندھی نے سارے ہندوستان کا دورہ کیا۔ وہ ہم تھے جنہوں کانگریس کو لبرلوں سے چھینا اور آزادی کے راستے پر لے آئے۔ قربانیاں ہم نے کیں۔ ہم نے اپنی جائدادیں نیلا گھر کے برتن قرق کرائے۔ نوکری چھوڑی، پریس ضبط کرایا۔ اخبار بند کرایا۔ جیل گئے۔ نظر بند ہوئے۔ پھانسی ہماری گردنوں کے لئے تیار ہوا۔ موتی لال آج بھی چیمبر پر یکٹس کر کے ہزاروں ماہوار کما رہے ہیں۔ جواہر لال نہ جانے کتنے بنکوں، فرموں، کمپنیوں اور کارخانوں میں ہیں۔ جن کا نفع ہر مہینے ان کی جیب میں پہنچتا رہتا ہے۔ گا کو ان کی قوم لاکھوں روپے دے رہی ہے۔ اور پوچھتی بھی نہیں اس رقم کا کیا کر رہے ہو۔ لیکن ہمارا کسی کمپنی میں حصہ ہے۔ ہمارے پاس کوئی سرمایہ نہیں ہے۔ ہم ہیں تم جیسے پورس کے ہاتھی ہیں جو ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کر ہمیں انگریز نہیں خرید سکا، ہم ہندو کے ہاتھ بھی نہیں بک سکے ——

شوکت صاحب بہت مختصر تقریر کیا کرتے تھے لیکن یہ تقریر ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ اور اب حالت یہ مولانا شوکت علی زندہ باد کے نعرے لگ رہے تھے۔ اور مصطفےٰ کامل قدوائی کا کہیں دور و نزدیک نام و نشان نہ تھا

طنز و مزاح کا مادہ بھی شوکت صاحب میں کافی تھا۔

ایک مرتبہ ہم لوگ خلافت ہاؤس کے صحن میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ شوکت صاحب کے قدیم اور دوست غلام حسین بٹ کے بھانجے یا بھتیجے ڈاکٹر اطہر رشید برلن سے ڈاکٹریٹ کر کے تازہ تازہ بمبئی وارد ہوئے تھے۔ خلافت ہاؤس میں مقیم تھے۔ بڑے کٹر نیشنلسٹ تھے۔ کھدر کے لباس میں ملبوس، گاندھی کیپ زیب سر۔ یہ بھی نر بزم تھے۔ طبعاً بڑے نیک اور شریف۔ عقیدۃً قوم پرور اور کانگریسی۔ اتنے میں شوکت صاحب کہیں باہر سے تشریف وہ بھی شریک مجلس ہو گئے۔ ہم سب ان کے استقبال کو کھڑے ہو گئے۔ یکایک ان کی نظر ڈاکٹر اطہر رشید پر جا کر رک گئی ہاتھ جوڑ کر اور ماتھے تک لے جا کر شوکت صاحب نے "بندے ماترم" کچھ ایسے انداز سے کہا کہ ہم سب ہنستے ہنستے بے ہو گئے۔ ڈاکٹر اطہر رشید پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا۔

کہاں تک لکھوں بہت کچھ لکھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کچھ نہیں لکھا۔ زندگی نے اگر مہلت دی تو انشاء اللہ ایک پوری کتا شوکت صاحب کی سیرت اور کردار پر لکھوں گا۔ ایسی دل ربا، ایسی سحر طراز، ایسی شفاف شخصیت میری نظر سے آج تک گزری۔ شوکت صاحب کی وفات کے وقت بھی بہت سے لیڈر موجود تھے۔ اب بھی ہیں اور آئندہ بھی ان کی تخلیق کا سل جاری رہے گا۔ لیکن

ہم جس پہ مرتے ہیں وہ کوئی بات ہی ہے اور
عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں ؟

آہ مولانا شوکت علی

از یحییٰ اعظمی

اُف غمِ روزگار کی باتیں — دہر ناپائدار کی باتیں
جور سے ایک دم قرار نہیں — آہ بسمل و نہار کی باتیں
اس خزاں آشنا زمانہ میں — کیا سنائیں بہار کی باتیں
دل جو پہلو میں ہو تو اب سنیئے — دیدۂ اشکبار کی باتیں
ہو گیا آہ آج وہ رخصت — یاد ہیں جس کی پیار کی باتیں
کس کو اب بیقرار کردیں گی — ملتِ دل فگار کی باتیں
کون ہے جو سنے گا اب یارب — اُمتِ سوگوار کی باتیں
قوم کو کون اب سکھائے گا — ہمتِ اُستوار کی باتیں
برق سے بڑھ کے کام کرتی تھیں — شوکتِ نامدار کی باتیں
وہ زباں کیا تھی تیغ جوہردار — جس میں تھیں ذوالفقار کی باتیں
تیغِ ابرو کے ہر اشارے پر — خنجرِ آبدار کی باتیں
تھیں سراپا پیامِ جوشِ جہاد — اس مجاہد شعار کی باتیں
تا ابد اشکِ خوں رلائیں گی — آہ شوکت کی پیار کی باتیں
کانپ اٹھتا تھا لشکرِ باطل — آہ کوہِ وقار کی باتیں

اب کہاں آہ شوکتِ ملت
آئینہ دارِ عظمتِ ملت

اب کہاں وہ وفا شعار افسوس — "خادمِ کعبہ" صد ہزار افسوس
ہند سے لیکے تا بہ خاکِ حجاز — غم میں کسی کے ہے سوگوار افسوس
اٹھ گیا وہ مجاہدِ اعظم — تھا جو اسلام پر نثار افسوس

اس بہادر سے ہو گئی خالی — صفِ میدانِ کارزار افسوس
چل دیا چھوڑ کر غلاموں کو — مالکِ ہمت کا تاجدار افسوس
آج خود شیرِ بیشۂ اسلام — ہو گیا موت کا شکار افسوس
وہ زعیمِ عجم اب نہ رہا. — جس سے تھا قوم کا وقار افسوس
دشمنوں سے مقابلہ کے لئے — تھا وہ اک سدِ استوار افسوس
سرفروشانِ ملک و ملت کا — مایہ ناز و افتخار افسوس
مٹ گئی ہائے بزمِ دنیا سے — آج جوہر کی یادگار افسوس
گلشنِ آرزوے ملت کی — خاک میں مل گئی بہار افسوس
شدتِ غم سے کیوں نہ ہو جائے — دامنِ صبر تار تار افسوس
صدمہ و ابتلائے پیہم سے — دلِ ملت ہے داغدار افسوس

ہیں ہرے آج زخمہائے جگر
آہ تازہ ہوا غمِ جوہر

اٹھ گیا وہ مجاہدِ اسلام — غرق ہے گرد و فقِ غم میں مصر و شام
وہ مجاہد کہ زندگی جس کی — تھی سراپا جہاد کا پیغام
وہ اولوالعزم قائدِ ملت — جس سے تھی تازہ شوکتِ اسلام
وہ بہادر کہ ہر ادا جس کی — جرأت آموزِ صد دلِ ناکام
وہ وطن دوست جس نے پہنچایا — گوشہ گوشہ میں حریت کا پیام
تھا وہی زیبِ مسندِ اسلاف — تھا وہی آج جانشینِ عظام
اجمل و جوہر و تصدق کا — اس کی ہستی پہ ہو گیا اتمام
آہ ہوتے ہیں اب کہاں پیدا — ایسے عالی ہمم زعیم ہمام
عہدِ حاضر کے سرفروشوں میں — اس مجاہد کا تھا بلند مقام
تھا وہ ملت کا قائدِ محبوب — تھے فدا اس پہ سب خواص و عام
روز و شب جد و جہدِ بے پایاں — تھا یہی اس کی زندگی کا نظام
مرتے دم تک شکست دے نہ سکی — اس کی ہمت کو گردشِ ایام
رشک ہے اس کی موت پر سب کو — مر کے پائی ہے وہ حیاتِ دوام
رو دے جی بھر کے آج اے ملت — کہ ہے یہ آخری وداع کا ہنگام
اب وہ پیکر نظر نہ آئے گا. — یونہی ہوتی رہیں گی صبح و شام

تھکنے والے تجھے مبارک ہو — ابدی خواب گاہ کا آرام
تیری روح عظیم پر صدقے — نعمت باغ خلد کا انعام
ہو قبول اسے مسافر جنت — ہم غلاموں کا بھی درود و سلام

آج مختار و جوہر و اقبال
سبھی حاضر ہیں بہر استقبال

معارف : جنوری ۱۹۳۹ء

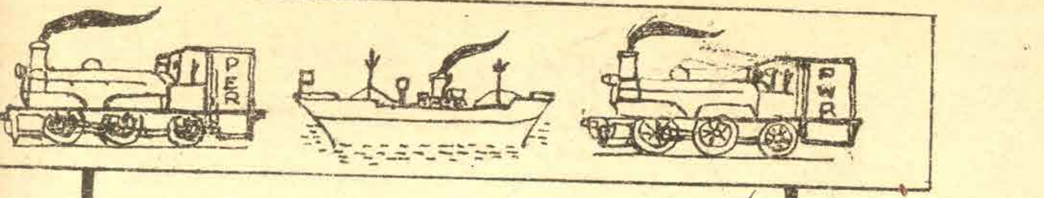

پاکستان ویسٹرن ریلوے

مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ریل اور سمندر کے ملے جلے راستے سے سامان کی براہ راست بکنگ

پاکستان کے دونوں حصوں کے درمیان ریل اور سمندر کے ملے جلے راستے سے سامان کی براہ راست بکنگ کی سکیم کی حد میں اس طرح توسیع میں مزید سٹیشن اور اشیاء شامل ہو گئی ہیں۔ ان اشیاء کی ترمیم شدہ مجموعی فہرست اور پی۔ڈبلیو۔آر اور پی۔ای۔آر کے ان سٹیشنوں کے نام جو بکنگ کے لیے درج کیے جا رہے ہیں۔

(i) وہ سٹیشن جو باہر جانیوالے مال کی بکنگ اور باہر سے آنیوالے مال کی وصولی کیلیے کھلے ہیں:۔

(الف) پاکستان ویسٹرن ریلوے: بہاول پور، بہاول نگر۔ بنوں، بھکر، چشتیاں۔ چیچہ وطنی روڈ۔ فورٹ عباس۔ گجرات۔ گوجرانوالہ حیدر آباد، ہارون آباد، جلو، خان پور، خیر پور، قصور، خانیوال ہری پور ہزارہ۔ خیر آباد (کنڈ)، خوشحال کوٹ۔ لاہور، لائل پور، لارنس پور منڈی بورے والا، مردان، میرپور خاص۔ منٹگمری۔ ملتان شہر۔ اوکاڑہ، پشاور چھاؤنی۔ پشاور شہر، چپلاں۔ کوئٹہ۔ راہوالی، رحیم راولپنڈی، سرگودھا۔ صادق آباد۔ سیالکوٹ، شکار پور، سکھر بندر، سکھر۔ واہ اور وزیر آباد۔

(ب) پاکستان ایسٹرن ریلوے: بوگرہ۔ چاند پور۔ چومہانی۔ ڈھاکہ، دولت گنج۔ دھوم۔ دیناج پور۔ جیسور۔ میمن نارائن گنج۔ راجشاہی۔ رنگ پور۔ سانتاہار۔ سلہٹ۔ کومیلا۔ شائستہ گنج۔ کھلنا۔ کشتیا۔ الیشوردی۔ بہراب بازار۔ سردار سید پور اور فرید پور۔

(ii) وہ اشیاء جن کی بکنگ ہو سکتی ہے:۔

(الف) مغربی پاکستان سے: بوٹ اور شوز، کھیلوں کا سامان اور آلات جراحی، ادویہ۔ تیل سرسوں۔ نباتاتی تیل اور گھی خشک پھل سوتی مصنوعات، گرم مصالحے۔ تمباکو۔ سنگ مرمر اور مرمری چپس۔ بریکٹس۔ لوہے کے اوزار (اس میں دستی اوزار اور چھوٹی ورکشاپ کے آلات شامل ہیں) بجلی کا سامان، پارچہ بافی کے رنگ۔ نمک۔ فوڈ اور گلوکوز۔ بلیچنگ پوڈر۔ سٹیل کے ٹیوب۔ سٹوو۔ تیل کے چولہے۔ لالٹین گھاس کاٹنے کی مشینیں۔ لوہے کے اوزار اور ہیڈ لاکس۔ ہرقسم کے پائپس۔ طباعت کا سامان۔ پرنٹنگ مشینری۔ صابن (ہمہ اقسام) نشاستہ۔ بیج (ہمہ اقسام) سٹرا بورڈ۔ چیپ بورڈ۔ کارڈ وگیسٹڈ بورڈز۔ اور پاکستانی کتابیں اور مطبوعات۔ شامیانے۔ رال۔ استر بائیسکل اور ان کے متعلقہ پرزے۔ فائر برکس۔ کنڈی ٹائر اور ٹیوبیں۔ مرچیں۔ تارپین کا تیل۔ ٹیکسٹائل مشینری اور فالتو پرزے۔ ربڑ کی مصنوعات (ہمہ اقسام) پولٹری کے استعمال کا حسب ذیل سامان۔ انکوبیٹرز۔ آئل بروڈرز یعنی الیکٹریکل کے علاوہ دیگر مشینری۔ مشینری اور مشین کے اوزار (ہمہ اقسام) اونی مصنوعات (ہمہ اقسام) ہارڈ ویئر اور پی۔ سی۔ پلاسٹک کا سامان بنا ہوا یا نہ بنا ہوا۔ رنگ اور ڈسٹمپر ڈویژن اے اور بی اور وارنش ڈویژن اے اور بی۔ پیتل کے برتن۔ مٹی کے برتن یا پتھر کے برتن۔ سویاں۔ موٹر ٹریکٹروں کے استعمال کے پرزے۔ ان جوتوں کے قالب۔ روئی (خام) ۵ ہنڈرڈ ویٹ کی گانٹھوں میں پوری طرح پریس کی ہوئی۔ تالے۔ قیمہ بنانے کی مشینیں۔ فریزرز اور پھلوں کا رس نکالنے والی مشینیں۔

(ب) مشرقی پاکستان سے: دیا سلائیاں۔ دالیں۔ سپاری۔ کاغذ اور پٹ سن کی مصنوعات۔ ہلدی۔ رسے۔ ادویہ۔ کتابیں کپڑے کے تھان۔ خشک مرچیں۔ مونگ پھلی۔ شیونگ ریزر بلیڈ۔ انڈے اور مرغیاں۔ کھل۔ چائے۔ چاول۔ املی۔ بوریاں اور ملکی ساخت کی چپلیں۔

(iii) چھوٹی اشیاء کی بکنگ:

تیل سرسوں۔ نباتاتی تیل۔ اور گھی کے سوا تمام مذکورہ اشیاء۔ (سمالز) چھوٹی اشیاء کے طور پر بکنگ کے لیے قبول کی جائیں گی۔ ریل اور سمندر کے ملے جلے راستے سے بک کی جانے والی چھوٹی اشیاء (SMALLS CONSIGNMENTS) کے لیے کم از کم قابل قبول وزن اور حجم ۱ سیر اور ۵ مکعب فٹ ہوگا۔

(iv) مغربی پاکستان میں اندرون ملک کے سٹیشنوں سے چاٹگانگ کے لیے۔ اور مشرقی پاکستان میں اندرون ملک کے سٹیشنوں سے کراچی کے لیے بکنگ کی اجازت بھی ہوگی۔

(۲) اگر تجارتی حلقوں کی طرف سے اس سکیم کی حوصلہ افزائی کی گئی تو آئندہ مزید اشیاء اور سٹیشنوں کو شامل کر کے ان انتظامات میں توسیع کر دی جائے گی۔

(۳) مزید تفصیلات کے لیے متعلقہ سٹیشن ماسٹروں سے رجوع کریں۔

چیف کمرشل منیجر

عام فہم معلومات و نکات سے بھرپور قانونی کتابیں

...ی لائسنٹ آرڈیننس تجزیہ ۱۹۶۲ء	قیمت ایک روپیہ	مزدوروں کے معاوضہ کا قانون	قیمت ایک روپیہ
...ٹ اسکیم نمبر ۷	〃 〃 〃	فیکٹریوں کے قواعد	〃 [illegible] روپیہ
...مسلم پرسنل لا شریعت ایکٹ مع جملہ ترمیمات ۱۹۶۲ء	〃 〃 〃	اچھوتوں کی روانگی کا قانون	〃 ایک روپیہ
...ٹرانسپورٹ ورکرز ہینڈ بک	〃 〃	لیبر قوانین کا اہم مجموعہ	〃 ایک روپیہ پچاس پیسہ
...عرضی نویسی (دیوانی)	〃 تین روپے ۵۰ پیسے	اصول شرع اسلام حصہ اول	〃 چار روپے
〃 (فوجداری)	〃 تین روپیہ	〃 〃 〃 〃 دوم	〃 پانچ روپے
〃 (مال)	〃 دو روپے ۵۰ پیسہ	بنیادی جمہوریتوں کا ترمیم شدہ ایڈیشن	〃 ایک روپیہ پچاس پیسہ
...ن لا	〃 ۹ روپے	بنیادی جمہوریتوں کے جملہ قواعد و ضوابط	〃 تین روپے
...ان کا نیا آئین (۱۹۶۲ء)	〃 تین روپے	مجموعہ تعزیرات پاکستان	〃 چھ روپے
...مسلمانوں کا بیاہ شادی کا قانون ۱۹۶۱ء	〃 پچاس پیسہ	مجموعہ ضابطہ فوجداری	〃 آٹھ روپے
...مسلم فیملی لاز آرڈیننس)		〃 〃 دیوانی	〃 〃
...کنٹرول آرڈیننس ۱۹۵۹ء	〃 پچھتر پیسہ	پاکستان کا قانون شہادت	〃 چار روپے پچاس پیسہ
...ترمیمات ۱۹۶۳ء		کلید وثیقہ نویسی	〃 دو روپے
...انتقال اراضی مع قوائد ۱۹۶۰ء	〃 پچاس پیسہ	ماڈرن تفتیش جرائم	〃 بارہ روپے
...کا قانون ۱۹۶۰ء	〃 پچاس پیسہ	تکمیل تفتیش جرائم	〃 ۱۵ روپے
...آرڈیننس مع ترمیمات ۱۹۶۳ء	〃 دو روپے	کریمنل لاز ترمیمی ایکٹ ۱۹۶۳ مع ضمیمہ	〃 ایک روپیہ پچاس پیسہ
...ایکٹ	〃 تین روپے	کرائم ریگولیشن ترمیم شدہ	
...عدالتوں کا آرڈیننس مع قواعد ۱۹۶۴ء	〃 دو روپے	زرعی اصلاحات مارشل لا ۱۹۵۹ء	قیمت ایک روپیہ
...اضافات مال	〃 آٹھ روپے	قوانین میں ترمیمات کا مجموعہ	〃 دو روپے پچاس پیسہ
...الضیات ترمیم شدہ تا نومبر ۱۹۶۲	〃 تین روپے	ہدایات متعلق انتقال اراضی	〃 پچھتر پیسہ
...کے ترمیم شدہ قوانین مع قواعد	〃 دو روپے	فیکٹری ایکٹ	〃 ایک روپیہ پچیس پیسہ
...ایکٹ	〃 ایک روپیہ		

مکمل فہرست کتب طلب کرنے پر مفت بھیجی جاتی ہے

منصور بک ہاؤس کچہری روڈ، انارکلی، لاہور

سیرت محمد علی از سید رئیس احمد جعفری ندوی

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کی مفصل اور مکمل سوانح عمری جس کا دیباچہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (نائب
جمہوریہ ہند) اور مقدمہ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے لکھا ہے۔ یہ کتاب ایک طرف تو مولانا محمد علی جوہر کے کردار ا
سیرت، شخصیت اور خدمات ملی، ملکی، ایثار و قربانی، اسلامیت اور للہیت کا نہایت دلچسپ اور مستند مرقع ہے
دوسری طرف محمد علی کے عہد کی ملی اور ملکی سیاست کا آئینہ بھی ہے۔ قاضی ولی محمد حبیب سیکرٹری بھوپال (مصنف
سفرنامہ اندلس) کی رائے تھی کہ اس کتاب کو یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب درس شامل ہونا چاہیے۔
پہلے پہل اس کتاب کو مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی نے شائع کیا تھا۔ دوسرا ایڈیشن مصنف کی نظر ثانی کے بعد پاکست
میں ہماری فرم نے شائع کیا ہے۔ کتابت، طباعت اور کاغذ بہترین قیمت صرف چھ (۶) روپے۔

رئیس احمد جعفری کی چند اور کتابیں

تراجم		تاریخ و ادب		اسلامیا	
مکمل ترجمہ نہج البلاغہ قیمت	۳۲-۰۰	بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد	۲۰-۰۰	سیرت ائمہ اربعہ	-۰۰
غزالی نامہ	۹-۰۰	واجد علی شاہ اور ان کا عہد	۱۰-۰۰	اسلام منزل بہ منزل	-۰۰
امام ابو حنیفہ رح	۱۵-۰۰	انوار اولیاء	۱۰-۰۰	امامت و سیاست	-۰۰
امام شافعی رح	۱۲-۰۰	دید و شنید	۶-۵۰	فاطمہ بنت محمد رض	-۰۰
امام جعفر صادق رح	۱۵-۰۰	گل کدہ	۱۰-۰۰	تلخیص البخاری	-۰۰
تاریخ تصوف اسلام	۳-۲۵	نفسیاتی علاج		صحیح مسلم مکمل ۲ جلد	-۰۰
حیدر آباد جو کبھی تھا	۱۰-۰۰	تکلیف و اذیت		امام محمد و امام ابو یوسف	-۵۰
کشمیر اور جوناگڑھ کی کہانی	۶-۰۰	فلسفہ تعلیم و تربیت		"	"

ملنے کا پتہ

شیخ غلام علی اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار۔ لاہور

ظفر احمد فاروق ندوی

سکریٹری محمد علی اکیڈیمی ۔ لاہور

حبیب احمد ندوی

... عرصے تک روزنامہ خلافت
... اور پھر مولانا شوکت علی
... والیوٹ سکریٹری رہے سراپا
... و عمل شخصیت کے مالک
... علی اکیڈیمی کی صدا پر
... لینے والوں میں پیش پیش ۔

* *

ہمدرد

سیاست و صحافت، تاریخ و تحقیق ادب و افسانہ اور شعر و سخن کی انجمن

ہمدرد صرف ایک روزنامہ نہ تھا، وہ ایک تحریک تھا، ایک پیام تھا، ایک مقصد تھا، ایک انقلاب تھا، ہمہ گیر اور ہمہ پہلو انقلاب!

آج سے پچاس سال پہلے اُردو زبان میں ہمدرد نے جس طرزِ صحافت کا آغاز کیا تھا ہی پر ختم ہو گیا ۔ قیس سا پھر کوئی اٹھا نہ بنی عامر میں!

ہمدرد کے مقالات، وقائع، اداریے، مراسلات، عالمِ اسلام سے متعلق تحقیقی اور تاریخی مضامین اور سب سے بڑھ کر اس کا وہ اندازِ بیان جس کی "سنجیدہ شوخی"، اور "شوخ سنجیدگی" اپنا ایک ایسا نقش قائم کر گئی ہے جو مرورِ ایام کے باوجود آج بھی تازہ ہے ۔

آئندہ صفحات میں "ہمدرد"، (۱۹۱۳ء) کے فائل سے، جو اَب نایاب ہیں وہ تحریریں ترتیب و تہذیب کے بعد درج کی جا رہی ہیں جن سے حیاتِ اسلامیہ کی پوری تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے ۔

— ★ —

بسم اللہ

ہمدرد کی اشاعت کا پہلا دور

یکم جون ۱۹۱۳ء

"ہمدرد" آج اخباری دنیا میں قدم رکھتا ہے مگر سہما ہوا۔ ہوا کہ کہیں ننگ وجود ثابت نہ ہو۔ اپریل ۱۹۱۲ء کی آخری تاریخوں میں ہمدرد نے عالم فکر سے عالم ذکر میں قدم رکھا تھا۔ اگر ہم شاعر ہوتے یا شعرا کی طرح تعلی بھی ہمارے لئے ایک جائز طرز بیان ہوتا اور "ہمدرد" کا خیال وزن اور قافیہ سے قالب میں ڈھل کر سخن سنجوں کی گرمی بزم کا باعث ہوا ہوتا، تو ہم فکر رسا کی داد خود چاہتے۔ تو دستائی کے عیب کی "تلمیذ رحمان" ہونے کے دعوے سے پردہ پوشی کرتے اور کہہ اٹھتے کہ ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

گریوں تو ہر مخلوق شئی تلمیذ رحمن ہے اور ہر چیز میں ہمہ اوست کی شان ہے اس لئے برخلاف شعراء کے اخبار نویسوں کی خود ستائی کو اپنی بے چادری سے مجوب ہونا پڑتا ہے۔ دوسرے یورپ میں آج ایک سے ایک بڑھ کر اخبار موجود ہے اس لئے جس چیز کو نوائے سروش کہہ سکتے وہ لنڈن کے "ٹائمس" اور پیرس کی "تان" کا صریح خاکہ اڑاتا تھا۔ الغرض جس گرمجوشی سے ہمارے نتیجہ فکر کا خیر مقدم ہوا اس سے ہ دل پر وہ اثر نہ ہوسکا جو مشاعرہ میں "واہ واہ" اور "کیا خوب فرمایا" سے کسی صاحب فکر رسا کے دل پر ہوتا۔ اردو داں حضرات بھی تراجم کے ذ سے جانتے تھے کہ یورپ کے اخباروں اور ہندوستان کے اردو جرائد میں ایک بحر اعظم حائل ہے اور کسی کا یہ کہہ دینا کہ وہ یورپ کے اخبار کی نقل کرے گا، اسے کسی طرح ایک نئی ایجاد کے حملہ کا مستحق نہیں کر سکتا۔ لائق تحسین وہ اس وقت ہوگا جب اس دریائے ناپیدا کنار دست برد سے جو یورپ اور اس ملک کی جرائد میں بہ اعتبار ان کی خوبیوں کے حائل ہے کچھ تھوڑی سی زمین نکال کر اپنے ملک میں لا دے من چلا سوار تو یہ کہنے لگا کہ دوڑ میں شریک ہونا چاہتا ہو تو بازخوانی نہیں کی جاتی بلکہ تحسین و آفرین کا اسی وقت مستحق ہوتا ہے جب تمام گھوڑوں سے آگے پیچھے اور کر کھوے۔ اس لئے ہمارے بے شمار کرم فرماؤں کے خیر مقدم نے جو "ہمدرد" کی تحریک سے شروع ہوگیا تھا۔ ہماری ذمہ داریوں کو اور بڑھا دیا۔

ہم پھر عرض کریں گے کہ "ہمدرد" گو آج اخباری دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ مگر سہما ہوا کہ کہیں ننگ وجود ثابت نہ ہو عالم فکر سے عالم ذکر آتے آتے کم و بیش دو سال لگے تھے۔ تو عالم ذکر سے عالم عمل میں آتے آتے ایک سال سے کچھ زیادہ ہی لگ گیا

ہمارے اہل وطن میں چند اقوام اپنے تئیں دوبج کہتی ہیں اس لئے کہ ان کا عقیدہ ہے کہ وہ ایک بار سے زیادہ جنم لیتی ہیں "ہمدرد" سے فخر و مباہات کی اجازت نہیں ملتی۔ لیکن ایک طرح وہ بھی دوبج ہے اور آج دوسرا جنم لیتا ہے ۲۳ رفروری کو ایک ورقہ نکلا تھا جس اپنے تئیں نقیب "ہمدرد" کہا تھا۔ اور اپنی معذرت خود اس طرح کی تھی۔

ہماری شرمساری اور محجوبی کا یہ عالم ہے کہ چلمن سے پردے کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ تاہم خیریت یہ ہے کہ ہم سرد و گرم چشیدہ احباب کے شکووں میں ایک طرح کی تلخ شیرینی ہوتی ہے۔ یہ اگر جاری رہیں تو مزا آتا ہے اور اگر بند ہو جائیں تو یاد آتے ہیں۔ مگر قوم کے بزرگ اور مخدوم کی شکایت سننے کا زہرہ نہیں ہم اپنے احباب کو طوعاً نہیں تو کرہاً راضی کر ہی لیتے لیکن جناب قبلہ و کعبہ نواب وقار الملک بہادر مدظلہ کا والا نامہ جو ابھی موصول ہوا ہے ایک ایسی زبردست تحریک ہے جس نے صبر و شکیبائی کے آخری بند توڑ ڈالے اور "ہمدرد" کو شلوار اور بنیان پہنے خلوت کدہ سے نکل کر برہنہ پا دوڑنا پڑا۔ لیکن برائے خدا اس ایک ورقہ کو "ہمدرد" نہ سمجھے "ہمدرد" تو وہی ہوگا جس کا تعارف اس مضمون کے شروع میں مجملاً اور ۲۵ اپریل کے "کامریڈ" میں مفصلاً کیا جا چکا ہے۔ البتہ "ہمدرد" کا نقیب ہے یا اس کا حاجب و در۔

جو حضرات "ہمدرد" کے جلوس کا تماشا دیکھنے لب بام آ گئے تھے۔ انہوں نے نقیب "ہمدرد" کی آواز بھی سنی ہوگی۔ اور انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہمدرد کی سواری اس قدر دیر میں کیوں آئی "آہستہ خرام" کے حکم پر عمل کرتے کرتے اس نے اپنے تماشائیوں کو جھلا کر "خرام" کہنے پر مجبور کر دیا۔

اس داستان گو نے دوسری اور تیسری شب کی کہانی میں ساری آپ بیتی سرگذشت سنا دی ہے اس لئے از سر نو معذرت غیر ضروری ہو گئی ہے۔ اگر ہماری مجبوریوں کا یقین نہ آتا ہو تو ایک بار خود سوچ لیجئے کہ اس نو وارد کو اس قدر انتظار دکھانے میں صرف شماتت ہمسایہ ہی نہیں تھا بلکہ نقصان مایہ کو بھی بہت کچھ دخل تھا۔

مگر کارفرمائے حقیقی کی اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔ سلطنت عثمانیہ ترکیہ پر جو طوفان نازل ہوا اس نے اخباری دنیا میں بالعموم ابر نیساں کا کام دیا۔ اور بہت سی کھیتیاں آج اس کے طفیل لہلہا رہی ہیں۔ ممکن ہے کہ ہماری خشک سالی ہی ہمارے لئے باعث رحمت ہو اور شاعر کا وعدہ پورا ہو کہ:۔

آنکھوں میں ہی وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

اخباروں کی گرم بازاری عاشق کے گھر کی رونق سے کسی طرح کم نہیں۔ دونوں ایک ہنگامہ پر موقوف ہیں اور دونوں کے لئے "نوحہ غم ہی سہی نغمہ شادی نہ سہی"۔ اس سے ہمارا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا نخواستہ ہمارے معاصرین ترکوں کی بربادی سے خود پریشان حال نہ تھے۔ در اصل انہوں نے ایک سخت آزمائش کے زمانہ میں اپنے درد دل کا ثبوت دے کر ہزاروں لاکھوں دردمندوں کے پاس سے ترکوں کے درد کا درماں تلاش کر نکالا۔ لیکن "ہمدرد" اگر ایسی ہمدردی کے لئے وقت پر حاضر نہ ہو سکا۔ تو یقین جانئے کہ اپنے درد کا ارمان بھی حاصل نہ کر سکا۔ اور آج نوحہ غم سے بھی گھر کی رونق نہیں بڑھا سکتا۔

ہم کیا ہیں۔ اور کیا ہوں گے۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب بہتر ہے کہ کچھ عرصہ تک ہمیں دیکھ بھال کر ہمارے ناظرین خود ہی دے دیں۔ لیکن اس قدر بتا دینا ضروری ہے کہ ہمارا خیال ایک اخبار کے فرائض کے متعلق کیا ہے؟ منزل مقصود کی تشریح کے بعد ہمارے ناظرین خود اس مشعل سے ہماری رہنمائی کر سکیں گے۔ اور ہم غلط چلیں گے تو یہ کہکر ہمیں ٹوک دیں گے کہ:۔

عزم سفر مغرب و رو در مشرق؟
اے راہرو منزل پشت بمنزل ہشدار!

جس وقت "ہمدرد" کا خیال پہلے پہل ظاہر کیا گیا۔ ہمارے معاصرین نے اسی وقت سے ہمارا نہایت گرم جوشی سے خیر مقدم کرنا شروع کر دیا۔ اس لئے اگر انصاف کو بھی ہاتھ سے دے دیا جائے۔ تب بھی ہماری ممنونیت ہر قدم پر ہمارا دامن پکڑے گی۔ کہ ہم اپنی احسان مندی کا اعتراف کریں۔ ہم کو ہرگز یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ہم ایک نیا آسمان اور ایک نئی زمین تیار کرنے آئے ہیں۔

دراصل منزل مقصود ہم سب کی ایک ہے گو شاید راستے کہیں کہیں مختلف ہوں ۔ بقول ایک شاعر کے ۔ ہمارے کارنامہ زندگی کی سچی داد
کے بعد ملتی ہے ۔ کیونکہ اس وقت وہ خوشامد اور خباثت کی قیود سے آزاد ہوتی ہے ۔ مرنے والے کی خوشی یا رنج کی کوئی کیوں پرواہ کرے ۔
اگر ناراض ہوا تو کیا لے گا ۔ اور خوش ہوا تو کیا دے گا ؟ اس لئے جہاں کہیں میرے کلام پر تنقید شائع ہوتی ۔ میں اس کا بہت ٹھنڈے دل سے
مطالعہ کرتا ۔ مگر ایسے نقاد کی تمنا ہی رہ گئی جو شاعر کے لئے نور ہدایت کہا جا سکے ۔

. . . . شاید بعض حضرات ہم سے یہ امید کریں کہ "ہمدرد" چوکھی لڑے گا ، مگر ہمدرد کو درس و تدریس سے تعلق ہے نہ کہ دنگل سے ہمارا
تو ہوگا ۔

جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنئے
جو ناسزا کہے اس کو نہ ناسزا کہئے
رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہئے

ہمدرد کا فرض ہوگا کہ روز سچی خبریں سنائے ۔ ان خبروں کو پوری طرح سمجھنے کے لئے جن معلومات کا مہیا کرنا ضروری ہے وہ مہیا کر
ناظرین کے معلومات میں ہر روز اضافہ کرے تاکہ وہ خود رائے قائم کر سکیں ۔ نہ اس کے رائے کے ہمیشہ محتاج رہیں ۔

مگر یہ خیال نہ کیجئے کہ ہمدرد مسجد کا ملا ہوگا ۔ تعلیم کا اصول یہی ہے کہ ایک چیز کا اسقدر کبھی مطالعہ نہ کیا جائے کہ طبیعت اکتا جائے ہمدرد ملک
ملاگیری کے اپنی رنگینیٔ طبع سے احباب کی رونق محفل بھی ہوگا ، سیاسیات کی تو تو میں میں سب کے ساتھ نقد سخن کی جھنکار بھی سنائی دے گی ۔ افسا
مزے مزے کے افسانے بھی ہوں گے اور فلسفے کی پھیکی سیٹھی کھچڑی کے لئے لطیفوں کی چٹنی چٹنی بھی دستر خواں پر موجود ہوگی ۔ ہمدرد آپ سے سیکھ
کو سکھائے گا ۔ خود روئے گا ۔ اور آپ کو رلائے گا ۔ اور جس طرح ساون میں کبھی کبھی بادل کے ساتھ ساتھ دھوپ بھی ہوتی ہے اور دھنک بھی اپنی
بہار آرائی کی جھلک دکھا جاتی ہے ۔ ہمدرد کبھی ہنستوں کو رلائے گا ۔ کبھی روتوں کو ہنسائے گا ۔ . . . . !

سر ایڈورڈ گرے اور برطانیہ کی مسلمان رعایا

شنبہ - ۱۶ ؍ اگست ۱۹۱۳ء

برطانیہ کے وزیر خارجہ سر ایڈورڈ گرے نے اسلامی سلطنتوں کے ساتھ برطانیہ کے طرز عمل پر بحث کرتے ہوئے دارالعوام میں کہا کہ "ہمارا طرز عمل رواداری کے خلاف نہ ہونا چاہیئے۔ اور نہ ہم کو کسی اسلامی طاقت کے خلاف خواہ مخواہ اور بغیر کسی اشتعالک کے دباؤ ڈالنا چاہیئے۔ لیکن سلطنت برطانیہ کے باہر کسی مسلمان طاقت کو ان نتائج سے بچانے کے ہم ذمہ دار نہیں ہیں۔ جو اس کے اپنے فعل سے پیدا ہو"۔

گذشتہ دو سال سے جو چیخ و پکار ہندوستان کے مسلمانوں میں ٹرکی اور ایران کے مصائب سے پیدا ہوگئی ہے اس کا اتنا تو اثر ضرور ہوا کہ انگلستان کے وزرا جب کبھی غیر ممالک کے ساتھ اپنے طرز عمل سے بحث کرتے ہیں تو ملک معظم کی اس سات کروڑ رعایا کا بھی خیال کرتے ہیں۔ جو ہندوستان میں ہے۔ اور اپنے کو مسلمان کہتی ہے مگر ہم نے سوائے زبانی تشفی اور لفظی تسکین کے کبھی ان کے طریقہ عمل میں کوئی بات ایسی نہیں دیکھی جس سے یہ سمجھا جاسکے کہ فی الواقع مسلمانوں کے جذبات اور ان کی خواہشات کا کچھ خیال کیا جاتا ہے۔

بلکہ برخلاف اس کے بسا اوقات ان ذمہ دار عہدہ داران برطانیہ نے اپنے خیالات کا اظہار ایسے الفاظ میں کیا ہے جس سے صریح اس قلبی عداوت اور دلی بغض کا ثبوت ملتا ہے جو ان لوگوں کے دلوں میں اسلامی سلطنتوں کی طرف سے بھرا ہوا ہے۔ اور اس طرح گویا یہ اپنے ذاتی جذبہ کے سامنے مسلمانوں کے احساسات کی وہ پرواہ نہیں کرسکتے۔ جنگ بلقان کے متعلق حکومت برطانیہ کی روش کو جو ہم غور کرتے ہیں تو اس کے طرز عمل میں ایک عجیب اجتماع اضداد اور اختلاف قول و فعل پائے جاتے ہیں۔

سب سے پہلے ٹرکی کو اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ نتیجہ جنگ خواہ کچھ ہی ہو ملکی حد بندی میں کسی قسم کا تغیر نہ ہوگا۔ مگر جس وقت مسٹر ایسکوتھ نے سالونیکا میں یورپ کی عیسائیت کے آغاز کا خواب دیکھا اس وقت سے ان کے قومی تعصب نے برطانیہ کی پالیسی خواہ مخواہ اس طور پر بدل دیا کہ "فاتح کو فتح کے اثرات سے محروم نہیں رکھنا چاہیئے" اور پھر جب ترکوں نے دوبارہ ایڈریانوپل پر قبضہ کرلیا تو ریاست ہائے بلقان کے گلہ میں صرف ٹرکی ہی ایک سیاہ بھیڑ تھی جس کے لئے معاہدہ لندن کی پابندی ضروری تھی۔ باقی اور ریاستوں کو ایک جدی ہونے کی حیثیت سے یہ مجاز تھا۔ کہ اپنے بزرگوں کی میراث کو جس طرح چاہیں آپس میں تقسیم کریں۔ اور معاہدہ کے ہوا خواہ صرف اس بات کی نگرانی کریں کہ ٹرکی اپنی حد سے آگے بڑھنے نہ پائے۔

ان تمام باتوں کے باوجود جب کبھی ان مدعیان عدل و انصاف کی زبان پر مسلمانوں کا ذکر آجاتا ہے تو بڑی شد و مد کے ساتھ بمصداق "مفت کرم داشتن" ہم کو یقین دلایا جاتا ہے کہ "کوئی وزیر ان معاملات پر گفتگو نہیں کرسکتا۔ بغیر اس بات کو مد نظر رکھے ہوئے کہ ملک معظم کی رعایا کروڑوں کی تعداد میں مسلمان ہے" اس کے ساتھ ہی انتہائی رعایت جس کی امید دلائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ برطانیہ کا "طرز عمل رواداری کے خلاف نہ ہونا چاہیئے"۔ اور "نہ اسے کسی مسلمان طاقت کے خلاف خواہ مخواہ دباؤ ڈالنا چاہیئے"۔ گویا سر ایڈورڈ گرے اور اس وزارت کے نزدیک جس کے وہ نمائندے ہیں "کروڑوں مسلمان رعایا" کا غالب سے بڑی اسلامی سلطنت پر"۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ وہ عدم رواداری (جسے غالباً سر ایڈورڈ گرے اور اقوام کے ساتھ جائز سمجھتے ہیں) کی دست درازیوں سے محفوظ رہیں گے۔

کی ہم نہیں سمجھتے کہ سر ایڈورڈ گرے کس بنیاد پر رعایا کی اتنی بڑی تعداد کو اپنی غیر ملکی پالیسی سے خارج کر دیتے ہیں؟ کیا مسلمانوں کی
حالانکہ جب کبھی کے اوپر اتنی ہی ہے کہ صرف اس کے "مقبوضات کے اندر مسلمانوں کے قومی جذبات اور احساسات کا لحاظ کیا جائے"۔
اپنی اور اپنے تو ہندوستان کی سرحد اور افریقہ ہیں ہم نے صرف گورنمنٹ کی خارجہ پالیسی کی حد اور اس کے اقتدار کے قائم رکھنے کے لئے
کی جانوں تک کی پروا نہیں کی! کیا اس کے سلسلے میں مسلمان برطانیہ سے سیاسات کا مطالبہ نہیں کر سکتے کہ جن سلطنتوں کے ساتھ ہم کو تاریخی
سے ہمدردی ہے برطانیہ ان کے قیام و بقا میں مدد دے یا کم سے کم ان کے دشمنوں کے ساتھ ایسے معاہدوں میں نہ شریک ہو جو ان کی تباہی
ہوں؟

کے سر ایڈورڈ گرے نے غیر ملکی معاملات میں مسلمانوں کو مایوس کن جواب دینے کے بعد اس طور پر اشک شوئی فرمائی ہے کہ سلطنت
وزیر خارجہ تمام حقوق ملحوظ رکھے جائیں گے اور ان کے تمام مذہبی جذبات کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا۔ اول تو ہم نہیں سمجھتے کہ
ان کی طرف انتظامات کے متعلق کہاں تک اپنے اوپر ذمہ داری لینے کا حق حاصل ہے۔ اور دوسرے خود ہندوستان کے اندر جس طرح
کی جا رہی ہیں وہ اسباب کا کافی ثبوت ہے کہ یا تو گورنمنٹ ہند پر وزارت کا کوئی اثر نہیں ہے، یا مسلمانوں کے جذبات کا لحاظ
کے لئے وعدہ کیا گیا تھا اس کا مقصود صرف موقع کو ٹال دینا تھا۔ یا گورنمنٹ ان جذبات کو مسلمانوں کے سچے جذبات تسلیم کرنے
صورتیں پہلی صورت یعنی گورنمنٹ ہند پر وزارت کا کسی قسم کا اثر نہ رکھنا کوئی شخص بھی تسلیم نہیں کرے گا۔ البتہ دوسری اور تیسری
ہیں جن میں سے ایک کو گورنمنٹ اور دوسری کو مسلمان تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ موجودہ واقعات جس بات کو ظاہر کر رہے ہیں
یا کم سے کم ان حکام کے نقطۂ خیال سے جو گورنمنٹ کی نمائندگی کے مدعی ہیں، مسلمانوں کا تمام جوش و خروش صرف چند امور پر مبنی ہے جن کو
بالتشریح کسی موقع پر نہیں بیان کیا ہے۔ مگر مختلف وقتوں میں مختلف طریقوں پر ان کا اظہار ہوتا رہا ہے۔

۱۔ مسلمانوں کے جذبات پر زیادہ تر گذشتہ دو برس کے اندر پے در پے ان واقعات کا اثر پڑتا رہا ہے جو ٹرکی ایران اور
پذیر ہوتے رہے ہیں۔

۲۔ مسلمانوں کی ناراضگی میں کسی قدر تقسیم بنگال کی تنسیخ نے بھی اضافہ کیا۔

۳۔ ہندوستان کے اندرونی معاملات بالخصوص واقعہ کانپور کے متعلق چند شورش انگیزوں اور بعض فتنہ پرداز اخباروں
طول دے کر کچھ سے کچھ کر دیا۔

ان تینوں دلائل کے متعلق جو بعض حکام اور برطانوی سیاست دانوں نے وقتاً فوقتاً پیش کئے ہیں ہم حسب ذیل کہنا چاہتے
تقسیم بنگالہ سے اگرچہ مسلمانوں کی ایک کثیر آبادی کو فائدہ تھا لیکن چونکہ اس کے متعلق خود رعایا کا ایک بڑا طبقہ ناراضگی کا اظہار کر
تنسیخ کا اعلان گویا ایک ایسی زبان سے کرایا گیا جس کا احترام ہندوستان کی قدیم روایات ملکی رسم و رواج اور مشرقی افتادِ طبیعت
کہ اس کی مخالفت بعض اوقات مذہبی گناہ کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ اس لئے مسلمانوں نے آج تک اس کے خلاف آواز تک نہیں نکالی
بات سے ایک گونہ خوشی ہوئی کہ وہ عظیم فصل جو ان کے اور ان کے ملکی بھائیوں کے درمیان بدقسمتی سے پیدا ہو گیا تھا، اب وصل ہو
اگرچہ اس سودے میں مسلمان کسی قدر خسارے ہی میں رہے۔ البتہ حضور وائسرائے نے جو مراسلہ صاحب وزیر ہند کو بھیجا تھا۔ اس
جرأت دلائی کہ وہ بھی اپنے مطالبات کو گورنمنٹ میں پیش کرنے میں پس و پیش نہ کریں۔ اور وہ مسلمان جو وفاداری کے بے غلط

لکھے ہوئے تھے کہ :-

اگر شہ روز را گوید شب است ایں
بہ باید گفت اینک ماہ و پرویں

اس بات سے آگاہ ہو گئے کہ قوم کے صحیح اور سچے جذبات کو چھپانے کی کوشش کرنا ایک اخلاقی جرم ہے - اور لارڈ مارلے، لارڈ ہارڈنگ اور لارڈ کریو کے اقوال سے ان کی ہمت بندھی کہ قوم کے صحیح اور سچے جذبات کو بہ جنسہ گورنمنٹ تک پہنچا دیں اور اپنے حقوق کے طالب ہوں

ترکی اور ایران کے واقعات نے جو کچھ ان کے دلوں پر اثر کیا وہ اظہر من الشمس ہے اور ان کی وجہ سے جو صدمے ان کے دلوں کو پہنچے ہیں اسے خود گورنمنٹ بھی اتنا ہی تسلیم کرتی ہے - جتنا کہ ہم محسوس کرتے ہیں - فرق صرف اتنا ہے کہ جہاں ہم ان کی بنیاد پر گورنمنٹ سے ہمدردی اور انتظامات ملکی میں ان احساسات کو ملحوظ رکھنے کی امید کرتے ہیں، وزراء ایسی مصلحتوں کی بنیاد پر جنہیں وہ بہ زعم خود زیادہ اہم سمجھتے ہیں ، ان کو ناقابل لحاظ سمجھتے ہیں - اور یہ پہلی بنیاد ہے اختلاف کی ہے - جو آج کل اس درجہ نمایاں ہے - اور جس قدر زیادہ ہماری طرف سے مسلمانوں کے احساسات کی اہمیت جتلانے کی کوشش کی گئی ہے - اسی قدر دوسری طرف سے ضد بڑھتی گئی - شاید اس وجہ سے کہ تنسیخ تقسیم بنگالہ کے اقتدار کش اثرات سے متاثر ہو کر یکایک گورنمنٹ نے ایشیائی "مفہوم اقتدار کو" اپنے ذہن نشین کر لیا - اور مسلمانوں نے مغربی حقوق رعایا کو صحیح معنوں میں سمجھنا شروع کر دیا - علاوہ اس کے مسلمان آزادی اور عصبیت کی حقیقت کو روز بروز زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھنے لگے انہیں یورپ کے موجودہ طرز عمل سے یہ یقین بھی پیدا ہو گیا - کہ ان کا وجود خطرے میں ہے اور دنیا کے پردے پر جہاں کہیں ان کی تھوڑی یا بہت آزادی باقی ہے - یورپ اس کے مٹانے پر تلا ہوا ہے - یہ خطرہ حالات موجودہ کو دیکھتے ہوئے بالکل حقیقت معلوم ہوتا ہے - اور مسلمان کسی طرح اس کی طرف سے مطمئن نہیں ہو سکتے - تاوقتیکہ وہ حکومت جس پر ان کی حفاظت کا بار ہے ان کی تسکین اور تشفی کے لئے عملی ذرائع نہ اختیار کرے - ہندوستان کی اندرونی بے چینی کے واقعات بالکل حالی ہی میں ظہور پذیر ہوئے ہیں جو ہم گن سکتے ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم اور بادی النظر میں سب سے زیادہ نمایاں کانپور کا حادثہ جانکاہ ہے - ہمارے خیال میں یہی ایک واقعہ ہے جس پر قوم و جملہ اخبار بین و نا اخبار بین، شہری و دیہاتی، کانگریسی اور کانفرنسی پروانہ وار جان تک نذر کر دینے کے لئے اٹھ اٹھ کر اکٹھے ہو رہے ہیں اور یہ ایک واقعہ ہے جس کی افسوسناک صورت کے بعد ذمہ دار حکام کو برملا اور بہ تکرار یہ کہنے کی جرأت ہوئی ہے کہ بیرونی مفسدہ پردازوں اور شورش پسند اخباروں نے جزو مسجد کی شہادت کو مقامی سے ہندوستانی اور میونسپلٹی سے مذہبی رنگ دے دیا ہے - ممکن ہے کہ ان ملزمان معہود ذہنی میں بھی کسی کو شرف قبولیت حاصل ہو - لیکن ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ باوجود اخباری ذمہ داری و پبلک جواب دہی کے ہم نے اس معاملہ کو جس خاموشی کے ساتھ سلجھانے کی کوشش کی جو شاید کسی اور نے نہ کی ہو - ہز آنر جیمس مینسٹن کی سرکار میں بذریعہ تار اور خطوط کے جس قدر روشنی اس معاملہ پر ہم نے ڈالی ہے وہ ناظرین کرام کی نظر میں ہو گی - لیکن جس وقت کہ ذمہ دار حکام کی اپنی غلطیوں سے یہ معاملہ طشت از بام ہو گیا - تو بجائے الزام مفسدہ پردازی کے ہمیں اپنے بھائیوں سے اس سکوت کی معذرت کرنی پڑی جو ہم نے ہز آنر کے ساتھ رسل و رسائل کے دوران میں حاکم و محکوم کے تعلقات کو خوشگوار رکھنے کی غرض سے اختیار کیا تھا - ان سب امور پر نظر ڈال لینے کے بعد بھی اگر بقول بعض اینگلو انڈین اخبارات کے مسلمان گورنمنٹ کی توقعات سے بڑھ کر ترقی کر گئے ہیں - تو آئین سیاست و فرمانروائی اس امر کی مقتضی نہیں ہے کہ مسلمانوں کو ان کی ذہانت و ذکاوت پر الزام دیا جائے - بلکہ خود گورنمنٹ کا فرض ہے کہ جس انصاف شفقت اور رعایا پروری سے مسلمانوں کے سیاسی، تعلیمی، اخلاقی و معاشرتی نشوونما میں خود باغبانی کرتی رہی ہے اب اس انصاف، شفقت اور رعایا پروری کو ملحوظ رکھ کر مسلمانوں کی موجودہ حسیات و ضرورت کا

مطالبہ کرے گی ۔ اور جس طرح سے لارڈ منٹو نے ہندوستان کے نئے حالات وضروریات کے مطابق ریفارم اسکیم کے نافذ کرتے مفہوم اقتدار کی آئین جہانبانی نہیں سمجھا اور نہ اس کے اجرار کرنے میں اپنی سابقہ پالیسی کی ہتک خیال کیا ۔ اسی طرح ہم لارڈ لارڈ ہارڈنگ سے ملتجی ہیں کہ وہ مسلمانان ہند کی حقیقی محسوسات کی تحقیقات کریں ۔ اور جو کچھ مسلمانان خود گورنمنٹ ہی سے مانگتے ہیں ان کو عنایت کریں ۔

"جوہر" —— "علی برادران"

ضمیمہ

ہمدرد
روزانہ

سہ شنبہ ۲۱ اکتوبر سنہ ۱۹۱۳

برقیات

—○•○—

انجمن ضیاء الاسلام کو سلطانی عطیہ

—:*:—

بمبئی ۱۹ اکتوبر ہفتہ کی شام کو ایک گارڈن پارٹی میں انجمن جس میں ضیاء الاسلام کی طرف سے ترکی کی قونصل جنرل خلیل خالد بی اے ۔ اے (کینٹب) کی خدمت میں ایک اڈریس پیش کیا گیا جس کی جواب میں صاحب موصوف نے فرمایا کہ مسلمانان ہندوستان نے جو برمحل اور ضروری مدد ترکی اور اسکی سپاہیوں کی کی ہے وہ تمام دنیا کی مسلمانوں کی مدد سے زیادہ ہے، جسکی وجہ سے حضور سلطان المعظم مسلمانان ہندوستان کی از حد مشکور ہیں ۔ انہوں نے یہہ بھی فرمایا کہ انگلستان ترکی کا دوست ہونیکی وجہ سے ہمکو ہر طرح مدد دیگا ۔ بغداد ریلوے کی کہانی کے متعلق انہوں نے فرمایا کہ یہہ ریل مسلمانان ترکی اور ہندوستان کے آپس میں لین دین سے تجارت کو بہت فائدہ پہنچائیگی جو کہ دونوں کیلئے بہبودی کا باعث ہوگا ۔

کلکتہ کی مسلمانوں کا جلسہ

—:•:—

کلکتہ ۱۸ اکتوبر ۔ کلکتہ کی شرفا کا ایک جلسہ کل سہ پہر کو ٹاؤن ہال میں کانپور کی ماخوذین کی رہائی اور مسجد کانپور کی فیصلہ پر وائسرائے کی شکریہ کیلئے منعقد ہونے والا ہے ۔ شہزادہ غلام محمد صاحب صدر نشین ہونگے اور مقرروں میں آنریبل فضل حق ۔ آنریبل محمد طاہر اور آنریبل نواب علی چودھری صاحبان ہونگے ۔ یہہ جلسہ کانپور کی فیصلہ کے بعد کلکتہ کی مسلمانوں کا پہلا قائم مقام جلسہ ہوگا ۔ اسمیں جو ریزولیوشن پاس ہونگے وہ کلکتہ کی مسلمانوں کی صحیح خیالات کی مترجم ہونگے ۔ گذشتہ کل کی جلسہ میں کوئی مسلمان لیڈر جو انکی رزولیوشن سے پورا اتفاق نہیں رکھتا تھا نہیں گیا ۔

—:•:—

بنگالی قوم پرستوں کا جلسہ

—:•:—

تصفیہ کانپور کی تائید میں

—:•:—

جنوبی افریقہ کے ہندوستانی

(چہار شنبہ ۱۹ - نومبر ۱۹۱۳ء)

جن لوگوں نے کل کی اشاعت میں جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے حالات پڑھے ہوں گے ان کے دل یقینی اپنے ہم وطنوں کے مصائب سے پاش پاش ہوں گے اور ساتھ وہ اس کا بھی اندازہ کر سکتے ہوں گے کہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے ساتھ کس قسم کا سفاکانہ اور ظالمانہ کاروائیاں روا رکھی جاتی ہیں۔ مسٹر گاندھی جیسا خیر خواہ ملک اور ہمدرد وطن اس وقت جیل میں ہے اور مسٹر داؤد محمد پریذیڈنٹ نٹال انڈین ایسوسی ایشن لکھتے ہیں کہ جو ہندوستانی کام پر جانے سے انکار کرتے ہیں وہ تازیانوں اور ڈنڈوں کے زور سے بھیجے جاتے ہیں۔ گورنمنٹ نے اکثر کانوں کے احاطہ کو جیل خانہ قرار دے دیا ہے۔ اور وہاں سے بھاگنے والے کو گولی مار دینے کی اجازت دے دی ہے سینکڑوں ہندوستانی کوڑے مار مار کر کام پر بھیجے گئے ہیں اور کئی پر گولیاں چلائی گئیں جن میں سے دو زخمی بھی ہوئے۔

یہ حالات ایسے ہیں کہ جن کو سنکر ہر ایسے شخص کا دل جس میں انسانیت ہوگی ضرور ان بے کسوں کی ہمدردی سے بے چین ہوگا خصوصاً ہندوستانیوں کا جن کو ان کے ساتھ دعوے ہم وطنی بھی ہے۔ ہمارے لیے یہ وقت سخت امتحان کا ہے اور اگر اس وقت ہندوستانی اپنی عزت آپ نہ قائم کر سکے تو آئندہ ان کے لیے دنیا کے ہر حصہ میں ذلت و خواری مقدر ہے۔

یونین گورنمنٹ اس وقت اپنے طرز عمل سے ثابت کر رہی ہے کہ اس کو نہ تو ہندوستانیوں کے ساتھ ہمدردی ہے اور نہ امپیریل گورنمنٹ کی مصالح ملکی کی پرواہ ہے۔ جو سختیاں ہندوستانیوں پر اس وقت جنوبی افریقہ میں ہو رہی ہیں اگر شاید اس کا دسواں حصہ بھی کسی ملک میں غیر ملکی رعایا کے ساتھ روا رکھی جائیں تو یہ بات یقیناً ان کے سیاسی تعلقات کو منقطع کر دینے کے لیے کافی ہوگی۔

لیکن اگر یونین گورنمنٹ اس وقت ہماری تذلیل اور ہماری حق تلفی کے درپے ہے تو ہمارا بھی فرض ہے کہ مردانہ وار ان سختیوں کا مقابلہ کریں اور جہاں تک ہمارے دست و بازو میں قوت ہے خدا پر بھروسہ کر کے اپنے مساعی ان مصیبتوں کے خلاف عمل میں لائیں۔ ہمارے لیے یہ بات بہت امید افزا ہے کہ خود ہماری گورنمنٹ ہمارے ساتھ ہے۔ اور امپیریل گورنمنٹ اور انگلستان کے با اثر اصحاب کی ہمدردی بھی مظلوم ہندوستانیوں کے ساتھ ہے۔ لیکن یہ امر قابل افسوس ضرور ہے کہ امپیریل گورنمنٹ باوجود ہندوستان اور جنوبی افریقہ کے مشترکہ حکمران ہونے کے اس بارے میں اپنا اثر جنوبی افریقہ پر ڈالنے سے ابھی تک قاصر رہی ہے جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کی اعانت یا با الفاظ دیگر اپنی عزت کی حفاظت کے لیے ہم کو اس وقت حسب ذیل

ذرائع اختیار کرنے ضروری ہیں۔

(۱) جنوبی افریقہ کے مصیبت زدوں کے لیے کافی چندہ فراہم کرنا تاکہ وہ استقلال کے ساتھ خاموش مقابلہ میں رہ سکیں۔

(۲) گورنمنٹ ہند کے ذریعہ سے امپیریل گورنمنٹ کو متوجہ کرنا تاکہ وہ بہ حیثیت مرکزی حکومت ہونے کے ا[عضاء] اعضاء کو باہمی تصادم سے باز رکھ سکے۔

(۳) اگر یونین گورنمنٹ اہل ہند کی مخالفت پر قائم رہے تو ہندوستان میں ایسے قوانین کا اجراء جن کے ذریعہ سے [ا]ہم بدسلوکی کا انتقام لے سکیں جو ہمارے ساتھ جنوبی افریقہ میں روا رکھی جاتی ہے۔

سلطنتِ برطانیہ اور اسکی مسلمان رعایا

(پنجشنبہ ۱۱ ستمبر ۱۹۱۳ء)

جنگِ طرابلس کے زمانہ سے اب تک مسلمانوں نے طرح طرح سے حکومت برطانیہ کو اس طرف متوجہ کیا کہ وہ اپنی مسلمان رعایا کے جذبات کا لحاظ کر کے ٹرکی اغراض و مقاصد کی حمایت کرے اور اسے ہر قسم کی بے جا دست درازی سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے برطانیہ کی وزارتِ خارجیہ کی طرف سے اسی قسم کی درخواستوں کا جواب مختلف طور پر دیا گیا لیکن تمام جوابوں کا خلاصہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ مسلمانوں کو برطانیہ کی خارجی پالیسی سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ انہیں اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ بیرونی معاملات میں برطانیہ سے توقع رکھیں کہ ان کی درخواستوں پر عمل کیا جائے گا۔ اگرچہ مسٹر اسکوئتھ، لارڈ گرے اور دوسرے وزراء نے اس قسم کا جواب دیتے وقت یہ خیال رکھا ہے کہ نفسِ مطلب کو بیان کرنے سے پہلے مسلمانوں کے مذہبی حسیات کے احترام کا ذکر کر دیتے ہیں اور یہ کہہ دیتے ہیں کہ ان کے "جذبات کا لحاظ رکھا جائے گا۔" لیکن جب ہم ان وزراء کے ان دلی خیالات اور ان ارادوں کو دیکھتے ہیں جو اکثر اوقات ان کی زبانوں سے ظاہر ہوتے رہے ہیں تو ہم کو یقین ہو جاتا ہے کہ ان کا رویہ ٹرکی کے ساتھ دوستانہ نہیں ہے اور گورنمنٹ کی طرف سے بھی جو جنگ طرابلس اور بلقان کے زمانے میں "غیر جانب داری کا اعلان" کیا گیا تھا، اس پر جس طریقے سے عمل درآمد کیا گیا ہے اس سے ایک طرف تو ٹرکی کے ساتھ سرد مہری اور دوسری طرف اتحادیوں کی ہمدردی کا لوگوں کو شبہ ہوتا رہا ہے۔ پھر بھی گورنمنٹ نے جس طریقے پر ان اتحادیوں کی بے جا طرف داری سے احتراز کیا ہے اسے ہم ضرور مسلمانوں کے اس اثر پر محمول کرتے ہیں جو برطانوی حکومت کی کثیر التعداد رعایا ہونے کی وجہ سے انہیں حاصل ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا برطانیہ کی خارجی پالیسی پر مسلمانوں کا کوئی اثر پڑنا چاہیئے یا نہیں اور ایسا ہونا ممکن ہے یا نہیں۔ ٹائمس آف انڈیا لکھتا ہے کہ "مسلمانوں کو معلوم ہو جانا چاہیے کہ سلطنت کی مجموعی پالیسی میں ان کی کیا حیثیت ہے؟ ان کو حق حاصل ہے کہ بالخصوص مقدس مقامات کے متعلق وہ برٹش گورنمنٹ کو اس حد تک ذمہ دار سمجھے جیسا کہ مسٹر ایڈورڈ گرے نے بیان کیا ہے لیکن نہ تو وہ اور نہ حکومت کی رعایا کے کسی اور طبقہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ یہ خیال کرے کہ ایک وسیع سلطنت کی پالیسی ان کے ہم مذہبوں کی اغراض کے ماتحت ہوگی۔ ہم کو اس بات کے تسلیم کرنے میں کوئی اعتراض نہیں کہ کسی سلطنت کی پالیسی بھی اتنی ہی وسیع ہونی چاہیے جتنی کہ ان کی وسعت ہے۔ لیکن مسلمان جو درخواست کرتے ہیں وہ اس وسعت سے باہر ہے یا ان کی درخواست کسی اور فرقہ یا طبقہ کی اغراض کے مخالف ہے؟ اس بات کے مان لینے میں کسی کو بھی عذر نہ ہوگا کہ حکومتوں کا طرزِ عمل زیادہ تر رعایا کی خواہشات اور جذبات کے ماتحت ہوتا ہے، اور برطانوی حکومت

لیکن ہیں۔ ہندو سب سے زیادہ ہیں یہ لحاظ تعداد ہندو، مسلمان اور عیسائی اجو ہیں یہ لحاظ تعداد ہندو سب سے زیادہ ہیں۔ لیکن
یساہیہ لحاظ مذہب صرف تین طبقے ہیں، یعنی ہندو، مسلمان اور عیسائی۔ ان میں سے عیسائی یا تو صرف، برطانیہ کے با
رہ گئے عیسائی، اور مسلمان ان میں سے
اغراض و مقاصد زیادہ تر ہندوستان سے وابستہ ہیں
ہیں یا ان نوآبادیوں میں رہتے ہیں جنھوں نے اپنی اغراض کو بہت حد تک مقامی بنا لیا ہے اور اپنے لعنفارت کو مرکزی
آزاد کرنے کی کوشش میں ہیں اگر ان ممالک پر نظر ڈالئے جن کے اندرونی اور بیرونی انتظامات کا تعلق زیادہ تر مرکزی گورنمنٹ
ہے، تو ان میں زیادہ تر وہ ممالک شامل ہیں جن میں بکثرت مسلمان آباد ہیں۔ ہندوستان کے علاوہ مصر و سوڈان جس
ملکیت کا دعویٰ کرنے کو تیار ہے کا بیہ مسلمانوں سے آباد ہے، اور ایران و مسقط و عمان جہاں تازی برطانوی حلقہ جات
گئے ہیں۔ خالص اسلامی ممالک ہیں۔ ایسی حالت میں اگر مسلمان جو بہ لحاظ آبادی دس کروڑ سے زائد ہوں گے اور بہ لحاظ
دوبارہ عظمیٰ دل کے وسیع حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں، اس بات کے خواہش مند ہوں کہ اپنی خارجیہ پالیسی میں برطانیہ ان
کو ملحوظ رکھے جو بلحاظ ہم مذہبی کی حیثیت سے اس کثیر آبادی کو دوسرے اسلامی ممالک مثلاً مصر، ٹرکی، طرابلس و ایران سے
ہے تو ہم نہیں سمجھتے کہ ان کے دعوے کو کون معقول پسند سیاستدان بے جا تصور کرے گا۔ کیا برطانیہ اس بات سے
کہ ٹرکی کی کمزوری اسے اتنا فائدہ نہیں پہنچا سکتی جتنا کہ اپنے رقیبوں کے مقابلہ میں اس کے لئے اندرونی استحکام ضرور
مسلمانوں سے جو امداد بیرونی متنازعات کے موقعہ پر اسے مل چکی ہے، وہ محتاج بیان نہیں لیکن آئندہ کے لئے بھی اس
ہونا چاہیے اس لیے کہ اب اسے اپنے استحکام اور بقا کے لیے ایشیا میں مقابلے کرنے پڑیں گے۔ جن کے لیے اس
چند سالوں کے اندر اپنی غلط پالیسی سے سامان پیدا کر لیا ہے۔ اور ان مقابلوں میں سلطنت کی حدود کا لحاظ رکھتے ہوئے
لیے کوئی دوسری نظم برطانیہ کے لیے کارآمد نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسے بدیہی دلائل کے باوجود بھی برطانیہ مسلمانوں کو اپنی غیر
سے خارج کرنے پر مصر ہے تو آئندہ کسی غیر متوقع نتیجہ کے پیدا ہونے کا وہ خود ذمہ دار ہوگا۔

مڈغاسکر میں اسلام

یکشنبہ ۳ر اگست ۱۹۱۳ء

سولھویں صدی عیسوی تک اہل یورپ کو اس جزیرہ کی عدم وجود کا بھی پتہ نہ تھا۔ سب سے پہلی دفعہ ۱۵۰۱ء میں پرتگال کے ملاح اس جزیرہ پر اُترے لیکن اس زمانے سے کئی صدی پیشتر اہل عرب نے اس کو دریافت ہی نہیں کر لیا تھا۔ بلکہ شرقی اور شمالی مغربی سواحل پر بستیاں بھی بنا لی تھیں۔

صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ عرب کس سن میں مڈغاسکر پہنچے۔ اس مسئلہ کے متعلق طویل بحثیں ہو چکی ہیں۔ مگر کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا اور اس معاملہ میں سوائے قیاس کے، غالب قیاس کے، یقینی بات نہیں کہہ سکتے۔ غالباً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب ہجرت سے پیشتر یہاں پر آئے۔ مشہور سیاح فلیکورٹ جو فورٹ ڈوفن کے فرانسیسی گورنر تھے اپنی ایک کتاب میں "ذفی ابراہیم" (ابراہیم کے چھوٹے بچے) کی قوم کا حال لکھتے ہیں جس نے اس وقت سینٹ میری کے جزیرہ میں اقامت اختیار کی لیکن انہوں نے اس وقت تک مذہب اسلام اختیار نہیں کیا تھا۔ موسیو الفریڈ گرانڈیر کا یہ خیال ہے اور جس کے لئے وہ بہت سے دلایل بھی اپنے پاس رکھتے ہیں کہ "ذفی ابراہیم" کا قبیلہ عرب سے غالباً اس وقت رخصت ہوا ہوگا جب کہ (حضرت) محمد (صلعم) کی مذہبی اصلاحات کی وجہ سے ملک میں بہت گڑبڑ پڑ گئی تھی۔ لیکن ذفی ابراہیم کے ترک وطن کے بعد بہت سے تارکانِ وطن ان کے پیچھے پیچھے گئے جنہیں یا تو سیر و سیاحت کا شوق کشاں کشاں لے گیا اور یا مخالف ہوا کی وجہ سے موزمبیق کے آبنائے میں داخل ہو گئے۔ اس کیمپ میں اکثر رسول مکہ (صلعم) کے پیرو تھے۔ اس طرح سے عیسائیت سے عرصہ دراز پہلے اسلام مڈغاسکر میں رونپذیر ہوا۔ جہاں ہر نیک مسلمان گویا اسلام کا واعظ تھا۔

مڈغاسکر میں اسلام کی تاریخ دو حصوں میں منقسم ہو سکتی ہے۔ پہلا حصہ تو وہ ہے کہ جس میں اہل عرب زمانہ ہجرت میں آئے اور سترھویں صدی عیسوی تک برابر آباد رہے۔ دوسرے یعنی موجودہ حصہ کا آغاز اٹھارھویں صدی سے ہوتا ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ عربوں کی سلطنت جو مڈغاسکر کے ساحل کے بار پھیلی ہوئی تھی۔ یک قلم غارت کر دی گئی۔ پہلا حصہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے مادی یا سیاسی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس اثنا میں مڈغاسکر شرقی اور شمالی مشرقی آبادی وہاں کے اصلی باشندوں ملنے جلنے لگی تھی۔ حتیٰ کہ اس نے اسلام قبول کر لیا۔ دوسرا حصہ اس نمایاں خصوصیت کی وجہ سے مشہور ہے کہ اس میں فاتحوں کے اسلامی خیالات مفتوحوں میں رائج ہونے شروع ہو گئے۔ یہ عمل ہمیشہ سے جاری ہے۔ اور اس میں اس وقت سے ایک قسم کی سرگرمی پیدا ہو گئی ہے جب سے کہ آخری پچاس سالوں میں ہندوستانی تجار کا عنصر آکر مل گیا ہے۔

ذفی ابراہیم اور ذفی امینیا کے فرقے جن کی سلطنت مشرقی مڈغاسکر کے ساحل پر پھیلی ہوئی تھی ان کے حالات اس قدر زیادہ ہیں کہ وہ اس مختصر مضمون میں نہیں سما سکتے۔ اور علاوہ ازیں عوام کو غالباً اس سے کچھ دلچسپی بھی نہ ہوگی۔ ان فرقوں کی سلطنت کے نشانات وہاں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہ سلطنت آخر میں بیرونی مخالفت اور اندرونی لڑائی جھگڑوں سے بالکل تباہ و برباد ہو گئی!

یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ باوجود اس کے کہ اسلام آٹھویں صدی سے مڈغاسکر میں رائج ہے لیکن جزیرہ کے اندرونی

حصہ میں اس کا مطلق اثر نہیں۔ ان تمام صدیوں میں عربوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں صرف ساحل ہی تک محدود رہیں۔ اور انہوں نے قدیمی آبادی پر کسی قسم کا اثر نہیں ڈالا۔ حالانکہ اس نے عربوں سے حساب کتاب کے بدلے جنتری اور بعض بعض علم ہیئت کی باتیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جب عربوں کی سیاسی طاقت مغربی مڈغاسکر میں جا رہی تھی تو اس عرصہ میں جزیرہ کی قدیم آبادی نے اس قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ ان سے وہ دلی نفرت رکھتے تھے۔ یہ دلی نفرت اس وقت اور زیادہ نمایاں ہوئی جبکہ یوٹین حکومت نے عربوں کی حکومت کو مغلوب کر لیا۔ اس کے بعد عربوں نے فقط ذہنی اور تجارتی ترقی کرنے پر اکتفا کیا جو تمام کی تمام انہیں میں تھی۔ بہت عرصہ تک قدیم آبادی کی مخالفت شد و مد سے جاری رہی۔ اور اس زمانہ میں اسلام کو بہت ہی کم ترقی نصیب ہوئی۔ لیکن یہ تمام تعصب اور مخالفت کا جوش جاتا رہا۔ انیسویں صدی سے اسلام بڑے زور و شور سے ترقی کر رہا ہے اور وہاں کے لوگ مراسم اور شعائر اختیار کرتے جاتے ہیں۔ عربوں نے وہاں عورتوں سے شادی کی جنہوں نے رفتہ رفتہ اسلام کو قبول کر لیا۔ ہمیں معلوم "سکالادا" قوم کی ملکہ نے بھی اسلام قبول کر لیا ہے۔ اور باوجود تبدیلی مذہب تخت سلطنت پر متمکن ہے۔

جزیرہ کی مسلمان آبادی آج کل اسلام کے پھیلانے کی سخت کوشش کر رہی ہے۔ یہ تحریک ان ہندوستانی تجار کی پیدا کردہ جو بحر ہند میں تجارت کرتے ہیں۔ بلکہ یہ ذاتی طور پر پچاس برس سے روپذیر ہو رہی ہے۔ ہر نیک مسلمان اس جزیرہ میں واعظ کا ہندوستانی اس تحریک میں کوئی حصہ نہیں لیتے۔ اور نہ وہاں کے مسلمانوں کے مشن میں مداخلت ہی کرنی چاہتے ہیں۔

اس تحریک کا اصلی سبب وہ بیداری ہے جو آج کل اسلامی ریاستوں میں پائی جاتی ہے۔ حال ہی میں عرب اور زنجبار کے مبلغوں نے گاؤں در گاؤں اور مختلف بندرگاہوں پر جا کر اپنے مقدس مشن کی براہ راست تبلیغ کی ہے وہاں کی اصل آبادی پہلے موتیوں اور ہڈیوں کے طور پر استعمال کیا کرتی تھی۔ مگر اب قرآن شریف کی آیتوں کو لکھ کر تعویذ بنا لیا جاتا ہے۔ مردوں کی نسبت عورتوں میں اسلام رائج ہے۔

اگرچہ شمالی مغربی حصہ ملک کی آبادی اسلام کی تعلیم کو پورے طور پر نہیں سمجھ سکتی۔ تاہم اسلامی جماعت میں اپنے آپ کو شمار اور اسلام کی روح سے سرشار نظر آتی ہے۔ چنانچہ محاربہ ٹرکی و بلقان کے آغاز پر یہ روح اور سپرٹ پورے طور پر ظاہر ہو گئی۔ کیونکہ ایسا معاملہ تھا جب کہ دنیا کے تمام مسلمانوں نے خواہ شیعہ ہوں یا سنی۔ عرب ہوں یا ہندی۔ خلیفۃ المسلمین کی امداد کے لئے چندے جن پر "کمبخت عیسائیوں" نے حملہ کر دیا تھا۔ یہاں مسلمانوں نے یہ بات ظاہر کی تھی کہ ترک کبھی مفتوح نہیں ہوں گے اور ہم خطرات کے وقت تعالیٰ اپنی نادیدہ طاقت سے دشمنوں کو غارت کر دے گا۔ اس جنگ کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ نام نہاد مسلمان بھی اسلام سے پورے طور پر گئے۔ اور خلیفۃ المسلمین کی الفت و محبت ان کے دلوں میں جاگزین ہو گئی۔

یہاں کے مسلمان بالعموم جاہل ہیں۔ حال ہی میں حدیدہ سے چند باثر اور تعلیم یافتہ عرب پہنچے ہیں۔ جو قرآن شریف کی تعلیم سے واقف ہیں۔

مڈغاسکر کے مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۷۵ ہزار ہے۔

(مسلم ورلڈ)

(…الرحمن بجنوری مرحوم کے قلم سے)

سرویا میں اِسلام

چارشنبہ ۱۱ر جون ۱۳ ۱۹ء

میں نے کامریڈ میں مسلمانان چین اور روس کے متعلق مختلف مضامین کو گہری دلچسپی سے پڑھا ہے - اور اس مطالعہ کا اثر ہے کہ میرے دل میں قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوا کہ قسطنطنیہ جاتے ہوئے میں سرویا اور بلغاریہ کے مسلمانوں سے واقفیت حاصل کروں - مجھے ان ریاستوں میں تقریباً دو ہفتے تک ٹھیرنے کا اتفاق ہوا - اور میں خوش ہوں کہ اس قلیل عرصہ میں مجھے کافی مواقع مل گئے - جن کی وجہ سے میں سچے اور قابل اعتبار حالات معلوم کرسکا -

سرویا میں "نعشی" اور دارالسلطنت میں مقیم رہا - بلگیریہ میں مجھے حضرت شیخ المفیتا کے مہمان ہونے کی عزت نصیب ہوئی - اور زیادہ تر یہی بزرگ میری معلومات کا ذریعہ ہیں - محمد رمزے بے تقریباً تیس سال کے ایک نوجوان عالم ہیں - لیکن کوئی شخص جس نے ہمارے ہندوستان کے علمار دیکھے ہیں - ان کے عالم ہونے کی نسبت رائے نہیں قائم کرسکتا - اگر ان کی وضع قطع دیکھتی ہو تو علی گڑھ کے کسی اولڈ بوائے کو دیکھ لیجئے - جہاں تک ان کی محدود آزادی ان کو اجازت دیتی ہے وہ سرویا میں اپنے ہم مذہبوں کے حالات کو بہتر بنانے میں مصروف رہتے ہیں ہم نے آپس میں دنیائے اسلام کی موجودہ حالت کی نسبت اکثر مفصل گفتگو کی ہے - لیکن موقع اور محل کے خیال سے میں یہاں سرویے مسلمانوں کے حالات لکھنے پر کفایت کروں گا -

سرویا میں ان مسلمانوں کا شمار جو سروے حکومت کی رعایا ہیں بیس (۲۰) ہزار ہے - یہ تعداد گورنمنٹ کے اندراجات کے مطابق ہے - اور خود مفتی صاحب بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں - اس کے علاوہ خاص بلگیریہ میں ایک اور دو ہزار کے درمیان غیر سروے مسلمان آباد ہیں - جو معمولی قسم کی تجارت کی غرض سے آتے ہیں - غیر ملکی بالعموم البانیا اور بوسینا کے باشندے ہیں - اور جب کبھی وہ سرویا آتے ہیں تو اہل وعیال کو تقریباً ہمیشہ اپنے پیچھے اپنے اپنے گھروں میں چھوڑ آتے ہیں - کیونکہ یہاں پر مسلمانوں کی ذاتی حفاظت کی بہت کم کفالت کی جاتی ہے -

اگرچہ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ سرویا سلطنت عثمانی کے زیر نگین تھا - مگر ان کی حکومت اور ان کے قبضہ کا کوئی نشان نہیں پایا جاتا - بلگیریہ میں ان کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے اگر اب بھی کچھ باقی ہے تو وہ چند ترکی توپوں کے علاوہ ترکی قلعہ کے کھنڈرات ہیں یا ایک حمام اور مشہور و معروف مجاہد مصطفیٰ پاشا کا مقبرہ باقی تمام یادگاریں گورنمنٹ اور دیگر عیسائیوں کے ہاتھوں تمام و کمال برباد ہو گئی ہیں - مصطفیٰ پاشا کی قبر کی لوح مقبرے کے احاطہ سے باہر ٹوٹی پھوٹی پڑی ہوئی ہے - دروازہ کی محراب کا کھتبہ سب کا مٹا دیا ہے - صرف ایک لفظ مصطفیٰ باقی رہ گیا ہے - یہ حرکت اس وقت کی گئی تھی جب کہ چند سال پیشتر عیسائی تعصب جو ہمیشہ کچھ عرصہ کے بعد ہوا کرتا ہے - بڑے زور و شور کے ساتھ پھوٹ نکلا تھا - سرویا میں اب کوئی ترک نہیں پایا جاتا - سوائے ان چھ خاندانوں کے جو نشی اور بلگیریہ میں آباد ہیں - بلگیریہ میں مجھے ایک ستر برس کے بوڑھے آدمی سے ملنے کا اتفاق ہوا - جو ترکی دور حکومت کی یادگار ہے - جب میں نے اس سے

دریافت کیا کہ اس زمانے سے لے کر اب تک ملک میں کیا کیا انقلابات واقع ہوئے ہیں تو اس نے جواب دیا کہ "آفندم" مرد
جہاں جہاں اب مکان ہیں وہاں پہلے سڑکیں تھیں۔ اور جہاں جہاں اب سڑکیں ہیں وہاں پہلے مکانات تھے۔ جہاں پہلے مساجد
اب قہوہ خانے نظر آتے ہیں۔ الغرض ہر جگہ اور خصوصاً بلگیریہ میں عیسائیوں نے کچھ نہیں چھوڑا۔ سرویہ میں مجھے پہلی وقعہ یہ
ہوئی کہ عیسائی یورپ بلقان کے مسلمانوں کے ساتھ کیا کچھ کر چکا ہے۔ اور ابھی تک کر رہا ہے۔ میرا جسم کانپنے لگتا ہے جب میں
ہوں کہ اگر یورپ کے ظالم ہاتھ کو نہ روکا گیا۔ جیسا کہ یقین ہے کہ ٹرکی روک سکے گی۔ تو خدا جانے آگے چل کر مسلمانانِ بلقان
ہونے والا ہے۔ اگر میں ایسے مضمون کو ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کروں تو مجھے ڈر ہے۔ کہ میں اس مضمون کے موقعہ
نکل جاؤنگا۔ اگرچہ میں نے جو کچھ خود اپنی آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا ہے اس نے مجھے بالکل دیوانہ کر دیا ہے۔
مسلمانوں کی مادی حالت بہت خراب ہے۔ اور جو کچھ سیاسی و اقتصادی اور تمدنی دباؤ ان پر ہمیشہ ڈالا جاتا ہے
کر کہا جا سکتا ہے کہ ان کی حالت کیوں خراب نہ ہو۔ اس کے خلاف ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ ملک بھر میں ایک مسلمان بھی دولت
سوائے چند نفروں کے جو معمولی حیثیت سے گزر کرنے کے قابل کما لیتے ہیں۔ یا قدرے فارغ البال ہیں۔ باقی سب کے
کی مزدوری کر کے پیٹ پالتے ہیں۔ سروے سیاست کا سارا رجحان یہ ہے کہ مسلمانوں کو بالالتزام مفلس بنا دیا جائے تاکہ
سے مجبور ہو کر وہ یا تو مر کھپ جائیں یا مذہب عیسوی قبول کر کے عیسائیوں میں ضم ہو جائیں۔ لیکن مسلمان اگرچہ متاع دنیوی
سے مفلس ہیں تاہم وہ ان اعلیٰ اخلاقی اور تمدنی نیکیوں اور برکتوں سے مالا مال ہیں۔ جو اسلام کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ وہ
ہر جگہ سادہ تر اور پاکیزہ تر زندگی بسر کرنے والے مشہور ہیں۔ شراب خوری، قمار بازی اور بدکاری کے اخلاقی ضیمہ ان میں نسبتاً
عیسائیوں کی بہ نسبت ان کی خاندانی زندگی بزرگ قبیلہ کے زیادہ تحت حکم ہے۔
عورتیں آزادی کے ساتھ باہر آتی جاتی ہیں۔ لیکن پردہ کا رواج ہے۔ اور ان کا تمام جسم اور چہرے کا زیادہ حصہ ڈھکا ر
ازدواج شاذ و نادر بلکہ معدوم ہے۔ غربا کے طبقہ میں مرد و عورت کا لباس عیسائیوں کے لباس سے بالکل مختلف ہوتا ہے
ہے کہ اس اختلاف کی وجہ ضروریات زندگی کی خصوصیات رسم پردہ اور عیسائیوں سے ممتاز رہنے کی خواہشیں ہیں۔
لیکن ان کی پہچان کی سب سے زیادہ آسان علامت ترکی ٹوپی ہے۔ کیونکہ یہ رفتہ رفتہ یقینی طور سے دنیا بھر کے مسلمانوں کا
بن رہی ہے۔ یہاں کے مسلمان اگرچہ نسلاً سرویے ہیں تاہم وہ اپنے غیر مسلمان ہم وطنوں سے خط و خال میں بھی مختلف ہیں۔ میر
اس کا سبب یہ ہے کہ گرد و پیش کے حالات شکل و شباہت پر اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ مسلمان سرویے عام شباہ
چلتے ہیں تو غالباً غلط نہ ہوگا۔ جو لوگ خوش حال ہیں یا ترک ہیں وہ یورپین یا ترکی لباس پہنتے ہیں۔ اور باعتبار طرز
سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔
ہر قسم کی موانعات مسلمانوں کے سر راہ ہیں۔ ان کے لئے نہ رواداری ہے نہ انصاف۔ انہیں کا ہر فرد و بشر عیسائیوں کے
دباؤ کا شکار ہو رہا ہے۔ کاشتکاروں کی حالت بعینہ غلاموں کی سی ہے۔ اور عام طور سے جو سلوک ان کے ساتھ کیا جاتا ہے
اور بے رحمانہ ہوتا ہے۔ ان کی بیخ کنی یا جبری تبدیلی مذہب کے تمام خلاف قانون اور مجرمانہ کوششوں میں گورنمنٹ ہمیشہ
ترکی گورنمنٹ کی مداخلت کی وجہ سے انہیں صرف چند ہی سال سے اس امر کی اجازت ملی ہے کہ وہ مساجد میں جا کر علانیہ نماز

ان دے سکیں - اب بھی سرویا میں چند ہی مسجدیں ہیں - اس لئے کہ گورنمنٹ مسجدیں بنانے نہیں دیتی - بلگریڈ میں صرف ایک مسجد ہے۔ تھوڑے
عرصہ کی بات ہے کہ وہاں گیا - ۱۵ مسجدیں تھیں مگر وہ سب کی سب یکے بعد دیگرے مسمار کر دی گئیں - لیکن باوجود اس کے مسلمانوں کی تعداد
میں کسی قسم کی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی - اسلام کی محفوظ رکھنے والی خوبیوں نے انہیں ہمیشہ بچایا ہے - ورنہ وہ گردوپیش کے ایسے
ناموافق حالات کی وجہ سے کبھی کے غارت ہو چکے ہوتے - یہ لوگ نہایت مذہبی خیال کے ہیں - اور ان سب کے دلوں میں اسلام کی محبت
کسی انعام کے وعدہ یا سزا کی دھمکی کی وجہ سے ان کا ایمان متزلزل نہیں ہو سکتا - اس وقت بھی جب کہ صورت حال انتہائی درجہ پر پہنچ جائے
وہ اسلام سے مرتد ہونے پر مر جانے کو ترجیح دیتے ہیں - لیکن موجودہ حالات میں مسلمانان عالم کے لئے مذہب کی قوت صرف ایک آلہ مدافعت
ہے - اور ظاہر ہے کہ یہ قوت عرصہ دراز تک ان تمام متحدہ قوتوں کا تنہا مقابلہ نہیں کر سکتی - جو مسلمانوں کی ہستی کو معرض خطر میں ڈال رہے
ہیں - اس لئے یہ ضروری ہے کہ وہ بطیب خاطر اپنی حالت میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کر لیں جو گردونواح کے حالات و واقعات کے بالکل موافق
ہو تاکہ جہد الحیات میں وہ فتح پا سکنے کے قابل ہوں - یہ تبدیلی صرف ایسی تعلیم حاصل کرنے سے پیدا ہو سکتی ہے - جو انہیں زمانہ کے نئے حالات
کے مطابق بنا دے - سرویا کے مسلمانوں میں تعلیم کی نہایت قابل افسوس کمی ہے - مگر اس میں اکیلے انہیں کی خطا نہیں - دوسری رعایا کی طرح تعلیمی
مقاصد کے لئے گورنمنٹ ان سے بھی ٹیکس وصول کرتی ہے - لیکن جو رقم وہ غیر سرکاری مدارس کی امداد و قیام کے لئے ادا کرتے ہیں انہیں اس کا
ایک حصہ قلیل بھی نہیں ملتا - مسلمانوں کی تعلیم گاہیں دراصل مکاتب ابتدائی تک محدود ہیں جنہیں گورنمنٹ سے برائے نام امداد ملتی ہے - چونکہ
مسلمان غریب ہیں اس لئے وہ بجائے خود اس سے زیادہ کوشش کرنے سے قاصر ہیں - اکثر اسلامی مدارس میں صرف ایک ہی معلم ہے - اور اکثر
اوقات اسی مدرس کو مختلف مدرسوں میں پڑھانے کے لئے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جانا پڑتا ہے - تعلیم زیادہ تر مذہب کے متعلق
ہوتی ہے - جو دوسری زبان میں دی جاتی ہے - مگر مسلمانوں کی کتابی زبان ترکی یا عربی ہے، ریاضی کے علاوہ جغرافیہ، تاریخ اور تھوڑی سی ترکی
زبان بھی پڑھائی جاتی ہے - لیکن ترکی پڑھنے پڑھانے کو گورنمنٹ شبہ اور ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے - بلگریڈ میں ایک سرکاری یونیورسٹی
ہے - مگر وہاں صرف دو مسلمان تعلیم پا رہے ہیں - جن میں سے ایک بھی سرب نہیں ہے - وہ دونوں بوسنیا کے رہنے والے ہیں - ان میں
سے ایک تو علم ریاضی حاصل کر رہا ہے اور دوسرا علم اللسان - سال آئندہ بوسنیا سے تقریباً بیس طلباء کی امید کی جاتی ہے - میں نے اس کا ذکر خاص
طور پر اس لئے کیا ہے کہ اگر تعلیم سے فراغت پانے کے بعد ان میں سے کچھ طالب علموں کو سرویا میں رہنے کی اجازت مل گئی تو وہ تھوڑے عرصہ کے
بعد تعلیمی ضروریات میں سرب مسلمانوں کو کافی مدد دے سکیں گے - لیکن مجھے اس امر کا ذکر کر دینا چاہئے کہ یہاں دو سرب ایسے بھی ہیں
جو یورپ سے فارغ التحصیل ہو کر آئے ہیں - اور جن کا تعلق مذکورہ بالا دو ترکی خاندانوں کے ساتھ ہے - ان میں سے ایک صاحب "نشی" میں ہیں
اور دوسرے بلگریڈ میں - دونوں صاحب ہائی اسکولوں میں پروفیسر ہیں - گورنمنٹ کی نگاہ میں مسلمانوں کی کچھ وقعت نہیں ہے - تو انہیں کا
ووٹ ان کے لئے برائے نام ہے - ان کو فوجی خدمت سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے - اور یہاں کوئی بھی مسلمان ایسا نہیں ہے جو کسی ذمہ دار ملکی عہدہ
پر فائز ہو - گورنمنٹ کے مسلمان ملازمین کی تعداد کلہم سو کے قریب ہے - اور یہ سب کے سب ادنیٰ درجہ کے کم حیثیت عہدوں پر ملازم ہیں -
قانوناً تو ایک مسلمان کا درجہ بھی عیسائی کے درجہ کے مساوی ہے - لیکن کسی مسلمان کو اپنے مقدمہ میں انصاف کی امید ہرگز نہ رکھنی چاہئے - جب کہ فریق ثانی
عیسائی ہو - مناکحت اور وراثت کے معاملات میں شرع محمدی کو تسلیم کیا گیا ہے - معاہدہ نکاح مفتیوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے - اور درخواستہائے
انفساخ نکاح و نزاعات متعلقہ برانہیں مفتیوں کی عدالت ہائے ازدواج ہی میں پیش ہوتی ہیں - تملیک جائیداد اور تقسیم وراثت کے

ات کی سماعت شیخ المفتیان خود کرتے ہیں۔ لیکن ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ شریعت کے قانون کو چھوڑ کر قانون دیوانی کے تحت جا
ئے۔ ان اسلامی عدالتوں میں قانون شہادت اور ضابطہ فوجداری و دیوانی بھی اسلامی ہے۔

اسلامی دنیا کے اتحاد کا خیال سرد مسلمانوں کے دلوں میں بھی موجود ہے۔ خطبہ خلیفہ کے نام کا پڑھا جاتا ہے۔ جو یہاں محمد خلیفہ محمد رسول
نسب سے یاد کئے جاتے ہیں۔

اٹلی و ٹرکی کی لڑائی نے گہرے تعلقات کے احساس کو بیدار کر دیا ہے۔ اور میں نے یہ واقعہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ مسل
وہ ہر شام شیخ المفتیان کے پاس آیا کرتے تھے۔ اور طرابلس کے مجاہدین کے متعلق تازہ خبریں سنا کرتے تھے۔ ترکوں کی فتح کے
دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ اور تقریباً ہر مہینہ ایک معتد بہ رقم انجمن ہلال احمر کے نام روانہ کی جاتی ہے۔

جو مآل و مستقبل دنیا کے دوسرے حصوں کے مسلمانوں کا ہونے والا ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ وہی مآل و مستقبل ان جیسی ہمارا مسلمانوں کا
م میں ایک قسم کی حرکت پیدا ہو گئی ہے اور جو قدم پڑا ہے آگے ہے۔ گو ایک منتظم ترقی کی جانب پڑ رہا ہے لیکن ابھی تک یہ ایک ایک
نی جہات اندھا جذبہ ہے۔ جو ایک زبردست اور باخبر قوت ارادی کا منتظر ہے۔ اور جس کا آنا اپنے وقت پر یقینی ہے۔ ما
سب کو سعی کرنا چاہئے۔

لہ عبدالرحمن سیوہاروی ۔ عبدالرحمان بجنوری مرحوم شارح کلام غالب ۔ ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا ۔

بلغاریہ میں اسلام

یک شنبہ ۲۲ر جون ۱۹۱۳ء

سرویا کے دارالخلافہ سے رخصت ہو کر میں بلغاریہ کے دارالسلطنت میں آیا۔ جب میں صوفیہ پہنچا تو میری نظر دور سے ایک گرجا پر پڑی جو روسی اور بازنطینی طرز کا تھا۔ جس کے گنبد کا سنہری کلس بڑی تیزی سے چمک رہا تھا میرے زیادہ قریب آنے پر اس کی قدوقامت میں اضافہ ہوتا جاتا تھا حتیٰ کہ جب میں اس کے نیچے آیا ہوں۔ تو سامنے بس اسی کی تصویر دکھائی دیتی تھی اور اپنی طاقت کا اظہار کر رہی تھی۔ بلقان کے دوسرے دارالخلافوں کی طرح صوفیہ بھی ایک نیا تعمیر شدہ شہر ہے۔ شہر کی عمارتیں علی العموم بیش قیمت بنانے کے علاوہ اعلیٰ اصول انجینیری کے مطابق بنائی گئی ہیں۔ اور عمارتوں کی یکسانیت کے اعتبار سے سانچے میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ دراصل صوفیہ کسی دوسرے شہر کی نقل ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا سینٹ پیٹرز برگ، ہے۔ جو اہل مشرق کے حلقۂ اثر سے نکلنے کے لیے اہل مغرب کی ایک ناکامیاب بغاوت کا اظہار کرتا ہے۔ آبادی مختلف عنصروں سے مرکب ہے۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ایسی ریاست کے دارالخلافہ میں جو ابھی سلطنتِ عثمانیہ کی شہنشاہانہ سیادت سے علیحدہ کی گئی ہے۔ کوئی مسلمان نہیں ہے۔ یہاں پچاس سے زیادہ ترک آباد نہیں ہیں۔ مگر باوجود اس کے میں نے یہ معلومات حاصل کرلی کہ مجھے کہاں جانا چاہیئے۔ اور یہی امر میرے لیے باعث تسکین تھا۔

دوسرے روز میں تفریح کے طور "گنگزوے" سڑک پر اچھی پوشاک پہنے ہوئے آدمیوں کے انبوہ کثیر میں سے گزر رہا تھا۔ جن میں بہت سے فوجی افسر بھی اپنی وردیاں ڈالے جا رہے تھے۔ جن کی تلواریں سڑک پر گھسٹتے وقت کھڑکھڑاتی تھیں۔ یورپین زندگی کی تھکا دینے والی یکسانیت سے میں سخت پریشان ہو رہا تھا" اتنے میں میری آنکھیں ایک عورت کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں میں پڑیں جو میرے پاس ہی کھڑی تھی۔ اس کے بال اس کی آنکھوں کی پتلیوں کی طرح سیاہ تھے۔ اور اس کی مانگ نکلی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ میری طرح سیاہی مائل بھورا تھا۔ اور مسکراتے وقت اس کے دانت نہایت تیزی سے چمکتے تھے۔ سر پر ایک سفید دوپٹہ پڑا تھا۔ جس نے اس کے جسم اور بالوں کو ڈھانک رکھا تھا۔ وہ بہت چپ چاپ اور غریب نظر آتی تھی۔ مگر ایسی کونسی بات تھی جس کی وجہ سے اس نے فوراً مجھے ہی اپنی خوب صورت اور مؤثر آنکھوں سے ایک جگہ قائم کر دیا؟۔ میں نے اس کو ہر ایسے ممکن طریقہ سے مخاطب کیا جس میں کہ میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا تھا۔ لیکن نہ تو اس نے میری بات سمجھی اور نہ میں نے اس کی۔

انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں تمہیں جامع مسجد دکھانے لے جاؤں گا۔ اور اپنے قلم کو رکھ کر جو ابھی ان کے ہاتھ ہی میں تھا انھوں نے اپنا ہاتھ دراز میں ڈالا۔ اور ایک ریوالور نکال کر پہلو کی جیب میں ڈال لیا۔ مجھے بعد میں دوسرے اشخاص سے معلوم ہوا کہ یہ کارروائی محض احتیاط کے طور پر ہی نہیں ہے۔ بلکہ جہاں تک ان کا تعلق ہے۔ نہایت ضروری ہے۔ مسجد اسلامی اور بازنطینی طرز کی عمارت ہے۔ اور اندر سے نہایت خوبصورتی کے ساتھ آراستہ کی گئی ہے۔ ایک قاری نہایت خوش الحانی سے قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا۔ اور بہت سے اشخاص بہت توجہ کے ساتھ بیٹھے سن رہے تھے۔ مسجد کے متصل ایک کلب ہے۔ جہاں ہر شام کو پندرہ اور پچیس کے درمیان نوجوان مسلمان جمع ہوتے ہیں۔ اور ترکی اخبارات پڑھنے کے علاوہ قہوہ پیتے اور اپنے سوشل اور سیاسی معاملات پر رائے زنی کرتے ہیں۔ یہاں سے ہم مفتی صاحب سے ملنے کے لیے اسلامی مذہبی عدالت میں گئے اور ہمیں پہلے ہی وقفہ پر اندر بلا لیا گیا۔ مفتی صاحب جو ایک بزرگ صورت شخص ہیں سبز لباس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سر پر ترکی ٹوپی اور پر عمامہ بندھا ہوا تھا۔ اُن کے اسسٹنٹ (نائب) پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسرشتہ دار بھی دائیں بائیں تھے۔ گفتگو قدرتی طور پر اسلامی دنیا کی موجودہ پست حالی پر ہوئی۔ میں نے آخر میں پوچھا کہ جناب اب کیا کرنا چاہیئے۔ بلغاریہ کے مفتی اور دوسرے باا ثر بزرگ نے جو جواب دیا۔ وہ حسب ذیل ہے۔

سب سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ بوسیدہ اسلامی طریقۂ تعلیم میں جو تمام دنیا میں رائج ہے۔ آزادانہ طور پر نمایاں اصلاح کی جائے۔ ایشیا، یورپ اور افریقہ کی پرانی مذہبی درس گاہیں جو طالب علم کو ملاگری کے علاوہ اور کسی کام کا نہیں رکھتیں (اور یہ امر اسلام میں ہرگز جائز نہیں ہے) دنیا میں ہمارے ادبار اور پستی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ مولوی جسکو اسلام کا ایک باکار ممبر ہونا چاہیئے نہ کہ خوشامد سے اپنے حلوے مانڈے کا خیال رکھنے والا ہو۔ اس گفتگو کے بعد قہوہ پیش کیا گیا۔ اور ہم رخصت ہوئے۔ دوسرے دن ایڈیٹر صاحب نے بلغاریہ کے اسلامی مدارس کے ڈائرکٹر خلیل زکی سے تعارف کرایا۔ وہ پوماک یعنی بلغاری مسلمان ہیں۔ وہ مذکورہ بالا ارکان ثلاثہ کے دوسرے ممبر ہیں۔ انھوں نے جو کوشش مسلمانوں میں موجودہ علوم پھیلانے کے متعلق کی ہے۔ اس کا مقابلہ کسی دوسرے شخص کی کوششوں سے نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے حال ہی میں غلیبہ میں ایک نارمل اسکول قائم کیا ہے۔ اور وہ اپنی دیگر تجاویز کو بھی جو فی الحال ان کے دماغ میں ہیں۔ بہت جلدی عملی صورت میں لانے کی کوشش کریں گے۔ وہ مجھے اپنا اسکول دکھانے کے لیے لے گئے۔ عمارت کی مرمت ہو رہی تھی۔ عمارت اگرچہ بہت وسیع ہے مگر معمولی۔ لیکن جیسا کہ سب کو معلوم ہے علی گڑھ کالج میں درس گاہ کی ابتدا بھی ایک پھونس کے بنگلے سے شروع ہوئی تھی۔ اس نارمل اسکول کے قیام کی سب سے زیادہ ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ اس کے اجرا، سے ان بلغاری قوانین کے برے اثر کی روک تھام کرنی مقصود تھی۔ جو کسی ایسے شخص کو اسلامی مدرسہ میں ٹیچر بننے کی اجازت نہیں دیتے جو بلغاری رعایا ہے۔ متذکرہ بالا اسکول کا سٹاف بہت قابل ہے۔ اس کی لائبریری عمدہ ہے۔ اور اسکول میں سے

ان کے اشارات ویسے ہی عجیب معلوم ہوتے تھے۔ جیسے کہ یقیناً اس کو میرے معلوم ہوتے ہوں گے۔ ا
میں یکایک میرے دل میں ایک خیال پیدا ہوا۔ میں نے کلمہ شہادت دہرایا اور معاً اس نے خوشی میں
وں کو اپنے خوب صورت نازک ہاتھوں سے دبا کر کہا کہ

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اور مسرت کے جوش میں ہنستی ہوئی چلی گئی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ایک جپسی مسلمان ہے۔ سطور
خیال میں ماہرین علم السنہ اور علم الانساب کے اس خیال میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہے کہ "جپسی" (آوارہ گرد) قوم
لی وطن ہندوستان ہے۔ بعد میں مجھے اس واقعہ کا علم ہوا کہ صوفیا میں چھ یا سات ہزار جپسی مسلمان
د ہیں۔

صوفیہ سے میں فلیجہ (یعنی فلی پوپل) آیا۔ کیوں کہ یہ مقام بلغاری مسلمانوں کا مرکز ہے۔ اس شہر کا عام منظر
ہ کی طرح ہے۔ اور یہاں عیسائیوں اور مسلمانوں کی مخلوط آبادی ہے۔ لیکن مسلمان جن میں "جپسی" بھی شامل ہیں
ہزار سے زیادہ نہیں ہیں۔ جب میں اسٹیشن سے گاڑی میں بیٹھ کر چلا تو میرا گذر ایک مسجد کے قریب ہوا۔ جہاں
لمان شربت والا چند برقع پوش مستورات کو ٹھنڈا ٹرکی کا شربت پیش کر رہا تھا۔ ماہ رمضان میں ابھی کچھ دن
تھے۔ چند مزدور جو اپنے پسینہ آلود سروں پر ترکی ٹوپیاں رکھے ہوئے تھے۔ ذرا فاصلہ سے زمین کھود رہے
بھی کبھی کوئی ترک بھی راستہ چلتا ہوا دکھائی دے جاتا تھا۔ جسے میں عیسائی بلغاری عورتوں اور مردوں کے اژدہام
سے بمشکل پہچانتا تھا۔ یہ تصویر کا کوئی شاندار رخ نہیں ہے۔ لیکن صوفیہ کی مایوس کن حالت کے بعد میرے
سے کم یہ ایک دل خوش کن نظارہ تھا۔

اگلی صبح کو میں "اخبار بلقان" کے اڈیٹر سے ملنے گیا۔ بلغاریہ میں صرف یہی ایک اسلامی اخبار ہے۔ جس کی نسبت
ے صوفیہ ہی میں واقفیت بہم پہنچائی تھی۔ مجھے ملاقات کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ادہم روحی اپنے اڈیٹر
ی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دفتر اچھے ہندوستانی اخبار کے دفتر کی مانند نہ تھا۔ وہ میانہ قد کے آدمی ہیں اور چالاک اور
ے بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے چہرے سے حلم اور تدبر کے آثار نمایاں ہیں۔ یہ حضرت بلغاریہ کے
ان لیڈروں میں سے ایک ہیں۔ اور یہ انجمن ثلاثہ اپنی طاقت اور وقت کو اپنے ہم مذہبوں کی ترقی میں صرف
ہے۔ جو اگرچہ کبھی ملائے اعلیٰ پر تھے مگر اب انقلاب زمانہ سے قعر پستی میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ انگریزی بولتے
ب میں نے ان سے یہ کہا کہ میں ہندوستان سے آرہا ہوں تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے بہت سے سوالات
گے۔ بہ نسبت اس کے کہ جو مجھے ان سے دریافت کرنے تھے۔ وہ ترقی کی باتوں پر مسرت اور ادبار کی
پر رنج کا اظہار کرتے تھے۔ اور انہوں نے اور ان کے دو دوستوں نے میرے سپرد یہ خدمت کی ہے۔ کہ
ریہ کے مسلمانوں کی طرف سے ہندوستان کے مسلمانوں کو محبت اور خیر اندیشی کا پیغام پہنچا دوں۔

گرچہ دوریم بیاد تو قدح مے نوشیم

کے تعلیم یافتہ ہیں۔ یہ بھی عوام قوم اپنے ملک میں اسلام کے دورِ جدید کا آغاز اور منبع امید سمجھے جاتے ہیں۔ احمد
فائق بے جوار کان ثلاثہ کے تیسرے ممبر ہیں۔ بلغاریہ کے سب سے بڑے سوداگر ہیں۔ ان کی مقامی تجارت بہت
وسیع پیمانہ پر جاری ہے۔ اور ملک میں سب سے بڑے دوکان کے مینیجنگ پروپرائٹر ہیں۔ انہوں نے د
کیا ہے کہ وہ نہایت خوشی سے بمبئی، کلکتہ اور رنگون کے تاجروں سے اسلامی تجارت کو وسیع کرنے کے متعلق
نامہ و پیام کریں گے۔ یہ جلسہ آدھی رات تک ہوتا رہا۔ خلیل ترکی میرے ترجمان تھے۔ اور ترکی سے جرمنی زبا
میں اور جرمنی سے ترکی میں ترجمہ کرتے جاتے تھے۔ نسل، ملک، رنگ اور زبان کے فرق کے باوجود ہم ایک دوس
سے اتنے قریب اور متحد معلوم ہوتے تھے کہ گویا میں بلغاریہ میں پلا بڑھا ہوں۔ فی الحقیقت اسلامی اخوت کے
یہی معنی ہیں ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا

اس آرٹیکل کے دوسرے حصہ میں میں نے اپنی گفتگو اور بحث کا نتیجہ اختصار کے ساتھ درج کر دیا
رمضان کی پہلی تاریخ کو میں نے صبح کے وقت سرحد پر چند بے کس بلغاری مسلمانوں کے قتل کی خبر سنی۔ جن کو
عیسائیوں نے قتل کیا تھا اور اس قتل میں جندرمہ اور پولیس نے خاص طور پر نمایاں حصہ لیا تھا۔ بلغاری جنہیں
ان کی دغابازہ گورنمنٹ ابھارتی رہتی ہے۔ مسلمانوں کے دیہات جلانے اور لوٹنے کے عادی ہیں۔ علاو
ازیں وہ دل ہلا دینے والے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ننھے بچوں کو تلوار کے سپرد کرتے ہیں۔ اور غیر محفوظ
عورتوں کی عصمت دری کرتے ہیں۔ یہ تمام کارروائی افسروں کے بھڑکانے اور تقویت دینے سے اس
کی جاتی ہے کہ مسلمان یا تو ملک بدر ہو جائیں اور یا عیسائیت قبول کر لیں۔

سہ پہر کو میں مسلمانوں کا ایک گاؤں دیکھنے کے لیے گیا۔ وہاں بہت سے بوڑھے آدمی موجود تھے۔ جن
کمریں بڑھاپے کی وجہ سے خمیدہ ہو گئی تھیں۔ مگر باوجود اس کے وہ نہایت فخر کے ساتھ اپنا سر بلند رکھتے تھے
بوڑھی عورتیں بھی اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو کھیت میں کام کرتے ہوئے دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھیں۔ اور ان
کاموں میں مدد دیتی تھیں۔ یہاں کی عورتیں برقعہ نہیں اوڑھتیں۔ چند لڑکیاں نزدیک ہی آہستہ آہستہ دبے لہجہ
اپنے ہاتھ دونوں رانوں پر رکھ کر باتیں کر رہی تھیں۔ دو جپسیوں کی گاڑیاں ذرا فاصلہ سے کھڑی تھیں۔ کچھ عور
اپنے بچوں کو بغل میں دبائے ہوئے جلدی جلدی اس طرف جا رہی تھیں۔ بعض عورتیں شام کا کھانا پکانے کے لیے
آگ جلا رہی تھیں۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ "یہ یاں" مجھے ارضِ مقدس میں ملنے آئی ہیں۔ اور
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ ہے۔ واللہ ان لوگوں کی زندگی کیسی پاکیزہ اور سادہ ہے۔ اور اس پر طرہ یہ
کہ یہی لوگ ان لوگوں کے وحشیانہ مظالم کا شکار رہتے ہیں جو اپنے آپ کو شہزادۂ امن یعنی مسیح علیہ السلام
امت میں شمار کرتے ہیں۔ چند سال پیشتر ہزاروں تلواریں اس ذلت کا انتقام لینے کے لیے یہاں سے باہر

اب تک اچھے اچھے قابل ماسٹر پیدا ہو چکے ہیں۔ ڈائرکٹر صاحب موصوف اس مقصد کو ترقی دینے کے لیے ترکی زبان میں تعلیم کے متعلق ایک رسالہ بھی نکالتے ہیں۔

آج سہ پہر کو میرا تعارف ایک ایسے معمر عیسائی شریف آدمی کے ساتھ کرایا گیا۔ جنھوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ ایک طویل گفتگو میں بلغاریہ کی مکمل تاریخ بیان کرنے کے بعد انھوں نے ظاہر کیا کہ ہماری سب سے بڑی بدقسمتی ہے کہ عثمانیوں کو ہم پر حکومت کرنے سے آہستہ آہستہ ہٹا دیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ نہیں نہیں یہاں کچھ آزادی نہیں ہے۔ ٹرکی کے عہد حکومت میں دراصل ہم ملک پر حکمران تھے۔ لیکن اب باوجودیکہ گورنمنٹ ہماری ہے۔ غیر ہم پر حکومت کر رہے ہیں۔ ہم بذات خود نہ لڑائی کر سکتے ہیں —— —— اور نہ صلح کر سکتے ہیں۔ ہمیں روس کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا ہے۔ جب کبھی ہمیں حکم دیا جاتا ہے۔ ہم کو مجبوراً ٹرکی کے ساتھ لڑنا پڑتا ہے۔ جس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ ٹرکی کی قوت کمزور کر دیں اور اپنے آپ کو تباہ کریں۔ ترک اگرچہ عدل کرنے میں سخت تھے ان کا انصاف مساوی ہوتا تھا۔ لیکن اب ہمارے جج صاحبان غیر مطبوع جماعتوں اور مردوں کے حقوق کو غارت کرنے کے لیے اعلیٰ یورپین ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ ترک تمام مذاہب کے یکساں محافظ تھے۔ مگر اب کسی مختلف فرقوں کے عیسائیوں کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہ تمام خوب صورت عمارتیں جو آپ برابر دیکھ رہے ہیں ان میں سے ایک ہی نہیں —— بلکہ ان سب کو ہمارے گھروں کے کھنڈرات پر غیر ملکی سرمایہ داروں نے تعمیر کرایا ہے۔ آہ جہاں جہاں آپ کو یہ مکانات نظر آتے ہیں وہاں کسی زمانہ میں ہمارے پسندیدہ گھر واقع تھے۔ ہمارے ہی گھر آباد تھے۔

شام کو میں ہند کا باغ دیکھنے کے لیے گیا۔ اور اس اثنا میں خلیل زکی نے مجھ سے کہا کہ "احمد فائق بے آپ کی شام کی دعوت کرتے ہیں —— ، جو آپ کو خوشی سے مطلوبہ واقفیت بہم پہنچائیں گے"۔ یہ باغ ایک پارک معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے سامنے ساکن پانی کا ایک تالاب تھا۔ شفق پھول ہوئی تھی۔ سڑک پر سلافی اور یونانی خط و خال کی عیسائی عورتیں اور مغربی جرمنی کے لباس میں جا رہی تھیں۔ فوجی افسر بھی سفید کوٹ اور نیلی برجس پہنے ہوئے چل رہے تھے۔ اور عورتیں عموماً پیرس کے جدید ترین لباس میں تھیں اور یہ منظر شمالی یورپ کے منظر سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ صرف کبھی کبھی جب کہ کوئی البانی یا کرد کسی عمدہ لباس میں گزر جاتا تھا۔ یا دور سے کالی اور سرخ ترکی ٹوپی دکھائی دے جاتی تھی۔ یا برقع پوش مستورات کا سریلا قہقہہ سننے میں آجاتا تھا۔ اس وقت میں اپنے آپ کو مشرق کی سرحد پر محسوس کرتا تھا۔

واپسی پر میں نے تمام مسجدوں میں چراغاں دیکھا کیوں کہ نئے چاند نے ماہ رمضان کی آمد کو مشتہر کر دیا تھا۔ مسجدوں میں چراغاں ایک تو ماہ رمضان میں کیا جاتا ہے اور یا خلیفۃ المسلمین سلطان المعظم کی سالگرہ کے دن۔ مجھے آج شام کو اتنے سارے بلغاری مسلمانوں کے نمایندوں سے مل کر نہایت مسرت حاصل ہوئی۔ تقریباً سب کے سب ہونہار نوجوان ہیں جنھوں نے قسطنطنیہ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ اور بعض فرانس اور سوئٹزرلینڈ

تمام کاروبار غیر ملکی سرمایہ داروں کے قبضہ میں ہے۔ اس لیے ان کی تجارت زیادہ نہیں۔ احمد فائق بے صرف ایک
مسلمان اور بلغاری سوداگر ہیں جو نوآبادیوں اور تبہ اعظم کی تجارت کے نگران ہیں۔ متوسط جماعت تمام زراعت پیشہ
ہے۔ ترکی عہد حکومت میں وہ بہت خوش حال تھے مگر اب ان کی زندگی غلاموں کی سی ہے۔ بھاری ٹیکسوں اور تکلیف
دہ کرایوں کے اقتصادی بوجھ، جائداد کی ضبطی برائے نام قیمتوں پر زمینوں کی جبریہ فروخت، گھروں کی تباہی ا
عورتوں کی عصمت دری کے سیاسی تعصب نے، مخالف پڑوس کے سوشل دباؤ نے، الغرض ان تمام باتوں نے
انہیں محتاج مصیبت زدہ اور بے کس بنا دیا ہے۔ ان کی زندگی ایک مسلسل آوارہ گردی کی زندگی ہے۔ وہ د
کے وقت دھوپ میں بیٹھ کر سوچ و بچار کرتے اور رات کو لیٹے لیٹے ستاروں پر غور کرتے ہیں۔ وہ بھی اسلام کے
ان دشمنوں کی بے پروا بے رحمی اور مظالم سے سخت تکلیف اٹھاتے ہیں۔ مگر وہ اپنی تکلیفات کو بعینہٖ اسی طرح برد
کرتے ہیں۔ جس طرح سے کہ ہرنوں کی ڈار شکاری جانوروں کی لوٹ کھسوٹ کو برداشت کرتی ہے۔

تمام مسلمان سنی المذہب حنفی ہیں۔ ان کی زندگی میں مذہب کا ایک نمایاں حصہ پایا جاتا ہے۔ بلغاریہ میں تق
۱۲۰۰ مسجدیں ہیں۔ جن میں سے چار سو اور پانچ سو کے درمیان بڑے شہروں میں واقع ہیں۔ خاص فلیبہ میں ۸ مساجد
مسجدوں کی نگرانی اوقاف سے کی جاتی ہے۔ لیکن متولیوں کی جہالت کی وجہ سے ان کا انتظام اچھا نہیں ہے۔ گورنم
ان کے انتظام میں ہمیشہ دخل انداز رہتی ہے۔ جس کا نتیجہ عموماً ضبطی ہوا کرتا ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کی زند
خالص طور پر مذہبی ہے۔ وہ سارے راست باز، ایمان دار اور دلیر ہیں۔ اور یہ صفات زیادہ تر اس لیے نمایا
معلوم ہوتی ہیں کہ وہ ایک ایسی قوم کے دوش بدوش رہتے ہیں۔ جو سچائی، ایمانداری اور دلیری جیسی پاکیزہ صف
سے بالکل معرا ہے۔ مستورات کی منزلت ایسی ہی ہے کہ جیسی کہ خود ٹرکی میں۔ اور وہ اپنی ہندوستانی بہنوں
نسبت زیادہ آزادانہ زندگی بسر کرتی ہیں۔ پردہ بس یہیں تک محدود ہے کہ باہر جاتے وقت "یشمک" اوڑ
جاتا ہے۔ اور عورتوں کی مجلس میں مردوں کو نہیں بلایا جاتا۔ جیساکہ مجھ سے مسلمانوں اور عیسائیوں نے کہا ہے
یہ ہے کہ مسلمانوں کی گھریلو زندگی عیسائیوں کی نسبت زیادہ خوش اور پاکیزہ ہے۔ کثیر الازدواجی شاذ و
ہے۔ اور اکثر جگہ بالکل ہی نہیں پائی جاتی۔ اور دیہاتیوں اور "جپسیوں" تک میں عورتوں کا بے حد ادب روا
جاتا ہے۔ عقد، جہیز، طلاق اور وراثت کے متعلق تمام تنازعات کے فیصلہ جات میں مسلمانوں کے قانون کے استع
کرنے کی اجازت ہے۔ صدر مفتی کی عدالت صوفیہ میں ہے۔ فلیبہ میں بھی ایک مفتی عدالت کیا کرتے ہ

ٹرکی کی طرح بلغاریہ کی اقتصادی حالت بھی تمام مشرقی ممالک سے مختلف نہیں ہے۔ غیر ملکی سرمایہ د
جسے فائدہ اٹھانے کے کافی ذرائع مہیا ہیں۔ مغربی تہذیب و تمدن کے فوائد سے متاثر کر کے ملک کو غریب
اور کھوکھلا کرنے کی عظیم الشان مہم میں برابر مصروفیت کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ مالکان صنعت و حرفت تمام
تمام یا تو روسی ہیں یا غیر ملکی یہودی اور یا اہل آرمینیا، بلغاری عیسائی اور مسلمان چند ایسی صنعتوں کے مالک ہیں
کا دارومدار صرف زراعت پر ہے۔ ان میں مسلمان عیسائیوں کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ غیر ملکیوں کے طرز

سکتی بلکہ جو ان بے گناہ کنواریوں کے ساتھ روا رکھا جاتا تھا۔ مگر اب خلیفہ کی حکومت جاتی رہی۔ جب کہ میں ان میں سے ایک بوڑھے آدمی کے سامنے کھڑا ہو کر اس کی زبان سے ترکوں کی گذشتہ عظمت اور شان و شوکت کے افسانے سن رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ اس کی چمکدار آنکھیں آسمان کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ مستقبل کو دیکھ رہا ہے۔ اس نے مجھ سے اور میرے ہمراہی سے کہا کہ "میرے بچو! انتظار کرو۔ خدا نے اپنے دین سے علیحدگی اختیار نہیں کی ہے۔ وہ پھر اسلام کی عظمت اور شان کو دوبارہ ظاہر کر دے گا انشاء اللہ تعالیٰ"۔

آدھی رات کو میں قلیبہ سے قسطنطنیہ روانہ ہوا۔ میں یہاں اگرچہ ایک اجنبی کی طرح آیا تھا۔ تاہم رخصت ہونے پر مجھے وعدہ کرنا پڑا کہ یہ آخری ملاقات نہیں ہے۔ بلکہ میں انشاء اللہ پھر آؤں گا۔

ترکوں کے عہد سلطنت میں بلغاریہ میں ۲۰ لاکھ مسلمان آباد تھے۔ لیکن روس و ترکی کی جنگ کے بعد جب کہ ملک پر ہلال کی بجائے صلیب کی حکومت قائم کر دی گئی تھی تو ہزاروں آدمی خود اپنی مرضی سے ترکی میں ہجرت کر آئے تھے۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ مسلمان جو حاکم اور خود مختار رہ چکے تھے نئے دور حکومت میں رہنا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ اخراج کا اصلی سبب وہ سلوک تھا جو عیسائی حکومت نے ان کے ساتھ روا رکھا۔ برادری کے اخراج سے لے کر ضبطی جائداد اور قتل عام تک کے تمام ذرائع ان کے خلاف اس غرض سے استعمال کیے گئے کہ وہ ملک سے رخصت ہو جائیں۔ ان ذرائع سے جو اب بھی اسی جوش و خروش سے جاری ہیں۔ عیسائی تعصب کو کم سے کم اتنی کامیابی ضرور حاصل ہو گئی ہے کہ مذکورہ بالا تعداد گھٹتے گھٹتے نصف سے کم رہ گئی ہے۔ آخری سرکاری گوشوارہ کے مطابق بلغاریہ میں اب مسلمانوں کی تعداد صرف ساڑھے نو لاکھ ہے۔ جس میں دو لاکھ "جپسی" بھی شامل ہیں۔ دار السلطنت میں اسلامی آبادی چھ اور سات کے درمیان ہے۔ جس میں سب کے سب "جپسی" یعنی آوارہ گرد قوم ہیں۔ خاص صوفیہ میں ۵۰ سے زیادہ ترک نہیں پائے جاتے۔ قلیبہ میں جو اسلامی آبادی کا مرکز ہے۔ ان کی تعداد جپسیوں سمیت بارہ ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ مسلمان بالعموم سرحدی شہروں کے قریب دیہات میں آباد ہیں۔ جن میں سے بعض میں خالص اسلامی آبادی ہے۔ بعض بڑے بڑے اسلامی مقامات کے نام رسچک، شمنی، دسگراد، [illegible] پلیونا، ایڈس اور ریڈن ہیں۔ مسلمان آبادی خالص ترکی (پوچک اصلاً و نسلاً بلغاری ہیں جو خاص وہیں کے رہنے والے ہیں اور جنہوں نے مذہب اسلام قبول کر لیا ہے۔ برخلاف اس کے جپسی ایک ایسی خانہ بدوش قوم ہے۔ جو کسی مقام کو اپنا وطن نہیں بناتے۔ علاوہ ازیں ان کی نسل بھی نامعلوم ہے۔ ترک آبادی کا زیادہ حصہ ہیں۔ یعنی پوچک ۵ فی صدی سے زیادہ نہیں ہیں باقی سب جپسی ہیں۔ ترکوں اور جپسیوں کی زبان ترکی ہے۔ پوچک عام طور پر بلغاری زبان بولتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بہت سے ترکی زبان بھی سمجھتے ہیں۔

دنیاوی وجاہت کے لحاظ سے مسلمان تین جماعتوں میں منقسم ہو سکتے ہیں۔ پہلی جماعت سوداگروں کی اقل تعداد پر مشتمل ہے۔ جو ملک کی تجارت میں بلغاری عیسائیوں کے ساتھ مساوی حقوق کے حصہ دار ہیں۔ لیکن چونکہ بڑے

یورپ سے فارغ التحصیل ہو کر آئے ہیں۔ میرے سوال کے جواب میں نہایت غصے کے لہجے میں کہا کہ "اگر وہ ہماری مساجد کو مسمار کر ڈالیں گے تو بھی ہم اپنے مکانوں کی بلندیوں سے خطبہ پڑھیں گے اور وہ سن لیں گے کہ ہم خلیفۃ المسلمین کا مقدس نام پڑھ رہے ہیں۔

اٹلی و ٹرکی کی جنگ کو یہاں کے لوگ جہادیہ لڑائیوں کی ابتدا خیال کرتے ہیں۔ انہوں نے پیشین گوئی کر دی تھی کہ دوسری لڑائی بلقانیوں سے ہو گی۔ اور اب انہوں نے تیسری جنگ کے متعلق بھی پہلے سے مطلع کر دیا ہے۔ اگر ان خیالات کو مبالغہ آمیز بھی خیال کر لیا جائے تو ہمیں ایک گھڑی کے لیے اس امر کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ بلغاریہ کے مسلمان نہایت ظالمانہ اور غیر منصف حکومت میں رہتے ہیں۔ بلغاریہ کے مسلمانوں نے نہایت فراخ دلی اور فیاضی سے طرابلس کے مصیبت زدوں کو مالی امداد پہنچائی ہے۔ اور طرابلس میں اسلامی حکومت قائم رکھنے کیلئے بہت سے بلغاری مسلمان والینٹر کی حیثیت میں اب تک جنگ کر رہے ہیں۔ بلغاری مسلمانوں کی کوئی ایسی انجمن نہیں ہے۔ لیکن بشرط امکان وہ ایک کانگریس کی بنا ڈالنا چاہتے ہیں۔ ان کے پاس صرف ایک ہی روزانہ اخبار بلقان ہے جسے ادہم روحی بے ترکی زبان میں شایع کرتے ہیں۔ یہ اخبار ۸ سال ہوئے جاری کیا گیا تھا۔ اور بلغاریہ اور ٹرکی میں اس کی بہت زبردست اشاعت ہے۔ اخبار کی گورنمنٹ کے ساتھ ہمیشہ جھڑپ رہتی ہے۔ یہاں تک کہ پار سال اس کے ایڈیٹر کو چھ ماہ کی سزا دی گئی تھی۔ غیر ممالک کے لیے اس کا سالانہ چندہ ۲۳ روپے چار آنہ ہے۔

لیکن کسی قوم کی باقاعدہ ترقی میں سب سے بڑا حصہ صحیح طریقۂ تعلیم کا ہے۔ اور اس کو بلغاریہ کے مسلمانوں نے پورے طور پر سمجھ لیا ہے۔ لیکن بلغاریہ میں مسلمانوں کو تعلیم کے معاملہ میں بے انتہا مختلف مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تمام اسلامی تعلیمی درسگاہوں کی نگرانی اوقاف سے کی جاتی ہے۔ جنگ کے بعد گورنمنٹ نے تمام مدارس اور مکاتب کی عمارتوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ چنانچہ وہ اب سرکاری دفاتر اور سرکاری مدارس کے استعمال میں آ رہے ہیں۔

جنگ کے آغاز سے لے کر اب تک نصف سے زائد اوقاف کو کسی نہ کسی بہانے سے ضبط کر لیا گیا ہے اور اس طرح سے مسلمانوں کی تعلیم کے لیے سامان آمدنی کو جبراً چھین لیا گیا ہے۔ تعلیم کے لیے جو ٹیکس مسلمانوں سمیت تمام آبادی سے وصول کیا جاتا ہے۔ وہ مسلمانوں کی تعلیم پر کبھی خرچ نہیں کیا جاتا۔ گورنمنٹ کا مقصد یہ ہے کہ رفتہ رفتہ مسلمانوں کو سرکاری مدارس میں تعلیم پانے پر مجبور کیا جائے۔ تاکہ وہ وہاں بلغاری زبان میں تعلیم پائیں۔ اور اپنی مادری زبان سے جو کہ ترکی ہے۔ بالکل بے بہرہ رہیں اور اپنے مذہب اور قرآن شریف سے نا آشنا ہو جائیں۔ لیکن مسلمانوں نے نہایت دلیرانہ طور پر اس کو منظور کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ بلغاریہ کے مسلمانوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ نوجوان جماعت میں سے جو ہونہار آدمی قسطنطنیہ یا یورپ سے فارغ التحصیل ہو کر آتے ہیں۔ وہ سلطنت عثمانیہ میں جا کر ملازمتیں کرنے اور بالآخر وہیں کی رعایا ہو کر آباد ہو جاتے

اور حکومت کی مدد اور حفاظت کے سبب عیسائیوں کی اقتصادی حالت کی ترقی یقینی ہے۔ اعلیٰ سلوک جوان کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ غالباً ان کو اس بڑی مصیبت سے بچائے گا جس کا انہیں خطرہ ہے۔ لیکن اسلامی سرمایہ اور محنت کی راہیں دن بدن کم ہو رہی ہیں۔ اور گورنمنٹ کا یہ مقصد ہے کہ تجارتی حلقوں میں سے مسلمانوں کو کلی طور پر نکال دے۔ مسلمانوں کی زیادہ تر تعداد زراعت پیشہ ہے۔ بلغاریہ میں زمین کا نرخ دن بدن بڑھ رہا ہے۔ آخری دس سالوں میں زمین کی قیمت دس گنی ہو گئی ہے۔ مسلمانوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی زمینوں اور جائدادوں کو برائے نام داموں پر فروخت کر دیں۔ اور پھر بایحتاج زندگی سے مجبور ہو کر ہجرت کر جائیں۔ اگر وہ عدل چاہنے کی جرأت کر بیٹھتے ہیں تو مال و اسباب کے ساتھ انہیں اپنی جان بھی ضایع کرنی پڑتی ہے۔ سال بھر میں کوئی دن ایسا نہیں گذرتا جس روز کہ چند مسلمان بلغاری عیسائیوں کے سلوک سے تنگ آ کر ترکی سرحدیں نہ داخل ہوتے ہوں۔

عہد نامہ برلن کے مرتب ہونے کے بعد بہت سے مسلمان ترک ملک کے انتظام میں شریک تھے۔ بلغاری مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد فوج میں ذمہ داری کے عہدے رکھتی تھی۔ لیکن یہ عمل عرصہ تک جاری نہیں رہا۔ اور رفتہ رفتہ تمام مسلمانوں کو ملکی اور فوجی عہدوں سے یک لخت محروم کر دیا گیا۔ چنانچہ اب سارے ملک میں ملکی یا فوجی عہدے پر کوئی بھی مسلمان مامور نہیں۔ خلیل زکی بے جو ایک پوماک (بلغاری مسلمان) ہیں آخری مسلمان تھے جو فوجی کالج میں پروفیسری کر رہے تھے۔ علاوہ ازیں ملک کے اخراجات کے لیے ان سے بڑا بھاری ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ اسی طرح سے مسلمان محکمۂ پولیس کی ملازمت سے بھی مستثنےٰ کر دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ دونوں طرف سے بے بس ہو کر وہ اپنے ہی حال میں رہنے کے لیے مجبور ہیں۔ ان سے کہہ دیا گیا ہے کہ بلغاریہ عیسائیوں کے لیے ہے۔ مسلمانوں کو عہد نامہ کی رو سے جو حقوق حاصل ہیں اور جن کی کفالت بین الاقوامی قوانین سے کی گئی ہے۔ دن دہاڑے پاؤں تلے روند دیئے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے عدل و انصاف کے دروازے بالکل بند ہیں۔ ان کی حالت روس کے یہودیوں سے بھی خراب خستہ اور گئی گذری ہے۔ ان کی زندگی ایک قسم کی ایسی غلامی ہے جس میں ان کی بے قدری کے سبب انہیں پناہ اور خاطر جمعی بھی حاصل نہیں ہے۔

لیکن مسلمان متحد ہو گئے ہیں اور ان تمام مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں جو نئی زندگی اور عام بیداری آج اسلام میں ظاہر ہو رہی ہے۔ اس نے ان کو متاثر کر دیا ہے۔ یہ جوش حیات جو قدرت کی دوسری طاقتوں کی طرح تھم نہیں سکتا ان کے لیے بھی وہی نتائج پیدا کرے گا۔ جو وہ باقی اسلامی دنیا کے لیے پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اور اس امر سے بخوبی واقف ہیں۔

علاوہ از ۲٫۹۹ سچے مومنوں کی طرح یہ اطمینان وہ یقین رکھتے ہیں کہ اگر بالفرض ہم اس کشمکش میں جان بحق تسلیم ہو گئے تو کم سے کم ہمیں یہ تو خوشی ہے کہ ہم نے اسلام کی آخری کامیابی کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کیا ہے۔ بلغاریہ کی تمام مساجد میں خطبہ ہز میجسٹی سلطان محمد خامس کے نام کا پڑھا جاتا ہے۔ گورنمنٹ نے مسلمانوں کو خلافت عظمیٰ سے علیحدہ کرنے کے لیے ہزار طرح کی کوششیں کی ہیں۔ مگر یہ امر ناممکن ہے۔ ایک نوجوان آدمی نے جو حال ہی میں

چین میں اسلام اور عیسائیت کا مقابلہ

(۱)

عیسائی پادریوں کی سرگرمی

جمعہ ۱۴ر جون سنہ ۱۹۱۲ء:-

آج کل یورپ، افریقہ اور مغربی ایشیا میں جو بربادی اور تباہی پیروانِ حضرت مسیح کے ہاتھوں اہل اسلام پر نازل ہو رہی ہے اس سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔ اٹلی کی قزاقی ٹریپولی پر، فرانس کی تسخیر مراکش، روس کا حضرت امام زین العابدین کے روضہ مقدس کا منہدم کرنا۔ اور اہل ایران کی نوزائیدہ آزادی کا خون کرنا، بلقانی ریاستوں کا مقدونیہ اور البانیہ کے مسلمان آبادی کو بلا تخصیص مرد و عورت یا بچہ کے تہ تیغ کرنا، یہ سب کچھ اس عظیم الشان اور عالم گیر جدوجہد کا معمولی شائبہ ہے جو ملت بیضا کو سرنگوں یا یوں کہو کہ نیست و نابود کرنے کے لئے عیسائی دنیا میں ہو رہی ہے۔ لیکن جو عمل مغرب اقصیٰ اور مغرب قریب میں دول یورپ کی حکمت عملی اور عیسائی سلطنتوں کو آتش فشاں توپوں، آہن پوش جہازوں اور دیگر آلات شیطانی کے ذریعے سے ہو رہا ہے، اس نے مشرق اقصیٰ میں دوسری صورت اختیار کی ہے ہمارے خیال میں مقدونیہ اور افریقہ کے مسلمانوں کا کلمہ لا الٰہ الا اللہ کہتے ہوئے عیسائی سنگینوں سے شہید ہونا ہزار درجہ بہتر ہے۔ اس عمل سے جو چین کے مسلمانوں کو دین اسلام سے برگشتہ کر کے صلیب پرستی پر مائل کرنے کی غرض سے عیسائی مشنری کر رہے ہیں۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں اسکاٹ لینڈ کے سب سے بڑے شہر اڈنبرا میں، تمام دنیا کی مشنری انجمنوں کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ سب سے اہم مسئلہ اس کانگرس میں زیر بحث یہ تھا کہ عیسائیت کی اشاعت میں جو رکاوٹ اسلام نے پیدا کر دی ہے اس کا سدباب کس طرح ہو۔ افریقہ اور ایشیا کے مشنریوں نے بیان کیا کہ باوجود لکھوکھا روپیہ خرچ کرنے کے اسلامی جماعتوں میں عیسائیت کو کوئی کامیابی نہیں ہوتی۔ اور افریقہ کے جس حصہ میں کوئی مسلمان مشنری پہنچ جاتا ہے تو وہ عیسائی پادریوں کی سالہا سال کی محنت کو برباد کر دیتا ہے۔ اس کانفرنس کا ایک جلسہ دروازہ بند کر کے بھی کیا گیا۔ اور اس میں کیا کچھ سرگوشیاں ہوئیں وہ کسی غیر شخص کو معلوم نہیں لیکن کانفرنس کے بعد مشنری تحریک نے جو رخ اختیار کیا ہے اس سے ——— اس کانفرنس کا سراغ چلتا ہے۔ منجملہ ان کے ایک فیصلہ یہ بھی کیا گیا کہ پادریوں کی ایک جماعت ایسی تیار کی جائے جو اپنے آپ کو اسلامی روایات، اسلامی تاریخ اور عربی زبان کی تحصیل کے لئے وقف کر دے۔ اور جو ان ممالک میں کام کرتے ہیں جہاں اسلامی آبادیاں ہیں۔ چنانچہ ایک بڑی فوج پرجوش پادریوں کے اس کام کی جانب متوجہ ہوئی ہے ڈاکٹر زویمر جو امریکہ کا بڑا لاٹ پادری اور عیسائی دنیا میں عربی دانی کے لحاظ سے ممتاز و مشہور ہے، اڈنبرا کانفرنس کا پریذیڈنٹ تھا۔ ان سے اپنی ایڈیٹری میں ایک رسالہ مسلم ورلڈ اسلامی دنیا کے نام سے نکالنا شروع کیا ہے جس میں علاوہ تاریخی اور مذہبی مضامین کے ان پادریوں کی رپورٹیں بھی شائع ہوتی ہیں جنہوں نے اسلامی دنیا میں عیسائیت پھیلانے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔

افریقہ اور ایشیا میں باوجود صدہا سال کی کوشش کے عیسائیت کو اسلام کے خلاف کوئی کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ ابھی کل کی بات

ہیں۔ اس سے بہت بڑی دماغی اور سوشل تمی واقع ہوئی ہے۔ ان حالات پر نظر ڈالنے کے بعد کوئی شخص یہ سن کر تعجب نہیں کرے گا کہ جہاں بلغاریہ میں تعلیم یافتہ عیسائیوں کی تعداد فی صدی ساٹھ ہے۔ وہاں مسلمانوں کی صرف فی صدی دس ہے۔ مسلمان نوجوان صرف مکاتب میں تعلیم پاتے ہیں۔ جہاں انہیں ابتدائی قسم کی مذہبی تعلیم دی جاتی ہے۔ وہاں کے مکاتب ہندوستان کی طرح سے نہیں ہیں۔ خلیل نہ کی بے نے ان میں ایک نمایاں اصلاح کردی ہے۔ اور جدید طرز کے بہت سے مدارس، فلیبہ، وارنہ، ورسچک، وبڈن اور دیگر مقامات میں جاری کردیئے گئے ہیں۔ اس سال فلیبہ میں ایک نارمل اسکول قائم کیا گیا ہے۔ جس کا مقصد ان قوانین کے برے اثرات کو روکنا ہے۔ جن کی رو سے کوئی شخص جو بلغاری رعایا نہیں ہے۔ کسی اسلامی مدرسہ میں ٹیچر (مدرس) نہیں بن سکتا۔ مسلمان ہر سال ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس کرتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس سے بہت مفید نتائج مرتب ہوں گے۔ کل مدارس کی تعداد تقریباً چودہ سو ہے۔ جن میں عورتوں اور مردوں کو ملا کر ۱۷۰۰ مدرس ہوتے ہیں۔ مدارس جانے والے لڑکوں کا شمار فی الحال ۴۲ ہزار اور لڑکیوں کا دس ہزار ہے۔ ان دونوں گوشواروں سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان، بلغاریہ کے مسلمانوں سے کیا کچھ سبق حاصل کرسکتے ہیں۔

بلغاریہ کے مسلمانوں کے مستقبل پر کچھ رائے زنی کرنا بہت مشکل ہے۔ مجھے اس نوجوان آدمی کی رائے پر پورا یقین ہے۔ جنہوں نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ "اس کا دارومدار ٹرکی کے مستقبل پر ہے۔ اور اس قول کی تائید ایک اور نوجوان مسلمان نے بدیں الفاظ کی تھی کہ تمام اسلامی دنیا کا مستقبل ٹرکی کے مستقبل کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور در اصل یہ درست بھی ہے۔

عبدالرحمٰن سیوہاروی (بجنوری)

پادری ٹپس نے عربی زبان کی انجیل مقدس چینی ترجمے اور حاشیوں کے ساتھ چھاپ کر تقسیم کی ہے۔ جو بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں
برٹش امریکن اور دیگر ممالک کی بائبل سوسائٹیاں ہزارہا جلدیں عربی بائبل کی ہر سال تقسیم کرتی ہیں۔

مسٹر روڈس جس نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ مسلمانان چین کو راہ راست سے منحرف کرنے میں صرف کیا ہے تحریر کرتا ہے۔ اور چھوٹی چھوٹی کتابیں جن میں قرآن کے پاروں کا خلاصہ ہے۔ اور اس کے ساتھ عیسائی نقطہ نظر سے اسلامی مسائل پر نقطہ چینیاں درج ہیں، نہایت مفید ثابت ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ کی کتابیں مدارس میں طبع کرائی گئی ہیں۔ اور چونکہ ان میں مکہ (معظمہ) کی تصاویر اور آیات قرآنی موقع بہ موقع چھاپی گئی ہیں اس لئے اسلامی مساجد میں بہت مقبول ہوئی ہیں۔ جہاں ہمارے دوستوں کی تعداد روبترقی ہے۔ مکہ (معظمہ) کی جو زبردست عظمت مسلمانوں کے دلوں میں باقی ہے۔ اس کی وجہ سے ایسی کتابیں جن میں کعبہ اور دیگر اسلامی مقامات مقدسہ کی تصاویر درج ہوں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ اور ان کے ذریعے سے ہمیں راستی کی تلقین کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ البتہ بعض مسلمان مسئلہ تثلیث پڑھ کر بہت الجھتے ہیں اور بارہا کہہ اٹھتے ہیں" ہم مریم والدہ مسیح کی پرستش تمہاری طرح ہرگز نہیں کرسکتے۔"

ڈاکٹر روڈس بڑی مسرت کے ساتھ عیسائی دنیا کو اطلاع دیتے ہیں کہ متذکرہ بالا طریقوں سے اسلامی جماعتوں میں کوشش کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ ہزارہا درخواستیں عربی کتابوں کے لئے وصول ہوئی ہیں۔ اور جو مسلمان پہلے یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے تھے کہ اسلام اور عیسائیت میں بہت فرق نہیں ہے اب یہ کہنے لگے ہیں واقعی عیسائیت اور چیز ہے۔ اور اسلام شئے دیگر۔"

مارشل برودم ہال جس نے تمام ملک چین کا دورہ مشنری خدمت کے سلسلے میں کیا ہے تحریر کرتا ہے:۔

"چین کے مسلمانوں کو عیسائی مذہب میں لانے کے لئے تو کچھ نہ کچھ کیا بھی جارہا ہے۔ لیکن مسلمان چینی باشندوں کو اپنے مذہب میں لانے کے لئے کچھ کوشش نہیں کرتے۔ عیسائی مشنریوں کو ہر جگہ وعظ کہنے کی اجازت ہے۔ لیکن مسلمانوں کو شارع عام پر مذہب اسلام کی تلقین کرنے کی حکومت کی جانب سے ممانعت ہے۔ مسلمان "انگور کھٹے ہیں" کی مثل پر عمل کر کے یہ کہتے ہیں کہ ان کا مذہب اس قدر پاک اور ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس کی اشاعت کے لئے عیسائی مشنریوں کی طرح شارع عام پر مارے مارے پھرنے کی ضرورت نہیں ہے، مسلمان اپنے مذہب کے متعلق کسی قسم کی کتابیں شائع نہیں کرتا۔ اور بمشکل تمام کسی اسلامی کتاب کا پتہ چلتا ہے۔"

ان واقعات سے مسلمانان ہند کو معلوم ہو سکتا ہے کہ چین میں اسلامی آبادی کو عیسائی بنانے میں کیسی جدوجہد دنیا بھر کے مشنری کر رہے ہیں۔ گذشتہ بغاوت میں چینی حکومت نے لکھو کھہا مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ اور تسلط کے بعد انہیں ایسی آہنی زنجیروں میں کسا کہ اشاعت اسلام کی آزادی جو انہیں پہلے حاصل تھی اب بالکل مفقود ہے۔ لیکن برخلاف اس کے عیسائی مشنری اپنی سلطنتوں کی حمایت میں ہر جگہ عیسائی مذہب کی اشاعت کے لئے کھلے بندوں اور بے روک ٹوک کوشش کر رہے ہیں۔

سال گذشتہ میں چین میں جمہوری سلطنت قائم ہوئی۔ لیکن اس کا پریذیڈنٹ عیسائی مذہب ہے۔ ۲۷ اپریل گذشتہ کو تمام عیسائی گرجاؤں میں نماز مرتب چین بلکہ یورپ میں بھی بڑے بڑے پادریوں نے جمہوریت کا باضابطہ خیر مقدم کیا۔ اور اس کی بقا کے لئے اس امید پر دعائیں مانگیں کہ اس کی وجہ سے عیسائیت پھیلانے کا دروازہ مشرق اقصیٰ میں پوری طرح کھل گیا۔

اس وقت چین میں نئی قوتوں اور نئے جذبات و تخیلات کا دور دورہ ہے۔ اور مسلمانان چین کی تاریخ ان کی روایات اور موجودہ کشاکش

ہے کہ نٹال کے وزیر اعظم نے جنوبی افریقہ میں اسلامی خطرہ کی عظمت اور سنجیدگی کو علی الاعلان بیان کیا تھا۔ لیکن تازہ ترین حالات سے معلوم
کہ چین میں عیسائیوں کو معتد بہ کامیابی کی امید ہے۔

چین میں مسلمانوں کی آبادی مصر، عرب یا ایران سے کہیں زیادہ ہے لیکن صدیوں سے ایک زبردست اور جابر حکومت کے زیر
کی وجہ سے وہ عصبیت نہیں ہے جو دیگر اسلامی ممالک میں ہے۔ علوم دینی کی بھی یہی کیفیت ہے۔ عربی زبان کے جاننے والے بہت کم تعداد
لیکن عام مسلمان ابھی بھی عربی زبان کی حد درجہ عظمت کرتے ہیں۔ ایک عیسائی پادری نے بیان کیا ہے کہ ایک صوبہ سے چینی مسلمانوں کو عیسائی
کے گرد جمع کرنے کی تمام کوشش بے کار گئی تو یہ ترکیب کی گئی کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی سوانحعمری اور عیسائیت کے متعلق دیگر معلومات عربی زبان
چھپوا کر لوگوں میں تقسیم کی گئیں۔ وہ مسلمان جو کسی عیسائی واعظ سے بات کرنے کے بھی روادار نہ تھے، ان عربی رسالوں کو کلام پاک سمجھ کر ہاتھ
لیتے اور سروں پر رکھتے تھے۔ صدہا مسلمانوں نے جو مضمون سے واقف نہ تھے محض اس خیال سے کہ عربی زبان میں سوائے متبرک باتوں کے
نہیں ہوسکتا۔ ان رسالوں کو مساجد میں جاکر رکھ دیئے۔

صرف ایک مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک مسلمانانِ چین کو اپنے مذہب مقدس سے کسی قدر الفت ہے۔ لیکن ان کی تعلیم دینی اور
کوئی بندوبست نہیں ہے۔ اور عیسائی مشنری اسلامی آبادیوں میں جابجا مدارس اور شفاخانے کھول رہے ہیں اور ان ذرائعہ سے ایک تعداد
کی عیسائیت کے دائرہ میں شامل ہوگئی ہے۔ اور اگر عیسائی مشنریوں کا یہی زور رہا تو کیا عجب ہے کہ چین کے لکھو کھہا مسلمان اسلام سے
ہو جائیں۔

جب سے ترکوں نے چینی مسلمانوں کی طرف اپنی توجہ مائل کی اس وقت سے عیسائیوں کی جد و جہد میں اور بھی ترقی ہوئی ہے مسلما
کی مشہور رواداری کی مثالیں چین میں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں۔ لیکن عیسائی پادریوں نے مسلمانوں کی مہمان نوازی اور رواداری سے نا
فائدہ اٹھانا شروع کردیا ہے۔ پادری پیٹس تحریر کرتا ہے "میں مسلمانوں کی مساجد میں ہمیشہ بے تکلف چلا جاتا ہوں۔ اور جب چاہتا ہو
عیسائیت پر وعظ دیتا ہوں۔ اکثر مسلمان میرے مکان واقع نان کنگ میں آکر مذہبی گفتگو کرتے ہیں۔ مشن اسکولوں میں مسلمان لڑکے
پڑھتے ہیں۔ اور بعض طلبا عیسائی مذہب قبول کرلیتے ہیں۔ دوسرے ممالک کے مسلمانوں کے جو حالات میں نے پڑھے ہیں۔ ان کے لحاظ
کہا جاسکتا ہے کہ چین کے مسلمان دنیا بھر کے مسلمانوں کی نسبت زیادہ زود حاصل لوگ ہیں۔"

مسٹر روڈس صوبہ یونان سے لکھتے ہیں :۔ "یہاں کے مسلمان اس وقت سے زیادہ کبھی بھی ہماری طرف مائل نہ ہوئے ہوں گے۔
پیروان اسلام میں مشنری کام کرنے کا دروازہ بالکل کھلا ہوا ہے۔ ہمیں مسلمان اپنی مساجد میں اس کثرت سے مدعو کرتے
ہیں۔ کہ بعض اوقات دعوت رد کرنی پڑتی تھی۔ بار بار مجھ سے مسلمانوں نے درخواست کی ہے۔ کہ کسی عربی دان مشنری کو بلایا جاتا
تاکہ مذہبی مباحثہ اس مقدس زبان میں ہوتا۔ شمال، مغربی حصہ ملک میں سویڈن کے مشن نے اپنا وسیع تار اعلیٰ پیمانہ پر پھیلا رکھا
ہے۔ کاشغر اور یارقند میں ترکی النسب مسلمانوں کے یقین کے لئے جابجا مدارس اور شفاخانے کھول رکھے ہیں۔ ڈاکٹر ہنٹر نے ترکی
ملاؤں کی امداد سے عیسائیت پر متعدد رسالے عربی زبان میں چھاپ کر مسلمانوں میں تقسیم کئے ہیں۔ صوبہ کانسو میں جہاں عربی زبان کے
پڑھنے اور سمجھنے والے کسی قدر زیادہ تعداد میں ہیں۔ مصر اور شام سے عیسائی رسالے اور اخبارات منگا کر مسلمانوں میں مفت تقسیم
کئے جاتے ہیں۔

جا ہیں ان کی جدوجہد کے حالات مسلمانانِ ہند کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے -

ہم چاہتے ہیں کہ ہمدرد میں وقتاً فوقتاً چینی مسلمانوں کے حالات شائع کر کے اپنے ہم وطنوں کی معلومات میں اضافہ کریں۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ باوجود بادبانی کشتیوں کے تکلیف دہ اور پُرخطر سفر کے صدہا مسلمان ممالک اسلامیہ سے چین میں بر
تھے - اور ملت بیضاء کی اشاعت کرتے تھے - طنجہ کے دُور دراز مقام کو جو مراکش کے دوسرے کنارہ پر ہے اور چین کی مسافت گز
مگر ابن بطوطہ جیسے باہمت مسلمان بکثرت چین میں سیر و سیاحت کو جاتے تھے - اور مسلمانانِ چین کو نہ صرف اخلاقی و روحانی تقویت دینے با
کی ہمتوں کو دوبالا کرتے تھے - اور دیگر ممالک اسلامیہ کے مسلمانوں کو وہاں کے دلچسپ حالات سنا کر ترکِ وطن اور اشاعت اسلام کی جانب
کرتے تھے - یا اب وہ زمانہ ہے انہیں مسلمانوں کی اولاد نہ کبھی "سیروا فی الارض" کی مقدس ہدایت پر عمل کرتی ہے - اس لئے اسلامی
سے وہاں کے حالات معلوم کرنا بہت مشکل ہے - لیکن یورپی ذرائع سے جو بدقسمتی سے اسلام کے متعلق ہمیشہ ہمدردانہ نہیں ہوا کرتے
معلوم ہو سکے گا ہم اپنے ناظرین کی خدمت میں پیش کریں گے -

لارڈ کچنر کی رپورٹ مصر پر

چار شنبہ ۲ر جولائی سنہ ۱۹۱۳ء

لارڈ کچنر کی دوسری رپورٹ بحیثیت ایجنٹ اینڈ گورنر جنرل حضور ملک معظم ۲۴ ۔ مئی کو شائع ہو گئی ہے۔ اس میں مصر و سوڈان کے مالیہ، انتظام اور عام حالت پر بحث ہے۔ رپورٹ ہذا وہائٹ پیپر نمبر سی ڈی 6682 کے عنوان سے طبع ہوئی ہے۔ رپورٹ کی تمہید میں لارڈ کچنر اس امر پر اطمینان ظاہر فرماتے ہیں کہ پارٹیوں کے باہمی نزاع و انشقاق میں نمایاں کمی ہو گئی ہے۔ بہ نسبت سابق رعایا کا خصوصاً خاموش جمہور کا گورنمنٹ پر اعتماد بڑھ گیا ہے۔ ان امور سے وہ یہ استنباط کرتے ہیں کہ عنقریب رعایا باہم متحد ہو جائے گی۔ اور رفاہِ عام کے لیئے باہم وفاداری کے ساتھ کوشش کرے گی۔ مگر انہیں امید واثق ہے کہ خود گورنمنٹ اس اثناء میں لوگوں کی حالت درست کرنے اور صحیح راستوں پر قدم بڑھانے کے لیئے ان کی امداد کرتی رہے گی۔ مشرقِ قریب میں جنگ (ٹرکی و بلقان) کا ذکر کرتے ہوئے جو بہت زیادہ پریشانی کے باعث تھے وہ فرماتے ہیں :۔

جنگ کا اثر یہاں بہت گہرا ہوا ہے اور اس کے نتائج کا ملک پر بہت اثر ہوا۔ متعدد ذی فہم اور دوربین اصحاب کو اس انحطاط کا کچھ احساس ہے جو حکومت سیّدہ (عثمانیہ) کی جڑیں کھوکھلی کر رہا ہے۔ ترکی اطالوی جنگ کی قائم کردہ نظیر پر مصر اس جنگ میں غیر جانبدار رہا۔ لیکن لوگوں نے ایک انجمن ہلالِ احمر مرتب کی اس میں دل کھول کر چندے دئے اور اسلامی مجاہدین جنگ کی ہوا خواہی میں پرجوش ہمدردی کا اظہار کیا۔ خاندان خدیویہ اور خصوصاً دو شہزادوں نے اس تحریک میں سرگرم حصہ لیا۔ مگر باشندگانِ مصر نے دورانِ جنگ میں بالکل ضبط نفس سے کام لیا ہے اور باوجودیکہ اپنے بھائیوں کے جنگی مصائب و نوائب کی وجہ سے ان کے دلوں میں فطرتی احساسات پیدا ہوئے مگر انہوں نے اسی روش کو برابر قائم رکھا۔

مصر کی موجودہ اقتصادی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے لارڈ کچنر نے یہ دکھلا دیا ہے کہ ملک کی دولتمن ایک گونہ روئی کی قیمت پر منحصر ہے۔ اس کے بعد وہ ایزاد کرتے ہیں کہ :۔

"دراصل جیسا کہ اس کی تجارت برآمد سے ظاہر ہے مصر کی قوت خرید ایک حد تک اس ایک جنس کی قیمت کی کمی بیشی پر ایک حد تک منحصر ہے اور اسی وجہ سے ملک تیزی اور مندے کا شکار رہتا

آخری سفر انگلستان کے وقت
(ایک جامعی کی پنسل ڈرائنگ)

اس لیے ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جس سطح دولت مندی پر ہم پہنچ گئے ہیں بیشتر اس امر پر مبنی ہے کہ روئی کی جو قیمت گذشتہ چند سالوں میں اٹھتی رہی ہے اسے بحال رکھا جائے۔ خوش قسمتی سے اس اندیشہ کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ مستقبل قریب میں روئی کی قیمت گھٹ کر اتنی ہو جائے جتنی کہ ۱۵ سال قبل تھی لیکن اگر کوئی بہت ہی مندا ہو گیا تو نتیجہ یہ ہو گا کہ موجودہ دولتمندی کے بل بوتہ پر جو زائد ذمہ داریاں لاحق ہو گئی ہوں گی۔ ان کے دباؤ میں آ کر قیمتوں کا یہ انقلاب نہایت سخت ہو گا۔"

مصر کی اقتصادی زندگی

ان ظاہر اور دیگر پوشیدہ خطرات کی موجودگی میں دو چند بدیہی و فرزانہ مشورے دیتے ہیں جو گورنمنٹ (مصر) کی تدبیر مالی پر خود بخود عائد بھی ہو جاتے ہیں:

یہ ضروری ہے کہ معمولی اخراجات میں کفایت شعاری کو ملحوظ رکھتے ہوئے غیر معمولی اخراجات کو اس طرح سے قاعدہ میں رکھا جائے۔ کہ ریزرو فنڈ (خزانۂ توفیر) میں اتفاقی ضروریات کے لئے کافی سرمایہ موجود ہے اس میں تو شک نہیں کہ گذشتہ دو سال سے غیر معمولی خراج مالیہ توفیر سے زیادہ نہیں بڑھا ہے۔ اور اس خزانہ کی زر توفیر میں کچھ کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ لیکن اگر گورنمنٹ پر اس لئے ملامت کی جائے کہ گذشتہ تیس سال میں اس نے قرضہ ملکی میں سے کچھ بھی ادا نہیں کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس اثناء میں گورنمنٹ نے قومی ضروریات پر رقوم کثیر صرف کر کے ملک کو دوبارہ اقتصادی زندگی عطا کر دی ہے، اور اگرچہ اس کا نتیجہ حسب مراد تو نہیں ہوا تاہم اگر ان قومی مصارف سے قرضہ ملکی میں اضافہ بھی ہو جاتا تو، گورنمنٹ حق بجانب تھی۔ مالیہ ملکی میں سے کوئی تین کروڑ پونڈ عمارتوں اور ریلوں کی تعمیر پر صرف ہوا ہے اور ان ضرورتوں کے لئے باہر سے کوئی قرضہ نہیں لیا گیا۔"

پھر لکھتے ہیں کہ گورنمنٹ ملک کے ذرائع آمدنی کو فروغ دینے کی ضرورت پر بوجہ اتم آگاہ ہے اور علاوہ کاشت پنبہ کے دیگر شعبوں پر بھی متوجہ ہے چنانچہ زراعت، پیمائش اور صنعتی تعلیم کے محکمے اس لحاظ سے مفید کام کر رہے ہیں۔

ملک کے پرائیویٹ قرضوں کی بابت لارڈ کچنر فرماتے ہیں کہ اس وقت بجز بار آور ضرورتوں کے کسی اور مطلب کے لئے نیا قرضہ لینے کی بہت کم ترغیب ہے ساتھ ہی دیہاتی سیونگز بنکوں کے قیام اور فائیو فیڈن لاء کے نفاذ سے ایسی صورتیں اختیار کی گئی ہیں جن سے دہقانی آبادی میں، جفدرسی پیدا ہو جائے گی۔ اور ناعاقبت اندیشی کے ساتھ قرضہ لینے کی عادت چھوٹ ہو جائے گی۔ (فائیو فیڈن لاء) ہر اس ادنے بسوہ دار کی حفاظت کرتا ہے جس کے پاس پانچ فیڈن یا اس سے کم زمین ہو۔ قرضہ کی ادائیگی میں اس کی زمین مکان یا برتن بھانڈے قرق نہیں ہو سکتے۔ اور اس قانون کا نفاذ غیر ملکی سود خواروں

کی وجہ سے ضروری ہُوا جو ملک میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور جن کے پاس غریب دہقان بہت پھنس جاتے ہیں۔ لارڈ کچنر کو تو یقین ہے کہ جدید قانون مقبول ہُوا ہے اور خود فلاحین بھی اسے
بادی
پسند کرتے ہیں۔

ایک اور اصلاح یہ ہوئی ہے کہ "کینٹونل جسٹس لاز" کا اجراء ہو گیا ہے اس قانون کے رو سے امراء چھوٹے چھوٹے علاقوں میں مقدمات خفیہ کے انفصال کے لیئے بطور آنریری مجسٹریٹوں کے کام کریں گے۔

آبپاشی

پشتہ اسیوان کے متعلق جو دسمبر گذشتہ میں کھولا گیا تھا ذکر کرتے ہوئے لارڈ کچنر آبپاشی کی عام حالت پر ایک تبصرہ کرتے ہیں۔ اگر دریا معمولی حالت میں رواں ہو تو اس نئے حوض سے جو وافر پانی دستیاب ہو سکے گا اس سے مزروعہ رقبہ میں سے اور ۱۴ فیصدی کی اراضی کی آبپاشی ہو سکے گی۔
اس سے بڑے رقبہ کی آبپاشی کی تجاویز بھی بیان کی گئی ہیں ان میں سے دو تو مثلث نیل میں زیر عمل ہیں اور باقی بالائے مصر میں زیر غور ہیں۔ نیز یہ تجویز ہے کہ سفید نیل پر ایک اور بند لگایا جائے جو خرطوم سے ۳۰ میل اوپر کو ہو گا۔

مسئلہ آبپاشی پر عبور کرنے کے بعد لارڈ کچنر مندرجۂ ذیل بڑے بڑے نتائج پر پہنچے ہیں۔

(۱) موجودہ وسیع و عظیم رقبہ مزروعہ کی آبپاشی کے لئے پانی کا کافی ذخیرہ ہے۔

(۲) کہ مثلث نیل میں آئندہ ۱۵ سال میں رقبہ مزروعہ کی جو توسیع بوجوہ اغلب ہو سکتی ہے اس کی آبپاشی کے لئے بھی پانی کا ذخیرہ کافی ہے۔ بشرطیکہ موسم گرما میں دریا بہت نہ اتر جائے۔

(۳) کہ چونکہ بالائے مصر میں مدامی زراعت کی توسیع اور دریا کے اتراؤ کے دنوں میں مثلث نیل کی توسیع یافتہ زراعت کی ضروریات آب پاشی کا لحاظ رکھنا بھی قرین مصلحت ہے اس لئے ضرورت ہو گی کہ پانی کی مقدار مطلوبہ کو تقسیم کرنے کے لئے نئے کام جاری کئے جائیں۔ توقع کی جاتی ہے کہ سفید نیل میں مجوزہ بند اس غرض کے واسطے کافی ہو گا۔

لارڈ کچنر عدالت ہائے مخلوط کے عدالتانہ نظام میں فوری اصلاحوں کی ضرورت کو بیان کرکے تمہید کو ختم کرتے ہیں اس مضمون پر وہ سال گذشتہ کی رپورٹ میں بھی بحث کر چکے ہیں سب سے زیادہ ضروری اصلاح تو یہ ہے کہ محکمہ عدالت کے اخراجات میں کفایت کی جائے۔ اور وہ اس طرح سے ہو سکتی ہے کہ اس وقت جو اجلاس کامل کے لئے کثیر تعداد ججوں کی مطلوب ہے اس میں کمی کی جائے۔ اس غرض کے لئے مصری گورنمنٹ نے پچھلے سال تجاویز کی تھیں اور ان رسل و رسائل کا حوالہ دیتے ہوئے جو سال گذشتہ میں اس مسئلہ کے متعلق ہوئے اور ان کا کچھ نتیجہ نہیں نکلا لارڈ

انجمن خدام کعبہ

رقم زدہ عالی جناب مولینا مولوی عبد الباری صاحب

۱۰ جون ۱۹۱۳ء

جمعیت خدام کعبہ کی ضرورت کو تو مسلمان عام طور پر محسوس کرتے ہیں۔ اس کی عرفی اور عارضی فوائد کی شہرت بھی ہوگئی ہے۔ اور ہر طرف سے شرکت کی درخواستیں آرہی ہیں۔ ہمارا اس مجلس کے قائم کرنے سے نہ تو کوئی سیاسی مقصد ہے۔ نہ امن عامہ میں خلل ڈالنا ہے۔ نہ یہ کوئی سازش یا راز ہے یہ انجمن امور مذہبی ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس سے ہماری بڑی غرض یہ ہے۔ کہ باوجود مختلف خیالات و عقائد کے مسلمانوں کو ملکی کام کرنے کی مشق ہو۔ ان کو ایک جانب توجہ دلانے سے ان کے باہمی مناظرات و مباحثات میں کمی ہو۔ تمام مسلمانوں کے دلوں میں مذہبی جوش قائم رہے۔ اور جو غفلت میں پڑے ہیں۔ ان کی چونک جانے کی امید کی جاسکے۔ جو دستور العمل شائع ہوا ہے۔ وہ عارضی ہے۔ اور مجلس بزرگان قوم کے مشورہ کی حاجت ہے۔ ہم اس مجلس کو کسی خاص جماعت کی ملکیت نہیں سمجھتے ہیں۔ بلکہ تمام مسلمانوں کی ایک ایسی انجمن ہے جس میں ہر قسم کی مساوات مد نظر رکھی گئی ہے۔ مگر عقلائے ملت اور علمائے امت کے اوپر اس انجمن کے قواعد و ضوابط کا دار و مدار ہے۔ اور ان کی رائے سے ہر قسم کا رد و بدل ہو سکتا ہے۔ چونکہ ہم خود اس امر کو جانتے ہیں کہ بالفعل کام جاری کرنے کے لئے جو قواعد ہم نے بنائے ہیں ان پر غور و تدبر کی بہت ضرورت ہے اس واسطے ہم نے یہ سفر اس غرض سے نہیں کیا ہے۔ کہ اکابر علماء کو اس انجمن کی شرکت کی دعوت دیں اور عام کو خواہ مخواہ انجمن کا ممبر بنائیں۔ بلکہ ہماری غرض اس سے علماء کی خدمت میں حاضر ہونا ان سے اپنے مقاصد کو زبانی عرض کرنا اور ان سے مشورہ دینے کی خواہش کرنا ہے۔ چنانچہ اس امر میں بہت کامیابی ہوئی۔ ہم بہت مشکور ہیں کہ جن علمائے کرام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے بڑے تپاک سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ اور ہمارے معروضات سنے۔ اور اپنی مفید ترین رایوں سے ہماری معلومات کو وسیع کیا۔ اور آئندہ مفید مشورہ دینے کا وعدہ کیا۔ ہم کو جو مشکلات اس انجمن کے قائم کرنے میں خود پیش آئیں اور اس سفر میں حضرت کبار کی مشورت سے جو باتیں قابل لحاظ معلوم ہوئیں۔ ان کو ہم مختصراً قلم بند کرتے ہیں۔ تاکہ ان مشکلات کے آسان کرنے کی صورت نکالی جائے۔

انجمن کے قائم کرنے اور اس کے برقرار رکھنے میں بہت سی دشواریاں ہیں۔ مگر یہ بات ان دشواریوں کے ملحوظ رکھنے کے بعد بھی نہیں ہوتی ہے۔ کہ ہم اس انجمن کی کارروائی کو موقوف رکھیں بلکہ ان دشواریوں کو رفع کرنے کی کوشش کی جاوے گی۔ اور جو امور اس دستور العمل کے قواعد کی وجہ سے ایسے ہیں۔ جن سے عام مسلمانوں کو شرکت میں سہولت نہیں ہوتی ہے۔ ان پر ممبران انجمن پوری توجہ کر رہے ہیں۔ اور عنقریب جو دستور العمل شائع ہوگا۔ اس میں ان باتوں کا لحاظ رکھا جائیگا۔

ہر انجمن کو لائق کارکن مل جانا اس انجمن کے قیام و قرار کا قوی سبب ہوتا ہے۔ یہ دشواری ہم کو پیش آرہی ہے۔ کہ جیسے کارکن اس انجمن کے ہونا چاہییں ابھی ہم کو دستیاب نہیں ہوئے۔ مگر امید قوی ہے کہ اس انجمن سے جو دلچسپی مسلمانوں نے ظاہر کی ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے ایسے لوگوں کا مل جانا بالکل آسان ہے جو اخلاص سے انجمن کا کام کریں۔ جن میں ایثار نفسی ہو۔ جو تجربہ کار ہوں۔ دیانت دار ہوں۔ اور ان پر ملک اعتماد کر سکتا ہو۔ اگرچہ اس وقت بھی انجمن کے کارکن بحمد اللہ ان اوصاف سے خالی نہیں۔ مگر جو اہم ذمہ داریاں آئندہ انجمن کے کارکنوں پر عائد ہونے والی ہیں ان کے اعتبار سے ہم ان کارکنوں میں اعلیٰ تر کارکن چاہتے ہیں۔ اور خدا نے چاہا تو موجودہ کارکن اپنے اوصاف کو موجودہ حالات سے زائد ترقی دیں گے۔ اور وہی ان امور کے انجام دینے کے بھی سزاوار ہوں گے۔ جب کہ ان سے توقع

کچنر فرماتے ہیں :-

"میں اس امر کو بہت مذموم خیال کرتا ہوں کہ پولٹیکل مخالفت ان عدالتوں میں اصلاح کے مانع ہے جن کو گورنمنٹ مستقل ترقی و حسن انتظام کے لئے لازمی خیال کرتی ہے، تجویزہ اصلاحیں کسی طرح بھی موجودہ عدالتی نظام کے بنیادی اصولوں میں تبدیلی نہیں کرتیں۔ یعنی یہ کہ جن مقدمات میں غیر ملکیوں کا تعلق ہو ان میں بہ نظر ثانی مختلف القوم غیر ملکی جج شریک ہوا کریں میں خود اس اصول کو برقرار رکھنے میں خیال ضروری سمجھتا ہوں کہ اس سے ان غیر ملکی باشندوں کی بہت بڑی مالی اغراض کی حفاظت ہو سکتی ہے جن کا روپیہ مصر میں لگا ہوا ہے۔ لیکن میری رائے ہے کہ بحالات موجودہ مذکور الصدر عدالتیں بوجہ ناقص نظام اور قدیم طرز عمل کے ان اغراض کی حفاظت کا کافی ذریعہ نہیں ہیں"۔

گورنمنٹ کی مالی حالت کو اطمینان بخش بتلایا گیا ہے۔ معمولی بجٹ میں ۲۰۴۵۰۰۰ پونڈ انگریزی کی توفیر ہے۔ سنہ ۱۹۱۲ء کے حسابات مارچ میں شائع کئے گئے تھے۔ اور ٹائمس اخبار کی ۱۳ مارچ کی اشاعت میں ان کا خلاصہ بھی کیا گیا ہے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مالیہ ۱۷۵۱۵۰۰۰ پونڈ (انگریزی) ہے اور معمولی اور خاص اخراجات کا اندازہ ۱۵۴۷۰۰۰ پونڈ ہے۔ سنہ ۱۹۱۱ء کی نسبت مالیہ میں ۲۲۲۰۰۰ کے پونڈ کا اضافہ ہوا۔ اس سے پیشتر کبھی اس قدر اضافہ نہیں ہوا۔

محاربۂ بلقان

سجاد حیدر یلدرم کے قلم سے

پنجشنبہ ۵ جون ۱۹۱۳ء۔

اسلام کے لئے میں اس لڑائی کو پچھلے سو برس بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ زمانہ کی سب سے بڑی فلاکت سمجھتا ہوں۔ ۱۸۷۸ء کی جنگ، روس میں بھی اسلام کو سخت ضربہ پہنچا تھا۔ لیکن وہ اس قدم اکھاڑ دینے والے دھکے کے مقابلے میں بہت کم تھا۔

اس معرکہ میں پیکر اسلام بے جان تو نہیں ہوا۔ مگر اس سے بڑھ کر ایک مصیبت میں مبتلا ہو گیا۔ مسلمان اپنی عزت نفس کھو بیٹھے۔ اور کتنے ہیں جو اس فلاکت کی وسعت اس زخم کی گہرائی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔؟ یورپ سے مسلمانوں کا اخراج ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ مصیبت زدہ خانماں برباد قافلے۔ اپنے وطنوں کو اپنے گھروں کو، اپنی زمینوں کو، اپنے باپ دادا کے کھیتوں کو چھوڑ کر اور اس طرح چھوڑ کر۔ کہ اپنی باقی تلخ محر نشیمن زندگی میں اس کا خواب ہی دیکھیں تو دیکھیں۔ اور خواب میں کون سی رات ہوگی کہ وہ نہ دیکھیں گے؟ وہ موعود اقالیم کی طرف جا رہے ہیں۔ دیس نکالا اور وہ بھی آگ کے شعلوں اور تلواروں سے جبر کوں کی متابعت کے ساتھ مل رہا ہے۔ اور اتنی فرصت بھی نہیں دی جاتی۔ کہ وہ اپنے گاؤں کے قبرستان میں جا کر اپنے باپ، ماں یا بھائی بہن کی قبر پر ایک آخری فاتحہ پڑھ لیں۔ یہ تو وہ ہیں جو آشیاں ویران ہیں۔ بھٹک رہے ہیں مگر امید نہیں ہوئے۔ اور جو جنگل میں آ گئے، وہ اپنے وطن سے نکالے نہیں گئے۔ ان کے ساتھ یہ احسان کیا گیا کہ وہ اپنے وطن کی زمینوں میں جلا دیئے گئے

اس بے پایاں سیلاب بلا کی مسلمانوں کی تاریخ میں کونسی نظیر ہے؟ اخراج مسلمانان از اسپین۔ تباہی بغداد۔ کشتۂ اسلام جب پاؤں تلے روندے گئے۔ اس وقت یہ دردناک۔ عبرت ناک نظارے چند عبرت اندوز آنکھوں اور چند ملہم دلوں نے دیکھے ان میں سے

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر   داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد پر
آسماں نے دولت غرناطہ جب برباد کی   ابن بدروں کے دل ناشاد نے فریاد کی   (اقبال)

مگر مجھے خوف ہے۔ کہ اس بلائے ناگہانی کے جو اپنے سیاہ دامن میں ہماری آنکھوں کے سامنے مسلمانوں کو لپیٹ رہی ہے۔ کیفیت، کمیت کے سمجھنے والے سمجھانے والے ہم میں کم یاب ہیں۔ اور یہ مصیبت بالائے مصیبت ہے۔ ہندوستان میں اس کی چوٹ سب کے دلوں پر لگی ہے۔ مگر ظفر کتنے۔ شبلی، محمد علی۔ ڈاکٹر انصاری اور چند اور لوگ ان کے مقابلے میں یہ منظر بھی ہماری آنکھوں نے دیکھا کہ اس مصیبت سے بالا رادہ۔ عارضہ اٹھانے والے لوگ ہم میں پیدا ہوئے۔ یہ مسلک پنجاب کے ایک اخبار زمیندار نے عجب طمطراق کے ساتھ اختیار کیا۔ ایک طرف تو یہ لوگ ہیں۔ دوسری طرف وہ جو اپنے گھروں میں آرام سے بیٹھ کر، ان قربان ہونے والوں پر طعنہ زن ہیں۔ کہ کچھ نہیں کیا قسطنطنیہ کے سادہ دل۔ زود اعتبار۔ بے پیش بین دفادار دل کے متعلق اپنے نزاکش و دشنام میں سے جتنے بتر چاہے استعمال کیجئے۔ مگر اے قارئین کرام! جو لوگ اسلام کے لئے اور اس کے نام کے لئے سینہ سپر ہوئے۔ گو سینہ گریاں ارکھتے تھے۔ شکم سیر حریف سے لڑے۔ گو خود بھوکے تھے، ان کا استہزاء تو نہ کیجئے۔

میں نے کہا کہ میں اس ضربہ کو ۱۸۷۸ء کے ضربہ سے بدرجہا شدید سمجھتا ہوں، اور اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اس وقت اسلام ترغہ میں نہ تھا بلکہ دولت

یہ خدا کی توفیق پر موقوف ہے۔ وَمَا ذَالِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیز تاہم مسلمانوں کو چاہئے۔ کہ ان اوصاف کے حضرات کی نشان دہی سے انجمن کے کارکن ا... فرمائیں۔ دوسری بات یہ قابل لحاظ ہے۔ کہ یہ انجمن ملک میں اتحاد پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لئے ممبروں میں پھوٹ نہ ہونا ضروری امر ہے۔ اس کی طرف خاص توجہ کرنی چاہئیے۔ تاکہ کارکنوں پر ملک اعتماد کرے۔ اور خود وہ حضرات بھی کسی داخلی یا خارجی مفسدہ پرداز کے اثر کو قبول نہ کریں۔ یہ سخت مشکل ہے۔ اور اس کے ... کی جس قدر صورتیں ہوں۔ ہر ایک خواہ اسلام کا فرض ہے۔ کہ ہم کو ان سے آگاہ کرے۔ اور اس مشکل کے دفعہ کرنے کی ہر وقت کوششیں ہونی چاہئیں۔ ہم خود ان امور سے انجمن کو بالکل علیحدہ رکھیں گے جو فرقہ بندی کا باعث ہیں۔ بلکہ اس پر خاص توجہ کی جائے گی کہ جس بات سے اسلام کو بھی ہونا ہو۔ وہ کیسی ہی مفید کیوں نہ ہو۔ ہم اس کو بغیر اس نقصان کے دفع کئے ہوئے نہ اختیار کریں گے۔ مثلاً اشاعت اسلام جتنا اہم اور ضروری ہے۔ اتنا ہی دشوار اور موجب افتراق ہے۔ یہ بحث ہے۔ کہ اور غالباً اس سے انجمن کو تعلق نہ رہے گا۔ اور ہر فرقہ کے عقائد کی اشاعت اس فرقہ پر چھوڑ دی جائے گی۔ ابتدائی مدارس وہیں کھولے جائیں گے جہاں ضرورت ہو۔ ورنہ موجودہ مدارس کی مدد کی جائے گی لہذا ہم کوئی امر ایسا نہیں کرنا چاہتے ہیں جس میں ہم کو اس بدظنی کا اندیشہ ہو۔ جو بات ایسی ہو اس سے اطلاع کرنا ہمارے مسلمان بھائیوں کا فرض ہے۔ تاکہ اس پر ہم غور کریں۔ اور اس کو دفع کر دیں۔ ہم کوئی راز نہیں رکھنا چاہتے ہیں۔ بلکہ ہر امر آشکارا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہمارے فرائض مذہبی ہیں۔ ان میں ہم کو یقین ہے۔ کہ متحدہ اقوام بالخصوص حکام ہند یا برطانیہ کے لوگ کبھی دست اندازی کو روا نہیں رکھیں گے اور ہم کو اس کا یقین ہے۔ کہ یہ لوگ ہرگز مقامات متبرکہ کی بے حرمتی کا گمان بھی نہیں رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے بلا خطرہ ہم اس انجمن کو قائم کر رہے ہیں تاہم کا تحفظ امن کے لحاظ سے یہ ہے۔ کہ وہ کسی ایسی تحریک کو جو امن عامہ میں خلل انداز ہو یا قانون کے خلاف ہو۔ شائع نہ ہونے دیں۔ اسی واسطے ہم کو بھی اس کا تحفظ ازبس ضروری ہے۔

چوتھا امر متعلق مال کے ہے۔ کوئی کام بغیر روپیہ کے نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ضروری ہے کہ اس انجمن کا چندہ کھولا جائے۔ مگر وہ چندہ ایسا نہ ہونا چاہئے کہ ہمارے ملک کی دیگر مفید انجمنوں کے چندہ کا سدراہ ہو۔ کیونکہ یہی انجمنیں ایسی ہیں کہ جن کی وجہ سے ہم اس وقت ترکی سلطنت کی تائید کر سکتے اور ملک کے فوائد ان سے حاصل ہو رہے ہیں۔ اس خیال سے چندہ قلیل مقدار کا رکھا گیا ہے۔ جو صورت مشتبہ ہو اس سے ہم کو اطلاع ہونا چاہئے۔ اس کا خیال رکھا جائے۔ اس طرح روپیہ جمع کرنے کا طریقہ ایسا ہونا چاہئے۔ جس میں غبن نہ ہو سکے۔ تیسرے مصارف کے اوپر خاص توجہ کرنا چاہئیے۔ اور وہ روپیہ جو سلطنت ترکی کو دیا جائے۔ اس میں تصفیہ کر لینا چاہئیے۔ کہ یہ روپیہ چونکہ خدمت مذہبی کے لئے دیا جائے گا۔ اس واسطے اس روپیہ سے سوائے مقامات متبرکہ کی عزت و حرمت برقرار رکھنے کے اور کچھ نہ کیا جائے۔ ہر حالت میں اس بات کا لحاظ رکھنا ضرور ہے۔ کہ کسی قسم کی ہمدردی اہل عرب کے ساتھ ایسی نہ کی جائے جو باعث ان کی اور ترکوں کی رقابت کا ہو اور مسلمانوں میں عداوت پیدا ہو۔ اگر خدانخواستہ ایسی کسی صورت میں ہم نے مدد کی تو بلا شبہ یہ مضر ترین فعل ہو گا۔ کسی طرز عمل سے اس کا شائبہ اگر ہوتا ہو تو ہر محب قوم و اسلام کا فرض ہے۔ کہ ہم کو آگاہ کر دے۔ ہم ہر طرح کی اصلاح کیلئے تیار ہیں۔

پروفیسر مرزا محمد سعید دہلوی[1]

ہندو مسلمان کے اتحاد پر ایک نظر

(شنبہ ۸ نومبر سنہ ۱۹۱۳ء)

میں قوم کے کسی فرد کی نسبت مجہول الاسم یا غیر معروف وغیرہ وغیرہ ہونے کا حملہ کرنا نہیں چاہتا۔ جیسا کہ بعض خود سر تحریروں ... رویہ ہے۔ کیونکہ یوں تو ہمیشہ شریف اور لائق اصحاب کی پگڑی اچھالنے اور قوم کی مصیبت اور اس کی مشکلات کے وقت کبھی کروٹ بھی نہ لے۔ بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو اصحاب باوجود مشکلات زندگی کے ہندو مسلمان کے اتحاد کے محرک ہوئے ہیں ان کے دلی جذبات اور خلوص کا اندازہ اپنے حلقہ اور مکان کی چار دیواری میں بیٹھنے والوں کو خود ساختہ بھاٹوں کی زبانی سنی سنائی باتوں سے نہیں ہو سکتا، جب تک کہ ان کے دل میں بھی جذبہ موجود نہ ہو۔

میرے خیال میں کاپی نویس پڑھیہ بند ہی نہیں بلکہ اگر قوم کے ایک لکڑہارے اور گھسیارے اور پریس کے کلیہ کے دل میں اسلام اور قوم کی سچی عزت اور ترقی ملک کے جائز جذبات موجزن ہیں تو ان کی ہستی ان ننگ قوم افراد کی زندگی سے بدرجہا زیادہ مبارک ہے، جو دین کے خلاف اپنی رائے رکھ کر عزت چاہتے اور اپنے خطابوں اور جاہ طلبی کی امیدوں سے دھوکہ میں آکر قومی جذبات کو پامال کرتے ہیں۔ خدا کے فضل سے امید ہے اور زمانہ بالکل قریب ہے جب کہ کاپی نویس، پڑھیہ بند اور کلیہ اپنے سچے جذبات کے ساتھ چمک دار ستارے اور آفتاب کی روشن کرنیں بن کر چمکیں گے اور ملت فروش و خود پسند درہم و دینار کے بندے تعجب و حیرت کے ساتھ اپنی چار دیواری میں گھن کھائے پیڑوں کی طرح پڑے پڑے سڑا کریں گے۔ ان مجہول الاسم اصحاب کی اتحادی تحریک بالکل نیک نیتی پر مبنی تھی مجھ کو ان میں خاص اصحاب کے جذبہ اور خلوص کا پورا پورا علم اور اندازہ ہے۔ لیکن انسان میں غفلت بھی ہو جاتی ہے ممکن ہے کہ کسی وقت کے سبب وہ اس معاملہ پر کافی غور نہ کر سکے ہوں۔ لہٰذا اگر ایک کام کرنے والی ہستی کی کسی غلطی کی وجہ سے تحقیر کی جائے، یا اس کو قوم کی نظروں سے گرانے والے الفاظ لکھے جائیں۔ تو اس بے سرے الاپ کو خود پسندی اور شوریدہ سری کی دھن کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ چونکہ آج کل اخبارات میں ہندو مسلمانوں کے اتحاد کے متعلق مختلف تجویزیں پیش ہو رہی ہیں اس لیے مجھ کو بھی اپنے خیالات حوالہ قلم کرنے کی جرأت ہوئی جن کو ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔

سنہ ۱۹۰۶ء سے پہلے جب دہلی میں بیرون شہر طاعون کے مریضوں کے لیے جھونپڑیاں ڈالی گئی ہیں اور اس وقت

---

[1] مشہور مصنف اور ادیب

عثمانی، ترکوں کے طرفدار یورپ کی کئی سلطنتیں تھیں جنہوں نے ہزیمت خوردہ ترکوں کا ...

نہملہ علی الاعلان مسلمانوں کے خلاف مذہبی جذبات برانگیختہ کئے جاتے تھے۔ ان کے مصائب سن کر یورپ کے چہرے پر مسرت کی سرخی آئی تھی بلکہ

ہمسایہ کی مثال اس سے بڑھ کر کوئی نہ ہوگی۔

اس لڑائی کے زمانہ میں تمام یورپ کے اخباروں میں جہاں جہاں کارٹون نکلے، ایک بھی ہمدردی کا نہ تھا بلکہ استہزائیہ ہنسی اور سلطنت عثمانیہ کی شکستوں پر تالیاں بجانے کا۔

میں ترکوں کی سادہ لوحی اور صاف دروں پر حیران ہوں "ثروت فنون" اور دیگر اخبارات اس بات پر ~~طا~~ طاقت کی تمام طاقت صرف کر رہے ہیں۔ کہ ہمیں یورپ سے انصاف کرنا چاہیے۔" اور پالاشمق،، ہو جانا چاہیے۔ اس طرح یورپین بننے کی کوشش کرنا چاہیے۔ کہ ہم میں اور ان میں کوئی فرق نہ رہے۔ تب ہم کو نجات ملے گی۔ میں کہتا ہوں کہ بہت جلد انہیں اس کی سزا ملے گی۔ کہ وہ یورپ کا پانی مگر لا کر رہے ہیں۔ باوجودیکہ یورپ بھا... گے اور پی رہا ہے۔ اور یہ بھاڑ کے نیچے۔

کاش یہ ہو کہ کوئی اسرافیل صور کی آواز ہم میں سے ایک ایک کو جگا دے، اور ہم نہ شکایت کریں۔ نہ گلہ، بلکہ اس نخبیڑ کی شدت کا پورا احساس کر... اور اس کا درماں معلوم کر کے اس کے درپے ہو جائیں اور یورپ سے کہہ دیں۔

گفتگو آئین درویشی نبود
ورنہ با تو ماجراہا داشتیم

سجاد حیدر یلدرم

مسلمانوں نے محض پردہ کے خیال سے انکار کیا تو ہمارے وطنی بھائیوں نے اتحاد کی اس طرح تحریک اٹھائی تھی جیسی کہ سنہ ۱۹۱۲ء کو مسلمانوں کی طرف سے بلا کوئی مابہ النزاع معاملہ ہونے کے ہو چکی ہے۔ اور اس اتحاد سے ہمارے بھائیوں نے وہی فائدہ اٹھایا جو مسلمانوں نے اپنے شرعی پردہ سے اٹھایا تھا۔ اور اس طرح دونوں قومیں ان تجویز کی تکالیف سے محفوظ رہیں، فریقین کی طرف سے اتحاد کی تحریک ہو چکی ہے۔ صرف فرق اتنا تھا کہ مسلمانوں نے اپنے بھائیوں کی اس نمائشی تحریک سے چشم پوشی کی اور دو لینڈی والے روز اپنی فراخ دلی اور خلوص کے ثبوت میں پان سپاری، شربت وغیرہ وغیرہ سے مدارات کی۔ لالہ صاحبان کے اس نمائشی اتحاد کا اس سے پتہ مل جاتا ہے کہ جب عید الاضحیٰ کا موقع آیا اور غریب دستکار پیشہ ور مسلمانوں نے اپنے تہوار کے وقت مزدوری طلب کی تو جس کا وہ بقر عید سے پہلے انتظام کر لیا کرتے تھے، اور اس وقت اس نمائشی اتحاد پر بھروسہ کر کے کوئی انتظام نہیں کیا تھا تو ان غریب مسلمانوں کو کورا جواب ملا کہ تم جیو ہتیا کرو گے، ہم تو ان تاریخوں کے بعد خرچ دیں گے۔ اسلامی بھائی اپنا سا منہ لے کر چلے آئے اور اتحاد کی قلعی کھل گئی۔ اب جو مسلمانوں نے تحریک اٹھائی تو وہ ہمارے بھائیوں نے نمائش پر محمول کی۔ حالانکہ مسلمانوں کو اس وقت نہ طاعون کی جھونپڑیاں نظر آ رہی تھیں اور نہ کوئی ملکی خوف ہراساں کر رہا تھا جس کے واسطے لالہ صاحبان سے امداد کی امید پر اتحاد کی تحریک اٹھائی جاتی۔

پھر اس کے بعد آج سے کچھ عرصہ پہلے بنگال ایجی ٹیشن کے وقت ہندو اصحاب نے مسلمانوں کو اپنا ہم آواز بنانے کے لیے اتحاد کی تحریک اٹھائی۔ لیکن چونکہ وہ آواز ایک حد تک گورنمنٹ کی منشاء کے خلاف تھی اور اسلامی تعلیم سے جدا تھی اور اس اتحاد کے قیام اور کسی قسم کی مادی وغیر مادی فائدہ کی امید نہ تھی اس لیے مسلمانوں کا علیحدہ ہی رہنا مناسب تھا جس کی نسبت یہ خبر اڑائی گئی کہ مسلمان ڈرپوک ہیں اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد جدا چننی چاہتے ہیں۔

ان واقعات کے بعد پھر نہ معلوم کہ ہندو مسلمان کس وقت دست و گریباں ہو چکے ہیں جس کی صفائی کے لیے مسلمانوں کو یکایک اتحاد کی امنگ پیدا ہوئی اور خواہ مخواہ مجہول الاسم کے دفتر میں لکھی گئی۔

پھر اس پر بھی بس نہیں بلکہ بعض سادہ لوح مسلمان فرط جوش میں آ کر مسلمانوں کو یہ مشورہ دینے کے لیے تیار ہو گئے کہ عید الاضحیٰ کی تاریخوں میں مسلمان گائے کا ذبیحہ چھوڑ دیں۔

تسلیم! لیکن سوال یہ ہے کہ اس وقت جب کہ ملکی ترقی کے خیال سے مسلمان اتحاد کے محرک ہوتے ہیں تو ان کو قبل از وقت اس قسم کی تجویزیں پیش کرنے کی ضرورت کیا ہے جس کو قوم کا بہت بڑا حصہ اس وقت تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ بجز اس کے کہ یا تو ایسے خیال والے اصحاب کو کوئی خاص امید پبلک میں لانا چاہتی ہے اور واقعات سے چشم پوشی کراتی ہے، یا وہ زمانہ کے واقعات سے اصلاً بے خبر ہیں۔

دیکھنا یہ ہے کہ بنگال ایجی ٹیشن کے وقت ہندو اصحاب نے باوجود مابہ النزاع کوئی واقعہ نہ ہونے کے اتحاد کی تحریک اٹھائی تھی اس وقت سے اب تک برادران وطن کی طرف سے کون سا ایسا مبارک سلوک ہوا ہے

مسلمانوں کو جابجا اتحاد کی طرف جذب نہ کر سکتا ہو۔ مجھ کو معاف فرمایا جائے اگر میں یہ عرض کروں کہ طبیعتوں میں جو تنفر ور کشیدگیاں و قومیت کا خیال اس وقت تھا، وہ اب بھی موجود ہے۔ مسلمانوں کو ملازمت کی چھوٹی چھوٹی اسامیوں کے لیے جو دشواریاں اُس وقت تھیں وہ اب زیادہ موجود ہیں۔ چھوت چھات کی رسم دن بدن زیادہ سخت ہوتی جاتی ہے۔ مذہبی مباحث کا لب و لہجہ روز بروز کڑا اور دل آزار ہوتا جاتا ہے۔ اب اگر ہمارے سادہ لوح مسلمان ان تمام باتوں کی وجہ سے گائے کی قربانی قرار دیتے ہیں تو، پانچ سوال پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) مسلمانوں کے تہوار پر کیوں اظہار رنج کیا جاتا ہے، جب کہ روزانہ ایک عمل جاری ہے۔ بجز اس کے کہ ہمارے بھائیوں کو مسلمانوں کی خوشی ناگوار ہے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

(۲) جب کہ ہندوستان کی تمام قومیں اس گائے کشی سے فائدہ اُٹھانے میں برابر ہیں خواہ فائدہ خوراک کے درجہ میں ہو یا آرائش و استعمال کی چیزوں سے حاصل ہوتا ہو۔ بستر بند، ہینڈ بیگ، گھوڑے گاڑی کا سامان سواری کا زین، بوٹ، شوز وغیرہ وغیرہ مسلمانوں کی کھال کی نہیں ہوتی بجز جانوروں کے چمڑہ کے تو محض اہل اسلام سے کیوں یہ تحریک کی جاتی ہے۔ اور عیسائیوں اور دیگر قوموں سے یہ سوال کیوں نہیں کیا جاتا؟ اور مسلمان دوسری قوموں سے پہلے کس احسان کے دباؤ میں ایسی تجویز پیش کرنے اور صلح کرانے کے لیے تیار ہیں جس کو ضمیر ماننے کے لیے حاضر نہیں ہے۔

باوجودے کہ مسلمان نسبتاً اپنی مذہبی پابندی میں کمزور نظر آ رہے ہیں تاہم اس تجویز کے تسلیم کرنے سے پہلے اُن کو یہ خطرہ ہو سکتا ہے کہ آج ایک فروعی مسئلہ مابہ النزاع قرار دیا جا رہا ہے تو ممکن ہے کہ کل کوئی اصولی بات ہمارے بھائیوں کے لیے موجب رنج ہو۔ اور اس کے بعد وہ تحریک کریں کہ پکار کر اذان نہ دی جائے۔ پھر اس کے بعد مسلمان مسجدوں میں نماز ادا کرنے نہ جائیں کیونکہ مسلمانوں کا ایک جگہ بیٹھنا بھی غیر مسلم اقوام کے دلوں کو ہمیشہ کھٹکتا رہا ہے۔ پھر اور آگے چل کر یہ تحریک ہو کہ مسلمان گھروں میں قرآن پاک کی تلاوت نہ کریں، کیونکہ ہندو اصحاب کو اس تعلیم سے اتفاق نہیں ہے۔ تو ذرا سادہ لوح حضرات غور فرمائیں کہ آئندہ مسلمان کن کن باتوں کو ترک کرنے کے لیے آمادہ نظر آتے ہیں۔

(۴) اس وقت جب کہ مسلمان بوجہ اپنی غربت کے بکری کا گوشت نہیں خرید سکتے جو گائے وغیرہ سے نسبتاً گراں ہے تو اس وقت جب کہ گائے کا گوشت دوا کے لیے بھی میسر نہ ہو گا اور مسلمان اگر اس گرانی کے متحمل نہ ہوں گے تب ان غریب مسلمانوں کی خوراک کا کیا انتظام ہو سکے گا۔ اور معتاد غذا نہ ملنے کے سبب وہ کیونکر اپنی صحت قائم رکھ سکیں گے۔

(۵) اگر تھوڑی دیر کے لیے مابہ النزاع گائے کشی کو تسلیم کر لیا جائے اور مسلمان اس کے ترک پر آمادہ بھی ہو جائیں تو اس کے عوض مسلمانوں کو اپنے بھائیوں سے کس قسم کی مادی یا غیر مادی فائدہ کی امید رکھنی چاہیے۔

دونوں قومیں مجھ کو معاف فرمائیں، مجھ کو اپنی مذہبی معلومات کے علاوہ دیگر مذاہب کی جو کتابیں دیکھنے کا اتفاق

ہوا ہے اور زمانہ کے واقعات بتا رہے ہیں - وہ یہ ہے کہ ما بہ النزاع کوئی مذہبی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ یہ جو کچھ ہے ناشدنی واقعات پیش آ رہے ہیں - یہ سب اسی بات کا خمیازہ ہے کہ اپنے مذہب کے سچے پابند نہیں ہیں - نہ ہندو، ہندو ہیں اور نہ مسلمان مسلمان - کیونکہ دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جس میں کچھ نہ کچھ اخلاقی تعلیم کا جز نہ ہو، اور اس کے تحت میں دل آزاری سے روکا نہ گیا ہو - یہ ایک بہت بڑی کمی واقع ہو گئی ہے جس کا ہندو مسلمان کسی وقت بھی لحاظ نہیں کرتے - اور فریقین کو وہ ناگوارشکائتیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اور اس کا تمام بار مذہب پر ڈالا جاتا ہے، اور معاملات زندگی میں نئی نئی خلشیں اور رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں - میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ہندو اصحاب میں سے جو صاحب اپنے مذہب کے پابند ہیں اُن کی ذات سے کسی مسلمان کو شاکی نہ پایا اور یہی طرح کسی ہندو کو مسلمان کا -

میرے خیال میں اگر آج ہندوستانی اقوام میں اگلی سی صداقت اور اخلاق پیدا ہو جائیں، جس کو اس جدید تعلیم نے مسخ کر دیا ہے، اور ہر ایک کو کبر و نخوت کا پتلا بنا دیا ہے، تو کبھی ایک دوسرے سے شکایت نہیں ہو سکتی - اس لیے میں مؤدبانہ عرض کرتا ہوں کہ بات بات پر مذہب کو آڑ بنانا اور اس کے او چھل دلی بخارات کا اظہار کر کے مذہب کو بدنام کرنا عقلمندی اور دور اندیشی سے بعید ہے - بجائے اس کے کہ ہم اپنے ملک کی ترقی کے لیے فنا ہو نے والی کوشش میں وقت صرف کریں - بہتر اور مناسب یہ ہے کہ ہر ایک کو اپنی حالت پر چھوڑا جائے - پرماتما کی بھگتی کرنے والے سے محمد صلعم کا نام لینے والوں کے اعمال کی بازپرس نہ ہوگی اور مسلمان سمجھتے ہیں کہ قیامت کے روز ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اُٹھائے گا - تو ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اپنے حقوق کی حفاظت اور اپنے ناموس کو آئندہ خطرات سے بچانے والے اسباب کی تلاش کریں - اور دنیاوی حقوق کی حفاظت کے ساتھ رام کی بھگتی اور خدا کی عبادت کریں اور سوچیں کہ اس پرماتما نے دنیا میں گوناگوں اور متضاد عناصر سے مختلف الخیال اقوام پیدا کی ہیں اور حقیقت میں دنیا کس راستہ کا نام ہے -

سعید دہلوی

رؤف کمانڈر جہاز حمیدیہ سے گفتگو

یکم جون سنہ ۱۹۱۳ء

ہمعصر اخبار "کرمل" کے فاضل ایڈیٹر نے رؤف بے حمیدیہ کے مشہور کمانڈر سے جو گفت وگو حمیدیہ کے حیفا پہنچنے پر کی تھی اس کا ذکر اپ
کی اشاعت میں کرتے ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ جمعہ کے روز گذشتہ کو عصر کے وقت "حمیدیہ" جہاز حیفا کی بندرگاہ پر پہنچا۔ میری طبیعت نے گ
نہیں کیا کہ پہلے کی طرح اب بھی اس جہاز کے مشہور افسر کی زیارت سے محروم رہوں۔ چنانچہ میں معہ اپنے ایک خاص دوست اور چند دیگر ہمراہیوں کے
بندر کے کنارے پہنچ کر ایک کشتی میں سوار ہوا۔ جو ہمیں بٹھا کر فوراً ہی حمیدیہ کی جانب روانہ ہوگئی۔ اس وقت کی کیفیت نہ پوچھئے دل کا
تھا کہ مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا۔ اور طرح طرح کے خیالات کے ہجوم نے جو لحظہ بلحظہ بڑھتے رہتے تھے مجھے بالکل محو کر دیا تھا۔ اس عالم بیخ
میں ہماری کشتی "حمیدیہ" کے پاس پہنچ گئی۔ اور میں یکایک چونک پڑا۔ ایک افسر سے ملنے کے لئے اجازت کا لینا ضروری تھا۔ اس لئے ہم نے ا
آنے اور غیور دل رؤف بے سے ملاقات حاصل کرنے کی باقاعدہ اطلاع کرائی۔ جس کے جواب میں انہوں نے اپنی معزز جماعت میں سے ایک شخ
کو ہمارے لئے بھیجا۔ جس نے ہمیں بہادر جہاز ران تک پہنچنے میں مدد دی۔ یہ گداز جسم، پست قامت، بلند پیشانی، مدوّر چہرہ، اور سیاہ چش
جوان تھا۔ خرمی و نشاط کے آثار چہرے سے نمایاں تھے۔ اس نے ہمارا استقبال اس طرح کیا جس طرح ایک بلند حوصلہ اور عالی ہمت شخص کو زیب
جس وقت ہم نے اپنے غیور دل جہاز ران کی زیارت کی تو یکایک ان کے کارناموں نے یاد آ کر میرے دل پر رعب طاری کر دیا۔ اور میرے حواس ایسے منت
کہ میں اپنے متعلق چند منٹ تک اسے کچھ نہ کہہ سکا۔ تاہم میری خوشی اس رعب پر غالب آئی۔ اور میں نے اپنی کپکپاتی زبان اور ٹوٹے پھوٹے بے رب
الفاظ سے جس قدر گویائی نے یاوری کی جہاز ران موصوف سے اپنے خوش قسمت ہونے کا اظہار کیا۔ ایسا شخص جس کی آنکھیں اور پلکیں چشم بینا او
شنوا پر اپنے استقلال و بسالت کا بزبان حال ثبوت دے رہے ہوں اسبات کی کامل دلیل ہیں کہ جس پر آشوب زمانہ کا احساس آج کل عثم
کر رہے ہیں۔ اس پر ان کے رؤف بے جیسے وطن پرست اور بہادر ضرور فتح حاصل کریں گے۔

جب ذرا رعب کم ہوا اور ہم کرسیوں پر بیٹھے تو مجھے خیال آیا کہ بہادر رؤف بے نے وطن کی خدمت کرتے ہوئے جو کچھ کارنمایاں کئے ہیں
کی داستان سننی چاہئے۔ لہذا میں نے کہا کہ میں نے آپ کے متعلق اخبار "ڈیلی ٹیلیگراف" میں ایک مضمون "بحری سبق" کے عنوان سے دیکھا
اور انگریزی میں کہا کہ دردانیال سے نکل کر بری محاربات میں آپ نے اپنی کامل بہادری کا ثبوت دیا ہے اور بحری رستوں کو دشمنوں کے لئے خط
بنا دیا ہے۔ یہاں تک کہ سرویہ نے جب اپنی سپاہ اور توپیں بھیج کر سقوطری کا محاصرہ کرنا چاہا تو محض "حمیدیہ" کی مدد سے بری سپاہ ارسال کی
توپیں پھر بھی نہ بھیجیں کیونکہ ان کے لے جانے کے لئے بری رستہ نہ تھا۔ آپ نے اس کا جواب انگریزی میں دیا۔ اور اس طرح گفت وگو کی
کوئی قادر الکلام شخص کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ "ڈیلی ٹیلیگراف" ایک نہایت وسیع پرچہ ہے لڑائی چھڑنے سے پہلے میں اسے اکثر دیکھتا تھا۔
لیکن ہم نے سنا ہے کہ وہ اتحادیوں کی طرف داری کے باعث عثمانی حکومت سے منحرف ہو گیا ہے۔ مجھے بہت برا معلوم ہوتا ہے۔ پھ
اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ یہ اخبار پھر وہی اعتدال پسندی کی روش اختیار کرے اور اپنی اصلیت پر آجائے۔

اس جواب سے مجھے معلوم ہوا کہ آپ اخبارات کو نہایت غور و خوض سے دیکھتے ہیں اور ان کے متعلق آپ پوری معلومات رکھتے ہیں۔ میں سنتا ہوں کہ ریوٹر کمپنی اور عثمانی کمپنی نیز دیگر کمپنیوں کو آپ اپنے کارناموں کے متعلق اطلاع دیتے ہیں۔ جو خبریں ان کے ذریعے سے پہنچتی ہیں۔ ان میں باہم کچھ اختلاف ہے اور ریوٹر نے آخر میں اپنے کارناموں کو عملی طور پر بیان بھی کیا ہے۔ مگر وہ کہتا ہے کہ حمیدیہ کے واقعات یہ ہیں کہ اس نے علاوہ سامان خورد و نوش اور ذخائر جنگ کے ۱۱۹ آدمیوں کو تلف کیا ہے۔ ہم اس واقعہ کے آپ کی زبان سے بالتفصیل سننے کے ازحد مشتاق ہیں۔ آپ نے کہا کہ سین جیوانی ڈی میڈوا پر جو واقعات گزرے ہیں ان کے متعلق کیا بیان کیا گیا ہے۔ میں نے کہا وہ کہتے ہیں کہ آپ نے سین جیوانی ڈی میڈوا پر دو جہازوں میں آگ لگا دی تین غرق کر دیے اور پچاس ساٹھ آدمی ہلاک کئے۔ لیکن تعجب ہے کہ آپ سرحدی سپاہ کی چھاؤنیوں کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکے۔

اس پر رؤف بے نے فرمایا "میں نے سین جیوانی ڈی میڈوا میں ایک بادبانی کشتی اور چھ تجارتی باربردار جہاز جو سامان خورد و نوش اور ذخائر جنگ سے پُر تھے۔ اور بعض میں تھوڑی سی سپاہ بھی بھیجی تھی جلائے اور غرق کئے۔ اس کے بعد معمولی طور پر میں اس موقع پر پہنچا۔ اور بعض باربرداری کے غرق ہونے والے جہازوں کا فوٹو لیا میں نے انہیں بنظر غائر دیکھا اور وہاں سے چلا آیا۔ اس کے بعد کنارے پر میں نے تین سرحدوں کی بارکیں دیکھیں۔ انہیں کے پاس سمندر میں تین جہاز بھی لنگر انداز تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے ان پر آتش باری کرنے کی تیزی کی تاکہ انہیں بھی ہمیشہ کے لئے [illegible] ابطال کر دوں۔ اور توپوں کو داغنا شروع کیا۔ اور ان میں بھی آگ لگا دی سرحد سے توپیں بھی ہم پر آگ اگل رہی تھیں لیکن ان کے گولے ہم سے بہت دور پانی میں گرتے تھے۔ ہم تک نہ آتے تھے۔

جب میں نے دریافت کیا کہ باربرداری کے جہازوں میں کیا تھا تو انہوں نے فرمایا کہ "یقینی طور پر یہ تو معلوم نہیں ان میں کیا تھا۔ کیونکہ وہ ہم سے بہت دور اور ساحل کے قریب تھے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ غالبا وہ بہیں سامان خورد و نوش اور ذخائر جنگ سے پُر تھے۔ دوسرے چار باربرداری جہاز جو رہ گئے تھے ان سے جب میں نے اطاعت قبول کرنے کو کہا تو انہوں نے اطاعت قبول کر لی۔ لیکن جب میں وہاں سے چلا اور حمیدیہ کی زد سے وہ دور ہوئے تو انہوں نے مکر کر کے بھاگنا چاہا۔ یہ دیکھ کر میں نے توپ داغی جس سے ان چاروں میں سے ایک جہاز "الیس" نامی کے انجن کے اس حصہ میں جس میں تیل رہتا ہے (اور جس کو عربی میں "مرجل" کہتے ہیں) آگ لگ گئی۔ اس جہاز میں بارود بھری تھی۔ پھر ہم نے اس وقت دیکھا جب کہ شعلے اچھی طرح بلند ہو چکے تھے۔ اور سپاہی آگ سے پناہ لینے کے لئے پانی کے دامن میں پہنچنے کی غرض سے سمندر سے کود رہے تھے۔ اس طرح میں نے باقی — کو بھی جلا دیا۔ تیسری بادبانی کشتی تھی۔ جس میں ذخائر جنگ اور سامان خورد و نوش بھرا تھا۔

اس کے بعد میں وہاں سے واپس آرہا تھا کہ ایک باربرداری کا جہاز اور ملا۔ اس میں بھی ذخیرہ جنگ اور سامان جنگ تھا۔ اسے بھی میں نے جلا کر غرق کر دیا۔ مگر اس کے ساتھ جو اسٹیمر تھے انہیں میں نے نہیں روکا۔ جب میں نے عرض کیا کہ بہت سے آدمی آپ کے خطرناک اعمال کو مافوق العادت خیال کرتے ہیں اور ریوٹر ڈیٹا کی خبر شائع کر کے کہتا ہے کہ آپ کے ساتھ ایک انگریزی افسر ہے۔ جو آپ کو اس شاہراہ کامیابی پر چلا رہا ہے۔ اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ آپ اسی افسر کے ساختہ پرداختہ ہیں تو رؤف بے نے ارشاد فرمایا کہ کثرت حرارت سے اس کے دماغ میں خون چڑھ گیا ہے۔ میں انگریزوں کی نہایت قدر کرتا ہوں۔ اور مجھے اعتراف ہے کہ بحری فنون میں انگریز بہت سی قوموں کے اُستاد ہیں اور ہمارے یہاں ایک انگریز امیر البحر بھی تھا۔ مگر اب وہ جب سے جنگ چھڑی ہے قانون حفاظت خود اختیاری کے اصول کے بموجب عثمانی بیڑہ کی خدمت سے معزول کر دیا گیا ہے۔ میں تین سال سے متواتر اس — جہاز کی جہاز رانی

کر رہا ہوں۔ ——— پر قائم ہیں۔ جب سے کوئی ایسا موقع پیش نہیں آیا کہ ہمارے ساتھ کوئی انگریز یا دیگر غیر ملکی اس خدمت پر مامور ہوا ہو۔ نہ ہم سے پہلے ایسا ہوا اور نہ آئندہ اس کی امید ہے۔ میرے یہ دریافت کرنے پر کہ کیا آپ نے کسی انگریز سے بھی بڑی تعلیم حاصل کی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ہرگز نہیں۔ مگر میرے والد نے البتہ ان سے تعلیم پائی تھی۔ اس عرصہ میں جہاز کے چاروں طرف زیارت کرنے والوں کا ہجوم ہوگیا تھا۔ نیز تبدیل جہاز ران کو اور بہت سے کام کرنے تھے اس لئے ہم نے رخصت کی اجازت چاہی۔

یہاں جب آپ نے دیکھا کہ آپ کے ہم وطنوں کے ساتھ افریقہ کی زندگی ... بہائم کے ساتھ بھی جائز رکھنے لرزتا ہے۔ تو دل بے تاب ہوگیا۔ چنانچہ مسٹر گاندھی نے جس وقت عدالت میں اپنا وکالت نامہ داخل کیا ہے تو عدالت اوّل نے اس عذر پر مقدمہ میں پیروی کرنے کی اجازت نہیں دی کہ کالے رنگ والے آبادی دنیا میں سفید رنگ کی ہمسری کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہیں۔ بلکہ غلامی کے لیے۔ اس لیے اس کو کوئی موقع نہیں دیا جاسکتا کہ اپنے فطری فرض سے نکل کر اپنے آقاؤں کے مقابلہ میں آئے۔ مگر عدالت بالادست سے بعد از دشواری بسیار وکالت کی اجازت مل گئی۔ ۱۸۹۳ء میں گاندھی کی عاقبت بین نگاہ نے ان تمام خطرات کو دیکھ کر جن کا بادل ہندی آبادی کی تباہی کے لیے فضا میں جمع ہو رہا تھا۔ نیٹال ہندی انجمن کی درخواست پر وہیں رہنا منظور کر لیا۔ کہ شاید ضرورت کے وقت اپنے مظلوم برادران وطن کے کام آئیں۔ اس سال آپ نے چند دیگر مقتدر آدمیوں کی یگانگت میں نیٹال ہندی کانگرس قائم کی۔ جس میں کچھ عرصہ تک بحیثیت آنریری سکرٹری کام کرتے رہے۔

اس زمانہ میں ممانعت داخلہ اقوام ایشیا کے خلاف آپ نے جد و جہد کی اور کامیاب ہو گئے۔ دوسری کوشش آپ نے ہندی آبادی کے حقوق غصب کرنے کے خلاف کی۔ مگر اس میں ناکامیاب ہوئے۔ تاہم امپیریل گورنمنٹ کے ایما پر ۱۸۹۵ء میں آپ ہندیان مقیم نیٹال و ٹرانسوال کے قائم مقام بن کر ہندوستان تشریف لائے۔ تاکہ یہاں کی آبادی کو اپنے آوارہ وطن بھائیوں کی ناگفتہ بہ سرگذشت سے آشنا کریں۔ اور اس فرض کو آپ نے شہر در شہر دورہ کر کے اور رسالہ جات شایع کر کے انجام دیا۔ یہ خبریں جب اخبارات کے ذریعہ سے افریقہ گئیں۔ تو آپ کے برخلاف گوری آبادی میں سخت اضطراب و بے چینی پیدا ہو گئی کیونکہ وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ اس کے مظالم کی داستان کو شایع کیا جائے کیوں کہ اس کے نزدیک سیاہ رنگ کو پیسنا اور برباد کرنا بھی فرض انسانیت تھا۔

اس عرصہ میں آپ معہ اپنے خاندان کے ڈربن واپس گئے۔ اور جس جہاز میں یہ وطن پرست سفر کر رہا تھا۔ اس میں چند دیگر ہمدردان ہند بھی تھے۔ مگر ان کے وہاں پہنچنے سے پیشتر نو آبادی کے شریروں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ مسٹر گاندھی اپنے ہمراہ ہندوستان سے ایسے کاریگر لے کر آرہا ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں یہاں کے اجڈ گوروں سے سامان محنت چھین لیں گے۔ ایک تو پہلے ہی خبروں کی آگ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی اس مزید روغن اندازی نے اور بھی شعلے بھڑکا دیئے۔ اور اب مسٹر موصوف کے خلاف ایک خدائی ہو گئی جس کی برافروختگی کو کوئی چیز فرو نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ جب جہاز لنگر انداز ہوا ہے تو گورے وحشیوں کی ایسی بھیڑ تھی کہ پولیس افسر نے خوف زدہ ہو کر جہاز پر آ کر مسٹر گاندھی کو مشورہ دیا کہ آپ رات کی تاریکی میں جہاز سے اتریں کہ مبادا کوئی ہنگامہ مذموم ظہور پذیر ہو جائے مگر مسٹر گاندھی نے اپنے ایک دوست کی معیت میں جو انہیں لینے کے لیے جہاز پر آ گئے تھے دن کی روشنی میں خشکی پر جانا پسند کیا۔ مسٹر موصوف نے جونہی خشکی پر قدم اتارا ہے۔ درندگان افریقہ نے حملہ کر دیا اور اگر سپرنٹنڈنٹ پولیس کی بیوی کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو شاید گوروں کی گردن اپنے گناہوں کے عذاب سے نجات پا جاتی۔ گاندھی بدقت تمام اپنے دوست کے مکان پر پہنچا دیئے گئے۔ مگر وہاں بھی آخر کار بدکرداروں نے چین نہیں لینے دیا۔ اور یہ رئیس الاحرار شب کی تاریکی

مسٹر موہن داس گاندھی

شنبہ ۱۳ دسمبر ۱۹۱۳ء

سرزمین ہند میں آج کون فرد ہے جو مسٹر گاندھی سپہ سالار حق و صداقت کے نام نامی سے واقف نہیں۔ یہ وہ فرزند نوجوان ہے جو مادر ہند کی عزت و احترام برقرار رکھنے کی خاطر آج تیسری بار جنوبی افریقہ کے جیل خانوں میں وہاں گوری آبادی کے ہاتھوں مظلومیت کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ مہذب دنیا کو فخر ہے کہ اس نے بردہ فروشی کو ناپید کر دیا۔ مگر جو سلوک جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے ساتھ جائز قرار دیا جا رہا ہے وہ کیا ہے؟ جس زندگی پر انہیں مجبور کیا جا رہا ہے اگر وہ غلامی نہیں تو پھر غلامی کیا ہے؟ جبر و ظلم بے دردی و بے رحمی کی ظلمت آفتاب صداقت کے چمکتے ہی کافور ہوتی ہے۔ آج جنوبی افریقہ میں حق و مکاری، حریت و استبداد نور و ظلمت کی کشمکش ہے۔ کل نتائج سامنے ہوں گے۔ دنیا کی تاریخ کے حصہ تاریک کا ایک صفحہ منور کر دیا جائے گا۔ مظلومیت کی فوج، جبر و ظلم کو پسپا کر دے گی۔ اس درمیان میں سپہ سالار حق و صداقت کے حالات خالی از دلچسپی نہ ہوں گے۔

مسٹر موہن داس کرم چند گاندھی کاٹھیاواڑ کے ایک قدیمی خاندان کے فرزند ارجمند ہیں۔ آپ ۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو کاٹھیاواڑ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد نہایت ہی عزت دار بزرگ تھے۔ اور مدت تک ریاست ہائے پوربندر و راجکوٹ میں بعہدۂ وزارت سرفراز رہے۔ گویا سیاسیات مسٹر گاندھی کی میراث پدری ہیں۔ آپ کی والدہ نہایت نیک طینت پرانے خیال کی خاتون تھیں۔ اور چونکہ مسٹر موصوف اپنے والدین کے سب سے آخری فرزند تھے اس لیے آپ اور آپ کی والدہ کے درمیان محبت مادری بھی خاص طرز کی تھی۔ جو لوگ اس راز سے واقف ہیں کہ بچہ کی ابتدائی تربیت پر حالات گرد و پیش کا اثر نہایت گہرا پڑتا ہے۔ وہ مسٹر گاندھی کی دینداری و پرہیزگاری سے صاحب موصوف کی والدہ کی سلامت روی کو دریافت کر سکتے ہیں۔ ہندی تعلیم کے بعد جب آپ ولایت جانے لگے تو آپ کی والدہ اپنے بیٹے کو سمندر کا سفر کرنے کی اجازت نہ دیتی تھیں۔ آخر بڑی ردوکد کے بعد اس وعدہ پر کہ گاندھی ولایت جا کر گوشت، شراب اور یورپ کی عورتوں سے پرہیز کریں گے۔ رضامند ہو گئیں۔ اور فرماں بردار بیٹے نے اپنے وعدوں کو صداقت سے پورا کیا۔ ولایت سے بی۔اے اور بیرسٹری پاس کر کے واپس آئے اور بمبئی میں وکالت شروع کر دی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کی آمدنی تقریباً پانچ ہزار روپے ماہوار تک پہنچ گئی۔ اور کامیاب بیرسٹروں میں شمار ہونے لگے۔ ایک ہندی مقدمہ کے متعلق آپ کو ۱۸۹۳ء میں جنوبی افریقہ جانا پڑا۔ فطرت کو یہی میدان آپ کی ہمت مردانہ کا جولان گاہ بنانا مقصود تھا

اس قانون کو اپنے وطن عزیز کی توہین خیال کیا گیا اور اسی ہی سال مسٹر گاندھی ولایت گئے کہ وہاں کے ذمہ داروں کو اس وحشیانہ سلوک سے آگاہ کریں۔ مگر اس غرض میں کامیابی نہ ہوسکی اور آخرکار مسٹر گاندھی نے واپس آکر خاموش جبر و تشدد کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا جو آج تک برابر جاری ہے۔ اس خاموش مقابلہ کے سلسلہ میں مقابلہ سے جبر و تشدد کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا جو آج تک برابر جاری ہے۔ اس خاموش مقابلہ کے سلسلہ میں صاحب موصوف کو معہ اپنے دیگر رفقاء کے ۱۹۰۷ء میں جیل جانا پڑا۔ اور اب اس کے بعد تیسری بار ہے کہ یہ سالار حریت اپنے بیوی بچوں، دوست و احباب کو خیرباد کہتے ہوئے جیل خانے کی تاریک زندگی بسر کر رہا ہے۔ اور یہ صرف اس لیے کہ اس کا دل دنیا میں جہاں ہر آدمی برابر کا بنایا گیا ہے۔ کسی آدمی کو غلام دیکھنا پسند نہیں کرتا۔

آپ کے بڑے صاحب زادے اس سے پیشتر وطن عزیز کی خدمت کی خاطر قید محن برداشت کر چکے ہیں۔ اور اس مرتبہ آپ اپنے چھوٹے صاحب زادہ کو بھی جن کی عمر صرف ۱۳ سال کی ہے لے گئے ہیں۔ تاکہ وطن پرستی کی شراب سے یہ معصومانہ کام و دہن بھی لذت یاب ہو جائے۔ حقیقت میں حریت پسندی کی آگ وہ ہے جو ایک مرتبہ سلگنے کے بعد کبھی بجھ نہیں سکتی۔ بلکہ بادِ صرصر کے جھونکے جتنی تیزی کے ساتھ چلتے ہیں اور بھڑکتے ہیں۔ کسی پست قوم میں اگر آزادی کی خواہش پائی جاتی ہے تو اسے مایوس نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ خواہش خود فلک عظمت پر پہنچا دے گی۔

اس وقت جنوبی افریقہ کے ہندوستانی جن قوانین کی مخالفت کا مقابلہ منفادمت مجہول سے کر رہے ہیں۔ ان کی سختی ناگفتہ بہ ہے۔ اور انہیں دنیا میں شاید جنوبی افریقہ کے سفید درندوں کے علاوہ وحشی سے وحشی قوم بھی کبھی ان لوگوں پر جاری کرنا جائز قرار نہ دیں گے۔ جنہوں نے پچاس برس کی جانکاہی کے بعد صحرا کو متعدد شہروں میں تبدیل کر دیا ہے۔ قوانین حسب ذیل ہیں۔

(۱) ہندوستانی کسی شہر کی آبادی کے اندر نہیں رہ سکتا۔

(۲) ان کی دوکانیں ۲ میل کے فاصلہ پر ہونی چاہئیں۔

(۳) یہ لوگ شہر کی کسی سڑک پر نہیں چل سکتے۔

(۴) سوائے تھرڈ کلاس کے یہ لوگ کسی درجہ میں سفر نہیں کر سکتے۔

(۵) کسی ہوٹل میں قیام نہیں کر سکتے۔

(۶) ہر ہندی مرد و عورت جس کی عمر ۱۳ برس سے تجاوز کر چکی ہے۔ ۳ پاؤنڈ یعنی ۴۵ روپیہ جزیہ دے

(۷) جتنے ہندوستانی افریقہ میں موجود ہیں خواہ مسلمان ہوں یا ہندو اگر ان کی شادیاں ہندوستان میں ہوئی ہیں تو چونکہ یہاں کا قانون تعدد ازدواج کو جائز قرار دیتا ہے۔ اس بنا پر وہ سب ناجائز ہیں۔ وہ تمام عورتیں حقوق زوجیت سے محروم اور ساری اولادیں ناجائز۔

موجودہ وقت میں جو جور و ظلم خاموش مقابلہ کو ختم کرنے میں جائز رکھا جا رہا ہے۔ وہ ہندوستان کا ہر باشندہ جانتا ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔ یعنی تمام مقابلہ کرنے والوں کو مجرم قرار دیا گیا ہے۔ کانوں اور کارخانوں کو

میں پولیس کی وردی پہن کر بہ مشکل اپنی جان لے کر بھاگا۔

جنوبی افریقہ میں گوری آبادی کا اثر جوں جوں بڑھتا گیا۔ وہ لگاتار اس کوشش میں مصروف رہے کہ ہندی جو وہاں جاکر آباد ہو گئے تھے ان کے حقوق کو پامال کرے اور ان آوارہ وطن مزدوروں کو باربرداری کے جانوروں سے بہتر کبھی نہ بننے دیا جائے۔ چونکہ سخت محنت کرنے والوں کے بغیر ایک وحشت زدہ ویرانہ متمدن آبادی میں تبدیل نہیں ہو سکتا تھا اس لیے ان کا وجود تو ناگزیر تھا۔ مگر یہ ہرگز منظور نہ تھا کہ یہ پیروں کے نیچے کچلی جانے والی مخلوق کبھی برابری کا دعویٰ کر سکے۔ لہذا آئے دن کے جھگڑے کھڑے رہتے تھے۔ اور ہندوستانی گوروں کی مشق ستم بنے رہتے تھے آخر جام لبریز ہو گیا اور گورنمنٹ برطانیہ نے عاجز آکر منجملہ دیگر شکایات کے ہندیوں کے ساتھ بدسلوکی کے عذر پر اعلان جنگ کر دیا۔ اور سنہ ۹۹ء کا پُر آشوب زمانہ شروع ہو گیا۔

مسٹر گاندھی نے جو مدنیت کی ذمہ داریوں کو بھی حقوق سے کم اہم خیال نہیں کرتے تھے۔ آغاز جنگ ہی پر ہندوستانیوں کی جانب سے ایک طبی مشن پیش کیا جو منظور کر لیا گیا۔ ہندوستان کے آدمی جو جنگ بلقان کے بعد سے یہ سمجھنے لگے ہیں کہ طبی مشن کیا بلا ہے اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسٹر موصوف کو ایک ہزار آدمیوں کی جماعت جمع کرنے میں کس قدر مصارف وغیرہ کا بار اٹھانا پڑا ہو گا۔ اس جماعت نے دورانِ جنگ نہایت قیمتی خدمات انجام دیں۔ اور صلہ میں اختتامِ جنگ پر مسٹر گاندھی کو ایک تمغہ جنگ عنایت ہوا۔

سنہ ۶ء میں افریقہ میں اصل آبادی افریقہ کے خلاف فوج کشی کرنی پڑی۔ اس موقع پر بھی مسٹر گاندھی نے ہندی آبادی کی جانب سے ایک طبی مشن پیش کیا جس نے نہایت کارنمایاں کیے۔ اور آخر میں اس کے ہر ممبر نے ایک ایک تمغہ پایا۔

جنگ کے کچھ ہی دنوں بعد گورنمنٹ برطانیہ نے جنوبی افریقہ کی حکومت خود اختیاری عطا کر دی۔ چنانچہ کیپ نیٹال اور ٹرانسول کے چار صوبے جو باہم مل کر ایک متحد حکومت بنائے گئے تھے۔ خود مختار ہو گئے۔ اور اس دن سے ہندیوں پر آسمان ستم ٹوٹ پڑا۔ اس سے پیشتر جنوبی افریقہ کی حکومت کو گورنمنٹ ہند کا بھی کچھ تھوڑا بہت خوف تھا وہ بھی اب جاتا رہا۔ بعد میں گوروں نے ہندوستانیوں پر کھلے بندوں مظالم کرنے شروع کر دیئے۔ اس آخری مشن سے واپس آکر مسٹر گاندھی ابھی اپنے گھر پر راحت بھی نہیں لینے پائے تھے کہ حکومت ٹرانسوال نے ”قانون آبادی اہل ہند“ پیش کیا۔ مسٹر موصوف اس کی عجیبت کو فوراً پا گئے۔ اور آپ نے اس کے خلاف خاموش مقابلہ کا علاج پیش کیا۔ اس کی ابتدا سے آج تک مسٹر گاندھی کی زندگی جبر وظلم کے خلاف صرف ہوئی ہے۔ بلکہ یوں کہنا بے جا نہ ہو گا کہ آپ کی زندگی جنوبی افریقہ کے جبر و تعدی کی ایک مفصل تاریخ ہے۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں گورنمنٹ نے قانون رجسٹریشن نافذ کیا جس کا منشا یہ تھا کہ ہر ہندی اپنے آپ کو درج رجسٹر کرائے۔ اور بجائے اپنا نام لکھنے کے خواہ خواندہ ہو یا ناخواندہ انگوٹھے کا نشان تحریر کرے کہ تحریر کا حق صرف اس ہستی کو حاصل ہے۔ جو کہ انسان ہے نہ کہ ہندی کو جو افریقہ تو افریقہ ہندوستان ہی میں غلامانہ زندگی بسر کرنے پر خوش ہے۔ ہندوستانیوں

جیلوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ اور اب وہ لوگ از روئے قانون مجبور ہیں کہ مشقت کریں اور اگر اب بھی انکار کریں تو تازیانہ کی سزا دی جائے۔ افریقہ میں ایک ہلچل پڑی ہے۔ اور وہاں کا ہر باشندہ ہندوستان سے جس کی عزت برقرار رکھنے کی خاطر وہ لڑ رہا ہے۔ مدد چاہتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ ہندوستان کیا کرتا ہے۔

گذشتہ سال میں مسٹر گوکھلے جب افریقہ گئے ہیں۔ تو گورنمنٹ افریقہ کے اعلیٰ افسروں نے وعدے کیے تھے کہ سو پونڈ جزیہ معاف کر دیا جائے گا۔ اور قوانین کی دیگر سختیاں بھی دور کر دی جائیں گی۔ اسی بنا پر انگلستان کے وزراء نے مسٹر گوکھلے کی زیادہ آؤ بھگت کی کہ ان کی کوشش سے افریقہ کی رنگ دار و گوری آبادی میں سمجھوتہ ہو جائے۔ مگر آج دریدہ دہنی دیکھئے کہ یہی بے شرم لوگ صاف کہہ رہے ہیں۔ کہ ہم نے کوئی اس قسم کا وعدہ نہیں کیا۔

سن لیجئے خلوتوں میں انا الحق کا ادعا
سولی پہ چڑھ کے سنائے وہ اب نعرہ زن کہاں
فرصت کسے خوشامد شمر و یزید سے
اب ادعائے پیروی پنج تن کہاں

کابل کے سیاسی قیدی

نہ دلیل نہ اپیل نہ وکیل

سہ شنبہ ۱۰ جون ۱۹۱۳ء

"دربار امیر" کے حالات میں جو کتاب مسٹر فرینک مارٹن نے چند سال ہوئے چھپوائی تھی ۔ اس میں انہوں نے سخت اذیت د
سزاؤں کا حال بیان کیا ہے ۔ جو کابل کے قید خانوں میں ان لوگوں پر روا رکھے جاتے ہیں جن پر سیاسی وجوہات کی بنا پر شہنشاہ ک
عتاب نازل ہوتا ہے ۔ یا جن سے پبلک کاموں میں کسی بے ایمانی کا اظہار ہوتا ہے ۔ افغانستان کے قوانین میں اس قسم کی کوئی رعایت
مد نظر نہیں رکھی گئی ہے ۔ کہ جب کبھی کسی شخص کو قید کر لیا جائے تو دریافت کرنے پر قانونی کارروائی کی وجوہات بھی بتا دی جائیں چنا
جن قیدیوں کو زندان میں بھیج دیا گیا ہے ۔ انہیں اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا کوئی موقع نہیں ملتا ۔ بلکہ وہ اس وقت تک قید میں پڑ
سڑا کرتے ہیں جب تک کہ وہ اپنے مفروضہ جرائم کی قرار واقعی سزا بھگت نہیں لیتے ۔ یا سخت جرائم کی حالت میں جلاد ان کی گردن نہیں ا
دیتا ۔ یہ امر شاذ و نادر ہی وقوع میں آتا ہے کہ سلطنت انگریزی کی ہندوستانی رعایا کو کسی واقعی یا مفروضہ جرم میں نظر بند کیا جا
ہے ۔ کیونکہ خوف ہے کہ کہیں گورنمنٹ آف انڈیا اپنی رعایا کی حفاظت کے لئے جسے ہر طرح سے حق دخل اندازی کرنے کا حاصل ہے
سوال نہ کر بیٹھے ۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ابھی تک پنجابی ڈاکٹر کا واقعہ جس کے حالات لاہور کے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ نے شائع کئے
ہیں ۔ گورنمنٹ کی توجہ سے محروم ہے ۔ جیسا کہ ہم کو ان کے روزنامچہ سے معلوم ہوا ہے ۔ مرحوم امیر خود صیغہ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے ۔ اگرچہ افغا
نے ان کے رائج کردہ طریقہ تعلیم سے موافقت نہ کی تھی اور اخلاقی و مذہبی وجوہات کی بنا پر تمام ملاں غیر زبانوں کے پڑھانے کے مخالف تھے
ان کے جانشین نے جو انگریزی زبان کا کچھ علم رکھتے ہیں ۔ ایک تعلیمی اسکیم مرتب کی جس میں کابل میں ایک مرکزی کالج قائم کرنے کا ذکر تھا ۔
اور چھ سال قبل جب وہ ہندوستان میں آئے تھے تو علی گڑھ کالج اور مسلمان طلباء کے ہجوم نے ان پر خاص اثر ڈالا ۔ اور انہوں نے ان کی
عمدہ الفاظ میں تعریف کی ۔ علی گڑھ کالج میں اس خود مختار بادشاہ نے کہا تھا کہ "مجھ سے کہا گیا ہے کہ بہت سے ہندوستانی مسلمانوں میں
یورپین تعلیم کے خلاف سخت تعصب پایا جاتا ہے ۔ جو صریح حماقت ہے ۔ اور میں یہاں مغربی علوم کی تائید میں کھڑا ہوا ہوں بجائے اس کے
کہ میں اسے ایک برا خیال کرتا ہوں ۔ میں نے کابل میں "حبیبیہ کالج" قائم کیا ہے ۔ جہاں حتی الامکان یورپین اصول پر تعلیم دی جاتی ہے ۔ ہز مج
ممدوح کے ان اعلیٰ اور پاکیزہ خیالات کا اعادہ صرف اس لئے کرتے ہیں ۔ کہ ان کا تعلق محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر کی قید سے ہے ۔ جنہوں نے تعلیمی
کام کی خاطر ڈاکٹری کو خدا حافظ کہا ۔ اور اب غالباً اپنی تبدیلی پیشہ پر افسوس کرتے ہوں گے ۔ ڈاکٹر عبد الغنی ہز مجسٹی امیر صاحب کے معالج بن
کر گئے تھے ۔ مگر افغانستان میں مغربی تعلیم و تمدن کے حامی اول ہونے کی حیثیت سے انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اپنی ذاتی وجاہت کو معراج ت
پر پہنچا سکتے ہیں حتی کہ وہ تعلیمی محکمہ کے افسر اعلیٰ بن گئے ۔ ان کا دعویٰ ہے کہ افغانیوں کو تعلیم کے فواید سے پورے طور پر بہرہ ور کرنے کے لئے
انہوں نے بہت سے مدارس قائم کئے ۔ کیونکہ لازمی تعلیم کی ابتدا یہی ہے ۔ لیکن بجائے اس کے کہ ڈاکٹر صاحب حامی تعلیم کے معزز لقب سے ممت

تین سال کابل میں

(ایک یورپین کے قلم سے)

پنجشنبہ ۵ جون ۱۹۱۳ء

ہمعصر اسٹسمین میں ایک یورپین نے کابل میں اپنے سہ سالہ قیام کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ جن کا اقتباس درج ذیل ہے:-

کچھ عرصہ ہوا کابل میں یورپینوں کی تعداد بارہ تھی۔ لیکن اب امیر کابل کے ڈرائیور اور کارخانوں کے نگران سمیت صرف چھ رہ گئی ہے۔

انگریزوں کے مکانات پر رات کو پہرہ رہتا ہے۔ یہ بغیر محافظ دستے کے باہر نہیں نکل سکتے۔

موجودہ امیر سے ہر روز مجھے ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ میں کہہ سکتا ہوں ملک میں ان سے بغیر کوئی شخص موجود نہیں ہے۔ لیکن یہ کوئی کام کرنے سے متنفر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ہفتوں سلطنت کے کاموں کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اور خود موٹر کی سواری۔ فوٹوگرافی اور کھانا پکانے میں مصروف رہتے ہیں۔ کھانا پکانے کے اس قدر دلدادہ ہیں جس طرح شہنشاہ لوئی شانزدہم اپنی زلفیں درست کرنے کا تھا۔

امیر حبیب اللہ خاں بہت امور میں مطلق العنان اور خود پسند واقع ہوئے ہیں۔ بعض اوقات وہ صبح کے ۶ بجے اپنی موٹر کار تیار کروا لیتے ہیں۔ اور تقریباً چھ سات میل جاکر چائے کا ایک پیالہ پی کر واپس آجاتے ہیں۔ جب کبھی ان کی طبیعت چاہتی ہے وہ موقع بے موقع فوج کو قواعد کرا لیتے ہیں۔ اُن کی فوجیں ادنیٰ درجہ کی ہیں۔

اس تمام بے پرواہی اور مطلق العنانی کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام ملک سرکش ہوتا جاتا ہے مختلف صوبوں کے گورنر بلا روک ٹوک مطلق العنان ہوتے جاتے ہیں۔ اور یہی سبب ہے جس نے گذشتہ سال "منگل" فرقہ کو فساد پر آمادہ کیا تھا۔ وہ فساد ابھی تک پورے طور پر فرو نہیں ہُوا ہے۔ اور عام بے اطمینانی اور بے چینی کی وجہ سے سلطنت کے دوسرے حصوں میں بھی پریشانی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔

ہز مجسٹی کے لئے یہ امر خوش قسمتی کا باعث ہے کہ ان کا کوئی بھائی بھی اس حالت میں نہیں ہے کہ ان کے خلاف کوئی بغاوت کر سکے۔ امیر صاحب کے مصاحبوں میں سے بھی کوئی شخص ایسا طاقتور نہیں ہے جو بغاوت کا سرغنہ بن سکتا ہو۔ اور اگر حبیب اللہ زیادہ قوت اور عقلمندی کو کام میں لانا شروع کر دیں۔ جیسا کہ وہ ایسا کرنے کی پوری قابلیت رکھتے ہیں۔ تو بغیر کسی دقت کے تخت پر ہمیشہ قابض رہ سکتے ہیں۔ کیونکہ افغانی ایک طاقتور حاکم کو محبوب

ہونے کے علاوہ امیر صاحب کے تحفہ جات سے مزین ہونے وہ گذشتہ چند سال سے ایسے الزاموں کی بنا پر کابل کی جیل میں پڑے سڑ رہے ہیں جن کی قانونی طور پر ابھی تحقیق ہونی بھی شروع نہیں ہوئی۔

اگرچہ امیر عبدالرحمن نے اپنے سب سے بڑے بیٹے کو تخت کا جانشین مقرر کیا تھا۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا کو بھی اپنے فیصلہ سے مطلع کر دیا تھا۔ تاہم یہ یقینی امر تھا کہ نئے بادشاہ کی تخت نشینی پر ملک میں خانہ جنگی ہوگی۔ افغانیوں کی روایت کے مطابق ہر نئے بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ اگر وہ ان طاقت ور جرگوں کی اطاعت چاہتا ہے۔ جو دراصل قومی قسمت کے فیصلے کرنے والے ہیں۔ تو اس کو چاہئے کہ جنگ کر کے تخت حاصل کرے۔ جب مرحوم امیر حالت نزع میں تھے تو اس وقت اگر فوج دوسرے بیٹے کی تائید کرتی جو بڑے کی نسبت زیادہ ہر دلعزیز ہونے کی وجہ سے حکومت کرنے کے زیادہ اہل سمجھے جاتے تھے۔ تو یقینا خانہ جنگی شروع ہو جاتی۔ مگر ابتدائی تنخواہ کا لالچ دے کر فوج کو اپنی طرف ملا یا گیا۔ اور پہلا ہی موقع تھا۔ کہ افغانستان میں تخت نشینی کے مراسم بغیر خونریزی اور غارت گری کے عمل میں آئے۔ مرحوم امیر کی ایک اور نوجوان بیٹی بھی تخت کی دعوے دار تھی۔ جو اپنی والدہ بی بی حلیمہ کے واسطہ سے شاہی خاندان کی اولاد ہونے کا دعوی کرتی تھی۔ مگر وہ سازشیں کرتے ہی کرتے حال میں انتقال کر گئی۔ عبد اللہ خان اور ان کے بااثر رشتہ دار سرکاری قیدی بنا لئے گئے۔ لیکن اس خاتون نے جس کے دارالخلافہ میں بہت سے ہمدرد حامی موجود تھے۔ نئی سلطنت کے خلاف بہت سی سازشیں کیں جو خوش قسمتی سے خوفناک صورت اختیار کرنے سے بہت عرصہ پیشتر ہی دبا دی گئیں۔ اس کی آخری اور سب سے زبردست سازش دو سال ہوئے ظاہر ہو گئی تھی۔ جن کی پوری تفصیلات ابھی تک پبلک کے روبرو نہیں آئی ہیں۔ اگر پرائیویٹ نامہ و پیام کو ذریعے گورنمنٹ آف انڈیا کو ان کا علم ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سازش میں امیر صاحب قتل ہونے سے بال بال بچ گئے۔ اور یہ کہ کچھ سازش کرنے والے قتل کر دئے گئے۔ اور باقیوں کو کابل کے قید خانہ میں ڈال دیا گیا۔ موخر الذکر بد قسمتوں میں پنجابی ڈاکٹر اور محکمہ تعلیم کے سابق ڈائرکٹر تھے۔ جو اب ہمارے لاہوری ہمعصر کے ذریعے اپنے ہم ملکیوں سے اپیل کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر غنی اپنی بے گناہی ثابت کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ میں چند درباری افسروں کی ناراضگی کا شکار ہوا ہوں۔ جو میری تعلیمی تجاویز کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور میرے مقاصد کو شکستہ کرنے کے لئے انہوں نے سب سے زیادہ آسان ذریعہ یہ سمجھا کہ مجھے متذکرہ بالا سازش کے الزام میں متہم کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس سازش کے ساتھ مجھے بھی ملا دیا۔ اگر ان کے بیانات درست ہوئے۔ اور چونکہ ان کی کوئی تردید نہیں ہوئی ہے اس لئے ان کو درست تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔) تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔ اور اگر امیر صاحب ہندوستان سے ان کا جانشین بنے ہیں تو ہمیں خوف ہے کہ بہت کم لوگ اس عہدہ پر وہاں جانے کی خواہش کریں گے۔

(ماخوذ از ایڈوکیٹ آف انڈیا)

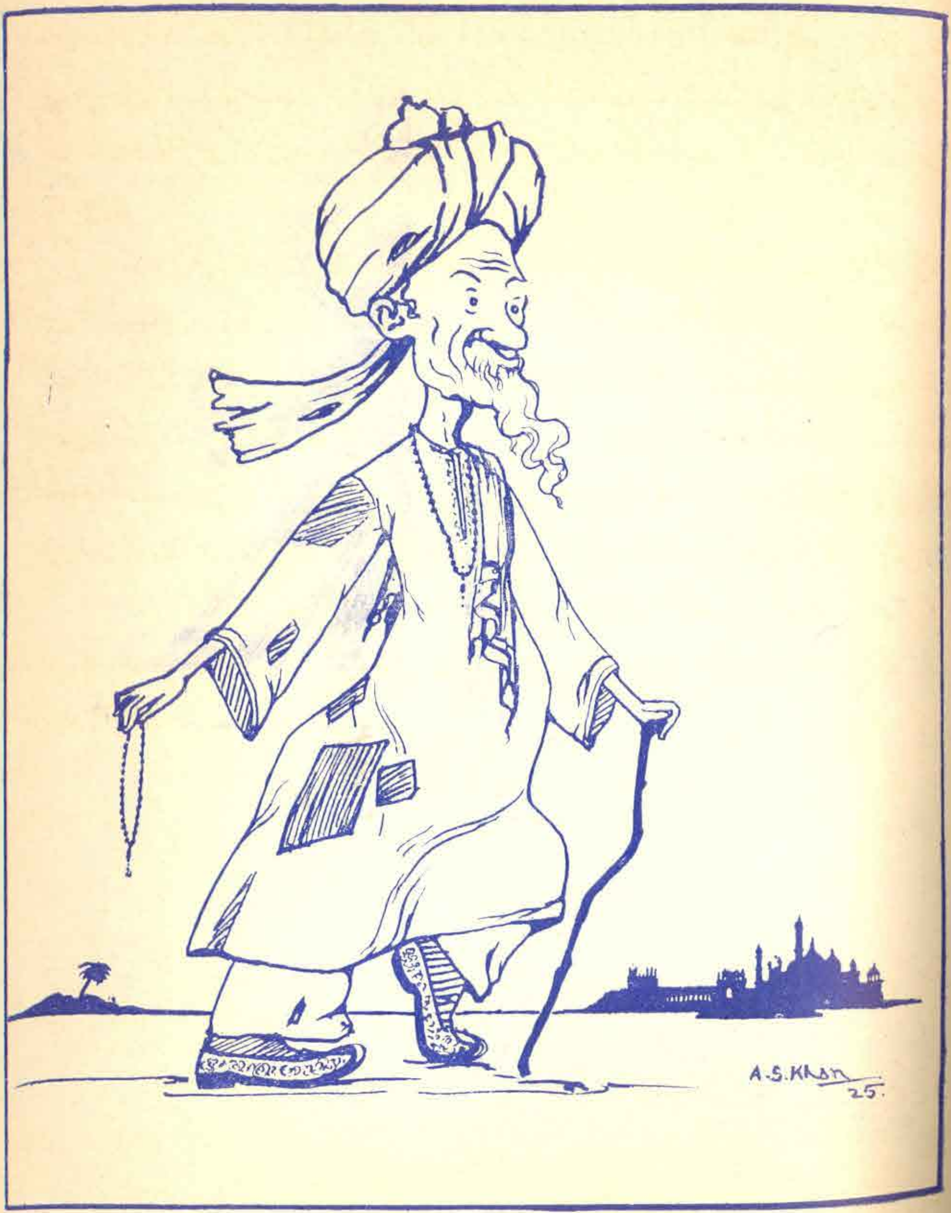

حاجی بغلول

رکھتے ہیں۔ اور ان کے والد مرحوم کی قسم کھا کر یاد کرتے ہیں۔ لیکن اگر ان کا رویہ ایسا ہی رہا جیسا کہ اب ہے تو مجھے اپنے سامنے ایک زبردست انقلاب نظر آتا ہے۔

ہمارا بنگلہ دریائے کابل کے ایک کنارے تقریباً ۷۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع تھا۔ موسم گرما میں صرف ۶-۴ دن گرمی پڑتی ہے۔ لیکن جاڑے میں نہایت سخت سردی پڑتی ہے۔ لیڈی نے جو حرم کا حال بیان کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کی خاتونیں ابھی زمانہ موجود کی عورت کی ابتدائی منازل طے کر رہی ہیں۔ لیکن وہ یورپین لباس کی بے حد شتاق نظر آتی ہیں۔ کابل کے کنارے کنارے درخت ہیں۔ اور وہاں موٹر چلانے کے لئے بہت عمدہ سڑکیں بھی نہیں۔ مگر شہر خود جھونپڑیوں کا ایک مجموعہ نظر آتا ہے۔ اردگرد کی پہاڑیاں خشک اور بنجر ہیں۔

اگر کابل خوب صورت نظاروں سے خالی ہے تو اپنی تاریخی روایات کے لحاظ سے وہ بالکل پرنظر آتا ہے "کوپ ہین" کی طرح اس نے بھی دو ہزار برس پیشتر فاتح سکندر اعظم کا استقبال کیا اور ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس کے قرب وجوار میں اب تک یونانی سکے نکلتے رہتے ہیں۔ کافرستان میں سکندر اور اس کے مقدونی ہمراہیوں کی یادگار اچھی طرح سے بنائی گئی ہیں۔ کیونکہ تمام کا تمام علاقہ یونانی فن تعمیرات کا نمونہ ہے۔ غالباً یہ واقع ہوگا کہ سکندر اپنے چند یونانی ہمراہیوں کو ہر مفتوح ملک میں آباد رکھتا تھا۔ اور پھر وہیں کی مقامی آبادی میں اپنی فوج کے لئے رنگروٹ بھرتی کرتا تھا۔ چنانچہ جب وہ پنجاب پہنچا ہے تو اس کی تمام کی تمام فوج ایشیائی تھی۔

دوسری تاریخی چیز شہنشاہ بابر کا مقبرہ ہے جو دراصل مغل سلطنت کے بانی تھے۔ اور جس کا فوٹو اب پہلی دفعہ چھپ گیا ہے۔ یہ مقبرہ کابل کے پہاڑوں میں واقع ہے اور ہمایوں کے مقبرہ واقع دہلی سے ہر امر میں مختلف ہے۔

حاجی وجیہ الدین

عبارت مولانا محمد علی نے لکھی ہے ۔

حاجی صاحب ہجے کر کے اپنی تقریر پڑھ رہے

سر فریڈرک وائٹ
صدر انڈین لیجسلیٹو اسمبلی دہلی

یہ عبارت بھی مولانہ محمد علی کے قلم کی ہے۔

موتی لال نہرو

یونان و سرویا

ڈاکٹر پوٹھیس نے انگلستان کے کسی اخبار کو ایک طویل مراسلہ بھیجا ہے جس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

مبادی صلح پر دستخط ہو جانے سے یہ امر ظاہر ہو گیا ہے۔ کہ اتحادیوں کے تنازعات اور زیادہ نمایاں ہو گئے ہیں۔ سمجھوتہ کرنے اور آنے والی ہولناک مصیبت کو رفع کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ مقابلے کے دعوؤں کا اچھی طرح مطالعہ یورپین ٹرکی کا جس قدر علاقہ اتحادیوں نے فتح کیا ہے اس کا پورا رقبہ ۱۳۰۰۰۰ مربع کیلومیٹر ہے جس میں تقریباً ۴۰ نفوس کی آبادی ہے جو مفصلہ ذیل طرق سے منقسم ہے :-

مسلمان = ۱۷۷۵۰۰۰ لاکھ - یونانی = ۱۱۰۰۰۰۰ لاکھ - بلغاری = ۷۸۰۰۰۰ لاکھ - سروے = ۵۰۰۰۰ یہودی = ۱۰۰۰۰۰ لاکھ = آرمی اور ولاشی - ۲۰۰۰۰ ہزار - ان میں سے بلغاریہ = ۲۵۸۰۰۰۰ نفوس - اور ۸۲۵۰۰ کیلومیٹر کا مطالبہ کرتا ہے جس میں کمانودا اور کوپر دلو کے علاقے بھی شامل ہیں۔ اور سرویا اور اس کے مابین ایک تنازعہ ہے۔ اور ان دونوں کی آبادی ۲۲۰۰۰۰ لاکھ اور رقبہ ۵۰۰۰ ہزار مربع کیلومیٹر ہے۔ بلغاریہ نے جتنی آبادی کا مطالبہ کیا اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

مسلمان = ۱۰۳۰۰۰۰ لاکھ = بلغاری = ۶۳۵۰۰۰ لاکھ - یونانی = ۵۸۰۰۰۰ لاکھ - یہودی = ۹۴۰۰۰ آرمینی اور رولاشی ۱۴۰۰۰ ہزار سروے ۱۲۰۰۰ ہزار - جن علاقوں کو یونان نے فتح کیا ہے۔ لیکن آسٹریا اور اٹلی ان کا الحاق البانیہ کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی تفصیل بہ لحاظ آبادی و رقبہ حسب ذیل ہے :-

رقبہ = ۱۱۸۰۰ مربع کیلومیٹر - آبادی = ۳۹۰۰۰۰ لاکھ اس میں سے ۲۵۰۰۰۰ لاکھ یونانی اور ۱۴۰۰۰۰ مسلمان البانی ہیں۔

جس آبادی کا بلغاریہ نے مطالبہ کیا ہے۔ اس میں بلغاری عنصر ۲۷ فیصدی سے زیادہ نہیں ہے۔ حالانکہ یونانی عنصر ۲۵ فیصدی ہے۔ ان شمار و اعداد سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ تنازعہ کسی خاص امر کے متعلق ہے۔

یونانی تھریس اور مقدونیہ کے ان حصص میں اپنے ہزارہا بچوں کا نقصان اٹھایا ہے جن پر فی الحال بلغاریہ کا قبضہ

آرٹسٹ کا تعارف

عبدالسمیع خاں " سمیع آرٹسٹ " کے نام سے مشہور ہیں، اصلی وطن امروھہ، پیدائش ھوشنگ آباد ، سی پی کی ہے - جے جے اسکول آف آرٹ میں مصوری کا سات سالہ کورس پورا کر کے ڈپلوما لیا - متعدد میڈل اور انعامات حاصل کئے - مسٹر محمد مارماڈیوک پکتھال ایڈیٹر بمبئی کرانیکل کی سفارش پر ہمدرد اور کامریڈ کے کارٹونسٹ مقرر ہوئے - ہندوستان ٹائمز ، نیشنل کال ، ہندو ، ریاست ، تیج ، ڈان ، وغیرہ میں بھی ان کے کارٹون اور اسکیچ شایع ہوتے رہے - مولانا محمد علی نے ایک مرتبہ پنڈت مالوی سے سمیع صاحب کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا -

" یہ سی پی کا موتی ہے "

سمیع صاحب دھلی میں ۲۴ سال رہے - گزشتہ ۱۵ سال سے کراچی میں قیام ہے -

یہ پانچوں کارٹون سمیع صاحب نے اپنے البم سے عنایت فرمائے ہیں جس کا شکریہ واجب ہے -

دآں قسطنطنیہ اور یورپین ترکی میں ۵ لاکھ یونانی ہیں جن کا تعلق ہمیشہ کے لئے قطع ہوچکا ہے۔ یہ امر بھی پیش
نا چاہیئے۔ کہ مشرقی رومیلیا میں ڈیڑھ لاکھ یونانی ہیں۔

یقیناً بلغاریہ باہمی صلح کی ضرورت کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے۔ کیونکہ یہ فعل نہ صرف اتحادیوں میں دلجمعی پیدا کرے
بلقان میں ہمیشہ کی یکانگت، اتفاق اور صلح کو قائم کر دے گا۔

یا کی موجودہ پالیسی

سرویا کے سابق وزیر مسٹر جیڈومیاٹووچ لندن سے لکھتے ہیں:۔
میں انگلستان کے اخبار میں پبلک کے روبرو چند باتیں لکھنی ضروری سمجھتا ہوں۔ کیونکہ ان
ویا کی موجودہ پالیسی کا پورے طور پر اظہار کرنا مقصود ہے۔

بلغاریہ کے ساتھ پوری ایمانداری برتتے ہوئے میں فی الفور مان لیتا ہوں۔ کہ سرسری نظر میں ان کی دلیل بہت قوی
ہوتی ہے۔ وہ ہم سے کہتے ہیں کہ "ہم نے سرویا کی تقسیم کے وقت ویس، پرلیپ، مناستر اور اوچریڈا بلغاریوں
یہ میں آئے گا۔ اس لئے ہم اس دفعہ کو عملی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں" بلغاریوں کے بیان کی سچائی اور راستی کو
لیم کرنے میں مجھے کچھ شک نہیں ہے۔ اور میں بلاچون وچرا مان لوں گا۔ کہ شرائط نامہ میں یہ شرط موجود ہے۔ کہ مقدونیہ
تجزیہ کرتے وقت چاروں شہر اور ان کا علاقہ بلغاریہ کو ملنا چاہیئے۔ بدقسمتی سے یہ خفیہ عہدنامہ شائع نہیں کیا گیا ہے
ن کے متعلق صرف چند مشہور باتیں پبلک میں آگئی ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے۔ کہ عہدنامہ کی پہلی شرط یہ ہے۔ کہ
اور بلغاری متحدہ طور پر مقدونیہ کو آزادی دلوائیں اور سرویا کے ملک کو وسعت دے کر ایڈریا ٹوپل تک پہنچا دیں، اس وقت تھریس اور
پل فتح کرنے کی تجویز نہیں کی گئی تھی لیکن چونکہ مقدونیہ اور البانیہ ہی ایسے علاقے تھے جو اتحادیوں یعنی سرویوں اور بلغاریوں میں منقسم ہوتے
تھے۔ کیونکہ یونانی ابھی اتحاد میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اور چونکہ سرویا کو شمالی البانیہ اور بحیرۂ ایڈریاٹک کا کچھ حصہ ملنا قرار
۔ اس لئے سرویا نے بلغاریہ کو مغربی مقدونیہ اور متذکرہ بالا مشہور و معروف شہر دینے پر رضامندی ظاہر کر دی۔

لیکن مابعد کے واقعات نے اصلی عہدنامہ کی شرائط کو بالکل تبدیل کر دیا۔ دو اتحادیوں کی بجائے چار اتحادی ہو گئے۔
مقدونیہ اور تھریس ہی تک جنگ محدود نہ رہی بلکہ ان کے علاوہ اور علاقے بھی شامل کر لئے گئے۔ سرویا کو شمالی البانیہ
و ایڈریاٹک کا کچھ حصہ ملنے کی بجائے اس نے دول عظمیٰ کے کہنے سننے سے ایڈریاٹک اور البانیہ میں اپنے تمام حقوق چھوڑ دیئے
کر لئے۔ مقدونیہ کی بجائے ایڈریانوپل اور تھریس کا علاقہ بھی اتحادیوں میں تقسیم ہونے کے لئے فتح کیا گیا۔ اور ایک
بلغاریوں کی شراکت میں مقدونیہ کو فتح کرنے کے علاوہ سروی فوج نے تن تنہا مغربی مقدونیہ کو ترکوں سے آزاد کروایا۔

مذہب عیسوی اور خزانۂ ہند

یک شنبہ ۱۰ اگست ۱۹۱۳ء

رپورٹ مردم شماری بابت ۱۹۱۱ء پایا جاتا ہے کہ ہندوستان میں ابن مسیح کے پیروؤں کی تعداد 3877000 ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

رومن کیتھولک	1904000
چرچ آف انگلینڈ	492300
پریسبیٹیرین	181000
پراٹسٹنٹ	961400
غیر کیتھولک (متفرق)	338300
کل تعداد	3877000

۱۹۰۹-۱۰ء میں جو گراں مایہ رقم سرکاری خزانہ سے ان مختلف فرقہ ہائے کلیسائی عہدہ داروں کو بعد مشاعرہ دئے گئے۔ 1827720 روپیہ تک پہنچ گئی ہے۔ جس میں سے چرچ آف انگلینڈ کو مبلغ 1673569 اور رومن کیتھولک کو چرچ کو مبلغ 137431 روپیہ ملے، بقول "کیتھلک ہیرلڈ آف انڈیا" جس سے یہ امور اخذ کئے گئے ہیں، یہ رقوم فقط اخراجات کلیسائے ملکی کے ہیں، اور اخراجات کلیسائے فوجی ان میں شامل نہیں صرف لارڈ بشپ آف کلکتہ اور ان کے عملہ کے مصارف اس قدر ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے اس بارہ میں ذیل کا پیراگراف جو جریدہ مذکور سے اقتباس کیا جاتا ہے۔ غور سے پڑھے جانے کے قابل ہے:۔

پریذیڈنسی - لاڈ بشپ آف کلکتہ۔

مبلغ 45980 روپیہ (مشاہرہ)، مبلغ 4500 روپیہ (سفر خرچ)، مبلغ 450 روپیہ (مصارف ڈاک و تار)، مبلغ 100 روپیہ (متفرق)، میزان کل مبلغ 51030 روپیہ عملہ (۱) مہتمم کلیسائے خانگی لارڈ بشپ موصوف مبلغ 6000 روپیہ (۲) نائب عہدہ دار کلیسائے خانگی۔ مبلغ 2000 روپیہ

(۳) سیکرٹری و رجسٹرار۔ مبلغ 3500 روپیہ۔

(۴) کرایہ مکان جالوس دفتر سیکرٹری مذکور مبلغ 1630 روپیہ

(۵) کلارک مبلغ 3360 روپیہ

(۶) ملازمین۔ مبلغ 520 روپیہ

(۷) الونس معاوضہ تبادلہ۔ مبلغ 380 روپیہ

میزان مبلغ 21590 روپیہ

کل میزان مبلغ 72620 روپیہ ہیں۔

سال زیر بحث میں الونس گرانی غلّہ شمار میں نہیں لایا گیا" اوپر کے نقشہ سے واضح ہوتا ہے سالانہ اخراجات جن کا بوجھ خزانۂ ہند پر پڑتا ہے، مبلغ 73620 روپیہ ہیں۔ دوسرے معنوں میں لارڈ بشپ موصوف کی تثلیث پرست ذاتِ واحد پر خزانۂ ہند کو اس سے دو چند روپیہ صرف کرنا پڑتا ہے جتنا کہ وہ رومن کیتھولک چرچ کے کل ادنیٰ و اعلیٰ عہدہ داروں کے اخراجات پر خرچ کرتا ہے۔ اس موقعہ پر یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان تمام رقوم میں فوجی کلیسا کے عہدہ داروں کی رقوم مشاہرہ وغیرہ شامل نہیں۔

اب قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر رقوم خطیرہ مذہب عیسوی کی حمایت اور اشاعت میں کیوں صرف کی جاتی ہیں؟ بالخصوص درآں حالیکہ اعلانِ ملکہ معظمہ آنجہانی ۱۸۵۸ء میں صریح الفاظ میں اس بات کا رعایا کو یقین اور اطمینان دلایا جا چکا ہے کہ کسی خاص مذہب کی رعایت و حمایت نہیں کی جائے گی۔ کیا اوپر کے حالات سے ہم یہ نتیجہ، مستنبط کرنے کے مجاز نہیں کہ دن دہاڑے عملی طور پر اعلانِ مذکور کی خلاف ورزی کی جا رہی ہے؟ اشاعتِ تعلیم اور حفظانِ صحت کی روز افزوں ضروریات کے باعث جن کا احساس اب حاکم و محکوم دونوں کو ہو رہا ہے، خزانہ کو نئی مشکلات کا مقابلہ درپیش ہے، نئے نئے ٹیکس لگائے جا رہے ہیں ہر بندوبست پر اراضی کے لگان میں معتدبہ بیشی کی جا رہی ہے۔ ۱۹۰۷ء میں پنجاب میں چناب پر اور ضلع راولپنڈی میں ٹیکس اراضی کی بیشی پر جو ادھم مچا اور جو جو فسادات معرضِ ظہور میں آئے، ناظرین سے پوشیدہ نہیں، اب پھر نہر چناب پر نئی تشخیص کی تجویز ہے، ہر جگہ میونسپل اور پراونشل ٹیکس بڑھائے جا رہے ہیں، مگر ضروریاتِ ملکی پوری نہیں ہوتیں حتیٰ کہ ہز ایکسیلنسی وائسرائے ہند کو حال ہی میں ایک نہایت گراں قدر رقم بذریعہ قرضہ حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے،

ایک طرف تو یہ کیفیت ہے، دوسری طرف جب ہم دیکھتے ہیں تو ایک سال میں گورنمنٹ مبلغ ۱۸۲۷۲۰ روپیہ مختلف فرقہ ہائے کلیسا کو بطور مشاہرہ عنایت کرتی ہے۔ خزانہ کا روپیہ ملک کی جملہ اقوام کی جیب سے، خواہ وہ کسی مذہب و ملت پر ہوں، نکلتا ہے۔ گورنمنٹ تو محض اس روپیہ کی امین ہوتی

ہے، اس کا فرض ہے کہ اس روپیہ کو بوجہ احسن رعایا کی تعلیمی اور تمدنی ضروریات پر صرف کرے، اگر وہ اس امر کی ضرورت سمجھتی ہے کہ آمدنی ملک کا کوئی جزو مذہبی ضروریات پر بھی صرف کیا جائے، تو تقاضائے انصاف تو یہ ہے کہ اسے ہر مذہب وملت کی حمایت میں خرچ کرے، نہ یہ کہ منجملہ دیگر مذاہب کے ملک کے دو بڑے بڑے مذہب ہندو دھرم اور اسلام تو اس سرکاری فیضان سے محروم رہیں اور اس کا سارا فائدہ عیسائی مذہب کو پہنچے، ٹیکس ادا کرنے والے اصل مالک ایسی یک طرفہ کارروائی کو کس طرح نظر استحسان سے دیکھ سکتے ہیں؟ ہماری رائے میں یہ معاملہ ایسا نہیں کہ اس کے انکشاف پر مذہبی سبھائیں اور انجمنیں خاموش بیٹھی رہیں اور اُف تک نہ کریں مگر سب سے موزوں طریق عمل تو یہ ہوگا کہ کوئی من چلا محب وطن امپیریل کونسل میں اس معاملہ کی سلسلہ جنبانی کرے، اس پر باقاعدہ سوال اٹھائے اور تاوقتیکہ معاملہ خاطر خواہ طریق سے طے نہ ہو جائے۔ اپنی مساعی کو دھیما نہ پڑنے دے ؂

افسانہ

دارُوئے تلخ

(منشی پریم چند کے قلم سے)

(پنجشنبہ ۱۷۔جولائی ۱۹۱۳ء)

یونیورسٹی کے امتحانات ختم ہو گئے تھے۔ اور کوئینس کالج کا بورڈنگ ہاؤس بالکل سنسان نظر آتا تھا۔ صرف دو مظفر صورتیں ایک کمرہ میں بیٹھی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ ان میں بہت گاڑھی دوستی تھی۔ چار سال کی رفاقت نے دوستی کی جڑ مضبوط کردی تھی۔ آج امتحانات کو ختم ہوئے پورا ایک ہفتہ گذر گیا ہے۔ مگر جدائی کا خوف انہیں جدا نہیں ہونے دیتا۔ کئی بار ان کے اسباب باندھے گئے۔ ریل کا وقت دیکھا گیا۔ کئی بار پھاٹک تک کرایہ کی گاڑی بھی بلائی گئی۔ مگر چلنے کا وقت آیا تو دونوں دوست باہم گلے لپٹ گئے۔ اور روانگی کا ارادہ فسخ ہو گیا۔ رات کو یہ صلاح کر کے سوتے کہ اب صبح کو ضرور چلیں گے۔ یہ جدائی کی مصیبت تو ایک دن جھیلنی ہی آخر کب تک ٹالیں گے۔ مگر کل آتے ہی ان کے دلوں کی وہی کیفیت ہو جاتی تھی جو موت کو بلانے والے لکڑہارے کی ہوئی تھی۔ آخر جب خوش نصیب لکشمی دت کے والد ڈاکٹر ہری دت نے جھلا کر لکھا تمہاری اس تاخیر سے مجھے اندیشہ ہوتا ہے۔ کہ تم نے وہاں اپنے پیروں میں کوئی نئی زنجیر ڈال لی ہے۔ تو گوبند رام کو اپنا دل مضبوط کرنا پڑا۔ گوبند رام کے گھر سے بھی اس مضمون کا خط آیا۔ باپ تو کب کے رخصت ہو چکے تھے۔ بیوی نے لکھا۔ پیارے! چاہے آؤ مت، مگر مجھے یہ اطمینان دلا دو کہ سوکن کا جلاپا تو نہ سہنا پڑے گا۔" اب بنارس میں رکنا غیر ممکن تھا۔ ۲۴ر اپریل کو امتحان ختم ہوا تھا کو ان کی روانگی کی ساعت آئی دونوں کے چہرے افسردہ تھے۔ اور گو آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ مگر کنارہ دریا کی بالو کی طرح انہیں صرف چھیڑنے کی دیر تھی۔ سطح کے نیچے پانی کا دریا چھپا ہوا تھا۔

لکشمی دت تو اپنے مکان پر پہنچ کر اپنے والد کے ساتھ نینی تال گیا۔ ڈاکٹر ہری دت بہت بارسوخ آدمی تھے۔ بیٹے کو جنگلات کے صیغہ میں ایک اچھی جگہ دلادی اور اساڑھ کے مہینے میں جب کہ آسمان بادلوں سے اور زمین پانی سے سفید ہو رہی تھی۔ اسے ترائی میں جانا پڑا۔ آبادی سے سینکڑوں میل دور۔ جہاں مشکل سے ڈاک پہنچ سکتی تھی۔ تنخواہ معقول اور اختیارات وسیع تھے۔ کچھ دنوں تک تو وہ بہت گھبرایا رہا۔ گوبند رام کی صحبتوں کو یاد کرکے کئی بار رو سوسائٹی، نہ کوئی تفریح۔ تمام دن ایک جنگلی مقام میں مقید رہنا پڑتا۔ مگر بالآخر کارگذار بننے کی خواہش اور ترقی کی امید دنیا کی ترغیبات دوستی اور موانست کی دلفگار جذبات پر غالب آگئی۔ دوستوں کی یاد اور رفیقوں کی دل جوئیاں ہو گئیں۔ دل میں لذت درد کا ذوق باقی نہ رہا۔ دنیا نے اپنے عام خراج کی قسط وصول کر لی۔

مگر گوبند رام کی زندگی کا راستہ ایسا ہموار نہ تھا۔ ایسا کوئی صیغہ نہ تھا جہاں اس نے ملازمت کے لئے دست سوال نہ پھیلایا ہو۔ مہینوں کا یہی کام تھا کہ صبح کو حکام کے بنگلوں پر حاضری دینا۔ دن بھر سرکاری دفتروں کے چکر لگانا۔ اور شام کو مایوس و مغموم منہ لپیٹ کر پڑ رہنا۔ نہ کوئی وسیلہ تھا، نہ کوئی سفارش۔ کالج کی اعلیٰ تعلیم نے مزاج میں خودداری کا احساس پیدا کر دیا تھا جو اس کی موجودہ حیثیت سے بھی اونچا تھا۔ اس لئے جب سے روکھے اور دلشکن الفاظ میں انکاری جواب ملتے یا اپنے ضمیر کا خون کر کے، دوسروں کی تعریف میں رطب اللسان ہونا پڑتا، تو اس کی روح کو بہت صدمہ ہوتا۔ کبھی کبھی اسے لکشمی دت پر رشک آتا۔ میں اس سے کسی بات میں کم نہ تھا۔ میری مدد سے اس نے ڈگری پائی، مگر وہ تین سو روپیہ ماہوار کا افسر ہے، اور میں تیس روپیہ کی غلامی کے لئے ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہوں۔ رسوخ اور حکام کے مقابلہ میں لیاقت کی یہ قدر ہے۔ ایک بار سخت مایوسی کے عالم میں اس نے للتا سے انہیں الفاظ میں اپنی تقدیر کا شکوہ کیا۔ مگر للتا نے اس کی طرف کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھا۔ کہ گوبند رام پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ مارے ندامت کے سر نہ اٹھا سکا۔

آخر تین مہینہ کی دوڑ دھوپ کے بعد ایک مدرسے میں اسے پچاس روپیہ کی جگہ مل گئی۔

(۲)

گوبند رام نے یہ خدمت خوشی سے منظور کی۔ پھولا نہ سمایا۔ گویا کوئی دفینہ ہاتھ آ گیا۔ تقدیر کی صلواتوں سے نجات ہوئی مگر بہت تھوڑے دنوں کے لئے۔ کھڑے ہونے کی جگہ پاتے ہی بیٹھنے کی فکر ہوئی۔ تمنا دل نے پاؤں پھیلایا۔ نوجوان آدمی تھا۔ دل میں امنگ موجود تھی۔ قانون کا امتحان دینے کا ارادہ مصمم ہو گیا۔ مگر قلیل تنخواہ! اس میں قانونی فیس اور کتابوں کا خرچ نکال کر خانگی مصارف کے لئے کیا بچت نہ ہوتی۔ کہ آئے دن کی الجھنوں سے گلا چھوٹے۔ یہ قانون کا جوش یہاں تک بڑھا۔ کہ کبھی کبھی اس سے فرائض منصبی میں ہرج واقع ہوتا۔ ایک بار ہیڈ ماسٹر صاحب برہم بھی ہوئے مگر گوبند رام وکالت کا خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے ماسٹر کی کچھ پرواہ نہ کی۔ بلکہ ان کے کمرے سے مونچھیں گھماتا ہوا نکلا۔ اور باہر آ کر دوسرے ماسٹروں سے ڈینگ مارنے لگا۔ "اجی ان سے وہ دبے جسے ہمیشہ غلامی کرنی ہو۔ یہاں تو چند دنوں کے اور مہمان ہیں۔ پھر تو اسی مدرسے میں آگ لگا دوں۔ چار گھنٹے کا نوکر ہوں۔ کچھ کام کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے۔ ترجمہ کی کاپیاں گھر نہیں لے جا سکتا۔ مدرسہ کا کام مدرسہ میں ہوگا۔ خواہ وہ کسی کو برا لگے۔ یا بھلا۔ چہ خوش! میں تو کاپیاں دیکھتے ہی بھر کا ہوا۔" ماسٹروں نے بڑھاوا دیا۔ "شیر ہے۔ شیر! اسی کا نام جوان مردی ہے۔" مگر کنکھیوں سے دیکھا۔ کہ ہیڈ ماسٹر صاحب آ رہے ہیں۔ تو میدان صاف ہو گیا۔

تین سال گوبند رام نے یوں ہی کاٹے۔ مگر اتنے دنوں میں اسے سب سے بڑا جو تجربہ ہوا۔ وہ یہ تھا۔ کہ ڈگریاں نہ پایا ملتی ہے۔ نام۔ وہ یکسوئی، وہ انہماک، وہ لاگ جو کامیابی کا راز مضمر ہے ہی۔ کسی نہ کسی وجہ سے مجھ میں اب بقدر ضرورت موجود نہیں۔ آئے دن ایسی فکریں پیدا ہوتی رہتی تھیں۔ جو اطمینان قلب کے منافی ہیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایسی کتنی ہی زندہ مثالیں موجود تھیں جنہوں نے سلسلہ تدریس کو وکالت کا زینہ بنایا تھا۔ یہ کوئی انہونی بات نہ تھی۔ جوش میں آ کر وہ دو چار دن غیر معمولی محنت سے کام کرتا۔ مگر پھر جوش کمزور ہو جاتا۔ حوصلہ بلند، مضبوط ارادے کے بغیر، بڑھاپے کا عشق ہے۔ وہ جب کتاب کھول کر بیٹھتا۔ تو اس کا دماغ مطالعہ کے مقابلہ میں وکالت کی برکتوں کے خیال سے زیادہ خوش ہوتا۔ یہ مکان مسمار کر دوں گا۔ اس جگہ ایک عالیشان

بولے کل میرے دوست لکشمی آنے ہیں۔ للتا نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ "وہ بہت اچھی بات ہے۔"

آئے دن کے قانونی مصارف نے للتا کو بہت بیزار کر دیا تھا۔ اس لئے جب نیا خرچ سامنے آجاتا۔ تو وہ جھنجھلا اٹھتی تھی۔ دوستوں کی دعوتیں اور نت نئی چھیچھے فراغت اور تمول کی جلوہ آرائیاں ہیں ایسے موقعوں پر للتا قانون ہی پر اپنا غصہ نکالتی۔

لیکن گوبند رام اس طنز کو پی گئے۔ اور بہت رفیق لہجہ میں کہا۔ "خوشی تو مجھے بھی ہے۔ پرانا دوست ہے۔ مگر اس کی دعوت ضیافت کی کیا فکر ہوگی۔ روپیہ کہاں سے آئے گا۔

للتا نے تیور بدل کر کہا "وکیا مجھ سے یہی سوال پوچھ رہے ہو؟"

گوبند رام اور بھی ملائم ہوئے۔ "نہیں تم سے بھلا کیا منہ لے کر پوچھوں گا"، مگر تمہاری صلاح لینی تو ضروری ہے۔ میرے صندوق میں اب چند آنے پیسوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور میں ٹھیرا مدرس۔ یہ جانتا ہوں۔ کہ ایک نمونہ ہزاروں روایتوں سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ میرے جتنے دوست، ملنے والے اور صورت آشنا ہیں۔ ان کو میں خود نمونہ بن کر سکھا چکا ہوں۔ کہ دنیا اعتبار کی جگہ نہیں ہے۔ اس فرض کو میں نے خوب دل توڑ کر پورا کیا ہے۔ انہیں یہ بھی تجربہ ہو گیا ہے۔ کہ مقروض کے وعدے معشوق کے وعدوں سے کم سست خرام نہیں ہوتے۔ اس لئے میں تو اسوقت بالکل معذور ہوں۔ تمہیں کوئی تدبیر سوجھی ہوگی"، للتا پر اس ظریفانہ گفتگو کا کچھ اثر نہ ہوا۔ بولی مجھے اس وقت سر مغز ذکر نے کی مطلق فرصت نہیں ہے۔"

گوبند رام زچ ہو کر بولے۔ "پیاری للتا دیکھو مجھے اس وقت دق نہ کرو۔ میں تین دن سے سخت پریشان ہوں۔ اب میرے ہوش و حواس بالکل نہیں۔ تمہیں کوئی نہ کوئی اپائے نکالو۔"

للتا کا غصہ کچھ فرو ہوا۔ سوچ کر بولی "ایک تدبیر سوجھتی ہے۔ تمہیں برا نہ لگے۔ تو کہوں"، گوبند رام کی جان میں جان آئی جواب دیا۔ بھلانے کی کوئی بات نہ ہوگی۔ تو کیوں بری لگے گی۔" للتا میں تو صاف دل سے کہتی ہوں۔ شبہ کرتے ہو۔ تو نہ کہوں گی۔؟

گوبند رام۔ "نہیں نہیں شبہ کی کوئی نہیں۔ بتاؤ تو سہی۔" للتا۔ "اپنے قانون کی چند کتابیں گرو رکھ دو۔ جب تنخواہ ملے۔ چھڑا لینا۔"

للتا نے یہ باتیں نہایت متین انداز میں کہیں۔ مگر گوبند رام اس خیال کو دور نہ کر سکے۔ کہ یہ پرانا بخار نکالا گیا ہے۔ وہ دل میں سمجھے تھے۔ کہ شاید للتا کوئی زیور گرو رکھنے کو دے گی۔ مگر للتا یہ بازی پہلے ہی ہار چکی تھی۔ اس کے کئی زیور ایک مہاجن کے صندوقچہ کا سنگار بنے ہوئے تھے گوبند رام نہایت خفیف ہوئے۔ اور باہر آکر اسی فکر میں غوطے کھانے لگے۔ یہاں تک کہ فکر نے چاروں طرف کا دروازہ بند پا کر قانون کا سہارا لیا۔ دل نے فیصلہ کیا۔ للتا کی تجویز باوجود خفت آمیز ہونے کے آزمائش کے قابل ہے۔ فوراً کمرہ میں گئے۔ اور نئی نئی کتابیں چن کر جمع کیں۔ انہیں کتابوں پر اپنی ولدیت اور قومیت اور سکونت لکھنے کا خبط تھا جیسے ان میں نظم سے زیادہ رغبت تھی۔ ہر ایک کتاب پر کسی استاد کے یہ بے نظیر اشعار لکھا کرتے تھے۔

ہر کہ دعویٰ بریں کتاب کند   دین و ایمان خود خراب کند
ہر کہ دعویٰ کند شود باطل   پیش قاضی و کوتوال عادل!!

اب وہ شاعرانہ رجحان تو نہ تھا۔ مگر اس کی یادگار باقی تھی۔ اسے ربڑ سے مٹایا۔ اور جب خوب اندھیرا ہو گیا

مکان بناؤں گا۔ اس کا نقشہ اس کی نگاہوں میں کھینچا ہوا تھا۔ کئی بار وہ بیچ بیچ پنسل اور کاغذ لے کر اس مجوزہ مکان کا نقشہ بنانے لگا۔ ایسا مکان ہو۔ کہ ہر موسم میں آرام ملے۔ مہمان آئیں تو انہیں آسائش کے ساتھ ٹھہرایا جا سکے۔ ان خیالی قلعے بنانے میں اس کا وقت صرف ہو جاتا۔ اور مدرسہ کا وقت آ پہنچتا۔

یہ تنگی مال تپسیہ کے دن تھے۔ للتا کو گھر کا سب کام کاج اپنے ہی ہاتھوں سے کرنا پڑتا۔ مگر چوڑیاں بہت ٹوٹتیں اور اس کی چوڑیاں کا ہفتہ وار خرچ مہری کی تنخواہ سے کچھ زیادہ ہی ہو جاتا تھا۔ گوبند رام منہ اندھیرے اٹھتے۔ اور پانی کی کلسی کھینچ لاتے۔ موٹے کھانے کھاتے اور موٹے کپڑے پہنتے۔ مگر موٹے پن کا جسم پر اثر ہوتا تھا۔ کبھی کبھی۔ خاص کر تہواروں کے دن۔ للتا جھنجھلا اٹھتی اور اپنا غصہ اپنی قسمت پر اتارتی۔ کپڑا اس سے زیادہ کمزور اسے اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ یوں چاہے للتا فاقے کرتی، گاڑھا پہنتی اور زیادہ بھی میلا ہوتا۔ مگر اپنی سبکی اس سے نہیں برداشت ہو سکتی تھی۔ ایک بار اس نے اپنی پڑوسن سے کچھ روپے قرض لئے۔ تنخواہ کا وعدہ تھا۔ مگر گوبند رام نے ضد کی کہ مجھے قانون کی چند کتابیں منگانی ضروری ہیں۔ مباحثہ ہوا۔ اور حسب معمول قانون نے حق پر فتح پائی۔ للتا کا وعدہ جھوٹا پڑ گیا۔ پھر کیا تھا۔ لڑائی شروع ہو گئی۔ مگر میدان میں نہیں۔ للتا نے مقابلہ مجہول کو زیادہ کارگر سمجھا، جو دور جدید کی بہترین حربی ایجاد ہے۔ تین دن گھر میں آگ نہیں جلی۔ اور پڑوسیوں نے یہ فیصلہ کر لیا۔ کہ آج کل لوذیات پر بسر ہو رہی ہے۔ ایسے بھی لوگوں کے نصیب ہیں۔ مگر فراغت کا بھیس بدل کر وہ بڑا ظالم اور بے رحم ہوتا ہے۔

گوبند رام کا ارادہ کتنا ہی کمزور ہو۔ اس میں تکلف اور ظاہر داری کی کمی نہ تھی۔ اس کے خطوط ایسے دل خوش کن ہوتے۔ کہ لکشمی دت کو بھی اس پر رشک آتا۔ آخر ملازمت سے اس کا جی ایسا اچاٹ ہوا۔ کہ اس نے رخصت کی درخواست دے دی اور اپنے دوست کو لکھا کہ تم سے ملاقات کرنے آتا ہوں۔

لیکن گوبند رام کو اس خبر سے بہت خوشی نہیں ہوئی۔ وہ سوچنے لگا کہ اب کیا کروں۔ لکشمی دت یہاں بڑی بڑی امیدیں لے کر آئے گا۔ وہ مسلسل دعوتوں کے خواب دیکھ رہا ہو گا۔ اور یہاں رام نام کے سوا کچھ نہیں۔ کیوں نہ ایک خط ڈال دوں کہ ایک ضروری کام کے لئے بمبئی جا رہا ہوں یا کوئی اور بہانہ کر دوں۔ للتا سخت بیمار ہے۔ سخت پریشان ہوں۔ مگر ان خیالوں پر وہ خود ہنس پڑا۔ یہ انسانیت نہیں۔ یہ دوستی نہیں۔ میری محبت اسے یہاں لائی ہے۔ اور میں اس سے منہ چھپاؤں۔ اس سے تو بہتر ہے۔ کہ صاف صاف اپنی رام کہانی سنا دوں۔ وہ میرا سچا دوست ہے۔ اسے میرے ساتھ ہمدردی ہو گی۔ اس میں میری کیا خطا ہے۔ کہ میں زیادہ امیر نہیں ہوں۔ میں نے وہ تعلیم حاصل کی۔ جو ثروت اور دولت کا خزینہ تھی۔ اگر اس جنس کا خریدار مجھے نہیں ملا تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔

گوبند رام نے مہمان داری کی تیاریاں شروع کیں۔ فرش فروش، میز اور کرسیاں سب ادھر ادھر سے مانگ کر جمع کیں۔ ایک خوبصورت جھالروں والا پنکھا بھی لگا دیا۔ ان تیاریوں سے فرصت پا کر للتا کے پاس گئے۔ اور

تو آپ نے کتابوں کا ایک پشتارا باندھا۔ اور رات کے لئے تھے پر رکھے ہوئے ایک کتب فروش کی دوکان پر جا پہنچے۔ ان کی گردن ایسی جھکی ہوئی تھی۔ اور کچھ اس طرح نظریں بچاتے پھرتے تھے۔ گویا یہ بامعصیت ہے۔

لکشمی دت دوسرے دن آگئے۔ گوبند رام نے انہیں چار سال بعد دیکھا۔ چھریرے بدن کا نوجوان اب ایک لحیم و شحیم بابو بنا ہوا تھا۔ ترائی کی مرطوب آب و ہوا نے اس کے مردانہ حسن کو خاک میں ملا دیا تھا۔ مزاج میں بھی کایا پلٹ ہو گئی تھی۔ یہ تکلفی تو وہی تھی مگر لب و لہجہ کسی قدر تحکمانہ اور مذاق کسی قدر نفیس اور امیرانہ ہو گیا تھا۔ پہلے اپنے کپڑے آپ پہنتے تھے۔ اب ضرورت تھی کہ کوئی دوسرا پہنا دے۔ پہلے خود نہاتے تھے خود کھاتے تھے۔ اب ضرورت تھی۔ کہ کوئی دوسرا نہلائے کوئی دوسرا کھلائے۔ بچپن کا گذرا ہوا زمانہ واپس آرہا تھا۔

مگر گوبند رام نے ان ظاہر پرستوں کی جڑ پہلے ہی کاٹ دی۔ گلے ملنے کے بعد جب دونوں دوست بیٹھے تھے۔ تو لکشمی نے مسکرا کر پوچھا۔ "یار بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ کیا کیا خاطر کرو گے۔؟"

گوبند رام نے ہنس کر جواب دیا۔ "بھئی تمہیں مہمان نہیں سمجھتا۔ اس لئے مہمان نوازی کی نہ فکر ہے۔ نہ سامان۔ جو کچھ حاضر ہے۔ اس میں عجبت نہیں۔ پہاڑی پانی پیتے پیتے منہ بدمزہ ہو رہا ہوگا۔ یہاں بہت صاف آب مقطر کیوڑے میں بسا ہوا مل جائے گا۔ کھانا میں ہمیشہ سادہ کھاتا ہوں۔ حکیموں اور ڈاکٹروں کی پابندی کرنی ہی پڑتی ہے۔ اور غالباً تمہیں بھی ملائم چپاتیاں نامرغوب نہ ہوں گی۔ دودھ کی چیزیں بے شک لذیذ ہوتی ہیں اور مجھے پسند ہیں۔ مگر ایک تو ثقیل اور دوسرے شہر میں دودھ نایاب۔ دودھ کے بدلے پانی ملتا ہے۔ اور پانی میں پیسہ پھینکنا فضول ہے۔ رہے خدمت گار سو مجھے ان سے نفرت ہے۔ ایک تو سلیقہ کے نوکر ملتے ہی نہیں اور ملے بھی تو کلکٹر کی تنخواہ مانگتے ہیں۔ دہقانیوں کو رکھو تو انہیں سکھانے اور سمجھانے میں سارا دن صرف ہو جاتا ہے۔ ندوادن اور درد سر ضربدن اگر تم مطمئن رہو۔ تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے پائے گی۔ مجھی کو اپنا خادم سمجھو۔"

لکشمی دت کمرہ کے اندر گئے تو اس کی آرائش اور نفاست آنکھوں میں کھب گئی۔ چاروں طرف فراغت اور تموّل کے آثار نظر آئے کچھ دیر بیٹھے اپنی جنگلی زندگی کے تجربات بیان کرتے رہے۔ پھر پرانے کالج کا ذکر آگیا۔ کیسے چین سے دن کٹتے تھے۔ سمجھے تھے ملازمت میں سکھ ملے گا۔ مگر جنجال میں آپھنسے۔ گوبند رام نے اپنی داستان چھیڑی۔ اس تین سال کے مدرسے نے ناک میں دم کر دیا۔ مجھے کوئی پوچھے تو میں صاف کہہ دوں کہ بھیک مانگ کھانا اچھا ہے مگر مدرسی اچھی نہیں۔

لکشمی دت بولے "یار بناوٹ کی باتیں نہ کرو چھیں کر رہے ہو۔ مجھے تمہارے اوپر رشک آتا ہے۔"

اس طرح باتیں ہوا کیں۔ عورتوں کا ذکر آنا لازم تھا۔ پہلے دونوں نے اپنی اپنی بیویوں کے حسن و قبح بیان کئے۔ پھر دیگر عاشقانہ مصروفیتوں کے چرچے ہوئے۔ یہاں تک کہ کھانے کا وقت آپہنچا۔ یہ باتیں کھانے سے زیادہ لذیذ تھیں۔ اگر کوئی فسانہ نگار موجود ہوتا تو اسے ایک درجن قصوں کا مصالہ مل جاتا۔ آخر۔ بارہ بجتے بجتے بھوکے پڑ گئے۔ وہاں کا ٹھاٹ دیکھ کر لکشمی دت کی آنکھیں کھل گئیں۔ گوبند رام اسے اپنی امید سے زیادہ خوش نصیب نظر آیا۔

کھانا کھانے کے بعد لکشمی دت پلنگ پر لیٹا اور بولے "اب پنکھے والے سے کہو پنکھا کھینچے۔ اور ہم تم اطمینان سے باتیں کریں ابھی مجھے ایک دفتر کا دفتر کہنا ہے۔

گوبند رام سناٹے میں آگیا۔ اس نے اس پنکھے کو محض نمائش کے لئے لگایا تھا۔ اس کی رنگین جھالر بہت خوشنما معلوم ہوتی تھی۔ سو... لگایہ بلائیوں کو خوبصورتی سے ٹالوں۔ کیوں کر بے تکلفی برتوں۔ صاف صاف کہہ دوں کہ یہ پنکھا ہاتھی کا دانت ہے۔ اس میں ... نہیں، کمرہ کی زینت مقصود ہے۔ مگر کچھ زیبا نہیں معلوم ہوتا۔ بولے "نہیں تم اب فوراً آرام کرو۔ تمہاری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ رات ... بھر کے جاگے ہوئے ہو۔ شام کو اطمینان سے باتیں ہوں گی۔ میں اس وقت ایک وکیل کی لڑکی کو پڑھانے جاتا ہوں۔ پڑھا ... لیا جاتا ہوں۔ پڑھنے جاتا ہوں۔ جو باتیں سمجھ میں نہ آئیں۔ وہاں جاکر پوچھ آیا۔ وکیل بہت مہربان ہیں۔ چار بجے تک آجاؤں گا ... یہ کہہ کر آپ نے رسی کو اندر والے دروازے سے آنگن میں پھینک دیا۔ اور دونوں کواڑ بند کر دیئے۔ تب آنگن میں دو چارپائیاں ... کھڑی کیں۔ ان پر ایک چادر تانی اور اس کے سایہ میں بیٹھ کر پنکھا کھینچنے لگے۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ گرمی کے مارے برا حال تھا۔ سارا بدن پسینہ ... پسینہ ہوگیا۔ دم پھولنے لگا۔ سر دھمکنے لگا۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ مگر وہ غریب، قہر درویش بر جان درویش، چپ چاپ ... ایک محویت کے عالم میں پنکھا کھینچ رہا تھا۔ ہاتھوں کے سوا سارا جسم بے جان اور بے حس معلوم ہوتا تھا۔ یکایک انہوں نے آنکھیں ... اٹھائیں۔ للتا سامنے کھڑی تھی۔ شرم سے آنکھیں نیچی ہوگئیں۔ اس نے پہلے حیرت اور تب ہمدردی کی نگاہوں سے دیکھا۔ منہ سے کچھ ... بولی۔ آنکھیں آب گوں ہوگئیں۔ انہیں وہاں سے بزور اٹھا دیا۔ اور خود پنکھا کھینچنے لگی۔

لکشمی دت تو تیسرے دن اپنے گھر چلے گئے۔ اور خوش گئے۔ لیکن ان کی میزبانی کا گوبند رام پر وہ اثر ہوا جو مدت العمر قائم رہا۔ ... غیرت مند طبیعتوں کے لئے ذات سے زیادہ پر زور اور کوئی تحریک نہیں ہوتی۔ دوپہر کے وقت دھوپ میں بیٹھ کر خود پنکھا کھینچنا۔ ا... اپنی بیوی سے کھنچوانا ایک ایسا پر اثر سبق تھا جو دل سے کبھی محو نہ ہوا۔ شاید کوئی دوسری طاقت گوبند رام کے اس ارادہ میں ایسا استحکا... پیدا کر سکتی تھی۔ قانون کو پھر فتح ہوئی۔ اس نے للتا کی ہمدردی حاصل کر لی۔ اور ایک سوئی اور ریاضت تو مضبوط ارادہ کے خادم اور مدد... ہیں۔ دو سال کے بعد جب پھر لکشمی دت اپنے دوست کا مہمان ہوا۔ تو گوبند رام نے ہنس ہنس کر اور ہنسا ہنسا کر اس واقعہ کا ذکر کیا۔ کیونکہ ... اب پکا وکیل ہوگیا تھا۔ اور اسے پردہ داری کے لئے تکلف یا تکلیف کی ضرورت نہ تھی۔ لکشمی دت نے پوچھا۔ "اگر اس دن پنکھا نہ کھینچنا ... تو شاید تم وکیل نہ ہو سکتے۔" گوبند رام نے جواب دیا۔ "میرا تو ایسا ہی خیال ہے خود کھینچا تو خیر کوئی بات نہ تھی۔ لیکن للتا کو اس حالت میں دیکھ ... قہر ہوگیا۔" لکشمی دت ہنس کر بولے "میری بدولت تمہیں جو تکلیف ہوئی۔ اس کا معاوضہ تو تم لے چکے۔ لیکن جب تک للتا کو اپنے ہاتھ ... پنکھا نہ جھلوں مجھے تسکین نہ ہوگی۔" گوبند رام نے کہا وہ ہرگز نہ مانے گی۔" لکشمی دت نے للتا کی تصویر کی طرف دیکھ کر کہا میں منا لوں گا...

"پریم چند"

سلطان حیدر جوش کے قلم سے

افسانۂ دل

چارشنبہ ۲۳ جولائی ۱۹۱۳ء

منظر کی، یعنی ان کے والد کی کوٹھی سے ملحق، گوشہ جنوب مغرب کی طرف اس طرف جس طرف منظر کا کعبہ تھا۔ جس طرف سجدہ کرنے کی اسے اجازت حاصل تھی۔ وہی سرخ کوٹھی واقع تھی۔ جو منظر کی تمام آرزوؤں کا تمام مسرتوں کا بلکہ تمام زندگی کا مرجع کہی جا سکتی تھی! اس کوٹھی کے مالک ایک برہمو سماج بنگالی تھے۔ جو عرصہ سے ایک عہدہ جلیل پر ریاست مذکور میں نہایت فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہے تھے! سوائے اولاد کے اور کسی بات میں کمی نہ تھی پیسہ، عزت، حکومت، فارغ البالی و عیش سب کچھ ضرورت سے زیادہ میسر تھا۔ البتہ اولاد کے نام سوائے ایک لڑکی کے اور کچھ نہ تھا۔ مگر وہ ایک لڑکی جس کے حسن کو زمانہ کی گرم سرد ہوا کھاتے ہوئے ابھی سترہ برس سے زیادہ نہیں گذرے تھے ایک انمول موتی یتیم تھی۔

یہ لڑکی کلکتہ کے ایک بنگالی گرل اسکول میں تعلیم پاتی تھی۔ اور اسی سال انٹرنس میں کامیاب ہوئی تھی۔ منظر کے والدین میں اور اس بنگالی فیملی میں نہایت خصوصیت کا ربط ضبط تھا۔ منظر کے والد تعصب سے قطعی پاک تھے۔ اور یہ بنگالی آزادی کے لحاظ سے بھی کہ دنیا کافی ہو گا برہمو سماج تھے،

پورے آٹھ سال کی ہمسائیگی ایسی چیز نہیں جو ایک معتد بہ اثر نہ کرے پھر اس پر دونوں طرف اس قدر صاف مخالفت و تعصب کی کدورت سے پاک دل، جس قدر بے تکلفی اور یگانگت پیدا ہو جاتی تھوڑی تھی۔ آج سے چھ سات برس پیشتر جب کہ یہ لڑکی کمیلا دنیا کو کسی اور بھولے انداز کی آمیز نظر سے دیکھتی تھی۔ منظر اور یہ ہم نشیں، ہم جلیس اور شریک شرارت رہتے تھے۔ پھر زمانہ نے ان کو علیحدہ کر دیا منظر علی گڑھ کالج میں بھیجے گئے اور کمیلا گرل اسکول کلکتہ۔ بنگالی گرل اسکول! خط و کتابت جاری رہنا کچھ تعجب آمیز نہ تھا اور ہر تعطیل کے موقعہ پر ایک دوسرے سے شوق کے ساتھ بنارس میں آکر ملنا قطعی نیچرل! مگر اس مرتبہ کچھ ایسا اتفاق ہوا تھا کہ پورے تین سال سے ملاقات نصیب نہیں ہو سکی۔ اس عرصہ میں منظر تو کئی مرتبہ بنارس آئے۔ اور کمیلا بھی۔ مگر۔ اسے اتفاق کہئے یا فلک کج رفتار کی شعبدہ بازی۔ جس دفعہ منظر آئے کمیلا نہ آ سکی۔ اور جس دفعہ وہ آئی منظر کالج نہ چھوڑ سکے۔ بچپن کی ہم نشینی نے ایک انس پیدا کر دیا۔ اور زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ خود رو چیز دونوں جانب جڑ پکڑتی رہی بخط و کتابت سے ہمیشہ اس خود رو چیز کو غذا پہنچتی رہی۔ اور! اور جب شباب کا نظر خیرہ کرنے والا آفتاب طلوع ہوا اس کی مہر سوز شعاعوں کا انعکاس دونوں اطہر دلوں پر شروع ہوا تو یہ خود رو چیز ایک ساتھ پھوٹ پڑی، پھیل گئی، ایک ایک رگ میں سرایت کر گئی! اب وہی الفاظ جو نہایت بے پروائی کے ساتھ قلم و زبان سے نکل جایا کرتے تھے۔ رکنے لگے۔ نہیں کوئی خاص چیز۔ کوئی خاص خیال۔ ایسے موقع پر زبان اور قلم کو یکایک دونوں طرف روک لیتا تھا! اور اس خیال کا احساس تکلیف دہ۔ مگر دل چسپ، مضطرب کن مگر لذت آمیز، انبساط افزا احساس۔ دونوں دلوں میں جاگزین تھا۔

ہاں تو۔۔۔ پورے تین سال شوق و انتظار کے بعد آج منظر عجیب بے چینی کے ساتھ کمیلا سے ملنے تشریف لے جا رہے تھے۔ یہ ابھی کو معلوم ہو چکا تھا کہ کچھ عرصہ سے ایک بنگالی سن رسیدہ عورت، کمیلا کی نگران یا اتالیق کی صورت میں اس کے پاس رہتی تھی۔ اور اسے ڈر تھا کہ

اس وقت بھی یہ بد زندگی میں کاٹ لے جانے والا تڑپ نہ لگا ہو۔ تاہم وہ جانتا تھا۔ کہ کمیلا فطرتاً شوخ طبع ہے۔ اور اس کے متین نہ ہونے سے وہ ادا
اس کا شیدائی تھا۔ کیونکہ وہ خود بھی کچھ کم شریر نہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی خلقی بے باکی کبھی ہرگز نہیں جا سکتی۔ اور اس بے باکی کی وجہ سے اور زیادہ خوش
تھا کیونکہ وہ خود بھی تکلفات سے انتہا درجہ کا متنفر تھا۔ اور اسے یقین تھا وہ چلبلی طبیعتیں اور وہ بے چین دل عرصہ دراز کے بعد یک جا ہو کر
کیسے آزادی کے ساتھ اظہار خیالات کا موقع کسی نہ کسی طرح حاصل نہ کر لیں! کمیلا ایک بید کی کرسی پر بیٹھی کچھ بن رہی تھی۔ اور اس کی نازک انگلیوں
کی تیزی کے ساتھ حرکت کرنے والی سلائیاں اپنے کام میں مشغول تھیں۔ برابر والی آرام کرسی پر وہی سن رسیدہ بنگالی عورت گرگ باراں دیدہ عورت
کی طرح سے غافل تھی۔ اس کی ٹھوڑی سینہ پر جا لگی تھی، سفید سر جھک کر سامنے آ گیا تھا۔ ناک اور ٹھوڑی میں اس قدر کم بُعد تھا جس قدر اس عمر میں
عورت میں منہ بالکل دیہاتی لیٹر بکس کی طرح کھلا ہوا تھا۔ اور سانس سنہار کے دھونکنے کی مانند برابر آ رہا تھا! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ موت
کے آنے سے پیشتر نیند کی رہبری میں عدم آباد میں پہلے سے اپنے لئے کوئی جگہ تجویز کرنے گئی ہو۔

آہٹ کے ساتھ کمیلا کی نظر اٹھی، اٹھی اور منظر کی نظر سے ملی، ملی اور خدا جانے ایک دوسرے پر کیا اثر کر گئی۔ وہ خود بخود دکھڑی ہوئی۔ مگر جھک گئی۔ از خود ایک تبسم پیدا ہوا۔ مگر زبردستی روک دیا گیا۔ بلا ارادہ ہاتھ کو جنبش ہوئی مگر کسی خاص خیال سے تھام لیا گیا۔ منظر نے نہایت بیباکی اور شوق کے ساتھ ہاتھ بڑھایا۔ اور اب کمیلا کا نازک ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ کیا اس کے بیان کرنے کی حاجت ہے کہ دونوں دلوں پر اس وقت کیسی کیفیت طاری تھی؟ دونوں دل بغیر زبان ہلائے وائرلیس ٹیلیگرافی سے کہیں زیادہ آسانی کے ساتھ بلا کسی ظاہری ذریعہ کے ایک دوسرے کے مافی الضمیر سے پوری پوری آگاہ ہو رہے تھے؛ منظر نے کمیلا کا ہاتھ چھوڑے بغیر، کیونکہ اس ہاتھ سے ایک ناقابل بیان انجذاب موجزن تھا۔ ایک عجیب برقی قوت کا احساس۔ نگیٹو اور پازیٹو کے اتصال سے پیدا ہونے والی بجلی کا احساس، لطف دے رہا تھا۔ کمیلا سے پوچھا "یہ کون ہیں؟ شاید آپ کی اتالیق ہیں۔؟"

کمیلا "ہاں! معلوم نہیں ہوشیار ہیں یا غافل!"

کمیلا کا جواب اگرچہ ظاہرہ بے تکا تھا۔ مگر در اصل معنی خیز تھا۔ گو منظر اس آسانی کے ساتھ متنبہ نہ ہو سکتا تھا۔ منظر "میں ابھی معلوم کر سکتا ہوں۔"

"کیونکر؟" ایک عجیب تبسم کے ساتھ جس سے آنکھوں میں خاص شرارت پیدا ہو گئی۔ کمیلا نے پوچھا۔

"نہایت آسانی کے ساتھ۔ میں ابھی تم کو بتائے دیتا ہوں" جواب دیتے ہوئے منظر کمیلا کے کان کی طرف جھکا۔ جس کے ساتھ ہی ایک بھولے پن کے ساتھ کمیلا نے اپنا کان اس کی طرف بڑھا دیا۔ مگر بجائے اس کے کہ اس کی قوت سامعہ کچھ الفاظ سنتی جو منظر کے، لب اس کے رخسار پر محسوس ہوئے اور ساتھ ہی ایک آواز کان تک پہنچی! یہ کوئی نئی بات نہ تھی جس سے کمیلا ناراض ہوتی۔ یا جس کے ارتکاب سے منظر خائف ہوتا۔ مگر اب وہ عمر نہ فوراً کمیلا کی نظر اپنے سینہ پر پڑی اور خدا جانے کس نئی چیز کا علم ہوا کہ دفعتاً چونک پڑی، منظر سے ہاتھ چھڑا کر ہٹ گئی، شرما گئی! وہ شوخ تھی، بیباک تھی، کلکتہ کی تعلیم یافتہ تھی مگر پھر بھی ہندوستانی تھی۔ اور اب شباب کو محسوس کرتی تھی! اور جو کچھ بھی ہو، اس بوسہ کی آواز کے ساتھ ہی سن رسیدہ عورت کی فطرت کا اندازہ ہو گیا۔ مردہ قالب میں یکایک جان سی پڑ گئی۔ اور اس نے آنکھیں کھول کر منظر سے کرخت آواز میں پوچھا۔ "تم کون ہو بابو؟"

"میں بابو نہیں ہوں، منظر ہوں،" منظر شرارت سے ابھی دست کش نہیں ہوا تھا! "منظار ریس (۲ حصہ) منظار۔ آج بڑا بابو تمہارا

الاے دردمند

حضرت آرزو لکھنوی

چہارشنبہ ۱۳ اگست ۱۹۱۳ء

گذرا نہ تھا جہاں تک وہم و گماں ہمارا
یوں آج مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا

ملتان ہو کہ ایران ترپلی یا مراکو
اک وقت میں لٹا ہے ہر کارواں ہمارا

توپیں تو مورچوں کی خاموش ہو چلی ہیں
نامہ ہو کوئی شاید آتش فشاں ہمارا

یا گھر میں بیٹھنا تک دشوار ہو گیا ہے
یا ایک وقت میں تھا سارا جہاں ہمارا

وہ دن کہاں ترقی شکل ہلال جب تھی
ہے اب تو بے نشانی نام و نشاں ہمارا

کرتے ہیں اب بسیرا آ آ کے بوم اُن پر
جن ڈالیوں پہ کل تک تھا آشیاں ہمارا

اک رگ ہزار نشتر اک دل ہزار پیکاں
ہے آج تشنۂ خوں سارا جہاں ہمارا

جو سیل آ رہی ہے سیل فنا ہے گویا
شکل سراب سمجھو، نام و نشاں ہمارا

کیا کام اس شجر سے سرسبز ہو کہ سوکھے
جس پر نہیں ہے باقی اب آشیاں ہمارا

ہم ساتھ زندگی کے خانہ خراب اب ہیں
تربت کے واسطے ہے یہ خاکدان ہمارا

مٹتے جسے بھی دیکھو جانو کہ ہے مسلمان
یہ اک رہ گیا ہے قومی نشان ہمارا

یہ قصۂ مصیبت نشتر سے کم نہیں ہے
روئے گا خون کے آنسو ہر قصہ خوان ہمارا

اب انتظار کیا ہے اب آنے والے جلد آ
گمراہ بے خضر ہے یہ کارواں ہمارا

تو لاج رکھ لے آ کر دین محمدی کی
جز تیرے کون اب ہے عزت نشاں ہمارا

سینے میں جن کے دل ہے تڑپیں گے آرزو وہ
اک داستانِ غم ہے گویا بیاں ہمارا

---

[1] جلال لکھنوی کے جانشین۔ غزلوں میں اُردو غزلوں کا رواج انہی نے دیا، پاکستان میں ۸۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔

سب مال ام سے پولا تھا۔ ام تم کو جنٹلمین سمجھا تھا۔"

" اور میرے جنٹلین ہونے میں اب شک ہے کیا؟"

او بس! تم ابھی کیا کیا؟"

"کچھ نہیں۔" مظہر اب تک بے باک تھا۔ مگر کیلا؟ اس کا سانس کس قدر معمول سے زیادہ سرعت کے ساتھ آرہا تھا۔

" ابھی ام کھد (خود) سنا! تم کیا کیا؟ ام بڑے بابو سے جرور (ضرور) بولے گا!"

"یہ کچھ نہیں تھا محض ایک بوسہ ذو معنی تھا" نہایت شرارت کے ساتھ مگر ظاہرا پوری متانت کے ساتھ مظہر نے جواب دیا!

"کیا ۔ کیا ۔ کیا تھا؟" بیچاری بنگالی عورت اس فارسی و عربی آمیز لفظ کا مطلب مطلق نہیں سمجھی!

اس کا جواب دینے کی بجائے مظہر کرسی کی طرف جھکا اور اس سے پیشتر کہ وہ سن رسیدہ آگاہ ہو زور کا بوسہ مظہر نے گرگ باراں دیدہ کی پیشانی کا لے لیا۔

"یہ کیا؟ یہ کیا . . . . "غصہ کے ساتھ بڑھیا کے منہ سے نکلا۔

مظہر (انگریزی میں) "کچھ نہیں تم اس قدر کیوں ناراض ہوتی ہو۔ ہمارے کالج کا یہ طریقہ ہے کہ ہم جب کبھی کسی برابر والے سے ملتے ہیں تو رخسارے پر بوسہ دینا ہمارا فرض ہے۔ اور کسی بزرگ سے ملیں تو پیشانی پر! اور اگر ایسا نہ کریں خصوصا اس وقت جب کہ محبت درمیان میں ہو تو سخت بد تہذیبی اور بدتمیزی سمجھی جائے گی۔"

" اچھا ۔ ول (well) یہ بات! یہ بات! تم ام کو ماف (معاف) کرے گا۔ ام افسوس ہے!"

اب بڑھیا کا غصہ رفو چکر ہو گیا تھا۔ بالکل اس طرح اڑ گیا تھا۔ جس طرح گدھے کے سر سے سینگ وہ بہت کچھ مظہر کی نسبت خود اس محبت کی نسبت جو مظہر اور کیلا کے مابین تھی۔ خود کیلا کے والد سے سن چکی تھی۔ اس لئے اب زیادہ مخل ہونا اسے خود برا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اٹھی اور چلی گئی۔! مظہر بھی کیلا کا ہاتھ ہاتھ میں لئے ہوئے باغیچہ میں ٹہلنے لگا۔ شکوہ شکایت، اظہار صداقت و استقلال، دل کی لگی، خدا جانے کیا کیا معاملات تھے جن پر عجیب لطف کے ساتھ گفتگو ہوتی رہی۔ مگر اثنائے گفتگو میں عین اس وقت جبکہ دو مجروح دل ایک بوسہ مشترک کے ساتھ ایک دوسرے کا پابند بنانے کا عہد کر رہے تھے۔ سامنے والی سڑک پر سے ایک شخص دردبھری آواز میں گاتا ہوا نکلا۔

از نبادس نہ دوم پائے بدام است اینجا

ہر برہمن بچہ چھمن و رام است اینجا

ہم کو اور کسی جھگڑے سے مطلب نہیں اس سے بھی کچھ غرض نہیں کہ بڑھیا نے اس واقعہ کا ذکر بڑے بابو سے کیا یا نہیں کیا۔ دراصل سگ بہ لقمہ دوختہ بہ" کے مصداق ایک نوجوان کے بوسہ نے اسے خاموش کر دیا۔ البتہ ہم کو صرف یہ الجھن ہے کہ "بوسہ ذو معنی" کا اطلاق ایک بوسہ پر ہو سکتا ہے یا دوسرے پر۔"؟

ایک خط میں بچپن کی یاد
لڑکیوں کے نیچرل جذبات کا اظہار

از مسٹر حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی

(شنبہ ۱۵؍ نومبر سنہ ۱۹۱۴ء)

خط کو تمہارے دیکھ کر، پیش نگاہ تم ہو اب — باتیں جو بچپنے کی تھیں، آگئیں یاد سب کی سب

ہائے وہ دن ہوا ہوئے، باتیں ہیں سب کہانیاں — راتوں کو کون بیٹھ کر کہتا ہے اب کہانیاں

نیم کے نیچے بیٹھ کر، کھیل وہ مجھ کو یاد ہے — تم بھی خوش اور میں بھی خوش کھیل وہ مجھ کو یاد ہے

ہو گئی کچھ جو چھیڑ چھاڑ، تن گئے اک ذرا میں پھر — مل گئے اک ذرا میں دل، من گئے اک ذرا میں پھر

کٹتے تھے کس خوشی کے ساتھ، بیٹھ کے دونوں پاس پاس — رنج نہ آئے ارد گرد، فکر نہ آئے پاس پاس

گڑیوں کو رات دن نئے، کپڑے سب پہنائے جاتے تھے — ہوتی تھیں روز نسبتیں، بیاہ رچائے جاتے تھے

لطف عجیب رہتے تھے، موسم برشکال میں جو — عیش نصیب رہتی تھی، موسم برشکال میں جو

لیتے تھے جھولنے میں ہم پینگ بہت بڑے بڑے — پینگ لیا تو گر پڑے، گر کے اٹھے تو ہنس پڑے

روز پڑھایا کرتے تھے، راتوں کو بیٹھ کر جسے — مٹھو وہ ہائے مر گیا۔ کوئی پڑھائے اب کسے

اب ہیں ہزاروں کاوشیں، جان ہے اک وبال میں — پہلے کے لطف بھول کر آتے نہیں خیال میں

جلد جواب خط کا دو، اب یہ تمہارا فرض ہے
افسر خوش خیال کو، میرا سلام عرض ہے

دُعَا

مجاہدین ریف کی فتح و نصرت کے لیے جو غازی عبدالکریم کی قیادت میں فرانس اور اسپین
کے خلاف معرکہ آراء تھے، جامع مسجد دہلی کے منبر سے جمعہ کی نماز کے بعد مولانا نے یہ دعا مانگی تھی
اس وقت مولانا کے تاثر کی یہ کیفیت تھی کہ روتے روتے گگھی بندھ گئی تھی۔ دوسری طرف ہزارہا
کا مجمع تھا جو زارو قطار رو رہا تھا۔ اور جامع مسجد کا وسیع صحن ایک ماتم کدہ بن گیا تھا۔ (از مرتب)

اے بحر و بر اور خشک و تر کے مالک، اے ارض و سماء کون و مکان کے خالق و فاطر، اے کہ وہ تیرا آستانہ ہر
درماندہ کا ملجا و ماویٰ اور تیری چوکھٹ بے نواؤں اور بے کسوں کے لیے آخری جائے پناہ ہے، اے وہ کہ مسکی
فریاد کو لبیک کہتا اور عجز و فتادگی کو عزیز رکھتا ہے، آج تیرا ایک گنہ گار و عصیاں شعار بندہ تیرے حضور میں حاضر ہوا ہے
اس کی پیشانی پر تیری اطاعت و فرمانبرداری کا کوئی نشان نہیں، مگر عرق خجالت و انفعال سے تر ضرور ہے۔ گو اس کا س
احکام کے سامنے کم جھکا ہے مگر خاک شرم ساری اور گرد خجالت سے وہ اٹا رہا ہے۔ اور اس کے چہرے پر دعون
سرکشی کی تمکنت و نخوت کی بجائے مذلت و خاکساری اور عجز و فروتنی موجود ہے اس کی جیب و دامن متاعِ طاعت
خالی ہے۔ مگر اس کے دل کی جھولی عجز و شکستگی اور فروتنی و فتادگی کی دولت سے معمور ہے۔ وہ چشم خوں بار اور قلب
کے ساتھ تیری بارگاہ عاجز نواز اور آستانہ ناز پر حاضر ہوا ہے کہ تیرے حضور میں اپنی خجل و شرم سار پیشانی کو رگڑ کر تجھ
کچھ مانگے اور سر نیاز کو جھکا کر کچھ طلب کرے۔ اے درد مند دلوں کی فریاد کو سننے والے اور اے عاجزانہ اور منکسرا
کو آغوش استجابت میں جگہ دینے والے خدائے حی و قیوم، تیرے سوا کون ہے جو دلوں کی شکستگی کو دولت و حشمت ک
ترجیح دیتا ہو اور روحوں کی دردمندی کو طاعت و عبادت کے نخوت پر مقدم رکھتا ہو۔ یقیناً تیرے سوا کوئی نہیں
ایک تہی دامن اور بے بضاعت بندہ تیرے آستانہ قدس کو چھوڑ کر اپنے دل کی تڑپ سناتے کے لئے کہا
اور کس کی چوکھٹ پر جا کر سرِ نیاز کو رگڑتا اے بے کسوں کو کس اور بے بسوں کو سہارا دینے والے رب، موسیٰ و ی
میں اس لیے حاضر نہیں ہوا کہ تجھ سے اپنے رہنے کے لیے عالیشان محل مانگوں کیونکہ قلب مطمئن کے ساتھ میں خس پوش
کو شان دار محل پر ترجیح دیتا ہوں۔ میں اپنے لیے شاہانہ جاہ و جلال اور عظمت و جبروت کا بھی طالب نہیں کہ عجز و گ

"ہمدرد" ــــــ ۲۷ جنوری ۱۹۲۷ء

ساتھ زندگی بسر کرنے کو پسند کرتا ہوں۔ مجھے دولت کی فراوانی بھی درکار نہیں نہ عیش و راحت کے لئے امیرانہ کروفر کی مجھے چاہ ہے بلکہ میں تو اس لیے تیرے حضور میں آیا ہوں کہ اگر تیری توفیق کرم فرمائے تو تجھ سے تیرے مجاہد سرفروش بندوں کے لیے جو صحرائے اعظم افریقہ کے ایک گوشہ ریف میں مصروف جہاد ہیں، دعا مانگوں کہ اے حق و صداقت کو دوست رکھنے والے خدا تو اپنے ان بندوں کی اپنی نصرت بخشیوں سے مدد فرما اور ان کو ظلم و طغیان کے مقابلہ کرنے کی طاقت عطا کر تاکہ حق سربلند و سرفراز ہو اور باطل خاسر و ناکام رہے۔

خداوندا! یہ مٹھی بھر آدمی جو بے سروسامانی مگر تیری نصرت فرمائیوں کے ساز و سامان کے ساتھ اسپین اور فرانس جیسی طاقت ور حکومتوں سے نبرد آزمائیں تاکہ اسلام کا علم مغرب اقصیٰ کی سرزمین پر سرنگوں نہ ہونے پائے۔ اپنے خزانۂ غیب سے ان کی مدد فرما۔ کیوں کہ بغیر تیری نصرت بخشی و نصرت فرمائی کے یہ بے سروسامان مجاہد ایسی عظیم الشان سلطنتوں کا کامیاب مقابلہ کس طرح کر سکتے ہیں جو اپنی شیطانی طاقت کے نشے میں سرشار ہیں اور جن کو اپنے جہنمی آلاتِ حرب پر اس قدر گھمنڈ ہے کہ جہاں کہیں بھی حق و صداقت کی روشنی نظر آتی ہے یہ چڑھ دوڑتے ہیں۔ تاکہ اس کو گل کر دیں۔ اور اپنی سطوت و جبروت کا سکہ بٹھائیں اور جو اپنی ابلیسی قوت پر اس قدر مغرور رہیں کہ جس جگہ بھی کوئی کمزور اور ناتوان قوم بستی ہے یہ اس پر دھاوا بول دیتے ہیں تاکہ جن گردنوں کو تو نے آزاد پیدا کیا ہے۔ ان میں اپنی غلامی کا طوقِ لعنت ڈال دیں۔ اور جن سروں اور پیشانیوں کو تو نے صرف اپنی بارگاہِ کبریائی میں رگڑنے کے لیے بنایا ہے۔ ان کو اپنی ناپاک چوکھٹوں پر رگڑوائیں۔

اے خدائے بے نیاز! اے وہ کہ تو نے اپنی قدرتِ کاملہ سے کمزوروں اور ناتوانوں کو طاقت و توانائی عطا فرمائی کہ سرکش اور متمرد انسانوں کو شکست و ہزیمت کی ذلت و رسوائی دلوائی ہے۔ تیرے یہ ریفی بندے جو بے سروسامانی کے سوا کوئی ساز و سامان نہیں رکھتے۔ بغیر تیری مدد کے فراعنہ اسپین و فرانس سے کس طرح سربرآ ہو سکتے ہیں اور جب تک تیری غیبی نصرت بخشیاں بے سروسامان مجاہدین ریف کے ہمرکاب نہ ہوں۔ وہ ایسی قاہر حکومتوں کا کیوں کر مقابلہ کر سکتے ہیں۔ بھلا ایک مفلوک الحال اور دنیاوی ساز و سامان سے محروم قوم کی یہ کسی ایک طاقت ور حکومت کے غرور و گھمنڈ سے کس طرح حق و صداقت کی پامالی کی حفاظت کر سکتی ہے۔ البتہ تو نے فرعون کے گھمنڈ کو موسیٰ کی بے کسی سے شکست دلوائی۔ اور بدر کے چند نفوس سے کفار قریش کے غرور کو پامال کرایا ہے۔ تیری ہی قدرت میں ہے کہ آج بھی تو پرستارانِ توحید کو غالب و سرفراز فرما۔ بارالٰہا! میں تو اس قابل بھی نہیں۔ کہ تیرے پاک بندوں کے لیے جو اعلائے کلمۃ الحق کی جدوجہد میں مشغول ہیں۔ دعا بھی کر سکوں ایک غلام و محکوم قوم کا فرد ایسے قدسی نفوس کے لیے دستِ دعا دراز کرنے کا کیا حق رکھتا ہے جو اپنی آزادی کی حفاظت میں جانیں قربان کر رہے ہیں اور پانی کی طرح اپنا لہو بہا رہے ہیں لیکن اے خدائے رحیم و غفور! ہم اپنی بدبختی پر نادم ہیں اور جہاں اپنی ناپاک زبان سے فتح و نصرت کی تجھ سے دعا مانگتے ہیں یہ بھی عاجزانہ اور دردمندانہ التجا کرتے ہیں کہ مجاہدین حق کے صدقے میں ہم کو بھی توفیق عطا فرما کہ غلامی کے بندھن اور محکومی کی زنجیروں سے نجات حاصل کرنے کے لیے سرفروشانہ جدوجہد میں مشغول ہوں۔

الٰہی! اگر تو نے بے کس اور بے سروسامان غازیانِ اسلام کی مدد نہ کی تو کفر کی تاریکی سارے اقصائے مغرب کو گھیر لیگی۔ اسلئے شہدائے بدر کے صدقے میں اپنے جان فروش ریفی بندوں کو فتح و نصرت عطا فرما اور انکے دشمنوں کو جو فی الحقیقت حق و صداقت کے دشمن ہیں، مغلوب و مفتوح بنا دے

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

الوداعِ اوّل

(مئی ۱۹۲۸ء میں علاج کی غرض سے یورپ جاتے ہوئے یہ مقالہ لکھا گیا تھا)

حقیقتاً ایک اخبار اسی وقت چل سکتا ہے، جب کہ عوام کو اس کی ضرورت محسوس ہو اور وہ کافی تعداد میں اسے
آج عوام کو "ہمدرد" کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، اس لیے میں اسے بند کرتا ہوں اور ایک بار پھر غالب کے اس شع

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں؟

عوام کی یقیناً آج پھر وہی حالت ہے کہ ؎

جاتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اس لیے بہتر ہے کہ انہیں ایک دو سال کے لیے ان کے حال پر چھوڑا جائے اور خداوند کریم سے دعا ک
کر وہ انہیں راہبر کی پہچان عطا فرمائے۔ اور پیشتر اس کے کہ ہر ایک تیز رو کے ساتھ تھوڑی دور تک بھاگتے بھاگتے
خستہ اور چور ہو جائیں۔ انہیں منزل مقصود کا پتہ لگ جائے۔ اور اس کی طرف بڑھنے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔
بھی "درمے" ان کی مدد کیا کر سکتا تھا۔ اپنی استطاعت کے مطابق کچھ چندہ کسی فنڈ میں دے دیا اور بس "قلمے" اور "قد
میں نے مجنونوں کی طرح ان کی امداد کی اور قرض میں بری طرح گرفتار ہو گیا۔ اور صحت کو بھی خیرباد کہہ چکا۔ ذیابیطس
کے باعث پہلے شکر ہی آیا کرتی تھی مگر امسال چربی (ALBUSNI) بھی آ رہی ہے۔ اور ایسی ٹون (ACITONE) زہر بھی
اور اعصابی سوزش (NEURITIS) نے رات کی نیند اور دن کا آرام حرام کر دیا ہے۔ اب "ہمدرد" کو بند کرتا ہوں اور یہاں
پر کہیں جا بھی نہ سکوں گا۔ "قلمے" اور "قدمے" جو ملک و ملت کی خدمت کرتا تھا مجبور ہوں کہ اسے بند کر دوں۔ البتہ "سخنے"
سکے گا۔ کروں گا۔ اپنی اور اپنے متعلقین کی معاش کے لیے ہر روز دو تین گھنٹے یا ہر ہفتے دو تین روز کسی کی خدمت کر کے جو کچھ
کے مل سکے گا اس کے کمانے کی کوشش کروں گا اور باقی وقت میں خود پڑھوں گا اور اپنی بچیوں کو بھی کچھ پڑھاؤں گا

"ہمدرد" ۔ ۲۰ مئی ۱۹۲۸ء

برے دل میں کیا کچھ مستور ہے۔ میں خود ۱۵ مئی کے بعد سے "ہمدرد" سے علیحدہ ہو چکا ہوں۔ اور آج سے ۲۰ مئی کے پرچے کے
بعد میرا نام بھی بہ حیثیت ایڈیٹر "ہمدرد" شائع نہ ہوا کرے گا۔ اب میں اس کے قارئین کرام اور ملک و ملت سے رخصت ہوتا
ہوں (آئندہ کیا ہوگا) خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس وقت میری زبان پر الوداع ہے اور میرے دل میں ایک درد ہے اور میری آنکھ
میں چند آنسو ہیں۔ میں اپنے بھائیوں اور بہنوں سے درخواست کرتا ہوں کہ میری صحت روحانی و صحت جسمانی دونوں کے
لیے دست بدعا ہوں۔ لیکن میرے اس جدید کرم فرما کو بھی نہ بھولیں۔ جسے خدائے مسبب الاسباب نے میری کھوئی ہوئی صحت
مجھے پھر دلانے کے لیے اپنا آلہ بنایا ہے۔ انہوں نے اپنا ذاتی یا اپنی ریاست کا یا عام طور پر ریاستوں کا کوئی کام بھی میرے
سپرد نہیں فرمایا ہے۔ بلکہ محض ذیابیطس کا فاقوں کے ذریعے علاج کرانے کے لیے مجھے لندن کے ایک ڈاکٹر کے پاس بھیجا ہے
اس کے خلاف جو کچھ اخبارات میں شائع ہوا وہ حسب دستور سراسر غلط ہے۔ میں نے جب آج سے ساڑھے تین سال پیشتر

"ہمدرد" کی دوسری بسم اللہ کی تھی تو اپنے رب ذوالجلال کے آگے ہاتھ پھیلا کر عرض کیا تھا:

"افسوس کہ میں اپنی کوشش میں اب تک ناکام و نامراد رہا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں آج بھی مایوس نہیں ہوں۔ آج
بھی میری یہی دعا ہے اور آج بھی مجھے خدائے قدیر پر بھروسہ ہے کہ جلد وہ میری دعا قبول فرمائے گا۔ میں چند ماہ کے لیے
ے اور ہندوستان سے رخصت ہوتا ہوں۔ اور دست بدعا ہوں کہ

الٰہی پھر انہیں آباد و شاد دیکھیں ہم
الٰہی پھر انہیں حسب مراد دیکھیں ہم

جامع ہیں یا کسی تفریح کی جگہ ہر اس بھائی کی خدمت کے لئے حاضر رہوں گا جو مفادِ عام کے کسی کام کے متعلق میری رائے دریافت کرنا پسند فرمائیں گے۔ کانگرس میں۔ خلافت میں۔ جمعیت العلماء وغیرہ میں اس طرح برابر شریک ہونے کی کوشش کروں گا۔ جس طرح ایک مفلس، نادار ہندوستانی اور مسلمان شریک ہو سکتا ہے۔ حقیقتاً جس طرح سال گذشتہ عرض کر چکا ہوں اب بھی عرض کرتا ہوں کہ یہ گوشہ نشینی نہیں ہے بلکہ "مکہ" سے ہجرت ہے۔ خدا کرے کہ جلد فتح مکہ نصیب ہو۔ جو بھائی مجھے اور میرے اہل وعیال کو اکل حلال کی کوئی صورت بتا سکیں، بتائیں۔ ان کا نہایت ممنون ہوں گا، لیکن اپنی ذاتی ضروریات کے لیے کسی سے کوئی مدد قبول نہیں کر سکتا، سال گزشتہ بھی جب اس قسم کی رو کے لیے چند بھائیوں نے امداد کی ظاہر فرمائی تھی، میں نے دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس سے مستفید ہونے سے بہ مجبوری انکار کر دیا تھا۔ اور اسی پر میں آج بھی قائم ہوں

حال ہی میں ایک سفر سے واپس آ کر جب میں نے اپنی ڈاک کھولی تو پہلا محبت نامہ جو میری نظر سے گزرا، میرے قدیم اور عزیز کرم فرما مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا تھا۔ اس میں انہوں نے "ہمدرد" کے لیے اپنے اور چند اور عزیز ترین احباب کی کوششوں کا ذکر فرمایا تھا اور وہ چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح "ہمدرد" جاری رہے اور اس کے متعلق ان سب احباب نے ایک اسکیم تیار کی ہے جسے وہ قارئین کرام کے سامنے پیش فرمائیں گے۔ آخر میں انہوں نے قرآن کریم کی ان ہمت افزا آیات بینات کو بھی دہرایا تھا کہ ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب ومن یتق اللہ وتوکل علی اللہ فھو حسبہ ان اللہ بالغ امرہ قد جعل اللہ لکل شیء قدرا (اور جو کوئی اللہ سے ڈرتا ہے وہ اس کا گزارہ کر دیتا ہے اور اس کو وہاں سے روزی دیتا ہے، جہاں سے اسے گمان بھی نہ ہو، اور جو کوئی اللہ پر بھروسہ رکھتا ہے سو وہ اس کے لیے کافی ہے۔ اللہ تو کسی نہ کسی طرح اپنا کام پورا ہی کر لیا کرتا ہے۔ اس نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ رکھا ہے)

جس سفر سے واپس آتے ہی میں نے مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب کا یہ محبت نامہ پڑھا، اس کے آخری دن خداوند کریم نے اپنے گنہگار اور ناچیز بندے کے لیے غیب سے علاج اور اس کے لیے سفر کا سامان یکایک اور ایک محیر العقل طریقے پر بہم پہنچا دیا۔ میں لکھ چکا ہوں کہ میں نے ہندو بھائیوں سے قرض تک لینے میں احتیاط برتی ہے اور قارئین کرام جانتے ہیں کہ میں خلافتِ راشدہ جیسی جمہوریت کا کس قدر شیدا ہوں اور ملکیت سے کس قدر بیزار ہوں۔ مجھے اس کا کبھی گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک ہندو فرماں روا جس سے ماہ اپریل سے پیشتر میں صرف دو ایک بار ہی ملا تھا۔ اور وہ بھی گھنٹے دو گھنٹے سے زیادہ نہیں ان پر میری خرابیٔ صحت کا یہ اثر پڑے گا کہ پہلے وہ خود میرا چند ماہ کے لیے فاقوں پر علاج کرنے پر اصرار کریں گے اور بالآخر خود ہی بلا طلب بلکہ خود بھی کسی چیز سے یکایک متاثر ہو کر مجھے آمادہ فرمائیں گے۔ کہ میں یورپ چلا جاؤں، اور جس ڈاکٹر سے خود انہوں نے علاج کا یہ طریقہ سیکھا ہے، اس سے اپنا علاج کراؤں اور چند ماہ یورپ میں کسی صحت بخش مقام پر آرام کر کے ابتدائے نومبر میں ہندوستان واپس چلا آؤں۔ میں نے بار بار اس کا اظہار کیا کہ میں اس امداد کا مستحق نہیں ہوں، مگر جس طریقے پر بار بار اصرار کیا گیا اس نے مجھے اور میرے ان اعزہ واحباب کو جن سے میں نے مشورہ لیا مجبور کر دیا کہ اس نعمت غیر مترقبہ کو اور اس خدا کی دین کو جو واقعی اس نے مہیا کر دی ہے، قبول کر لوں۔ اور ۱۱ جون کے جہاز میں عازم یورپ ہو جاؤں۔ میرے یہ جدید کرم فرما نہیں چاہتے کہ میں شکریے کے الفاظ بھی زبان پر لاؤں۔ چہ جائے کہ ان کی فیاضی کی تعریف کروں۔ اس لیے میں خاموش ہوں۔ لیکن خدا خوب جانتا ہے کہ

الوداعِ اخیر

اپریل ۱۹۲۹ء کو "ہمدرد" کو ہمیشہ کے لئے بند کرنے کے موقع پر لکھا گیا۔

میں نے "ہمدرد" میں بہت سے اور بے حد طول طویل مضامین شائع کر کے قارئین "ہمدرد" کی سمع خراشی کی ہے خود بھی بہت کچھ رویا ہوں۔ اور بعض اوقات انہیں بھی کسی قدر رلایا ہے۔ مگر آج آخری بار ایک مضمون لکھ رہا ہوں اور ان کو الوداع کہہ رہا ہوں۔ قرین قیاس یہی ہے کہ آج "ہمدرد" کے جو معدودے چند قارئین کرام رہ گئے ہیں۔ اب ان کی آنکھوں کے آنسو بھی سوکھ چکے ہوں گے اور میں بھی اب نوحہ گری اور سوز خوانی سے تھک گیا ہوں۔ اس لیے اس آخری تحریر سے انہیں ایک بار اور رلانا ٹھیک نہیں یہ اور بات ہے کہ جس رفیقِ سفر کے ساتھ ایک مدت مدید سے اتنی منزلیں طے کی ہوں کہ اسے رخشِ عمر کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ اس سے رخصت ہوتے وقت میں خود بچشمِ پُرنم اسے الوداع کہوں۔ میں نے جب ۱۹۱۰ء میں ریاست بڑودہ کی ملازمت سے اس نیت سے علیحدگی اختیار کی تھی کہ اس سے زیادہ وسیع دائرے میں قدم رکھ کر ملک و ملت کی خدمت کیا کروں تو "کامریڈ" نکالنے کے لئے کلکتہ گیا تھا۔ اس وقت سے یہ خیال میرے دل میں تھا۔ کہ انگریزی ہفتہ وار تو حکومت کی خدمت میں عرضِ حال کرنے کے لئے ہو اور ہندوستان کی دوسری ملتوں کو بھی ملتِ اسلامیہ کے افکار و مطامح سے اس کے ذریعے سے باخبر رکھا جائے۔ اور ایک حد تک ہندوستان کے باہر کی اسلامی اور غیر اسلامی دنیا کو بھی افکار و مطامح سے آگاہ کیا جاتا رہے۔ لیکن سوائے ان مسلمانانِ ہند کے جو اردو سے ناواقف اور ناآشنا ہیں۔ باقی مسلمانانِ ہند کی خدمت کے لئے جو اس ملتِ مرحومہ کے سوادِ اعظم ہیں۔ ایک روزنامہ اردو بھی شائع کیا جائے۔ جب "کامریڈ" کی اشاعت شروع ہونے کے ایک ہی سال بعد حکومت نے کلکتے کو چھوڑ کر دہلی کو پھر دار الحکومت بنانے کی ٹھانی اور "کامریڈ" کے لیے اس اجڑے دیار میں اس وقت قارئین کرام کو اس پر آمادہ کیا کہ ہمدرد کو بھی جاری کرنے میں میری امداد فرمائیں تاکہ "کامریڈ" کے ساتھ ساتھ اس مطبع سے ٹائپ کے حروف میں روزنامہ "ہمدرد" بھی شائع ہو سکے۔ اور انہوں نے ہمیں پچیس ہزار روپے کے ڈبنچر میری استدعا پر پندرہ سال کے لیے خرید فرمائے اور میں "کامریڈ" "ہمدرد" پریس ۱۹۱۲ء میں قائم کر سکا اور ۱۹ ستمبر ۱۹۱۲ء کو دہلی پہنچ گیا۔ یہاں آتے ہی ایک نئی مصیبت کا سامنا کر

"ہمدرد"، ۱۲-اپریل ۱۹۲۹ء

جس وقت دہلی سے "کامریڈ" کا پہلا پرچہ نکلا۔ ترک جو ابھی جنگِ طرابلس کی مصیبت سے نکلنے نہ پائے تھے۔ جنگِ بلقان کی تازہ مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ بیروت سے جو نسخ کا ٹائپ منگایا گیا تھا وہ دیر میں آیا اور اس پر بھی ضرورت سے کم آیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک عرصے تک "ہمدرد" نہ نکل سکا۔ اور اس کا ایڈیٹوریل عملہ اس تمام عرصے میں بے کار رہا اور مصارف برابر جاری رہے۔ لوگوں کے اصرار پیہم سے مجبور ہو کر جو کچھ ٹائپ موجود تھا۔ اسی سے کام لیا گیا۔ اور ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء سے ایک ایک ورقہ نقیب "ہمدرد" بن کر آنے والے "ہمدرد" کی منادی کرنے لگا۔ اس وقت اس ایک ورقہ نے اپنا تعارف قارئین کرام سے ان الفاظ میں کرایا تھا۔

"ہماری شرم ساری اور محجوبی کا یہ عالم ہے کہ چلمن سے پردے کی نوبت پہنچتی جاتی ہے تاہم خیریت ہے کہ ہم سر اور ہم چشم احباب کے شکووں میں ایک طرح کی تلخ شیرینی ہوتی ہے "یہ اگر یہی رہیں تو مزا آتا ہے، اگر بند ہو جائیں تو یاد آتی ہیں مگر قوم کے بزرگ مخدوم کی شکایت سننے کا زہرہ نہیں۔ ہم اپنے احباب کو طوعاً نہیں تو کرہاً راضی بھی کر لیتے۔ لیکن جناب قبلہ و کعبہ وقار الملک بہادر مدظلہٗ کا والا نامہ جو ابھی موصول ہوا ہے ایک ایسی زبردست تحریک ہے جس نے صبر و شکیبائی کے آخری بند توڑ ڈالے اور ہمدرد کو بنیان اور شلوار ہی پہنے خلوت کدے سے ویسے ہی نکل کر برہنہ پا دوڑنا پڑا"

جب بیروت سے کافی ٹائپ آگیا تو "ہمدرد" کی بسم اللہ ہوئی۔ اس وقت "ہمدرد" نے جن الفاظ میں اپنا تعارف کرایا تھا انہیں بھی اختصار کے ساتھ آج پھر دہرائے دیتا ہوں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ "ہمدرد" آج اخباری دنیا میں قدم رکھتا ہے مگر سہما ہوا کہ ننگِ وجود نہ ثابت ہو۔ عالمِ فکر سے عالمِ ذکر میں آتے آتے کم و بیش دو سال لگے تھے تو عالمِ ذکر سے عالمِ عمل میں آتے آتے ایک سال سے کچھ زیادہ ہی لگ گیا۔ جو حضرات "ہمدرد" کے جلوس کا تماشہ دیکھنے لبِ بام آگئے تھے۔ انہوں نے نقیبِ ہمدرد کی آواز بھی سنی ہو گی۔ اور انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ "ہمدرد" کی سواری اس قدر دیر میں کیوں آئی۔ کہ آہستہ خرام کے حکم پر عمل کرتے کرتے اس نے اپنے تماشائیوں کو جھلا کر مخرام کہنے پر مجبور کر دیا۔ اسی داستان گو نے دوسری اور تیسری شب کی کہانی میں ساری آپ بیتی سرگزشت سنا دی ہے اس لیے از سرِ نو معذرت غیر ضروری ہو گئی ہے۔ اگر ہماری مجبوریوں کا یقین نہ آتا ہو تو ایک بار خود سوچ لیجئے کہ اس نو وارد کے اس قدر انتظار دکھانے میں صرف شماتتِ ہمسایہ ہی نہ تھی بلکہ نقصانِ سرمایہ کو بھی بہت کچھ دخل تھا۔ مگر کار فرمائے حقیقی کی اس میں بھی کوئی مصلحت ہو گی۔ سلطنت عثمانیہ پر جو طوفان نازل ہوا ہے۔ اس نے اخباری دنیا میں بالعموم ابر نیساں کا کام دیا۔ اور بہت سی کھیتیاں آج اسی کے طفیل لہلہا رہی ہیں۔

ممکن ہے کہ ہماری خشک سالی ہی ہمارے لیے باعثِ رحمت ہو اور شاعر کا وعدہ پورا ہو کہ ؎

آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

اخباروں کی گرم بازاری عاشق کے گھر کی رونق سے کسی طرح کم نہیں، دونوں ایک ہنگامے پر موقوف ہوں اور دونوں کے لئے ع

مولانا محمد علی

رئیس وفد خلافت (لندن) سنه ۱۹۲۱ء

نوحۂ غم ہی سہی ، نغمۂ شادی نہ سہی

چونکہ "ہمدرد" کے نکلنے تک جنگِ بلقان کا خاتمہ ہو چکا تھا اور چونکہ کم از کم مسلم اخبارات کے خریدار زیادہ تر جنگ و جدال اور حرب و قتال کی ہی خبروں سے محظوظ ہوا کرتے ہیں۔ ان کا فروخت کرنے والا صحیح طور پر شاعر کی طرح کہہ سکتا ہے کہ

من قاش فروشم دلِ صد پارۂ خویشم!

اس لیے اس وقت "ہمدرد" کا جاری ہونا ایک منڈی کے بازار میں سودا کرنے کا مترادف تھا۔ اس لیے میں نے لکھا تھا کہ "ہمدرد" نوحۂ غم سے بھی گھر کی رونق نہیں بڑھا سکتا۔ اس سے جہاں ہر شخص کو ایک بدیہی نقصان نظر آئے ہمیں ایک بیش بہا فائدے کی بھی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یعنی قومی ماتم پر نئی تہذیب کی تحسین و آفرین کا شبہ اور سینہ کوبی پر تالیوں کا دھوکہ نہیں ہو سکتا۔ جو حضرات قومی اقبال کے جنازے کو کاندھا دینے آئے تھے انہیں ہم اپنا تختِ رواں بردار نہیں بنا سکتے۔ اس لیے تشنہ لب جب کبھی مست ہو سکیں گے تو کہہ سکیں گے کہ ؎

مست ہیں جس مے سے ہم اس مے کا پیمانہ نہیں
منتِ ساقی نہیں غوغائے مے خانہ نہیں

یہ آج سے سولہ برس پہلے کی عبارت ہے۔ قارئین کرام غور فرمائیں اور کہیں کہ کیا یہ "ہمدرد" کے لئے ایک صحیح پیشین گوئی نہ تھی۔ بیروت کا نسخ کا ٹائپ مسلمانانِ ہند میں مقبول نہ ہو سکا تو سال بھر نقصان اٹھا کر میں نے لیتھو کی دو مشینیں خریدیں۔ اور جلد ہی سے رجعتِ قہقری کر کے دورِ حجر کی طرف عود کیا۔ لیتھو کا خطِ نستعلیق بے شک مقبول ہوا۔ اور روزانہ اشاعت بڑھنے لگی۔ اس کے مہینے دو مہینے کے بعد جنگِ عمومی کا افتتاح ہوا اور اب تو "ہمدرد" کی اشاعت ایک سال کے اندر دس ہزار تک پہنچ گئی مگر ۱۵؍مئی ۱۹۱۵ء میں اس کا مالک اور اڈیٹر معہ اپنے بڑے بھائی مولانا شوکت علی کے نظر بند ہو گیا۔ اور اس کے ماہ بعد "ہمدرد" پر ایک ایسا سنسر بٹھا دیا گیا۔ جس کا فرضِ منصبی بظاہر یہ قرار دیا گیا تھا۔ کہ وہ جلد سے جلد "ہمدرد" کو بند کرا دے "کامریڈ" ترکوں سے جنگ شروع ہوتے ہی پریس کی ضمانت ضبط کئے جاتے پر نومبر ۱۹۱۴ء سے بند ہو چکا تھا۔ اور ضمانت دی گئی تھی بند ہو گیا، ایک عرصے تک اس امید پر کہ نظر بندی سے رہائی مل جائے گی، میں کوچہ چیلان کے اس مکان کا جس میں پریس بھی تھا، اخباروں کا دفتر بھی تھا اور میں خود بھی رہتا تھا کرایہ برداشت کرتا رہا۔ حالانکہ کرایہ اس وقت ایک سو پینتیس روپے ماہوار تھا۔ اور مجھے حکومت کی طرف سے اپنے اور اپنے بال بچوں اور دیگر متعلقین کے ماہوار خرچ کے لیے دو سو پچاس روپے کی گراں قدر رقم ملا کرتی تھی۔ مئی ۱۹۱۵ء سے نظر بندی، قید، رہائی، تحفظ خلافت کے لیے سفرِ یورپ، ترکِ تعاون اور سارے ہندوستان کا گشت اور پھر ستمبر ۱۹۲۱ء میں گرفتاری، کراچی کا مقدمہ اور دوبارہ قید اور اگست ۱۹۲۳ء کے اواخر میں رہائی کی داستان دہرانا فضول ہے۔ ہندوستان میں لوگوں کا حافظہ بظاہر زیادہ قوی نہیں۔ لیکن تو آج بھی شاید ملک و ملت کو یاد ہو کہ جب قید و بند سے دوبارہ رہائی ملی تو چند ماہ تک پھر سارے ملک میں گشت لگانے ملک و ملت کی حالت بدل چکی تھی۔ آج "ہمدرد" کے بعض ہم عصر جن حضرات کی ملک پروری اور مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی رفاقت کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ اس وقت یہی ہم عصر ان کی سنگھٹنی ذہنیت اور شدھی میں ان کی سرگرمی

اور اس کے جواب میں قطعی تعلیم اور تسلی [illegible] "ہمدرد" کو زندہ کیا جائے۔ اور اس "دوج" کی جوڑی نے ایک بار اور اکتوبر، نومبر ۱۹۲۴ء میں جنم لیا۔ ہمدرد کی دوسری بسم اللہ کرتے وقت میں نے عرض کیا تھا کہ میں تو ایک گدائے بے نوا ہوں، بے سروسامانی میرا سامان ہے۔ میرے پاس اگر کوئی پونجی ہے تو صرف اس قدر کہ دل میں چند ارادے اور دماغ میں چند افکار ہیں جن کی تکمیل کا بھروسہ خداوند کریم کی توفیق فرمائی پر ہے۔ اس کے سوا نہ کوئی ساز رکھتا ہوں نہ کوئی سامان۔ اس پونجی کو لے کر بازارِ جہاں میں نکلا ہوں۔ ان چند ارادوں اور چند افکار کے سوا میرے ہاتھ خالی ہیں۔ نہ تو میری جیب میں دولت ہے۔ جس کا مجھے غرور ہو، نہ میرے پاس طاقت ہے۔ جس کا مجھے گھمنڈ ہو۔ نہ اعوان و انصار کی کوئی فوج ہے جس پر بھروسہ ہو۔ اس لیے میں نے اپنے کارساز سے التجا کی تھی کہ میں پرانی آرزوؤں اور تمناؤں کو لے کر صرف تیری نصرت فرمائی پر بھروسہ کر کے پھر اٹھتا ہوں میری مدد فرما کہ ان کی تکمیل کر سکوں اور جو ارادے اور خواہشیں میرے دل میں مدت سے پرورش پا رہی ہیں، ان کی تکمیل کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ عطا فرما کہ آگے قدم بڑھا سکوں۔

میں ایک بار پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور آج "ہمدرد" کو بند کرتے ہوئے پھر عرض کرتا ہوں۔ کہ میں اپنے کارساز سے شکوہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اور شکر ہی میرا شعار ہونا چاہیئے۔ بلاشبہ میری نیت ہی میں کچھ نہ کچھ کھوٹ ہوگی کہ اس وقت تک میری دعا قبول نہ ہوئی۔ اور جن چیزوں کو مجھے اپنی پرانی آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کے لئے ضرورت تھی وہ عطا نہ ہوئی۔ "ہمدرد" کی مالی حالت کا رونا بار بار رویا جا چکا ہے۔ ۳۔ جون ۱۹۲۵ء کو میں نے "ہمدرد" کے ہمدردوں سے خطاب کے عنوان سے اس کی ساری سرگزشت "ہمدرد" میں شائع کر دی تھی۔ اس خطاب کا جو جواب ملا تھا۔ اس کا پتہ قارئین کرام کو اس مضمون سے چل گیا ہوگا۔ جو حج و زیارت و شرکت مؤتمر عالم اسلام کے لیے جاتے وقت میں نے "کشکول گدائی" کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ اور جو سالِ گزشتہ سے "ہمدرد" کی اڈیٹری اور پروپرائٹری سے الگ ہوتے وقت میں نے دوبارہ ۱۱ مئی کے پرچے میں شائع کرا دیا تھا جو "ہمدرد" کی عیدی کے عنوان سے ۳۱ مارچ ۱۹۲۷ء کو شائع کیا گیا تھا۔ اس عنوان سے ایک دوسرا مضمون ۱۰۔ اپریل ۱۹۲۷ء کو شائع کیا گیا تھا جس سے قارئین کرام کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ جس نتیجے پر بالآخر ۱۹۲۸ء میں پہنچا۔ اس پر دراصل ایک سال پہلے ہی پہنچ چکا تھا یعنی صحافت اور گشتی سیاست دونوں سے کنارہ کشی۔ یہ دراصل گوشہ نشینی نہ تھی۔ نہ ترکِ تبلیغ بلکہ مکہ سے ایک ایسے مدینہ کی طرف ہجرت کا مقصد، جہاں مجھے امید تھی کہ کم از کم کچھ لوگ میری بات سننے کے لئے زیادہ آمادگی کا اظہار کریں گے۔ اسی لیے اس عنوان سے ایک تیسرا مضمون ۲۷۔ اپریل ۱۹۲۷ء کو شائع کیا تھا۔ اور ظاہر کر دیا تھا کہ "ہمدرد" کو بند کرتے کے بعد میں کیا کروں گا۔ یہ سب مضمون سالِ گزشتہ یورپ جاتے وقت میں نے شائع کر دیئے تھے۔ ۲۹ فروری ۱۹۲۸ء کو فسانہ غمِ دل" کے عنوان سے میں نے گزشتہ دو سال کے خسارے کا مکمل حساب شائع کر دیا تھا۔ اور اس کے بعد جو کچھ اعانت جمہورِ ملت نے کی وہ بھی برابر شائع ہوتی رہی۔ بالآخر ۲۔ مئی ۱۹۲۸ء کو میں نے قارئین کرام کو آج سے ایک بار پہلے بھی الوداع کہی اور ۲۵۔ مئی کو دہلی چھوڑ کر عازم یورپ ہوا۔

اس دن کے بعد آج تک میرا نام "ہمدرد" کے اڈیٹر کی حیثیت سے شائع نہیں کیا گیا اور میرا خیال تھا کہ اب جب کہ

گلڈ اشاعت گھر کی مطبوعات

مطبوعات پاکستان رائٹرز گلڈ (ادارۂ مصنفین پاکستان)

چائے والا (ناول)
اے حمید
قیمت ۴ روپے

زیر طبع
آبلہ پا (ناول)
رضیہ فصیح احمد

زیر طبع
بہو بیگم (ناول)
پرنسپل ابراہیم خاں

لال چادر (بنگالی ناول)
تصنیف سید ولی اللہ
ترجمہ یونس احمر
صفحات ۷۲
قیمت دو روپے ۵۰ پیسے

افسانے
تیسری منزل (افسانے)
ہاجرہ مسرور
صفحات ۳۷۶ قیمت ۵ روپے

سورج بھی تماشائی (افسانے)
انور
صفحات ۳۲۴
قیمت ۵ روپے ۵۰ پیسے

تھکے ہارے (افسانے)
خدیجہ مستور
قیمت ۵ روپے ۵۰ پیسے

علاقائی ادب
پونر پری آکاس
شیخ ایاز
کے سندھی کلام کا مجموعہ
قیمت ۸ روپے ۵۰ پیسے

ہاڑے
سائیں فیروز
کے پنجابی کلام کا مجموعہ
قیمت ۳ روپے ۵۰ پیسے

پنجابی لوک کہانیاں
مرتب شفیع عقیل
صفحات ۲۷۲
قیمت ۴ روپے ۵۰ پیسے

اردو میں سوانح نگاری
ڈاکٹر سید شاہ علی
(اس کتاب پر ۱۹۶۲ء میں داؤد پرائز ملا)
صفحات ۳۶۵
قیمت سات روپے

فصیل شب (ڈرامے)
میرزا ادیب
صفحات ۳۰۸
قیمت ۴ روپے

شاعری
ہفت کشور
اردو کے صاحب طرز شاعر جعفر طاہر کا
پہلا مجموعہ کلام جس پر ۱۹۶۲ء کا آدم جی ادبی
انعام دیا گیا
صفحات ۳۳۵ قیمت ۷ روپے

جاگتے جزیرے (مجموعہ کلام)
احسن احمد اشک
صفحات ۱۰۴ قیمت ۲/۵۰ روپے

صدا الصحرا (مجموعہ کلام)
یوسف ظفر
صفحات ۲۰۰
قیمت ۴ روپے ۵۰ پیسے

پاکستان رائٹرز گلڈ کا ترجمان
ماہنامہ **ہم قلم**
سالانہ قیمت ۶ روپے
فی پرچہ ۶۲ پیسے

ملنے کا پتہ: **گلڈ اشاعت گھر** — اسٹریچن روڈ — کراچی (۴)

بڑی مشکل سے اس کی پروپرائٹری سے پیچھا چھڑایا تھا، جو ایڈیٹری کی شماتت ہمسایہ کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے کہیں زیادہ نقصان اٹھا کر میں بچی مجھے مبتلا کرتی چلی آتی تھی۔ ممبر اینڈ ان دونوں پاپوں سے چھوٹ گیا۔ اب مولانا ظفر الملک صاحب نے انتظامی امور اپنے ہاتھ میں لیے تھے اور مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی اڈیٹری کے نگران تھے۔ میرے یورپ کے قیام میں اطلاعیں ملتی رہیں کہ مولانا ظفر الملک جس جفر رسی سے کام کر رہے ہیں اور روز بروز اخراجات کم کر رہے ہیں۔ مگر افسوس اس بات کی ایک اطلاع نہ آئی کہ آمدنی بھی بڑھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب میں ۶ ستمبر کو ہندوستان پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ پیہم نقصانات کے باعث "ہمدرد" کو بند کئے دیتے تھے مگر چونکہ میں ۲۲۔ اکتوبر کو عازم ہندوستان ہو چکا تھا۔ شوکت صاحب اور میرے ایک اور عزیز نے میرے واپس آنے تک نقصان کی ذمہ داری لی اور "ہمدرد" کو جاری رکھا۔ افسوس کہ اس عرصے میں ملک و ملت میں اور بھی انتشار پیدا ہو گیا تھا اور سہ

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

مجھے آتے ہی پٹنہ اور پھر کلکتہ جانا پڑا اور بہار کی مسلم آل پارٹیز اور آل انڈیا خلافت کانفرنسوں کی صدارت کرنا پڑی اور دہلی واپس آ کر بھی آل انڈیا مسلم کانفرنس میں حصہ لینا پڑا، اور مسلم لیگ میں مصالحت کرانے کی امید نے تو برا تک سے گھسیٹ بلایا۔ ابتدائے جنوری میں بھی "ہمدرد" کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ کیونکہ بعض احباب کا خیال تھا کہ "ہمدرد" بند کرنا کیسا "کامریڈ" کو بھی دوبارہ جاری کرنا چاہیئے۔ اور اس بار اسے بھی ایک روزنامے کی حیثیت سے نکلنا چاہیئے۔ مجھے آج تک پریس اور اخباروں کے لیے اچھے منیجر نہیں ملے اور غلام حسین مرحوم کے بعد سے "کامریڈ" کے لئے کوئی سب اڈیٹر بھی نہ مل سکا، حالانکہ میرے اعزہ اور احباب اچھی طرح جانتے ہیں کہ غلام حسین مرحوم کے نعم البدل نہ سہی معمولی سے معمولی جانشین کے لیے میں کہاں کہاں گھوم آیا ہوں۔ اس لیے میں نے اس تلخ تجربے کے بعد قطعی فیصلہ کر لیا کہ اگر مجھے کوئی آزاد چھوڑ دے گا تو اس کے اخبار کی اڈیٹری تو قبول کر لوں گا مگر خود کوئی اخبار اب نہ نکالوں گا۔ اور نہ نفع کا طالب ہوں گا اور نہ خسارے کے لیے ذمہ دار۔ جو حالتِ انتشار آج بھی باقی ہے اس کو دیکھ کر میں مسلمانوں سے بالکل مایوس ہوں کہ یہ کوئی اچھا اخبار نکال سکیں گے اور رفع انتشار کی امید میں مزید انتظار عین حماقت ہے۔

ابتدائے جنوری میں مولانا ظفر الملک صاحب مجھے حسابات سمجھانے دہلی تشریف لائے۔ میں نے خود ہی حسابات تیار کرا رکھے تھے۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ میرے ولایت جانے ہی باوجود اخراجات میں بے حد کتر بیونت کے آمدنی کے بے حد گر جانے سے خسارہ بڑھنے لگا۔ جون میں اگر دو سو روپے سے اوپر تھا تو جولائی میں چار سو کے قریب پہنچ گیا۔ اگست میں نقصان میں پچاس روپے کی کمی واقع ہوئی۔ تو ستمبر میں پچیس روپے اور بھی بڑھ گئے۔ اور اب سوا چار سو ماہوار کا نقصان ہونے لگا تقریباً یہی حالت میرے زمانے میں تھی۔ کہ اگر میں "ہمدرد" سے اپنے مصارف کے لیے ایک حبہ بھی نہ لیتا۔ تب بھی باقی عملے اور دیگر مصارف کے لیے پانچ سو روپے گھر سے دینے پڑتے۔ اکتوبر، نومبر اور دسمبر کے خسارے کے اعداد میرے پاس نہیں ہیں۔ بلکہ مولانا ظفر الملک ہی کے پاس بتائے جاتے ہیں۔ مگر میرا قیاس ہے کہ یہی تخمینہ ان مہینوں کے متعلق بھی صحیح ہو گا۔ بہر کیف اتنا تو معلوم ہے کہ میری غیر حاضری کے زمانے کے متعلق تین ہزار سے اوپر کی رقم واجب الادا ہے۔ ایسے حساب کا سمجھنا کچھ مشکل نہ تھا میں

اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا مگر جب دریافت کیا گیا کہ یہ واجب الادا رقم کس طرح ادا ہوگی تو مجھ سے کہا گیا کہ ہاں اب یہ سوال ہے کہ اسے کون ادا کر
ہیں سوائے اس کے کیا عرض کر سکتا تھا کہ یہ سوال کسی سے بھی کیا جائے یقیناً مجھ سے تو نہیں کیا جا سکتا۔ جسے قبول کیا گیا مگر آج تک ا
ایک حبہ بھی ادا نہیں کیا جا سکا۔ آئندہ کیا ہوگا۔ خدا کو معلوم ہے۔

میرے آنے کے بعد آمدنی کسی قدر بڑھی مگر پھر بھی دو سو روپے سے زیادہ کا خسارہ جنوری میں ہوا۔ فروری اور مارچ کے خسا
تقریباً ڈیڑھ سو روپے ماہوار کے حساب سے ہوئے۔ مگر چونکہ میں اس تمام عرصے میں "ہمدرد" کی خدمت سے بمبئی اور رنگون جا
کے باعث اور یہاں بھی مسلم لیگ کے جھگڑوں میں گھر جانے کے سبب سے محروم رہا۔ اس لیے اپریل کے ان چند دنوں کی صور
صاف بتا رہی ہے کہ خسارہ اور بھی زائد ہوگا۔ یاد رہے کہ میں نے واپس آنے پر بھی "ہمدرد" سے ایک حبہ اپنے اور اپنے اہل و عیا
کے مصارف کے لیے نہیں لیا ہے۔

اب سوائے اس کے کیا چارہ ہے کہ میں "ہمدرد" کو بند کر دوں۔ اور اس بہیم خسارے کے بارے میں سبک دوشی اختیار کر
میرا ارادہ تھا کہ میں دہلی میں ایک چھوٹے سے مکان میں قیام کرتا اور ہر روز تین گھنٹے یا ہفتے میں دو تین دن کسی کا کام کر کے اتنا پی
کرتا کہ میں اور میرے بال بچے قوت لایموت سے محروم نہ رہیں۔ باقی وقت خود کچھ سیکھتا۔ کچھ اپنی لڑکیوں اور بیوی کو سکھاتا۔ جن کی
سے میں طوعاً نہیں بلکہ کرہاً اب تک غافل رہا ہوں۔ اور جو وقت بچتا۔ اس میں ایک مفلس نادار شخص کی حیثیت کے مطابق ملک و
کا کام کرتا۔ مگر میری غیر حاضری میں میرا بہ حیثیت صدر جمعیتِ خلافت انتخاب کیا جا چکا ہے اور میں مجبور ہوں کہ امسال اور ملک
گشت لگاؤں۔ اور جمعیتِ خلافت کے مقاصد سے مسلمانوں کو آگاہ کر دوں۔ اور انہیں ہر گاؤں اور ہر شہر کے ہر محلے میں خلافت کمیٹ
اور بچوں کے لیے ابتدائی اور عمر رسیدہ لوگوں کے لیے شبینہ مدارس قائم کرنے پر آمادہ کر دوں۔ اور اس سلسلے میں کل انشاء اللہ پھر
جاؤں گا۔ اور وسط مئی میں وہاں سے واپسی پر انشاء اللہ مسلمانانِ جنوبی افریقہ کی دعوت پر وہاں جاؤں گا۔ اور ہندوستان آکر مختلف ص
میں اور بالخصوص سندھ اور پنجاب میں دورہ کروں گا۔

لیکن جو کام اب میں نے ساری عمر کے لیے اپنے لیے تجویز کر لیا ہے۔ خواہ وہ دہلی میں بیٹھ کر کیا جائے یا کہیں اور جا کر۔ وہ پہلے مسل
میں اور پھر ساری دنیا میں فکرِ اسلامی پیدا کرتے اور کفر و الحاد کے اس سیلاب کے مقابلہ کرنے کا ہے۔ جو یورپ سے وطن پرستی
جنسیت و قومیت کی شکل میں امڈا آ رہا ہے اور جو ترکی اور ایران شام اور عراق ہی نہیں بلکہ افغانستان اور ہندوستان میں بھی نوجوا
مسلمانوں کو خدا اور آخرت دونوں سے انکار کی طرف مائل کر رہا ہے۔ اسلام ہرگز حبِ وطن اور غیر مسلموں کے ساتھ آزادی او
اور بنی نوع انسان کی خدمت میں تعاون کرنے کے برخلاف نہیں اور اس معنی میں ہر مسلم کو ملک پرور اور محب وطن بننا لازمی ہے۔ او
نہ کرے کہ وہ دن آئے کہ مسلمانانِ ہند اپنی موجودہ غلامی پر راضی ہو جائیں۔ یا پھر اپنے غیر مسلم بھائیوں سے نفرت کو اپنے دلوں
جاگزین ہونے دیں۔ اور اس کے ساتھ ذرا سی بھی ناانصافی کو روا رکھنے لگیں لیکن کوئی مسلم اس محب وطن اور جنسیت و قومیت کا ہرگز
نہیں ہو سکتا جو عرب کو عجم سے ترک کو تاجیک سے یا ہندی کو افغانی سے جدا کرے۔ کان الناس امۃ واحدۃ فبعث اللہ النب

مبشرین و منذرین وانزل معہم الکتاب لیحکم بین الناس فی ما اختلفوا فیہ (خداوند کریم نے تمام انسانوں کو ایک ہی قوم بنایا تھا، پھر ان میں اپنے انبیاء اس غرض سے مبعوث فرمائے تھے کہ وہ نیکوکاروں کو فلاحِ دارین کی خوشخبری سنائیں اور بدکاروں کو دنیوی تباہی اور اخروی رسوائی سے ڈرائیں اور اسی لیے ان کے ساتھ صحفِ سماوی نازل فرمائے تاکہ جن امور میں لوگوں میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا ان میں سب کو راہِ راست دکھا کر اس اختلاف کو مٹائیں اور دنیا میں امن و آشتی قائم ہو)

یورپ کے جو نام نہاد سیاست دان اور مدبر اور مغرب کی نام نہاد تہذیب و تمدن کے نام لیوا بنی نوع انسان کو ملکوں، قوموں اور رنگتوں میں تقسیم کر کے ایک کو دوسرے کے خلاف ابھار رہے ہیں وہ حقیقتاً ایک شیطانی کام کر رہے ہیں۔ اور اگر وہ کامیاب ہو گئے تو اسلام جو ساری مخلوق کو بلا جبر و اکراہ آپس میں ملا کر دنیا میں امن و سلامتی کا دور دورہ قائم کرنے آیا ہے، سمجھ لو کہ وہ خدانخواستہ ناکام و نامراد رہا۔ اس لیے میں بار بار کہتا ہوں کہ خدا نے انسان کو بنایا اور شیطان نے قوم کو بنایا۔ یہی وہ فکرِ اسلامی ہے، جس کی نشر و تبلیغ ہر مسلمان کا فرض ہے تاکہ دنیا میں جنگ و جدال کا خاتمہ ہو۔ اور ساری خلقت بلا کسی تفریقِ حسب و نسب۔ مرز و بوم اور زبان و رنگ کے دینِ فطرت پر چلنے لگے۔ اور سارے عالم میں نورِ اسلام پھیل جائے۔ وہ نور جس کی تعریف میں سورۃ النور میں اسلام کے درخت کو اس زیتون کے نام سے پکارا گیا ہے۔ جو لا شرقیۃ ولا غربیۃ (نہ صرف مشرقی نہ صرف مغربی) ہے، جس نبی کو رب المشرقین و رب المغربین نے رحمت اللعالمین بنا کر کافۃ الناس کے لیے بھیجا تھا۔ اس کا دین انسانی سرشت ہے۔ فطرۃ اللّٰہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللّٰہ۔ وہی حضرت آدم کا دین تھا۔ وہی ان کے بعد سب انبیائے کرام کا دین تھا۔ وہی رسول اکرم صلعم کا دین تھا اور وہی آج ہر مولود کا دین ہے خواہ وہ کسی مسلم کے گھر پیدا ہوا ہو یا کافر کے گھر۔ لوگوں نے دینِ فطرت کو چھوڑ کر قوموں اور ملکوں کے جداگانہ دین بنائے ہیں اور جداگانہ نام نہاد تہذیبیں گھڑ لی ہیں۔ اور کل حزب بما لدیہم فرحون۔ ہر ایک اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے ہوئے اپنی ڈفلی پر اپنا ہی راگ بجا رہا ہے۔ ہمیں عصرِ نو کی اس فکرِ جنسیت کو دنیا سے مٹانا اور تمام دنیا کو ایک کر کے جنگ و جدل کی جگہ اسلام اور سلامتی کو پھیلانا ہے۔ افسوس ہے کہ میں اب تک اس کام میں بھی ناکام رہا اور سے

یک الفتِ بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

لیکن اب تو اسے گریباں سمجھ چکا ہوں۔ پھر دستِ وحشت کو کس طرح روک سکتا ہوں۔ کہ اسے چاک نہ کرے۔ صیقلِ آئینہ کی کمی اور بیشی خدا کے اختیار میں ہے۔ قارئین ہمدرد سے اب رخصت ہوتا ہوں اور ان سے التجا ہے کہ میرے آئینہ قلب کی صیقل اور دستِ وحشت کی کامیابی کے لیے دعا فرمائیں کہ یہ گریباں ایک نہ ایک دن چاک ہی ہو کر رہے۔ برما اور جنوبی افریقہ کی دعوتوں پر وہاں جا رہا ہوں۔ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس دعوت و تبلیغ میں میری کس حد تک امداد فرمائیں گے واپسی پر معلوم ہوگا۔ کہ مزید صحرا نوردی اختیار کرنا چاہیے یا غارِ حرا میں خلوت، جمہور کی اصلاح کی کوشش سے بھلا کوئی کس طرح مستغنی ہو سکتا ہے مگر باوجود اس کے آج بھی اس فقیر بے نوا کا وہی قول ہے کہ سے

مست ہیں جس مے سے ہم اس مے کا پیمانہ نہیں
منتِ ساقی نہیں، غوغائے مے خانہ نہیں

میرے لیے ساقی کوثر کافی ہے۔ اسی سے التجا ہے کہ ؂

جو دوسخائے ساقیٔ کوثر کی دھوم ہے
اک جام ہم کو بھی جو عطا ہو تو جانیے (جوہر)

اب میں قارئین "ہمدرد" کو الوداع کہتا ہوں۔ میں نے جس کسی کا قصور کیا ہے اس سے استدعا ہے کہ وہ مجھے معاف کرے نہیں تو اسے اختیار ہے کہ جو جی چاہے مجھے کہہ لے۔ مگر میرے لیے دعا ضرور کرے کہ خدا مجھے حق گوئی، حق نگاری اور حق پرستی کی توفیق عطا فرمائے اور میرے بے شمار گناہوں کو معاف کرے۔

افوض امری الی اللہ علیہ توکلت والیہ اُنیب

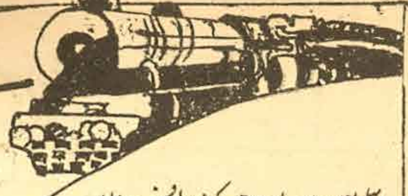

ریلوے کے مسافروں کے لیئے

آرام گاہیں

پہلے اور دوسرے درجہ کے مسافروں کی آسائش کے لیے پاکستان ویسٹرن ریلوے نے لاہور، راولپنڈی، ٹیکسلا، کوئٹہ، کراچی شہر اور کراچی چھاؤنی ریلوے سٹیشنوں پر آرام گاہیں مہیا کر رکھی ہیں - ان آرام گاہوں میں علیحدہ علیحدہ سونے کے کمرے اور غسل خانے موجود ہیں - جو عمدہ قسم کے سامان رہائش و آرائش سے آراستہ ہیں -

مختلف سٹیشنوں پر مختلف قسم کے رہائشی کمروں کے لیے مندرجہ ذیل کرائے مقرر ہیں -

نام سٹیشن	۲۴ گھنٹے یا اسکے کسی حصہ کا کرایہ
کراچی شہر	۱- ایک فرد کے رہائشی کمرے کے لیے: پانچ روپے ۲- دو افراد کے رہائشی کمرے کے لیے: آٹھ روپے
کراچی چھاؤنی	۱- ایک فرد کے رہائشی کمرے کے لیے: پانچ روپے ۲- دو افراد کے رہائشی کمرے کے لیے: آٹھ روپے
لاہور	ایک فرد کے رہائشی کمرے کے لیے: پانچ روپے
کوئٹہ	۱- ایک فرد کے رہائشی کمرے کے لیے: پانچ روپے ۲- دو افراد کے رہائشی کمرے کے لیے: آٹھ روپے ۳- فی بستر: تین روپے
راولپنڈی	۱- ایک فرد کے رہائشی کمرے کے لیے: پانچ روپے ۲- دو افراد کے رہائشی کمرے کے لیے: آٹھ روپے ۳- فی بستر: تین روپے
ٹیکسلا	۱- ایک فرد کے رہائشی کمرے کے لیے: پانچ روپے ۲- دو افراد کے رہائشی کمرے کے لیے: آٹھ روپے

مزید تفصیلات کے لیے ریلوے اوقات و کرایہ نامہ کا صفحہ ۱۴۶ ملاحظہ کریں یا متعلقہ سٹیشن ماسٹر سے ملیں -

پاکستان ویسٹرن ریلوے

حیات افروز اور روح پرور کتابیں

دو عظیم تاریخی شاہکار

شاہجہاں مغل تاجداروں میں جو لازوال اور عظیم تخلیقی کارنامے انجام دیے ہیں وہ تاریخ میں ایک قیمتی اثاثہ اور قیمتی سرمایہ ہیں۔ رئیس احمد جعفری نے اس عظیم فرمانروا کے تاریخی دربار کی ایک ایسی داستان مجت پیش کی ہے جو تاج محل کی طرح امر اور لال قلعہ کی طرح عظیم ہے۔ قیمت بارہ روپے

بابر مغلیہ فرماں روایان ہند کا سب سے پہلا اور اولالعزم فاتح اور کشور کشا۔ یہ ایک نہایت دلچسپ تاریخی ناول ہے قیمت ساڑھے دس روپے۔

بعض تاریخی کتابوں کے نئے ایڈیشن

ملک کے عظیم اور مایہ ناز مورخ، ادیب اور انشا پرداز رئیس احمد جعفری کے حسب ذیل تاریخی شہ پاروں کے متعدد ایڈیشن طبع ہو کر ختم ہو چکے تھے۔ اب ان کتابوں کے حقوق ہم نے حاصل کر لیے ہیں چنانچہ مندرجہ ذیل نئے ایڈیشن فوری طور پر پیش کیے جا رہے ہیں۔

سومنات	علاؤ الدین خلجی	غدر
۱۰ روپے	نو روپے	پانچ روپے

احمد شاہ ابدالی

۱۰ روپے

ہمارے نئے مطبوعات

ناہید وحشی محمود آبادی کا دلکش اور رومان سے بھرپور ناول
قیمت پانچ روپے

تاجدار غرناطہ غافل اکبرپوری کا معرکتہ الآرا تاریخی ناول ایک حیرت خیز، سنسنی خیز اور معجز نما کردار کی کہانی۔ مسلمانوں کی شوکت کا آ[...] قسمت کے کھیل۔ محبت کا جادو۔ ایک مرتبہ شروع کرنے کے بعد ختم کیے [...] چین نہیں آتا۔

قیمت چھ روپے

ہمارے دوسرے بہترین مطبوعات

اجنبی	از شہر بانو	اصلاحی ناول قیمت تین [...]
ایک ہی راستہ	از کیپٹن ظہور ملک	بہترین ناول " چھ [...]
مولانا مودودی سے ملیے	" اسعد گیلانی	سوانحی خاکہ " چھ روپے [...]
کتاب انقلاب	" اسعد گیلانی	انشائیہ " ایک [...]
انتظار	" اسعد گیلانی	روح پرور پیام " ایک [...]
چوکھٹے کے اندر	" ازام فاروق	شعور اسلامی کی دعوت " [...]
اسلام اور جدید مسائل	ابوالاعلیٰ مودودی	" ۳۰ [...]
تحسین	" قیسی رام پوری	سماجی ناول رنگین [...]
ماجدہ	" وحشی محمود آبادی	معاشرتی ناول قیمت [...]

ملنے کا پتہ

بساطِ ادب — چوک انارکلی لاہور

ماں جی

قدرت اللہ شہاب کا غیر فانی تاثراتی شاہکار

قدرت اللہ شہاب نے نثر میں ماں کا نوحہ لکھا ہے۔ اردو زبان میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے۔ اس درجہ اثر آفریں، رقت خیز اور سوز و گداز سے معمور کہ پتھر کا دل بھی موم ہو جاتا ہے۔ یہ تاثراتی خاکہ بلاشبہ قدرت اللہ شہاب کے خامۂ اعجاز آفرین کا لازوال کارنامہ ہے جس پر بجا طور سے اردو زبان فخر کر سکتی ہے اور خود شہاب صاحب بھی فخر کر سکتے ہیں۔

قیمت ۵٫۵۰ روپے

فہمی

یہ کہانی رئیس احمد جعفری کے جادو نگار قلم نے لکھی ہے۔ اس شخص کے قلم میں واقعی جادو ہے۔ جب چاہے رلا دے، جب چاہے ہنسا دے۔ مکالمات کی برجستگی، زبان کی حلاوت، انداز بیان کی شیرینی، ان سب چیزوں نے مل کر اس کہانی کو قیامت بنا دیا ہے۔

یہ ایسی دل دوز، جگر فگار اور ساتھ ہی ساتھ نتیجہ خیز کہانی ہے جس سے تعمیر حیات میں مدد مل سکتی ہے، جو ایک پیام بھی ہے ایک مقصد بھی۔ ایک منزل بھی اور ایک راستہ بھی۔ اس میں محبت کے آنسو بھی ہیں اور مسرت کے نغمے بھی۔ شعلے بھی ہیں اور پھول بھی۔ موسم بہار بھی اور موسم خزاں بھی۔ زندگی کی راحت بھی اور زندگی کی اذیت بھی۔۔۔

قیمت : سات روپے

بہترین کتابیں

تاریخ

اسلام کے غازی یورپ میں	رئیس احمد جعفری	۵٫۵۰	منگول	رئیس احمد جعفری
فتح قسطنطنیہ	″	۵-۰۰	صلیبی جنگیں	″
نام راج سے رام راج تک	″	۶-۰۰		

ناول

زرینہ	رئیس احمد جعفری	۶٫۵۰	اجالا	قیسی رامپوری
سہیلہ	″	۷-۰۰	حنا	″
مہمان خانہ	انتظار حسین	۵-۰۰	دارا شکوہ	اختر یونس
دشمن	″	۵٫۵۰	چاند	ملکہ معین
شیشوں کا مسیحا	″	۴-۰۰	مجبور	ابن انشا
جاگی وارڈ میں	محمد خالد اختر	۴٫۵۰	طوفان کی رات	اے حمید
امراؤ جان ادا	مرزا رسوا	۳-۰۰	سفر نامہ ابن جبیر	
دلہن	محمود ریاض	۵-۰۰	ممنوعہ لٹریچر	ابراہیم جلیس
مغل اعظم	اختر یونس	۵-۰۰	توبۃ النصوح	مولوی نذیر احمد
ہلاکو خاں	″	۴٫۵۰		

ادبیات

قواعد اردو	مولوی عبدالحق	۵-۰۰	رستم سہراب (ڈرامہ)	آغا حشر کاشمیری
انتخاب کلام میر	″	۴٫۵۰	اردوئے معلیٰ	غالب
خطبات مدراس	سید سلیمان ندوی	۳-۰۰	اسلامیات: رحمت عالم	سید سلیمان ندوی
پرچھائیاں	ساحر لدھیانوی	۱٫۲۵	نظم: چینی نظمیں	ابن انشا
موج مری صدف صدف	مصطفیٰ زیدی	۳٫۵۰	شہر آذر	مصطفیٰ زیدی

لاہور اکیڈمی

۲۰۵- سرکلر روڈ، لاہور

ٹرکش میڈیکل مشن

پہلی جنگ عظیم سے پہلے جب دولِ مغرب نے ترکوں کو یورپ سے جلا وطن کر دینے کا منصوبہ
بنایا تھا اور ان کی ماتحت بلقانی ریاستیں ان کے خلاف اعلانِ جنگ کر رہی تھیں ،
یونان نے انگریزوں کی شہ پا کر سرزمینِ ترکیہ کو مسلمانوں کے خون سے لالہ زار بنا دیا تھا
ترک مٹ رہے تھے ، کٹ رہے تھے ، مر رہے تھے ۔۔۔ لیکن لڑ رہے تھے ۔
اس وقت محمد علی نے "کامریڈ" میں ایک سلسلۂ مقالات شروع کیا ، ترکی میں میڈیکل مشن بھیجنے
کے لیے سرمایہ کی اپیل کی ، اور جب سرمایہ فراہم ہو گیا تو ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں ایک وفد
روانہ ہو گیا جس کے ارکان میں خلیق الزماں ، شعیب قریشی ، عبدالرحمٰن صدیقی ، عبدالعزیز انصاری
۔۔۔ اور عبدالرحمٰن پشاوری وغیرہ تھے ۔
اگلے صفحات ٹرکش میڈیکل مشن کی گم شدہ تاریخ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

ڈاکٹر انصاری کا خط ترکی سے

جمعہ ۶ جون ۱۹۱۳ء

اس ہفتہ ڈاکٹر انصاری کا اور بھی دلچسپ خط موصول ہوا ہے۔ جس کے ساتھ چند بہت ضروری کاغذات بھی ہیں۔ ...
آئندہ شائع کئے جائیں گے۔

ترکی میں کبھی کبھی غیر متوقع واقعات بھی پیش آجاتے ہیں، مسلم بنک اور کواپریٹو سوسائٹی کی تجویز عملی صورت پکڑتی جا...
ہے۔ اور کمیٹی کی اسکیم کو قابل عمل بنائی جاتی ہے انجمن مدافعہ ملیہ جو ترکی افواج کی رسد رسانی کا بہت زیادہ کام کر رہی ہے۔ ا...
دوسرے معاملات میں بھی بہت کچھ کر رہی ہے۔ وہ عنقریب ۲۵ ہزار پونڈ مسلم بنک میں حصص خریدنے کے لئے جمع کروا...
والی ہے۔ اس فیاضانہ عطیہ کی بدولت کواپریٹو سوسائٹی عملی صورت میں آگئی۔ اب صرف ۲۵۰۰۰ پونڈ اور جمع ہو جائیں...
سوسائٹی جاری ہو سکتی ہے۔ سوسائٹی کے قواعد تیار ہو جانے کے بعد فوراً "سلطانی ارادہ" شائع ہو جائے گا۔ اس کے بعد پر...
تیار کر کے مختلف اسلامی ملکوں کو بھیجے جائیں گے۔ تاکہ وہاں حصص فروخت ہوں تو خیال کر سکتے ہو کہ کواپریٹو سوسائٹی اور بنک...
اثرات کس قدر وسیع ہوں گے۔ اور اس کی وجہ سے ترکی اور دیگر اسلامی ممالک کی مردہ صنعت و حرفت کس قدر ترقی کرے گی۔ د...
فوری سوال مدینہ یونیورسٹی کا ہے۔ مرکزی کمیٹی کا ایک جلسہ اس ہفتہ ہوا تھا۔ جس میں اکثر وزراء ترکی کے بہت سے اصحاب اس...
شریک تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں ترکوں کو کس قدر دلچسپی ہے۔ وزیر اوقات نے کسی قدر دلچسپی ظاہر کی اور ان کی تو...
خواہش تھی کہ جس قدر جلد ہو سکے یونیورسٹی قائم ہو جائے۔ نظام نامہ پر (جس کی نقل تمہیں بھیجتا ہوں) بحث ہوئی اور منظور کر لیا گیا۔ ک...
ٹیوشن کمیٹی کے ممبر مقرر کئے گئے۔ جس میں میں اور مسٹر ظفر علی خاں بھی شامل ہیں۔ شیخ عبدالعزیز شاویش جو اس تحریک کے روح رو...
ہیں۔ غالباً یونیورسٹی کے پرنسپل مقرر ہوں گے۔ ہم تمہیں تار دے چکے ہیں۔ اور ہمیں امید ہے کہ تم نصاب و نظام یونیورسٹی...
ترتیب میں پوری محنت کرو گے۔ اور کوئی بات اٹھا نہ رکھو گے۔ جو علی گڑھ یونیورسٹی کی طرز پر ہونا چاہئے۔ مقامی ضروریات کا خاص...
رکھا جائے۔ اور یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ عربی زبان میں تعلیم دی جائے گی۔ مہربانی کر کے مولانا شبلی نعمانی، ڈاکٹر اقبال، میجر بلگرامی، مولوی...
الدین صاحب اور جن اصحاب کو تم مناسب سمجھو سب سے مشورہ کر لو۔ شیخ شاویش صاحب نے لندن اور مصر کے بعض اصحاب سے
درخواست کی ہے کہ وہ مسودہ نصاب تیار کریں۔ ان تینوں مسودوں کے آجانے پر کمیٹی جو نصاب سے زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کو...
کر کے اس کی بنا پر خود ایک نصاب بنائے گی۔ ہندی عثمانی انجمن نوآبادیان کے دو جلسے اور ہو چکے ہیں۔ اور قواعد کا ایک مسودہ...
کر لیا گیا ہے۔ جو وزیر داخلہ کی منظوری کے لئے پیش کیا جائے گا۔

حاجی عادل نے ہمیں اناطولیہ میں زمینوں کی ایک فہرست دی ہے جو فی الحال حکومت کے پاس ہیں اور جنہیں وہ نوآبادیو...
لئے دے گی۔ انگورا میں ریلوے کے قریب ۲۵ ہزار ایکڑ زمین مل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ادرنہ میں ایک بہت ہی بیرا...

ڈاکٹر انصاری کا خط

قسطنطنیہ ۳۰ مئی

چارشنبہ ۱۸ جون ۔ ۱۹۱۳ء ۔

طلعت بے اور ڈاکٹر اسد پاشا کی کوششوں کا مشکور ہونا چاہیئے۔ کہ ان کی بدولت گورنمنٹ نے سرکاری طور پر "سوسائٹی نوآبادیان مہاجرین مقدونیہ" کو منظور کر لیا۔ چار شخصوں کی کمیٹی بن گئی ہے جس میں میں اور مسٹر ظفر علی خاں بھی شامل ہیں ہم سب آئندہ جمعہ کو اناطولیہ جاتے ہیں۔ جہاں ہم نوآبادیوں کے لئے ایک ۔ ایسی مناسب جگہ تجویز کریں گے۔ جہاں زراعت حفظان صحت اور کفایت شعاری کا بھی لحاظ رہ سکے۔ مدینہ یونیورسٹی کا نصاب تیار کرنے کے لئے ہم انگلستان، مصر اور ہندوستان کے مجوزہ نصاب کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس عرصہ میں کانسٹی ٹیوشن کمیٹی ابھی بہت کچھ ضروری کام کرنے میں مشغول ہے۔ اور تاریخی نصاب سائنس اور دینیات کے صیغوں کے متعلق اس نے تیار بھی کیا ہے۔ سب سے زیادہ دشوار کام ایسے پروفیسروں اور اسسٹنٹ پروفیسروں کا مہیا کرنا ہوگا۔ جو عربی میں سائنس پڑھا سکیں۔ ایک دفعہ یونیورسٹی جاری ہو جائے خواہ کچھ زیادہ بڑی پیشانی پر نہ ہو پھر تو وہ کامیاب ہو ہی رہے گی۔ مجھے یقین ہے۔ کہ ہر مسلمان اس یونیورسٹی کا خیر مقدم کرے گا۔ کیونکہ اسلامی دنیا میں یہ ایک عظیم الشان اتحاد ہوگا۔ بعض لوگوں کے خطوط میرے پاس آرہے ہیں۔ کہ ہمارے لئے کچھ ترکی یتیموں کو ہندوستان لیتے آنا۔ مجھے کچھ شک نہیں ہے۔ کہ لوگوں کی یہ خواہش اس شریفانہ خیال پر مبنی ہے۔ کہ ان غریب خانماں برباد یتیموں کی پرورش کریں۔ لیکن ان کی خواہش کا پورا کرنا ناممکن ہے۔ کہ یہ تمام یتیم سرکاری یتیم خانوں میں بھیج دیئے جاتے ہیں۔ اور اس لئے نہیں مل سکتے۔ میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ دونوں مشن مئی کے آخر میں بند کر دیئے جائیں۔ اور سب ممبر سوائے ان لوگوں کو جو نوآبادیوں کے کام کے لئے یہاں رہنا چاہیں۔ وسط جون میں یہاں سے روانہ ہو جائیں۔

میں ۴۵ ہزار ایکڑ زمین دستیاب ہو سکتی ہے۔ لیکن یہاں کی آب و ہوا زیادہ گرم ہے اور مقدونیہ سے آئے ہوئے مہاجرین کو راس نہیں آئے گی۔ بروسہ اور قونیہ کے قریب بھی بیس اور پچیس ہزار ایکڑ کے درمیان زمین مل سکتی ہے۔ اناطولیہ میں دورہ کرنے سے پیشتر ہم صرف سوسائٹی کے قواعد کی وزیر داخلہ سے باقاعدہ منظوری ملنے کے منتظر ہیں۔ امید ہے کہ ہمیں ایک ہفتہ سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ میں تم کو اپنے مشن کے ان ممبروں کے نام بتا چکا ہوں۔ جو کام کی نگہداشت کرنے کی غرض سے وسط ستمبر تک قیام کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن تمہیں اب قابل آدمیوں کی تلاش میں رہنا چاہئے۔ جو یہاں اگست کے آغاز میں پہنچ سکیں تاکہ جب پرانے ممبر سبکدوش ہوں تو نئے آدمیوں کو کام میں کسی قسم کی دقت محسوس نہ ہو۔ بسیم عمر پاشا کو دیہات اور جھونپڑیوں کا عام نقشہ تیار کرنے کے واسطے ایک ماہر فن دستیاب ہو گیا ہے۔ ہر ایک گاؤں سو مکانات۔ ایک مسجد، ایک مدرسہ، ایک ہسپتال، ایک دھوبی خانہ اور ایک ایسے مدرسہ پر مشتمل ہو گا۔ جہاں فن زراعت کی عملی تعلیم دی جایا کرے گی۔ ہر مکان دو منزلہ ہو گا۔ پہلی منزل میں باورچی خانہ کھانے کا کمرہ، گودام غسل خانہ، اور پاخانہ ہو گا۔ احاطہ میں مویشیوں کے لئے اور فصل کے غلہ کے لئے ایک چھپر علیحدہ ڈالا جائے گا۔ جس وقت کہ گورنمنٹ مختلف ٹھیکہ داروں کے تخمینوں کا ملاحظہ کرنے کی منظوری دے دے گی تو میں ان نقشوں کو تمہارے پاس بھیجدوں گا۔ چونکہ ہند بہ میں صرف ۳۰ مریض رہ گئے ہیں اور صلح کے آثار اب کی مرتبہ امید افزا ہیں۔ اس لئے میں نے ہسپتال کو بند کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ پچاس بستروں کا سامان تو میں ہندوستان ارسال کر دوں گا اور باقی کو عثمانی ہلال احمر کے گودام میں داخل کر دوں گا۔ ممبروں کو اب چناق قلعہ بھیج دیا جائے گا۔ کیونکہ وہاں ابھی مریضوں کی کافی تعداد موجود ہے۔ اس کے علاوہ باہر کے مریض بہت آتے ہیں۔ جن کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے تو آبادیوں کی سکیم، مدینہ یونیورسٹی اور مسلم بنک اور کواپریٹو سوسائٹی کی وجہ سے کام کی اس قدر کثرت ہے کہ میں مسٹر کاظم حسین کی چٹھی کا جواب نہیں دے سکا۔ جو گذشتہ ہفتہ کے کامریڈ میں چھپا ہے۔

مگر مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا ہے کہ میرے بیانات کو غلط پیرایہ میں سمجھا گیا ہے۔ اور ان کے متعلق ابھی ایسی باتیں تصور کر لی گئی ہیں جو کسی ایسے آدمی کے دماغ میں بھی نہیں آ سکتیں۔ جو دل میں خواہشمند ہے کہ اس کا پیشہ بدنامی سے محفوظ رہے بہر حال حسابات بیباق کرنے کے لئے میں ۱۵ ہزار روپیہ کے واسطے ایک تار بھیج رہا ہوں۔ ہلال احمر نے مریضوں کے سامان خوراک پہنچانے اور ہمارے ہسپتال کے لئے ضروری اشیاء خرید کرنے کے عوض میں ۵۰۰ ترکی پونڈ کا حساب بھیجا ہے۔ ہمارے ذمہ ہلال احمر کی کل رقم بھی اتنی ہی ہے جس کے ادا کرنے کے بعد ہم سوسائٹی کے مالی قرضہ سے بالکل سبکدوش ہو جائیں گے۔

قسطنطنیہ سے ایک خط

یک شنبہ ۱۰ر جون ۱۹۱۳ء

ہم ذیل میں حافظ محمد یوسف صاحب انصاری ممبر آل انڈیا میڈیکل مشن کا ایک خط درج کرتے ہیں۔ جو انہوں نے اپنے ایک عزیز کی وساطت سے ہمیں بھیجا ہے۔

ہندیہ (عمرلی) خطوط مدافعہ چنانچہ ۱۳ر مئی ۱۹۱۳ء

دو تین ہفتہ سے کوئی ایسی بات نہیں ہوئی کہ جس کے لئے بڑا خط لکھا جا سکے۔ نیز مشن کا کام عموماً اور عمرلی کا ہسپتال خصوصاً عنقریب بند کر دیا جائے گا۔ اکثر وقت اس کی ادھیڑ بن میں لگ جاتا ہے اس لئے فرصت بھی نہیں ہوتی۔ لیکن یہاں کے متعلق چند غلط افواہیں مشہور کی جا رہی ہیں جن سے مسلمانان ہند کو صدمہ پہنچا ہے۔ اس کو دیکھ کر جی چاہا کہ مختصر صحیح حالات سے اس کی تردید کروں۔ قدیم جواہرات وتاج وغیرہ کی فروخت کی افواہ ہے وہ محض غلط ہے۔ کہ میں پچھلے ہفتہ خود اس مکان میں جہاں جواہرات وقدیم اشیاء رکھی ہیں شیخ عبد العزیز کے ہمراہ گیا۔ ان سے دریافت کیا اور ان کی معرفت تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ صرف وہ اشیاء فروخت کی گئی تھیں جو سابق سلطان عبد الحمید خاں نے پبلک کے روپیہ سے خرید کی تھیں۔ اور وہ بھی اب نہیں، عرصہ ہوا۔ اس کے سوا تمام اشیاء بدستور ہیں۔ یہ افواہیں یورپ کا معمولی کرشمہ ہیں۔ اس لغو بیانی کا ماحصل یہ ہے کہ مسلمانان عالم میں ترکوں کی طرف سے سوء ظنی اور بد دلی پھیل جائے۔ اور برائے نام مسلمانوں میں جو ارتباط ہے یہ بھی نہ رہے، رہا سہا شیرازہ بھی بکھر جائے۔ چنانچہ وہ اپنے اس مدعا میں برابر کامیاب ہو رہے ہیں۔ اور مسلمان مسلسل قعر مذلت میں چلے جا رہے ہیں۔ اور ہوش نہیں آتا۔ یہ بالکل غلط ہے کہ انور بے اور احمد عزت پاشا میں مخالفت ہے۔ غلط ہی نہیں بلکہ ناممکن۔ کیونکہ میں دونوں سے متواتر ملا ہوں۔ اور دونوں کی حالت سے بخوبی واقف ہوں۔ ایسے لوگ اگر مسلمانوں میں زیادہ ہوں تو نکبت ہی کیوں رہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ جب انور بے گیلی پولی میں تھے تو میجر فتحی بے (جو پہلے طرابلس میں کمانڈر تھے) یہاں بھی انور بے کے افسر تھے۔ انہوں نے ایک دن غصہ میں یہ فرمایا تھا کہ باب عالی کے سامنے تو بہت کچھ کر دکھاتے ہو بلغاریوں کے مقابلہ میں کچھ کر کے دکھاؤ۔ سننے والے خاموش ہو گئے یہ خاموشی بجز اس کے نہ تھی کہ وہ عادتاً خاموش ہیں۔ پس ایسی ذرا سی بات کو پھول پھل لگا دیا گیا۔ اغیار کو آستانہ میں اراضی دی جانے کی خبر بھی قطعاً غلط ہے۔ البتہ ایک پرانی فوجی بارک تھی جس کا معاملہ کامل پاشا اپنی وزارت کے زمانہ میں طے کر چکا تھا۔ وہ کرشن کمپنی کے تصرف میں ہے۔ آگے اس کے سوا سب غلط ہے۔

درِّ دانیال سے ایک خط

۱۴ر جون ۱۹۱۳ء

قاضی بشیر الدین صاحب، ممبر آل انڈیا میڈیکل مشن ۱۳ر مئی کو درہ دانیال سے ہم کو لکھتے ہیں :-

ہم بدستور کام کر رہے ہیں۔ لیکن روزانہ مسلسل کام کرنے نے ہم سب کی تندرستیوں پر بہت اثر کیا ہے۔ چنانچہ سب کے سب یکے بع
یگرے بیمار پڑ چکے ہیں۔ مگر تین چار دن میں جب ذرا اچھے ہو جاتے ہیں تو پھر کام کرنے لگتے ہیں۔ میں نے سنا ہے مشن اوائل جون میں
جائے گا۔ ۲۶ جون کو غالباً سویرے سب لوگ اسٹیمر پر سوار ہوں گے۔ اس وقت تک غالباً ہمارے مریضوں کی تعداد دو ہزار ہو
جس میں ہسپتال میں رہنے والے مریض اور باہر کے مریض دونوں شامل ہوں گے۔ ارمینیا کا معاملہ اب معرض بحث میں آ رہا ہے۔ اگر
س نے معاونت کی تو یقیناً ارمینیا ترکوں کو دشواریوں کا باعث ہوگی۔ با اثر زمینداروں کا ایک گروہ محمد شوکت پاشا کے پاس اصلاحات
وی کرنے کے لئے گیا تھا۔ اب تک معلوم نہیں کہ کیا جواب دیا گیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی، عزت اور عافیت کی حفاظت چاہتے ہیں
ن کا بیان ہے کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ فوجیں جو جنگ سے لوٹیں گی ان تمام مصائب کا جو اتحادیوں کی بدولت ان کو اٹھانے پڑے ہیں ہم سے
نتقام لیں گے۔ ترکی کی موجودہ حالت کے متعلق میرا خیال تو یہ ہے کہ ترکوں نے بلا شک شکست فاش کھائی۔ اتحادی ان پر ہر طرح سے سبقت
لے۔ بعض ایسے لوگ بھی ہیں مثلاً عبداللہ پاشا جنہوں نے جنگ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ترکی یونانیوں سے بھی لڑنے کے قابل نہیں ہے۔
میدان جنگ میں بھی ان کے پاس بہت کم افسر ایسے تھے جن کی جنگی قابلیت اچھی کہی جا سکے۔ سپاہی ادھر ادھر جمع کر دیئے گئے تھے۔ اور ان کو
بندادی گئی تھیں۔ لیکن اس زمانہ کی جنگ میں محض جسمانی طاقت سے کام نہیں چلتا۔ قطعاً یقین ہے کہ ترک نہایت شجاع اور محب وطن ہیں۔ لیکن کیا
ان کی بہادری ان کے دماغ کی کھوٹ کے بدلہ میں کام آ سکتی ہے ؟ مجھے امید ہے کہ ترک اس صاف گوئی کو معاف کریں گے۔ جو ایک ایسے شخص کی
زبان سے ادا ہو رہی ہے جو ان سے محبت کرتا ہے۔ اور ان کا ثناخواں ہے۔ اتحادیوں کے لئے تو ابتدا سے آخر تک تمام فتوحات نہایت آسان
ثابت ہوئیں۔ ان شکستوں کا اثر ہے کہ ترک سست پڑ گئے۔ معمولی آدمی یہ نہیں جانتا کہ اس کے ملک کو کیوں شکست ہوئی۔ یہاں تک کہ لفٹیننٹ ا
سب لفٹیننٹ جس نے سال بھر برابر دن میں دو دفعہ اپنے سپاہیوں کو ڈرل کرائی اور جو کچھ پوشیدہ فوجی معلومات اسے حاصل تھیں وہ سب ا
بتائے۔ پھر بھی اس کے ملک کو شکست ہوئی۔ اس لئے اب اس کو کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔ سوائے اس کے کہ تقدیر الٰہی پر صبر و شکر کرے۔
کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ سپاہیوں پر اس شکست کا بہت برا اثر پڑا ہے۔ اگر ہم اس واقعہ کو قبول نہ کریں تب بھی سوائے اپنے کسی کو دھوکہ نہ
دے سکتے۔ ایک کمیشن مقرر کیا گیا ہے تاکہ وہ اناطولیہ جائے اور رپورٹ کرے کہ وہاں کس طرح اصلاحات کی جا سکتی ہیں۔ میرے خیال میں اس
کو کامیاب ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ اب ترکوں کو اور کرنا ہی کیا ہے۔ اور اب سوائے اس حصہ کے اور ملک ہی کونسا رہ گیا ہے جس کا انتظام کیا جائے
یا جس سے آمدنی ہو۔ معمولی ترک افسروں اور "دیتلاری" کو برا بھلا کہتا ہے، افسر پاشا کو برا بھلا کہتے ہیں، اور پاشا گورنمنٹ پر الزام رکھتے
ہیں گورنمنٹ جیسا کہ چاہئے، عبدالحمید خاں اور ان کی ۳۰ برس کی بد انتظامی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

تعلیم کی حالت یہ ہے کہ یہاں عورتوں میں ہندوستان کے مقابلہ میں تعلیم کا زیادہ چرچا ہے۔ بہت سی لڑکیاں فرنچ، جرمن اور انگریزی زبانیں بول سکتی ہیں اور حفظان صحت اور خانہ داری کے متعلق کچھ نہ کچھ معلومات رکھتی ہیں۔ لیکن مردوں کی تعلیم میں ہندوستان ترکی سے کم نہیں ہے۔ پھر بھی اصل یہ ہے کہ دونوں کا مقابلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان میں ہم اطمینان کی زندگی بسر کرتے ہیں اور ہماری کمزوریاں پوشیدہ ہیں اور اس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتیں جب تک کہ ہمیں خود اپنے پاؤں پر کھڑا نہ کر دیا جائے۔

قاضی بشیر الدین صاحب نے یہ بھی لکھا کہ حسن رضا پاشا کی طرح نیازی بے سعد پاشا کی خونخواری کا شکار ہو گئے۔ یہ تحریر نہایت صاف ہے اور ترکی کی اصل صورت حال پر بہت روشنی ڈالتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ جب ایک مہینہ کے بعد ڈاکٹر انصاری صاحب ہندوستان واپس تشریف لائیں گے تو ان کے لکچروں سے ہمیں وہ پوری معلومات حاصل ہوں گی جو ان ہفتہ وار خطوں سے جو اس قدر جلدی میں اور اختصار کو مدّ نظر رکھ کر لکھے جاتے ہیں حاصل نہیں ہو سکتے۔ تفصیل حالات کے معلوم ہونے کے بعد شاید ہم کو ترکی سیاسی حالت کے متعلق اپنے خیال میں بہت کچھ تغیر و تبدل کرنا پڑے گا۔ اس لئے جو آگے موقعہ پر حالات کو بچشم خود دیکھ کر آئیں، ان سے جو معلومات ہم خود حاصل کریں گے، وہ بہت قیمتی اور نتیجہ خیز ہوگی۔ ہمارا یہ ارادہ ہے کہ طبی مشن کے تمام تجربات اور مشاہدات کو آئندہ ایک کتاب کی صورت میں شائع کریں۔

ڈاکٹر انصاری کی چٹھی

چہارشنبہ ۲۵ جون ۱۹۱۳ء

جنابِ من: -

کامریڈ کا وہ نمبر جس میں "برٹش ریڈکریسنٹ سوسائٹی" کے سیکرٹری مرزا کاظم حسین صاحب کی چٹھی شائع ہوئی ہے۔ مجھے گذشتہ سے پیوستہ ہفتہ کی ڈاک میں موصول ہوا تھا۔ اس مسئلہ پر میں آج سے ایک ہفتہ پہلے قلم اٹھاتا۔ لیکن طبی فرائض کی انجام دہی کے علاوہ مسئلہ قیام نوآبادی برائے مہاجرین کے متعلقہ مشاغل نے فرصت نہ دی۔ مزید برآں سرکاری اعداد و شمار کا دستیاب ہونا بھی بہت کچھ انتظار و صبر کا محتاج تھا۔ شکر ہے کہ میرے صبر و انتظار کا صلہ مجھے اعداد و شمار کی ایسی جامع فہرست کی بہم رسی کی شکل میں مل گیا۔ جس سے زیادہ کامل و مکمل فہرست بحالت موجودہ دستیاب ہونی محال تھی۔ صرف ایک سرکاری فہرست مجھے بہم نہیں پہنچ سکی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ بہت کچھ تلاش و جستجو کے بعد بھی یہ فہرست برآمد نہ ہوئی۔ یہ فہرست یا تو حکام کو وصول ہی نہیں ہوئی اور یا عجب نہیں کہ گم ہو گئی ہو۔ لیکن اس فہرست کی عدم دستیابی کی تلافی میں نے ان اعداد و شمار کے اندراج سے کر دی ہے جو مدرسہ طبیہ قسطنطنیہ کے ایک طالب علم درجۂ اعلیٰ نے قلم بند کر کے میرے حوالہ کیے ہیں۔ طالب علم موصوف کی خدمت بحیثیت رجسٹرار شفاخانہ متعلقہ کو تفویض کی گئی تھی۔

مرزا کاظم حسین صاحب نے میری تجویز کے متعلق سخت مغالطہ دہی سے کام لیا ہے۔ اور اس سے ایسے ایسے نتائج پیدا کیے ہیں۔ جن کا انہیں ہرگز کوئی استحقاق نہ تھا۔ انہوں نے میری تحریر کو خود غرضی اور انسانیت پر محمول کرتے ہوئے دنیا پر یہ ظاہر کرنا چاہا ہے کہ میرا مقصد بدنیتی کی راہ سے برطانوی ہلال احمر کے اراکین کو بدنام اور مطعون کرنا تھا۔ لیکن میری تحریر کو اگر بغور مطالعہ کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ میرا مقصد اس تحریر کے حوالہ قلم کرنے سے صرف یہ تھا کہ ان معاندہ تہمتوں کی قلعی کھول دی جائے جو یورپین اخبارات کے ایک طبقہ نے ترکی شفاخانوں کے انتظام کے خلاف تراش رکھی تھیں۔ اور یورپین طبی وفود کی کارگزاری کا ذکر اگر بیچ میں آ گیا تھا تو محض ذیلی و ضمنی تھا۔ میری تحریر کے جس فقرہ نے نکتہ چینوں کو اس قدر نعل در آتش کیا ہے ان کے اعادہ کے لیے باوجود خوف طوالت بھی مجھے کسی عذر خواہی کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے پڑھنے سے ارباب انصاف کو ایک نظر میں معلوم ہو جائے گا کہ آیا میں نے نہایت نیک نیتی سے محض واقعات

بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے یا ...

نوع کے ملکوتی فرض کی انجام دہی میں مصروف تھے۔

فقرہ زیر بحث کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔ یہ داستان کہ ہزارہا ترک مجروحین میدان جنگ میں سسک کر مر جانے کے لیے چھوڑ دیئے گئے۔ کذب و افترا کا ایک خبیث آمیز مجموعہ ہے۔ جس کی حقیقت ہر اس شخص کے لیے بغیر کھلے نہیں رہ سکتی جو ترکی شفاخانوں میں داخل ہو کر ایک سرسری نظر سے یہی دیکھے کہ کس قدر بڑے بڑے اعمال جراحی کتنے مریضوں پر کیے گئے ہیں۔ اور ان سے کیونکہ وہ نہایت ہی قابل اطمینان نتائج مترتب ہوئے ہیں۔ جن پر یورپ کے بہترین ماہرین فن جراحی کو بھی ناز ہو سکتا ہے۔ مقابلہ کے طور پر اس امر کا بیان کرنا خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ جرمن صلیب احمر۔ مسٹر امیر علی والی برطانوی ہلال احمر اور فرانسیسی صلیب احمر کے شفاخانہ جات کے نتائج ناقابل اطمینان ثابت ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ ممکن ہے کہ ان شفاخانہ جات کے ڈاکٹروں کی ناقابلیت یا بے توجہی ہو۔ انہیں برے نتائج کی وجہ سے یہاں عام طور پر خیال پھیلا ہوا ہے۔ کہ یورپین وفود کے ڈاکٹروں نے جان بوجھ کر اپنے مریضوں کے اعضاء قطع کیے ہیں جنہیں استحفاظی طریقہ علاج کے اختیار کرنے سے محفوظ رکھا جا سکتا تھا۔ لیکن بلاشبہ یہ غلط ہے۔

اس فقرہ میں حسب ذیل تین صریح و بین دعاوی کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔

(۱) ترکی شفاخانہ جات کی کارگزاری پسندیدہ و قابل اطمینان نہ تھی۔

(۲) ترکی شفاخانہ جات کے مقابلہ میں بعض یورپین طبی وفود کے نتائج قابل اطمینان نہ تھے۔

(۳) یورپین ڈاکٹروں کی کارگزاری کے برے نتائج کے باعث یہ خیال عام طور پر پھیلا ہوا تھا کہ یہ لوگ اعضاء کو محفوظ رکھنے کی بجائے عمداً اور دیدہ دانستہ اپنے مریضوں کے اعضاء بریدگی کو جائز رکھتے تھے۔

شق اول کے متعلق جو امر زیر بحث لی جاتی ہیں میں فقط اتنا عرض کروں گا کہ اگر مرزا کاظم حسین صاحب اس امر کے بدل و جان متمنی ہیں کہ یورپین اخبارات کا گندہ دہاں طبقہ ترکی ڈاکٹروں کو منہ بھر بھر کر گالیاں دے۔ ان پر مفتریانہ اکاذیب کا جھاڑ باندھے تو میں کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ اس مسرت بارہ اطمینان سے جناب مرزا صاحب ممدوح محروم کیے جائیں۔ لیکن ان کا یہ اطمینان اس بحث میں میرے پائے استدلال کو چوبیں نہیں بنا سکتا۔ البتہ شق دوم کے متعلق مرزا صاحب کو بگڑنے اور چیں بہ جبیں ہونے کا پورا حق حاصل ہے۔ بشرطیکہ اس کی تائید کے لیے ناممکن التردید شہادتوں کا انبار جمع نہ ہو۔ لیکن اگر مرزا صاحب کا دماغ واقعات اور شمار و اعداد کے اہل منطق سے متاثر ہونے کی کچھ بھی قابلیت رکھتا ہے تو ایسی حالت میں جب کہ عثمانی مصری ہندوستانی اور دیگر شفاخانہ جات کے مریضوں کی شرح اموات صرف ۲ یا ۳ یا زیادہ سے زیادہ ۸ فی صدی ہو۔ یورپین وفود کی ۱۸ اور ۱۹ فی صدی شرح مرزا صاحب کے دربار میں مجھے یقیناً اس دعوے کے استحقاق سے محروم نہیں کر سکتی کہ مؤخر الذکر نتائج

نام شفاخانہ	تعداد مریضان مرجوعہ	تعداد اموات	فی صدی اموات	کیفیت
(۳) کالی کرایہ	۵۰	نامعلوم	نامعلوم	نوٹ :- ڈاکٹر کرٹ نے اپنی رپورٹ میں ل... لکھا ہے کہ کل ۱۱۲۵ مریض ان کے شفاخا... میں داخل ہوئے ۔ لیکن خود شرح اموات درج نہیں کی ۔
(۴) بگیوس برطانوی	۹۸	۵۳	۵۴٫۰۸	
ہلال احمر				
(۱) ایاسٹیفانو	۳۰۵	۵۸	۱۹٫۰۱	
(۲) شفاخانہ واقع مدرسہ ثانیہ السقودرہ	۸۷ - ۹۳	نامعلوم	نامعلوم	نوٹ :- ۲۰ مریضوں کے اعضاء قطع کیے گئے ۔ یہ کیفیت رجسٹرار سے معلوم ہوئی ۔
الوفد الطبی من بلاد الہند	اندرونی ۲۰۸	۱	۴۸	نوٹ :- ایک مریض جس کے دست و پا... سے کٹ گئے تھے ۔ شفایاب ہوا ۔ اندرونی اور بیرونی اموات کی مجموعی فیصدی ۱۶...
(۱) ہندیہ (عمرلی)	بیرونی ۳۹۰			مجموعی فی صدی ۸۶ر
(۲) درہ دانیال	اندرونی ۳۵۵	۱۱	۳٫۰۹	نوٹ :- تعداد ۱۵ر مئی ۱۹۱۳ء تک کی ہے
	بیرونی ۱۱۵۲	۲	۱۷ر	
غریب مسلمانان بمبئی کا طبی وفد				نوٹ :- اگرچہ اس مشن کے شمار و اعداد... وصول نہ ہونے کے باعث میں ان اعد... کو شایع نہ کرسکا ۔ لیکن مجھے اس بات کا... ہے ۔ کہ اس کی شرح اموات بھی بہت ک... اور کسی طرح ۲ فی صدی سے زیادہ نہیں...

اس نقشہ کے اعداد و شمار پر رائے زنی کرنے سے پہلے اس واقعہ کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ مختلف شفاخانہ جات میں جو مریض پہنچ گئے تھے ان سب کی حالت سردی کھا جانے ضعیف و نقیہ ہونے یا زخم... میں مواد فاسد کے جمع ہونے کے لحاظ سے عموماً یکساں تھے ۔ ذرایع نقل و حمل بھلے یا برے جو کچھ بھی تھے ۔ س... شفاخانہ جات کے لیے ایک سے تھے ۔ البتہ بعض برطانوی شفاخانہ جات کو خوبی تقدیر سے ریل یا سمندر کے پ... قریب موقع مل گیا تھا ۔ بخلاف اس کے ان شفاخانہ جات میں جو شتالجہ کے خطوط دفاعی سے قریب تر تھے ۔ زیاد...

ناقابلِ اطمینان تھے۔ لیکن غالباً میرا سب سے بڑا قصور جناب ممدوح کی نظروں میں یہ ہے کہ کیوں میں نے اس عام افواہ کا ذکر اپنے مضمون میں کر دیا۔ کہ بعض یورپین طبی وفود کے ڈاکٹروں نے اس استحفاظی طریقہ علاج کو گلدستۂ طاق جراحی بنا کر جسے دنیا کے بڑے بڑے ماہرین فن جراحی نے اپنا معمول بہا بنایا ہے کثرت کے ساتھ مریضوں کے اعضاء بریدگی کو اپنا شعار قرار دے لیا۔ اس افواہ کے متعلق میری ذاتی رائے ان الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے۔ کہ "بلاشبہ یہ افواہ غلط ہے"۔ اور جناب مرزا کاظم حسین تک کی نظروں میں میرے یہ الفاظ میرے جرم کا کفارہ ہوگئے تھے۔ یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ یورپین وفود کے ڈاکٹروں کی نسبت جو عام خیال پھیلا ہوا تھا۔ اسے صحیح تسلیم کرتے ہوئے وہ قدرتی تامل میرے یقین کا سنگ راہ ثابت ہوا ہے۔ جو اپنے یورپین طبی ہم چشموں کے نام نیک کے برقرار رکھنے کی خواہش کا لازمہ تھا۔ بحث فقط اتنی ہے کہ یہ خیال قسطنطنیہ کے عام حلقوں میں فی الحقیقت پھیلا ہوا تھا یا نہیں۔ سو اس کے موجود ہونے کی سب سے بڑی تصدیق اس رپورٹ سے ہوتی ہے جو ایک برطانوی وفد کے ڈائرکٹر نے ترکی حکام کی خدمت میں بھیجی ہے۔ اس رپورٹ کا پہلا فقرہ یہ ہے۔

چونکہ یہ خیال عام طور پر پھیلا ہوا ہے کہ مجروحین کے اعضاء کثرت سے قطع کیے گئے ہیں۔ لہذا میں یہ رپورٹ پیش کرتا ہوں۔

خیال زیر بحث کے موجود ہونے کی تصدیق تو خود برطانوی طبی وفد کے ڈائرکٹر کی زبانی ہو گئی۔ رہا یہ امر کہ اس خیال کی واجبی اور حق بجانب ہونے کے بھی کوئی بنیاد تھی یا نہیں۔ سو مزید تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ بنیاد تھی اور ضرور تھی۔ چنانچہ ذیل کے شمار و اعداد اس بارہ میں اپنی شرح آپ کر رہے ہیں۔

نام شفاخانہ	تعداد مریضان مرجوعہ	تعداد اموات	فیصدی اموات	کیفیت
ہلال احمر عثمانی	۱۳۴۴۵	۳۲۳	۲٫۳	از ابتدائے جنگ تا باعلان متارکۂ ثانی
عثمانی فوجی شفاخانجات	۲۲۵۲۴	۷۵۳	۳٫۳	
مصری ہلال احمر	۱۵۹۱	۱۴۲	۸٫۹	
ولندیزی ہلال احمر	۱۸۵	۴	۲٫۱	
برطانوی صلیب احمر				
(۱) شفاخانہ واقع مدرسہ فنون لطیفہ	۳۱۳	۶۱	۱۸٫۳	دس مجروحین کے اعضاء قطع کیے گئے۔ جن میں آٹھ جان بحق ہوئے۔
(۲) علی بے چیفلک	۴۹	۱	۲٫۰۴	

میں نے بہت کم مریضوں کے اعضا قطع کیے ہیں اور میں خوش ہوں کہ میں نے یہ اعمال جراحی اس قدر کم کیے
مجھے یہ کامیابی اس لیے ہوئی کہ میں اصول استحفاظ پر تنقید کے ساتھ عامل ہوں ۔

ایک بلند پایہ یہودی ڈاکٹر جو قسطنطنیہ کے ایک شفاخانہ میں ملازم ہے ۔ موجودہ جنگ کے دوران میں جراحی کے قاطعانہ کارناموں کی شدید بدترین مضرتوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد یورپین طبی وفود میں سے ایک کی نسبت حسب ذیل رائے ظاہر کرتا ہے ۔

ظاہر ہے کہ سب کے سب شفاخانوں کی نگرانی ایسے ڈاکٹروں کے حصہ میں نہیں آسکی جو اپنے فن کی ماہ
ہو اور جن کا علاج بے خطا ہو۔

یہ انہیں سرگرم اور سراپا استعداد جراحوں کی جاں فشانی کا نتیجہ تھا کہ اعضا کی ہیبت انگیز بریدگی زخموں کے مواد فاسدہ کی غیر منتہی تراوش اور حرارت غریزی کی غیر معمولی کمی ہمارے دیکھنے میں آئی۔ اکثر کم عمر اور ناتجربہ کار ڈاکٹروں نے جو میدان جنگ کی جراحی کی ابجد خواں تک نہ تھے ۔ مجروحین کو اپنا تختۂ مشق بنا رکھا تھا۔ اور ان مصیبت کے ماروں کی یہ حالت تھی کہ شفاخانہ میں پہنچتے ہی انہیں اپنے زخم اور جراحان نوخاستہ کی سلائیوں اور اور دشمنو
اور اوزاروں کے حوالہ کر دینے پڑتے تھے ۔ شاید ان نوجوان سرجنوں کو اس حقیقت کا علم نہ تھا کہ جنگ کی جراحی میں استحفاظ بہترین طریقۂ علاج ہے ۔ ایسے زخمی بھی ہمارے دیکھنے میں آئے ۔ جن کے جسم میں گولی داخل ہو کر گم ہو گئی اور گم شدہ کی تلاش میں ڈاکٹر صاحب نے بیچارے مجروح کے جسم میں اتنے بڑے اور لمبے شگاف دیئے کہ قیاس
میں نہیں آسکتے ۔ یورپین وفود میں سے ایک کی قسطنطنیوی کارگذاری کا ذکر کرتے ہوئے بھی ڈاکٹر حسب ذیل معنی خ
الفاظ قلم بند کرتا ہے ۔

ان سپاہیوں کے زخموں میں زہریلا مادہ سرایت کر چکا تھا ۔ زخم رس رہے تھے ۔ گھناؤنے تالو پڑے
ہوئے تھے ۔ کٹے ہوئے ہاتھوں اور پاؤں کے بھیانک ٹھنٹ رہ گئے تھے ۔ غرض جنگ کی ناقص العمل جراحی کے وہ تمام ناگفتہ بہ نتائج ہمارے پیش نظر تھے جو موجودہ صدی کے لیے مایۂ ننگ و عار ہیں ۔ سپاہیو
کی جسمانی صفائی بالکل نظر انداز کر دی گئی تھی ۔ ان کے جسموں اور کپڑوں میں جوئیں پڑی تھیں ۔ اور وہ سر سے
لے کر پاؤں تک میل میں اٹے ہوئے تھے ۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ سپاہی تھے ۔ جو ابھی ابھی میدان جنگ سے
واپس آئے تھے ۔ اور انہیں راحت و آسایش میسر نہ آئی تھی ۔ اور نہا دھو کر صاف ہونے کا موقع نہ ملا
بلکہ یہ بیچارے مریض تھے ۔ جن پر اعمال جراحی کیے گئے تھے ۔ اور دو مہینے تک ایک شفاخانہ میں ان کی دیکھ
بھال ہوتی رہی تھی ۔ بڑے بڑے شگاف جو طول میں ۳۰ سے لے کر ۴۰ سنٹی میٹر تک تھے ۔ ٹانگوں اور رانوں میں
ڈالے گئے ۔ اس لیے کہ جراح کو ایک گم شدہ گولی کی تلاش میں یہی مناسب معلوم ہوا کہ پورے عضو کی چیر پھاڑ کی ج
ملاحظہ ہو فوٹوگراف" ۔

ہلال احمر عثمانی کے اعلیٰ عہدہ داروں میں سے ایک نے پروفیسر ڈی ہاج کی معیت میں جب ان مریضوں

نازک حالت کے مریض بھیجے جاتے رہے اس لیے کہ ان کا ضعف و نقاہت اس امر کا متحمل نہ ہو سکتا تھا کہ وہ زیادہ فاصلہ طے کر سکیں۔ پس مختلف شفاخانہ جات کے نتائج کا محاکمہ کرتے وقت ان واقعات کا پیش نظر رکھنا نہایت ہی ضروری ہے۔ اسی ضمن میں یہ واقعہ بھی قابل لحاظ ہے کہ بعض شفاخانہ جات میدانی تھے جو خیموں میں تھے۔ اور بعض پختہ بارکوں اور عمارتوں میں تھے۔ ظاہر ہے کہ اوّل الذکر شفاخانجات کے مریض بوجہ خیموں میں رکھے جانے کے موسم کے استبداد کی زیادہ زد میں تھے۔ اور اس لیے ان کے معالجہ اور خبر گیری میں زیادہ تر احتیاط اور توجہ کی ضرورت تھی۔ برطانوی شفاخانہ جات اکثر صورتوں میں بجائے خیموں کی بارکوں یا دوسری پختہ عمارتوں میں تھے۔ اور ان کے نتائج پر نظر ڈالتے وقت اس واقعہ کا مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ یورپین ڈاکٹروں نے جو خدمات ترکی میں آکر انجام دی ہیں۔ ان کے لحاظ سے اگرچہ مجھ پر بحیثیت مسلمان ہونے کے ان سب کا شکریہ اور باعتبار ایک طبیب ہونے کے ان کی مساعی کا اعتراف واجب ہے۔ لیکن جب ان کے نتائج پر نظر پڑتی ہے تو یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ دوسرے شفاخانہ جات کی فی صدی اموات بہت بڑھی ہوئی ہے۔

یہ تو عام نتائج کا تبصرہ ہُوا۔ جب ان مریضوں کی تعداد پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ جن کے اعضا برطانوی شفاخانہ جات میں قطع کیے گئے (دس مریضوں کے اعضا برطانوی صلیب احمر اور بیس کے برطانوی ہلال احمر میں قطع کیے گئے آخر الذکر عدد محتاج تصدیق مزید ہے) تو خواہی نخواہی اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بڑے بڑے جلیل القدر برطانوی اور یورپین ڈاکٹروں نے دوران جنگ میں فن جراحی کے استحفاظی پہلو کے متعلق جن روایات کو ہم تک پہنچایا ہے انہیں ہر حالت میں برقرار نہیں رکھا گیا۔ کسی عضو کا کاٹ ڈالنا آسان ہے۔ لیکن کٹا ہوا عضو پھر اپنی اصلی حالت پر نہیں آسکتا ؎

کہ لعل است لعل بدخشاں شکست
شکستہ نیابد دگر بارہ بست

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ قطع اعضا کے متعلق تمام اعمال جراحی کامیاب ثابت ہوئے۔ (جو بدقسمتی سے کم از کم برطانوی صلیب احمر کے دس اعمال کے متعلق جو خود ڈائرکٹر کی رپورٹ کے مطابق آٹھ مریضوں کے ہلاک ہونے کا باعث ہوئے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ تو پھر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ آیا ان مریضوں میں سے چند کے اعضا بھی محفوظ رکھے جا سکتے تھے۔

پروفیسر دیباج جو بلجیم کے صلیب احمر کے وفد کے ہمراہ قسطنطنیہ آئے ہیں۔ ایک بہت بڑے پیمانہ کے سرجن ہیں۔ انہیں فن جراحی کے متعلق موجودہ جنگ کے تمام پہلوؤں پر نظر غائر ڈالنے کے خاص خاص مواقع حاصل ہوئے ہیں۔ وہ اصول استحفاظ کی بڑی شد و مد سے حمایت کرتے ہیں۔ اور اپنے زمانہ قیام کی ترکی میں مریضوں کے اعضا قطع کرنے میں انہوں نے بہت ہی احتیاط اور تامل سے کام لیا ہے۔ ان کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

معاینہ کیا تو ایسے پریشان و متحیر ہوئے کہ انہوں نے اس ڈاکٹر سے (یہودی ڈاکٹر سے مراد ہے) فرمائش کی کہ ان مریضوں کی عکسی تصاویر برغرض اشاعت لے لی جائیں۔ اس بارہ میں ڈاکٹر موصوف کا بیان حسب ذیل ہے۔

ہم ان تصاویر کو اس غرض سے شایع کرتے ہیں کہ دنیا کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ یورپ کی مجالس صلیب احمر اپنی ذمہ داریاں لائق اور تجربہ کار ڈاکٹروں کے تفویض کیا کریں۔ اور ایسے ناتجربہ کار اور نالائق ڈاکٹروں کو مجروحوں کی پارہ گری کے لیے نہ بھیجا کریں۔ جو جراحی کا فن سیکھنے کے لیے غریب سپاہیوں ہی کو تختہ مشق بنانے کے خواہش مند ہوں"۔

اس کے بعد اسرائیل ڈاکٹر بہت سے مریضوں کے حالات نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کرکے دکھاتا ہے کہ ناقص جراحی اور غیر محتاط تیمارداری نے کیسے ناقابل اطمینان نتائج پیدا کیے اور خاتمہ پر اپنے غصہ کا اظہار حسب ذیل الفاظ میں کرتا ہے۔

"کیسے افسوس کا مقام ہے کہ اس انیسویں صدی میں .... کی طرح کی سلطنتیں ہمارے زخمیوں کی چارہ گری کے لیے ایسے ڈاکٹروں کے بھیجنے کی جرأت کرتی ہیں جو شاید ہمارے حجاموں جتنی لیاقت بھی نہیں رکھتے وائے بر حال ٹرکی! کیسی خلاف قانون مضرتیں ہیں۔ جو ان مصیبت کے ایام میں ہم کو پہنچائی جا رہی ہیں"۔ کیا اسی کا نام ترقی تہذیب ہے۔

اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے۔ وہ بے وجہ و بے بنیاد نہ تھا۔ باوجود خوف و طوالت میں ترکی ڈاکٹروں کے چند اور بیانات حوالہ قلم کرتا ہوں۔ ایک ڈاکٹر اپنی سرکاری رپورٹ میں برطانوی شفاخانہ جات میں سے ایک کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہے:۔

ایک مریض مرض کزاز میں مبتلا تھا۔ اس پر عمل جراحی کرنے کے لیے جس مقراض اور دیگر آلات کا استعمال کیا گیا۔ انہیں آنچ دیئے یا عرق دافع مواد سمیہ میں دھوئے بغیر دوسرے مریضوں کے زخموں کے لیے بلا تامل استعمال کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس شفاخانہ میں چھ مریض کزاز میں مبتلا ہو کر جان بحق ہوئے۔ حالانکہ خود شفاخانہ کے منتظمین کو اقرار ہے کہ ابتدا میں صرف دو مریض اس متعدی مرض میں میدان جنگ سے مبتلا ہو کر داخل شفاخانہ ہوئے تھے۔ شفاخانہ کے منتظمین کی بے پروائی کا یہ عالم تھا کہ کزاز کے مریضوں کے بستر مواد متعدیہ سے پاک و صاف کیے بغیر دوسرے مریضوں کے کام میں لائے جاتے تھے۔

بہت ہی احتیاط کی گئی تو صرف اتنا کیا گیا کہ بستروں کو تھوڑی دیر کے لیے باہر ہوا میں پھیلا دیا گیا۔ جو ہرگز کافی نہ تھا ...

پیچش کے بارہ مریض جنہیں معالجہ کی بہت بڑی ضرورت تھی بلا علاج چھوڑ دیئے گئے۔ یہاں تک کہ یہ بیچارے ایک ایک کرکے درد و کرب اور ضعف و نقاہت کے عالم میں جان بحق ہو گئے۔

(۱) ایڈیٹر صاحب "کامریڈ" کو میں نے لکھ دیا ہے کہ ان عکسی تصاویر کی ایک ایک نقل آپ کی خدمت میں بھ

بغرض اشاعت بھیج دی جائے۔
ہیضہ کے مریضوں کے لیے علیحدہ رکھے جانے کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ بلکہ انہیں دوسرے مریضوں کے ساتھ رکھا گیا۔ ایک مریض نے جو نہایت ضعیف و لقبیہ تھا اور جس کا دوسرے دن انتقال ہو گیا۔ پینے کے لیے پانی مانگا۔ یورپین ڈریسر نے جس کے سپرد اس کی تیمار داری تھی بجائے پانی کے آبخورے کے اپنے بوٹ کی ایک ٹھوکر اس کی چھاتی پر رسید کی۔
مدرسہ طبیہ واقع حیدر پان کا ایک پروفیسر انگریزی شفا خانہ جات میں سے ایک کی نسبت لکھتا ہے یہ افواہ بارہ کر میرے کانوں تک پہنچتی ہے کہ بہت سے اعمال جراحی (جو مستلزم قطع اعضا تھے) ایسے کیے گئے۔ جن کی بالکل ضرورت نہ تھی۔ اور جنہیں فن طب ہرگز جائز نہ سمجھتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مریض جان بر نہ ہو سکے۔
ایک بہت بڑا ترکی ڈاکٹر جس کی شہرت یورپ تک میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور جو یہاں کے مدرسہ طبیہ کا پروفیسر بھی ہے۔ بیان کرتا ہے۔
یہاں تو برقی افواہیں اس مضمون کی پھیلی ہوئی ہیں کہ انگریزی ہلال احمر اور بعض دوسرے یورپین طبی وفد نے جو قسطنطنیہ اور دیگر مقامات میں مقیم ہیں اپنی خدمات مفوضہ کی انجام دہی کے وقت زخمیوں اور مریضوں کا علاج ویسا نہیں کیا۔ جیسا انہیں چاہیئے تھا۔ اور بعض اعمال جراحی انہوں نے ایسے کیے جو بالکل غیر ضروری تھے۔
علاقہ شناطبہ کے جملہ شفا خانہ جات فوجی کا ایک افسر جس سے ان کا شفا خانہ جات کی صفائی کے متعلق ہے۔ لکھتا ہے:۔
"وہ (یورپین) اخبارات جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ترکی ڈاکٹروں نے اپنے مریضوں کا علاج بہترین طبی اور جراحی اصولوں کے مطابق نہیں کیا اس الم افزا حقیقت کو بخوبی ذہن نشین کر لیں کہ بجائے ترکی ڈاکٹروں کے یہ الزام ان یورپین صلیب احمر وفود پر بدرجۂ اولیٰ عاید ہوتا ہے۔ جو قسطنطنیہ یا میدان کارزار میں موجود ہیں۔
اخبار "کامریڈ" مورخہ ۸ر فروری ۱۹۱۳ء میں جو آپ کا مضمون شایع ہوا ہے۔ میری نظر سے گذرا جو کچھ آپ نے اس مضمون میں لکھا ہے وہ حرف بحرف سچ ہے۔ جیسا کہ آپ کا بیان ہے کہ یورپین طبی وفود میں سے بعض کے شفا خانہ جات میں زخمیوں کا علاج اچھی طرح نہیں کیا گیا۔ جو کچھ آپ نے اپنے مضمون میں تحریر کیا ہے۔ میں اس کی پوری طرح سے تصدیق کرتا ہوں۔
ناانصافی ہوگی اگر میں انگریزی ڈاکٹروں کا ذکر کرتے ہوئے اس قابل تعریف خدمت کا اعتراف نہ کروں جو ہیضہ کے مریضوں کے معالجہ کے متعلق ڈاکٹر بنیس نے انجام دی۔ ڈاکٹر کیل نھروپ کی جراحانہ قابلیت کا اعتراف بھی مجھ پر واجب ہے۔ جنہوں نے بارہ مریضوں کے اعضا قطع کیے۔ اور یہ سب کے سب شفایاب ہوئے۔ جن لوگوں نے ہندوستان میں ترکی مجروحین جنگ اور پسماندگان شہدا کی امداد کے لیے

...وجہ یتھی کہ میں نے اپنے طبی ہم پیشوں کے کام کی تنقیح میں اس قدر جارحانہ تنقید سے کام لیا۔ ورنہ ان کی کار
...زادی اور قابلیت مجھ سے خراجِ تحسین و آفرین وصول کیے بغیر نہ رہ سکتی۔

۱۷ اق

خاکسار۔ مختار احمد بی۔ اے (مدارس) ایم۔ ڈی۔ ایم۔ ایس (ایڈنبرا) ایم۔ آر۔ سی۔ ایس
(انگلینڈ) ایل۔ آر۔ سی۔ پی (لندن)
ناظم الوفد الطبی من بلاد الہند۔ قسطنطنیہ ۲۷ مئی ۱۹۱۳ء

کیا ڈھونڈتے ہو فصلِ خزاں میں بہار کو
اب وہ چمن کہاں ہیں وہ رنگِ چمن کہاں
کشتوں کو تیرے کس نے کیا ہے سپردِ خاک
ان میتوں کے واسطے گور و کفن کہاں
سنتے ہیں یہ بھی ایک بزرگوں کی رسم تھی
اس دورِ اعتدال میں دار و رسن کہاں

وقتاً فوقتاً خاص خاص اشیاء اور انجمنوں کے ذریعہ سے رقوم روانہ کی ہیں۔ ان کے استفسارات کہ رقمیں وصول ہوئیں یا نہیں۔ مجھے بذریعہ ڈاک آئے دن وصول ہوتی رہتی تھی۔ ان استفسارات کے جوابات میں جو چند فقرے میں نے "کامریڈ" میں لکھے۔ انہیں جناب مرزا کاظم حسین صاحب نے خواہ مخواہ اپنی سوسائٹی کے سر چپک لیا۔ ظاہر ہے کہ ان فقرات کا مشار الیہ برٹش ریڈ کریسنٹ سوسائٹی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے کہ اس سوسائٹی کے حسابات تو خود مرزا کاظم حسین صاحب ہی کی تصریح کے بموجب باقاعدہ طور پر اخبارات میں شایع ہوتے رہتے ہیں۔ میں جناب مرزا صاحب کو یقین دلاتا ہوں کہ رائٹ آنریبل مسٹر سید امیر علی بالقابہ نے مسلمانانِ ہند کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں ان کا اوصاف مجھ سے بڑھ کر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

جنابِ مرزا صاحب نے اپنی سوسائٹی کے مداخل کی کمی کی مرثیہ خوانی فرماتے ہوئے اس کمی کا مورد الزام جن اشخاص کو قرار دیا ہے وہ اس الزام سے بری ہیں۔ اگر جناب ممدوح قطع نظر ہندوستان کے متعدد اردو اخبارات کے لندن کے بعض سرکردہ مسلمانوں ہی سے دریافت حالات کی زحمت گوارا فرماتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ حقیقی الزام "برٹش ریڈ کریسنٹ سوسائٹی" کے خزینۂ خاصہ میں رقوم کے بافراط نہ داخل ہونے کا کس کے سر ہے۔ کیا جناب مرزا صاحب براہِ نوازش اس احقر کے اس سوال کا کوئی شافی جواب ارشاد فرما سکتے ہیں کہ کیوں جنابِ ممدوح کی سوسائٹی نے ان طبی وفود کی رکنیت کے شرف سے ہر ہندوستانی کو محروم رکھنے کی از حد کوشش کی ہے۔ جو قسطنطنیہ کی جانب بھیجی گئی؟

خود مجھے چند ایسے مسلمان نوجوانوں کے نام معلوم ہیں جنہوں نے برٹش ایڈ کریسنٹ مشن کے لیے اپنی خدمات رضا کارانہ حیثیت سے بلا شرط مزد و بلا امید انعام پیش کی تھیں۔ مگر ان کی درخواست یا تو رد کر دی گئی یا استغنا کی اس ٹوکری میں جھونک دی گئی جو خاص اسی مطلب کے لیے "برٹش ریڈ کریسنٹ سوسائٹی" کی میز کے نیچے رکھی رہتی ہے۔ ان نوجوانوں کا قصور اگر کوئی تھا تو یہ تھا کہ وہ بدقسمتی سے ہندوستانی واقع ہوئے تھے۔ اور بہترین برطانوی یونیورسٹیوں میں سے بعض گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ تھے۔ اور اپنی خدمات انہوں نے بلا کسی مشاہرہ کے مطالبہ کے پیش کی تھیں۔ اور بعض نے تو ٹرکی جانے اور آنے کے اخراجات تک اپنی گرہ سے ادا کرنے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔

مجھ پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ میں نے انگریزی ڈاکٹروں کی حسن کارگزاری کا موزوں الفاظ میں اعتراف کرنے کی بجائے انہیں بدنام کیا ہے۔ نیتوں کا حال تو خدا جانتا ہے۔ لیکن جو شخص بہترین برطانوی روایات کی گود میں تربیت پا چکا ہو۔ اور جس نے فن طب و جراحی کو انگلستان میں اس کی کامل ترین شکل میں دیکھا ہو۔ اس کا ہمیشہ یہ نصب العین ہونا چاہیے کہ ان روایات کے برقرار رکھے جانے میں ہر طرح ساعی ہو۔ فن طب کی قندیل سقفِ علم کے بعد تابانی و درخشانی آویزاں ہے۔ ہر وہ ہاتھ جو اس جگمگاتی ہوئی قندیل کو اس بلندی سے اتارنا چاہتا ہے اس قابل ہے کہ بلا خوف لَوْمَةَ لَائِمٍ اسے قطع کر دیا جائے

ٹرکی سے آل انڈیا میڈیکل مشن کا الوداعی منظر

(یکشنبہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۳ء)

جناب ایڈیٹر صاحب زاد عنایتکم! السلام علیکم۔ مندرجہ ذیل مضمون اپنے اخبار کے گوشہ میں شائع فرما کر ممنون فرمایئے۔

۱۹ مئی کو ڈاکٹر انصاری صاحب نے ہر دو شفاخانہ جات متعینہ عمرلی و چپاق قلعہ کا شفاخانہ بالترتیب افتتاح بند کر دیئے جائیں۔ یہ امر پہلے ہی سے طے ہو چکا تھا۔ کہ ہر دو شفاخانہ جات میں سے پچاس بیماروں کا مکمل سامان ہندوستان سے لے جانے کے لئے علیحدہ کر کے باقی کل اسباب ہلال احمر عثمانی کے حوالہ کر دیا جائے۔

اس وقت عمرلی کے شفاخانہ میں بہت تھوڑے مریض باقی رہ گئے تھے جن میں چند تو ایسے تھے۔ کہ ان کی علالت خفیف باقی رہ گئی تھی۔ صرف چندے راحت کی ضرورت تھی۔ لیکن ۳ بیمار ایسے تھے۔ جن پر حال ہی میں عمل جراحی ہوا تھا۔ اور اس قابل نہ تھے۔ کہ چل پھر سکیں۔ تاہم یہ رائے قرار پائی کہ یہ سب مریض ۲۲ تاریخ کو استنبول کے کسی عثمانی شفاخانہ میں ضروری ہدایات کے ساتھ بھیج دیئے جائیں۔ لیکن شفاخانہ بند ہونے کی خبر بیماروں تک پہنچانے سے ہم نے عمداً احتراز کیا۔ کیونکہ بیمار کو اس کی مرضی کے خلاف بغرض علاج کے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا فطرتاً شاق ہوتا ہے۔ مگر ہندوستان لے جانے والے سامان کو علیحدہ کرنا ہر شے کی مفصل فہرست تیار کرنی اور پھر خیمہ وغیرہ اکھاڑ کر بنڈلے بنانا۔ غرض یہ سب کچھ بحیثیت مجموعی ایسا کام نہ تھا جو بیماروں کی نظر سے بچا رہتا۔ چنانچہ ۱۲ تاریخ کو مریضوں کا شبہ درجہ یقین کو پہنچ گیا۔ کہ رخصت کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اور متعینہ ڈاکٹر سے بار بار سوال کیا جانے لگا۔ کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا آپ ہم کو ادھ بیچ میں چھوڑے جاتے ہیں۔ اور پھر یہ سوالات کچھ ایسے مایوسانہ لہجے میں کئے جاتے تھے۔ کہ خواہ مخواہ طبیعت پر قلق انگیز اثر ہوتا تھا۔ رات کو جب انہیں معلوم ہو گیا کہ ۲۲ کو شفاخانہ بالکل بند ہو جائے گا۔ تو بعض تو آبدیدہ ہو کر رہ گئے اور بعض غصہ کا سا منہ بنا کر بیٹھ گئے۔ اور جب ان سے ناخوشی کی وجہ دریافت کی گئی تو چیں بہ جبیں ہو کر کہا کہ اب نہ تم ناحق ہم محبت کرو اور نہ تم ہم سے کیونکہ جدائی کی قیامت ہوتی ہے۔ ایک مریض جس کا دست راس ٹوٹا ہوا تھا۔ اس نے نہایت غمگین لہجہ میں ایک ترکی شعر پڑھا

"بینی بین بر گون الرالیر ...."

جس کا ماحصل یہ ہے۔ کہ تجھے ہماری قدر نہیں۔ لیکن یقیناً ایک روز آنے والا ہے۔ جب تو میری جستجو کرے گا۔ اور میں نہیں ملوں گا۔ یہ شعر پڑھ کر آنسو بھر لایا۔ اور دوسرے بھی چشم نم ہو گئے۔ ۲۱ رہی کو یہ صلاح قرار پائی کہ اپنے مریضوں کو رخصتی دعوت

دی جائے جس میں طبیب تیمار دار اور مریض شامل ہوں۔ بیماروں کو خیموں میں باقاعدہ چیزیں وغیرہ آراستہ کی گئیں۔ اور جنگل میں
جس قدر بھی بہتر دعوت کا سامان ہو سکتا تھا۔ وہ کیا گیا۔ اور سب نے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ اس موقع کا فوٹو بھی لیا گیا تھا۔
مگر غالباً اور بہت سی دیگر بلٹیوں کے ہمراہ یہ بھی ضائع ہو گیا۔ ڈاکٹر انصاری صاحب کا حکم تھا۔ کہ ۲۲ تک تمام سامان کی مفص
فہرست ہو جائے۔ اور ہندوستان جانے والا سامان بمبئی بھیجے جانے کے لئے ٹھیک ہو کر نشان اور پتہ سے درست رہے۔ چنانچہ
۲۲ تاریخ کو ہلال احمر عثمانی کی طرف سے اسمٰعیل حقی بے اور چار دیگر اصحاب سامان لینے کے لئے آ گئے۔ اور ہم نے بلاتردد اپنی فہرست
سے مقابلہ کرا کر سامان ان کے حوالہ کر دیا۔ ایک واقعہ میں درج کرنا بھول گیا کہ موضع ہنہ یا عمرلی بلندی پر واقع ہے۔ اور ہمارا شفاخا
نشیب میں چنانچہ ہمارے اکھڑتے ہوئے خیمے موقع کے مہاجرین نے بھی دیکھے۔ اس موضع میں ساٹھ کے قریب مہاجرین آباد تھے۔ جن
دونوں وقت ہمارے ہاں سے کھانا پہنچتا تھا۔ چونکہ ان مہاجروں میں پردہ نشین مستورات زیادہ ہیں۔ اور مرد کم اس لئے کھانا ہر گھر پر پہنچا
جاتا تھا۔ اور دونوں وقت ایک دو ممبر تقسیم کرنے کے لئے ہمراہ جاتے تھے۔ اس لئے تمام مہاجرین ہر شخص سے جداگانہ واقف ہو گئے
اور محبت کے بدلے محبت کرنے لگے تھے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر رضا صاحب گھر گھر جا کر علاج کرتے تھے۔ اور ہر روز دو دفعہ موضع میں اپنے
بیماروں کو ضرور دیکھنے جاتے تھے۔ اس برتاؤ نے خصوصیت سے سب کو گرویدہ بنا لیا تھا۔ مرمت مسجد اور مکتب قائم کئے جا
کی اطلاع تو پہلے ہی آپ کو مل چکی ہے۔ بہرحال انہیں چند خفیف باتوں کی وجہ سے مہاجرین کا تعلق ہم سے اس قدر گہرا ہو گیا۔ ک
ہمارے خیمے اکھڑتے وقت ان کو دلی صدمہ پہنچا۔ ۲۲ تاریخ کو تمام موضع کے عورت مرد بچے بوڑھے گھروں سے باہر نکل آئے کیو
کسی نے غلط اطلاع دی تھی۔ کہ ۲۲ تاریخ کو روانگی ہے۔ تاہم ۵-۶ گھنٹے بلندی پر بیٹھے ہوئے ہمارے کیمپ کی طرف دیکھتے رہ
جب ہم میں سے کوئی ادھر پہنچا تو ایک ساتھ مع السلامۃ کے صدا بلند ہو گئی۔ اور ہزاروں دعائیہ فقروں کی بوچھاڑ جن کو ہم سمجھ بھی نہ
تھے۔ ہونے لگے۔ آخر جب ان کو یقین ہو گیا کہ آج ہم نہیں جائیں گے تب کہیں اپنے گھروں کو گئے۔ ۲۳ مئی کی صبح کو جن
احمد عزت پاشا کمانڈر انچیف افواج عثمانی کے اور جنرل عبدالسلام پاشا انسپکٹر جنرل شفاخانہ جات عثمانی کی خدمات میں جدا جدا
دیئے۔ کہ ہم نے اپنا شفاخانہ بند کر دیا ہے۔ اور ہماری آرزو ہے۔ کہ رخصت سے پہلے ایک دفعہ اور شرف قدم بوسی حاصل کریں۔ ا
چونکہ آپ کا وقت قیمتی ہے۔ اس لئے استدعا ہے۔ کہ مناسب اوقات سے اطلاع دی جائے۔ کہ صرف ملازمت کو حاضر ہو
دونوں جگہ سے فوراً تار کا جواب آیا۔ عبدالسلام پاشا نے بلاتعین وقت تحریر فرمایا کہ جس وقت بھی آئیں حاضر ہوں۔ اور احمد
احمد عزت پاشا نے ۲ بجے بعد دوپہر وقت ملاقات معین فرمایا۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد کمانڈر انچیف کے اردلی کا سوار بائسک
کی تحریر لایا جس کا منشا یہ تھا۔ کہ آنے والوں کی صحیح تعداد سے اطلاع دی جائے۔ تاکہ گھوڑے سواری کے لئے اس قدر بھیج
جائیں۔ بعض اصحاب جو گھوڑے کی سواری کو کسی وجہ سے پسند نہ فرماتے تھے۔ اس سے گھبرا گئے۔ اور پریشانی چھپانے لگے۔ ا
طوعاً وکرہاً جانے والوں کی تعداد لکھنی پڑی۔ ۱۲ بجے اسٹنبول گاڑی جاتی تھی۔ اس میں بیماروں کو رخصت کرنا تھا جو پی
چل سکتے تھے وہ پیدل اور معذورین کو اسٹریچر پر ڈال کر اسٹیشن پر لے گئے۔ یہ منظر قابل دید تھا۔ ان کا رخصت
وقت مل مل کر ہاتھ اور منہ چومنا۔ بھرائی ہوئی آواز میں دعائیہ کلمات کہنا ایسا تھا جو ہمارے دلوں کو موہ نہ لیتا۔ چنانچہ جس وق
ٹرین چھوٹی اس وقت ہم میں سے ہر شخص کے رومال کا کچھ حصہ ضرور تر تھا۔ بیماروں کو رخصت کرنے کے بعد اپنے ذا

اسباب کو ایک جا کرنے میں مشغول ہوئے۔ لیکن ساتھ ہی یہ انتظار بھی لگا ہوا تھا۔ کہ کب باسق کماندان کی طرف سے گھوڑے آئیں اور اس سراپا عزت کی الوداعی قدمبوسی حاصل ہو۔ تقریباً ایک بجے دور سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی اور ان کے ہنہنانے کی آواز نے سب کو متنبہ کر دیا۔ کہ گھوڑے آ گئے۔ لیکن باہر نکل کر دیکھنے پر یہ خیال ہوا۔ کہ یہ ہمارے گھوڑے نہیں ہیں بلکہ کوئی باعزت پاشا اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ کس طرف جا رہا ہے۔ اول تو گھوڑوں کی تعداد ہمارے اندازے سے کہیں زیادہ تھی۔ دوسرے چار شہر کہ رسالہ کے آگے آگے رہتے تھے۔ ان کی شان اور زرق برق وردیوں سے ہمارے خیال کی تائید ہوتی تھی۔ بہر حال یہ آنے والا رسالہ ہمارے کیمپ سے کوئی سو قدم کے فاصلے پر پہنچ کر ٹھہر گیا۔ افسروں میں سے ایک شخص جو بہ ظاہر رتبہ میں سب سے برتر معلوم ہوتا تھا۔ گھوڑے کو بڑھا کر ہمارے خیمہ کے سامنے جس میں ہم سب جمع تھے۔ آیا اور السلام علیکم کہہ کر آگے بڑھے۔ اور اندر لا کر بٹھانا چاہا۔ لیکن انہوں نے معمولی اداء مراسم کے بعد کہا کہ وقت تھوڑا ہے۔ اگر آپ لوگ تیار ہیں۔ تو بسم اللہ چل کر سوار ہو جیے۔ باسق کماندان آپ کے منتظر ہیں۔ ہم سب پہلے ہی سے تیار تھے۔ فوراً ساتھ ہو لئے۔ یہاں عبدالسلام پاشا اور احمد شوقی پہلے سے موجود تھے۔ ان سے ملاقات کی۔ ہز ایکسلنسی نے فرمایا۔ کہ غالباً ان حضرات کے رسمی تعارف کی تو ضرورت نہیں۔ کیونکہ کئی دفعہ ملاقات ہو چکی ہے۔ عبدالسلام پاشا جو عرب ہیں آگے بڑھے اور نہایت ہی منفعلانہ لہجہ میں فرمایا۔ کہ افسوس میں لوگوں کی مدارات اگر اپنے مکان پر کرتا۔ تو زیادہ مسرت ہوتی۔ لیکن پاشا حضرت لمری نے ابھی فوج کے پاشاؤں کو آپ سے ملنے کے لئے یہیں طلب فرما لیا۔ اس لئے یہ مسرت نہ حاصل کر سکا۔ تاہم ایک ہی بات ہے۔ یہاں یا وہاں۔ ہم ابھی بیٹھنے نہیں پائے تھے۔ کہ محمود پاشا ناظر بحریہ، عزت فواد پاشا کماندار سواری۔ ضیا پاشا کمانڈر خط مدافعہ اول تشریف لے آئے۔ یہ سب عہدہ حضور کمانڈر انچیف کے طلبیدہ ہم سے رخصتی ملاقات کے لئے تشریف لائے تھے۔ جب سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو ڈاکٹر صاحب نے بذریعہ ترجمان اول گھوڑوں کے بھیجنے اور وداعی ملاقات کی اجازت بخشنے کا شکریہ ادا کیا۔ پاشا حضرت لمری نے ارشاد فرمایا۔ کہ یہ ایک معمولی بات ہے۔ آپ اس کو اس قدر وقعت کیوں دیتے ہیں۔ اور فرمایا۔ کہ مجھے افسوس ہے۔ کہ آپ لوگ جا رہے ہیں۔ چھوڑنے کو طبیعت نہیں چاہتی اور جدائی کا تصور کر کے طبیعت کو کوفت ہوتی ہے۔ اس پر مسٹر شعیب قریشی نے عرض کیا۔ ہز ایکسلنسی کی۔ آئی۔ ڈی۔ سی رشید بے اور محمد انور بے یاور بحری انگریزی خوب جانتے تھے۔ کہ ہم لوگ آج آپ کی خدمت میں اس غرض سے حاضر ہوئے ہیں۔ وہ اپنے اور نیز تمام مسلمانان ہند کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کریں۔ کہ جناب والا نے مختلف طریقہ سے سہولت بہم پہنچا کر اور اپنے عساکر کو ہماری امداد کے لئے متعین فرما کر ہم کو اس قابل بنا دیا کہ اپنے شجیع بہادر مظلوم مگر زخمی بھائیوں کی خدمت کر سکیں۔ یہ وہ خدمت ہے۔ جس کے ادا کرنے کے لئے آج تمام دنیا کے مسلمان تڑپ رہے ہیں۔ ہم کو فخر ہے۔ کہ خدا کی عنایت سے ہم اپنے بھائیان فدائیان اسلام کی خدمت کر سکے۔ ہز ایکسلنسی اس تقریر سے بہت متاثر ہوئے اور فرمایا کہ افسوس آپ نے ترکی کو اس حالت میں دیکھا جبکہ اعداء سے چاروں طرف سے گھبرے ہوئے اور تمام دنیا اس کے درپے آزار ہو رہی ہے۔ کاش تم اس کو فتح اور عروج کے زمانہ میں دیکھتے۔ شکست و فتح خدا کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کیا نتیجہ ہو گا۔ کوئی اکیلی طاقت تمام دنیا کا مقابلہ نہیں کر سکتی

نے اپنی طرف سے کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔ قدرت خداوندی میں کوئی چارہ نہیں جو منظور خدا تھا، وہ ہوا۔ ہماری سلطنت سے بہت سا قیمتی علاقہ نکل گیا۔ ہمارے بھائیوں کے ساتھ ناگفتہ بہ مظالم ہو رہا ہے۔ جن کا طبیعت پر داغ ہے۔ اور جس کی یاد نہ صرف ہمارے لئے سوہان روح بنی ہوئی ہے۔ بلکہ آئندہ نسلوں کے لئے بھی منشاء زندگی صرف خیال انتقام ہوگا اس قدر فرما کر ہز ایکسلنسی انتہائے جوش میں کھڑے ہوگئے، تاہم سب کچھ کھو کر ہم کو وہ ایک بیش بہا چیز حاصل ہوئی جس نے اس نقصان کے خیال سے زیادہ تلافی کر دی۔ اور ان مصائب کی تاریکی میں وہی ایک روشنی ہے جس سے آئندہ کی امیدیں وابستہ ہیں۔ اور جس نے تمام قوم میں امید کی نئی روح پھونک دی ہے۔ اور یہ یقین ہے۔ کہ جو ہم کو اس لڑائی کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ کہ ہزاروں میل فاصلہ پر ہمارے درد میں برابر کا حصہ لینے والے موجود ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اخوت اسلامی اور ہمدردی کی مثال ہمارے سامنے پیش کرکے ہم کو اس قدر اخلاقی نفع پہنچایا ہے۔ کہ جس کو ہم عثمانی کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بلکہ فی الحقیقت یہ ایک ایسا گراں بار احسان ہے۔ جس سے ترک کسی وقت بھی سبکدوش نہیں ہو سکتے میں آپ کا اور ہندوستان کے تمام مسلمانوں کا اپنی طرف سے بحیثیت کمانڈر انچیف تمام عساکر عثمانیہ کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ میرا پیام ہندوستان ضرور پہنچا دیں۔ افسوس میں وقت معین نہیں کر سکتا۔ لیکن تاہم خلوص سے عرض کرتا ہوں کہ میرا دل احسان مندانہ خیالات سے اسقدر لبریز ہے۔ کہ ضرور ایک دن خود ہندوستان آپ کی مساعی جمیلہ کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں گا۔" مسٹر شعیب قریشی نے اس کے جواب میں کچھ کہنا چاہا۔ لیکن ہز ایکسلنسی کی تقریر نے سب کے قلوب میں کچھ ایسے مخصوص جذبات پیدا کر دیئے تھے۔ کہ اظہار خیالات کی قدرت باقی نہ رہی۔ قہوہ اور سگریٹ کی تواضع کے بعد ہز ایکسلنسی کھڑے ہوگئے۔ اور فرمایا کہ وقت خوشگوار ہے۔ باہر نکل کر مناظر قدرت کی سیر کیجئے۔ اول ہم کو چند خیمہ دکھلائے جو شاہ ناصر الدین قاچار کی آمد کے وقت ترکی میں تیار کرائے گئے تھے۔ قدیم صنعت کا عجیب نمونہ تھا۔ فارسی کے اشعار ریشم سے پردوں میں کڑھے ہوئے تھے۔ تمام کام نہایت قیمتی اور قدیم زمانہ عروج کی یاد کو تازہ کرنے والا تھا۔ یہاں سے پھر ہز ایکسلنسی ہم کو سمر ہاؤس میں لے گئے قدرت نے اس جگہ کو خود ہی حسین بنایا ہے۔ پھر اس پر حضرت انسان کا دماغ اور ترکوں کا مذاق۔ ان تمام باتوں نے مل جل کر اس جگہ کو خاص دل فریبی بخش دی ہے۔ پاشا حضرت ملوی نے چند دوربینیں منگائیں۔

اور دیر تک سب کو تمام خطوط مدافعت دکھلائے۔ اور ان کے متعلق خاص جدید اور قدیم تاریخی واقعات، ہر ایک کی وجہ تسمیہ بیان فرمائی اور اس جگہ سب کو جمع کرکے سب کے درمیان کھڑے ہوئے دوسرے پاشا اور ہم چاروں طرف حلقہ گرد ہو گئے۔ ہز ایکسلنسی نے ایوننگ پارٹی کا پہلے سے انتظام کر رکھا تھا۔ جس کا ہم کو اب تک علم نہ تھا۔ چنانچہ فوٹو کھلے خیمہ میں لئے گئے۔ جس میں ہز ایکسلنسی کی شایان شان سامان دعوت آراستہ تھا۔

سب سے زیادہ دل آویز چیز پاشا حضرت لمری کی عادات اور اطوار ہیں۔ ہر ملاقات پر جس بے تکلفی اور سادگی سے ہم لوگوں کے ساتھ برتاؤ کیا ہے۔ اس کا لطف کبھی نہ بھولیں گے۔ کئی مرتبہ یہ فرمایا کہ تم میرے بچہ ہو۔ اور واقعی ان الفاظ کی حقیقت اپنے افعال سے ہمارے دلوں پر نقش کر دی۔ فوٹو کے وقت بے تکلفانہ طرز سے کسی کو بغل میں لے لینا۔ بیٹھتے وقت نہایت ملاطفت اور محبت سے زبردستی اپنے پاس برابر بٹھانا۔ کوئی چیز میز پر سے خود اٹھا کر پیش کرنا۔ یہ سب کچھ اس قدر بے ساختگی

کیمپ میں جمع ہو گئے۔ لڑکیاں اور جوان عورتیں تو ایک طرف برقعہ پہنے ہوئے بیٹھ گئیں۔ لیکن بوڑھی عورتوں نے بری طرح گھیر لیا
اتھ۔ کوٹ کا دامن جو بھی سامنے آگیا پکڑ کر چومتی تھیں۔ بھرائی ہوئی آواز میں بار بار سوال کرتی تھیں۔ اب تم چلے جاؤ گے۔ خدا کرے
تم اپنے ملک میں خیر و عافیت سے پہنچو۔ اپنے عزیز و دوستوں سے خوش و خرم ملو۔ دائمی خوشی حاصل ہو۔

لیکن اب ہماری کون خبر لے گا" ان کی ان باتوں سے طبیعت کو سخت صدمہ ہوا تھا۔ غریبوں سے گھر چھوٹا۔ زمین چھوٹی۔
عزیز و اقارب مل گئے۔ اور اب بے بسی کی عالت میں ہیں۔ اکثر مہیروں کی حالت غیر ہو گئی۔ اور گھر آباد ہونا ناممکن ہو گیا۔ بعض عورتوں
اور بچوں کے انداز اور ان کے رہے سہے سامان سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ نہایت ہی شریف خاندان اور ناز و نعمت پروردہ ہیں
مگر اب گردش تقدیر سے پیر میں جوتا نہیں۔ رہنے کے لئے جھونپڑا نہیں۔ خدا کے آسرے کے سوا کھانے کا کوئی سہارا نہیں۔ آہ اس
گردش زمانہ تو نے کیسے کیسے گھرانے ویران صدہا معصوم بچے یتیم اور ہزارہا عروسان بیوہ کر دیں۔ اس کے بعد ہمارے ساتھیوں کی
باری آئی۔ جو شروع سے آخیر تک ہماری خدمت کرتے رہے۔ دو روز پیشتر بذریعہ تار ڈاکٹر انصاری نے ان کو بطور انعام دینے کی
اجازت منگائی تھی۔ اور یہ قرار پایا تھا۔ کہ ہر شخص کو ایک ماہ کی تنخواہ کے برابر مشن کی طرف سے دیا جائے۔ جو سپاہی کے دو روپے
اٹھارہ ان کے بشمول تین روپے ۱۲ آنے پاشر کے پانچ روپے ہوتے ہیں انکو ایک جگہ بلا کر دیا یہ منظر بھی ایسا نہ تھا جو جلد فراموش ہو جائے۔ ہر ایک
شخص گلے مل کر منہ گردن اور رخسار کے بوسے لیتا تھا۔ علیحدہ ہوتے وقت دو چار آنسو شانہ پر گرا جاتا تھا۔ اللہ اللہ کیا سچی
اور حقیقی محبت کے مظاہرے یہ لوگ ہیں۔ ہر مرد محبت۔ ایمانداری سادگی اور مروت کا زندہ نمونہ تھا۔ قناعت اور صبر ان
پر ہے۔ قریباً ۲ ماہ ایک جگہ رہنے کا اتفاق ہوا۔ تمام سامان خیموں میں تھا۔ اور یہی لوگ نگرانی کے لئے تعینات ہوئے
ان ہی کے ہاتھ میں تھی۔ مگر جہاں سے جو کچھ شے ادھر سے ادھر ہو گئی ہو۔ چلتے وقت وزیر وان نے ہر شخص کو حسب حیثیت
اپنی جیب سے کچھ نقدی پیش کی۔ اب ریل کا وقت آگیا تھا۔ ہم سب اس جم غفیر کے ساتھ اسٹیشن پر پہنچے۔ ریل آئی اور
اس میں سے ہز ایکسلنسی کے دو بادر دایڈی۔ سی۔ پی رشید بادر سواری اور محمد انور بے بادر بحری اترے۔
ان کو بھی پاشا حضرت لری نے ہم کو الوداع کہنے کے لئے بھیجا تھا۔ ان دونوں نے آتے ہی اول پاشا حضرت
لری کا سلام سب کو پہنچایا۔ اور ہز ایکسلنسی کا دستی تحریر کردہ مکتوب۔ ڈاکٹر رضا صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ خط
ترکی میں تھا۔ لفظی ترجمہ تو غالباً ڈاکٹر انصاری صاحب اپنی کسی تحریر میں بھیجیں گے۔ اگر مناسب سمجھا۔ لیکن اس کا
ماحصل یہ ہے۔

پاشا حضرت لری نے اپنی فوج اور قوم کی طرف سے ہماری خدمت اور ہندوستان کے مسلمانوں کی سچی ہمدردی
کا جو انہوں نے ایسی مصیبت کے زمانہ میں ترکوں سے کی۔ نہایت قیمتی الفاظ میں اعتراف کیا۔

اس وقت ہم سب ریل میں سوار ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر رضا صاحب نے باہر نکل کر انگریزی میں ایک برجوش
تقریر کی جس میں عام طور پر ترکوں کے اخلاق اور محبت بھرے برتاؤ کا جو انہوں نے اس دوران قیام میں ہمارے
ساتھ برتا اور پاشا حضرت لری کے الطاف شاہانہ کا خصوصاً تذکرہ تشکر آمیز الفاظ میں کیا۔ آخر میں حضرت خلیفۃ
سلطان المعظم قوم ترک اور باشی کمان دان حضرت احمد عزت پاشا کی درازی عمر ترقی دولت اور خوش حالی

سے کرتے تھے۔ کہ تصنع کی بو بھی نہ پائی جاتی تھی۔ ہنس کر فرمانے لگے۔ اگرچہ میں روزانہ ۸، ۹ میل پیدل چلتا ہوں اور دو گھنٹہ
سواری پر تا ہم میں موٹا ہو گیا ہوں۔ اس وقت بہت سے ڈاکٹر موجود ہیں۔ کوئی دوا بتلائیے کہ جسم ہلکا ہو جائے۔ پھر فرمایا۔ کہ
کیا ہندوستان میں بھی آدمی موٹے ہوتے ہیں۔ جس پر ہم میں سے ایک صاحب نے سید اسماعیل حسین شیرازی کو پیش کیا۔ کہ حضور
تو یہ ہیں۔ لیکن ہندوستان میں تو ایسے موٹے ہیں۔ کہ وہ کوئی حرکت بھی نہیں دے سکتے۔ حضرت فواد پاشا بہت ہنسے اور فرمایا۔ کہ
خدا کا شکر ہے۔ کہ میرے ساتھی اور بھی ہیں۔ اتفاق سے عبدالرحمٰن پشاوری علالت طبع کی وجہ سے رخصت ہونے نہ آئے۔ فوراً سوال کیا
"برادر افغان کجا است" مجھ سے فرمایا تم سے تو میں گفتگو سہولت سے کر سکتا ہوں۔ کیونکہ میں فارسی سمجھتا ہوں عربی بولتا ہوں۔
فارسی بولتے ہو۔ غالباً پہلی ملاقات میں ہم نے اسی طرح باتیں کی تھیں۔ غرض یہ وقت اس قسم کی پر لطف باتوں میں گذرا۔ چلتے وقت
بعض ممبروں نے سب پاشاؤں سے درخواست کی۔ ہماری نوٹ بک میں دستخط کر دیجئے۔ غلام احمد خاں کی نوٹ بک کسی قدر بڑی
تھی۔ حضرت فواد پاشا جو بڑے مشہور شکاری اور نہایت ہی با مذاق آدمی ہیں۔ نوٹ بک دیکھ کر فرمانے لگے۔ کہ یہ تو اچھا خاصا رجسٹر ہے
اور قلم لے کر اول اپنی تصویر بنائی نیچے دستخط کئے۔ تصویر اس قدر صحیح ہے۔ کہ سر مو فرق نہیں۔ پہلی نظر میں آدمی پہچان سکتا ہے۔ کہ یہ
کسی کی تصویر ہے۔ ٹوپی کے شکن تک دکھا دیئے ہیں۔ اس کے بعد ہم نے واپسی کی رخصت چاہی۔ مصافحہ کے ساتھ ہم نے چاہا۔ کہ
دست بوسی کریں۔ بمشکل سے ہاتھ چومنے دیا۔ لیکن خود سب کے منہ چوم لئے۔ گھوڑے کسی قدر فاصلہ پر تھے۔ فرمایا میں گھوڑوں تک
پہنچانے چلوں گا۔ بڑی منت سماجت سے روکا۔ اس جگہ ہوا کی وجہ سے سردی بہت زیادہ تھی۔ بعض ممبر باوجود ضبط کے آثار
سردی کو نہ چھپا نہ سکے۔ پاشا نے ہم کو رخصت کرنے کے بعد ایک افسر کو کچھ اشارہ کیا۔ وہ جھپٹ کر ہم سے آملا۔ ایک جگہ کودنے
کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ ہم کو وہاں لے گیا۔ تمام نوجوان افسروں کو وہیں جمع کر لیا۔ پہلے خود کودے پھر ہم سے مصر ہوئے کہ تم بھی
کودو۔ مجبوراً سب کودے۔ پاشا کھڑے دیکھتے رہے اور نہایت ہی بزرگانہ انداز سے اظہار مسرت فرمایا کئے۔ غلام احمد خاں سب
سے زیادہ کودے۔ اس پر بہت خوش ہوئے۔ اس سے یہ فائدہ ہوا۔ کہ سردی جاتی رہی۔ اور غالباً پاشا حضرت کی بھی یہی منشاء
تھا۔ اس کے بعد گھوڑے آگئے۔ اور ہم سوار ہو کر مغرب کے قریب ہنستے کودتے اپنے کیمپ میں پہنچ گئے۔ اب تک ہم مہاجرین کو
برابر کھانا پہنچاتے رہے تھے۔ لیکن ۲۴ کو چونکہ روانگی یقینی تھی۔ اس لئے یہ تجویز قرار پائی کہ ایک ہفتہ کی پوری رسد انہیں بھیج دی
جائے۔ اس کے بعد خدا مالک ہے۔ چنانچہ ۲۴ کی صبح کو ہر مہاجر کے مکان پر ایک ہفتہ کی پوری رسد پہنچا دی گئی۔ تقریباً ۱۱ بجے جنرل
عبدالسلام پاشا مع اپنے اسٹاف کے ہمارے کیمپ میں تشریف لائے۔ اور فرمایا کہ میرا خود بھی جی چاہتا تھا۔ کہ تم کو ریل میں سوار
کرانے آؤں۔ لیکن حضرت بلوری نے آج علی الصباح مجھے طلب فرما کر ارشاد فرمایا کہ آپ میری طرف سے عموم ہندوستان [illegible]
کے ممبران کو رخصت کرنے جائیں۔ اور میری طرف سے اظہار معذرت کریں۔ کہ میں خود آپ لوگوں کو رخصت کرنے آتا۔ لیکن بوجہ
عدیم الفرصتی میں اپنی اس خواہش میں ناکامیاب رہا۔ چنانچہ میں اس وقت حضرت پاشا کمانڈان کا قائم مقام بن کر نیز اپنی طرف سے
تم لوگوں کو رخصت کرنے آیا ہوں۔ ہمارے ممبروں کے لئے یہ وقت نہایت دشواری کا تھا۔ تمام اسباب میکین میں بار کرانا
نواح کی فوجوں کے افسر ڈاکٹر رخصت کرنے کے لئے جوق در جوق چلے آرہے تھے۔ ان کو بٹھانا۔ بات چیت کرنا۔ سب سے
زیادہ قیامت خیز سماں مہاجرین بلقدیہ کوئی کا ہجوم تھا۔ عورت، مرد، بوڑھے بچے موضع میں کوئی بھی نہ رہا۔ سب ہمارے

ہم بتلاتے ہیں۔ اس پر عمل کرو۔ سب سے زیادہ خطابات اس ناچیز کے ملے جلد جلد جو نہ ہوتے تھے۔ پیار سے کوئی نے شوکو راحت ... آغا
دلبخش ہوا ہے کو سنجیدہ نام ہے۔ یاد فرمایا کہ خلیق صاحب نے منشی دلاور علی چٹھی رساں کے ہر دلعزیز لقب سے ملقب فرمایا۔ بہرحال
وہ ایک خاص دلکش مسرت آمیز منظر تھا جو کبھی فراموش نہیں ہو سکتا۔ کیمرج جہاز میں ہمارے ساتھ جو وفد ہے اور دیگر اصحاب
ہلال احمر کی طرف سے مامور ہو کر اس شفاخانہ کا سامان لینے آئے تھے۔ ان سے قدر شفاخانہ کی بے تکلفانہ واقفیت تھی۔
وہ قریب کچھ عرصہ تک تو حیران دیکھتے رہے۔ کیونکہ منظر ان کے لئے بالکل نیا تھا۔ لیکن بعد میں وہ بھی ہماری خوشیوں میں شریک
ہوگئے۔ جب خوب دل کے ارمان نکل چکے تو سب مل کر پھر کام میں مشغول ہوئے۔ شاید میں شروع عریضہ میں لکھ چکا ہوں۔ کہ ڈاکٹر
انصاری صاحب نے ہلندیہ اور چناق قلعہ ہر دو شفاخانہ جات کو کچھ تھوڑے سے تقدم تاخر کے ساتھ بند کرنے کی ہدایات
ایک ساتھ روانہ فرما دی تھیں۔ یہاں کے لئے۔ یہاں کے لئے یہ ارشاد تھا۔ کہ ۲۲ کو وہ مریض جن کا علاج شفاخانہ میں رکھ کر کیا
جاتا ہے۔ رخصت کر دیئے جائیں۔ اور ۲۴ کو دوا لے جانے والے مریضوں کو بھی نہ لیا جائے۔ یہ اطلاع یہاں ۱۹ کو پہنچی۔ چونکہ
شفاخانہ کے بعض ملازم خاص چناق قلعہ کے رہنے والے تھے۔ اس لئے فوراً یہ خبر شہر میں گشت کر گئی۔

شفاخانہ کے مریضوں پر تو رخصت کی خبر کا اثر وہی پڑا۔ جو ہلندیہ کوئی کی بابت میں لکھ چکا ہوں۔ لیکن باہر سے دوا لے جانے والے
بیماروں نے حق میں بعض عیسائی بھی تھے۔ اپنی احسان مندی کا اظہار اور مصاحبین و تیمارداروں کے اچھے برتاؤ کا اعتراف بالکل نئی
طرز میں کیا۔ عورتوں میں جن میں طبقہ غرباء اور پاشاؤں کی بہو بیٹیاں تک شامل تھیں اپنے ہاتھ کے کڑھے ہوئے ریشمی رومال،
سلیپر و دیگر مختلف ہدایا نام بنام ہر ممبر کے لئے بھیجے۔ بچوں نے روزانہ گلدستے بنا کر پیش کرنے شروع کر دیئے۔ غرباء حسب
مقدرت مٹھائی، اور دودھ کے ہدیہ روزانہ پہنچا جاتے تھے۔ حسب ہدایات ڈاکٹر انصاری کے ۲۴ کو علی الصباح شفاخانہ کے تمام
مریض فوجی شفاخانہ میں بھیج دیئے گئے۔ رخصت ہوتے وقت بیماروں نے جس خلوص اور حقیقی محبت کا اظہار ہر ایک ممبر کے
ساتھ کیا۔ اس کی مثال ہندوستان میں مفقود ہے۔ یہاں کی کیفیت میں نے سنی ہے۔ اور ہلندیہ کا واقعہ چشم دید ہے۔ اس
کی اجمالی کیفیت کے لئے میں صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ ہر دو جگہ کے بیمار ہم سے اسی طرح رخصت ہوئے جیسے بھائی
بھائی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوتا ہے۔

۲۵ مئی سے ہندوستان جانے والے اسباب کو پیک کرنا شروع کر دیا اور باہر کے آنے والے مریضوں کو بھی بادل نخواستہ جواب
دینا پڑا۔ ان مریضوں میں اکثر مہاجرین ہوتے تھے۔ ان کو جواب دیتے ہوئے صدمہ ہوتا تھا۔ مگر کیا کیا جاتا مجبوری۔ گو چناق قلعہ
والے ممبر ایک دفعہ عثمانی بیڑہ کی سیر کر چکے تھے۔ لیکن تاہم امیر البحر طاہر بے کا یہ وعدہ تھا۔ کہ جب کل ممبر یہاں جمع ہوں گے۔ اس وقت
بھی آپ کو سیر کرائی جائے گی۔ ڈاکٹر رضا خاں صاحب نے ۲۷ کو اطلاع کرا دی کہ ہمارے سب ممبر آگئے ہیں حسب وعدہ سیر کرائی
وہاں سے ایک اسٹیمر لینے کے لئے آیا۔ اور ہم سوار ہو کر سب سے پہلے خیر الدین باربروسہ پر پہنچے۔ یہ سب سے بڑا جہاز ہے۔ اور
امیر البحر اسی میں رہتے ہیں۔ اس جہاز کے نائب کپتان انگریزی خوب بولتے ہیں۔ انہوں نے ہر چیز تفصیل کیساتھ دکھلائی۔ سیلون میں قہوہ،
سگریٹ کی تواضع کے بعد ہر ممبر کو مانجار ہی اور، یونانی گولوں کے ٹکڑے جو اس جہاز پر پھٹے تھے پیش کئے۔ چناق قلعہ کے شفاخانہ کے
ممبر اس جہاز کے سپاہیوں سے فٹ بال میچ بھی کھیل چکے تھے۔ کپتان نے یہ درخواست کی۔ کہ کھیلنے والے فریقین کا ایک گروپ بطور

دعا اور ہر ایک کے بعد ۲-۳ دفعہ نعرہ ہائے مسرت بلند کئے۔ تقریر ختم کی۔ ساتھ ہی گاڑی ہم کو لے کر استنبول روانہ ہو گئی۔ شعیب چشتوں پر الواح نصب کرائے جو مشن کی یادگار کے لئے کندہ کرائی گئی تھیں۔ اور مکتب و مسجد بنڈیرما کی تکمیل کے لئے وہیں رہ گئے۔ ہم استنبول تقریباً پانچ بجے شام کو پہنچے۔ ندوۃ شستہ خانہ میں حسب سابق ہمارے ٹھہرنے کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ سب وہاں جا کر ٹھہرے۔ ڈاکٹر انصاری چونکہ مہاجرین کے آباد کرنے کی غرض سے زمین دیکھنے اناطولیہ جانے والے تھے۔ اور اتمام حصہ ہمارا استنبول رہنا فضول تھا۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب نے یہ تجویز کیا کہ ہم سب لوگ بھی چناق قلعہ چلے جائیں۔ وہاں دوسرے حصہ مشن کو اسباب وغیرہ پیک کرنے میں مدد دیں۔ اور پھر سب ایک ساتھ شروع ماہ جون میں استنبول چلے آئیں۔ ہلال احمر کا جہاز "گیرج" جو یونانیوں سے اسی لڑائی میں ترکوں نے لیا ہے، وہ بیماروں کو گیلی بولی اور چناق قلعہ سے لانے کے لئے آتا جاتا ہے۔ اس میں یہ سفر مفت طے ہو جائے گا۔ ۲۵ مئی کو عبد الرحمن صاحب نے منیجر ہلال احمر کے دفتر سے جہاز کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ آج شام کو جائے گا۔

آج شعیب بھی بلندیہ کوئی سے آگئے۔ لیکن چونکہ ان کو اپنے حصہ مشن کا حساب کتاب منیجر صاحب کو دینا تھا اس لئے وہ ہمارے ساتھ چناق قلعہ نہ جا سکے۔ ڈاکٹر محمود اللہ اپنے ضروری کام کی وجہ سے استنبول رہ گئے۔ باقی سب ممبر رات کو دس بجے "گیرج" میں سوار ہو گئے۔ ۲۷ کو ایک بجے چناق قلعہ پہنچے یہاں سب کو یہ تو معلوم تھا۔ کہ بلندیہ کوئی والے اپنا شفا خانہ بند کر کے چناق قلعہ آئیں گے۔ لیکن تاریخ آمد معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ہمارا اس وقت پہنچنا بالکل اچانک ہوا۔

میں ایک دفعہ پہلے مشن کے کچھ کاغذات لینے یہاں آچکا تھا۔ اس لئے راستے سے واقف تھا۔ سب میرے ہمراہ شفاخانہ پہنچے شفاخانہ میں عجیب افراتفری مچی ہوئی تھی۔ ہر شخص کسی نہ کسی کام میں مصروف تھا۔ کوئی فہرست بنا رہا تھا۔ کوئی اشیاء کے شمار میں مصروف کوئی پیک کرنے میں مشغول۔ بہر حال ہم اس گڑبڑ سے مستفید ہو کر بلا اطلاع ان کے قریب پہنچ گئے اور چناق قلعہ والوں کو قطعاً علم نہ ہوا۔ ہم سب نے اپنے لئے ایک ایک آدمی آنکھیں بند کرنے کے لئے منتخب کر لیا۔ اور قریب تھا کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر چناق قلعہ والوں کو کچھ دیر ستاتے۔ لیکن کالا کوا سیانا مشہور ہے۔ مسٹر انور الحسن) کی بیقرار نظریں کہاں چوکتی تھیں۔ فوراً دیکھ لیا۔ اور جب دیکھ لیا تو پھر ان کی طرح ان کا چلبلا دل پہلو میں کب ٹکنے بیٹھنے لگا تھا۔ نوری بے اسی زور سے نعرہ مسرت بلند کر کے ہماری طرف جھپٹے جیسے کسی کی قیمتی چیز مدتوں کی کھوئی ہوئی اتفاقیہ پا جائے۔ پھر کیا تھا۔ آن واحد میں دو دو مل کر ایک ہو گئے۔ جو لوگ کہ ابھی فنا ہونے کے مجسمہ تھے چناق قلعہ جیسی جگہ میں اپنی خوش مزاجیوں کے بہت سے موقعوں پر ترکوں جیسی متین قوم سے بھی داد وصول کر چکے تھے۔ اس وقت ان میں ہر فرد اسکول کے لڑکوں سے شوخیوں میں کوئی سبقت لے جا رہا تھا۔ ہر شخص بہ مقتضائے وقت فقرے کسے جا رہے تھے۔ پہلا خطاب جو غریب بلندیہ کوئی والوں کو شہر چناق قلعہ کے رہنے والوں سے عطا ہوا وہ "دیہاتی" تھا۔ ایک صاحب نے نہایت کرم گستری فرما کر معلم کی خدمت اپنے ذمہ لی۔ اور ہم کو شہر کے آداب و قواعد سکھانا شروع کئے "بھئی تم گو دیہاتی ہو۔ لیکن ہمارے بھائی ہو اگر یہاں کے لوگوں نے تمہاری گنواری عادات دیکھیں تو ہم کو بھی شرمندہ ہونا پڑے گا۔ اس لئے مناسب ہے۔ کہ تم ہر چیز غور سے دیکھ لو۔ اور سمجھ لو

کہ ۴۰-۵۰ میل تک بحر مارمورا کے برابر چلی گئی ہے۔ ایک طرف سمندر اور دوسری طرف پہاڑ سبزہ زار ہیں دو طرفہ درختوں کی قطار
چلی گئی ہے۔ اور بعض حصوں میں صرف ایک طرف پہاڑ کی چڑھائی اترائی کو اس خوبصورتی و خوش اسلوبی سے کاٹا ہے۔ کہ قطعاً گاڑی کے
گھوڑے کو نقصان نہ معلوم ہو۔ ایک پہاڑی سے اترتے وقت میں نے شمار کیا تو دس دفعہ گاڑی نے ایک جگہ گشت لگایا۔ گیارہویں دفعہ سیدھی سڑک پر گھوڑے
پڑے۔ سڑک وسیع اینٹوں پھر نہایت ہموار کٹا ہوا۔ قدرتی مناظر اور دنیاوی دلفریبیوں کی یہ زمین مظہر ہے۔ جابجا پانی کے چشمے اور نا
دونوں طرف پھولوں کے قطعات، زیتون اور چیڑ بے حساب۔ انگور کی کشت زار ہیں تو یہاں اس طرح ہیں۔ جیسے ہندوستان میں مول
کے لئے گوار بے اندازہ کاشت کر دیتے ہیں۔ راستہ میں سب سڑک قصبہ ازنیق کوئی آیا۔ اس میں مسلمان بھی ہیں۔ لیکن زیادہ تر یونا
عیسائیوں کی آبادی ہے۔ ڈاکٹر حسن بے ہم کو اس قصبہ کے اندر لے گئے۔ کیونکہ کرنل راجب بے جو اس نواح کی تمام افواج کے
ہیں۔ اس قصبہ میں ان کا صدر مقام ہے۔ کرنل صاحب کے مکان پر گئے۔ وہ ہم سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ اپنے صاحبزا
سے ملایا۔ جو استنبول کے طبیہ دار العلوم میں پڑھتے ہیں۔ قہوہ سگریٹ پیش کیا۔ کھانے کے لئے بہت مصر ہوئے۔ لیکن ڈاکٹر حسن
نے شکریہ کے ساتھ یہ کہہ کر انکار کر دیا۔ کہ ہمارے ساتھ موجود ہے۔ وہ ضائع ہو گا۔ کرنل صاحب سے رخصت چاہی۔ تو باوجود
سی التجاؤں کے شہر سے باہر تک دھوپ میں پہنچانے آئے۔ راستہ میں جابجا سڑک سے متصل فوجی چھاؤنیاں تھیں۔ ہماری وردی
سے پہچان کر ہر جگہ سے افسر دوڑتے تھے۔ اور جب تک ہم کچھ دیر ٹھہر کر قہوہ سگریٹ نہ قبول کر لیں۔ تب تک نہ چھوڑتے تھے
راستہ طے کرنے کے بعد ہلال احمر کا ایک شفاخانہ ملا۔ جس میں ٹھہر کر ہم نے کھانا کھایا۔ شفاخانہ میں گرم نیم بوش بربیضہ مرغ۔ دہی
قہوہ ملا۔ غرض ان عجائبات قدرت کی سحر آفرینیوں سے حظ اٹھاتے شام کے قریب ہم چم ادرہ پہنچے۔ چم ترکی میں
اور ادرہ چھوٹے موضع کو کہتے ہیں۔ یہاں چیڑ کے درخت بھی بکثرت ہیں۔ اور شفاخانہ کے قریب ایک چھوٹا سا موضع ہے
کو درختوں کے مناسب سے چم ادرہ لکھتے ہیں۔ شفاخانہ ایک سرسبز پہاڑی پر قائم ہے۔ جابجا درختوں کا سایہ و جانب مش
ایک پہاڑی کی اوٹ میں تقریباً ۳ میل پر بحر مارمورا۔ اور قلعہ جات سدالبحر اور کم الے اس قدر قریب ہیں۔ کہ شب کے وقت
کی تفتیشی روشنی نظر آتی ہے۔ اس شفاخانہ کا کل سامان برٹش ہلال احمر کا ہے۔ جو وہ چلتے وقت فروخت کر گئے تھے
اس قدر سبک مضبوط۔ کارآمد اور نفیس تھی۔ کہ بار بار دیکھ کر رشک آتا تھا۔ کہ کاش ایسا ہی سامان ہمارے پاس بھی
شفاخانہ کی صفائی اور حسن انتظام اس قدر اعلیٰ تھا۔ کہ اس سے پیشتر اس خوبی کا آراستہ نظر سے نہ گذرا تھا۔ شفاخانہ کے
خیمے، بیماروں سے معمور تھے۔ اس لئے ہمارے لئے جدید خیمے اس وقت نصب کئے گئے۔ ڈاکٹر حسن بے کی غیر متناہی عنا
اور بے حد مہربانیوں کا اظہار کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ باوجودیکہ وہ بھی ہماری طرح تھکے ہوئے تھے۔ اور ۴۶ میل دو
میل سواری کر کے یہاں پہنچے تھے۔ لیکن ایسی خود فراموشی کی مثال مشکل سے ملے گی۔ جو انہوں نے ہم کو دکھلائی۔ ہمار
خدام اور ماتحت عملہ کے موجود ہوتے ہوئے خود نصب کرائے۔ بستر سب کے اپنے ہاتھ سے لگائے۔ چارپائیاں
اٹھا کر لائے۔ غرض باوجود سب کے منع کرنے کے سب کام خود کرتے تھے۔ اور ہم لوگوں کو اصرار پر ایک مختصر جواب یہ تھ
لوگوں کی خدمت کا پھر کب موقع ملے گا۔ رات کو کھانا کھا کر تھکان کی وجہ سے سب گہری نیند سوئے۔

یادگار میں لینا چاہتا ہوں۔ اگر آپ لوگ بھی اس خیال کو پسند کریں۔ سب بخوشی آمادہ ہوگئے۔ اور جہاز کے سامنے کے حصہ پر توپوں کے سایہ میں یہ گروپ لیا گیا۔ اس کے بعد کل مشن اور جہاز کے افسر بیٹھے۔ عثمانی جھنڈا کھولا گیا۔ توپیں کسی قدر نیچی کر کے ایک گروپ لیا گیا۔ یہ گروپ نہایت شاندار اور خوبصورت ہے۔ اس کے بعد حمیدیہ کو دیکھنے گئے۔ حمیدیہ اور مجیدیہ بالکل ایک ہی قسم کے جہاز ہیں بحری افسر عام طور پر انگریزی جانتے ہیں۔ اس لئے سیر میں نہایت سہولت ہوگئی۔ جہازوں کی صفائی، سپاہیوں کی مستعدی، اور تنومندی قابل حیرت تھی۔ صوم و صلوٰۃ اور پابندی احکام خدا اور رسول جس قدر جہازوں میں دیکھے۔ اتنے دوسری جگہ کم ہوں گے نماز کا وقت ہوتے ہی امیر البحر کے جہاز پر نماز کا جھنڈا اڑا دیا جاتا تھا۔ اس کو دیکھ کر تمام جہاز والے تقلید کرتے ہیں اور ہر جہاز کا موذن بلندی پر چڑھ کر اذان دیتا ہے۔ اور پھر جماعت کے ساتھ نماز ہوتی ہے چلتے وقت اس جہاز پر بھی ہمارے مشن کا ایک گروپ لیا گیا۔

اس کے بعد تھرموٹ ہیٹس وغیرہ دیکھے۔ ایک جہاز دیکھنے کے بعد دوسرے جہاز میں ہلال احمر عثمانی کی طرف سے شام کو عمائدین شہر، کلکٹر ضلع، پولیس کمشنر، فوج کے پاشا و دیگر افسروں کی طرف سے سرکاری باغ میں الوداعی پارٹی کا انتظام تھا۔ دعوتی کارڈ پہلے آچکے تھے۔ اس لئے وقت معین پر وہاں پہنچے۔ دعوت کا انتظام، زیبائش اور آرائش میزبانوں کی شایان شان تھی۔ قابل ذکر وہ لکچر تھے جو جلسہ و دیگر اراکین کی طرف سے دیئے گئے۔ ان کا مضمون نقل کرنا دشوار ہے۔ صرف مختصراً اتنا کہہ دینا کافی ہے۔ کہ اختتام جلسہ پر ہم سب کے دلوں میں ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا۔ اور وہ یہ کہ الحمد للہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سعی رائیگاں نہیں گئی۔ دنیا میں مقبولیت تو آنکھوں سے دیکھ لی۔ کچھ بعید نہیں کہ درگاہ عالی میں بھی مقبول ہوجائے۔

کوئی نئی چیز دیکھنے کی باقی نہیں رہی۔ بجز اس کے کہ نئے آدمیوں سے ملاقات ہوجائے۔ یہاں سے اسٹیمر میں بیٹھ کر چناق قلعہ واپس آئے چناق قلعہ میں علاوہ شفاخانوں کے ہلال احمر عثمانی کی طرف سے بھی ایک بہت بڑا شفاخانہ قائم ہے۔ اس کے طبیب اعلیٰ ڈاکٹر رحمن بے ہیں۔ ڈاکٹر رحمن و دیگر ممبران سے ان کے اخلاق اور صفات حمیدہ، کی اکثر تعریف سنا کرتا تھا۔ لیکن اب تک ذاتی تعارف کا موقع نہ ملا تھا۔ ۲۰ کی صبح کو ان کا پیام آیا کہ سواریوں کا انتظام ہوگیا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے۔ کہ آپ ایک دو شب میرے سیار شفاخانہ میں گذاریں۔ وہاں کی سیر کے ساتھ میری آرزو بھی پوری ہوجائے گی۔ ہمارا تمام اسباب پیک ہوچکا تھا۔ صرف تھوڑا سا سامان ہلال احمر کو سونپنا باقی تھا۔ اس کیلئے نور الحسن عبد العزیز انصاری، خلیق الزمان، منظور علی خاں صاحبان نے ذمہ لے لیا۔ کہ یہ کام یہاں رہ کر ہم انجام دے دیں گے۔ اور ڈاکٹر نفیضی صاحب بھی اس تجویز سے متفق ہوگئے اور ڈاکٹر رحمن بے کو جواب لکھ دیا گیا ہم تیار ہیں۔ آپ تشریف لے آئیں اصل میں اس سفر کا محرک ڈاکٹر رحمن کا سیار شفاخانہ نہ تھا بلکہ اشتیاق پیدا یہ کہ چناق قلعہ سے تقریباً ۲۵ میل ہیلیس ٹرائی ہے۔ جو پرانا تاریخی مقام ہے۔ دوسرے یہ جی چاہتا تھا۔ کہ ترکوں کی اصل زندگی کا مطالعہ کیا جائے۔ شہروں میں عام طور پر یورپین تہذیب کا پردہ پڑا ہے۔ دیہات میں یقیناً ترکی زندگی کا صحیح نقشہ ملے گا۔ تقریباً ۸ بجے صبح کے ۳ شکرم اور ۱۰ گھوڑے آگئے۔ چند آدمی دھوپ کے خیال سے شکرموں میں بیٹھ گئے۔ باقی گھوڑوں میں سوار ہو کر روانہ ہوگئے۔ ہندوستان بیٹھے یہ سنا کرتے تھے۔ کہ ٹرکی میں پختہ سڑکیں نہیں۔ لیکن جس سڑک پر ہم کو اس وقت اتفاق ہوا۔ وہ بہت سی وجوہ سے اپنی آپ ہی نظیر ہے۔ یورپ کے تعلیم یافتہ ڈاکٹروں نے اسکاٹ لینڈ یا آئرلینڈ میں ایسی سڑک کا ہونا بیان کیا۔ لیکن ہندوستان میں تو یقیناً ایسی شاہراہ دیکھنے میں نہیں آئی۔ سب سے بڑی دل فریبی اس میں یہ ہے

۱۹ کی صبح کو خیال تھا۔ کہ نواح کی سیر کو جائیں گے۔ لیکن سید تونگر حسین کو تھکان کی وجہ سے بخار آگیا۔ اور حامد رسول صاحب
بھی آج زین سواری کے لئے تیار نہ تھے۔ چونکہ باوجود بہت سے حفظ ماتقدم کے زین کی سختی کی وجہ سے کرسی پر بیٹھنے میں تکلیف
معلوم ہوتی تھی۔ اس لئے ڈاکٹر حسن بے نے آج کا دن آرام کے لئے رکھا۔ شام کے وقت دھوپ کسی قدر نرم ہوئی۔ تو ڈاکٹر فوزی
ڈاکٹر رضو سید اسمٰعیل حسین شیرازی، میں اور چند دیگر اصحاب گھوڑے لے کر نکلے۔ دس میل پر ایک موضع تھا۔ لوگ پہلے تو دیکھا کر
ہوئے۔ لیکن جب ہلال احمر کے ڈاکٹر کا علم لے لئے جو ہمارے ساتھ تھے۔ ان کو بتلایا کہ یہ ہندوستانی ہلال احمر کے ڈاکٹر ہیں اور
کام ختم کر کے اپنے بھائیوں کو یہاں دیکھنے آئے ہیں۔ تو فوراً ہمارے گھوڑے پکڑ کر ہم کو اتارا۔ ایک قہوہ خانہ میں لے گئے
گھاس کی بنی ہوئی بہت سی چھوٹی چھوٹی کرسیاں لا کر ڈال دیں دو تخت وہاں پہلے سے پڑے ہوئے تھے۔ کرسیوں پر ہم و مجیبا
موضع کے معمر اور باا ثر آدمی تختوں پر بیٹھے۔ باقی آدھے قطار لگا کر سامنے زمین پر بیٹھ گئے۔ ایک آدمی اسی وقت موضع کے مولوی صاحب
کو بلانے کے لئے بھیجا گیا۔ میں یہ لکھنا بھول گیا تھا۔ کہ چناق قلعہ سے انسپکٹر مدارس ضلع بھی ہمارے ساتھ آئے تھے۔ اور اس جگہ وہ
ہمراہ تھے۔ انسپکٹر صاحب نے مولوی صاحب سے اسکول کے متعلق کچھ سوالات کئے۔ ان سے معلوم ہوا۔ کہ مختصر پیمانہ پر زنانہ مردانہ
دونوں اسکول ہیں۔ لڑکیوں کو قرآن شریف پڑھا کر امور خانہ داری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کشیدہ کاڑھنا، کھانا پکانا وغیرہ اس کے
لئے ایک عورت مامور ہے۔ بچوں کو ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے۔ جس میں بعد مذہبی تعلیم کے تھوڑا حساب جغرافیہ بھی شامل ہے۔ ایک
بات ہم نے خاص طور پر دیکھی ہے۔ کہ حاضرین میں جوان کوئی اتفاقیہ ہی تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ صرف اس موضع سے
۷۰ آدمی لڑائی پر گئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں قہوہ آیا اور سگریٹ کی جگہ اناطولین تمباکو اور کاغذ پیش کیا گیا۔ دیا سلائی کی جگہ مٹی کی
کے ٹکلے پیالے اس میں رکھے۔ اور چند آگ کی چنگاریاں پڑی ہوئی۔ اس سے سگریٹ بنا کر سلگا لئے گئے۔ جب ہم نے رخصت
چاہی تو نہایت خلوص اور سادگی سے مصر ہوئے۔ کہ آج رات یہیں گزاریے۔ ہمارا جی بھی چاہا کہ مگر ڈاکٹر حسن بے متفکر ہوئے۔ اس
لئے واپسی ہی مناسب معلوم ہوئی۔ یہ جگہ اور بعد میں دوسرے دیہات دیکھ کر یہ قیاس بے جا نہ ہوگا۔ کہ تمدن، تہذیب مذہبی
احساسات اور عام طرز معاشرت میں استنبول سے قطع نظر کر کے دیہات اور قصبات ہم ہندوستانی مسلمانوں سے بدرجہا
فائق ہیں۔ مکانوں کا طرز تعمیر۔ ان کی صفائی ستھرائی۔ عورتوں کی تعلیم پردہ اور حیا۔ مردوں کا ستر پوش لباس۔ نماز، روزہ و دیگر
اسلامی احکام کی تکمیل۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ جن پر وہ مسلمان جن کو خدا نے ان تمام نعمتوں سے مستفیض فرمایا ہے۔ بجا طور پر ناز کر سکتے
ہیں۔ مستورات بے تکلف باہر نکل کر کام کرتی ہیں۔ لیکن ایسے گہرے پردے میں کہ مجال نہیں غیر مرد ان کی ایڑی بھی دیکھ پائے۔ ہم
نے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے بعض مستورات کو دیکھا۔ سر سے پاؤں تک برقعہ میں ڈھکی ہوئی اور اس پر بھی جب ان کی نظر ہم پر پڑی
تو فوراً کھیت میں بیٹھ گئیں۔ دیہات میں دھوبی کا نام نہیں۔ امیر گھروں میں خادمہ اور متوسط و غربا میں اپنے کپڑے خود دھو لیتے ہیں
ہر گھر میں چھوٹا سا باغیچہ ضرور ہوتا ہے۔ کبھی کسی بچہ کو برہنہ یا میلا کچیلا نہیں دیکھا۔ مردوں کا لباس ہمارے افغانی بھائی ہنگ وال
سے بہت ملتا جلتا ہے۔ شلوار، پگڑی۔ بعض جگہ خط و خال بھی بہت ملتے جلتے ہیں۔ صرف امتیازی نشان ہر مرد میں یہ ہے۔ کہ
افغان تند خوئی میں ضرب المثل ترک نرم خوئی میں عدیم المثال۔ بہر حال یہاں سے رخصت ہو کر دن چھپے ہم واپس شفاخانہ میں
پہنچے۔ راستہ میں قابل ذکر واقعہ درپیش آیا۔ کہ تمام گھوڑے شیرازی صاحب کی شہسوارانہ ران سے آشنا ہو گئے۔ بار بار گھوڑے بے

یلن غریب سے غریب گھوڑا بھی ان کی ران کے نیچے آکر بدلگامی کرتا تھا جس کی وجہ سے مجبور ہو کر کئی ایک دفعہ تو بادل نخواستہ زیر
پڑا پڑتا۔ بارے خدا خدا کر کے راستہ طے ہوا۔ ڈاکٹر حسن بے نے شفاخانہ پہنچ کر چناق قلعہ ٹیلیفون کر دیا تھا۔ کہ ایک اچھا
ڈاکٹر افریان بھیج دیا جائے۔ چنانچہ ۲۹ کی شام کو وہ آگیا۔

۳۰ کی صبح کو ڈاکٹر حسن بے نے اول مختلف گروپ اپنے شفاخانہ کے لئے۔ اس کے بعد ایک بیٹھ کر دوسرا حسب گھوڑوں پر سوا
ہو کر چلنے کے لئے تیار ہوئے اس وقت ہمارا اور اپنے اسٹاف کا شاہی گروپ لیا۔ گھوڑوں والا گروپ خصوصاً شاندار ہے۔ ناشتہ ہم
سب کر چکے تھے۔ دوپہر کے لئے دو ٹٹوؤں پر ساتھ لے لیا گیا۔ اور تقریباً ۸ گھوڑے سواروں کا دستہ چم ادیہ سے روانہ ہو گیا۔ راستہ میں
قاضی شیر الدین صاحب نپولین بنے۔ عبدالرحمن صاحب پشاوری کو مارشل نے کا خطاب ملا۔ غلام احمد خاں اور میرے لئے بھی انتخا
کی مناسبت سے نام عطا ہوئے۔ اور سب سے کار آمد اور موزوں نام سید اسماعیل حسین صاحب شیرازی کے لئے توپ خانہ کا تجویز
راستہ بہت خراب تھا۔ اور بعض دفعہ تو حقیقت میں نپولین اور اس کے اسٹاف کو توپ خانہ کھینچ کرانے میں بہت ہی وقتوں کا سامنا
کرنا پڑا۔ یہ سب کچھ اس لئے کہ مبادا دشمن کے قبضہ میں نہ چلا جائے۔ کیونکہ اکثر توپ خانہ بہت ہی پیچھے رہ جاتا ہے۔ مارشل نے اور نپولین
کے (FLANKING) (MOVEMENT) سے سب کا قافیہ تنگ تھا۔ کبھی کبھی اسٹاف کو بھی زبردستی شامل ہونا پڑتا تھا۔ منشی تفضل حس
صاحب نے اپنی قدامت کا لحاظ کئے بغیر ایک نہایت ہی جسیم گھوڑا اپنے لئے پسند فرمایا۔ اور اس پر دونوں ہاتھوں سے زین پکڑ کر اس
شان سے بیٹھے کہ ان کی ہیئت کذائی نے نپولین اور مارشل نے کو مجبور کیا۔ کہ اپنی فوجی نقل و حرکت کے دائرہ میں ان کو بھی شامل کر لی
لیکن دو ہی دفعہ گھوڑے کے دولتی پھینکنے پر بھوق صاحب نے مناسب سمجھا۔ کہ ان شاہی ہمراہیوں سے علیحدہ ہو کر ڈاکٹر حسن بے
ہی دو قدم آگے چلیں تاکہ گھوڑا سکون سے چلے اور ان کا سفر بھی خیریت سے کٹ جائے۔ دس گیارہ میل چلنے کے بعد قصبہ ادا ز بیرہ پہ
پہنچے۔ یہ قصبہ ضلع چناق قلعہ کی ایک تحصیل ہے۔ یہاں حکومت کی طرف سے ایک تحصیلدار رہتے ہیں۔ شہر کے درمیان ہو کر ایک ندی
بہتی ہے اور ندی کے دونوں طرف شہر آباد ہے۔ دونوں آبادیوں کو ایک پل ملاتا ہے۔ ہم پل سے گذر کر شہر کے ٹاؤن ہال میں پہنچے۔ یہاں
دروازہ کے سپاہی کھڑے تھے۔ انہوں نے ہمارے گھوڑے بندھوانے کا انتظام کیا۔ ٹاؤن ہال کے چند کلارک ہم کو بالا خانہ پر لے گ
جو نہایت ہی خوش نما اور سلیقہ سے آراستہ تھا۔ اطلاع ہونے پر تحصیلدار صاحب مع عمائدین شہر ہم سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔ تح
صاحب کی آمد پر مولوی محمد شریف و ڈاکٹر فیضی صاحبان تو حیران رہ گئے۔ اور قریب تھا کہ کوئی استعجابیہ کلمہ بھی منہ سے نکل جائے۔ کیونکہ
تحصیلدار صاحب قاضی رفیع الدین بیرسٹر بیٹ لا بمبئی سے اس قدر مشابہ ہیں کہ معاً ہر دو صاحبان کو یہ خیال ہوا۔ کہ شاید کسی اتفاق سے
قاضی صاحب یہاں تشریف لائے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر حسن بے کی قریب ملاقات نے وہ طلسم توڑا۔

تحصیلدار صاحب سراپا متانت اور نہایت خلیق تھے۔ باتیں کرتے وقت زود فہمی اور ذکاوت برستی تھی۔ بہت دیر تک ہندو ست
کے مسلمانوں کے حالات دریافت کرتے رہے۔ بار بار یہ لکھنا تو فضول ہے۔ کہ مسلمانان ہند کا شکریہ ادا کیا۔ کیونکہ یہ تو ہر ملاقا
کا ضروری باب ہے۔ خواہ وہ سلطان معظم سے ہو یا کسان سے ہر شخص کا دل احسان مندانہ اور تشکرانہ جذبات سے اس قدر لبر
اور گفتگو کی ابتداء اسی طرح ہوئی ہے۔ کہ قوت ناطقہ کی پوری طاقت اظہار تشکر میں صرف کر دی جائے۔ قہوہ سگریٹ کے بعد شہر کی
سیر کے لئے نکلے۔ اس قصبہ میں عیسائی کم اور مسلمان زیادہ ہیں۔ بازاروں میں پتھر کی بڑی بڑی سلوں کا فرش لیکن پتھر کٹا ہوا تھا۔ چمڑے کا کام بنانے

کی دوکانیں ۔ یہاں زیادہ نظر آئیں ۔ جوتا، گھوڑے کا زین وغیرہ بیشتیں ہٹرہ۔ جوتا یہاں بوٹ بھی بنتے ہیں۔ اور پرانی وضع کے بھی۔ پرانی وضع کا جوتا ہمارے ہندوستانی پہاڑی جوتے سے بالکل اشبہ ہے۔ کچھ عجیب نہیں۔ جو ایجاد ایک جگہ کی ہو۔ شہر میں گھومنے کے بعد دو تین دیہات میں گئے۔ ہر جگہ نہایت فراخ دلی کے ساتھ ہمارا خیر مقدم ہوا۔ اور بالکل یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ ہندوستان کی پرانی طرز کے لوگوں سے ہم مل رہے ہیں۔ وہی خلق، وہی تواضع اور وہی متانت و وقار ہر گاؤں میں پختہ مسجد، قہوہ خانہ، اور مکتب موجود، متمول لوگوں کی نشست گاہیں جس میں فرصت کے وقت شرفاء جمع ہوتے ہیں۔ گاؤں کے چاروں طرف انگور، اور زیتون کے باغات بکثرت، جو دور سے بالکل ہندوستان کے آم کے باغات معلوم ہوتے ہیں۔ اب پھرتے پھرتے تقریباً ایک بج گیا تھا۔ اور بھوک نے ستانا شروع کردیا دو بجے کے قریب ہم فوج علی موضع میں پہنچے۔ یہ نہایت ہی چھوٹا سا موضع تھا۔ اور چاروں طرف خشک پتھر کی چٹانوں سے گھرا ہوا تھا، بڑی بڑی چٹانیں ایک دوسرے پر اس طرح علیحدہ علیحدہ بنی ہوئی تھیں۔ جیسے کسی مشین سے رکھ دی گئی ہوں۔ موضع کے آدمی مصر ہوئے کہ آپ موضع میں ٹھہریں۔ لیکن ڈاکٹر حسن بے نے موضع کے باہر زیتون کے درختوں کے سایہ میں ٹھہرانے کی جگہ پسند کی۔ موضع کے آدمی دریں قالین اور گدے لے آئے ہم نے کچھ دیر آرام کیا۔ اور ہم منہ ہاتھ دھو کر کھانے کے لئے بیٹھے۔ ڈاکٹر حسن بے کھانا نہایت تکلف کا اپنے ساتھ لائے تھے۔ کچھ اضافہ موضع والوں نے کیا، تازہ پنیر، دہی، دودھ، پیاز اور چند سبزیاں انہوں نے بہت سی لا رکھیں۔ بھوک سخت لگی ہوئی تھی خوب لطف سے کھانا کھایا۔ بلکہ بھوک میں بے اندازہ کھا گئے۔ پیٹ ہلکا کرنے کے لئے کچھ دیر چٹانوں پر چڑھے اترے اور پھر سوار ہو کر آگے بڑھے۔ ؎

ابھی ہم پچھلداریوں تک نہیں پہنچنے پائے تھے۔ کہ تمام آدمی لیس ہو کر ایک قطار میں ہمارے راستہ میں کھڑے ہو گئے۔ فوجی سلامی کے بعد کپتان اور سے کہتا تھا۔ کہ دیکھو یہ تمہارے بھائی ہندوستان سے تمہاری تکلیف اور درد میں حصہ لینے کے لئے آئے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے تمرگی اور چناق قلعہ میں ہزاروں مجروحوں کا علاج کیا۔ اب یہ رخصت ہونے والے ہیں۔ اور اس نواح میں اپنے بھائیوں کو دیکھتے اور رخصت ہوتے پھر رہے ہیں۔ کچھ بیان نہیں ہو سکتا ہے۔ کہ یہ الفاظ ان سچے مسلمان نمازیوں میں کیا جذبات پیدا کرتے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کے چہرے اس مختصر اسپیچ کے وقت کس طرح چمک اٹھتے تھے۔ دفعۃً جذبات سے بعض کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔ اور بعض ایک لمبے سانس لیتے تھے۔ یوں ہی کپتان نے تقریر ختم کی۔ اور ایک ساتھ سپاہیوں نے "اینا شوں"، "اینا شوں" کے نعرے لگانے شروع کئے۔ اور دور تک ہم ان کے دعائیہ فقرات سنتے چلے جاتے تھے۔ جب تک روشنی رہی تب تک تو ہر جگہ قہوہ اور سگریٹ کی رسم جاری رہی۔ لیکن اندھیرا ہو جانے کے بعد گھوڑوں کی رفتار بھی تیز کرنی پڑی۔ اور ملاقات بھی مختصر سے مختصر۔ گھوڑوں کی رفتار تیز ہو جانے کی وجہ سے زمین بوسی کا سلسلہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ جوش و خروش سے شروع ہو گیا۔ بسم اللہ عثمانی ہلال احمر کے ہر دلعزیز ادارہ معمور نے کی گھوڑا پوری دلکی چلا جا رہا تھا۔ اور اس کی نگاہیں زمین پر لگی ہوئی تھیں۔ کہ اوپر سے ایک درخت کی شاخ میں الجھ کر چاروں شانے چت گرے۔ بدقسمتی سے بجائے اس کے کہ ان کے ساتھ ہمدردی کی جائے۔ سب بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ اور ان کو تو اس گرنے میں نیا لطف آیا۔ کہ برابر یہ حرکت جاری رکھی چم ادیر تک تین مرتبہ گھوڑے کے قدموں میں گر گرا کے رہ گئے کی کوشش کی۔ ادارہ مامور کے بعد نمبر سید اسمٰعیل حسین صاحب شیرازی کا تھا۔ سچ یہ ہے۔ کہ ان کے گرنے میں بھی ایک شان ہے اگر کوئی شہ سواری پر ناز کرے تو ہمارے شیرازی صاحب بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ گرنے کے لئے بھی کمال کی ضرورت ہے۔ شیرازی

صاحب بھی کبھی اس زور سے نہیں گرتے۔ کہ چوٹ آئے۔ اگر گھوڑا اونچا ہوتا تو بتدریج گرتے ہیں اور اگر گھوڑا ان کے قد کے مناسب ہو
ذاتے کی گون کی طرح سہولت سے پھسل جاتے ہیں۔ میرا جہاں تک خیال ہے۔ شبرازی صاحب نے اس سفر میں اپنے کمال کی نمائش
دو دفعہ کی۔ لیکن خود شبرازی صاحب کو صرف ایک مرتبہ یاد ہے۔ اس لئے یقیناً ان کی یادداشت زیادہ قابل اعتبار ہے۔ افسوس
فضل حسین سید تونگر حسین۔ اور مارشل بے عبدالرحمٰن پشاوری صاحب بھی اس لالچ سے اپنا دامن ملوث کئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور انہوں
نے بھی اپنے لیڈر شبرازی صاحب کی تقلید کی۔''
اب رات بہت تاریک ہوگئی تھی۔ اور راستہ خراب بعض ہمراہی بہت پیچھے رہ جاتے تھے۔ اس لئے تھوڑے فاصلے پر مذکورہ صد
ادارہ مامور صاحب ''تمام'' کی صدا زور سے لگاتے تھے۔ اگر سب ساتھ ہوئے تو سب نے ''تمام'' کہہ دیا۔ اگر کوئی غائب ہوا۔ تو
جواب میں ''نقصان'' کی صدا الگتی تھی۔ غرض خدا خدا کر کے شفاخانہ میں ۱۱ بجے کے قریب واپس پہنچے۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ ابین پاشا حلمی پاشا ان
کا اسٹاف اور کرنل راہی بے ہم سے ملنے آئے ہیں۔ ابین پاشا تو سو گئے تھے۔ مگر حلمی پاشا جو نہایت ہی معمر اور فرشتہ خصلت آدمی ہیں۔ ہمارے
منتظر تھے۔ فرنچ خوب بولتے ہیں۔ قاضی بشیر الدین صاحب کی معرفت بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد سو گئے۔
۳۱ کی صبح کو چناق قلعہ کی واپسی کی تجویز تھی۔ آج تو گھوڑوں کا تصور کرنے پر بعض صاحبوں کو ہول آنے لگا۔ لیکن گاڑیاں
واپس جا چکی تھیں۔ اس لئے زین سواری کے سوا چارہ نہ تھا۔ پاشاؤں اور شفاخانہ والوں سے رخصت ہو کر مع کرنل راہی بے یہاں
سے روانہ ہوئے۔ ابھی تک ہمیں لڑائی ہم نے نہیں دیکھ لیا تھا۔ اب واپسی میں وہ راستہ اختیار کیا۔ جس میں ہم اس تاریخی مقام کو
دیکھ سکیں۔ راستہ بعض جگہ سے تو اس قدر دشوار گذار تھا۔ کہ گھوڑے چھوڑ دینے پڑے۔ ایک طرف پہاڑ دوسری طرف ایک چوڑی
ندی خالی گھوڑا بھی مشکل سے گذرا۔ اس گھاٹی کو طے کر کے گھوڑوں پر سوار ہوئے تھے۔ کہ ہمارے ڈاکٹر فیضی صاحب کے پیٹ
میں کچھ بے چینی پیدا ہوئی۔ اور وہ ہم سے علیحدہ ہو کر جھاڑیوں میں غائب ہو گئے۔ ہم نے ان کے انتظار میں گھوڑوں کی رفتار
دھیمی کر دی۔ جب بہت دیر ہو گئی۔ اور ڈاکٹر صاحب نہ آئے۔ تو مجبوراً ٹھہرے ہو کر انتظار کرنا پڑا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ ٹھہرے
رہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نہ آئے۔
کرنل راہی بے مجبور ہو کر پھر روانہ ہو گئے۔ اور ان کے ساتھ ہمارے ممبر بھی۔ لیکن ڈاکٹر رضا صاحب کو چونکہ ڈاکٹر
فیضی سے بوجہ قیام عمر کی نسبتاً زیادہ انس تھا۔ اس لئے انہوں نے پیٹ کی چیقلش کا عذر کیا اور مجھے انجاونچ چھوڑ کر ایک کھیت
میں غائب ہو گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد ڈاکٹر صاحب کھیت سے جو واپس تشریف لائے تو بے حد نڈھال تھے۔ چہرہ پر ہوائیاں جا
اتفاقی ہوئی۔ غالباً ڈاکٹر فیضی صاحب کے نہ آنے کی وجہ سے یہ پریشانی ہو گئی۔ ساتھی بہت دور چلے گئے۔ اس لئے سوار ہو
میں جلدی کی۔ لیکن تقدیر میں جلدی نہ لکھی تھی۔ ابھی ڈاکٹر صاحب آدھے ہی سوار ہوئے تھے کہ دھم سے زین پر اور زین
ہٹ کر کے پیٹ پر آ گیا۔ دیکھنے سے معلوم ہوا۔ کہ زین کے نیچے سے ایک کمبل کی تہہ ڈاکٹر صاحب کہیں گرا آئے ہیں۔ خدا خدا کر
اس کو درست کیا اور پیش رفتگاں کے قدم دیکھتے ہوئے چلے۔ گھوڑے بعض جگہ سرپٹ کرنے پڑے۔ اور تقریباً تین میل پیچھے
ساتھیوں کو جا پکڑا۔ اب ڈاکٹر فیضی صاحب بھی کسی طرف سے آملے۔ تینوں ڈاکٹروں میں سے دونوں اپنا فرض ادا کر چکے تھے۔
ڈاکٹر رضا صاحب باقی تھے۔ انہوں نے بھی اپنے مہاجرین سے پیچھے رہنا پسند نہ کیا اور وہ بھی درد شکم کی شکایت کر کے ہم

جدا ہوئے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ کل کے سفر میں مختلف پانی پینے سے ہمارے تین ڈاکٹروں کو پیچش ہوگئی۔ ڈاکٹر علی بے کے آجانے کے بعد ہم ایک موضع میں پہنچے۔ جہاں آبادی بہت کم تھی۔ اور ایک کرد رسالہ ٹھہرا ہوا تھا۔ اس رسالہ کا ہر ایک سوار نام ونمود معلوم ہوتا تھا۔ ہر سپاہی ہر ایسے پن کی شان رکھتے تھے۔ زیادہ تعریف فضول ہے۔ صرف اتنا لکھنا بس ہے کہ یہ لوگ تھے۔ جن کا کھانا شہرہ آفاق ہے۔ یہاں ہم نے کھانا کھایا جو ڈاکٹر حسن بے نے ساتھ کر دیا تھا۔ اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد بیبلس کے پرانے کھنڈر دیکھنے چلے۔ جو یہاں سے صرف میل بھر تھی۔

رسالہ کا ایک نوجوان لفٹنٹ ایک نہایت نفیس گھوڑے پر بلا زین ولگام سوار ہو کر ہمارے ساتھ چلا۔ یہ اس کی شہ سواری تھی کہ گھوڑے نے اس کی ران کے نیچے ذرا بھی نہیں کی۔ لڑائی کے کھنڈروں میں کردوں اور عربوں کی مخلوط رجمنٹ پڑی ہوئی تھی۔ انہوں نے ہم کو ٹھہرنے کے لئے کہا۔ گدی اور قالین زمین پر ڈال دئے اور سب ایک جگہ نہایت بے تکلفی سے بیٹھ گئے۔ اوّل سگریٹ پیش کئے گئے۔ اس کے بعد قہوہ کی باری آئی۔ قہوہ کی پیالیاں تو معمولی تھیں۔ لیکن قہوہ ان میں چند قطرے ہی تھا۔ کرنل راہی بے نے بتلایا کہ تھوڑا قہوہ دینا علامت محبت ہے۔ پیالی بھر کر دینا اس کے برعکس۔ مہمان جتنا زیادہ دفعہ طلب کرے اس کی طرف سے اظہار محبت ہے۔ اگر انکار کیا جائے تو عداوت سمجھی جاتی ہے۔ قہوہ اس قدر تلخ تھا۔ کہ پینا دشوار ہوگیا۔ مگر مجبوری خوف کے مارے پینا پڑا۔ اور خدا کا شکر کیا کہ محبت کی علامت میں تھوڑا دیا۔ ورنہ مشکل پڑ جاتی۔ یہاں سے اٹھ کر بیبلس کے کھنڈر دیکھنے گئے۔ یہ نہایت ہی پرانے آثار ہیں۔ اور مرور زمانہ نے ان کو بالکل زیر زمین دفن کر دیا ہے۔ سلطان عبدالحمید خاں کے زمانہ میں کسی امریکن کمیٹی کو کھودنے کا ٹھیکہ دیا گیا تھا۔ اس کمیٹی نے تھوڑی سی جگہ صاف کی۔ اور جو کچھ ملا لے گئی۔ اب صرف عمارتیں اور چند پتھر۔ لیکن ان پتھروں میں بھی قدیم صنعت کے لاجواب نمونہ پائے جاتے ہیں۔ ساحل سے یہ جگہ بہت ہی قریب ہے۔ سمندر یہاں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر گھوم گھام کر ہم پھر سوار ہو گئے۔ ادن کوئی تک کرنل راہی بے ساتھ آئے۔ یہاں سے وہ رخصت ہوئے۔ اور ہم دن چھپے کے قریب ہنافی قلعہ بخیریت پہنچ گئے۔ یہاں آکر معلوم ہوا۔ کہ ڈاکٹر محمود اللہ عبدالرحمٰن بیگ اور شعیب قریشی بھی کل سے آئے ہوئے ہیں۔

n

یہ بھی بڑے بنیں گے
بچوں کا بھول پن دیکھئے' سمجھتے ہیں کہ صرف کپڑے پہن کر بڑے بن سکے
ہیں! لیکن سمجھدار والدین جانتے ہیں کہ ان کا صحیح نشو ونما توخوب غذائیت
اور اچھے ہاضمے پر منحصر ہے' اور یہ دونوں چیزیں سنکارا بخوبی مہیا کرتا
سنکارا جڑی بوٹیوں' معدنی اجزا اور کثیر حیاتین کا
ایک متوازن مرکّب ہے' جو عام کمزوری کو دور کرتا ہے'
مرض سے چھٹکارا پانے کے لئے قوّت مدافعت پیدا کرتا ہے
اور پٹھوں' ہڈیوں اور دانتوں کو مضبوط بناتا ہے۔ نزلہ
زکام نہیں ہونے دیتا۔ سنکارا کا ایک وصف
یہ بھی ہے کہ ہر موسم میں استعمال ہوتا ہے۔
سنکارا
بچوں کے لئے بے مثل ٹانک — اور آپ کے لئے بھی
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان کراچی ڈھاکہ لاہور
STRONACHS

OUR FIRST CUSTOMERS ARE STILL WITH US.

After more than a decade, Golden Block Works can say with pride that our first customers are still among our satisfied clients. In view of competition and rapidly advancing printing trends, no higher compliment could be paid to our efficiency.
Using the most up to-date process, Golden demands the ultimate in precision and speed — the standards which make clients, (present and future,) our life-long friends.

Line and halftone blocks
in colour or monochrome
Matrices and sterio blocks
Colour plates from transparencies
Photoprints and photostats
Printing and Designing

Golden Block Works

South Napier Road, Karachi.
Phones 31415 - 38013

قسطنطنیہ کی چٹھی

(جمعہ ۱۲ر ستمبر ۱۹۱۳ء)

مسٹر عبدالرحمٰن نے ذیل کی یہ دل چسپ اور پر از معلومات چٹھی تازہ ولایتی میل سے ہمارے نام ارسال کی ہے۔ جسے ہم بہ خوشی درج اخبار کرتے ہیں۔

جو خط میں نے آپ کو جلدی میں ایڈریانوپل سے لکھا تھا۔ اس میں میں نے بعد میں تفصیل کے ساتھ حالات لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی روانگی کے باعث اس سے پیشتر خط نہ بھیج سکا۔ اگرچہ مجھے دیر ہو گئی ہے تاہم نہ بھیجنے سے بہتر ہے۔

ایڈریانوپل کے متعلق جو میرے مشاہدات ہیں وہ اور ان کے علاوہ چند ضروری واقعات ذیل میں تحریر کیے جاتے ہیں۔

اس سے پیشتر کہ دوسرے اشخاص کو اس کا وہم و گمان بھی ہو ہمیں اپنے خاص ذرایع سے معلوم ہو گیا تھا کہ پیش قدمی کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ جب ہم نے خبر سنی ہم فی الفور ڈاکٹر بسیم عمر پاشا کے پاس گئے اور کہا کہ پیش قدمی کی صورت میں ہم ایک چھوٹی سی جماعت مرتب کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ فوج کے ساتھ رہ کر سب سے پہلے مدد دے سکیں۔ ہم قدرتی طور پر ایک بڑے فوجی اسپتال کا انتظام نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ اوّل تو اس میں بہت وقت صرف ہوتا اور دوسرے ہم صرف چند آدمی ہی تھے۔ فوج میں اس قسم کے انتظامات ہوتے ہیں کہ خود سپاہی میدان جنگ سے زخمیوں کو ایک چھوٹے سے خیمے میں لے آتے ہیں۔ جہاں ایک ڈاکٹر اور دو تین جراح فوری تیمارداری کرنے کے بعد انہیں فوجی اسپتال میں بھیج دیتے ہیں۔ جو ہمیشہ گولہ باری کی زد کے بار مقامات میں واقع ہوتا ہے۔ ڈاکٹر بسیم عمر پاشا نے وعدہ کر لیا کہ فوراً مدد کرنے کے لیے تمہیں بھیج دیں گے۔ اور ہم اس نئی اور دل چسپ خدمت کو پورا کرنے کے خیال میں مست تھے لیکن افسوس ہے کہ ہمارے خیالات پورے نہیں ہوئے۔ فوج اس قدر تیزی کے ساتھ بڑھی کہ اس سے پیشتر ڈاکٹر بسیم عمر پاشا ہمارے لیے اجازت حاصل کر سکیں۔ اس نے لوسی برغاس پر قبضہ کر لیا تھا۔ ایڈریانوپل کی دوبارہ تسخیر کا ہر لحظہ انتظار

---

[1] سابق گورنر مشرقی پاکستان۔

کیا جا رہا تھا۔ علاوہ ازیں ان مقامات پر قبضہ کرتے ہیں کوئی جنگ بھی نہیں ہوئی۔ سوائے اس کے کہ ایڈریانوپل۔ ترق، کلسیا اور ریزا کے قریب آخری دن ایک جنگ ہوئی تھی۔ مگر یہ سب صرف چھوٹے چھوٹے معرکے تھے۔ اور یقیناً کوئی بڑی جنگ نہیں تھی۔ آخر کار "عید حریت" کی سال گرہ کی شام کو "طنین" نے ۴ بجے ایک غیر معمولی ایڈیشن نکالا جس کے ذریعے سے دنیا کو معلوم ہو گیا کہ انور بے نے آبائی وطن کی بار دگر خدمت کی ہے۔ فوج کا معہ اپنے جنگی سامان کے ایک دن میں ۸ کیلومیٹر چلنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ایڈریانوپل میں چشم دید شہادتوں سے جو اطلاعیں بہم پہنچی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً صبح کے سات بجے ۵ فدائی سوار شہر میں ڈرانہ اور بے خوف گھس آئے۔ آدمیوں کے واپس آنے پر انور بے کی ہمراہی میں ابراہیم کا رسالہ تقریباً ساڑھے نو بجے آ پہنچا۔ اس واقعہ کے ایک دو گھنٹے بعد آدمی کو دس کی دسویں پلٹن جو خورشید پاشا کے زیر کمان تھی آ پہنچی۔ اور شہر میں داخل ہو کر تمام استحکامات اور سرکاری عمارات پر قبضہ کر لیا۔ ایک جنرل اور تقریباً دو ہزار بلغاری قید کیے گئے۔ بلغاری ۲۶۰ توپیں بھی چھوڑ گئے تھے۔ پانچ فدائیوں کے پہنچنے کے ساتھ ہی لوگ جمع ہو گئے۔ اور "بشاسوں عثمان بے" (خدا عثمانیوں کو عرصہ دراز تک سلامت رکھے) اور پاشا "ہم چوق جیشا" کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ یہودیوں کے ربی (مذہبی اقتدار) اور قدیم نغتی بینڈ بجاتے ہوئے گاڑیوں میں بیٹھ کر نکلے۔ تاکہ ترکوں کا خیر مقدم کریں۔ لوگوں کی بشاش نگاہوں اور چہروں سے معلوم ہوتا تھا کہ اس سے پیشتر ان پر کس قدر ظلم ہو رہا تھا۔ ترک فی الحقیقت بطور منجی کے تھے اس لیے کہ انہوں نے لوگوں کو شیطان کے اعلیٰ افسروں کے پنجوں سے رہائی دی۔ ترکوں کا استقبال کرنے کے لیے آبادی کے ساتھ یونانی بھی شامل تھے۔ ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ترک ان کے پرانے دوست ساری سے بدرجہا افضل ہیں۔ اس کے ثابت کرنے کے لیے میرے پاس مضبوط دلائل بھی ہیں۔ ان لوگوں نے بلغاریوں کو مسلمانوں کے قتل کرنے میں بے حد مدد دی تھی۔ لیکن نئے دور کے بعد تو صورت معاملات نے اختیار کی۔ اس میں بلغاریوں نے یونانیوں کو اپنے سلوک کا کرشمہ دکھلا دیا۔

میں اپنے اصل پوائنٹ سے ذرا دور جا رہا ہوں۔ اس خبر کو پر امن اور پر از شکوہ استنبول نے بھی نہایت مسرت کے ساتھ سنا۔ مختلف مقامات پر جلوس نکالے اور بینڈ بجائے گئے۔ اسی رات کو حاجی عادل بے اور ان کی ولایت کے مختلف افسر چھ سو جندرمہ کے سپاہیوں کی ہمراہی میں تشریف لے گئے۔ خوش قسمتی سے کمال عمر بے نے ہمیں وقت پر خبر دی۔ اور اس لیے ہم بھی شاندار اور پر جوش مجمع کے ساتھ انہیں الوداع کرنے گئے۔ ہز ایکسلنسی طلعت بے اور دیگر دیوانی اور فوجی اعلیٰ افسر بھی موجود تھے۔ اعزازی گارڈ جو فوجی اور پولیس کے سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ موجود تھا۔ ہمارا تعارف نئے والی کے ساتھ کیا گیا۔ جس نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ اور جب کمال بے نے ان سے کہا کہ ہم ہلال احمر کے اسپتال میں کام کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے ایڈریانوپل میں آنے کی دعوت دی اور کہا کہ میں حتی الامکان تمہاری مدد کروں گا۔

ہراول کے ساتھ نہ جانے میں جو ہمیں مایوسی اٹھانی پڑی تھی۔ وہ پورے طور پر زائل ہو گئی۔ جب کہ بسیم عمر پاشا نے ہمیں اپنے ساتھ لے جانے اور ایڈریانوپل میں ہلالِ احمر کے ہسپتال میں کام کرنے کے لیے کہا۔ اس وقت یہ خیال نہ

بلغاری بہت سے ترکی قیدیوں کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ اور بالفرض اگر جنگ ہوئی تو اس صورت میں ہم بہت مفید ثابت ہوں گے۔

آگے کرنے کے بعد ہم آج کی صبح کو عازم ایڈریانوپل ہو گئے۔ سرکجی کے اسٹیشن ماسٹر نے ہم سے کہا کہ "میں انتظامات کرنے ... نہیں کہہ سکتا کہ آیا ٹرین سیدھی ایڈریانوپل تک جائے گی یا نہیں۔ اس لیے کہ والی جو آپ سے ایک شب پہلے روانہ ہوئے ... شارلو یا لولی برغاس سے گھوڑے پر سوار ہو کر جائیں گے۔" بہرحال محض اپنے اتفاق کے سہارے ہم روانہ ہو گئے۔ ہم سب گنتی میں چھ تھے۔ بین خالق، غلام احمد، منظور، شعیب اور میں ڈاکٹر فواد کی ماتحتی میں جا رہے تھے۔ ہم سینٹ استیفانو کو چاک حکمہ اور پیارے عمرلی کے مانوس مناظر طے کرتے ہوئے اپنے عملیات خانہ اور آبدست خانہ سمیت دن کے بارہ بجے خادم کوئی پہنچ گئے۔

یہاں سے سفر کا نہایت تکلیف دہ اور خوفناک حصہ شروع ہوتا ہے۔ بلغاریوں کی سفاکیوں اور خون ریزیوں پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ اور چنانچہ اب شاہ فلسطین والی یونان نے بھی موقع پا کر ان غریب مظلوموں کی تائید میں اپنی آواز بلند کی ہے۔ جنہوں نے ان وحشیوں کے ہاتھوں تکلیف اٹھائی ہے۔ کاش وہ اپنی عیسائی سپرٹ کا اظہار اس وقت کرتے۔ جب کہ غریب مسلمانوں کے گلوں پر چھری چل رہی تھی۔ خود ان کے سپاہی اور دو افسروں نے ظلم کرنے میں کچھ کمی نہیں کی۔ ممکن ہے کہ وہ بلغاریوں کی نسبت کچھ کم خون خوار ہوں۔ مگر مسلمانوں کی مخالفت میں تو سب کے سب یکساں تھے۔ اگر اس کمیشن نے جس کا مطالبہ اس وقت یونان کر رہا ہے، باضابطہ تحقیقات شروع کر دی، تو مجھے یقین ہے کہ یونان کو سرخ روئی کی بجائے تھوڑی بہت شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔ لیکن مجھے تو یورپ کے انصاف اور حق پسندی پر بالکل اعتبار نہیں رہا۔ اگر اس کمیشن نے تحقیقات کی بھی تو وہ انسانیت اور رحم کے تقاضے سے نہیں بلکہ سیاسی وجوہ سے ضرور متاثر ہوگی اور مظلوموں کے ساتھ کبھی انصاف نہیں ہوگا۔ اور اس طرح اصل مجرم جائز سزا سے بالکل بچے رہیں گے۔ ساڑھے تین بجے اور قلعہ احمد پاشا کا چکر کھاتی ہوئی ریل گاڑی فاراسو کی وادی میں داخل ہوئی۔ اور یہ وہی مقام ہے جو اس جنگ میں بڑی بڑی خون ریزیوں کا منظر رہا ہے۔ ترکی تاروں کے جال یہاں ابھی تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مگر ان کی حالت بہت خراب ہے۔ قریب ہی نخشالیش کے کھنڈر پڑے ہوئے ہیں۔ شہر کی مسجد کی چار دیواری ہی باقی رہ گئی ہے۔ اور اس پر چھت بھی ندارد ہے۔ علاوہ ازیں جس مینارے پر سے اذان دی جاتی ہے۔ وہ بھی نصف کے قریب ٹوٹا ہوا ہے۔ بالآخر شتلجہ پہنچے۔ جب بلغاری اس مقام پر آئے ہیں تو اس وقت انہوں نے تمام مسلمانوں کو قتل کر ڈالا۔ اور مکانات اور مساجد کو گولہ اور بارود سے اڑا دیا تھا۔ اور جب وہ گئے ہیں تو انہوں نے تمام یونانیوں کو قتل کر دیا تھا۔ ان کی سفاکی کا نتیجہ یہ ہے کہ شتلجہ سے لے کر لولی برغاس تک کسی انسان کا پتہ نہیں۔ اور ایسا کوئی مکان نہیں جو قابل رہائش کہلایا جا سکے۔ یہاں بربادی اور تباہی پورے طور پر پائی جاتی ہے۔ ان پہاڑیوں میں مویشی تک نظر نہیں آتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرندے بھی ان حیوانوں کے خوف سے بھاگ گئے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن، سڑکوں، گاڑیوں، انجنوں کو اور پانی دینے کے حوضوں میں آگ لگا دی گئی تھی۔ اسٹیشنوں کے ترکی ناموں کو کھرچ کر اس پر بلغاری ...

... ادنیٰ درجے کے فوجی افسروں کی درس گاہ کو سومہ کوچک صابقان ... ہے۔ یہی عمارت ...
کے ہسپتال کا کام دے رہی تھی۔ اس عمارت میں برطانوی ہلال احمر کے ہسپتال نے بھی تسخیر شہر کے بعد کام کیا تھا۔ ڈاکٹر
بہاؤالدین شاکر ہے جو شہزادہ ولی عہد یوسف عزیز الدین آفندی کے پرائیویٹ ڈاکٹر ہیں اور علم طب کے پروفیسر
بھی ہیں۔ محاصرہ کے دنوں میں ہسپتال کے ڈائرکٹر تھے۔ بعد میں وہ قید کر لیے گئے تھے۔ بلغاری انہیں قتل کرنا چاہتے
تھے نگران کے دوستوں نے جو صوفیہ اور قسطنطنیہ میں رہتے تھے۔ اس کے خلاف شور مچایا۔ چنانچہ وہ رہا کر دیئے
گئے۔ یہ وحشی (میرے پاس ان حیوانوں کے لیے اور کوئی زیادہ سخت لفظ نہیں ملتا) ڈاکٹروں کے اور نیز ہلال احمر کا
بھی کچھ لحاظ رکھنا نہیں چاہتے۔ تسخیر شہر کے بعد بلغاری ڈاکٹر آرگرڈف ہسپتال کے مہتمم تھے۔ اور یہیں اس عمارت
میں انگریزی قونصل اور اس کے دوستوں نے ترکی زخمی اور بیمار سپاہیوں میں انجیل اور "دی خورشید" نسخے
تقسیم کیے تھے۔ اور خوراک اناج کی بہت بڑی مقدار بلغاری قطنہ میں چھوڑ گئے ہیں۔ انہوں نے ایک بہت بڑی
تعداد جلا بھی دی تھی۔ مگر جو مقدار باقی رہ گئی ہے۔ وہ نظرانداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔ سامانِ حرب کی بھی
بہت سی مقدار ترکوں کے ہاتھ آئی ہے۔ علاوہ ازیں ۴۰ ہزار سے ۶۰ ہزار تک رائفلیں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔
اسٹیشن پر اناج کے بہت سے ڈھیر جل رہے تھے۔ اور تمام سامان خوراک میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اسٹیشن سے
ہو کر ہم ہسپتال گئے جہاں ڈاکٹر بہا بے نے بھی نہایت تپاک کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ اور ہم سے کہا کہ "آپ
یہاں صرف بہ حیثیت وزیٹر آن کے ٹھیر سکتے ہیں میں ہسپتال کو بند کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے کہ لڑائی نہ ہونے کی وجہ
سے کوئی مریض نہیں ہے۔ اور فوج کی حالت نہایت عمدہ ہے۔ اس بات نے ہمارے آتش جوش کو کم کر دیا۔ مگر ہمارے
دلوں میں یہ خوشی سمائی ہوئی تھی کہ ہم ایڈریانوپل میں ہیں۔ اور یہ وہی مقام ہے۔ جہاں ترکوں نے اپنی کھوئی ہوئی
فوجی عظمت دوبارہ حاصل کر لی ہے۔ بعض یورپین نامہ نگاروں نے ترکی فوجوں کی شجاعت و جسارت کو گھٹانے
کی کوشش کی ہے۔ اور قلعوں کو "رنگی ہوئی لکڑی کی تختی" سے تعبیر کیا ہے۔ میری بحث اس امر پر ہے کہ پتھر اور
اینٹوں کی بجائے "منقش لکڑی کی تختی" پر بھروسہ کرنا بہت زیادہ مشکل ہے۔ اور اس لحاظ سے ترکی بہادری
کا نقش دلوں پر اور زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شکری پاشا نے مدافعت کے تمام انتظامات کی جانب
اپنی توجہ نہیں کی۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کی غلطی تھی کہ انہوں نے آخری حملہ کے موقع پر مشرقی قلعوں کو
زیادہ مضبوط نہیں کیا۔ حالانکہ وہ مزید سپاہیوں کے ذریعہ سے ایسا کر سکتے تھے۔ بہرحال خواہ کچھ ہی ہوا ہو
فوجی ماہرین اور مؤرخین دنیا کے سامنے تسخیر ایڈریانوپل کے دوسرے ہی اسباب بیان کریں گے۔ لیکن مجھ جیسے
آدمی کو جو جنگی باتوں سے زیادہ مہارت نہیں رکھتا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شتالجہ اور بولیر کی ترکی فوجیں ایڈریا
نوپل والوں کی مدد نہیں کر سکتی تھیں۔ شہر بالضرور فتح ہوتا تھا۔ خواہ ایک مہینے ہی بعد ہوتا۔ لیکن ترکی افسروں
کی بہادری اور پابندی فرائض پر سوائے تعریف اور حیرت کے اور کچھ ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔
ہم ایڈریانوپل میں صرف چار روز تک ٹھیرے۔ لیکن اس قلیل عرصہ میں میں نے اس قدر چیزیں دیکھی ...

لکھ دیئے گئے ہیں۔ یہ امر کہ ترکی فوج نے کس قدر جلد پلوں اور ریلوے پٹری کی مرمت کر ڈالی۔ ان کے جوش اور صناعی کی صاف دلیل ہے۔ شتلجہ سے ہو کر پھر ٹرین قبا قچہ پہنچی۔ اور پھر وہاں سے سنکلی اور چرکس کوئی تک جاتی ہے۔ مؤخر الذکر مقام بلغاری جنرل سیوودف کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ اور وہاں خاص اس کی آنکھوں کے سامنے تمام اسلامی آبادی کو قتل کر دیا گیا تھا۔ مسجدوں کو جلا کر ڈھیر بنا دیا تھا۔ چنانچہ ریلوے اسٹیشن میں ایک درجن کے قریب تنور پائے جاتے ہیں۔ مانچیسٹر گارڈین کا نامہ نگار ہمارے ساتھ تھا۔ اس نے ان مظالم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ گاڑی یہاں سے سیدھی تنار لو جاتی ہے۔ یہاں کی تمام قدیم ترکی فوجی بارکیں اور ہسپتال بالکل محفوظ ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ بلغاریوں نے انہیں فی الواقع چھوڑ دیا ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ انہیں ان کو تباہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ اس لیے کہ وہ بہت جلد ان مقامات کو چھوڑ کر جا رہے تھے۔ چرکس کوئی اور شادلو کی اردگرد کی پہاڑیوں کی سڑکوں پر ہمیں بہت سی گاڑیاں ملیں۔ جن میں مرد عورتیں اور بچے بیٹھے ہوئے جا رہے تھے یہ وہ مہاجرین ہیں جنہیں اپنے اپنے گھروں کو واپس جانے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ مگر افسوس کہ ان کا کوئی بھی گھر نہ تھا۔ چند مقامات پر ہمیں خاندان کے خاندان ملے۔ جو ایک دیوار کے سایہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس اجڑے ہوئے مکان میں وہ کبھی رہا کرتے تھے۔ جس تکلیف اور مصیبت میں یہ لوگ ہیں۔ وہ ناقابل بیان ہے اگر اتفاقیہ تمہیں کوئی ایسا مکان مل جائے جو بالکل صحیح سالم ہو۔ تو پہلا خیال جو تمہارے دل میں آئے گا۔ وہ یہ نہیں ہوگا کہ بلغاریوں نے نہایت فیاضی کے ساتھ اسے بچا لیا ہے) بلکہ یہ ہوگا کہ وہ کس طرح بلغاریوں کی زد سے محروم رہا؟ اس تباہی کا خیال کرو اور پھر اس غیر مصافی آبادی کا خیال کرو، جسے بلغاریوں نے تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ قدرتی طور پر سب نہیں بھاگ سکتے تھے۔ اکثر حصہ پیچھے رہ گیا تھا۔ ہائے افسوس! وہ اب کہاں ہیں؟۔ غالباً جنرل سیوودف اور اس کے سپاہی اس راز کو بہتر حل کر سکیں گے۔ شادلو سے ہو کر ہم لولی برناس پہنچے۔ مرادلی اور دسیڈلی بھی ہمارے راستہ میں پڑے۔ مرادلی کے نزدیک ہماری ریل گاڑی نے خط ابنوس میٹریا کو عبور کر لیا۔ اور اس طرح ہم گویا متنازعہ فیہ قطعۂ ملک میں داخل ہو گئے۔ سنجاق تیپہ کے بعد سیڈ را ہمارا فرارگاہ عمومی قرار پایا۔ اور جب فوج ایڈریانوپل میں داخل ہو گئی ہے۔ تو ہیڈ کوارٹروں کو بابا عسکی میں تبدیل کر دیا گیا۔ ہماری گاڑی عین مغرب کے بعد لولی برغاس پہنچی۔ اسٹیشن کے قریب ہمیں چند مکانات کے نشانات نظر پڑے۔ مگر ہوا ان غیر مدفون سپاہیوں کی وجہ سے کثیف ہو گئی تھی۔ جو اس عظیم الشان جنگ میں مقتول ہوئے تھے۔ یہاں سے ہم آلیبو لو جنگشن گئے۔ جہاں سے ریل گاڑی بابا عسکی اور قرق کلیسہ جاتی ہے۔ ہمیں یہاں تین گھنٹے ٹھیرنا پڑا۔ اس کے بعد ہماری گاڑی ایک جنگی گاڑی کے ساتھ ملا دی گئی۔ علی الصباح ہم ایڈریانوپل پہنچ گئے۔ گاڑی شہر میں جنوب مشرقی غیر مستحکم حصے سے داخل ہوئی۔ مگر مسجد جامع سلیم کے مینارے ہمیں دور ہی سے نظر آ رہے تھے۔

ریلوے اسٹیشن کے احاطہ میں داخل ہوتے ہی مغربی جانب چند فوجی بارکیں دکھائی دیتی ہیں۔ جنہوں کو بلغاریوں نے اڑا دیا تھا۔ وہاں صدیوں کی ۲۵۰ توپیں بھی پڑی ہوئی ہیں۔ جن کو بلغاری جلدی میں اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ قریب ہی

پرچم لہرا رہا تھا۔ مسجد ایک خوب صورت پہاڑی پر واقع ہے۔ اور تعمیر اس نے ایڈریانوپل کی فتح کے
رہتا۔ دیگر ترکی مساجد کی طرح یہ مسجد اندر سے بھی بہت خوب صورت اور منقش ہے۔ بلغاری بوٹ پہنے اس میں
داخل ہوتے تھے۔ اور بعض نے اسے نجس کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ خود اس نے ترکوں کو
دوبارہ اسے پاک کرنے کے لیے بھیج دیا۔ سپاہیوں اور افسروں کو نماز اور قرآن شریف پڑھتے ہوئے دیکھ کر تسکین
محسوس ہوئی۔ ایک چھوٹے گنبد میں کسی گولہ سے قدرے نقصان پہنچا ہے۔ مگر محکمۂ اوقاف نے اس کی مرمت شروع
کردی ہے۔ میں یقین نہیں کرسکتا کہ یورپ کس طرح ترکوں سے ایڈریانوپل اور قسطنطنیہ کو واپس لینا چاہتا ہے۔
ان دونوں شہروں کی ظاہری صورت ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خالصتہً اسلامی شہر ہیں۔ اور اس لیے ان پر حکومت کرنے
کے لیے کسی عیسائی حاکم کو مقرر کرنا بالکل بے معنی اور مضحکہ انگیز ہوگا۔

چونکہ استحکامات دیکھنے کا وقت باقی نہیں رہا تھا۔ اس لیے ہم نے والی کی خدمت میں حاضر ہونے کے بعد رخصت
ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ گورنمنٹ چند مقامات پر سے اڑا دیا گیا ہے۔ اور سبزہ جھیوں کے راستہ میں شکستہ عمارت کے
پتھر پڑے ہوئے ہیں۔ حاجی عادل بے نے نہایت تپاک سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ اور ہماری پیش کردہ مبارک باد کا
شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے ہم سے چند بلغاری مظالم کا ذکر کیا۔ اور آخر میں کہا کہ ایڈریانوپل کے والی اور کمانڈر
فیصلہ کرلیا ہے کہ اگر گورنمنٹ نے بھی شہر کو خالی کرنے کا حکم دے دیا تو وہ ہرگز خالی نہیں کریں گے۔ انہوں نے کہا
کہ وہ آبادی کو زیادہ پریشان کرنا اور ان خون ریز کتوں سے کٹوانا نہیں چاہتے۔ والی سے رخصت ہونے کے
بعد ہم محمد علی پاشا کمانڈر کے دفتر میں گئے۔ یہ حضرت پہلے میڈوس کمانڈر رہ چکے ہیں۔ انہوں نے ایک دفعہ
ہمارے ہسپتال واقع چناق قلعہ کا بھی معاینہ کیا تھا۔ وہ اگرچہ دفتر میں موجود نہ تھے۔ تاہم جنرل سٹاف کے سب سے
بڑے افسر سے مل لیے یعنی انور بے سے جو دسویں آرمی کور سے متعلق ہیں۔ جب عمارت میں داخل ہوئے۔ تو اس
وقت پانچ چھ افسر ایک بلغاری سپاہی سے سوالات کر رہے تھے جو قریب کے گاؤں کے ایک مکان میں آگ لگا
ہوا پکڑا گیا تھا۔ ڈاکٹر علی غالب بے باہر آئے اور ہمیں ایک کمرے میں بٹھا دیا جو خوش قسمتی سے انور بے کا کمرہ تھا۔
ہم سے کہا گیا کہ ان کا انتظار کیجیے۔ چند منٹ کے بعد انور بے مسکراتے ہوئے آئے اور نہایت انکساری کے ساتھ ہماری
مبارک باد کو قبول کیا پھر ہم نے ان سے رخصت ہونے کی اجازت طلب کی اور درخواست کی کہ ہم استحکامات کو دیکھنا
چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے معاً قبول کرلیا۔ تھوڑی سی گفتگو کرنے کے بعد ہم رخصت ہو گئے اور کرا آغاج پہنچے
جہاں کہ ہسپتال واقع ہے۔

دوسرے دن علی الصباح ہم جنوبی قلعوں کو دیکھنے کے لیے گئے۔ اسٹیشن اور قلعوں کی درمیانی جگہ ٹوٹی
پڑی ہے۔ قریباً ایک سو مربع گز سے جگہ ہموار نظر آتی ہے۔ گولہ باری کی وسعت اور قوت کا اس واقعہ سے اندازہ
کیا جاسکتا ہے کہ ایک عمارت کو قریباً ۲۰۰ نشان لگے مگر اس میں سے صرف دو مؤثر ثابت ہوئے۔ یہ عثمانی ہلال
عمارت تھی۔ بارود خانے اور دیگر تمام استحکامات نہایت اچھی حالت میں ہیں۔ تمام توپیں اس قدیم جگہ پر رکھی ہوئی

کہ میں نہیں جانتا کہ ان سب کو آپ کے روبرو کس طرح بیان کروں۔ کم سے کم دو باتیں صاف اور صریح ہیں۔ اول یہ کہ تمام آبادی اپنے بلغاری حاکموں سے سخت عاجز اور نالاں تھی۔ اور کہ انہوں نے نہایت صدق دلی اور ایمان داری کے ساتھ اپنے رہائی دینے والوں کا استقبال کیا۔ جنہوں نے ان کو خوف اور دیگر تکلیفات سے آزادی دلائی۔ یورپ اور اس کے ماہرین سیاست جس طرح چاہیں، فیصلہ کریں۔ لیکن اگر ایڈریانوپل کے باشندوں کی خواہشات کا لحاظ کیا گیا تو وہ یک زبان ہو کر نہایت شکریہ کے ساتھ رحم دل ترکوں کی تائید میں رائے دیں گے۔ جنہیں اس قدر نشانہ الزامات بنایا جا رہا ہے۔

سب سے پہلی چیز جو ہم نے دیکھی وہ ہسپتال کی عمارت تھی۔ یہ ایک بہت بڑی صاف ستھری عمارت ہے یہاں چند سروے مریض بھی تھے۔ بلغاری اپنے مریضوں کو لے گئے تھے۔ اور ان قدیم ساتھیوں کو چھوڑ کر چلے گئے تھے جو ان کے دوش بدوش ہو کر لڑے تھے۔ یہ ہے بلغاری صداقت کا ثبوت۔ ہسپتال کے متعلق ایک چھوٹا سا واقعہ ہے جسے میں یہاں لکھتا ہوں۔ چند آسٹریا کی ڈاکٹر عورتیں محاصرہ کے دنوں میں ڈاکٹر بہابے کے ماتحت تیمارداری کا کام کر رہی تھیں۔ جب بلغاری آئے تھے اور ڈاکٹر بہابے کو گرفتار کیا گیا تو یہ ڈاکٹر عورتیں چلی گئیں۔ ان سے بڑے افسروں نے درخواست کی کہ وہ ہسپتال میں آ کر کام کریں۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ بخلاف اس کے ترکی فوج شہر میں داخل ہوئی تو وہ بھاگ آئیں۔ اور پورے جوش کے ساتھ دوبارہ اپنا کام شروع کر دیا۔ یہ ڈاکٹر عورتیں عیسائی ہونے کے علاوہ آسٹریا کی رعایا تھیں جو بلغاریا کا دوست ہے۔ اور بلغاری قبضہ کے دنوں میں مریضوں کی تعداد زیادہ تر عیسائی ہی تھی۔ مگر انہوں نے سرویوں اور بلغاریوں کی تیمارداری سے انکار کر دیا لیکن غیر مصافی مسلمان آبادی کے زخمیوں کی تیمارداری کرنے کے لیے وہ فی الفور تیار ہو گئیں۔

سب سے پیشتر ہم مصری ہلال احمر کا ہسپتال دیکھنے کے لیے گئے۔ جس کے مہتمم ڈاکٹر مصطفیٰ تھے۔ یہ ہسپتال خاص شہر میں واقع ہے۔ جو ریلوے اسٹیشن سے قریباً دو میل کے فاصلے پر آباد ہے۔ برابر ایک نہایت خوبصورت سڑک گئی ہے۔ شہر کے راستے میں دو دریا یعنی دریائے آردا اور دریائے مرتضیٰ پڑتے ہیں۔ سب سے پہلا دلچسپ نظارہ جو دکھائی دیتا ہے وہ "ہلال عثمان" کی نمائش ہے۔ جو تقریباً ہر مکان کی کھڑکیوں سے ہویدا ہے۔ قہوہ خانوں اور ہوٹلوں نے طرح طرح سے اس خوب صورت جھنڈے کو سجا رکھا تھا۔ جو دنیا کے تمام قومی جھنڈوں سے زیادہ شان دار ہے۔ شہر میں ترکی سکوں کی کمی ہے۔ اس لیے اگر کوئی چیز خریدی جائے تو اس کے عوض میں عام طور پر بلغاری سکہ ملے گا۔ سگریٹ بلغاری کارخانوں کے ہیں۔ اس لیے کہ "رجی ڈس ٹوبیکس" کی گماشتی شہر میں سگریٹ پہنچانے سے قاصر رہی تھی۔ مصری ہسپتال میں ہمیں چند بلغاری مریض ملے۔ جن میں سے دو افسر بھی تھے ہسپتال کی کتاب معائنہ اس لحاظ سے ذرا دلچسپ تھی کہ اس میں شہر کے بلغاری شریف اور دیگر بلغاری افسروں کی آراء اور دستخط ثبت تھے۔

نہایت جوش کے عالم میں ہم جامع سلیم میں داخل ہوئے۔ صرف تین دن پیشتر اس خوب صورت مسجد پر بلغاری

یاست کرنے آئے ہیں۔ ان کا نہایت شان دار استقبال کیا گیا۔ اور چونکہ ان کی قیام گاہ کا [illegible] انتظام [illegible] تھا اس لیے انہیں بلدیہ (میونسپل کمیٹی کی عمارت) میں ٹھہرایا گیا۔ سہ پہر کے وقت ایک بڑی فوجی نمائش کی گئی۔ جس کے بعد شہزادہ ولی عہد نے عزت پاشا اور دیگر افسروں کا شکریہ ادا کیا۔ کہ انہوں نے شہر کو بلغاریوں کے پنجہ سے نجات دلوائی۔ شاہزادگان ممدوح کے استحکامات دیکھنے کے بعد مصطفیٰ پاشا تشریف لے گئے اور دن قرق کلیسہ اور پھر وہاں سے سیدھے استنبول پہنچے۔

جس وقت شاہزادہ ولی عہد فوج کا معائنہ کر رہے تھے۔ اس وقت ایڈریانوپل کے باشندوں نے شہر کے ایک بہت بڑے احاطہ میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ حاضرین کی تعداد بے شمار تھی۔ اور اس میں ہر قوم کے نمائندے شامل تھے یونانی، آرمینیا کے اسقف۔ اور یہودیوں کے ربی (مذہبی پیشوائے اعظم) بھی موجود تھے۔

بہت سے اصحاب نے تقریریں کیں اور ان میں بلغاریوں کی سفاکیوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ چند ریزو لیوشن بھی پاس کیے گئے۔ اور آخر میں حضرت اقدس سلطان المعظم اور عثمانیوں کے لیے دعائیں مانگی گئیں۔ ان ریزولی کو مختلف کونسلوں کی خدمت میں بھیج دیا گیا۔ جنہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اپنی اپنی حکومتوں کے پاس روانہ کر دیں گے۔ قسطنط جانے کے بعد مجھے اخبارات کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ایڈریانوپل کے باشندے یورپ کے تمام بڑے بڑے دارالخلاف میں وفود بھجوا رہے ہیں۔ تاکہ ایڈریانوپل کو دوبارہ بلغاریوں کے حوالے نہ کیا جائے۔

غلام احمد کے پاس عزت پاشا کی ایک بہت بڑی تصویر تھی اور وہ اب بابا عسکی اسی غرض سے جا رہے تھے۔ تاک اس پر ان کے دستخط کرائیں۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ عزت پاشا شہزادہ ولی عہد کے ہمراہ ہیں۔ انہوں نے ایڈریانوپل ہی سپہ سالار اعظم کی موجودگی سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس غرض سے وہ خالق اور منظور کو لے کر اپنی قسمت آزمانے کے لیے۔ عزت پاشا، ضیا پاشا، محمد علی پاشا اور دیگر افسروں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ان تمام افسروں نے ان لوگوں پہچان لیا۔ اور نہایت تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا۔ عزت پاشا نے تصویر پر اپنے دستخط کر دیئے۔ لیکن جو محبت ان کو ہند کے ساتھ ہے۔ اس کا اندازہ ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے تصویر پر لکھے۔ الفاظ یہ ہیں ”از غلو ار غلام احمد خا جس کے معنی میرے بیٹے غلام احمد خاں“ کے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا مہربانی ہو سکتی ہے۔ محمد علی پاشا نے منظور کو گا اور قرآن شریف قرأت سے پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ انہوں نے منظور کی اس قدر تعریف کی تھی کہ عزت پاشا اسے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ انہوں نے دوسرے دن علی الصبح منظور کو اپنے پاس بلایا۔ عزت پاشا نے ان سے سورۂ انا قرأت سے پڑھنے کی درخواست کی۔ منظور نے سورۃ کو اپنی خوش آہنگی میں پڑھا۔ جس سے حاضرین پر بے حد اثر منظور کا شکریہ ادا کیا گیا۔ اور حاضرین نے قرآن شریف سننے کے بعد مرحبا کی آوازیں بلند کیں۔ اس کے بعد ہم نے ان متبر اور قابل ادب اشخاص سے رخصت چاہی۔ اور سیدھے گاڑی میں بیٹھ کر ”خضرلق“ پہنچے۔

یہ وہ جگہ ہے جہاں شکری پاشا محاصرہ کے دنوں میں اپنے اسٹاف کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ ایک چھوٹا سا قلعہ جس کے ارد گرد چاروں طرف بارود خانے واقع ہیں۔ وہاں ایک دوسرے کے برابر برابر بہت سے کمرے واقع

جہاں شکری پاشا انہیں چھوڑ گئے تھے۔ بعض بعض مقامات پر کچھ نقصان پہنچایا گیا ہے۔ لیکن اب ان کی بہت جلد مرمت ہو جائے گی۔ سردی فوجیں زیادہ تر اسی حصہ پر حملہ کر رہی تھیں۔ لیکن ان سے کچھ نہ ہو سکا۔ سہ پہر کو ہم پھر ایوان بلبا اور حال تپہ دیکھنے کے لیے گئے۔ یہ شہر کے مشرق کی طرف واقع ہیں۔ اور گاڑیاں خاص توپوں تک جا سکتی ہیں۔ قلعہ کے جدید مہتمم سرگیشیا کے ایک شریف آدمی ہیں اور ان کا نام محمد علی آفندی ہے۔ اور میں نے ان سے بہتر "ضابطی" افسر نہیں دیکھا۔ انہوں نے ہم سے آخری جنگ کی کیفیت بالتفصیل بیان کی۔ اور تسخیر شہر کی وجوہات بھی بتائیں۔ ایوانہ بابا شہر کے نزدیک ہی واقع ہے۔ اور اگر اسے فتح کر لیا جائے تو شہر کسی حالت میں محفوظ نہیں رہ سکتا۔ جب جرمنی والے شہر کا استحکام کر رہے تھے تو اس وقت جنرل اسٹاف کے ایک ممبر نے یہ کہا تھا کہ مغربی و جنوبی استحکامات اور شہر کے درمیان ایک بہت بڑی کشادہ جگہ ہے۔ اور اگر دشمن کی فوجیں اس کھلی جگہ پر بھی قابض ہو جائیں۔ تو اس حالت میں مشرقی اور شمالی قلعوں کی توپیں دشمن کی پیش قدمی کو بہت آسانی کے ساتھ روک سکتی ہیں۔ لیکن چونکہ اس کے اور شہر کے درمیان بہت ہی مختصر کھلی جگہ ہے۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ ایوانہ بابا کے بالمقابل مال تپہ اور پہاڑیوں کے سلسلے کو اور زیادہ مستحکم کیا جاتا۔ اور پہلے مورچوں کی قطار کی تسخیر کے بعد ایوانہ بابا کو دوسرے مورچوں کی قطار بنا دیا جاتا۔ مگر اس کی تجویز کو بالکل **غلط** سمجھا گیا اور ترکی کو تسخیر کی سزا بھگتنی پڑی۔ بلغاری التوائے جنگ کے زمانہ میں نہایت خفیہ طور سے اپنی توپیں اور سپاہی ان پہاڑیوں کے پیچھے سے لاتے تھے۔ اور ایوانہ بابا کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے۔ ایوانہ بابا کی توپوں سے تھوڑے فاصلہ پر دوار ناؤدکوئی" کا گاؤں واقع ہے۔ اور جس میں خالصتہً یونانیوں اور آرمینیا والوں کی آبادی ہے ایسا خیال کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ شکری پاشا نے گاؤں کو برباد نہیں کر ڈالا۔ یہ لوگ ترکی توپوں اور سپاہیوں کے متعلق بلغاریوں کو تقریباً روزانہ خبریں پہنچاتے تھے۔ اوّل تو موقع ہی کمزور تھا اور دوسرے "آرنٹ کوئی" کے لوگوں کی دغا بازی کی وجہ سے ایوانہ بابا فتح کر لیا گیا۔ ارد گرد کی زمین پر پھٹنے والے گولے اور گولیاں پڑی ہوئی ہیں۔ ہم سے کہا گیا کہ فریقین کی طرف سے گولہ باری اس قدر خوف ناک ہو رہی تھی کہ تمام رات صرف توپوں ہی کے شعلوں سے شہر میں روشنی رہا کرتی تھی۔ اس مقام پر بدبو بہت کثرت سے پھیلی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ بلغاریوں نے ترکی مقتولین کو اب تک دفن نہیں کیا۔ اور آخر کار انہوں نے ہیضہ کے خوف سے ترکی قیدیوں کو دفن کرنے کے کام پر مامور کر دیا۔ واپس ہونے پر راستہ میں ایک ایسا جزیرہ پڑا۔ جہاں قیدی ۳۰ ہزار سے ۲۵ ہزار تک خوراک اور سردی اور برسات سے کسی پناہ کے بغیر چار دن تک رکھے گئے تھے۔ آپ نے فیراسٹ میں سے ایک چٹھی کامریڈ میں درج کی تھی۔ یہ بالکل سچ ہے کہ چار سو سے زیادہ آدمی روزانہ انتقال کر جاتے تھے۔ اور ان میں سے بعض زخمی بھی ہوا کرتے تھے۔ سرائے ایجابو (اس جزیرہ کا نام ہے) کے مظالم سے خون خشک ہو جاتا ہے۔ اور ہمیں یقین نہیں ہے کہ آیا ان بلغاریوں کو انسان کا لقب بھی دے سکتے ہیں یا نہیں۔ وہ وحشی ہیں۔ بلکہ وحشیوں سے بھی کہیں بڑھ کر ہیں۔

دوسرے دن علی الصبح توپوں کے شور کی وجہ سے ہماری آنکھیں کھل گئیں۔ توپوں کی آواز فی الواقع ہمارے دروازے سے ٹکرا رہی تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شہزادہ ولی عہد یوسف عزیز الدین اور پرنس ضیاء الدین شہر

ترکوں کے سچے حالات مشاہدہ کی بنا پر

(پنجشنبہ ۱۸ دسمبر ۱۹۱۳ء)

خدا ہمارے خلیفۃ الاسلام ارشاد محمد خامس کو ہمیشہ زندہ رکھے اور اُن کے زیر سایہ اسلام کو ترقی بخشے، مجھ سے اس
خواہش کی گئی ہے کہ ترکوں کے سچے حالات ذاتی مشاہدہ کی بنا پر "ہمدرد" اخبار میں بغرضِ اشاعت ارسال کروں، اول
میں اتنی قابلیت ہی نہیں ہے کہ جو کچھ آنکھوں سے دیکھوں اُس کو زبان پر لا سکوں، یا قلم سے ادا کر سکوں کیونکہ اس کے
واسطے خاص مادہ اور قابلیت کی ضرورت ہے، دوم میں نے دیکھا ہی کیا ہے جو لکھوں۔ مجھے اتنا موقع ہی نہیں ملا کہ تفص
کے ساتھ دیکھ بھال سکوں۔ نو دس ماہ کے قریب قسطنطنیہ اور اس کے اطراف و جوانب میں رہا اور اس قلیل عر
انقلاباتِ ملکی سے ترکوں کو فرصت کہاں تھی اور نہ مجھ کو شفاخانہ کے کام سے فرصتِ مشاہدہ ملی۔ میں اپنے آپ کو کسی ط
اس قابل نہیں سمجھتا کہ ایسے اعلیٰ اخبار کے کالموں کو اپنی ناچیز تحریر سے ناپاک اور سیاہ کراؤں۔ مگر مجھی سے کام کر
جرأت ہوتی ہے تو فقط اس خیال سے کہ یورپ اور امریکہ کے مضمون نگار اور مصنف میری ہی طرح دو آنکھیں بلکہ
دل اور دیدۂ نابینا لے کر ترکی جاتے ہیں اور ہفتہ عشرہ قسطنطنیہ میں قیام پذیر ہونے کے بعد واپس چلے آتے ہیں، اور
اور ترکی پر کتابیں لکھ مارتے ہیں۔ ان کتابوں کو لکھنے میں وہ اپنے پیش رو متعصبین سے اور اُن کی تصانیف سے
مدد لیتے ہیں، ظاہر ہے کہ صرف قسطنطنیہ میں پانچ چھ دن رہ کر خود پایۂ تخت ہی کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے ہیں،
سارے ترکی پر کتاب لکھنا۔ میں کم سے کم ان لوگوں سے زیادہ حق دار ہوں کہ ترکی کے حالات لکھوں، میں کوئی کتاب
کا نہیں، صرف مختصر پیرایہ میں چھوٹے چھوٹے مضامین کے ذریعہ سے ترکی کی حالت نذرِ ناظرین کروں گا اور اس
اُجرت یا داد صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ ناظرینِ "ہمدرد" ان کو پڑھ کر ہمیشہ سے زیادہ ترکوں کے نہیں بلکہ اسلام
پر کمرِ ہمت باندھ لیں۔ کیونکہ میرے خیال میں بقائے حکومت اسلام ترکی پر منحصر ہے، ترکی سلطنت گو برائے نام
اُس کا بالکل مٹ جانا گویا اسلام کا مٹ جانا ہے۔ گو مذہبِ اسلام تو بقول ڈاکٹر اقبال کے :-

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

کوئی دنیوی طاقت مٹا ہی نہیں سکتی لیکن رہی سہی جو حکومت ہے وہ مٹ کر ذلتیں اور مصیبتیں بڑھ جائیں گی۔

ك مشہور موسیقار و فلم کار خلیفہ محمود کے والد

یہاں شکری پاشا اور ان کے اسٹاف کے افسر رہتے تھے۔ اور یہیں بالآخر وہ قید ہو گئے۔ سرویوں کے شمالی دروازہ کا ہگر کر کے بعد "خضرلق" پہنچے۔ عبدالرحمٰن (علیہ) کے قریب ان کا خفیف سا مقابلہ کیا گیا۔ مگر وہ بڑھتے چلے گئے۔ اور سیدھے قلعہ "خضرلق" میں داخل ہو گئے۔

بلغاری افواج شہر کو بہت ہی کم نقصان پہنچا سکیں۔ اسلامی محلہ کے چند مکانوں کو بالکل اڑا دیا گیا۔ بہت سی چھوٹی مساجد کو تنوروں، اصطبلوں اور آبدست خانوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ انہوں نے یہ خیال کیا تھا کہ چونکہ وہ اس مقام پر ہمیشہ حکمرانی کریں گے۔ اس لیے انہوں نے شہر کو بگاڑنے یا برباد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جامع سلیم کے علاوہ وہاں اور بھی عالیشان جامع مسجدیں ہیں۔ جن میں سے بایزید، عسکی اور امرچ شرنلے زیادہ تر ذکر کے قابل ہیں۔ اگرچہ سب مساجد کو تھوڑا بہت نقصان پہنچا ہے۔ تاہم اچ شرنلے کو بے حد صدمات پہنچے ہیں۔ اس خوب صورت مسجد کا انہوں نے گودام بنایا تھا۔ اور چلتے وقت انہوں نے اس میں آگ لگا دی تھی۔ یہ تمام و کمال ایک پتھر کی عمارت ہے۔ اور اس لیے آگ نے اسے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا۔ انہوں نے ایک مینارے کا سب سے اونچے کا درجہ بھی گرا دیا تھا۔ تاکہ ان کی سفاکی اور مظالم کی داستان ہمیشہ ہمیشہ تازہ رہے۔

عبدالرحمٰن صدیقی کا تعارف

مسٹر عبدالرحمٰن صاحب صدیقی کے نام سے لوگ واقف نہ ہوں گے۔ آپ آل انڈیا میڈیکل مشن کے مینجر تھے۔ اور "کامریڈ" اور "ہمدرد" کے سابق مینجر رہ چکے ہیں۔ ڈاکٹر انصاری صاحب کے قسطنطنیہ سے رخصت ہونے کے بعد آپ وہاں اس غرض سے ٹھیر گئے تھے کہ مہاجرین کی نوآبادیوں کے متعلق کچھ کام کریں۔ صاحب موصوف ان خوش قسمت اشخاص میں سے ہیں جو ایڈریانوپل میں فاتحانہ فوج کے ساتھ داخل ہوئے۔ آپ کے دلچسپ و پر از معلومات مضامین کامریڈ اور ہمدرد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مذکورہ چٹھی آپ نے روانہ ہونے سے پیشتر لکھی تھی۔ جس کی اشاعت میں ہمیں افسوس ہے کہ تاخیر ہو گئی ہے۔ آتے ہوئے آپ نے سفر میں تھوڑے دن قیام کیا تھا۔ اب دہلی والوں کی خوش قسمتی ہے کہ وہ گھر سے یہاں تشریف لا رہے ہیں۔

ں کو جواب دے کر مطمئن کر دوں۔ میرا اصل مقصد اس مضمون نویسی سے یہ ہے کہ اب تک مسلمانانِ ہند کا متعصب تاری
یسوں اور مضمون نگاروں کے بیانات پر انحصار رہا ہے۔ یہ مضامین چونکہ بے غرضانہ نہیں ہوتے، اس لیے ان
میں عادتاً بے جا ترکوں کی برائیاں ایک عالم کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ میں نے اتنا عرصہ انتظار کیا کہ میرے
ہم سفر بھائیوں میں سے مجھ سے کوئی قابل شخص اس فرضِ اہم سے ہمراہانِ مشن کی گلو خلاصی کرے اور اپنی قابلیت
سے دیگر مسلمانانِ ہند کو مستفیض بنائے۔ لیکن جب خاموشی میں اس قدر بڑا حصہ عمر کا گزر گیا، اور ترکوں کی طرف
سے میں نے مسلمانوں کے جوش کو کم ہوتے دیکھا تو جبراً و قہراً اپنے ہی سر لے لیا۔ خدا میری مدد کرے کہ میں
کردگان سچ سچ حالات عوام الناس کے سامنے پیش کر سکوں۔ اور اس طرح پر ترکوں کی یاد تازہ کر کے اس
کی مدد کی اپیل کر دوں۔ نیز یہ کہ اپنے ترکی جانے سے کوئی فائدہ اُن لوگوں کو بھی پہنچاؤں جو بے چارے دل پہ پتھر
رکھے یعنی پڑے رہنے پر مجبور تھے۔ ترک عام طور پہ ہم ہی لوگوں کی طرح ہیں، سوائے اس کے کہ شجاعت زیادہ ہے
اور کوئی بات نہیں۔ ان میں برائیوں کے ہونے سے پریشانی کی ضرورت نہیں۔ ہر زوال پذیر قوم کی یہی حالت ہو
چلی آئی ہے۔ یہ تو ہر انحطاط پذیر قوم کا تمغہ ہوتا ہے۔ اگر یہ دن نہ ہوتا تو آج ویانا اور پیرس، میڈرڈ اور ل
قاہرہ اور ایتھنز، بوسنیا اور بلگریڈ، استنبول اور طہران، مراکو اور طرابلس، سسلی اور مالٹا، قبرص اور قریہ، الجی
الجزائر، کابل اور کوئٹہ، چی کنگ اور ماسکو، دہلی اور رنگون، کولمبو اور جاوا وغیرہ وغیرہ:
خلیفۃ المسلمین امیر المومنین خادم حرمین شریفین سلطان البرین و البحرین کا سکہ رواں ہوتا لیکن "ہر کمالے
را زوالے" کا ثبوت تاریخوں سے ملتا آیا ہے، اسی طرح اس کا بھی ثبوت ملتا رہا ہے اور اسی لڑائی میں ملا کہ "ہر زوالے
را کمالے"۔ یونان اور بلغاریہ کو دیکھیے کیا تھے اور کیا ہو گئے؟

مثلِ بو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا
رخت بر دوشِ ہوائے چمنستاں ہو جا
شوقِ وسعت ہے تو، ذرہ سے بیاباں ہو جا
نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا
بول اسلام کا ہر قوم میں بالا کر دے
اور دنیا کے اندھیرے میں اُجالا کر دے

ترکی ہی ایک ایسی اسلامی قوم باقی ہے جو حکومت اور آزادی کے سبب ہمارے مقصدِ آفرینش کی تکمیل یعنی حفاظت حرمین شریفین کر سکتے ہیں۔ عرب یا افغان مقابلۃً ترکوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے، افغانوں سے تو ہم کو اکثر واسطہ پڑتا ہی رہتا ہے، ان کی حالت جیسی خراب ہے اس کا اندازہ ہم کو اچھی طرح ہے۔ عربوں کی حالت میں آگے چل کر مضمون میں لکھتے وقت اپنی وہ وجوہ بھی بیان کروں گا جن کی بناپر میں عربوں پر ترکوں کو ترجیح دیتا ہوں۔ ایک قصہ مجھے یاد آیا، اس سے کم سے کم ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کا اندازہ ہو جائے گا، اس کے شاہد شاید میرے ہمراہی بھی ہیں جو ادرنہ کی تسخیر کے بعد میرے ہمراہ شہر مذکور میں گئے تھے، ایسے شاندار معرکہ میں جس سے کفرستان اور عالم اسلام دونوں کو حیرت ہوگئی، ہمارے چند پنجابی مسلمان بھائی بھی شریک تھے، چنانچہ یہ لوگ ہندوستان چھوڑ کر جہاد کے لیے ٹرکی پہنچے تھے۔ سات کروڑ مسلمانوں میں سے یوں چند اشخاص کا عملاً جہاد میں شریک ہو جانا ہی ان کی بہادری کا کتنا بڑا ثبوت ہے۔ یہ لوگ انور بک کے ہمراہ ادرنہ کو بلغاریوں سے واپس لینے کی غرض سے گئے تھے، اور خدا کے فضل سے نہایت تزک اور احتشام کے ساتھ چھوٹی موٹی معرکہ آرائیاں کرتے ہوئے اپنے شجاع ترک بھائیوں کے ساتھ ادرنہ میں داخل ہوئے۔ میں بھی اپنے چند ہمراہیوں کے ہمرکاب ہوا کے گھوڑے پر چڑھ کر دوسرے تیسرے ہی دن ادرنہ پہنچ گیا تھا۔ ادرنہ ٹرکی میں ایڈریا نوپل کو کہتے ہیں۔ یہاں پہنچکر خوش قسمتی سے انور بک و عادل بک وغیرہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، اس کی مفصل کیفیت، ہمدرد ہی کے ذریعہ سے اپنے ایک خط میں جو میں نے قسطنطنیہ سے بھیجا تھا، لکھ چکا ہوں۔ اسی اثنا میں مجھے اپنی جماعت سے بھی زیادہ خوش قسمت جماعت یعنی انہیں چند پنجابی بھائیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ یہ لوگ مجھے مرلدیہ یعنی عمارت میونسپلٹی کے سامنے جب کہ ولی عہدِ خلافت اور سرِ قرق کلیسا جانے والے تھے، تماشائیوں اور سپاہیوں کے مجمع میں نظر پڑے، میں نے ان سے مختصراً دریافت کیا کہ مارچ کرتے وقت انہوں نے کیا کیا؟ اس سوال کے ساتھ ہی ایک رشک ظاہر ہونے لگا۔ گو میں نے کتنا ہی چھپایا، مگر میری باتوں سے صاف ظاہر ہو گیا۔ اور وہ لوگ ہنسنے لگے۔ جواب دیتے ہوئے مجھ سے من وعن کیفیت بیان کی۔ میرے اس سوال پر کہ کبھی خود بھی کسی کو مارا؟ نہایت شرم سے جواب دیا کہ "ہم ہندوستانی ہیں اکثر چھوٹے پیمانہ پر لڑائیاں ہوئیں۔ ترکوں نے بڑھ بڑھ کر دشمنوں کی گردنیں اڑائیں لیکن ہم پیچھے ہی رہتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ افسران ہم کو روکتے تھے، بلکہ اس لیے کہ ہم نے کبھی تلوار و بندوق نہیں اٹھائی تھی۔ ہم کو خود بخود ایک رکاوٹ سی ہوتی تھی، جیسے ایک قاتل قتل کرتے وقت مرعوب ہو جاتا ہے، اسی طرح ہم پر بھی رعب طاری ہو جاتا تھا۔ اب اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہم کیسے ہیں۔ افسوس کہ ہم لوگوں کو اتنا بھی نہیں آتا کہ اگر موقع پڑے تو جان بھی بچا سکیں۔ چہ جائیکہ جنگ میں مرنا اور مارنا۔" میں نے یہ قصہ اس لیے پیش کیا ہے کہ ہم کو اس کا اندازہ ہو جائے کہ ترکوں میں اور ہم میں کتنا فرق ہے۔ مسلمانوں میں حاکم، آزاد، بہادر اگر کوئی قوم صفحۂ ہستی پر ہے تو وہ ترک ہے۔ میرا مستقل ارادہ ہے کہ صحیح حالات لکھوں، لیکن اپنی رائے کو شامل کرتا رہوں گا۔ کیونکہ وجوہ کا بتلانا نہایت ضروری ہے۔ میں اس کے لیے بھی تیار ہوں، کہ کوئی صاحب اگر میری طرح ذاتی مشاہدہ کی بنا پر میرے بیانات کی تکذیب کریں۔ تو میں

از نواب وقار الملک

ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری کی مراجعت ہندوستان

یکشنبہ ۲۹ جون سنہ ۱۹۱۳ء

یقین ہے کہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں نے ڈاکٹر انصاری صاحب کی مع الخیر والعافیت مراجعت فرمانے کو بہت خوشی سے سُنا ہوگا جو چھ سات روز ہیں، انشاءاللہ بمبئی پہنچنے والے ہیں۔ وہاں سے تمام بڑے بڑے مقامات پر بذات خود تشریف لے جاکر مسلمانوں کو ترقی تمسکات قرضہ کی خریداری کی ترغیب دیں گے۔ درحقیقت ابھی تک بہت سے ایسے مسلمان ہیں جو یہ سن کر کہ جنگ ختم ہوچکی ہے یہ سمجھ رہے ہیں کہ اب ترکوں کو مالی امداد بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ ان کا یہ خیال صرف واقعات کی لاعلمی کی وجہ سے ہے اور واقعات کی لاعلمی زیادہ تر اس پر مبنی ہے کہ عام اشخاص کو ابھی تک اخبار بینی کا مذاق پیدا نہیں ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ دورہ تمام مصائب و تکالیف و ضروریات پر سے پردہ اٹھادے گا جو گزشتہ پر افسوس جنگ اور ہولناک بربادی کی وجہ سے ترکوں اور مقدونیہ وغیرہ کے مسلمانوں کو اس وقت لاحق ہورہی ہیں۔ نیز جس قدر تدبیریں اور کوششیں کہ ان مصیبت زدوں کو مدد پہنچانے کی غرض سے ہندوستان میں کی جارہی ہیں اور جن کی بابت واقعات کی ناواقفیت کی وجہ سے بعض صاحبان کو کچھ غلط فہمیاں ہورہی ہیں۔ ان کی غلط فہمیوں کی اصلاح بھی اس موقع پر ڈاکٹر صاحب موصوف کے ذریعہ سے پوری طرح ہوجائے گی۔ انہیں مسائل میں اناطولیہ میں مہاجرین اہل اسلام کے واسطے نوآبادیاں قائم کرنے کا مسئلہ بھی ہے۔ اس کے متعلق بھی جو شبہات بعض صاحبوں کو پیدا ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا بیان سننے کے بعد، غالباً وہ بھی رفع ہوجائیں گے۔ حالانکہ بعض شبہات تو اس قسم کے ہیں جو ذرا بھی غور و تامل کے بعد دل میں بھی قائم نہیں رہ سکتے مثلاً جب ترکی حکام نے اس کمیٹی کو منظور کرلیا ہے جو نوآبادیوں کے واسطے قائم کی گئی ہے۔ اور جس میں خود ترکی تجربہ کار افسر شریک ہیں تو اب ہم کو اس بحث میں پڑنا کہ پہلے سے جو ایک کمیٹی مہاجرین اس قسم کی امداد کے واسطے ترکی میں قائم تھی۔ اسی کے سپرد یہ کام بھی کیوں نہ کیا گیا ہمارے منصب سے بالکل خارج ہے۔ اور جب تمام واقعات کمیٹی کے سامنے ہیں اور کمیٹی کے موقع پر ان کی نسبت غور کررہی ہے تو وہ ہماری بہ نسبت بہت اچھی طرح اس بات کا تصفیہ کرے گی کہ کن کاموں کی ضرورت ہے اور ان میں کس قدر خرچ ہونا چاہیے یا مثلاً اس قسم کی نکتہ چینیاں کہ چندہ کا روپیہ کس کے پاس گیا اور خزانچی کون ہونا چاہیے وغیرہ وغیرہ چلتی گاڑی میں روڑا اٹکانا ہے۔ ایک بزرگ

ابھی تک اسی شش و پنج میں ہیں کہ بجائے طبی وفد بھیجے جانے کے نقد روپیہ کہ ترکوں کے پاس بھیجا جاتا زیادہ مفید تھا۔ آفتاب نصف النہار پر پہنچ چکا ہے۔ دوست اور دشمن نے اقرار کر لیا ہے کہ ڈاکٹر انصاری صاحب کے طبی وفد نے جو کامیابی حاصل کی ہے اس سے بہتر مفید نتائج اور طرح حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے بعد بھی وفد بھیجنے یا نقد روپیہ بھیجنے کے سوالات کو جاری رکھنا یہ اسلام کی سچی خدمت نہیں ہے جس وقت یہ وفد روانہ ہو رہا تھا۔ میرا خیال بالکل اس طرف منتقل نہیں ہوتا تھا۔ کہ مجروحوں کے علاج معالجہ کے سوا جس میں بے شبہہ ایک خاص جزو بہت زیادہ ہمدردی کا شامل ہو گا۔ اور کوئی ایسا اہم پولیٹیکل نتیجہ بھی پیدا ہو گا۔ جس کا سلسلہ اب شروع ہوا ہے، یعنی ہندوستان کے مسلمانوں اور ترکوں کے درمیان ایک مضبوط رشتہ اتحاد کا قائم ہونا اور یہ وہ نتائج ہیں کہ جس قدر خرچ کی کارروائی میں ہوا اگر اس سے دس گنا روپیہ بھی خرچ ہو جاتا تو بھی یہی نتائج جو حاصل ہوئے بہت ارزاں سمجھے جانے کے قابل تھے آج جو بیج کہ قسطنطنیہ میں ڈاکٹر انصاری صاحب اور مولوی ظفر علی خاں صاحب اور ان صاحبوں کے دوسرے اعوان و انصار کی کوشش سے بویا گیا ہے اگر مسلمانان ہندوستان اپنی مالی امداد سے اس کی آبیاری کرتے رہے تو وہ عنقریب ایک تناور درخت ہو گا۔ اور ایسا شیریں پھل لائے گا کہ جو بزرگوار اس وقت وفد کی کارروائی کو فضول خرچی سے تعبیر کرتے ہیں وہ غالباً اپنی رائے کو بدلنے پر مجبور ہوں گے۔

علیٰ ہذا القیاس قسطنطنیہ میں ایک اسلامی بنک قائم کرنے کی تجویز کی نیت پر اعتراضات کا پیدا کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ معترضین کا یہ خیال کہ ایک وقت میں چند قسم کی کوششوں کو جاری کر دینا ہر ایک کوشش کے ضعف کا موجب ہو گا۔ اصولاً صحیح ہے لیکن ایک وقت ایسا بھی آ جاتا ہے جب کہ منشیات سے ہی کام لینا پڑتا ہے اور آج جو مصیبت ترکوں پر عائد ہو رہی ہے اسی قسم کی مصیبت ہی جس کے لیے جائز ہے بلکہ لازمی ہے کہ ساتھ ہی ساتھ چند کام شروع کیے جائیں، ایک شخص بھوکا بھی ہے پیاسا بھی ہے اس کے بدن پر کپڑے بھی نہیں ہیں وہ بیمار بھی ہے تو اب جو شخص بھی ایسے ایک مصیبت زدہ بندہ خدا کے ساتھ ہمدردی کرنا چاہے وہ قابل معافی ہو گا، اگر اس کی سب ضرورتوں کو ایک ساتھ بہم پہنچانے کی کوشش کرے اور جو صاحب اس پر معترض ہیں ان کو چاہیے کہ بجائے اس کے کہ مختلف کاموں کو بند کرنے کی رائے دیں جس کام میں ان کو زیادہ دلچسپی ہو وہ اپنی کوشش خاص اسی کام میں مصروف رکھیں۔ پھر اس کی شکایت کی جاتی ہے کہ چندہ مانگنے میں سخت زبانی سے کام لیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ دینے والا بھی عاجز آ کر نا دہند بن جائے اور بلاشبہ اس قسم کی معذرت ان صاحبوں کی طرف سے ہو سکتی ہے جو چندہ میں تو ایک پیسہ نہ دیں اور دنیا جہان کے اعتراضات پیدا کر کے لوگوں کو ترکوں کی مدد سے باز رکھیں۔ اور دوسرا کوئی عذر اس قسم کی کارروائی

یے واسطے وہ پیش ہی کیا کر سکتے ہیں لیکن پوری قلعی کھل جاتی ہے جب ان اعتراضات کا پڑھنے والا معترضین کے اس مشورہ پر پہنچتا ہے۔ کہ بجائے اس کے کہ ٹرکی سلطنت کی حفاظت میں مہاجرین کے واسطے نوآبادیاں قائم کی جائیں بہتر یہ ہے دول یورپ کے توسط سے پھر مہاجرین کو ان کے پہلے وطنوں کو لوٹانے کا انتظام کیا جائے۔ اور پھر ان کو انہیں سفاک، بے رحم، ناخدا ترس ظالموں کے پنجہ میں دے دیا جائے جنھوں نے ان میں سے بہتوں کو بے گناہ قتل کیا ہے۔ ان کو لوٹا ہے۔ ان کی عصمت دری کی ہے اور کوئی دقیقہ ان کو نقصان، تکلیف اور ذلت پہنچانے کا باقی نہیں چھوڑا۔ مشفق ناصح اس موقع پر یہ لکھنا بھول گئے ہیں کہ اگر دول یورپ ان کو اپنی طرف سے بلقان و یونان میں ایجنٹ مقرر کرکے بھیج دیں، تو وہ ذمہ دار ہوں گے کہ بلقانی و یونانی ریاستوں کو ایک سرمو بھی مسلمانوں پر دوبارہ دست تعدی دراز نہ کرنے دیں گے۔ یہ ہیں ہمارے مسلمان ناصح خدا کے واسطے کوئی بتادے کہ آیا ان نصیحتوں پر عمل کرنا۔ مسلمانوں کی عقلمندی اور عزت غیرت اور حمیت کے شایان ہوگا۔ ایک وقت میں یہی دلسوز ناصح ہندوستان کے مسلمانوں کو حجاز ریلوے میں چندہ دینے سے روکتے تھے۔ آیا ان نصیحتوں پر عمل کرنے سے مسلمان دنیا میں اپنی عزت وقار قائم رکھ سکتے ہیں

گر مسلمانی ہمیں است کہ واعظ دارد   وائے گر در پس امروز بود فردائے

اس سے زیادہ اور اس باب میں لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ سوائے اس کے کہ خدا نے ڈاکٹر انصاری صاحب کو اس وقت بہت ہی برمحل اور برموقع ہندوستان کو واپس بھیج دیا ہے۔ پس ہر جگہ جہاں جہاں سے وہ گذریں اور جہاں تشریف لے جائیں ان پر یہ ثابت کردیا جائے کہ مسلمانوں نے ان کی خدمات کو بہت ہی احسان مندی و شکرگزاری و اعتماد کے ساتھ دیکھا ہے۔ اور پورے جوش کے ساتھ دیکھا ہے اور پورے جوش کے ساتھ ان کا استقبال کریں اور عام جلسے کرکے ان کے بیانات سے مستفید ہوں، لیکن اس کا یہی خیال رکھیں کہ وہ بہت سخت محنت برداشت کرکے اور ایک بڑے سفر سے واپس آرہے ہیں لہذا ان کا وقت بہت قیمتی ہے۔ اور جو وقت بھی ان سے کسی کام میں صرف کرانا چاہیں وہ کام بھی قیمتی ہونا چاہیے۔ "کامریڈ" اور "ہمدرد" ان کے پروگرام کو وقتاً فوقتاً چھاپتے رہیں گے اور بالفعل جہاز سے اترنے کے بعد پہلا قیام ان کا بمبئی میں ہوگا۔ جن ہمدردانِ قوم کو ان کاموں سے دلچسپی ہے چاہیے کہ وہ بمبئی ہی سے ان کو اپنی طرف کھینچنے کی اس طرح کوشش شروع کردیں کہ ان کا وقت زیادہ صرف نہ ہو، نہ زیادہ تکلیف ہو اور بہت سے مسلمانوں کو وہ نہایت مفید اور ضروری اطلاعوں سے مستفیض فرما سکیں۔

خاکسار:- مشتاق حسین امروہوی (نواب وقار الملک)

مقام دہلی - ۲۵- جون سنہ ۱۹۱۳ء

خیر مقدم ڈاکٹر انصاری

ادا کرتے ہیں ہم شکر جناب حضرت باری
کہ آئے خیریت سے ممبران وفد انصاری

ہزاروں کوس جا کر بھائیوں کی تم نے خدمت کی
یہی تھا درد اسلامی تھا، یہی تھی رسم غمخواری

فراق ملک و ترک خانماں و دوری منزل!
خدا کے فضل سے کڑیاں یہ تم نے جھیل لیں ساری

جو سچ پوچھو تو زیبا ہے تمہیں دعوئے آقائی
کہ تم نے کی ہے ترکان مجاہد کی پرستاری،

تمہارا ناز اٹھائیں اہل ملت جس قدر کم ہے
کہ تم نے غازیان دیں کی، کی ہے ناز برداری

تمہارے سامنے موتی کی لڑیاں پوت سے کم ہیں
کہ دیکھ آئے ہو تم ترکی یتیموں کی گہر باری!

تمہی کچھ جاں نوازی ہائے اسلامی کو سمجھو گے
کہ تم دیکھ آئے ہو نصرانیوں کا طرز خوں خواری

نہیں ہے سوز اسلامی کا گو نام و نشاں باقی
تمہارے دل میں ہیں کچھ درد کی چنگاریاں باقی

آم کے آم گٹھلیوں کے دام!

بہت سے لوگ ہیں جن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون سا طریقہ ہو سکتا ہے کہ سرمایہ کو کسی طرح کا خطرہ بھی نہ لاحق ہو اور باضابطگی کے ساتھ ماہ بہ ماہ یا سال بہ سال یا سہ ماہی، ششماہی نفع بھی پابندی سے ملتا رہے۔

ہمارا مشورہ یہ ہے کہ آپ اپنا روپیہ تاج کمپنی لمیٹڈ میں لگائیے، نہ سرمایہ کو کسی طرح کا خطرہ ہے نہ نفع وصول کرنے میں کسی طرح کی دقّت! آپ جتنی مدّت تک کے لیے چاہیں روپیہ جمع کرا سکتے ہیں اور اس مدت میں نفع برابر ملتا رہے گا۔

اگر آپ اپنا سرمایہ واپس لینا چاہیں تو بھی کسی طرح کی دشواری نہ ہوگی۔ جب چاہیں اپنا روپیہ واپس لے سکتے ہیں۔

اور اس مادّی نفع کے علاوہ ایک نفع اجرِ آخرت کی صورت میں بھی آپ کو ملے گا، کیونکہ تاج کمپنی عام بازاری کتابیں نہیں چھاپتی۔ اس کا مقصدِ وحید صرف اعلیٰ پیمانے پر

قرآنِ شریف

کی طبع و اشاعت ہے، جس کی ساری دُنیا معترف ہے

تفصیلات کیلئے فوراً کمپنی سے رجوع کیجیے

تاج کمپنی لمیٹڈ (ناشرانِ قرآن و اسلامیات) منگاپیر روڈ۔ کراچی

پھیری والے سوداگر کی صدا

(از غلام امیر صاحب رئیس بدایوں)

ترکی کے تمسکات لے لو لے لو — جنت کے قبا لجات لے لو لے لو
ترکی کی مدد ہے فرض ہر مسلم پر — اسی گرتے ہوئے کا ہات لے لو لے لو
یوں دب کے کبھی نہیں کیا تھا سودا — کچھ آن پڑی ہے بات لے لو لے لو
تحریریں گاہکوں کی دستخط کر دو — جلدی سے قلم دوات لے لو لے لو
کل حشر کے روز بھی وعدہ نہ سہی — تم آج ہی نجات لے لو لے لو
جب وقت نکل گیا تو پچھتاؤ گے — ملتے ہی رہو گے ہات لے لو لے لو

یورپ کی بساط جنگ اور زر سے دریغ
تو اپنی خوشی سے مات لے لو لے لو

تعمیری، تخلیقی اور اصلاحی ادب

اُردو زبان میں تعمیری، تخلیقی اور اصلاحی ادب کا ستھرے اور شائستہ انداز میں پیش کرنا ہمارے مکتبہ کا طرۂ امتیاز ہے

آئن اسٹائن کی کہانی

دُنیا کے عظیم انسان اور عظیم سائنسداں آئن اسٹائن کے احوال و سوانح، تعلیم و تربیت، علم و فضل اور شہرت و عظمت کی کہانی، ازدواجی زندگی، اولاد، جلاوطنی، بیماری اور موت کی داستان، یہ داستان آئن اسٹائن کی سکریٹری کی لکھی ہوئی ہے جس کا رواں اور سلیس ترجمہ مشہور مترجم، ادیب اور انشاپرداز رئیس احمد جعفری نے کیا ہے۔ قیمت: روپے

★ ★ ★

نوشابہ

ایک عظیم ناول

جو اُردو زبان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے

رئیس احمد جعفری کے سحر طراز قلم کا نتیجہ ہے

یہ

یہ دعوتِ انقلاب بھی ہے اور پیامِ اصلاح بھی۔ حد درجہ دل گداز اور اثر آفریں۔ قیمت: آٹھ روپے

اسی مصنف کی دوسری کتابیں

اندھا • جواری • قیامت • فرار

مکتبۂ خاور • چوک انارکلی • لاہور

عالم بے بدل، فاضلِ اجل، جامع معقول و منقول، ماہرِ شریعت و طریقت

حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی نور اللہ مرقدہٗ کا

اُردو ترجمہ قرآن مجید

اردو زبان میں اب تک قرآن مجید کے جتنے ترجمے ہوئے ہیں ان سب میں حضرت مولانا
احمد رضا خاں صاحب بریلویؒ کا ترجمہ قرآن اپنی انفرادیت، معنویت، زبان کی سلاست
ترجمے کے اعتبار سے ایک خصوصی حیثیت رکھتا ہے۔

تاج کمپنی یہ فخر

یہ صرف زر کثیر بلاکوں کے ذریعے یہ نایاب اور نادر ترجمہ عربی متن کے
ساتھ شائع کیا ہے اور اس طرح ایک بہت بڑی ضرورت پوری کر دی
صرف تاج کمپنی کو حاصل ہے کہ اس نے یگانۂ روزگار علماء کے
ترجمے عربی متن کے ساتھ آرٹ پیپر یا بڑھیا سفید کاغذ پر

بلاکوں کی طباعت کے ذریعے

پیش کر کے ایک ایسی راہ نکالی ہے جس کا عرب ممالک تک سپاس و
مسرت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔

ھدیہ: روپے

تاج کمپنی لمیٹڈ منگھا پیر روڈ • کراچی

ہنگامہ زارِ کانپور!

آج سے پچاس برس پہلے!

پچاس سال پہلے جب انگریز پورے استبداد اور قہرمانیت کی شان سے ہندوستان کا آقا تھا اور ہندو مسلم اس کے غلام تھے۔ کلکٹر کانپور نے یوپی کے لیفٹننٹ گورنر کی شہ پاکر مسجد کا ایک حصہ سڑک کی توسیع کے سلسلے میں منہدم کرادیا۔

مسجد کی شہادت!

اس سلسلے میں غلام مسلمانوں نے کیا کیا، غلام مسلمانوں کے زعمار نے کیا کیا اور ان دونوں کے ایثار قربانی نے کس طرح بالآخر دالسرائے کو جھکنے اور گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا۔ یہ تاریخ کا ایک نہایت دلچسپ باب ہے۔

ایک وہ زمانہ تھا اور ایک یہ زمانہ ہے کہ ہندوستان کی قومی اور سیکولر حکومت نے ان صدہا مسجدوں کو نہ اب تک دوبارہ بنا سکی جو شہید کردی گئی تھیں، نہ واگزار کراسکی جو آج تک غیر مسلموں کے قبضے میں ہیں!

★

مضبوط. بہترین. ارزاں

بازار سے انسان جو چیز خریدتا ہے کوشش کرتا ہے کہ ایسی چیز خریدے جو مضبوط ہو، بہتر ہو، سستی ہو اور یہ خواہش سائیکل کے بارے میں اور زیادہ قوی ہوتی ہے اس لیے کہ اس زمانے میں سائیکل کا شمار ضروریاتِ زندگی میں ہوتا ہے۔ غریب اور متوسط طبقے کے لوگ سائیکل کے بغیر نہ دفتر وقت پر پہنچ سکتے ہیں نہ گھر، یہی ایک ایسی غریب نواز سواری ہے جو غریب اور متوسط طبقے کے لیے رگِ زندگی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہماری دکان میں

پاکستان کی ہر سائیکل ساز کمپنی کی سائیکلیں

مناسب داموں پر آپ بہ آسانی حاصل کر سکتے ہیں

— علاوہ ازیں —

ٹائر۔ ٹیوب۔ پرزے اور دوسرا متعلقہ سامان

بھی آسانی اور کفایت کے ساتھ ہمارے ہاں سے آپ کو مل سکتا ہے

بشیر اینڈ کمپنی —— سائیکل ڈیلر

صرافہ بازار • کوئٹہ

کانپور میں مسجد کی شہادت

دوشنبہ ۸ جولائی ۱۹۱۳ء

کانپور کی مسجد واقع مچھلی بازار کے ایک حصہ کے انہدام کا ناخوشگوار معاملہ کچھ عرصہ سے درپیش تھا جس کے متعلق اکثر اسلامی اخبارات نے معاملہ کے ہر شوشہ کے گوشہ پر طویل بحث کر کے اور اچھی طرح ظاہر کر دیا تھا کہ صورت حالات وحقیقت واقعات کیا ہے۔ اور مسلمانوں کی تشویش وپریشانی کس حد تک جائز ہے۔

ہمارے ناظرین کو سخت تعجب ہوگا کہ اس بارہ میں ہمدرد نے اپنی زبان سے اب تک کیوں ایک حرف بھی نہ نکالا۔ اور اس اہم معاملہ کو کس وجہ سے قابل التفات نہ سمجھا۔ لیکن جیسا کہ مسلمانان کانپور کو اچھی طرح علم واطلاع ہے مسٹر محمد علی نے صوبہ جات متحدہ آگرہ اودھ کے حاکم اعلیٰ کی معاملہ فہمی اور مصلحت شناسی بلکہ انصاف پسندی اور عدالت شعاری پر بھروسہ کر کے مناسب سمجھا کہ اس بارہ میں ہز آنر سر جیمس مسٹن صاحب بہادر کی خدمت میں اصلی حالات اور صحیح واقعات پیش کر کے وہ تمام امور مراسلت کے ذریعہ سے گوش گذار کر دیں جو اخبارات کے ذریعے سے پیش کئے جاتے اور اس طرح اگر یہ معاملہ خطوط وعرائض کے صفحات میں لانے سے رو براہ ہو جائے تو بدرجہا اور بمراتب اس سے بہتر ہوگا کہ اخبارات کے کالموں میں لا کر ایک طرف تو اسلامی پبلک کے جوش کو بڑھکایا جائے۔ اور دوسری طرف گورنمنٹ کی مشکلات میں اضافہ کیا جائے۔

مسلمانان کانپور نے بطور خود بھی آخری کوشش کی یعنی ہز آنر کی خدمت عالی میں آخری میموریل پیش کیا جس میں شرح وبسط کے ساتھ واقعات بیان کر کے درخواست کی کہ مسجد کا کوئی حصہ منہدم نہ کیا جائے۔ ہز آنر خود بھی بغرض معائنہ مسجد ودریافت حالات کانپور میں تشریف لائے اور ہمیں توقع امید تھی کہ وہ ہر پہلو کو اچھی طرح سوچ سمجھ لیں گے اور حکم اخیر نافذ فرمانے سے پہلے اس امر کو ملحوظ رکھیں گے کہ ان کے صوبہ کی رعایا کی کثیر تعداد اور معتدبہ حصہ کی دل آزاری اور خاطر شکنی نہ ہونے پائے مگر افسوس کہ حسن ظن کی قسمت میں بہو بیٹے ہو کر بہہ جانا لکھا ہوتا ہے۔ اس پر کافوری مرہم کے ہزار پھاہے رکھے جائیں تب بھی کچھ نہیں ہوتا اور وہ بغیر بھٹی اور تراوش کئے نہیں مانتا۔

جیسا کہ ہمارے ناظرین کو اس وقت تک تفصیل وصراحت معلوم ہو چکا ہوگا۔ کانپور کی مسجد کا وہ شرقی حصہ جسے چاہے دالان کہو یا غسل خانہ یا وضو خانہ اور جسے کانپور میونسپلٹی کے چیئرمین صاحب تاک چکے تھے۔ آج ایک ہفتہ ہو چکا کہ پیوند خاک اور سطح زمین سے ہموار کر دیا گیا۔ مسجد شکنی بھی ہوئے اور خاطر شکنی بھی ہوئے نہ صرف مسلمانان کانپور کی بلکہ مسلمانان ہند کی خاطر شکنی! اور آج ہمیں اقرار کرنا پڑتا ہے کہ معاملہ کو چپ چاپ اور مراسلت ومصالحت طے کرانے کے متعلق مسٹر محمد علی کی تمام کوششیں بالکل رائیگاں اور محض بے سود ثابت ہوئیں۔

ہم ہز آنر سر جیمس مسٹن اور مسٹر محمد علی کی خط وکتابت کو بجنسہ شائع کرتے ہیں جس سے ناظرین واقعات کو دیکھ کر اور بجائے خود رائے قائم کر سکتے ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ ہم ادائے فرض سے غافل نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ہم ابھی عرض کر چکے ہیں ہم نے چاہا تھا کہ اگر اس سہل طریقہ سے حصول مقصد ہو جائے تو اخباری دارو گیر سے پرہیز ہی اولیٰ ہے۔ لیکن ہم آج محسوس کر رہے ہیں کہ جمہوریت میں جمہوری طریقہ

سخن ہائے گفتنی

کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں،

آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آگئی ہے منتظرِ نفخ صور ہیں

کچھ نوجواں ہیں بے خبر نشۂ شباب
ظاہر میں گرچہ صاحب عقل و شعور ہیں،

اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ
مجرم کوئی نہیں ہے، مگر ہم ضرور ہیں،

سینہ پہ ہم نے روک لئے برچھیوں کے وار
از بسکہ مست بادۂ ناز و غرور ہیں،

ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر
لذت شناس ذوق دل ناصبور ہیں،

پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
"ہم کشتگان معرکۂ کانپور ہیں"!

موجود ہونا تو ضرور تھا کہ بجائے زبانی جواب دینے کے چیئرمین صاحب اسے عین موقع پر جیب سے نکال کر معترضین کے منہ پر کھینچ مارتے۔ بلکہ ان ازروئے
کہ جنہیں چیئرمین صاحب نے اپنی پر پیچ وخم منطق کی تائید میں پیش کیا ہے ایک وہ ہے کہ جس میں عام الفاظ میں گورنمنٹ کی طرف سے بورڈ کو ڈھائی
لاکھ روپیہ اس غرض سے دئے جانے کا ذکر ہے کہ شہر کانپور کے سڑکوں کو وسیع اور گنجان آبادی کو کشادہ کیا جائے۔ مگر ہم اس عجیب منطق کے سمجھنے سے
بالکل قاصر ہیں جس کی رو سے کلیات کی منظوری کے بعد جزئیات کی بحث بالکل ممنوع اور ناممنوع قرار دی جائے جو ریزولیوشن پاس ہو چکا تھا۔ اس میں
جزئیات کا کوئی تذکرہ ہوا نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اب جب کہ وہ وقت آیا کہ بورڈ میں جزئیات پر ہر ہر معاملہ کے متعلق علیحدہ علیحدہ بحث کی جائے تو چیئرمین
صاحب کا ان معاملات کو امور طے شدہ قرار دے کر مزید گفتگو کی اجازت نہ دینا اس شخصی حکومت کی مثال ہے جو لوکل سیلف گورنمنٹ کے پردے
میں کام کر رہی ہے ممبران بورڈ کو صحیح طور پر یہ معلوم نہ تھا کہ سڑک کی تعمیر کے لئے کون کون سی عمارتوں کے حصول و انہدام کی ضرورت ہوگی۔ بلکہ ہم سے تو
یہاں تک کہا گیا ہے کہ سڑک مجوزہ کے نقشہ میں مسجد کے حصہ انہدام طلب کو دکھایا ہی نہیں گیا تھا۔ لیکن اگر نقشہ میں اس حصہ کو دکھایا بھی گیا ہو۔ تو
وہ ممبر جو انگریزی نہیں جانتے ہیں اسے کیا سمجھ سکتے تھے۔ اس کارروائی میں سب سے زیادہ معما لاینحل یہ ہے کہ امپروومنٹ ٹرسٹ کمیٹی
نے ۲ر فروری ۱۹۱۳ء کو مسجد کے مشرقی حصہ کے لینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن
اس سے پندرہ مہینے قبل افسر حصول اراضی نے یہ رپورٹ کر دی تھی کہ "مسجد کا صرف ایک کونا جو غسل کرنے کی غرض سے حال ہی میں بنایا گیا ہے)
لے لیا جائے گا۔ اور اس کے معاوضہ میں مکانات گرد و پیش منہدم کر کے ایک قطعہ اراضی دے دیا جائے گا۔ جب امپروومنٹ ٹرسٹ کمیٹی
نے ۲ر فروری ۱۹۱۳ء تک یہ طے نہ کیا تھا کہ آیا مسجد کا شرقی حصہ ضرور ہی لے لیا جائے گا۔ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ افسر حصول اراضی کو اپنے
کار مفوضہ سے زیادہ اور اپنے فرض منصبی کی حدود سے تجاوز کر کے اس مسئلہ کے تصفیہ کرنے کا کیا حق حاصل تھا۔؟ کیا افسر مذکور کسی بالادست
طاقت کے ایماء و ہدایت پر عمل پیرا ہو کہ اس معاملہ کے لئے راستہ صاف کر رہا تھا؟ کیا افسر مذکور کا حصہ انہدام طلب کو "مسجد کا صرف ایک
کونا" مان کر اس پر یہ استہزا کرنا کہ "جو غسل کرنے کی غرض سے حال ہی میں بنایا گیا ہے" معنی خیز نہیں؟
چیئرمین صاحب نے جو خط صاحب کلکٹر ضلع کو لکھا ہے اس میں فرماتے ہیں کہ "جب تک قریب کے ہندو مندر کو بچا نہ دیا گیا اس
وقت تک حصہ مسجد کے اصول کے خلاف ایک آواز بھی بلند نہ ہوئی"۔ ہم نہیں جانتے کہ اس چھوٹے سے فقرہ میں جو غدر لنگ مستور ہے اس کی
توہین و تضحیک کریں یا جو الزام قبیح مضمر ہے اس کی تحقیق و تردید۔ یہ پہلا واقعہ ہے۔ کہ اس سڑک کے نکاس کی صرف دو صورتیں تھیں یعنی یا
تو سیدھی بخط راست نکالی جائے جس میں مندر مسمار ہوتا تھا یا خم دے کر نکالی جاتی جس سے مسجد کا ایک حصہ منہدم ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں
ایک ہی وقت میں اور ایک ساتھ نہیں ہو سکتی تھیں۔ لہذا جب یہ خیال تھا کہ سڑک سیدھی بخط راست نکالی جائے گی۔ تب تک کوئی وجہ نہ تھی کہ مسجد کو موضع
شک میں سمجھ کر مسلمان عرض معروض اور داد فریاد کرتے پھرتے۔ لیکن جب اس امر کا اعلان کر دیا گیا کہ مندر بچا دیا گیا اور مسمار نہ کیا جائے گا۔ تب کہیں جاکر
انہیں معلوم ہوا کہ مسجد کا حصہ مشرقی ہی متحتم الوجود قرار دیا گیا ہے۔ اور اس وقت سے انہوں نے اس بارہ میں داد روش شروع کی۔ مگر چیئرمین صاحب
مسلمانان کانپور پر یہ الزام قائم فرماتے ہیں کہ انہوں نے دریا نظر آنے سے پہلے موزے کیوں نہ اتار لیے اور موت کی خبر سننے سے پہلے گریہ و بکا
کیوں نہ شروع کر دیا۔ چیئرمین صاحب کا معناً یہ الزام لگانا کہ ہندوؤں کے مندر بچ جانے کے بعد مسلمانوں کو بربنائے رقابت مذہبی یہ خیال ہوا کہ حصہ
مسجد کے متعلق شور و شغب کرنا چاہئے۔ بہتان صریح اور افترائے قبیح ہے۔ اس تمام ناخوشگوار اور دل آزار واقعہ میں اگر کوئی بات ایسی ہے جسے مسلمان
آنکھیں استحسان کے ساتھ دیکھ سکیں اور مسلمان دل شکر گزاری سے یاد رکھ سکیں تو وہ ہمارے ہندو بھائیوں کے حصۂ کثیر کا برادرانہ اور دوستانہ طرز عمل

واری نہیں ہوتی ۔ کانپور کی مسجد کا انہدام ایک ایسا واقعہ ہے جو بہ آسانی مسلمانوں کے دلوں سے محو نہیں ہو سکتا ۔ اور اس واقعہ نے ہمیں
یا ہے کہ لوکل سیلف گورنمنٹ جس چیز کا نام ہے وہ محض ایک دھوکے کی ٹٹی ہے ۔ جس کی آڑ میں جمہوریت نما مگر شخصیت پسند خود مختار عمال
ان کے ساتھ رعایا کے دلوں کو تو وہ مشق نشانہ بازی بنا سکتے ہیں ، اور کمال بے پروائی کے ساتھ ایسے حالات پیدا کر سکتے ہیں جن
گورنمنٹ کے تعلقات میں کشیدگی واقع ہو جائے ۔ ذیل میں ہم ان واقعات کو درج کرتے ہیں جو بالتصریح بتائیں گے کہ کانپور کی نا واقف
ت گورنمنٹ ناواقف اور کمزور رعایا کے حقوق کی کیسی اچھی حفاظت کر سکتی ہے ۔ اور یہ کہ ہز آنر کے صریح وعدوں (کہ مسجد میں کسی قسم
ت نہ کی جاوے گی) حسب مطلب تاویلیں کر کے کس قدر قابل احترام راستی کا ثبوت دیا جاتا ہے ۔

چھ عرصہ سے دوسرے بڑے شہروں کی طرح کانپور کو " اصلاحات " کا متعدی مرض لاحق ہوا ہے ۔ اس مرض کے علاج و معالجہ کے لئے صوبہ
ں نے ۱۹۰۸ء میں ڈھائی لاکھ روپیہ اس غرض سے دینا منظور کیا کہ " سڑکیں چوڑی کی جائیں اور رفاہ عام کے اسی قسم کے اور کاموں کا
ئے " ۔ جس سے کانپور کی گنجان آبادی کی مصیبتیں کم ہو جائیں اور " اس مقصد کے حصول کے لئے جو تجاویز طے ہو چکی ہیں یا آئندہ ہوں
یا جائے " ۔ انہیں تجاویز میں اے . بی روڈ کی تعمیر کی تجویز تھی جسے ، اپریل ۱۹۰۹ء کو گورنمنٹ منظور کر چکی تھی ۔ اہل شہر کو جب اس
لاع ہوئی تو مفصل حالات سے لاعلمی کی وجہ سے انہیں تشویش و پریشانی لاحق ہوئی ۔ اگر سڑک مجوزہ سیدھی بنائی جاتی تو مچھلی بازار
ے مقابل جو مندر واقع ہے وہ یقیناً میونسپلٹی کے انجنیر کے پھاوڑوں کی نذر ہو جاتا ۔ اہل ہنود جب اس خطرہ سے مطلع ہوئے تو
ت بھی ان میں بےچینی پیدا ہوتی ۔ چنانچہ ہوئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا اور ہونا چاہئے تھا کہ یہ امر طے پایا کہ مندر کو بچا دیا جائے ۔ جب یہ تجویز
دسے مندر منہدم ہوتا تھا مسترد کی گئی اور سڑک کو کسی قدر موڑنا پڑا تو چونکہ مندر اور مسجد کے درمیان اتنا کافی فاصلہ نہ تھا کہ سڑک نکل
ں لئے مسلمانوں کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سڑک کی غرض کو یکساں رکھنے کے لئے مسجد کا مشرقی حصہ لینے کی کوشش کی جائے
۱۹۱۲ء میں جب حضور لفٹیننٹ گورنر بہادر صوبجات متحدہ کانپور تشریف لائے تو مسلمانان کانپور نے مسجد کے حصہ مذکور کے متعلق
ے استدعا کی کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا خیال کر کے اسے محفوظ رکھا جائے ، اس پر ہز آنر نے اپنی اسپیچ میں کہا کہ مسجد اور مندر دونوں
اندازی نہ کی جائے گی ۔ ہز آنر کی یہ تقریر کانپور کے مقامی اخبار ہیرلڈ آف انڈیا مورخہ ۲۴ نومبر ۱۹۱۲ء میں شائع ہو چکی ہے ۔
اس صاف و صریح وعدہ کے الفاظ معمولی عقل کے آدمی کے نزدیک جو معنی رکھتے تھے وہی مسلمانان کانپور نے سمجھے ۔ اور شکرگزاری کے ساتھ
ے اس وعدہ سے مطمئن ہو گئے اور مسجد کی طرف سے بے فکر ہو بیٹھے ۔ ان بیچاروں کو کیا معلوم تھا کہ ان الفاظ کے مفید مطلب معنی نکال لینا
سند چیرمین صاحب میونسپل بورڈ کی نکتہ آفرین طبیعت سے کچھ بعید نہ تھا ۔ چنانچہ چیرمین صاحب نے ہز آنر کے الفاظ کا جو مطلب وہ
تے تھے وہی سمجھ لیا ۔ اور امپروومنٹ ٹرسٹ کمیٹی میں جس کے متعلق بہ حیثیت سب کمیٹی میونسپل بورڈ کل انتظامات متعلقہ اے . بی روڈ کے
ے اس مضمون کا ریزولیوشن پاس کرا لیا کہ مسجد مذکور کے مشرقی حصہ (دالان) کو منہدم کر دیا جائے اور اس کے عوض مسجد کو جانب شمال جگہ دی جائے ۔
جب کمیٹی کا یہ ریزولیوشن آخری منظوری کے لئے بورڈ کے سامنے پیش ہوا تو ایک ممبر نے یہ مسئلہ پیش کیا کہ آیا اس امر کی ضرورت بھی ہے کہ مسجد
صہ لیا جائے ۔ مگر اس مسئلہ پر بحث کرنا ضروری نہ سمجھا گیا ۔ اور ممبر صاحب کو اس بنا پر گفت و گو کرنے سے روک دیا گیا کہ " بورڈ کے سامنے جو سوال
ں معاوضہ کا سوال ہے ۔ عمارت کا لیا جانا تو پہلے ہی طے ہو چکا ہے ۔
چیرمین صاحب کے اس بیان کی کوئی تصدیق نہیں ہوتی کہ " عمارت کا لیا جانا پہلے ہی طے ہو چکا ہے " ۔ اگر بورڈ کے پاس اس قسم کا کوئی ریزولیوشن

بجز ان دروازہ و عمارت شمالی و شرقی و جنوبی اور صحن اور حوض ایسے مقامات نہیں جو شامل و داخل مسجد سمجھے جائیں۔ کیونکہ یقیناً یہ وہ مقامات ہیں جہاں عمائد
پولیس کے بوٹ تشریف نہ لے جاتے ہوں۔

ممکن ہے کہ ہمیں صاحب مجسٹریٹ بہادر ضلع کانپور کے الفاظ یا خیالات کی سبکی کرنے کا مرتکب قرار دیا جائے۔ لیکن جو شخص ہمیں مرتکب قرار دے
اسے چاہیے کہ پہلے اپنے کلیجہ پر ہاتھ رکھ کر دیکھ لے اور اپنے دل سے صلاح لے کر سوچ لے کہ مسلمانوں کے مذہب کے ساتھ اس طرح مذاح و ظرافت
کرنا زیادہ سنگین جرم ہے یا صاحب بہادر کے الفاظ کی سبکی کرنا زیادہ سخت الزام ہے۔

اگر کسی ضلع کا حاکم اپنے زعم حکومت میں کسی مسجد میں جوتا پہنے چلا جائے جیساکہ روز ہوتا ہے اور اس کی رعایا جو اس کی شان جباری سے
واقف ہے اپنی جہالت اور کمزوری بلکہ بزدلی کی وجہ سے اس حاکم کو جوتا پہنے جانے سے نہ روکے۔ کیونکہ وہ واقف ہے کہ صاحب بہادر کو روکنا
کتنے بڑے ناقابل معافی جرم کا مرتکب ہوتا ہے جس کی پاداش میں کیا کچھ خمیازے بھگتنے نہ پڑیں گے تو اس حاکم کو کہاں تک لازم ہے کہ وہ اپنی رعایا
کی کمزوری کو اسی کے منہ پر کھینچ مارے۔ اور اس سے رعایا کے اہم مذہبی معاملہ کے انفصال کے وقت فائدہ اٹھائے۔

سلسلہ خیالات میں الجھ جانے سے سلسلہ واقعات ہاتھ سے چھوٹا جاتا ہے۔ صاحب مجسٹریٹ ضلع کے معائنہ کے بعد مسلمانان کانپور نے مسجد میں
ایک جلسہ کیا جس میں پانچ علماء نے جن میں مولانا آزاد سبحانی پرنسپل مدرسہ الٰہیات کانپور بھی شامل تھے باضابطہ فتویٰ بدیں مضمون دیا کہ حصہ زیر بحث
یعنی شرقی حصہ مذہباً اور شرعاً جزو مسجد اور شامل مسجد ہے شرع اسلامی کی رو سے مسجد یا اس کے کسی جزو یا حصہ کی بیع یا مبادلہ عوضہ خلاف شریعت ہے
اس کے بعد مسلمانان کانپور صاحب کلکٹر بہادر ضلع کانپور کی خدمت میں اس غرض سے حاضر ہوئے کہ اپنی واجبی شکایات ظاہر کریں۔ اور احکام مذہبی کی
تشریح کر دیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانان کانپور کے پیش کردہ دلائل کلکٹر صاحب بہادر کے لئے باعث تشفی نہ ہوئے۔ اب مسلمانان کانپور
کے لئے صرف ایک ہی کھلا دروازہ رہ گیا تھا۔ اور وہ دروازہ ایوان لفٹیننٹ گورنر کا تھا۔ چنانچہ انہوں نے آنریبل مسٹر شاہد حسین صاحب بیرسٹر
ایٹ لا کے توسط سے ۱۴ اپریل ۱۹۱۳ء کو ہز آنر لفٹیننٹ گورنر صوبجات متحدہ کی خدمت میں میموریل پیش کیا جس میں انہوں نے واقعات معاملہ
ظاہر کر کے عرض کیا کہ صاحب مجسٹریٹ ضلع نے مسجد کے شرقی حصہ کو انہدام سے بچانے کے متعلق اظہار ناراضامندی کیا۔ اور چونکہ اس حصہ کے
انفصال و انہدام سے ان کے مذہب پر دست درازی ہوتی ہے جو گورنمنٹ کی مصلحت کے منافی ہے لہٰذا ان کی استدعا ہے کہ حضور لفٹیننٹ گورنر
بہادر حصہ مسجد کو دست برد انہدام سے محفوظ رکھیں۔ اس میموریل کے جواب میں انڈر سیکرٹری گورنمنٹ صوبجات متحدہ نے ارقام فرمایا:۔

"لفٹیننٹ گورنر بہادر نے میموریل پیش کنندگان کی گذارش پر بخوبی غور فرما لیا ہے۔ اور واقعات کو مقامی افسروں سے دریافت کر لینے
کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ سڑک کی لائن جو پہلے ہی تجویز ہو چکی ہے برقرار رکھنی چاہئے۔ ہز آنر نے اس امر کا ذمہ لیا تھا کہ مسجد میں دست اندازی نہیں
کی جائے گی۔ لیکن منہ ہاتھ دھونے کی جگہ عمارت مقدس کا جز نہیں ہے۔ اور جب اس قسم کی بحث لکھنؤ کی درستی شہر کے متعلق پیش آئی تھی تو مسلمان اس پر
راضی ہو گئے تھے کہ منہ ہاتھ دھونے کی جگہ جو اغراض عامہ کے لئے مطلوب ہے اس کی بجائے انہیں کوئی دوسری جگہ منہ ہاتھ دھونے کے لئے دے
دی جائے۔ لہٰذا مسجد کانپور کے متعلق جو منہ ہاتھ دھونے کی موجودہ جگہ ہے اسے بھی مسمار کر دینا چاہئے۔ متولیان مسجد سے کہا جائے گا کہ وہ کوئی اور جگہ
پسند کر لیں جس پر میونسپل بورڈ ان کے لئے منہ ہاتھ دھونے کی جگہ تعمیر کر دے گا۔ انڈر سیکرٹری صاحب کے جواب سے اس امر کی تصدیق ہو گی کہ ہز آنر
نے اس امر کا ذمہ لیا تھا کہ مسجد پر دست درازی نہ کی جائے گی۔ مگر ذمہ دار مقامی عمال بھلا اسے کیوں کر گوارا کر سکتے تھے کہ ان کی شیخی یوں کرکری
ہو اس لئے انہوں نے ہز آنر کے الفاظ۔ اپنی باراں دیدہ اور خزاں چشیدہ منطق اور مسلمانوں کے پنبہ دہان سے ایک معجون مرکب تیار کی جس نے

ہے جسے ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔ جیسا ہم پہلے عرض کر چکے ہیں بورڈ کے جلسہ میں ایک ممبر نے مسجد کے شرقی حصہ کے حصول و انہدام پر اعتراض کیا مگر اسے خاموش کر دیا گیا اس پر دس ممبروں نے جن میں چھ ممبر ہندو تھے۔ ایک درخواست لکھ کر چیئرمین صاحب کی خدمت میں بھیجی۔ جس میں استدعا کی گئی تھی کہ ریزولیوشن درج ایجنڈا کیا جائے۔

امپرومنٹ ٹرسٹ کمیٹی کی روئیداد سے جو جلسہ بورڈ منعقدہ ۴ر مارچ ۱۹۱۳ء میں پیش ہوئی اور جلسہ بورڈ منعقدہ ۸ر مارچ میں منظور ہوئی جس میں بورڈ کے ایک ممبر کا اعتراض مسترد کر دیا گیا تھا بورڈ کو واضح ہوتا ہے کہ مسجد واقع مچھلی بازار کی عمارت کا ایک حصہ سڑک A.B کے لئے حاصل کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا تحریک کی جاتی ہے کہ چونکہ مسجد کی بنا پر قابل اعتراض اور بخلاف ارشاد ہز آنر لفٹیننٹ گورنر بہادر صوبجات متحدہ مصدرہ ۱۳ر نومبر ۱۹۱۲ء کے خلاف ہے لہٰذا بورڈ کی رائے ہے کہ مسجد کا حصہ مشرقی نہ لیا جائے اور اس پر بورڈ ہذا کا کوئی سابقہ ریزولیوشن جس میں بصراحت یا بہ اشارت اس حصول کو منظور کیا گیا ہو منسوخ کیا جائے۔

یہ ریزولیوشن بورڈ کے جلسہ منعقدہ یکم اپریل ۱۹۱۳ء میں پیش کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ ترمیم پیش ہوئی کہ گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ مسلمانوں کے جذبات کا خیال کر کے سڑک A.B میں مسجد کا کوئی حصہ شامل نہ کیا جائے۔ اس ترمیم کی تحریک و تائید باقاعدہ ہوئی۔ لیکن چیئرمین صاحب نے ایک دوسری ترمیم پیش کی جس کی مسٹر رائن نے "تائید" کی۔ اس ترمیم کا مطلب یہ تھا کہ ریزولیوشن پیش کردہ پر کچھ عمل درآمد نہ کیا جائے۔ لیکن اس ترمیم کی "تائید" مزید صرف چار یوروپین ممبروں نے کی چونکہ پہلی ترمیم کی "تائید" مزید تیرہ ممبروں نے کی تھی۔ لہٰذا وہ کثرت رائے سے منظور ہوئی اور ابتدائی تحریک واپس لے لی گئی۔ لیکن چیئرمین صاحب نے صاحب کلکٹر ضلع کو اپنی چٹھی میں لکھا کہ ترمیم شدہ حالت میں بھی وہ ریزولیوشن کی سفارش کرنے سے قاصر ہیں۔ کیونکہ اگر مسجد کا یہ حصہ بدستور رکھا گیا۔ تو سڑک نہایت بدنما ہو جائے گی۔ جو کسی طرح جائز نہیں رکھی جا سکتی اس ترمیم شدہ ریزولیوشن بورڈ نے اپنے جلسہ منعقدہ ۱۵ر اپریل ۱۹۱۳ء میں منظور کر لیا۔

مگر اس سے کچھ عرصہ پہلے کانپور کے صاحب مجسٹریٹ ضلع بھی مسجد کے حصہ شرقی کے انہدام میں شرکت فرمانے اور اس کارِ خیر میں حصہ لینے کو تشریف لائے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ صاحب موصوف کا پہلا کام یہ تھا کہ وہ معائنہ مسجد کے لئے گئے اور مشرقی حصہ مسجد میں بوٹ پہنے داخل ہوئے سنا جاتا ہے کہ واپسی پر صاحب موصوف نے اپنی رائے علی الاعلان ظاہر فرما دی کہ حصہ متنازعہ کسی طرح جزو مسجد نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ کسی مسلمان نے انہیں وہاں بوٹ پہن کر جانے سے نہیں روکا۔

اس واقعہ ہائلہ نے خیالات میں جو تلاطم برپا کر رہا ہے اس کی وجہ سے ہم اس قابل نہیں ہیں کہ کوئی چبھتی ہوئی مثال پیش کر کے صاحب بہادر کی منطق کی تائید کریں۔ لیکن اس امر کے دریافت کی اجازت چاہتے ہیں کہ کیا آئندہ سے مسجد کی تعریف یہ قرار پائی ہے کہ وہ جگہ اور صرف اسی قدر جگہ جہاں صاحب بہادروں کے غریب پرور بوٹ نہ جا سکیں!! اگر یہی ہے تو بڑے شہروں کی میونسپلٹیوں کو عموماً اور دہلی میونسپلٹی کو خصوصاً اپنے شہر کی ترقی و تزئین مبارک ہو کہ مسجد و خانقاہ کے صحن اور حجرے اور دروازے سڑکوں کی توسیع و ترمیم کے لئے وقف ہو گئے۔ اب نہ ٹراموں اور ریلوں کو مساجد کی وجہ سے غیر ضروری پیچ و خم دینے کی ضرورت رہے گی۔ نہ عمارات و شوارع عامہ کو موقع بے موقع ہونا پڑے گا کیونکہ مسجد کے مختصر سے گنبد کو چھوڑ کر باقی وہ کل لق و دق حصہ جس میں دروازہ و عمارات مشرقی و شمالی و جنوبی اور صحن اور حوض اور چھتیں اور کھڑکیاں سب شامل ہیں حسب ضرورت ان کارو ہائے خیر کے حوالے کیا جا سکے گا۔ یہ ہم اس لئے کہتے ہیں کہ جب مسجد کی تعریف بھی ٹھہری کہ وہ حصہ جس میں صاحب بہادروں کے بوٹ نہ جا سکیں تو ہندوستان جیسے طویل و عریض ملک کسی کسی مسجد کا چاہیے وہ شاہ جہاں بادشاہ کی بنائی ہوئی مسجد جہاں نما (جامع مسجد) ای

رش کا "استیصال کلی کر دیا۔ ان عـتمال نے شروع ہی سے حصہ مسجد کو مختلف ناموں سے یاد کرنا" ایک گوشہ" "ایک تعمیر جدیدہ" "وضو کی جگہ" "غسل خانہ" ۔ آخر کار وہ اپنی پندار اور ہز آنر کی نگاہ میں اس امر کے ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ "وہ مسجد کا حصہ شرعی نہیں ہے ۔ اور اس لئے خارج از مسجد ہے ۔ اس کے بعد منطق کی کڑیاں مضبوط تھیں ۔ ہز آنر نے ضرور ذمہ لیا تھا کہ مسجد میں دست اندازی نہ کی جائے گی ۔ مگر حصہ انہدام طلب خارج از مسجد ہے ۔ لہذا ہز آنر کی ذمہ داری اس پر عائد نہیں ہوتی ۔

افسوس ہے کہ اس سلسلے میں جو سب سے زیادہ کمزور کڑی تھی اس پر مطلق توجہ نہ کی گئی یعنی آیا حصہ انہدام طلب (جو افسوس ہے کہ اب شہید و مسمار و منہدم سب کچھ بھی ہو چکا ہے) داخل مسجد ہے یا نہیں ۔ اور اس پر مسجد کا اطلاق ہو سکتا ہے یا نہیں ۔ ہمیں معاف کیا جائے اگر ہم یہ عرض کریں کہ مقامی عـتمال بلکہ خود ہز آنر کی عاملانہ اور عاقلانہ یا لغ نظری چاہے حکومت کے کیسے ہی راز ہائے سربستہ اور عقدہ ہائے لاینحل کے حل کرنے میں کامیاب ہو جائے ۔ مگر یہ مسئلہ ایک خاص مذہب اور اس مذہب کی ایک شاخ اور فن سے تعلق رکھتا ہے اور علماء و فقہائے اسلام کے یا ان لوگوں کے جو شرع اسلام کے مسائل پر عبور رکھتے ہیں دوسرے کا کام نہیں کہ اسے طے کرے ۔ علماء نے یہ طے کر دیا اور فتویٰ دے دیا کہ یہ حصہ مذہبا اور شرعاً داخل و شامل مسجد ہے ۔ مگر صوبہ کی گورنمنٹ کا فتویٰ ہے کہ "خارج از مسجد" ہے بہتر ہوتا کہ یو پی اور با عظمت گورنمنٹ کل مالی و ملکی و سیاسی و اقتصادی اور اصلاحی و انتظامی امور کی باگ ڈور اپنے ہی یا رعب و داب عہدہ داروں کے ہاتھ میں رکھتی مگر اسلامی امور متعلق افتاء اور تشریح مسائل کا کام غریب اور میلے کچیلے کپڑے والے مولویوں کے ہاتھ میں ہی رہنے دیتی ۔

تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

مسلمانان کانپور پورے وثوق کے ساتھ اور نہایت زور سے دعویٰ کرتے ہیں کہ مرحوم دالان مسجد سے جدا نہ تھا ۔ اور ان کے پاس اس امر کا ثبوت ہے کہ جب کبھی کسی وجہ نمازیوں کا مجمع زیادہ ہوتا تھا تو ہمیشہ اس حصے میں نماز پڑھی جاتی تھی ۔

چیئرمین صاحب کے راج ہٹ کی یہ ادنیٰ مثال ہے کہ ۲۰ مئی کو میموریل کا جواب مل جانے کے بعد جب پھر ایک دفعہ بورڈ میں ریزولیوشن پیش کیا گیا وہ بورڈ گورنمنٹ سے سفارش کرتا ہے کہ آخری حکم پر نظر ثانی کی جائے " تو چیئرمین صاحب نے خود ایک ترمیم پیش کی کہ بورڈ کی طرف سے کسی مزید تحریک کی ضرورت نہیں ہے ۔ اور گورنمنٹ کے حکم کو حکم اخیر سمجھنا چاہئے ۔ یہ ترمیم صاحب چیئرمین کے اپنے ووٹ کی وجہ سے پاس ہو گئی ۔ برٹش گورنمنٹ کے دور حکومت میں نام نہاد لوکل سیلف گورنمنٹ کا یہ عجیب و غریب استعمال ہے کہ گورنمنٹ ہند نے جو آلہ بصد اظہار شفقت ہمیں اپنی جائز اغراض کی حفاظت کے لئے عطا فرمایا ہے اسی کے ذریعے سے ہمارے حقوق اور ہماری آزادی کا گلا کاٹا جاتا ہے ۔

اپنی جوتی اپنی چاند

اس ریزولیوشن کی شکست کے بعد ایک دوسرا میموریل ہز آنر لفٹیننٹ گورنر بہادر کے حضور میں بھیجا گیا ۔ اور اس میں تفصیل کے ساتھ وہ معروض اور گذارش و التماس کی گئی ۔ ہمیں معلوم نہیں کہ صوبہ کے حاکم اعلیٰ کی پیش گاہ سے اس میموریل کا اب تک کوئی جواب ملا یا نہیں ۔ مگر یکا یک ۳ جولائی کو ہز آنر سر جیمس مسٹن خود کانپور تشریف لائے اور مسجد کا معائنہ فرمایا ۔ کسے معلوم تھا کہ ہز آنر کے یوم تشریف آوری کی شب حصہ مسجد کی شب رحلت ہوگی ۔ ؟

کیوں کہ عام امیدیں تو تسلی دے رہی تھیں کہ صوبہ کے سب سے بڑے حاکم کی تشریف آوری مریض کے لیے مسیحائی کرے گی۔ لیکن افسوس ی کی شام تک جو امیدیں تھیں وہ یکم جولائی کی صبح کو خاک میں مل گئیں۔

علی الصبح سنگیں چڑھائے ہوئے مسلح پولیس مسجد کے ہر چار طرف متعین تھی ہمارے خاص کارسپانڈنٹ نے اسی روز جو تار ہمیں دیا ہے ے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی طرف آنے کے تمام راستے روک دیئے گئے تھے۔ اور لوگ بہت جلد سمجھ گئے کہ یہ سب کچھ تیاری مسجد کے اس حصہ کو ہدام کرنے کے لئے ہے جو سڑک کی داغ بیل میں آتا ہے۔ پولیس کے سوار ہر طرف سڑکوں پر پھر رہے تھے اور جہاں کہیں لوگوں کا مجمع ہوتا جاتا تھا منتشر کرتے جاتے تھے۔ انہدام کے بعد ہزاروں مسلمان جن میں بہت سے کارخانوں کے مزدور تھے دن بھر اس موقع کو دیکھنے آتے رہے"۔ ایک رے کارسپانڈنٹ نے بعد کو اطلاع دی کہ اسی دن شام کو مسلمانان کانپور کا ایک عظیم الشان جلسہ عیدگاہ میں ہوا۔ اور ذیل کا تار ہز ایکسیلنسی حضور والسرائے کی خدمت میں بھیجا گیا۔

مسلمانان کانپور نے آج ایک عام جلسہ میں یہ ریزولیوشن پاس کیا کہ یور ایکسیلنسی کو اطلاع دی جائے کہ حکام ضلع نے مسلح پولیس کی امداد ے اور بلا انتظار نتیجہ اس میموریل کی جو ہز آنر لفٹیننٹ کو بھیجا گیا ہے۔ مچھلی بازار کی مسجد کی عدیم المثال بے حرمتی کی ہے۔ یہ طرز عمل بالکل خلاف نون ہے اور اس کی نظیر ہندوستان میں انگریزی اور حکومت کی ابتدائے آج تک نہیں مل سکی۔ سخت بے چینی پیدا ہو گئی ہے۔ التجا ہے کہ حضور اخلت فرمائیں۔ اور اس مقدس عمارت کو اسی جگہ پھر بنا دینے کا حکم فرمائیں۔

ہمارا خاص نامہ نگار اطلاع دیتا ہے کہ مسلمانوں کا پختہ ارادہ ہے کہ حضور والسرائے کی طرف سے جواب آجانے کے بعد باقاعدہ عملی کارروائی ی جائے گی۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ" ان لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جو مسجد میں نیز عیدگاہ میں جاکر روئے۔ اور جنھوں نے اس طرح اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

ظاہر ہے کہ اہل کانپور سے جو کچھ بن پڑا وہ انہوں نے سب کچھ کر چھوڑا۔ جب ہر طرف ہاتھ پاؤں مار کر تھک گئے تو آخر میں وہ سب سے بڑے احکم الحاکمین کے دروازے پر جاکر روئے ہم ان کے غم میں شریک ہیں اور سچ پوچھو تو ہمارا دل اندر ہی اندر رو رہا ہے۔ مگر ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اب وہ وقت نہیں ہے کہ بچوں یا بوڑھی عورتوں کی طرح ہم اپنے حقوق کی پامالی پر سر پکڑ کر آہ و زاری کر لیں اور بس۔ حکام کی بے ہنگامی اور خود رائی کی بدولت جو مسلمانوں کو صدمہ پہنچا یا پہنچ رہا ہے اس کا اثر یہ نہ ہونا چاہئے کہ ہمارے پاؤں میں پہلے سے بھی زیادہ قوت اور طاقت آ جائے اور وہ ہمیں ان دروازوں تک لے جائیں جو ابھی دادرسی کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ ملک کا کوئی قانون نہیں ہے جو ہمیں ان دروازوں کے کھٹکھٹانے اور جائز وسائل اختیار کرنے سے روک سکے مسلمانوں کی مذہبی آزادی اور ان کی عبادت گاہوں کی حرمت کا مسئلہ نازک ہوتا جاتا ہے۔ کیونکہ بہت سے پرجوش افسران تعمیرات حفظان صحت ہندوستان کی سرزمین پر چھیٹے پھر رہے ہیں۔ یہ حضرات پرانے کوٹ کے گرانے اور نئے کوٹ کے بنانے کی دھن میں ہمارے جذبات سے بے پروا اور غیر متاثر ہو کر جو کچھ بھی نہ کریں کم ہے۔ دہلی کانپور اور لکھنؤ پر کیا موقوف ہے یہ مطلق العنانی رہی تو ہمیں ان نئے شیدائیان تعمیرات و حفظان صحت کی مہربانیوں کا ہر جگہ شکار ہونا پڑے گا۔ اس لئے مسلمانوں کو اور مسلمانوں کی قائم مقام جماعتوں کو خصوصاً مسلم لیگ کو پوری طرح موقع کی اہمیت کا اندازہ کر کے اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہئے اور اگر ضرور ہو تو اپنے مختصر حقوق کو لے کر پارلیمنٹ کے دروازے تک جانا چاہئے اور مذہبی معاملات عدم دست اندازی و غیر جنبہ داری کے برطانوی اعلان کا کامل تشریح و تفسیر تفصیل پوچھ لینی چاہئے۔ کہ وقت ضرورت کام آئے۔

کانپور کے واقعہ نے امید کے بہت سے منقش اور خوش نما پردے جو ہماری مفتون و مسحور نگاہ کے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ دفعتاً نوچ کر
پھینک دیئے۔ اور اب ان کی جگہ مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے نے لے لی ہے۔ مسٹر جیمس مسٹن ہنوز صوبجات متحدہ کے لفٹیننٹ گورنر بھی
نہ ہوئے تھے کہ ہمیں ان کے ساتھ حسن اعتقاد شروع ہو گیا تھا۔ مگر کانپور کے واقعات نے کم سے کم ہمیں اس قدر کہنے پر مجبور کر دیا ہے
کہ صوبجات متحدہ کے بیدار مغز حاکم اعلیٰ مسلمانان کانپور کے صحیح جذبات کا اندازہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اور جس استقلال اور معاملہ
فہمی کی ہمیں ان سے امید تھی اس کا کافی اظہار نہ فرما سکے۔ اب ہم مسلمانان کانپور کو سوائے اس کے اور کوئی مشورہ نہیں دے سکتے کہ وہ خدا کے
کسی پر بھروسہ نہ کریں۔ اور اپنے حقوق کا دعویٰ تمام جائز طریقوں سے کئے جائیں۔ خوشنما امیدوں کے چمن بندیوں میں ہم سب انٹونی
میکڈانل کے دور حکومت کو بھولتے جاتے تھے۔ لیکن

ہم ہی چوکے جو ترا گوشۂ داماں پکڑا

۸ جولائی کی اشاعت میں ہم ناظرین کے اس تعجب کو دور کر چکے ہیں جو انہیں مسجد مچھلی بازار کانپور کے جزوی انہدام کے متعلق
ہماری عدم رائے زنی کے بارے میں پیدا ہوا تھا۔ جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا گیا ہے۔ ہماری اس ہیبت ناک خاموشی کی وجہ یہ تھی کہ ہم
نے صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے حاکم اعلیٰ سر جیمس میسٹن کی معاملہ فہمی اور انصاف پسندی پر بھروسہ کر کے مناسب خیال کیا تھا کہ اس معاملہ کے
جملہ حالات اور واقعات صحیح صحیح پیرایہ میں مراسلات کے ذریعے سے صاحب موصوف کے گوش گذار کر دیں جو دوسری صورت میں اخبار کے
ذریعے پیش کئے جاتے۔ اس طرز عمل سے جو محض نیک نیتی اور مصلحت اندیشی پر مبنی تھا۔ ہماری غرض یہ تھی کہ اگر یہ ناگوار معاملہ خطوط
کے صفحات میں لانے سے طے ہو جائے تو بدرجہا بہ مراتب اس سے بہتر ہو گا۔ کہ اخبارات کے کالموں میں لا کر ایک طرف تو اسلامی پبلک
کے جوش کو بھڑکایا جائے۔ اور دوسری طرف گورنمنٹ کی مشکلات میں اضافہ کیا جائے۔ مگر تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ اور ہمیں بکمال افسوس
تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہمیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ ایک طرف تو حکام اس بات کے خواہشمند ہوں کہ ان
کے اعمال و افعال پر کسی طرح اخبارات میں نکتہ چینی نہ کی جائے اور دوسری طرف رویہ اس قسم کا اختیار کریں کہ جب تک ہندوستانی اخبار
ان کی غلطی نہ کھولی جائے، راہ راست پر نہ آئیں! کیونکہ اعیان حکومت کی جانبدار اخباروں کی پالیسی تو اب ایک راز آشکارا ہو چکی ہے۔ پانیر جو اینگلو انڈین
جرائد میں چوٹی کا اخبار خیال کیا جاتا ہے۔ لکھتا ہے کہ مسلمانان کانپور کی فریاد مصنوعی اور بناوٹی ہے۔ اسلامی جرائد کی اضطراب آموزی کا نتیجہ
ہے۔ حالانکہ اگر یہ ہمہ دان ہم عصر حالات سے واقفیت رکھتا یا انصاف سے کام لیتا تو اسے معلوم ہوتا کہ اگر مسلمانان کانپور نے
کی بابت دو کالم اسلامی جرائد کو لکھ کر چھاپنے کو بھیجے ہیں۔ تو انہوں نے چند ہی سطور پر اکتفا کیا ہے۔

مسلمانان کانپور نے ہمیں ڈاک اور تار کے ذریعے التجا پر التجا کی اور خود ہمارے دفتر میں تشریف لا کر درخواست کی کہ مسجد کے
اخبار کے کالموں میں شد و مد سے بحث کی جائے۔ مگر مسٹر محمد علی نے یہی مناسب سمجھا کہ بذریعہ نامہ و پیام ہی حکام سے داد طلبی کی جائے۔ انہیں
پورا وثوق تھا کہ ہز آنر جیمس میسٹن جو ان کے عقیدہ کے مطابق ایک متدین اور مصلحت اندیش حاکم ہیں ہمارے طرز عمل کو پسندیدگی کی نظر
اور مسلمانوں کی مذہبی محسوسات کا لحاظ کر کے مسجد کے حصہ شرقی کو منہدم ہونے سے بچا دیں گے۔ مگر صاحب موصوف کی ذات میں انہیں جو اعتماد
کا حشر جو کچھ ہوا ناظرین سے پوشیدہ نہیں اب حصہ مذکور شہادت پا چکا ہے۔ اور جو کچھ بھی ہوا ان کی منظوری سے ہوا ہمیں رنج ہے کہ
ہم نے ابتدا ہی میں اخبار کے کالموں میں گورنمنٹ ممالک متحدہ کے متعدد عہدہ داروں مسٹر سم اور ٹائیلر کے برخلاف صدائے احتجاج

گورنمنٹ کی ہواخواہی کے خیال سے اخبار میں علانیہ نکتہ چینی کرنے کی بجائے مراسلت کے ذریعہ معاملہ کو گورنمنٹ کے حضور میں پیش کرکے رعایا اور سرکار کے درمیان ترجمانی کی خدمت انجام دی اور گورنمنٹ نے ہمیں یہ انعام دیا کہ ہمارے جملہ دعاوی اور دلایل جنہیں در اصل سات کروڑ مسلمانان ہند کے دعاوی اور دلائل کہنا چاہیے ایک رشحۂ قلم سے ملیامیٹ کر دیا۔

یا للعجب ! یہ حشر امید دراز کا !

ایسے موقعوں پر بے اختیار انسان کو خیال آتا ہے کہ بنگال کے اخبار نویسوں اور جرائد نگاروں کی روش کی پیروی کی جائے۔ جو اپنے غل غپاڑہ سے حکام کا ناک میں دم کر دیتے ہیں اور جب تک اپنے مقصد میں فائز المرام نہیں ہوتے، اپنی چیخ و پکار سے آسمان کے گنبد میں سوراخ کر دیتے ہیں۔

مسٹر جیمس مسٹن اعتراف کرتے ہیں کہ ہماری مراسلت کا لہجہ نہایت معتدل اور معقول تھا۔ اور جو درخواست ہم نے ان کے حکم اول کی نظر ثانی کی بابت کی تھی برمحل اور دوستانہ تھی ہم بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ہماری مراسلت اور ہمارے تاروں کا جواب عنایت آمیز تھا۔ مگر ہمیں اس قسم کے لفظوں سے کیا خاک تسکین ہوگی جبکہ ہمارے برادران کانپور، گورنمنٹ متحدہ کے حکام کے ہاتھوں جوتی جگر پی رہے ہیں؟ اس موقع پر ہمیں یہ بھی ظاہر کرنا ہے کہ اگرچہ ہماری عام مراسلت اور ہمارے تاروں کا جواب عنایت آمیز تھا۔ مگر ہمیں اس حسن خلق کی یقیناً توقع نہیں تھی۔ کہ ہز آنر ہماری اس چٹھی کا جواب جو اسی مسجد کے متعلق تھی اس کے منہدم کئے جانے کے ایک روز بعد دیں گے۔

مسٹر جیمس میسٹن کی فیصلہ سے ایک زبردست نتیجہ جو ہم مستنبط کر سکتے ہیں یہ ہے کہ انڈین سول سروس کے ارکان کی رائے کی اہمیت اپنی نظیر آپ کہلانے کے مستحق ہے، ان کے فیصلہ جات اٹل ہوتے ہیں۔ اور خواہ وہ صحیح ہوں خواہ غلط، صوبہ کے حاکم اعلیٰ تک ان کو منسوخ نہیں کرتے۔ اور ان کے مقابلے میں جوئی کے معزز و ممتاز ہندوستانیوں کی رائے کی شنوائی نہیں ہوتی۔ شاید اس قسم کی کاروائی سے ممبران سول سروس کی دقعت و وقار کو برقرار رکھنا مقصود ہے۔ مگر ہمارے خیال میں حکام کا فرض ہے کہ وہ معاملہ کی تہ تک پہنچیں اور ہمیشہ اصلیت اور حقیقت کے متلاشی رہیں، ورنہ نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ حاکم و محکوم کے درمیان تفرقہ کی خلیج جو ایسے ہی حالات سے ملک کے بعض حصوں میں کچھ عرصہ سے پیدا ہو گئی ہے، عریض ہوتی جاتی ہے۔ اور اس کا اثر ملک اور سرکار دونوں کے حق میں نہایت ناخوشگوار پڑ رہا ہے۔

ہم نے ہز آنر کی توجہ اس امر کی جانب منعطف کروائی تھی کہ معاملہ کانپور میں امر تنقیح غلط قائم کیا گیا ہے۔ گورنمنٹ کے نزدیک امر تنقیح یہ تھا کہ "آیا مسجد کے مشرقی جزو میں جس کے انہدام کی تجویز زیر بحث تھی نماز ہوتی ہے یا نہیں"۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ امر تنقیح یہ ہونا چاہیئے تھا کہ "آیا مسجد کا کوئی حصہ، جزوی یا کلی طور سے فروخت ہو سکتا ہے یا کسی دوسرے مصرف میں لایا جا سکتا ہے۔ اس امر کے تصفیہ کے لئے ہم نے کہا تھا کہ گورنمنٹ کو علمائے اسلام سے استصواب کرنا چاہیئے۔" یہی وہ درخواست ہے جسے ہز آنر نے نہایت اعتدال آمیز اور جائز قرار دیا تھا مگر تعجب کی بات ہے کہ باوجود اس حسن ظن کے اس پر توجہ نہیں کی گئی جہاں تک ہمارا علم ہے کسی مفتی یا عالم سے اس امر میں مشورہ نہیں لیا گیا۔ اور صاحب ممبران میونسپل بورڈ کی رائے کو جو شروع ہی سے مسجد کے حصہ مذکور کے انہدام کا تہیہ خلوت خانہ دل میں کر چکے تھے، اول سے لیکر آخر تک برقرار رکھا گیا ہے۔ انہوں نے شروع سے ہی یہی بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کا شور و غل امر فرضی ہے۔ اور اس بات کو ہز آنر کے دل نشین کرنے اور مسلمانوں کے کعبہ دل کو ڈھانے میں وہ کامیاب ہو گئے ہیں، بقول ہز آنر ان کی شہادت "قول فیصل" ہے۔ اور اس کی صحت "بلا کم و کاست قابل منظوری" طرفہ بات یہ ہے کہ ہمیں یقین دلایا جاتا ہے کہ جزو مذکور کا انہدام ہز آنر کے دو آخری حکم "کی تعمیل پر مبنی تھا۔ اور تمام معاملہ نہایت احتیاط سے تمام طبقوں کے بہت

سے اصحاب کے مشورہ سے طے ہوا۔ علانیہ طور پر تو ایسا کوئی مشورہ نہیں لیا گیا، اور اگر چپکے چپکے کوئی مشورہ اس امر میں لیا بھی گیا ہے تو یہ سخت قابل اعتراض ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ مشورہ دینے والے اصحاب کیسے بزرگ تھے۔؟ ممکن ہے کہ بعض بوالہوس جاہ طلب لوگوں نے ہز آنر کی خوشنودیِ مزاج حاصل کرنے کی حرص میں اندھے ہو کر ایسا مشورہ دیا ہو، مگر اس کی وقعت؟ ایسے ضمیر فروش، ملت فروش، خود فروش لوگ تو اگر بس چلے تو گورنمنٹ کو بھی بیچ ڈالنے سے باز نہ رہیں۔ تاہم ہم از حد ممنون ہوں گے اگر ہز آنر ان بزرگان ملک و ملت کے اسمائے گرامی سے ہمیں مطلع کریں جنہوں نے اپنے قیمتی مشورہ اس آڑے وقت میں حکام گورنمنٹ کی دستگیری کی ہے۔

ایک اور عمل قابل ذکر یہ ہے کہ مسئلہ کانپور کی مسلسل کاروائی کے ملاحظہ سے پتہ چلتا ہے کہ اب تک لوکل سیلف گورنمنٹ محض برائے نام ہے، ہندو مسلمان ممبران بورڈ نے ہر چند صاحب چیئرمین کی مخالفت کی، مگر ان کی مخالفت کا اثر؟

مسلمانان کانپور کا مسلک ابتدا سے آخر تک نہایت قابل تعریف رہا ہے انہوں نے صاحب کلکٹر کے پاس وفد بھیجا، ہز آنر کی خدمت میں محضر بھیجے مگر شنوائی نہ ہوئی۔ آنریبل مسٹر شاہد حسین و بحیثیت ان کے نمائندہ کے ہز آنر سے مراسلت کا کئی ناکامی ہوئی۔ آنریبل راجہ صاحب محمود آباد بالقابہ کو دوسرا محضر دے کر ہز آنر کی خدمت میں شملہ میں روانہ کیا، غرض ہر طرح کی کوشش کی گئی کہ کسی طرح معاملہ کو اخبارات کے کالموں میں لے جانے کی نوبت پیش نہ آئے، مگر نتیجہ؟ راجہ صاحب بہادر کو ہز آنر نے یقین دلایا کہ ان کی شفاعت رائیگاں نہ جائے گی۔ مگر چند دن کے بعد ہی اصلیت کھل گئی، ہز آنر فرماتے ہیں کہ "ان کے حکام پہلے ہی قطعی اور ناطق تھے"۔ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیا راجہ صاحب بہادر سے بھی یہی کہا گیا تھا کہ زمین آسمان مل جائیں مگر ہمارا حکم نہ ٹلے گا؟

ایک اور بات یہ ہے کہ گو فرضاً ہز آنر کے احکام' جہاں تک کہ ان کا تعلق ان سے تھا "قطعی اور ناطق" تھے مگر یہ صحیح ہے کہ اب تک ہز ایکسیلنسی حضور وائسرائے کشور ہند نے ان درخواستوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جو بذریعہ تار ان کی خدمت میں بھیجی گئیں، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا گورنمنٹ لوکل گورنمنٹ کے فیصلہ جات سے بھی یہی سلوک کیا کرتی ہے؟ دیگر اسی وقت ہز آنر کو چاہیے تھا کہ گورنر جنرل اور مسلمانوں کو بتلا دیتے کہ ان کے احکام قطعی اور ناطق تھے اور مسجد کو منہدم کرنے کی منظوری دینے سے پہلے مسلمانوں کو موقع دیتے تاکہ وہ آپ کے فیصلہ کے برخلاف گورنمنٹ ہند میں اپیل کر لیتے۔

اب پایونیر کی روش کو بھی ملاحظہ کیجیے۔ وہ لکھتا ہے "اس کاروائی کے بعد جو منگل کے دن صاحب مجسٹریٹ کانپور نے مسجد کے بارے میں کی یہ معاملہ جو کچھ عرصہ سے زیر بحث ہے" خاتمہ پذیر ہو جائے گا"۔ مگر اسے یاد رہے کہ مسلمان اس مذہبی دست اندازی کو مطلق بھول نہیں سکتے، یہ ایک خار ہے جو کہ ان کے سینہ میں چبھ رہا ہے۔ اور چبھتا رہے گا۔ جب تک منہدم شدہ حصہ پہلی صورت میں بنا نہ دیا جائے گا۔ یوں تو تمام روئے زمین مسلمان کے لئے مسجد ہے اور وہ ہر جگہ نماز پڑھ سکتا ہے اور ہزار سم اور ٹائیلر اسے اس سے باز نہیں رکھ سکتے۔ مگر ہمیں شکایت ہے تو اس امر کی ہے کہ ایک نہایت وسیع اور مہتم بالشان اسلامی اصول کو توڑا گیا ہے۔ حالانکہ تعلیم اسلام کی رو سے ہم مسجد کی چپہ بھر زمین بھی کسی اور استعمال میں نہیں لا سکتے شریعت بیضا کے مطابق تو مسجد کی اینٹ، پتھر، چونا، گارا، کنکر، ذرہ سب کے سب مقدس ہیں اور سچا مسلمان کسی صورت میں بھی ان کی ذلت اور بے حرمتی ہوتے دیکھنا گوارا نہ کرے گا۔

یک ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالہ کے داغ کا

سر جیمس مسٹن کو حقیقت حال سے حکام مقامی کانپور نے واقف نہیں کیا - ورنہ وہ بھی نہ کہتے کہ مسٹر ٹیلر اور مسٹر ... ہیلٹ صاحب کے زمانے
...مسجد کے انہدام کا فیصلہ ہوا تھا۔ اس کے برخلاف واقعات کی شہادت اس کے برعکس ہے۔ عجب معاملہ ہے -

نمکے ان جانب دیگر ان می کشند
وے تیر برجانِ ما می زنند
زہے غمزہ و شوخی و چابکی
کجا می نمائند کجا می زنند

اگر حکام کانپور اپنے طرزِ عمل کی صداقت کے قائل ہیں تو وہ کیوں ان کاغذات کو شائع نہیں کرتے جو اس معاملہ کے متعلق ان کے ہاں موجود ہونے چاہئیں ؟ کیا وجہ ہے کہ وہ مسلمانان کانپور کو اس نقشہ کی نقل دینے سے انکار کرتے ہیں۔ جس میں اے۔ بی روڈ کی ابتدائی لائن بنی ہے۔ کیا سبب ہے کہ وہ بورڈ کے اس ریزولیوشن کو ظاہر نہیں کرتے جو ۴ مارچ ۱۹۱۳ء سے پہلے پاس ہوا تھا؟ اور وہ نوٹس کہاں ہے جو ایکٹ حصول اراضی کے مطابق متولیان مسجد کو دیا جانا لازمی تھا۔ اور جو ۲۹ جون کے بے ضابطہ نوٹس سے پہلے دیا جانا چاہئے تھا؟

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

خاتمہ پر ہم ایک اور بات کہنا چاہتے ہیں سنتے ہیں آیا ہے کہ اب متولیانِ مسجد پر طرح طرح کا ناجائز دباؤ ڈال کر انہیں ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ گورنمنٹ سے معاملہ فہمی کر لیں اور معقول عوض قبول کر لیں انہیں مختلف طریقوں سے اسبابِ پر مائل کیا جاتا ہے اس کی نسبت خطوط لکھے جاتے ہیں۔ کہ گورنمنٹ کی پیش کردہ زمین مشرقی دالان کے عوض میں منظور کر لو۔ ورنہ وہ ہنود کو دے دی جائے گی۔ اس قسم کی شاطری نہایت درجہ عیاں ہو رہی ہے۔ متولی مسجد کا عوض حاصل کرنے کا کوئی اختیار نہیں رکھتے مسجد کا معاملہ ہے اور اس کا فیصلہ، مسلمانوں کی قوم سے ہوگا۔ اور وہ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ مسجد کا جزء مذکورہ پھر پہلی صورت میں تعمیر کر دیا جائے بعض ایسے خطوط راجہ صاحب محمود آباد کی خدمت میں بھیجے جا چکے ہیں اور وہ عدد ہمارے پاس بھی موجود ہیں۔ ان سے ایک طرف تو متولیوں پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ اور دوسری طرف ہندو مسلمانوں کے درمیان منافرت پیدا ہونے کا امکان ہے۔ ہم اس قسم کی کارروائی کے برخلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ اور حکام کانپور (اور گورنمنٹ کی توجہ اس امر کی طرف منعطف کراتے ہیں۔

مسجد مچھلی بازار کانپور

مسٹر محمد علی اور ہز آنر لفٹیننٹ گورنر بہادر صوبجات متحدہ کے درمیان مسجد کانپور کے متعلق جو خط و کتابت ہوئی ہے، وہ بہ اجازت ہز آنر سر جیمس صاحب بہادر ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

سہ شنبہ ۸ر جولائی ۱۹۱۳ء

(تار)

بخدمت ہز آنر سر جیمس میسٹن صاحب بہادر لفٹیننٹ گورنر بمقام نینی تال۔

کانپور کے بہت سے مسلمان باشندوں نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ میں ان کی اس عرضداشت کی تائید کروں کہ مسجد مچھلی بازار کی مسجد کے ایک حصہ کو میونسپل کمیٹی کے چیئرمین کو سڑک درست کرنے کے لئے درکار ہے۔ منہدم نہ کیا جائے۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ یور آنر کی خدمت میں ایک میموریل بھی بھیجا گیا ہے۔ اگر جواب موافق ہو تو مجھے اس معاملہ میں تحریک کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ کیا یور آنر مجھے فیصلہ سے مطلع کر سکتے ہیں؟

کانپور کے مسلمانوں میں بہت جوش پھیلا ہوا ہے۔ میں اس موقعہ پر خصوصیت کے ساتھ ان کے جوش کو ہلکا کرنے کا خواہشمند ہوں۔

۱۵ مئی ۱۹۱۳ء　　　　محمد علی کامریڈ

جواب

موسومہ مسٹر محمد علی ایڈیٹر کامریڈ ۔ دہلی

مجھے کانپور کی مسجد کے متعلق آپ کا تار ملا۔ میموریل میں جو اعتراضات کئے ہیں، ان پر احکامات جاری ہو گئے ہیں۔ میں نے اس معاملہ پر خاص طور سے ذاتی توجہ کی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ شکایت زیادہ تر ذہنی و خیالی ہے۔ یہ امر کہ مسجد کا حصہ انہدام طلب غسل خانہ ہے، اور در اصل متبرک عمارت کا کوئی جزو نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان جوتا پہن کر اس احاطہ میں داخل ہوتے دیکھے گئے ہیں۔ بہر حال ہر طرح سے کوشش کی جائے گی کہ غسل خانہ ایک مناسب موقع زمین پر بنوا دیا جائے۔ لیکن سڑک کی لائن بدلی نہیں جا سکتی۔ مسجد کا ادب ہر طرح سے ملحوظ رکھا جائے گا۔

۱۵ مئی ۱۹۱۳ء　　　　میسٹن لفٹیننٹ گورنر ۔ نینی تال

جواب

بخدمت لفٹیننٹ گورنر بہادر بمقام نینی تال۔

میں جناب کی تار کا مشکور ہوں۔ شرع اسلام کی رو سے زمین کا کوئی حصہ جو مسجد کی غرض کے لئے وقف کر دیا گیا ہو، کسی اور مقصد کے لئے منتقل نہیں ہو سکتا۔ جس مقام پر وضو کیا جاتا ہے۔ وہ حصہ ہمیشہ مسجد کا جزو سمجھا جاتا ہے۔

کانپور کے مسلمانوں کا جواب ہے کہ جس حصہ مسجد کو منہدم کرنے کی غرض سے مانگا جاتا ہے اس مقام پر جوتی نہیں پہنچائی جاتی۔ بلکہ جب کبھی نمازیوں کا زیادہ مجمع ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہاں نماز ادا کی جاتی ہے۔ میں یور آنر کی اس خواہش کو بہ نظر استحسان دیکھتا ہوں کہ یور آنر مسجد کا احترام کرنا چاہتے ہیں۔ اور ساتھ ہی وضو وغیرہ کے لئے منہدم شدہ حصہ کے عوض کوئی مناسب جگہ دینی چاہتے ہیں۔ لیکن مجھے شبہ ہے کہ یور آنر کو متنازعہ فیہ کے متعلق کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے۔ میرا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ محض خیالی شکایات کی بنا پر گورنمنٹ کو پریشان کروں اور خصوصاً اس نازک موقع پر مگر میں یور آنر سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سڑک کی لائن ایسا معاملہ نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے ہم ایسی شکایات پر سر برآوردہ مقبول اشخاص کو پیدا ہو گئی ہیں۔ باقی رہنے دی جائے جس سے ناانصافی کا خیال قائم ہو سکے۔ میں نہایت ادب کے ساتھ یور آنر کو مشورہ دیتا ہوں کہ کسی قسم کی کوئی کاروائی کرنے سے پیشتر آپ اس معاملہ کے متعلق مسلمان علماء اور قانون دان اصحاب سے مشورہ فرمالیں۔

۱۶ رمئی ۱۹۱۳ء محمد علی کامریڈ

جواب

مائی ڈیر محمد علی!

کانپور کے معاملہ کے متعلق آپ نے جو آخری تار مجھے بھیجا تھا۔ اسے میں نے کچھ دن غور کرنے کے لئے بلا ادائے جواب رہنے دیا۔ میں حکام مقامی کو پہلے ہی احکام بھیج چکا تھا۔ مگر میں نے چاہا کہ آپ کی نہایت معتدل و معقول درخواست دوبارہ غور مزید کو نظر انداز نہ کروں۔ میں نہایت صفائی کے ساتھ آپ سے کہتا ہوں کہ میری رائے میں یہ جوش کسی حقیقی مذہبی شکایت پر مبنی نہیں ہے۔ اگر اس معاملہ میں مجھے شبہ کا شائبہ بھی ہوتا تو میں نہایت احتیاط کے ساتھ ایسے امر سے احتراز کرتا۔ جو حقیقی جذبات کو صدمہ پہنچانے والے ہوتے۔ مگر جو شہادت میرے پاس ہے۔ اس سے قطعی اور مختتم طور پر ثابت ہوتا ہے کہ غسل خانہ کے متعلق شور و شغب بعد از وقت ہے۔ اور یہ کہ جو حصہ منہدم کیا جانے والا ہے۔ اس میں مسلمان جوتا پہنے جاتے ہیں۔ امر آخر الذکر کے متعلق کسی شبہ کی گنجائش کا امکان بھی نہیں معلوم ہوتا۔ میں بصداقت امید کرتا ہوں کہ مسلمانوں کی عقل سلیم انہیں اس معاملہ کو طول دینے سے باز رکھے گی۔ ہم سے جس قدر ہو سکے گا معاملات میں آسانی و سہولت پیدا کریں گے۔ مگر آپ اچھی طرح اندازہ کر لیں گے کہ امور عامہ سوائے صحیح اور کافی وجوہ کے روکی نہیں جا سکتی۔

میں آپ کی حالت کا صحیح اندازہ کر سکتا ہوں۔ اور اس لئے میں نے معاوضۃً اپنی صحیح حالت اپنی عادت کے موافق نہایت صفائی سے آپ کے روبرو بیان کر دی ہے۔

آپ کا مخلص:۔ جیمس میسٹن ۔ گورنمنٹ ہاوس نینی تال ۲۴ رمئی ۱۹۱۳ء

جواب

مائی ڈیر سر جیمس

میں کانپور کی مسجد کی بابت جناب کو پھر تصدیعہ دینا چاہتا ہوں۔ چند اردو اخباروں میں اس معاملہ پر تھوڑی بہت بحث ہو چکی ہے۔ اور مجھے خطرہ ہے کہ باقی اخبارات بھی فی الفور معاملہ کو ہاتھ میں لے لیں گے۔ میرا خیال ہے کہ اردو کے اخبارات میں جو مضامین سرکاری افسروں کے متعلق شائع ہوتے ہیں عموماً ان کا اثر ان افسروں پر نہیں ہوتا۔ کیونکہ عام طور پر وہ اردو نہیں جانتے ہیں۔ اور میں نے یہ التزام مدنظر رکھا ہے کہ جس امر کو گورنمنٹ کے مطالبہ میں لانا منظور ہو اسے "کامریڈ" میں شائع کیا جائے۔ اور جو عوام (پبلک) کی واقفیت کے لئے لکھا جائے

.. "ہمدرد" میں شائع ہو۔ اس لئے میں نے مذکورہ بالا مضمون کے متعلق "ہمدرد" میں کچھ بھی لکھنا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ اس قسم کی تحریریں گورنمنٹ پر تو کوئی اثر نہیں کرتیں اور خاص مزاج کے لوگوں کو بھڑکا دیا کرتی ہیں۔ مگر یور آنر کی حالت اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہے اس لئے کہ یور آنر اردو اخبارات کو خود اچھی طرح پڑھ سکتے ہیں۔ کانپور کی مسجد کے متعلق میں ضرور "کامریڈ" میں کچھ لکھتا۔ اگر مجھے یہ امید نہ ہوتی جو اب ہے کہ وہی نتیجہ اور اطمینان بخش نتیجہ یور آنر سے خط و کتابت کرنے سے بھی حاصل ہو سکتا ہے جو اخبار میں اس بحث کو اٹھانے میں ہو سکتا تھا۔ لیکن اس وقت تک تو مجھے مایوسی ہوئی ہے کیونکہ باوجودیکہ یور آنر میری درخواست کو میانہ روی اور راستی پر محمول فرماتے ہیں لیکن اب تک اس کا کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہوا۔ لیکن میں اب تک بالکل نا امید نہیں ہوا۔ اور ایک دفعہ پھر یور آنر سے التجا کرتا ہوں کہ اس تجویز کو منظور فرما کر علماء اور قانون دان اصحاب سے مشورہ فرمائیں۔ مجھے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت یہ سوال زیر غور ہے کہ جس حصہ عمارت کو میونسپلٹی کے چیئرمین منہدم کرنا چاہتے ہیں اس میں آج کل نماز پڑھی جاتی ہے یا نہیں۔ لیکن جس امر پر سب سے پہلے توجہ ہونی چاہئے تھی وہ یہ ہے کہ کیا کوئی ایسی عمارت جو فی سبیل اللہ وقف کرا دی گئی ہو اس کا کوئی حصہ بیع یا کسی اور مقصد کے لئے منتقل کیا جا سکتا ہے۔ میں نہ تو اسلامی فقہ سے واقف ہوں اور نہ کچھ ایسا ماہر قانون ہوں۔ لیکن مجھے وثوق ہے کہ اس قسم کی موقوفہ املاک کو کسی اور غرض کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر میرا یہ وثوق بجا ہے۔ تو اس عمارت کے کسی حصہ کو بھی منہدم کرنے سے ہم سب کی محسوسات کو صدمہ پہنچے گا اور ایسی حالت میں یور آنر خود فیصلہ فرما سکتے ہیں کہ کیا سڑک مذکورہ کی داغ بیل اس قدر بیش قیمت ہے کہ وہ ہمارے ہاتھ اس قدر گراں بیچی جا رہی ہے۔ ہم حکام کی مجبوری کی اس وقت کچھ قدر کر سکتے تھے۔ اگر مسلمانوں کی مصیبت کی وجہ سے کوئی مہتم بالشان پبلک عمارت بنتے بنتے رک جاتی۔ لیکن صاف عرض کرتا ہوں کہ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس وجہ سے کہ میونسپلٹی کے چیئرمین سڑک کو علم ہندسہ کی رو سے درست کرنا چاہتے ہیں مسلمانوں کی محسوسات کو نظر انداز کر دیا جائے حالانکہ وہ سڑک میں خم دے سکتے تھے۔ اور عمارت بالکل محفوظ رہ سکتی تھی۔ مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ اگر سڑک کا خط سیدھا کھینچا جاتا تو مساجد کو چھیڑنے کی بھی ضرورت نہ پڑتی۔ اور ایک مندر بچانے کے لئے مسجد سے قریباً ۱۵۰ فٹ کے فاصلہ پر کوئی ۸ فٹ کا ایک خم کر دیا گیا ہے۔ جو عین وسط میں واقع ہے۔ میں نے کانپور کے مسلمانوں سے جو مجھے ملنے کے لئے یہاں آئے تھے کھود کھود کر دریافت کیا کہ اس وجہ سے مسلمان ہندوؤں سے تو کچھ آزردہ دل نہیں ہوں گے۔ لیکن مجھے یقین دلایا گیا ہے کہ ہندوؤں سے کوئی عناد اس وجہ سے نہیں ہے کہ یور آنر نے مندر کو بچانے کا فیصلہ کیا ہے۔ بلکہ امر واقع یہ ہے کہ وہ اس معاملہ میں برابر اس امر کے متمنی رہے ہیں کہ میونسپل بورڈ کانپور کے ہندو ممبروں کی امداد حاصل کریں۔ اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ جہاں ہندوؤں نے اس معاملہ میں مسلمانوں کی امداد کی ہے وہاں مسلمانوں نے بھی ایک ہندو جنٹلمین کی یہ ترمیم منظور کر لی تھی کہ اس معاملہ کے متعلقہ ریزولیشن کے نفس مضمون کو بہ نسبت اصل کے جو میونسپل بورڈ ایجنڈا میں درج تھا نرم کر دیا جائے۔ بلکہ جب اس مسئلہ پر ۲۸ مئی کو ممبروں سے رائے لی گئی تو اس وقت بھی یہ ظاہر ہوا کہ بجائے مخالفت کے زیادہ تر ہندوؤں نے ہی اس امر پر زور دیا کہ اس کارروائی کو روک دیں۔ تاکہ مسلمانوں کو پھر ایک دفعہ گورنمنٹ سے عرض معروض کرنے کا موقع مل جائے۔ لیکن مجھے معلوم ہوتا ہے کہ چیئرمین صاحب کا اس معاملہ میں خاص حصہ ہے۔ اور وہ اپنی تمام طاقت کام میں لا رہے ہیں۔ انہیں کی رائے نے آخری موقع پر بھی مسلمانوں کے خلاف معاملہ طے کر دیا تھا۔

اگر صاحبان کانپور کا بیان صحیح ہے تو اس سے کلکٹر صاحب ضلع کے اس طریق عمل کی عجیب حقیقت کھلی ہے۔ جو وہ اس امر کا ثبوت بہم پہنچانے

میں استعمال کر رہے ہیں کہ مسجد کے جس حصہ کو میونسپلٹی کے چیئرمین منہدم کرنا چاہتے ہیں وہ مسجد کا جزو نہیں ہے۔ ان کا بیان ہے کہ:-
مسٹر ٹائلر مسجد کے زیر بحث حصہ میں بلا اجازت جوتی سمیت گئے اور وہاں سے واپس ہو کر کہا کہ اگر یہ مسجد کا حصہ ہوتا تو مجھے ضرور روک دیا جاتا۔ اگر یہ خبر صحیح ہے تو مسلمانان کانپور اسی قابل تھے اور ان کا علاج یہی تھا کیونکہ میرا خیال ہے کہ مہذب دنیا میں کہیں بھی کوئی مجسٹریٹ شہادت پیدا کرنے کے لئے یہ بیہودہ طریق اختیار نہیں کرے گا۔ اور بجز مسلمانوں کے جنہیں ہمارا دوست ٹامس طرح طرح کے الزام دیتا ہے کوئی اور قوم اس قسم کے سلوک کو گوارا نہیں کر سکتی۔ مجھے معلوم نہیں ہے کہ یور آنر کے پاس اس مضمون کے متعلق کیا اطلاع پہنچی ہے۔ لیکن اگر مسٹر ٹائیلر نے شہادت پیش کی تو مجھے امید ہے کہ یور آنر نے ان کو ضرور نصیحت کی ہو گی۔ کیونکہ اگر یہ واقعات راست ہیں تو وہ فرد کسی نہ کسی نصیحت کے محتاج ہیں۔ حق الامر یہ ہے کہ اگر جوتہ گندگی سے پاک ہو تو از روئے شریعت مسلمان جوتی سمیت مسجد کے فرش پر نماز پڑھ سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہندوستان کی سڑکیں عموماً ایسی صاف نہیں ہوتیں کہ اگر مسلمانوں کی جماعت جوتی سمیت نماز پڑھے تو فرش مسجد نماز کے قابل رہے۔ اس لئے شدہ شدہ اس عام فہم خیال نے ہندوستان میں ایک رسم و رواج کی صورت اختیار کر لی ہے کہ کوئی شخص کو جوتی سمیت مسجد میں نہ آنا چاہئے۔ اور ایک عرصہ تک اس دستور سے مسلمانوں کو چنداں دقت بھی محسوس نہ ہوئی۔ اس لئے کہ ان کا جوتا در حقیقت سلیپر ہوتا ہے (اور اس کے اتارنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی) لیکن یورپین اصحاب بعض بعض مسجدوں میں بوٹ پہنے ہوئے گھس جاتے ہیں۔ جس سے مسلمانوں کو بہت رنج ہوتا ہے۔ اور مجھے یہ بتلایا گیا ہے کہ خود ہز ایکسیلنسی وائسرائے بہادر بہ نفس نفیس اس رواج کو توڑا نہیں بلکہ عملاً مسدود کرنے والے ہیں۔ اور اس کے بعد ہمیں امید ہے کہ نہ صرف دہلی کی جامع مسجد بلکہ آگرہ کی بعض بعض مقدس عمارات بھی جن میں مسٹر مورڈن نے غیر مسلموں کو مع بوٹ جانے کی اجازت دیدی ہے۔ بوٹوں کی پامالی سے محفوظ ہو جائیں گی اور واجب التحریم شمار ہوں گی۔ لیکن مسلمانان کانپور زور کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ہر طرح سے یہ ثابت کرنے کے لئے تیار ہیں کہ جس حصہ کو منہدم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اس پر کبھی بھی جوتیاں نہیں گئیں۔ اور نہ کبھی زینہ کے قدموں سے آگے جوتیاں رکھی جاتی ہیں۔ بلکہ جب نمازی زیادہ ہو جاتے ہیں تو اس حصہ پر نماز ادا کی جاتی ہے۔

بہر نوع جیسا کہ میں پہلے اپنے ایک تار میں عرض کر چکا ہوں ہر ایک جگہ وضو گاہ مسجد کا لازمی حصہ ہوا کرتی ہے اور جس قدر حرمت مسجد کے کسی اور حصہ کے لئے واجب ہے اس قدر حرمت وضو گاہ کے لئے بھی واجب آتی ہے۔

مجھے جو کچھ اطلاع ملی ہے اس کی بنا پر میرا خیال ہے کہ پہلے تو یہی تجویز تھی کہ اس مندر کو منہدم کر دیا جائے جو عین سڑک کے وسط میں واقع ہوتا ہے۔ لیکن اہل ہنود کی داد فریاد پر گورنمنٹ نے بالکل بجا کیا۔ اگر اس کو بچا لیا۔ اس کے بعد یہ تجویز ہوئی کہ مندر کے عوض میں کیوں نہ مسجد کا ایک حصہ منہدم کر دیا جائے۔ بیان کیا گیا ہے کہ جب نومبر گذشتہ میں یور آنر کانپور میں رونق افروز ہوئے ہیں تو میونسپل بورڈ کے مسلمان ممبروں نے یور آنر کی خدمت میں التجا کی تھی کہ انہیں اس امر کا یقین دلایا جائے کہ مسجد منہدم نہ کی جائے گی۔ اور میں نے "ہیرلڈ آف انڈیا" میں دیکھا کہ یور آنر نے ممبروں کو یقین دلایا تھا۔ کہ امپروومنٹ ٹرسٹ کمیٹی مسجد اور مندر دونوں کو ہاتھ تک نہ لگائے گی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ باوجود آنجناب کے وعدے کے امپرومنٹ ٹرسٹ نے ایک ریزولیشن پاس کیا کہ اس حصہ مسجد کو حاصل کر لیا جائے اور اس کے عوض میں شمال کی جانب ایک قطعہ دے دیا جائے لیکن جس وقت یہ ریزولیشن میونسپل بورڈ کے سامنے منظوری کے لئے پیش ہوا تو مسلمان ممبروں کی مخالفت کی وجہ سے ملتوی کر دیا گیا۔ اس کے بعد مسٹر ٹائلر مسجد کو ملاحظہ کرنے کے لئے گئے۔ اور بوٹ پہنے ہوئے اس

حصہ مسجد پر چڑھ گئے ۔ بعد ازاں ایک میٹنگ میں پانچ کانپوری علماء نے فتویٰ دیا کہ مسجد کا یہ حصہ مسجد ہی میں شامل ہے اور میٹنگ نے
اس مضمون کا ریزولیوشن پاس کر دیا۔ اس کے بعد بورڈ کا ایک اور اجلاس ہوا اور قبل از وقت نوٹس نہ دینے کی وجہ سے ایک مسلمان
ممبر کی اس تحریک کو مسترد کر دیا گیا کہ مسجد کا یہ حصہ مسمار نہ کیا جائے ۔ چنانچہ شہر کے ممتاز مسلمانوں کے ایک وفد نے کلکٹر صاحب کی خدمت
میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ مسجد کا یہ حصہ بچا لیا جائے اور انہوں نے ہیوسے روڈ کی نظیر بھی پیش کی جس کی داغ بیل پہلے اس طرح
ڈالی گئی تھی کہ چھوٹی عیدگاہ کی وضوگاہ سڑک میں آ گئی تھی ۔ لیکن جب مسٹر ہوسے کی خدمت میں مسلمانوں کا وفد حاضر ہوا تو ان کی خواہشات کو ملحوظ
رکھ کر سڑک کا رخ بدل دیا گیا تھا ۔ میرے پاس ہوسے روڈ کا ایک نقشہ موجود ہے ۔ جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مسجد کا گیارہ فٹ عریض
حصہ سڑک میں آنے سے بچا لیا گیا ہے ۔ لیکن اگر ان دنوں بھی علم ہندسہ کی رو سے مستقیم سڑک بنائی جاتی تو وہ بھی منہدم ہو جاتی ۔ سڑک عموماً ۱۲
سے ۱۰۵ فٹ تک چوڑی ہے ۔ لیکن یہاں یہ مسجد کے پاس سے گذری ہے وہاں ایک جگہ تو اس کا عرض ۹۴ فٹ رہ گیا ہے اور دوسری
جگہ ۹۶ فیٹ ۔ اس جگہ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ مسجد زیر بحث کا جو نقشہ میرے پاس ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسجد کا جو حصہ سڑک کو
مستقیم بنانے کی غرض سے منہدم کیا جانے والا ہے وہ کہیں بھی ناپا جائے ساڑھے تیرہ فٹ سے زیادہ عریض نہیں ہے ۔

جس بات کا مجھ پر بہت ہی زیادہ اثر ہوا ہے وہ میونسپل کمیٹی کا وہ ریزولیوشن ہے جو یکم اپریل کی میٹنگ میں پاس کیا گیا ہے ۔ اصل
ریزولیوشن کے مسودہ پر بورڈ کے چار مسلمان ممبروں کے علاوہ چھ ہندو ممبروں کے دستخط ثبت تھے مگر دو ہندو ممبروں نے ایک ترمیم تجویز کی تھی
جس میں اصل ریزولیوشن کی تمہید انہوں نے چھوڑ دی تھی ۔ مگر اس نتیجہ سے وہ متفق تھے کہ مسجد کا کوئی بھی حصہ نہیں لینا چاہئے ۔ چیئرمین نے ایک اور
ترمیم تجویز کی اور ایک یورپین ممبر نے اس کی تائید کی کہ اس تجویز پر کوئی توجہ نہ کی جائے ۔ لیکن صرف چار راؤں میں اس ترمیم کی تائید ہوئی ۔ بر خلاف
اس کے تیرہ ممبروں نے ہندو اصحاب کی رائے کی تائید کی اور پھر ترمیم پاس ہو گئی ۔ صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی یور آنر کے سامنے یہ خیال
ظاہر کرنا داخل گستاخی ہو گا کہ جب چیئرمین اپنی من مانی بات منوا سکتا ہے تو لوکل سیلف گورنمنٹ محض ایک ڈھکوسلا ہے ۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ
صورت حالات کے اس پہلو نے جس قدر مجھ پر اثر کیا ہے اسی قدر یور آنر نے لیا ہو گا ۔

یور آنر کی گورنمنٹ نے میرے دوست آنریبل مسٹر شاہد حسین کو جواب دیتے ہوئے لکھنؤ کی ایک نظیر بیان کی ہے جس میں تین شہری
سے مسجد کی ایک وضوگاہ حاصل کر لی گئی تھی ۔ مسلمانان کانپور کا بیان ہے کہ اگر اس پیش کردہ تجویز میں مولوی گنج کی ان دو مسجدوں کا حوالہ ہے جو
امین آباد کے مغرب میں واقع ہیں تو ان کو یقین ہے کہ جو حصہ حاصل کیا گیا تھا وہ ایک علیحدہ عمارت تھی ۔ اور وہاں کبھی بھی نماز نہیں پڑھی گئی تھی ۔
کیف وہ اس امر پر زور دیتے ہیں کہ ہوسے روڈ کی نظیر اس سے زیادہ زوردار ہے ۔ اور یہ کہ مان بھی لیا جائے کہ کسی جگہ کے مسلمانوں نے مسجد کی
وضوگاہ کو دے دینے پر رضامندی ظاہر کی ہے ۔ جو یقیناً وقف سبیل اللہ ہے تو اس قسم کی رضامندی دوسری جگہ کے مسلمانوں کو پابند نہیں کر سکتی
مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ میونسپل بورڈ کا جو اجلاس ۲۰ مئی کو ہوا تھا ۔ اس میں صرف چیئرمین کی آخری رائے ہی کے بل پر یہ ترمیم پاس ہو سکی کہ
مسلمان ممبروں کو گورنمنٹ کی خدمت میں اپنی معروضات پیش کر سکنے کی غرض سے سڑک کی مزید کارروائی ملتوی نہ کی جائے ۔ میرا خیال ہے کہ یہ
ہندوؤں کے جنہوں نے چیئرمین کی تائید کی تھی ۔ اور چیئرمین کی رائے کے خلاف اگر مسلمان ممبروں اور ان چار ہندو ممبروں کی اب بھی وہی رائے ہے کہ سڑک
کی کارروائی روک دی جائے تو یہ ایک ایسا امر ہے جس میں گورنمنٹ بخوبی سمجھ سکتی ہے کہ زیادہ ہندو اور مسلمان ممبروں کی رائے کے مقابلہ میں چیئرمین
کی رائے کی چنداں وقعت نہیں رہتی ۔ مجھے امید اور یقین ہے کہ یہ معاملہ چیئرمین کے کسی فعل سے ہندو مسلمانوں کے مسئلے کی شکل اختیار نہیں کرے گا

بلکہ اگر یہ صورت پیدا ہو چکی ہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ کوئی نہ کوئی شخص یہ شبہ کر بیٹھے گا کہ چیئرمین نے اس تنازعہ کے پیدا کرنے میں سرگرمی سے
حصہ لیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یور آنر کو اس امر کا کس قدر خیال رہتا ہے کہ کسی افسر پر ذرا سا شبہ بھی نہ ہونا چاہئیے کہ وہ "رعایا میں پھوٹ ڈا
کر حکومت کرو" کی تدبیر پر کاربند ہے۔ مجھے امید ہے کہ خدا کرے کا نپور میونسپلٹی کے چیئرمین بھی اس قسم کے شبہات سے پاک رہنے کے اس
طرح خواہشمند ہوں۔ میں نے مسلمانان کانپور کو مشورہ دیا ہے کہ اگر وہ پہلی التماس کو آخری التماس سمجھ کر خاموش ہونا نہیں چاہتے تو یور آنر کی خد
میں اپنی معروضات پھر پیش کریں۔ اور میں بھی ایک دفعہ پھر گذارش کرتا ہوں کہ براہ مہربانی میری تجویز کو منظور فرما کر اس معاملہ میں مسلمان علماء اور مسلمان
قانون دان اصحاب سے مشورہ فرمالیں۔ اس میں تو شک نہیں کہ اگر اس شکایت کے خلاف فیصلہ صادر ہوا تو مجھے یقین ہے کہ راستی پر مبنی ہے تو اس
رائے ظاہر کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ میری تو خواہش یہی ہے کہ اس معاملہ پر مجھے کوئی جرح قدح کرنا ہی نہ پڑے اور خود یور آ
معاملہ پر نظر ثانی کے بعد اس معاملہ میں ہمارے محسوسات کا پاس رکھنا ممکن تصور فرمالیں۔

دہلی ۳ر جون ۱۹۱۳ء - آپ کا صادق - محمد علی

جواب

جواب ہز آنر سر جیمس میسٹن بالقابہ لفٹیننٹ گورنر صوبجات متحدہ -

مائی ڈیر محمد علی!

مجھے بہت افسوس ہے کہ دیگر ضروری کاموں کی وجہ سے دیر ہوئی۔ اور میں اب تک آپ کی چٹھی متعلقہ مسجد واقع مچھلی بازار کانپور
مورخہ ۹ر جون ۱۹۱۳ء کا جواب نہ دے سکا۔ میں آپ کی اس توضیح کے ساتھ اور تاہم دوستانہ رنگ میں چٹھی لکھنے کو بہت قدر کی نگاہ
دیکھتا ہوں۔ اور میں بھی حسب دستور اس رنگ میں جواب دینے کی کوشش کرتا رہوں گا۔

۲ - میں نے بہت احتیاط کے ساتھ اور مختلف حیثیت کے بہت سے اصحاب سے مشورہ کر لینے کے بعد اس فیصلہ پر مکرر
غور کر لیا ہے۔ جو مسجد کے دالان کے مسمار کر دیے جانے کی بابت شائع ہو چکا ہے۔ (میں قانون دان اصحاب کی طرح بالکل بے تعصبی
کے ساتھ اس حصہ مسجد کو دالان کے نام سے پکارتا ہوں) میں خود اس بارے میں اپنا ذاتی اطمینان کرنے کی فکر میں تھا کہ جو احکام جا
ہو چکے ہیں اور میرے آخری احکام ہیں کہیں بے غوری اور ناانصافی پر مبنی نہ ہوں۔ اور مزید غور و خوض کے بعد میں نہیں دیکھتا کہ از ر
انصاف ان احکام کی بابت بد رائے قائم کی جاسکتی ہے۔

۳ - مدت سے سے۔ بی روڈ کے نقشہ میں بھی دکھلایا گیا ہے کہ اس دالان کے متعلق کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں کی گئی بلکہ
مگر یہ وعدہ کہ مسجد مسمار نہ کی جائے گی اس دالان سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا۔ جو بظاہر مسجد سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اور جس کی نسبت مجھے
ذمہ دار افسروں نے کامل یقین دلایا ہے کہ دالان مقدس عمارت کی تعمیر میں بالکل شامل نہیں ہے۔

۴ - دالان کو مسمار کرنے کے خلاف معروضات میرے پاس اس وقت پہنچائیں جبکہ ہندوؤں کے مندر کو بچا لینے کا فیصلہ شائع ہوئے کئی
ماہ گذر چکے تھے۔ قدرتاً مجھے اس بنا پر یہ تحقیقات کرنے کا خیال پیدا ہوا کہ یہ صدائے احتجاج سچی شکایتوں پر مبنی ہے یا ہندوؤں کو رعایت
مل جانے کے بعد اس کا خیال سوجھا ہے۔ تاکہ مسلمانوں کے لئے ایسی ہی مراعات حاصل کی جائیں۔ اس لئے اس امر کا تحقیق کرنا ضرور تھا کہ
مسلمان اس دالان کی کیا وقعت کرتے ہیں۔ اس کے متعلق میں نے مٹر کم سے دریافت کیا اور انہوں نے فوراً مجھے بتلایا کہ جب مسلمان انہیں

ان دکھانے کے لئے لے گئے تو بہت سے مسلمان اس میں جوتی سمیت گھس گئے تھے۔ میں خود اس بارہ میں رسم و رواج اور محسوسات سے
واقف نہیں ہوں کیونکہ میں بہت سے خوش عقیدہ مسلمانوں کے ساتھ اکثر مسجدوں میں گیا ہوں۔ چنانچہ میں نے مسٹر سیم کے بیان کو (جسے
میں بلا شک وشبہ تسلیم کرتا ہوں) اس معاملہ پر قطعی شہادت سمجھ لیا۔ کہ دالان کی اس قدر حرمت نہیں ہے جتنی کہ خاص مسجد کی ہے۔ یہ شہادت
آپ کی چٹھی کے اس بیان سے بہت کچھ مختلف ہے کہ مسٹر ٹائیلر یہ ثابت کرنے کے لئے دالان میں بوٹ سمیت داخل ہوئے تھے کہ یہ جگہ
واجب التحریم نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ نتیجہ اخذ کیا ہے وہ خود مسلمانوں کے افعال ہی سے کیا ہے۔

جب میں کانپور گیا تو میں نے مسلمانوں کے اسی نقطۂ خیال کے اظہار اور ان اعتراضوں کی نوعیت کا جو بعد میں کئے گئے لحاظ کر کے احکام
جاری کئے۔ اور انہیں احکام کو آخری قرار دیا۔ (اگر مجھے کسی جماعت کے سچے جذبات کو رنج پہنچانے یا ان کی مذہبی محسوسات کو دکھ دینے کا اندیشہ
ہوتا تو میں کبھی ایسا نہ کرتا۔ نہ تو اس وقت مجھے معلوم ہوا اور نہ اب مجھے کوئی اس قسم کا اندیشہ معلوم ہوتا ہے۔ میں نے کسی جماعت کے مذہبی محسوسات
کو صدمہ نہیں پہنچایا ہے۔ ممکن ہے کہ لوگ نئی باتوں کو ناپسند کریں اور پرانی اور مانوس اشیاء سے مداخلت کرنے پر اظہار ناراضگی کریں۔ مگر
مسلمانان کانپور کی یہ چیخ پکار کہ ہمارے مذہبی محسوسات کو صدمہ پہنچا ہے، مجھے مبالغہ آمیز معلوم ہوئی۔ اور میں نے خیال کیا کہ اس میں پورا پورا اخلاص و
صدق نہیں ہے۔ میرا یقین تھا کہ دالان (متنازعہ) کے عوض کسی اور جگہ جو پہلی جگہ کی طرح موزوں ہو ایک نیا دالان تعمیر کر دئے جانے اور مسجد
اس کے متعلقہ اور گرد کی عمارتوں کو معقول امداد دینے سے ہم کسی تکلیف یا ایسی تبدیلی کا ازالہ کر دیں گے۔ جو عارضی طور پر نمازیوں کو پیش آئے
یا ان کے روز مرہ کے معمول میں واقع ہوئی ہو۔ اس طریقہ سے ہم پورا پورا عوض دینے کو تیار ہیں۔ اس تجویز کے مطابق عملدرآمد کرنے سے جو
آپ پیش کرتے ہیں یا تو ہمیں رستہ کے لئے نئی سمت ڈھونڈھنی پڑے گی یا دالان مذکور کو اس طرح لب سڑک کھڑا رکھنا ہوگا کہ وہ سڑک
کے تھوڑے حصے کو ڈھانپے رکھے۔ خود تو یہ خفیف سا معاملہ ہے مگر افراد یا کسی قوم کے ایک حصہ کو چھوٹی چھوٹی رعائتیں دینے کی وجہ سے کس حد تک
رفاہ عام کے کاموں میں حرج کیا جاسکتا ہے؟

۶۔ یقین فرمایئے کہ اگر یہ شور وغل ٹل سکتا تو مجھے بہت مسرت ہوتی۔ مگر ہم سب کو اس امر سے اتفاق ہونا چاہئے کہ اگر ہم رفاہ عام کا خیال
دل میں رکھتے ہیں تو ہمیں چھوٹی اور بڑی باتوں کے درمیان امتیاز کرنا چاہئے۔ اگر خفیف سے خفیف تکلیف کو قومی شکایت بنا دیا جائے اور
اسے قومی شکایت تسلیم کر لیا جائے، تو گورنمنٹ کے قانون اور امور رفاہ عام کی ترقی کا خدا حافظ ہے۔ اگلے مہینے جب میں کانپور آؤں گا، تو
مسلمانوں سے ملاقات کروں گا۔ اور جہاں تک مجھ سے بن پڑا ان کی ناراضگی خاطر کو جس پر مجھے حقیقی افسوس ہے دور کر دوں گا۔ مگر میں اب فیصلہ
کو کہ اسے بی روڈ کے لئے دالان کو منہدم کیا جائے تبدیل نہیں کر سکتا۔ میں آپ کا کچھ کم شکر گزار نہیں کہ آپ نے اس معاملہ کو ایسی صفت
بیجی اور آزادی سے میرے سامنے پیش کیا ہے۔

گورنمنٹ ہاؤس نینی تال۔ آپ کا مخلص:۔

مورخہ ۲ر جولائی ۱۹۱۳ء (دستخط) سر جیمس میسٹن

خواجہ حسن نظامی کی

کہو تکبیر!

اَللّٰہُ اَکْبَرُ - اَللّٰہُ اَکْبَرُ - لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْد -

(یہ تقریر بتاریخ ۹ رمضان المبارک مطابق ۸ اگست ۱۹۱۳ء بعد نماز جمعہ میرٹھ شہر کی جامع مسجد میں دس ہزار مسلمانوں کے سامنے کی گئی اور جس کے ایک ایک لفظ نے جلسہ میں تہلکہ ڈال دیا)

اس بندوق کی قسم جو ظالم و مظلوم کے ہاتھ میں یکساں کام کرتی ہے۔ اس سنگین کی قسم جو دوست و دشمن کے سینہ میں برابر اتر جاتی ہے۔ اس تلوار کی قسم جس پر اگر آج غیر کا قبضہ ہے تو کل ہمارا ہوگا۔ اس پستول کی قسم جو سر انگلی کے اشارے سے کام کرتا ہے۔ ہم کانپوری شہیدوں کے ماتم میں یہاں جمع ہوئے ہیں ہم ان زخمیوں کی ہمدردی کرنی چاہتے ہیں جو کانپور میں بندوق و کرچ و سنگین کا نشانہ بنائے گئے۔

اس مسجد کی قسم جس کے اندر آج ہم سب کلمہ گو بھائی صف بند نظر آتے ہیں۔ کانپوری مسجد کا غم ہم کو یہاں کھینچ لایا ہے وہ مسجد جو مچھلی بازار میں تھی۔ وہ مسجد جس کا ایک حصہ سڑک سیدھی کرنے کی خاطر زور اور ظلم سے شہید کر دیا گیا۔ وہ مسجد جس کی محبت کرنے والے مسلمانوں کو ۲۹ شعبان کے دن بندوقوں نے دس منٹ لگاتار فائر کر کے خاک و خون میں ملا دیا۔ وہ مسجد جس کے سامنے ہمارے بوڑھے بزرگوں کی لاشیں تڑپ تڑپ کر گریں۔ اور ان کی سفید داڑھیاں خون سے لال ہو گئیں۔

اس مسجد کی قسم جس کے سامنے دم توڑنے والے شہیدوں نے یہ کہا۔ سلام ہمارا مدینے والے سلطان پر جس کے دین کی لاج پر ہم جان دیتے ہیں۔ سلام اس پر جو حجاز کے اونچے پہاڑوں سے آیا ہے۔ اور ہم کو اپنے سینے کے سہارے لئے بیٹھا ہے۔ ہمارے زخموں کو پیار کرتا ہے۔ جس کے گیسو دراز نواسے حسن رضؓ و حسینؓ اس مقتل میں اپنی سرخ سبز قباؤں کے دامن بچھا رہے ہیں۔ جن کی صاحبزادی فاطمہ زہراؓ اپنے باپ کی ہچکیاں لینے والی امت کو پانی کے گھونٹ پلاتی پھرتی ہیں۔ جس کے طفیل جنت کی حوریں کوثر کے جام لائی ہیں۔

اس مسجد کی قسم جس کے اندر سینکڑوں بے گناہ ستم کی رسیوں سے باندھے گئے۔ اور بھوکے پیاسے جیل خانہ کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں بند کئے گئے۔

ہم اسی غرض سے یہاں آئے ہیں کہ اپنے کانپوری شہیدوں کی ارواح کو درود و سلام بھیجیں۔ ہم اس لئے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں کہ کانپوری زخمیوں کی تیمارداری کے لئے تدبیریں سوچیں۔ ان کے زخموں کے واسطے مرہم بھجوائیں۔ اور قیدیوں کی رہائی دلوانے کا کچھ سامان کریں۔ اور شہیدوں کے بے کس بال بچوں کو بھوک اور پیاس کی تکلیف سے بچائیں۔

میرٹھ کے مسلمانو! اسلام تم سے اپنا حق مانگتا ہے۔ کانپور کے مسلمانوں نے اپنا حق جان و مال سے ادا کر دیا۔ وہ قربان ہو گئے اور مسجد کی بے آبروئی پر کٹ مرے۔ تم سے فقط مال کی مانگ ہے تاکہ زخمیوں اور شہیدوں کے پس ماندوں اور قیدیوں کے گھر والوں کی مدد کی جائے۔ دوسری مانگ تم سے اور ہے اس کو بھی سنو اور زور سے اک نعرۂ تکبیر بلند کرو۔ اللہ اکبر - لا الہ الا اللہ - واللہ اکبر - اللہ اکبر و للہ الحمد - اور وہ طلب یہ ہے کہ سب ایک ہو جاؤ اور ہندوستان نے نیک دل وائسرے حضور لارڈ ہارڈنگ بہادر کو فریاد نامے بھیجو۔ کہ کانپوری حکام

نے ہمارے بھائیوں کو ناحق تیغ و تفنگ کا نشانہ بنایا - ہماری مسجد کو تلوار کے زور سے ڈھا دیا - بے قصور مسلمانوں سے جیل خانے بھر دئے - لارڈ ہارڈنگ کو لکھو - لنڈن کی پارلیمنٹ کو لکھو اور اس رحم دل آدمی کو لکھو جس کا نام جارج خامس ہے - اور جوان ظالم حکام اور کانپوری مظلوموں کا منصف بادشاہ ہے - وہ بادشاہ جو مسلمانوں کے دین سے محبت رکھتا ہے - جس نے دہلی دربار میں آنے کے وقت اس جہاز میں سفر کیا جس کا نام مدینہ تھا - کیونکہ وہ جانتا تھا کہ نجات مدینہ کے نام میں ہے - وہ بادشاہ جس نے جامع مسجد دہلی کا طواف کیا - وہ بادشاہ جس کے آگے جلوس دربار کے موقع پر اسلامی جھنڈا تھا جس پر نصر من اللہ و فتح قریب لکھا ہوا تھا - ہم کو اپنے اس انصاف پسند بادشاہ سے امید ہے کہ وہ کانپور کے ظالم انگریزوں کی جفا کاریوں کو معاف نہیں کرے گا -

اللہ کے بندو! ہراساں اور مایوس نہ ہو - کمر ہمت مضبوط باندھو - آنکھیں دیکھتی ہیں کہ بول بالا ہونے کا وقت قریب آیا ہے - کان سنتے ہیں کہ عذاب الٰہی کا بادل گرج رہا ہے -

کانپوری مسجد کا واقعہ ایسا نہیں ہے جس سے تم بے خبر ہو یا جس کو سن کر تم سب کے دلوں میں جوش نہ پیدا ہوا ہو مگر اس ملک میں کچھ انگریز ہیں جو کہتے ہیں کہ گنتی کے چند مسلمان اور اخبارات غل مچا رہے ہیں - باقی مسلمانوں کو تو کانوں کان خبر بھی نہیں کاش وہ بدنصیب جانتے کہ اسلام کے کلمہ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ میں ایک ایسی بجلی ہے جو انگریزوں کی بے تار کی تار میں بھی نہیں پائی جاتی - اس میں ایک ایسی لہر ہے جو دنیا کے تمام سمندروں کی موجوں سے زیادہ پر جوش ہے ان کو یقین کرنا چاہئے کہ سارا ہندوستان کانپوری مسجد کے معاملہ میں ایک دل اور ایک زبان ہے - کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ بلقان و طرابلس کے دور دراز ملکوں میں جب ہمارے بھائیوں کے ایک پھانس چبھتی تھی تو یہاں پر ہم ہندوستانیوں کے دلوں میں خنجر چل جاتے تھے - کیا یہ لوگ مسلمانوں کا جوش دیکھنا چاہتے ہیں؟ کیا ان کو آرزو ہے کہ مسلمان اپنا ایجی ٹیشن دکھائیں - مگر ان سے کہدو ہمارا جوش ایجیٹیشن اور نمائش کا جوش نہیں ہے - جو میز کرسی تک محدود رہے - ہم جب جوش میں آتے ہیں کرہ ارض تھرا جاتا ہے - سمندر ڈر کے مارے سمٹ جاتا ہے - پہاڑ پست ہو جاتے ہیں - دریاؤں کی روانی رک جاتی ہے - ہمارا جھنڈا جب بلند ہوتا ہے تو سینٹ پال کے گرجا کے سوا اور کہیں نصب نہیں ہوتا - اس لئے ہم زور سے درخواست کرتے ہیں کہ ہم کو نہ چھیڑا جائے ہم وفادار لوگ ہیں - ہم اپنے بادشاہ کے فرمان پر سر جھکانے اور اس کے پسینہ کی جگہ خون بہانے والے لوگ ہیں - کیونکہ خدا اور رسول نے ہم کو یہی حکم دیا ہے - تم ہم کو نہ ستاؤ اور چپ چاپ اپنا کام کرتے رہو - ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے اس وعدہ کا خیال رکھو کہ ہندوستانیوں کے مذہب میں حکومت کبھی کوئی مداخلت نہ کرے گی -

ہماری کانپور کی مسجد بنا دو - ہمارے قیدیوں کو چھوڑ دو - ہمارے زخمیوں کو ہمارے حوالہ کر دو - اور موقع دو کہ ہم اب اطمینان سے اپنے مالک الملوک پروردگار کے آگے سر جھکائیں اور اس کی عبادت کریں جس کے لئے ہم پیدا ہوئے ہیں -

اے مسلمانو! خیال تو کرو کہ آج جب کہ تم آرام سے اپنے گھروں میں بیٹھے ہو - کانپوری شہیدوں اور زخمیوں کے بال بچوں پر کیا گذر رہی ہوگی لہذا جیب میں ہاتھ ڈالو اور ان کی مدد کے لئے حسب توفیق کچھ دو -

کانپور کے مسلمانوں کی شہادت کا ذمہ وار کون ہے

پنجشنبہ ۷؍ اگست ۱۹۱۳ء

آخر وہ دن آگیا جس کا ہم کو خوف تھا۔ اور جس کے متعلق ہم نے بار بار گورنمنٹ کو متوجہ کرنا چاہا تھا۔ مگر ہٹ دھرم اور ضدی حکام کی آزمین اور سخن پرور طبیعتوں کی بدولت اصلی حالات پر روشنی نہ پڑ سکی۔ اور کانپور کی مسجد کے معاملات نے افسوسناک صورت اختیار کی جس کا ذکر اشاعت میں مفصل کر چکے ہیں۔ اور جس کے متعلق مسٹر ٹائیلر مجسٹریٹ کانپور کا بیان ہے کہ بیرونی اشتعالک اور طعنوں سے تنگ آکر مسلمانا بے بلوا کر دیا۔ مگر مسٹر ٹائیلر اور ان کے ہم خیالوں پر واضح ہونا چاہئے کہ سب سے بڑی اشتعالک مسلمانوں کو اگر کسی بات سے ہو سکتی وہ یہ تھی کہ باوجود ان کی فریاد اور واویلا کے سرکاری اعلان میں یہ اشارہ کیا گیا کہ کانپور کے مسلمانوں میں دراصل کوئی سچا جوش مسجد کے نہیں ہے جس کے معنی دوسرے الفاظ میں اس سے زیادہ کیا ہو سکتے تھے۔ کہ گورنمنٹ ان کی نفظی ناراضگی کی کچھ پرواہ نہیں کرتی اور مسٹر اور ان کے ہم نوا اس بات کے آرزومند تھے کہ اس سے کچھ زیادہ بروئے کار آئے ہم ان کو مبارک باد دیتے ہیں کہ ان کی آرزو پوری ہو اب مسٹر ٹائیلر اپنی سرکاری رپورٹ میں خواہ ان واقعات کو کس رنگ میں رنگیں مگر شہیدان کانپور کے لہو کی سرخی ہمیشہ کے دامن پر جھلکتی رہے گی۔ اور ان بے گناہوں کا خون تاقیامت ان کی گردن پر رہے گا۔

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

مسلمانوں کی وفاداری اور اطاعت شعاری کے متعلق اب سے پہلے بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ اور ہم اب بھی گورنمنٹ کو یقین دلا ہیں کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ سے کوئی پرخاش نہیں ہو سکتی۔ مگر جس حالت میں کہ ان کی مؤدبانہ عرضداشت اور ان کی باضابطہ فریاد کو مسٹر بے فہیم حکام یہ ثابت کرنا چاہیں اور یہ طعنہ دے کر کہ ان میں کوئی سچا جوش نہیں ہے ان کی رگِ غیرت وحمیت کو حد اعتدال سے زیادہ میں لانا چاہیں تو اگر ان سے کوئی امر خلاف قانون سرزد ہو تو محل استعجاب نہیں۔

نہ بینی کہ چوں گربہ عاجز شود
برآرد بہ چنگال چشمِ پلنگ

مسلمانوں کی مذہبی تعلیم خود ان کو بتاتی ہے کہ جو لوگ تم سے انصاف کے ساتھ پیش آئیں تم ان کی اطاعت کرو۔ مگر جس وقت عابد کی بے حرمتی کر کے ان سے یہ چاہا جائے کہ وہ اپنے سچے مذہبی جذبات کا ثبوت دیں تو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ انہیں جانیں اور اپنی گر عبادت گاہوں سے زیادہ عزیز نہیں۔ اور وہ اپنی چند روزہ زندگی کا اس سے بہتر کوئی خاتمہ نہیں سمجھتے۔ کہ وہ خدا کی راہ میں کام آ

وبالِ دوش ہے یہ سر مگر اسے ہم نے
لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لئے

کانپور کے نہتے مسلمان اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے۔ کہ وہ مسلح فوج اور نیزہ بردار پولیس کے سواروں کے مقابلے میں نہیں ٹھہر

صرف مسجد کے منہدم شدہ حصہ کی ازسرِ نو تعمیر کا قصد ہی اس بات کو بخوبی ثابت کرتا ہے کہ ان کا ارادہ فاسد نہ تھا۔ بلکہ صرف ایک مذہبی جذبہ تھا جس پر شارع عام پر خلاف قانون مجمع یا زیادہ سے زیادہ گورنمنٹ کے جس حکم کی مطابق وہ حصہ سرکاری ضبطی میں آیا تھا۔ اس کی خلاف ورزی کا الزام آسکتا تھا۔ اور یہ ایسی باتیں تھیں جن کے متعلق ایک نیک نیت حاکم بعد مجمع کے خود بخود منتشر ہو جانے کے ذمہ دار لوگوں سے بہ آسانی جواب طلب کر سکتا تھا۔ اور بغیر اس کے کہ مسلح پولیس سے ان کا محاصرہ کر کے ان کو زیادہ اشتعال دلایا جائے۔ تمام معاملات طے ہو سکتے تھے۔ مگر جو حاکم اپنی شان انا ربکم الاعلیٰ اور اختیار لمن الملک الیوم کا اظہار کرنا چاہتا ہو۔ اور جس نے بغیر اس کے کہ کوئی قطعی فیصلہ ہو مسجد کو ڈھا کر بے بس اور بے کس مسلمانوں کو اپنی سنگینوں کا جوہر دکھانا چاہا ہو اس سے کب یہ توقع ہو سکتی تھی کہ وہ وقت اور موقع کی نزاکت کو ملحوظ رکھے گا۔ مسٹر ٹائلر اپنے اس فعل کو خواہ کوئی جامہ پہنائیں مگر حکومت برطانیہ کا انصاف ان سے بے گناہ مسلمانوں کے خون کا مواخذہ لے کر رہے گا۔ اور ان کا اشتعال انگیز طرز عمل کسی پردہ میں نہیں چھپ سکے گا۔ کہ بیرونی طعن و تشنیع اس اندرونی ہنگامہ کے سبب ہوئے۔ اگر مسلمانوں نے دوسروں کے یا خود مسٹر ٹائیلر کی غیرت دلانے کی وجہ سے یا انہدام مسجد کو خلاف قانون سمجھ کر اس کو دوبارہ درست کرنا چاہا تو مسٹر ٹائیلر کو کس بات نے تحریک کی کہ وہ مسلح پولیس سے ایک غیر مسلح جماعت پر حملہ کر دیں۔

ہاتھ کی سرخی کو مانا کہ حنا کہتے ہیں
یہ جو دامن پہ ہیں چھینٹے انہیں کیا کہتے ہیں

ہم کو سر جیمس میسٹن بالقابہ اور گورنمنٹ ہند سے پوری توقع اس بارہ میں ہے کہ وہ حکومت برطانیہ کے ضرب المثل انصاف کو اس موقع پر ہاتھ سے نہ جانے دیں گے اور محض سرکاری رپورٹوں اور حکام ضلع کے بیانات پر اکتفا نہ کریں گے۔ جن کے یک طرفہ اور متعصبانہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ ہم کو بخوبی اس بات کا اندازہ ہے کہ اس سے پہلے کانپور کے مسلمانوں کا ارادہ قانون کی کسی قسم کی خلاف ورزی کا نہ تھا۔ اور ہم بوثوق کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کے المناک حادثہ کے وقوع کے ذمہ دار حکام ضلع ہیں جنہوں نے خلاف واقعہ اطلاعیں گورنمنٹ میں پہنچا کر مسلمانوں کو مشتعل کرنا چاہا۔ اور اب ایک غلط بیانی کی پردہ پوشی دوسری افترا پردازی سے کی جاتی ہے۔ آخر میں ہم ان سرفروشان ملت کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں۔ جنہوں نے صرف اپنے مذہبی حقوق زندہ رکھنے اور اعلاء کلمۃ الحق کے لئے جانیں خدا کی راہ میں فدا کی ہیں۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند بر عاشقانِ پاک طینت را

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۝

ہم اپنے مذہبی بھائیوں سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ اس معاملہ میں وہ ضبط و تحمل کو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے۔ اور ان گرفتارانِ بلا کی اعانت کی تدابیر پر غور کریں گے۔ جو اس وقت زیر عتاب ہو رہے ہیں۔ آئندہ ہم ان تدابیر اور نیز دیگر امور کے متعلق بحث مفصل کریں گے۔

کشکول

واقعہ کانپور کے متعلق ہز آنر کی رائے ——— !

جمعہ ۸ ر اگست ۱۹۱۳ء

ہز آنر جیمس میسٹن نے آگرہ کی تقریر میں شہدائے کانپور کی بیواؤں اور یتیم بچوں کی آہ و بکا - اور مسجد مچھلی بازار پر قربان ہونے والوں کی حالت زار کا پُر درد سماں بیان کرنے کے بعد جس شاعرانہ طریقہ پر حکام وقت کی رحم دلی اور انصاف پروری کی مدحت سرائی کی طرف گریز کیا ہے ہم افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم اس کی داد دینے سے قاصر ہیں - ہم ہز آنر کے ضرور مشکور ہیں کہ انہوں نے زخمیوں کی عیادت کی - گرفتاروں کے حالات دریافت کئے اور بیواؤں اور یتیموں کی فریادیں سنیں - مگر مسٹر ٹائلر جیسے ناعاقبت اندیش، مغرور، ضدی اور بے پروا حاکم کی دانشمندانہ تعریف میں افسوس ہے کہ مسلمان ہز آنر کا ساتھ دینے سے معذور ہیں - بلکہ ہم کو اس کا بھی افسوس ہے کہ کانپور کے معاملات کی طرف سے اتنی غفلت کی گئی کہ صورت حال کچھ سے کچھ ہو گئی - اور بجائے اس کے کہ بچے جوش والے مسلمانوں کی قلبی کیفیت کو ان کی زبانوں سے سنتے ہز آنر کو ان میں سے اکثر کا ماتم کرنا پڑا - پھر بھی غنیمت ہے کہ ان جان سے جانے والوں کے ساتھ ہمدردی تو ہے -

آفریں بر دلِ نرم تو کہ از بہر ثواب
کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدۂ

پایونیر اور بلوۂ کانپور :-

ہمارے قدیم مہربان اور ہم عصر پایونیر حسب معمول تحریر فرماتے ہیں کہ منہدم حصہ مسجد کو دوبارہ بنانے کا ارادہ کرنا در اصل مجمع کی طرف سے حکام کو بلاوا تھا کہ وہ اپنا سارا زور لگالیں - اگر واقف رموز مملکت پایونیر کی یہ رائے صحیح ہے تو ہم یہ امید کرتے ہیں کہ وہ آئین ملک داری کے اصول کی رو سے یہ بھی ضرور مان لے گا کہ جن عہدہ داروں میں سے اس قدر انتظامی مادہ نہیں ہے کہ وہ برافرو رعایا کے احساسات اور جذبات کو سمجھ کر امن عامہ کو قائم رکھ سکیں وہ حاکم بننے اور رہنے کے اہل بھی نہیں ہیں - ہمیں سخت افسوس آتا ہے اخبار مذکور حکام کی ذاتی غلطیوں کی تائید کرتے ہوئے یہ محسوس نہیں کرتا کہ اخبارات کا فرض تو یہ ہے کہ گورنمنٹ کو واقعات کی اصل حقیقت آگاہ کرتے رہیں - نہ یہ کہ اسے اندھیرے میں رکھ کر اور ٹھوکریں کھانے کے لئے غلط راستہ پر ڈال دیں - اس قسم کی غلط بیانیوں پر اعت کر کے جیمس میسٹن جیسے زیرک اور حق پسند فرمانروائے صوبہ نے منہدم حصہ مسجد کی شہادت کا حکم دے کر مسلمانان ہند کی دلآزاری کی - اور پھر کے بعد جیسا کہ معزز ہم عصر انڈین ڈیلی ٹیلیگراف صفائی کے ساتھ تسلیم کرتا ہے سرکاری اعلان شائع کر کے مسلمانان کانپور کو خالی از جر بنایا اور یا یوں کہئے کہ جوش کی دبی ہوئی چنگاریوں کو مشتعل کر دیا - عیدگاہ میں کثیر التعداد مسلمان جمع ہوئے اور حقیقت واقعات معلوم پر غم و غصہ کھانے لگے لیکن لکھے پڑھے مسلمان سمجھدار مسلمان، اعتدال پسندی اور قانونی پابندی کی تلقین کرتے رہے - اور علمائے دین بھی جو نفا سے کر جلسہ حاضرین کو ہیجان میں لاسکتے تھے - ضابطہ کے اندر ہی رہنے پر زور دیتے رہے - مگر کوئی تین ہزار شرکائے جلسہ میں سے چند سو

سمار ہے اور جان پر کھیل جانے والے مسلمان جلد برخاست ہونے کے بعد واپسی میں کچھ ایسے جوش میں آگئے اور اپنی جاہلانہ سمجھ کے مطابق صرف اس قدر برہم
میں آگئے کہ اگر گورنمنٹ اپنی غلطی کی اصلاح میں پس وپیش کرتی ہے یا لیڈران قوم سرگرمی و چابک دستی کے ساتھ گورنمنٹ سے غلطی کی اصلاح
کرانے میں تاخیر سے کام لے رہے ہیں تاہم وہ اپنے ہاتھوں سے شہید حصہ کو زندہ کرکے گورنمنٹ کی اصلاح کردیں۔ مگر وہاں تو ایک اور بلبلہ
ہونے والی تھی جس طرح سے مسلح پولیس کی نگرانی میں حصہ زیر بحث شہید کیا گیا تھا۔ اسی طرح مسلح پولیس اور سوار ہتھے، جاہل افراد رعایا پر حملہ
کرنے کے لئے بلوائے گئے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ مسٹر ٹائیلر یا مسٹر ووڈ نے اس معاملہ میں جرأت، تحمل، دانشمندی یا موقع شناسی کی صفات
میں سے کونسی صفت پر عمل کیا۔ صاحبان بہادر کے جلو میں مسلح پولیس ہے جو ایک "بزن" پر غریب رعایا پر گولیاں برسانے کو تیار ہے اور
مجمع جوش مذہبی میں از خود رفتہ ہے، ایسی حالت میں اگر مجمع میں سے بعض ناسمجھ لڑکوں نے جنہیں لڑکے سمجھ کر ہر آنرنے رہا بھی کر دیا ہے۔ اور
متعدد اشخاص نے ان پر اینٹ پتھر پھینک بھی دیئے تو چنداں قابل مواخذہ نہیں کہا جاسکتا۔ ابتدائی معاملہ سے وقوع بلوہ تک صاحبان امن
پسند مسلمانوں کو اشتعال دلاتے رہے اور اشتعال بھی مذہبی۔ ہم امید کرتے ہیں کہ گورنمنٹ اس معاملہ کو اصلی روشنی میں دیکھے گی۔ اور اس افسوسناک
بلوہ کے لئے حکام ضلع کو جوابدہ ٹھیرائے گی۔ نہ کہ جاہل مسلمانوں کو یا بے قصور متولیان مسجد کو۔

HIL
روشنی کے بغیر زندگی
"ایک جسم ہے بے روح"
کوئی ایک ماچس —— ؟
حبیب کی طرح طرح کی ماچسوں میں سے منتخب کر لیجیے
EXPRESS
SAFETY MATCHES
HURRICANE
SAFETY MATCHES
MADE IN PAKISTAN
THE BANDUK
SAFETY MATCHES
MADE IN PAKISTAN
HABIB INDUSTRIES LTD. DACCA
SAFETY MATCHES
HABIB INDUSTRIES Ltd. DACCA
PARROT
SAFETY MATCHES
HABIB INDUSTRIESL DACCA
GREEN ARROW
حبیب ماچس کبھی خراب نہیں ہوتی
حبیب انڈسٹریز لمیٹڈ ڈھاکہ

آزمودہ کوالٹی

آزمودہ نام

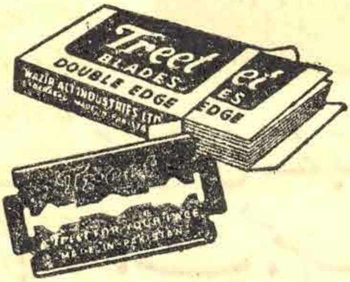

ٹریٹ
بلیڈ

۷۰ پیسے کے ۱۰ بلیڈ

T-B-21/167

PRESTIGE

خانہ داری میں
اِن کا جواب نہیں
یہ اپنے شوہر کی تنخواہ کا ایسا حساب پھیلاتیں
کہ گھر کی ہر ضرورت آسانی سے پوری ہو جاتی
لیکن ایک دِن یہ بے خیالی میں
ایک ایسا سُوتی کپڑا اُٹھا لائیں جس پر
"سینفورائیزڈ" کا لیبل لگا ہوا نہ تھا۔
اَب اِن کی خوبصورت نئی چولی کا حشر دیکھئے
یہ ایک ہی دَھوپ میں کیا سے کیا ہو گئی۔
خریدتے وقت کسی کے کہنے سُننے میں نہ آیئے
روپے کے صحیح مَصرف کا اندازہ خود لگایئے!
ہمیشہ آدم جی کے
SANFORIZED
سینفورائیزڈ پارچہ جات طلب کیجئے
پھر آپ کے کپڑے سُکڑ کر کبھی غیر موزوں نہ ہوں گے!
پاکستان میں سینفورائیزڈ پارچہ جات
آدم جی انڈسٹریز لمیٹڈ
تیار کرتے ہیں اور انہی کو اس ٹریڈ مارک کے استعمال کا حق حاصل ہے

طیبی

قائم شدہ ۱۸۰۵ء

UNANI

طیبی برِصغیر کا سب سے قدیم دواخانہ

اپنی روایات کے ساتھ جدید ترین لباس میں

عام یونانی مرکبات اور دواخانہ کے مخصوص مجربات تیار کرنے میں ڈیڑھ سو سال سے غیرفانی شہرت کا حامل ہے۔ صحیح اجزاء، مکمل اوزان اور دواسازی کے پورے معیار کے ساتھ تیار شدہ مرکبات کا استعمال معالج کی شہرت کا باعث اور بیماروں کی صحت کا ضامن ہے۔

طیبی دواخانہ کے مرکبات اپنی افادیت اور معیار کے لحاظ سے ہمیشہ ایک امتیازی حیثیت کے حامل رہے ہیں

اطباءِ کرام اور طبِ یونانی کے قدردان فہرستِ دواخانہ طلب فرما کر ملاحظہ فرمائیں

طیبی دواخانہ یونانی

نیپیر روڈ کراچی

سر جیمس مسٹن کی تقریر آگرہ میں

(سہ شنبہ-۱۲-اگست ۱۹۱۳ء)

مسجد مچھلی بازار کانپور کے حصہ معلوم کے شہید ہونے سے قبل ہمیں سر جیمس میسٹن اور اپنی باہمی خط و کتابت اور مسلمانا
کانپور کی مصروفیات و اکثر ممبرانِ میونسپلٹی کے اختلاف رائے سے خوش گوار نتائج پیدا ہونے کی بہت کچھ توقع ہے۔ مگر
توقعات جس طرح خیالِ باطل ثابت ہوئیں وہ ناظرین سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اس کے بعد ہمیں امید تھی کہ ہندوستان بھر ک
سرکردہ مسلمانوں، اسلامی انجمنوں اور علماء کی تقریروں، تحریروں اور فتاوے پر نظر ثانی اور اپنی رائے میں ترمیم کر کے سر جیمس میس
مذہبی مداخلت کے الزام سے بری ہو جائیں گے مگر اس طلسم امید کو گورنمنٹ صوبجات متحدہ کے سرکاری اعلان نے توڑ د
کانپور کے حادثہ قلق انگیز و خون ریز کے بعد سر جیمس میسٹن کی انصاف پسندی حق گوئی اور رحم دلی پر بھروسہ کر کے ہم لدترہ دار کی ط
گوش برآواز تھے کہ جناب والا قدر کی تقریر آگرہ نے اس آخری امید پر بھی پانی پھیر دیا۔

اس تقریر سے عمر بھر میں پہلی مرتبہ ہم کو یہ معلوم ہوا کہ رسم عزاداری میں کشتگان محبت کے وارثوں سے الٹا گلہ بھی ک
ہے چنانچہ سر جیمس میسٹن بالقابہ نے اپنی تقریر آگرہ کو سراپا حیرت سے لبریز کر دیا ہے اور منجملہ ان امور کے جن پر جناب موصوف
حیرت ظاہر کی ہے وہ ان لوگوں پر ہے جنہوں نے دورہ کر اور محفوظ رہ کر تقریروں اور تحریروں سے جاہل خلقت خدا کے جذ
میں آگ لگا دی اور جن کے اوپر خدا کی نظروں میں اور انسان کی نگاہوں میں اس بے ضرورت خونریزی اور مصیبت بپا کرنے کا گنا
ہز آنر کی یہ حیرت بجا ہوتی اور ہم' ان کے ساتھ متحیر ہونے کو تیار ہو جاتے بشرطیکہ ہمیں یہ یقین بھی ہو کہ کانپور سے باہر رہنے وا
نے دورہ کر اور محفوظ رہ کر تقریروں اور تحریروں سے جاہل خلقت خدا کے جذبات میں آگ لگا دی" ہے۔

ہز آنر کے اس اظہار حیرت سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اول تو یہ کہ بیرونی اصحاب نے لطف تماشا کی غرض سے گورنمنٹ
اور مسلمانان کانپور کے درمیان بدمزگی پیدا کی اور دبے دبائے معاملہ کو سوئی ہوئی بھڑوں کی طرح جگا دیا۔ دوسرے یہ کہ خو
تک بے حرمتی مسجد کے متعلق نہ کوئی احساس تھا اور نہ کوئی جوش، مگر چاروں طرف کی ہائے پکار سے احساس بھی پیدا ہو گیا، جوش
موجزن ہو گیا، اور شہیدان محبت اور دیوانگان عشق سنے سنائے یا تو مرنے مارنے اور جان ہارنے پر کمر بستہ ہو گئے۔ اگر بنائے ج
ہوئی ہے تو خود ہمیں اس پر کچھ حیرت نہیں ہے کیونکہ حضور موصوف سے پیشتر "لندن ٹائمس" اور بعض دیگر اہل الرائے جنگ ٹرکی

کے متعلق ہمیں قصوروار ٹھہرا چکے ہیں کہ ہم ترکوں کو ان کی مرضی کے خلاف لڑوائے جاتے ہیں اور اب بھی اینگلو انڈین اخبارات اسی قسم کے آوازے کس کر مسلمانوں کے فریاد کو شش گلوں میں رہ رہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ لیکن اب کہ گورنمنٹ نے وقتاً فوقتاً مسلمانوں کو مانگنے اور گلہ پھاڑ پھاڑ کر مانگنے کا سبق ازبر کرا دیا ہے اور اب کہ مسلمان یہ بخوبی سمجھ چکے ہیں کہ ہمارے منصف مزاج فرماں رواحضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم "دروازہ کھٹکھٹا اور وہ تجھ پر کھولا جائے گا" پر شدومد کے ساتھ کاربند ہیں اور ہم سے بھی اسی تعلیم کی پیروی کرانا چاہتے ہیں ہم افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں کہ مسلمان اس سبق کو کبھی نہ بھولیں گے۔ اور جب تک ان پر دروازہ کھولا نہ جائے گا۔ وہ اسے برابر کھٹکھٹاتے رہیں گے۔ خواہ دروازہ کھلنے پران پر گولیوں کی بوچھاڑ یا پھولوں کی بارش ہو لیکن اگر اس سے مراد مسلمانان کانپور کے احساس وجوش کا عدم ثابت کرنا ہے تو ہم ہز آنر کا ذہن ان عذرات کی طرف منتقل کراتے ہیں جن پر ہز آنر کے تفقد دین نے توجہ نہ فرمائی تھی اور اگر اس وقت وہ مسلمانوں کے زخمی دل کو ملاحظہ نہ کر سکتے تھے تو اس وقت تو شہداء کے دہان زخم سے ضرور فریاد سنتے ہوں گے۔

شہیدوں کی خونیں چادروں پر جو حیرت ہوئی سو ہوئی۔ اس کے مقابلہ میں سر جیمس میسٹن کی دوسری حیرت پر ہمیں بھی حیرت ہوئی ہے ہز آنر فرماتے ہیں مجھے اپنے افسروں کی انسانیت اور پولیس کے اس طریقہ پر حیرت ہے جس طرح کہ بلوہ فرو ہونے کے بعد انہوں نے مصیبت زدوں کی امداد زخمیوں کو ہسپتال لے جانا اور انہیں ہر قسم کا ممکن اور عارضی آرام دینے میں دل وجان سے کوشش کی اور جس طرح کہ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ کی ماتحتی میں انہوں نے بے ضرورت بدلہ لینے کے خیال سے اپنے آپ کو باز رکھا۔

ہز آنر کی حیرت بے شک بالکل بجا ہے اور ہمیں خود اس پر حیرت ہے۔ اگرچہ گمان غالب ہے کہ مزید ومفصل حالات کے وصول ہونے پر کم ازکم ہماری یہ حیرت قائم نہ رہے گی لیکن جن افسروں اور پولیس والوں نے کچھ عرصہ قبل بے ضرر اور نیک نیت رعایا کو اشتعال دلایا اور ان نہتے سادہ لوح فدائیان مذہب کو اشتعال دلا کر اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا تھا، ان افسروں اور پولیس والوں سے عفو اور انسانیت کا ظہور پذیر ہونا نہ صرف ادائیگی فرض منصبی سے خارج فعل تھا بلکہ ایسی صفات کا اظہار تھا جو صرف بے نفس اور دردمند بندگان خدا کی طبیعتوں میں مضمر ہوتی ہیں! کیا اس تقریر کو پڑھ لینے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہز آنر کو حیرت نہ ہوتی اور ہمیں بھی تقلید کورانہ کی زحمت نہ اٹھانی پڑتی اور تحولہ بالا افسران والا لیان پولیس شہیدوں اور زخمیوں کی لاشوں کو عبرت دلانے کے لیے سڑک پر سڑنے کے لیے چھوڑ دیتے جس طرح سے کہ بلقانی اتحادی ترک شہیدوں کی لاشوں کو بے گوروکفن اور زخمیوں کو سسک سسک کر دم توڑنے یا بھوک اور تکلیف سے جاں بحق ہونے کے لیے راستوں پر چھوڑ جاتے تھے۔ اگر سر جیمس میسٹن بہادر اپنے افسروں کی اس قدر شائستگی وانسانیت ہی پر حیرت زدہ ہو گئے ہیں تو ہم خیال کرتے ہیں کہ مریضوں کی مرہم پٹی اور قیدیوں کے سلوک پر اور بھی زیادہ حیرت زدہ ہوں گے۔

ہز آنر نے تقریر کا ختم دعا پر کیا ہے جس میں آگرہ کے متعلق یہ خواہش کی گئی ہے کہ وہاں اسی قسم کا کوئی حادثہ پیش نہ آئے ہم کو ہز آنر کی اس دعا سے کلی اتفاق ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی دعا ہے کہ آگرہ کی کسی مسجد کا وہ حشر نہ ہو جو کانپور کی مسجد مچھلی بازار کا ہوا۔

مسلمانوں کا وفد ہز آنر کی خدمت میں

سہ شنبہ۔ ۱۹ اگست ۱۹۱۳ء

ایک وفد بہ سرکردگی راجہ صاحب محمود آباد۔ ۱۲ اگست کو ۱۱ بجے ہز آنر لفٹیننٹ گورنر صوبجات متحدہ کی خدمت میں بمقا
ہاؤس لکھنؤ حاضر ہوا۔ اور مسجد کانپور کے متعلق حسب ذیل ایڈریس پیش کیا۔

ہم جن کے دستخط ذیل میں ثبت ہیں، صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے مسلمانوں کی طرف سے مسجد مچھلی بازار کانپور کے متعلق
کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔

قبل اس کے ہم اس سوال کے مختلف پہلوؤں سے بحث کریں جس کے متعلق ہم گفتگو کرنا چاہتے ہیں، ہم یہ بیان کر دینا چاہ
کہ ہم حضور کی خدمت میں ان ذمہ داریوں کو پورے طور پر سمجھ کر حاضر ہوئے ہیں۔ جو ہماری قوم اور نیز گورنمنٹ کی طرف سے ہم
ہیں جس مسئلہ کو ہم حضور کی توجہ کے لئے پیش کرنے والے ہیں اس کی زبردست اہمیت کا لحاظ کر کے ہم نے یہ ذمہ داری ا
ہے ہمارا یقین ہے کہ اگر اس نازک موقع پر ہم نے اپنی قوم کے جذبات کی ترجمانی نہ کی تو ہم اپنی قوم کے فرض اور گورنمنٹ کی د
قاصر رہیں گے۔ اس قسم کے اہم امور پر لحاظ کر کے ہم نے حضور سے ایک وفد کے منظور کرنے کی درخواست کی اور ہم حضور کی عنایت
کے ممنون ہیں۔ جس کی وجہ سے ہم حضور تک آج پہنچ سکے۔

ہم سب سے پہلے حضور کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ مسجد زیر بحث کے قریب والے مندر کی خوش قسمتی پر ہماری قوم ک
نہیں ہے۔ ہماری قوم نے اس خیال کی بہت سخت مخالفت کی ہے کہ مندر کا بچ جانا اشتعال طبع کا باعث ہوا۔ ہمارا خیال ہے
بچانا ضروری تھا۔ اور مناسب ہوا کہ وہ بچا لیا گیا۔

اب ہم چند الفاظ غفلت اور تساہل کے اس الزام کے متعلق کہنا چاہتے ہیں۔ جو کانپور کے مسلمانوں پر لگایا جاتا ہے
راست مسجد سے تعلق تھا۔ بغیر اس مسئلہ کو بحث میں لائے ہوئے کہ آیا مسجد کا وہ حصہ جو یکم جولائی ۱۹۱۳ء کو منہدم کیا گیا دا
۱۹۰۹ء میں حاصل کر لیا گیا تھا۔ ہم اس التماس کی جرأت کرتے ہیں کہ کافی ثبوت اس امر کے باور کرنے کے موجود ہیں کہ کانپو
پبلک کو اس حصول کے واقعہ کا علم نہیں تھا۔ زمین محصولہ پر کوئی نشان نہ تو موقع پر لگایا گیا۔ اور نہ اس زمین کا کوئی نقشہ
گیا۔ پھر ایک انگریزی نقل کی جو کلکٹر کے دفتر میں عوام کے معائنہ کے لئے آویزاں کر دی گئی تھی۔ اگر یہ آویزاں نقشہ مطالعہ کیا
یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مسجد کے کسی حصہ کا حاصل کیا جانا مقصود تھا۔ علاوہ ازیں مسجد کے متولیوں کو کوئی اطلاع زیر دفعہ ۹ قا
نہیں دی گئی۔ جیسا کہ قریب کی اور زمینوں کے مالکوں کو دی گئی تھی۔ بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس قسم کے تمام شکوک ا
ہو گئے۔ جب کہ نومبر ۱۹۱۲ء میں کانپور کے مسلمانوں نے حضور کے اس ارشاد کو جو حضور نے ہماری قوم کے بعض اشخاص سے
کلکتہ بھادی جائے گی۔ اطمینان بخش سمجھا۔ یہ بھی معلوم ہو گا کہ استحصال کے متعلق کانپور میونسپل بورڈ بعض کے ممبروں کو بھی ۰۸

ت کو سخت صدمہ پہنچایا ہے۔

ہم یور آنر کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اس مسئلے کے متعلق ہماری کمیونٹی کے احساسات انفرادی، مقامی یا مصنوعی نہیں ہیں۔ یکم جولائی
دارہ کو دالان کے انہدام نے جس کے وقوع میں آنے سے پیشتر ہم نہایت خاموشی کے ساتھ حکام سے اس کے بچانے کی کوشش کر رہے تھے
ہندوستان کی تمام اسلامی آبادی میں ایک تہلکہ مچا دیا ہے۔ یہ جذبات اصلی ہیں اور ہمارے مذہبی ایمان کی سخت چٹان پر قائم ہیں ہم کو اس امر
کہنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ اس معاملہ میں کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ اور ہمیں امید واثق ہے کہ یور آنر اس کو تسلیم کریں گے بشرطیکہ
پ بھی اس مسئلہ پر اسی طرح غور کریں جس طرح کہ ہم کر رہے ہیں۔

ہم نے یور آنر کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ تین اگست کے افسوسناک واقعہ سے قبل کر لیا تھا۔ ہم سب ان اندوہناک واقعات
روتے ہیں لیکن ہم ان معاملات پر رائے زنی کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ کہ اس معاملہ پر باضابطہ طور پر تحقیق و تفتیش ہو گی۔ بہر حال ہمیں بھروسہ
ہے کہ ان واقعات کا یور آنر کے فیصلہ پر کچھ اثر نہیں پڑے گا۔

ہم یور آنر سے نہایت ادب اور جوش کے ساتھ التجا کرتے ہیں کہ مسجد کے منہدم حصہ کو دوبارہ تعمیر کر دیا جائے جس کے لئے ہم اور ہماری
ہماری قوم ہمیشہ آپ کی احسان مند رہے گی۔ ہم کو اس امر کا چنداں یقین دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اگر یور آنر نے وہ حکم صادر کر دیا جس
کا ہم سب آپ سے التجا کر رہے ہیں۔ تو اس سے وہ جوش مدہم پڑ جائے گا۔ اور تمام مسلمان کمیونٹی کے زخم مندمل ہو جائیں گے۔ دستخط:۔

مولانا عبدالباری۔ آنریبل راجہ سر محمد علی خاں، خان بہادر کے سی۔ آئی۔ ای۔ (محمود آباد) آنریبل راجہ سید تصدق رسول خاں۔
کے سی ایس۔ آئی۔ (جہانگیر آباد) آنریبل راجہ میر ابو جعفر (پیرپور) خانصاحب نواب محمد اسحٰق خاں۔ خان بہادر نواب محمد مزمل اللہ خاں۔
آنریبل مسٹر سید عبدالرؤف۔ آنریبل مسٹر شیخ شاہد حسین۔ آنریبل خواجہ غلام الثقلین۔ آنریبل مسٹر سید رضا علی۔ مسٹر سید نبی اللہ
بیرسٹر ایٹ لا۔ خانصاحب مولوی محمد حبیب الرحمٰن۔ مولوی محمد نسیم صاحب ایڈووکیٹ۔ منشی احتشام علی صاحب۔

اجلاس تک کوئی علم نہیں تھا جیسا کہ ذیل کے ریزولیوشن سے ظاہر ہوتا ہے جو بورڈ مذکور کے اجلاس منعقدہ یکم اپریل ۱۹۱۳ء کو پیش کیا گیا۔

" امپرومنٹ ٹرسٹ کمیٹی کی کارروائیوں سے جو بورڈ کے سامنے ۱۴ مارچ ۱۹۱۳ء کو پیش ہوئیں اور جس کے متعلق بورڈ کے ایک ممبر کا اختلاف مسترد کر دیا گیا، بورڈ کو یہ معلوم ہوا ہے کہ مسجد مچھلی بازار کی عمارت کا ایک جزو اسے بی سٹرک کے لئے لیا جا رہا ہے۔ چنانچہ مجوزہ حصول اراضی چونکہ مذہبی بنیاد پر قابل اعتراض ہے اور چونکہ ہز آنر لفٹیننٹ گورنر کے ۱۳ نومبر ۱۹۱۲ء والے بیان کی منشا کے خلاف ہے لہٰذا بورڈ کی رائے ہے کہ مسجد کا حصہ مذکور نہیں لیا جانا چاہیے۔ اور بورڈ کی کوئی تحریک جو صاف لفظوں میں یا مبہم طور سے اس حصول کی تائید کرتی ہو نامنظور کی جائے۔"

بحث کے بعد اس ریزولیوشن کی اصلاح ہوئی اور مندرجہ ذیل الفاظ میں پاس کیا گیا۔

" یہ کہ ایک سفارش گورنمنٹ میں اس مضمون کی بھیجی جائے کہ اسے بی سٹرک کی مسجد کا کوئی حصہ مسلمانوں کے جذبات کے لحاظ سے نہ لیا جائے۔"

بورڈ کے چیئرمین نے صاحب کلکٹر کے توسط سے ریزولیوشن مذکور کو گورنمنٹ کی خدمت میں بھیج تو دیا مگر ساتھ ہی یہ ریمارک بڑھا کر وہ ریزولیوشن کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے اس لئے گورنمنٹ نے بورڈ کی سفارش کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔

بورڈ کے ایک جلسہ منعقدہ ۳۰ مئی ۱۹۱۳ء میں اس امر کی کوشش کی گئی تھی کہ ایک ریزولیوشن کو پیش کر کے مسجد کے دالان کو بچا لیا جائے۔ ریزولیشن یہ تھا " بورڈ اس امر کی سفارش کرتا ہے کہ گورنمنٹ نہایت مہربانی سے اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرے گی "۔

اس میں چیئرمین نے یہ ترمیم پیش کی کہ بورڈ کی طرف سے اب کوئی نمائندگی نہیں ہونی چاہیے۔ اور یہ کہ گورنمنٹ کے فیصلہ کو قطعی سمجھنا چاہیے جو پاس ہو گئی اور پہلی تحریک چیئرمین کے زائد ووٹ کی وجہ سے پاس نہ ہو سکی۔ اور جہاں تک کہ بورڈ کا تعلق تھا۔ معاملہ اس دن ختم ہو گیا۔

اس اثنا میں ماہ مارچ ۱۹۱۳ء میں کانپور کے مسلمانوں کا ایک وفد صاحب کلکٹر ضلع کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لیکن اس کا کچھ نتیجہ نہیں نکلا۔ اس کارروائی کے بعد شیخ شاہد حسین کے ذریعہ سے حضور کی خدمت میں ایک میموریل بھیجا گیا۔ لیکن وہ مئی کی ۶ تاریخ کو مسترد ہو گیا۔ اس کے بعد کانپور کے مسلمانوں کی طرف سے راجہ صاحب محمود آباد کے توسط سے ایک اور میموریل حضور کی خدمت میں بھیجا گیا۔ مگر دالان مسجد کے انہدام کے بعد انہیں اس کا جواب ملا۔ یادداشتوں کے علاوہ ہم نے اپنے دعوے کی صداقت کا اثر یور آنر کے دل پر بٹھانا شروع کیا۔ اس لئے کہ ہمارے علماء کے فتووں نے ہمارے دعویٰ کی تائید کی۔

یور آنر منہدمہ حصہ کے تقدس کا سوال بالکل اسلامی شرع کا قانون ہے موروثی یقین ہماری پشت پناہ ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے علماء کے فتوے جو حال ہی میں دیے گئے ہیں ہماری تائید میں ہیں۔ انہی باتوں کو مدنظر رکھ کر ہم پورے زور اور متانت کے ساتھ اس امر کی تصدیق کرنا چاہتے ہیں کہ ہم اس بات کا مطالبہ کر سکتے ہیں کہ منہدم شدہ حصہ مقدس تھا۔ اور مسجد کا ضروری جزو تھا۔

ہمیں کچھ شک نہیں ہے کہ یور آنر ہمیں معاف کریں گے۔ اگر ہم مسئلہ کے اس حصہ پر ذرا ذرا آزادی اور جوش کے ساتھ گفتگو کریں ہمیں یہ دیکھ کر سخت رنج ہوا ہے کہ پبلک کے روبرو ایسے دلائل پیش کئے گئے ہیں جن سے متنازعہ فیہ مسئلہ کے متعلق ہمارے مذہبی خیالات کی ہتک ہوئی ہے، ہم مصلحت وقت کا لحاظ کر کے اس ایڈریس کے دلائل کو باطل ثابت کرنا نہیں چاہتے۔ یور آنر! اگر ہمیں اس امر کی اجازت ہو کہ ہم اس مسئلہ کے ایک پہلو پر اپنے جذبات کی گہرائی کا مقابلہ دوسرے پہلو سے کریں۔ تو ہمیں اس امر کے کہنے میں کچھ تامل نہ ہوگا کہ اس حصہ نے ہمارے

سر جیمس مسٹن سے التجا

شنبہ ۹ر اگست ۱۳ء ۱۹ء -

کانپور کے روح فرسا حادثہ کے بعد خیال کیا جا سکتا تھا کہ حکام وقت کو اپنی غلطی کا احساس ہوگا - اور بعیس پچیس مسلمانوں کے
معاوضہ میں مسجد مچھلی بازار واپس کر دی جائے گی - مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہز آنر کو مسٹر ٹائیلر کی خاطر اتنے مسلمانوں کی جانوں سے زیادہ
ہے - اور سر جیمس کا نفسہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ علمائے دیو بند، بریلی اور لکھنؤ کے فتاوے کو تسلیم کریں - اور اگر چہ
نے قائل کر دیا مگر ہز آنر قائل ہونا نہیں چاہتے -

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ جمہور مسلمانان اور علماء اسلام کے ہوتے ہوئے ہز آنر کو کیا ایسی ضرورت پیش آئی کہ لفٹیننٹ گورنر
سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلامی مسائل پر رائے زنی کریں - اور بلائے بھی ایسی کہ کتنے مسلمان شہید کتنے زخمی ہوئے اور سیکڑوں
ہیں - مگر کسی طرح اس کی غلطی کا یقین نہیں آتا -

یہ ہم نے مانا کہ مسجد کی طرف رخ کرنے والوں میں زیادہ تر غیر ذمہ دار لوگ تھے اور جن لوگوں میں زیادہ عقل تھی انہوں نے جلسہ
جلسہ کے بعد بھی یہ کوشش کی کہ کوئی خطرناک صورت نہ پیدا ہونے پائے - مگر کیا ایک ہزار غیر مسلح مسلمانوں کا بے جگری کے ساتھ ایسی شدید
کے فائر کے سامنے جس میں گولی چلانے والے اپنے اور بیگانوں کو بھی تمیز نہ کر سکے کھڑا رہنا اور اس وقت تک منتشر نہ ہونا جب تک
نے حملہ نہیں کیا، اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ مسجد کی شہادت کا ان پر ایسا گہرا اثر تھا کہ اس کے مقابلہ میں اپنی جانیں تک انہیں
ایسے صریح اور بدیہی نتائج کے بعد بھی ہز آنر کو اپنی رائے پر اصرار ہے تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ کہاں تک انہیں رعایا کے صحیح جذبات کا اندازہ ہے
حد تک وہ اصول ملک داری سے واقف ہیں -

دوسری طرف جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہز آنر کو مسٹر ٹائلر کی بے رحمانہ اور قاتلانہ کاروائی میں وہ موزونیت اور خوش اسلوبی نظر آتی ہے
چشم مجنون نے حسن لیلیٰ میں بھی نہ مطالعہ کیا ہوگا - تو ہم کو شبہ ہوتا ہے کہ ہم ہز آنر کے ہاتھوں اپنی دل آزاریوں کی داد پا سکیں گے - کیا
ہے کہ ایک بے دست و پا جماعت پر مسلح فوج سے کر ایسا سخت حملہ کیا جائے کہ اگر آج اسی تعداد میں "فوجوں کا بھی مقابلہ ہوتا تو شاید
مقتولین اور مجروحین کی تعداد اس سے زیادہ نہ ہوتی! افسوس ہے اس قوم پر جس کے مسٹر ٹائیلر جیسے افراد اپنے افسروں کی زبان سے
کا خطاب پائیں گے! اگر شجاعت و بہادری کا یہی معیار ہے تو آئندہ برٹش قوم کو امید منقطع کر دینا چاہئے کہ اس میں ٹائیلر کے
ولنگٹن جیسے لوگ پھر پیدا ہو سکیں گے - اور اگر انصاف اسی کو کہتے ہیں جس کی تعریف میں ہز آنر کانپور سے آگرے تشریف لے
عالم سے خودی میں کھڑے ہوتے ہی منصور وار انا الحق کہہ اٹھے تو یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک ایسا بھی انصاف کرنے والا ہے جس کے
ہز آنر دونوں کو جواب وہی کرنا ہوگی جس کا انصاف مصلحت وقتی اور ضرورت سیاسی کی پابندیوں سے آزاد افسر و ماتحت کی نہ پرواہ کرنے
گرفتار کرنے والا ہے - واللہ شدید ذو انتقام -

ـلـہ ہزار آفرین ان چند ذمہ دار لوگوں پر اور ہزار آفرین ان پر جو ان لوگوں کو غیر ذمہ دار کہتے ہیں -

ہم ہز [ایکسلنسی] سے پھر درخواست کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کے اندازہ کرنے میں زیادہ دانشمندی کو کام میں لائیں اور ایک افسر کی غلطی پر سے بیسیوں مسلمانوں کے ساتھ حکومت برطانیہ کے انصاف کا بھی خون روا نہ رکھیں۔ ہم کو قوی امید ہے کہ ہز آنر ہماری [معروضات پر] ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔ اور اس قسم کے معاملات کو سرسری نگاہ سے نہ دیکھیں گے۔ اگر اس کے بعد بھی ہز آنر نے مسلمانوں کی دلی [کیفیت] کو معلوم کر لیا اور ان کے صحیح جذبات کو دریافت کر سکے تو ہم سمجھیں گے کہ ہمیں مسلمانوں کی جانیں بے سود ضائع نہیں ہوئیں۔ اور ہم کو ان [کا معاوضہ] مل گیا۔ ورنہ ۔ ع

جو اس پر بھی نہ وہ سمجھے تو اس بت سے خدا سمجھے

ہم غریبوں کو نہ پہلے تھا نہ اب ہے انکار
کہ ہر اک شہر میں ہے آپ کے انصاف کی دھوم
یہ بھی تسلیم ہے ہم کو کہ یہ جو کچھ کہ ہوا
اس میں ملحوظ رہے عدل کے آداب و رسوم
آپ قانون کی حد سے نہ بڑھے یک سرِ مو
فیر کا حکم دیا آپ نے جب بہرِ ہجوم
گولیاں کھا کے جو گرتے تھے جوانانِ حسین
سب یہ کہتے تھے قیامت ہے کہ جھڑتے ہیں نجوم
گولیوں کے تھے نشان منبر و محراب پہ بھی
بسکہ درکار ہیں مسجد کے لئے نقش و رسوم
جا بجا خون سے مسجد ہے نگاریں اب تک
یہ وہ صنعت ہے کہ تا حشر نہ ہو گی معدوم
واقعہ یہ ہے غرض کوئی نہ مانے نہ سہی
آپ ظالم نہیں زنہار، پہ مظلوم ہیں ہم (شبلی)

مسلمانوں کی اتنی بڑی جماعت گورنمنٹ اور اس کے افسروں کی نسبت ایسا برا خیال رکھتے نہیں بلکہ یقین رکھیے کہ ہم نے ان کے منسوب کردہ
خیالات کی بنا پر یہ کارروائی کی ہے اور یہ کہ ہم ان کے جذبات اور مراسم کی طرف سے بالکل تغافل ہیں۔ یہ امر ان اخباروں نے فرض کر لیا ہے۔ اس
میں آپ کا شکریہ ہوں کہ آپ نے آج موقع دیا ہے کہ ہم اپنی کارروائیوں اور اپنے خیالات کو صحیح روشنی میں پیش کریں۔ جس طرح سے
آپ نے اعتدال اور آزادی کے ساتھ مجھے مخاطب کیا ہے اسی طرح میں بھی آپ کے ساتھ صفائی قلب کے ساتھ گفت و گو کروں گا۔ اور
غسل خانہ کے انہدام کی وجوہات مختصراً بیان کروں گا۔ تین چار سال قبل ۱۹۰۹ء کانپور میں اس امر کا سب کو علم تھا کہ ایک نئی سڑک مچھلی بازار
کے علاقہ میں سے گذرے گی جس سے بہت سی عمارتیں لازمی طور پر منہدم ہو جائیں گی۔ اور کچھ شبہ نہیں کہ جو لوگ ان عمارتوں میں تعلق رکھتے تھے
وہ بہت دلچسپی کے ساتھ اسکیم کی رفتار کو دیکھتے رہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ۱۹۰۹ء کے ماہ مارچ میں حکام کی خدمات میں ایک میموریل ارسال
کیا گیا جس میں ایک دوسرے راستہ کا مشورہ دیا گیا تھا۔ اور ضمناً اس امر کا بھی ذکر کر دیا گیا تھا کہ اسے۔ جی سڑک (جیسی کہ اس وقت تجویز کی گئی
تھی) تین مساجد اور دو مندروں کے انہدام کا باعث ہوگی۔ میں اس واقعہ کا ذکر یہ ظاہر کرنے کے لئے کرتا ہوں کہ کوئی شریف آدمی یہ بہانہ
نہیں کر سکتا کہ اہل کانپور مجوزہ کام سے تعلق یا دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ سڑک کی داغ بیل کو پورے طور پر ڈالنے کے بعد نقشے پبلک کے
معائنہ کے لئے معمولی طریقہ سے پیش کر دئے گئے۔ میں سڑک کے ایک نقشہ کی نقل آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ اس کا معائنہ کرنے پر آپ دیکھ
سکیں گے صحن مسجد کا ایک حصہ اور نیز غسل خانہ لئے جانے کی تجویز کی گئی ہے۔ مسجد اراضی نمبر ۹۰ میں واقع ہے، اور جیسا کہ پیمائش کرنے سے
معلوم ہوا ہے، اس کا کچھ حصہ اراضی نمبر ۸۹ میں بھی آتا ہے۔ اس معاملہ کے متعلق آپ کے میموریل میں جو ریمارک کئے گئے ہیں، نیز بعض
بعض غلط بیانات جو سڑک کی داغ بیل کے متعلق شائع ہو گئے ہیں۔ بالضرورت نقشہ کے غلط پڑھنے پر مبنی ہیں۔ اس یقین کا دوسرا ثبوت
کہ لوگ جانتے تھے کہ مسجد کا ایک حصہ لیا جائے گا۔ اور اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کی گئی۔ یہ ہے کہ نومبر ۱۹۱۱ء میں مسجد کے
متولیوں نے میونسپل بورڈ کو ایک متصل مکان کی فروخت کی نسبت ایک درخواست پیش کی جو اراضی نمبر ۸۹ کے باقی ماندہ حصہ پر واقع
تھا۔ اس درخواست سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مکان کی مغربی دیوار، صحن مسجد کے احاطہ کی مشرقی دیوار تھی۔ مکان کی فروخت اور اس کے عملہ کے
ہٹانے کا مطلب متولیوں کے الفاظ کے مطابق مسجد کی شہادت تھا۔ انہوں نے اس لئے دیوار قائم رکھنے کی اجازت دے دی۔ مسٹر اودھ
بہاری لال نے جو زمین حاصل کرنے کے کام پر خاص طور پر متعین تھے، موقع کا معائنہ کیا اور ایک تحریری رپورٹ لکھ دی کہ دیوار کو فی الحال چھوڑ دینا چاہیے
اس لئے کہ اس حصہ کی اس وقت ضرورت ہوگی جبکہ غسل خانہ لے لیا جائے گا۔ ان کاغذات کو کمیٹی کے روبرو رکھ دیا گیا۔ اس لئے کہ شہر کی ترقی و
تزئین کا کام اسی کمیٹی کے متعلق تھا۔ اس کی ساری کارروائیاں میونسپل بورڈ کے روبرو پیش کر دی گئیں۔ ان دونوں جماعتوں میں مسلمان اصحاب
تھے اور اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ مسلمان ان دونوں امور سے واقف نہیں تھے۔ کہ مسجد کی مشرقی دیوار کا تعلق مسجد سے کچھ بھی نہیں ہے اور یہ کہ عمارت
داو متعدد سڑک کے لئے لیا جائے گا۔ مگر مجھے اس امر سے کچھ تعلق نہیں ہے کہ مضمون مذکور کے متعلق اسلامی پبلک کا کیا خیال تھا۔ یہ امر بالکل بدیہی
ہے کہ مسجد کے متولی جن سے پہلے پہل ہمیں معاملہ طے کرنے کی ضرورت تھی، واقعہ سے پورے طور سے باخبر تھے اور ہمارے پاس کوئی ایسا ریکارڈ موجود
نہیں جس سے یہ ظاہر ہو کہ مجوزہ قبضہ کے خلاف کوئی اعتراض کیا گیا تھا۔
نومبر ۱۹۱۲ء میں میں کانپور گیا اور بذات خود تیل کے مندر کے موقع کو جس کے انہدام کے برخلاف مجھے متعدد احتجاج وصول ہوئے
تھے ملاحظہ کرنے گیا۔ اور لازمی طور پر مسجد سے چند گز کے فاصلہ پر کھڑا ہوا مجھے یاد ہے کہ نہ خود میں نے مسجد کو دیکھا۔ اور نہ کسی نے میری توجہ

سر جیمس مسٹن کے نام متمیز مسلمانوں کا وفد

ہز آنر کا جواب

پنجشنبہ - ۲۱ اگست ۱۹۱۳ء -

مسلمان معززین کا ایک وفد ہز آنر لفٹیننٹ گورنر کی خدمت میں ۱۶ اگست کو بمقام گورنمنٹ ہاؤس (لکھنو) حاضر ہوا - وفد میں

راجہ صاحب محمود آباد ، راجہ صاحب جہانگیر آباد - مولانا عبد الباری ، آنریبل مسٹر عبد الرؤف ، آنریبل مسٹر شاہد حسین ، آنریبل مسٹر رضا

اور منشی احتشام علی شامل تھے -

علی - مسٹر سید نبی اللہ ، مولوی محمد حبیب الرحمان خاں - مسٹر محمد نسیم

آنریبل راجہ صاحب محمود آباد نے ایڈریس کو پڑھ کر سنایا - اور اس اثناء میں وہ بہت متاثر نظر آتے تھے -

ایڈریس کے اختتام پر مسٹر سید نبی اللہ خاں نے کہا کہ میرے خیال عدالت ہائے دیوانی کے روبرو ہمارا بہت ہی اچھا مقدمہ در پیش

ہے -

مسٹر عبد الرؤف نے اس کے بعد یہ کہا کہ ہم یہاں دیوانی یا فوجداری قانون کے مطابق اپنے حقوق پر بحث کرنے نہیں آئے ہیں - اس وفد

کا مقصد یہ ہے کہ ہز آنر کی خدمت میں ایک ایڈریس پیش کیا جائے تاکہ لفٹیننٹ گورنر حال کے واقعات پر قطع نظر کر کے مسلمانوں کے جذبات پر

خیال اور ہمدردانہ دستوں پر غور کریں -

مسٹر رضا علی نے عبد الرؤف کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ میں نکتہ پیش کرنا چاہتا ہوں کہ آیا دالان مسجد کا اصلی اور ضروری جزو ہے یا نہیں

اسلامی شرع میں "ضروری جزو" کے الفاظ نہیں پائے جاتے - بلکہ تمام مسجد یکساں طور پر متبرک و مقدس سمجھی جاتی ہے خواہ وہ غسل خانہ ہو یا حجرہ

یا ممبر - اس لئے مسجد کے کسی حصہ پر قبضہ حاصل نہیں کیا جا سکتا -

راجہ صاحب جہانگیر آباد اور مسٹر شاہد حسین نے کہا کہ ہم سب مرحمت خسروانہ کے خواستگار ہیں -

ہز آنر لفٹیننٹ گورنر نے ایڈریس کا جواب دینے سے پیشتر وفد کی توجہ چند نقشوں کی طرف مبذول کراتے ہوئے کہا کہ ان کے متعلق

اخبارات میں غلط فہمیاں پھیل گئی ہیں - نقشے ہر ممبر کو فرداً فرداً انہوں نے دکھائے -

سر جیمس میسٹن ـــــ کی تقریر

پنجشنبہ ۲۱ اگست ۱۹۱۳ء

حضرات جس طریقہ سے آپ نے میرے سامنے مچھلی بازار کانپور کی مسجد کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے - میں اس کا نہایت گرم

جوشی کے ساتھ شکریہ ادا کرتا ہوں - جو رویہ کہ آپ نے اختیار کیا ہے وہ نمایاں طور پر اس غیر معتدل زبان درازی اور واقعات کی غلط

بیانی کے طریقہ سے بالکل مختلف ہے - جس روش پر کہ پریس کے بعض طبقات نے اس پر بحث کی ہے - میرے لئے یہ امر سخت افسوس کا باعث

اس کی طرف منعطف کی۔ یہ ممبران بورڈ و دیگر عمائدین کانپور میرے ہمراہ تھے۔ اور جہاں تک میرا حافظہ کام کر سکتا ہے، وہاں جس قدر گفت و گو ہوئی، آزادانہ اور عام دلچسپی کی باتوں پر ہوئی۔ با ایں ہمہ کسی نے مسجد کا ذکر تک نہ کیا۔ اور نہ اس کے متعلق کسی قسم کی شکایت کا اظہار کیا۔ مگر ہاں اس کے بعد جب مجھے ممبران بورڈ سے سرکٹ ہاؤس میں ملاقات کرنے کا اتفاق ہوا۔ تو جلسہ برخاست ہونے پر ایک مسلمان ممبر نے مجھ سے سوال پوچھا جس کے صحیح صحیح الفاظ مجھے یاد نہیں، مگر میرا خیال ہے کہ اس نے یہ امر دریافت کیا کہ آیا مندر کو بچا دینے کی صورت میں جب سڑک کے نقشہ میں رد و بدل کی جائے گی تو اس کے سبب کسی مسجد کو تو ضرر نہیں پہنچے گا! بظاہر سڑک پر دو مسجدیں تھیں، ایک اس کنارے پر اور ایک اس کنارے پر۔ مجھے اس بات کی نسبت پہلے کچھ علم نہیں تھا۔ اور ان صاحب کو جواب دینے سے پہلے ممبر صاحب صدر بورڈ سے استصواب کرنا ضروری تھا۔ صاحب موصوف نے جواب دیا کہ اگرچہ مسجدوں میں سے ایک کا غسل خانہ حاصل کرنا کسی صورت میں بھی رک نہیں سکتا۔ مگر سڑک کے نقشہ میں جو تبدیلی ہم نے کی ہے اس سے مسجدوں میں کوئی مزید دست اندازی نہیں کی جائے گی بنائرعلیہ میں نے سوال کرنے والے صاحب کو نفی میں جواب دیا بعد میں جو نقشے مرتب ہوئے، ان سے بوضاحت پایا جاتا تھا کہ مندر کو بچا دینے کی صورت میں مسجد سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا جائے گا۔ صورت حال یہ ہے کہ ایک چوڑی سڑک کو دو تنگ شاخوں میں تقسیم کرنے سے معلوم ہوا کہ ممکن ہے کہ احاطہ مسجد میں جس کا حاصل کیا جانا ابتدائی نقشہ میں قرار پایا تھا۔ کمی واقع ہو۔ پس فیصلہ یہ ہوا کہ نہانے دھونے کی جگہ تو حاصل کی جائے۔ لہٰذا یہ امر کہ مندر کو مسجد کے ایک بڑے حصے کی گرانے سے بچا دیا جانا قرار پایا، غلط ہے۔"

صاحبان! جب پہلے پہل مسجد کے متعلق عمل عبارہ شروع ہوا تو یہ سب امور میرے اور مقامی حکام کے پیش نظر تھے، ان سے ظاہر تھا کہ دراصل کوئی شکایت نہیں تھی۔ اور نہ تو مذہب میں دست اندازی کا شکوہ تھا۔ اور نہ ایک نہایت ضروری تمدنی اصلاح میں رکاوٹ ڈالنے کا منشا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس میں میرا خیال ہے کہ وہ اصحاب جن کا براہ راست مسجد سے تعلق نہ تھا۔ ان تجاویز سے واقف تھے۔ اور مقامی حکام کے ارادہ کو منظور کرتے تھے۔ کہ عمارت کا وہ حصہ جو مشرقی اور شمالی دیوار کے درمیان واقع تھا حاصل کر لیا جائے۔ جس میں نہ تو مسجد میں مداخلت ہونے کا خدشہ تھا۔ اور نہ نمازیوں کو کسی قسم کی دقت پیش آنے کا اندیشہ تھا۔ پس جب اواخر مارچ اور اوائل اپریل میں مجھے کاغذات احتجاج آنے لگے تو میں سخت ششدر و پیچ میں ہوا کہ صورت حالات میں ایسی تبدیلی کیوں کر واقع ہوئی ہے۔ مجھے آپ کے اس اطمینان دلانے سے خوشی ہوئی ہے کہ اس تبدیلی کا باعث کوئی حسد یا بغض نہیں تھا جو ہنود کے مندر بچ جانے پر مسلمانوں میں پیدا ہونا ممکن تھا۔ اگر بعض مسلمان احباب کا دل شکنی کا باعث اوپر کا خیال ہوا ہے تو مجھے درجہ غایت افسوس ہے۔ لیکن اگر غیر متوقع احتجاجات کے ظہور کا یہ سبب نہیں تھا تو آخر کوئی اور ہوگا۔ میرے دل میں اس بات کی یاد تازہ ہی تھی کہ لکھنؤ میں بھی ایک مسجد کی عمارت میں اسی قسم کی خفیف سی تبدیل کی گئی تھی۔ مگر وہاں کے مسلمانوں نے بلا حیل و حجت اسے منظور کیا۔ مجھے تو اس قسم کے بہت سے نظائر یاد ہیں۔ اور آپ کو بھی یاد ہوں گے۔ تو اگر ان حالات کانپور میں جو ایسی ہی تمدنی اصلاح تجویز ہوئی تو کیا وجہ ہے کہ اس پر اعتراضوں کی بوچھاڑ کی گئی؟ کیا نہانے دھونے کی جگہ مسجد کے اس حصہ میں زیادہ مقدس تھی جو لکھنؤ یا دوسرے مقامات میں دوسری جگہ پر منتقل کیا گیا؟ کیا وضو خانوں سے کوئی خاص مذہبی خیال وابستہ ہے؟

صاحبان! یقین کیجیے کہ اس امر میں میں نے خود ہی کوئی نتیجہ نہیں نکال لیا۔ یہ امر صحیح ہے کہ میں نے علمائے اسلام سے مشورہ نہیں کیا تھا۔ جیسے کہ اب معاملہ کے چھڑ جانے سے کر رہا ہوں۔ اور جس کا جواب کسی نے کچھ اور کسی نے کچھ دیا ہے۔ مگر میں نے بعض مسلمان عمائد سے مشورہ کر لیا تھا۔ جو خود پرانی وضع کے مسلمان ہیں۔ اور اپنے ہم خیال مسلمانوں کے نمائندے ہونے کے باعث پورے طور سے معتبر خیال کیے جاتے ہیں۔ ان حضرات نے

مجھے مطلع کیا کہ وضو خانہ یا استنجہ خانہ ایسا مقدس نہیں جیسے کہ مسجد کی جائے عبادت ہوتی ہے۔ مقامی تحقیقات سے بھی اس امر کی تصدیق ہوئی ا
مسجد کے حصہ متنازعہ میں لوگوں کا جوتی سمیت جانا اسبات کی مزید شہادت ہے۔ میں باوجود ان تمام مخلوں کے جو اس شہادت پر اخبارات
کئے گئے ہیں۔ اس کو معتبر خیال کرتا ہوں۔ اور اگر آپ ٹھنڈے دل سے معاملات پر غور کریں تو قطع نظر اس قسم کے اصطلاحی نکات کے کہ مسجد کے
ایک حصہ میں جوتی سمیت جاسکتے ہیں اور ایک حصہ میں انہیں اتارنا ہوتا ہے۔
آپ بھی میری رائے سے اتفاق کریں گے۔ اوسط درجہ کا انسان تو یہی خیال کرے گا کہ ان دونوں حصوں میں بہ اعتبار تقدس فرق ہے
جو تقدس ایک حصہ کو حاصل ہے وہ دوسرے کو نہیں۔ قطع نظر شرعی موشگافیوں کے فہم عامہ میں تو یہی بات آتی ہے اور حکام نے بھی نہانے دھو
کی جگہ کی نسبت یہی خیال ملحوظ رکھا ہے۔ آپ کی عرضداشت سے پایا جاتا ہے کہ گورنمنٹ کے کسی الفاظ نے مسلمانوں کی اتنی دل شکنی نہیں
کی جتنی کہ اس فقرہ نے کہ نہانے دھونے کی جگہ اور دیگر حصص کی پاکیزگی میں فرق ہے۔
میں اس سے بڑھ کر اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ یہ بیان محض نیک نیتی پر مبنی تھا۔ اور اس کی تائید طرز قدیم کے بہترے مسلمان بزرگوں س
کی تھی۔ اور اس سے ہرگز یہ مقصود نہیں تھا۔ کہ آپ کے مذہبی جذبات کو صدمہ پہنچایا جائے۔ آپ میں سے اکثر حضرات میری خصوصیات
سے واقف ہیں اور بنابریں یہ وثوق ہے کہ آپ میری بات پر یقین کریں گے۔
میں اس درخواست کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جس پر آپ کا میموریل ختم ہوا ہے اور وہ درخواست یہ ہے کہ منہدم شدہ غسلخانہ
دوبارہ تعمیر کا حکم دے دوں۔ جیسا کہ میں نے آپ سے کہا ہے۔ میں ہمیشہ مستعد رہا ہوں اور اب بھی مستعد ہوں کہ مسجد کو شمال کی طرف
ایک ٹکڑا زمین کا پوری قانونی کاروائی اور وقت کے اصول کے مطابق دے دوں۔ اور یہ ٹکڑا غسل خانہ کے لئے کافی سے زیادہ ہوگا۔ س
ہی اس کے میں اس رقبہ پر غسل خانہ تعمیر بھی کرادوں، یا متولیوں کو اس تعمیر کے لئے کافی ذیادہ روپیہ دے دوں۔
میری طرف سے یہ پیش کش پہلے سے ہو چکی ہے۔ اور اب بھی موجود ہے۔ اگر آپ کی درخواست کا یہ منشا ہے کہ غسل خانہ اس سر تہ
تعمیر کیا جائے جو حاصل کرلی گئی ہے، تو مسئلہ کی حیثیت بالکل بدل جاتی ہے۔ اگر ہم چند ہفتہ پہلے ملے ہوتے اور معاملہ پر ایسے ہی بح
کرتے جیسے کہ آج کی ہے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ کیا نتیجہ ہوتا۔ لیکن صورت معاملہ ۱۳ر اگست کے واقعہ کے بعد بالکل دور ہو جاتی ہے
اور میں افسوس کرتا ہوں کہ اس قسم کا کوئی حکم دینا میرے لئے ناممکن ہے۔ افسوس کا اظہار میں نے از راہ تصنع نہیں کیا ہے۔ اس
میں آج اپنے پاس بہت بڑے دوستوں کو بیٹھا دیکھتا ہوں۔ جن ہندوستانی کی رائے کی میں بڑی قدر کرتا ہوں۔ اور جن کی نصیحتو
میں دس میں سے نو بجا مان لونگا۔ لیکن اس معاملہ میں مجھے وسیع انتظامی امور کا لحاظ کرنا ہے جو قانون اور ضابطہ کے قیام کے لئے ضرور ہیں
اور جن کی فروگذاشت کو بدنظمی اور اندھیر کہیں گے۔ آپ لوگوں کی طرح میں بھی ۱۳ر اگست کے حادثہ پر بحث نہیں کرسکتا۔ جو عدالت کے
قابل ہے۔ اگرچہ میں بہت صداقت کے ساتھ آپ ہی لوگوں کی طرح جانوں کے تلف ہونے اور مصیبتوں پر افسوس کرتا ہوں۔ لیکن بغیر اس کے
تحقیقات کے نتائج پر کہ پیشین گوئی کی جائے یہ میرا فرض ہے کہ اس اصول کو مدنظر رکھوں کہ گورنمنٹ زور و زبردستی کی باتوں کو نہیں
سکتی۔ یا ان کے ماننے کو ظاہر نہیں کرسکتی۔
صاحبان! اب میں آپ سے امداد طلب کرتا ہوں آپ پر روشن ہے کہ حکومت برطانیہ دیدہ دانستہ تمہاری مقدس عمارات کی
نہیں کرنا چاہتی۔ اس کے برخلاف آپ کو معلوم ہے کہ گورنمنٹ نے آپ کی ان عمارات مذہبی کو واگذار کیا ہے۔ اور آپ کے ان

کے لئے تحفظ کا انتظام فرمایا ہے، جنہیں آپ اپنا سرمایۂ ناز تصور کرتے ہیں۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس قسم کا خفیف رد و بدل جیسا کانپور میں ہوا ہے۔ رعیت کی مدنی ضروریات کی بنا پر ملک کے اکثر حصص میں مسلمان پبلک کی منظوری سے وقوع میں آتا رہتا ہے۔ اس سے ہرگز ہمارا مطلب نہیں ہوتا کہ آپ کی شریعت کی توہین کی جائے۔ بلکہ ان کا مطلب محض رفاہ عام ہوتا ہے۔ اس صوبہ کے مختلف حصوں میں اس قسم کے اکثر نظائر پائے جاتے ہیں۔ جن کا تذکرہ تضیع اوقات ہوگا۔ مگر آپ اور میں بخوبی جانتے ہیں کہ ہماری نشست گاہ سے دو میل کے اندر ایسی نظیر موجود ہے۔ عامہ ناس کے سیرت میں ایسا غیر معمولی انقلاب عظیم کیسے آیا ہے۔ اور کیا وجہ ہے کہ وہی انتظام جسے چند ماہ پیشتر لکھنؤ میں بلا مخالفت احدی پبلک نے منظور کیا ہے۔ کانپور میں اعتراض قرار دیا جاتا ہے؟

امید ہے کہ ان حالات پر غور کرتے ہوئے جو آج صبح میں نے آپ سے بیان کئے ہیں آپ مجھ سے اس امر میں اتفاق کریں گے کہ تصفیہ نامرضیہ کانپور میں مبالغہ، اور غلط فہمی سے کام لیا گیا ہے کہ گورنمنٹ کے فعل سے کروڑہا مسلمان رعایا کی مذہبی محسوسات کو صدمہ پہنچا ہے مگر وہ کیا چیز ہے جس نے آپ کے مذہبی احساس کو ضرر پہنچایا ہے۔ کیا اس کی وجہ گورنمنٹ کا کوئی فعل ہے؟ یا گورنمنٹ کے افعال اور ارادوں کی تمسخر انگیز ترجمانی؟ آپ درخواست کرتے ہیں کہ ہم روز افزوں بے چینی کو گھٹانے کی کوشش کریں۔ اور مسلمانوں کے زخم دل پر مرہم لگائیں اس بارے میں جو کچھ معقول بات بھی مجھ سے ہو سکے گی مجھے اس کے کرنے سے دریغ نہیں ہوگا۔ مگر آپ ہیں اس کام کی اہلیت اور طاقت مجھ سے بدرجہا بڑھ کر ہے۔ یہ امر آپ کے احاطہ استطاعت کے اندر ہے کہ ان مختلف افواہ و غلط بیانیوں کی تردید کریں جو ملک کے اطراف وجوانب میں پھیل رہی ہیں۔ آپ کو چاہیئے کہ آپ مسلمان پبلک کو صحیح صحیح معاملات سے آگاہ کریں۔ اور ان کو ہدایت کریں کہ اس گورنمنٹ پر اعتماد کرے جس کے قرین دل بجز اس کے کچھ نہیں رہا کہ آپ ترقی اور بہبودی کے وسائل اختیار کرتے رہیں۔

سر مسٹن کا جواب

انہدام مسجد مچھلی بازار کے حق بجانب ہونے کے دلایل بیان کرنے کے بعد ہز آنر نے سب سے زیادہ جس بات پر زور دیا ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ ۳ اگست کے واقعہ کے بعد صورت معاملہ بالکل بدل گئی ہے اس لیے مسلمانوں کی کوئی درخواست منظور نہیں ہوسکتی۔ یہ ا[...] صورت معاملہ کیوں اور کیسے بدل گئی ہے۔ اس کے متعلق جہاں تک ہز آنر کی تقریر سے مترشح ہوتا ہے یہ ہے کہ اگر اس واقعہ کے بعد گورنمنٹ نے اپنا حکم واپس لیا تو اس کی کمزوری سمجھی جائے گی۔ غالباً یہ سبق ہز آنر کو تقسیم بنگلہ کی تنسیخ کے بعد حاصل ہوا ہے۔ مگر ہم کو افسوس ہے کہ ہز آنر مسلمانوں کو اس واقعہ سے کچھ اور سبق دے رہے ہیں۔

یہ کہنا کہ گورنمنٹ بزور کسی بات کو نہیں مان سکتی واقعات کو چھپانا ہے۔ ہم نے ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو دیکھا کہ کس طرح بعض اوقا[ت] بڑے سے بڑے حکام بھی زور کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ ان چند نفوس میں غالباً ہز آنر بھی ہوں گے جن کو دربار کے اہم تغیرات کا علم پہلے سے تھا۔ مگر معلوم نہیں ہز آنر کی یہ پالیسی کہ "گورنمنٹ کو کسی بات کو بزور نہیں ماننا چاہیے" اس وقت کہاں سوئے تھے؟ یا ہم یہ سمجھیں کہ جس زور کو گورنمنٹ نہیں تسلیم کرتی وہ اور قسم کا زور ہے۔ اور جس زور کو وہ تسلیم کرتی ہے وہ اور طرح کا ہے؟ ہز آنر کو معلوم رہنا چاہیے کہ اس قسم کی ابلہ فریب ا[...] طفلانہ دلایل کے دام سے مدت ہوئی کہ ہندوستان آزاد ہو چکا۔ اور حکومت برطانیہ کی لائی ہوئی روشنی میں وہ اب ان کی حقیقت کو بخو[بی] دیکھ لیتا ہے۔

ہز آنر کا ارشاد ہے کہ اگر چند ہفتے پہلے معاملہ ان کے سامنے پیش کیا جاتا تو وہ نہیں کہہ سکتے کہ کیا جواب ملتا"۔ جس کے معنی یہ ہیں ک[ہ] اس وقت موافق جواب کے ملنے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ مگر کون سی وجہ اب مانع ہے؟ غالباً یہ ہوگی کہ چونکہ مسلمانوں کی ایک تعداد کثیر کا خو[ن] پیدا ہو چکا ہے۔ لہذا اب ان کے دعووں کو تسلیم کرنے میں ایک سفاک کی گردن بھی بیچ میں حائل ہے۔ جس کو بچانا ہز آنر اپنا فرض سمجھتے ہی[ں] ورنہ گورنمنٹ یا کسی حاکم کی کمزوری کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ کہ وہ انصاف سے صرف اس وجہ سے گریز کرنا چاہتا ہے اس کے اقتدار کے کم ہو جانے کا خوف ہے؟ انصاف اور قانون کا اقتدار ہمیشہ اس کے برتنے سے بڑھتا ہے۔ البتہ شخصی اقتدار ممکن [ہے] کم ہو جائے۔ اور یہاں ہز آنر کو شخصی اور قومی اعتبار کا شاید زیادہ لحاظ ہو بہ مقابلہ قانونی اقتدار کے؟

مسلمانوں کے لئے یہ کہنا کہ وہ کسی بات کو بزور منوانا چاہتے ہیں، ایک صریح بہتان ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ کون سی مسلح پولیس یا ہتھیار بند سوار ان کے ساتھ ہیں جن کے بھروسے پر ڈیپوٹیشن کے ارکان ہز آنر کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ اور جن کے مقابلے میں سی[نہ] اکڑے ہو جانا۔ ہز آنر نے اپنے لئے فرض سمجھا۔ غریب مسلمانوں کے پاس اس سے زیادہ اور کیا زور ہے کہ :۔

عبث سعی کئے تو مر رہئے میر
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

اور انہوں نے یہ کر دکھایا۔ اگر ہز آنر کا اشارہ اسی زور اور زبردستی کی طرف ہے جس کے مقابلے میں حکومت برطانیہ کے نما[...] کی حیثیت سے ۲۷ سوار اور پیدل فوج اور لکھو کھا پولیس لا کھڑی کرنا اپنے اقتدار کے لئے ضروری سمجھتے ہیں تو ہم نہیں کہہ سکتے ک[ہ]

مسلمانوں کے نزدیک احاطہ مسجد کا ہر حصہ ویسا ہی محترم ہے جیسا کہ ممبر اور اس کی ایک ایک اینٹ کو وہ ایسے ہی عزیز رکھتے ہیں جیسے اپنے دل وجگر کو۔ ہز آنر اگر اس کے مقر ہیں کہ ان کے حکم سے لکھنؤ کی کسی مسجد کا حصہ منہدم کیا گیا۔ اور وہ مسجد عام مسلمانوں کی ملکیت تھی تو ہز آنر کو واضح ہونا چاہئے کہ ان کا یہ فعل اس بات کی شہادت میں پیش کیا جائے گا کہ وہ مسلمانوں کی دل آزاری کے درپے ہیں۔ اور اس پر جداگانہ باز پرس کی جائے گی۔ اس لئے کہ ایک خلاف قانون فعل کی سند دوسرے خلاف قانون فعل سے نہیں دی جا سکتی۔

وفد کی درخواست نامنظور کرنے میں ہز آنر نے سب سے زبردست دلیل جو اپنے نزدیک کہی ہے وہ یہ ہے کہ مسجد کی دوبارہ تعمیر کرا دینے سے گورنمنٹ کی کمزوری ثابت ہوگی۔ شاید انہیں دانا دل لارڈ مارلی بالقابہ کا یہ قول یاد نہیں ہے کہ سچی طاقت اس بات میں نہیں کہ انسان اپنی کمزوری پر ہمیشہ پردہ ڈالتا رہے۔ اور ڈرتا رہے کہ لوگوں پر اس کی غلطی عیاں نہ ہو جائے۔ ہندوستان میں تو بے چینی کا یہ علاج تھا جو موجودہ حکومت کے سیاسی طبیب تے کیا۔ مگر اہل آئرلینڈ باوجود اپنی طبعی شورہ پشتی اور عملی قانون شکنی کی حکومت خود اختیاری حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ آب وہوا کا اختلاف یا جغرافیائی حیثیت ہو۔ یا یہ ہو کہ ہز آنر کے وطن سے زیادہ قریب رہتے ہیں۔؟

وفد کو دل شکن جواب دینے کے بعد ستم ظریف سر جیمس نے مسلمانوں سے الٹی یہ درخواست کی کہ وہ اس قدر بے چینی کو رفع کرنے اور شورش کو دبانے میں گورنمنٹ کی مدد کے لئے تیار ہیں۔ مگر اس ہنگامہ کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں ہے جس پر ہز آنر جیسے اعلیٰ عہدہ دار اپنی بزم حکومت کی رونق موقوف سمجھتے ہوں۔ ہز آنر خود تسلیم کرتے ہیں کہ وفد میں ان کے بعض ایسے دوست موجود تھے جن دس باتوں میں نو کو وہ تسلیم کرنے کے لئے تیار تھے۔ کیا اس سے نہیں ثابت ہوتا کہ ہندوستان کے ہر طبقہ کے مسلمان اس مسجد کے معاملہ میں متفق ہیں۔ اور خوشی کا مقام ہے کہ بعض ان اصحاب نے بھی جن کے متعلق عام طور پر خوشامد پسندی اور ہاں میں ہاں ملانے کا الزام لگایا جاتا تھا۔ اس موقع پر اخلاقی جرأت سے کام لے کر اپنے فرض کو سمجھا۔ اور بالآخر وہ دسویں بات کہہ ہی ڈالی جس کے ماننے کے لئے ہز آنر بھی تیار نہیں ہو سکتے۔ ایسی حالت میں معلوم نہیں سر جیمس کس توقع پر مسلمانوں سے اس بات کے خواہاں ہیں کہ وہ ان کے ہم آہنگ ہوں۔

تم اپنی خو نہ چھوڑو گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

کب تک قائم رہے گا ؟

اے زبردست زیر دست آزار
گرم تا کے بماند ایں بازار ؟

ہز آنر کے لئے مناسب ہے کہ ضد اور ہٹ سے باز آجائیں ۔ انصاف کا خون نہ کریں ۔ اور یہ جاننے کی کوشش کریں کہ رعایا ان کے افعال کو کس نظر سے دیکھ رہی ہے ؟

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

ہز آنر کی پوری تقریر میں جتنے دلائل انہدام جزو مسجد کے بجا ہونے پر پیش کئے گئے ہیں ان میں سے (اگر الہ آباد کے سرکاری ساز کی آواز کو ہم باور کریں تو) دو دلیلیں بہت زبردست خیال کی جاتی ہیں ۔

۱ ۔ یہ کہ لکھنؤ میں کسی گمنام مسجد کا ایک حصہ اسی طور پر منہدم کیا گیا مگر کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا ۔

۲ ۔ یہ کہ غسل خانہ اور وضو خانہ اس قدر متبرک نہیں ہیں جتنا کہ مسجد کے اور حصے ۔ لکھنؤ کی مسجد کے انہدام کے متعلق تو اس قدر کہہ دینا کافی ہوگا ۔ کہ معلوم نہیں وہ کونسی مسجد تھی اور کیسی مسجد تھی ۔ جس کے دیگر جزو نامعلوم کو منہدم کر کے ہز آنر مساجد کے انہدام کے لئے حجت قائم کرتے ہیں غالباً وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ مساجد کے احترام کے تسلیم کر لینے کے بعد یہ کہنا کہ حکام نے اکثر مسجدوں کو ڈھا دیا ۔ اور کسی نے دم نہیں مارا ان حکام کی بے پرواہی اور زبردستی اور رعایا کی بے بسی اور مجبوری کو ثابت کرتا ہے ۔

ایک لکھنؤ کیا بلکہ ہمارا خیال ہے کہ سینکڑوں مقامات پر مساجد کی اس قسم کی بے حرمتی روا رکھی گئی ہوگی ۔ اور بے زبان رعایا نے بندوقوں اور سنگینوں کے خوف سے دم نہ مارا ہوگا ۔

لکھنؤ یا کسی اور جگہ پر کسی مسجد یا جزو مسجد کو منہدم کر دینا اور اسے سند میں پیش کرنا ایسا ہی ہے جیسے ایک قاتل اپنی بریت میں یہ دلیل پیش کرے کہ وہ اس سے پہلے قتل کا مرتکب ہو چکا ہے ۔ اور کسی نے اس کی گرفت نہیں کی ۔ ہم نہیں سمجھتے کہ سیاست برطانیہ کے حامی مرجیمس مینسٹن اس قسم کے دلایل کو پیش کر کے حکومت کے کس پہلو کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں ۔ اور اس سے کہاں تک ان کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے ۔

دوسری بحث تقدس کے مدارج کے متعلق ہے جس کی بابت شاید ہز آنر یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر ایک خط ممبر سے صحن مسجد میں ہوتا ہوا دروازہ اور سیڑھیوں تک کھینچا جائے تو جن حصص میں سے یہ خط گذرے گا تو وہ بہ ترتیب درجہ تقدس سے گرتے جائیں گے ۔ حتیٰ کہ جب وہ خط وضو خانہ اور غسل خانہ تک پہنچ جائے گا تو اس کا احترام اتنا کم ہو جائے گا ۔ کہ جس وقت ہز آنر چاہیں سم اور ٹائلر جیسے لوگوں کی شہادت اور اپنے اجتہاد پر محض ایک سڑک کی زیبائش کے لئے اسے منہدم کر سکتے ہیں ۔

جس سائنٹفک اصول پر ہز آنر نے تقدس کا معیار قائم کرنا چاہا ہے وہ فلسفیانہ حیثیت سے ضرور قابل داد ہے اور ہز آنر کے مفید مطلب بھی ہے ۔ مگر افسوس ہے کہ "جاہل" مسلمان تعلیمی حیثیت سے ابھی اس رتبہ پر نہیں پہنچے ہیں کہ خدا کے بنائے ہوئے قانون کے مقابلہ میں ہز آنر کے ایجاد کردہ معیار تقدس کے طریقے کو تسلیم کر لیں ۔ کاش کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے مقابلہ اس اصول کو برتنے کی بجائے ہز آنر یورپ کے کسی اکیڈمی کے سامنے یہ فلسفیانہ طریق استخراج تقدس پیش کرتے تو زیادہ داد پاتے ۔

کانپوری شہید کے گھر میں "پہلی رات"

(شنبہ ۲۳۔ اگست ۱۹۱۳ء)

(نوشتہ مولانا خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی)

کانپور کے اسٹیشن کے پلیٹ فارم بنچ پر دلی کا آستانہ فقیر مغرب سے کچھ پہلے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ یہ وہ دن تھا جب کہ کانپور میں ہولناک خون ریزی ہو چکی تھی اور جب کہ الہ آباد سے دہلی جاتے وقت یہ فقیر بھی چند گھنٹے کے لیے کانپور ٹھہر گیا تھا۔ اور خون ریزی کے بعد کانپور کے بازاروں میں ایک گشت لگا کر اس وقت اسٹیشن پر آیا تھا۔ ریفرشمنٹ روم میں بکثرت یورپین عورت مرد بیٹھے ہوئے تھے اور پلیٹ فارم کے قلیوں کو دیکھ رہے تھے جو ایک جمگھٹ بنائے بیٹھے کچھ کانا پھوسی کر رہے تھے۔

ایک منظر کو دیکھ کر میں نے مغرب کی طرف نظر اٹھائی، جہاں سورج ڈوب رہا تھا اور لرزتی ہوئی شعاؤں کا ہاتھ بڑھا کر آنے والی رات سے مصافحہ کر رہا تھا۔ اس نظارہ کو جسم کی آنکھوں نے دیکھ کر دل سے کہا تو بھی دیکھ، دل اس وقت خود فراموش تھا۔ اس کے کان رات کی آخری باتیں سننے میں مصروف تھے۔ دن نے کہا۔ پیاری کلو۔ میں جاتا ہوں اور دنیا کا چارج تجھ کو دیتا ہوں۔ رات بولی ڈیر سن خدا حافظ جاؤ۔ مگر حساب کا پرچہ دیتے جاؤ تاکہ میں خدا کے بندوں کے اعمال کا جائزہ لے سکوں۔

دن سکرات کے عالم میں موت کی ہچکیاں لے رہا تھا۔ اس کے منہ سے فقط اتنا نکلا، اندھیری رات، آج سفید آدمیوں کے اعمال تیری صورت سے زیادہ کالے ہیں تو مجھ سے اعمال نامے نہ مانگ اور کانپوری مظلوموں کے گھروں میں جا جہاں بے قرار جانیں تیری راہ دیکھتی ہوں گی۔ بیوہ عورتیں اکیلی جن کے شوہر مسجد کے سامنے تیغ ستم سے ہلاک کر دئے گئے۔ یتیم بچے باپ کے انتظار میں رو رہے ہوں گے۔ تو جا اور ان سب کو آغوش شفقت میں لے۔

ان کی دلخراش وصیت سنکر رات نے دنیا کی طرف منہ موڑا، اور پہلے تاریکی برسانے والی آنکھوں سے ایک سکوت حیرت کی نگاہ کائنات پر ڈالی۔ جونہی میں نے نماز مغرب کی سنتوں کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے رات نے جھک کر میرے قدموں پر رکھ دیا۔ سیاہ برقع والی نامحرم کے سر سے میرے پاؤں نے پوچھا تجھ کو کس کی طلب ہے۔ یہ چو کھٹ ظلمات وانوار کے لیے نہیں ہے تو اور کہیں جا۔ اور مجھ کو ساڑھے سات بجے کی ایکسپریس میں سوار ہونے دے جو دہلی جاتی ہے۔

رات نے اپنے دائیں بازو کا آنچل اٹھایا اور اپنی دھن سیاہ فام کو میرے کانوں کے پاس لاکر کہا، ذلیل اور ادا نیشی کی آبرو نہیں ہے کہ جسد خاکی کا مقید بستر لیں دامن چھڑانے میں کانپوری شہداء کے گھروں میں سے کہ چلوں گی اور تم کو چلنا ہوگا۔

Edited by Afzal Ipbal

This book was originally entitled Islam : Kingdom of God by the Maulana nd was to be finished in four volumes. But unfortunately he had never had the me to complete the work. the book now presented comprises the first volume he nished and is mainly taken up with a detailed explanation of the author's religious ntecedents and his attitude towards Islamic Theology. The incomplete second olume forms an Appendix to this book.

SELECT WRITINGS AND SPEECHES OF MAULANA MOHAMED ALI

Edited by Afzal Iqbal

These writings and speeches' are expression of a life time's convictions, and the reader turns the pages he will discover that Mohamed Ali has felt every ing that he has described and has been burnt by every flame that he has kindled.

The first volume contains nine articles and one speech of the Maulana along th a facsimile of a letter to Mir Syed Mahfuz Ali Badayoni. The volume ends ith a memorable article : CHOICE OF THE TURKS published in the Comrade 1914. The Govt. of India not only confiscated the issue of the Comrade contai- ng this' objectionable' article, but also forfeited the security of the Prees and nt the Mulana to confinement.

"........ I want to go back to my country with the substance of freedom in my nd and if you do not give us fredom in india, you will have to give me a grave re "

This is an extract from a speech delivered by the late Maulana Mohamed Ali ew days before his death in London. It precisely sums up the political faith of most dynamic personality India has produced.

What he uttered was no empty phrase -- he had never uttered one. The tish Government did not give freedom to India but Mohamed Ali won a grave a free country. He was buried in Jerusalem in the place of the Prophets. He e his life for India but denied her his body.

The second volume contains seven speeches and eight articles which are more portant than those of the first volume, for these cover a period of political nax in the career of the Maulana.

It closes with his historic' Last Letter' to the Prime Minister of England two s before his death. The letter was dictated in absolute defiance of the doctors represents Mohamed Ali's last desperate bid to find a solution of du - Muslim Problem.

Two volumes : vol. I, Rs· 8/00 vol. II, Rs. 12/00

Sh. MUHAMMAD ASHRAF
Kashmiri Bazar Lahore

نزر عقیدت

K.B. Josephe & Co., Ltd

کے۔ بی جوزف اینڈ کو لمیٹڈ

۷۸ - انارکلی لاہور

Phone No. 65828

78 - Anarkali Lahore

میں نے کہا اور یہ بدن جس کو لوگ حسن نظامی کہتے ہیں؟ رات سے ایک لیاقت ...
...س ہٹا کر دہلی بھیج دو۔
ادھر نیچے کرتے۔ لمبے بالوں والا مجوزہ ریل کی کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا اور لال پگڑی پر طلائی طرے لگانے والے چار
چار تھانہ داروں کی شکی نگاہوں میں کھٹک رہا تھا۔
ادھر شب تو خیز کے ہمراہی تھے جو غریب چھپروں میں جھانک جھانک کر مظلوموں کی آہ و بکا سن رہے تھے
ادھر ریل روانہ ہو گئی اور پولیس کے دستے گھورتے کے گھورتے رہ گئے ادھر پھر اپنی میزبان رات کے ہمراہ ایک گھر
میں داخل ہوا۔ جہاں چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ اور دو عورتیں ٹوٹے ہوئے بورے پر بیٹھی تھیں ان میں ایک بڑھیا تھی اور ایک جوان
گر دونوں متفکر اور سراسیمہ معلوم ہوتی تھیں۔ دروازے کی آہٹ پر کان لگے ہوئے تھے جہاں ذرا کھٹکا ہوا۔ اور بڑھیا نے کہا۔ کی
بیٹا حسن۔ مگر کوئی جواب نہ دیتا تھا۔ آخر ایک دفعہ دروازے میں کوئی شخص دو بچوں کا ہاتھ پکڑے ہوئے داخل ہوا اور بولا۔ لو یہ
تمہارے حوالے بڑی کوشش اور پوچھ گچھ کے بعد اٹھا تو معلوم ہوا کہ میاں حسن مار ڈالے گئے۔ مگر لاش کا پتہ نہ چلا۔ کوئی کہتا ہے
سینکڑوں آدمی مرے ہیں اور گولی چلانے والوں نے بدنامی کے ڈر سے لاشیں دریا میں پھینک دی ہیں فقط پندرہ سولہ ک
مرنا ظاہر کیا ہے۔ کوئی اس کے خلاف کہتا ہے غرض ہم نے تو اپنے مقدار کے موافق بہتیرے جتن کر لئے مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ ایک
صاحب گھوڑے پہ سوار جا رہا تھا۔ میں نے اس کو آواز دی ذرا ٹھہرنا۔ اس نے گھوڑا روک لیا میں نے کہا یہ دو بچے ہیں ان
باپ آج کی لڑائی میں مارا گیا ہے۔ اس کی لاش مل جانی چاہیے۔ صاحب نے آگے بڑھ کر میرے ایک کوڑا مارا اور کہا
جاؤ کتے کے موافق آدمی۔ وہ کوڑا میرے تو لگا نہیں۔ ان غریب بچوں پہ پڑ گیا اور یہ لاوارث بلبلا گئے اور صاحب گھوڑا
کر چل دیا۔

یہ قصہ سنکر بڑھیا عورت نے چھاتی پیٹنی شروع کی اور ہائے ہائے میرا حسن کہہ کر ماتم کرنے لگی۔ جوان عورت نے جو ٹریا
زار زار اور نوحہ و زاری میں شریک ہو گئی۔ بچے یہ سماں دیکھ کر سہمے ہوئے کھڑے تھے۔
آخر ایک بچے نے اپنی دادی کے گلے میں ہاتھ ڈال دئے اور بے اختیار رونے لگا۔ دوسرا اپنی ماں کو چمٹ گیا۔

فریاد

بڑھیا عورت نے فریاد شروع کی۔ الٰہی میرا اکلوتا لال کہاں بچھڑ گیا۔ اب میں اس کی جوان بیوی اور ان چھوٹے چھوٹے
بچوں کو کیوں کر پالوں گی۔ گھر میں تو فجر کے لیے بھی کچھ کھانے کو نہیں ہے۔ جب یہ بچے صبح روٹی مانگیں گے تو میں کیا دوں
خدایا میری فریاد کو پہنچ۔ میری گود کے پالے کی لاش بھی کہیں خارج ہو گئی۔ ہائے آخری وقت صورت دیکھنی بھی نصیب
ہوئی۔ میرا حسن تو بڑا نمازی تھا۔ مرتے وقت اس کو کفن بھی نہ ملا۔ خبر نہیں کن لوگوں نے اس کے مردہ کو اٹھایا ہوگا۔ مگر
شہید تھا اور سنتی ہوں کہ شہید کو کفن و غسل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اچھا تو اے خدا میں تیرا شکرانہ بھیجتی ہوں کہ حسن کو شہا
نصیب ہوئی۔

کانپور کے قیدیوں اور مجروحین کی کیفیت

ہمارے خاص نامہ نگار کے قلم سے

پنجشنبہ ۲۸ اگست ۱۹۱۳ء

آج میں اور شیخ ذکر الرحمن صاحب وکیل سول سرجن کی کوٹھی پر ساڑھے آٹھ بجے صبح پہنچے صاحب بہادر حاضری تناول فرما رہے تھے ہم اطلاع کر کے ان کے کمرہ دفتر میں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تو چھری کانٹے کی آواز آتی رہی۔ اس کے بعد ہم چشم براہ ہوئے کہ صاحب اب آتے ہیں اب آتے ہیں۔ لیکن آنکھیں تو انتظار کرتی ہی رہیں۔ کان بھی آہٹ نہ سن سکے۔ ۲۰ منٹ گذرے۔ آدھ گھنٹہ ہوا۔ پون بھی ختم ہو چکا۔ انتظار مایوسی کی شکل اختیار کرنے لگا۔ ہمارا خیال ہوا کہ صاحب موصوف بھول گئے۔ اور پورا ایک گھنٹہ صبر آزمائی کرائیں گے۔ لیکن گھنٹے کے پورے منٹ نہیں گذرے تھے کہ صاحب موصوف تشریف لائے۔ خندہ رو ہو کر ہاتھ ملایا۔ اور عذر کیا کہ "میں بھول گیا تھا۔ معاف کیجئے۔ آپ کو انتظار بیٹھنا پڑا۔" غرض ہم نے بھی حق تہذیب ادا کرتے ہوئے با دل نخواستہ یہی کہا کہ "کچھ بات نہیں"۔ صاحب موصوف نے سوال کیا کہ "میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں"۔ ہم نے جواب دیا کہ "جیل خانہ میں ملزمین اور شفا خانہ سے مجروحین کو ملنا چاہتے ہیں۔ اور آپ سے اجازت طلب کرتے ہیں"۔ انہوں نے دوبارہ نام دریافت کر کے اجازت نامہ لکھ دیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ "بعض اخباروں میں طریق علاج کی نسبت شکایت درج ہوئی ہے۔ حالانکہ میں بہت غور اور توجہ کے ساتھ علاج کر رہا ہوں"۔ اس پر ہم نے یہ جواب دیا کہ "ہم نے کسی اخبار میں آپ کی شکایت نہیں پڑھی"۔ انہوں نے فرمایا کہ "پنجاب کے کسی پرچہ میں ایسی شکایت چھپی ہے۔ بہر کیف اگر آپ صحیح واقعات معلوم کرنا اور شائع کرنا چاہتے ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں پوری توجہ اور ہمدردی کے ساتھ مریضوں کی دیکھ بھال کر رہا ہوں مجروحین کے علاج پر بہت خرچ ہو رہا ہے۔ اور قیمتی دواؤں کا استعمال کرنے کی وجہ سے خرچ اس قدر ہو رہا ہے کہ میں شفاخانہ کے معمولی بجٹ سے اس کی گنجائش نہیں نکال سکتا۔ اس لئے میں نے صاحب کلکٹر سے رپورٹ کی ہے کہ ان اخراجات کو کسی اور فنڈ سے ادا کرنا چاہئے"۔ ہم نے کہا کہ "ہم بہت مشکور ہیں کہ آپ مجروحین کے علاج معالجہ میں اس قدر دلچسپی لے رہے ہیں ہم اپنے اخباروں میں غلط اور سماعی واقعات درج کرنا نہیں چاہتے۔ صحیح صحیح واقعات تو معلوم کرنے کے لئے جس میں خاص طور پر یہاں بھیجا گیا ہوں۔ ہمارا اصول اور مقصد تو محض حکام و محکوم کے تعلقات کو خوشگوار کرنا ہے۔ ہم ہمیشہ گورنمنٹ اور پبلک کے سامنے راست راست اور بے کم و کاست حالات پیش کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں"۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ "اگر میرا سلوک قابل اطمینان نہ ہوتا تو میں آپ صاحبان سے حالات کو چھپانے کی کوشش کرتا۔ آپ خود مریضوں سے دریافت کر سکتے ہیں"۔ غرض ہم شکریہ ادا کر کے رخصت ہوئے اور صاحب بہادر نے دوبارہ دیر تک بٹھلائے رکھنے کی معذرت چاہی اور ہم نے بھی دوبارہ حق تہذیب ادا کر دیا۔

وہاں سے ہم جیل کا ارادہ کر کے چلے کیونکہ سول سرجن صاحب خود اس وقت شفا خانہ کو تشریف لے جا رہے تھے۔ جیل پر پہنچے تو وہاں خلقت کا ہجوم دروازہ پر کشمکش میں مبتلا تھا۔ محمد عثمان صاحب سوداگر نے ہمارا اجازت نامہ داروغہ صاحب تک پہنچا دیا۔ داروغہ صاحب نے مشکل

دوسرا گھر۔

جب یہ سیر ہو چکی تو دوسری جھونپڑی کو دیکھا۔ وہاں ایک عورت بیمار پڑی تھی۔ گھر میں کوئی نہ تھا۔ اندھیرے میں بیمار
کی آواز نہایت خوفناک ہو رہی تھی۔ وہ کہتی تھی ارے کوئی پانی پلا دے۔ یہ آج اب تک گھر میں نہیں آئے۔ مولوی صاحب کا
وعظ عید گاہ میں کب تک رہے گا۔ میرا حلق تو پیاس کے مارے سوکھا جاتا ہے یکایک پاس کے گھر میں رونے کی آواز آئی
اور غل مچا کہ فلاں فلاں آدمی لڑائی میں مارے گئے اُن میں اس کے خاوند کا نام بھی تھا۔ اس صدا کو سن کر بیمار نے ایک آہ کی اور
بیہوش ہو گئی۔

حافظ احمد اللہ کے گھر میں سحری

ظلمات کی سیر کرتے کرتے سحری کا وقت آگیا آخر اپنے دوست حافظ احمد اللہ کے گھر پہنچے۔ ان کو اس روز گرفتار کیا گیا تھا
خدا نے سب کچھ دیا ہے۔ مال و دولت آل اولاد۔ بوڑھے باپ اور گھر والوں نے ساری رات آنکھوں میں کاٹی تھی سحری
کے وقت اس گھر میں عجب حسرت و یاس تھی۔ در و دیوار سے حافظ احمد اللہ کی صدا آتی تھی۔ گھر والوں کے حلق میں ذرا سے
اٹکتے تھے اور آنسو امڈے چلے آتے تھے مگر سنت رسول کی تعمیل میں سحری کھانی ضرور تھی۔

مولانا آزاد سبحانی کا مدرسہ

ایک نظر مدرسۃ الحیات پر بھی ڈالی۔ کتابیں غمگین نہ تھیں ان میں غیظ تھا۔ طیش تھا۔ اپنے قدر دانوں کی حمایت میں ولولہ تھا
فلسفہ حدیث فقہ کے حروف نے قرآن کے حروف سے کہا تم کیوں نہیں بولتے۔ یہ وقت تمہاری لیڈری کا ہے ہماری ترجمانی
کرو اور جو دل میں ہو کہو۔

قرآنی حروف بولے ہم بہ ظاہر خاموش مگر باطن میں گویا ہیں مسجدوں میں ہمارا ہی چرچا کیا جاتا ہے ہم میں بھی وہ اسٹیم ہے جس
سے مومن کے قلب کی مشین چلتی ہے۔ ہمارا ناظر و منظور نظر آزاد سبحانی اس مسجد کی خاطر قید کیا گیا جس میں ہماری عزت کی جاتی تھی
تو کیا ہم اس کو معاف کریں گے نہیں ہرگز نہیں۔ آج جو بولتے تھے خاموش ہیں۔ اس واسطے ہم کہ خاموش تھے بولیں گے۔ کیونکہ
کہ ہمارا بولنا آثار قیامت میں شامل ہے۔ کاغذ کے لکھے ہوئے حرف کا جوش دیکھ کر میری لوح قلب و ذہن کے حروف بھی تو بولنے
بولنے لگے۔ اور مجھ کو اندیشہ ہوا کہ میری سیر و سیاحت میں رخنہ نہ پڑ جائے اس واسطے میں نے شب کو زہ پشت سے کہا اب
مجھ کو جانے دو۔ رات جس کی زندگی کا چراغ سحری ہو رہا تھا آنکھوں میں آنسو بھر لائی اور بولی کیا انسانوں میں ونتی انسانیت کہ جو کچھ یاسے
لوگوں کی خبر لیں۔ مرنے والوں کے لاچار پس ماندوں کی مدد کریں۔ بے قرار اور مضطرب الحال اشخاص کی فریاد پر متوجہ ہوں۔
میں نے جواب دیا۔ ہاں ان میں درد شناسی ہے۔ وہ اپنے نوالے روک اپنے بھائی کے نوالہ کی فکر کریں گے۔ وہ
اپنے بچوں کا حصہ مظلوم بچوں کو دیں گے۔
مسلمان ہمدرد قوم ہے۔ اس کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نصیحت کی ہے کہ مسلمان بھائی کا دوسرے مسلمان بھائی
پر بہت بڑا حق ہے تب تو ضعیف العمر رات بہت خوش ہوئی اور نور سحر کے سامنے مصافحہ کرتے ہوئے آسمان پر چلی گئی۔
اس وقت میں نے بھی اس وجود کی جانب توجہ کی جس کو حسن نظامی کہا جاتا تھا اور دیکھا کہ صبح چھ بجے وہ دہلی کے پلیٹ فارم پر گاڑی
سے اتر رہا تھا۔

...ندی کا ئیے ساتھ کی ہے ۔ اور ہمیشہ خاص توجہ اور محبت سے ان کی دیکھ بھال کرتے رہتے ہیں ۔ فرماتے ہیں کہ اگر وہ جانبر ہو گیا تو ...

...دماغ صحیح نہ رہے گا ۔ کیونکہ اس کے ماتھے پر متعدد چھرے لگیں ہیں ۔ اور دماغ پر اثر پہنچ چکا ہے ۔ غریب اکثر بے ہوشی کی حالت میں رہتا ...

...کبھی ہوش آتا ہے ۔ تو اماں ! اباجی مجھے کروٹ دو ، پکار اٹھتا ہے ۔ اسی حالت میں کلمہ طیبہ " لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ " کا ورد بھی ...

...لگتا ہے ۔ اس سے دریافت کیا جاتا ہے کہ " چوٹ کیسے لگی تو وہ جواب دیتا ہے کہ " خدا کے راستہ میں مجھے چوٹ لگ گئی " ۔ میرے سامنے ...

...ہوش میں آیا ۔ اور دل ہلا دینے والی آواز میں پکارنے لگا اباجی ! بڑے میاں !! کروٹ لے دو !! ہم اس صدائے درد کی تاب نہ لا ...

...کمرہ سے باہر نکلے تو آگے امید علی مجروح مذکور الصدر کے پاس ڈاکٹر عبد الصمد صاحب اور ایک اور ڈاکٹر کھڑے ہوئے تھے ۔ ڈاکٹر صاحب ...

...اس کی جان بری کی کچھ کم امید ظاہر کی کیونکہ چھرے پھیپھڑے میں بیٹھ گئے ہیں اور سوزش پیدا ہو گئی ہے ۔ پچکاری سے دوا پہنچائی جاتی ہے ۔ خدا ...

...غریب کو صحت دے ۔ شفاخانہ میں ہم کو منظور احمد صاحب سب انسپکٹر نے یہ بھی بتلایا کہ سول سرجن صاحب ہمارے وہاں پہنچنے سے قبل ...

...تشریف لائے تھے ۔ اور حکم دے گئے تھے کہ ایک وکیل صاحب اور ایک نامہ نگار صاحب زخمیوں کو دیکھنے کے لئے آئیں گے ۔ انہیں اچھی طرح سے

زخمیوں کو دکھلا دینا ۔

آخر ڈاکٹر عبد الصمد کی دلی توجہ اور سب انسپکٹر صاحب کی مہربانی کا شکریہ ادا کر کے ہم جیل کی طرف روانہ ہوئے ۔ اکثر لوگ تو باہر نکل آئے ...

...تھے ۔ مگر کچھ چلے آ رہے تھے ۔ سردار گنڈا سنگھ صاحب داروغہ جیل آگے بڑھے ۔ انہوں نے کہا کہ ۹۲ لوگ صبح آ چکے ہیں ۵۱۳ اب آئے ...

...تھے ۔ ان کے علاوہ پانچ آدمی ہم تھے ۔ گویا گیارہ بجے تک چھ سو سے اوپر زائرین ۶۰۷ گرفتاروں کو دیکھنے کے لئے آئے ۔ خیر ہجوم کچھ کم ہوا ...

...تو داروغہ صاحب آدمیوں کو روک کر ہمیں اندر لے گئے ۔ حوالات پر پہنچے اسیر سلاخوں میں سے جھانک رہے تھے ۔ گویا ہمارے منتظر ہی تھے ...

...معانقہ کے لئے ہاتھ نکلنے شروع ہوئے ۔ معانقہ تو ہمارے سینوں کی بجائے سنگین سلاخوں نے کیا ۔ سب سے تسلی و تشفی کی باتیں کرتے ہوئے ...

...مولانا آزاد سبحانی کے قفس کی آہنی تیلیوں کے سامنے پہنچے ۔ انھوں نے نہایت اشتیاق اور خندہ پیشانی کے ساتھ سلاخوں میں ہاتھ نکالے ...

...ہم نے ان بے گناہ ہاتھوں کو بوسہ دیا آنکھوں سے لگایا ۔ مگر دل و جگر کو حسرت ہی رہی کہ حافظ احمد اللہ اور مولانا محمد سعید صاحب کے ...

...ہاتھ چومے ۔ یہ ہر دو صاحبان ان کے رفقا ، بالکل شاداں نظر آتے تھے ۔ ہم نے ان سے عرض کیا کہ قوم کی آنکھیں آپ صاحبوں پر لگی ہوئی ہیں ...

...اس پر انھوں نے نہایت وقار اور استقلال سے فرمایا کہ " اسلام زندہ ہے ۔ اس کے سچے شیدائیوں کی ہمیشہ آزمائشیں ہوتی رہیں ۔ اور اب ...

...امید ہے کہ خدائے کریم اپنے فضل و کرم سے ہمیں اور ہماری قوم کو اس آزمائش میں ثابت قدم رکھے گا " ۔ انھوں نے بار بار شکریہ ادا کر ...

...کے ہمارے شرمندہ کیا ۔ آخر ہم قادر مطلق کی عظمت و جلال کو یاد کرتے ہوئے وہاں سے واپس ہوئے ۔ اور قریب بارہ بجے کے بنگلہ ...

...پر پہنچے ۔

راستہ صاف کرا کر ہمیں اندر تک پہنچا دیا۔ خود لوگوں نے بھی ہمیں دیکھ کر اور اپنے عزیز و مظلوم کا ہمدرد سمجھ کر ہمارے لئے راستہ چھوڑ دیا۔

ہم دروازہ کے اندر پہنچ گئے۔ مگر اتوار کی وجہ سے عام اجازت تھی اور قیدیوں کے عزیز و اقربا، دوست و غمخوار کا ہجوم تھا۔ اس لئے اس قدر بھیڑ بھاڑ میں ہم اپنے قومی قیدیوں سے اچھی طرح سلام و علیک بھی نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہم نے پہلے شفاخانہ میں جا کر مجروحین و بیماروں کی تیمار داری کو ترجیح دی۔

شفاخانہ پہنچے۔ مسٹر عثمان ہمارے ساتھ ہی تھے۔ سب انسپکٹر منظور احمد صاحب کو جو مجروحین پر مامور ہیں پاس دکھلایا گیا۔ نہایت تپاک سے ملے۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ زخمیوں کے ساتھ ہمیشہ مہربانی و مروت کے ساتھ پیش آتے ہیں اور ان پر کسی قسم کی سختی نہیں کرتے۔ خود پولیس کی بندوقوں، بھالوں اور تلواروں کے مضروبین نے ان کی شرافت اور حسن سلوک کی شہادت دی۔ ہم نے ان کا مناسب شکریہ ادا کیا۔ مجروحین میں سب سے پہلے دو غریب برآمدہ میں پڑے ملے۔ ان میں سے ایک کا نام امید علی ہے اس بیچارے کے بہت ضربیں آئی ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ بندوق کے چھروں اور نیزے کی کچوکوں نے اس پر خوب ارمان نکالے ہیں۔ جگہ جگہ سے اس کا جسم چاندماری بنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی حالت زار دیکھ کر دل خود بخود پگھلتا جا رہا تھا۔ اگرچہ اس کا سراپا یاس ڈھیر زبان حال سے بھی کہہ رہا تھا کہ "صورت ببیں حالم مپرس"۔ مگر مزاج پرسی ہمارا فرض تھا۔ اور ہم نے اس سے پوچھا "کہو بھائی کیا حال ہے" کہا شکر ہے۔ اب اچھا ہوں۔ ہم نے تسلی دی اور کہا "گھبراؤ نہیں تم جلدی اچھے ہو جاؤ گے۔ تمہارا علاج غور سے ہو رہا ہے۔ صبر سے کام لو۔ خدا رحم کرے گا۔ ساری قوم کے دل میں تم لوگوں کا درد ہے"۔ اس پر غریب پھوٹ پڑا بدن کانپنے لگا۔ آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔ قریب تھا کہ ہم بھی دو اشکوں کے گنہگار ہو جاتے۔ لیکن دل کو سنبھالا اور اسے "صبر" کہہ کر آگے کو بڑھے۔ دوسری جانب ایک اور صاحب ماتھے پر پٹی باندھے لیٹ رہے تھے۔ ان کی حالت اچھی تھی اور وہ بالکل مطمئن و خوش معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے سب انسپکٹر صاحب مذکور الصدر اور افسران شفاخانہ کی تعریف کی۔ اور ہم اظہار ہمدردی کے بعد اندر مجروح خانہ میں گئے۔ وہاں بوڑھے۔ ادھیڑ اور کم عمر کے زخمی لیٹے ہوئے تھے یا بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک دو چل پھر رہے تھے۔ سب سے بات چیت ہوئی۔ ہم نے سب کو ڈھارس دی۔ اور سب نے ہمارا اور ان سب بزرگان قوم کا اظہار احسان مندی کیا جو کانپور میں ان کی تیمار داری اور ان کی اور ان کے ساتھی قیدیوں کی قانونی پیروی کے لئے اپنا گھر بار اور سکھ چین چھوڑ کر یہاں آئے ہوئے تھے۔ یہ سب لوگ زخمی تھے، مصیبت زدہ تھے۔ بال بچوں سے علیحدہ تھے۔ مقدمہ کے حشر سے جرخواہ مخواہ بلائے بے درماں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑا بے خبر تھے۔ مگر سب کے سب اپنے حال پر صابر و شاکر تھے اور ان کے چہروں پر بے گناہی اور توکل کے آثار نمایاں تھے۔ ان زخمیوں میں دو لڑکوں کی حالت خصوصاً قابل ذکر اور واجب الرحم ہے۔ نور الٰہی اور اشفاق الٰہی۔ دونوں سگے بھائی تیروں اور بندوقوں کے بے پروا اور بے درد حملوں سے لہولہان ہوئے۔ اشفاق کوئی دس بارہ برس کا ہوگا۔ بیچارہ انہی صدموں میں خدا کو پیارا ہوا۔ اور قادر ذو الجلال کے عرش کے نیچے شہیدوں میں جا ملا۔ بڑا بھائی نور الٰہی ابھی بیمار ہے۔ اس کی حالت نازک ہے سول سرجن صاحب نے ملاقات میں اس کا کچھ حال بیان کیا تھا۔ ان کی رائے میں اب اس کے بچ جانے کی کچھ امید ہو چلی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ اگر بعد رہائی بھی وہ عام مظلوموں کی طرح شفاخانہ ہی میں رہا تو اس کی زندگی اغلب ہے۔ ورنہ اس کا بچنا محال ہے۔ آج دوپہر کو ایک ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ مظلوم کی رہائی کا حکم صادر ہو چکا ہے۔ مگر ڈاکٹر عبد الصمد صاحب جنہوں نے ابتداء ہی سے جملہ زخمیوں کی مرہم پٹی نہایت دل سوزی

یہ ہیں ہز آنر کے دلائل جن کی معقولیت منوانے کے لئے بجز مسلح پولیس اور فوج کے جس کی پرورش ہمارے ہی عوض سے کی جاتی ہے یا مسلم آبادی کے، جس کے نزدیک حکام کے راگ کے ساتھ اپنے ساز کا نہ ملانا گناہ کبیرہ ہے۔ اور کوئی نہیں۔ افسوس ہے اس حاکم پر جو اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کو ایسی لغو بے معنی دلیلیں پیش کرے۔ اور آفرین ہے اس قوم پر جس کے بیسیوں افراد ایک ضدی حاکم کے تمود نہادی کی نذر ہو چکے لیکن پھر بھی وہ اپنے حقوق پر نثار ہونے کے لئے تیار ہے۔

حق گویم و حق دانم و در راہِ انا الحق
منصور صفت سر بہ سرِ دار فروشم

ہم ان دلائل پر بالتفصیل بحث کرنا اس موقع پر چنداں ضروری نہیں سمجھتے اس لئے کہ ان کی مضبوطی عدالت دیوانی میں زیادہ خوبی کے ساتھ جانچی جاسکے گی۔ البتہ سب سے زیادہ چیز حیرت و استعجاب میں ڈالنے والی ہے وہ ہز آنر کا جواب ہے جو ایڈریس کے نفس مطلب سے تعلق دیا گیا ہے جس سے ہز آنر کے تدبر، وسعت خیال، سیاست دانی۔ اور ملک داری کا پردہ بالکل فاش ہو جاتا ہے۔ جس "وسیع" انتظامی پالیسی پر ہز آنر نے اس قدر زور دیا ہے۔ اس کے پس پردہ ہندوستانی اور انگریزوں کے خلاف الوان کا لحاظ صاف جھلکتا ہے۔ اور جس اقتدار کو وہ قائم کرنا چاہتے ہیں، ہمیں شبہ ہے کہ اس سے برطانوی سیاست اور قانون کا اقتدار نہیں بلکہ بعض متکبر حکام کی غلط بیانی کا اقتدار قائم رکھنا مقصود ہے۔ سر جیمس نے اپنے قول و فعل سے یہ ثابت کر دیا کہ نہ صرف ان میں حق کی حمایت کی ہمت نہیں بلکہ امن عدل و انصاف کی بنیاد کو بھی متزلزل کرنا چاہتے ہیں جس پر برطانیہ کی عظمت و اقتدار کا دارو مدار ہے۔ ان کو معلوم رہنا چاہئے کہ شجاعت اور جرأت و اولوالعزمی یہ نہیں ہے کہ ایک غیر مسلح جماعت پر بندوقوں اور تیروں سے حملہ کیا جائے۔ اور نہ ہمت و استقلال اس کو کہتے ہیں کہ باوجود اپنی غلطی کا یقین ہو گیا ہو محض اپنی بات اونچی کرنے کے لئے ایک قوم کی دل شکنی کی جائے۔

نہ مرد است آں بہ نزدیک خردمند
کہ با پیلِ دماں پیکار جوید
بلے مرد آں بود از روئے تحقیق
چو در خشم آیدش باطل نگوید

سیاست و اقتدار حکومت اس کا نام نہیں کہ ایک فرد واحد کی غلطی پر سینکڑوں بے گناہ قربان کر دیے جائیں۔ بلکہ سیاست وہ ہے جو رعایا پروری کے لئے قائم کی جائے اور اقتدار حکومت وہ اقتدار ہے جو قانون اور انصاف کے لئے ہو۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے متعلق ایک مشہور قصہ ہے کہ جب انہوں نے ایک صوبہ کے گورنر پر حد شرعی بھی جاری کئے جانے کا حکم فرمایا تو بعض لوگوں نے اس خیال سے کہ مقبوضہ ملک کی غیر مسلم رعایا کے سامنے ایک حاکم کی بدرعبی شاید کوئی برا اثر پیدا کرے۔ آپ کو مشورہ دیا کہ ایسا کرنے سے باز رہیں۔ جس کے جواب میں حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ میں اس اقتدار کو قائم کرنا نہیں چاہتا جو شخصی اور ذاتی ہو۔ بلکہ اس اقتدار کو قائم کرنا چاہتا ہوں جو مذہبی اور قانونی ہو۔ یہ ہے اصلی سیاست اور سچا اقتدار جس کی بنیاد پر قائم کیا ہوا انتظام مملکت باوجود حوادث زمانہ کے تیرہ سو برس تک مستحکم رہا۔ مگر افسوس ہے کہ اسلامی روایات کے علم کے مدعی سر جیمس مسٹن یا تو اس سے بے خبر ہیں یا مصلحت وقت انہیں اس کا پابند ہونے کی اجازت نہیں دیتی۔

سرجیمس مسٹن کی ضد

(۱)

چہارشنبہ ۲۰ / اگست ۱۹۱۳ء

مسلمانوں کے وفد کو ہز آنر نے جو جواب دیا ہے اس پر کلیتاً بحث کرنے سے پہلے ہم ہز آنر کی تقریر کے مختلف حصوں پر مختصراً بحث بیان کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ سب سے پہلے ہز آنر نے وہ دلائل پیش کئے ہیں جن کی بنیاد پر وہ مسجد کے منہدم حصہ کی عظمت کو تسلیم نہیں کرتے ہز آنر نے اس امر پر زور دیا ہے کہ متولیوں کو یہ علم تھا کہ مسجد کا ایک جزو سڑک کے لئے لیا جائے گا۔ لیکن ہم سے خود کریم احمد اور عبدالرحیم متولیان مسجد نے ملکر کہا کہ ان لوگوں کو کوئی علم جزو مسجد کے حاصل کئے جانے کا مارچ ۱۳ء سے پہلے نہیں تھا۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ ہز آنر اور متولیوں میں کون سچا ہے؟ البتہ اتنا ضرور ہے کہ متولی جو کچھ کہتے ہیں اپنے ذاتی علم کی بنیاد پر کہتے ہیں۔ اور ہز آنر سم اور ٹامہلہ کی شہادت پر۔

علاوہ ازیں اسبات پر خواہ مخواہ زور دیا گیا ہے کہ دالان اور وضو خانہ وغیرہ مسجد کے حصے نہیں ہیں۔ جس کے صریح معنی یہ ہیں کہ آئندہ جب کبھی گورنمنٹ چاہے گی تو اس قسم کے حصوں کو مسجد سے علیحدہ کر کے اپنے تصرف میں لے آئے گی۔ اور کیا تعجب ہے کہ آئندہ شاہی دار الحکومت کی زیبائش و آرائش کے لئے ایک کسی غیر مسلم نقیبہ کے نخرے پر جامع مسجد کی سیڑھیاں سڑک کی نذر کر دی جائیں۔ اس لئے کہ وہ مسجد کا "جزو خاص" نہیں ہیں۔

مگر معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کی اہمیت پر نظر ثانی کر کے ہز آنر نے صرف اپنے ہی فتوے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جب معاملات کو زیادہ طول پکڑتے دیکھا تو بعض معتقبوں سے بھی آپ نے تنہائی میں مشورے لئے۔ اور اگرچہ بمصداق "تنہا پیش قاضی روی راضی آئی" ممکن تھا اس قسم کے تمام فتاوے ہز آنر کے حسب دلخواہ ملتے۔ مگر پھر بھی لوگوں نے "مختلف نوعیت" کے جواب دئے۔ اس کی وجہ بجز اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ دنیا میں "مختلف نوعیت" کے لوگ رہتے ہیں ممکن ہے کہ جن معتقبوں کو ہز آنر جیسے فقیہوں کے ہاتھ سے تمغہ اور اسناد ملے ہوں، انہوں نے "اجی حضور" کہنے کی کی پرانی عادت کی بنیاد پر اپنے مذہبی حکم "ہل جزاء الاحسان الا الاحسان" بہانہ قرار دے کر بمصداق "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" ہز آنر کے ساتھ ہاں میں ہاں ملا دی ہے۔ اور بعض نے ہز آنر کے اشارۂ ابرو کو سمجھنے سے قاصر رہ کر یا خوف خدا کی وجہ سے اس فتوے پر صاد کرنے سے انکار کر دیا ہو۔

پھر ہز آنر نے اس سوال کا ذکر کیا ہے جو سڑک کی ترمیم پر کسی مسلمان نے ان سے کیا تھا کہ "مسجد کا کوئی حصہ تو سڑک میں نہ آجائے گا۔" اور اگرچہ بعض وجوہ سے سوال کے الفاظ تو ہز آنر کے حافظے میں نہیں رہے۔ مگر شکر ہے کہ اپنا انکاری جواب یاد تھا۔ مگر واقعات کی رو سے وسیع تدبیر کی پاس داری کی وجہ سے دفتہ رفتہ اس دو حرفی انگریزی لفظ "نو" کی تفسیر کے لئے ہز آنر کو بہت سی نئی مصطلحات مثلاً "جزو خاص" اور "جزو عام" کی مسجد کے مختلف حصص کے لئے وضع کرنے پڑے اور اس تکلیف دہی کا جواب خدا اور اس کے بندوں کے نزدیک وجاہل اور وحشی مسلمانوں اور دور بیٹھ کر فتنہ انگیزی کرنے والوں کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔

کانپور کی عید

(ہمارے خاص نامہ نگار کے قلم سے)

(نوشتہ ۱۴ ستمبر۔ ۱۰ بجے شب)

(مطبوعہ۔ سہ شنبہ۔ ۱۹ ستمبر ۱۹۱۴ء)

مکرم بندہ جناب ایڈیٹر صاحب۔ السلام علیکم۔

آج عید کا دن ہے۔ صبح اٹھتے ہی بتقاضائے بشریت گھر یاد آیا۔ اور دل کچھ ملول سا ہوا۔ لیکن اس وقت میں محسوس کرتا ہوں کہ اچھا ہوا کہ میں گھر کی جیل ہی میں نہ تھا۔ اور ماتم کدہ کانپور میں عید کے دن قومی ماتم کا خاموش نظارہ دیکھ سکا۔ باوجود اتنے دنوں کے قیام اور مختلف طبقوں کے مسلمان بھائیوں سے روزمرہ ملنے جلنے میں اس دلی رنج والم کی تہ کو نہ پہنچ سکا تھا۔ جو کل مجھ پر عیاں ہوا۔ اس قومی احساس کو دیکھ کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ اور مجھے سخت تعجب ہوا کہ ہمارے حکام محکوموں کے زبردست دلی احساسات کی طرف سے کس قدر بے خبر ہیں۔ کم از کم میں تو اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں۔ اور زور کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب ہمارے حکام ہمارے ذرائع معلومات کو زیادہ معتبر بنائیں ورنہ غلط فہمیوں کی جو بنا گو... اور اطاعت کیش مسلمانوں کے رشتہ تعلقات میں پڑ گئی ہے اس پر اور گرہیں دن بدن ایزاد ہوتی رہیں گی۔ میرا خیال ہے کہ واقعات ذیل سے جناب بھی اس نتیجہ پر پہنچیں گے۔ چنانچہ جیسا کہ میں پہلے اپنے کسی پچھلے خط میں گزارش کر چکا ہوں یہاں پر روز عید کے لیے بیرونی پولیس کے منگوانے کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ جہاں تک میں تحقیق کر سکا ہوں ایک ہزار مسلح جوان غیر اضلاع سے منگوائے گئے تھے۔ دوسری طرف یہ کوشش کی جا رہی تھی کہ مسلمان سب کے سب حسب معمول عیدگاہ میں نماز ادا کریں۔ مگر خوف و ہراس اور انتشار کا یہ عالم تھا کہ کوئی کسی کی نہ سنتا تھا۔ جس کسی سے یہ کہا جاتا تھا کہ بھئی سال بھر کے بعد یہ موقع نصیب ہوتا ہے کہ شہر اور مضافات کے مسلمان ایک جگہ جمع ہوں۔ اور گلے ملیں۔ اس شرعی حکمت کو ہاتھ سے نہ دیں تو جواب یہی ملتا تھا۔ صاحب ہماری آنکھوں میں تو تاریخ کی تلواروں اور نیزوں کا سماں پھر رہا ہے۔ ہمارے کانوں میں بندوقوں کے چلنے کی آواز اب تک گونج رہی ہے۔ پولیس کی وہ دار و گیر آج تک ہمارے دلوں پر نقش ہے۔ آپ نے وہ قیامت کا سماں دیکھا نہیں جو ہم کو وعظ کر رہے ہیں۔ اور صاحب اب تو نوبت... پولیس باہر سے ہتھیار بند آگئی ہے۔ ہم عیدگاہ میں گئے اور چلتے چلاتے کسی مسلمان سے پولیس والے کی نوک جھونک ہوئی اور ڈنڈا پڑا اور بس رائفلوں سے گولیاں برسنے لگیں۔ پھر آپ صاحبوں کو اور مقدمہ لڑنا پڑے گا۔ اس کا جواب ہمارے پاس کیا تھا۔ غرض یہی ہوا جس کا ڈر ہمیں اور حکام کو لگا ہوا تھا۔ چونکہ مسٹر لوائز وکیل سرکار، مولانا آزاد سبحانی کے مقدمہ میں ۲۰ اگست کو گواہ پیش نہ کر سکے تھے۔ اور مقدمہ کی پیشی ۱۵ ستمبر کی ڈال دی گئی تھی اس لئے مسٹر مظہر الحق کو مجبوراً ٹھہرنا پڑا۔ چنانچہ میں بھی ان کے ہمرکاب ایک چھوٹی سی مسجد میں جو دولارے کی مسجد کے نام سے موسوم ہے۔ دوگانہ عید ادا کرنے گیا۔ بنگلہ سے مسجد تک ایک سناٹے کا عالم تھا۔ اتنا بڑا شہر اور عید۔ وعید بھی عید الفطر جو تیس روزہ کے بعد نصیب ہو) کا دن مگر اکے دکے آدمیوں کے سوا سڑکوں پر کوئی مجمع نہیں دکھائی دیا۔ بڑی بڑی سڑکیں تو کسی نقش پا کی بھی مشتاق احسان نہ معلوم ہوتی تھیں۔ نہ گاڑی نہ یکہ۔ نہ کوئی دکان نہ کوئی میلہ ٹھیلہ کا سامان۔ غرض ایک ہو کا عالم تھا۔ البتہ پولیس ضرور جگہ جگہ اپنے فرض منصبی کو ادا کرتے ہوئے نظر پڑ جاتی تھی۔ اس عالم میں ہم بھی...

لیے ہوئے اس "شہر خموشاں" کی شاہراہوں سے (خاکم بدہن خدا اسلام اور مسلمانوں کو ہمیشہ زندہ سلامت رکھے) ہوتے ہوئے تنگ گلیوں
پہنچے خیال تھا کہ گھروں سے نو بچوں کی چہل پہل کی آوازیں سننے میں آئیں گی۔ معصوم ننھے بچوں کی جن کے صدقہ سے عید عید ہوتی ہے، خوش خوش شکلیں
اچھی اچھی پوشاکیں نظر آئیں گی۔ مگر آہ! مچھلی بازار کی مسجد نے ان کو بھی "کشتگان معرکۂ کانپور" کا نوحہ گر بنا رکھا تھا۔ جو بچے ہمیں نظر پڑتے ان کے
چہرے اداس، کپڑے میلے، سراپا یاس و حسرت کی تصویر بنی ہوئے تھے۔ غرض مسجد کی حدود میں پہنچے۔ مسجد کے باہر تک راستہ پر نمازی صف باندھے
بیٹھے ہوئے تھے۔ آس پاس کی چھتیں بھی آدمیوں سے پٹی ہوئی تھیں۔ مگر کچھ رونق نہ تھی، خاموشی تھی، اداسی تھی، کسی نے کپڑے بھی نہ بدلے تھے۔ مسٹر
ان کو دیکھ کر لوگ فوراً کھڑے ہو گئے۔ پھر تو مجھے یاد ہوا کہ جاندار ہستیاں تھیں۔ اگر میں امریکہ کی سرزمین میں ہوتا تو شاید گمان ہوتا کہ کہیں
کا کوئی شبہ نہ ہو۔ مگر جب السلام علیکم کے نعرے بلند ہونے لگے۔ اور لوگ ان سے مصافحہ کرنے کو لپکے تو مجھے یقین ہی ہو گیا کہ یہ سب لا الہ الا اللہ
الرسول اللہ پر ایمان رکھنے والے ہیں اور یہ بھی ہماری طرح اللہ اکبر کے آگے سر جھکانے آئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب تشریف لائے۔ بہت
اور شب بیدار بزرگ ہیں۔ خیر نماز ہوئی، خطبہ ہوا مگر مختصر۔ پھر جو ہم اٹھے تو ایک ہڑبونگ مچ گیا۔ صاحب موصوف کو تو اتنی ہوش کہاں رہی کہ کس کس
ان کے ہاتھوں کو چوما۔ اور آنکھوں سے لگایا۔ میں خود بھی نہ دیکھ سکا۔ اور ایک بھیڑ میں غائب ہو گیا۔ بارے میرے سینہ پر "خدام کعبہ" کا نشان
تھا، وہ کام آگیا۔ خدا کرے کہ اس نشان کی لاج دنیا میں رکھ سکوں۔ کہ محشر کی بھیڑ بھاڑ میں بھی کام آجائے۔ کسی کی نظر پڑ گئی اور ان صاحب نے مشکل
نجات کرا کر مجھے جناب موصوف تک پہنچا دیا۔ مگر وہاں اس سیلاب کا زور تھا۔ آخر چند صاحبوں نے لوگوں کو زبردستی دور دیا۔ یہ کھڑا کیا کہ صاحب موصوف
باہر چلے ہوا میں آجائیں۔ مگر پھر بھی دونوں طرف سے ہاتھ پر ہاتھ پڑتا تھا۔ جو لوگ معانقہ کرنے کا ارمان نہ نکال سکے انہوں نے سبحان اللہ، مرحبا
کے نعرے بلند کرنے شروع کیے۔ مسجد سے باہر آئے تو باہر ایک اور مجمع منتظر تھا۔ غرض اسی صورت سے گاڑی تک پہنچے۔ مگر وہاں بھی دو طرفہ
بڑھنے لگے۔ گاڑی چلی تو کچھ لوگ ساتھ دوڑے۔ آخر بمشکل انہیں دست بستہ سلام کرتے ہوئے مسجد سے روانہ ہوئے۔ واپسی میں پھر وہی سوتے
مکان، بند بازار جو دکانیں کھل رہی تھیں ان پر دکاندار یا مکھیوں کے سوا کوئی خریدار نہیں نظر پڑا۔ خاموش گلیاں سنسان سڑکیں اور پولیس
کا لال دوپٹہ اور خاکی وردی! بنگلہ پہنچے ہی پائے ہوں گے کہ عید ملنے والے آنے شروع ہوئے کوئی ساڑھے دس بجے تک تو چار چار پانچ
پانچ کی ٹولیاں آتی رہیں۔ پھر تو ایک بجے تک بیس بیس تیس تیس کے غول آنے لگے۔ کرسیاں کافی نہ ہوئیں تو لوگ ارد گرد کھڑے ہونے لگے
جب کمرہ میں کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ رہی تو برآمدے میں نکل آئے۔ آخر جب چاروں طرف سے ہوا بھی رک گئی اور ہمیں فطرہ اور عیدی کے روپے
لینے اور رسیدیں کاٹنے میں دقت ہونے لگی تو یہ قرار پایا کہ جو لوگ چندہ دے چکیں وہ رسیدیں لے کر تشریف لے جائیں۔ اور ہم چندہ کو دو
کمروں میں بنائیں، ایک آدمی آکر مسٹر مظہر الحق سے رسیدوں پر دستخط لے جایا کرے۔ اسی بھیڑ بھاڑ پر ایک ستم ظریف نے فقرہ چھوڑا کہ پولیس کا انتظام
تو یہاں ہونا چاہیے تھا، فضول سڑکوں، مسجدوں اور عید گاہوں پر کیوں پہرہ دے رہی ہے: ۔

قصہ مختصر محلہ محلہ کے لوگ جوق در جوق آئے تھے۔ اور اپنی اپنی مسجدوں اور گھروں سے جمع کیا ہوا چندہ پیسے اکنیاں، دوانیاں وغیرہ
لا کر عاجزت اور انکسار کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ صاحب استطاعت لوگوں نے اپنے بچوں کی عیدیوں کی معقول رقمیں بھی شہدا اور زخمیوں
کے بچوں کے لئے پیش کش کی۔ رات کے نو بج گئے اور بجز معدودے چند خانہ اصحاب کے جن کا فرض تھا کہ جماعت اسلامی سے الگ رہ کر اپنی
تکمیل کریں۔ اور بجز عورتوں کے سارا کانپور مسٹر مظہر الحق کی خدمت میں اظہار عقیدت و احسان مندی کے لیے حاضر ہوا۔ احساس قومی یہاں تک
تیز ہو گیا ہے کہ شام کے وقت ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ اگر جناب سے تم اجازت لے لو تو طوائفیں بھی برقع پوش ہو کر چندہ پیش کرنا چاہتی

سر رضا علی کی تقریر

اسپیچ جو آنریبل سید رضا علی صاحب نے ۸ ستمبر ۱۹۱۳ء کو عام جلسہ منعقدہ جامع مسجد مراد آباد میں دی۔

السلام علیکم۔ میرے بزرگوارو! عزیزو! بھائیو!! خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہم کو اس دین میں پیدا کیا جو بہتر
ادیان ہے اور ہم کو وہ نبیؐ دیا جو خاتم الانبیا اور رحمت اللعالمین ہے۔ آج کل کے مسلمانوں کے اعمال کیسے ہی زشت کیوں نہ
مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ آخرت کی تمام نعمتیں ہم کو عطا ہوئی ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں بھی ہم نے وہ کام کئے ہیں کہ جب
آفتاب مشرق سے طلوع اور مغرب میں غروب ہوگا ہمارا نام صفحۂ ہستی سے مٹ نہیں سکتا۔ یہ سچ ہے کہ اب ہمارے پاس حکومت
نہیں ہے مگر ہماری موجودہ حالت خود ہمارے اعمال کا نتیجہ ہے۔ محکوم ہوکر رہنا کوئی عیب کی بات نہیں ہے جب ہم حاکم تھے
تاریخ شاہد ہے کہ اچھے حاکم تھے اب اگر ہم اپنے کو اچھا محکوم ثابت کریں تو یہ بھی ہماری خوش قسمتی ہے۔ حاکم و محکوم کے تعلق
پر میں چند الفاظ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے کہ یہ جلسہ مظلومانِ کانپور کی اعانت کے لئے منعقد کیا گیا ہے۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا
اس جلسہ کی شرکت ہمارے اور ہماری حکمران قوم کے تعلقات پر کیا اثر ڈالتی ہے۔ بعض اصحاب کا اصل اور بعض اصحاب کا مص
خیال ہے کہ اس جلسہ کی شرکت گورنمنٹ کے خلاف ہے، قبل اس کے کہ اس سوال کا جواب دیا جاسکے یہ امر دریافت طلب ہے کہ
سے کیا مطلب ہے۔ اگر گورنمنٹ سے مطلب وہ تمام اہل کار افسر اور عمال ہیں جو گورنمنٹ کے عہدوں اور مناصب پر اس
مامور ہیں کہ رعایا کی فلاح و بہبود میں کوشش کریں تو ممکن ہے کہ اس جلسہ پر ایک حد تک یہ الزام لگایا جاسکے مگر پھر بھی
زیادہ مورد الزام نہیں ہوسکتے، کیونکہ ہم گورنمنٹ کے تمام امور پر نکتہ چینی نہیں کرتے صرف انہیں پر اعتراض کرتے ہیں جو
اعتراض ہیں حضرات اگر آپ ایک منٹ کے لئے بھی یہ باور کرنے کے لئے تیار ہوں کہ مسٹر ٹائلر مجسٹریٹ و مسٹر ڈاڈ سپرنٹنڈ
پر اعتراض اور بجا اعتراض کرنا گورنمنٹ کی مخالفت ہے تو میں یہ تسلیم کروں گا کہ ہم گورنمنٹ کے مخالف ہیں مگر یہ اصول نہا
اندیشہ ناک اصول ہے۔ اگر اس اصول کو بیان کیا جاوے تو جیسا کہ ایک مقدمہ میں ہائی کورٹ کلکتہ میں بطور مذاق
تھا کہ کانسٹبل کو بھی گورنمنٹ ماننا پڑے گا اور کسی شخص کو یہ حق حاصل نہ رہے گا کہ بغیر کئے الزام کا خطرہ اپنے اوپر
کانسٹبل پر اعتراض کرسکے مگر حضرات یہ تمام تخیلات اور بجا تحلیلات ہیں نہ کانسٹبل گورنمنٹ ہے نہ مسٹر ٹائلر و مسٹر ڈاڈ
ہیں۔ جس طرح ہم کو ایک کانسٹبل کی نازیبا حرکت پر اس کی شکایت کرنے کا حق حاصل ہے اس طرح مسٹر ٹائیلر اور مسٹر
کی غلطیوں پر حکام بالادست کی خدمت میں استحقاقاً معروض کرنے کا حق ہم کو حاصل ہے اور یہ ہمارا وہ حق ہے جو اس
تک کوئی طاقت ہم سے نہیں لے سکتی جب تک ہم کو برٹش گورنمنٹ کی رعایا ہونے کا حق حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس
تعلق ہمارے صوبہ کے لفٹنٹ گورنر سر جیمس میسٹن سے ہے۔ اور اس طرح کے جلسوں سے ان کی مخالفت منظور ہو

ہیں - مزید تحقیق سے معلوم ہوا کہ ان لہو ولعب کی بندیوں اور عیش و عشرت کی دیویوں نے بھی "کشتگان معرکہ کانپور" کے غم میں نہ آنکھوں میں سرمہ لگایا نہ ہاتھوں میں مہندی، نہ سر میں کنگھی چوٹی کی اور نہ تن پر زرق برق کپڑے پہنے - محرم کی سیاہ و سبز پوشاک بھی نہ تھی بلکہ میلے کچیلے کپڑے صرف تن ڈھکنے کو - اس ماتم کی دل کے ساتھ انہوں نے بھی دریافت کرایا کہ کیا وہ بھی شریک قوم ہو سکتی ہیں؟ - کاش ہم بھی اپنی خفیفہ گاہوں کو یاد کر کے اپنے دامنوں میں نگاہ ڈالیں اور اسلام کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے لگیں، ہاں یہ احساس کوئی اور نہیں - اس سے قبل بھی یہ طبقہ جن کو حقارت کے ساتھ دیکھنے کی بجائے ہمیں اپنے معاصی پر نگاہ کرنا چاہیے - جنگ ٹرکی و بلقان میں فیاضی کے ساتھ چندہ دے چکا -

یہ تو چندہ آنے کی خبر ہی تھی - لیکن جو چندہ لوگ خود لا کر دے رہے تھے - اس کا اور اس کے لانے والوں کا تانتا ۹ بجے شب کے بعد بند ہوا - میں نے اس چندہ کی فہرست کچھ مرتب کر لی ہے - مکمل کر کے ارسال خدمت کروں گا -

آج شام کے پانچ بجے ہیں تو بھی چند مقامی صاحبوں کو لے کر عیدگاہ اور شہر کی حالت دیکھنے گیا -- مگر جو خاموشی سکوت، اور ویرانی صبح کے وقت ہر سڑک پر طاری تھی - وہی اب بھی تھی - عیدگاہ مقفل تھی - چھوٹی عیدگاہ جو بڑی سڑک پر واقع ہے اور جہاں میلہ کا اژدہام اس قدر ہوا کرتا ہے کہ گاڑی یکہ چل نہیں سکتا - اور تل دھرنے کو جگہ نہیں ملا کرتی وہاں اس وقت پولیس اور خاکروب کے جھاڑو کے سوا شاذ و نادر ہی کوئی متنفس نظر آتا تھا - یہ فرق حضرت دل کی شادمانی اور نوحہ خوانی میں - گھر آباد ہیں، لوگ زندہ ہیں - سب سامان موجود ہیں - لیکن صرف ایک دل کے ساتھ نہ دینے سے گھر خالی معلوم ہوتے ہیں - اور سب ساز و سامان صرف جگہ روکنے کو دھرے رکھے ہیں -

راستہ میں معلوم ہوا کہ مسجدوں پر مسلح پولیس کے پہرے تھے - ایک جگہ یہ بھی سنا کہ کسی مسجد میں پولیس والوں نے امام سے عید پڑھانے کے متعلق کچھ باز پرس بھی کی اور بعض لوگوں کے نام بھی لکھے - مجھے یہ امر ابھی تک تحقیق نہیں ہوا - اور میرا خیال ہے کہ پولیس نے یہ غلطی تو نہ کی ہوگی - اس سلسلہ میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ امام صاحب جامع مسجد میں نماز میں تکبیریں کہنا بھول گئے - اور نماز دوبارہ ہوئی - اس کی وجہ لوگوں نے انتشار بتلایا - مگر میرا خیال تھا کہ اس کی وجہ سہو ہوگی - (یا شاید یہ ہو کہ ہندوستان کے ایک صوبہ کی گورنمنٹ نے "کہو تکبیر" کو ممنوع قرار دیا ہے) چنانچہ بہ نظر تحقیق میں خود جامع مسجد میں گیا - وہاں کچھ لوگ عصر کی نماز پڑھ کر نکل رہے تھے، کچھ ٹہل رہے تھے - جو ٹہل رہے تھے وہ بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں کے طلبہ تھے - میرے سوال پر لوگ پہلے تو کچھ ٹھٹکے" آخر انہوں نے غالباً خدام کعبہ خیال کر کے کہا کہ امام صاحب کو ہم بلوائے دیتے ہیں - امام صاحب تشریف لائے - میں نے سوال کیا وہ کچھ خاموش سے ہو گئے - آخر میں نے اپنے ساتھیوں کو بلا کر انہیں یقین دلوایا کہ یہ کوئی غیر آدمی نہیں - اس پر انہوں نے کہا کہ ہاں صاحب آج کل ہر شخص پر خفیہ ہی کا شبہ ہوتا ہے - اور خاموش ہی رہنا پڑتا ہے خیر انہوں نے فرمایا کہ اصل میں پولیس کا جا بجا پہرہ تھا - قریب ہی معلوم ہوا تھا کہ ایک چوکی میں مسلح گارد اور افسران پولیس موجود تھے - اور خود نمازیوں میں اکثر گھورنے والے نظر آتے تھے - اس لئے طبیعت کچھ پریشان و خوف زدہ تھی - غالباً (کچھ رک کر) اس قسم کے خیالات خلل انداز ہو گئے - شاید ان کا یہ خیال ہو کہ ان کا اقرار ایک عالم و امام کی شایان شان تھا - کیوں کہ وارث تو انہیں بزرگوں کے ہیں جنہوں نے تلواروں کے سایہ میں جبین نیاز کو سجدہ آمیز کیا ہے -- یہ کیفیت ہے عید کی، عید کانپور کی - دیکھئے یہاں کب تک صف ماتم بچھی رہتی ہے؟ مقلب القلوب سے دعا ہے کہ جلد حاکم و محکوم کو مسجد مچھلی بازار کے متعلق ہم خیال و ہم آہنگ کر دے -

یہ خیال بھی اس قدر غلط اور بے بنیاد ہے جیسا کہ پہلا خیال بالفرض سر جیمس میسٹن کے کسی فعل پر بحیثیت لفٹنٹ گورنر ہونے کے ہم اعتراض کریں تو اس سے گورنمنٹ کی کیا مخالفت ہو سکتی ہے۔ اگر لفٹنٹ گورنر کے ہر فعل کو خواہ وہ زیبا ہو یا نازیبا ہم آمنّا و صدّقنا کہہ کر تسلیم کر لیں پھر اصول حکمرانی کو ہمیں خیرباد کہہ دینا پڑے گا جو انگریزی حکومت کا سنگ بنیاد ہے۔

حضرات! ہم ملک معظّم جارج پنجم کی رعایا اور وفادار رعایا ہیں اور ایسی رعایا ہیں جن کی وفاداری، جانبازی و جاں نثاری کی صدائیں سنگ ہائے سے سومالی لینڈ اور بوشہر تک گونجتیں رہیں اور گونجیں گی۔ ہم وہ وفادار رعایا ہیں جنہوں نے گورنمنٹ کی طرف سے خود اپنے ہم مذہبوں سے جدال و قتال کرنے میں بھی دریغ نہیں کیا۔ بلوچیوں کو خون میں ہم نے رلایا، کابلیوں سے ہم لڑے، ایرانیوں کے مقابلہ میں ہم نے تلوار نکالی کیا سنہ ۱۸۹۲ء کی سرحدی لڑائی میں مسلمان فوجیں سب سے زیادہ سرفروش ثابت نہیں ہوئیں اور میرے ایک قابل دوست مجھے اس جلسہ میں یاد دلاتے ہیں کہ خود کانپور میں جن سنگینوں اور بندوقوں نے مسلمانوں کو عالم حیات سے عالم ممات میں پہنچا دیا ان میں سے بہت سی سنگینیں اور بندوقیں خود مسلمانوں کی نہ تھیں؟ کیا ہماری وفاداری کے کافی امتحانات نہیں ہو چکے؟ یہ باتیں کون نہیں جانتا اور کس کو نہیں معلوم پھر آج سے کیوں کہا جاتا ہے کہ ہماری وفاداری زوال پذیر ہے۔ ہم کو عقیدت اور وفادارانہ عقیدت جارج پنجم کے تخت و تاج سے ہے۔ ہم نے اپنے بادشاہ کے لئے خون بہایا ہے۔ اور پھر بہائیں گے مگر ہم نے کوئی معاہدہ ایسا نہیں کیا ہے کہ ہم اپنی چھاتیوں کو ٹائیلر کی پولیس کی سنگینوں اور تلواروں کا نشانہ بنا دیں اور اف نہ کریں ؛

حضرات گورنمنٹ کے تمام عمّال کے افعال پر نکتہ چینی کا ہمیں حق حاصل ہے مگر ہم سب پر نکتہ چینی نہیں کرتے ہم اجلا کو سفید اور سیاہ کو سیاہ دیکھتے ہیں۔ جہاں مسٹر ٹائیلر کے بیداد کی فریاد کرتے ہیں وہاں کلکٹر کرانچی کی انصاف پسندی کا بھی اعتراف کرتے ہیں۔ جہاں مسٹر فورڈ مجسٹریٹ لکھنؤ کے جابرانہ اختیارات مجسٹریٹی کا ذکر زبان پر لاتے ہیں جنہوں نے ۱۶ اگست کو مظلومان کانپور کی امداد کے لئے جلسہ نہیں ہونے دیا وہاں مسٹر لیٹن کی بیدار مغزی کے بھی قائل ہیں جنہوں نے باوجود پولیس کی ناجائز کارروائیوں کے ہم کو یہ جلسہ منعقد کرنے کا موقع دے کر اپنے خلق کا گرویدہ بنایا۔ ہم کہتے ہیں اور صاف کہتے ہیں کہ انگریزی حکام کثرت سے انصاف پسند اور راستی باز ہیں اگر سو میں دس انگریز حاکم کج رائے ہیں تو ہم کو اپنی رائے کثرت کے لحاظ سے قائم کرنا چاہیے۔ یہ نہایت ناانصافی ہو گی کہ اگر ہم صرف قلّت پر نظر رکھیں ؛

دوسری بات فراہمی چندہ کے متعلق ہے۔ بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ یہ چندہ کس لئے کیا جا رہا ہے۔ حضرات آپ سب کو معلوم ہے کہ چندہ پس ماندگان شہدائے کانپور اور مجروحین واقعہ ۳ اگست کے لئے اور ان ملزمین کی پیروی کے لئے کیا جا رہا ہے جن کی تعداد سو سے اوپر ہے اور جن پر سنگین سے سنگین جرائم کے مقدمات قائم ہیں۔ ان اغراض کے لئے ایک رقم کثیر کی ضرورت ہے اور ہم دل و جان سے اس کی فراہمی کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے سوائے چندہ کسی اور کام میں بھی خرچ کیا جائے گا۔ جس کام کی طرف یہ لوگ اشارہ کرتے ہیں مگر نام لینے سے اجتناب کرتے ہیں وہ غرض ایسی ہے کہ [illegible] ہی کانپور کی امداد اور پیروی مقدمہ سے بھی زیادہ ہمارے دلوں کو عزیز ہے مجھے اس غرض کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ قبل اس کے کہ میری آواز آپ کے کان تک پہنچے آپ کا دل آپ کو خبر دے رہا ہو گا کہ وہ غرض کیا ہے۔

حضرات! وہ مقدس غرض یہ ہے کہ ہم سب مل کر وہ تدابیر جو انگریزی گورنمنٹ کے قوانین نے ہم کو بتائی ہیں اس غرض سے عمل میں لائیں کہ ہماری مسجد کا منہدم شدہ حصہ ہم کو واپس مل جائے۔ بعض اشخاص کا خیال ہے کہ یہ امر نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی ناراضی کا باعث ہوگا مگر یہ خیال بے بنیاد ہے۔ لاٹ صاحب نے جو حکم مسجد کے بارے میں دیا ہے اس کا قانونی اثر عدالت دیوانی کے فیصلہ سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ مگر کیا کوئی ذی عقل یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر کسی عدالت دیوانی کے فیصلہ کی ناراضی سے اپیل کیا جائے تو اس سے اس عدالت کی تحقیر مقصود ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں، اسی طرح اگر ہم ہز آنر مسٹر جیمس میسٹن کے حکم کی چارہ جوئی حضور وائسرائے ہند یا سیکرٹری آف اسٹیٹ سے کریں اور اس کے لئے چندہ جمع کریں تو اس میں کسی کو اعتراض ہو سکتا ہے۔ لہذا میں آپ کے سامنے یہ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ یہ امر ہرگز ایسی نہیں ہے جو منشاء قانون کے خلاف ہو اور جس کے لئے چندہ دینے سے کوئی قاعدہ یا قانون آپ کو مانع ہو۔ مسجد کی واپسی ایسا امر ہے جو ہر مسلمان کے دل کو واقعات کانپور کی سب سے زیادہ عزیز اور پیارا ہے۔ میرا ذاتی خیال اس معاملہ میں جو کچھ بھی ہو مگر جن مسلمانوں سے مجھ کو بات چیت کا موقع ملا ہے ان میں کثیر حضرات کا جو خیال ہے وہ میں آپ کے سامنے عرض کرنا چاہتا ہوں ان کا خیال ہے کہ شاید حضور وائسرائے ہم کو جزو منہدمہ مسجد واپس نہ دلائیں۔ صاحب وزیر ہند کے یہاں سے بھی ان کو کامیابی کی پوری امید نہیں ہے مگر ان کا عقیدہ ہے جس پر وہ نہایت زور سے قائم ہیں کہ ہماری پوری مسجد کا منہدمہ جزو ہم کو ملک معظم جارج پنجم خلد اللہ ملکہ کی بارگاہ سے واپس ملے گا اور ضرور ملے گا۔

۲۳- نومبر ۱۹۱۳ء

(از جناب کیفی چریا کوٹی)

رباعی

کل مریم کو قیصر کی سوجھی	اور موسیٰ کو طور کی سوجھی
الٹی قسمت جو حشر والوں کو	فتنہ کانپور کی سوجھی

شبلی

اگرچہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی

اگرچہ صدمۂ بلقان سے جگر شق ہے

بچا رکھے ہیں مگر میں نے چند قطرۂ خون

کہ کانپور کے بھی زخمیوں کا کچھ حق ہے

دہلی کا پُراسرار جلسہ انگریزوں کی حمایت میں

نواب صاحب رام پور اور دوسرے حضرات کے کارنامے

(ہمارے نامہ نگار کی رپورٹ)

(یک شنبہ ۔ ۵ ۔ اکتوبر ۱۹۱۳ء)

قسمت کا پھیر اپنا دورہ ختم کر چکا ہے ۔ اور دیر یا سویر وہ حصہ، جو آج نیچے ہے کل اُوپر آ جائے گا۔ جو لوگ کل بھی دم نہ مار سکتے تھے، آج گلے پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے ہیں ۔ اور دنیا بھر کو اپنی طرف مخاطب کر رہے ہیں ۔ زمانہ نے بیسیوں روپ بھرے اور کروٹیں بدلیں، مگر ہندوستان اور خصوصًا دہلی کے لوگوں میں نادر شاہ کے تلخ نتیجے کے بعد بھی نیل بگاڑنے والوں میں (افواہ پھیلانے والوں) ایک شمہ برابر فرق نہ آیا ۔ لطف یہ ہے کہ خبر جو نکلتی ہے وہ خواہ کتنی ہی کا نفیدنشل کیوں نہ ہو بالکل صحیح ہوتی ہے ۔ مگر جب وہ منہ سے نکل کر کوٹھوں پر چڑھتی ہے تو اس پر وہ دو باتوں کے حاشیے چڑھتے ہیں اور وہ رنگا رنگی جامے پہنائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے عام اور خاص میں خود بخود سنسنی پیدا ہو جاتی ہے ۔ کچھ عرصہ سے بہت دھیمے سروں میں یہ چلی تھی کہ دہلی میں بوساطت حکیم اجمل خاں و بہ سرپرستی ہز ہائینس نواب صاحب بہادر رام پور ایک جلسہ دلائل ایسوسی ایشن بمبئی کی وضع کا منعقد ہوگا۔ جس میں ان کارروائیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا جو قوم کے سچے بہی خواہ اور ایثار پرست ہمدردوں نے اب تک کی ہیں، اور نیز مسٹر محمد علی (آکسن) اور مسٹر وزیر حسن کا فعل مجنونانہ تصور کیا جائے گا، اور یہ کہ وہ قوم کے سچے نائب کی حیثیت میں نہیں ہو سکتے۔"

پرسوں ہمدرد کے مطالعہ اور زمیندار کے تار نے، اور انگریزی والوں میں آئی ۔ ڈی ۔ ٹی ۔ کے مکالمہ میں، خوش گپوں کے لیے من وسلویٰ اتار دیا ۔ دہلی میں ایک سرے سے لے کر دوسرے تک آگ کی طرح یہ خبر مشہور ہوئی اور بڑے بڑے حاشیوں کے ساتھ سارا نزلہ گرا تو بے چارے حکیم اجمل خاں صاحب کے اوپر ۔ ہر شخص اپنی ایک نئی بات سنا رہا تھا کوئی کہتا تھا حکیم اجمل خاں صاحب اس جلسہ کے اہتمام پر نواب صاحب رام پور کی طرف سے مقرر کیے گئے ہیں یہ جلسہ انہی کے مکان پر ہوگا ۔ کوئی کہتا تھا نواب محمد اسحٰق خاں آنریری سیکریٹری، علی گڑھ کالج اس کے مہتمم ہیں حکیم صاحب صرف مہمانوں وغیرہ کے ٹھہرانے کے منتظم قرار دیے گئے ہیں ۔ کوئی کہتا تھا کہ یہ جلسہ مسٹر محمد علی اور وزیر حسن کی مخالفت میں کیا جا رہا ہے ۔ کسی کی یہ رائے تھی کہ نواب صاحب رام پور مسجد کا نپور دوبارہ بنوانے اور اس کی نسبت

کے لیے یہ جلسہ کر رہے ہیں۔ کوئی یہ کہہ کر اس کی رد کرتا تھا کہ جی نہیں یہ جلسہ محض اس غرض سے منعقد کیا گیا ہے کہ ایک پوزیشن خاص قومی لیڈران کا منتخب کیا جائے اور وہ حضور وائسرائے سے یہ درخواست کرے کہ اس وقت تک جس قدر شورش ہو رہی ہے وہ دو چار اخباروں کا نتیجہ ہے جن کی آواز عام مسلمانوں کی آواز نہیں ہے، اور ہم لوگ سچے وفادار گورنمنٹ ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ مسجد کی تعمیر کی اجازت اس طرح دے دی جائے کہ نیچے کی زمین سڑک کے کام آجائے اور اس جگہ جہاں دالان اور وضو خانہ تھا ہم چھجہ کے طریقے سے بڑھا کر کے اس پر اس طرح سے حمام اور وضو خانہ بنادیں۔ کوئی کہتا تھا کہ نہیں یہاں یہ جلسہ محض اس غرض سے کیا جا رہا ہے کہ ان لوگوں کی مخالفت میں جو کانپور کے واقعہ کی نسبت چندہ کر رہے ہیں اور دلچسپی لے رہے ہیں نیز ان اخباروں کی نسبت جو اس کے متعلق مضمون لکھ رہے ہیں اور سر جیمس میسٹن کی گورنمنٹ کو برا بھلا کہہ رہے ہیں، ایک رزولیوشن پاس کرے اور گورنمنٹ سے استدعا کرے کہ سوائے ہمارے سب باغی ہیں۔ کوئی کہتا تھا کہ بھائی کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ کیونکہ جو لوگ بلائے آئے ہیں ان میں خصوصیت رکھی گئی ہے۔ سنتا ہے کہ راجہ صاحب محمود آباد اور نواب وقار الملک جو ہمارے مسلمہ لیڈر ہیں اسی لیے مدعو نہیں کیے گئے، غرض ہزار منہ اور ہزار باتیں۔

مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ جس قدر اور جلدی کے ساتھ دہلی میں اس جلسہ کی نسبت افواہیں مشہور ہوئی ہیں اس سے پہلے کبھی کسی جلسہ کی مخالفت یا موافقت میں نہیں اُڑی تھیں۔

لوگ نہایت مضطرب معلوم ہوتے تھے۔ یہاں تک عملی طور پر دہلی والوں نے کر کے دیکھا کہ کئی نوٹس بورڈوں پر کئی اشتہار اس جلسہ کی مذمت میں چسپاں کیے جس میں حکیم اجمل خاں صاحب کی نسبت بھی بہت بے ہودہ باتیں لکھی گئی تھیں۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ کئی تار حکیم صاحب کے پاس بھیجے گئے تھے۔ جس میں جلسہ نہ کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔

یکم اکتوبر کو بہت سے لوگ اسٹیشن پر اس امر کی ٹوہ لینے پہنچے کہ جلسہ کہاں ہوگا کیونکہ کئی خبریں اس کی نسبت مشہور تھیں ایک تو یہ تھی کہ مسلمان ڈرولینڈ ہوٹل میں ٹھہرائے جائیں گے اور جلسہ حکیم اجمل صاحب کے مکان میں ہوگا دوسری خبر تھی کہ ٹاؤن ہال میں ہوگا۔ تیسری خبر یہ تھی کہ روشن آرا باغ میں ہوگا۔ اور چوتھی خبر یہ تھی کہ رام باغ میں ہوگا۔ لوگ بھٹکتے بھٹکتے اس تلاش میں پھرتے رہے تھے۔ وقت کے متعلق بھی پریشان تھے کہ کس وقت اور کہاں ہوگا۔

بالآخر بعض اصحاب کو معلوم ہوا کہ رام باغ میں بوقت گیارہ بجے یہ جلسہ شروع ہوگا۔ چنانچہ کچھ آدمی وہاں کی سمت سے چلے۔ دل میں سوچتے جاتے تھے کہ ممکن ہے وہاں پولیس کا پہرہ ہو یا اگر نہ ہو اور ہم پہنچ جائیں تو شاید ہم کو کہہ دیا جائے کہ چلے جاؤ یہ جلسہ عام نہیں ہے۔ مگر وہاں جا کر جو دیکھا تو کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہاں کئی اور اصحاب ہم ہی جیسے تھے یعنی بے بلائے۔ مگر فرق یہ تھا کہ وہ دس بیس اسٹیشن پر سے محض اس لیے لائے گئے اور ہم یہیں سے۔ حاضرین میں جو نواب صاحب رام پور کی طرف سے مدعو کیے گئے تھے ایک کافی تعداد تھی۔

ٹھیک ساڑھے بارہ بجے نواب صاحب رام پور تشریف لائے اور کرسی صدارت پر متمکن ہوئے۔ صاحب موصوف نے ایڈریس پڑھا اور اس میں تین مقاصد بیان کیے جو آپ کے اخبار میں شائع ہو چکے ہیں۔

نواب صاحب کا ایڈریس نہایت معقول تھا اور ہمیں تعجب ہوا کہ جب یہ افتتاحی کارروائی ہے تو ناحق ایسی بے بنیاد باتیں شہر میں اڑ گئی تھیں۔ اس کے بعد آنریبل رضا علی صاحب نے ایک مختصر تقریر کی اور فرمایا کہ میں بغیر بلائے ہوئے آیا ہوں اور ممکن ہے کہ مجھے تقریر کا کچھ حق نہ ہو۔ مگر اس امر کے لیے تیار ہوں کہ اگر مجھ سے اب بھی کہا جائے کہ چلے جاؤ تو میں چلا جاؤں گا۔ اس پر میر مجلس صاحب نے نہایت خندہ پیشانی سے فرمایا کہ یہ جلسہ آپ سے مشورہ کی غرض سے کیا گیا ہے اور ہم سب آپ کی نیک صلاح سے بھی ضرور مستفید ہوں گے۔ آپ ضرور اپنے خیالات سے ہمیں مدد دیں۔ اس پر رضا علی صاحب نے تقریر دوبارہ شروع کی اور فرمایا کہ میرے نزدیک اس جلسہ میں بعض سچا قومی لیڈر تمثیلاً نواب وقار الملک بہادر، راجہ صاحب محمود آباد وغیرہ مدعو نہیں کیے گئے ہیں اور اس لیے اس جلسہ کی کارروائی کو تمام مسلمانوں کی کارروائی نہیں سمجھنی چاہیے اور نہ یہ جلسہ تمام مسلمانوں کی نیابت کرتا ہے۔ اس لیے میری رائے یہ بھی ہے کہ اس کی تمام کارروائی ملتوی کی جائے اور کسی دوسری تاریخ میں یہ جلسہ منعقد کیا جائے۔ اور اس کی نسبت ایک باضابطہ نوٹس جاری کیا جائے۔ اور تمام ہندوستان سے سربرآوردہ لوگ اس میں مدعو کیے جائیں۔

اس کے بعد حامد علی خاں بیرسٹر کھڑے ہوئے اور انہوں نے فرمایا کہ میں نواب وقار الملک اور راجہ صاحب محمود آباد کو نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، مگر یہ ضروری نہیں سمجھتا کہ جس جلسہ میں یہ صاحبان نہ ہوں اس جلسہ میں کوئی کارروائی بھی نہ کی جائے، یہ لوگ ہر جلسہ کا دم چھلا نہیں ہو سکتے۔ میں نہایت ایکسٹریمسٹ ہوں مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان لوگوں کا یا کسی کا مقلد بھی ہوں۔

اس کے بعد مسٹر اظہر علی وکیل لکھنؤ نے تقریر فرمائی اور مسٹر حامد علی خاں کی تقریر کی تردید کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ یہ درست نہیں ہے کہ جس جلسہ میں تمام سربرآوردہ مسلمانوں کے ممبر نہ ہوں اس میں کوئی کارروائی کی جائے اور اس جلسہ کو تمام مسلمانوں کی آواز اور اُن کی قسمت کا فیصلہ کیا جائے۔

اس کے بعد مسٹر محمد یعقوب وکیل نے ایک نہایت مدلل اور معقول تقریر کی جس میں فرمایا کہ ایک انگریزی مثل مشہور ہے کہ بادشاہ یا والیان ملک کو سیاسی معاملات سے کچھ تعلق نہ ہونا چاہیے۔ ہم بالکل مانتے ہیں کہ نواب صاحب رام پور ہمارے بہی خواہ اور سچے ہمدرد ہیں۔ مگر میری رائے میں ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ حضور نواب صاحب جیسے والیانِ ملک ہمارے ان معاملات میں دخل دیں جن میں ہم بغیر ان کے کارروائی کر سکتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ جب ہم تھک جائیں اور کوئی علاج ہمارے پاس اپنے مرض کا نہ رہے تو ہم آپ جیسے والیان ملک کو تکلیف دیں۔ بہت قبل از وقت ہے کہ جلسہ نواب صاحب رام پور کی طرف سے منعقد کیا جائے۔ اس لیے میری ... ہے کہ جلسہ ملتوی کیا جائے۔

اس کے بعد سربلند جنگ حمید اللہ خاں بیرسٹر الہ آباد نے تقریر کی اور فرمایا کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ راجہ محمود آباد اور نواب وقار الملک اس جلسہ میں شریک نہیں کیے گئے ہیں تو اس جلسہ میں کوئی کارروائی بھی نہ کی جائے۔ ہم سب لوگ بھی قوم کے سربرآوردہ لیڈران میں سے ہیں اور اس امر کا حق رکھتے ہیں کہ جو مقاصد ہم ...

جمع ہوئے ہیں ان پر فیصلہ کریں۔

ان صاحب کی تقریر نہایت لمبی چوڑی تھی۔ اس لیے تمام حاضرین گھبرا اٹھے۔ اس لیے راجہ غلام حسین صاحب ایڈیٹر کامریڈ کھڑے ہوئے اور انہوں نے میر مجلس صاحب کو مخاطب کر کے یہ فرمایا کہ میری رائے میں زیادہ مناسب ہوگا ہر ایک بولنے والے کے لیے کچھ وقت مقرر کر دیا جائے۔ یا یہ کہ اگر وقت مقرر نہ کیا جائے تو میر مجلس صاحب ہر تقریر کرنے والے صاحب کو جب مناسب سمجھیں حکم دیں کہ وہ اپنی تقریر ختم کر دے۔ نواب سربلند کی تقریر نے حاضرین کو کچھ اس قدر اکتا دیا تھا کہ ہر شخص ایک دوسرے سے گفتگو کر رہا تھا۔ اور یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ یہاں کوئی میٹنگ ہو رہی ہے۔ اس قدر گڑبڑ شروع ہو گئی تھی کہ کمرہ میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس دوران میں نواب سربلند جنگ بٹھا دیے گئے اور دو چار تقریریں بھی ہو گئیں جو کسی نے سنیں اور کسی نے نہیں سنیں۔ نواب مزمل اللہ خاں، کرنل عبدالحمید صاحب وغیرہ کی تقریریں اسی دوران میں ہوئی تھیں اس لیے افسوس ہے کہ ہم ان کے سننے سے بوجوہات یا قاصر رہے اور نہیں لکھ سکے۔

اس کے بعد آنریبل محمد شفیع نے ایک مختصر تقریر میں یہ بیان کیا کہ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ سب صاحب کا منشا بظاہر یہ ہے کہ ایک اور جلسہ اس کارروائی کے متعلق منعقد کیا جائے، اور اس میں مختلف جگہ کے مسلمانوں کو مدعو کیا جائے۔ اس پر رضا علی صاحب نے فرمایا کہ اس کو رزولیوشن کی طرح پیش کیا جائے تو مناسب ہے۔ اس پر باجازت صاحب میر مجلس یہ رزولیوشن پیش کیا گیا۔

اب جھگڑا اس بات پر شروع ہوا کہ مدعو کون کرے اور داعی کس کو بنایا جائے۔ بہت سے اصحاب کی رائے تھی کہ نواب صاحب رام پور مدعو کریں۔ اس پر رضا علی صاحب نے فرمایا کہ نواب صاحب رام پور اور راجہ صاحب محمود آباد دونوں کی طرف سے بلاوے بھیجے جائیں۔ اس پر نواب صاحب رام پور نے فرمایا کہ میری رائے میں داعی ایک ہونا چاہیے خواہ آپ لوگ راجہ صاحب محمود آباد کو بنائیں یا مجھے مقرر کر دیں۔ میرے تعلقات راجہ صاحب محمود آباد سے بہت گہرے ہیں اور اگر آپ لوگ انہیں داعی بنائیں گے اور وہ مجھے مدعو کریں گے تو میں ضرور اس جلسہ میں شریک ہوں گا۔ اس پر مظہر علی صاحب نے یہ بات پیش کی کہ اگر نواب صاحب رام پور راجہ صاحب محمود آباد کو اپنے ساتھ شریک کرنا نہیں چاہتے ہیں تو میں نواب وقار الملک بہادر کو پیش کرتا ہوں۔

اس وقت بھی کچھ ایسی گڑبڑ ہو رہی تھی کہ کوئی کچھ کہتا تھا، اور کوئی کچھ، اس پر ایک دم نواب محمد اسحٰق خاں صاحب آنریری سیکرٹری علی گڑھ کالج کھڑے ہوئے اور وہ اس قدر غصہ میں بھرے ہوئے تھے کہ باوجود نہایت تیز آواز کے ان کی تقریر کا اصل مفہوم سمجھنے سے لوگ قاصر تھے۔ جو دو ایک فقرے سمجھ میں آ سکے وہ یہ تھے کہ اتنا بڑا آدمی تمہارے جلسہ میں شریک ہوتا ہے اور تمہارے معاملات میں دل چسپی لیتا ہے اور تم لوگ اس طرح اس کی توہین کرتے ہو۔ پھر نواب صاحب رام پور سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اگر یہ لوگ آپ کی نہیں سنتے ہیں تو بس آپ بھی تشریف لے چلیے اور میں بھی چلتا ہوں۔ اس پر چونکہ رضا علی صاحب بھی بار بار کھڑے ہو کر کچھ فرماتے رہے تو آنریبل محمد شفیع اور حاذق الملک

پُراسرار جلسہ دہلی کی کیفیت آنریبل سید رضا علی کی زبانی

چارشنبہ ۸ر اکتوبر ۱۹۱۳ء

مسٹر اظہر علی بحیثیت سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ اور یہ خاکسار بحیثیت قائم مقام مسلمانان روہیلکھنڈ یکم اکتوبر کے جلسہ منعقدہ دہلی میں ناخواندہ مہمان کے طور پر شریک ہوئے ہم کو یہ خیال تھا کہ ہم جلسہ سے خارج کر دیے جائیں گے۔ مگر اس کی نوبت نہ پہنچی۔ ہز ہائینس نواب صاحب بہادر رامپور نے ایک مختصر تحریری اسپیچ فرمائی۔ جس میں مسلم پریس کو اعتدال پر رہنے کا مشورہ دیا۔ کانپور کے افسوسناک حادثہ پر اظہار تاسف کیا۔ اور مجروحین کی مدد کے بارہ میں بیان کیا کہ کس طرح مدد کی جائے اور حضور والا نے یہ بھی ظاہر کیا کہ اگر گورنمنٹ سے مصالحت کرنے کی خواہش ہے تو میری خدمات قوم کے واسطے حاضر ہیں۔

اس کے بعد آنریبل مسٹر محمد شفیع صاحب بیرسٹرایٹ لا نے تقریر کی جس نے موجودہ معاملات پر بحث کی اور چند مسلمان قومی لیڈروں کے جلسہ امروزہ میں عدم موجودگی پر توجہ دلائی۔

ازاں بعد خاکسار نے قوم کے نقطۂ خیال کو جلسہ کے سامنے پیش کیا۔ اور عرض کیا کہ چونکہ قوم کے دو مسلّمہ اور واجب التعظیم لیڈر یعنی عالیجناب مشتاق حسین صاحب بہادر مدظلہ العالی اور آنریبل راجہ محمود آباد نہ مدعو کئے گئے ہیں۔ اور نہ جلسہ میں تشریف رکھتے ہیں۔ لہذا یہ جلسہ جائز طور پر اس امر کا مدعی نہیں ہو سکتا کہ اپنے کو مسلمانوں کا قائم مقام جلسہ قرار دے۔ اگر آپ حضرات کی یہ خواہش ہے کہ قوم فرقہ بازی کی مصیبت سے بچ جائے تو اس جلسہ کو ہرگز کسی ایسے مسئلہ پر بحث نہیں کرنی چاہیئے۔ جس کا اثر مسلمان کی پالیسی پر پڑتا ہو۔ بلکہ اس غرض کے لئے ایک عام جلسہ مناسب مقام پر منعقد کیا جائے۔ اور اہم قومی مسائل اس جلسہ میں پیش ک جائیں۔ اس کے بعد خان بہادر مسٹر آل نبی صاحب رئیس آگرہ نے ایک نہایت مدلل تقریر میں میری تائید فرمائی۔ بعد ازاں مسٹر حامد علی صاحب بیرسٹرایٹ لا لکھنؤ نے فرمایا کہ اگرچہ دو لیڈران قوم شریک جلسہ نہیں مگر ان کی عدم شرکت سے جلسہ پر کوئی اثر نہیں پڑ سک صاحب موصوف نے دوران تقریر ایک ایسا جملہ بھی فرمایا کہ جس سے جلسہ میں برہمی پیدا ہوئی۔ اور بیرسٹر صاحب موصوف کو اپنے جملہ کی توضیح کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ مسٹر اظہر علی صاحب سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ اور مسٹر محمد یعقوب صاح وکیل مرادآباد نے پرزور اور قابلانہ تقریروں میں ظاہر کیا کہ اس جلسہ کا کسی امر کو طے کرنا نہایت غیر مآل اندیشانہ اور نامناسب کار ہوگی۔ اور ممدوحین نے اس امر پر بھی زور دیا کہ یہ جلسہ قوم کا قائم مقام نہیں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس جلسہ کے انعقاد میں جو ر دوانیاں کی گئی ہیں۔ ان پر اس واقعہ سے کہ جناب نواب صاحب وقار الملک بہادر و آنریبل راجہ محمود آباد مدعو نہیں کئے گئے۔ روشنی پڑتی ہے۔

اس کے بعد عام مباحثہ شروع ہو گیا۔ جس میں مسٹر حمید اللہ خاں صاحب سربلند جنگ نے نمایاں حصہ لیا، اگرچہ بدقسمتی اہل جلسہ ان کی فصیح و بلیغ تقریر کا بیشتر حصہ سمجھنے سے قاصر رہے۔

حکیم اجمل خاں صاحب نے رضا علی صاحب سے کچھ کان میں گفتگو کی اور اُن کو باہر علیحدہ لے گئے۔ اس کے بعد رضا علی صاحب پھر کمرہ میں واپس آئے اور نواب محمد اسحٰق خاں صاحب سے اُن کی غصہ بھری تقریر میں مداخلت کرتے ہوئے جو برابر جاری تھی یہ کہا کہ آپ مجھ سے علیحدگی میں ایک بات سن لیں۔ اور یہ دونوں صاحب باہر چلے آئے اور پھر جب یہ صاحبان واپس آئے تو کسی نے یہ بات پیش کی کہ پہلے فیصلہ ہو گیا کہ نواب صاحب رام پور پریذیڈنٹ اور داعی بنائے جائیں اور راجہ صاحب محمود آباد سیکرٹری۔

اس کی مخالفت عبدالعزیز صاحب مینیجر پیسہ اخبار اور مولوی انشاء اللہ صاحب ایڈیٹر وطن نے کی اور نہایت جوش و خروش سے دونوں نے ہم زبان ہو کر کہا کہ ہم ہرگز اس بات کو منظور نہیں کریں گے اور ہم اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ مگر بالآخر غل غپاڑے کے بعد یہ رزولیوشن پاس ہوا کہ نواب صاحب رام پور پریذیڈنٹ اور داعی بنائے جائیں اور راجہ صاحب محمود آباد سیکرٹری اور آئندہ بہت جلد کسی مناسب موقع پر جلسہ کیا جائے۔

اس کے بعد نواب صاحب رام پور باہر برآمدہ میں تشریف لے گئے جہاں کچھ کھانے پینے کا سامان نہایت سلیقے سے میزوں پر چنا ہوا تھا۔ اندر کمرے میں کچھ لوگوں میں چہ مے گوئیاں ہونے لگیں۔ اور آنریبل رضا علی صاحب و مسٹر محمد یعقوب صاحب نے اپنی موافقت کے ووٹس سردار بہادر صاحب سے لکھوائے اور سر بلند جنگ صاحب نے بھی فرمایا کہ میں جن جن باتوں کا مخالف رہا ہوں اُن کو ضرور لکھوں گا۔

اسی عرصہ میں وطن کے ایڈیٹر صاحب اپنے تیہے (غصہ) میں مغلوب میز پر جھپٹے اور ان کاغذات پر جن میں رزولیوشن لکھے گئے تھے اور ووٹس لکھنے میں سردار بہادر صاحب مصروف تھے وطن صاحب نے ہاتھ رکھ کر نہایت تحکمانہ لہجہ میں پوچھا کہ

"جلسہ ختم ہو گیا ہے آپ کس قاعدہ سے لکھ رہے ہیں"

وہ بے چارے ہکا بکا ان کی صورت دیکھتے رہے اور آنکھوں آنکھوں میں تہذیب کی الف بے کو یاد دلا رہے تھے۔ مگر وطن صاحب نے کاغذات اُٹھا لیے اور بالآخر اُسے پھاڑنے لگے۔ مگر ایک تماشائی نوجوان نے اُن کو چراغ پا کر دیا۔ پھر سب لوگ باہر برآمدہ میں آئے اور ٹی پارٹی کا لطف اُٹھا اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

حکومت اور رعایا

(از حکیم الطاف حسین آزادؔ)

جمعہ ۵ ستمبر ۱۹۱۳ء

رعایا حکومت سے ناخوش نہ ہو — اسی میں ہے مضمر حکومت کی زیست
مگر لاٹ صاحب کو پروا نہیں — بدیں ملک داری بباید گریست

آخر میں مسٹر محمد شفیع صاحب نے ایک ریزولیوشن پیش کیا۔ جس میں ہز ہائینس کی قابل قدر افتتاحی تقریر کا شکریہ ادا کیا اور یہ تجویز پیش کی کہ اہم معاملات قومی پر غور کرنے کے لئے ایک قائم مقام جلسہ منعقد کیا جائے۔ یہ تحریک بالاتفاق منظور ہوئی اس بارہ میں کہ جلسہ کس کی طرف سے منعقد کیا جائے، تھوڑا سا اختلاف پیدا ہوا۔ مسٹر محمد شفیع صاحب نے ایک درمیانی صورت تصفیہ کی نکالی۔ جس کو ہز ہائینس نواب صاحب بہادر رام پور نے بھی منظور فرمایا۔ لیکن منشی عبدالعزیز صاحب منیجر پیسہ اخبار اور مولوی انشاء اللہ خانصاحب ایڈیٹر اخبار وطن نے اس تصفیہ کی مخالفت کر کے خواہ مخواہ جھگڑا بڑھا دیا۔

بالآخر کثرت رائے سے یہ امر طے پایا کہ جناب نواب صاحب بہادر والی رام پور کی طرف سے ایک عام جلسہ منعقد کیا جائے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قوم اس منزل پر پہنچ گئی ہے۔ جہاں سے دو راستے پھٹتے ہیں مجھے پورا بھروسہ ہے۔ کہ ہز ہائینس نواب صاحب رام پور کی دور اندیشی ایثار نفسی اور عالی ہمتی قوم میں کسی طرح تفرقہ اندازی نہ ہونے دے گی۔ ہز ہائینس نے وعدہ فرمایا کہ راجہ صاحب محمود آباد سے بغیر مشورہ کئے کوئی کام نہیں کریں گے۔

سردست تجویز ہے کہ یہ جلسہ اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں منعقد کیا جائے۔

کانپور میں حضور وائسرائے کا ورود مسعود

جمعہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۳ء

ایسے وقت میں جبکہ مسلمان ہر طرف سے مایوس ہو کر درد دل کو اپنے لئے دوا سمجھنے لگے اور ہر قسم کی چارہ جوئی سے ناامید ہو چکے تھے یکایک کانپور سے یہ خبر آئی کہ خود حضور وائسرائے شملہ سے تشریف لا رہے ہیں تاکہ تمام معاملات کا تصفیہ اس طرح پر کر دیں جو مسلمانوں اور گورنمنٹ دونوں کے لئے قابل پذیرائی ہو۔ خاص خاص حلقوں میں پہلے سے خبریں گرم تھیں اور لوگوں نے بہت بے چینی کے ساتھ نتیجہ کا انتظار کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلی خبر جو موصول ہوئی وہ مسجد کے معائنہ اور راجہ صاحب محمود آباد، مسٹر مظہر الحق اور مولانا عبد الباری سے ملاقات کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی قیدیوں کی رہائی کی خبر شائع ہوئی۔ اس وقت مسلمانوں نے ایک آہ سرد اور ان بے کسوں کی تصویریں آنکھوں کے سامنے پھر گئیں۔ جنہوں نے مسجد کے سامنے داعی اجل کو لبیک کہا تھا۔ آہ!

وہ آتے ہیں ہماری نعش پر آج
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

مسلمانوں نے جو ایڈریس حضور وائسرائے کی خدمت میں پیش کیا اس کے مختصر اور جامع الفاظ بہت وضاحت کے ساتھ اس انصاف اور انسانی ہمدردی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کی توقع ہز ایکسیلنسی کی ذات ستودہ صفات سے مسلمان ہمیشہ رکھتے تھے اور انہوں نے اسی اعتماد پر تمام امور کا تصفیہ ہز ایکسیلنسی کی رائے پر چھوڑ دیا۔

ہز ایکسیلنسی کا جواب ممکن ہے کہ مسلمانوں کی توقعات سے کامل مطابقت نہ رکھتا ہو لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جن الفاظ میں انہوں نے مصیبت زدگان کانپور کے ساتھ اظہار ہمدردی فرمایا ہے اور جس شفقت آمیز طریقہ پر مسلمانوں کو گذشتہ واقعات کے فراموش کر دینے کے لئے ارشاد فرمایا ہے وہ بالکل اس منصب عالی کے شایان ہے جس پر وہ فائز ہیں۔ اور اگر فیصلہ میں مسلمانوں کی امیدوں کے خلاف کچھ بات باقی بھی رہ گئی ہو تو جس طریقہ پر اس کا سرانجام ہوا ہے وہ غالباً مسلمانوں کے لئے تشفی بخش ہوگا۔

واقعات پر نظر ڈالتے ہوئے قیدیوں کی رہائی ایک ایسا منصفانہ اور شریفانہ فعل تھا جس نے مسلمانوں کے دلوں سے اس غم و غصہ کو قریب قریب دھو دیا ہوگا جو ۳ اگست اور اس کے بعد پے در پے واقعات سے پیدا ہو گئے تھے۔ البتہ مسجد کی دوبارہ تعمیر کی اجازت جس شرط کے ساتھ دی گئی ہے وہ محتاج تنقید ضرور ہے، اور ہمارے نزدیک چونکہ یہ مسئلہ بالکل مذہبی بنیاد پر پیدا ہوا تھا۔ اس لئے اس کے متعلق جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ مذہب ہی کے نقطہ خیال سے کہا جا سکتا ہے۔ اور ہم بعض خود پسندوں کی طرح اپنا تصفیہ خواہ مخواہ پبلک سے منوانا نہیں چاہتے۔ اس لئے اس بارہ میں صرف اسی قدر کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ اگر علماء کے فتوے اور امت کا اجماع اس فیصلہ کے ساتھ ہے تو مذہبی حیثیت سے ہم کو کوئی وجہ اعتراض کی نہیں ہو سکتی۔

قیدیوں کی رہائی اور تعمیر مسجد کے علاوہ دو امور ایسے ہیں جن کے متعلق خواہ مخواہ سوال پیدا ہوتے ہوں گے۔ ان میں سے ایک تو بیجا او

حضور وائسرائے کی تقریر

پنجشنبہ ۱۶ر اکتوبر ۱۹۱۳ء

حضرات!

جو ایڈریس آپ نے ابھی پڑھا ہے۔ اس سے مجھے بہت زیادہ اطمینان حاصل ہوا ہے۔ اس لئے کہ اس میں صرف میرے رحم او
نیات ہی پر اعتماد کا اظہار نہیں کیا گیا۔ بلکہ ایسی بات کی گئی ہے جس کی میں بہت زیادہ قدر کرتا ہوں۔ یعنی ہمارے ملک معظم کے ساتھ
اس وفاداری کا اظہار کیا گیا ہے جس کے متعلق میں یہ خیال کر کے خوش ہوتا ہوں کہ اس ملک کے مسلمانوں کی خصوصیت رہی ہے۔ اگر مجھے
آپ کی قوم کے وفادارانہ جذبات کا یقین واثق نہ ہوتا تو میں آج شملہ سے کانپور نہ آتا۔ میرے لئے یہ بالکل غیر ضروری ہے کہ جو یقین
میں نے پچھلی لیجسلیٹو کونسل کے اجلاس میں اس بارے میں دلائے ہیں کہ حضور ملک معظم کی رعایا کے مذہبی عقائد کے متعلق گورنمنٹ
ہند کی پالیسی میں کوئی تغیر نہیں ہوا ہے۔ اس کو پھر دہراؤں۔ اس لئے کہ آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ یہ ایک واقعی بات ہے۔ ترقی اور
تہذیب کی رفتار کے ساتھ یہ ہمیشہ ممکن ہے کہ سڑکوں، ریل اور نہروں کی تعمیر موجودہ مذہبی یا اور قسم کی عمارتوں کے ساتھ ٹکرائے۔ لیکن
آپ لوگوں کو یقین رکھنا چاہئے کہ گورنمنٹ کافی توجہ سے ان لوگوں کے تمام مطالبات پر غور کرے گی جن کے مفاد پر اس طرح اثر پہنچنے کا
اندیشہ ہوگا۔ اور ہمیشہ کوشش کرے گی کہ مسئلہ متنازع کو اس طور پر حل کرے جو تمام اشخاص متعلقہ کے لئے قابل اطمینان ہو۔ چونکہ میں
آپ کے لفٹیننٹ گورنر کے فیاضانہ اور مہربانہ کیرکٹر سے بخوبی واقف ہوں۔ اس لئے مجھے پورا بھروسہ ہے کہ اگر آپ بھی میرے ہی طرح
مسجد کا مل ڈھونڈنے میں فکرمند ہوئے تو سر جیمس میسٹن کی خواہشات کے متفق ہو جاتے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو ۳ر اگست کے افسوسناک
واقعات کبھی ظہور میں نہ آتے۔ اور بیواؤں اور یتیموں کو اپنے خاوندوں اور سرپرستوں کے لئے رونا نہ پڑتا۔ اب یہ تمام باتیں ہو رہی ہیں
اور مجھے امید ہے کہ لوگ انہیں جلد بھول جائیں گے۔ میں خاص شملہ سے اسی غرض سے آیا ہوں کہ آپ کے واسطے پیغام امن لاؤں۔ آپ
اپنے ایڈریس میں مجھ سے کہتے ہیں کہ آپ موجودہ صورت حالات کے مسائل اور نتائج کو فیصلہ کے لئے میرے ہاتھ میں چھوڑ دینے پر کلی طور سے
مطمئن ہیں۔ اس لئے کہ آپ کو یہ یقین ہے کہ میں تمہاری کمیونٹی کی طرف سے بہت اچھے خیالات رکھتا ہوں۔ یہ سب سچ ہے کہ میں تمہا
کمیونٹی کا بہی خواہ ہوں۔ اور میں نے اس معاملہ پر خاص توجہ مبذول کی ہے اور یہ کہ میں نے کامل غور و فکر کے بعد متنازع فیہ مسئ
کا ایک ممکن حل معلوم کر لیا ہے۔ میں اس فیصلہ پر پہنچا ہوں کہ ۸ فیٹ بلند ایک چھتہ بنا دیا جائے اور اس پر دالان اسی طرح اور اسی
پر تعمیر کر دیا جائے جیسا کہ پہلے سے موجود تھا۔ مگر پہلے سے ذرا بلندی پر، تاکہ نیچے اس طرح ایک سڑک نکل آئے جس سے مسجد کی متعلقہ عما
میں کسی قسم کی مداخلت اور فتور نہ ہو۔ میں اس امر کو کچھ بھی وقیع اور اہم نہیں خیال کرتا کہ وہ زمین جس پر دالان تعمیر ہوگا، کس کے قبضہ میں
گی، مگر یہ ضروری ہے کہ عام پبلک اور نمازی اسے بطور سڑک کے استعمال کرنے کے مجاز ہوں۔ علاوہ ازیں متولیوں کو ایک چھتہ دار محراب بنا لین
چاہئے اور ان عمارات کے نیچے بھی ایک گذرگاہ تعمیر کر لینی چاہئے جو میونسپل بورڈ کی مجوزہ تجاویز کے عین مطابق ہے۔

اور یتیموں کی مستقل امداد کا مسئلہ ہے اور دوسرے کانپور کے مقامی حکام کے طرز عمل کے حق یا ناحق ہونے کا سوال ہے۔ یتیموں اور بیواؤں کی امداد کی ضرورت کو گورنمنٹ کے ذہن نشین کرنا بہ لقمان آموختن کے مصداق ہے اور اگرچہ ہز ایکسیلنسی نے اپنی تقریر میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا لیکن ہماری یہ توقع بے جا ہوگی کہ ہز ایکسیلنسی اس ضرورت کی طرف سے غافل نہیں ہونگے۔ اور عنقریب اس کے لئے بندوبست فرمائیں گے۔ حکام کے طرز عمل کے متعلق ہز ایکسیلنسی کی خاموشی ان کی دانشمندی اور اعلیٰ تدبیر کی دلیل ہے ممکن ہے کہ یہ خیال کیا جائے کہ جب مسلمانوں نے کمال ایمان داری اور قانون ورزی کے ساتھ ان لوگوں کے طرز عمل پر اظہار ناپسندیدگی یا جو اینٹ پتھروں کو پھینکنے میں یا اور طریقہ جو قانون شکنی کی مرتکب ہوئے، تو حکام سے بھی جو کچھ بے اعتدالیاں اس موقع پر ہوئیں ان پر بھی تاسف کا اظہار ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اگر ملزموں کی رہائی بغیر شرط کے نہ ہوئی ہوتی تو ہم اس مطالبہ میں بالکل حق بجانب تھے کہ واقعات کی تحقیقات اور تفتیش کے عفو اور فراموشی کی تھی اس لحاظ سے ہم کے طرز عمل کی پوری تنقید غالباً ملزموں کو بغیر پرسش رہا کر کے عملی طور پر کر دی گئی ہے۔

بہر حال یہاں تک ہم اس کل کارروائی کو دیکھتے ہیں جو ۱۴ ار اکتوبر کو کانپور میں انجام پذیر ہوئی ہے، ہم کہہ سکتے ہیں مسلمانوں کے مطالبات کا بیشتر حصہ پورا ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ جس وقت ہز ایکسیلنسی کے اس ارشاد پر غور کرتے ہیں کہ "میں تمہارے باپ کی جگہ ہوں اور تم میرے بچے ہو" اور یہ فرمانا کہ مسلمانوں کو تمام گزشتہ واقعات بھول جانا چاہیے۔ ان تمام باتوں کا مجموعی اثر ہمارے نزدیک مسلمانوں کے لئے ہر طرح قابل اطمینان ہوگا۔ ہم کو امید ہے کہ مسلمان اس قضیہ نامرضیہ سے فارغ ہونے کے بعد اس قوت یگانگت کو جو اس وقت ان میں پیدا ہو گئی ہے، زائل نہ ہونے دیں گے بلکہ فوراً اس کو دوسرے مفید اور کارآمد مشاغل میں صرف کریں گے۔

تیرے ہی صدقے میں تو خاں بہادر ہوں میں

(پنجشنبہ ۱۸ ار دسمبر ۱۹۱۳ء)

پردہ ساز سے اک آتی تھی شیریں آواز — میں نے خوش ہو کے جو پوچھا تو کہا سر ہوں میں
پیار سے مجھ کو خوشامد بھی کیا کرتے ہیں لوگ — گوش منصب کے لئے بیش بہا دُر ہوں میں
بندہ جاہ کے لب پر ہوں اگر میں "جی ہاں" — خود غرض کی ہوں جو دل میں تو "تھنک" ہوں میں

دم میں کر دیتی ہوں حل عقدہ ماہ نیمل — یدیا ساری پڑھا دیتی ہوں وہ گُر ہوں میں
پالیسی بھی مجھے کہتے ہیں سیاست والے — جس کو ایمان سے نہ مطلب وہ تدبر ہوں میں
سن کے چپکے سے کہا میں نے قمر صدقتا
تیرے ہی صدقے میں تو خاں بہادر ہوں میں

سید قمر الدین احمد قمر
سندیلوی

... فی۔ تاہم اُن کے بارہ بجے ...
موجود ہوئے۔ مسٹر بوائز نے بیان کیا کہ لوکل گورنمنٹ کی ہدایات کے مطابق انہوں نے تمام ملزمین کے خلاف مقدمہ واپس لینے کی درخو...
اُن جو تین مختلف مقدمات کے ذریعے سپرد سیشن کئے گئے ہیں، مسٹر مظہر الحق نے جواب میں کہا کہ وہ بخوشی اس موقع کو قبول کرنے کے لئے
...یار ہیں۔ اس کے قیدی رہا کر دئے گئے۔ اور گاڑیوں میں بیٹھ کر جو پہلے سے اس غرض سے مہیا رکھی گئی تھیں وہ اپنے اپنے گھروں میں
پہنچا دئے گئے۔
خلقت کا اژدہام اس قدر تھا کہ پولیس کو مجمع کا انتظام کرنے میں بہت زیادہ دقت اٹھانی پڑی۔

مساجد کی حفاظت کے لئے پولس کی حاجت ہے
خدا کو آپ نے مشکور فرمایا، عنایت ہے
پنہائی جا رہی ہیں عالمانِ دیں کو زنجیریں
یہ زیورِ سیّد سجّادؑ عالی کی وراثت ہے
یہی دس بیس اگر ہیں کشتگانِ خنجر اندازی
تو مجھ کو سستی بازوئے قاتل کی شکایت ہے
شہیدانِ وفا کے قطرۂ خوں کام آئیں گے
عروسِ مسجدِ زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے
عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
کہ یہ بچّے ہیں ان کو جلد سو جانے کی عادت ہے
شہیدانِ وفا کے خون سے آتی ہیں آوازیں
کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محرومِ سعادت ہے

بلوائیوں پر اظہار نفرت:-

اب میں ان لوگوں کی نسبت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ جنہوں نے ۳ر اگست کو بلوہ کا ارتکاب کیا۔ میں آپ کے باپ کی جگہ پر ہوں اور آپ سب میرے بچے ہیں۔ جب بچے غلطی کریں تو یہ ان کے سرپرست کا فرض ہے کہ باوجود قلبی محبت کی ان کی تنبیہ کریں۔ تاکہ انہیں عقل آ جائے اور وہ دوبارہ ویسی ہی غلطی نہ کریں۔ میرے الفاظ کے مخاطب صرف آپ صاحبان ہی نہیں ہیں بلکہ وہ تمام لوگ جن پر بلوہ کے جرم کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اور جو گذشتہ دس ہفتوں سے جیل خانہ میں مقید ہیں۔ جو لوگ واقعی طور سے فساد کے مرتکب ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو غلطی میں ڈال دیا ہے۔ کہ ان پر قانون کا مقابلہ کرنے کا الزام لگایا گیا ہے۔ انہوں نے نہ صرف قانون کو توڑا ہے بلکہ اسلام کے امن وسیع اور مسلمہ اصول کی خلاف ورزی کی ہے جس پر ان کا ایمان ہے۔ گورنمنٹ کا فرض ہے کہ وہ قائم شدہ قانون کی پیروی کرے اور گورنمنٹ آف انڈیا کا افسر اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے یہ بات کہتا ہوں کہ قانون کا ادب ہمیشہ ملحوظ رکھا جائے گا۔ معمولی حالات میں گورنمنٹ کا یہ فرض تھا کہ وہ قیدیوں پر مقدمہ چلائے اور انہیں سزا دے۔ مگر وہ کافی سزا بھگت چکے ہیں۔ اور جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ میں کانپور اس لئے آیا ہوں کہ پیغام امن لاؤں۔ میں ان لوگوں پر بھی رحم کرتا ہوں جنہوں نے بلوہ کی اشتعالک دی اور اس طرح سے اس نقصان رسانی کے مرتکب ہوئے جو اب تک ہو چکا ہے اور اس لئے کسی خاص سلوک کے مستحق نہیں رہتے۔ مگر مسجد کے متعلق موجودہ مشکل کا حل ڈھونڈتے میں اس امر کے لئے فکرمند ہوں کہ جن واقعات نے اس قدر احساس اور جوش پیدا کر دیا ہے وہ بالکل بھلا دینے چاہئیں بہرحال مجھے بھروسہ ہے کہ اگر اشتعالک دینے والوں کے ساتھ رحم کیا جائے تو ان کی غیر معتدل فصیح البیانی کے افسوسناک واقعات ان لوگوں کے لئے باعث تنبیہ ہوں گے۔ اور نیز ان لوگوں کے لئے جو آئندہ اس طرح بے پروائی کے ساتھ تقریر کرنا چاہیں گے۔ میری خواہش ہے کہ جن لوگوں پر بلوہ میں شامل ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے ان کی تکلیفات ختم کر دی جائیں۔ اور اس لئے میں نے سر جیمس مسٹن اور آنریبل مسٹر ریلی کے ساتھ اتفاق رائے کرتے ہوئے لوکل گورنمنٹ سے درخواست کی ہے کہ وہ تعزیرات ہند کی دفعہ ۴۹۴ کے مطابق ان تمام لوگوں کے ساتھ کارروائی کرے جن کا بلوے کے ساتھ تعلق تھا۔ اور جو مقدمہ کے فیصلہ کے لئے سیشن سپرد ہو گئے تھے۔ مجھے پورے طور پر بھروسہ ہے کہ مسئلہ مسجد کا جو حل میں نے کیا ہے یا ماخوذین کے متعلق جو میں نے ابھی بیان کیا ہے اس سے نہ صرف کانپور کے مسلمانوں میں اطمینان ہو جائے گا بلکہ ہندوستان کی تمام مسلمان آبادی بھی مطمئن ہو جائے گی۔ مقامی اور بیرونی طور سے اب ایسی کارروائی کرنی چاہئے جس سے گذشتہ مہینوں کے واقعات کی افسوسناک یاد دلوں سے جاتی رہے۔ اور تمام مسلمان اپنے شہنشاہ کی وفاداری میں متحد ہو جائیں۔ اور اس خوبصورت زمین پر جہاں کہ ہم سب رہتے ہیں قانون کا انتظام، امن اور خوش حالی کے قائم و برقرار رکھنے کے لئے مقرر شدہ حکام کے ساتھ وفادارانہ اتفاق کریں۔

ہز ایکسیلنسی کے جواب کا خان بہادر مولا بخش مترجم نے اردو میں ترجمہ سنایا۔

ملزمین کی رہائی:-

ایک بہت بڑا مجمع سیشن عدالت میں ۱۰ بجے ملزمین کی رہائی کی امید میں کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ مسٹر لائل سیشن جج جو اس مقدمہ کی سماعت کرنے کے لئے خاص طور پر بلائے گئے تھے، عدالت میں موجود تھے۔ اگرچہ آج کی تاریخ مقدمہ کی سماعت کے لئے مقررہ

ت میں وقیع تر ڈیپوٹیشن پیش ہوا۔ لہذا انہوں کے ...

... کو محسوس کر کے دوبارہ اپنی نیک سرشتی و نرم دلی کے اظہار کے میلان کا تلمیحاً بھی ارشاد فرماتے تو ممکن تھا کہ ایک اور ڈیپوٹیشن انہیں وہ سہرا باندھنے کا موقع دیتا جو بالآخر نیک سرشت اور نرم دل وائسرائے کے سر بندھا۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

جو فیصلہ ہز ایکسیلنسی نے صادر فرمایا ہے وہ پیام امن کے نام سے معنون ہے اور جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں کہ وہ بہت دیر تک احتیاط کے ساتھ غور و خوض کرنے کے بعد اس فیصلہ پر پہنچے ہیں ہم بھی اسے دُور اندیشی تدبر اور باہمی مصالحت کا بہترین حل مشکلات سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ ہم اس عنوان میں نہ ماخوذین کی حیثیت پر بحث کرنا چاہتے ہیں اور نہ ان افسروں کی حیثیت پر جو اس مقدمہ میں ذی شانی کا درجہ رکھتے تھے۔ اب ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ عہدہ داران کانپور بھی اس وقت گذشتہ قصہ کو بھلا کر اس ملاپ کی قدر کریں گے جو حضور والا وائسرائے کی ذات بابرکات نے آپس میں کرا دیا ہے اور مسجد کے متعلقہ ان جزئیات کو لطف و آشتی کے س... طے کریں گے جو مقامی افسروں کی فرزانگی پر چھوڑ دی گئی ہیں۔ خدا کرے کہ مسلمان کانپور کو دائمی امن و امان نصیب رہے اور افسروں کے س... ان کے تعلقات خوشگوار رہیں، اور ہم امید کرتے ہیں کہ ایسے ہی رہیں گے۔

جھکی ذرا وہ چشم جنگ جو بھی نکل گئی دل کی آرزو بھی
بڑا مزا اُس ملاپ کا ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

وائسرائے کی تقریر پر ایک نظر

۱۸ اکتوبر ۱۹۱۳ء

وائسرائے نے واقعہ کانپور کو حاکم و محکوم یا راعی و رعیت کا مسئلہ نہیں بنایا۔ بلکہ اسے خانگی رنجش سے تشبیہ دی ہے، جو
باپ اور بیٹے میں بھی غلط فہمی سے پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ اس تشبیہ کو استعمال کرتے ہوئے وائسرائے نے اپنی انتظامی حیثیت گورنر جنرل
یا اجلاس کونسل کو مدنظر نہیں رکھا۔ اور نہ ماخوذین مقدمہ کو اس نظر سے دیکھا ہے جس نظر سے لوکل گورنمنٹ اور عدالت دیکھتی ہے بلکہ
اس میں انہوں نے زمرۂ سول سروس اور افراد رعایا کو ایک ہی پدری سلطنت کا جزو خیال کیا ہے۔ جن کی یک جہتی، موافقت و موانست میں
حظ اور انبساط اس فرمانروا کے لئے ہے جو دونوں سے سلطنت کے بقا و قیام امن و آسائش، فلاح و بہبودی کو قائم و مستقل رکھنے کا متمنی
ہے۔ اور جس نے اپنے گورنر جنرل کو ظل الٰہی کا دامن پھیلانے کے لئے بھی سرفراز کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کارپردازان جلسہ دہلی کو جنہوں
کی ستائی کا اعلان کر کے اپنی وفاداری کے صدقہ میں قوم کے لئے توقیع خوش دلی لانا چاہتے تھے لطف آمیز لہجہ میں سبق دیا ہے کہ شہنشاہ
عالم پناہ کے نائب اور گورنمنٹ ہند نے کبھی اہل اسلام کی وفاداری میں شبہ نہیں کیا۔ اور مسلمان ہمیشہ سلطنت کی عقیدت مندی و وفاکیشی
میں سرگرم رہے ہیں اور یہی یقین واثق ہے جو ان کو شملہ سے کانپور تک لایا ہے۔

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ۝

اگر حضور وائسرائے کے ان دونوں خیالات کو ملا کر پڑھا جائے تو اس سے صاف یہ ٹپکتا ہے کہ کم از کم اس معاملہ میں سلطنت کے دل میں اگر کچھ
رنج تھا تو اتنا ہی جتنا کہ ایک شفیق باپ کے دل میں اپنی نوجوان اولاد کی آزاد روی سے پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ ورنہ حقیقت میں نہ تو نوجوان
اولاد کی منشا گستاخی تھی اور نہ شفیق باپ نے اسے گستاخی سمجھا۔ اور نہ اس کی اس روش پر دوسرے بھائیوں کی دل سوزی و رفاقت کو دوسرے
بیٹوں کی تمردی پر محمول کیا۔ یہ ایک طریق جہانبانی ہے جو متفرقوں کے دل کو مٹھی میں کر لیتا ہے۔ اور یہی ایک ادا ہے جو انہیں واقعی مرغوب
کر سکتی ہے۔ اور انہیں بندۂ بے دام بنا لیتی ہے۔ جو صدمہ کہ حضور وائسرائے کو ملک کی اس "خانگی رنجش" سے ہوا ہے۔ اس کا اظہار وہ موثر
پر درد بھرے دل کے ساتھ ظاہر کر چکے ہیں۔ مگر ہم کو معلوم ہے کہ آج تک جو وہ ہمارے زخموں پر مرہم نہیں رکھ سکے اس کے فراہم وہ معاندین
رہے ہیں جو فرزندان سلطنت کے ساتھ وہ پیار اور محبت بھرا رشتہ قائم رکھنا نہیں چاہتے۔ جیسے ظل اللہ کے نائب مستحکم کرنا چاہتے ہیں
بلکہ وہ صرف وہ تعلق رکھنا پسند کرتے ہیں جو ایک غالب و مغلوب یا نادر و دہلی میں ہو سکتا ہے۔ ورنہ جہاں تک آپ کو معلوم ہے یہ خیر
بہت پہلے فریاد و مصیبت کو داد و راحت سے بدل دیتا۔ بہرحال ہم مشکور ہیں ان ذی منزلت صاحبان کے بھی جنہوں نے حضور وائسرائے
کی سوز قلبی کے ساتھ سازہ کا سر ملایا۔ اور احسانمند ہیں آنریبل مسٹر سید علی امام اور آنریبل مسٹر ہیلی قائم مقام لفٹیننٹ گورنر کے جنہوں نے
کانپور تشریف لا کر اس رشتہ کو مضبوط کرنے میں قابل ستائش امداد دی۔

اور رہا مسز جیمس کا تعلق ۳ اگست کے حادثہ سے حضور وائسرائے انہیں نیک سرشت اور نرم دل فرماتے ہیں اور ہم بھی کبھی انہیں

ادا کر دیا جائے۔ ان کے متعلق کوئی بے ہودہ لفظ زبان سے نکالا جائے۔ وہ لوگ شکریہ کے مستحق ہیں۔ اور ان کی قدر ہم پر لازم ہے۔ اب
اس معاملہ میں آخر امر صلح کے متعلق عرض کرتا ہوں۔ مجھ سے ان حضرات نے کہ جن پر مجھے پورا بھروسہ ہے مثلاً مسٹر مظہر الحق اور راجہ صاحب محم
آباد نے مشورہ دریافت کیا کہ آیا مصالحت مناسب ہے یا نہیں۔ میں نے جس حد تک میری قوت غور و فکر کے میری مساعد ہوئی تمام جوانب کا لحا
کر کے مسلمان کی بڑی فتح و ظفر پیام صلح ہی کو تصور کیا۔ اور میں نے کہا کہ ایک مدت سے پریشانیوں اور افکارات میں مبتلا ہو جانے سے طبائع
تھک جانا زیادہ متوقع ہے۔ اس واسطے اگر احترام اسلام کے ساتھ مصالحت ہو تو بے حد غنیمت ہے۔ میں ان حضرات کا نہایت دل سے شکر
ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس مشورہ کی قدر کی اور جس کوشش میں یہ تھے اس کو انجام تک پہنچا دیا۔ میرا خاص تعلق مسئلہ شرعی سے تھا۔ مجھ سے ا
اہم اور ضروری مجبوریاں اور احتیاج اہل اسلام کا ذکر کیا گیا جن کو لحاظ کر کے میں نے اسبات کا وعدہ کر لیا کہ تا بامکان میں ایسی صورت شرعی نکا
جس سے اس مخمصہ سے بھی نجات ہو جاوے۔ اور مسلمانوں کی عزت بھی باقی رہے۔ اور گورنمنٹ کا وقار بھی قائم رہے۔ مگر مسجد کے معائنہ کے
اور علماء سے مشورہ لے کر میں ایسا کر سکتا ہوں۔

چنانچہ میں کانپور گیا۔ اور مسجد دیکھی واقعات سنے مجھے اگرچہ پہلے انتشار تھا کہ جزو جزو مسجد ہے یا نہیں جیسا کہ گذشتہ جلسہ مؤید الاسلا
میں نے اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔ مگر مسجد کے دیکھنے سے اور وہاں کے احوال سننے سے اس امر کو تسلیم کر لینا پڑا کہ جزو متنازعہ جزو مسجد ہے
اس کے بعد مجھ سے مخلص نکالنا بہت مشکل ہو گیا۔ میں ہرگز کسی طرح یہ نہیں کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانوں کو کسی جزو مسجد کو کسی دوسرے مصرف میں لانا جا
میرا خیال ہے کہ جزو جائز الانہدام تھا۔ بلکہ میں یقین کرتا ہوں کہ اس جزو کے اصل مسئلہ سے زیادہ اس کی طرز انہدام نے اہم کر دیا تھا۔
واقعہ ہائلہ۔ اگست ۱۳ء نے تو احترام اسلام کا سوال پیدا کر دیا۔ اور شعائر اسلام کی ہتک ہونے میں کسی کو بھی شبہ باقی نہیں رہا۔ میں
چاہا کہ عام طور پر علماء سے مشورہ کر لوں مگر مجھے اخفائے راز کی ذمہ داری اس سے مانع ہوئی۔ جن اکابر پر اعتبار کر کے ان سے ذکر کیا تو
علالت و دیگر اسباب مجھے کافی مدد ملنے کی توقع جاتی رہی۔ ناچار میں نے اپنے اعزہ اہل علم سے ضرورتاً اس مسئلہ میں مذاکرہ کیا۔ میر
وحیلہ اس کا یہ سوچا کہ جزو متنازعہ کے درمیان مسجد کا دروازہ کر دیا جائے۔ اور اس حصہ زمین کو سڑک سے مرتفع کر کے بنایا جاوے، سہ در
بازوؤں کے رخ اگر دروازے ہوں تو بہتر ہے اس کی چھت کے برابر صحن مسجد کر دیا جاوے۔ نیچے اس کے ممبر مسجد کا ہو، اگر ضمناً کوئی دوسرا شخص
طرف سے اس طرف گذر جائے تو ہم اس کو مانع نہیں۔ ضرورت کے وقت اجازت ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ احترام اس جزو کا مثل احترام
مسجد کے قائم رہے۔ اور ممبر میں جو امور ضرورتاً جائز ہیں۔ ان کے سوائے کوئی امر خلاف آداب مسجد نہ ہو۔ ہمارے احباب کو یہ صورت پسند
نے مشروط کر دیا کہ یہ مخلص بھی اس وقت اختیار کیا جائے جبکہ علمائے کانپور اور دیگر افراد اہل فضل و علم کی بھی خواہش ہو۔ جہاں تک علما
ل سکا ہمارے ذمہ دار احباب نے مشورہ کیا، جو وجہ کہ مجھے اس مخلص کے نکالنے کی درپیش ہوئی وہی ان کو بھی ضروری و اہم معلوم ہو
کہ انہوں نے اس شرط پر تسلیم کیا کہ یہ نظیر آئندہ کے لئے نہ ہو۔ بہر حال ہمارے تین مطالبات پیغام صلح کے جواب میں ضروری تھے۔ ا
دل میں ہم نے ان کو معراز صلح تو نہیں گردانا تھا۔ مگر ایک ایک ہی حیثیت سے پیش کئے گئے تھے اول یہ کہ مسجد کے جزو پر ہم کو قبضہ د
بکسے ہم حقیقتاً مستحق ہیں۔ ہم سے کوئی معاہدہ اس شرط اسی واپسی مورخہ ۲۴ رجولائی ۱۳ء کی کاروائی میں نہ ہو مگر ہم اعتماد رکھتے ہیں
احترام احکام گورنمنٹ کا خیال کیا جائے گا۔ جس تک مذہب اجازت دے۔ چنانچہ صورت بالا پیش کی گئی تھی۔

دوسرے یہ کہ تمام مجرمین پر سے مقدمہ اٹھا لیا جائے۔ معافی کی درخواست کی حاجت نہیں۔

مسجد کانپور کے فیصلہ پر ایک نظر

(نوشتہ مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ

حَامِدًا وَّمُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

یکشنبہ ۱۹ر اکتوبر ۱۹۱۳ء

میرے اکابر حضرات اور میرے اعزہ و دیگر احباب اس وقت مجلس موید الاسلام کے دفتر جلسہ میں موجود ہیں۔ جس کے اکثر اجلاس اس دو سال کے عرصہ میں فرنگی محل میں ہوئے اور اس میں یہ حضرات شریک ہوتے رہے ہیں۔ مگر اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا جس قدر دشواریوں کا زمانہ اور مصائب و امتحان کا وقت تھا وہ بطن غالب گذر گیا۔ اس واسطے اس جلسہ کو ان جلسوں سے بلحاظ نوعیت کے فرق ہے۔ وہ مجلس ماتم کی ہوتی تھیں اور یہ مجلس سرور ہے۔ ہم کو نہایت مسرت سے آپ حضرات کی خدمت میں یہ عرض کرنا ہے کہ دو سلطنت ٹرکی کو سکون اور طمانیت کی امید ہوئی۔ ادھر مسلمانان ہند کو اطمینان اور دلچسپی نصیب ہوئی۔ چونکہ آخر الامر میں مجھے بھی ایک تعلق ہے اس واسطے میں مختصراً مگر جامع تقریر میں ضروری امور گذارش کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ اور اہم امور کے ظاہر کرنے سے بھی موقع اور محل کے لحاظ سے کچھ عذر نہیں ہے۔ وقت سے ان کو بھی بیان کر سکتا ہوں۔ لیکن اس وقت چونکہ بے محل ہے اس واسطے ان کے عرض کرنے کی جرات نہیں کرتا۔ میرا مدعا اصل حال سے باخبر کر دینا ہے، میری غرض یہ نہیں ہے کہ میں قوم کے مسلم محسن مسٹر مظہر الحق اور مسٹر راجہ علی محمد خاں صاحب کو لوگ بُرا بھلا نہ کہیں۔ کیونکہ ہماری کارروائیاں جن حضرات کے خلاف فوائد اہل اسلام معلوم ہوں۔ ان کو حق ہے کہ وہ ہم سب نکتہ چینی کریں۔ اور جو لوگ ہم سے کسی طرح کی مخالفت رکھتے ہیں وہ بھی اس کے مستحق ہیں۔ کہ ہماری ان کارروائیوں کو بطور استحسان نہ دیکھیں۔ میں اس واسطے اس امر کو خود تسلیم کرتا ہوں۔ کہ مجھ میں بہت سی کمزوریاں ہیں۔ میں خود غرض، جاہ طلب، خوشامدی، قوم فروش ہوں۔ خدا میرے خبیث وجود سے یا تو دنیا کو پاک کرے یا مجھ سے ان عیوب کو دفع کر کے مجھ کو پاک کرے۔ میں ان دوستوں کا دل سے اور خدا کی قسم دل سے مشکور ہوتا ہوں جو میرے عیوب مجھ سے خود یا لوگوں سے کہہ کے میرے اوپر غائبانہ شفقت کا احسان رکھتے ہیں۔ یہ لوگ تو میرے محسن ہیں۔ میں ان صاحبوں کی بھی بہی خواہی کرتا ہوں جو مجھ سے اس قدر ناخوش ہیں۔ کہ مجھ کو اور میرے وفات یافتہ بزرگوں کو نہ فقط بُرا بھلا کہتے ہیں۔ بلکہ فحش گالیاں دیتے ہیں۔ یہ امر میں نے شکایت سے نہیں کہا ہے بلکہ واقعتاً ان صاحبوں کو اپنے اصل خیالات سے آگاہ کرتا ہوں۔ یہ بھی گذارش خلاف نہ ہوگی کہ مجھے اپنے واجبی عیب چینی پر عقلاً ناراض نہ ہونا چاہئے اور غیر واجبی کا تبادلہ خدا نے اپنے فضل و کرم سے خود ہی کر دیا ہے کہ انہیں کثیر التعداد افراد کا میری طرف حسن ظن اور عقیدہ نیک پیدا کر دیا ہے بلکہ انکے قلوب کو میری جانب متوجہ کر دیا ہے جو مجھ کو اپنے دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور مجھ پر جان نثار کرنے کو اپنی نجات تصور کرتے ہیں۔ میں خدا کا جس قدر شکر کروں وہ بجا ہے۔ مگر اس وقت آپ کے سامنے یہ ضرور افسوس سے کہوں گا کہ دیگر بہی خواہان قوم اور خدام اسلام ایسے نہیں ہیں کہ ان کی خدمات کو تسلیم

...ایت اس وجہ سے ابتر ہوگئی کہ ہم کو نہایت معتبر طریقوں سے معلوم ہو گیا کہ معاملہ جزو مسجد میں حضور وائسرائے بالقابہ نے ہمارے صو...

کے اعلیٰ افسر مسٹر جان ہیولٹ بالقابہ سے خاص تاکیدی حکم فرمایا کہ ان کی تعمیر میں احکام اسلامیہ کے احترام کو ہر طرح مدنظر رکھنا چاہئے...

ایسی نیک نام صفات حاکم مسٹر جان ہیولٹ بالقابہ کی موجودگی میں ذرہ برابر بھی اس کا اندیشہ نہیں کہ ہمارے واجبی مطالبات اتباع احـ...

اسلامیہ دوبارہ جزو مسجد نظر انداز کئے جائیں گے -

ہم کو بالخصوص اس معاملہ میں جناب نواب مسٹر علی امام صاحب اور جناب نواب اعلیٰ افسر صوبہ مسٹر جان ہیولٹ کا دل سے مشکور ہونا...

جنہوں نے اس وقت ہماری حسب دلخواہ اور آئندہ بھی ہم کو اپنی تائید کرنے کا وعدہ فرمایا ہے کل کا واقعہ نہایت مسرت خیز ہے ۔ اور ا...

تاریخ کے زرین ایام میں سے کل کا روز ہے - میں پھر حضور وائسرائے اور ان کے اسٹاف اور اپنے معزز ترین بھائی مسٹر علی امام صاحب...

صوبہ کے اعلیٰ افسر مسٹر جان ہیولٹ کا دوبارہ شکریہ ادا کرتا ہوں - اور علماء سے اپیل کرتا ہوں کہ جس طرح ان حکام سے جنہوں نے اس...

احترام کا لحاظ نہیں رکھا جارہا شکایات تھی اسی طرح ان حکام سے جنہوں نے ہر طرح اسلام کا احترام قائم رکھا اور آئندہ رکھنے پر تیـ...

واجبی طور پر شکریہ ادا کیا جاوے -

اب میں اپنے بھائیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنے فرائض ادا کئے - بلکہ اس سے پہلے ان گرامی مرتبہ نفوس کے...

دعائے مغفرت کرتا ہوں جنہوں نے خدا کے گھر کی حفاظت میں اپنی عزیز جانیں قربان کی ہیں - میں تمام مسلمانان ہند کی فیاضی...

ہمدردی اور اخوت کا دل سے مقر ہوں اور باہمی اتفاق کے لئے دست بدعا اور ہر طرح سے ساعی رہنا اپنا فرض تصور کرتا ہوں...

تمام آفات ارضی و سماوی سے ان کو محفوظ رکھے اور سچے اسلامی درد میں روز بروز اضافہ ہو اور فلاح دارین عطا فرمائے - آمین -

عام طور سے شکریہ ان وکلاء اور قانون پیشہ حضرات کا ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنے مالی نقصان کا خیال نہ کر کے کامل ہمدر...

دیا۔ مثلاً مسٹر حافظ الدین حسن صاحب، مسٹر محمد وسیم صاحب، مسٹر محمد نسیم صاحب، مسٹر راس مسعود صاحب، مسٹر رضا علی صاحب، مسٹـ...

صاحب، خواجہ عبدالمجید صاحب، مسٹر محمود صاحب و دیگر حضرات - یہ لوگ مستحق شکریہ کے ہیں - ان کی قدر ہمارے دلوں میں ہے -...

شکریہ میں تین حضرات کا ادا کرتا ہوں - سب کے پہلے مستقل مزاج خطرات سے ڈر نہ رکھنے والا فدائے قوم مسٹر سید فضل الر...

وکیل کانپور کا ہم کو مشکور ہونا چاہئے - ان کی ثابت قدمی اس وقت جبکہ ان کا کوئی ہاتھ تھامنے والا موقع واردات پر نہ تھا - ان...

کا اندازہ نہیں ہو سکتا - انہوں نے اپنی سچی ہمدردی اسلام کا ثبوت دے دیا - ہمارے اختیار میں اس کے مکافات نہیں -

بجز اس کے کہ ہم ان کے مشکور ہوں - اور ان کے لئے فلاح دارین کی دعا کریں - ان کے بعد میں اس شخص کا نام لوں گا جس...

کا شیرازہ باندھا - اور جس نے اپنے اوپر حیثیت سے زیادہ بار لاد لیا - اور گھر بار چھوڑ کر کانپور کو اپنا مسکن بنا لیا - مسٹر مظہر الحـ...

کے واسطے کسی وصف کا ذکر کرنا بے محل ہے ان کے ظاہر سے باطن بہت اچھا ہے اور مجھے اپنے نفس سے زیادہ ان کے دل میں...

درد معلوم ہوتا ہے - دوسروں کے متعلق میں نہیں کہہ سکتا - ان کا جہاں تک شکریہ ادا کیا جائے وہ کم ہے - خدا جزائے خیر دے...

ان سب کے بعد —— خاص طور پر اپنے محترم عزیز سر راجہ علی محمد خان صاحب والی ریاست محمود آباد کا شکریہ...

مستغنی عن الالقاب اس طرح اپنی ذمہ داریوں کو انجام دینے کے لئے خطرات کے مقابل ہو گئے جو انہیں کا کام تھا - ان کا اگـ...

کہا ان کی عزت اگر دلوں میں نہ ہو تو میں سمجھوں گا کہ ایسے دلوں میں حیات نہیں ہے - میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور ان کے...

تیسرے یہ کہ ایک قاعدہ بنا دیا جاوے کہ آئندہ تحفظ مقامات متبرکہ سے مسلمانوں کو اطمینان ہو اور بدقسمتی سے پھر ایسی غلطی نہ ہو جس سے مسلمانوں کو بے چینی پیدا ہو۔

چوتھے یہ کہ ان لوگوں کی خاطر خواہ تنبیہ ہو کہ جس سے آئندہ ہماری جانیں ضائع نہ ہوں۔

پانچویں یہ کہ جو عزیز جانیں مسلمانوں کی تلف ہوئیں ان کی تلافی تو ناممکن ہے مگر ان کے پس ماندگان کی اشک شوئی ہو جائے۔

چھٹی یہ کہ اخبارات سے جو اس معاملہ میں ضمانتیں لی گئی ہیں ان سے درگذر کیا جائے۔

حضور وائسرائے بہادر نے تمام معاملات کے تصفیہ کے لئے بالآخر نواب لفٹیننٹ بہادر اور نواب مسٹر علی امام ممبر کونسل کو کانپور بھیجا۔ ما بہ النزاع امور سے صرف بالائی تین دفعات معرض بحث میں آئے۔ اول حصہ کے متعلق بہت زیادہ مجھ سے اور ممبروں سے گفتگو ہوئی۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ احکام مذہبی میں کوئی کچھ نہیں دخل دے سکتا۔ حقیقتاً جس طرح سے کہ وہ حصہ لے گیا ہے اسی طرح سے واپس کیا جائے۔ نہایت تنزل اور بقول ضعیف اور مخلص کے طور پر صورت مجوزہ ہے۔ اگر اس پر بھی رضامندی نہیں ہوتی تو بجز حکام کو اختیار ہے۔ آخر میں یہ بھی کہہ دیا کہ میں بری الذمہ ہوں۔ علمائے کرام کی ایک مجلس جمع کی جائے۔ وہ اگر اس صورت کو جو ہم سے کہی جاتی ہے منظور فرمائیں مجھے قطعاً دریغ نہ ہوگا میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا ہوں۔ اس گفت و گو میں تمام وقت صرف ہو گیا۔ مصالحت کی امید منقطع ہو گئی۔ اس وقت میں نے یہ صورت پیش کی کہ سردست حضور والیسرائے ہم کو دالان کی چھت پر قبضہ دے دیں کہ ہم بنائیں اور نہ میں بھی دیدیں۔ اس کو بھی ہم ہی بنائیں حسب قواعد میونسپلٹی جو تمام عمارات کی راسط عام ہے۔ پھر ہمارا اور میونسپلٹی کا معاملہ ہو جائے گا۔ اس کو تمام قانونی حضرات نے پسند کیا اور میں نے اس لئے اس کو اپنی صدارت مجوزہ سے بھی بہتر خیال کیا۔ کہ قواعد میونسپلٹی سے ممکن ہے کہ ہم کو بہترین موقع اس کے حاصل کرنے کا ہو۔ اگر نہ ملا تو ہم مجبور ہیں۔ ویسے ہی تصور کریں گے جیسا کہ اس وقت دہلی کی جامع مسجد میں ہے ہماری مسجد ہے۔ مگر صحن میں وہ احترام نہیں کرا سکتے ہیں جس کے ہم مستحق ہیں۔ انگریزوں کو جوتا پہن کے آنے سے روک نہیں سکتے۔ لیکن ہم کو امید ہے کہ وقتاً فوقتاً اس جانب گورنمنٹ کو متوجہ کرتے سے ہمارا مطلب حاصل ہو جائے گا۔ اس کے واسطے نہ اس قدر جوش و خروش کی ضرورت ہے نہ اتنی بے چینی سے فائدہ دیوانی کے مقدمات کا ہر وقت اختیار ہے مسلمانوں کو مذہبی احکام کی چارہ جوئی ہر وقت ممکن ہے غرض کہ اول کی تینوں دفعات حسب دل خواہ ہو گئیں۔

کل حضور وائسرائے تشریف لائے حسب تجویز مجھ سے مسجد متنازعہ میں پارہ بنانے کی خدمت لی گئی۔ میں ان کو محسن اول اسلام تصور کرتے کی وجہ سے اس عزت کو انجام دینے کے لئے تیار ہو گیا۔ حضور وائسرائے نے نہایت خندہ پیشانی سے اس کا شکریہ ادا کیا اور اظہار مسرت کے ساتھ کہا کہ یہ مسجد نہایت عالیشان مستحکم بنائی جائے۔ شاہی عطیہ بھی مسلمانوں کو اس کے واسطے دیا جائے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ جو کچھ تباہی اس واقعہ سے مسلمانوں کی ہوئی تھی اس کے کچھ مکافات جناب کی اس مخصوص سرفرازی سے ہو گئے۔ میں جہاں تک اپنے علم سے کام لیتا ہوں مجھے یہ پہلا موقع معلوم ہوتا ہے کہ جب مجرمین کو رہائی دلانے کے واسطے خود حاکم وقت اور بادشاہ ہند کو تکلیف گوارا کرنا ہوا۔ میں خاص طور پر اس کو مسلمانوں کے احترام سے تعبیر کرتا ہوں۔ اور اسلام کی عزت سمجھتا ہوں۔ اور جناب وائسرائے والقابہ کی انتہائی مہربانی تعبیر کر کے انتہائی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور تمام مسلمانوں سے توقع ہے کہ اس امر میں میرے ہم خیال اور ہم زبان ہوں گے۔

اس کے بعد موافق تجویز دیرینہ تینوں مقاصد ہمارے حاصل ہوئے۔ تقریر کے الفاظ کی نشست اور طرز ادا نہ مجھے اس سے واقفیت نہ اس کی طرف کوئی التفات کرنا چاہئے۔ مجموعی حیثیت سے ہم اس خاص مہربانی میں حضور والیسرائے کے دلی شکر گذار ہیں زیادہ

تصفیۂ کانپور پر ایک نظر

چہار شنبہ۔ ۲۲۔ اکتوبر

تصفیہ کانپور کے متعلق اب تک ہم کو جس قدر واقفیت ہو سکی ہے عام طور پر مسلمان ایک حد تک اظہ
اطمینان کر رہے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں کا جو مطالبہ مسجد کے متعلق تھا وہ لفظ بہ لفظ پورا نہیں کیا گ
لیکن یہ بات بھی ضرور تشفی بخش ہے کہ جو کچھ تصفیہ ہوا ہے وہ احکام شرع کے مطابق ہے۔ مساجد کا شمار اوقاف میں
اور اوقاف میں کسی قسم کی ترمیم جو اغراض اوقاف کے خلاف ہونا جائز نہ ہے۔ ایسی حالت میں مسجد میں اگر کوئی ترمیم ہو سک
تھی تو وہ صرف نمازیوں کے لیے ہو سکتی تھی۔ چنانچہ مسجد مچھلی بازار میں جو ترمیم کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ زمین سے کم سے کم آ
فیٹ بلند ایک چھتہ بنا لیا جائے جو سابق کی طرح وضو خانہ اور غسل خانہ وغیرہ کے کام میں آئے، اور نیچے ایک محراب د
راستہ نمازیوں کی آمد و رفت کے لیے ہو، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس صورت کے اختیار کرنے کی وجہ صرف یہی ہے کہ میون
کو پیدل چلنے والوں کے لئے راستہ مل سکے، لیکن چونکہ کل عمارت متولیوں کی طرف سے تعمیر ہوگی اور قبضہ دراصل متولیوں ہی کا
گا اگرچہ حضور وائسرائے نے کسی مصلحت کی بنیاد پر صاف لفظوں میں اس کا اظہار مناسب نہیں سمجھا اس لئے ہماری دانس
تمام درپیش شدہ معاملات کے لحاظ سے فیصلہ مسلمانوں کے موافق اور قابل اطمینان ہے۔ قیدیوں کی رہائی کا حکم دیتے ہو
ہز اکسیلنسی کا یہ کہنا کہ وہ کافی سزا بھگت چکے۔ ممکن ہے کہ بعض دلوں میں کھٹکے خصوصاً اس لیے کہ ان پر ابھی تک کوئی جرم ثا
ثابت نہیں ہوا۔ لیکن ہم کو اس فقرے پہ تنہا نظر نہیں ڈالنی چاہیئے بلکہ کل تقریر کو مجموعی حیثیت سے دیکھنا چاہیئے اور اس میں ک
شبہ نہیں کہ ہز ایکسیلنسی کی پوری تقریر اور ماخوذین کے مقدمہ کا تصفیہ انسانی شرافت، انصاف، ہمدردی اور رعایا پرور
اعلیٰ نمونہ ہے جس کے ساتھ ساتھ سیاست کو بھی انہوں نے ملحوظ رکھا ہے۔

مسجد کی بے حرمتی اس کو گرانے اور اس کے بعد اس مقدس سرزمین پر معصوموں کو خون ریزی سے ہوئی تھی اس کا کف
ہم نہیں سمجھتے کہ کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن ہز ایکسیلنسی کا محض اس کام کے لئے سے کانپور آنا اور تمام امور متنازعہ کا خود فیص
اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے واقعہ کی اہمیت کو بہ خوبی سمجھا، اور اگر فیصلہ میں کوئی کمی رہ گئی ہے تو ہم اس کو ان

بدعا ہوں کہ خدا ان کو سلمانوں کی ہمدردی کا اجر عطا فرمائے - اور آفات ارضی و سماوی سے محفوظ رکھے -

آخر میں وہ امر جو اول میں کہنے کے قابل تھا ذکر کرتا ہوں - وہ انہیں اسلامی اخبارات کی خدمات ہیں بالخصوص "زمیندار" "الہلال" "ہمدرد" - "توحید" - وغیرہ انہیں کا سب یہ اثر ہے جو ہم عام احساس مسلمانان ہند میں پاتے ہیں -

ہم کو ماننا پڑ گیا کہ یہ ہماری زبان و ہماری قوت بازو، ہمارے سچے خیر خواہ ہیں - انہوں نے گورنمنٹ کی بھی سچی خدمات انجام دیں ان دشواریوں کو تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ اپنے اوپر برداشت کریں، حکام عالی مقام کو ان سے معاف کرائیں، ان کی ضمانتیں واپس کرائیں، اگر اس میں ناکامی ہو تو خود مسلمان ان کو ادا کریں ان کی تائید میں اپنی تابندہ ہے -

اس کے بعد مجھے اس کی بھی امید ہے کہ روپیہ مجتمعہ کو اچھے مصرف میں لانے کی تدبیر سوچنا چاہئے - پس ماندگان شہدا کی تائید اور مسجد کے استحکام سے جو بچے وہ بھی عمدہ مصرف میں صرف ہو -

حقیقتاً ان سب امور میں مستحق حمد و شکر وہی ذات ہے جس نے ہم کو نبی کریم کا ایسا نبی عطا فرمایا - اسلام نے ایسے جہانگیر و عالمگیر مذہب کی ہم کو ہدایت کی - تمام مسلمانوں کو ایک اخوت کے سلسلہ میں جکڑ دیا - وقتاً فوقتاً اس نے ہماری غفلتوں سے ہم کو متنبہ کیا - اس کے غضب میں بھی رحمت مضمر رہی - اسلام کے لئے عزت اور عزت کے لئے مسلمانوں کو پیدا کیا -

فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ اَوَّلِہٖ وَاٰخِرِہٖ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی نَبِیٍّ لَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ - وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ۝

مسجد سے خطاب

(ترجمانِ حقیقت مسٹر حامد اللہ صاحب افسر کی تازہ نظم)

اے عبادت گاہ مسلم سجدہ گاہِ بے کساں — خانۂ اخلاقِ عالم بابِ مقصودِ جہاں
جلوہ فرما ہے تجھی میں شاہدِ حسنِ ازل — تیرا ہر گوشہ ہے محبوبِ حقیقی کا نشان
پیاری مسجد تیری ہر اینٹ کوہ طور ہے — ذرہ ذرہ میں ہے تیرے نورِ حق جلوہ فشاں

ہے سحابِ لطف جلوہ سقف پر انوار کا
ظلِ سبحان ہے سایہ تیری دیوار کا

تو مدینہ والے مولا کی ہے زندہ یادگار — تجھ سے قائم ہے ہمارے دین کا جاہ و وقار
ساری دنیا میں حفاظت دل سے ہوتی ہے تری — ہر جگہ یکساں تجھے حاصل ہے عزّ و افتخار
زندگی تجھ پر فدا ہو یہ ہے اپنی زندگی — مسلم دل ریش کہلاتے ہیں تیری جان نثار

کچھ تیری تقدیس پر دھبہ نہ آنے پائے گا
تو ہو بے حرمت کبھی ہم سے نہ دیکھا جائیگا

پر محمول کرتے ہیں جو ہز ایکسیلینسی کے راستہ میں یقیناً پیش آئی ہوں گی، جو شخص گورنمنٹ ہند کے نظام کو بخوبی سمجھتا ہوگا وہ ان مشکلات سے بھی آگاہ ہوگا جو کسی امر کے فیصلہ اور بالخصوص ایسے فیصلہ میں پیش آسکتی تھیں۔ جس میں مخالفین کو اقتدار کے مسئلہ پر بحث کرنے کا موقع ملے۔ ہم حضور لارڈ ہارڈنگ کی نیک دلی شرافت اور صلح گستری کی ذاتی اوصاف سے بخوبی واقف ہیں اور مسلمانوں سے عام طور پر امید رکھتے ہیں کہ کم سے کم اس ذات کے ضرور مشکور ہوں گے جس نے ان کے احساسات کو سمجھا اور ان کے مذہبی جذبات کے احترام کا باوجود سیاسی دشواریوں کے لحاظ کیا۔

مسلمانوں سے ہز ایکسیلنسی نے کہا ہے کہ وہ کل واقعہ کو بھول جائیں سلسلہ واقعات نے جو اہمیت اور نوعیت اختیار کر لی تھی۔ اس کے لحاظ سے ممکن ہے کہ مسلمانوں کے دلوں سے عرصہ تک یہ بات فراموش نہ ہو۔ لیکن کم سے کم وہ ہز ایکسیلنسی کے اس ارشاد کو پورا کرنے کی ضرور کوشش کریں گے اور ساتھ ہی اس کے جہاں مسلمانوں سے ہم واقعات کو بھول جانے کی امید کرتے ہیں وہ اس کا بھی یقین ہے کہ وہ نتیجہ کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

کانپور کے متنازع حالات

مشکل حکایتے ست کہ تقریر مے کنند

(ہمارے خاص نامہ نگار کے قلم سے)

(چہار شنبہ - ۲۲ اکتوبر ۱۹۱۳ء)

جس عظیم الشان ڈراما کا اختتام ماخوذین مقدمہ مسجد مچھلی بازار کی رہائی پر ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو ایک بجے کانپور کے اسٹیج پر ہوا اس کی تیاریاں یوں تو بہت قبل سے ہو رہی تھی، مگر ۱۶ اکتوبر کو واقعات پبلک کے سامنے آ گئے تھے، اس روز ہز آنر ڈی۔ سی بیلی قائم مقام لفٹنٹ گورنر صوبہ جات متحدہ ہمراہی آنریبل مسٹر سید علی امام شملہ سے اور آنریبل سر راجہ محمد علی محمد خاں بہادر، جناب مولوی عبد الباری صاحب، ڈاکٹر ناظر الدین حسن صاحب، مسٹر محمد نعیم اور مسٹر شاہد حسین اور دیگر اصحاب لکھنؤ سے یہاں تشریف فرما ہوئے۔ اور وہ روہیل کھنڈ ریلوے اسٹیشن پر استقبال کے لیے مسٹر مظہر الحق، منشی محمد اسماعیل تاجر چرم، حافظ صمد اللہ و سید فضل الرحمٰن وکیل اور دیگر معززین کانپور موجود تھے۔ یہاں پر راجہ صاحب مع دیگر ہمراہیان الیسٹ انڈین ریلوے اسٹیشن پر گئے۔ وہاں ہز اکسی لینسی اور آنریبل سید علی امام سے ملاقات کرنے کے بعد سرکٹ ہاؤس میں مولوی عبد الباری صاحب، راجہ صاحب محمود آباد، مسٹر مظہر الحق، آنریبل سید رضا علی، مسٹر شاہد حسین، مسٹر حبیب اللہ مینیجر علاقہ محمود آباد، سید ظہور احمد وکیل لکھنؤ، اور آنریبل سید علی امام کی ایک باہمی کانفرنس قریب چار گھنٹے تک رہی۔ اس کانفرنس میں مقامی حضرات میں سید فضل الرحمٰن وکیل بھی موجود تھے۔ خدا جانے اس مجلس شوریٰ میں ایسی کیا بات ہوئی تھی کہ ممبران مجلس سے جو گفتگو سرکٹ ہاؤس کے باہر اور لوگوں سے ہوئی ان کے چہروں سے خوشی یا رنج کی کوئی علامات ظاہر نہیں ہوتی تھیں۔ عام پبلک کو صرف اس قدر معلوم ہو سکا تھا کہ حضور وائسرائے ۱۴ اکتوبر کو ۹ بجے کانپور میں رونق افروز ہونے والے ہیں۔ اس خوشی میں الیسٹ انڈین ریلوے اسٹیشن من جانب مسلمانان کانپور پھولوں سے آراستہ کر دیا گیا تھا اور پلیٹ فارم پر سرخ رنگ کا فرش بطور پا انداز ہز ایکسیلنسی کے لیے بچھا دیا گیا تھا۔

ٹھیک ۹ بجے حضور وائسرائے مچھلی بازار کے معائنہ کے لیے بہمراہی آنریبل مسٹر سید علی امام مع اپنے اسٹاف تشریف لائے۔ جہاں آنریبل مسٹر مظہر الحق، راجہ صاحب محمود آباد، حافظ محمد ہاشم صاحب، الشیخ نثار الدین صاحب، راجہ عبد الغفور، منشی محمد اسمٰعیل صاحب تاجر چرم، حاجی عبد القیوم صاحب، سید فضل الرحمٰن صاحب وکیل، و دیگر حضرات

وار ہے تھے۔ مسٹر بوائنہ مسٹر مظہر الحق و سید فضل الرحمٰن صاحب موٹر پہ عدالت کی طرف روانہ ہو گئے، جہاں ہجوم کی
کثرت تھی کہ موٹر کے نکلنے کا راستہ قطعاً بند تھا۔ بدقت یہ لوگ عدالت کے کمرے میں داخل ہوئے۔ مسٹر لائل
سشن جج کے آنے پر من جانب گورنمنٹ تین درخواستیں حسب ذیل دفعہ ۴۹۴ ضابطہ فوجداری دی گئیں۔ جن کا
مضمون یہ تھا کہ "بلحاظ چند وجوہات گورنمنٹ کو ان مقدمات کا چلانا منظور نہیں ہے"۔
اس پر عدالت نے مسٹر مظہر الحق سے دریافت کیا کہ آپ کو ان درخواستوں میں کوئی عذر تو نہیں ہے؟ جس کے
جواب میں مسٹر مظہر الحق نے کہا کہ میں خوشی کے ساتھ حالت موجودہ کو قبول کرتا ہوں۔
منظوری درخواست اور حکم رہائی کے بعد مسٹر مظہر الحق نے عدالت کو مبارکباد دی۔ اس کل کارروائی کے ختم ہو جانے
کے بعد ماخوذین مقدمہ حافظ احمد اللہ صاحب کے اہتمام میں نہایت اطمینان کے ساتھ گاڑیوں میں بیٹھ کر اپنے
گھروں میں چلے گئے۔ قریب تین بجے کے آنریبل مسٹر سید علی امام، مسٹر مظہر الحق اور راجہ صاحب محمود آباد حضور
وائسرائے کے لنچ کی شرکت کے بعد بنگلہ پر تشریف لائے، جہاں جملہ وکلاء و بیرسٹران و دیگر مقامی و بیرونجات
کے معزز مسلمان موجود تھے۔ چار بجے راجہ صاحب محمود آباد اپنے موٹر پر سوار ہو کر لکھنؤ واپس تشریف لے گئے۔ ہم نے سنا
مسٹر مظہر الحق نے کانپور میں دو روز اور قیام کیا اور ۱۶ اکتوبر کو علی گڑھ روانہ ہو گئے۔ بوقت روانگی اسٹیشن پر
مسلمانان کانپور کا اس قدر مجمع تھا کہ بدقت کھڑے ہونے کو جگہ مل سکتی تھی۔ حاضرین نے چاروں طرف سے پھولوں
کی بارش کر کے اور متعدد ہار پہنا کر آپ کی ایک دلچسپ صورت بنا دی تھی۔ حکیم نواب علی برقی نے فارسی میں ایک
نظم پڑھی جو آئندہ کسی مضمون کے ساتھ "ہمدرد" کے لیے بھیجوں گا۔ معلوم ہوا ہے کہ دوران سفر میں کچھ دیر کے لیے
الہ آباد بھی قیام کریں گے۔
حضور وائسرائے کے تشریف لانے اور ماخوذین مقدمہ کی رہائی کا حکم سنانے نے جو مسرت اور اہمیت پیدا
پیدا کر دی ہے اس کی نظیر کانپور کی تاریخ میں مفقود ہے۔ جواب ایڈریس اور فیصلہ دالانِ مسجد کے متعلق مختلف آوازیں
سنی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ حضور وائسرائے کا حکم رہائی ملزمان بلحاظ مضمون ایڈریس ایک طرح کی کمزوری کی دلیل ہے
فیصلہ دالان کے متعلق بھی مختلف چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ بعض کی رائے یہ ہے کہ مسٹر محمد علی اور سید وزیر حسن
اطلاع کے بغیر یہ فیصلہ کر لینا نامناسب تھا۔ دوسری رائے جس کو وقعت دی جا رہی ہے یہ ہے کہ معاملات میں اس
نزاکت پیدا ہو گئی تھی کہ اس فیصلہ کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہ تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو فیصلہ حضور وائسرائے نے کیا
یہی فیصلہ کلکٹر ضلع کے ذریعہ بھی ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے جواب میں سنا جاتا ہے کہ حضور وائسرائے کے فیصلہ میں ایک خاص
وقعت اور اہمیت ہے جو دوسری صورت میں حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ کچھ اس قسم کی خوش گپیاں بھی ہو رہی ہیں
انگلینڈ میں مسٹر محمد علی اور وزیر حسن کی (گفتگو) نے جو کام کیا ہے اس کا نتیجہ عنقریب دالانِ مسجد کی
واپسی کی صورت میں ہونے والا تھا۔ اور اس لیے اس فیصلہ نے نفاذ میں عجلت کی گئی تاکہ ہوم گورنمنٹ میں اب کوئی
مزید کارروائی نہ ہو سکے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ نواب رامپور والی کانفرنس کی کامیابی کے خوف نے بھی ا

نے ہز ایکسی لینسی کا خیر مقدم کیا۔ ہز ہائی نس صاحب سے فرداً فرداً تعارف اور رسم سلام کے بعد حضور وائسرائے اندرون مسجد تشریف لے گئے۔ جہاں سیاہ بانات کا فرش پہلے ہی سے بچھا دیا گیا تھا۔ یہاں خونِ شہداء اور گولیوں کے نشانات دیکھنے کے بعد مولوی عبدالباری صاحب سے کچھ گفتگو بواسطہ سید علی امام صاحب ہوتی رہی۔ جس کے دوران میں حضور ممدوح نے مولوی عبدالباری صاحب سے فرمایا کہ واقعاتِ گذشتہ کو خوابِ پریشاں کی طرح فراموش کر دینا چاہیے۔ جواب میں مولوی عبدالباری صاحب نے کہا۔ کہ اگر ہمارا مذہبی احترام باقی رہے گا تو فی الحقیقت ہم کو پچھلی باتیں یاد نہ رہیں گی۔ تزئینِ مسجد کے لیے حضور وائسرائے نے اپنی جیب خاص سے ایک معقول رقم عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

اس کے بعد سرکٹ ہاؤس میں ممبران ڈیپوٹیشن جمع ہونا شروع ہو گئے۔ جہاں مقامی حضرات کے علاوہ بیرونجات کے معززین مثل مولوی محمد نسیم صاحب ایڈووکیٹ لکھنؤ۔ سید نبی اللہ صاحب بیرسٹر۔ آنریبل سید رضا علی صاحب۔ اور اکثر وکلاء اور بیرسٹران مقدمہ موجود تھے۔ حضور وائسرائے کے تشریف لانے پر جملہ ممبران ڈیپوٹیشن اور حاضرین نے کھڑے ہو کر تعظیم کی۔ اس کے بعد نواب سید سید علی خاں صاحب بہادر نے ایک خوش نما نقرئی کاسکٹ میں رکھ کر ایڈریس پیش کیا۔ جس کو مولوی سید فضل الرحمن صاحب وکیل کانپور نے باآواز بلند پڑھا۔ ممبران ڈیپوٹیشن کے نام حسب ذیل ہیں:۔

(۱) نواب سید سید علی خاں صاحب بہادر
(۲) نواب سید جعفر علی خاں صاحب بہادر
(۳) حافظ محمد حلیم صاحب
(۴) حافظ احمد اللہ صاحب
(۵) منشی محمد اسمٰعیل صاحب تاجر چرم
(۶) شیخ محمد ثناء الدین صاحب
(۷) حافظ محمد ہاشم صاحب
(۸) شیخ کریم احمد صاحب
(۹) مولوی سید فضل الرحمن صاحب وکیل۔

باوجود اس امر کے کہ ممبران وفد مقامی مسلمانوں کے صحیح قائم مقام اور معززین طبقہ کے منتخب اصحاب تھے جن میں نواب سید سید علی خاں صاحب بہادر اور نواب سید جعفر علی خاں صاحب بہادر کی شرکت ایک خاص اہمیت رکھتی تھی۔ اور شہر میں بعض حضرات کو تعجب ہے کہ ڈیپوٹیشن میں بیرونجات کے معززین کیوں شریک کیے گئے۔

ایڈریس کے ختم ہونے پر ہز ایکسی لینسی نے ایک طولانی جواب انگریزی میں پڑھا جس کے دوران میں حاضرین کسی موقع پر چیرز دیتے تھے، اور کسی موقع پر خاموش تھے۔ جواب ایڈریس حضور ممدوح نے کھڑے ہو کر پڑھا تھا۔ جس کو ممبران ڈیپوٹیشن نے حسب ارشاد عالی بیٹھ کر سنا۔ جس وقت اس جواب کا اردو ترجمہ خان بہادر مولا بخش صاحب

حضور وائسرائے کی تقریر

(۱)

مسلمانوں کی دل جوئی

(یک شنبہ ۲۱ ستمبر ۱۹۱۳ء)

جنگ بلقان اور اس سے پہلے جنگ طرابلس کے دوران میں مسلمانوں نے طرح طرح سے برٹش گورنمنٹ کو اس طرف توجہ دلائی کہ برطانیہ ان کے ہم مذہبوں کی خونریزی کو روکنے کی کوشش کرے۔ لیکن نام نہاد لبرل وزارت اور اس کے بے خبر وزیر خارجہ نے بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ برطانیہ کو مسلمانوں کے جذبات کی کوئی پروا نہیں ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ طریقِ عمل زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا تھا، اور بالآخر لارڈ مارلی اور خود سر ایڈورڈ گرے نے اس مذہبی تعلق کو تسلیم کیا جو مختلف ممالک کے مسلمانوں کے مابین قائم ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے دل میں برطانیہ کی بیگانگی اور انہیں وزراء میں سے بعض کے اقوال سے یہ بدگما پیدا ہو چلی تھی کہ خدانخواستہ برٹش گورنمنٹ اندرونی طور پر ٹرکی کی مخالفت پر تو آمادہ نہیں ہے؟ ہمیں پہلے بھی یقین تھا اور بعد کے نتائج سے بھی ثابت ہوتا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ ان وزراء نے خاص خاص موقعوں پر ٹرکی کی مخالفت میں کہا تھا وہ ان کی ذاتی رائیں تھیں۔ اور حضور ملک معظم کی گورنمنٹ مسلمانوں کے جذبات سے ضرور متاثر ہوئی۔

۱۷ر ستمبر کو شملہ میں حضور وائسرائے لجسلیٹو کونسل میں جو تقریر فرمائی ہے وہ در اصل آئینہ ہے اُن تمام اثرات کا مسلمان کی گذشتہ دو تین برس کی مسلسل بے چینی کی وجہ سے گورنمنٹ ہند اور حضور ملک معظم کی گورنمنٹ پر ہوا ہز ایکسی لینسی نے اپنی تقریر کی ابتدا بلقان اور ایران کے معاملات سے کی اور یہ کھلا ہوا ثبوت اس بات کا ہے مسلمانوں کی بے چینی کو کس حد تک انہوں نے اہم سمجھا ہے اور کہاں اسے بجا تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا یہ فرمانا کہ جب لارڈ مارلی نے دارالامراء میں بیان کیا تھا زمانہ جنگ میں برٹش گورنمنٹ نے جنگ جویوں کے مقابلہ میں، جس حد تک اس مرتبہ مسلمانوں کی طرف سے نمائندگی کی ہے ایسی کبھی اس سے پہلے نہیں کی تھی" صاف بتلا رہا ہے کہ مسلمانوں آواز رائیگاں نہیں گئی۔ اور بالآخر اس کا اثر ذمہ دار ارکان گورنمنٹ پر ہوا۔

فیصلہ کے قبول کرانے میں بڑا کام کیا ہے۔ آپ کے نامہ نگار کے کانوں تک اُڑتی اُڑتی یہ خبر بھی پہنچی ہے کہ مسٹر محمد علی اور سید وزیر حسن نے تار سے اطلاع دے دی تھی کہ وہ کامیاب ہونے والے ہیں۔ بہر حال مدعی جتنے کہ اُتنی باتیں" ع

ناموس عشق در تن عشاق می برند
عیب جواں ز سرزنش پیر می کنند

یہاں جس بات پر اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ مسٹر مظہر الحق اور راجہ صاحب محمود آباد نے خصوصاً و دیگر قانون پیشہ حضرات و بزرگان قوم نے عموماً اس معاملہ میں جو قومی خدمات کی ہیں، اس کے بار گراں سے یہاں کے مسلمان کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے ہیں۔ آپ کو نامہ نگار کو یقین ہے کہ اگر اگست کے پہلے ہفتہ میں جب کہ کانپور میں قیامت صغریٰ بپا تھی بزرگان لکھنؤ مدد نہ کرتے تو یہاں کی حالت کا سنبھلنا دشوار تھا۔

سرمایہ مسجد میں اس وقت قریب مبلغ نوے ہزار روپے نقد مسٹر مظہر الحق صاحب کی تحویل میں جمع ہیں۔ اس سرمایہ کے مصرف کا اختیار تو بالکل ان بزرگوں کو ہے جنہوں نے اپنی جیبیں خالی کر دی ہیں۔ مگر یہاں بعض اسلامی حلقوں میں یہ رائے ظاہر کی جاتی ہے کہ اس قومی سرمایہ سے شہر میں ایک اسلامیہ سکول جس کے ساتھ ایک مسجد جامع بھی ہو اس بے نظیر قومی ایثار کی یاد میں قائم کر دیا جائے۔ تاکہ کانپور کے مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت اس آسان طریقے سے رفع ہو جائے۔

لیڈر اخبار   اور حضور وائسرائے کا جواب اس خط کے پہنچنے تک آپ کے پاس دیگر ذرائع سے آگیا ہوگا، اس لیے ضرورت نہیں سمجھتا کہ ان کو بھیج کر ملال انگیزی کا باعث بنوں۔

ہز ایکسی لینسی نے ہم کو صرف موجودہ معاملات ہی کے متعلق اطمینان نہیں دلایا ہے بلکہ آئندہ کی بابت بھی یقین دلایا ہے کہ برطانیہ اور ٹرکی کے باہمی تعلقات زیادہ خوشگوار رہنے کی امید ہے۔ انہوں نے ٹرکی کے متعلق آئندہ امیدوں کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے کہ "اگر ٹرکی اصلاحات کی پالیسی کو مسلسل جاری رکھے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ وہ مستحکم نہ ہو جائے اور دنیا میں سب سے بڑی اسلامی سلطنت کی حیثیت سے دوسرے نمبر پر قائم نہ رہے۔"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلامی آبادی اور وسعت مملکت کے لحاظ سے برطانیہ اس وقت سب سے بڑی اسلامی سلطنت کہلانے کا مستحق ہے اور ٹرکی بے شک اس سے دوسرے نمبر پر ہے۔ لیکن جب اس مذہبی تعلق کا خیال کیا جاتا ہے جو صرف ہندوستان یا مصر بلکہ تمام عالم کے مسلمانوں کو ٹرکی کے ساتھ وابستہ کیے ہوئے ہے اور جسے ہز ایکسی لینسی نے بھی اپنی تقریر کے دوران میں تسلیم کیا ہے۔ تو ٹرکی کی آبادی کی کمی اس کے لیے اس بات میں ہارج نہیں ہوتی کہ برطانیہ بحیثیت ایک ہم چشم کے وہ اپنی اغراض کی تائید کی توقع رکھے اور نہ غالباً برطانیہ ہی کو یورپ کی برادری میں اس بات کے اظہار کرنے میں عار معلوم ہونا چاہیے تو ازن قوت کے مسئلہ میں اس کا پر ٹرکی کی طرف جھکتا ہوا ہے، چنانچہ حضور والسرائے نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ہم امید کرتے ہیں کہ وہ انہیں نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوں گے۔

ایران کے متعلق ہز ایکسی لینسی نے جو کچھ فرمایا ہے وہ بھی بہت کچھ تشفی بخش ہے۔ ایران کی بہبودی اور فلاح کی کوشش کے امید دلانا اور اس بات کا یقین دلانا کہ ہندوستانی فوج شیراز سے واپس بلالی جائے گی۔ بلاشبہ اس بدگمانی کو دور کرنے کے لیے کافی ہے کہ برطانیہ ایران کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ لیکن جنوبی ایران کی تخفیص اور شمالی ایران میں روسی پیش قدمی کی وجہ سے اس ملک کے کم سے کم ایک حصہ کی طرف سے ہم ہنوز غیر مطمئن ہیں۔ ہم کو توقع رکھنا چاہیے کہ برطانیہ عنقریب اس حقیقت کو بھی معلوم کر لے گا کہ روس کی موجودگی ایران میں نہ صرف ایران کے لیے خطرناک ہے بلکہ برطانیہ کے تمام ایشیائی اغراض کے لیے مضر ہے۔

ٹرکی اور ایران کے متعلق مسلمانوں کو اطمینان دلانے کے بعد ہز ایکسی لینسی نے مسلمانوں کو ضبط و تحمل کی دوستانہ تنبیہہ کی ہے اور ان سے کہا ہے کہ برطانیہ کی غیر ملکی پالیسی کے متعلق وہ ہمیشہ وسیع النظری سے کام لیں۔ ہمارے نزدیک اس مشورے میں کوئی نقص نہیں نظر آتا اور غالباً ہز ایکسی لینسی نے مسلمانوں کو کبھی حد سے متجاوز ہوتے نہ دیکھا ہوگا۔ بشرطیکہ کسی خارجی اثر نے جس سے ہماری مراد مسز جمیس کے بیرہ نے شورش پھیلانے والے نہیں ہیں ان کو مجبور نہ کیا ہو اور ہم گورنمنٹ کو یقین دلاتے ہیں کہ جب تک وہ مسلمانوں کے غیر ملکی تعلقات کو ملحوظ خاطر رکھے گی اور جب تک ہندوستان کے اندر بلاوجہ محض ضد اور ہٹ کی بنا پر ان کی عرضداشت مسترد نہ کی جائے گی۔ اس وقت تک ہمارے اور گورنمنٹ کے درمیان کسی قسم کی کشیدگی پیدا نہیں ہوسکتی۔ بہر حال مجموعی طور پر ہز ایکسی لینسی کی اس تقریر کو ہم مسلمانوں کے لیے ایک پیغام امید سمجھتے ہیں۔ اور کیا عجیب ہے کہ اب سے اگر معاملات کی طرف خاطر خواہ توجہ کی گئی تو جو کچھ خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں ان کی تلافی ہو سکے۔

جس دن ہم آگے ہم سے ہم ...

شکوے جو دل میں تھے وہ فراموش ہو گئے

---

(۲)

دل ربائی ہمہ آن نیست کہ عاشق بکشند

خواجہ آن ست کہ باشد غم خدمت گارش

اس سے بیشتر ہم حضور والسرائے بہادر کی تقریر کونسل کے ان حصص پر بحث کر چکے ہیں جن کا تعلق مسلما
کے غیر ملکی معاملات کے ساتھ مربوط تھا۔ آج ہم ان امور پر اپنی رائے پیش کرتے ہیں جن کا رشتہ ملکی معاملا
کے ساتھ منسلک ہے اور ان حالات کے ساتھ وابستہ ہے جن میں ہندو و مسلم ہم ردیف ہیں۔

تبت کی صورت حال پر گفت گو فرمانے کے بعد حضور والسرائے نے ان ہندوستانیوں کے حال پر
فرمائی ہے جو شومیِ طالع سے سلطنتِ عظمیٰ کی خود بیں نو آبادیوں کی مقدس سرزمین پر اپنے قدم رکھ بیٹھے ہیں
لیکن حضور والسرائے نے ہندوستانیوں کو جزو سلطنت سمجھتے ہیں۔ وہ کالے گورے کے تفرقہ انداز امتیا
کرتے ہیں۔ چنانچہ اُنہوں نے ملک کو یقین دلایا ہے کہ اگرچہ خود مختار نو آبادیوں کے ساتھ اس مسئلہ کا تع
نازک پہلو لیے ہوئے ہے۔ تاہم گورنمنٹ ہند اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتی ہے اور سلطنت برطانیہ کلاں
حصہ میں مسلمانوں کے مساوات حقوق پر زور دینا چاہتی ہے۔ حضور والسرائے فرماتے ہیں نو آبادیوں میں ہن
کی شکایات کے متعلق ۱۹۱۰ء سے خط و کتابت ہو رہی ہے اور جب تک یہ شکایت رفع نہ ہوگی ہم برابر
انسداد پر زور دیتے رہیں گے۔ ....

ہم ہز ایکسیلینسی کو اس بلند آہنگی، عالی ظرفی اور ہندی ہمدردی پر مبارک باد دیتے ہیں اور امید کر
نیم سرکاری ہمعصر الہ آباد اگر حضور والسرائے کی اس ہمدردی کو لارڈ ہارڈنگ کا ذاتی احساس قرار دیتا ہے ا
گورنمنٹ کی پالیسی کا عنوان تسلیم کرنے سے جھجکتا ہے۔ اس مسئلہ کو تو ضرور گورنمنٹ ہند کی پالیسی مان لے گ
پانیر جو چاہے کہے۔ ہم جملہ ہندوستانی بھائیوں سے التماس کرتے ہیں کہ وہ اپنی متفقہ آرزوؤں کو اس
کے ساتھ بلند کرتے رہیں گے کہ ان کے کارواں کے حدی خواں خود حضور والسرائے اور گورنمنٹ ہند ہیں
ہے کہ اب حافظ علیہ الرحمۃ کے اس شعر سے فال لیں ؎

دست از طلب ندارم تا کام من برآید

یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید

جس طرح گورنمنٹ ہند اپنی رعایا کے حقوق کو منوانے پر مصر ہے، اسی طرح ہم بھی جب تک گوہر مقص
دامن پر نہ کر لیں اپنے ان بھائیوں کو ذلت اور تحقیر کی زندگی سے بچانے میں سرگرم رہیں جو اس وقت جنوبی افر

پیکون ہو جاتی ، تاہم ہم حضور وائسرائے ...

حفاظت کا کھلے کھلے لفظوں میں ہمیں یقین دلایا ہے ، اور ہم کلی اعتماد رکھتے ہیں کہ نکتہ رس افسران اس ارشاد کو عاقلے را اشارہ کافی ست ؛ پر محمول کر کے اپنے ہی ہاتھوں سے ان زخموں پر مرہم لگا دیں گے جن پر انھوں نے جراحی کی ہے ۔

حضور وائسرائے تو

خواجہ آں ست کہ باشد غم خدمت گارش

کے مصداق ہو چکے ہیں اور ہم منتظر ہیں کہ دیگر افسران بھی

دل ربائی ہمہ آں نیست کہ عاشق بکشند

کے غلط اصول کو چھوڑ کر حضور وائسرائے کے سچے غاشیہ بردار بن جائیں گے ۔ سر دست ہم بھی کانپور کے درد انگیز واقعہ کو پس پشت ڈالتے ہیں اور سیشن جج کی عدالت پر معدلت گستری کی امید باندھتے ہیں ۔

گرچہ افتاد ز زلفش گرہے در کارم
ہم چناں چشم امید از کرمش مے دارم

وغیرہ میں ہر قسم کے مصائب کے مقابلہ میں سینہ سپر بنے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد ہندوستان کی مرفہ الحالی کا ذکر آتا ہے جس کے متعلق اعداد و شمار ہم شائع کر چکے ہیں۔ جس سے ناظرین خود ہندوستان کی تجارتی ترقی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مگر جہاں ہز ایکسلنسی کو ہندوستان کی تجارت درآمد برآمد پر بجا مسرت ہے، وہاں پنجاب کے بیشتی جرائم اور بنگال کی ڈکیتیوں پر دلی رنج بھی ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ صوبہ پنجاب میں زمینداروں میں مرفہ الحالی کی وجہ سے شراب خوری اور اس ام الخبائث کے اثر سے قتل، زنا و قمار بازی کے جرائم فطرت ثانیہ ہوگئے ہیں۔ اور ہم خوش ہوں گے کہ اگر پنجاب گورنمنٹ سختی اور مصلحت کے ساتھ ان خرابیوں کو مجوزہ اصلاح کو جلد عمل میں لائے گی۔ ہمارا خیال ہے کہ ان جرائم کے انسداد میں خالصۃً سیاسی معقول امداد مل سکتی ہے لیکن جاہل زمینداروں کے جرائم کی نسبت صوبہ بنگال کی ڈکیتیاں ہر بہی خواہ ملک کے لیے درحقیقت موجب شرم رنج ہیں۔ جیسا کہ ہز ایکسلنسی فرماتے ہیں ان ڈکیتیوں کو کوئی پولیٹیکل اہمیت نہیں دی جاسکتی ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس قتل و غارت کی ابتداً تقسیم بنگال کی بے چینی سے ہوئی تھی۔ تو اب، حضور ملک معظم کے مراحم خسروانہ سے بدامنی اور بے چینی کا ہر ایک بہانہ رفع ہوگیا ہے۔ لیکن ان حرکات غارت گری کی وجوہات خواہ کچھ بھی ہوں ہم یہ پسند نہیں کرتے کہ تعلیم یافتہ افراد اور معزز خاندانوں کے لڑکے اپنے ہی بھائیوں کے مال و جان پر حملہ کر کے عام ڈکیتوں کی طرح ملک کو تہلکہ میں ڈالیں۔ اور ہم امید کرتے ہیں کہ ملکی لیڈر اس دفعہ کانگریس میں اس مسئلہ پر ضرور توجہ کر کے ملک میں امن پھیلانے کی کوشش کریں گے۔ برخلاف ان ناقص العقل ڈکیتوں کے (حضور والسرائے کی رائے کے مطابق) کلکتہ کے اسکولوں اور کالجوں کے وہ طلبہ مستحق تحسین ہیں جنہوں نے حال کی طغیانی میں مصیبت زدگان کو امداد دی اور تعلیم کی برکات کو ملک پر ظاہر کیا۔ ان دونوں صورتوں پر نظر تعمق ڈالنے کے بعد ہمارا خیال ہے کہ 'بد لوگ' جو ڈاکہ زنی کرتے ہیں وہ اپنے حصول مقاصد کے لیے غلط راستہ پر چل رہے ہیں۔ اور ہم توقع رکھتے ہیں کہ اب وہ اپنے رویہ کو بدل کر ایسی ملکی خدمات میں اپنے اوقات کو صرف کریں گے جن کو ہر طبقہ بہ نظر استحسان دیکھ سکے گا۔

عام ملکی حالات پر تبصرہ کرنے کے بعد حضور والسرائے مسجد کانپور کے حادثہ پر مسلمانوں کو توجہ دلاتے ہیں۔ صورت معاملات کی گتھی سلجھانے کے متعلق تو ہز ایکسلنسی نے کوئی خیال ظاہر نہیں فرمایا، کیونکہ مقدمات عدالت کے زیر غور ہیں۔ مگر ان مصیبت زدگان سے قلبی ہمدردی کا اظہار فرمایا ہے جو اس حادثہ میں بیوہ ہوگئی ہیں، یا یتیم ہوگئے ہیں یا بے اولاد ہوگئے ہیں، ہم حضور کی اس تعزیت و فاتحہ خوانی کے بہت مشکور ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ورثاء بھی اس شاہی رسم تعزیت پر سلطنت برطانیہ کے حق میں دعاگو ہوں گے۔ لیکن ہمارے کان اس سے زیادہ امید افزا پیغام کے منتظر تھے۔

کاش اگر حضور ملک معظم کے نائب السلطنت مقدمات کو عدالت کی چھان بین پر چھوڑ کر خود مسجد کے متعلق اپنے ہمدردانہ خیالات کو بھی ظاہر فرما دیتے تو جو بے چینی اس وقت مسلمانان ہند کو مضطرب کیے ہوئے ہے وہ بدل

مسلمانوں کی فریاد

(فقید کی صدا)

(سہ شنبہ - ۹ ستمبر ۱۹۱۳ء)

تیرے در پر آئے ہیں ہم لے کر فریاد اے اللہ — ہم سے بڑھ کر اس دنیا میں کون ہے ناشاد اے اللہ
ہوتی ہے اب قوم ہماری کیسی برباد اے اللہ — گھر گھر غم ہے گھر گھر ماتم، تو ہی دے داد اے اللہ

کانپور میں خون بہا اور ملک میں بہتا پھرتا ہے
کہنے کو تو لال[1] ہے، لیکن سب کچھ کہتا پھرتا ہے

خون میں زخمی خوب نہائیں، تجھ کو کچھ پروا ہی نہ ہو — جائیں مٹی میں مل جائیں، تجھ کو کچھ پروا ہی نہ ہو
تو جو خدائی لے کر بیٹھا، آخر یہ کس کام کی ہے؟
گھر تیرا یوں ڈھایا، تجھ کو کچھ پیچ اپنے نام کی ہے؟

بیٹوں کی موت آئی، بیوائیں دل دنیا میں کیا شاد کریں — قیدی، زخمی، مُردے، آخر کس کس کو ہم یاد کریں
ننھے ننھے بچے، جن کو ہیکیمہ کے ٹکڑے مشکل ہیں — قوم جلالی ان کو تو یہ جی جانے کے قابل ہیں
بندوقوں سے جسم ہوا ہے چھلنی زخم رسیدوں کا — پھیلا ہے مقتل کی زمین پر یہ خون شہیدوں کا
روتے روتے نور گیا سب بیواؤں کے دیدوں کا — خون ہوا بیچارے کمسن لڑکوں کی امیدوں کا
قہر کے ہاتھوں بے دردوں نے کیسے پاپڑ بیلے ہیں — ہم حق پر اور ناحق ہم پر چاروں طرف سے ریلے ہیں
مٹی کے کچھ ڈھیلے لینا جرم ہوا ہے، جور یہ ہے — برچھا جائز، گولی جائز، چھرا جائز، جور یہ ہے
قہر ہوئے ہیں صدہا ہم پر، قہاری کا دور یہ ہے — پھر بھی ہم ٹھیرے ملزم، طرہ اس پر اور یہ ہے
ہاتھوں میں ہتھ کڑیاں ہیں اور پاؤں میں زنجیریں ہیں — قید کی کڑیاں جھیلیں بے کس، اس کی سب تدبیریں ہیں
باپ ہے بوڑھا، بیٹا زخمی، جینے کی کچھ آس نہیں — بچہ ننگا بلبلاتا ہے اور کوڑی اس کے پاس نہیں
قومی بہنیں لاوارث ہیں، قوم کو کیا احساس نہیں — جیبوں میں سے کچھ بھی نہ نکلے، ایسا تو افلاس نہیں
اپنے گھر کے کام سے بڑھ کر کام ہے ان مجبوروں کا — قوم کا وہ آرام ہے جو کام ہے ان مجبوروں کا
ہائے یتیمی! پڑ گئے اب تو جان کے لالے بچوں کو! — رحم کرے قوم اور بچا لے، موت نہ کھا لے بچوں کو!
کون سخی داتا ایسا ہے جو اب پالے بچوں کو — کوڑی پیسہ جو بچتے ہوں، وہ دے ڈالے بچوں کو
کام یہ ساری قوم کا ہے اور کام خدا کی راہ کا ہے — جو کرنا ہے کرلو یا دو، یہ سودا اللہ کا ہے

(راقم فریادی)

---

[1] لال کے معنی گونگے کے ہیں۔

خطوط و مقالاتِ شوکت علی

مولانا شوکت علی، جنھیں گاندھی جی پیار سے Big Brother کہا کرتے تھے اور جو دوستوں کی محفل میں "بڑے بھیا" کے نام سے پکارے جاتے تھے اور جنھیں مولانا ظفر علی خاں نے "بابائے خلافت" کا خطاب دیا تھا صرف قد و قامت ہی کے اعتبار سے بھاری بھرکم اور بڑے آدمی نہیں تھے بلکہ اپنے کردار سیرت اور شخصیت کے اعتبار سے بھی بہت بڑے، بہت اونچے اور بہت کھرے آدمی تھے۔ یہ وہ شخص تھا جو خدا کے سوا کبھی کسی سے خائف نہیں ہوا نہ بم سے ڈرا اور نہ پستول سے!

اگلے صفحات میں مولانا شوکت علی کے وہ غیر مطبوعہ خطوط بالکل پہلی مرتبہ حضرت جمال میاں کی نوازشِ خصوصی کے باعث منظرِ عام پر آ رہے ہیں جو انھوں نے اپنی نظر بندی اور قید کے زمانے میں اپنے مرشد مولانا عبدالباری مرحوم کو لکھے تھے، ان خطوط سے جہاں آج سے پچاس سال پہلے کی سیاست کے بعض اہم واقعات نظر کے سامنے آتے ہیں وہاں ایک مردِ مومن کے وہ جذبات و حسیات بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے زندان کی تاریک کوٹھڑی میں اسے شوقِ جہاد اور شوقِ شہادت سے بیقرار کر رکھا تھا۔

"اولڈ لیوائے" اور "ہمدرد" وغیرہ کے قدیم فائلوں سے شوکت صاحب کے بعض مقالات بھی اس عنوان کے تحت موجود ملیں گے۔ جو دلچسپ بھی ہیں اور تاریخی بھی!

— ★ —

تارک وقت آگیا ہے اور درس و تدریس و ذکر و اوراد سے بڑھ کر عبادت کا موقع سلطان جائر کے خلاف اعلاء کلمۃ الحق کے جہاد افضل میں ہے، کارگزاری کا دائرہ "انجمن خدام کعبہ" تھی، ۱۹۱۳ء میں فرنگی محل میں اس انجمن کی بنیاد رکھی گئی۔

خادم الخدام یا صدر مولانا عبدالباری مقرر ہوئے۔ معتمد یا سیکرٹری مولانا شوکت علی اور شیخ مشیر حسین قدوائی تھے۔ جمعیتہ اصلیہ کے ارکان مندرجہ ذیل بزرگ ہیں۔

حکیم عبدالولی صاحب جھوائی ٹولہ لکھنؤ۔ مولوی غلام محی الدین صاحب وکیل۔ قصور۔ نواب وقار الملک بہادر مرادآباد۔ مولوی غلام محمد صاحب فاضل۔ ہوشیار پوری۔ مسٹر مشیر حسین صاحب قدوائی بیرسٹر ڈاکٹر ناظر الدین حسن صاحب بیرسٹر لکھنؤ اس مقصد پر کچھ روپے فراہم ہو گئے۔ جو سیٹھ عبداللہ ہارون کی تحویل میں دے دیئے گئے یہی خلافت کا بنیادی سرمایہ تھا۔

مولانا شوکت علی:۔ مولانا شوکت علی کی ملکی اور ملی خدمات کو افسوس ہے کہ ابھی تک کسی غیر جانبدار مؤرخ نے اپنا موضوع نہیں بنایا اور کرکٹ کے اس کھلاڑی کو سیاست قومی کے میدان میں گھسیٹ لانے والے جذبہ کی تلاش کی طرف ابھی کسی نے ہنوز توجہ نہیں کی اس جذبہ کی قدر کرنے کا کیا سوال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جن کو علی برادران کے نام سے سیاسی تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی علی گڑھ کی وفادارانہ سیاست کے سایہ میں پروان چڑھنے والے وہ پہلے رہنما تھے جن کی سعی مسلسل سے ہندوستان کی پوری آبادی میں مقابلہ کے دم خم پیدا ہو گئے اور اسی کی پاداش میں جنگ عظیم اول کے زمانہ میں یہ دونوں نامور بھائی نظر بند کر دیئے گئے۔ تحریک خلافت کے زمانہ میں ترک موالات کی تجویز کو جس نے گاندھی جی کی رہنمائی میں ایک ہلچل مچا دی تھی مسلمانوں کے نمائندوں سے منظور کرانے کا اہم فریضہ انجام دینے والے بھی مولانا شوکت علی تھے۔

پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ میں "سال کے آغاز میں (۱۹۲۰ء) اس طریقہ کار پر (ترک موالات و عدم تشدد) غور کرنے کے لئے مسلمانوں کا ایک جلسہ شاید مسلم لیگ کی کونسل کا جلسہ تھا بمقام الہ آباد سید رضا علی کے مکان پر ہوا، مولانا محمد علی ابھی یورپ سے واپس نہیں آئے تھے مولانا شوکت علی موجود تھے۔ مولانا شوکت علی تو واقعی سراپا جوش تھے لیکن ان کے سوا باقی سب لوگ بہت افسردہ اور گھبرائے ہوئے تھے۔ وہ کوئی سخت کارروائی کے لئے تیار نہ تھے لیکن مخالفت کرنے کی بھی ان میں ہمت نہیں تھی (جلسہ سے گاندھی جی نے خطاب کیا جس میں تحریک چلانے کے سلسلے میں بعض شرائط منوائے جن کے بعد ان کڑی اصطلاحوں سے جو گاندھی جی نے اپنی تقریر میں استعمال کیں اور ہونے والے کے اٹل جوش صداقت سے اکثر سامعین کے رونگٹے کھڑے ہو گئے لیکن مولانا شوکت علی وہاں موجود تھے تا کہ قدم نہ اکھڑنے دیں چنانچہ جب رائے شماری کا وقت آیا تو اکثریت نے شرما حضوری میں چپ چاپ اس تجویز یعنی جنگ

حرفِ آغاز

(از حضرت مولانا جمال میاں خلف الصدق حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ)

برِ عظیم ہند و پاکستان کی سیاست میں انجمن خدام کعبہ کی یہی وہ پہلی انجمن ہے جس نے حکومت برطانیہ کے خلاف برملا تحریک شروع کی، یہی انجمن ہے جس نے ممالک اسلامیہ کی طرف، مسلمانان ہند کو متوجہ کیا۔ خلافت کی تحریک کے لیئے فضا تیار کی، ہندو مسلم اتحاد کا بیج بویا۔ تقسیم بنگالہ اور اُس کے بعد اس کی تنسیخ نے ہندو مسلمانوں دونوں کی نگاہوں میں برطانوی عزائم کو عریاں کر دیا تھا۔ طرابلس اور بلقان کی لڑائیوں نے برطانیہ کے خلاف جذبات بغاوت کو انداز مقاومت سکھایا۔ مسلمانوں کو نظر آنے لگا کہ دول مغرب کی سرگرمیاں اور یونان و اٹلی کی دھمکیاں صلیبی لڑائیوں کی بچی کھچی چنگاریاں ہیں جس سے ملت ختم رسل شعلہ بہ پیراہن ہے۔

اسلامی اخوت و ہمدردی اور انگریز بیزاری کا ایک ایسا عام جذبہ اس زمانہ میں پیدا ہوا جس سے مسلمانوں کا کوئی طبقہ نہیں بچا۔ علی گڈھ کے تعلیم یافتہ مغرب زدہ طبقے نے ایسے لوگ پیدا کیئے جنہوں نے سرکاری نوکریوں اور دنیاوی عشرتوں سے منہ موڑ کر بلقان کے زخمیوں کی تیمارداری کے لیئے وفد روانہ کیا اس وفد میں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی شریک تھے۔

سنہ ۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد مچھلی بازار کے انہدام کا حادثہ پیش آیا جس کے ساتھ فائرنگ ہوئی اور کشتگان معرکۂ کانپور کے خون کی گلکاریاں ساری ملّت کی بیداری اور عبرت کا سامان ہو گئیں، قومی مزاج سنہ ۱۹۰۷ء سے بدلنا شروع ہو گیا جب علی گڈھ کے ایک نوجوان شاعر نے عہدوں اور جاگیروں کو چھوڑ کر زنجیرہ سلاسل کو اختیار کیا اور رسم عاشقی کی ایک نئی طرح ڈالی تھی ۱۹۰۸ء و ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۱ء ۱۹۱۲ء تک اس ہلکے ہلکے بہنے والے چشمے نے ایک ندی کی صورت اختیار کر لی تھی جس کی رو میں نئے پرانے سب بہنے لگے تھے، شاعروں نے گل و بلبل کی جگہ "آبروئے امت مرحوم"، "تہذیب نو کی خودکشی" اپنے مضامین قرار دیئے، علما نے انگریزی اقتدار کے خلاف فتاوے دیئے اور فقہی تحریروں سے انگریزی مال کے مقاطعہ کی ترغیب دلائی۔ کلکتہ سے مولانا آزاد کے "الہلال" نے ضیا پاشی کی، یہی وہ وقت تھا جب علی گڈھ کے دو رِند، بڑے اور انہوں نے زمانہ کو ایک نیا رنگ دکھا دیا۔ کرکٹ و شاعری، عیش و ملازمت، سب چھوڑ چھاڑ مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی ملت کو بیدار کرنے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

مولانا عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ عالم دین و مرشد طریقت تھے انہوں نے بھی یہ محسوس کیا کہ عالم اسلام

از مولانا صبغۃ اللہ
شہید فرنگی محلی

حرفِ گفتنی

مکتوب نگار اور مکتوب الیہ

حضرت الحاج مولانا شوکت علی خادم کعبہ کے مکتوبات کا مجموعہ آپ کے سامنے ہے، کاتب مکاتیب کو وصال فرمائے اتنا زمانہ گزر جانے اور معیار مقتدائی کے بہت کچھ بدل جانے کے باوجود وہ ان سب خوش نصیبوں کی آنکھوں کے سامنے ہیں اور حافظوں میں رچے ہوئے ہیں جنھوں نے ان کو کبھی دیکھ یا سیدھی سادھی اردو میں ان کی سیدھی دل میں اترنے والی تقریروں کو سنا یا کسی ذاتی یا قومی مقص کے لیے آں مرحوم کے پاس حاضری کا اتفاق ہوا۔ غالباً ہندوستان میں مولانا شوکت کے خطوط کا اتن بڑا ذخیرہ یکجا کہیں نہ ہوگا اور ہوگا کیسے شوکت مرحوم کے اتنے گہرے، فدایانہ، مخلصانہ مسترشدانہ او دوستانہ اور بے تکلفانہ تعلقات کسی سے نہیں تھے، جتنے حضرت مکتوب الیہؒ سے تھے۔ روحانی ارتبا سیاسی رفاقت اور ہم آہنگانہ اتحاد مقصد و عمل اور تھا کس کے ساتھ، مرشد کے ساتھ مسترشد کا تعلق کچ ایسا ہوتا ہے جو کسی اور کے ساتھ نہیں ہوتا، مرشد روحانی باپ ہوتا ہے، قلبی طبیب ہوتا ہے مرکز خیا ہوتا ہے، منتہائے نظر ہوتا ہے، تمام دنیاوی اور اُخروی حاجات میں آخری امید گاہ مجازی اور پھر وہ مح اسرار بھی جس کی جناب میں اپنے تمام حالات، خواب، واردات اور مقدس مشاغل تک مزید تعلیم ک لیے عرض کر دیے جاتے ہیں، چنانچہ ان مکاتیب میں بھی لاڈلے اور بے تکلف مسترشد نے اپنے گھریلو حالا اپنے تجارتی معاملات ہی نہیں اپنی سبحہ گردانی اور شب بیداری تک کا ذکر کر دیا ہے، اس لئے ان مکاتیب کے ذریعہ سے وہ مولانا شوکت علیؒ بھی آنکھوں کے سامنے آجائیں گے، جن کو بہت کم آنکھوں نے دیک ہے، یہ البم اسٹیج والے، مرکزی خلافت والے، میدان حریت وطن والے، کام میں نہ تھکنے والے پیکر عم مجسمہ خلوص و ایثار اور بے مثال تنظیمی اور تربیتی صلاحیت رکھنے والے شوکت بھائی کا نہیں بلکہ وہ ہے جس میں شوکت اپنے بہت سے خصوصیات، کمالات، معتقدات اور مصروفیات کے ساتھ صاف رو میں نظر آئیں گے۔

کے حق میں رائے دی۔ (میری کہانی جلد ۱)

پہلی نظربندی کے ساتھ مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کے افکار و اعمال میں انقلاب آ گیا غیرت اسلامی اور حمیت ایمانی تو ہمیشہ سے تھی اب مطالعے اور مجاہدے سے بصیرت دینی اور معرفت کی تشنگی پیدا ہوئی حضرت مولانا عبدالباری کے دست حق پرست پر ان دونوں بھائیوں نے بیعت کی اور باقاعدہ سلسلۂ عالیہ قادریہ رزاقیہ میں داخل ہوئے۔

زیرترتیب مکاتیب میں اس بکھری ہوئی کہانی کی کڑیاں مل جاتی ہیں۔ یہ خطوط مرشد کے نام مرید کی بے ساختہ تحریریں ہیں جس میں سادگی و پرکاری دونوں کے مظاہرے ہیں۔

دونوں بھائی مقید تھے اس لئے سیاسی مسائل پر زیادہ لکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس لئے ان تحریروں میں زیادہ تر قلبی کیفیات اور شخصی مسائل پر اکتفا کیا گیا ہے۔

مکاتیب شوکت کی ترتیب و اشاعت کا خیال کئی سال سے میرے ذہن میں تھا عرصہ ہوا والد کے ذخیرہ تبرکات میں ایک فائل ملا جس میں مولانا شوکت علی کے بہت سے خطوط مرتب موجود تھے۔ مولانائے مرحوم راقم تحریر کے خاص مربی اور شفیق سرپرست تھے اور راقم تحریر کو آج جو کچھ میسّر ہے وہ بہت حد تک مولانا شوکت علی مرحوم کی توجہ اور سرپرستی کے طفیل میں ہے اس لئے تمنا تھی کہ مولانا کی سوانح کے ساتھ ان کی یہ تحریریں شائع کر دی جائیں:۔

برادرم رئیس احمد جعفری نے کراچی سے ریاض تاجی ہو سال نکالنا ہے مجھے (۳) کے لئے مضمون لکھنے کی فرمائش کی جس کی تعمیل میں نہ کر سکا لیکن بعد کو یہ فائل میں نے جعفری صاحب کو بھیج دیا اور وعدہ کیا کہ لکھنؤ میں جو خطوط موجود ہیں ان کے نقول جلد ارسال کردوں گا، ابھی یہ نقول جعفری صاحب تک نہیں پہنچے تھے کہ برادرم مولانا رضا صاحب نے "عبدالباری اکاڈمی" کا خاکہ بنایا اور مجھے خیال ہوا کہ "مکاتیب شوکت" کی اشاعت اکاڈمی ہی کی طرف سے ہو۔

اس شرافت اور دیانت کی مثال آجکل کم ہے جس کا مظاہرہ رئیس احمد صاحب نے کیا۔ میں نے جیسے ہی اپنے خطوط اُن سے مانگے انہوں نے پورا ذخیرہ بحفاظت مجھے ارسال کردیا۔ اس مجموعہ میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کے بہت سے خطوط شائع نہیں کئے جا رہے ہیں جو بعد کو حضرت مولانا عبدالباری کی یادداشتوں کے ساتھ شائع ہوں گے۔ اس مجموعہ میں مولانا محمد علی کے بھی وہ خطوط درج کر دیئے گئے ہیں جو مولانا شوکت علی کے خطوط کے ساتھ موصول ہوئے تھے۔ مولانا عبدالباری کے علاوہ ان میں چند خطوط مولانا سلامتہ اللہ مرحوم اور مولانا شہید انصاری...... کے نام بھی ہیں جس طرح مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی یکجان دو قالب تھے اسی طرح مولانا عبدالباری اور مولانا سلامتہ اللہ تھے اور مولانا شہید انصاری کو بھی خصوصی نسبت حاصل تھی۔

اس لوکل گورنمنٹ کے خط آنے کے بعد گورنمنٹ ہند کا دوسرا خط آیا۔ جس کی عبارت یہ ہے
کیا گیا کہ محمد علی کو نواب صاحب نے نظر بند خود کیا ہے یا کسی کے کہنے سے شرائط کیا ہیں، کیا محمد علی نواب صاحب کے

مہمان ہیں"۔
نواب صاحب نے کمشنر بریلی کو بلایا مگر اس نے ٹال دیا، بلکہ یہ لکھ بھیجا کہ آپ کسی معتبر آدمی کو مع جواب کے بھیج دیں، اور میں
جواب کو دیکھ کر اس کو مناسب مشورہ دوں گا، وہ اس وجہ سے نہیں آیا کہ گورنمنٹ ہند کو اطلاع ہونے پر نتیجہ برا ہوگا، اور سب
کو اور صاف صاف معلوم ہو جائے گا جیسا کہ اب بھی ہے، کہ یہ سب کاروائی سر جیمس مسٹن اور اس کے نالائق افسروں کی ہے
نواب صاحب نے جواب دیا کہ محمد علی کو میں نے خود نظر بند کیا تھا، (جیسا کہنا ان کو مجبوراً لازمی تھا) وہ صرف ایک شب میرے
محل میں رہے، اور اب اپنے مکان پر ہیں، اور چونکہ وہ اور ان کے بچہ زیادہ بیمار ہو گئے ہیں، میں نے ان کو منصوری جانے کی اجازت
دے دی ہے، اب چونکہ یہ معاملہ گورنمنٹ تک پہونچ گیا ہے، اس کے بارے میں یعنی منصوری جانے کے بارے میں
گورنمنٹ کو کچھ اظہار رائے کرنا ہو تو قبل روانگی فرما دے، نواب صاحب نے اب سارا بوجھ گورنمنٹ پر ڈال دیا ہے، جواب
کا انتظار ہے، انشاء اللہ جواب آنے پر محمد علی ۱۴ ر یا ۱۵ ر مئی تک دہلی آکر منصوری چلے جائیں گے، یہ خط حضور جس کو مناسب
سمجھیں دکھا دیں، نواب صاحب کو ہمارے ساتھ ہمدردی ہوگئی ہے، مگر وہ کسی طرح لوکل گورنمنٹ کے خلاف نہ کریں گے
ہم کو بھی کافی ثبوت مل گیا ہے، یہ سب کاروائی مسٹن صاحب کی تھی، اس لئے ہم کو نواب صاحب سے کوئی شکایت نہیں
خدا ان کی کمزوریوں کو دور کرے، اور ان کو ہمت دے، کہ وہ اپنے برے بھلے کو دیکھ سکیں، ہم ان سے لڑنا پسند نہیں
کرتے کیونکہ وہ صرف بنا لئے گئے ہیں، ہم کو اصل بات پر توجہ کرنی چاہیئے، ابھی ہم خاموشی اور صبر سے دیکھتے ہیں، جو
آنے پر سب حالات معلوم ہو جائیں گے، اس کے بعد اگر ضرورت ہوگی، تو ہم اپنی آواز بلند کریں گے، محمد علی کے ساتھ اس قسم
زیادتیاں کرنا ہم ہرگز گوارہ نہ کریں گے، حضور اجمیر شریف کس تاریخ جائیں گے، ہم سب کا ارادہ ہے تاریخ ورود
ضروری
مطلع فرمائیں۔
معلوم ہوتا ہے کہ سر جیمس مسٹن کی کوشش کہ مسلمانوں میں کبھی کسی نہ کسی طرح شورش پھیلے اور وائسرائے بدنام ہوں۔
حضور کا خادم شوکت علی،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

لینڈ سڈاؤن

۱۲ ر اپریل ۱۹۱۵ء

مجی شوکت علی، ممالک متحدہ کی گورنمنٹ نے مجھ سے خواہش کی ہے، تم کو اطلاع کرنے کی کہ تم کو مسلمان نوکر د
انجمن خدام کعبہ میں داخل کرنے سے پرہیز کرنا چاہیئے، اس قسم کے تمام کام روک دینا چاہیئے،
دستخط ۔بی۔اے اینڈرسن

دہلی - ۹ مئی ۱۹۱۵ء　　　　ضروری

قبلہ و کعبہ - السلام علیکم

میں کل صبح رامپور سے واپس آیا، مزید حالات لکھتا ہوں، جس سے حضور کو تمام معاملہ کا اندازہ ہو سکے گا۔ نواب صاحب نے اجازت دے دی تھی کہ محمد علی منصوری چلے جائیں، کیونکہ خود ان کو بخار آتا تھا، اور بچیاں بھی بیمار تھیں، ڈاکٹر صاحب نے اور انھوں نے مل کر اول سے بنگلہ منصوری میں لے لیا تھا، نواب صاحب نے جو کچھ کارروائی کرنی چاہی تھی، وہ صرف انسپکٹر جنرل پولیس ڈگلس اسٹریٹ کی وجہ سے تھی، جو سر جیمس مسٹن کا پیام زبانی لائے تھے، صاف صاف الفاظ میں کہا ہو یا نہ مگر اشتعال اور خوف ضرور نواب صاحب کو دلا کر یہ کام کرنا چاہا تھا، کیونکہ محمد علی ۱۶/ اپریل کو رامپور گئے تھے، اور اسی دن شام کو سرکار کے سلام کو گئے تھے، سرکار ملے تو نہ تھے، مگر اُن کو اطلاع ضرور ہو گئی ہو گی، ۱۷/ اپریل محمد علی علاقہ میں شکار کو چلے گئے، ۲۰/ کو ڈگلس اسٹریٹ وہاں آیا تھا، اور اول ملاقات سے واپس آتے ہی محمد علی کو سرکار نے دریافت کیا، کہ وہ کہاں تھا، اور یہ کہ جب وہ آئے تو اس کو بلانا، کانپور میں خون برسنے کی خبر جو نامہ نگار کانپور نے بھیجی تھی، اس کا تذکرہ بھی کیا، اور کہا کہ جب مشہد مبارک میں اُس سخت واقعہ کے بعد خون نہ برسا تو کانپور میں کیا برستا، اُس کے بعد حالات حضور کو معلوم ہیں، حکیم اجمل خاں صاحب، ڈاکٹر انصاری صاحب اور خود رامپور کے حکام نے سرکار کو سمجھایا کہ حضور کیوں اس معاملہ میں پڑتے ہیں، اگر سر جیمس مسٹن اور گورنمنٹ محمد علی کو پکڑنا چاہتی ہے تو وہ پکڑ لے، حضور کیوں پھانسی ڈالنے کا کام اپنے ذمہ لیتے ہیں، محمد علی نے آپ کے قانون کے خلاف کوئی فعل نہیں کیا ہے، نواب صاحب اسی وقت نرم پڑ گئے کیونکہ جو کچھ انھوں نے کیا تھا وہ سر جیمس مسٹن کی وجہ اور ڈگلس اسٹریٹ کے اُکسانے سے کیا تھا، ڈگلس اسٹریٹ کا رامپور آنا بلا وجہ نہ تھا ڈاکٹر انصاری سے سرکار نے مجھ کو یہی پیام بھیجا، اور چونکہ مجھ کو اُن سے اُنس تھا باوجود تمام باتوں کے میں نے اُسی وقت جواب تحریری بھیج دیا جس کی نقل بھیجتا ہوں، صاف صاف میں نے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا تھا، یعنی ۳۰/ کو رامپور گیا بھی اور سرکار سے ملا، اور تمام معاملات پر صاف صاف گفتگو کی، میں نے کوئی بات لگی لپٹی نہیں رکھی، حضور کو تمام حالات معلوم ہو گئے ہوں گے، سرکار نے محمد علی کو منصوری جانے کی اجازت دے دی تھی، اس عرصہ میں سر جیمس مسٹن کی کوئی تحریر آئی کہ جس میں یہ لکھا تھا، کہ گورنمنٹ ہند نے مجھ سے محمد علی کی نسبت کہا تھا کہ وہ کہاں ہیں، میں نے کہہ دیا کہ اُن کو نواب صاحب رامپور نے بند کر دیا ہے، یہ یقینی امر ہے کہ نواب صاحب نے گورنمنٹ صوبہ کو کوئی اطلاع نہیں بھیجی تھی کہ محمد علی کو میں نے نظر بند کر دیا ہے، کیونکہ محمد علی نظر بند نہ تھے، پھر لوکل گورنمنٹ نے کیسے بالا بالا شملہ لکھ دیا اور بغیر نواب صاحب سے دریافت کئے ہوئے، نواب صاحب نے اگرچہ ظاہر نہیں کیا مگر یہ بات اُن کو بہت بری معلوم ہوئی، واقعی والیان ملک کی بے توقیری کی حد ہو گئی، میرے خیال میں نواب صاحب جس وقت غور کریں گے تو اُن کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ یہ سب ظاہری باتیں مطلب کی ہیں، سر جیمس مسٹن سے زیادہ بد ظن کوئی انگریز حاکم مشکل سے ہو گا، اور ایسے حاکموں سے سلطنت برطانیہ کو دنیا میں سخت سے سخت مصیبت پڑے گی، خواہ مخواہ مخلوق کو تنگ کر کے گورنمنٹ سے دل برداشتہ کرتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ؕ

لینڈسٹاؤن

۱۴ ر نومبر ۱۹۱۵ء

مجبی اینڈرسن - تمہارا بارہ تاریخ کا خط لکھو ہوا جس کا جواب میں تمہیں بھیجتا ہوں، امید ہے کہ تم ممالک متحدہ کی گورنمنٹ کو اطلاعاً یہ خط روانہ کردو گے میں نے اپنے خیال میں تمام اُن احکام کی پابندی پورے طور سے جو مجھے ۲۱ رجون ۱۵ء کو نظربندی کے حکم کے ساتھ روانہ کئے گئے تھے، خواہ یہ احکام سخت ہی ہوں خواہ ناانصافی کے، اپنی موجودہ حالت میں میں کسی سے بحث نہیں کرسکتا بالخصوص گورنمنٹ عالیہ سے، لیکن انصاف یہ ہے کہ جو اطلاع گورنمنٹ کو ملی ہے کہ میں مسلمانوں کو ترغیب دلاتا رہا ہوں، کہ انجمن خدام کعبہ میں داخل ہوں، جسکے سکرٹری ہونے کا شرف خود مجھ کو حاصل ہے، اور جس اطلاع ظاہرا کا گورنمنٹ کو یقین معلوم ہوتا ہے، وہ واقعی سراسر بے بنیاد و غلط ہے، میں نے یہاں ایک شخص سے بھی خدام کعبہ میں داخل ہونے کی خواہش ظاہر نہیں کی، اور اگر میں نے ایسا کیا بھی ہوتا تو کوئی سرکاری حکم کی جو میرے بارے میں نافذ ہوا ہو فرو گذاشت نہیں کی، اول ہی سے میں نے تمام اُن افعال سے پرہیز کیا ہے، جو میرے کسی بدخواہ کے دل میں کوئی بدگمان پیدا کرسکتے ہوں، میں اس کے مثال میں ایک امر پیش کرتا ہوں، تم جانتے ہو کہ لینڈسڈاؤن ایک چھوٹی جگہ ہے، اور کئی ہفتہ سے یہاں کوئی امام نماز جمعہ پڑھانے کو نہیں ہے، اور جب ایک تھا تو وہ بہت ضعیف اور کمزور تھا، کہ خطبہ بھی درست نہیں پڑھ سکتا تھا، مسلمان ہونے کی حیثیت سے مجھ پر اور اگر کوئی اور قابل آدمی موجود ہوتا تو اُس پر یہ فرض تھا کہ نماز پڑھاتا تاکہ نماز درستی کے ساتھ ادا ہوتی، لوگوں نے بارہا مجھ سے نماز پڑھانے کے واسطے سخت اصرار کیا، لیکن میں نے محض اس وجہ سے انکار کیا کہ میرے بارے میں کوئی بدگمانی نہ پیدا ہو، واقعی میں یہ میری ایک مذہبی کمزوری تھی، جسے میں دعا کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ معاف فرما دے گا، میں نے جمعۃ الوداع کو نماز پڑھانے باوجود لوگوں کے سخت اصرار قطعاً انکار کیا، اور صرف مجبور ہوکر آخر میں دعا مانگی جو دعا میں اپنی تمام زندگی مانگتا رہا ہوں، سٹر بار کے سامنے مانگ چکا ہوں، اور خوشی سے لفٹنٹ گورنر یا کسی اور شخص کے روبرو مانگنے کو تیار ہوں، ہر نماز کے آخر میں ہر مسلمان اس دعا کو پڑھتا ہے، جس میں وہ اسلام فتح اسلام، خلیفۃ الرسول خود اپنے، اپنے اعزا، احبا اور تمام دنیا کے مسلمان مرد و عورت کے تحفظ کے واسطے دعا کرتا ہے، ہر مسجد میں بلا اعلان یہ دعا ہندوستان کی ہر مسجد میں نماز کے بعد مانگی جاتی ہے، اور خاص کر بمبئی، کلکتہ، مدارس اور رامپور کی مساجد میں اب خدام کعبہ کے بارے میں میں سخت پشیمان ہوں کہ میں نے اب تک یہاں کسی شخص کو خدام کعبہ میں داخل ہونے کی ترغیب نہیں دی ہے، وہ خدام کعبہ جو واقعی ایک بہت بڑی مذہبی تحریک ہے، اور جو مجھے یقین ہے، کہ اسلام کو زندہ کردینے میں بہت مدد کرے گی، اور ہم لوگوں کو بہتر مسلمان بنا دے گی، اور یوں گورنمنٹ کی بہتر اور زائد قابل قدر رعایا بنا دے گی، یہاں کئی آدمی خدام کعبہ میں داخل ہوئے ہیں، لیکن میرے کہنے سے نہیں، مجھے امید ہے کہ گورنمنٹ میری بات کا یقین کرے گی، اور اگر نہیں تو ان اشخاص سے خود دریافت کرلے گی، تب گورنمنٹ کو اس بات کا یقین ہوجاوے گا کہ مجھ پر ایسے فعل کا الزام لگایا گیا جو واقعی میں میں نے ہرگز نہیں کیا تھا، چند مسلمانوں نے میرے پاس آکر یہ ضرور دریافت کیا تھا، کہ اس تحریک کا مقصد کیا ہے

اور میں کعبہ شریف کی خدمت کے واسطے تیار ہوں، اور زندگی بھر اگر خدا نے چاہا تو حتی المقدور کرتا رہوں گا، اور ہر مسلمان پر فرض
ہے مجھے اس امر کی ضرورت میں اپنے لئے کوٹ اور زرد نشان خدام کعبہ کا تذکرہ کروں کیونکہ تم اسے خود متعدد بار دیکھ
چکے ہو، جب سے میں ۶ مئی ۱۳ء کو خدام کعبہ میں شامل ہوا ہوں یہ کوٹ اور نشان برابر میرے جسم پر رہا ہے، اور جس نے
مجھے دیکھا ہوگا، انہیں بھی دیکھا ہوگا اور شاید لفٹننٹ گورنر اور چیف سکرٹری نے بھی جب میں نے اُن سے رامپور کی ۱۳ء
کی دعوت میں ملاقات کی تھی ضرور اس کوٹ اور نشان کو دیکھا ہوگا، میں نے ان چیزوں کو لینڈ سٹراؤن کے مسلمانوں
کو ترغیب دلانے کے واسطے نہیں پہنا تھا، اگر انہیں چیزوں نے مسلمانوں کے دلوں کو تسخیر کر کے اُن میں شریف و پاک خواہش
پیدا کر دی کہ اس بڑی تحریک میں حصہ لیں اور اس طور پر زندگی بہتری اور خلوص کے ساتھ بسر کریں تو مجھے اس امر کی بہت
خوشی ہے، اور امید کرتا ہوں کہ یہاں اور عاقبت میں، دونوں جگہ مجھے اجر نیک ملے گا، میں نہیں جانتا کہ گورنمنٹ ممالک متحدہ
کے خیالات خدام کعبہ کے بارے میں کیا ہیں، لیکن یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے خادم الخدام حضرت مولانا عبدالباری صاحب
قبلہ فرنگی محلی تک اور وائسرائے کے پرائیویٹ سکرٹری کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی تھی، جس میں ہم نے تمام اپنے اعلے اعلے
خیالات و جذبات ظاہر کئے تھے، اُس کے جواب میں ہز ایکسیلنسی نے لکھا تھا کہ وہ ایسی مذہبی انجمن کے بارے میں کوئی رائے ظاہر
کرنا مناسب نہیں خیال کرتے، میں نے خود گورنر بمبئی اور دوسرے بڑے بڑے سرکاری حکام سے ملکر جن میں سی آئی ڈی کے
افسران بھی ہیں، تمام قوانین و ضوابط کی نقلیں اُنہیں دی ہیں، اُن سے اپنے کام کی حالت بیان کی ہے، اور کئی بار انجمن کے
مختلف امور پر بحثیں کی ہیں، حجاز شریف کے زائرین کی جو خدمت ہم نے کی ہے، اُس کی بے حد تعریف کی گئی ہے، اور اب
بھی ہمارے کارندے اس معاملہ میں بمبئی میں اور دوسری جگہوں پر خوب کام کر رہے ہیں، جنگ کے اختتام پر ہمارا قصد ہے کہ اگر
خدا نے چاہا تو ایک آل انڈیا شپنگ کنسرن قائم کر کے گورنمنٹ کو زائرین کے حجاز کے تمام تردوات و افکار سے سبکدوش
کر دیں گے، اس کمپنی میں رئیس سے لے کر فقیر تک، اپنی حیثیت کے مطابق حصہ لے گا، اور انشاء اللہ یہ مرحلہ بالکل طے
ہو جاوے گا، میں نے دوبارہ ہز آنر سر جیمس مسٹن سے خواہش کی مجھے ملاقات کی اجازت دیں تاکہ میں خود انہیں تمام امور سے مطلع
کر دوں، لیکن وہ اور امور ضروری میں بیحد مشغول تھے اور انہیں موقع نہ ملا، میں پھر یہ خواہش پیش کرتا ہوں، کہ میں بہت
ممنون ہوں گا اگر ہز آنر مجھے موقع دیں کہ میں مل کر اس اہم اور عمدہ انجمن کے بارے میں اُنہیں پوری پوری اطلاع دوں،
مجھے بالکل خواہش نہیں کہ میں اپنے ذاتی امور پر بحث کروں، اگر میرے ساتھ زیادتی یا ناانصافی کی جاوے تو یہ چنداں مضر نہیں
لیکن میرے خیال میں یہ گورنمنٹ یا لوگوں کے واسطے کوئی معمولی برائی نہ ہوگی، اگر ایک اہم مذہبی انجمن جو احکامات قرآنی پر مبنی
ہو مثل خدام کعبہ بد ظنی کی نگاہ سے دیکھی جاوے، میں اس بارے میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ خدمت کعبہ شریف ہر مسلمان
مرد و عورت و بچہ پر فرض ہے، اور ہر مسلمان کو اگر وہ مسلمان رہنا چاہتا ہے، تو خدام کعبہ ہونا چاہیئے، ہماری انجمن صرف اس وجہ
سے قائم کی گئی ہے، کہ مسلمانوں کو خدا کے ایک ایسے حکم پر عمل کرنے میں مدد کرے جسے انہوں نے فروگذاشت کر دیا تھا، خاص کر
حال میں جب کہ خادم الحرمین الشریفین خلیفۃ الرسول امیر المومنین سلطان المعظم ترکی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ، ایسے کمزور ہو گئے ہیں، کہ

مقامات مقدسہ کی حرمت غیر مسلم سلطنتوں کے خلاف قائم رکھنا ایک مشکوک امر باعتبار اُن کی طاقت کے تمام دنیا کے مسلمان خیال کرنے لگے ہیں، مجھ کو یہ تحریر کرنے کی ضرورت نہیں، کہ سرکاری دس کروڑ مسلمان رعایا کس قدر خوش ہوئی، اس اعلان سے جو اوائل جنگ میں شائع کیا گیا تھا، کہ اسلام کے مقامات مقدسہ کی حرمت برقرار رکھی جائے گی، یہ فعل نہایت مدبرانہ تھا، اور تمام وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ عرب پاک کو سلطنت انگلشیہ میں ملا لینا چاہیئے، اور اس طور پر گورنمنٹ کو دھوکا دے کر اپنی زبانی وفاداری کا یقین دلانا چاہتے ہیں، اس سلطنت کے سب سے بڑے دشمن ہیں، اور اس قابل ہیں کہ پھانسی دے کر سب سے اونچے درخت سے لٹکا دیئے جاویں، میرے بعض بعض عقائد ہیں جو میرے ایمان کا جز ہیں، اور جن کے بارے میں قرآن پاک میں صاف صاف تنبیہ ہے (ہر آنر لفٹنٹ گورنر خود بھی ایک مذہبی آدمی ہیں) مجھے یقین ہے کہ اس بات کو پسند کریں گے کہ ہر شخص اپنے مذہب کا پابند رہے، خواہ اُس کا مذہب اُن کے مذہب سے بالکل جداہی کیوں نہ ہو، میں حتی الامکان کوشش کروں گا کہ گورنمنٹ کے تمام احکام کی پابندی کروں، اگر وہ ان احکام کے خلاف ہونگے جو تیرہ^۱۳ سو برس قبل ایک کہین بارگاہ سے ملے ہیں یعنی میرا خدا جو تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہے، مجھے یہ خوف نہیں ہے کہ گورنمنٹ کسی کو مجبور کرے گی کہ اپنی طبیعت کے خلاف عمل کرے کیونکہ اب تک اُس نے ایسا کبھی نہیں کیا، لیکن گورنمنٹ کو یہ جاننا چاہیئے، کہ میں مسلمان ہوں اور شاہ معظم اور اکثر بڑے بڑے سرکاری افسران عیسائی یعنی غیر مسلم ہیں، تیرہ^۱۳ سو برس سے زائد ہوئے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہمارے خدا نے ہمارے روزانہ زندگی کے تمام امور کے بارے میں تعلیم کی ہے، نہ میں نے اُن میں کوئی تغیر کیا ہے، اور نہ میں کسی حالت میں اُن میں کوئی تغیر کر سکتا ہوں،۔

تمام غلط فہمیاں اور شکوک رفع کرنے کے واسطے میری خواہش ہے کہ سرکاری اعلےٰ افسران قرآن پاک اور احادیث کی تعلیم حاصل کریں، اور میں اُن کو خاص طور پر قرآن پاک کی ذیل کی آیتوں کی طرف توجہ دلاتا ہوں جن پر انجمن خدام کعبہ مبنی ہے،

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى ط وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ٥ سورۃ البقر رکوع (۱۵)۔

ترجمہ:۔ (اور یاد دلاؤ بنی اسرائیل کو) کہ جب ہم نے مقرر کیا اس مکان (کعبہ شریف) کو بنی آدم کے جمع ہونے اور اُن کی حفاظت کا گھر اور لوگوں کو حکم دیا کہ (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) کے گھر کو عبادت گاہ بنادیں اور حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ علیہ السلام سے عہد لیا کہ اُس کو پاک رکھیں اُن لوگوں کے واسطے جو اُس کا طواف کرتے ہیں، عابدوں کے واسطے اور اُن لوگوں کے واسطے جو عبادت میں جھکتے ہیں،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَٰذَا وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ إِن شَاءَ ط إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ٥ ۔سورۃ التوبۃ رکوع (۴)۔

ترجمہ:۔ اے وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہو، یقینی مشرک نجس ہے پس اُن کو نہ جانے دو مقامات مقدسہ میں اُن کے اس سال کے بعد اور اگر کمزوری سے ڈرتے ہو اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے تمہاری کمزوری دفع کر دے گا، اگر وہ چاہے گا، یقینی خدا تعالےٰ سب جانتا ہے، اور سب درست سمجھتا ہے۔

ان دونوں آیتوں سے صاف ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے ایمان حضرت ابراہیم ع کے مثل ہیں یعنی مسلمان، اُنھوں نے کعبہ کی حرمت قائم رکھنے کی قسم کھائی ہے، اور اُس وقت سے نہ تو کوئی غیر مسلم وہاں داخل ہوسکا ہے اور نہ کوئی اثر اپنا پیدا کر سکا ہے، قرآن پاک کا ہر حکم ہر شخص مسلم پر فرض ہے اور کوئی اپنی ذمہ داری کو دوسرے پر نہیں چھوڑ سکتا۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتؤمنون باللہ ط ولو اٰمن اھل الکتاب لکان خیراً لھم ط منھم المؤمنون واکثرھم الفاسقون ○ سورۃ آل عمران رکوع (۱۲)

ترجمہ:۔ تمام ان قوموں میں جو انسان کی تعلیم و تربیت کے واسطے پیدا کی گئی ہیں تم سب سے بہتر ہو، کیونکہ تم اُن کو نیکی کی ہدایت کرتے اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو، اور اگر اہل کتاب نے (یہود و نصاریٰ) یقین کیا ہوتا (اسی طور پر) تو اُن کے واسطے بہتر ہوتا لیکن اُن میں سے بعض مانتے ہیں، اور اکثر نہیں مانتے،

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر ط وللہ عاقبۃ الامور ○ (سورۃ الحج رکوع ۶)۔

ترجمہ:۔ یہ (مسلمان) اگر ہم ان سے دنیا کو بھردیں (یعنی انھیں پیدا کریں دنیا میں) نماز پڑھیں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور لوگوں کو نیکی کرنے کی تنبیہ کریں گے، اور برائی سے روکیں گے، اور تمام امور کا انجام اللہ کے ساتھ ہے،

بالآخر میں کہنا چاہتا ہوں کہ میں جانتا ہوں کہ میں کیا ہوں، اور کوئی مجھے مجھ سے بہتر نہیں جانتا، میں نہیں کہتا کہ میں خدا رسیدہ یا عالم ہوں، نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں ایک پولیٹیکل لیڈر ہوں، میں ایک بالکل معمولی مسلمان آدمی ہوں، جس نے بہت تجسس کے بعد قرآن پاک میں ایک طریقہ دنیا و آخرت میں عاقبت بخیر ہونے کا پالیا ہو، میں نے نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق روزانہ زندگی بسر کرنے کا ایک طریقہ معین کرلیا ہے، مجھے افسوس ہے کہ بعض اوقات آرام و زندگی آسائش حاصل کرنے کی وجہ سے اور کبھی اس خوف سے کہ میں ان کو کھو بیٹھوں گا اور تکلیف اُٹھاؤں گا میں نے دوسروں کی خواہش کے مطابق اس طریقہ پر عمل نہیں کیا ہے، اور اپنے پیدا کرنے والے کے احکام کے خلاف ورزی کی ہے، اس وجہ سے میں نے اس نظربندی کے حکم کو اپنے گذاشتہ اعمال بد کی معقول سزا خیال کرکے منظور کرلیا ہے، درحقیقت یہ سزا بہت خفیف ہے اور کسی طور پر میرے گناہوں کو خیال کرکے کافی نہیں،

کیا میں اب بھی وہی غلطی کروں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کروں خواہ کسی حالت میں کسی وجہ سے کسی جبر سے کیوں میرے اعتقادات ہیں اور میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے استقلال دے کہ میں اُن پر قائم رہوں، میں نے تمام امور کے بارے میں آزادی سے لکھا ہے اور مجھے امید ہے کہ گورنمنٹ اس آزادی سے فائدہ اٹھاوے گی ۔ (دستخط) شوکت علی، مکرر یہ کہ اس تحریر کو ختم کرنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرا تبادلہ ممالک متوسط میں چھندواڑے میں ہوگا، میں ممالک متحدہ کی گورنمنٹ سے استدعا کرتا ہوں کہ اس تحریر کی ایک نقل گورنمنٹ ممالک متوسط کو روانہ کردے، تاکہ مجھے آئندہ فضول خط و کتابت نہ کرنا پڑے ۔ دستخط شوکت علی

میں نے اواخر فروری میں ارادہ کرلیا تھا، کہ لاہور کے چیف کورٹ میں کامریڈ کا جو مقدمہ دائر تھا، اُس کی سماعت ملتوی کرکے لیجسلیٹو کونسل کے سشن کے بعد کچھ عرصہ کے لئے اپنی صحت کی اصلاح اور دماغی کام سے فرصت حاصل کرتے

اور دو دن حرارت کے باعث وہی میں رہ کر پندرہ اپریل کو شب کے پچھلے دس بجے کی گاڑی سے رامپور روانہ ہوئے اور سولہ تا
کے سوا چھ بجے رامپور پہونچ گئے ۔

۴- شب ماقبل میں میرے سالے مسٹر معظم علی ڈھاکہ سے رامپور پہونچ چکے تھے ، اور اُن کے ایک دوست تشریف لا
ہوئے تھے ، رامپور پہونچنے کے بعد ہم سب کا ارادہ ہوا کہ چند دن کے لئے سوار کی تحصیل میں شکار کے لئے چلے جائیں ، چنانچ
کی صبح کو میں اپنے بھائی کے گاؤں موضع رامپور کو مع چند احباب کے اور چند عزیزوں کے روانہ ہو گیا ، مگر جیسا کہ میرا دستور رہا ہے
میں جس دن رامپور پہونچا اُسی دن حضور نواب صاحب کے سلام کے واسطے کوٹھی خاص باغ کو جہاں حضور والا تشریف رکھتے
گیا ،

مگر جب سے کانپور کا واقعہ پیش آیا ہے ، حضور ممدوح کی باریابی کا شرف حاصل نہیں ہوا ہے ، گو میں اپنی حاضری کی اطلاع
دیا کرتا ہوں ، چنانچہ اس بار بھی یہی ہوا ، چند گھنٹہ کوٹھی خاص باغ میں سیکرٹری کے پاس بیٹھنے کے بعد میں شب کو مکان واپس
اور دوسرے دن صبح کو شکار کے لئے روانہ ہوا ،

۵- ۱۷-۱۸-۱۹-۲۰- تاریخوں کو ہم نے تحصیل سوار میں شکار کھیلا ، اور موخر الذکر تاریخ کو عازم رامپور ہو کر شب کے آٹھ
مکان پر پہونچا اس عرصہ میں میری طبیعت کچھ نادرست تھی اور شکار و سفر کے کسل کے باعث مجھے شب کو مکان آتے ہی
آگیا ، البتہ صبح کو بخار میں کمی تھی ، ۲۱ر کی صبح کو مجھے معلوم ہوا کہ بیس ۲ کو ممالک متحدہ کے انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر ڈگلس اسٹر
رامپور آئے ہوئے ہیں ، اور قلعہ معلی انگریزی مہمان خانہ میں مقیم ہیں ، اس کے کچھ دیر بعد میرے چچا زاد بھائی کپتان حشمت
صاحب جو قلعہ معلی کے کپتان اور مجسٹریٹ ہیں ، میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ نواب صاحب صبح کو تشریف
تھے ، اور میرے متعلق دریافت فرماتے تھے ، کہ شکار سے واپس آگیا یا نہیں ، اور مسجد کانپور میں خونباری کے متعلق
اپریل کے ہمدرد میں جو حالات شائع ہوئے تھے ، اس کے متعلق فرماتے تھے کہ یہ کیا واقعہ ہے ، مشہد مقدس میں
خونباری ہوئی نہیں ، کانپور کی مسجد میں کیسے ہوئی ، میں نے عرض کیا کہ اگر جناب سے پھر دریافت فرمائیں تو کہہ دیجئے گ
میں تو پندرہ ۱۵ اپریل کو دہلی سے رخصت ہو چکا ہوں ، اور اخبار کا تمام کام اُس دن سے دوسروں کے سپرد کر چکا ہو
مجھے مسجد کانپور کی خونباری کا کیا علم ہو سکتا ہے ، محض اتفاقاً بیس ۲ کی شب کو شکار سے واپس آنے پر انہیں کے یہاں
دن کا ہمدرد نظر سے گذرا اور اس واقعہ کی اطلاع ہوئی ، ورنہ میں نے تو پندرہ اپریل کے بعد سے ہمدرد بھی نہیں دیکھا ،

۶- یہ غالباً صبح کے ساڑھے نو بجے کا واقعہ ہے ، اس کے چند ہی منٹ کے بعد قلعہ سے ایک ہرکارہ میر
پاس آیا اور مجھے اطلاع دی کہ چیف سیکرٹری صاحب نے کوٹھی خاص باغ سے ٹیلیفون دیا ہے کہ مسٹر محمد علی کو کوٹھی خا
باغ بھیجا جائے ایک سرکاری کام کے لئے ضرورت ہے ، کچھ عرصہ گاڑی کا انتظار کرنے کے بعد میں کوٹھی خاص باغ
گیا اور غالباً گیارہ بجے تک وہاں پہونچ گیا ، چیف سیکرٹری صاحب کو اپنے پہونچنے کی اطلاع دلائی ، اور اُن کے دفتر
کمرہ میں بیٹھا رہا تھوڑی دیر بعد وہ تشریف لائے ، اور مجھ سے مسجد کانپور کی خونباری کے متعلق دریافت فرمایا ، میں
نے اُن کو بھی وہی جواب دیا جو اپنے بھائی کپتان حشمت علی خاں صاحب کو اس کے قبل دے چکا تھا ، اس کے بعد وہ

کے لئے دہلی سے باہر چلا جاؤں گا، کامریڈ بند ہونے سے جو فرصت مل گئی، اُس کے وجہ ذیابیطس کے مرض میں مبتلا ہو چکا تھا اور اُس کے علاوہ بھی اپنی صحت خراب کر چکا تھا، مجھے ضروری معلوم ہوا، اُس فرصت کو غنیمت جان کر کچھ عرصہ کے لئے آرام کروں۔

۲۔ اس تعطیل کے زمانہ کو کہاں گذاروں اس کے متعلق مختلف مقامات کا خیال آیا، پہلے میرا ارادہ ہوا کشمیر چلا جاؤں لیکن اول تو بعد دوسرے کشمیر میں مسٹر کوپ سابق ریذیڈنٹ بڑودہ کا ریذیڈنٹ ہونا جو غالباً مجھ سے اُن مضامین کے باعث برافروختہ ہیں جو مہاراجہ صاحب بڑودہ کے واقعہ دربار کے متعلق کامریڈ میں شائع ہوئے، ان دونوں وجوہ سے میرے احباب نے مجھے کشمیر جانے سے روکا، بعض نے صلاح دی کہ میں پچمڑی چلا جاؤں مگر وہاں جانے میں بھی کچھ بعد مانع ہوا، اور کچھ یہ خیال کہ وہاں میں، میں بالکل اجنبی ہونگا، اور کسی قسم کی صحت میسر نہ آئے گی، خود میرا خیال شملہ کے متصل کسی پہاڑی پر ایک مکان لینے کا تھا لیکن بعض احباب نے اس کے برخلاف رائے دی، اس لئے کہ انہیں خوف تھا، کہ مبادا پنجاب گورنمنٹ جو مسٹر ظفر علیخاں کی ناروا تشدد کر چکی تھی، اپنی دست تشدد کو مجھ تک پہنچائے، بعض احباب کا خیال تھا، کہ مجھے منصوری جانا چاہیئے، اور اس میں ایک فائدہ یہ تھا، کہ ڈاکٹر انصاری بھی منصوری میں مکان لے رہے تھے، مگر ممالک متحدہ کے حکام سے جو میرے تعلقات تھے، وہ ظاہر ہیں، اور منصوری کی حالت شملہ سے بھی بدتر ہوتی، ایسی حالت میں چارہ نہ تھا کہ یا تو دارجلنگ یا مہابلیشور وغیرہ کا دُور دراز سفر اختیار کیا جائے، یا دہلی ہی میں اقامت رہے، مؤخر الذکر حالت میں دراصل فرصت ملنا ناممکن ہے، اس لئے کہ یہاں دہلی میں ہونا اور ہمدرد کے متعلق کچھ کام نہ کرنا اور متعدد احباب سے نہ ملنا اور کسی پبلک معاملات کے متعلق استفسارات کا جواب نہ دینا ناممکن تھا، آخر شش یہ رائے قرار پائی کہ کم سے کم کچھ عرصہ کے لئے رام پور رہوں اور اس کے بعد اگر میری صحت کے لئے ضروری ہو تو، ڈاکٹر انصاری کے ہمراہ منصوری جا کر رہوں، میرے بہت سے احباب اس فیصلہ کے بالکل خلاف تھے اور اُن کی رائے تھی، کہ ممالک متحدہ کے حکام جس کام کو خود کرتے ہوئے ڈریں گے، اُس کو ریاست کے ذریعہ سے کرانے میں انہیں کچھ تامل نہ ہوگا، اس لئے کہ ان کی خواہش انتقام تو پوری ہو جائے گی، مگر ساری بدنامی ریاست کے سر رہے گی، میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ شبہات بیجا تھے، خصوصاً اس حالت میں جب کہ واقعات نے اس کی تصدیق کر دی ہے، مگر مجھے غالباً معلوم ہوا تھا کہ اس سے قبل ایک بار میرے اور شوکت علی کے رامپور آنے کے متعلق لفٹننٹ گورنر ممالک متحدہ نے نواب صاحب کو کچھ طنزاً لکھا تھا، جس کے جواب حضور ممدوح نے صاف لکھ دیا تھا کہ رامپور ان کا وطن ہے، اور میں اُن کی رامپور کی آمد و رفت کو نہیں روک سکتا، اس لئے مجھے قوی امید تھی، کہ ریاست میں میرے ساتھ کوئی کارروائی نہ کی جائیگی جس کے کرنے میں خود گورنمنٹ کو تامل ہو۔ جب کہ ریاست کو میرے طرز عمل سے شکایت پیدا ہونے کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا،

۳۔ رام پور آنے کے متعلق میں آخری فیصلہ غالباً بیس ۲۰ مارچ تک کر چکا، اور بمبئی میں کچھ قانونی مشورہ کرنے اور علی گڑھ اولڈ بوائز کے سالانہ جلسہ اور مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے اجلاس کے بعد میں اپنے تمام مشاغل سے فارغ ہو کر پندرہ ۱۵ اپریل کو عازم رامپور ہوا، میرا قصد ۱۴ اپریل ہی کو جانے کا تھا، مگر رامپور میں طاعون کا زور ہونے کے باعث ڈاکٹر انصاری نے اصرار فرمایا کہ میں مع اپنے متعلقین طاعون کا ٹیکہ لگوانے کے بعد رامپور جاؤں، چنانچہ ۱۳ تاریخ کو ہم سب کے ٹیکہ لگایا گیا

میں تشریف لے گئے، چند منٹ کے بعد ایک صاحب سرکار ہی سے تشریف لائے، اور مجھ سے فرمایا کہ سرکار کا حکم ہے، کہ آپ کوٹھی میں دفتر کے کمرہ میں آجائیں، جب میں دفتر کے کمرہ میں پہونچا، تو چیف سیکرٹری صاحب نے فرمایا، کہ سرکار نے آپ کو اپنے استراحت کے کمرہ میں طلب فرمایا ہے، چنانچہ جوتا اُتار کر میں اُن کے ہمراہ سرکار کی خوابگاہ میں حاضر ہوا، حسب معمول دو تین حکام اور دو تین مصاحبین اس کمرہ میں موجود تھے، اور سرکار پلنگڑی پر تشریف فرما تھے، چونکہ مجھے پورے دو برس سے شرف باریابی حاصل نہیں ہوا تھا، اس لئے میں نے اپنے آباؤ اجداد کے طریقہ پر قدم بوسی کی اور سلام کرنے کے بعد حسب الحکم سرکار پلنگڑی کے پاس بیٹھ گیا، اس کے بعد سرکار نے فرمایا، کہ میں پالیسی کی باتیں نہیں جانتا ہوں بس میں کہتا ہوں، آپ دوران جنگ میں رامپور ہی میں رہیں، قلعہ میں آپ کو ایک کمرہ مہمان خانہ میں دے دیا جائے گا، وہیں آپ قیام رکھیں، اور اخبار کو کریں بند جب لڑائی ختم ہو جائے تو سو گالیاں آپ گورنمنٹ کو دیں اور چار سو مجھے جب تک لڑائی رہے گی آپ کو قلم دوات نہیں دی جائے گی، میں بغیر سوچے سمجھے ہاتھ نہیں ڈالتا ہوں، میرے ہاتھ کو گرانہ ہونے دینا، اس پر میں نے عرض کیا، کہ میں اخباروں کے لئے کوئی مضمون نہیں لکھنا چاہتا، میری صحت خراب ہو چکی ہے، اور آرام کرنے کی غرض سے گھر آیا ہوں، اس پر سرکار نے قلعہ میں رہنے کے متعلق فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ انگریز مجھ سے کہا کرتے ہیں، کہ تم ہی نے تعلیم دلا کر دونوں بھائیوں کو ہمارے پیچھے لگایا ہے، اس لئے یہ مناسب ہے، کہ تم دوران جنگ میں قلعہ میں رہو، اور اخبار کو بند کر دو، میرا ناک میں دم ہو گیا، ہر انگریز تمہاری شکایت کرتا ہے، سارے جہان کو شیطان کی طرح گمراہ کر رکھا، یہ مشہور کر دیا ہے کہ میں بھی تمہارا ہم خیال ہوں، میں نے اس کی تردید کی مگر نواب صاحب سب شتم فرماتے رہے، جس کی وجہ سے میں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا، مگر اسی سلسلہ میں سرکار نے فرمایا کہ تو نمک حرام ہے اس پر میں نے کہا کہ یہ درست نہیں، اس پر اور بگڑ کر سرکار نے فرمایا کہ تو نمک حرام اور تیرا باپ نمک حرام، میں نے عرض کیا کہ جو کچھ میرے باپ نے کیا وہ اُن کا فعل تھا، اور اُس کا عذاب ثواب اُس کی گردن پر میں ذمہ دار نہیں، لیکن اپنے متعلق پھر عرض کروں گا، کہ میں نے کبھی نمک حرامی نہیں کی ہے، اس پر سرکار اور برافروختہ ہوئے اور کہا کہ میرے سامنے جواب دیتا ہے، میں نے عرض کیا سرکار نے اس سے قبل بھی بہت کچھ برا بھلا کہا، مگر میں نے گردن نہیں اٹھائی، البتہ نمک حرامی کے الزام کا جواب دینا میرا فرض ہے، میں سرکار کے سامنے پھر عرض کروں گا کہ یہ الزام بالکل غلط ہے اور جس کسی نے سرکار سے یہ کہا ہے، وہ جھوٹ بکتا ہے، رہا قلعہ میں مقید ہونا یہ تو کوئی چیز نہیں ہے، اگر سرکار جیل بھی بھیج دیں تو ایک مرتبہ اپنی اطاعت شعاری ثابت کرنے کے لئے، اور سرکار کا کہنا نیچے نہ ڈالنے کے خیال سے میں خود بیڑیاں پہن کر جیل خانہ چلا جاؤں گا، میرے خاندان میں جو کچھ دولت و ثروت جاہ و عزت ہے وہ سرکار اور سرکار کے آباؤ اجداد کی دی ہوئی ہے، اور اُن کی خدمت میں حاصل ہوئی ہے، اگر سرکار یہ سب کچھ لے لیں گے تب بھی اپنی ہی دی ہوئی چیز لے لیں گے ہم یہ چیزیں کہیں اور سے نہیں لاتے تھے، اور میری تو تعلیم بھی سرکار ہی کے قرض دیئے ہوئے روپیہ سے ہوئی تھی، اس کی بدولت جو کچھ تھوڑی بہت قابلیت یا عزت حاصل ہے، وہ سرکار ہی کا طفیل ہے، اس گفتگو کے بعد بھی سرکار مجھے قلعہ بھیجنے پر مصر رہے، اور فرمایا کہ ہندوستانی مہمان خانہ کے نیچے کے درجہ میں اُن کو ایک کمرہ دے دیا جائے، وہاں آج کل مقابلتاً گرمی کم ہوگی، بجلی کا پنکھا موجود ہے، کھانے کے لئے ہندوستانی اور انگریزی باورچی خانہ کو حکم دے دیا جائے، کہ یہ جو کچھ طلب

ہیں، اُن کو دیا جائے، اور ہندوستانی اور انگریزی دواخانوں کو بھی حکم دیا جائے کہ حکیم یا ڈاکٹر جو اُن کے لئے دوا تجویز کریں اس کے بعد چیف سیکرٹری سے فرمایا کہ اس کی اطلاع علی امام صاحب کو ضرور کر دینا، اُس پر انہوں نے کہا کہ پہلے ... سرکار یہ مناسب نہیں ہے، تو فرمایا کہ نہیں ان کو ضرور لکھ دینا، وہ ہی مجھے لکھ سکتے ہیں، اور کوئی نہ لکھے گا، پھر اخبار کے متعلق ... فرمایا کہ ہاں ہمدرد میں ضرور چھاپ دینا کہ میں نے یہ حکم دیا ہے، اس کے اخبار بند کرنا، میں نے اس کے جواب میں عرض کیا کہ یہ تو قلعہ میں رہنا ہے، اگر سرکار مجھے جیل میں رہنے کا حکم دیں بلکہ سزائے موت بھی دیں، تو میری زبان پر حرف شکایت نہ آئیگا سرکار نے اور سرکار کے آباؤ اجداد نے ہماری پرورش قاعدہ اور قانون کی پابندی میں نہیں کی اس لئے آج اگر سرکار سزا دیتے ہیں، تو ہم ... قاعدہ و قانون کی تلاش نہیں کریں گے، اگر گورنمنٹ ہمیں مقید کرتی تو جہاں تک قاعدہ اور قانون اجازت دیتا ہے اپنے حقوق کے ... لڑتا، اس لئے کہ گورنمنٹ دیتی بھی ہے، تو قاعدہ و قانون کے اندر مانگ بھی سکتی ہے تو قاعدہ اور قانون کے اندر، افسوس ہے ... سرکار ایسا خیال فرمائیں، کہ ہم سرکار کے احکام کی شکایت اخباروں میں کرنے جائیں گے، اگر سرکار کے حکم سے میری جان بھی جاتی ہے، تو اس کے متعلق تو میں کچھ نہیں سکتا، مگر اپنے اعزا کے متعلق کہہ سکتا ہوں کہ وہ تو اس کا خیال نہ کریں گے کہ ہمارے خاندان میں محمد علی نامی کا بھی کوئی شخص کبھی پیدا ہوا تھا، البتہ اخبار کے متعلق مجھے کچھ عرض کرنا ہے، اور مجھے امید ہے، کہ اس کو توجہ سے سُنا جائے گا، اس لئے کہ اس سے قبل بھی سرکار کو جو شکایت واقعہ کانپور کے متعلق مجھ سے ہے، اس کے متعلق میری طرف سے میری مجبوریوں کا اظہار ہو جائے گا، میں عرض کر چکا ہوں کہ جو کچھ میرا ہے، خواہ وہ دولت ہو یا عزت سرکار پر سے نثار ہے، مگر میں اپنے حقوق کو سرکار پر سے تصدق کر سکتا ہوں، حق العباد کی قربانی خدا کے لئے بھی نہیں کی جا سکتی، اور خدا وند کریم بھی حق اللہ معاف کر سکتا ہے، حق العباد کا معاف کرنا بندوں کی مرضی کے بغیر وہ بھی گوارا نہیں فرماتا، سرکار میرے تمام حقوق صلب کر لینے ... کو جو خدمت میں کامریڈ و ہمدرد کے ذریعہ سے قوم و ملک کی کرتا رہا ہوں، وہ کسی حالت میں ترک نہیں کی جا سکتی، اس عرصہ میں حکیم اجمل خاں صاحب بھی وہیں تشریف لے آئے اور انہوں نے بھی، ہمدرد کے متعلق فرمایا کہ اُس کی روش قابل اعتراض نہیں معلوم ہوتی بلکہ نہایت معتدل ہے، اس پر سرکار نے فرمایا کہ خیر اخبار جاری رہے مگر تم قلعہ میں رہو، اس کے بعد متفرق امور پر گفتگو ہوتی رہی، اور جب سرکار، حکیم صاحب سے کچھ گفتگو فرمانے لگے تو ہم سب اُٹھ کر باہر چلے آئے اور میں صاحب چیف سکرٹری کے ہمراہ اُن کے دفتر کے ڈیرہ میں چلا گیا۔

میں نے مناسب سمجھا کہ کم از کم اپنے برئیت کے لئے ایک امر کے متعلق اُن کے توسط سے سرکار کی خدمت میں عرض حال کی جائے، اور وہ یہ تھا کہ اگر سرکار کے احکام معلوم ہونے کے بعد پبلک میں کچھ شورش ہو تو میں ذمہ دار نہ ہونگا، چنانچہ میں نے چیف سیکرٹری صاحب سے کہا کہ میں اس وقت آپ سے بحیثیت ایک دوست کے گفتگو نہیں کر رہا ہوں، بلکہ محض بحیثیت ایک عہدہ دار ریاست کے، ریاست میں اس وقت کوئی وزیر یا مدار المہام نہیں ہے، بلکہ چند سیکریٹریز ہیں، اور آپ کا لقب چیف سیکرٹری ہے، اس لئے آپ کا فرض ہے، کہ آپ میرے متعلق احکامات کے بارے میں سرکار کو اُن کے تمام نتائج سے مطلع کریں سرکار کی عمر کا زیادہ حصہ رام پور میں گزرا ہے، اور بالعموم اُن کے تعلقات لوگوں سے والئی ملک اور رعایا کے رہے ہیں، شخصی حکومت الگ چیز ہے، اور جمہوریت دوسری چیز ہے مجھے خوف ہے کہ نواب صاحب کافی طور پر نہیں جانتے کہ اُن کے ان احکام

...ان کے خلاف بھی بھڑکا ... دوست ہیں، ان کے خلاف ... کہ دیکھو یہ میرے دوست ہیں، ان کے خلاف ...
سرجیمسٹن لفٹنٹ گورنر ہوئے، تو میں نے محمد علی سے کہہ دیا، کہ دیکھو یہ میرے دوست ہیں، ان کے خلاف کچھ نہ
سرجیمسٹن کی کئی بار تعریف بھی چھپی، لیکن کانپور کا واقعہ ہوا اور محمد علی نے کامریڈ میں سرجیمسٹن کے خلاف لکھنا شروع کردیا، اُس
سرجیمسٹن نے اسے اپنے پاس نہیں آنے دیا، اور آج بھی جب میں نے اسے اپنے پاس بلایا تو اور لوگ اُٹھ کر جانے لگے، مگر میں نے
دن سے میں نے روک لیا اور کہا کہ میں اس سے دس بارہ آدمیوں کی موجودگی میں ملنا چاہتا ہوں، سرجیمسٹن آخر جون ۱۹۱۳ء میں بجلی کے کارخانہ کی
بنیاد رکھنے رامپور تشریف لائے تھے، اس وقت، کانپور کے تمام فائل اُن کے پاس موجود تھے، انہوں نے مجھ سے پوچھا، کہ آپ
کی کیا رائے ہے، میں نے کہا کہ اس عمارت کو منہدم نہ کرائیے، چنانچہ انہوں نے مان لیا مگر چند ہی روز بعد ٹائیلر، وکلکٹر کانپور نے
عمارت کو ڈھوا دیا، اس میں سرجیمسٹن کا کیا قصور ہے، اس پر میں نے عرض کیا، کہ مجھے حضور کی خدمت میں واقعہ کانپور کے متعلق
کچھ عرض کرنے کا یہ پہلا موقع ہے، اگر حضور کامریڈ کے مضامین منگوا کر دیکھیں گے تو واضح ہو جائے گا کہ میں نے سرجیمسٹن پر انہدام
مسجد کانپور کا الزام کہیں نہیں لگایا، میں نے صرف یہ لکھا تھا، کہ اُن کے ایک ماتحت نے اُن کے خلاف منشا، اور شاید خلاف حکم
ایک غلط کاروائی کردی، اگر یہ واقعی ایک مضبوط حاکم ہوتے تو اس تمرد و سرکشی کی سزا اُس کو دیتے مگر وہ سخت کمزور نکلے، اور ایک سولین کے
تمرد کو بھی انہوں نے گوارا کیا اور اُس کی سزا دہی کو گوارا نہ کیا، اس پر نواب صاحب نے فرمایا کہ نہیں یہ تو اُن کی کریم النفسی ہے کہ انہوں نے
دوسروں کی غلطی کو اوڑھ لیا کوئی دوسرا شخص لفٹنٹ گورنر ہوتا تو سارا الزام ٹائیلر پر دھر دیتا، اس کے بعد سرکار نے خود اپنی ریاست
کا ایک واقعہ دہرایا جس میں انہوں نے اپنی غلطی کے عام اعتراف سے باز رکھا، تاکہ داب حکام قائم رہے، سرکار نے یہ بھی فرمایا کہ
ٹائیلر سے زیادہ قصور دار انسپکٹر منیر الدین کا تھا، اور مسٹر ڈگلس اسٹریٹ اُس کو سزا بھی دینا چاہتے تھے، مگر سرجیمسٹن نے اسی بنا پر روک
دیا، مسٹر ڈگلس اسٹریٹ نے اعتراف کیا کہ واقعی منیر الدین کا قصور تھا، پھر سرکار نے فرمایا کہ اُس نے دوسری غلطی یہ کی کہ محمود آباد سے
روپیہ لے کر یہ اور وزیر حسن چلے گئے، میں اس تمام تقریر کے دوران میں صرف ایک بار لب کشا ہوا تھا، اور چند امور میں سرکار کو
غلط فہمی ہوئی تھی، یا حافظہ نے سرکار کے صحیح طور پر یاد آوری نہیں کی تھی تاہم میں نے تردید کرنا سوء ادب خیال کیا تھا، البتہ جب
سرکار نے یہ فرمایا کہ ہم راجہ صاحب محمود آباد کے روپیہ سے ولایت گئے تھے، تو میں نے اس غلط فہمی کو دور کرنا مناسب سمجھا
اس کے بعد سرکار نے کہ لارڈ کریوان سے ضرور ملتے، مگر چونکہ دہلی میں ہماری میٹنگ ہو چکی تھی اس لئے وزیر ہند نے ملنے سے انکار
کیا اور کہہ دیا کہ تم تمام مسلمانوں کے نائب نہیں ہو، ایک پارٹی اور بھی ہے غرض کہ ایک طرف میں نے کھینچا اور ایک طرف اس نے
کھینچا، اُس کے متعلق میں نے اتنا عرض کیا کہ میں صرف کانپور کے متعلق ولایت نہیں گیا تھا، بلکہ میرے مقدمہ کا فیصلہ کلکتہ ہائی
کورٹ سے ہو گیا تھا، اُس کے متعلق مجھے پریس ایکٹ کی منسوخی کی بھی کوشش کرنا تھی، دوسرے ایڈریا نوپل کا مسئلہ پیش تھا
اور میرا اور غالباً تمام مسلمانوں کا یہ خیال تھا، کہ مسٹر اسکوتھ اس معاملہ میں ترکوں کے ساتھ ناانصافی کر رہے ہیں، اور جنگ بلقان کے
دوران میں ان کی متضاد تقریریں اس کا ثبوت دے چکی ہیں، اس لئے میں نے ولایت کو بھی متعدد تار بھیجے تھے، اور حضور والا نے
کو بھی ایک طویل تار دیا تھا، اس پر سرکار نے فرمایا کہ تم سے زیادہ سخت تار میں نے دیئے تھے، اور اس کے بعد روس اور مشہد
مقدس پر گولہ باری کے متعلق سرکار اپنے خیالات کا اظہار فرماتے رہے، پھر موجودہ جنگ کا ذکر چھڑ گیا، مسٹر ڈگلس اسٹریٹ
کو سرکار کی اور میری رائے سے کہیں کہیں اختلاف تھا ہندوستانی اخباروں کے خلاف مسٹر ڈگلس اسٹریٹ بہت کچھ کہتے رہے

پبلک پر کیا اثر ہوگا، اگر اُن کا یہ فرمانا تسلیم کر لیا جائے کہ میں نے پبلک کو گمراہ کر رکھا ہے، تب بھی چونکہ پبلک میرے بتائے ہوئے راستہ پر چل رہی ہے، اس لئے جب تک غلط رہبر نہ سمجھے پبلک میری تکلیف سے ضرور پریشان ہوگی، اور میرے مقید ہونے پر غالباً ایک شورش ہو اور گو پبلک ایک منٹ کے لئے بھی یہ تسلیم کرے کہ تمام کارروائی صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ کے ایماء و اشارہ سے یا کم از کم اُن کے خوش کرنے کے لئے کی گئی ہے، تاہم پبلک میں سرکار کے خلاف بھی بددلی ضرور پھیلے گی، میرا خیال ہے کہ تمام نشیب و فراز سے سرکار کو مطلع کرنا آپ جیسے حکام کا فرض ہے، لیکن شاید آپ اسے گستاخی سمجھیں کہ میں آپ کو آپ کے فرائض کے متعلق کچھ بطور پند و نصیحت کے کہوں، اس لئے یہی سمجھ لیجئے کہ ایک اہل غرض آپ سے محض اپنے بچاؤ کی خاطر کچھ عرض کر رہا ہے، اگر آپ سرکار کو ان امور کے نشیب و فراز سے مطلع نہیں کر سکتے تو کم سے کم میری جانب سے یہ عرض سرکار کی خدمت میں پہونچا دیجئے کہ میں نے خود تو سرکار کے احکام کو سمعنا و اطعنا کہکر آنکھوں پر رکھ لیا، لیکن اگر میرے سلب آزادی اور پبلک سے قطع تعلق کے بعد پبلک سرکار یا سر جیمس مسٹن کے خلاف شورش کرے تو میں اس کا ذمہ دار نہ ہونگا چنانچہ چیف سیکرٹری صاحب سرکار کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور میری طرف سے میری معروضات کو سرکار میں دہرایا، اُس کے بعد چیف سیکرٹری صاحب باہر تشریف لائے، اور مجھ سے فرمایا کہ سرکار نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس وقت میں سوتا ہوں شب کو آٹھ بجے بیدار ہونگا، اس وقت محمد علی کو پھر بلاؤں گا، اور احکام جاری کرونگا، چیف سیکرٹری صاحب کو خوف تھا کہ چونکہ مسٹر ڈگلس اسٹریٹ انسپکٹر جنرل پولیس ممالک متحدہ قلعہ میں بطور مہمان کے مقیم ہیں اُن کی موجودگی میں میرے قلعہ کے رہنے میں مبادا کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے، اس لئے سرکار نے حکم دیا کہ شام تک مجھے کوٹھی خاص باغ میں دفتر کے قریب ایک کمرہ میں رکھا جائے،

۸۔ میں اس کمرہ میں عصر کے وقت تک رہا اور اسی عرصہ میں مجھے حرارت بھی ہوگئی، عصر کے وقت میں چیف سیکرٹری صاحب کے ہمراہ اُن کے دفتر کے ڈیرہ میں رہا اور شب کو انہیں کے ساتھ کھانے کے ڈیرہ میں کھانا کھایا، سرکار کے بیدار ہونے پر میں پھر کوٹھی خاص باغ کے کمرہ میں چلا گیا، اور حرارت کی وجہ سے وہیں پلنگ پر لیٹا رہا اس عرصہ میں معلوم ہوا کہ مسٹر ڈگلس اسٹریٹ سرکار کی ملاقات کو آئے ہیں، سرکار اُن سے ڈرائنگ روم میں ملے اور چند منٹ کے بعد چیف سیکرٹری صاحب نے مجھے اطلاع دی کہ سرکار مجھے ڈرائنگ روم میں یاد فرماتے ہیں، چنانچہ میں ڈرائنگ روم میں حاضر ہوا اور سرکار کو آداب بجا لایا اس پر مسٹر ڈگلس اسٹریٹ نے بھی اُٹھ کر مجھ سے رسم مزاج پرسی کی اور مصافحہ کیا، سرکار نے کرسی کی طرف اشارہ کر کے بیٹھنے کا حکم دیا اس گفتگو کے صرف وہی حصہ درج کئے جاتے ہیں، جو میری نظر بندی سے متعلق معلوم ہوتے ہیں، انسپکٹر جنرل نے دوران گفتگو میں مجھ سے کہا کہ آپ ہم سب کو دشمن سمجھتے ہیں، جس سے ممکن ہے، کہ اُن کا مفہوم خاص اپنا دشمن یا تمام مسلمانوں کا دشمن ہو، میں نے جواب دیا، کہ کیا آپ کا یہ خیال نہیں ہے کہ غلط فہمی کی دونوں جانب گنجائش ہے، نواب صاحب نے دوران گفتگو میں فرمایا کہ کچھ عرصہ سر جان ہیوٹ سابق لفٹننٹ گورنر ممالک متحدہ نے مجھے کہا تھا کہ دونوں بھائیوں کو رامپور سے نکال دو، میں نے پوچھا کہ کیوں کیا وجہ ہے میں تو اُن کو ہرگز نہ نکالوں گا، اس پر سر جان ہیوٹ نے کہا کہ اچھا آپ ان کو سمجھا سکتے ہیں، میں نے کہا ہاں یہ ہو سکتا ہے، چنانچہ میں نے تو ان دونوں بھائیوں کو سمجھا دیا اور سر جان ہیوٹ کو آئندہ شکایت کا موقع نہیں ملا، مگر جب

معالجہ کے لئے حسب الطلب سرکار تشریف لائے ہیں، میں نے انہیں بُلوایا مگر ۴ بجے تک وہ تشریف نہ لا سکے تو ریاست کے ایک
ڈاکٹر کو بُلوا بھیجا، اتنے میں ڈاکٹر انصاری صاحب اور اُن کے ہمراہ چیف سکرٹری صاحب میرے کمرہ میں تشریف لائے، ڈاکٹر صاحب
سے معلوم ہوا کہ سرکار سے انہوں نے میرے متعلق گفتگو کی تھی، اور سرکار کو نظربندی کے آئندہ خراب نتائج سے بھی مطلع کیا تھا، ڈاکٹر
انصاری صاحب مجھے دیکھ رہے تھے کہ سرکار نے انہیں یاد فرمایا اور وہ تشریف لے گئے، اس عرصہ میں چیف سکرٹری صاحب نے
مجھے فرمایا کہ تم بھی سرکار کی خدمت میں حاضر ہو تو مناسب ہے،
سرکار کا حکم ہے کہ تم اپنے مکان جا سکتے ہو، مگر تا اختتام جنگ رامپور سے باہر نہ جاؤ نہ کسی سے خط و کتابت کرو نہ یہاں کسی
خاص و عام جلسہ میں پالیٹکس پر گفتگو کرو، میں نے کہا کہ مجھے رات سے سخت حرارت ہے اس وقت کچھ پسینہ آرہا ہے، اگر میں اس
وقت باہر نکلا تو ہوا لگ جانے اور مرض بڑھ جانے کا اندیشہ ہے، اس پر انہوں نے فرمایا کہ خیر تم لکھ دو کہ تم ان شرائط کی پابندی
کرو گے، واضح ہو کہ نہ قلعہ میں اپنی خوشی آیا نہ یہ شرائط مجھے پسند ہیں، دونوں کو حکم سرکار سمجھا، اور جس طرح پہلے حکم پر عامل ہونا اپنا اخلاقی
فرض سمجھا، اسی طرح اس نئے حکم پر بھی سمعنا و اطعنا کہا، چنانچہ تینوں امور جن کا چیف سکرٹری صاحب نے ذکر کیا تھا، ایک عرضی کے چھپے
ہوئے فارم پر ایک سرکاری محرر نے لکھ دیئے اور میں نے دستخط کر دیئے، البتہ دو امور کے متعلق میں نے عذر پیش کیا، ایک یہ کہ
تا اختتام جنگ میں شہر رامپور سے باہر نہ جاؤں، میں نے کہا کہ مجھے اختتام جنگ سے کیا واسطہ، چاہے جنگ کل ختم ہو، چاہے ہزار
برس رہے، مجھے صرف سرکار کے حکم سے واسطہ، اس لئے بلا اجازت سرکار باہر نہ جاؤں گا، دوسرے یہ کہ خط و کتابت
ویسے بھی کم کرتا تھا، اور اب تو اور بھی کم خط و کتابت کرنے کی ضرورت پیش آئے گی، لیکن ضرورت ہو گی تو لکھنا پڑیگا، البتہ مجھے کچھ
عذر نہ ہو گا اگر سرکار ڈاک میں پڑنے سے پیشتر میرے خطوط ملاحظہ فرما لیا کریں، چنانچہ چیف سکرٹری صاحب نے فرمایا کہ اسی طرح
لکھ دو اور میں نے ان دو امور کے متعلق عرضی میں اسی طرح لکھ دیا، عرضی کی عبارت حسب ذیل ہے:

غریب پرور سلامت، جان نثار کو رات سے بخار شدت سے چڑھا ہوا ہے، اور پسینہ آرہا ہے، اس وجہ سے اس وقت
حاضری سے معذور ہوں ورنہ خود حاضر ہو کر امور ذیل کے متعلق عرض کرتا۔

۱۔ میں اقرار صالح کرتا ہوں کہ بغیر اجازت سرکار کے شہر رامپور سے باہر نہ جاؤنگا۔
۲۔ میں اس کا بھی اقرار کرتا ہوں، کہ کسی سے ریاست کے باہر خط و کتابت نہ کرونگا، اگر کسی کو مجبوری سے کوئی تحریر بھیجنا ہوئی
اول وہ تحریر سرکار میں پیش ہو جائے گی، اور اگر سرکار اس کو ناپسند نہ فرمائیں گے تو ارسال کی جائے گی۔
۳۔ میں یہاں پولٹیکل امور کے متعلق خاص یا عام جلسہ میں گفتگو نہ کروں گا، واجب تھا عرض کیا آفتاب دولت و اقبال تا
دور خشاں باد، عریضہ جانثار محمد علی مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۱۵ء۔

دس بارہ منٹ کے بعد چیف سکرٹری صاحب واپس آئے اور فرمایا کہ سرکار نے اجازت دی ہے تم گھر جا سکتے ہو،
چنانچہ میری علالت کے باعث پالکی منگوائی گئی، اور میں اس میں سوار ہو کر مغرب کے وقت مکان واپس آیا، قلعہ میں میں کل آٹھ
رہا، میرے مکان آجانے کے کچھ عرصہ بعد مسٹر شوکت علی نے حسب ذیل تحریر نواب صاحب کی خدمت میں ارسال کی۔

اس پر میں نے اُن کے بعض الزامات کی تردید کی اور ہمدرد کے متعلق جو شروع سے میرا اصول رہا ہے، یعنی ایسے مضامین جو کامریڈ میں شائع ہوتے تھے، اُن کے ہمدرد میں شائع کرنے سے عمداً احتراز کیا جاتا تھا، مسجد کانپور میں خونباری کے متعلق جو خبر درج ہمدرد ہوئی تھی، اس کا مسٹر ڈگلس اسٹریٹ نے ذکر کیا، میں نے کہا کہ یہ واقع میرے دہلی سے چلے آنے کے بعد کا ہے مگر مجھے اس وقت اطلاع ملی کہ یہ واقع صحیح ہے، گو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ خون کی بوندیں کتنی خلاف قدرت طور پر مسجد میں گریں، ہمارے کانپور کے نامہ نگار نہایت معتبر اشخاص ہیں، اس لئے اُن کی مرسلہ خبروں کی زیادہ چھان بین بھی غیر ضروری ہے اگر یہ خبر میرے سامنے آئے ہوتے تو ممکن ہے کہ میں اسے نہ چھاپتا، اس لئے کہ اس سے بجائے پبلک کی تعلیم کے وہم پرستی کو بھی تقویت ہوسکتی ہے، اس گفتگو کے بعد کوئی ساڑھے گیارہ بجے شب کے مسٹر ڈگلس اسٹریٹ رخصت ہوئے، اور سُنا ہے کہ موٹر کے چلتے وقت مجھ سے مخاطب ہوکر کہا، کہ امید ہے کہ اب آپ ممالک متحدہ کی پولیس کو کچھ زیادہ نہیں سمجھتے ؛

مسٹر ڈگلس اسٹریٹ کے رخصت ہونے کے بعد سرکار سے چیف سیکرٹری صاحب نے دریافت کیا کہ محمد علی کے متعلق کیا ارشاد ہے فرمایا کہ انہیں تو قلعہ میں رہنے دو، چنانچہ میں چیف سیکرٹری صاحب اور پرائیویٹ سیکرٹری صاحب کے ہمراہ موٹر میں اپنے مکان آیا اور بستر اور چند ضروری چیزیں نوکر کے ساتھ قلعہ بھیج دیں، اور خود موٹر میں اُن دونوں صاحبان کی معیت میں قلعہ پہونچا،

میرے بھائی کپتان حشمت علی خاں صاحب کپتان اور مجسٹریٹ قلعہ، قلعہ میں سو رہے تھے، اُن کو جگوایا گیا، اور میری نظر بندی کے متعلق اطلاع دی گئی، چونکہ سرکار نے فرمایا تھا، کہ میں ملنے سے منع نہیں کرتا چیف سیکرٹری ہیں، احمد علی خاں ہیں حشمت علی خاں ہیں، اُن سے ملو، بات چیت کرو، اس لئے چیف سکرٹری صاحب نے کپتان صاحب قلعہ سے کہا کہ فی الحال مناسب ہے کہ یہی حضرات ملیں، کل سرکار سے زیادہ مفصل احکام اس بارے میں حاصل کرلوں گا، چنانچہ صبح کو جب میر الھانجہ اور اُس کے بعد میرا ایک بھائی مجھ سے ملنے قلعہ میں آئے، تو کپتان حشمت علی خاں نے معذرت کی، اور فرمایا کہ سرکار کا حکم ابھی حاصل نہیں ہوا ہے، میں یہاں اس امر کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں، کہ پرائیویٹ سکرٹری صاحب، چیف سکرٹری صاحب نے میرے آرام و آسائش کے لئے جو کچھ ممکن تھا کردیا، اور جب تک میں قلعہ میں رہا، مجھے کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ ملا بلکہ میں ہر اس شخص کا شکر گزار ہوں جس کے متعلق میری خورد و نوش یا قیام وغیرہ کا انتظام تھا، میں نے ہندوستانی مہمان خانہ کے اوپر کی منزل میں ایک کمرہ پسند کیا، اور جب تک قلعہ میں رہا وہیں قیام کیا، میں پہلے بھی اس کا اظہار کرچکا ہوں کہ مجھے ۲۰ رکی شب کو بخار آگیا تھا اور ۲۱ رکی سہ پہر سے پھر حرارت ہوگئی تھی، شب کو بخار بڑھ گیا، اور باوجود کسل و ماندگی اور نیند پوری نہ ہونے کے میں ساری رات نہ سویا، صبح کو اس خیال سے کہ سرکار شاید قلعہ تشریف لائیں میں نے شب خوابی کے کپڑے اُتار کر دن کے پہننے کے کپڑے پہن لئے، سرکار قلعہ تشریف لائے، مگر مہمان خانہ کی طرف تشریف فرما نہ ہوئے، غالباً دس گیارہ بجے مسٹر ڈگلس اسٹریٹ انگریزی مہمان خانہ سے اسٹیشن چلے گئے، مجھے اس وقت حرارت کی شدت ہوگئی تھی، اس لئے شب خوابی کے کپڑے پہن کر لیٹ گیا، حکیم اجمل خاں صاحب کے نسخہ کے مطابق دفع حرارت کے لئے گھر سے دوا منگا کر پی، مگر حرارت کم نہیں ہوئی، برابر بڑھتی رہی اور میری بے چینی میں اضافہ ہوتا رہا، اس عرصہ میں سنا کہ ڈاکٹر انصاری صاحب بیگم صاحبہ کے

دوران غلطیوں کی سزا کے لئے ہم ہر وقت تیار ہیں، وہ سزائیں، ہمارے تزکیہ اور نجات کا باعث ہوں گی،

حضور والا کو منصوری اور شملہ کا واقعہ خوب یاد ہوگا، غیر ہمیں اگر سنگسار بھی کرے تو اس کی چوٹ نہیں لگتی، ہاں اپنے
کا پھول مارنا گولی سے زیادہ تکلیف پہونچاتا ہے،

حضور والا گورنمنٹ کے افسروں کو اس قدر اختیارات اور طاقت ہے کہ محمد علی غریب تو کیا اگر وہ چاہیں تو حضور نظام
دائی دکن کو بھی ایک چوکیدار کی معرفت پکڑوا بلوائیں، بعد کا نتیجہ چاہے کچھ ہو،

حضور والا، رامپور ہمارا وطن ہے، رامپور ہی میں ہم اور ہمارے باپ دادا پیدا ہوئے اور وہیں باپ دادا مرے
اور دفن ہوئے، رامپور ہی میں مرنے اور دفن ہونے کی ہم کو خود خواہش ہے، اور رہے گی، جب تک کہ ہم حضور کے مجرم ثابت نہ
ہوں، رامپور اور حضور ہمارے ہیں اور ہم اپنے وطن میں آئیں گے اور جائیں گے، جس دن حضور کا حکم ہوگا مت آؤ ہم بدرجہ
مجبوری تعمیل کریں گے، مگر دل وہیں پڑا رہیگا،

رہی میری اپنی ذات۔ تو سرکار میرا دل تو وہیں رامپور میں پڑا رہے گا، اگر زندوں سے ملاقات نصیب نہ ہو تو بی [illegible]
ایک سفید قبر سے ملاقات کرنے کے لئے دل تڑپے گا، میں ہر وقت حضور کے حکم کی تعمیل کے لئے حاضر ہوں، مجھے یہاں
کی اور چیزوں سے کام نہیں، ہر خدام کعبہ کا کام عقبہ عمر کرنا ہے، میں حلف بھی لے چکا ہوں وہ میں دہلی نہ سہی رامپور بیٹھکر کر
سکتا ہوں، مگر اس وقت محمد علی کے کارخانہ کو سنبھالنا ضروری ہے، کیونکہ ہم سب کا اسی پر گذر ہے، بفضلہ تعالیٰ آمدنی معقول
ہے، مگر مصارف اس قدر بڑھا رکھے تھے، الاماں۔ اس پر بدنامی اور لے تو بھی، اس وقت مجھ کو پندرہ ہزار روپیہ کا انتظام
کرنا ہے، تاکہ تمام قرضہ کے بل ادا کر سکوں، خدا مددگار ہے، حضور کی اور میری بے آقا اور نوکر کے درمیان کبھی کوئی پردہ نہ
تھا اور نہ ہوگا، اپنے دل کا سب حال عرض کر دیا، یعنی سوائے حضور کے کسی دوسرے شخص کو دنیوی معاملات میں مربی نہیں بنا
اور اب آخر وقت میں کیا بناؤں گا،

حضور خفا ہوں یا خوش، سزا دیں یا انعام، ہم حضور ہی کے ہیں، اس لئے بس یہی التجا ہے کہ اگر ہماری قسمت میں اسلام
کی خدمت کرنے کے صلہ میں پھانسی ہو تو وہ پھانسی غیر کے ہاتھ سے ہماری گردن میں ڈالی جائے کسی عزیز کا مبارک ہاتھ ہمارے
خون سے گنہگار نہ ہو،

میں جب رامپور آتا ہوں تو حسب معمول قدیم سلام کو حاضر ہو جاتا ہوں، حضور کو اطلاع مل جاتی ہوگی، انشاء اللہ
تعالیٰ ۳ر مئی ۱۵ء کو ایک دن کے لئے حاضر ہوں گا، میں خوش ہوں اور حضور کے لئے دعا کرتا ہوں، خدا اسلام کا دنیا میں
بول بالا کرے، پہلے دیوانہ تھا اب مجنوں ہو گیا ہوں اقبال پڑھتا ہوں اور مست رہتا ہوں،

اس کے بعد ۳ر اپریل ۱۵ء کو مسٹر شوکت علی رامپور تشریف لائے اور سرکار کی خدمت میں تقریباً روزانہ حاضر ہوتے رہے
میرے متعلق بھی چند بار گفتگو ہوئی اور میری علالت کا خیال فرما کر سرکار نے مسٹر شوکت علی کی استدعا کو منظور فرما لیا، کہ میں منصوری
چلا جاؤں، مسٹر شوکت علی نے یہ بھی استدعا کی تھی کہ چونکہ دس بارہ دن میں مجھے کئی بار بخار آچکا تھا، اس لئے مجھے دہلی جاکر ڈاکٹر
انصاری سے مل آنے کی اجازت دی جائے، انہوں نے عرض کیا کہ اس سے ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہوگا کہ بینکڑوں آدمی جو

شوکت کا خط

عرض حال

حضور پرنور دام اقبالہم، ڈاکٹر انصاری صاحب دہلی تشریف لائے اور مجھے حضور کا محبت آمیز حکم سنایا، حضور کو میں خوب جانتا ہوں اور حضور مجھ کو بخوبی جانتے ہیں، خدا کا شکر ہے کہ میرے ایمان اور حمیت میں اب پہلے سے اور اضافہ ہوگیا ہے کوئی کمی اور تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور جہاں تک میرا گمان ہے، حضور بھی نہیں بدل سکتے ہیں، ہاں

رموز مملکت خویش خسروان دانند

حضور کو ضرور علم ہوگا کہ ہم نے اپنے طرز عمل میں اب تک کوئی فرق نہیں ہونے دیا، ہم دل سے نمک حلال اور وفادار ہیں، جیسے کہ پیشتر تھے، رامپور ہمارا پیارا وطن ہے، اور وہ ہم سے کبھی چھوٹ نہیں سکتا، حضور ہمارے آقا ہیں، اور کوئی طاقت ہمارے اور حضور کے درمیان تفرقہ نہ ڈالے گی، ہم نے آج تک کوئی کام قانون یا اپنے آقا کے خلاف نہیں کیا، اس کو خدا، خود ہم کو اور تمام حکام و رعایا شہر اور باقی دنیا جانتی ہے، اسی وجہ سے ہم کو کبھی رامپور آنے جانے میں نہ ڈر ہوا ہے نہ ہوگا، جس وقت محمد علی کی صحت کا سوال آیا تو سب کے خلاف میری یہ رائے ہوئی کہ وہ آرام سے جاکر دو مہینہ رامپور میں بیٹھیں اور وہاں اطمینان سے علاج کریں، اور اگر بعد کو ضرورت ہو تو شملہ یا منصوری جائیں، اس میں ہر طرح کا فائدہ تھا، ایک تو تمام خاندان اور دوست احباب تیمارداری کریں گے اور دوسرے مصارف کم ہونگے، مجھ کو اس بات کا ضرور خیال تھا کہ ممکن ہے کہ حکام صوبہ متحدہ جو محمد علی کے درپئے آزار ہیں کوئی ایسی کارروائی کریں، جس سے محمدؐ علی کو حضور کے ذریعہ سے نقصان پہونچے اور ان کا مطلب نکلے، اُن کا کام ہو جائے اور دنیا بھر میں حضور کی بدنامی رہے، مَیں خوب جانتا ہوں کہ مطعون کرنے میں خود ان افسروں کا بڑا حصہ ہوگا، وہ کہتے کہ باوجود اس کے کہ ہم محمدؐ علی سے سخت ناراض ہیں، ہم کوئی کام خلاف قاعدہ نہیں کرتے، دیکھو وہ جن کی محمدؐ علی اور تم لوگ تعریف کرتے ہو، اس طرح کی زبردست اور خلاف قانون کارروائیاں کرتے ہیں، اگر ہم ہندوستان سے چلے گئے تو بجائے انصاف کے اس طرح کے بلکہ اس سے زاید مظالم کئے جائیں گے، مگر مجھ کو یقین کامل تھا، کہ حضور وہی کریں گے، جو حضور نے کیا،

اگر محمدؐ علی کے خلاف گورنمنٹ کوئی کارروائی کرنا چاہتی ہے، تو محمدؐ علی کا مکان اور کارخانہ دارالحکومت دہلی میں موجود ہے ذرا سی اطلاع پر وہ آج ہی رامپور سے واپس دہلی آجائے گا، اور حکام کے ساتھ ہی حاضر ہو کر اپنے مقدمہ کی پیروی کریگا۔

ہم نے اپنی خدمات، اپنی قابلیتیں، اپنی صحت، اپنی دولت، اور اپنے دوست اپنی اور اپنی ہر چیز اللہ اور اس کے رسولؐ کے کام کے لئے وقف کر دی ہے، اور ہم ایک منٹ کے لئے بھی اپنے بار سے سبکدوش ہونا نہیں چاہتے، خدا سے بھی دعا ہے کہ وہ ہماری ناچیز خدمات کو قبول کرے اور ہم کو صراط مستقیم پر قائم رکھے، ہم گورنمنٹ کے ہرگز ہرگز خلاف نہیں ہیں، مگر ہاں ہم اپنے دین کے سچے حامی ہونا چاہتے ہیں، اور اس کے خلاف کسی اور کو جائز نہیں سمجھتے ہیں، چاہے ہمارا کیسا ہی نقصان کیوں نہ ہو ہم روپیہ شہرت آرام کے بھوکے نہیں ہیں، یہ ممکن ہے کہ ہم بہت سی غلطیاں کرتے ہوں، مگر ہماری نیت بخیر ہے

مسلسل ۱۰۳ کی حرارت ہے، سہ پہر کو حرارت اور بڑھ کر ۱۰۵ تک جا پہونچی، اس وقت گھر کے آدمیوں نے گھبرا کر ذریعہ ٹیلیفون اس کی اطلاع مجھے کرنا چاہی جس کا علم اب مجھے واپسی پر ہوا ہے، ڈاکٹر عبد الحکیم غریب تو اب یہاں ہے نہیں، لہذا باقی ماندہ ڈاکٹروں پر کام کا بار زیادہ پڑ گیا ہے، مجھے اب تک کوئی ڈاکٹر نہیں ملا کہ لڑکے کو دکھا سکوں، بخار ظالم ہے اور حرارت تقریباً ۱۰۲ سے کم نہیں ہوتی، اس عرصہ میں جو بخار کے دو حملہ مجھ پر ہوئے، ایک منجھلی لڑکی پر اور سنجھلی لڑکی پر، اس نے مجھے سخت پریشان کر دیا ہے ایسی حالت میں سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے، بچی سفر کرنے کے قابل جیسے ہی ہو تو میں رامپور سے چلا جاؤں، براہ کرم سرکار سے میرے اس عریضہ پر حکم حاصل فرما لیجئے جو میں نے کل آپ کے خط کے ساتھ ملفوف کیا ہے، یہ ظاہر ہے کہ اس بار جیسے میں رامپور پہونچا ہوں، نصیب سے رہنا نہیں ہے، اور مجھ سے یہ توقع کرنا نامناسب ہے کہ اس زمانہ سے کہ ناگزیر ہے، میں یہاں زیادہ رہ کر اپنی اور اپنے بچوں کی صحت کو خراب کروں از راہ کرم میرے اس عریضہ کو ضروری سمجھیں ؎

اس کے بعد میں نے ڈاکٹر انصاری کو دہلی سے بلایا، مسٹر شوکت علی علیگڑھ تھے، اُن کو اس تازہ واقعہ کی اطلاع دی گئی، چنانچہ دوپٹی کو دونوں صاحب تشریف لے آئے، ہم لوگ سہ پہر کو سرکار میں حاضر ہوئے، تو معلوم ہوا کہ سرکار نے گورنمنٹ کو میرے متعلق کچھ تحریر فرمایا ہے، اور جواب کے منتظر ہیں، اگر گورنمنٹ کو عذر نہ ہوا تو سرکار کو میرے چلے جانے میں کوئی عذر نہ ہوگا جہاں تک مجھے علم ہے اب تک کوئی جواب موصول نہیں ہوا ہے، یہ وہ واقعات ہیں، جو اب تک پیش آئے ہیں، اور میں نے ان کا قلمبند کرنا ضروری سمجھا ہے، تاکہ آئندہ میں موجود ہوں یا نہ ہوں اصل واقعات ہر شخص کو بآسانی دستیاب ہو سکیں،

ہمدرد میں جو کچھ میرے متعلق میری غیر حاضری میں چھپا ہے، وہ اور مضامین کی طرح نہ میرے ایما سے چھپا ہے نہ میرے علم سے، اس لئے میں اُس کا ذمہ دار نہیں، جو، جو کچھ شائع ہوا ہے، یقیناً میرے کسی خیر طلب کی مصلحت اندیشی پر مبنی ہوگا، اور غالباً اُس کی غایت اور غرض سوائے اس کے کچھ نہ ہوگی کہ ایک مسلمان والیٔ ملک جہاں تک ممکن ہو بدنامی سے بچایا جائے، اور آج کل کی پریشانیوں میں، ایک ذاتی شورش کا اضافہ نہ ہو،

نظر بندی کے متعلق اُن سے ہزاروں استفسارات کرتے رہتے ہیں وہ خاموش ہو جائیں گے، اور سرکار کی بدنامی نہ ہوگی، خیال سے جو طریقہ اب تک خود انہوں نے اور ہمارے دوستوں نے اختیار کر رکھا تھا اُس میں کبھی میرا دہلی جانا اور لوگوں سے آزادانہ ملنا ممد و معاون ہوگا، مگر اس کی روانگی کے وقت سرکار نے اس درخواست کا کوئی جواب عطا نہیں فرمایا تھا، ۴ر مئی ۱۹۱۵ء کو میں خود ایک عریضہ سرکار کی خدمت میں بھیجا جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے،

ترجمہ چٹھی

حضور والا! مجھے سخت افسوس ہے، کہ میں خاص باغ میں ایک بار سے زاید جب کہ حضوری حاصل کرنے سے محروم رہا تھا، بغرض قدم بوسی حاضر ہوں گا، وجہ یہ ہوئی کہ میں بخار کے پہلے حملہ سے پوری نجات پا بھی نہ سکا تھا، کہ دوسرا حملہ ہوا نتیجہ یہ ہے کہ اب تک چلنے پھرنے میں معذور رہوں، میں شکر گذار ہوں کہ حضور والا نے میری صحت کا خیال فرما کر مجھے منصوری جانے کی اجازت مرحمت فرمائی، پہلے ارادہ یہ تھا کہ ۱۰ یا ۱۲ ماہ حال تک پہاڑ پر چلا جاؤں، لیکن پندرہ دن کے اندر جو دو حملہ بخار کے ہو چکے اُن سے یہ اندیشہ ہوتا ہے، کہ شاید ایک سخت فصلی بخار کے جراثیم میرے جسم میں پیدا ہو چلے ہیں لہذا میری خواہش یہ ہے کہ چند یوم کے لئے دہلی چلا جاؤں وہاں ڈاکٹر انصاری صاحب سے معائنہ بھی کرالوں اور ضرورت ہو تو ان کا علاج بھی شروع کر دوں امید ہے کہ حضور والا کو اس میں اعتراض نہ ہوگا، میں ہوں حضور کا جان نثار و تابعدار خادم محمد علی،

یہ عریضہ چیف سکرٹری صاحب کے نام کے خط میں ملفوف کر کے چیف سکرٹری کے پاس ۴ر مئی کی شام کو بھیج دیا گیا تھا، مگر معلوم ہوا کہ ان کو ۵ر کی صبح تک موصول نہیں ہوا، اس اثنا میں ۴ر مئی اور ۵ر مئی کے درمیان رات کے گیارہ بجے چیف سکرٹری صاحب میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ بھائی ایک عجیب آفت ہے آج ریذیڈنٹ صاحب (کمشنر بریلی) کے پاس سے ایک اطلاع تحریری اس مضمون کی موصول ہوئی ہے کہ گورنمنٹ ہند نے پوچھا تھا کہ محمد علی کے متعلق کیا واقعہ ہے، جس کے جواب میں لوکل گورنمنٹ (سر جیمس مسٹن) نے لکھ دیا ہے کہ دربار رامپور نے انہیں منقید کر دیا ہے، واضح ہو کہ اب تک اس معاملہ میں گورنمنٹ کو ریاست کی طرف سے کوئی تحریر نہیں بھیجی گئی تھی، اس لئے بظاہر سٹر ڈگلس اسٹریٹ، چیف لوکل گورنمنٹ کا ذریعہ ہو سکتے ہیں، اب چونکہ سر جیمس مسٹن نے ریاست سے دریافت کئے بغیر گورنمنٹ ہند کو یہ لکھ دیا کہ مجھے منصوری نہ جانے دیا جائے اور چونکہ وہ واپس چلے گئے تھے اس لئے حکم ہوا کہ مجھ سے کہہ دیا جائے کہ منصوری نہ جاؤ، مجھے اس زمانہ میں خود بھی حرارت تھی، اور ایک لڑکے کی حرارت رفع ہونے پر دوسرے لڑکے کو شدت سے بخار آ گیا تھا، ۵ر مئی کو میرے لڑکے کا بخار ۱۰۵ ڈگری تک پہونچ گیا تھا، اور پھر بھی ڈاکٹر نہ نصیب ہو سکا میں نے چیف سکرٹری کو ایک ذیل کی تحریر لکھی،

تحریر بنام چیف سکرٹری، اشد ضروری

مکرمی من،

مَیں نے آج آپ سے ذکر کیا تھا کہ اپنے منجھلے لڑکے کو بخار میں چھوڑ کر خاص باغ میں آیا ہوں، اس کو کئی گھنٹہ ہو چکے تھے

مجھ کو یقین کامل ہے کہ میری سچائی اور صاف گوئی کی گورنمنٹ داد دے گی، معاملات دین میں مصلحت آمیزی سے کام لینا سخت
خرابیوں کا باعث ہوتا ہے، اور ہم نے دیکھ لیا کہ ...... کیسی بے قدری کی گئی، ہماری قابل قدر خدمات بجائے شکریہ کے
مستحق ہونے کے ...... پہونچانے کا باعث ہوئیں، جو خدمات دین ہم پر فرض ہیں، وہ تو ہم کسی طرح نہیں ترک کرینگے
جو تکالیف اور مصائب اُن کی وجہ سے آئیں، ہم اُن کے لئے بخوشی طیار رہیں گے، غالباً وہ میرا خط حضور کو اب مل گیا ہو،
انشاء اللہ انوار کی ..... میل سے، لکھنؤ ہی میں قدم بوسی حاصل کروں گا، والدہ صاحبہ سلام عرض کرتی ہیں، حضور دعا فرمائے
جاویں، اب تک بفضلہ تعالیٰ قلب میں بہت طاقت ہے، تہجد کی تھوڑی سی نماز سے قوت میں اضافہ ہے اور دل بہت مطمئن
خدا ہر مسلمان کو قوت ایمان دے، عجیب چیز ہے، بس یہی دعا ہے کہ خدا توفیق دے کہ کوئی خدمت اسلام اس ناچیز اور
کمزور ہستی سے سرانجام کو پہونچ جائے، مولانا سلامت اللہ صاحب کی خدمت میں سلام مسنون، یہ بھی خدا کا بڑا شکر ہے کہ لکھنؤ
ہو کر جانا ہوا، تاکہ حضور کی قدم بوسی ہو سکے گی، میرے گھر میں کا گذشتہ سال ۱۳ محرم کو انتقال ہوا تھا، غالباً اُس دن میں ریل
میں ہونگا، اور معمولی فرائض کے علاوہ اس قدر فرصت نہ ہوگی کہ کچھ زادراہ کا سامان کرتا، حضور توجہ فرماکر مرحومہ کے لئے
دعاء مغفرت فرمائیے گا، یہ ایسے دن ہیں کہ انسان اطمینان سے یاد رفتگاں بھی نہیں کرسکتا،

حضور کا خادم۔ شوکت علی، متمد خادم الخدام کعبہ

ے کاغذ غائب،

وائسرائے کو انتباہ

(۳)

حامد باغ رامپور ۲۱ نومبر ۱۴ء،

قبلہ و کعبہ۔ السلام علیکم،

حضور کا والا نامہ ملا جو خط حضور نے وائسرائے بہادر کے لئے لکھا ہے وہ نہایت مناسب ہے اول تو بہتر یہی ہو
کہ حضور یہ تمام باتیں زبانی فرمائیں اور اسلئے حضور ناظر الدین حسن صاحب سے لکھوا کر محض ملاقات کے لئے وہ خط بھجوا دیں اگر
وائسرائے بہادر ملاقات کا وقت نہ دے سکیں تو یہ تحریر اُن کی خدمت میں بھیجی جاوے، یہاں مولانا خواجہ احمد صاحب موجود
نہیں ہیں، میں دو مرتبہ گیا علاقہ کو گئے ہوئے ہیں، دہلی اب تک میں گیا نہیں ہوں، ایک تو میں خود کام میں ہوں دوسرے محمد علی
بھی وہاں مصروف ہونگے، ترجمہ میں خود کرلوں گا، ایک اور طریقہ تھا کہ یہ خط بجنسہ سر علی امام کی معرفت وائسرائے بہادر کی خدمت میں
پیش کیا جائے وہ اس کا ترجمہ کرکے اُن کو سُنا دیں گے آخر مسلمان اور ہندوستانی ممبر کا یہی مقصد تھا، مجھ کو امید ہے کہ حضور کے
پاس اس خط کی اصل موجود ہوگی، میں مسودہ محمد علی کے پاس ابھی بھیجتا ہوں، یہاں ایک آدھ صاحب کو دکھایا سب نے پسند کیا
اس کا بعد کو شائع ہونا از بس مفید ہوگا۔ افسوس کہ انگریز حاکم اس قدر بدحواس ہو رہے ہیں کہ جو اُن سے کہہ دیا جائے اس کو یقین کر
کے بے تکی اور بے موقع کاروائی شروع کردیتے ہیں، مشورہ نیک نہ لیتے ہیں نہ اس پر توجہ کرتے ہیں۔ وائسرائے بہادر سے ملنا از حد
ضروری ہے، میں نے سر جیمس مسٹن کو اول ملاقات کے لئے لکھا تھا بریلی میں مگر اُن کا وہاں قیام نہ ہوا اس لئے انہوں نے ملاقات

وائسرائے کا اعلان

(۱)

۹ نومبر ۱۴ء   قبلہ وکعبہ۔ السلام علیکم

حضور والا نے وائسرائے کا دوسرا اعلان ملاحظہ فرمایا ہوگا جس میں جرمن قوم کی جھوٹی..... کی تردید کی گئی ہے کہ برطانیہ نے جدہ پر گولہ باری کی، اس قسم کی افواہیں ہر وقت اُڑیں گی، اور مخلوق میں سخت بے چینی کا باعث ہوں گی، اس کا علاج یہی ہے کہ حجاج وہاں ٹھہرنا شروع ہوں اور سچے طور..... انکار کر دینگے۔ ...٭ مسلمان ہرگز اس کو پسند نہیں کرینگے کہ حجاج کی ...٭ یا کسی وجہ سے بھی ایک منٹ کے لئے جدہ یا عرب مقدس سے خادم الحرمین الشریفین کے علاوہ کسی دوسرے کا تعلق ہو۔ بدرجہا بہتر ہے کہ حجاج وہاں ٹھہر کر مریں اس لئے اب سب کی رائے ہے کہ وقت آگیا ہے کہ حضور انجمن خدام کعبہ کی طرف سے وائسرائے بہادر سے ملیں اور حجاج کی واپسی کی نسبت اُن سے دریافت کریں کہ آپ نے کیا سوچا ہے انگریزی جہاز وہاں نہیں جا سکتے اور وہاں کے جہاز یہاں نہیں آئینگے۔..... امریکہ، اٹلی، سویڈن وغیرہ کے جہاز ...٭... اُن کی واپسی کا انتظار کرے گی حضور ...٭... اجازت دیں کہ ہم اس کا انتظام .... ہے کہ اس معاملہ میں سلسلہ جنبانی کریں اگر ممکن ہو تو حضور ایک دن کے لئے رام پور تشریف لے آئیں، نیز علی امام صاحب کو بھی لکھیں۔ میں تار بھیجتا ہوں۔ کارخانے کا کام اچھا ہو گیا۔

حضور کا خادم۔ شوکت علی

٭ عبارت ضائع ہو گئی ہے،

ہم ہر تکلیف برداشت کرینگے

(۲)

لینڈس ڈاؤن ۱۹ نومبر ۱۹۱۵ء

حضور والا، السلام علیکم،

حضور والا کا حکم نامہ مع دونوں پارسلوں کے ملا، خط تو اول ملا تھا، اور پارسلیں شام کو ملیں، کیونکہ وہ کھولنے کیلئے روک لی گئی تھیں، کل ہی محمد علی نے خط حضور کو لکھا تھا، اور ۲۱ر تاریخ کے لئے ناشتہ کی یاد دہانی کی تھی، یاد دہانی کی حضور کو کب ضرورت تھی، اس سے پیشتر کہ ہم کو خیال ہوتا خدا کی طرف سے لینڈس ڈاؤن میں آموجود ہوا، جو حضور نے خط میں تحریر فرمایا ہے، اُس کو پڑھ کر ہمارا دل بھر آیا، خدا حضور کو خدمت دین کے لئے برسوں زندہ اور سلامت رکھے، تاکہ ہم لوگ اس قابل ہو سکیں کہ اپنے متبرک مذہب کی خوبیاں دیکھ سکیں، ۱۶ر کو میں نے ایک خط اور لکھا تھا جس میں ایک نقل اُس خط وکتابت کی شامل کر دی تھی، جو میرے اور صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ کے مابین نسبت خدام کعبہ کے ہوئی تھی، وہ رجسٹری شدہ بھیجا تھا، میں آج اس کی نسبت سکتر سے دریافت کروں گا کیونکہ رسید رجسٹری میرے پاس اب تک نہیں آئی ہے، اپنے جواب میں میں نے تمام غلط فہمیوں کی جڑھ کاٹ دی تھی، اور خدام کعبہ کی نسبت تمام حالات اور اپنے معتقدات بحیثیت مسلمان بیان کر دیئے تھے،

کو ملتوی کر دیا، اب میں نے لکھا ہے کہ جہاں ملیں گے اور جب، دیکھئے کیا جواب ملتا ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ بات صاف ہماری سن لیں اور اُس کے بعد ان کو اختیار ہو چاہیں غلط فہمی قائم رکھیں، اگر نہ ملیں تو بھی ہمارا کچھ نقصان نہیں ہم اپنا فرض ادا کر چکے،

خط کا مضمون واپس بھیجتا ہوں اس کو حضور، زمیندار، سیارہ، پیسہ اخبار، ہمدم، اعظم، اتحاد بمبئی اور دیگر اخبارات میں بھجوا دیں اور اگر آسانی ہو تو ایک ہزار کا بیان انجمن کے صرف سے طبع لکھنؤ میں کرا دیں، دہلی سے ظفر احسن صاحب کل شام کو بمبئی روانہ ہو گئے ۲۲ رکو حجاج کی آمد ہے، سر علی امام[۱] کا جو جواب آئے حضور مجھکو مطلع فرمائیں۔

حضور کا خادم۔ شوکت علی،

[۱] گورنر صوبہ متحدہ

ٹرنر ماریسن کمپنی[۱] اور حجاج

(۴)

حامد باغ رامپور ۱۳؍ دسمبر ۱۴ء

قبلہ و کعبہ۔ السلام علیکم،

میں آج صبح ڈاک سے بمبئی سے واپس آیا، میرا ارادہ اسی شب کو بمبئی جانے کا تھا جس شب کو سانحہ پیش آیا حضور دعا فرمائیں کہ خدا میری زندگی پاک رکھے اور اپنی راہ میں میری قربانی قبول فرما دے، بمبئی ۷ رکو روانہ ہوا تھا اور تین دن رہا علاوہ بیرسٹروں کے سر فیروز شاہ مہتہ، مسٹر واشا اور مسٹر واڈیا نے بمبئی بلایا تھا یہ لوگ اخبار کرانیکل کے کمپنی کے ڈائرکٹر ہیں مجھ سے سب حالات سننے کے بعد اُن کی رائے ہوئی کہ مقدمہ ضرور چلایا جاوے، یہی نہیں کہ ہم فتحیاب ہوں گے، بلکہ مسئلہ حج جو سارے ہندوستان کا مسئلہ ہے حل ہو جائے گا، خفیہ کاروائی جانبر نہ ہوگی، اور گھر بیٹھے ٹرنر ماریسن کی رعایت نہ ہو سکی ٹرنر ماریسن اب گھبراتا ہے کیونکہ عدالت میں تمام معاملات کھل جائینگے، جس سے اُس کی پردہ داری ہو جائے گی کہ غریب حاجیوں پر کیا کیا مظالم ہوتے تھے۔ اسی وقت ایک کمپنی قائم کی گئی ہے جس پر سر فیروز شاہ مہتہ، مسٹر ڈینشا سکرٹری کانگریس مسٹر واڈیا، مسٹر سنلوڈر، مسٹر ابیٹ، مسٹر جناح حضور میرے، ڈاکٹر انصاری محمد علی مظہر الحق، فاضل بھائی، کریم بھائی اور دیگر مجاہدین کے نام ہوں گے، اور راجہ صاحب محمود آباد، اور وزیر حسن صاحب کے نام بھی شامل کئے جانے کی اجازت چاہی ہے۔

اپیل معقول اور اس کی نقل کل کو بھیجوں گا، امید ہے کہ کل تک بمبئی سے آجائے گی "ترکوں کی حماقت"، حضور کو بھیجتا ہوں، حضور ایک وائسرائے کو لکھیں اور ایک تمام اخبارات میں شائع کریں، اور اگر مناسب خیال فرمائیں تو تمام جمعیت اصلیہ کے نام اس میں ہوں (گشتی خط میں) محمد علی نے کل وائسرائے کو اپنا پرائیویٹ خط اس کی بحث شکایت میں بھیجا ہے ہم پر فرض ہے کہ ہم سچے خیالات گورنمنٹ پر ظاہر کر دیں، ایسے پاجی اشخاص گورنمنٹ اور مسلمانوں کے سخت دشمن ہیں۔

آپ کا خادم۔ شوکت علی،

---

[۱] حاجیوں کو لے جانے والی جہاز ران کمپنی

سلطان المعظم ترکی

(۵)

حامد باغ رامپور ۱۹ دسمبر ۱۴ء

قبلہ و کعبہ ۔ السلام علیکم،

حضور کا والا نامہ صادر ہوا، بہت مناسب ہے کہ حضور کا نام اس عام اپیل پر نہ ہو بلکہ حضور علیحدہ ایک اپیل خدام کعبہ اور دیگر مسلمانوں کے پاس بھیجیں میرے خیال میں براہ راست خط و کتابت پرائیویٹ سکریٹری صاحب وائسرائے ہو تو بہتر ہے علی امام صاحب کو درمیان میں ڈالنا میرے خیال میں نہ تو ہمارے لئے مفید ہے نہ علی امام صاحب کے لئے ترکوں کی حماقت کی نسبت اخبارات میں تحریر ہونا نہایت ضروری، آخری حصہ کی نسبت کیونکہ اُس سے ہم کو مذہبی تعلق ہے، عام مسلمانوں میں اس وقت نہایت درجہ بے چینی پھیلی ہوئی ہے، کیونکہ خلیفۃ المسلمین کے خلاف کوئی فعل کرنا بے دینی کا باعث ہے اس وقت عام مسلمانوں کی نگاہیں علماء اکرام کی طرف لگی ہیں کہ وہ مذہبی احکام کو صاف صاف طور سے حکام کے سامنے پیش کر دیں، خوش اسلوبی کے ساتھ کہ کسی قسم کی بدمزگی نہ ہو، مجھ کو یقین کامل ہے کہ حکام کبھی مسلمانوں پر زور بیجا نہ ڈالیں گے مسئلہ خلافت کا تذکرہ اس وقت لانا حماقت ہے، سوائے سلطان المعظم کے کوئی دوسرا خادم الحرمین شریفین نہیں ہو سکتا، ہم دینی احکامات حکام یا اُن کے ماتحتوں سے نہیں قبول کر سکتے، ہم کو ان امور کو صاف کر لینا چاہیئے، کیونکہ اندیشہ ہے کہ مفسد لوگ اس معاملہ میں ایسی ریشہ دوانیاں کریں، جس سے مسلمانوں میں فضول اشتعال پیدا ہو، ایسے وقت میں بزرگان دین اور قوم کی زیادہ مصلحت آمیز خاموشی نقصان کا باعث ہوگی، عام مسلمانوں کو ہدایت اور بھی ہدایت کی ضرورت ہے، میں آج رات کو علی گڑھ جاؤں گا، اور ۲۱ و ۲۲ کو دہلی رہوں گا، جہاں سالانہ رپورٹ طیار کرنی ہے، انشاء اللہ ۲۳ کو رامپور واپس آؤنگا، حضور کے آنے سے بہت سے ضروری معاملات طے پا جائیں گے، تاریخ سے مجھ کو اول سے مطلع فرمایا جائے،

حضور کا خادم شوکت علی،

علماء سور کا ذکر

(۶)

حامد باغ رامپور ۲۴ دسمبر ۱۴ء

قبلہ و کعبہ، السلام علیکم،

حضور کا تار ابھی ملا تردد ہو گیا، خدا اپنا فضل کرے مجھکو امید ہے کہ حضور کل ایک تار مجھ کو اور بھجوا دیں گے جس سے گھر میں کی خیریت معلوم ہو سکے۔ مَیں دہلی گیا تھا، محمد علی سے تو ملاقات ہوئی نہیں کیونکہ وہ لاہور گئے ہوئے ہیں۔ کاغذات وزارالغاء حضور کے لئے چھوڑ گئے تھے مگر اظہر علی صاحب اس کو بغیر لئے چلے گئے ہیں اس کو بعد کو بھجوا دوں گا۔ اسمیں

وائسرائے کے خط کا ترجمہ اور حضور کا وائسرائے کو خط وغیرہ تھا، خدا حضور کو تندرست کردے۔ اس وقت نہایت ضروری ہے کہ ایک دن کے واسطے حضور دہلی تشریف لے آتے راولپنڈی میں بہت اچھا موقع تھا کہ سب احباب سے مشورہ ہو جاتا، یہاں ایک فتوی آیا ہے جس میں خلیل الرحمن صاحب دستخط علماء کے مانگتے ہیں کہ ہم کو سلطان المعظم سے کوئی ہمدردی نہیں ہے، حضور کو غالبًا اس کا علم ہوگا۔ جمعیۃ اصلیہ کا دہلی میں جلسہ ہونا مناسب ہوگا، اسی موقع پر حضور اگر مناسب سمجھیں ایک عام جلسہ کرکے سالانہ رپورٹ جو میں تیار کررہا ہوں سُنادی جائے اگر ممکن ہوسکے تو حضور ایک دن کے لئے بھی راولپنڈی آسکیں تو بہت مناسب ہے،

ظفر احسن صاحب علوی کی نسبت کانفرنس کے دفتر میں ایک مثل جو اُن کے سخت خلاف ہے، میں اس کو خود علیگڑھ میں نہ دیکھ سکا مگر وہ راولپنڈی میں میرے دیکھنے کے لئے لائی جائے گی اس کے دیکھنے کے بعد میں رائے قائم کرسکوں گا اور حضور کے ملاحظہ کے لئے بھیجوں گا،

حضور کا خادم شوکت علی،

سنسر کا حکم

(۷)

مہرولی۔ ۲۳ جون ۱۵ء ایک بجے دن،

اگر زاہد دعا خیر میخواہی مرا ایں گو،
کہ آں آوارہ کوئے بتاں آوارہ تر باشد،

قبلہ وکعبہ۔ السلام علیکم،

پرسوں شام حکم ملا تھا کہ ہم کوئی خط وکتابت عام اخبارات میں شائع اُس وقت تک نہ کریں، جب تک اس کو سنسر پاس نہ کردے، دوسرے دن معلوم ہوا کہ اخبار کو حکم ہوا کہ اس کی ہر تحریر سنسر کے پاس جائے، جو ایسے احمق نابغ ہوئے ہیں کہ انہوں نے شروع سے لے کر آخر تک نامنظور نامنظور ہی لکھ دیا، آج صبح ۹ بجے ایک موٹر آئی اور اس پر ایک مسلمان سب انسپکٹر تھے، وہ کاغذ لائے جس میں لکھا تھا کہ گورنمنٹ نے آپکو لینڈسڈاؤن پہاڑ جانے کا حکم دیا ہے، محمد علی کا ڈھائی سو روپیہ اور میرا سو روپیہ خرچ کا منظور ہوا ہے، مَیں نے نہایت شکریہ کے ساتھ لینے سے انکار کردیا ایسی عنایت کیا جس سے نہ پیٹ بھرے نہ جسم، غالبًا میری پنشن والے ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ کردیئے گئے ہیں، جن کو اس نظر بندی سے کچھ تعلق نہیں ہے، محمد علی نے عذر لکھ دیا کہ اس وقت مجھ کو پہاڑ بھیجنا میری تندرستی کے سخت خلاف ہوگا کیونکہ گٹھیا کا سخت ترین دورہ مجھ پر ہے، علاوہ ازیں میں اپنے طبیبوں سے دور ہوجاؤں گا، میرے دل میں بھی آئی حضور کو لکھ دوں کہ مجھ کو پہاڑ سے کیا تعلق، میرے لئے درگاہ ہی مناسب جگہ تھی، اس خط وکتابت سے ۱۱ بجے فارغ ہوئے پھر ایک دوسری تحریر محمد کو لکھنا تھی، جس میں وہ غریب اب تک مشغول ہے، حضور کو اُس کی اطلاع ہوجائے گی امروز کا خط ہے، میں نے جلدی جلدی چند دوست واحباب کو یہ خبر سنادی، اس عرصہ میں یہاں درگاہ کے لوگ اور اہل شہر مانوس ہوگئے تھے، اُن کو رخصت کرنا ہے، والدہ صاحبہ یہاں ہی موجود ہیں، اور محمد علی کے گھر میں اور کئی اور عزیز موجود

ے آگئے تھے، وہ رخصت ہوگئے تھے کہ اُن کو دوبارہ بلوایا اور اُن کے ہمراہ والدہ صاحبہ اور محمد علی کے گھر ہی کو سوار کرایا، والدہ ماجدہ کسی طرح نہیں مانتیں، برقع اوڑھ ساتھ ساتھ جانے کو ہمراہ تھیں، اُن کو دہلی گھمائیں گے، اور وہاں سے وہ ۴ بجے کی گاڑی سے مرادآباد جائیں گے اور پھر ہم اور وہ ہمراہ لینڈڈون جائیں گے، مرادآباد سے نجیب آباد کو ریل جاتی ہے، اور وہاں سے کوٹ دوارہ ہوتے ہوئے کل ۱۰ یا ۱۱ بجے تک دن کے انشاء اللہ لینڈڈون پہونچ جائیں گے، وہاں سے مفصل حال لکھوں گا، غالبًا اس خیال سے کہ کہیں اہل دہلی ہماری آؤ بھگت اور خاطرداری دوبارہ نہ کریں، ہم کو موٹر میں ہی غازی آباد یا ہاپوڑ لے جائیں گے، اور وہاں سے ریل میں بٹھا دیں گے، خدا کی عجب شان ہے کہ کس طریقہ سے ہم کو لینڈس ڈاؤن کی سیر کرانا ہے، میں بہت خوش ہوں، قریب سے دل میں تقویت آتی ہے، حضور دعا فرماتے رہیں، میرا سب کو سلام،

حضور کا خادم۔ شوکت علی،

لینڈس ڈاؤن میں نظربندی

(۸)

بنگلہ سنر انٹیک لینڈس ڈاؤن ۲؍جون ۱۵ء،

قبلہ و کعبہ۔ السلام علیکم،

ہم پرسوں بخیریت یہاں پہونچ گئے خدا کی کیا شان ہے کہ اُس نے ہم غریبوں کو بغیر کسی تکلیف اور زیر باری کے اس پہاڑ کی سیر سی کرادی میں بفضلہ تعالیٰ خوب تندرست ہوں جو میرے لئے اب معمول ہوگیا ہے، محمد علی بھی اچھے ہیں، مگر گٹھیا کا تھوڑا درد ہے، اُس کے علاج کی طرف عنقریب توجہ کی جائے گی، ڈاکٹر انصاری صاحب منصوری سے واپسی پر یہاں آئیں گے، اور دیکھ کر علاج تجویز فرمائیں گے، محمد علی دونوں وقت پھرنے جاتے ہیں، اور انشاء اللہ ورزش برابر جاری رہے گی، اور اُن کے لئے مفید ہوگی۔

دہلی سے تو حضور کو رخصت ہوتے وقت ایک لکھ چکا تھا، جو ملا ہوگا، وہاں سے راستہ میں خدا نے ایسا کیا کہ ۲۴ گھنٹے مرادآباد میں ٹھہرنا ہوگیا، اگرچہ ...... سید رضا آنے کی ہدایت ہوئی تھی، مگر دہلی کی گاڑی دیر سے ...... کوٹ دوار کو روانہ ہوتے ہیں صبح ۵ بجے، نجیب آباد سے ۱۵ میل ہیں اور ایک گھنٹہ کا راستہ ۶ بجے ہم کوٹ دوار پہونچے، وہاں تانگہ اور اسباب کے لئے اب کہ ٹوقلی وغیرہ سب موجود تھے، چاء وغیرہ سے فارغ ہوکر ہم تانگہ میں سوار ہوئے، اور ۱۳ میل تک تانگہ میں آئے اور اُس کے بعد ۱۳ میل چڑھائی کے ہم دونوں نے ٹٹوؤں پر اور والدہ ماجدہ نے ڈانڈی پر طے کئے، ہم قریب ۱۲ بجے کے لینڈس ڈاؤن آگئے، راستہ خوبصورت تھا اور مثل نینی تال کے راستہ کے، چاول کی کاشت زیادہ ہوتی ہے، گورنمنٹ نے ایک بنگلہ ہمارے لئے، کرائے پر لے لیا ہے، جو ہر طرح سے آرام کا ہے اور جس میں سب سامان موجود تھا، اس کا مالک گورکھا رجمنٹ کا افسر تھا مگر غریب لڑائی میں مارا گیا یہاں ۲ رجمنٹ فوج کی رہتی تھیں یعنی گورکھا اور گڑھوال جنہوں نے لڑائی میں بڑی بہادری دکھائی، اکثر پرانے افسر مارے گئے، بنگلے خالی پڑے ہیں،

انتظام کی دیکھ بھال کے لئے صرف ایک افسر رہتے جو جنٹ مجسٹریٹ کے درجہ کے ہوتے ہیں، موجودہ جنٹ مجسٹریٹ نے ہمارے
راستہ کا انتظام عمدہ طریقہ پر کیا تھا، اور ہم کو کسی طرح کی تکلیف نہ پہونچی، آدمی معقول اور بااخلاق ہیں، ہم اُس وقت چونکہ
جمعہ تھا وضو کرکے نماز ادا کرتے مسجد گئے اور دو ... جے ... سابق طور سے ادا کیا مسلمان مشکل سے ۵، یا ۶ ہوں گے
یہ جگہ صرف چھاؤنی ہے، اور کوئی آبادی نہیں خدا کا شکر ہے کہ ہمارا دین ایسا مقدس ہے کہ ... جے ... طرح کی آسائش
مل جاتی ہیں، سب ..... کاغذ .... غائب ...... پھر واپس آئے، تو .....
.... غائب .... مسٹر بارکر آئے جو جائنٹ مجسٹریٹ ہیں، ہمارے خطوط آئیں گے
بھی ان ہی کی معرفت اور جائیں گے بھی انہیں کی معرفت، اگرچہ اس کا رنج ہوا، کہ اس صوبہ کی گورنمنٹ نے کیوں ہماری اس
قدر بے اعتباری کی مگر نقصان کچھ نہ ہوا، کیوں کہ ہم کو کوئی خفیہ بات کرنا ہی نہ تھی، حضور یقین رکھیں کہ یہ جگہ بھی خدا کی یاد کے
لئے بہت موزوں ہیں، تمام طرف جنگل اور پہاڑ ہیں نماز نہایت زور سے ہوتی ہے، محمد علی اپنی بڑی موٹی اور بھدی
آواز میں آذان دیتے ہیں، پانچوں وقت، جس سے تمام پہاڑ گونج جاتا ہے، میں امام بنایا گیا ہوں، صبح و شام ٹہلنے جاتے
ہیں، خوب دُور تک، صبح کو تلاوت قرآن پاک ہوتی ہے، مح ... کاغذ غائب .... کے جس وقت سے خدام کعبہ میں
حضور کے طفیل سے داخل ہوا اُس وقت سے بفضلہ تعالیٰ نماز کبھی قضا نہیں ہوئی، تلاوت قرآن شریف گندہ دار ہوتی
تھی اب جب سے دہلی گئے تھے، تب سے باقاعدہ تلاوت بھی ہونے لگی ہے، خدا کو اس غرض سے ہم کو نظر بند کرانا
تھا، آب و ہوا یہاں کی عمدہ ہے، نینی تال کی سی خنکی نہیں ہے، مگر موسم ضرور خوشگوار ہے، حضور کو ضرور آنا ہوگا جب
طبیعت چاہے، اول سے اطلاع دینا ہوگی، تاکہ تانگہ اور سواری وغیرہ کا انتظام کیا جا سکے، یہاں ایک اور قاعدہ
اول سے جاری ہے، کہ کوئی باہر کا آدمی نہیں آنے پاتا جب تک اس کو ڈاکٹری معائنہ کے لئے ....
....
.... کیونکہ چوا غرہ ....
بھی۔ اور نیز ہمارے نوکروں کے لئے، اب یہاں رنگروٹ بھرتی ہو کر لڑائی پر جاتے ہیں، ہم سب طرح بخیریت ہیں
حضور خدا سے دعا فرمایئے گا کہ خدا محمد کو ایمان اور اُس کی رضا جوئی عنایت فرمائے،

صدر دفتر سے تمام کاغذات حسب معمول یہاں میرے پاس آئیں گے تاکہ کام کی غور و پرداخت ہو سکے، حضور کو
اس وقت میں زیادہ کام کا بار پڑ جائے گا، آمدنی اس وقت بہت کم ہے، اخراجات کے لئے حسب ضرورت حضور لکھو
کی جمعیت عالیہ کے خزانہ سے یا بذریعہ چک تنخواہ وغیرہ بھجوا دیجئے گا، عملہ بہت کوشش کرتا ہے، اور اس میں کہ صرف
تھوڑے ہو سکتے ہیں، یہ دو تین ماہ تنگ کے ہیں، جو انشاء اللہ جلد گذر جائیں گے اور پھر خدا کے فضل سے ہم اپنے
اس مقدس کام کو آسانی سے چلائیں گے، یہ موجودہ بدگمانیاں اور شبہات دور ہو جائیں گے، میرا سب کو سلام فرما دیجئے
گا، خاص کر مولوی سلامت اللہ صاحب، بھائی الطاف، احسان، خواجہ الیاس، قاضی وحید الدین، مجید الدین، صبغتہ اللہ
صاحب، اور دیگر برادران کو، بہت خوش ہوں، اور خدا سے ہر وقت اسلام کیلئے گڑگڑا، گڑگڑا کے دعائیں مانگتا ہوں، مراد آباد

پونکہ اب یہاں قیام ہوگیا ہے اس لئے بہت سے ۔ ۔ ۔ کاغذ غائب ۔ ۔ ۔ دوست ملنے رامپور سے آگئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
غائب
۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پتہ کے لئے، ہمارا نام اور لینڈس ڈاون کافی ہوگا، حضور کا تار شام ملا تھا، ناظر الدین حسن اور ممتاز میاں کو بھی سلام، غرض سب کو سلام۔

شوکت علی،

مفسدوں کی افتراپردازیاں

(۹)

لینڈس ڈاون، ۱۸ ستمبر ۱۹۱۵ء،

قبلہ و کعبہ، السلام علیکم،

یہ خط فقط حضور کی مزاج پرسی کے لئے لکھتا ہوں، کیونکہ اخبارات سے معلوم ہوا کہ لکھنئو پر اور مزید مصیبت آئی، ہزاروں لاکھوں مخلوق کا برا حال ہوا، خدا اپنا فضل کرے، اول بارش اور طوفان اور طغیانی، بعد کو زلزلہ اور بارش، یہ سب ہمارے اعمال کی سزا ہیں، ہم لوگ اسقدر خدا کو بھولے ہوئے ہیں، اور اُس کے صریح احکام کی نافرمانی کرتے ہیں، کہ وہ ہم کو جو سزا اب دے تھوڑا ہے، کاش اب بھی غفلت کو دور کریں، اور صراط مستقیم اختیار کریں، ناظر الدین حسن کے خط سے معلوم ہوا تھا کہ سوائے حضور کے مکان میں فرنگی محل میں اور بہت سے مکانوں کو نقصان پہونچا، خدا کرے سب احباب اور اعزہ بخیریت ہوں، بفضلہ تعالیٰ ہم اچھے ہیں، اور حضور کو اکثر یاد کرتے ہیں، اور یاد کر کے دل کو تقویت ہوتی ہے، خدا حضور جیسے مسلمان اور دنیا میں بڑھائے تاکہ دین متین کی تقویت کا باعث ہوں، اور دنیا میں سے کفر کی ظلمات کی جگہ نور حق کی اشاعت ہو، محمد علی دست بستہ سلام عرض کرتے ہیں، کل مفصل خط خدام کعبہ کی نسبت مولانا صاحب کو بھیجوں گا، میں نے دفتر سے سب کاغذات منگا کر دیکھے جس سے صاف صاف معلوم ہوگیا کہ ہمارے برخواست شدہ حضرات سب سے زیادہ انجمن کو نقصان پہونچاتے ہیں رسیدیں میرے پاس آگئیں، جس سے خط بھی پہچان لیا گیا، بالکل صاف ہے، پیسہ اخبار کو بھی میں سب حالات بھیجتا ہوں تاکہ وہ گمنام خطوط اور مفسدوں کی افترا پردازیوں پر توجہ نہ کریں، اور تعجب اور جہالت سے کام نہ کریں، ہمارے تبادلہ کی نسبت ابھی کوئی اطلاع نہیں ملی کہ کہاں جائیں گے، اور کب، ہم ذرہ پریشان نہیں ہیں، نہ ہم کو تنہائی محسوس ہوتی ہے ہمارا خدا ہمارے ساتھ ہے، اور وہ سب سے عمدہ محافظ ہے، حضور دعا فرماتے رہیں، کہ خدا ہم کو آخر وقت ایمان پر قائم رکھے، خدا کرے حضور اور تمام احباب بخیریت ہوں، خدا معلوم ان مصائب کا کب خاتمہ ہوگا، جب تک کہ ہم اپنے اعمال درست نہ کریں گے، اور خدا کے احکام کی پوری تعمیل نہ کریں گے، ہم اسی طرح مبتلا و آلام رہیں گے، خدا ہم کو توفیق دے میرے بھائی الطاف، احسان، عزیزی الیاس کو سلام، مولوی سلامت اللہ صاحب خدا کرے بخیریت ہوں، صا دفتر پر حملے اگرچہ کم ہوگئے ہیں، مگر ان ۳ ماہ تک اور ان کی دلجمعی اور تقویت کی ضرورت ہے، اُس کے بعد انشا اللہ

صرف اس قدر ہے کہ آپ لوگوں کی مخالفت مثمر نہ ہو، ممکن ہے کہ میری موافقت فائدہ بخش ہو اور جو مشکلات مسلمان بچوں کو
سرکاری یونیورسٹی میں پیش آتے ہیں، اُن کی تفصیل ہو جاتی ہے، اس واسطے کہ میں اس سے زیادہ مت .. کاغذ غائب ...
یونیورسٹی قائم کرنے والوں میں نہیں پاتا تھا، اب بھی مخالفت بے سود معلوم ہوتی ہے، میں نے تار ڈاکٹر صاحب کو دیا
کاغذ غائب
ہے اور اس کی نقل مرسل ہے، فقط ....
(یہ تحریر مولانا کی معلوم ہوتی ہے) محمد علی

منافقین اسلام

(۱۱)

لینڈس ڈاؤن ۱۷، اکتوبر ۱۵ء،

مخدومی و مکرمی جناب مولانا صاحب، السلام علیکم،

کئی دن سے ارادہ لکھنے کا کرتا تھا، مگر اس یونیورسٹی کے قضیہ کی وجہ سے علی گڑھ کو زیادہ لکھنا پڑا، اور کچھ تھوڑی سی سستی بھی تھی، اور معمولی خطوط کا تو اب دیا مگر چونکہ آپ کو ضروری امور پر لکھنا ہے، اس لئے اُس کو ملتوی کرتا رہا، بنک بنگال کا خط بھیجتا ہوں، اُس کی ہدایت مطابق اُس کو لکھ کر روپیہ لکھنؤ کو منتقل کرا دیجئے گا اور بہتر ہے وہاں سے لیکر اپنے پاس احتیاط سے رکھوا دیجئے گا، یہ ضروری ہے، اس میں دیر نہ فرمایئے گا،

(۱) غالباً آپ نے وہ اشتہار دیکھا ہوگا جو منافقین نے دہلی سے نکالا تھا، دروغ گوئی کی حد ہو گئی ہے نہایت ضروری ہے کہ اس کا جواب دیا جائے، اور وہ ایک گشتی خط کی صورت میں ہو، اور زور دار ہو، جس میں منافقین اسلام کا سب حال کھول دیا جائے، حضور رسول اکرم صلعم کے زمانہ میں ان منافقین اور مفسدین کی کمی نہ تھی اب تو بدترین وقت ہے اور قریب قیامت، حضور صاف صاف الفاظ میں ایک مراسلہ کے ذریعہ سے جمعیت کے مقاصد کے علاوہ ان مفسدین کے حالات بھی کھول دیں، ہر شخص جو بددیانتی اور بدچلنی کی وجہ سے نکالا جائے، وہ قومی خیرخواہ بن کر آکھڑا ہو اصل یہ ہے کہ یہ زمانہ ایسا ہے کہ مفسدوں کو موقع مل گیا ہے، کہ جس قدر فساد چاہیں کریں، جنگ کی وجہ سے ہم لوگ ملک کی دشواریوں میں اضافہ کرنا نہیں چاہتے، اور کسی ناعاقبت اندیش حکام کی طرف سے اشارہ مل گیا ہوگا، یہ اُن کی بہت کمزوری ہے کہ اس قسم کے آلوں کو مذہبی اور کار خیر روکنے کے لئے استعمال کریں، ڈاکٹر ناظر الدین حسن کو اور اور قانونی اصحاب کو بھی وہ اشتہار دکھا دیجئے گا، برادرم قدوائی کا خط دیکھا، خیر مقدمہ تو کیا، مگر خط ناظر الدین حسن بحیثیت قانونی ان صاحب لکھیں اور ٹائمز سے جواب طلب کریں، کہ آیا اُس سے مقصد ہماری انجمن ہے یا کوئی اور، خط سخت ضرور ہونا چاہیئے، د... اسلامک ریویو رسالہ بھیجتا ہوں جس میں قدوائی کا مضمون تھا، معاف فرمایئے گا کہ اول حسب وعدہ غلطی کی وجہ سے نہ بھیج سکا،

(۲) کریم بخش صاحب کے خطوط کی میری نظر میں زیادہ وقعت نہیں، اُس کی نسبت مفصل میں آپ کو لکھ چکا ہوں

اطمینان سے عمدہ آدمی ڈھونڈھ لیں گے اور کام کو گذشتہ کی طرح درست کریں گے اس وقت تو کسی نہ کسی طرح کام برابر جاری رہے، بند نہ ہونے پائے دشمن اس کی فکر میں ہیں کہ کام کرنے والے خود گھبرا کر اور تنگ آ کر کام چھوڑ دیں،

حضور کا خادم شوکت علی،

مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ

(۱۰)

لینڈن - ۱۱ اکتوبر ۱۵ء، ضروری

حضور والا، السلام علیکم،

ہم کو کل اطلاع ملی کہ ہم کو یونیورسٹی کے اجلاس میں شامل ہونے کی اجازت نہیں مل سکتی، اس لئے مجبوراً تحریری رائے بھیجدی ہے، جو امید ہے کہ جلسہ میں پڑھ کر سنائی جائے گی، کم از کم اس قدر تو ہم دور افتادوں پر رحم کیا جائیگا کہ اس کو سنانے کی اجازت جائے گی، حضور کی شرکت اس جلسہ میں ضروری ہے، نہایت ضروری ہے تاکہ یونیورسٹی اگر قبول کی جائے تو صرف انہیں شرائط پر جن کی وجہ سے ہمارے دین مقدس کی تعلیم صاف صاف دی جائے، اور کسی قسم کی غیر مسلمان کی مزاحمت نہ ہو، حضور سے ہماری دونوں کی التجا ہے کہ حضور ضرور جائیں،

حضور کا تابعدار شوکت علی،

(اسی خط کی پشت پر)

مجھے تعجب تھا کہ آپ لوگوں نے شرکت مجلس کی اجازت کیوں لینا چاہی ہے، کیونکہ میں خیال کرتا تھا، کہ آپ کے اجازت مل جانے سے آپ کی نظر بندی کی اہمیت کم ہو جاوے گی، مگر میرا گمان غلط نکلا اس واسطے کہ ابھی تک عمدہ انتظام اور مناسب طبع تحفظ کرنے کی قابلیت موجودہ حکام میں ثابت نہیں ہو سکی، اور آپ کو انہوں نے جانے نہ دیا، بہتر ہوا میں خود شرکت جلسہ علی گڑھ کا خیال بھی نہیں رکھتا تھا، مگر ڈاکٹر انصاری صاحب کا تار آیا، اور آپ کے خط سے جانے کی ضرورت معلوم ہوئی، مگر میں دیانت سے کوئی فائدہ نہیں پہونچا سکتا ہوں، میری رائے یونیورسٹی کے بارہ میں ابتداء سے یہ ہے کہ اگر تعلیم محض حصول کمال کے واسطے مسلمان دلانا چاہتے ہیں تو چارٹر کی پرواہ نہ کریں، اپنا کام شروع کریں مگر ایسا ہونا ناممکن ہے، بلکہ مقصد تعلیم محض تجارتی اصول پر ہے، اور ملازمت یا حکومت سے وابستگی مطلوب ہے، جس کا بدون ملازم رکھنے والے یا عزت افزائی کرنے والے کی خوشی کے ناممکن ہے، پھر اجازت سے قطع نظر نہیں ہو سکتی ہے، اس میں کد سے کیا فائدہ ہے، میں نے شرکت کے وقت علماء کو مطلع کر دیا تھا کہ میں جانتا ہوں کہ اس یونیورسٹی کا مقصد کیا ہے، تکمیل غرض سید احمد خاں اور تائید مدرستہ العلوم علی گڑھ ہے، مجھے شرکت سے فائدہ

موجودہ کارکنوں میں میں امین صاحب اور اسد اللہ خاں کو ذاتی واقفیت اور تجربہ کی بنا پر انجمن کا سچا دوست، مخلص، اور پکا آدمی خیال کرتا ہوں، اس کی غلطی ضرور تھی، کہ اس نے دوسروں کو روپیہ قرض دیا،

(۳) ایوب احمد صاحب سے مجھ کو ہمیشہ سے محبت تھی اور اب تک باوجود تمام امور کے میں کہنے پر مجبور ہوں کہ یہ نوعمر شخص بہت سے حوصلہ اور جوش لے کر نوکری چھوڑ کر انجمن میں آیا تھا، نہایت افسوس کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے دفتر کی آب و ہوا ایسے لوگوں کیلئے مضر تھی، جو کچھ رہا سہا جوش اور حوصلہ تھا اس کو بھی ضائع کر دیا، اس میں سب سے زیادہ حصہ ظفر احسن کا تھا کہ بہتوں کے منہ کھلوا دیئے تھے، انشاء اللہ سب سے مقدم دفتر میں ایک ایسے عالم باعمل کا قیام ہوگا جو ہم سب کو روحانیت کا سبق دیں گے اور احکام الٰہی سے آگاہ کریں گے، ایوب احمد ہمارے ہاں کے کام کے نہیں ہیں، مگر بلاشبہ انجمن کا وہ دوست ہے، اور دل میں اسلامی محبت کی چمک رکھتا ہے، اسید منظور اللہ کو بھی میں قابل قدر جانتا ہوں، اگرچہ نوعمر ہیں اور گرد و نواح کا اثر ان کے لئے زہر تھا، ہم لوگ اپنا چندہ کل بذریعہ تار بھیجیں گے، تاکہ نومبر کو دفتر میں پہونچ جائے، وصولی چندہ کی طرف توجہ فرمایئے گا، گشتی خط مل گئے یہ جنگ تو جلد ختم ہونے والی نہیں، کیا اس کے لئے ہم تمام کاروبار بند کر دیں، خاص کر جب کہ ہماری وفاداری اور امن پسندی کے خاک بھی قدر نہ کی جائے اور ہمارے مقابلہ کے لئے ذلیل اور بدمعاش لوگ کھڑے کئے جائیں، ہم خدا کا شکر کرتے ہیں، کہ اس نے ہمیں قوت ایمان دی ہے، اس لئے ہم کو کسی قسم کا خوف و خطر نہیں، مگر ہماری جماعت میں کچھ افراد ایسے بھی ہوں گے جن کا قلب کمزور ہوگا، ان کے لئے ضرور ہم کو کچھ انتظام کرنا چاہیئے، تاکہ وہ ایسے لغو الزامات سے پژمردہ اور خوف زدہ نہ ہوں، گشتی مراسلہ منافقین اسلام پر نہایت ضروری ہے، اور حضور قبلہ اس کو نہایت خوبی سے لکھیں گے، کیونکہ تمام اسلامی روایات سامنے ہیں، اس سے تمام مسلمانوں کے قلب میں طاقت آجائے گی، ضرور اس کی نسبت مجھے مطلع فرمایئے گا، محمد علی کی بھی یہی رائے ہے کل ایک بھائی کے ہم نام نے بیعت کی ہے ہمارے ذریعہ سے، وہ اپنا نام اور پتہ بھیجیں گے، مخلص اور نیک شخص ہیں، اور اچھے مسلمان ہیں، ان کا نام فہرست میں داخل کر دیا جائے،

آپ کا ہر ماہ میں، دہلی جانا لازمی ہے، دفتر سے اطلاع ملی کہ آپ نے ان کو ۲۵۰ روپیہ بھیج دیئے، نہایت مناسب کیا، کیونکہ ان کا مصارف سے تنگ رہنا اچھا نہ تھا، آپ کے خط کا انتظار رہے گا، دیکھیئے کیسی ہوا ہے شملہ کی کہ وہاں جاکر انسان مضمحل ہو جاتا ہے، کیا گھبراہٹ یونیورسٹی کی پڑی تھی کہ جیسے بٹلر صاحب دینا چاہیں وہ لے لیں، اور وہ دھمکیوں کے زور پر، کیا بٹلر صاحب اور موجودہ وائسرائے بہادر نے نیکی اور فراخ حوصلگی کا ٹھیکہ لے لیا ہے، انشاء اللہ ان سے بعد ازجنگ بہترین کام کرنے والے آئیں گے، جو ہماری زیادہ خاطر اور مدارات کریں گے اور ہماری ہی شرائط پر ہم کو یونیورسٹی دیں گے، آخر ہمارے امتحانوں اور مصائب کا بھی تو کچھ صلہ ملے گا، انشاء اللہ مالک حقیقی ہماری مدد کرے گا، اور روپیہ اور قوت اور سامان موجودہ زمانہ سے اگنا دے گا، میرا حضور کی خدمت میں دست بستہ سلام عرض کر دیجئے گا، تمام احباب کو سلام، بھائی الطاف نے اب تک مطلع نہیں کیا کہ گھڑی کی بنوائی کس قدر دی، ان سے تقاضا کریں، خدا کرے آپ سب بخیریت ہوں، والد ماجد کی خدمت میں میرا سلام کہہ دیجئے، خدا آپ سب کو زندہ اور سلامت رکھے،

وت اسلام ہے، اور ہم سب کو ثابت قدم رکھے اور توفیق دے کہ ہم کوئی نمایاں خدمت اسلام کریں،

آپ کا بھائی شوکت علی،

محمد علی سلام عرض کرتے ہیں، میرے دونوں چھوٹے بچے آگئے ہیں، اور محمد علی کی چھوٹی لڑکی بھی ہے، والدہ صاحب رامپور گئی ہیں، ان بچوں سے بڑی دل بستگی رہتی ہے، ہاں اکثر مار پیٹ کے مقدمات بھی ہو جاتے ہیں، جن کا تصفیہ اکثر اوقات راضی نامہ کے ذریعہ سے ہو جاتا ہے، یہ دونوں تصویریں عزیزی الیاس کو دے دیجئے گا، حضور سے اطلاع نہ فرمائیے گا

قیدی کا خط

(۱۲)

بینڈس ڈاؤن ۲۸ اکتوبر ۱۹۱۵ء،

قبلہ وکعبہ، السلام علیکم،

حضور کا عرصہ سے کوئی حکم نامہ نہیں آیا جس سے صحت مزاج کی اطلاع ملتی، میں خود بھی اس عرصہ میں زیادہ خط وکتابت نہ کر سکا کیونکہ عید کے موقع پر چند اعزہ اور احباب آگئے تھے، اور رامپور سے میرے دو لڑکے بھی بھاگ آئے تھے، اُن کی وجہ سے فارسی عدیم الفرصتی بھی رہی تھی، علاوہ ازیں اس امر کا انتظار تھا کہ جلد اسباب وغیرہ باندھیئے کیونکہ یہاں خبر تھی کہ آخر ماہ تک ہمارا تبادلہ کسی اور مقام کو ہو جائے گا، اب تک تو کوئی اطلاع نہیں ملی ہے، کہ کب جائیں گے اور کہاں کو، خدا کرے دہلی کا قرب ہو تاکہ محمد علی صاحب کا بقیہ علاج بھی مکمل ہو جائے، الفضلہ تعالیٰ الشکر تو آنا بند ہو گئی ہے درد اعضا میں ہوتا ہے مگر چونکہ بارش اب بند ہے، اس لئے اول کی سی تکلیف نہیں ہے، دہلی کے حالات حضور کو معلوم ہوتے رہتے ہونگے، وہاں دوسری مقامی جمعیت قائم ہو گئی ہے جو انشاء اللہ عمدہ کام کرے گی، میں اب فقط یہ چاہتا تھا کہ جو سامان اور دفتر ہمارا اُن منافقین اور مفسدین کے پاس ہی پاس ہے وہ ہم کو واپس مل جائے، میں ڈاکٹر انصاری صاحب کو اس بارہ میں لکھا ہے اور اگر حضور بھی اس عرصہ میں دہلی جائیں، تو اس کی طرف توجہ فرمائیے گا، نیا سال شروع ہے، ہم لوگوں نے تو اپنا چندہ ٹھیک یوم الحج کو بذریعہ تار کے بھیجدیا تھا، امید ہے کہ امسال پوری کوشش سے کام کیا جائے گا، یہ جنگ کو لامتناہی معلوم ہوتی ہے، اس کی وجہ سے انسان کون کون سے ضروری امور بند کریگا، امید ہے کہ مولانا سلامت اللہ صاحب نے بھی کام شروع کر دیا ہوگا، اور وصولی کی طرف پوری توجہ کی ہوگی، حضور یہ میرا عریضہ اُن کو دکھا دیں، اضلاع کے پرجوش کام کرنے سے تاکید کی جائے، کہ وہ وصولی چندہ کی طرف متوجہ ہوں، انشاء اللہ ضرور کامیابی ہوگی، تاج محمد صاحب نے بمبئی میں امسال بڑی محنت سے کام کیا، مولوی غلام محمد صاحب کمتری کی شکایات آئی ہیں، اُن کی طرف ضرور توجہ کرنا ہے، اس قدر رنج ہوتا ہے کہ باوجود ہماری اس قدر خاطر اور

ارات کے کارکن متدین اور خدا سے ڈرنے والے نہیں ملتے، مفصل حالات بعد کو حضور کو بھیجوں گا، اس عرصہ میں برابر
انجمن کی نسبت غور کرتا رہا ہوں، اور انشاء اللہ اس جنگ کے بخیر ختم ہو جانے اُس کا مستقبل نہایت شاندار اور
کامیاب ہوگا، صرف سوال کام کرنے والوں کا رہ جاتا ہے، اور اُن کی نگرانی کا، انشاء اللہ اس کی نسبت بھی مفید تجاویز
گذشتہ تجربہ کی بنا پر کی جائیں گی، خدا کرے یہ عید مبارک تمام عالم اسلام کے لئے باعث خیر و برکت ہو اور مسلمان اس
بڑی قربانی سے سبق حاصل کریں، اصل یہ ہے کہ اسلام کی خوبیاں اور برکتیں اب ہم پر ظاہر ہوتی جاتی ہیں، اس عید کو
اور اس قربانی کو مسلمان عام طور سے مشکل سے سمجھے ہیں، خدا ہم سب کو توفیق دے کہ ہم بھی سنت ابراہیمی ادا کر سکیں
میرا، بھائی الطاف الرحمٰن صاحب، احسان، الیاس، اور دیگر احباب کو سلام،،

گھڑی کی مرمت کی اجرت کا ٹھیک حال باوجود تقاضوں کے نہیں معلوم ہوا، حضور بھائی الطاف سے دوبارہ تذکرہ فرما دیں، افسوس راجہ صاحب محمود آباد نے اس یونیورسٹی کے معاملہ میں بٹلر صاحب کا ساتھ دے کر اپنے کو بد نام اور گندہ کیا اور ناظر الدین حسن کو بھی لے ڈوبے اس معاملہ پر ایسے وقت میں بحث کرنا صرف چند افراد کا نظر بندی کی طرف کھینچنا تھا، اب جو نظر بند اور مقید ہوں گے، ان کے ذمہ دار راجہ صاحب اور ان کے احباب ہوں گے،

محمد علی کا سلام درست بستہ،

حضور کا خادم شوکت علی معتمد خادم الخدام کعبہ

مسلمانوں کو کیسی یونیورسٹی چاہیئے؟

(۱۳)

لینڈس ڈاؤن ۵ نومبر ۱۵ء،

حضور والا، السلام علیکم،

دو خط حضور کے پے در پے ملے تھے، محمد علی نے مفصل جواب حضور کو دیا ہے، ملا ہوگا، یونیورسٹی کے مسئلہ میں میں ان کا ہم خیال ہوں اور میرے نزدیک کوئی وجوہ ایسے ظاہر نہیں کئے گئے ہیں جن سے مسلمان اپنا خیال بدلیں، چند مفروضہ اور خیالی خطرات کا تذکرہ سُنا ہے، جن کی کوئی وقعت نہیں ہے، نہ نیک نیتی اور ہمدردی کا بٹلر صاحب اور لارڈ ہارڈنگ بہادر پر خاتمہ ہوگیا ہے، میرا گمان غالب ہے کہ نیا ممبر تعلیم بٹلر صاحب سے اگنا عمدہ اور ہمدرد آدمی ہے اور جو وائسرائے بھی آئے گا، وہ انشاء اللہ لارڈ ہارڈنگ صاحب بہادر سے اچھا ہوگا، علاوہ ازیں وہ اچھے ہوں یا بُرے، ہم کو انصافاً اپنی حالت کو دیکھنا ہے اور یہ کہ ہم جو طلب کرتے ہیں، وہ ہٹ دھرمی پر مبنی ہے یا اپنی ضروریات پر ہمارے مطالبات سب جائز ہیں اور وہ خود گورنمنٹ قبول کر چکی ہے، ہم کو یہ ترقی معکوس پسند نہیں ہے، آخر اس کی کوئی انتہا بھی ہے، حضور پر ہماری حالت روشن ہے، ہم کو تمام واقعات ہو چکنے کے بعد معلوم ہوئے، راجہ صاحب کو ہرگز زیبا نہ تھا کہ ذاتی مروت کی وجہ سے جو ان کی بڑی خوبی ہے، وہ ایسی بات کھڑی کریں، جس کو وہ ضرور جانتے تھے،

مسلمان ہرگز پسند نہ کریں گے، محمد علی کو ناظر سے یہ شکایت تھی کہ اُن کو شملہ کے واقعات اور ضروریات سے بالکل بے خبر رکھا، وہ اس عرصہ میں برابر ہماری امداد کرتے رہے تھے، اور ہم اُن کے مشکور ہیں، اُن کی محمد سے خط و کتابت تھی مگر انہوں نے اصلی واقعات کا کچھ کبھی تذکرہ نہیں کیا، راجہ صاحب کو زیبا تھا کہ وہ اس مقابلہ میں اول ہر فریق سے مشورہ کر لیتے اور خاص کر اُس سے جو ہمیشہ اُن کا ہم خیال رہا تھا، ہم کو اپنی دینی عزت اور وقعت کے خیال سے کسی طرح ایسی کوئی کارروائی نہ کرنا چاہیئے تھی، جس سے ہمارے بھائیوں کے دل پژمردہ ہوں، اور مصائب کیا کم تھے کہ یہ نئی پریشانی کھڑی کر دی، اُس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ نئی پریشانی ہم لوگوں نے نہیں کھڑی کی تھی، ہم پر تو بلائے ناگہانی کی طرح آن پڑی، ہم بے دست و پا تھے، محمد علی کا رجسٹری خط جو ۱۳ کو بھیجا تھا، جس میں مفصل رائے تھی، اُس کی رسید ۱۵ کو سولن پہاڑ سے آئی، بجائے آنریبل سکرٹری کے کسی انگریز کے سے دستخط تھے، ممکن ہے کہ کوئی اور مزید سنسر ہوگا، دفتر علی گڑھ میں ۲۲ اکتوبر کو بجائے ۱۴ اکتوبر کے پہونچی، ان صاحبوں کو ذرہ یہ تو خیال چاہیئے تھا کہ جب وقت ایسا ہو کہ معمولی اور نہایت قابل اور معتدل رائے تعلیمی معاملات پر دینا ناممکن ہو تو اُس میں ایسے ضروری مسئلہ چھیڑنا مناسب تھا یا غیر مناسب، راجہ صاحب نے صرف اپنے مخالفین اور دشمنان اسلام کا دل خوش ہوا میں حضور کو یقین دلاتا ہوں کہ کسی شخص کو راجہ صاحب کو تکلیف دینا منظور نہیں ہے بلکہ سب کو صدمہ ہے، ایسی تحریک اگر آفتاب احمد یا محمد شفیع یا عبد اللہ کی طرف سے ہوتی تو کسی کو رنج نہ ہوتا، ناظر کو میں نے خط لکھا تھا، خدا معلوم اُنہوں نے حضور کو دکھایا یا نہیں، ہم کو اُن سے بہت محبت ہے، اور اُن کا خلوص قابل قدر ہے، میرے خیال میں عمر کے ساتھ اُن میں پختگی بھی آئے گی اُنسی سنائی باتوں سے وہ بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں، اور خوفزدہ بھی ہو جاتے ہیں، اور دوسرے کو بھی خوفزدہ کر دیتے ہیں، میرا ذاتی تجربہ ہے مگر یہ فقط اُن کی نیک نیتی کی وجہ سے، مثلاً اگر مجھ سے ایک نہیں ۲۰ آدمی کہیں کہ مولوی سلامت اللہ صاحب سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہوئی ہے جو اُن کی شان کے زیبا نہ تھی اور ناروا تھی، تو حضور میں تو اُس وقت تک یقین نہیں کروں گا، جب تک خود بعد دریافت مجھ کو یقین نہ ہو جائے، اور بہمہ وجوہ اس کا جواب خود مولانا صاحب سے نہ حاصل کر لوں، اُس وقت تک ہر جگہ اُس کی تردید کروں گا، اور ہرگز اُن کو قصوروار نہ ٹھہراؤں گا یہی بات میرے نزدیک محمد علی میں بھی قابل اعتراض ہے طبیعت کے خلاف بات سُن کر فوراً بگڑ جاتا، ہاں خوف کا پتہ نہیں ہے، ناظر نے ضرور غلطی کی اور اُن کے عزیز دوستوں کو ان کی اول کی تقریر سے رنج نہیں ہوا جس قدر کہ اُن کی دوسری تقریر سے جو انہوں نے جلسہ سے اُٹھ آنے کے بعد کی تھی، یونیورسٹی کا کچھ نہیں بگڑا صرف اس کارروائی سے راجہ صاحب کی قدرے بدنامی ہوئی، ہندو اپنی یونیورسٹی سے ذرہ خوش نہیں ہوئے، اور یہ ہمارے حکام کی بدقسمتی ہے کہ جو چیز دیتے ہیں، وہ اس قدر بدمزگی کے بعد کہ اس کے دینے کا سب نتیجہ بیکار ہوتا ہے، اگر اس جنگ کے دوران میں لارڈ ہارڈنگ کو کسی متنازع فیہ معاملہ کو چھیڑنا نہ تھا تو اس یونیورسٹی کے معاملہ کو جھگڑا سے علیحدہ کر دیتے اور ہم کو اور ہندوؤں کو اُن کی خواہش کے مطابق یونیورسٹی دے دیتے، تمام لوگ خوش اور مطمئن اور ملک بھر میں واہ واہ۔ نہیں۔ یہ اصول تو افسوس حکام وقت کو پسند نہیں، ملک کی خواہش جائز خواہش دبائی جائے، اور پھر بھی تمام ملک میں اُن کی ناموری ہو، حضور یہ سب ناموری

ے تھا، محمدؐ کو بھی میری محبت نے خراب کر دیا ہے، بھائی الطاف کو سلام و پیار، میں نے اول سے ارادہ کر لیا تھا کہ صرف
تقاضوں پر ہی اُن کو ۸ روپیہ بھیجتا اب تو انہوں نے خود مجھ کو رہائی دی، انشاء اللہ یا تو اُن کو جب مجھ کو وہ اپنے مطبخ سے عمدہ
لیک بھیجیں گے جواہرات کے کھنڈولے عنایت کروں یا ایک نادہندمدت کی یاد چھوڑ جاؤں گا، عزیزی الیاس، نعطب پیارا
احسان سب کو پیار والدہ صاحبہ سلام کہتی ہیں،

حضور کا خادم شوکت علی،

اسٹیشن الہ آباد کا ایک واقعہ

(۱۶)

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۶ ر دسمبر ۱۵ء

قبلہ و کعبہ، السلام علیکم،

حضور کا تار پرسوں ملا تھا، اُسی دن کتابیں اسٹیشن سے منگالیں تھیں، ایک دو دن میں باقاعدہ درس شروع کیا جائے گا
خدا حضور کو جزائے خیر دے، کہ حضور ہمارے متزکیہ نفس کے لئے اس قدر تکالیف اور توجہ فرماتے ہیں، میں نے پرسوں بعد
تلاوت قرآن پاک شجرہ کو شروع سے آخر تک پڑھا، اُس کے آخر میں جو چند الفاظ حضور کے دست مبارک کے لکھے ہوئے تھے
جس میں ہمارے تائب ہونے کا تذکرہ تھا، اور یہ کہ حضور نے دعا دی تھی، کہ خدا ہم کو قوت دے کہ ہم فسق و فجور سے بچے رہیں،
ان الفاظ کا میرے دل پر نہایت گہرا اثر پڑا اور قلب میں از سر نو نئی قوت پیدا ہو گئی، خدا ہم کو توفیق دے کہ ہم روز محشر شرمندہ نہ
ہوں، اور اُس دن بجائے سیاہ رو ہونے کے سرخرو ہوں، اور اجر خیر پائیں، میرا خط مولانا سلامت اللہ صاحب کو مل گیا ہوگا
اس میں میں نے مفصل حالات سفر کے لکھے تھے، حضور نے ملاحظہ فرما لیا ہوگا، برادرم ناظرالدین حسن کو بھی محمد علی نے مفصل
خط لکھا تھا، الہ آباد میں صرف بدمزگی کا اظہار ہوا اور وہ بھی تھوڑا ہم سے اور زیادہ تر اُن بزرگان سے جو ہم سے ملنے آئے
تھے، افسوس ہمارے صوبہ کے حاکم ایسی غلطی کرتے ہیں، کہ ڈاکٹر ناظرالدین حسن، مسٹر وسیم، مسٹر ولایت علی، اور مسٹر
ظہور احمد، سید ظہور احمد صاحب، وغیرہ جیسے معزز حضرات کے ساتھ اسٹیشن پر وہ برتاؤ کیا جو ان حضرات کی توہین نہ تھی
تھی بلکہ خود گورنمنٹ پر ایک بدنما دھبہ تھا، جب ہماری شام کو وہاں کے کلکٹر مسٹر فری مینٹل سے ملاقات ہوئی، جو میرے
ملنے ملنے والے تھے، اور ان سے بھی کلکتہ میں ملے تھے، تو ہم نے صاف صاف اپنے خیالات کا اظہار کیا، اُن سے کہہ
دیا گیا کہ اس قسم کی، نازیبا حرکات کی وجہ سے گورنمنٹ کو اُس کے نالائق عہدہ دار بدنام کرتے ہیں اور مخلوق کے دلوں میں
نفرت کے خیالات پیدا کرتے ہیں، ریل کے افسر کو اُن کی گستاخی اور بدتمیزی سے آگاہ کر دیا گیا تھا، جو پونے کے پوری
افسر وہاں موجود تھے، اُن کو خود اُس ٹریفک سپرنٹنڈنٹ کی حرکت پر بہت غصہ آیا، بجائے بھیڑ کو کم کرنے کے تمام ریل کا اسٹیشن
پر بہت تھا، خدا معلوم ان لوگوں کی عقلیں کہاں گئی ہیں، اس زمانہ جنگ میں بجائے غیر معمولی سختی کرنے کے غیر معمولی خاطر و
مدارات کرنا چاہیئے تھا، جبل پور میں سب نے ہماری بہت خاطر کی اور یہاں پر بھی سب شرافت سے پیش آتے ہیں، ڈپٹی کمشنر

چھوٹی ہے، لارڈ کرزن جب ہندوستان میں تھے، بوجہ نام میں واہ واہ تھی، میکڈانل تھے اُن کی اُن کے زمانہ میں تعریف تھی، اُن کے جانے کے بعد ہر شخص اُن کو گالیاں دیتا ہے، آج کل کا اصول حکومت مجبور کرتا ہے، "مخلوق خدا" "از آشنہ مردک نام بد کار آمد بود"، جو لوگ اچھے اور نیک ہوتے ہیں اُن کا ہمیشہ نام چلتا ہے، لارڈ رپن کی آج تک تعریف، نوشیرواں کافر تھا، مگر مسلمان اور دیگر افراد اُس کی عزت کرتے ہیں، مجھ کو امید ہے کہ یونیورسٹی کے قضیہ کو ملتوی کر دیا جائے اور اس لیگ کو زندہ کیا جائے جس کو مارنے کی کوشش کرائی جاتی ہے، حضور۔ ہماری ناقص عقلیں اس تدبر کے سمجھنے سے قاصر ہیں لیگ زندہ رہے گی مگر کیسی بدمزگی ہوگی، آخر میں نتیجہ اس کا خود حکام کی بدنامی کا باعث ہوگا سب لوگ جانتے ہیں کہ کون پس پردہ ہے، ہم ملک اور امن کے دوست ہیں، اور ہم پر فرض ہے کہ صحیح حالات حکام کے گوش گذار کریں، چاہیں وہ ہم کو بجائے عزت دینے کے سزا دیں، مگر ہم انشاء اللہ اب سچ کہیں گے،

اس یونیورسٹی کے معاملہ میں حضور بے تعلق نہ رہیں، میں نے اپنے خط میں جو اجلاس یونیورسٹی میں پڑھا گیا تھا صاف صاف لکھ دیا تھا اور میں دعویٰ کرتا ہوں کہ مجھ سے زیادہ کسی کو اس کے اظہار کا حق حاصل نہ تھا، کیونکہ میں یونیورسٹی کی طرف سے پیغامبر بنا کر تمام ملک میں بھیجا گیا، گیا اور سینکڑوں تقریریں اُس کی تائید میں کیں تھیں، کہ یہ مسلم یونیورسٹی جرمنی کی طرح آلات حرب طیار کرنے اور سائنس کے تکملہ کی غرض سے نہیں قائم کی جاتی تھی، بلکہ "اشاعت دین حق" کے لئے۔ ہمارا منشا تھا کہ ہم موجودہ نام نہاد مسلمان سچے مومن ہوں، اور ہمارے تعلیم یافتہ "نور اسلام" کی مشعل سے تمام عالم کو منور کر دیں، کیا عمدہ نور ایمان ہوگا، جس کو جب چاہیں مسٹر ٹول یا بول یا گول بٹھا دیں، جہاں ایسے بااختیار اسلام کے بدنام کرنے والے ہوں جیسے ضیاء الدین، عبد اللہ، آفتاب احمد جو علماء دین کو خود مرکز تعلیم میں دین حق کی تعلیم اور قرآن پاک کی تلقین سے منع کر سکیں، مولوی سلیمان اشرف صاحب کی نظر بندی خدا معلوم کیسے بچ گئی، ٹول نے تو کالج کے آنریری سکرٹری کو نینی تال سے اطلاع دی تھی کہ وہ نظر بند کر دیئے گئے، اور کوئی دوسرا شخص اُن کی جگہ مقرر ہو، ہم ایسی ہی یونیورسٹی لیں گے، جس میں ہمارے علماء کرام تلقین دین بلا روک ٹوک کر سکیں، کیونکہ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہمارا دین "نقض امن" نہیں بلکہ "حفظ امن" کی اعلیٰ تعلیم دیتا ہے، انشاء اللہ یہ جنگ جلد ختم ہوگی اور اس کا خاتمہ بالخیر ہوگا، اُس وقت ہم کو ایسی یونیورسٹی حکومت ہند سے ملے گی، جیسی کہ ہم چاہتے ہیں، اور ہماری اس جنگ میں خدمات کا شکریہ کے ساتھ اعتراف کیا جائے گا، ایک لاکھ سال نہیں انشاء اللہ ۲۰ لاکھ سالانہ ملے گا، میری اس تحریر کے بعد حضور کو یقین ہو گیا ہوگا کہ میں بذات خود تفریق کو کچھ اہمیت نہیں دیتا، مضلی مامسفلی۔ محمد کو زیادہ صدمہ ہوا، کیونکہ اُس کو راجہ صاحب اور ناظر دونوں سے بہت محبت تھی اور ہے، اور قدرتی طور سے اُس کی ذرہ سی بھی چوٹ دل کو صدمہ دیتی ہے، تار حضور کو مل گیا ہوگا، جب مقام معلوم ہوگا حضور کو اطلاع دونگا، کل دوپہر ہم کو اطلاع ملی کہ ہم عنقریب کہیں بھیجے جائیں گے، اور ہم ۲ گھنٹہ قبل ہم کو مطلع کر دیا جائے گا، مقام نہ معلوم ہے، خدا معلوم ان مضحکہ انگیز رمزوں میں کیا بھید ہے، ہم کو جہاں حکم ملے گا ہنسی خوشی جائیں گے، اگر وہ جگہ اور زیادہ خراب ہوگی، تو قیود سخت ہوں گی، اور زیادہ خوشی ہوگی کیونکہ اس کا اجر ہم کو "احکم الحاکمین" کے یہاں سے بہترین ملے گا، دوست احباب عزیز نہ ہوں مگر ہمارا خدا ہمارے ساتھ اور احباب اور بزرگوں کی دعائیں، حضور دعا فرمائے جائیں، بفضلہ تعالیٰ دل اور ایمان اب تک خوب قوی، ہیں تو بلغمی مزاج ابتدا

صاحب جو ہمارے ہم ملک ہیں، نہایت قابل اور مدبر آدمی ہیں، اور ہماری بہت خاطر کرتے ہیں، اور لوگ بھی، حضور والا
خدا کا عجب کرم اور حضور کی دعا کا طفیل ہے کہ ہمارے آنے سے قبل ہی مخلوق کو ہم سے محبت تھی، اور ہندو مسلمان یکساں
جوق در جوق ملنے آتے ہیں، اور محبت کا اظہار کرتے ہیں، کسی چیز کی ضرورت ہو فوراً آجاتی ہے، اور ہر شخص کی یہ خواہش
ہوتی ہے کہ میں مہیا کروں کل بہت سے تعلیم یافتہ مرہٹہ وکلاء ملنے آئے تھے، نہایت درجہ اخلاص سے ملے، مسلمانوں
کی حالت عجیب ہے، بفضلہ تعالیٰ ہر ایک دل میں اسلام کی محبت موجزن ہے، اور نماز کا عام طور پر شوق ہو چلا ہے
قاضی عبد الکولی صاحب کی توجہ سے یہاں بہت پھیل گئی تھی، اُن کی روحانیت میں عجیب غریب اضافہ ہو گیا تھا، ہر ہندو
مسلمان جو اُن سے ملتا تھا، اُن کا ہو جاتا تھا، خاص کر عوام ہندوؤں کو اُن سے بڑی عقیدت مندی تھی، اُن کو یہاں سے
ہماری وجہ سے تبدیل کر دیا گیا، بتول کو جو یہاں سے ۸۰ میل پر ہے، خدا کو اس میں بھی بہتری کرنا منظور تھی، والدہ صاحبہ
حضور سلام کہتی ہیں، محمد علی کے گھر میں اور بچیاں اور زاہد دست بستہ آداب عرض کرتے ہیں، سامان کلکتہ اور بمبئی
منگایا گیا ہے، مگر ابھی نہیں آیا ہے، کل یہاں چیف کمشنر صاحب آئیں گے، ایک ہل کا افتتاح کریں گے، اور
پارٹی ہے، ہم کو بھی دعوت آئی ہے، میر الیھائی الطاف، احسان، الیاس، قطب میاں صاحب، جناب مفتی صاحب
کو سلام، میں بہت خوش ہوں، افسوس کوئی کہنے والا نہیں، کہ بغداد شریف ہمارے متبرک مقامات میں ہے، اور وہاں
ایسے بزرگ زیر خاک دفن ہیں، جن کی وجہ سے بغداد شریف کی فتح نہایت دشوار ہو گی، اور سخت نقصان کا باعث، مناسب
ہی تھا کہ اس خیال سے درگذر کی جاتی اور اور طرف توجہ کی جاتی، حضور غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ اس کے محافظ ہیں، جو
حکم خدا سے وہاں دفن ہیں،

حضور کا خادم شوکت علی،

میرا رجسٹری شدہ خط حضور کو لینڈس ڈاؤن سے ملا یا نہیں، شوکت،

مژدہ اے پیمانہ بردار خمستان حجاز

(۱۵)

چھنڈواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۱ر دسمبر ۱۵ء،

قبلہ و کعبہ، السلام علیکم،

حضور کا حکم نامہ آیا تھا، اس کو آنکھوں سے لگایا، حضور دعا فرمائیں کہ ہم کو روز محشر اور نیز دنیا میں شرمندہ ہونا نہ
پڑے کیونکہ ذاتی کمزوریوں کا مجموعہ موجود ہے، اور صرف فضل ایزدی ہی اُن کو بچا سکتا ہے، حضور کے خطوط سے
کو از حد تقویت ہوتی ہے، اور اور قوت ارادہ میں مضبوطی پیدا ہو جاتی ہے، حکیم صاحب کا خیال بالکل صحیح ہے، مجھ کو
بمبئی کے حالات معلوم ہوئے ہیں، سید منظور علی ابھی نہیں جا سکے ہیں، حکیم صاحب کا مستقل قیام بمبئی میں نہایت
مفید ہوگا، کیونکہ اُن کے اثر سے وہاں ہمارے کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی، حضور کا تار نہایت عمدہ اور

موزوں تھا، اور مجھ کو امید ہے کہ ذمہ دار افسر اُس پر پوری توجہ فرمائیں گے، اور اس مہم سے دست بردار ہوں گے، بلکہ ان مقدس مقامات میں جہاں ہر قطعہ زمین پر بزرگان دین دفن ہیں، اور جن کی وجہ سے وہ حصہ ملک متبرک ہو گیا ہے بھی اس کی ذلت گوارہ نہ کریں گے اور نہ مسلمان اس جگہ کی جنگ سے خوش ہونگے، حضور نے مسلمانوں کی طرف سے فرض ادا کر دیا کہ اُن کے سچے جذبات کا اظہار کر دیا، میرے خیال میں ہر ملک کے اور سلطنت کے بہی خواہ کا بھی فرض ہے کہ سچے حالات کا اظہار کر دے اور گورنمنٹ خود حضور کی ضرور ممنون ہوگی، خدا کرے کہ جلد حضور سلطان المعظم خلیفۃ المسلمین خادم الحرمین شریفین اور ہماری سرکار میں عزت کے ساتھ صلح ہو جائے، تاکہ اسلامی ممالک میں امن ہو اور تمام مسلمانان عالم اطمینان سے اپنے دین مقدس کی خدمت کی طرف متوجہ ہو جائیں، مسئلہ حج ڈاکٹر ناظر الدین حسن مسلم لیگ میں پیش کریں گے، اور کانگریس میں بھی پیش ہوگا، سر فیروز شاہ مہتا نے وعدہ کیا تھا کہ کانگریس کا فرض تھا کہ وہ اس تمام ہندوستان کے مسئلہ کو حل کرنے میں مسلمانوں کی مدد کرے، حضور کو تجویز کی نقل بھیجتا ہوں، یہ وہی ہے جو میں نے گورنر صاحب بمبئی سے بروقت ملاقات پیش کی تھی، اور جس کو انہوں نے پسند کیا تھا، یہ اس قدر معقول ہے کہ کسی کو اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رہتی، گورنمنٹ خود تمام والیان ملک اور امرا اور عام مسلمانوں سے درخواست کرے کہ وہ کوشش ہوگی، اگر مسلمان خود متفقہ کوشش سے ایک بڑی جہاز رانی کمپنی قائم کرے جو حجاج کے آرام کے لئے تھوڑے منافع پر اس تجارت کو اصول تجارت کے مطابق کرے، مگر کار خیر کی حیثیت سے، دوسرے دلال صرف سر برآوردہ اسلامی انجمنیں مقرر ہوں جو ہر طرح حجاج کی مدد کرے گی، اس طریقہ سے مسئلہ حج کا خاتمہ ہو جائے گا، اور تمام پریشانیاں اور بدگمانیاں رفع ہو جائیں گی، سالانہ رپورٹ ۱۳۳۲ھ میں صفحہ ۲۰۷ سے لے کر صفحہ ۲۴۴ تک میں نے مفصل طور پر تمام واقعات درج کئے ہیں حضور آج ہی ناظر الدین سے مل کر اُن کو ہدایت فرما دیں، اس مسئلہ پر تمام خیالات کے لوگ متفق ہونگے، محمد علی نے یہ تحریک باقاعدہ طور سے مسلم لیگ کے دفتر کو بمبئی بھیجدی ہے، اور یہ بھی کہ ڈاکٹر ناظر الدین حسن اس کو پیش کریں گے، مسٹر مظہر الحق صاحب اپنے ایڈریس میں بھی مسئلہ کا پورا ذکر کریں گے، میرا اسلام برادرم قطب میاں صاحب، بھائی الطاف، عزیزی احسان، اور ...... الیاس، صبغۃ اللہ کو فرما دیجئے گا، مولوی سلامت اللہ صاحب پر آج کل خاص کیفیت طاری ہے، اُن کی شاعری میری تقریر ہو گئی ہے، انسان آخر کب تک بک اٹھے:-

کیوں دل جلوں کے لب پہ ہمیشہ فغاں نہ ہو ÷ ممکن نہیں کہ آگ لگے اور دھواں نہ ہو،

حضور اگر راجہ صاحب سے ملیں تو ہمارا اسلام پہونچا دیں، ہم ان کے بہت ممنون ہیں، اور ان سے بہت محبت کرتے ہیں، یہ وقت خموشی کا نہیں ہے، بلکہ ہر مسلمان کی زبان پر (دل کے علاوہ) اللہ کا نام ہو، اقبال نے میرے ہی لئے لکھا تھا،

مژدہ اے پیمانہ بردار خمستان حجاز ÷ بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش
نغمہ پیرا ہو کہ یہ ہنگام خاموشی نہیں ÷ ہے سحر کا کارواں خورشید سے مینا بدوش،
آنکھ کو بیدار کر دے وعدہ دیدار سے ÷ زندہ کر دے دل کو سوز جوہر گفتار سے،

محمود آباد،

حضور کا خادم شوکت علی،

پڑھتا ہے جن کے معاملات ادرہم مسلمان مجبور ہیں، مجھ کو یقین ہے کہ میری تحریر کا بہت عمدہ اثر سب پر پڑے گا، یہ دونوں خطبہ کی کتابیں، اور تمام عبارت، یہاں کے ڈپٹی کمشنر مسٹر چینڈویس صاحب کو سنائیں، اُن پر بہت اثر پڑا، واقعی ایسے ہیں کہ جو کلام الٰہی کو پڑھے گا، متاثر ہوگا، حضور والا، مجھ کو ان معاملات کی ذرا بھی پرواہ نہیں ہے، فکر ہے تو اپنی کمزوریوں اور اپنے اعمال کی، حضور دعا خیر فرماتے رہیں، خدا کی امداد غیبی کا پورا یقین ہے، بفضلہ تعالیٰ دل میں پوری قوت ہے، بلکہ اور اضافہ ہوگیا ہے،

دعا کا طالب حضور کا خادم شوکت علی،

محمد علی کی علالت

(۱۷)

چھنڈواڑہ (صوبہ متوسط) ۱۷ مارچ ۱۶ء، — اللہ اکبر

قبلہ و کعبہ، السلام علیکم،

پرسوں حضور کو بڑا خط لکھ چکا ہوں، آج صرف اس وجہ سے لکھتا ہوں، کہ حضور کو مطلع کروں کہ محمد علی کا قارورہ کل سول سرجن نے دیکھا تھا، اور اس کا امتحان کیا، شکر زیادہ آتی ہے، اور تقریباً ۶ فی صدی ہے جو بہت زیادہ ہے، اس عرصہ میں پرہیز برابر جاری ہے، اور دوا بھی حکیم اجمل خاں صاحب کی پیتے ہیں، اس زیادتی پر تعجب ہے، ارنڈ خربوزہ ہی ایک معمولی چیز تھی، جو کھاتے تھے مجھ کو خیال تھا کہ اُس کی اجازت تھی اس لئے دیا جاتا تھا، اب اُس کو بھی بند کردیا، گو پھر ٹھیک معلوم نہیں کہ وہ بھی منع ہے یا نہیں، انشاء اللہ ۶ دن میں جب دوبارہ امتحان ہوگا، تو بہتر نتیجے کا اظہار ہوگا، میں حضور مطلع کروں گا، جنگاسوں میں داد ہو گئے ہیں، جو سخت تکلیف دہ ہے، اور وہ دو دن سے پلنگ پر ہی رہتے ہیں، اُٹھنے بیٹھنے میں تکلیف ہوتی ہے، حضور کو سلام عرض کرتے ہیں اور دعا کے طالب ہیں، اس عرصہ میں پریشان بھی رہتے تھے، اور میموریل وائسرائے بہادر کو بھی طیار کرتے تھے، خدا اپنا فضل کرے اور مزید حالات بعد کو لکھوں گا،

حضور کا خادم شوکت علی،

حکومت کی طرف سے مزید پابندیاں

(۱۸)

چھنڈواڑہ (صوبہ متوسط) ۳۰ مارچ / ۱ اپریل ۱۶ء، — اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم،

میں خود کئی دن سے خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا، مگر اطمینان قلب نہیں ملا تھا، کہ بڑا سا خط لکھتا اور معمولی خط لکھنے کو دل نہیں چاہتا خاص کر حضور کو، خدا کا شکر ہے کہ محمد علی کی ذیابیطس میں اول کی نسبت کمی ہے، شکر ۵ فی صدی آنے

نماز میں کیا پڑھتے ہو؟ انگریز کا سوال!

اللہ اکبر

چھنڈواڑہ (صوبہ متوسط) ۱۵؍فروری ۱۶ء،

قبلہ وکعبہ، السلام علیکم،

حضور کے دونوں خط بھائی کے نام آئے تھے، اُن سے خیریت مزاج والا کا حال معلوم ہوا تھا، اس عرصہ میں میں کاروباری خط وکتابت میں زیادہ مصروف رہا تھا، اس لئے بھائی کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ حضور کو تمام حالات سے مطلع کرتے، میرا خیال ہے کہ، چیف کمشنر صاحب ضرور اپنے ان احکامات کو جو انہوں نے غلط فہمی کی وجہ سے اور امور ان مذہبی سے ناواقفیت کے سبب سے اجرا فرمائے تھے، واپس لے لیں گے، ۳۰ دن ہوئے کہ مجھ سے دریافت کیا گیا تھا کہ بجواب میری مفصل تحریر کے جس میں میں نے تمام حالات درج کر دیئے تھے، اور یہ بھی کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے کسی طرح ان کی پابندی کا وعدہ نہیں کر سکتا، بعض اوقات امامت احکام فرض ہو جاتی ہے، اگرچہ نہ تو مجھ کو امامت کا شوق ہے اور نہ میں اپنے آپ کو اس ممبر خانہ خدا میں چڑھنے کے قابل پاتا ہوں، جس پر ہمارے رسول مقبول صلعم اور صحابہ کرام اور دیگر بزرگان اسلام کھڑے ہو کر خطبہ پڑھتے تھے، اس گئے گزرے زمانہ میں بھی علماء کرام اور دیگر نیک بزرگ اس پر چڑھنے کی مشکل سے ہمت کر سکتے تھے، نہ کہ میں جو ایک ناچیز جاہل اور گنہگار مسلمان ہوں، جو بمشکل نماز اور دیگر فرائض کی ادائیگی کی کوشش کرتا ہوں، مگر تاہم میرے اور میرے خدا کے معاملات میں تیسرے شخص کے احکام کی گنجائش نہیں ہے، اور میں مجبوراً ایسے احکامات کی جن کا تعلق مذہب سے ہو اور جو خلاف حکم شریعت ہوں تعمیل نہ کر سکوں گا، مجھ کو یقین کامل تھا کہ چیف کمشنر صاحب بہادر ہرگز دیدہ ودانستہ کسی کے مذہب میں دست اندازی کرنا پسند نہ فرمائیں گے، اب مجھ سے دوبارہ دریافت کیا گیا کہ میں نے نماز میں کیا پڑھا تھا، سکے جواب میں میں نے پورا خطبہ بھیجدیا اور اس میں، اس حصہ کا ترجمہ بھی بھیجدیا جس کا تعلق حضور سلطان المعظم خلیفۃ الرسول خادم الحرمین الشریفین سے تھا، تاکہ اُن کو معلوم ہو جاتا کہ مسلمان کس طرح سے اپنے خلیفہ کیلئے دعا مانگنے کے عادی ہیں، یہ کتاب خطبوں کی میری ملکیت نہ تھی بلکہ ملکیت مسجد تھی، اور تقریباً ۳۰ برس ہوئے کہ طبع ہوئی تھی، میں نے جو نماز میں قرآن پاک تلاوت کیا تھا، وہ بھی مع ترجمہ کے لکھ دیا، اول رکعت میں سورہ بقر میں سے یا ایہا الذین امنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ اور دوسری میں "لا یستوی اصحاب الجنۃ واصحاب النار" دعا میں نے وہ پڑھی جو ہر روز پڑھتا ہوں، اسلام کی ترقی، اُس کے دشمنوں کی تباہی، کفر کا دنیا سے غائب ہونا، مسلمانوں کو قوت ایمان کا نصیب ہونا، دین کی راہ میں ہر ایک کو توفیق ہونا کہ وہ جان، مال، وقت، قابلیت سب کچھ خوشی سے صرف کرے، حضور سلطان المعظم خلیفۃ الرسول کے لئے دعا کہ خدا اُن کی مدد فرمائے، اور اُن کے مرتبہ میں ترقی کرے اعلیٰ کر سلطان کے لئے دعا، وہ دعا جو ہمیشہ مانگتا رہا ہوں، خطبہ کی دوسری کتاب بھی تھی جس میں سے یہاں اکثر خطبہ مع اردو تر[illegible] پڑھا جاتا تھا، اس میں تو ۲۷ صفحہ سلطان المعظم اور خلیفۃ الاسلام کی تعریف میں، اور کفار کی مذمت میں تھے، مجھ کو [illegible]تاب نہیں ملی تھی ورنہ اسی

سے مجھ کو تعجب ہوا تھا، کیونکہ گذشتہ دو ماہ سے سخت پرہیز کیا گیا تھا، صرف ایک اجنبی پھل تھا جس کی نسبت ہم کو پورا یقین
نہ تھا کہ اُس کی اجازت تھی، "ارنڈ خربوزہ" جو یہاں کثرت سے ہوتا ہے، خیال تھا کہ وہ مفید ہوگا، اُس کو بھی فوراً بند کر دیا گیا
اول ہفتہ میں شکر ۶½ فی صدی آگئی، اور کل کے امتحان میں ۵ فی صدی، خدا سے امید ہے کہ کچھ عرصہ میں وہ بالکل جاتی رہے گی،
اُس غریب کے پرہیز کو دیکھ کر رنج ہوتا ہے، مگر کھانے پینے کی چیزوں کی تو ہم احتیاط کرسکتے ہیں، بیرونی پریشانیوں کا دفعیہ
مشکل تھا، ایک تو ویسے ہی قلب مسلم کے لئے آج کل ایک لمحہ آرام کا نہیں ہے، اُس پر اور اضافہ ہو جانا تکلیف کا باعث
ہوتا ہے، بعض اوقات تو ایسی غلطی کی جاتی ہے کہ خاموشی سے خود ایمان میں فرق آتا ہے، ویسے خدا کا شکر ہے کہ اب زیادہ
خط و کتابت کرنا نہ پڑے گی، نئے ڈپٹی کمشنر اب ہم سے واقف ہوگئے ہیں، اور یہ بھی کہ ہم قانون کے پابند ہیں، مگر اس کے
ساتھ تمام قانونی چارہ سازیوں کو کام میں لائیں گے، اور خلاف قانون احکام پر متوجہ نہ ہوں گے، بفضلہ تعالیٰ قوت
ایمان اب تک تو کمی نہیں ہے، آئندہ کے واسطے حضور دعا فرماتے رہیں، خدا ہم سے کوئی کام خلاف نہ کرائے، جس سے
ہمارے دین کی کمزوری ہو، حضور سے دعا کا طالب ہوں کہ ذاتی کمزوریاں خدائے برتر دور کرے، ہم لوگ انشاء اللہ
العزیز کوشش کریں گے کہ صبر و تحمل کے ساتھ زندگی بسر کریں، خط و کتابت کے بارے میں یہ فیصلہ قطعی نہیں ہوا کہ کوئی
خط و کتابت خانگی تھی، علی گڑھ وغیرہ کے معاملات پر اجازت ہے، مگر مسلم یونیورسٹی کی نسبت نہیں، "خدام کعبہ" پر خط و
کتابت میں نہیں کرسکتا کیونکہ اُس کو یہ حضرات پولٹیکل کہتے ہیں، میں نے بھی عرض کر دیا کہ نفس "خدمت کعبہ" سے تو میں
کسی وقت بے تعلق نہیں ہوسکتا، رہا انتظامی امور میں مشورہ دینا تو اُس میں اپنے دوری کی وجہ سے ویسے بھی مجبور تھا
اور بفضلہ تعالیٰ اُس کے خواہاں بہت موجود ہیں، ہم نے خود ہی تا اختتام جنگ اپنے کاروبار کو کم کر دیا ہے، مگر اس مقدس
اور قابل قدر کام کو پولٹیکل ٹھہرانا ایک نہایت تعجب انگیز امر تھا کل کو نادان لوگ فقط غیر واقفیت کی بنا پر قرآن پاک
کو پولیٹکل کہہ دیں گے، مذہبی امور کی ہم کو پوری آزادی ہے، اور اُس پر ہر طرح کی خط و کتابت کرسکتے ہیں، جس مسئلہ میں
انتشار قلب ہوگا حضور کی طرف رجوع کروں گا، کچھ دنوں سے مجھ کو اس کی بڑی خواہش ہوگئی ہے کہ خدا ایسا سامان کر دے
کہ چند دنوں کے لئے حضور کی خدمت میں رہتا مگر صرف تزکیہ نفس کی طرف متوجہ ہوتا تاکہ اُس کے بعد دنیاوی معاملات کو پورے
انہماک کے ساتھ کرتا، مگر اصلی غایت اور غرض اعلائے کلمۃ الحق ہوتی، انشاء اللہ جلد وہ وقت آئیگا، ہم لوگوں نے درخواست
دی ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے جلسہ میں شرکت کی اجازت دی جائے، جواب تقریباً تو معلوم ہے، مگر زیر قانون ایک دفعہ ہے
جس کا ہم نفع اُٹھانا چاہتے ہیں، آج برادرم مسٹر سجاد حیدر آئے اور اُن سے مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی، محمد علی اور وہ
ہم درجہ تھے اور بہت عزیز دوست، کل معاملات پر بہت دلچسپ گفتگوئیں ہوئیں، ہم کو بڑا اندیشہ افتراق کا ہے، اس
وقت ہم سب میں محبت اور میل کا تھا تاکہ سب مل کر دین مقدس کی خدمت کرسکتے، اور کچھ مدد نہیں کرسکتے تھے، بوجہ مجبوری یا
اور غیر استطاعت کے تو کم از کم اپنے گھروں، مسجدوں، خانقاہوں میں بڑے عجز و انکسار کے ساتھ باری تعالیٰ کی بارگاہ
میں دعائیں مانگتے کہ وہ ہم مسلمانوں کو مع الخیر والایمان اس زمانہ ابتلاء سے نکالتا، ان مو[illegible]قلی میں اضافہ کرنا گناہ عظیم ہے
خدا ہم سب کو توفیق دے کہ ہم خدمت دین کرسکیں، حضور کو علم ہے کہ ہم کو رابعہ صاحبہ [illegible]س قدر محبت ہے، اور علی الخصوص

محمدؐ علی کو، جس بات کا اُس کو صدمہ ہے وہ یہ ہے کہ عزیز دوستوں میں ایک تفرقہ کھڑا کیا جاتا ہے، جس سے دونوں کا نقصان ہے، اور ہمارے دشمن فائدہ اُٹھائیں گے، اس وقت مذاق اڑاتے ہیں، اور یہ شعر پڑھا جاتا ہے:۔

ہر چہ دانا کند کند ناداں ٭ لیک بعد از خرابی بسیار

خدا دانا اور بینا ہے، کہ ہم سب مسلمانوں کی فلاح اس وقت اور ہمیشہ محبت اور اتفاق میں ہے، مگر اُس کے آ[ثار] نظر نہیں آتے، کیونکہ جس سے محبت اور مدد کی امید تھی، وہی سب سے زیادہ مضر ہے، حضور اس بلا کو قوم اور مسلمانوں [کے] سر سے ٹالیں، میں جانتا ہوں کہ حضور کی مدد مانگی جائے گی، اور بغیر حضور کی مدد کے کامیابی ناممکن ہے اور خدا [سے] یہ بھی امید ہے کہ وہ مدد انشاء اللہ نہیں ملے گی، کیونکہ اس وقت کوئی ایسا کام جس کا یقینی نتیجہ توہین اسلام ہو یا مسل[مانوں] کے ایمان کو کمزور کرنے والا ہو اُس میں حضور کی شرکت ناممکن ہے، کم از کم اس معاملہ میں خدا کا شکر ہے کہ ہم پر کوئی الز[ام] نہیں آسکتا، خدا ہم سب پر اپنا فضل کرے، محمدؐ علی کے بچے اور گھر میں علیل ہیں، بخار اور جاڑہ اور زکام ہے، نوکر [بھی] سب بیمار پڑے ہیں، حضور دعا فرمائیں، والدہ صاحبہ کے چوٹ زیادہ آئی تھی، اب تک اشاروں سے نماز ادا کر[تی] ہیں، مگر خدا نے بڑا فضل کیا، غالباً ۶ یا ۷ اپریل تک رامپور سے روانہ ہوں گی، ہم تو ہر وقت دست بدعا ہیں کہ خ[دا] اسلام کی برتری کرے، برادرم الطاف پر خدا رحم فرمائے، اُن کو آج خط لکھتا ہوں،

حضور کا خادم شوکت علی،

محمدؐ علی کا ذکر

(۱۹)

چھنڈواڑہ (صوبہ متوسط) ۵/اپریل ۱۶ء، — اللہ اکبر

قبلہ و کعبہ، السلام علیکم،

ہم تو خدا سے چاہتے تھے کہ بھائی احسان یا کوئی اور دوست حضور کا یہاں ملے تو اُس سے دل کھول کر باتیں کر[یں] اس لئے احسان بھائی سے مل کر دل از حد خوش ہوا، اور یہ وقت نہایت پر لطف گفتگو میں صرف ہوا، اُن سے حض[ور] کو تمام حالات کی اطلاع ملے گی، یہاں کے آنے کی نسبت سب کو طرح طرح کی غلط فہمیاں ہیں، جو احباب آنا چاہیں ہم کو ایک ہفتہ قبل اطلاع دیدیں ہم ڈپٹی کمشنر صاحب کو مطلع کر کے اُن کی اجازت لے لیں گے، اور احباب کو [مطلع] کردیں گے، کسی قسم کی دقت اور دشواری نہ ہو گی، جہاں تک ہم کو علم ہے، گورنمنٹ کا منشا نہیں ہے کہ ہمار[ے] پاس اعزہ اور احباب کے آنے کو روکیں،

اس یونیورسٹی کے بارے میں حضور کو ہماری رائے کا علم ہے، محمدؐ علی ضدی آدمی ہرگز نہیں ہے، مگر دل کا کم[زور] بھی نہیں ہے، کہ خواہ مخواہ فرضی یا اصلی خوف کے قصوں اور فسانوں سے متاثر ہو کر راہ حق چھوڑ دے، اس نے ا[پنی] بھی رائے تحریر کر دی ہے، اور برادرم احسان اُس کا ترجمہ حضور کو سنا دیں گے، میری ذاتی رائے کا حضور کو علم ہے

بھاری کاردان ہوں گے، مجھ کو از حد خوشی ہوگی اگر وہ حضور کی قدم بوسی کا موقع پا سکیں گے، اس مسئلہ یونیورسٹی میں حضو
نے راجہ صاحب کو بچایا، اُمید ہے کہ وہ آئندہ مشکلات میں بغیر سوچے سمجھے نہ کود پڑیں گے، مولوی عطا محمدؐ صاحب
کا خط بھیجتا ہوں، وہ قابل امداد ہیں، بڑے نیک آدمی ہیں، حضور اُن کو بلوالیں تو بہتر تھا، حضور کو اختیار ہے، میرا ابرا
الطاف، احسان، عزیزی الیاس، قطب میاں صاحب اور تمام احباب اور اعزہ کو سلام اور پیار، محمدؐ اور معظ
سلام عرض کرتے ہیں، محمدؐ علی کو ہم سب نے خراب کر دیا ہے، اس کی خاطر داریاں کر کر کے، حضور بھی اس کی بہت
خاطر کرتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ گستاخ ہو گیا ہے، گو حضور کا سچا خادم ہے،

حضور کا تابعدار شوکت علی،

"جان و مال حاضر ہیں"

چھنڈواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۸/ اپریل ۱۹۱۶ء، (۲۱) اللہ اکبر

اُنہیں ہے عقل جو محتاج غیر ہے ہر دم ؛ مجھے ہے عشق کہ جو خود ہے مدعا میرا
غرور اُنہیں ہے تو مجھ کو بھی ناز ہے اکبر ؛ سوا خدا کے سب اُن کا اور خدا میرا

حضور والا، السلام علیکم،

والدہ صاحبہ مع پورے کاروان کے پرسوں شب کو یہاں پہونچیں، وہ کمزور ہیں، مگر اُن کی ہمت دیکھ کر ہم
شرم آتی ہے، میرا کل دن بھر باوجود روزے کے بچوں کے ساتھ کھیلنے اور اُن کے مقدمات کے تصفیہ میں گذرا، حضو
کی خیریت مزاج دریافت فرما کر دل کو خوشی ہوئی، میں اور میرے تمام حضور پر قربان ہوں، خدا حضور کو زندہ اور سلام
رکھے، حضور سے ہماری تقویت ہے اور اسلام کا مرتبہ اس خراب زمانہ میں قائم ہے، خدا کی قدرت اب نظر آتی ہے، با
تعالیٰ کس کس طریقہ سے ہم لوگوں کو متوجہ کرتا ہے، اور بیدار، ان آلام اور مصائب کی وجہ سے دل میں اس قدر قوت آ
جاتی ہے کہ دل خوش رہتا ہے، جو اس کی مرضی ہوگی وہی ہوگا، مگر انشاء اللہ تمام امور دین کی بہتری کے لئے ہوں گے، عجب
تماشا دنیا میں نظر آتا ہے، بس اب تو یہی دعا ہے کہ خدا ہمارے ایمانوں میں تقویت دے اور ہم کو توفیق دے کہ ہم خدمت
دین کر سکیں تبلیغ اسلام کا کام انشاء اللہ بعد از جنگ نہایت اطمینان اور طاقت سے کریں گے، اور تمام دنیا کو نور اسلا
سے روشن کر دیں گے، حضور مجھ کو جلد جلد خط لکھتے رہیں، والدہ صاحبہ اب آگئی ہیں، انشاء اللہ نمازیں اور زیادتی اور آ
ہوگی، کیونکہ تہجد کو اُن کی بغیر حاضری میں کوئی جگانے والا نہ تھا، وہ اور سب حضور کو دست بستہ سلام عرض کرتے ہیں، محمدؐ علی
خط لکھتا ہے مگر چونکہ اُس کا خط تو ایک دفتر ہوتا ہے اس لئے کل کی ڈاک سے پڑے گا، میں آج کل بہت خوش ہوں، اور
حضور کا خط آجاتا ہے تو دل کو اور تسکین ہوتی ہے، اجمیر شریف تو غالباً حضور ضرور جائیں گے، کاش کہ میں بھی اُس گروہ
ہمراہ ہوتا، انشاء اللہ حجاز کو ساتھ جانے والوں میں ہونگا، میری چچی صاحبہ جو عربی نژاد ہیں ابھی حجاز سے ہم برس کے بعد

مانع ہیں، ہم کو اس وقت تمام کام چھوڑ کر اپنے ایمان کی درستی اور قائم رہنے کی فکر چاہیئے، ان قصبوں کا ایسے وقت چھیڑنا غریب مسلمانوں کے زخمی دلوں پر نمک پاشی ہوگی، اور وہ ضرور برہم ہوں گے، اور چھیڑنے والوں کی طرف سے بدظن، یہ تحریری رائے ہے مگر اگر خدانخواستہ کسی وجہ سے حضور اس معاملہ میں . . . . کاغذ غائب . . . . اسلامی نقصان گوارہ کریں اور افتراق دور کرنے کے لئے سر کٹوانے میں ہار گریں، تو ہم حضور کو تنہا آرائش میں جانے جانے دیں گے، بلکہ دیدہ و دانستہ حضور کے ہمراہ جائیں گے، اور اپنا فخر سمجھیں گے کہ حضور کے ہمراہ تھے، اس لئے جس وقت حکم ملے گا، فوراً بذریعہ تار مطلع کریں گے، کہ جیسی یونیورسٹی ملے اُسے فوراً لے لو، بلکہ خود یہ خط اور اس کا آخری حصہ کافی ہوگا، حکم کی تابعداری سے انشاء اللہ کسی وقت دریغ نہ کریں گے، اگر عرض حال کر دیں گے، اگر اجازت ہوگی حضور کو ہر وقت اختیار ہے کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، حضور بغیر اطلاع کے میری طرف سے جو وعدے چاہیں دیدیں، اور مجھ کو اس حکم کی اطلاع دیں،

حضور کا خادم شوکت علی،

سنسری زیادتیاں

(۲۰)

چھنڈواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۳ر اپریل ۱۶ء،

قبلہ وکعبہ، السلام علیکم،

پرسوں حضور کو خط لکھا تھا، مگر نامعلوم کسی وجہ سے ہمارے اردو کے سنسر نے اُس کو پاس کرنے سے انکار کر دیا، فضول خط وکتابت کرنا میں نے بیکار سمجھا، اس لئے اُس کے بجائے آج دوسرا لکھتا ہوں، معظم علی صاحب بانکی پور سے آئے ہوئے ہیں، کل دن بھر اُن سے لطف صحبت رہا اس لئے نہ لکھ سکا، معافی کا خواستگار ہوں، مولانا سلامت اللہ صاحب کے خطوں سے مسلم یونیورسٹی کے جلسہ کے حالات معلوم ہوئے، اُن کی شوخ تحریر سے میرا دل ہمیشہ خوش ہو جاتا ہے، خدا اُن کی زندہ دلی کو قائم رکھے، بلکہ اُس میں اور اضافہ ہو، حضور کو معلوم ہے کہ میں ان معاملات کو ضروری تصور کرتا ہوں مگر یہ وقت ہم پر سخت تر ہے اور صرف بارگاہ الٰہی میں دعا اور عجز و انکسار کا ہے، تاکہ وہ ہماری مدد کرے، اور اسلام کی بہتری اور برتری ہو، برادرم حسرت موہانی کے حالات سے دل کو صدمہ ہوا، وہ ہمارے عزیز ہیں، اور ہم پر اُن کی مدد فرض ہے خاص کر اُن کی بیگم صاحبہ کی جو ہماری بہین اور عزیز ہیں، چونکہ مسلمان ہیں اور اُن کا اسلام مضبوط ہے اس لئے اُن کا دلیر ہونا لازمی تھا، وہ تمام مصائب کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کریں گے، مگر ہم سب پر اُن کی مالی اور ہر طرح کی امداد فرض ہے، محمد علی نے تو کل اُن کو خط لکھ دیا، بجواب بیگم حسرت صاحبہ کے خط کے، مجھ سے ہمیشہ سے اُن کی خط وکتابت تھی، والدہ صاحبہ غالباً کل رات کو یہاں آئیں گی، انشاء اللہ حضور سے ملنے کو لکھنؤ اُتریں گی اگرچہ بچے وغیرہ بڑے

محمد علی کا ایک خط

(۲۳)

چھندواڑہ ۳۰ مئی ۱۹۱۶ء،

حضور اقدس، السلام علیکم،

عرصہ سے حضور کی خدمت میں کوئی عریضہ نہ لکھ سکا، کچھ تو علالت کچھ کاہلی اس کا باعث ہوئیں، شکر کا عجب حال ہے، میں نے حکیم اجمل خاں صاحب کی دوا ترک کر کے یہاں کے سول سرجن صاحب کا علاج شروع کر دیا تھا، اس سے بقدر فائدہ ہوا کہ شکر ۵½ سے ۲½ فی صدی تین سے چار ہی روز میں رہ گئی، مگر دوا نہ رہی، دہلی سے تار دے کر منگائی، اس عرصہ میں پھر شکر ۶ فی صدی ہوگئی، اب دوا آگئی ہے، سول سرجن صاحب ہی کا علاج ہے، پیشاب کی مقدار کم ہو گئی ہے، جو مرض کی کمی کی نشانی ہے، آئندہ جمعہ کو قارورہ پھر بھیجوں گا، تاکہ شکر کی مقدار معلوم ہو جائے، یہاں اسہال کی سخت پڑی جس سے مرض بڑھ گیا اور دو بار حرارت بھی ہوگئی، اس خوف سے کہ مبادا انتقال قیام اس کو ردہ سے بھی بدتر بلکہ کو نہ کر دیا جائے، (جیسا کہ اب تک تجربہ ہوا ہے) میں نے یہیں گرمیاں گذارنا مناسب سمجھا، ۔۶۔ از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است، کیا عجب ہے کہ اس صبر کے باعث میرے دوزخ میں سے چند انگارے کم کر دیئے جائیں، گو اُس پاک پروردگار سے جو گناہوں کا بخشنے والا ہے امید ہے کہ بطفیل رسول اکرمؐ دوزخ کی آنچ کو ہم پر حرام فرما دیگا، خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جو افواہیں حضور اقدس کے متعلق دشمنوں نے اُڑائیں تھیں، اُن کا نتیجہ سوائے اُن کے نقصان کے کچھ نہ نکلا، یہ وہ ہوائی غبارے ہیں، جو ہوا کا رُخ اور اُس کی تیزیٔ رفتار جانچنے کے لئے کبھی کبھی چھوڑے جاتے ہیں، اُن کا جواب وہی استقامت ہے، جو ہر مسلمان کا شیوہ ہونا چاہیئے، کاش ہم بھی حضور کی سی استقامت حاصل کر سکیں، ہمارے نبی صلعم اُن کے اصحاب پاک اور اہل بیت نے ہمارے لئے اپنے نقش چھوڑے تھے، مگر امتداد زمانہ کے باعث اور اندرائی کم ہمتی سے ہم نے وہ نقوش اپنے دلوں سے محو کر دیئے تھے،

(یہ خط مولانا محمد علی صاحب کا لکھا ہوا ہے، صرف ایک ورق ہے، باقی حصہ غائب ہے)

کچھ ذاتی مسائل

(۲۴)

چھندواڑہ ۳ جون ۱۶ء، اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کا حکم نامہ ملا تھا، اس عرصہ میں حضور کو یہاں کے سب حالات معلوم ہو گئے ہوں گے، محمد علی کا خط بھی پہونچا ہوگا، نئی دوا سے اُن کو فائدہ محسوس ہوتا ہے، کل کو قارورہ کا پھر امتحان ہوگا اور خدا سے امید ہے کہ نتیجہ مفید ہوگا، پارسل مل گئے تھے، آم تو عمدہ آئے، مگر خربوزے خراب ہو گئے تھے، راستہ میں ۲ سیر خرا بھی لئے گئے، آم بہت مزے دار تھے،

ئی ہیں، اُن سے وہاں کے قحط کا حال معلوم ہوا مگر وہ لوگ بڑے بہادر اور ہمت والے ہیں، عورتوں کا صبر و شکر اور مضبوطی دیکھ کر ہم شرماتے ہیں،

حضور کا خادم شوکت علی،

ہم لوگ کس قابل ہیں، مگر جان و مال حاضر ہیں، جس وقت درکار ہو، خدا حضور کو زندہ اور سلامت رکھے، (شوکت)

سر سٹن گورنر یوپی

(۲۲)

اللہ اکبر

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۳ مئی ۱۹۱۶ء،

حضور والا، السلام علیکم،

خیریت مزاج کا تار ملا کر طبیعت کو اطمینان اگرچہ فکر اور پریشانی ہم کو ذرہ نہ تھی، کیونکہ خدا ہر وقت نگہبان اور محافظ ہے اور اس کے ہوتے ہوئے خواہ مخواہ فکر کرنا سراسر ناشکری تھی، اس لئے میں تو جہاں تک ممکن ہوتا ہے، دل کو بات نہیں لگاتا ہوں، اور جو کام میرے ضمیر کے نزدیک اچھا ہوتا ہے، اس میں کوشاں ہوتا ہوں، کامیابی اور غیر کامیابی خدائے برتر کے ہاتھ میں ہے، مگر اتنا ضرور کہونگا کہ حضور کے مرتبہ کے بزرگوں کی نسبت اس طرح کی لغو اور بیہودہ افواہوں کا اُڑانا نہایت نقصان پہونچانے والا تھا، اور مشتہر کرنے والا مستحق سزا تھا، لاکھوں نفوس کے دلوں اور مذہبی جذبات کو صدمہ پہونچا، دشواریوں کا پیدا کرنا تھا، محمد علی کی طبیعت اس ہفتہ اچھی رہی شکر میں کمی ہو کر ۲½ فی صدی، رہ گئی، اور آئندہ امید ہے کہ بالکل جاتی رہے گی، اس عرصہ میں میں خطوط بالکل نہ لکھ سکا، اول تو بچے یہاں تھے، اُن کے مقدمات سے فرصت نہ تھی، دوسرے خلیق الزمان صاحب اور علی گڑھ سے مسٹر شعیب قریشی اور مسٹر عبد الرحمن آ گئے، ان سے تمام دنیا کی باتیں ہوتی تھیں، خلیق صاحب تو غالباً اس عرصہ میں اپنے وطن رہیں گے، اور حضور سے ملے ہوں، مخدومی و مکرمی جناب مولانا سلامت اللہ صاحب کو بھی خط نہ لکھ سکا، انشاء اللہ کل لکھوں گا، اُن کا آخری پوسٹ کارڈ ہمارے سنسر صاحب نے ہم کو اطلاع دی کہ گورنمنٹ متوسط نے سر جیمس سٹن کو بھیجدیا، یہ نہایت اچھا اور مناسب ہوا تاکہ صوبہ کے بڑے افسر کو مسلمانوں کے اصلی اور سچے جذبات کا علم ہو جائے جو ان کے اپنے مذہبی پیشواؤں کے ساتھ ہیں، مجھ کو یقین کامل ہے کہ وہ اگر تدبر سے کام لیں گے تو ایسے مفسدوں کو جو جھوٹی خبریں اُڑا کر ملک میں بدامنی اور بے چینی پیدا کرنا چاہتے ہیں، سخت سزا دیں گے، والدہ صاحبہ حضور کو اور تمام گھر کو سلام اور دعا کہتی ہیں، میرا سلام مولانا سلامت اللہ صاحب، برادرم احسان، الطاف، الیاس، اور مولوی عنایت اللہ صاحب سے فرما دیجئے گا، قطب میاں صاحب کو سلام مسنون ہم لوگ خوب تندرست ہیں، گرمی ۲ دن سے بہت تھی، جو یہاں کیلئے غیر معمولی تھی، رات کچھ آندھی آئی تھی اور کچھ بوندا باندی بھی جس سے ٹھنڈک بھی ہوگئی، ہم لوگ ہر وقت دست بدعا ہیں، محمد علی بہت سست ہوگئے ہیں، کل حضور کو ضرور خط لکھیں گے، جب دل چاہتا ہے تو کچھ شاعری کر لیتے ہیں، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا ایک شعر اخبار میں دیکھ کر بہت بیتاب ہوگئے اور اس پر غزل لکھی، جو حضور مولانا سلامت اللہ صاحب کو دے دیجئے گا، عجیب طبیعت پائی ہے،

حضور کا خادم شوکت علی،

ن کا مقدس تھا اس کی بے حرمتی کرتا ضرور ہمارے اعتقادات کی رو سے خرابی کا باعث ہوگا، یہیں اسی وجہ سے بعد د
کے قریب کی لڑائی سے پریشان تھا اور لینڈ ڈسٹاون میں اپنے سب ملنے والے انگریز دوستوں کی توجہ مبذول کی تھی
متبرک جگہیں جن کا دین سے تعلق ہے اور ان کی حرمت فرض تھی، متعدد ایسے واقعات رامپور اور اور جگہ دیکھے
کہ علم ہو جانے پر بے حرمتی کی گئی ہے ان جگہوں کی جو کسی بزرگ کے نام کے وابستہ تھیں اور کسی نہ کسی طرح اس گھر
کے نام رہنے والوں پر مصیبت ناگہانی آئی، حال کا واقعہ نواب بشیر الدین احمد خاں صاحب کے بھائی کا حیدرآباد میں
یں کا حضور کو پورا علم ہوگا کیونکہ اُن کا انتقال غالباً لکھنؤ ہی میں ہوا تھا کہ باوجود منع کرنے کے زعم حکومت میں لوگوں کا
ینا نہ مانا اور اس مخصوص جگہ اجلاس کرنے کا چبوترہ بنایا۔ نواب صاحب مجھے بیان کرتے تھے کہ اول دن سے
جلاس کے بعد وہ یکایک اس نئے مہلک مرض میں مبتلا ہو گئے جس کے باوجود علاج کے وہ جاں بر نہ ہو سکے،
فرنگی محل تو سیکڑوں برس سے بزرگوں کا مخزن رہا ہے باوجود آج کل کی تعلیم کے ہمارا بحیثیت مسلمان پختہ اعتقا
ہے کہ اس قسم کی دینی بے حرمتی ہمیشہ زوال اور ذلت کا باعث ہوتا ہے۔ بزرگان دین کے حضرت نظام الدین
اولیاء رحمۃ اللہ علیہ اور کسی بادشاہ دہلی کا (غالباً کوئی تعلق تھا) واقعہ مشہور تھا کہ وہ حضور کی تباہی کا سامان کر رہا
تھا اور نہایت درجہ گستاخ تھا کہ آپ کو غصہ آگیا اور جس دن وہ کاٹھ کا نیا دروازہ جس کو اُس نے بڑے شوق سے تیار
کرایا تھا اول مرتبہ مکمل ہوا دیکھنے گیا تو وہ یکایک گر گیا اور اُس کے نیچے وہ مر گیا اس وقت بہت لوگوں نے حضور کو
دیکھا کہ غصہ میں ٹہل رہے تھے اور زبان پر یہ شعر تھا۔

اے روبہک چرا توکستی بجائے خویش ⁂ باشیر پنجہ کردی دیدی سزائے خویش

خدا کے نیک بندوں سے گستاخی کرنا اور اُن کی دل آزاری ہمیشہ نقصان کا باعث ہوتی ہے، خدا حضور کو زندہ و
سلامت ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ دعا میں حضور ہم کو ضرور یاد فرما لیا کریں، انگھوٹے کے درد سے فکر ہو گئی ہے خدا کرے
معمولی اور عارضی ہو، مولانا مولوی سلامت اللہ صاحب کو کل خط لکھ چکا ہوں، میری اور اُن کی خط و کتابت کا معاملہ دوسرا
ہے جب دل چاہتا ہے لکھتا ہوں واقعی خفگی جائز تھی مگر میں معذور تھا یہاں موسم نہایت ..... در ہے رمضان
قریب ہے ورنہ حضور کو تکلیف دیتے مگر ایک بار کے دیدار میں سیر ہی نہیں ہوتی، انشاء اللہ جلد خدا ملائے گا۔

حضور کا خادم شوکت علی،

بھنڈارہ ۲۱ رجون ۱۶ء،

حضور والا، السلام علیکم،

میرا پہلا خط پہونچا ہوگا، پرسوں آم مع الخیر پہونچ گئے۔ اگرچہ ریل کا گارڈ ان میں ضرور شریک ہو گیا تھا، لکھنؤ

اور محمد علی نے بھی کھا لئے، خدا کے فضل سے کوئی برائی ظہور پذیر نہ ہوئی، اس طرح کی خبروں سے سوائے انتشار اور بدمزگی کے کچھ پیدا نہیں ہوتا ہے، اور ملک میں بدامنی بھی ہوتی ہے، آخر مخلوق اپنے ننگ و ناموس کو بھی دیکھتی ہے، اور ناموس کا جب معاملہ آجاتا ہے تو انسان سر بکف ہو کر سب کچھ کر گزرتا ہے، مولوی عطا محمد صاحب ہر طرح قابل امداد ہیں، اور چونکہ حالات خراب ہیں نوکری اور جگہ ملنا دشوار ہے، سید فیض الحسن حسرت اپنے خیالات میں پختہ آدمی ہیں، . . . کاغذ غائب . . . جو ون کرنا چاہتا تھا، محمد نے بھی سمجھایا تھا، مگر وہ رائے قائم کر چکا تھا، رہی امداد تو وہ ناامید نہ ہوگا، کیونکہ اُس کا عمل نیاز کے مشہور شعر پر تھا:-

طمع فاتحہ از خلق نداریم نیاز ؂ عشق من جرس من فاتحہ خوانم باقیست

اور میرے ناچیز خیال میں ہر کام کرنے والے کا خدا پر ہی بھروسہ چاہیئے، اب میں برابر خطوط لکھتا رہونگا، مولانا سلامت اللہ صاحب کو کئی دن ارادہ خط لکھنے کا کرتا ہوں، مگر طبیعت لکھنے پر مائل نہیں ہوتی، اور میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ قرض اُتارنے والا خط اُن کو لکھنا بیکار ہے، برادرم الطاف کی بیماری کی وجہ سے پریشانی تھی، خدا اُن کو صحت دے، اُن کا منصوری پتہ حضور تحریر فرمادیں تاکہ میں خیریت پا سکوں، معظم غالباً مجبوری کی وجہ سے اجمیر شریف نہ جا سکے ہوں گے، کام از سر نو شروع کیا ہے، اس لئے بانکی پور سے غیر حاضری دشوار ہوگی، افسوس کہ علی امام مظہر الحق صاحب کے خلاف نواب سرفراز حسین خاں کے لئے کوشش کرتے ہیں، ان کا حال بھی معلوم ہو گیا، مگر کس قدر تجربوں کے بعد، والدہ صاحبہ نے نشاط بیگم صاحبہ کو علی گڑھ خط لکھا ہے، اور اُن کی تشفی و تسلی کی ہے، اُن کی امداد ہم سب پر فرض ہے، اور ہم سے جو کچھ ہو سکے گا باقاعدہ ماہ بماہ اُن کے مصارف کیلئے بھیجے جائیں گے، قلب آج کل مضطرب رہتا ہے، مگر سوائے صبر و شکر کے کیا چارہ ہے، حضور دعا فرمائیں کہ یہ دن جلد گزر جائیں، اور وہ وقت جلد آئے کہ ہم سب اطمینان سے خدمت دین کو . . . کاغذ غائب . . . قوت اور شوق سے متوجہ ہوں، ہم سب بخیریت ہیں، یہاں موسم اچھا ہے، رات کو سردی ہوتی ہے، برآمدہ میں سوتے ہیں، تھوڑی بارش ہوگئی ہے گرمی صرف ۷ یا ۸ دن سخت پڑی ورنہ موسم قابل برداشت تھا، محمد علی کا دست بستہ سلام، والدہ صاحبہ حضور کو اور تمام اہل خاندان کو دعا دیتی ہیں، محمد علی کی شکر کل کے امتحان میں صرف ½ فی صدی تھی، انشاء اللہ اگلے ہفتہ میں غائب ہو جائے گی،

حضور کا خادم شوکت علی،

؎ راجہ غلام حسین مرحوم کی اہلیہ،

بزرگانِ دین کی عقیدت

(۲۵)

چھندواڑہ ۱۲ / جون ۱۶ء،

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کا دوسرا خط ملا۔ اس سے رنج ہوا، افسوس کہ ذمہ دار اشخاص اس متبرک زمین کی پوری قدر نہیں کرتے جس پر برسوں سے کتب الٰہی کا درس ہوتا رہا ہے اور سینکڑوں بزرگانِ دین کے قدم اس پر سے گزرے ہیں، وہاں کی چپہ چپہ

کے دفتر سے ملیں گے، حضور کا خط بھی وہاں سے واپسی پر ملے گا، ڈپٹی کمشنر آج کل یہاں نہیں ہے، ناگپور رخصت پر گئے ہیں، اگر وہ ہوتے تو غالباً خطوط مل گئے ہوتے، ہم بفضلہ تعالیٰ بالکل تندرست ہیں، محمد علی کو شکر آنا بند ہے، خدا نے بڑا فضل کیا، والدہ صاحبہ اور تمام بچے اچھے ہیں، اور حضور کو سلام عرض کرتے ہیں، اور دعا کے ملتجی ہیں، نماز تہجد کے بعد بھی حضور کو اپنا خادمانہ سلام پہونچا دیتا ہوں، حضور کو مل جاتا ہوگا، جو تعلقات اب خدا کے بڑے فضل سے قائم ہو گئے ہیں، وہ انشاء اللہ مٹنے والے نہیں ہیں، ملاقات بند کر دی جائے یا خطوط بھی مگر حضور کا فیض محبت دل سے بھی زائل نہیں ہو سکتا ہاں اپنی کمزوریوں سے ضرور قلب کو تکلیف پہونچتی ہے، اور اس کی صفائی کے لئے حضور کی دعا اور توجہ کے ہمیشہ طالب رہیں گے، میں نے اور محمدؐ نے صاف صاف سرکار والا تبار کو لکھ دیا ہے کہ ہم ہر حکم کو جس کا دنیاوی معاملات سے تعلق ہوگا چاہیں وہ کتنے سخت ہوں مانیں گے مگر معاملات دینی میں ہم کو مجبوراً انکار کرنا ہو گا۔

اس کے لئے خدا کا بھیجا ہوا قانون "قرآن مجید" موجود تھا، اور اس کی نسبت کوئی رائے یا مشورہ کسی شخص کا سوائے ہمارے علماء کرام اور مستند علماء کرام کے قابل پذیرائی نہ ہوگا، ہم کسی طرح بے دین اور مرتد ہونا نہیں چاہتے، سوائے اس وجہ سے کہ ہم کمزور اور نادار تھے، ہمارا خدا زبردست اور طاقت والا تھا، مجھ کو یقین کامل ہے کہ ہم کو بالکل آزادی ملے گی، کہ ہم اپنے روحانی اور مذہبی معاملات میں بلا روک ٹوک یا کسی پولٹیکل مصلحت کے حضور کی طرف رجوع کر سکیں گے، دین کے مقابلہ میں ہم کو جان و مال پیارا نہ تھا، اور اب تو مزہ چکھ لیا ہے، انشاء اللہ خدمت دین کا سوال اب آئندہ پس پشت نہ ڈالا جائیگا، تمام مال اندیشی مصالح ملکی کا اجر ہم نے چکھ لیا، بے دینی کے درجہ تک پہونچ گئے، دروغ گوئی کی حد کوئی نہ تھی اور پھر بھی نتیجہ کچھ نہ نکلا، خدا ہمارے گناہوں کو معاف کرے، اور آئندہ ہم کو اُن سے محفوظ رکھے، رامپور ہمارے بعض اعزہ پر خدا معلوم کیوں سخت گیری ہو رہی ہے، مگر وہ لوگ مسلمان ہیں اور صبر و شکر کے ساتھ تمام مصائب کا مقابلہ کر رہے ہیں، ہمارے بڑے بھائی مسٹر ذوالفقار علی جن سے بڑھ کر ریاست میں کوئی قابل اور متدین شخص نہ تھا، اُن پر بھی مقدمات طیار کئے جا رہے ہیں، گواہوں پر زور دیا جاتا ہے، اُن کو ۲۰ دن سے جیل خانہ میں مقید رکھا گیا ہے، مگر وہ سچ پر قائم ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم سے کیا آج تک کسی سے انہوں نے رشوت تو کیا نذرانہ تک مٹھائی تک نہیں قبول کی ہے، ۴۰ ہزار سے اپنے محکمہ کی آمدنی دو لاکھ سالانہ کر دی، خدا مالک ہے، ہماری درخواست کا ابھی جواب نہیں ملا ہے حضور دعا فرمائیں، انشاء اللہ امسال کاٹن مل میں ضرور بڑا نفع ہوگا، اور تمام سالوں کی کسر نکل جائے گی، مولانا سلامت اللہ صاحب کو بہت بہت سلام، میاں الطاف، قطب میاں صاحب، الیاس اور تمام اعزہ کو سلام،

حضور کا خادم شوکت علی،

ہیں ٹوکریاں مضبوط زیادہ نہیں ملتیں اس سال خدا نے ایسی عمدہ گھڑی سے آموں کی فصل شروع کی تھی کہ اول دن سے
جبکہ حضور کے مرسلہ آم و خربوزہ آئے تھے آج تک برابر سلسلہ قائم ہے اور اس قدر آم کھانے کو ملے کہ معمولاً یہاں
ہیں نہیں ملتے تھے۔ تمام احباب و اعزہ بھیج رہے ہیں تقریباً چار پانچ پارسلیں ہر ہفتہ آجاتی ہیں۔ کل ولایت علی کے
آم آئے نہایت عمدہ تھے اس سے ایک دن مولانا ابو الکلام صاحب نے لکھنؤ سے بھجوائے تھے، بانکی پور، غازی پور،
رام پور غرضیکہ ہر جگہ سے آم آرہے ہیں اور اب تو انشاء اللہ تعالیٰ اور اضافہ ہوگا۔ خدا اپنے غریب بندوں کی ہر
طرح پرورش کرتا ہے، بارش یہاں تقریباً ۲۰ دن سے یکساں ہو رہی ہے، اب تو فصل کو نقصان کا اندیشہ ہے، تبرک
کے ردے رکھے تھے بالکل معلوم نہیں ہوئے دہلی سے خبر آئی ہے کہ وہاں سخت گرمی پڑ رہی ہے، خدا کرے لکھنؤ میں
امن ہو، محمد علی دست بستہ سلام کہتے ہیں، ان کی طبیعت اب اچھی ہے، خدا کو منظور تھا کہ ان کو بھی آم کھانے کو مل
جائیں، مگر میں بڑی سختی کرتا ہوں اور نہایت مشکل سے دو یا تین آم دیتا ہوں، مگر وہ حضرت ایک دو اور لے لیتے
ہیں پرہیز اب کی انہوں نے بہت سخت کیا، آج کل آموں کے پارسلوں سے بہت دلچسپی ہے ان کو اسٹیشن سے منگا لیتے
ہیں اپنے ہاتھ سے کھولتے ہیں، بندش پر اور ٹوکریوں اور ریل کے گارڈوں جیسے دشوار مضمون پر اعلیٰ لیکچر دینے کی قابلیت
پیدا کر لی ہے آموں کے پال کا خاص انتظام ہے، مجھ کو اندیشہ ہے کہ اس معاملہ میں ان کی دلچسپی خالی از علت نہیں
ہے، حضور دعا فرمائیں کہ خدا ایمان میں تقویت دے اور ہم کو توفیق دے کہ ہم خدمت دین سے کسی حال میں منہ نہ موڑیں
خدا دین و دنیا کی رسوائی سے بچائے اور روز حشر ہم کو شرمندہ نہ کرے،

خورشید نے دوسرا مکان کرایہ پر لے لیا ہے، کیونکہ غالباً کچھ خاندان کی مستورات بھی آجائیں، رشید میاں
جو میرے ماموں زاد بھائی ہیں ان کی اکلوتی لڑکی جو مشکل سے ۲۰ برس کی ہوگی دق میں مبتلا ہے خدا اپنا رحم کرے
خدا کا شکر ہے کہ عزیزی النفات کی صحت اب اچھی ہے، خورشید کو خدا صحت دے ان کی بیماری سے مجھ کو از حد
پریشانی ہے، کیونکہ کارخانہ کا کام سب وہ کرتے ہیں، میں کوشش کروں گا کہ اس عرصہ کیلئے ہماری نظر بندی رام پور ہو
جائے، فصل کی نسبت رام پور سے ملازم عمدہ چیزیں دیتے ہیں بارش موقع سے ہوتی ہے اس لئے کاٹن مل کی
نسبت اول نہایت امید دلانے والی خبریں ملی ہیں، حضور نقصانات کی وجہ سے پریشانی ہے، ایک دو سال اچھے
ہو جائیں تو سب کسر نکل جائے گی،

(شوکت علی)

اللہ اکبر

خدا کا قانون: قرآن

(۲۶)

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۱۶ر جولائی سنہ ۱۶ء،

حضور والا، السلام علیکم،

ہمارے خطوط نہ آنے سے حضور پریشان نہ ہوں، انشاء اللہ جلد حضور کو تین چار اکٹھے چیف سکرٹری گورنمنٹ

ہم ان آزمائشوں میں پورے اُتریں گے

(۲۷)

الله اکبر

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۲ جولائی ۱۹۱۶ء،

قبلہ و کعبہ، السلام علیکم،

حضور کا خط مورخہ ۱۹ جولائی آج صبح ملا، اس کو پڑھ کر قلب میں قوت آئی حضور کا فرمانا درست ہے، اب تعلقات دلی کا بفضلہ تعالیٰ اس درجہ کو پہونچ گئے ہیں، کہ خطوں کی ضرورت نہیں ہے، اگر ہمارے ہاتھ قلم کر دیئے جائیں، اور زبان کاٹ دی جائے، تب بھی دل سے رشتہ محبت اور راز و نیاز قائم رہے گا، مجھ کو ذرہ فکر نہیں ہوتی جب کہ حضور کے خطوط چیف کمشنر صاحب کو بھیجے جاتے ہیں، یا ہمارے خطوط، بہت عمدہ بات ہے کہ کلمۃ الحق اُن کے کانوں تک بھی خدا اس ذریعہ سے پہونچا دیتا ہے، میں تو حضور سے بعد نماز تہجد عرض کرتا ہوں جو کچھ کہنا ہوتا ہے، حضور دعائیں ہر وقت یاد فرماتے رہیں، حضور اطمینان رکھیں کہ جب سے اُس قادر مطلق کی محبت دل میں پیدا ہو گئی ہے، اور اس کا ہی خوف ہے انعام دنیا اور اُس کے انعامات اور سزائیں ہیچ معلوم ہوتی ہیں، انشاء اللہ اب ہم کو دین کے راستہ میں مسلمان مضبوط پائیں گے، تمام مصالح دنیوی کا نتیجہ بجز بدگمانی اور بے اعتباری کے کچھ نہ ملا، تمام اور آزادیاں سلب تھیں، مذہب کی جڑ بھی کھوکھلی کرنا منظور ہے، تو انشاء اللہ اُس کی جڑ مضبوط ہو گی، ہمارے خطوط نہ لکھنے سے حضور متفکر نہ ہوا کریں، اگرچہ انشاء اللہ میں برابر لکھتا رہوں گا، رامپور کارخانہ روئی کے کام کے زمانہ میں جانے کی درخواست منظور نہ ہو سکی کل جواب ملا، اس میں بھی خدا کی کوئی بہتری ہو گی، کیونکہ وہاں بھی ہمارے، خاندان پر سخت بے جا عتاب ہو رہا ہے، ایک عزیز کو برطرف ہی نہیں کیا گیا، بلکہ دس ہزار روپیہ جرمانہ بھی کیا گیا، باوجودیکہ کوئی جرم نہ تھا، مقدمہ بنوانے کی کوشش کی گئی مگر کچھ واقعہ ہو تو مقدمہ بنے، دوسرے عزیز جو نہایت قابل عہدہ دار تھے، اُن کو بھی معطل کر دیا گیا ہے، اور قلعہ میں رکھ لیا گیا ہے، بڑے بھائی مسٹر ذوالفقار علی صاحب جن کو سال بسال زبردستی ترقی دے دے کر گورنمنٹ سے مانگا تھا اور جنہوں نے ۔ ا برس میں اپنے محکمہ کی آمدنی تقریباً ۳ گنا کر دی، اُن پر بھی مقدمہ تیار کیا جاتا ہے، اور کمیشن تحقیقات مقرر ہوا ہے، گواہ رشوت ستانی سے انکار کرتے ہی نہیں ہیں بلکہ تمام شہر گواہ موجود ہے مگر گواہوں کو جیل میں رکھا جاتا ہے، غرضیکہ طرح طرح کی زیادتیاں یکایک شروع کی گئی ہیں، دسمبر ہی میں اُن کی خدمات خاص طور پر تعریف لکھ کر حاصل دوبارہ کی گئی تھیں، اب یہ حال ہے، ہم ان آزمائشوں میں انشاء اللہ پورے اُتریں گے، حضور دعا فرمائیں، یہ زمانہ نہایت پر لطف ہے اور غالباً خدا کو ہماری بہتری اور پاکیزگی انہیں مصائب کے ذریعہ سے منظور ہے، والدہ صاحبہ کا سلام حضور کو گھر سب کو، میرا اور محمد کا سلام اور پیار سب کو، خاص کر مولانا سلامت اللہ صاحب، بھائی الطاف، احسان، قطب میاں اور الیاس کو،

حضور کا خادم شوکت علی،

ہمیں صرف خدا کی رضاجوئی درکار ہے

(۲۸)

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۲ راگست ۱۶ء   اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کا حکم نامہ آیا تھا، محمد علی کے نام، اس کو میں نے بھی کئی بار پڑھا، اور دل پر گہرا اثر ہوا اور اپنی بدکاری اور بداعمالیوں پر شرم آئی، دنیا میں لوگ ہم کو نہایت اچھا اور نیک کہتے ہیں، مگر ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم کیا ہیں، دنیا کو دھوکہ دے لیں خدا دانا اور بینا ہے، وہ تمام حالات جانتا ہے، خدا توفیق دے کہ ہم صراط مستقیم پر قائم رہیں، اور روز حشر ہم کو شرمندگی نصیب نہ ہو، حضور برابر دعا فرماتے رہیں، کہ ہمارے ایمان میں تقویت ہو اور ہم گناہوں کے بوجھ سے ہلکے ہوں، جہاں اس کی سیاہ کاریاں ہیں وہاں اس میں شک نہیں اب تھوڑی تھوڑی اپنی بداعمالیوں پر شرم بھی آتی ہے، اس کی ذات سے امید ہے کہ وہ نظر ترحم فرماکر ہمارے قلب کو پاک کردے گا اور اس کی نفسانیت کو دور کردے گا اور ہم کو سوائے اس کی محبت اور اس کی رضاجوئی کے کسی دوسرے کام سے تعلق نہ ہوگا،

میں کئی دن سے خط کا ارادہ کرتا تھا، مگر کوئی نہ کوئی امر مانع ہو جاتا تھا، آج ہمت کرکے بیٹھ گیا ہوں، اور تمام خطوط کا جواب دیتا ہوں، والدہ صاحبہ بعد عید رامپور تشریف لے گئیں اور وہاں سے منصوری گئیں، عزیزی ...دیکو بخار برابر رہتا ہے اور اب تک کچھ افاقہ نہ تھا، خدا کرے، اب چونکہ موسم بھی خوشگوار ہوگا، اُن کو صحت ہو، ...طرف سے بہت ہے، غالباً والدہ صاحبہ بھی اکتوبر تک منصوری رہیں گی، میں شاید حضور کو لکھ چکا ہوں، کہ ...کمشنر صاحب کے یہاں سے جواب آگیا کہ ہماری ——— دوبارہ نظربندی رامپور روئی کے موسم تک کیلئے ...کا انتظام نہیں ہو سکتا، امید کم تھی، مگر ہم نے اپنا دستور رکھا ہے کہ جو واجبی ضرورت ہم کو ہو ہم اس کا اظہار ...منظوری اور نامنظوری کا اُن کو اختیار ہے، حضور والا، ہم لوگ خدا کی رحمت سے ہرگز ناامید نہیں ہیں، اس لئے ...اللہ جلد یہ دن ختم ہو جائیں گے، حضور کے دیدار کو بہت دل چاہتا ہے، انشاء اللہ جب حکم ہوگا حضور کی قدم ...جائے گی، ہمشیرہ عزیزہ نشاط بیگم صاحبہ کا خط آیا اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے رفیق مجلس حسرت نے الہ آباد میں ...کی امامت کی اور نماز عید ادا کی، خدا اس کی عید کو ضرور مبارک کریگا، نماز میں اب لطف آنے لگا ہے ...امانت اللہ صاحب کو ہمارا دست بستہ سلام، وہ بہت یاد آتے ہیں، اُن کی امداد کی جلد ضرورت ہوگی، انشاء اللہ ...کے کام کا وقت قریب آگیا ہے، فصل کا حال ابھی معلوم نہیں، مگر انشاء اللہ جلد حالات معلوم ہونگے، رامپور ...کا انتظار ہے، بھائی الطاف کی خیریت بھی معلوم نہیں ہوئی، اب یہاں قائم ڈپٹی کمشنر کی جگہ دوسرے نئے ...ہیں، مسٹر ہمنگوے جو پہلے تھے، وہ یکایک سخت بیمار ہو گئے، اور اب سُنا ہے کہ وہ ناگپور سے دو برس ...پر انگلستان جائیں گے، فی الحال سخت بیمار ہیں، متواتر تبدیلیوں سے قدرے تکلیف ہوتی ہے، کیونکہ نیا ...سے واقف نہیں ہوتا، اور ہم اس کے طرز عمل سے نہیں، حضور ہمارے لئے دعا فرمائیں ہم بھی ہر وقت دست

بدعا ہیں، خدا ضرور ہماری سنے گا، رامپور کی دشواریوں میں کمی ہوتی ہے، فضول مفسدین ہماری جنگ کراتے تھے، محمد علی
نے ایک تازہ غزل لکھی ہے، مولوی سلامت اللہ صاحب کے لئے، جلد ارسال کروں گا، عزیزی قطب میاں صاحب، الیاس
اور احسان کو پیار، بچے سب سلام عرض کرتے ہیں،

حضور کا خادم شوکت علی

ایک معقول انگریز

(۲۹)

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۵ ستمبر ۱۶ء

اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کا حکم نامہ ملا۔ اس کو نہایت غور سے کئی مرتبہ پڑھا، کیونکہ اس میں ہماری ہدایت کے لئے بہت سامان ہوتا
ہے اور ہم کو تقویت ملتی ہے کہ ہم دنیا کی فواحشات ولغویات سے بچ سکیں، حضور کی شکایت بالکل بجا تھی کہ ہمارے پاس
سے جواب دیر سے ملے، جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، اس عرصہ میں یہاں افسر پہ افسر تبدیل ہوا، اور ہم نے ازراہ سہولیت
نئے آدمی کو آرام اس وقت تک دینا چاہا کہ وہ اپنے قیام وغیرہ کا مناسب انتظام کرلے، جو ڈپٹی کمشنر یہاں پہلے تھا
وہ سخت بیمار ہو کر ولایت بھیج دیا گیا، ان کی جگہ یہاں کا مہتمم بندوبست کام کرتا تھا، علاوہ خود اپنے کام کے، ان کے بعد
ایک، دوسرے آفیسر آئے ہیں، جس غریب پر علاوہ دیہاتی بنکوں کے کام کے ضلع کا کام بھی کرنا، اور اس پر اضافہ ہماری ڈاک
کا دیکھنا، ایک تو نیا آدمی خواہ مخواہ اجنبیت کی وجہ سے نئے کام سے گھبراتا ہے اور اس کی تکمیل میں زیادہ وقت لیتا ہے اور
دوسرے خود اس کا اپنا کام ہوتا ہے، اس لئے مجبوراً اور کسی کا نقصان ہو یا نہ ہو ہمارا حرج ہوتا ہے، اور خطوط دیر میں روانہ ہوتے
ہیں اور دیر میں ملتے بھی ہیں، پھر اردو کی ناواقفیت اور مصیبت ہے، مترجم ہر وقت مکان پر موجود نہیں رہتا، ہم لوگ
واقعی خط لکھ ... (کاغذ غائب) ... تھے، جو غالباً ... (کاغذ غائب) ... ہوئی تو ہم ... (کاغذ غائب) ... کریں گے، کہ وہ کوئی دوسرا
انتظام تھا، جیسا کہ لینڈون میں تھا، وہاں ہم کو ذرہ تکلیف نہ ہوئی، ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولس، انگریز تھا، اور ایک
ہندو سب انسپکٹر اردو کے لئے، یہاں اردو کے خطوط میں زیادہ دقت ہوتی تھی، کیونکہ مترجم خود خط وکتابت میں
بہت دلچسپی لیتے تھے، اور اس کو عوام میں مشہور کرتے تھے، مذہبی امور جو انسان کی زندگی کا سب سے خانگی کام تھا،
ان میں نئے نئے معنی پہنائے جاتے تھے، اس شریف مردود وملعون کے معاملہ میں نہ حضور کو میرے خطوط ملے
اور نہ حضور کے مجھ کو، سوائے صبر کے کچھ چارہ نہ تھا، اور ہم نے بدمزگی کرنا چاہی نہیں، اگرچہ ارادہ تھا کہ چیف کمشنر صاحب
کو تمام حالات سے اطلاع دی جائے، مذہبی معاملات میں مداخلت مخدوش بات ہے اور قانون کے خلاف، میں
سمجھتا ہوں کہ دینی معاملات میں مصلحت اندیشی کا نتیجہ ہمارے حق میں مضر تھا، ہر لحاظ سے، دینی و دنیوی، حضور کم از کم
اس بات کا تو یقین رکھیں کہ انشاء اللہ ہم اس معاملہ میں ذرہ بھی کمزوری آئندہ نہ دکھلائیں گے، حضور دعا فرمائیں،

نئے ڈپٹی کمشنر ایک نوجوان ہیں جو محمدؐ کے زمانہ میں، آکسفورڈ میں تھے، اور اگرچہ محمدؐ سے ملاقات نہ تھی، مگر محمدؐ کے چند اور انگریز اور ہندوستانی دوستوں کے دوست تھے، ہم جب ملنے گئے، تو حسب معمول اخلاق سے ہی پیش نہ آئے بلکہ ہم گھنٹہ تک تمام معاملات پر بہت صاف صاف اور دلچسپ گفتگو ہوئی، سول سروس کے لحاظ سے روشن خیال اور اس ملک سے ہمدردی رکھنے والے معلوم ہوتے ہیں،" اور خوشامد سے متنفر، مگر یہ کم بخت ایسی بلا ہے کہ حاکم کو ...... کاغذ غائب ماتحت کا محکوم کر دیتی ہے، اور اس کے پھندے سے بچنا دشوار معلوم ...... کاغذ غائب۔ ہم کو سوائے خدا کے کسی سے ...... کاغذ غائب اور انشاء اللہ تعالیٰ، ہم ایسے ارادوں پر قائم رہیں گے، اس عرصہ میں یہاں چند بدباطن کوشش کر رہے تھے کہ اندر ہی اندر یہاں کے لوگ ہم کو بائیکاٹ کر دیں اور ان کو خلاف حکم گورنمنٹ طریقہ طریقہ سے دھمکایا جاتا تھا کہ وہ ہم سے نہ ملیں، اس کا نتیجہ سوائے ناکامی کے کچھ نہ ہوگا، کیونکہ اگر مسلمان اور ہندو ہمارے مصائب پر اور غیر مستحق نظر بندی پر افسوس کرتے ہیں تو اس قسم کی باتوں سے اس میں فرق نہیں آتا ہے، ویسے ہم تو حضور کو علم ہے کہ ہم تو امن پسند ہیں، اطمینان سے جب تک خدا کا حکم ہے اس خدا کی زمین اور خدا کے ایمان کے نیچے بیٹھے ہیں آج چھندواڑہ میں ہیں تو کل کو مانڈلے میں ہوں گے یا اپنے وطن دہلی یا رامپور میں، اس میں جو ہم سے ملے گا ہم اس سے ملیں گے، اخلاق سے ملے گا، اخلاق سے ملیں گے، برے طور پر ملے گا، ہم اس کو ذلیل اور کمینہ سمجھ کر اس سے کنارہ کشی اختیار کریں، بفضلہ تعالیٰ ہر گوشہ ملک میں والیان ملک سے لے کر غریب سے غریب مگر سچے مسلمان سے ہماری محبت ہے، ہم کو کسی کے ملنے یا نہ ملنے کی پرواہ نہیں ؎-

قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے"

یہ خدا کا شکر اور اس کی نعمت ہے کہ اس نے ہم کو منکسر مزاج اور خوش طبع پیدا کیا ہے اور ہمارے اخلاق سے امیر اور غریب سب یکساں خوش ہوتے ہیں، اور ہم کو دعائے خیر دیتے ہیں، حاضر اور غائب، ان کو ہمارے اخلاق گرویدہ کرتے ہیں، جب کہ وہ دیکھتے ہیں، کہ معمولی حیثیت کے انسان تھوڑی سی حکومت اور اختیار پر ان سے گالی گفتار، شیخی اور اکڑ سے برتاؤ کرتے ہیں، اور بات بات پر تازیانہ دکھاتے ہیں، غریبوں اور بے کسوں پر ظلم اور زیادتی، اور بڑوں کے سامنے خوشامد اور چاپلوسی، یہ کمینہ خصلت کی ظاہری نشانی ہے، خدا کا شکر ہے کہ حضور کی صحبت اور دعا سے رہی سہی شیخی بھی ہمارے دماغ سے نکل گئی، حضور دعا فرماتے رہیں، حضور یقین ریں کہ ہم کو اب کسی کو راضی کرنے کی خواہش نہیں، سوائے اس مالک حقیقی کے جو ہم سب کا آقا ہے، مولانا سلامت ہد صاحب کو ہمارا بہت بہت سلام اور پیار حضور پہونچا دیں، حضور سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے، انشاء اللہ دا جلد سامان ملاقات پیدا کر دے گا، ظاہراً تو میرے کارخانہ روئی کے حالات نہ ہوں مگر سامان ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ اگر اس کی خوشی ہوئی تو امسال ضرور کچھ عمدہ نتائج نکلیں، بیوپاریوں کو میں نے طلب کیا ہے، جاپانی، یے برانڈی اور خود رامپور کے خریدار، چند اعزہ کا بھی خریدنے کا ارادہ ہے، اگر میں موجود کارخانہ میں ہوتا تو بہتر ا، مگر گورنمنٹ صوبہ تبادلہ کا انتظام نہ کر سکی، غالباً تبادلہ کرنا پسند نہیں کیا، خیر، اب جو کچھ ہو، بمبئی سے انجینیر

الہ آباد میں سنائے تھے، پچھلے اور موزوں تھے وہ حضور کا خط دیکھ کر بار بار یاد آتے ہیں:-

تیری خاطر بھی ہے مدنظر، پاس ادب بھی ہے — مگر میں کیا کروں دل کی جلن کچھ اور کہتی ہے
یقین آنے کو تو آجائے تیرے عہد و پیماں کا — تیری آنکھ او بت وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے

پچھلے خط میں حضور کے کچھ افسردگی سی معلوم ہوتی تھی، خدا کرے طبیعت حضور کی بالکل تندرست ہو، یہ ضرور ہے کہ ہم مسلمانوں کی موجودہ مذہب سے علیحدگی ضرور تکلیف دہ ہے، اور جس کی ہم کو سزا بھی مل رہی ہے، مگر پھر بھی ہم کو خدائے برتر کی ذات پر بھروسہ کرنا چاہئے اور میرے خیال میں تو ہمارے حالات میں تبدیلی بہت امید افزا ہے۔ تو ہر حال میں راضی برضا رہنا اور خوش رہنا ہے، میں تو آج کل بہت خوش ہوں، اور مست، دست بدعا رہتا ہوں، اور پوری امید رکھتا ہوں کہ ہمارے تمام مصائب بہت جلد ختم ہو جائیں گے، انشاء اللہ حضور کے قدموں کے پاس بیٹھ کر اللہ اور رسول صلعم کی باتیں سیکھوں گا، اور اپنی بساط کے مطابق ان کی اشاعت کروں گا، اپنے خانگی معاملات تو ان کو خدا کے سپرد کر دیا ہے، وہ کارساز ہے، انشاء اللہ بہتری ہوگی، رامپور میں کارخانہ کی درستگی ہو رہی ہے، بمبئی سے انجینئر وغیرہ آگیا ہے، سال کی پیداوار کی نسبت کچھ ہونا فضول ہے، اگر خدا کو منظور ہوگا تو وہ آناً فاناً سب انتظام درست کر دیگا، خریداروں کا آنا لازمی تھا کیونکہ ہمارے پاس ....کاغذ غائب.... نہ تھا کہ خود خریدتے، جاپانی یا دیسی برادرس آگئے تو بہتر ہو جائے گا، کاٹن مل کے تمام امور کو خدا کے سپرد کر دیا ہے، مگر خدا سے قوی امید ہے کہ امسال ضرور بہتری ہوگی، حضور دعا فرمائیے گا، مولانا سلامت اللہ صاحب کو میرا اسلام، میرا یہ خط حضور ان کو دکھا دیں، والدہ صاحبہ بعد عید آئیں گی اور حضور سے ضرور ملیں گی،

حضور کا خادم شوکت علی معتقد خادم الخدام کعبہ،

علالت طبع کا ذکر

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۱۴ ار اکتوبر ۱۶ء (۳۱) اللہ اکبر

بہار آئی نشہ میں جھومتے ہیں، ؛ مریدان پیر مغاں کیسے کیسے،

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کا والا نامہ اور عید کے موقع پر دعاؤں کا تار بھی آیا تھا، میں فوراً جواب لکھنے سے معذور تھا، کیونکہ مجھے پلنگ سے ہلنے کا حکم نہ تھا، اور نیز بخار میں بھی مبتلا رہتا تھا، پانوں میں بال توڑ نکلا تھا، ایک تو اچھا ہو گیا تھا دوسرا اچھا ہی تھا کہ میں نے اس کو ڈاکٹر کو دکھایا، اس نو عمر دوست نے فوراً نشتر سے کام لینے کا ارادہ کر دیا، میں نے سمجھایا بھی مگر اس نے کچھ نہ سنا اور میں نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا، ڈر تھا کہیں خوف زدہ ہو جانے کا الزام عائد نہ ہو، کیونکہ ڈاکٹر ان معاملات میں، زیادہ جانتا ہے، عمل جراحی کے بعد زخم کی حالت اور خراب ہو گئی، اور سب طرف ورم ہو گیا

عمدہ بلایا ہے کہ تمام کارخانہ کو درست کر دے، ۱۵ اکتوبر تک، مولانا صاحب ناامید نہ ہوں، دعا فرمائیں۔ انشاء اللہ کامیابی ہو گی، کم از کم مصارف نکل آئیں گے، برادرم الطاف، احسان، قطب میاں صاحب کو ہمارا اسلام مسنون، والدہ صاحبہ مع خورشید علی کے ہمارے پاس اکتوبر میں بعد عید آئیں گی، حضور سے ضرور ملیں گی، جاتے وقت جلدی میں تھیں، اس لئے نہیں ٹھہریں، اور اسٹیشن پر حضور کو تکلیف دینا انہوں نے قبول نہیں کیا، عزیزی زاہد بیمار ذرہ تھے، اس وجہ سے امتیاز الحق صاحب کو جواب نہ دے سکے، میرے پاس کوئی کتاب یا رجسٹر موجود نہیں ہے سب چیزیں دہلی میں تھیں، حضور ان کو ... کاغذ غائب ... دیں، امین صاحب کو غالباً علم نہ ہو گا، محمد علی کل کو ... کاغذ غائب ...

احسان کو ایسے وقت میں انگلستان کے سفر کا کیوں خبط ہوا ہے، بعد از جنگ جائیں۔

حضور کا خادم شوکت علی

کشور کفر میں کعبہ کو بھی شامل کر لو

(۳۰)

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۱ ستمبر ۱۶ء

اللہ اکبر

حضور والا السلام علیکم،

حضور کا حکم نامہ ملا تھا، مع اس تمام خط و کتابت کے جو حضور اور پرائیویٹ سکرٹری وائسرائے کے درمیان ہوئی، بہتر ہوتا اگر لوکل گورنمنٹ کے ذریعہ سے بھی حضور تمام مرحلے طے فرما لیتے، جیسا کہ سکرٹری کے خط میں درج ہے، میں خود اس خط و کتابت اور خاص کر جواب پر رائے نہیں دے سکتا، رہا شریف صاحب کا معاملہ تو قلب و ضمیر سے میں مجبور ہوں، اُن کی بہت تعریف سنی تھی، چند احباب سے اور حضور نے بھی ان سے بذات خود ملاقات کی ہے، خدا کرے کہ یہ عام خبریں اُن پر اتہام ہوں، اور غلط ثابت ہوں، عام لوگ اور میں جو اُن کو بُرا کہتا ہوں، صرف اسلامی خیالات اور جذبات اسلامی کے لحاظ سے کہ اگر کوئی شخص اماکن مقدسہ میں فساد اور کشت و خون کرے، خاص کر ایسے زمانہ میں تو وہ ضرور جیسا کہ حضور نے اول لکھا تھا، "قابل دار" تھا، میرا خود بھی گمان غالب ہے کہ اس معاملہ میں اُن کو بدنام کیا گیا ہے، خدا کرے ایسا ہی ہو، اخبار القبلہ حضور کے پاس اگر آتا ہو تو بعد پڑھنے کے اور میرے پاس بھیجا کریں، تاکہ ہم بھی دیکھ لیں، خدا کرے اس کو پڑھ کر ایمانوں میں تقویت ہو، کہیں اسی شعر کا مصداق نہ ہو۔

کشور کفر میں کعبہ کو بھی شامل کر لو ؛ سیر ظلمات کو تھوڑی سی فضا اور سہی،

ان معاملات میں میں اپنی جہتی اور معمولی حسن ظن سے کام لینا چاہتا ہوں، مگر یہ ایمان کا معاملہ ہے اس لئے دل ڈرتا ہوں، کہ کہیں یہ کارروائی شیطان تو نہیں کراتا ہے، تاکہ میں اپنے ضمیر کو خاموش کر دوں، اور اپنے آپ کو لعنت سے بچاؤں، محمد علی نے قریب ۱۰ برس ہوئے ایک غزل لکھی تھی، جس کے دو شعر انہوں نے اپنی تقریر میں

ہمتی سے کوئی زہریلا مادہ بھی زخم کے ذریعہ سے اندر پہونچ گیا، جس سے خون میں خرابی پیدا ہوگئی اور مادہ اوپر نیچے آنے
نے لگا، اسی ٹانگ میں ورم تھا کہ یکایک ران میں پیدا ہوگیا، کبھی گھٹنے میں، غرضیکہ بہت تکلیف رہی، بخار ہمراہ رہتے
تا، آخر کو سول سرجن نے خون اور معدہ صاف کرنے کی دوا دی، اور چلنا پھرنا قطعی منع کردیا، دودھ یا کھچڑی کھانے کو دی،
ں اچھا ہوں، اصلی زخم تقریباً اچھا ہوگیا ہے، مگر تھوڑا مادہ باقی ہے، اس کا اخراج بھی ہو رہا ہے، پلنگ پر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں
عد کی نماز کو تو ضرور گاڑی پر ٹہ کر گیا تھا، نماز بھی بیٹھ کر اور ایک ٹانگ پھیلا کر پڑھتا ہوں، انشاء اللہ دو چار دن میں بالکل
چھا ہو جاؤں گا۔ بچے سب اچھے ہیں، خدا کا شکر کہ معظم کے چھوٹے بھائی کو جو انڈک اپنے ہمراہ لائے تھے، اب
اقہ ہے، اور بخار ٹوٹ گیا ہے، علاج اور غور و پرداخت خوب ہوا اور خدا نے صحت دی، سب حضور والا کو سلام
ض کرتے ہیں، ہم جانتے ہیں کہ حضور کی دعائیں ہماری ممد اور معاون ہیں، خدا حضور کو زندہ اور سلامت رکھے، انشاء اللہ
ں زندگی کے ذریعہ سے کوئی بڑی دینی خدمت سرانجام ہوگی، ہماری دعائیں ضرور بارگاہ اعلیٰ میں پہونچتی ہونگی، خدا ہمارے اور اسلام کی مدد
گا، اس عرصہ میں تہجد پھر چھوٹ گئی، انشاء اللہ ۶ یا ۷ دن میں پھر شروع کردوں گا، جاڑوں کی راتوں میں اور لطف نماز وں
تا ہے، خدا کا شکر ہے کہ باقی نمازیں ہو جاتی ہیں، محمد علی غریب ہم سب کی تیمارداری میں لگے ہوئے تھے، الفضلہ تعالیٰ
ب تندرست ہیں، ایک نئی غزل لکھنا شروع کی ہے، کسی پرانے استاد کا خوب شعر تھا، اس پر لکھتے ہیں:۔

تم تو کعبہ کے خدا تھے پر نکالے کیوں گئے ❊ لے تو کیسی خدائی ہوتے ہوتے رہ گئی،

صرف ایک شعر مجھ کو کل سنایا تھا، خوب لکھا ہے، دل خوش ہوگیا، حضور مولانا سلامت اللہ صاحب کو سنادیں:۔

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا، ❊ کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی،

برادرم الطاف، احسان، قطب میاں صاحب، مولانا سلامت اللہ صاحب اور احباب کو سلام، حضور کی قدم بوسی
ہت دل چاہتا ہے، انشاء اللہ جلد ملائے گا، ناظر الدین حسن کو سلام جب حضور ملیں،

حضور کا خادم شوکت علی،

شہور سابق جج حیدرآباد ہائی کورٹ، حضرت سیاسی امور میں مولوی سے اکثر مشورہ کرتے تھے،)

محمد علی کی بیماری،

(۳۲)

الله اکبر

ندواڑہ (صوبہ متوسط) ۱۳ / نومبر ۱۶ء،

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کا پوسٹ کارڈ ملا تھا، جس سے علالت طبع کی اطلاع ملی تھی، والدہ صاحبہ کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ ہاتھ پر
ت زور تھا، خدا اپنا فضل و کرم کرے، امید ہے کہ ان مسہلوں سے فائدہ ہوگا، میں بہت دنوں سے دیکھتا ہوں کہ کوئی
ئی سلسلہ ہاتھ اور انگلیوں میں برابر چلا جاتا ہے، حضور اب کی مرتبہ ڈاکٹروں اور حکیموں کو پورے طور پر ہاتھ کو ملاحظہ
یے گا، تاکہ وہ اصل وجہ اس درد اور تکلیف کی بتا سکیں، اور رحم کر علاج ہو، غالباً اس عرصہ میں ڈاکٹر انصاری صاحب

لکھنؤ آئیں گے، اُن کی رائے بھی ضرور معلوم ہونا چاہیئے، پہلے تو ہمارا خیال تھا کہ مرض صرف جلدی تھا، مگر اب معلوم ہوتا ہے،
کہ خون میں کچھ حدت یا فساد تھا، خدا حضور کو جلد تر صحت کامل عطا فرمائے، ہم لوگ بفضلہ تعالیٰ اچھے ہیں، عزیزی خورشید والدہ
صاحبہ کے ہمراہ آگئے ہیں، یہاں کی خشک آب و ہوا سے اُن کو معتد بہ فائدہ نظر آتا ہے، خدا اپنا فضل فرمائے۔ ان کے گھر میں
اور بچے کو بھی بلوالیا ہے، تاکہ ان کے دل بہلنے کا سامان ہوجائے، چند ماہ سے ڈاکٹر کے حکم سے دوا محمد علی نے بالکل بند
کردی تھی، اور طبیعت بالکل اچھی تھی، پرہیز بھی ترک کردیا تھا، اور شکر بھی معمول سے زیادہ استعمال کی تھی، گذشتہ ہفتہ
میں تھوڑی شکر ظاہر ہوئی تھی، فوراً سخت پرہیز اور دوا پھر شروع کردی، اب طبیعت پھر اچھی ہونا شروع ہوگئی ہے
انشاء اللہ امسال وہ تندرست رہیں گے، حضور کی دعا کے خواستگار ہیں، ان کے گھر میں اور بچیاں سال بھر رہنے کے بعد
مستحق نہیں کہ تبدیل آب و ہوا کریں، فی الحال معظم علی صاحب کے پاس بانگی پور گئے ہیں اور اب عنقریب رامپور
[کاغذ غائب] ..... واسطے جائیں گے، غالباً لکھنؤ بھی ضرور قیام کریں گے تاکہ حضور کی اور تمام خاندان کی قدم بوسی کرسکیں
عزیزی زاہد علی رامپور گئے تھے، غالباً ایک دو روز میں ضرور آجائیں گے، ان کو تاکیداً لکھ دیا گیا تھا، کہ وہ لکھنؤ ضرور
ٹھہریں، ان کی حالت حضور کی توجہ کی محتاج ہے، پڑھنے سے دل چراتے ہیں اور لغویات پر زیادہ توجہ ہے، حضور اُس کے
واسطے دعا فرمایئے گا، اور سامنے بٹھا کر صاف صاف احکام اس کو اس کی زندگی کے متعلق فرما دیجئے گا، انشاء اللہ
ان کا اثر ہوگا، اور اُس کی زندگی درست ہوجائے گی، میں اُس کی طرف سے بہت زیادہ پریشان ہوں، یہ وقت کسب علم
اور درستگی اخلاق ہے اور اس کو ضائع کردیا تو بہت آئندہ تکلیف اٹھائیں گے، برادرم شبیر کو خط لکھ رہا ہوں، خدا ان کو
زندہ اور سلامت رکھے، وہ کلمہ حق سے دنیائے کفر کو منور کرنا چاہتے ہیں، برادرم احسان الرحمان کا خدا حافظ تھا،
ابھی خیال آیا کہ وہ بھی جہاز عربیہ میں سوار تھے، نام اُن کا پڑھا تھا، مگر اس وقت ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوا، فہرست
میں مسٹر شیخ ایم، ای، رحمان درج تھا، مجھ کو یقین کامل ہے کہ یہ سب مسافر فقط ان کی وجہ سے بچ گئے، حضور کی دعا ان
کے ہمراہ تھی، مرنے میں کیا باقی رہا تھا، صرف خدا کا فضل اُن کے ہمراہ تھا، ایک انگریز خاتون جو مسلمان ہوگئی ہیں، اور
ہمارے دوست مسٹر حسن شاہ کی بیبی ہیں، وہ اور اُن کی چھوٹی بچی بھی ہمراہ تھی، خدا ان سب کو اپنی امان میں رکھے، ایسے
وقت سفر کرنا مناسب نہ تھا، ہم لوگ یہاں اطمینان سے زندگی بسر کرتے ہیں، اور جب تک خدا کا حکم ہے، آرام سے
رہیں گے، خدا اسلام کا بول بالا کرے، صرف حجاز مقدس کی فکر ہے، خدا اُس ملک میں امن و امان رکھے، اور کفار کی
نگاہ بد سے بچائے، وہ ہماری جان ہے، ہم وہاں کے مسلمانوں کو اور ہم سب کو باایمان رکھے، حضور ہمیشہ اماکن مقدسہ کی
طرف متوجہ رہیں، وہاں غیر مسلموں کے معاملہ میں دخل نہ دینا چاہیئے ورنہ بڑا سخت خمیازہ اُٹھانا پڑے گا، اس عرض
پاک کا خدائے برتر محافظ ہے، کل مولانا سلامت اللہ صاحب کو مفصل خط لکھوں گا، اُن سے ملنے کو بہت دل چاہتا
ہے، جب اُن کو فرصت ملے ایک دو دن کے لئے آجائیں، حضور کا خط اخبارات میں دیکھا، نہایت عمدہ تھا، کاش کے
محسن صاحب حضور کے ہمراہ رہتے، ان کو تمام معاملات کا علم تھا، اور اُن کا رہنا مفید پڑتا، میرا سب کو سلام و دعا، والدہ صاحبہ سلام
کہتی ہیں،

حضور کا خادم شوکت علی،

سے روانہ ہوں گے، لکھنؤ قدم بوسی کے لئے ضرور ٹھہریں گی، حضور اطمینان رکھیں، ہم انشاء اللہ کوئی امر ایسا نہیں کریں گے، جس سے توہین اسلام ہو، ہاں انسانی کمزوریوں سے ڈرتے ہیں اور اس کے . . کا غذ غائب . . سے بھی درخواست دست بستہ ہے کہ حضور کبھی دعاؤں میں ضرور یاد فرما لیا کریں، قدم بوسی کو بہت دل چاہتا ہے، مگر صبر کرتے ہیں، جب اس کا حکم ہوگا بہ مسرت دلی بھی حاصل ہوگی، اب نمازوں اور دعاؤں میں لطف آنے لگا ہے، اور کلام پاک میں تو نئے نئے روز مزے پاتے ہیں، ایک صاحب کا خط لکھنؤ سے آیا تھا، جو مالک کارخانہ رکابنچ فلکوریل ہیں، وہ خط کہیں ضائع ہو گیا ہے، نہیں ملتا تھا کہ جواب دیتا، جناب مولانا سلامت اللہ صاحب جو اسی سلسلہ میں تجارت ہے، غالباً اُن کا نام اور پتہ جانتے ہوں گے، اُن کو میرے کارخانہ کے متعلق کچھ دریافت کرنا تھا، اشتہار بھیجتا ہوں، مفصل حالات بعد کو لکھوں گا، میں انشاء اللہ پرسوں تک ضرور شبیر حسین صاحب اور عزیزی احسان کو خط لندن لکھوں گا، بھائی الطاف، مولانا عنایت اللہ صاحب، قطب میاں صاحب، عزیزی الیاس، صبغۃ اللہ سب کو سلام مسنون،

حضور کا خادم شوکت علی

یہ وقت دعا اور صبر کا ہے!

(۴۴)

چھندواڑہ ار اپریل ۱۹۲۸ء،

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا ۔ آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا (غالب)

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کے دو خط آئے ہوئے رکھے تھے، اور جواب دینے کو دل بار بار تقاضا کرتا تھا، مگر اپنی بے بضاعتی اور پابندیوں کا اندازہ کر کے دل پر جبر کرتا تھا، صبر کئے بیٹھا ہوں، جب خدا آزادی دے گا دل کھول کر شکوہ و شکایت کروں گا، مگر یہ وقت شکوہ اور شکایات کا نہ تھا، بلکہ امداد کا، سخت سے سخت مخالفت کو دبانا چاہیئے، نہ کہ تفرقہ ڈالنا، تمام امور میں میری رائے کا حضور کو علم ہے، اور ان میں ذرہ بھی فرق نہیں آیا ہے، بلکہ اور تقویت ہوگئی ہے، حجاز کے معاملات سے دل کو اذیت پہونچتی ہے، خدائے واحد القہار ہے، ان امور کا فیصلہ کرے گا، اور مستحقوں کو سزائے سخت اور عذاب دردناک دے گا، اسے مبارک علی اور ان کے ذریات تو خدا ان حشرات الارض کو جلد تر فنا کرے گا، ان سب کو دعا میں ضرور یاد کرتا ہوں، خدا کا شکر ہے کہ جمیعت نے مناسب فیصلہ فرمایا، جو شکایت مجھ کو ان صاحبان سے ہے، وہ یہ ہے کہ یہ وقت فتنہ و فساد کا نہ تھا بلکہ یک جہتی اور امداد کا، گھر کے معاملات ہم سب کی مدد سے بعد کو

سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے!

(۳۴۳)

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۳۱؍فروری سنہ ۱۷ء، — اللہ اکبر

ہوئی ہے عشق سے پس فنا میرے ✽ گر اسیق ہیں جو مشہور جا بجا میری (حسرت)

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کا حکم نامہ محمدؐ کے نام آیا تھا، اس کو پڑھ کر قلب کو تسکین ہوئی دل تو چاہتا ہے کہ روز بڑے بڑے خط حضور کو لکھوں اور اپنے دل کے تمام جذبات کا اظہار کروں، تاکہ قوت ایمان کا سامان ہو اور دل سے کدورتیں اور وہ بلائیں جو ہم کو خدا سے جدا رکھتی ہیں، دور ہوں، مگر اول تو مجبور، دوسرے لکھنے کے لئے دفتر درکار اور پھر اگر انسان لکھے تو کیا لکھے میرے اظہار کی ضرورت نہیں ہے، خدا پر ہمارے قلوب کیا خوب روشن ہیں، حضور خود اندازہ فرما سکتے ہیں اس لئے

سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے،

مشکل سے کسی وقت اپنی موجودہ دشواریوں کا خیال کرتا ہوں، مگر ہاں ایک خیال ہے کہ سوتے، جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، دل کو تو ...کاغذ غائب... ہے اور کعبہ مکرم کی محبت اور عزت کا ...کاغذ غائب... اور مدینہ منورہ کے دیدار کی دھن، خدا ان کی حرمت کو برقرار رکھے گا، اور ہماری ایک آرزو کو پورا کرے گا، کہ ہم حج بیت اللہ سے جس کا ارادہ مجبوراً... کر نا پڑا فارغ ہو سکیں زمیندار میں گزشتہ یوم الحج کی ایک نظم سیماب وارثی اکبرآبادی کی نکلی تھی، وہ ہر وقت یاد آتی ہے، مرصع تھی اور دل جلے کی محبت کا اظہار تھا، انشاء اللہ ہم کو ثواب حج بیت اللہ یہاں پر مل جائیگا، اگر قسمت میں نہیں لکھا ہے

(۱) لاشہ مرا مدینہ کے جنگل میں ہو پڑا ✽ اے نسیم روضہ سے لبیک کی صدا،
تشریف لائیں خود میری میت پہ مصطفےٰ ✽ چہرہ سے ہوں عیاں میری حسرت نصیبیاں
ٹھوکر لگا کے پھر مجھے زندہ کریں حضور ✽ آجائے جان اس تن بیجان میں بن کے نور

(۲) قربان جاؤں دیکھ کے دیدار پر سرور ✽ قدموں پہ پھر نبیؐ کے نکل جائے میری جان
حاصل جو ایسی موت ہو اور ایسی زندگی ✽ ارمان میرے دل میں نہ باقی رہے کوئی

(۳) آبادیوں مدینہ میں بربادیاں میری، ✽ مطلب یہ ہے کہ مجھ کو ملے عمر جاوداں،
لنگر اٹھا قریب ہے، ہنگامہ سحر، ✽ اب دل ہے ناشکیب نہ لاالہ دیر کر

(۴) ہیبک خیال نے مجھے دی ہے ابھی خبر ✽ وہ دیکھ مسجد نبویؐ میں ہوئی اذان،

حضور کا دوسرا خطاب تک نہیں ملا ہے، میں دریافت کروں گا، حضور کو یقین ہونا چاہیئے، کہ جو حضور کی رائے ہوگی وہی ہماری، تمام دینی معاملات میں ہم کو حضور سے بڑھ کر کون راہنما ملے گا، یہ ہماری خوش قسمتی تھی، عنقریب ولایت علی، غلام حسین وغیرہ یہاں آئیں گے، ان کے لئے اجازت لے لی ہے، محمد علی کے گھر میں مع بچوں کے ۸ کو راجپور

فضول خطوط سے سوائے دل کے بے چین ہونے کے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا، اس لئے صبر کرتا ہوں، مگر ملنے کو دل تڑپتا ہے، خدا ایسا جلد کرے کہ حضور سے ہم لوگ مل سکیں، کیا معلوم پھر حضور کو حکم گذشتہ طریقہ سے حکم مل جائے، میں تو ذرہ خوش ہوا تھا کہ اب کچھ نئے لطف دیکھنا نصیب ہوں گے، اس کے لئے اچھے اچھے کپڑوں کی تیاری کی تھی، تاکہ مرنے سے پیشتر دل کی بھڑاس نکال لوں، مگر اب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایسے خوش قسمت کہاں کہ راہ حق میں اور تکالیف نصیب ہوں، ایک دوست نے سہرہ لکھنے کا وعدہ کیا تھا، مگر اب تو غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

محمد مجھ سے از حد رنجیدہ اور کشیدہ ہو گئے تھے، کیونکہ یہ عزت میرے ساتھ منسوب کی گئی تھی، اور ان کا تذکرہ نہ تھا، خدا کی عجب شان ہے:۔

تیغ قاتل نے یہ کیا اپنے دکھائے جوہر
سر بکف پھرتے ہیں اب جان چرانے والے (اکبر)

حضور والا میں تو اب مست ہو گیا ہوں، ہاں صبر کو ہاتھ سے اب تک نہیں دیا ہے، اگرچہ دل چاہتا ہے کہ بے ننگ نام ہو جاؤں،۔

پھر وضع احتیاط سے گھبرانے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے (غالب)

حضور دعا فرمائیے، دل قبول نہیں کرتا کہ حضور یہاں تک نہیں آئیں گے، اس لئے صبر کئے بیٹھا ہوں، مگر دل میں ملنے کی بہت خواہش ہے، جب تک آنے کی امید ہوتی ہے، دل خوش رہتا ہے، اسی لئے محمد تو روکتا رہتا تھا کہ حضور کو تکلیف نہ دے، مگر اس کو اس انس خاص کی وجہ سے جو حضور کو اس سے ہے اور جس کی وجہ سے وہ حضور پر زیادتی بھی کر لیتا ہے، اس سے ضبط نہ ہو سکا، اس نے درخواست کر ہی دی، اب کی مرتبہ ارادہ مصمم تھا کہ حضور کو زبردستی ۳ یا ۴ دن کم از کم روکتے، اگرچہ یہ جانتا تھا کہ، حضور کا لکھنؤ سے علیحدہ ہونا، وہاں سب کو شاق گذرتا ہے، شیطان مجھ کو ورغلاتا ہے کہ اس مقام چھندواڑہ کی طرح طرح سے تعریف لکھوں، کہیں آب و ہوا کی نسبت مدح کا قصیدہ پڑھوں، کہیں یہاں کے پھلوں کی تعریف لکھوں، کہیں قدرتی منظر کا تذکرہ کروں، غرضیکہ طرح طرح سے حضور کو سبز باغ دکھا کر بلالوں تاکہ قدم بوسی ہو سکے، آخر، انہیں مہینوں کے بعد ملنے کا استحقاق تو ضرور پیدا ہو گیا ہے۔ سب لوگ مستدعی ہیں، آج مجبور ہو کر حضور کو میں نے بھی لکھ دیا، اب تک صبر کرتا رہا تھا، میرا یہ خط حضور، مولانا سلامت اللہ صاحب کو بھی دکھا دیجئے گا، اور ان کو میرا بہت بہت پیار، اب پھر راجہ صاحب مسئلہ مسلم یونیورسٹی کو اٹھاتے ہیں، اور مسلمان پریشان ہیں،

...پاس صحیح ذرائع

موجود نہیں ہیں، مگر جاسوسیے کچھ ہیں، ان سے بھی اپنی قدیم رائے میں اور پختگی پیدا ہوگئی ہے، یہ وقت دعا اور صبر کا ہے، اور ہمت اور استقلال سے کام کرنے کا، کلمہ حق کہنے کا اگر کوئی وقت ہے تو یہی ورنہ ویسے تو معمولی انسان بھی کہہ سکتا ہے میرا تو اقبال کے دو شعروں پر عمل ہے:۔

یہ رسم بزم فنا ہے اے دل، گناہ ہے جنبش نظر بھی،
رہے گی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بے قرار ہوگا
واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں،
اقبال کو، یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے،

ہم مسلمانوں کو اب استحقاق نہیں ہے، کہ ایک لفظ بھی گستاخانہ ان لوگوں کی شان میں کہیں جو تمام معاملات پر غور کرنے کے بعد راہ حق میں جدوجہد کرتے ہیں غریب اتراک اور راجہ صاحب کا کیا قصور ہے، اگر مقامات مقدس میں ہم لوگ خود بت پرست ہو جائیں، اصل قصوروار تو دوسرا ہے، غریب خوف زدہ جو حکم سننے والوں پر اعتراض جائز نہ تھا، حضور سے ملنے کی از حد تمنا تھی مگر افسوس کہ نئے سامان دشواری کھڑے ہو گئے۔ جناب قبلہ راجہ صاحب جہانگیر آباد سے توقع تھی کہ وہ اپنے اس بڑے اثر کو جو ان کو حکام سے تھا، ہمارے لئے استعمال کر کے ہم کو آزادی دلائیں گے، مگر وہ تو نہ ہو سکا، اور ہماری تکلیف اور پریشانی کا باعث ہوئے، اور اس روحانی غذا کو ہم سے روک دیا جس کے لئے ہم بیتاب تھے، خدا ان مصلحتوں کا برا کرے، ہم غریبوں کے لئے سوہان روح ہو گئی ہیں، "مرے کو مارے شاہ مدار" جب حضور راجہ صاحب سے ملیں تو میری طرف سے شکایت ضرور پیش کر دیجئے گا، عزیزہ گلنار کی بسم اللہ ملتوی کردی گئی ہے، اب جب خدا حضور سے ملائے گا، اس وقت ہی وہ رسم ادا کی جائے گی، خیر اس دنیا میں ملاقات جسمانی ہو یا نہ ہو سکے، مگر حوض کوثر پر کی ملاقات کے لئے ناامید نہیں ہوں، اور حال کے واقعات دیکھ کر صرف کافر ہی ناامید ہوگا، دعاؤں میں تاثیر آچلی ہے، جہاں گناہوں کا بوجھ لیتا ہوں وہاں بھی کبھی دل سے گڑگڑا کر دین کے لئے بھی دعا نکل جاتی ہے، اگر دس مرتبہ اپنے لئے ہوتی ہے، تو ایک مرتبہ خالص دین کی بہتری کے لئے بھی نکل جاتی ہے جو اس خالق مطلق کے دربار تک ضرور پہنچ جاتی ہے، انشاء اللہ اچھے نتائج نکلیں گے، اب تو حضور پیران پیر رحمۃ اللہ کی جن کے ساتھ حضور کے توسل سے ہم کو بھی رشتہ کی عزت نصیب ہو گئی ہے، ہمارے ساتھ دعا میں شریک ہوں گی، حضور ہم سب کو صبر و شکر کرنا چاہئے، اس میں عجیب لطف ہے۔ اور حقیقی بہتری انشاء اللہ چند دنوں میں اس کا پھل مل جائے گا، حضور کے ہمراہ مولانا سلامت اللہ صاحب سے ملنے کی بھی امید تھی، ان کو میں نے پرسوں سے خط نہیں لکھا ہے، وہ بڑے زوروں کے آدمی ہیں، اور ان کی بانگ سے ہم سب بیدار ہو جاتے ہیں، اس لئے

وقت نہیں ضائع کرتا اور اگر کسی فقرہ پر اعتراض ہوتا ہے تو اس کو نکال دیتا ہوں ورنہ دوسرا خط لکھ دیتا ہوں، اس میں کیا دشواری ہے۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہے،

انشاءاللہ اس جنگ کا جلد تو خاتمہ بالخیر ہوگا، اور ہم سب اطمینان کے ساتھ حضور کی قدم بوسی کریں گے یہ زمانہ آشوب زیادہ دن رہتا نہیں معلوم ہوتا،:۔

دیکھیئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
ایک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے، (غالب)

حضور دعا میں ہم کو ہرگز نہ بھولیں، ہم لوگ صبر و شکر کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں، مگر خدا کے طالب ہیں صراط مستقیم پر آخر دم تک قائم رکھے قرآن پاک میں صبر کی میرے خیال میں سب سے زیادہ تعلیم دی گئی، نمازیں پڑھو اور صبر سے کام لو، تمام ایسے امور میں جن میں ہم صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے ہم خاموش رہ کر گناہ سے بچتے ہیں، مو اکبر حسین صاحب نے اپنا نیا دیوان ہم کو بھیج دیا تھا، اس میں بعض اوقات تو وہ گوہر اور نکتہ موجود ہیں جن سے دل شاد ہو جاتا ہے، کیا خوب اور سچ لکھا ہے،:۔

ہر عمل نیر لے ہے اکبر تابع عزم حریف،
جب یہ موقع ہو تو بھائی کچھ نہ کرنا چاہیئے،

ہم لوگ سب بخیریت ہیں، محمد علی کے پاؤں میں خراش ہوگئی تھی جس کی وجہ سے وہ چلنے پھرنے سے منع کر دئے گئے ہیں، ذیابیطس والے کے لئے زخم برا ہوتا ہے، وہ اب اچھا ہو گیا ہے، انشاءاللہ کل یا پرسوں یہ چلنے پھرنے لگیں گے، اُن کے گھر میں اور بچے حضور کو اور گھر میں سب کو آداب کہتے ہیں،

حضور کا خادم شوکت علی

یہ وقت استقلال کا ہے

(۳۶)

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۰ مئی ۱۹۱۷ء، اللہ اکبر

جو خدا کا حکم ہے خوب ہے، مجھے توبہ کرنے میں عذر کیا
مگر ایک بات ہے واعظا، کہ بہار اب تو قریب ہے — اکبر

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کا تار ملا تھا، جواب سے حضور کو خیریت معلوم ہوگئی ہوگی، اسی عرصہ میں میرا مفصل خط جناب مولانا سلامت

اور ادھر خود گورنمنٹ مصیبت میں ہے، مناسب تو یہی تھا کہ اس وقت یہ پریشان بحث نہ چھیڑتی، دعا کا طالب ہوں، اپنے نفس سے بہت پریشان ہوں، وہ بڑا زبردست ہے، حضور توجہ فرماتے رہیں، ہم سے بے فکر نہ ہوں، غیر سے مجھ کو ذرہ خوف نہیں، اور خود اپنے سے،

حضور کا خادم شوکت علی،

اقبال کی ایک نظم

(۳۵)

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۱۶ راپریل ۱۷ء، اللہ اکبر

منظور مجھے شکوہ بیداد بتاں ہے،
للہ بتا دے کوئی اللہ کہاں ہے،

حضور والا، السلام علیکم،

تقریباً ۵ یا ۶ دن ہوئے کہ حضور کا حکم نامہ آیا تھا، مگر صرف لفافہ ہی دیکھنے کو ملا، دریافت کرنے کرنے پر ۳ دن کے بعد معلوم ہوا کہ وہ خط روک لیا گیا اور ہم کو نہیں ملے گا، حضور کو ہماری معذوریوں کا علم ہے اس لئے کبھی ہم کو دوسرے سیاسی امور پر حضور نہیں لکھتے ہاں جو کچھ ہماری روحانی دشواریاں ہوتیں ہیں، ان کو ہم حضور میں پیش کر کے اطمینان قلب طلب کرتے ہیں، ہم کو صرف خانگی اور ذاتی امور پر خط و کتابت کی اب اجازت ہے، اور مذہبی امور مسلمان کی زندگی کا سب سے بڑا جزو تھا، اس پر ہم مصر ہیں اور ہمیشہ رہیں گے، دنیوی معاملات کے متعلق جو حکم ملے چاہیں کیسے ہی لغو اور سخت کیوں نہ تھے ہم نے ان پر اپنی رائے کا صاف اظہار کرنے کے بعد جس طرح بن پڑا عمل کیا مگر اول دن سے ایسے احکام کو جو خدا کے بھیجے ہوئے حکموں کے خلاف تھے ہم نے قبول کرنے سے انکار کیا اور انشاء اللہ کریں گے، حضور اور ہمارے درمیان میں تو صرف کعبہ مکرم" اور رب کعبہ"، کا ایسا مضمون جس سے ہم کو دلی عشق تھا اور اب حضور کے طفیل سے اس بڑے رشتہ میں شامل ہو گئے تھے، جس کی بنا پر حضور پیران پیر شاہ جیلان رحمۃ اللہ علیہ سے غلامی کا تعلق ہو گیا تھا، بدقسمتی سے اس امر کا فیصلہ بھی غیر مسلموں کے ہاتھ میں کہ کون مسئلہ مذہبی تھے اور کون غیر مذہبی، میں تو اول دن سے صبر سے کام لیتا ہوں، اور جب دل پر کوئی سخت چوٹ لگتی ہے تو "رب کعبہ" کی بارگاہ میں عرض معروض کرتا ہوں، اور اس کی امداد طلب کرتا ہوں، خدا کا شکر ہے کہ وہ سمیع اور بصیر ہے اور ہماری خوب سنتا ہے اس پر ہمارا بھروسہ ہے، ہاں جب حضور کا خط نہیں ملتا ہے تو رنج ہوتا ہے، خدا کا شکر ہے کہ اس کی محبت میں یہ بھی تکلیف نصیب ہوتی ہے، اقبال نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی نسبت ایک نظم میں خوب لکھا ہے، جس کو پڑھ کر تسکین ہوتی ہے، اور قلب میں نئی طاقت آتی ہے،

اپنے خطوں کی مجھ کو ذرہ بھی فکر نہیں ہوتی اول تو میں خود بے کار معاملات پر جن کا سیاسی دنیا سے تعلق ہوتا ہے

حضور کے [illegible]
حسب خواہش نہیں ہوتا ہے، :-

جلوۂ حسن کچھ آسان نہیں لئے دیدہ شوق،
جور کا ذکر بھی ہے، حشر کی تمہید کے بعد،

بعد آدتشریف سے ۵ یا ۶ روز ہوئے کہ ایک خط ہمارے دونوں کے نام آیا تھا، لکھنے والے دو نقیب
زادہ سید سیف الدین گیلانی، تھے، معمولی دریافت خیریت تھی، اس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کو ہمارا الح
سلسلہ قادریہ میں بحیثیت غلام کے داخل ہونے کا علم تھا، حضور مزید حالات سے مطلع فرمایئے گا، اس
وقت وہ خط ملتا نہیں ہے، بعد کو بھیج دوں گا، محمدؐ علی کے گھر میں اور تمام بچے دست بستہ سلام کہتے ہیں
موسم نہایت خوشگوار ہے، غیر معمولی بارش سے اندیشہ قحط دگرانی ہوتا ہے، خدا محفوظ رکھے،
حضور کا خادم شوکت علی متعمد خادم الخدام کعبہ

حسرت کی ایک غزل

اللہ اکبر

(۳۷)

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۸ مئی ۱۷ء،

کچھ دامن کی خبر ہے نہ گریبان کا ہوش،
دل و دین کا ہے عاشق کو نہ ہے جان کا ہوش، (حسرت)

حضور والا، السلام علیکم،

برسوں تار ملا تھا، اور کل خربوزے اور آج خط، اس نے فضل کیا، بارش نے موسم کو ضرور خنک
کر دیا، مگر بیماری اور خاص کر بخار میں زیادتی کر دی، اور غریب خربوزوں کا تو ستیا ناس کر دیا، کل
کاٹنے بیٹھے، اور جس کو کاٹتے تھے، علیحدہ رکھتے جاتے تھے، مقام عبرت تھا کر لکھنؤ کے بہ
خربوزے اور اس قدر پھیکے، کہ اگر محمدؐ بھی ان کو کھا لیتا تو شکر میں اضافہ نہ ہوتا، حضور کی یاد آوری
شکریہ ادا کرنا تو گستاخی ہوگا، اس لئے زیادہ نہیں لکھتا، حضور کے خط کی پشت پر مولانا سلامت
صاحب کے لکھے ہوئے چند الفاظ تھے، ان سے گونہ تشویش اور صدمہ ہوا، خدا حضور کو جلد تر
فرمائے، تبدیل آب و ہوا کے لئے چھندواڑہ مناسب مقام ہوگا، کیونکہ یہاں گرمی بہت کم
اور بارش کے بعد تو موسم نہایت خوشگوار ہو جاتا ہے، کبھی پہاڑ پر جانے کی ضرورت نہیں ہوتی،
ہفتوں کا قیام انشاء اللہ بہتری صحت کا باعث ہوگا، ہر طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں، اور جنگل
ہر وقت تفریح اور ورزش کے لئے باہر جا سکتا ہے، حضور خون کا ملاحظہ ڈاکٹر انصاری یا سعید ا

صاحب کو ملا ہوگا، اس سے مزید حالات معلوم ہوگئے حضور کے پوسٹ کارڈ سے مسہلوں اور علالت طبع کا حال معلوم ہوا تھا، مگر دو ہی دن کے بعد مولانا سلامت اللہ صاحب کے خط سے اطلاع ملی کہ حضور اجمیر شریف تشریف لے گئے تھے، امید ہے کہ مع الخیر واپس تشریف لے آئے ہوں گے، ایک عزیز دوست کے خط سے یہ بھی معلوم ہوا تھا واپسی میں حضور بمبئی بھی تشریف لے گئے تھے، خدا کرے سب بخیریت ہوں، کل اخبارات میں یہ پڑھ کر خوشی ہوئی اجمیر شریف کے موقع پر مولانا سلامت اللہ صاحب کا وعظ ہوگا، مجھ کو کبھی سننے کا اتفاق نہیں ہوا، مگر اندازہ کرتا ہوں کہ جس وقت وہ مرد خدا جوش میں آکر فرمائیں گے تو بیان ضرور پر لطف ہوگا، اور پر اثر، خدا کرے ہم لوگ بھی سننے کا موقع جلد ملے، حضور اب مفصل حال اپنی طبیعت کا تحریر فرمائیں، تاکہ اطمینان ہو، میرے خیال میں تو حضور احسان بھائی کو ولایت سے بلالیں اگر جہاز مل جائے، وہاں اس وقت رہنا مناسب نہ تھا، ایک طوفان برپا ہے، گیہوں کے ساتھ غریب گھن بھی پس جائے گا، یہ وقت ایسا نہ تھا، کہ وطن چھوڑ کر باہر جاتے، مگر ان پر یورپ کا بھوت سوار تھا، حضور کی دعا تھی کہ جاتے میں بچ گئے، ورنہ موت میں کیا باقی رہا تھا، خدا اپنا فضل کرے، حضور، یہ وقت استقلال کا ہے اور صبر کا، ہم لوگوں کو خدا کی رحمت پر بھروسہ کرنا چاہیئے، وہ معاملات جو ہم کو تشویش میں ڈالتے ہیں، ان پر صبر کرنا چاہئے، اکبر نے کیا خوب فرمایا ہے:۔

ہر عمل تیرا ہے اکبر تابع عزم حریف
جب یہ موقع ہو تو بھائی کچھ نہ کرنا چاہیئے،

میرا تو اس پر عمل ہے، جو معاملات ایسے ہوں کہ جن کی نسبت ہم کو صاف صاف اور سچے حالات معلوم نہ تھے، ہم کوئی رائے قائم نہیں کرتے، اب تو بس یہی دعا ہے کہ خدا اس جنگ کا جلد خاتمہ بالخیر کرے تاکہ ہم لوگ زیارت بیت اللہ شریف اور روضہ اطہر کر سکیں، ممکن ہے کہ اس وقت مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ تک ریل بھی تیار ہو جائے، اور ہم سب اطمینان اور آسانی کے ساتھ سفر کریں، اگرچہ وہاں کی تکالیف یہاں کی آسائشوں سے زیادہ ہم کو عزیز ہیں، خدا سے دعا ہے کہ آپس کے نفاق اور قضیئے بھی سب طے ہو جائیں گے، اور حرم محترم واقعی حرم محترم ہوگا، اور کفر اور شرک کی نجاست سے پاک، محمد علی خود حضور کو مفصل لکھیں گے، ۸ یا ۱۰ دن سے حمیدہ کی بیماری سے پریشان ہے، اس کو پانوں سرد ہو کر جاڑہ آجاتا ہے، اور اب تک افاقہ نہیں ہے، اگرچہ بخار کم ہے، سول سرجن کا علاج ہے جو اب ایک ہمارے ہم قوم بنگالی ہیں، اول کا انگریز ڈاکٹر بھی بہت بھلا آدمی تھا، اور ابتدا، سے ہمارے ساتھ شریفانہ برتاؤ تھا، والدہ صاحبہ ابھی رامپور سے واپس نہیں آئی ہیں، فروخت جائداد کا کاغذ ابھی نہیں ہوا، ۲۰ ہزار کی قیمتی جائداد علیحدہ کر دی ہے، تاکہ موجودہ خرخشوں سے نجات ملے، واپسی میں لکھنؤ ضرور قیام فرمائیں گی، زاہد علی مع اپنے دونوں بھائیوں شاہد اور عابد کے آج یا کل تک آئے گا، وہ بھی غالباً لکھنؤ ٹھہرے، اب انٹرنس میں آگیا ہے، میری خواہش تھی کہ وہ حضور میں حاضر ہوتا، یہ زمانہ بھی انشاء اللہ جلد گزرنے والا ہے،

صاحب سے فرمالیں کیونکہ ہمیشہ سے وہ تکلیف دیتا ہے، کل میں حسرت کا دیوان پڑھ رہا تھا جو ان کی
ہادر اور بیوی، بہن نشاط بیگم نے مجھ کو بھیجا تھا، تمام کلام مرصع ہے، مگر ایک غزل کو پڑھ کر دل بھر آیا،
ور قلب پر عجیب اثر ہوا، میرا ارادہ تھا کہ حضور کو وہ بھیجتا مگر وہ تو عزیزی مولانا صبغۃ اللہ صاحب کے
رسالے میں شائع ہو چکی ہیں، مرصع ہیں، مطلع فقط لکھتا ہوں،:-

دستگیری کا طلب گار ہوں شیئاً للہ
بے نوا میں ناچار ہوں شیئاً للہ،
حال دل شرم سے اب تک نہ کہا تھا لیکن
آج میں درپئے اظہار ہوں شیئاً للہ
غوث اعظم سے جو مانگو گے ملیگا حسرت
بس کہو حاضر دربار ہوں شیئاً للہ،

پوری غزل مرصع ہے، حضور کا خط صداقت میں دیکھا، الناظر نہیں دیکھا ہے، مگر کل ولایت کے
نگریزی خط سے معلوم ہوا کہ محمدؐ کا پرائیویٹ خط جو انہوں نے راجہ صاحب محمود آباد کو مسلم یونیورسٹی
کے بارے میں لکھا تھا، اُس کو حاصل کر کے شائع کر دیا گیا، جو ناجائز تھا، حضور کو علم ہے کہ میں
مسئلہ یونیورسٹی کو اس وقت قابل توجہ نہیں سمجھتا، جب وقت آئے گا، اس ضروری مرحلہ کو طے
کرلیں گے، مگر محمدؐ کو اُس کی نسبت نہایت درجہ قلق ہے اس وجہ سے کہ ہماری کمزوریوں
سے تمام مسلمان کہیں بد دل نہ ہو جائیں، وہ اپنے دلی جذبات کو ضبط کرنے میں کامیاب نہیں
ہوتے، حضور دعا فرمائیں، حضور والا کے خطوط میں یاس کی بُو آتی ہے، حضور یہ وقت یاس کا نہیں،
انشاء اللہ تمام تکالیف اور پریشانیاں جلد تر دور ہو جائیں گی، حضور بس دعا فرمائے جائیں، خدا
یار اور مددگار ہے، انشاء اللہ یقینی بہتری اور برتری ہو گی، باران رحمت اس وقت ہوتا ہے جب
گرمی کی شدت سے مخلوق خدا پریشان ہو جاتی ہے، خدائے برتر سے بس یہ دعا ہے کہ خدا ہم ناکاروں
سے بھی کچھ کام لے لے،

حضور کا خادم شوکت علی،

ے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو احتراق خون کی شدید تکلیف تھی،

یہ بھی دِن کٹ جائیں گے دو چار دن کی بات ہے

(۳۸)

اللہ اکبر

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۱ر جولائی ۳۸ء،

حضور والا، السّلام علیکم،

خدا آپ کو زندہ اور سلامت رکھے، تاکہ حضور کے ذریعہ سے ہم لوگ بھی کچھ خدمت دین کر سکیں،
والدہ صاحبہ تشریف لے آئیں، اور اُن سے حضور کی صحت مزاج اور دیگر حالات اور پریشانیوں کی اطلاع ہو
انشاء اللہ یہ دن جلد تر خواب پریشان کی طرح گذر جائیں گے، اور ہم سب پھر اطمینان اور جوش کے ساتھ
اشاعت کلمہ حق میں کوشاں ہونگے، اور دنیا کو اسلام کے نور سے منور کر دیں گے، برادرم الطاف کو ہمار
پیار کہہ دیجیئے گا، اُن کی پریشانیوں سے رنج ہوا، خانگی امورات میں آج کل بدمزگی ہونا نہایت درجہ تکلیف
دہ تھا، خدا اپنا فضل کرے، ...جی کی نسبت مجھ کو اول بھی شبہہ ہوا تھا کیونکہ علی گڑھ میں ایک آدھ مرتبہ
مَیں نے ایسا کچھ سُنا تھا، جس سے اُن کی نسبت مجھ کو حسن ظن نہ تھا، اگرچہ ایک دوست اُن کے مداح
اب حال معلوم ہو گیا کہ میرا خیال صحیح تھا، خدا اُن کو راہ راست پر لائے، حضور والا، ان پریشانیوں
زیادہ صدمہ نہ اُٹھائیں، ہر بڑے خاندان میں بعض اوقات ایسے معاملات پیش آتے ہیں، خدا حضور
کو جلد تر تندرست فرمادے، نقصان مایہ کوئی بڑی حیثیت نہیں رکھتا مگر ہاں قلبی تکلیف ضرور پریش
کن ہوتی ہے، مگر آج کل اس پر بھی کچھ زیادہ تعجب نہ کرنا چاہیئے، خدا یہ دن بھی جلد گذار دیگا،:-

رنج و غم گھٹ جائینگے دو چار دن کی بات ہے
یہ بھی دن کٹ جائیں گے دو چار دن کی بات ہے

اور معاملات خوش کن ہیں، ہم تو خدائے برتر پر بھروسہ کئے بیٹھے ہیں، اور خوش ہیں، وہ ضرور ہم
سنے گا، اپنے لئے تو نہ عزت کی خواہش ہے، اور نہ ذلت سے ڈر ہے، ہم سے لاکھوں قربان ہو جا
مگر خدا دین کا بول بالا کرے، اور وہ انشاء اللہ ضرور ہو گا، میں ہرگز نا امید نہیں ہوں، ہمارے
معاملات کا حال حضور کو والدہ صاحبہ سے معلوم ہوا ہو گا، بہر حال میں خوش ہوں اور مست، حضو
بدولت ایسا کام نصیب ہو گیا ہے، کہ ہر وقت قلب میں خوشی رہتی ہے، اور طاقت، صداقت
کل ایک غزل حضرت تپش کی خوب نکلی ہے، دل جلے ہیں، ہمارے علی گڑھ کے اولڈ بوائے ہیں،:-

ذرا آنے تو دو مجنوں کو زنداں سے بیاباں میں
چھپی بیٹھی رہے گی لیلے، ہم بھی دیکھیں گے،
ہوئی تھی بے خودی طاری وہاں اک دشت پیما کو
چل اے جوش جنوں، صحرائے سینا ہم بھی دیکھیں گے

دون خطوط حضور کو مل جائیں گے، تو حضور کو تمام حالات سے آگاہی ہو جائے گی، اور تشفی بھی، کل شام
جسین کے سانحہ کا حال سُن کر دل کو از حد صدمہ ہوا، ہم سب لوگ سب دست بدعا ہیں، خدا ہم
کسوں کی ضرور سُنے گا، اور اُس غریب کو صحت عطا فرمائے گا، وہ مرد مسلمان ہے اور اس کی زندگی میں عظیم
ستان تبدیلی واقع ہو گئی ہے، اور آئندہ اور ہو گی، انشاء اللہ وہ اسلام کی بڑی خدمت کرے گا، خدا اپنا فضل
ے، ہم سب نے عجز و انکساری کے ساتھ دعا مانگی تھی، آج صبح ڈاکٹر انصاری کا تار آیا جس سے معلوم ہوا کہ حالت
بہتر تھی، خدا صحت عطا فرمائے ہم سب لوگ تار کو پڑھ کر خوشی سے رونے لگے، اور نماز نفل شکرانہ ادا
حضور نے ضرور دعا فرمائی ہو گی، ہماری خاص خواہش ہے کہ حضور راجہ غلام حسین پر توجہ فرمائیں، قلب
ہے، خدا اُس کو صحت کامل جلد عطا فرمائے، محمد علی کا تو ارادہ تھا کہ فوراً تار دے کر اجازت طلب
ے مگر میں نے منع کیا کیونکہ ہماری درخواست دس دن ہوئے کہ گورنمنٹ صوبہ اور عالیہ کو بھی گئی ہے، ہم نے
خواست کی ہے کہ اب ہم کو، ۲ ماہ نظر بند ہوئے گذر گئے، ہم نے صبر کے ساتھ تمام قانونی ہدایات کی پابندی
یا تو گورنمنٹ ہم کو بالکل آزاد فرمائے، یا اگر یہ مصلحت کے خلاف تھا تو ہم کو اول ستمبر سے آخر فروری تک
ہم پور میں نظر بند کر دیا جائے، تاکہ ہم روئی کے کاروبار کو دیکھ سکیں، اور یہ بھی خلاف منشا تھا تو ہمارے تمام
نقصانات کا بوجھ گورنمنٹ اٹھائے، ۱۵ ہزار سالانہ محض سود کا دینا ہوتا ہے، وہ ادا کرے اب ہم میں برداشت
کی گنجائش نہ تھی کیونکہ ہم ساری جائداد اپنی فروخت کر چکے ہیں، ہم کو امید قوی ہے کہ گورنمنٹ متوجہ ہو گی، اور
ہماری معقول درخواست کو منظور کر کے ہم کو آزاد کر دے گی، جواب کی آج کل میں امید ہے، کیونکہ مرمت کارخانہ
کا کام اول ستمبر سے ضرور شروع ہونا چاہیے، حضور دعا فرمائیں، کہ خدا گورنمنٹ کے مشیروں کو ہدایت نیک عطا
ے، تاکہ موجودہ دشواریاں دور ہوں، حضور دعا فرمائیں، والدہ صاحبہ اور تمام بچے حضور کو سلام کرتے
ہیں، ہمارا دست بستہ سلام مولانا سلامت اللہ صاحب کو برادرم قطب میاں صاحب، عنایت اللہ
صاحب، صبغۃ اللہ صاحب، الطاف، اور ممتاز میاں صاحب پیار اور سلام،

حضور کا خادم شوکت علی، متخذ خادم الخدام کعبہ،

برادرم الطاف کو ایک تحفہ بھیجا تھا، زاہد نے، غلام حسین صاحب کے تحفہ کے ساتھ، وہ یا کوئی اور
نیوایرا، کے دفتر جا کر لے آئیں، خدا غلام حسین[1] صاحب پر اپنا فضل کرے،

شوکت

---

[1] محمد علی کے چہیتے رفیق کار، کامریڈ کے سب ایڈیٹر، محمد علی کی نظر بندی کے بعد لکھنؤ سے "نیوایرا" نکالا، خوب چلا، ایک حادثے کے شکار ہو کر اس جہان فانی سے گزر گئے، محمد علی نے مرثیہ کہا،

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین — کوئی دن اور بھی جئے ہوتے
کچھ تو انعام حق پرستی کے — ہم غریبوں سے بھی لئے ہوتے

لانا سلامت اللہ صاحب کی شکایت بالکل درست تھی، محمدؐ نے اُن کو بڑا سا خط لکھا تھا، مگر وہ پاس
ہو سکا، میں انشاء اللہ کل ضرور لکھوں گا، انشاء اللہ امسال میرا روئی کا کارخانہ یا تو کرایہ پر اُٹھ جائیگا
عمدہ قیمت پر بک جائے گا، بہرحال ضرور نتائج اچھے نکلیں گے اگرچہ میری غیر حاضری وطن سے
ضرور نقصان کا باعث ہوگی، اگست میں وہاں نظربند ہونے یا رہا ہونے کی درخواست دونگا، تاکہ روئی
کے موسم میں کام کرسکوں، نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہے، اگر نہ بھی ملی تو یہاں ہی سے انتظام کروں گا، امسال
تھوڑے روپیہ کی ضرورت ہوگی، تاکہ انجن جو مرمت طلب ہے، درست ہو جائے، انشاء اللہ
روپیہ کا بھی انتظام ہو جائے گا، حمیدہ بانو کو بخار نہایت درجہ سخت ملیریا تھا، اب کمی ہے، مگر
نہایت درجہ کمزور کر دیا ہے، حضور دعا فرمائیے، ممتاز میاں صاحب نے نہایت عمدہ طور پر
دش کر کے آم بھیجے تھے، جو اچھی حالت میں پہونچے، بالکل طیار تھے، کل اُن کو کہا کر بھیجنے والے
دعائیں دیں، قطب میاں صاحب، مولوی عنایت اللہ صاحب، صبغۃ اللہ صاحب، بھائی
ملاقات سب کو سلام، خدا احسان کو جلد تر باصحت واپس لائے، اب تو حالت اور خراب
لئی، گھر تک یہ خبر پہونچ گئی ہے، بمبئی خطرہ میں ہے، خدا فضل کرے گا، والدہ صاحبہ سلام
تی ہیں، اور سب بچے دعا کے طالب،

حضور کا خادم شوکت علی،

راجہ غلام حسین

(۳۹)

ندواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۱ر اگست ۱۹۱۷ء، اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کی شکایت بالکل بجا تھی، کہ ہمارے خطوط دیر سے آتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ دو بڑے خط
علی کے جو اس نے حضور کو لکھے تھے، اب تک لاپتہ ہیں، اور ان کا انتظار رہتا ہے، کہ آج پاس
آجائیں تو حضور کو روانہ کئے جائیں، بالکل خانگی اور پرائیویٹ امور پر تھے، کسی سیاسی مسئلہ سے
ن نہ تھا، مگر خدا معلوم وہ کیوں سنسر نے ناگپور بھیج دیئے، ہم کو یہ بھی علم نہیں ہے کہ ناگپور گئے یا
ں پر تھے، آج محمدؐ علی پرانے اور نئے دونوں سنسروں سے مل کر اُن کی نسبت فیصلہ کریں گے، اور اگر
درت ہوگی، تو چیف کمشنر کو تحریر بھیج کر واقعات سے اطلاع حاصل کریں گے، یہ اپنے ڈپٹی کمشنر اور
سنسر آج کل کسی وجہ سے معطل ہیں، یہ ۲۳ برس کی خدمت کے انگریز ہیں، ان کی جگہ ایک اور صاحب
مقام ہیں، جو اول ہماری اردو کی خط و کتابت کا ملاحظہ کرتے تھے، چونکہ نئے ہیں اس لئے احتیاط سے
لیتے ہیں، جس کا اثر خط و کتابت میں تاخیر ہوتی ہے، حضور ہم کو قابل معافی تصور فرمائیں، جس وقت محمدؐ علی کے

مسٹر جناح کی خط و کتابت

(۴۰)

چھنداواڑہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۰ء،

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا،

(غالب)

حضور والا، السّلام علیکم،

محمد علی کے گھر میں غالباً لکھنؤ راستہ میں اُتری ہوں گی اور معظم بھی، ہماری خیریت حضور کو مل گئی ہو گی ہیں اس عرصہ میں بنگلہ کی مرمت وغیرہ میں لگا ہوا تھا، اس وجہ سے حضور کو نہ لکھ سکا، علاوہ ازیں مہمان آئے ہوئے تھے اور اُن کی موجودگی خطوط نویسی میں حارج ہوئی مجھ کو احباب سے معلوم ہوا کہ میرے کسی خط کی خاص طور پر شکایت کی جاتی ہے کہ جو میں نے حال میں حضور کی خدمت والا میں لکھا تھا حضور کو علم ہے اور حضور اس کی گواہی دے سکتے ہیں کہ میری عادت سخت خطوط لکھنے کی کبھی نہ تھی، طرح طرح کی افواہیں سُنی ہیں جن سے بعض اوقات ہنسی آتی ہے مجھ کو امید تھی کہ قبل اس کے کہ کوئی کارروائی کی جاتی ہم سے دریافت حال تو کر لیا گیا ہوتا اور یہ کہ آیا وہ خط ہمارا تھا یا کسی حضرت کی شرارت تھی میں نے اس معاملہ کا تذکرہ حضور سے بھی صرف اس غرض سے کیا کہ میرے نام کے ساتھ حضور والا کا نام بھی لگا ہوا تھا، ہم نے مسٹر جناح کو لکھا ہے کہ وہ برائے مہربانی اس خط کی نقل ہم کو بھجوا دیں بہتر تو اصل ہوتا یا اس کی عکسی تصویر۔ یہاں بفضلہ تعالیٰ خیریت ہے اور ہم سب لوگ تندرست ہیں ہاں محمد علی کی شکر میں زیادتی ہے حال کی کشمکش اُن کے لئے سخت خراب تھی خاص کر حمیدہ بانو[1] کی بیماری کے بعد۔ انشاء اللہ علاج اور پرہیز سے فائدہ ہو گا، والدہ صاحبہ کو جاڑہ آ گیا تھا مگر خدا نے اُن کو دو دِن کے بعد ہی صحت دے دی حضور سے قدمبوسی کو از حد دل چاہتا ہے، مگر راجہ صاحب جہانگیر آباد کے پھر مخل ہونے کا اندیشہ ہے، انشاء اللہ جلد لکھنؤ حاضر ہو کر ہی اطمینان سے ملیں گے۔ مولانا سلامت اللہ صاحب کا خط آیا خدا اُن کی زندہ دلی کو سلامت رکھے اب کی مرتبہ مرغ کے جنم سے بدل کر جنگل کے ہاتھی ہو گئے تھے۔ اور انہی اور اُن کی ہیئت کذائی کے بعد یہ ادا پسند آئی تھی۔ میں الزام سے بالکل بری ہوں۔ نہ زیادہ غصہ سے نہ تھا۔ موسم یکساں رہتا ہے۔

نہ ستم کا کبھی شکوہ نہ کرم کی خواہش
دیکھ تو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے

والدہ صاحبہ حضور کو اور گھر میں سب کو سلام و دعا کہتی ہیں۔ بچے اور محمد حضور کو سلام عرض کرتے ہیں،

[ا]ور سب دعا کے طالب ہیں، میرا سلام اور پیار، مولانا سلامت اللہ صاحب، بھائی الطاف، ممتاز میاں [ص]احب، مفتی صاحب، قطب میاں صاحب تک حضور پہونچا دیں۔

حضور کا خادم شوکت علی،

بی اماں

(۱۴)

[چ]ھندواڑہ ۲۰ نومبر ۱۹۱۷ء،

حضور والا، السلام علیکم،

عرصہ سے حضور والا کی خیریت مزاج نہیں معلوم ہوئی، خدائے برتر سے امید ہے کہ حضور مع تمام اعزا کے [خ]یر و خوبی ہوں گے، اخبارات سے مصروفیت کا حال معلوم ہوا تھا، اور ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان تمام امور [م]یں وقت کس قدر صرف ہوتا ہے۔ پرسوں ہمارے سنسر نے ہم کو مطلع کیا تھا کہ مولانا عنایت اللہ صاحب [ک]و دوبارہ ہمارے پاس آنے کی اجازت دی گئی ہے، مگر ابھی یہ نہیں معلوم ہے کہ وہ کب تک آئیں گے [ا]ن کو تاریخ روانگی کے لئے لکھا گیا ہے خدا کرے جلد تشریف لائیں، غریب محمد علی کو ۵ روز سے جاڑا [بخ]ار آنا شروع ہو گیا ہے، تین باریاں زور کی آئیں آج ناغہ ہوا ہے اور خدا سے امید ہے کہ اب وہ اس سے [ب]چے رہیں گے۔ پت اور بلغم زیادہ تھا، متلی نے زیادہ تکلیف دی، ۳۰ گرین کونین دی گئی کان گنگ [ہو]ئے، کمزور ہو گئے ہیں، انشاء اللہ جلد تر صحت ہو گی، حضور دعا فرمائیں، یہاں کی آب و ہوا اچھی ہے مگر [ب]لغم زیادہ پیدا ہوتا ہے، مجھ کو بھی کچھ شکایت تھی مگر ہلکا سا مسہل لے کر میں تو بچ گیا۔ عزیزی سلطانہ بانو [کو] بھی جاڑا آنے لگا ہے اور آج بھی زور سے آیا خدا کا شکر ہے کہ والدہ صاحبہ اب اچھی ہیں، واقعہ [یہ ہ]ے کہ اُن کی ہمت کے مقابلہ میں کسی بیماری کا ٹھہرنا دشوار معلوم ہوتا ہے رام پور کے خطوط سے یہ معلوم [ہو]کے خوشی ہوئی کہ حمیدہ بانو کو اب دس دن سے بخار نہیں آیا وہ مراد آباد میں معظم علی کے پاس تھی اب غالباً [آ]گئی ہوگی مع محمد علی کے گھر کے۔ اُن کی طبیعت بھی خراب ہے پھر قلب پر وہی پرانا دورہ پڑا تھا ان پریشانیوں [ک]ی وجہ سے محمد علی کی پریشانی بالکل بجا تھی، خیر یہ دن بھی جلد تر گذر جائیں گے، اور ہم سب پھر خوش و خرم [ہو ج]ائیں گے، ہم اخبارات کو بہت شوق و غور سے پڑھتے ہیں، اس لئے تمام بیرونی اور اندرونی حالات [س]ے آگاہی ملتی ہے، حضور خیریت مزاج سے مطلع فرماتے رہا کریں، حضور کی صحت کی طرف سے فکر ہے، [ا]ب تک افاقہ نہیں ہے، خدا صحت کامل عطا فرمائے۔ محمد علی حضور کو دست بستہ سلام عرض کرتے ہیں، [ا]ور طالب دعا ہیں۔

مولانا سلامت اللہ صاحب، مولانا عنایت اللہ صاحب، قطب میاں صاحب، مفتی صاحب، بھائی

الطاف، ممتاز میاں صاحب، صبغۃ اللہ صاحب، سب کو سلام اور پیار، مولانا عنایت اللہ صاحب کا انتظار ہے، ویسے سب خیریت ہے، ہم دونوں کی درخواست کہ سکرٹری ہند سے ہماری ملاقات ہو مسترد کر دی گئی، محمد علی کو ۲۶ کے ڈپوٹیشن میں جانا ہے مگر ابھی کوئی اطلاع نہیں ملی ہے کہ اجازت ملے گی یا نہیں، غالباً نفی میں اس کا بھی جواب ہوگا پرلطف زمانہ ہے ہم لوگ اس گوشہ عافیت میں بیٹھے ہوئے دنیا کے دنگل کا تماشا دیکھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں، محمد علی کی صحت کی طرف سے ذرا پریشانی ہے،

حضور کا خادم شوکت علی،

خود اپنے ہاتھ سے پھر دست بستہ اداب عرض کرتا ہوں، محمد علی،

ذاتی حالات

(۴۲)

اللہ اکبر

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۰؍دسمبر ۱۷ء،

ایسا بھی دے کے دل کوئی مجبور غم نہ ہو
یوں بھی نہ خاتمہ ہو کسی کے غرور کا، (حسرت)

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کا خط ملا تھا، اور اس کے بعد کا تار بھی، اجازت کے لئے ڈپٹی کمشنر کو لکھ دیا ہے اور انہوں نے ہم کو بھی بتایا کہ بالا بالا حضور کی تحریر بھی آئی تھی، جس دن اطلاع ملی فوراً تار دیا جائے گا، حضور کی قدمبوسی کا از حد اشتیاق ہے اور خدا جلد یہ عزت دے، حضور کے خط کا جواب دینے کو تھا مگر اس عرصہ میں اور ضروری امور پیش کرتا کہ اس کا لکھنا اطمینان کے وقت کے لئے ملتوی کیا، حضور دعا فرمائیں، انشاء اللہ... کارخانہ کی فروخت میں فائدہ ہوگا، اگرچہ اس کی قیمت اب دوگنی ہو گئی ہے، مگر مجبوری کو جس قدر مل جائے اچھا ہے، اتنا ضرور یقین ہے کہ تھوڑا بہت فائدہ ضرور ہوگا، اگر وہ ہمارے پاس رہتا تو ضرور بڑا فائدہ رہتا مگر موجودہ حالت میں اس کا سنبھالنا دشوار تھا، تمام اعزہ خود اپنی زمینداری کی افکار میں تھے، اور فضول کام کا بوجھ ڈالنا جب کہ کام کی فرصت نہ تھی، عقلمندی نہ تھا۔ انسان اُس وقت بوجھ اٹھائے جب طاقت ہو، انشاء اللہ میں خود آزاد ہو کر سب کی مدد کروں گا، اور چند سالوں میں خود دوسرا کارخانہ بنا لوں گا، اب جس کے ہاتھ فروخت کرتا ہوں، اگرچہ بالکل مسلمان نہیں ہے، مگر خوجے ہیں، اور وہ بھی آغا خانی نہیں، اس لئے امید پڑتی ہے کہ آئندہ اُن کو صراط مستقیم پر لایا جا سکے گا، خیر جو کچھ نتیجہ ہو، موجودہ قرضہ کے بوجھ سے سبکدوشی لازم ہے، کیونکہ سود دینے کی اب تاب نہیں ہے، دین اور دنیا دونوں کا خسارہ ہے، کارخانہ کے بیع کے بعد انشاء اللہ سب ادا کر کے اتنا بچ جائے گا، کہ بچے تعلیم اور پرورش

پاجائیں گے، اور یہ قرضے سے آزاد ہو کر حج بیت اللہ شریف سے سبکدوش ہوں گا، اور دل کھول کر خدمت دین اطمینان قلب کے ساتھ کروں گا، حضور بھی دعا فرمائیں، ابھی کوئی بات پختہ نہیں ہوئی ہے، مولوی عنایت اللہ صاحب کو مفصل حالات معلوم ہیں، اور انہوں حضور سے میرا پیام کہہ دیا ہو گا، اب اطمینان سے سب عرض کرونگا جب قدم بوسی ہوگی، والدہ صاحبہ رامپور گئیں، عزیزی خورشید کی علالت میں اضافہ ہے، حضور سے غالباً ملی ہوں گی، دنیا میں اب کسی کے قول کا اعتبار نہ رہا اور دل میں اب مصمم ارادہ ہے کہ صرف ذات باری تعالےٰ پر بھروسہ کیا جائے اور اس کے بعد اپنی قوت بازو پر، ہم لوگ صبر اور صلوٰۃ سے کام لیتے ہیں، حضور بھی ضبط فرمائیں، خدا ہماری سنتا ہے، اور گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگیں گے، کہ خدا ایمان پر قائم رکھے اور آزمائش کے وقت مضبوط رکھے، حسرت موہانی خوب لکھتا ہے، خدا اس کو اجر دے، :-

ایمان واتقاہی نہیں شان اولیاء،
بےحزن وخوف غیر بھی ہے جان اولیاء

محمد سلام عرض کرتے ہیں، حضور کا خادم شوکت علی،

"لیڈر" کے دو مضمون،

(۴۳)

چھندواڑہ ۲۲ جنوری ۱۹۱۶ء،

حضور والا، السلام علیکم،

اس عرصہ میں خاموش رہا جس کی معافی کا خواستگار ہوں، بیکار نہ تھا۔ اس ماہ مبارک میں ۱۴ مولود شریف ہوئے اور سب میں شریک ہوا اور کچھ بیان بھی کیا، اور نظمیں بھی سنائیں، محمد نے حسب معمول نہایت فصاحت کے ساتھ ان صحبتوں میں تمام حالات اس پاک زندگی کے فرمائے جس سے ہماری عزت اور نجات تھی، آخر میں غزوات کا حال ناتمام رہا کیونکہ ان کو زکام کی وجہ سے ۴ دن بخار رہا تھا، اب تندرست ہیں۔ اخبارات سے حالات معلوم ہوتے ہیں "لیڈر" نے حال میں دو مضمون نقل کئے ہیں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ عجیب وغریب حالات دنیا میں پیش آنے والے تھے۔ خوب پر لطف شرائط تھیں، حضور نے ملاحظہ فرمائے ہوں گے، میں بھیجدونگا۔ افسوس کہ حضور کے ملنے کی اجازت نہیں ملی، ہم نے دوبارہ لکھا ہے اور سختی کے ساتھ دریافت کیا ہے، کہ کیوں ہم کو اجازت نہیں ملی، کہ ہم حضور کی قدم بوسی کر سکتے۔ خدا معلوم کیا خوف اور وجہ ہے کہ فضول رکا جاتا ہے، میں نے اخبارات میں حضور کا گشتی خط پڑھا، جمعیتہ کا احیا ضروری تھا، مگر میں جمعیت کے روپیہ سے کسی قسم کی امداد قبول نہیں کروں گا۔ ہاں جب ضرورت ہو گی نہایت خوشی کے ساتھ اپنے تمام اعزا اور احباب اور خدام کعبہ سے روپیہ طلب کر لوں گا۔ اور اس کو استعمال کروں گا،

ی الحال امید ہے کہ گورنمنٹ کو مجبوراً ہمارے الاونس میں اضافہ کرنا ہوگا، ہمارے بچے اب بڑھ گئے ہیں اور تین ڑکوں کو علی گڑھ امسال پہونچنا ہوگا، جس کے معنی یہ ہیں کہ مصارف میں (۱۵۰) ایک سو پچاس ماہوار کا اضافہ ہوگا مید ہے کہ گورنمنٹ ہمارا الاونس ۵۰۰ ماہوار کا کر دے گی، میرے کارخانہ کے نقصانات ۵۴ ہزار ادا کرنے سے اب تک گورنمنٹ انکاری ہے، اب مشیران قانون کو تمام کاغذات بھیجتا ہوں، حضور دعا فرمائیں، والدہ احبہ بخیریت پہونچ گئیں، باوجود تکان وغیرہ کے اُن کے قلب میں طاقت معلوم ہوتی ہے اور خوش ہیں۔

میر اسلام برادرم الطاف الرحمٰن، مولانا سلامت اللہ مولوی عنایت اللہ صاحب، قطب میاں احب، ممتاز میاں صاحب اور دیگر احباب کو عرض کر دیجئے گا۔ شعیب[۱] یہاں آئے تھے وہ نیوابر کے م میں مدد دینگے اُن کو اور کام بھی تھا، حضور کی امداد نہیں کرسکیں گے، مسجد کا پرانا سامان بیکار فروخت کے اس کا روپیہ وصول کیا جاسکتا ہے؟ اور اس کو مسجد میں لگایا جائے،

حضور کا خادم شوکت علی،

۱ شعیب قریشی مشہور خادم خلافت جو بعد کو گاندھی جی کے اخبار ینگ انڈیا کے ایڈیٹر ہوئے اور اُن کو مولانا محمد علی کی چھوٹی صاحبزادی ا بیگم بیاہی گئیں، قیام پاکستان کے بعد کراچی آگئے، روس میں پاکستان کے سفیر بن کر گئے دہلی میں پاکستان کے ہائی کمشنر رہے پھر وزیر اطلاعات ہوئے معذ منصب فائز رہ کر کچھ عرصہ ہوا انتقال فرما گئے۔

خوددار قیدی

ندواڑہ (صوبہ متوسط) ۱۲ فروری ۱۸ء، (۴۴) اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کا حکم نامہ ملا تھا، اُس سے قدرے تشویش ہوئی تھی، ادھر کو صحت خراب اور اُدھر طرح رح کے روزمرہ نئے زخم، خدا حضور کو صبر و استقلال فرمائے جس کے ہم آپ مستحق ہیں، یہ زمانہ ابتلا اء اللہ جلد گذر جائے گا، اور پھر ہم ساتھ ساتھ حج بیت اللہ شریف کے لئے جائیں گے، حضور تو ایک ر زیارت فرما چکے ہیں اس لئے بغیر ساتھ ہوئے ہم لوگ جانے نہیں دیں گے، اُس وقت انشاء اللہ طرف امن و امان ہوگی، اور ہم لوگ اطمینان قلب کے ساتھ اپنے فرائض سے سبکدوش ہوں گے، نے ہمدم میں حضور کا خط پڑھا خدا حضور کو زندہ اور سلامت رکھے، تاکہ تقویت دین ہو اور ہدایت سامان ہو، میں ممنون ہوا کہ حضور نے میری خواہشات کا اظہار فرما دیا تھا، اپنے احباب اور برادران خدام سے خانگی امداد طلب کرنے میں ہم کو ذرہ باک نہ ہوگا، اور انشاء اللہ تھوڑا تھوڑا کر کے بڑی رقم فراہم جائے گی، فی الحال ہم کو امید ہے کہ جائز مطالبات پر گورنمنٹ ہمدردانہ توجہ کرے گی، کلکتہ کے احباب سے لکھ

کہ ہم نے ۵ روپیہ ماہوار ہر ایک کا مقرر کرا لیا ہے، تاکہ شرکت ہو جائے، اور ہمارا حق خراج قائم رہے، ۵ ار وپیہ کا منی آرڈر فوراً بھیجدیا گیا اور اس کے علاوہ کمیٹی اعانت نظر بندان نے ۵۰ ماہوار کا منی آرڈر اور بھیجدیا، جس کا مطلب میں اول نہ سمجھا مگر بعد کو خط سے معلوم ہوا کہ یہ میرے بچوں کی تعلیم کے لئے تھا، اس قدر توجہ اور محبت کا دل پر اثر ہوا اور یقین ہو گیا کہ نظر بندان اسلام اور ان کے اہل و عیال کے ساتھ فراخ حوصلگی سے کام لیا جائے گا، اس کا اثر خود ہم سب پر اور تمام دنیا پر پڑے گا، خود سب کو اور توفیق خدمت دین دے یہ ۵۰ ماہوار میں واپس کر رہا ہوں، کیوں کہ ان کی فی الحال ضرورت نہیں، امید ہے کہ گورنمنٹ جلد تر ہمارے الاونس کو ۳۰۰ روپیہ ماہوار سے بڑھا کر ۵۰۰ ماہوار ہر ایک کا کر دے گی، ہاں کارخانہ کے نقصانات کی ادائیگی سے اب تک انکار ہے مگر کل میں نے دوسرا اور صاف صاف خط لکھا ہے، جس پر امید ہے کہ توجہ کی جائے گی، یہ بھی عجیب تماشہ ہے کہ میرے روئی کے کارخانہ کی قیمت بھی اس عرصہ میں دوگنی ہو گئی ہے، میری کاٹن مل ضرور کامیاب ہو گی، ایک سال کی محنت میں تمام نقصانات کی تلافی ہو جائے گی، انشاء اللہ تعالیٰ میں اس سے ہرگز مایوس نہیں ہوں، امسال روئی کا بھاؤ نہایت عمدہ اور بڑا تیز ہے، جو چیز معمولاً ۲½ سو کو ملتی تھی، اس کی قیمت اب ۶۰۰ کے قریب ہے، اور مانگ بھی زائد، اس لئے صرف باری تعالیٰ کے حکم کی دیر ہے، آزاد ہو کر ایک سال میں انشاء اللہ کافی کما لیں گے، خدا حضور کو صحت کامل عطا فرمائے، مولانا سلامت اللہ صاحب کو ہمارا اسلام مسنون پہونچا دیں، اور کارخانہ کے متعلق اطلاع فرما دیجئے گا، انہوں نے ہمیشہ سے دلچسپی اس کے معاملات میں لی ہے، یہ ہماری قسمت تھی کہ ہم لوگ نظر بند ہو گئے، اور اس تین سال میں برابر نقصانات ہوئے، خیر خدا مالک ہے، حضور دعا فرمائیں، انشاء اللہ جلد خدمت والا میں حاضر ہو کر قدم بوسی کریں گے، حضور کو کیوں یہاں تشریف لانے کی اجازت نہیں ملی، اس کا جواب ہماری سمجھ سے باہر ہے، ہم لوگ مجبور ہیں، اور جہاں تک ممکن ہو گا، تمام ایسے معاملات میں احکام کی پابندی کریں گے مسجد کی تعمیر نہایت سرعت سے جاری ہے، انشاء اللہ قبل برسات ختم ہو جائے گی، ایک شرعی مسئلہ کی نسبت حضور کو غالباً لکھا گیا تھا، اس مسجد کے اوپر کہیں مل تھی، اس کے کپڑے اور لکڑی فروخت کر دی گئی تھی، اور اس کا روپیہ مسجد میں لگایا جاتا تھا، مگر بعد کو شبہہ ہو جانے سے معاملہ کو ملتوی کر دیا ہے، بظاہر تو درست معلوم ہوتا ہے، کہ مسجد کے سامان کا روپیہ اگر مسجد میں ہی لگایا جائے تو خلاف حکم نہ ہو گا، ورنہ اس کا کیا مصرف ہو گا، پڑے پڑے ضائع ہو گا حضور مطلع فرمائیں، والدہ صاحبہ اور محمد علی کے گھر میں زکام اور بخار میں مبتلا تھیں مگر اب افاقہ ہے، والدہ صاحبہ کو اب بھی کچھ باقی ہے، محمد علی کو رات کو بخار آ گیا تھا، خفیف تھا، ان کی صحت بظاہر درست ہے، مگر اب وہ طاقت نہیں ہے، جو اول تھی، اور اور زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی، یہ منحوس بیماری اندر اندر جسم اور صحت کو کھوکھلا کرتی ہے، علی گڑھ کے

معاملات میں کامیابی ہوئی، ان مفسدوں اور منافقوں کا ایسا تدارک کیا جائے کہ آئندہ ہمت نہ پڑے
کہ خواہ مخواہ مسلمانوں میں نفاق ڈلوائیں، والدہ صاحبہ حضور کو سلام کہتی ہیں، اور قطب میاں صاحب
اور تمام گھر کو پیار اور بچے دست بستہ آداب عرض کرتے ہیں، ابین صاحب اور اسداللہ خاں صاحب معقول
آدمی ہیں، اور حضور ان کو دوبارہ بلوائیں،

حضور کا خادم شوکت علی،

زیارت بیت اللہ کی حسرت

(۴۵)

اللہ اکبر

گھسارواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۲/۲۴ فروری ۱۹۱۸ء،

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کا حکم نامہ ملا، حالات سے آگاہی ہوئی، حضور نے بالکل درست فرمایا ہے، جو تعلقات کہ ہماری
خوش قسمتی سے حضور اور ہمارے درمیان قائم ہو گئے ہیں، اُن کے لئے جسمانی ملاقات کی ضرورت نہیں ہے
انشاءاللہ نہ ملنے پر بھی وہ رشتہ اور مضبوط ہوتا جائے گا، جس قدر ہمارے ایمانوں میں پختگی آتی جائے
گی، اُسی قدر ہمارا تقرب حضور سے اور ہوتا جائے گا، تاہم اگر قدم بوسی ہوتی جاتی تو کسی کا کچھ نقصان نہ تھا
مگر اس میں بھی خدا کی طرف سے کچھ بہتری ہوگی، ہم تو ہر حال میں راضی برضا ہیں، حسب حکم شرع شریف
مسجد کا ملبہ فروخت کر دیا گیا ہے، اور اُس کی قیمت صرف کی جاتی ہے مسجد کا کام نہایت سرعت سے
ہو رہا ہے، انشاءاللہ قبل از برسات وہ تیار ہو جائے گی، کام مضبوط اور عمدہ بننا ہے، اور انشاءاللہ
مسجد نہایت خوبصورت اور شاندار ہوگی، اگرچہ چھوٹی سی، یہاں کی حیثیت کے مطابق، حضور کی مسلسل بیماری
کی وجہ سے فکر ہے، خدا حضور کو بالکل تندرست کر دے، دہلی ضرور جاکر حضور، حکیم اجمل خاں صاحب سے
بھی رجوع فرمائیے، خدا نے اُن کے اور ڈاکٹر انصاری صاحب کے ہاتھ میں، شفا دی ہے، مجھے اندیشہ ہے
حضور اس پر آشوب زمانہ میں جواز مقدس نہ جاسکیں گے، یقیناً اس وقت مدینہ طیبہ ہی مقام امن رہ گیا ہے،
جہاں قلب مومن تسکین پائے، خدا جلد تر بلاد اسلامیہ کو تمام حوادث سے محفوظ کر دے اور اس سے کفر کی
گندگی اور نجاست دور ہو، انشاءاللہ بعد از اختتام جنگ یہاں کے کاموں سے فراغت حاصل کر کے زیارت
بیت اللہ سے مستفید ہوں گا، تخمیناً تو یہی ہے، اور اس کے بعد ایک لمبا سفر افریقہ، یمن، اور نجد وغیرہ کا
یورپ کے دیکھنے سے قبل تمام ممالک اسلامیہ کی سیر کرنے کا ارادہ ہے، انشاءاللہ یہ تمنا بھی پوری ہوگی، خدا
کرے یہ جنگ جلد تر خاتمہ بالخیر کو پہونچے، انشاءاللہ میری ردّی کامل ضرور بعد از جنگ کامیاب ہوگا، اور اُس
کے ذریعہ سے اس قدر سرمایہ جمع ہو جائے گا، کہ اطمینان سے خدمت دین کی طرف ہم سب متوجہ ہوں گے،

اور دنیا کے روزمرہ کے بکھیڑوں سے نجات ہو جائے گی، محبوب میاں صاحب نہایت درجہ بدمعاملہ ثابت ہوئے، جو روپیہ اور رسید بکیں جو اپنے ساتھ لے گئے تھے وہ اب تک واپس نہیں آئیں بلکہ گمان تو یہ تھا کہ وہ رسید بکوں کا روپیہ وصول کر کے داخل نہیں کیا، وہ ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ اُن کو دوبارہ حضور کام دینی سپرد کریں، متدین نہیں ہیں اور بیکار آدمی ہیں، جب حضور مولانا عبدالماجد صاحب کو خط لکھیں تو ہمارا بہت بہت سلام تحریر کر دیں، اُن سے ہمیشہ شکایت رہے گی کہ وہ جبل پور تک ایک مرتبہ جلسہ وعظ کے لئے تشریف لائے مگر ہم تک نہ آسکے، یہاں موسم میں بہار کا لطف آگیا ہے، اور سردی غائب ہو گئی ہے، اگرچہ گرمی یہاں برائے نام ہوتی ہے، صرف مئی ذرہ سخت ہوتا ہے، وہ بھی دوپہر کے وقت جبکہ پنکھے کی ضرورت گرمی کو دفع کردیتی ہے، شب ہمیشہ پر لطف ہوتی ہے اور اکثر فرد کی ضرورت پڑتی ہے اور برسات کے بعد تو اندر سونے کی ضرورت پیش آتی ہے، ہم کو خدا کی رحمت سے ایک منٹ کیلئے مایوس نہیں ہونا چاہیئے، خدا ہم کو بس ایمان پر قائم رکھے دل میں وہی محبت دیتی ہے، اور صبر و شکر کے خزانہ میں اُس کے فضل سے کمی نہیں، آئندہ کا وہ مالک اور جاننے والا ہے، حضور کو علم ہے کہ میں . . . بیرونی معاملات اور اثرات کا ہمیشہ شکریہ ادا کرتا ہوں مگر کبھی اُن کے بھروسہ پر اپنے اعمال کو مبنی نہیں کرتا، اسی لئے کبھی مایوس نہیں ہوتا، دوسروں کی تعریف اور تحسین اور مدد کا ہمیشہ خواستگار اور ممنون ہوتا ہوں، مگر بھروسہ صرف ذات باری تعالےٰ پر کرتا ہوں، اور اُس کے احکام اور مرضی کی ماتحتی میں اپنی واحد ذات پر تمام دنیا کے کاموں کا انحصار کرتا ہوں،

طمع فاتحہ از خلق ندارم نیاز ؛ عشق من در پس من فاتحہ خوانم یا قیست

بفضلہ تعالیٰ اب تک ایمان پر قائم ہوں، اور دل میں طاقت ہے، حضور کی دعا کا ہر وقت بھوکا ہوں، پُر لطف زمانہ میں دنیا کا تماشہ دیکھتا ہوں، محمد علی سلام عرض کرتے ہیں، وہ بہت کمزور ہو گئے ہیں، اور بیماری کا مقابلہ نہیں کر سکتے، میں بے فکری کا کھانا کھا کر موٹا ہو گیا ہوں، دبلے ہونے کی کوشش اور ورزش جاری کی ہے، حضور کی صحت مزاج کی دعا کرتا ہوں، غالباً حضور کا ۲۶ کو دہلی جانا ہو گا، شعیب ابھی وہیں ہے،

حضور کا خادم شوکت علی، خادم کعبہ

سنسر سنسر

(۴۶)

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۲ مارچ ۱۹۱۸ء، — اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کا حکم نامہ آیا تھا، مگر سوائے لفافہ کے اب تک اور زیادہ دیکھنا میری قسمت میں نہ تھا، سنسر نے مجھ کو مطلع کیا کہ انہوں نے حسب معمول چیف سکرٹری کو ناگپور بھیجدیا، علی العموم تو حضور کوئی بات ایسی نہیں لکھتے ہیں، جس پر

وہ مالک داتا ہماری مدد کریگا

(۴۷)

الله اکبر

ہنڈواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۸ مئی ۱۸ء

حضور والا ! السلام علیکم

حضور کا تار کل شام ملا تھا، آج صبح جواب میں تار ارسال کر دیا تھا، حضور کی خیریت کی اطلاع مل گئی ہوگی، اس عرصہ میں مجھکو معلوم ہوتھا کہ حضور لکھنؤ سے باہر گئے تھے، اجمیر شریف سے گلبرگہ شریف وغیرہ تک کی زیارت کا ارادہ تھا، اور ٹھیک، پر یہ معلوم نہ تھا کہ اب تک واپس تشریف لائیے گا، اسی لئے خط نہیں لکھا گیا تھا، حاجی ماموں کے خط سے بعد کو معلوم ہوا تھا، کہ حضور تشریف لے آئے تھے، اور عنقریب کسی پہاڑ پر جانے کا قصد تھا، آج والدہ صاحبہ سے اطلاع ملی کہ حضور نے کچھ دنوں کیلئے پہاڑ پر جانیکا ارادہ ملتوی کر دیا ہے، حضور کی خرابی صحت سے پریشانی رہتی ہے، یہ کس قسم کا زہری مادہ تھا کہ اب تک اوس کا تدارک نہیں ہوا، اس کا علاج حضور پوری کوشش سے فرمائیں خدائے برتر صحت عطا کریگا، اوس کو ابھی حضور کی ذات سے بہت سی خدمات لینا ہیں میں اس وجہ سے زیادہ پریشان نہیں ہوتا، وہ مالک اور آقا ہماری مدد کرے گا۔ مولینا سلامت اللہ صاحب کا ایک پوسٹ کارڈ اپنے خاص رنگ میں لکھا ہوا آیا تھا، خدا کا شکر ہے کہ ہمارے موجودہ سنسر معقول آدمی ہیں ان الفاظ مذکور کو کوئی خفیہ سازش کا آلہ نہیں ٹھہرایا، میں شاعر نہیں ہوں، قوافی اور ردادف اگر کوشش کروں تب بھی دستیاب نہ ہوں، اس لئے خاموش رہا، اور ارادہ کیا کہ جب کبھی ملاقات ہوگی تو انشاء اللہ نثر میں جواب دونگا بفضلہ تعالیٰ ہم لوگ تندرست ہیں، اور خوش، صابر و شاکر ہیں اور دست بدعا، یہ ضرور ہے کہ اس نہس زندگی سے دل اکتا گیا ہے، مگر قرآن پاک میں بھی صبر کی بہت زیادہ تعریف فرمائی گئی ہے اس لئے ہم لوگ پابند حکم ہیں، یہ ضرور ہے ہم خود دیکھتے ہیں کہ صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے اور انشاء اللہ اب بھی ہم کو مالک حقیقی کے یہاں سے اوس کے صلہ میں انعامات ملیں گے، تاہم غالب مرحوم کا کلام ہماری سچی تصویر کھینچتا ہے :۔

جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن ۔۔۔ بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

حضور کی قدمبوسی کا از حد اشتیاق ہے، اگر خدا کو منظور ہے تو جلد تر نصیب ہوگی، بعد نماز فجر اور عشا، ضرور حضور کو یاد کر لیتا ہوں، اور جب ہفتہ میں ایک یا دو بار نماز تہجد نصیب ہو جاتی ہے، تو دل کھول کر مل لیتا ہوں، حضور کی دعا اور مدد کی بہت ضرورت ہے، حضور ضرور بعد نماز یاد فرمالیا کریں، روئی کے کارخانہ کے اب کئی گاہک کھڑے ہو گئے ہیں، اور یقین ہے کہ اچھے دام مل جائیں گے اگرچہ میں علٰیحدہ کرنا نہیں چاہتا ہوں، ایک چندولی کا مارواڑی ۱/۴ الاکھ فقط مشینری کا دیتا ہے، کچھ لوگ اوس کو سالانہ ٹھیکہ پر بھی لینا چاہتے ہیں، میں بھی پسند کرتا ہوں کہ ٹھیکہ پر دے دوں، مسٹر عمر سبحانی رئیس بمبئی، جو میرے دوست ہیں کوشاں ہیں کہ ٹھیکہ کی رقم کے اعتبار پر دوبارہ روپیہ قرض لے لیا جائے اور پرانے روپیہ کا قرض ادا کر دیا جائے، مجھ کو یہ رائے پسند ہے، حضور دعا فرمائیں، کہ معاملہ کامیابی کے ساتھ طے پا جائے اور نواب صاحب رامپور نے از راہ پرورش قدیمی میرے مقدمات کی تاریخ میری درخواست پر ۱/۲ ماہ کیلئے ملتوی

مسٹر معظم علی، محمد علی کے برادر نسبتی حضرت رح کے مرید

اعتراض ہوسکے، مگر آج کل اعتراض کا ہونا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی، اس لئے مجھ کو زیادہ تعجب نہیں ہوتا ہے، خدا کرے حضور والا تندرست ہوں، گرمیوں میں طبیعت اکثر خراب رہتی تھی اس لئے اندیشہ لگا ہوا ہے، حضور جلد تر خیریت مزاج سے مطلع فرمائیں، کل اخبارات میں حضور کا خط پڑھا خدا کا شکر ہے کہ حضور جمیعت کے کام سے بے خبر نہیں ہیں، ہم لوگ صبر و شکر کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں، اور یہی نہیں کہ خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں، بلکہ اُس سے فضل کے امیدوار ہیں،:۔

حضور دعائیں یاد ضرور فرمالیا کریں، انشاء اللہ لکھنؤ میں ہی حاضر ہو کر قدمبوسی حاصل کریں گے، تمام گھر آجکل بھرا ہوا ہے، اور ہم سب بفضلہ تعالیٰ تندرست ہیں، موسم پر لطف ہے اور گرمی کے آثار ہیں، مگر گرمی یہاں زیادہ نہیں ہوتی ہے، آموں کی کثرت کی امید ہے اس لئے دل شاد ہے، میں دبلے ہونے کا علاج کرتا ہوں، تاکہ آموں کے کھانے کے لئے بہت سی گنجائش نکال لوں، حضور کو ہم سے نہ ملنے کا ضرور صدمہ ہوا ہوگا، مگر ہم کو خود بھی بہت صدمہ ہے، خیر یہ دن ہمیشہ نہ رہیں گے، آخر ایک دن تو اس جنگ عالمگیر کا خاتمہ بالخیر ہوگا، پھر اطمینان سے میں تو قدموں میں بہت زیادہ رہوں گا، خدا وہ دن جلد لائے، والدہ صاحبہ حضور کو اور تمام گھر کو سلام اور دعا کہتی ہیں، محمد علی کے گھر میں بھی سلام عرض کرتی ہیں، زاہد انٹرنس کا امتحان دینے ہوشنگ آباد گئے ہیں، امتحان ختم ہو گیا ہے، اب بھوپال ہوتے ہیں، انشاء اللہ پرسوں تک یہاں آجائیں گے، پرچے اچھے گئے ہیں، صرف ایک حساب کا پرچہ خراب تھا مگر امید اُس میں بھی کامیابی کی تھی، حضور دعا فرمائیں، گرمیوں کے لئے رامپور بھیج دونگا، جہاں مدرسہ عالیہ میں تعطیل میں فارسی اور عربی کی تعلیم کا سلسلہ شروع کراؤں گا، میرا مولانا سلامت اللہ صاحب، اور مولوی عنایت اللہ صاحب کو سلام پہونچا دیجئے گا، اور بھائی الطاف، ممتاز میاں صاحب، عزیزی قطب میاں صاحب، کو بہت بہت پیار، سب سے ملنے کو دل چاہتا ہے، انشاء اللہ جلد تر ملاقات ہوگی، محمد علی سلام عرض کرتے ہیں، مسجد کے نقشہ کی درستی میں مصروف ہیں، ایک عزیز کی شادی رامپور میں تھی، ہمشیرہ صاحبہ کی سخت تاکید پر اجازت طلب کی گئی تھی مگر وہی معمولی جواب ملا جس کی توقع تھی، یعنی یہ کہ اجازت نہیں دی جائے گی، اضافہ الاؤنس کے بارے میں ابھی کوئی اطلاع نہیں ملی ہے، خدا معلوم کب تک جواب آتا ہے، اور کیا آتا ہے، تین مہینہ غور کرتے ہو گئے خدا کرے نتیجہ غور بہتر نکلے، موجودہ الاونس میں گذارہ دشوار تھا اور اس کی نسبت صاف صاف لکھ دیا گیا تھا، ہم لوگ ہر حالت میں خوش ہیں اور ہمارے سارے معاملات، ہم نے اُس دنیا کی سب سے بڑی طاقت کے سپرد کر دیئے ہیں، اُس سے بڑھ کر کون محافظ اور ناصر ملیگا، حضور کی خیریت مزاج کا طالب ہوں، حضور کی کبھی مسٹر واحد یار خان صاحب بی، اے، سے ملاقات ہوئی تھی، یہ ہمارے کالج کے اولڈ بوائے ہیں، اور صاحب ایمان ہیں، مدبر نئی روشنی تھے، اُن کے دل میں درد اسلام ہے، اور کام کے آدمی ہیں، ان کا پتہ "نئی بستی" الہ آباد ہے، حضور اُن کو بلا کر ضرور ملیں، ممکن ہے حضور کے معتمد ہو کر خدمت دین کریں، حضور اُن کو ضرور طلب فرمائیں، غالباً فرنگی محل کے جلسوں میں، حضور ملے تھے،

حضور کا خادم شوکت علی، خادم کعبہ

اش اول سے خیال کیا ہوتا تو اب تک اچھی خاصی استعداد ہو گئی ہوتی، اوس وقت بھی بیکار نہ تھے، اب ذرا اطمینان ہوا ہے، تو آئندہ کی فکر ہو رہی ہے، قرآن پاک کی وجہ سے بہت سے الفاظ سے مانوس ہو گئے ہیں، علاوہ ازیں میں نے تو ایف اے عربی میں پاس کیا مگر صرف و نحو بالکل بھول گیا ہوں، انگریزی میں اوس سے بدتر حالت ہے، والدہ صاحبہ حضور کو اور گھر میں سب کو سلام اور دعا کہتی ہیں، حمیدہ بانوں کو بخار آگیا تھا، مگر اب خدا کا فضل ہے، زاہد علی، علی گڈھ نونیہ لے کر آئے تھے، اور کچھ دن تو اون کی وجہ سے رامپور میں پریشانی رہی مگر خدا نے میری بے کسی پر رحم فرما کر اوس کو صحت دی، اب اچھا ہے، لکھنؤ میں بیماری کی کثرت ہے، خدا حضور کو اور تمام ہوا خواہان اسلام کو اپنی امان میں رکھے، مسہل کے بعد اجوائن کے پانی کا استعمال رکھنا، از حد مجرب ثابت ہوا ہے، ایک حصہ اجوائن اور ۱۰ حصہ پانی کو خوب جوش دے کر مثل چاء کے چھان کر ہر ۲ گھنٹے کے بعد نصف چھٹانک دیتے رہیں مفید ہوگا، خدا سے امید ہے کہ وہ شفا دے گا، نیم سہل ہے اور کوئی دشواری نہیں، بعد کے حالات سے حضور کو مطلع کروں گا،

حضور کا خادم شوکت علی معتمد خدام کعبہ

دو ماہ میں عربی بول چال سیکھنے کا عزم

بلند دروازہ، ۲۹ نومبر ۱۸ء　　　　اللہ اکبر

یہ رسم بزم فنا ہے اے دل، گناہ ہے جنبش نظر بھی　　　　رہے گی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بے قرار ہوگا، (اقبال)

حضور والا، السلام علیکم

والا نامہ ملا تھا، اور اوس سے قبل میزان منشعب اور دیگر عربی کی کتابیں، خدا کو منظور ہے تو دو ماہ میں عربی بول چال سیکھ لیں گے تاکہ سفر ارض مقدس میں دشواری نہ ہو، حضور دعا فرمائیں جو ہم کو بریت میں لکھنا تھا وہ بیس تو ۴ یا ۵ دن ہوئے ختم کر چکا تھا، باقی بھی کل ختم ہو گیا اور سب کل رجسٹری شدہ الہ آباد بھیج دیئے گئے، ۲۷ آخری دن تھا، اور اوس دن ہم بھیج دیتے مگر ڈاکخانہ بند تھا اور رجسٹری نہیں ہو سکتی تھی، آج گورنمنٹ کو ہم نے اپنے اون قرضوں کی ادائیگی کی نسبت بھی لکھا ہے جو مجبوراً ہم کو معمولی خورد و نوش کے لئے کرنا پڑے تھے، تعداد کچھ اوپر ۳ ہزار ہے، ماہواری الاؤنس مشکل سے اون کو مہینہ میں کافی ہوتا تھا، قحط اور گرانی کا جو عالم ہے وہ کم از کم گورنمنٹ کو تو ضرور معلوم ہوگا، ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا، اب کمیٹی جانے اور گورنمنٹ، مگر نظر بندی میں معمولی مصارف کا دینا اوس پر لازم تھا، ابھی معلوم نہیں ہے مگر غالباً کمیٹی اول ہفتہ دسمبر میں آئے گی، وہ ہمارے کاغذات کا انتظار الہ آباد میں کرتی تھی اور یہاں ہم اوس کے منتظر تھے، ہمارے سر سے بوجھ ہلکا ہو گیا، اب وہ آئیں یا نہ آئیں ہم کو زیادہ فکر نہیں ہے، بہتر ہوتا کہ وہ جلد فیصلہ کر دیتے یا ادھر یا اودھر تاکہ ہم لوگ اپنی زندگی اطمینان سے بسر کرتے، خدا کا شکر ہے کہ حضور کی دعا سے ایمان اور قلب میں ویسی ہی طاقت بلکہ اب تو اور اضافہ ہو گیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہی غریبوں سے ابابیل کی خدمت لی جائے گی،

کردی، جس سے اون کی عنایت کا ثبوت ملتا ہے، حسرت موہانی نے کیا خوب تازہ غزل میں لکھا ہے:۔

بام پر آنے لگا وہ، سامنا ہونے لگا　　اب تو اظہار محبت، برملا ہونے لگا

میرا خیال ہے کہ اگر کوشش کی گئی تو حضور نواب صاحب غالباً خود کارخانہ پر روپیہ دے دیں، حضور دعا فرمائیں حسرت کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے، اوس کی صداقت اور ہمت ہمارے لئے مشعل ہے، اور رہا کلام تو اوس میں بیڑیوں کی جھنکار کی آواز آتی ہے، جو قلب کو مسرور اور خوش کر دیتی ہے، مسٹر گاندھی کے نام حضور کا خط اخباروں میں دیکھا، جزاک اللہ، خدا حضور کو اجر دے گا، کلمہ حق انشاء اللہ دنیا میں بالا ہو کر رہے گا، والدہ صاحبہ حضور کو سلام فرماتی ہیں، اور گھر میں سب کو سلام و پیار، تازہ کوئی بات نہیں ہے، گورنمنٹ کے سامنے ہمارے الاونس نظر بندی کا مسئلہ چند ماہ سے در پیش تھا، اب تک جواب نہیں ملا تھا، یہی کہا گیا تھا کہ وہ زیر غور ہے، اس عرصہ میں مجبور ہو کر تار اور خطوط لکھے گئے ہیں، تاکہ فوراً اضافہ کیا جائے، مقامی اور بیرونی قرضہ بہت بڑھ گیا ہے، امید ہے کہ اول جون یا ابتداء جون میں جواب شافی ملے، ہمارا قطب میاں صاحب، بھائی الطاف، امتاز میاں، مولوی عنایت اللہ صاحب، مولانا سلامت اللہ صاحب کو سلام مسنون۔

حضور کا خادم شوکت علی عفی عنہ خادم الخدام کعبہ

میں نے ایف اے عربی میں کیا تھا

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۱۸ نومبر ۱۹۱۸ء　　اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم

پرسوں کے بعد حضور کو خط لکھتا ہوں، اگرچہ خطوط کی کچھ بہت زیادہ ضرورت بھی نہ تھی، جو تعلقات روحانی تھے، اون کے ہوتے ہوئے، اگر خط نہ بھی لکھا جائے تو کچھ ہرج نہ تھا، خلیق اور دیگر احباب سے حضور کی خیریت مزاج کا حال معلوم ہوتا رہا تھا، سنا ہے ۵ نومبر کے بعد لنڈ سے اور عبدالرؤف یہاں ہم سے ملنے آئیں گے، غالب مرحوم نے خوب فرمادیا ہے:۔

حضرت ناصح جو آئیں دیدہ و دل فرش راہ　　پر کوئی اتنا تو سمجھا دے کہ سمجھائیں گے کیا،

یہ تحقیقات بھی بلائے جاں ہو گئی ہے، کم بخت جلد ختم ہو اور ہم لوگ اطمینان سے اپنے کاروبار میں مصروف ہوں، یہ خط حضور کو کام سے لکھتا ہوں، آج کل عربی پڑھنے کا گھر بھر میں زور ہے، میں اور محمد بھی بھولے ہوئے خود بہت علم کو تازہ کرنا چاہتے ہیں، ایک کتاب معمولی بول چال کی جو حال میں مصر میں تصنیف ہوئی تھی، میرے پاس ہے، مگر صرف خطوط کے تازہ کرنے کی ضرورت ہے، ایک جلد میں ابن مشعب اور صرف میر اور نحو میر کی ضرورت ہے، حضور کے علاوہ کس سے طلب کی جائے، مصمم ارادہ ہے کہ چھ ماہ میں معمولی بول چال کرنا سیکھ لیں، خدا امداد کرے،

بہرحال میں مست ہوں، خلیق الزمان صاحب کو میں نے ایک کاپی اپنے جواب کی دے دی تھی، دل تو نہیں چاہتا کہ کسی غیر کو اپنے مذہبی جذبات اور اعتقاد کا ثالث بناتا مگر "ایں ہمہ اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر"۔ یاس کفر ہے خدا کی رحمت کا ظہور دیکھ لیا، گذشتہ زمانہ کی دعاؤں کا اب اثر نکلا، حال کی دعاؤں کا ظہور خدا نے بہتر ضرور دکھائے گا، نجات کا طالب ہوں، اور اپنے گناہوں سے شرمندہ۔ اب تو دل آزاد محبت کا عادی ہو گیا، خدا کا شکر ہے۔

جانے کیا ساقی کی آنکھوں نے اشارا کر دیا ندر ساغر آج ہم نے زہد و تقوے کر دیا

حضور دعا میں ہرگز نہ بھولیں، قدمبوسی کا اشتیاق ہے، اور دل میں بہت کچھ بھرا ہے، قدموں پر سر رکھ کر خوب عرض معروض کروں گا، قاضی عبدالغفار صاحب یہاں موجود ہیں، اس سے قبل غالباً حضور کی خدمت میں حاضر ہو جائیں، عزیزی مولوی صبغۃ اللہ صاحب کا خط آیا تھا، اوس کا جواب کل لکھوں گا۔

حضور کا خادم شوکت علی خادم کعبہ

مولانا صبغۃ اللہ کے نام

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۱۳؍ دسمبر ۱۸ء — اللہ اکبر

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے — لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا
دل جو برباد محبت ہوا، آباد ہوا — سایۂ تعمیر تھا اس قصر کو ویراں ہونا
لطف دیتا ہے مجھے مٹ کر تیری الفت میں — ہمہ تن شوق ہوا ہے عربستاں ہونا
یہی اسلام ہے میرا یہی ایماں میرا — تیرے نظارۂ رخسار سے حیراں ہونا (اقبال)

عزیزی، مولانا صبغۃ اللہ صاحب، السلام علیکم

میں معافی کا خواستگار ہوں، کہ اب تک نہ تو آپ کے حکم کی تعمیل ہو سکی اور نہ خط لکھ کر ... مانی کا شکریہ اور اپنی معذوری کا اظہار کر سکا، واقعہ یہ تھا کہ جب آپ کا اوس وقت تقریباً ڈیڑھ ماہ کے بعد انتظار کے بعد گورنمنٹ ہند سے فرد الزامات آئے، اور وہ بھی ادھورے ۳½ برس کے بعد ہم کو اس سے زیادہ کی توقع رکھنا ہی فضول تھا۔

کی میرے قتل کے بعد اوس نے جفا سے توبہ ہائے اوس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

۱۴ دن کی مہلت تھی کہ اوس کے اندر اگر ہم چاہیں تو جوابات بھیج دیں، ۱۸؍ نومبر ۱۹۱۸ء کو یہ فرد ہم کو ملی اور اوس سے ایک دن قبل یہاں کے چیف سکرٹری نے یہ بھی ہم کو اطلاع دی تھی کہ ممبران کمیٹی مسٹر لعد سے اور سید عبدالرؤف صاحب ۲۹ نومبر کو ہم سے ملنے چھندواڑہ آئیں گے، اس لئے ہم نے مناسب سمجھا کہ جوابات کا لکھنا ملتوی کر دیں، ممکن ہے بر سر ملاقات کچھ مزید حالات معلوم ہوں، ایک ہفتہ اس انتظار معشوقانہ میں گذر گیا تب معلوم ہوا کہ کمیٹی کا اگر ہم یہاں انتظار کر رہے تھے، تو وہ بھی الہ آباد میں ہمارے بیانات کے بے قراری کے ساتھ منتظر تھے۔

یہ مزہ تھا دل لگی کا کہ برابر آگ لگتی　　نہ تجھے قرار ہوتا نہ مجھے قرار ہوتا

جلد جلد ایک ہفتہ میں بیانات مرتب کر کے ۲۷ نومبر کو الہ آباد روانہ کر دیئے، نہ تو میں زیادہ لکھنا پسند کرتا تھا اور نہ کچھ زیادہ مجھ کو کہنا تھا "صرف خدا اور کعبہ" کے متعلق غلط فہمیاں دور کرنی تھیں، جن کی بنا ناواقفیت پر تھی، بفضلہ تعالےٰ ہمارے مقاصد تھے تو اس قدر اعلےٰ اور ارفع کہ کسی کو اون کی نسبت سوال کرنے کی گنجائش نہ تھی، نہ ہا ہمارا عملہ تو ہم کو سب کو فخر رہے گا کہ ہم نے اپنا وقت، روپیہ، اور فرصت ایسے نیک کام میں صرف کی تھی، ہمارے افعال روز روشن کی طرح دنیا پر ظاہر تھے، اگرچہ ہم نے اسلامی انکساری سے کام لے کر اون کو دور تک شائع نہیں کیا تھا، اب انشاء اللہ سب کو معلوم ہو جائیں گے، میرا گمان ہے کہ ہمارے بیانات کے بعد جملہ شکوک رفع ہو جائیں گے، مشکل سے یہ کام ختم کیا تھا کہ مکان کے خطوط سے متوحش خبریں آنے لگیں، ۲۸، ایک عزیزترین خاتون کا، ۲۴ برس کی عمر میں اس بخار سے انتقال ہوا، مرحومہ میری اہلیہ مرحومہ کی سب سے چھوٹی بہن تھیں، اور ہم سب کی چہیتی، ہم سے ملنے یہاں آنے کا ارادہ کر رہی تھیں، بلکہ اون کے شوہر تو لکھنؤ سے واپس آ گئے، اسی عرصہ میں معلوم ہوا کہ کمیٹی تحقیقات جمعرات کو ہم سے ملنے چھندواڑہ آئے گی، ایک غم سے نجات نہیں پائی تھی کہ بدھ کو یکایک تار ملا کہ ہماری اکلوتی بیاہدر بہن کی بڑی لڑکی نے جو پانچ ماہ ہمارے پاس رہ کر گئی تھی ۱۲ برس کی عمر میں اس دنیا سے کوچ کیا، والدہ صاحبہ نے مرحومہ کو بیٹی کر کے پالا تھا، اور جو صدمہ اون کو اور ہم سب کو ہوا اوس کا اندازہ کرنا مشکل ہے، مگر سوائے صبر کے کچھ چارہ نہ تھا اور ابھی معلوم ہوا تھا کہ گھر میں ۱۶ اور چھوٹے بڑے مخدوش حالت میں بیمار پڑے تھے، صرف ایک تیماردار تھی اور جب یہ معلوم ہوا کہ ہماری غریب بہن بھی جو ہم سب کے کاروبار کی نگہداشت کرتی تھیں، اب خود سخت علیل تھیں اور ہم ضرور پریشان ہوئے، عارضی طور پر وطن جانے کی اجازت بھانجی کی علالت کی خبر پا کر کی تھی، مگر جب دو گھنٹے کے بعد موت کی خبر مل گئی تو اجازت کی درخواست کو تار دے کر منسوخ کرایا اسی عرصہ چیف سکرٹری کے یہاں سے نامنظوری بھی آ گئی تھی، کیونکہ کمیٹی چھندواڑہ آ رہی تھی، جمعرات کی شام کو وہ آ گئے اور ہم لوگ بعد نماز جمعہ علی الصباح والدہ صاحبہ کو اسٹیشن پر رخصت کر کے اور اپنی عزیزہ کی سوئم کی فاتحہ خوانی کر کے اون سے ملے، اول مجھ سے گفتگو ہوئی، تین گھنٹہ ملاقات رہی، خوب گفتگو ہوئی، دلچسپ تھی، میرا گمان ہے کہ اون پر ایک مسلمان کی صاف گوئی اور اعلانئے کلمہ حق کرنے کا اچھا اثر پڑا، وہ نہایت درجہ اخلاق سے پیش آئے، اور میں نے بھی نہایت درجہ خندہ پیشانی سے جوابات دیئے آخر میں ہم ایک دوسرے سے قریب مغرب رخصت ہوئے، اونہوں نے اپنی جائز خوش اخلاقی کا ثبوت دے کر سرٹیفکیٹ طلب کیا جو میں نے نہایت خوشی عطا کیا، میں نے بھی اپنی خوش اخلاقی اور پاک طینتی کا سرٹیفکیٹ مانگا جو ممبران کمیٹی نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ عطا کیا، گفتگو ہوئی انشاءاللہ بر سر ملاقات بیان کروںگا غالب مرحوم کا پرلطف شعر اس وقت کافی ہے:-

تھی خبر گرم کہ غالب کے اوڑیں گے پرزے　　دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

دوسرے دن ہفتہ کو ۱۰ بجے سے سارا دن محمد علی کے لئے دیا گیا تھا اور مجھ کو بھی اجازت دی کہ موجود رہ کر تمام

گفتگو قلم بند کروں، نماز ظہر کے لئے ایک گھنٹہ کام بند تھا، نماز عصر اور مغرب سرکٹ ہاؤس میں ہی ادا کی اور نماز ضرور پر لطف تھی، مسٹر لنڈ سے قرآن پاک سے ناواقف تھے، مگر سید عبد الرؤف صاحب، کو آیاۃ قرآنی سن کر ضرور لطف آیا ہوگا، گفتگو طویل تھی، مگر موضوع ,,مسلمان کے مذہبی فرائض'' تھا، ہم قریب ۸ بجے شب کے مکان پر آئے، اور وہ صبح کو الہ آباد واپس گئے، ایک بوجھ تھا جو اتر گیا اور اب اطمینان سے ہم لوگ زندگی بسر کر رہے ہیں، مگر ہمشیرہ کی سخت علالت سے پریشانی ہے، دوسرا تار عارضی رخصت کا بھی ہے، اور اوس کی یاد دہانی بھی کی گئی ہے، جواب ملا بھی کہ ہماری درخواست عارضی رخصت کی گورنمنٹ ہند کے پاس بھیج دی گئی ہے، خدا سے یہ دعا ہے کہ باقی اعزہ پر رحم فرما کر جلد صحت عطا فرمائے، محمد علی صاحب کو پرسوں بخار آگیا تھا، مگر اب اچھے ہیں، نقاہت ہے، آپ تحریر کرتے ہیں اور تقاضا فرماتے ہیں کہ ہم کچھ ,,نبی نمبر'' کے لئے لکھیں، اول تو مضمون ایسا کہ اوس پر جسقدر لکھا جائے دین اور دنیا دونوں کے لئے مفید، دوسرے آپ کا تحریر کرنا، آپ کو علم ہے کہ جو تعلق اب ہمارا فرنگی محل سے ہے، تعمیل ارشاد ایک ادنےٰ خدمت ہوتی مگر،:۔

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

عزیزی اگر ہم کوئی تحریر شائع کرنے کی غرض سے لکھیں تو اول اوس کو اس صوبہ کے چیف سکرٹری کے پاس بھیجنا ہوگا، وہ اس گے سنسر ہیں ہم نے آج تک کوئی تحریر نہیں بھیجی اور ایک اشتہار اپنے روئی کے کارخانہ کا، جو دس دن میں واپس آیا تھا، معمولی تحریر ہوتی تو آپ کی خاطر بھیج دیتا، مگر دل یہ قبول نہیں کرتا، کہ وہ الفاظ جو حضور سرور کائنات صلعم کی شان میں ایک غریب مسلمان کا ہدیہ ہوں، غیر مسلم کی اجازت سے شائع کئے جائیں، یا اون میں کتر بیونت کرے، انسان ایسا فعل ہی کیوں کرے جس میں دل آزاری اور توہین کا اندیشہ ہو مجھ کو امید ہے کہ اب ہم کو معاف کر دیجئے گا، عزیزی یہ وہ زندگی تھی جس کے تھوڑے حالات پڑھ کر بھی ہمارے قلبوں میں نئی طاقت آتی ہے، دنیا میں کسی قوت کا خوف دل میں نہیں رہا، بہر حال میں مست ہوں، کوئی مصیبت کیوں نہ آئے، کیسا ہی صدمہ کیوں نہ آئے، کیسا ہی صدمہ کیوں نہ ہو ہر حال میں اوس مکمل اور پاک زندگی، کی مثال ہمارے سامنے موجود ہوتی ہے، اور رہنمائی فرماتی ہے، اللہ اللہ کیا کیا سبق سکھاتی ہے، برادر عزیز مولانا ابو الکلام آزاد اور محمدؐ علی کی زبان سے حضور کے حالات سن کر وہ لطف آیا ہے، کہ اب تک دل میں ارادہ کر لیا ہے کہ اگر صحیح حالات بغیر کسی قسم کی چاشنی کے مسلمانوں کے کانوں تک پہونچائی جائیں تو ہم لوگ دین اور دنیوی دولتوں سے مالا مال ہو جائیں گے، عجیب تعلیم تھی کہ معمولی اور ذلیل ترین انسان پر بھی ذرہ سا اثر پڑا اور وہ کندن ہو گیا، مجھ پر علاوہ اور بہت سے صحابہ کرام کے حالات کے حضرت بلال رضی اللہ عنہ، کے حال سے بڑا اثر پڑتا ہے وہ نہ تو یورپ کی تعلیم گاہوں کے سند یافتہ تھے نہ علی گڈھ کا اثر تھا، فرنگی محل اور دیوبند کی تعلیم سے بھی محروم تھے ہمنو تھے، اعلےٰ خاندان نہ رکھتے تھے، کچھ خوبصورت بھی نہ تھے، غلام ابن غلام تھے اور وہ بھی حبشی بد شکل، مگر کیا قسمت تھی، ظالم کافر آقا زمین پر چلتے ہوئے زمین پر گرا گرا کر مارتا تھا، گرم ریت پر لٹاتا تھا، طرح طرح کی اذیتیں دیتا تھا، مگر وہ ایک لفظ ,,احد احد'' ,,اللہ ایک اللہ ایک'' زبان پر جاری تھا، کیا مجال تھی کہ عقیدہ میں کسی حالت میں بھی فرق آتا، دین کے معاملات میں مصلحت کون شے تھی، خدا تو بس ایک تھا، اور اوس کا آخری رسول اکرم صلعم بھی اوس کا مکمل اور آخری

لے کر آیا تھا، اب نہ ہمیں کیسی جان رہے یا جائے، بدنامی ہو یا نیک نامی، عاقل کہلائیں یا احمق، اب تو ایک کے غلام
ہو گئے، اوس حبشی جاہل غلام زادے کے ایمان کا ایک دسواں ٹکڑا بھی ہم کو میسر ہوتا تو فلاح دارین میں شبہ نہ تھا،
اور دین اور آخرت ملتی یا نہ ملتی مگر دنیا کی سرداری اور بہتری تو ضرور ہمارے قدموں کے نیچے ہوتی، اقبال نے جس
خوبصورت اور سچے الفاظ میں حضرت بلالؓ کی تعریف فرمائی ہے وہ ہر مسلمان کے دل میں جگہ پانیکے قابل ہے:-

کیا قسمت تھی جس قدر ہم رشک کریں بجا تھا، مگر وہ اُس کے مستحق تھے:-

اذاں ازل سے تیرے عشق کا ترانہ بنی ــ نماز اُس کے نظارہ کا ایک بہانہ بنی

آج بھی اگر ہم عشق بلالی پیدا کریں تو نظارہ میں کسی قسم کی روکاوٹ باقی نہ رہے گی، حضور کے حالات پڑھ کر دل کو کس قدر تقویت ملتی ہے، احباب ہماری ہمت اور استقلال کی تعریف کرتے ہیں، کسقدر صبر سے ہم نے یہ زمانہ ابتلا اور آزمائش کاٹا ہے، یہ اُس کی پاک زندگی کے سبق کا نتیجہ تھا، مگر ہماری آزمائش ابھی ہوئی ہی کیا ہے، اُس حبیب خدا نے جس کی خاطر یہ سب کون و مکان پیدا ہو گیا تھا، ایک برس نہیں، دو برس نہیں، ۱۳ برس تک مسلسل طرح طرح کی ایذائیں سہیں، کوئی مصیبت نہ تھی، جو حضور اکرم صلعم کے سامنے نہ آئی ہو، مگر ایک لمحہ کے لئے بھی قدم نہ ڈگمگائے، ایسی مثال، ایسا اعلےٰ نمونہ سامنے موجود ہوتے ہوئے کیا ہوا اگر حضور مولانا محمود الحسن صاحب قبلہ نے مالٹا کی تکالیف بخوشی منظور فرمائیں، حسرت نے ہنسی خوشی جیل کاٹا، ابو الکلام نے رانچی کی اور شوکت اور محمد نے لینڈس ڈاؤن چھنڈواڑہ پر لطف اور صحت بخش ہوا میں ۳½ برس کاٹے،

خدا آپ کو اجر دے اور توفیق دے کہ دن رات اس مکمل زندگی کے حالات عام مسلمانوں میں پہونچانے کیلئے اپنا آپ وقف کر سکیں، حضور والا کی بیماری کا حال کل کے خط سے معلوم ہوا، ہم نے تو حضور کو اور تمام اعزہ اور احباب کو خدا کے سپرد کر دیا ہے، اور اس سے بس دعا ہے تو ایک اور وہ یہ ہے کہ وہ ہم کو زندہ رکھے تو اسلام پر اور مارے تو اسلام پر، دلی خواہش ہے کہ طاعون اور وبا سے ہم نہ مریں بلکہ آخر وقت تک دین کی خدمت کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوں، خدا کی رحمت کا منتظر ہوں، وہ ضرور آئے گی مگر اُسی وقت آئے گی جبکہ ہم اُس کے سچے مستحق ہوں گے، اور کیا لکھوں:-

ہمہ حسرت ہوں سراپا غم بربادی ہوں ــ ستم دہر کا مارا ہوا فریادی ہوں

آپ کا خیر طالب شوکت علی خادم کعبہ

نوٹ ضروری، میرے اس خط کو پڑھنے کے بعد مسٹر عباس حسین قاری صاحب کو مٹیا محل دہلی بھجوا دیجئے گا،

پیرول پر رہائی

(۵۱)

اللہ اکبر — ...ندواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۶ جنوری سنہ ۱۹ء

حضور والا، السلام علیکم

حضور سے رخصت ہو کر ہم لوگ مع الخیر جمعہ کے دن شب کو یہاں پہنچے، راستہ کی تھکن اور اُس سے زیادہ
...پور کی مہمان نوازیوں کا اثر اب کہیں جاکر دور ہوا ہے، اخبارات اُس ۴ ہفتہ کے بالکل نہیں پڑھے تھے، یہانتک
...طمینان کے ساتھ لیگ اور کانگرس کے خطبات بھی نہیں دیکھے تھے، اس ہفتہ خوب ہوئے اور تمام گذشتہ
...ارات کو بھی پڑھا، اب جاکر طبیعت اور زندگی معمول پر آئی ہے، بڑا امکان ہے، اس کی تنہائی دیسے ممکن تھا
...شت پیدا کرتی، مگر اب کی مرتبہ خموشی سے دل خوش ہوا، اب خط وکتابت کا سلسلہ شروع کر دیا ہے، اور
...لئے حضور سے معافی کا خواستگار ہوں، کہ اب تک خیریت مزاج نہیں دریافت کر سکا تھا، رامپور اور لکھنؤ
...ملاقاتیں کچھ ایسی عالم خواب اور گھبراہٹ میں ہوئیں تھیں، کہ اُن سے نہ تو قلب کو اطمینان ہوا، اور نہ دل کو
...ل میلے ٹھیلے کی ملاقاتیں تھیں، خدا کرے کہ جلد خدمت عالی میں قدمبوسی کا موقع ملے، اور اطمینان سے
...ں معروض کر سکوں، بالتوڑوں نے بھی یہاں تنگ کیا، اب ایک پاؤں میں رہ گیا مگر وہ بھی تکلیف دہ نہیں رہا
...، کارخانہ کے متعلق رامپور سے ابھی مفصل اطلاع نہیں ملی ہے، کہ لکھنؤ سے کیا جواب گیا، انکار کی تو گنجائش
...ں مگر ان حضرات سے کوئی فعل بھی بعید نہ تھا، بمبئی کے خطوط سے طلبی تقاضا تھا، میں نے مفصل حالات رامپور
...دیئے ہیں، جہاں سے ضرور ہمدردی اور امداد کی امید ہے، اور واقعہ بھی یہ ہے کہ ضمانت کارخانہ کی خود نہایت
...رہے، سوائے فائدے کے نقصان کا اندیشہ نہ تھا، گورنمنٹ ہند کا آخری جواب آگیا کہ وہ ہمارے کارخانوں
...و کا نقصان نہیں دے سکتے، ۱۰ ہزار کا مطالبہ تھا، جو ہماری جیبوں سے گیا تھا، ہماری درخواست معقول تھی اور
...ن کمیٹی نے بھی اس کو اپنی رپورٹ کے ساتھ بھیجا تھا، سوائے صبر وشکر کے کیا چارہ ہے، خدا ہمیں نعم البدل
...ے گا، ایسی رقم حقیر سے ہمارا فائدہ تھا، اور جنگ کے اخراجات میں وہ معلوم ہی نہیں ہوتی، کمیٹی کی رپورٹ
...یہ مانگا ہے، دیکھئے کب اطلاع ملتی ہے، ہم نے کل خط لکھ کر ... جانے کی اجازت طلب کی ہے، تاکہ حسب
...روپیہ کا انتظام ہو کر ادائگی کر دی جائے، .... (کاغذ غائب) .... مل جائے گی....
...وصہ میں کچھ .... حضور اب شبیر حسین صاحب کو بھی تحریر
...بلوائیں تاکہ کام میں آسانی ہو، انہوں نے بھی اس ۴ سال میں خوب آرام اور رفاقہ کشی کر لی ہوگی، اب تھوڑا
...ھی کریں، اس چار ہفتہ کی رخصت سے کافی تجربہ ہو گیا، کہ انشاءاللہ ہم لوگ پوری محنت اور جفاکشی سے
...سکیں گے، یہ زمانہ ہمارا بیکار ضائع نہیں ہوا، خدائے برتر کے تمام کاموں میں حکمت ہوتی ہے، ہم کو خوشی
...کہ ہماری معمولی خدمات کو اسلامی، بڑھا چڑھا کر مسلمان دیکھتے ہیں، اس نرخ سے ہمارا بیوپار برا نہ تھا، لکھنؤ

...کے لئے حکومت نے پیرول پر علی برادران کو اجازت دی تھی۔ حضرت ان سے ملنے رام پور گئے تھے۔

میں حضور دفتر کے لئے مکانات وغیرہ کی تلاش فرمالیں، زمین عمدہ مل جائے تو کیا کہنا، وسط شہر میں ہو اور مسلمان
آبادی کے قریب مگر فی الحال تو کرایہ کا مکان وغیرہ لینا پڑے گا، علاوہ دفتر کے ۱۵ یا ۲۰ آدمیوں کے رہنے کے
کافی ہو جب سے ہم یہاں آئے ہیں، کم و بیش روزمرہ بارش ہو رہی مگر بیچ میں دھوپ بھی نکل آتی ہے، آج
سے پھر ابر موجود ہے، ہمدم اور اخبارات سے معلوم کرکے اطمینان ہوا کہ اُس طرف بھی معقول بارش ہو گئی،
جس کی سخت ضرورت تھی، خدا نے بڑا فضل فرمایا ورنہ مخلوق تباہ ہو جاتی مولوی سلامت اللہ صاحب کی خدمت میں
میرا سلام مسنون، اور بھائی الطاف کو بہت سا پیار لکھنؤ حاضر ہونے کے اشتیاق میں دل رہتا ہے، فرنگی محل
میرے جسم کے برابر والا ناشتہ کا بکس آج کہیں جا کر خالی ہوا ہے، ہم لوگ کھاتے کھاتے، اور کھلاتے کھلاتے
تھک گئے، مگر وہ ناشتہ ختم ہی نہیں ہوتا تھا، میرے کمرے میں رکھا ہوا ہے، اُس کو دیکھ کر لکھنؤ کی یاد تازہ ہو جاتی
ہے، اگرچہ میرا ارادہ ہے کہ وہاں کے قیام میں ابتداً جسمانی ورزشوں کا زیادہ زور رہے گا، تاکہ جسم کم ہو جائے
اُس کے لئے شیرمال اور بالائی اور برفیاں زہر کا کام دیں گی، ہم لوگ بہرحال ہم لوگ ہر حال میں خوش ہیں،
وغیرہ ابھی تک یاد نہیں ہوتے ہیں، غالباً ہفتہ عشرہ میں مکان اُن کے بغیر سونا معلوم ہو گا، مگر اس عرصہ میں کو
ئی کوئی بات صاف ہو جائے گی، مولوی عنایت اللہ صاحب، مولوی صبغۃ اللہ صاحب، قطب میاں صاحب
مولوی محمد یونس صاحب غرضیکہ سب کو سلام مسنون، خدا سے دعا ہے کہ حضور کی طبیعت اب بفضلہ تعالیٰ
ہو گی، علاج ایک مرتبہ جم کر ہو جائے تاکہ تمام جسم صاف ہو جائے، محمد علی تندرست ہیں، اور حضور کو دست
بستہ سلام کہتے ہیں،

حضور کا خادم شوکت علی

آرزوئے ملاقات

(۵۲)

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۱۲ر فروری سنہ ۱۹

حضور والا، السلام علیکم

اس سے قبل حضور کو مفصل خط لکھ چکا ہوں جو غالباً ملا ہو گا، جواب سے محروم رہا، خدا کرے طبیعت اس
عرصہ میں درست رہی ہو، مجھ کو تو رامپور جانے کی اجازت آ گئی، مگر اب تک محمد علی کی نسبت دوبارہ یاددہانی کا جو
نہیں آیا ہے، اُن کی اہلیہ بھی اس عرصہ بخار اور زکام میں سخت مبتلا رہی ہیں، اور ہم کو اُن کی طرف سے تشو
رہی تھی، اب کسی قدر افاقہ ہے، اگر کل صبح تک بھی جواب نہیں آیا تو معلوم ہو جائے گا کہ گویا اجازت دینا منظو
تھا، میں کل کی گاڑی سے چل کر یعنی جمعرات کو چل کر ہفتہ کے دن میل سے لکھنؤ گذروں گا، اگر حضور کو تکلیف
مجھ سے اسٹیشن پر مل لیں، مع مولانا سلامت اللہ اور بھائی الطاف کے، میں تار بھی دوں گا، یعنی ۱۴ کو چل

لہ استاذ الاساتذہ مولانا عبدالحی کے نواسے مدیر "النجم رشید" کے فاضل مصنف فرنگی محل کے یگانہ عالم، مرض دق میں فوت ہوئے۔

کی ہیل سے لکھنؤ سے گذروں گا، خلیقؒ کو بھی تار دوں گا، خدا کرے محمد علیؒ کی اجازت بھی آجائے، ۷ کو میں نے تار دیئے تھے، اور خود ڈپٹی کمشنر نے بھی، اب تک جواب نہیں دیا، تنہا جانا مجھ کو ناگوار ہوگا، مگر اس ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر، انشاء اللہ رخصت کے ختم ہونے سے قبل ہی کام ختم کرکے واپس آجاؤں گا، حضور سے دعا اور مشورہ کا طالب ہوں؛

حضور کا خادم شوکت علی خادم کعبہ محمد خادم الخدام کعبہ

فتوے کا انتظار

(۵۳)

رامپور ۱۷ فروری سنہ ۱۹ء

حضور والا، السلام علیکم

عزیزی محمد نظام الدین صاحب تشریف لائے تھے، اور اُن کا تار بھی حضور کو مل گیا ہوگا، وہ آج ہی واپس جاتے ہیں، میں حضور کا ہم خیال ہوں، ضرور ایسے نیک کام کے لئے، جن سے مقامات مقدس کی حرمت برقرار رہے، اور اسلامی نقطۂ خیال ذمہ دار وزراء کے سامنے پیش کیا جاسکے، امداد دینا چاہیئے، اس رقم سے زیادہ بھی ضرورت ہو تو دیا جائے، فضول بنک میں پڑا رہنا بیکار تھا، اتنی رقم رہنی چاہیئے جس سے انجمن کا کام پھر اجرا ہوسکے، چند علماء سے ملا ہوں، اور کل پوری کوشش کروں گا، اور ہر ایک سے ملوں گا، حضور کو ایک خط میاں خواجہ احمد صاحب کو بھی لکھ دینا چاہیئے، اگرچہ میں عرض کردوں گا کہ میں حضور کا پیامبر تھا، خدا کامیابی عطا فرمائے مفصل خط کل کو لکھوں گا، اتوار کے دن شعیب صاحب، خلیق عبدالرحمٰن صاحب، اور چند اور احباب مراد آباد سے آئیں گے، معظم علی صاحبؒ ایک نقل فتوے مراد آباد کے لئے طلب کرتے ہیں، غالباً حضور کو لکھا ہوگا، قطب میاں صاحب، مولانا سلامت اللہ صاحب اور بھائی الطاف کو سلام خدا حضور کو زندہ اور سلامت رکھے،

حضور کا خادم شوکت علی خادم کعبہ

چیف کمشنر سے ملاقات

(۵۴)

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۸ مارچ سنہ ۱۹ء

اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم

خدا حضور کا مرتبہ اور بلند فرمائے، اُس وقت حضور وہ کام کر رہے ہیں، جو حضور کے شایان شان تھا، اخبارات میں حالات پڑھ کر قلب کو جو مسرت اور ایمان میں جو تقویت ہوئی خدا ہی جانتا ہے، لاکھوں مسلمانوں کے ایمانوں کو

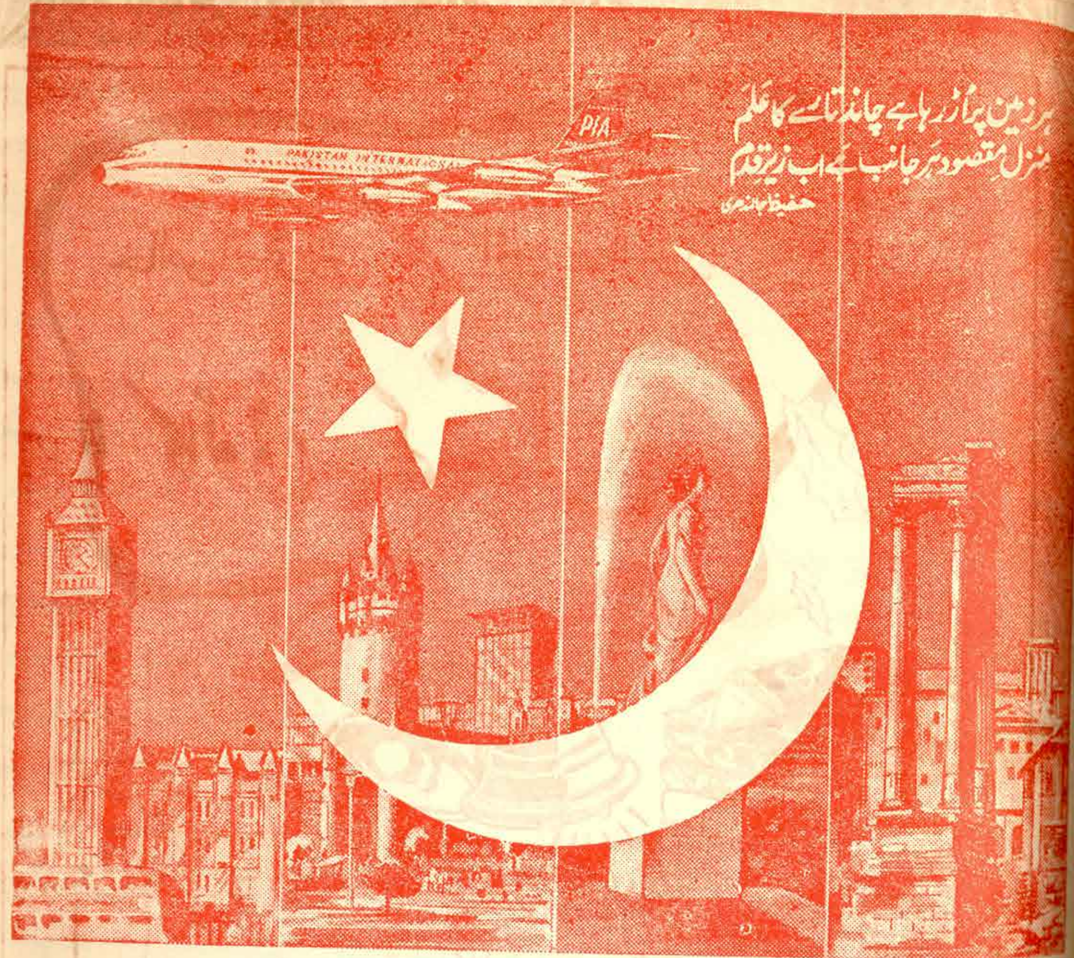

ہمارا چاند تارا ترقی اور اطمینان کا نشان ہے۔

اس تصویر میں ہمارا چاند تارا دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوموں کے نشان بردار میناروں پر روشنی برسا رہا ہے۔

ریاست ہو یا سیاست۔ امارت ہو یا تجارت۔ صنعت ہو یا حرفت اب ساری دنیا سے تعلق رکھتی ہے۔

پاکستان کے مشرق مغرب اور باہر کی دنیا پر عزت اور اطمینان کی اُڑان سے ہمارے طیارے ہماری اپنی خوش نصیبی کا عملی اعلان ہیں۔

PIA

پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائنز۔ باکمال لوگ لاجواب پرواز

خالص آسٹریلئن اون سے تیار کردہ
کاؤنی کے کمبل
پاس ہوں تو
جاڑوں کی کیا پرواہ
خوبصورت ڈیزائن
ارزاں مگر پائیدار
کاؤنی ووُلن ملز لمیٹڈ
اسماعیل آباد (ملتان)
کاؤنی سیلز ڈپو ۳۸- دی مال لاہور

تازہ فرمادیا، "اللھم زوفزد" میں معافی کا خواستگار ہوں، کہ حضور سے لکھنؤ ملنے کے بعد اب تک خط نہ لکھ سکا، الہ
میں گاندھی صاحب سے پھر ملاقات ہوئی تھی اور مجھ کو بڑی خوشی ہوئی تھی کہ وہ دوسرے دن حضور سے ملنے لکھنؤ
رہے تھے، اور حضور کے ہی مہمان ہوئے تھے، اخبارات میں تمام حال پڑھا تھا، امید ہے کہ وہ حضور سے مل کر
اور خوش ہوئے ہوں گے، مجھے اپنے بارے میں تو زیادہ لکھنے کی ضرورت نہ تھی، حضور سے تو عرض کرچکا تھا، ا
ملاقات اور قدمبوسی کا اشتیاق ہے، خدا کے حکم کی پابندی ان معاملات میں اب تک کی ہے اور اب بھی بفضلہ تع
کسی قسم کا اضطراب ہم دونوں کو نہیں ہے، اطمینان سے یہاں زندگی بسر کرتے ہیں، ۴ دن ہوئے کہ چیف کمشنر آ
صوبہ کے بیان آئے تھے، پہاڑ پچھمڑی کو جاتے تھے، یہی راستہ ہے، اُن سے ملاقات ہوئی، نہایت د
اخلاق سے پیش آئے اور بہت ہمدردی کی، ہم نے دریافت کیا کہ ہم کو معلوم ہونا چاہیئے، کہ کمیشن نے ہم
نسبت کیا رپورٹ کی اور گورنمنٹ نے اُس پر کیا فیصلہ کیا، طرح طرح کی خبریں آتی ہیں مگر ہم کو آج ۴ ماہ ہوئے
باضابطہ اطلاع نہیں ملی، اُن کو بھی تعجب تھا، کہ ایسا کیوں ہوا، ادھر یا اُدھر، جواب ضرور صاف صاف ملنا چاہیئے
پھر ہم نے کہا کہ یہ نظربندیاں بنظر تحفظ تھیں، نہ کہ سزاً، پھر کیوں ہم لوگوں پر ۱۵ ہزار روپیہ سالانہ جرمانہ ہوتا ہے،
رقم جو ہم کو اپنی جیبوں سے سود میں ادا کرنی ہوتی ہے، گورنمنٹ ہم کو ۶۰ ہزار روپیہ واپس کردے، جو ہم نے
ادا کیا ہے، اسکے علاوہ ہمارا الاؤنس کم از کم ۵۰۰ روپیہ ماہوار فی آدمی دسمبر ۱۹۱۷ء سے کیا جائے، اور ہم پر جو
الاؤنس کی وجہ سے قرض ہوگیا ہے تقریباً ۴ ہزار، وہ ادا کیا جائے، بچوں کی تعلیم کا سامان کیا جائے، اس الاؤنس
کس طرح میں ۳ لڑکوں کو علی گڈھ پڑھا سکتا ہوں، کم از کم ۱۵۰ روپیہ ماہوار کا صرف ہوگا، بڑا لڑکا زاہد وہاں
۷۰ روپیہ ماہوار صرف کرتا ہے لڑکیاں جو اب جوان ہو رہی ہیں، اُن کے مصارف اور تعلیم کا انتظام ہونا چاہیئے
پر اثر پڑا اور اُنہوں نے تمام باتوں کے نوٹ لے لئے اور کہا میں اتوار کو (یعنی پرسوں) ۳۰ مارچ کو وائس
سے ملوں گا اور اُن سے مفصل گفتگو کروں گا، اور تم کو بعد کو اطلاع کروں گا، اُنہوں نے صاف صاف کہا کہ
برس میں مجھ کو آپ حضرات سے کسی قسم کی شکایت نہ تھی، میں نے اپنے تمام ماتحت افسروں کو حکم دے د
وہ آپ سے اخلاق سے پیش آئیں اور آپ کی ہر طرح کی مدد کریں، ہمارا کام فقط اس قدر تھا، کہ آپ کو چھ
میں رکھیں، دیکھئے کیا نتیجہ نکلتا ہے، مالی نقصان دینا کسی طرح جائز نہ تھا، امید ہے کہ کچھ نتیجہ نکلے گا، حضور
کروں گا، خدا کرے ہم سب یکجا ہوں، اور اطمینان سے اعلےٰ پیمانہ پر اپنے مذہبی فرائض ادا کریں، لکھنؤ کے
سے دل کو فرحت ہوتی ہے ایک تو حضور کا قرب، دوسرے تمام فرنگی محل کی پرجوش کام کرنے والی جمعیت
اللہ بہترین کام کرنے والے پیدا ہوں گے، حضور دعا فرمائیں، موسم یہاں پرلطف ہے، اور ٹھنڈا،
زاہد کا امتحان ختم ہوگیا، باوجود بیمار رہنے کے اُس نے پرچے اچھے کئے ہیں، اور کامیابی کی امید
حضور دعا فرمائیں، محمد علی کے گھر کے لوگ اونیچے غالباً والدہ صاحبہ بھی شروع اپریل میں یہاں
گی، امیر اسلام مولانا سلامت اللہ صاحب بھائی الطاف الرحمٰن صاحب، قطب میاں صاحب، مولو

آج خان جاتے ہیں، ہم سب مع اُن کے دیگر احباب کے اسٹیشن پہنچانے جاتے ہیں، وہ بفضلہ تعالیٰ مسلمان ہیں اور مضبوط، اس قسم کی تکالیف سے اُن پر کیا اثر پڑ سکتا ہے، یہ بھی خیر ہو جائے محمد علی کا خوب شعر ہے:-

دور حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد ہے ابتدا ہماری تیری انتہا کے بعد

انشاء اللہ حضور سے جلد ملاقات ہوگی، ورنہ حوض کوثر تو ہے ہی، دل آج کل خوش ہے، قلب میں حضور کی دعا سے کافی طاقت ہے، کفار کے سامنے مرعوب ہونا ناممکن ہے، حضور دعا میں یاد فرمائیں، انشاء اللہ حضور کو مزید حالات سے مطلع کروں گا، ہم لوگ خدا کی ذات پر بھروسہ کرتے ہیں، اور اُس کی امداد کی طلب ہے ہے کہ آنکھوں کا پردہ اٹھ گیا اور اب کفر اور اسلام کا فرق نظر آتا ہے، برادرم مولانا سلامت اللہ صاحب، الطاف الرحمٰن، قطب میاں صاحب، مولوی عنایت اللہ سب کو سلام مسنون،

حضور کا خادم شوکت علی خادم کعبہ

کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے

اللہ اکبر

(۵۶)

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۱۸ مئی ۱۹۲۰ء

اہل ایماں رکھتے ہیں کامل بہ فحوائے جنوں شان "لا خوف علیہم" شیوۂ "لا یحزنون"

حضور والا، السلام علیکم

حضور کا خط بلکہ دونوں خط اور تار ملے تھے، میں عرصہ سے لکھنے کا ارادہ کرتا تھا، مگر معمولی خط لکھ تھا، اور اس بات کا مجھ کو یقین تھا کہ حضور اب ہمارا منشا سمجھ گئے ہوں گے، اور غلط فہمی کا اندیشہ نہ ہوگا، غلط تھا، اس لئے میں چند ضروری گذارشیں کروں گا جن سے یقین کامل ہے کہ معاملات صاف ہو جائیں اور غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی، حضور کو خط لکھتے ہوئے میں ہمیشہ ڈرتا ہوں، اس لحاظ سے کہ ممکن لفظ ایسا نکل جائے، جس سے خلاف دلی محبت اور جذبات گستاخانہ معنی لئے جا سکیں، اگرچہ میں جا کہ حضور جیسے غیروں کا برا کہنا سن کر برا نہیں مانتے تو میری نسبت تو گنجائش ہی نہ تھی، اُس زمانہ سے جب قدمبوسی میں حاضر ہوا اب تک حضور کے اور ہمارے درمیان وہ تعلقات پیدا ہو گئے ہیں، جو انشاء اللہ وقت موت تک قائم رہیں گے، پیری مریدی اور خدام کعبہ کے علاوہ حضور کو ہم اسلام کا سچا خادم جاں نثار جانتے ہیں، اور ہم کو یقین کامل ہے، کہ باوجود اور لاکھوں کمزوریوں کے حضور کو بھی اس یقین ہے کہ ہم اسلام کی توہین ایک منٹ کے لئے گوارہ نہیں کر سکتے اور اُس کے لئے جان و مال فدا کرنے ہیں، یہ رشتہ خود اس قدر وسیع ہے کہ اس میں ہر سچے مسلمان کی کھپت ہو سکتی ہے، چاہے وہ سنی ہو شیعہ

اللہ صاحب، اور عزیزی صبغۃ اللہ صاحب تک پہنچوا دیجئے گا،

حضور کا خادم شوکت علی معتمد خادم الخدام کعبہ

بڑھتا ہے اور ذوق گناہ یاں سزا کے بعد

(۵۵)

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۱ مئی ۱۹ سنہ ء — اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم

حضور کا حکم نامہ ملا تھا، جس سے قلب کو تسکین اور اطمینان ہوا تھا، خدا کا شکر ہے کہ مسلمان دین کے کاموں سے اب غافل نہیں ہیں، اور ہر طبقہ کچھ نہ کچھ کر رہا ہے، یہ ضرور ہے کہ یہ کافی نہ تھا، ہم کو دین مقدس کے لئے ہر وقت جان سپر رہنا چاہیئے، انشاء اللہ وہ دن بھی جلد آئے گا، دنیا میں کوئی کام ایک وقت میں ہی مکمل نہیں ہوتا ہے، سامان خدا رفتہ رفتہ پیدا کرتا ہے، ہم لوگ دیکھتے ہیں کہ ان مصائب اور آزمائشوں کے ذریعہ خدا ہمارے ایمانوں کو دیکھ رہا ہے اور ہماری غفلت کو دور کرتا ہے، بعض نادانوں کی حرکات پر ہنسی آتی ہے، جو یہ خیال کرتے ہیں، چابک ہی ایک علاج ہے، اس کے ذریعہ سے نسل والے اور غیر نسل والے سب یکساں ہانکے جا سکتے ہیں، ان تمام واقعات سے جو پیش آتے ہیں، دل کو سرور ہوتا ہے، خدا کا شکر ہے کہ ہم لوگ بھی صرف تماشائی نہیں ہیں بلکہ خدائے برتر نے ہم کو بھی ایک ذلیل اور چھوٹا سا پارٹ دے دیا ہے، خدا صراط مستقیم پر قائم رکھے، حالی مرحوم خوب فرما گئے ہیں:-

بڑھتا ہے اور ذوق گناہ یاں سزا کے بعد — تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب

والدہ صاحبہ غالباً کل یا پرسوں یہاں سے مع میرے بچوں کے روانہ ہوں گی، حضور سے انشاء اللہ ضرور ملیں گی، رامپور چند ضروری خانگی امور کا تصفیہ کرنا تھا، عظیم الدین صاحب عزیزی الطاف پر کل یہاں قانون تحفظ ہند کی رو سے حکم ملا کہ وہ ۲۴ گھنٹے کے اندر چھندواڑہ ضلع چھوڑ دیں، امن عامہ اور خطرات ہند کے لئے مخدوش تھے، کل والدہ صاحبہ کے ہمراہ وطن جا رہے تھے، اُن کی بڑی عزت افزائی ہوئی، ہم اپنی آخری بیان والسرائے کو بھیج چکے ہیں، ۲۴ کو روانہ کیا تھا، اول کچہری کو ہی بھیجا گیا تھا، اب غالباً شملہ پہنچ گیا ہوگا، جواب تو معلوم ہے مگر مسلمان عمر بھر اُس وقت تک خاموش نہ ہوں گے جب تک کہ اُن کے مذہبی احکام کی پوری عزت نہ کی جائے گی، یہ معمولی بات نہ تھی، خدا حضور کو زندہ اور سلامت رکھے، اور ہمت اور استقلال عطا فرمائے، علاوہ کی بیداری اور بے چینی لازمی تھی، جب ہم گناہ گاروں اور جاہلوں کا یہ عالم ہے تو وہ لوگ وارث نبی صلعم تھے:-

فریاد و فغاں بلبل ناشاد کئے جا — مہمان قفس خاطر صیاد کئے جا

فریاد ہو یا نالہ ہو یا آہ جگر سوز — جو ہو سکے تجھ سے دل ناشاد کئے جا

یا غیر مقلد، اس قدر تمہید کے بعد میں چند باتوں کا حضور کو یقین دلاتا ہوں، تاکہ معاملات صاف ہو جائیں اور ہمیشہ کیلئے،

(۱) ہم ایک منٹ کے لئے، بھی یہ خیال نہیں کرتے کہ حضور عیش پرست یا آرام طلب ہیں، اور اس لئے اسلام کی راہ میں تکلیف اُٹھانا گوارا نہیں کرتے "لاحول ولا قوۃ الا باللہ"، حضور اسلام کے ایسے ہی سچے شیدا ہیں جیسا کوئی مسلمان ہو سکتا ہے، جان و مال قربان کرنے کا شوق ہے، مگر اُس کو ضائع کرنا نہیں چاہتے، عمدہ غذا، عمدہ مکان، عمدہ لباس اور آرام کی زندگی سے دل میں نفرت ہے، اور اگر خدا یہ نشیمن حضور سے چھین بھی لے، تو حضور کو بجائے رنج اور افسوس کے خوشی ہوگی کہ اب تو اکابر اور صلحائے اسلام کی طرح خدا نے آپ کو بھی منتخب کر لیا،

(۲) حضور کی نیت ہمیشہ بخیر ہوتی ہے، اور بہادری سے اسلام کی خدمت کرنا چاہتے تھے ہیں، یہ کافی تھا، کہ حضور کو معلوم ہو جائے، تاکہ غلط فہمی کی گنجائش باقی نہ رہے، اور آپس میں فضول معاملات پر بحث نہ کی جائے، جس بات میں ہم کو شکایت ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ حضور پر الزام کم ہے،

(۱) مسلمانوں کی کم ہمتی اور بے حسی سے جلد مایوس ہو جانا اور اس خیال سے کہ کام کا ارادہ کر کے ناکام رہنے سے کفار کی نگاہ میں ہم اور حقیر ثابت ہوں گے، اور وہ ہم پر اور مظالم اور زیادتیاں کریں گے اسے بہتر سمجھا کہ صرف ایسا کام کیا جائے جو کامیاب ہو سکے، یہ ایک حد تک صحیح تھا، مگر جب معلوم ہو گیا کہ مریض مہلک بیماری میں مبتلا تھا، تو پھر چشم پوشی کرنا بیکار تھا، پھر تو جان توڑ کر دیوانہ وار کوشش کرنا تھی، کہ علاج معالجہ وقت پر ہو جائے، اور صحیح طریقہ سے، اُس وقت دشواریوں اور ناکامیوں کا کیا ڈر، سو مرتبہ ناکام رہیں گے اور ذلیل ہوں گے، اور پھر کوشش کریں گے آخر میں "ہمت مرداں مدد خدا" صحیح ثابت ہوگا، اس میں حضور مجھ کو معاف فرمائیں گے، کچھ قصور حضور کا تھا، مگر زیادہ تر ہم ساتھ والوں کا جو بے ہمت تھے، اور بجائے دل بڑھانے کے اعتراضات کی بوچھاڑ اور بحث مباحثہ سے پژمردہ کر دیتے تھے،

(۲) روزمرہ کے معمولی سیاسی معاملات میں لوگوں کی رائے سے جلد تر، متاثر ہو کر رائے کو پلٹ دینا جس سے کام کرنے والوں کو یقین نہ تھا کہ کسی خاص مسئلہ میں حضور کیا کریں گے، اس میں کچھ قصور حضور کی ذہانت اور طباعی کا اور کچھ حضور کی مروت، اور اسلامی شیوہ کا تھا، کہ ان معاملات میں اپنی رائے کو جمہور اور احباب کی رائے پر بھروسہ کر کے بعض اوقات متضاد رایوں کا اظہار ہو جاتا تھا، اس بارے میں بھی میں حضور پر الزام زیادہ نہیں لگا سکتا، کیونکہ حضور کو خود اعتراف ہے کہ حضور کو سیاسی معاملات میں واقفیت نہ تھی، اور نہ کچھ بہت لگاؤ، مگر آج کل سیاسی معاملات اور مذہبی معاملات ایسے خلط ملط ہو گئے ہیں کہ اُن کا علیحدہ کرنا دشوار تھا، اگرچہ مذہب اسلام میں سیاست اور مذہب کبھی جدا تھے ہی نہیں، مگر اب کفار کی حکومت میں مجبوراً ایسا امتیاز قائم کیا گیا ہے،

(۳) یہ میرے نزدیک سب سے بڑا الزام ہے کہ مذہبی احکامات کو بجائے صاف اور چند الفاظ میں ظاہر کرنے کے مبہم الفاظ کے دریا میں ملا دینا تھا، جس سے کافی ہدایت نہیں ملتی تھی، اور یہ کہ موٹے موٹے اصول لیکر اُن کو بار بار نہ کہنا اور اُن پر توجہ دلا کر مسلمانوں کو بیدار نہ کرنا، حضور نے بہت سے خطوط لکھے، اور خطبے پڑھے اور

سب میں اسلامی جوش اور سچائی بھری تھی، مگر وہ اس قدر پھیلی ہوئی تھی اور اُس کے گرد اس قدر توہمات جمع ہو گ
تھے کہ لوگ اُس سے ہدایت نہیں پا سکتے تھے، مثلاً حضور کو صاف کہنا تھا اور بار بار کہنا تھا، اور ہر جلسہ اور ہر موقع
پر کہنا تھا، کہ خلیفۃ الرسول کے خلاف لڑنا، جب کہ وہ جہاد مقامات مقدسہ کی حفاظت کے لئے کرتا تھا، حرام ہے
بار بار اس پر زور دینا تھا تاکہ مسلمان سپاہی اور سول والے عذاب دوزخ سے بچے رہتے، میرا ذاتی ایمان ہے ک
دین کے معاملات میں مصلحت وقت اور گلو خلاصی کا خیال دین کی کمزوریوں کا باعث ہوتا ہے، صاف سوال کا صا
جواب دیا جائے، اور اُس پر اٹل رہنا چاہیئے، اور اگر ضرورت ہو تو اُس کی خاطر تمام تکالیف برداشت کرنا چاہئے
حضور نے سب کچھ کہا مگر بہت سی باتوں پر کہا، اصل بات اُن میں غائب ہو گئی یا کم از کم اُس پر کافی توجہ نہیں کی گ
حضور والا میری عبارت بھونڈی ہے اور اکثر جگہ بے ربط مگر مجھ کو امید ہے کہ حضور میرا مطلب سمجھ جائیں گے، ا
جہاں گستاخی ہو گی، اُس کو معاف فرمائیں گے، ہم کو حضور سے اس قدر توقعات ہیں اور اس قدر امیدیں ہیں کہ ہم چاہ
ہیں کہ اسلامی دنیا کو معلوم ہو جائے کہ حضور کے جسم میں کیسا سچا اور طاقت ور قلب تھا اور دماغ تھا، جو اسلا
بیداری اور برتری کے لئے، ہر وقت کوشاں تھا، حضور کا فتویٰ نہایت عمدہ کام تھا مگر ۴ برس دیر میں شائع
اور اُس میں بھی یہ غلطی کی گئی کہ وہ فقط والسرائے کو بھیجا گیا، اور مسلمانوں کو عام طور پر مختلف زبانوں میں ترجمہ
ساتھ نہ ملا، تاکہ اُن میں بیداری اور قوت پیدا ہوتی، اور وہ اُس سے فائدہ اُٹھاتے، والسرائے کو سب حا
معلوم ہے، اُنہوں نے تو آنکھوں پر دیدہ و دانستہ اپنے حصول اغراض کے لئے پٹی باندھ لی ہے۔

اب ہمیں تھوڑا اپنی نسبت عرض کرنا ہے، حضور ہم کو خوب جانتے ہیں کہ ہم لوگ عیش و آرام کے عادی فاسق
فاجر تھے، اور ہیں، ہم کو ان باتوں پر فخر نہیں ہے، مگر واقعات کو چھپانا بھی نہ چاہیئے، ہم شرمندہ ہیں، اور خدا سے د
کرتے ہیں، کہ وہ ہم کو قلب مومن عطا کرے، اور ہماری گندگیوں کو دور کرے، تاکہ ہم سچے بندے ہو سکیں، ہم دنیاد
ہیں، اور اُس کو کمانا خوب جانتے ہیں، بے ایمان نہیں ہیں کیونکہ بے ایمان واقعی دنیا میں پورہ کامیاب نہیں ہو
ہے، ملک کے سیاسی معاملات سے واقف ہیں اور اپنے مخالفین کے داؤں پیچ کو خوب پہچانتے ہیں، مگر خد
واقف ہے، کہ ان تمام ذاتی خواہشوں اور نفسانی خواہشات کے علاوہ اُس پاک پروردگار نے دل میں ایک چیز
بھی پیدا کر دی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اُس کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں جو خدا اور رسول اکرم صلعم کا دشمن تھا اور جس سے د
مقدس کو خطرہ تھا، جس کسی کو کافی تجربوں کے بعد اسلام کا دشمن پایا تھا، تو اُس کی بیخ کنی اور دین مضبوطی کی فک
سے کسی وقت بے فکر نہیں رہے، ہم ضرور چاہتے ہیں کہ نیک نام ہوں، فقط شہرت نہیں چاہتے بلکہ نیک نامی کے
خواہاں ہیں، مگر اُس کے ساتھ یہ بھی چاہتے ہیں کہ خدا ہم کو توفیق دے اور سامان دے، تاکہ ہم واقعی کچھ کام بھی کر
جس سے نیک نامی کے مستحق ہوں، غیر حقیقی شہرت نہیں چاہتے، ہم کو شوق ہے کہ خدا ہم سے کوئی خدمت لے مگر حضو
جس صبر اور استقلال کے ساتھ اور جس قدر غور و فکر کے بعد ہم کام کرتے ہیں وہ یا تو ہمارا خدا جانتا ہے یا ہمارا دل ہم کو فخر
کہ ہم نظر بند کئے گئے اور اب تک آزاد صرف اس وجہ سے نہیں کئے گئے کہ ہمارے خیالات میں کچھ فرق نہ تھا، ہم آج ب

ویسی ہی استعدادی کے ساتھ دین کی فکر میں ہیں جیسے کہ قبل نظر بندی کے تھے، احباب سے رنج ہے کہ اُنہوں نے ہماری اس ۴ برس کے امتحان کے بعد یہ قدر کی کہ وہ ہمارے مشوروں پر آپ یہ کہہ کر بدگمانی کریں کہ ہم اب نظر بندی کی مسلسل قیود سے اُکتا گئے ہیں اور پریشان خاطر ہیں، ہم کو اس قدر دانی سے ضرور سخت صدمہ ہے، اور اس لئے صاف عرض کریں گے کہ چونکہ ہمارے احباب میں سے کثیر التعداد خود کم ہمت تھے، اس لئے وہ ہم پر اُلٹا الزام لگاتے ہیں، حسرت نے صحیح کہا ہے اور تجربہ کے بعد:-

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم — گھبرا گئے ہیں بے دلی ہمرہاں سے ہم

ہمارا قدم آج بھی آگے کو بڑھتا ہے، خدا کا شکر ہے، کیونکہ ہم اُس عقل سلیم کو استعمال کرنے کے بعد ہر عمل کرتے ہیں، جو خدا کی طرف سے ہم کو عطا ہوئی ہے، ہم آج بھی اپنی قوم کو تمام اور قوموں سے بہتر جانتے ہیں، کیونکہ ہم ہر طبقہ میں پہلے ملتے رہے ہیں، اور اب بھی برابر ملتے رہتے ہیں، ہم کو صرف ایک دھن اور وہ اپنی رہائی کی نہیں، لاحول ولاقوۃ الا باللہ، بلکہ اعلائے کلمہ حق کی، اُس کے لئے ہم بے چین رہتے ہیں، اگر عمدہ خبریں ملتی ہیں، تو ہم خوش ہوتے ہیں، اور اگر بزدلی اور بے ہمتی کی اطلاع پاتے ہیں، تو ہم کو صدمہ ہوتا ہے، مگر خدا نے ایسا قلب دیا ہے کہ تھوڑی دیر بعد وہ پھر مایوسی کو لات مار کر نکال دیتا ہے، اور خدا پر بھروسہ کرکے از سر نو عمارت بناتا ہے، حضور والا ۴ برس گذشتہ کا تجربہ ہمارے احباب کے لئے کافی ہونا چاہیئے تھا، اگر دسمبر ۱۹۱۴ء میں وہ خطبہ پڑھا گیا ہوتا جو ۱۹۱۶ء میں پڑھا گیا تو آج اسلام کی فتح یقینی ہوتی اور مقامات مقدسہ کفار کے ہاتھ میں نہ ہوتے، یہ تجربہ کافی تھا ہماری رہنمائی کے لئے، خدا کی نعمتوں کو ہم نے ٹھکرا دیا تھا، بغداد شریف، کربلائے معلے، نجف اشرف، اور بیت المقدس کو ذلیل اور ناپاک کرنے والے ہم اور آپ ہیں اور ہماری ذلیل اور بزدلی سکھانے والی مصلحتیں جو آخر میں ثابت ہو گئیں، کہ ناکارہ تھیں، ہم نے ہزاروں مسلمان سپاہیوں کو جہنم کا راستہ دکھایا، ہم نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بجا آوری میں پہلو تہی کرکے اپنے آپ کو دین و دنیا میں خراب و برباد کیا، اب ہم دیکھتے ہیں کہ وہی سلسلہ پھر جاری ہے اگر کچھ کمی ہے تو خود حکام کی حماقت اور دیوانگی کی وجہ سے وہ پھر وہی جبر و ظلم کا نسخہ استعمال کر رہے ہیں، جو کامیاب ہوا تھا، اور ہم پھر اُسی تدبیر اور مصلحت بینی کے پیرو ہیں جس نے دنیائے اسلام کو تباہ و برباد کیا تھا، حضور اب یہی سے کام کرنے کا وقت تھا، ہم کو صاف کہہ دینا چاہیئے کہ یا تو فوراً ہمارے تمام مطالبات پورے کرو ورنہ ہم پر مذہبی احکامات کی رو سے تمہاری امداد حرام تھی، بلکہ جہاد فرض تھا، حضور ہجرت کے خیال کو تو اب چھوڑ دیں اب تو جہاد کا حکم نافذ ہونے کا وقت معلوم ہوتا ہے، بحث و مباحثہ کا وقت نہ تھا، ہم نے احکام نظر بندی صرف اس وجہ سے توڑے ہیں کہ کچھ تو کیا جائے، جس سے احباب میں گرمی آئے، وہ خود افسردہ تھے، اور دوسروں کو بھی نا امید کرتے تھے ہم کو مشورے کی اب ضرورت نہ تھی، ہم کو اس امر کی اطلاع کی ضرورت تھی کہ ہر دوست یہ کہے کہ میں نے اسلام کے لئے یہ کیا، عمل چاہیئے نہ کہ باتیں، میں حضور سے دریافت کرتا ہوں کہ ڈاکٹر انصاری کے خط کی کیا ضرورت تھی ... اور گورنمنٹ کی امداد حرام ... کے خلاف کرو امیر ہندوستان

کرنے کو نہیں آیا ہے بلکہ وہ تو دشمنانِ اسلام کی سرکوبی کو آیا ہے، تاکہ وہ قوم جس نے دیدہ و دانستہ باوجود صریح وعدوں کے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ، بیت المقدس، اور عتبات عالیات کو کفر کی ظلمت سے گندہ کیا ہے، اُس کو تباہ و برباد کرے اور ہم کو ہمارے احباب مشورہ دیتے ہیں کہ تمام مسلمان دشمنانِ اسلام کی حمایت کریں، اور مجاہدین کی خونریزی، یہ کیا مصلحت ہے، اس سے تو کفار کی ہمت بڑھتی ہے، اور مسلمانوں کو صدمہ ہوتا ہے، یکسوئی کے ساتھ صاف کہنا چاہیئے اور عمل بھی کرنا، گاندھی نے حال میں بمبئی میں مسئلہ خلافت پر ایک لاجواب لکچر دیا، "ینگ انڈیا" اخبار منگا کر ملاحظہ فرمائیں اُس میں شائع ہوا ہے، وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنے مطالبات فوراً فوراً صاف طور سے پیش کریں، اور اپنی مجبوریوں کا بھی صاف اظہار کردیں، سنسر کو ہم خط وغیرہ نہیں بھیجتے ہیں، قیام یہاں پر ہے اور رہے گا، جب تک ہم کو زیادہ تنگ نہ کریں، احباب سے درخواست ہے کہ وہ ہم پر بھروسہ رکھیں، ایک طرف تو ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں ہم منتخب لیڈر ہیں دوسری طرف ہمارے مشوروں کو لغو اور بے کار بتایا جاتا ہے، یہ وقت شکوہ شکایت کا نہیں ہے، ہم کو اپنے مطالبات صاف صاف بیان کرنا چاہیں، کہ ہم اس جنگ میں کوئی مدد نہیں دے سکتے تا آنکہ ہمارے مطالبات فوراً قبول کئے جائیں، تب انشاء اللہ صلح کرادیں گے، خط کے جواب کی ضرورت نہ تھی حضور آئندہ لکھیں تو لفافہ پر "وزیران بی بی آپا" کوٹھی محلہ جھنڈوواڑہ تحریر فرمائیں، بھائی الطاف، مولینا سلامت اللہ اور تمام احباب کو خط دکھا دیجئے گا

حضور کا خادم

شوکت علی معتمد خادم الخدام کعبہ

اتنا اور عرض کرنا ہے کہ جو کچھ شکایت کی گئی ہے اُس میں بہت سے عزیز اور احباب شامل ہیں، از روئے سختی خادم الخدام کعبہ حضور کی طرف نہ تھا، بلکہ حضور سے جو شکایت تھی، وہ تو علیحدہ عرض کر دی گئی تھی، اور وہ کچھ ایسی شکایت بھی نہ تھی، بلکہ ایک مشورہ تھا، کہ اب صرف ایک امر کی طرف توجہ کی جائے، احمد کی طرف سے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں، کہ جو کام ہم کرتے ہیں، آپس میں پورے طور پر مشورہ اور بحث کے بعد اگر اختلاف ہوتا ہے تو ہرگز نہیں کرتے، ایک اپنی رائے کا زور دوسرے پر نہیں ڈالتا، اپنی اپنی رائے کا اظہار ضرور کرتے ہیں، مگر عمل اسی وقت جبکہ کامل اطمینان کے بعد رائے دونوں کی قائم ہو جائے، حضور کو علم ہے کہ ہم دونوں بھائی نفس مطلب پر تو مجتمع ہیں، مگر طریقہ عمل دونوں کا مختلف، بعض اوقات سخت اختلاف ہو جاتا ہے، مگر بفضلہ تعالےٰ عمل کے وقت ہم مشورے اور باہمی تشفی کے بعد قدم بڑھاتے ہیں، یہ خیال کرنا کہ ایک دوسرے سے مرعوب ہوتا ہے، بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے، ہر کام کے تمام پہلوؤں پر غور کر لیا جاتا ہے، ترجمہ کے بارے میں حضور کے خط سے تسلی ہو گئی، حضور کا مشورہ صحیح اور درست تھا، مولوی صاحب نے اپنے خط میں اس کی تفصیل نہیں کی تھی، جس سے غلط فہمی ہوئی، صاحب مطبع کو انجان پریشانی میں ڈالنا زیبا نہ تھا اُس کی اشاعت سے غرض یہ ہے کہ مسلمان کلمہ حق کہنے کے عادی ہو جائیں، زمانہ بے حجابی کا آگیا ہے، خدا توفیق دے کہ ہر مسلمان کا قدم احکام الٰہی کے مطابق پڑے، اور سب مل کر اعلائے کلمہ حق کریں، اس سے اسلام کی عزت ہوگی، خاموشی سے جمود پیدا ہوتا ہے اقبال نے خوب کہا ہے:۔

ہاں اسے شراب عشق یہ دن ہیں نمود کے ایسی اچھل کہ خلوت مینا بھی چھوڑ دے

والدہ صاحبہ آگئیں، اُن کی ہمت مردانہ پر دل فریفتہ ہے، خدا اُن کو زندہ اور سلامت رکھے تاکہ وہ کچھ دیر دین کی خدمت کریں محمد کا دست بستہ آداب کسی غیر معروف شخص مگر معتبر کا پتہ اور نام چاہیئے تاکہ اُس کے نام ڈاک سے جائے، حضور کو وہ دستی جاکر دے دے، حضور کے خط تو مشکوک تھے،

حضور کا خادم شوکت علی معتمد خادم الخدام کعبہ

نماز تہجد کی عادت

(۵۷)

اللہ اکبر

جیل بیتول (صوبہ متوسط) ۶ر دسمبر ۱۹ء

حضور والا، السلام علیکم

حضور کو مفصل خط لکھنے کو ہمیشہ دل چاہتا ہے مگر بس صبر سے کام لیتا ہوں، اور صرف مجبوری کے وقت لکھتا ہوں جب فضول بدگمانیاں یہاں پیدا ہوں تو خواہ مخواہ اُن میں کیوں اضافہ کیا جائے، جو تعلقات روحانی حضور سے ہیں وہ ہم جیسے گناہگاروں کے لئے بہت کافی ہیں، بعد نماز تہجد حضور کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں اور بعد دعا کے سلام علیک پہنچا دیتا ہوں، یہ دل کی تسکین کے لئے کافی ہے، جب خدا کا حکم ہوگا، تو اُس کے بدلے حاضر خدمت ہو کر قدمبوسی کروں گا، اور لکھنؤ میں اس قدر رہوں گا کہ کوئی شکایت کی گنجائش باقی نہیں رہے گی، بلکہ برادرم مولانا الطاف الرحمٰن کو بھی رقابت پیدا ہو جائے گی، دل کی تمنا ہے کہ جلد تر حضور کے ہمراہ حجاز مقدس کا سفر کروں اور یمن، نجد اور عراق میں بھی پھروں اور زیارت مقدسہ سے فراغت حاصل کرکے کچھ ثواب دارین حاصل کروں، جو لطف حجاز مقدس میں اب آئے گا پہلے نہ آتا، کیونکہ بڑی خدمت درپیش ہے،

لائے اُس بت کو التجا کرکے کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے

برادرم مولانا سلامت اللہ صاحب کو ۵ نومبر کو ایک خط لکھا تھا، اور عزیزی خلیق الزمان صاحب کے پتہ سے بھیجا تھا خیال تھا کہ ضرور مل گیا ہوگا مگر اب تک جواب نہ آنے سے اندیشہ ہوتا ہے کہ ڈاکخانہ کی غلطی یا کسی اور وجہ سے وہ نہ ملا ہو، اخبارات سے جناب مولانا عبدالعزیز صاحب فرنگی محل مرحوم کے انتقال کی اطلاع ملی، دلی رنج ہوا، مرحوم سچے مسلمان تھے، اور ہماری خدام کعبہ سے دلی محبت رکھتے تھے، خدا مرحوم کو .... (کاغذ غائب) .... میں جگہ دے، اور تمام اہل خاندان کو صبر جمیل عطا فرمائے، .... (کاغذ غائب) .... تک پہنچا دیں بفضلہ تعالیٰ ہم لوگ تندرست .... (کاغذ غائب) .... کرلیتا ہے اُس کی ذات کے ہوتے ہوئے .... (کاغذ غائب) کسی کی .... (کاغذ غائب) .... سے خدمت کس طرح بیکار تصور کئے جا سکتے ہیں، اُس کی رحمت سے مایوسی کی کوئی وجہ ہی نہیں ہے، قلب میں طاقت ہے

اس ۵ برس کے تجربہ کے بعد بجائے پستی کے اور نئی قوت پیدا ہوگئی ہے، خاص کر یہاں کے دلچسپ قیام نے
لوگوں کی زندگی بہت پرلطف ہے، جب قدمبوسی حاصل کروں گا، تو مفصل حالات بیان کروں گا، اخبارات
یا ۱۸ آتے ہیں، اور خوب وقت ملتا ہے کہ اُن کو پڑھیں، تمام معاملات سے خبر ملتی ہے، عزیزی خلیق الزمان
بہت کچھ توقعات تھیں مگر افسوس کہ اُن کا لکھنؤ کا قیام مفید نہیں ثابت ہو رہا ہے، کل "ہمدم" پڑھ کر سید
برجبین پر افسوس آیا، کاش یہ سچ ہوتا، کہ حضور میں ذاتی ترفع اور آگے بڑھنے کا نیا شوق پیدا ہوگیا ہے، ہم کو تو
سب سے بڑی یہی شکایت تھی کہ حضور تصنع سے اس قدر بھاگتے ہیں، اور اس قدر شرمیلے ہیں، کہ بعض اوقات کا
نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، دنیا اس قدر تصنع کی عادی ہوگئی ہے کہ اُس کے بغیر کام چلنا دشوار ہے، ہم
گ حضور کے لئے دعا کرتے ہیں، اور اب بہت خوش ہیں، حضور کی خدمات کا صلہ تو وہ قادر مطلق اور بادشاہ د
یہاں ہی دے گا، ہم کو یکسو ہو کر اُس کی خدمت کرنا چاہیئے، والدہ صاحبہ کی دوبارہ علالت کی خبر —— ملی، ہم
گ صرف دعا ہی کر سکتے ہیں، پہلے کی نقاہت موجود تھی، اب پھر بخار اور پیچش کی شکایت ہے وہی پرانی آنتوں ک
رابی ہے، جس سے خطرہ ہے، خدا مالک ہے، آج بارہویں ربیع الاول ہے، افسوس محفل میلاد میں شرکت ا
سال نصیب نہیں ہوئی، مگر میں سیرۃ نبوی پڑھ رہا ہوں، جس کی ایک جلد مولانا سید سلیمان صاحب نے بھیجی
آج انشاءاللہ ختم ہوجائے گی، مولانا ابوالکلام صاحب کا تذکرہ حضور نے پڑھا، ضرور کلکتہ سے الہلال پریس س
منگوائیے مولف کے دیباچہ کے علاوہ خود تذکرہ نہایت درجہ دلچسپ اور قابل قدر ہے، محمد علی اچھے ہیں، اس
عرض کرتے ہیں، ہمارا اسلام مسنون مولوی سلامت اللہ صاحب مولوی عنایت اللہ صاحب برادرم الطاف الر
کاغذ غائب
. . . . احباب؛ عزیزی قطب میاں صاحب کو دیدہ بوسی، دعائیں حضور، . .
کاغذ غائب
. . . . نہ تھی سید فضل الرحمٰن صاحب کو بہ
کاغذ غائب
. . . . (خادم شوکت علی معتمد خادم الخدام کعبہ
بہت پیار . . . .

بپن چندر پال اور خلافت

اللہ اکبر

(۵۸)

قبلہ و کعبہ۔ اسلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہ،
ابھی حضور والا کو دہلی کی تشریف آوری کے متعلق تار دیا ہے، میں پرسوں یہاں آیا ہوں، کلکتہ میں حضور سے ر
ہو کر ڈھاکہ، کریم گنج، چٹاگانگ، چاندپور میں قیام کیا اور وہاں کی حالت دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، نواب صاحب
نہایت ہی سچے مسلمان نوجوان ہیں، اور اس مذہبی کام میں کوشاں ہیں اور آسام وغیرہ کا دورہ کرنے کا وعد
کیا ہے، ڈھاکہ میں اہل ہنود نے خاص طور پر دعوت دی، اور چاند وغیرہ کے بعد خلافت اور جزیرۃ العرب

متعلق سوالات کئے، میرے جواب سے وہ متحیر ہوئے اور بولے کہ اس کا تو ہم کو علم ہی نہ تھا، اور اب ہم ہر طرح آپ کے ساتھ ہیں، اور واقعی دنیا کے مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے، چٹگانگ جس کا پرانا نام اسلام آباد تھا وہاں کے اہل ہنود بھی ہمارے اس مقدس کام میں کوشاں ہیں، اور ہمارے ساتھ ہیں، کریم گنج میں جو ضلع کی کانفرنس ہوئی ہے اس کے صدر بپن چندر پال تھے، انہوں نے خلافت میٹنگ میں شرکت کی اور بنگلہ زبان میں وہ تقریر کی جو کوئی مسلمان نہ کرتا، ان سے بہت امید ہے، ابھی حضور کا خط ختم نہ ہوا تھا کہ محمد علی کا تار جو رامپور گیا تھا، ابھی ملا، جس کی نقل ملاحظہ کے لئے تحریر ہے،

میں نے ابھی راجہ صاحب کو تار دیا ہے، اور درخواست کی ہے ان کی امداد کی ضرورت ہے، اور وہ اپنی رائے سے مطلع کریں کہ انگلستان معہ رضا علی کے جائیں گے یا نہیں مہاتما گاندھی جانے کے لئے آمادہ ہیں اور یہ بڑی قوت ہے، اس تار کے مضمون سے معلوم ہوگا، کہ وہاں ان لوگوں کی ضرورت ہے، آسام کے سفر کے بعد کلکتہ آیا اور ایک دن قیام کر کے بمبئی کے لئے روانہ ہوا اور راستہ میں ناگپور و برہان پور قیام کیا مسلمانوں کی حالت ہر جگہ یکساں ہے اور اس کے ساتھ ہی ناگپور کے ہنود نے بھی میری تقریر سن کر وہی وعدہ کیا جو دوسری جگہ کے ہندوؤں نے کیا تھا، بمبئی آخر ماہ تک قیام کرنے کا ارادہ تھا تاکہ صدر دفتر میں کام کا پورا انتظام کر جاؤں امید ہے کہ جب تک مقیم ہوں یہاں کی حالت درست اور کام باضابطہ ہو جائے گا، ۲۲ کو دہلی پہنچنا ہے، جیسا کہ ابھی حضور کو تار سے مطلع کیا ہے، اور اس محمد علی کے معاملہ کے بعد کو مشورہ کی اور بھی ضرورت ہے، شیر صاحب کل تشریف لائے اور وہ اس وقت یہاں موجود ہیں فرماتے ہیں کہ حضور ۲۲ کو ضرور دہلی آئیں مہاتمہ گاندھی بھی آئیں گے،

حضور کا خادم شوکت علی خادم کعبہ

گاندھی جی سے ملاقات

نہایت ضروری

۱۸ مئی ۱۹۲۰ء

قبلہ وکعبہ، السلام علیکم

حضور کا گرامی نامہ جو چوک کے ڈاکخانہ کے سپرد ۱۴ مئی کو گیا یہاں ۱۸ مئی ۲۰ء کو پہنچا، لفافہ کی حالت سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کھولا گیا، اور مجھے یقین ہے کہ آپ کے اور ہمارے خطوط برابر کھولے جاتے ہیں، تاہم اس کی کوئی پرواہ نہ کرنی چاہیئے،

شرائط صلح کے اعلان کے بعد سے جو کچھ بھی ہیجان وسوہان روح ہم لوگوں میں نہ ہو وہ کم ہے، پھر بھی ہمیں اپنے مقاصد کو کامیاب بنانے کی غرض سے ضرور غور و تحمل سے کام لینا پڑے گا، اس موقعہ پر خدا مولانا فاخر صاحب کا بھلا کرے کہ ہم لوگوں میں ایک تازہ روح پھونک دی انہوں نے سنت نبوی کی زندہ نظیر پیش کر دی جس سے

ری قوت ایمان میں اور اضافہ ہوا، اس قسم کی نظیر پیش کرنے کے واسطے ہر مسلمان کو تیار رہنا چاہیئے، دعا یہ ہے کہ
روردگار ہم سب کو توفیق استقامت دے، میں ابھی گاندھی مہاراج سے ملا تھا، اور سب کی یہ رائے ہے کہ
کی خلافت کمیٹی کا دفتر کسی صدر مقام میں ہونا چاہیئے یہ جگہ دور و دراز ہونے کے باعث اکثر لوگوں کو یہاں آنے
ں دقتیں ہوتی ہیں، نہ معلوم کتنی جلد جلد جلسوں کا انعقاد ہو، اس وجہ سے یہاں سے صدر دفتر لے جانیکا خیال
ہے، اُس کے واسطے تین مقام زیر تجویز ہیں، دہلی لکھنؤ اور الہ آباد، میری ذاتی رائے یہ ہے کہ صدر دفتر لکھنؤ
ہونا چاہیئے، ۲۷ مئی کو ایک میٹنگ ہونے والی ہے اور مقام انہیں تینوں مندرجہ بالا مقامات میں سے تجویز
کیا جائے گا، ۱۲ مئی والی میٹنگ میں انقطاع تعلق کا مسئلہ بالکل طے ہو گیا، اُس کے چار مدارج رکھے گئے ہیں،
جن کا آپ کو بھی علم ہے، اس مسئلہ کے متعلق جو اعلان لکھا گیا تھا، وہ گاندھی مہاراج نے بغرض ترمیم رکھ لیا ہے
کیونکہ وہ اعلان قبل از اشاعت شرائط صلح تھا، اور اب جب کہ ہماری قسمتوں کا فیصلہ ہو چکا اُس میں تغیر و
تبدل کے بعد اُسے بہت جلد شائع کیا جائے گا، اب مرکزی کمیٹی کا کام نہایت شد و مد سے شروع کیا جا رہا
ہے، پراونشیل کمیٹی سے ایک ایک نمائندہ آئے گا جو مرکزی کمیٹی میں رہ کر مستقل طور سے کام کرے گا، مولانا
آزاد بھی وہیں رہیں گے، مہاتما گاندھی نے بھی طے کر لیا ہے کہ جس جگہ خواہ الہ آباد دہلی یا لکھنؤ میں دفتر ہو
مقیم رہیں گے، "انقطاع تعلق" کے متعلق جو عہد نامجات ہیں انہیں چھپنے کے واسطے بھیجا جا رہا ہے، اس
وقت ہم لوگوں کی حالت نہایت نازک ہے، اور ضرورت ہے کہ اس وقت غور و تحمل سے کام لیں، ہیجان
ان تمام مصائب کا ایک جزوی نتیجہ ہے، لیکن ہمیں اُسے دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اس وقت اس کا
طریقہ سے اندازہ کرنا ہے، کہ کون کون ایثار کر سکتا ہے، اور کتنا کر سکتا تاکہ اس موقع پر کوئی بھی ایک
پیچھے نہ ہٹنے پائے، ۲۷ مئی کو جس جگہ میٹنگ ہوگی، وہاں صرف رہائش کا انتظام کرنا ہے، باقی کھانے پینے
واسطے ہر شخص فرداً فرداً انتظام کرے گا اور غیر ضروری بار کسی پر ڈالنے کی ضرورت نہیں، اگر کوئی مکان لکھ
صدر دفتر کے واسطے مل جائے، تو آپ اُس کی کوشش کیجیئے، ہمارا دفتر اُس میں رہے گا، اور دفتر کے
۲۰ یا ۲۵ اشخاص ہوں گے، اور علاوہ ازیں اتنی اور گنجائش ہو کہ اس میں مہمان وغیرہ بھی آکر تھوڑی
تعداد میں ٹھہر سکیں، ایک مکان تو اس قدر وسیع ملنا دشوار ہے، اس لئے متفرق مکانات قریب قریب
بھی غنیمت ہے، انجمن صاحب بہادر کا ایک مکان وکٹوریہ گنج میں تھا، سنا ہے کہ بڑا تھا، مگر خلافت
تو اُس کا ملنا دشوار معلوم ہوتا ہے، ان رامپور کے واقعات کے بعد خود چھٹانی میاں صاحب کا
ایسا ہی ہے، اگر صدر دفتر ہندوستان چلا جائے، ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں وہ صدر بھی نہ رہ سکیں
وقت اُن کی مشکلات کا خیال بھی لازمی تھا، بد قسمتی ضرور ہو گی کہ ایسے وقت مقام تبدیل کیا جائے
کرنا پڑے گا، خانگی طور سے خاص خاص احباب سے حضور مشورہ فرمائیں، میرے خیال لکھنؤ
ہونا مناسب ہوگا، اور دہلی سے بہتر، ۲۷ مئی کو یہ اہم معاملہ اور معاملات کے ساتھ پیش ہو

بلایا ہے تاکہ وہ اپنا مشورہ دیں، اس صورت میں ہوا صاحب آپ ...
کو حضور بطلیح فرمادیں، اور حضور کی شرکت اس موقع پر بھی ضروری ہے، حالانکہ گرمی کی تکلیف بہت سخت ہو
بفضلہ تعالےٰ چھوٹانی سیٹھ صاحب اب کام کے لئے طیار ہیں، نہایت درجہ خوشی ہوئی، مفصل حالات زبانی
وقت ملاقات عرض کروں گا، اُن کا مجسٹریٹی استعفا بھی تیار ہے، دو چار دن میں یہاں بڑی میٹنگ ہوگی، شر
صلح سے اظہار نارضامندی لے لی، مولانا فاخر صاحب کی بیگم صاحبہ کو کل ۵۰۰ روپیہ خلافت کمیٹی کی طرف سے رو
کردیئے گئے، اور آیندہ بھی ہر امداد کے لئے تیار ہیں، خدا کا شکر ہے کہ الہ آباد نے اور ہمارے صوبہ نے اپنی
دلی اور بیداری کا ثبوت دیا، ایک ہزار پرسوں روانہ کروں گا اور اور روپیہ بھی بعد کو،

حضور کا خادم شوکت علی خادم کعبہ

ہم لوگ اپنے نئے دفتر میں آگئے ہیں، یہ بھی عارضی کیونکہ اصلی مکان دو ماہ میں تیار ہوگا، یہاں کا کرایہ اور
سخت زیادہ ہیں کل سے وصولی چندہ بھی شروع ہوگئی ہے، یہ ٹیلر پہاڑ سے کیوں اوتھ کرآرہے ہیں، ایک تو
کو تنگ کریں اور پھر امید رکھیں بفضلہ تعالےٰ ہم صابر و شاکر ہیں اور آخر تک صبر سے کام لیں گے،

کانگرس ہمارے قریب آتی جاتی ہے

(۶۱)

الجمعیۃ المرکزیۃ الھندیۃ للخلافۃ الاسلامیہ (بمبئی)

اللہ اکبر

بمبئی، دفتر سنٹرل خلافت کمیٹی، ۱۵ر جنوری سنہ ۲۱ء

حضور والا، السلام علیکم

عزیزی سعید الرحمٰن نے حضور کے خطوط دکھائے، اُن سے مجھ کو فکر ہوئی، مگر میرا خیال ہے کہ مولانا س
اللہ صاحب سے گفتگو اور مفصل حالات سننے کے بعد صحیح حالات معلوم ہوئے ہوں گے، حسرت بھائی تو
گھبراہٹ پیدا کرتے ہیں، احکام الٰہی کے مقابلہ میں ہم کو کانگرس یا مسلم لیگ یا کسی ملکی انجمن کے احکام عزیز نہیں
نہ اُن کی پابندی ہم پر فرض ہے اور نہ ہم نے کی ہے اور نہ آیندہ کریں گے، ترک موالات خلافت کمیٹی نے
مراحل ہمارے لئے طے کردیئے ہیں، اور ہم اُن پر کاربند ہیں، کانگریس قبول کرے یا نہ کرے، ہم تو احکام ا
کے پابند ہیں، صاف صاف ہمارا یہ مطالبہ تمام دیگر اقوام نے قبول کرلیا ہے، کانگریس خدا کا شکر ہے روز بروز ہم
قریب آتی جاتی ہے، مگر ہمارے لئے تو اُن کے کوئی احکام مذہب کے احکام کے مقابلہ میں نہیں، یہ مہاتما گا
صاحب نے صاف صاف اپنی تقریر اور تحریر دونوں میں بارہا صاف کردیا، پھر ہمارے بھائیوں کو بیجا بدگمانی
کہاں تمام اہل الرائے نے اُن الفاظ کو مسلمانوں سے غیر متعلق کہا، کیونکہ مسلمان کے لئے تو تمام احکام ۱۳

ہیں ہر مسلمان کو لازم تھا، کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے قلب اور ضمیر کا محاسبہ کرے، اور دیکھے کہ جو مشورہ وہ دے رہا تھا، نفسانیت اور ذاتی آرام کے لحاظ سے تھا، یا محض مقاصد کی بہتری کے لئے، میرے خیال میں ہر کام یکسوئی سے درست ہوتا ہے، اگر آشتی سے کام لینا ہے تو آشتی ہو اور اگر جنگ ہے تو پھر جنگ ہی ہو، دوطرفہ کارروائی میں نقصان کا احتمال ہوتا ہے، اس لئے میں نہایت ادب سے مشورہ دوں گا کہ ہم کو ۴ یا ۵ ماہ تک مسٹر گاندھی کا نسخہ سچائی کے ساتھ استعمال کرنا چاہئے پورے پرہیز کے ساتھ، اُس کی ناکامیابی پر ہم وہ کریں گے، جو خدا کا حکم ہوگا، صبر و استقلال اور ہمت سے کام کرنا ہے، اور خدا کے فضل سے امید ہے کہ وہ ہماری کوششوں کو باریاب کرے گا، ابھی حضور اور مولانا ابوالکلام صاحب کا تار سلا، ۱۱۱ اصحاب اب بلانا اور پھر دوسری میٹنگ جلدی کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے، ضروری امور کا فیصلہ خلافت کمیٹی ہی کرے گی، میں نے ابھی حضور کو حسب ذیل تار دیا ہے، "وقت کم ہے، ۲۷ کو میٹنگ طلب کرنا ہے، ممبروں کا دوبارہ آنا دشوار ہے، لکھنؤ میں اگر صرف رہنے کا انتظام ہو جائے تو کھانے کے مصارف ہم سب خود کریں گے، جواب تار سے دیجئے، الہ آباد سے میٹنگ کرنے کے متعلق کوئی جواب نہیں آیا ہے۔"

حضور کے خط کا منتظر رہوں گا، اور تار کا بھی، رات یہاں غریب مسلمانوں نے محلہ مدنپورہ میں بڑا جلسہ کیا، تقریباً ۲ ہزار آدمی تھے، انقطاع تعلق کی تحریک کو سب نے قبول کیا، چندہ غریبوں نے دیا اور کرہندہ مل میں کام کرنے والوں نے وعدہ کیا کہ باقاعدہ دیں گے، چھوٹانی میاں صاحب نے ابھی ٹیلیفون پر بلا کر کہا کہ میں آپ کو تار کر دوں کہ "اگر لکھنؤ میں جلسہ کا انتظام مشکل ہو تو بہتر ہے بمبئی ہی میں میٹنگ بلائی جائے، الہ آباد میں بھی دشواری ہوگی"، میں نے مناسب خیال کیا کہ حضور اور مولانا آزاد فوراً یہاں تشریف لے آئیں، تاکہ زبانی گفتگو ہونے کے بعد تمام امور کا تصفیہ ہو جائے، مہاتما گاندھی یہاں کل صبح آئیں گے، میں اُن کو روک لوں گا، زیادہ کیا لکھوں، بہتر، مشیر حسین صاحب بھی ہمراہ آئیں، اُن کا انگلستان جانا اب تو بے کار معلوم ہوتا ہے۔

حضور کا خادم شوکت علی خادم کعبہ

زندہ یاد الٰہ آباد

(۶۰)

۲۲ رمئی ۲۰ء — اللہ اکبر

حضور قبلہ و کعبہ جناب مولانا صاحب، سلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ،

امید ہے کہ حضور بخیریت ہیں، عرض یہ ہے کہ پہلی دوسری جون کو الہ آباد میں جلسہ کرنے کا ارادہ ہے، وہاں سے دعوت بھی آگئی ہے، مہاتما گاندھی صاحب کو تار دیا ہے، امید ہے کہ وہ رضامندی دیدیں گے، تو اس حالت میں کوئی شبہ ہی نہیں رہے گا، یہ تاریخیں اس وجہ سے تجویز کی گئیں کہ ۳۰، ۳۱ مئی کو بنارس میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا جلسہ ہے، خلافت کمیٹی کا جلسہ ہے، خلافت کمیٹی کی طرف سے ہندوستان کے ہر خیال کے ہنود صاحبان

قبل آ گئے ہیں، ایک دوسرے حضرت جو را وی دروغ بھی ہیں، ایک فرضی من گھڑتی قیاس پر کہ سنا ہے محمد علی صاحب
کاغذ غائب
نے راجہ صاحب محمود آباد کو اس امر پر مبارک باد دی۔ . . . .
کاغذ غائب
. . . . پر لعن وطعن شروع کر دیا۔ . . . .
تو الاعواہ غلط فہمیاں پیدا کر کے تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں، یہ وقت کام کرنے کا ہے، فضول وقت ان جھگڑوں میں ہم ضائع نہیں کر سکتے، ہم کو ۸ ماہ کے اندر تمام اپنے مطالبات حاصل کرنا ہیں بفضلہ تعالیٰ تمام ملک نے ہمارے اسلامی اصولوں کو پسند کر کے اُن کی پابندی کی، تمام ملک ایک ہو گیا، اس پر خدائے برتر کا شکر کرنا ہے،

(۲) مولانا عبدالقدیر صاحب کا خیال نہایت اچھا ہے، ۲ ہزار اُس کے لئے اور ایک ہزار مصارف کے لئے بھیجے جاتے ہیں، زبانی گفتگو میں تمام معاملات اور کام کا طریقہ طے ہو جائے گا،

(۳) کل میں اور چھوٹانی میاں ۔ . . . . . . مشیر حسین صاحب جہاز پر پہنچیں گے، اُن کو یہ خیال ہرگز نہ کرنا چاہیئے تھا، کہ ہم لوگ اُن سے بدسلوکی کریں گے، اور وہ بھی اس طرح کی کہ کسی قسم کا اُن کے لئے انتظام نہ کریں گے، محمد علی سے جو واقعات پیش آئے تھے، اور جن کی نسبت دو بدو گفتگو ہو جائے گی، ضرور رنج پہنچا تھا، نیز آغا خاں کا مشیر پر بہت اثر ہے، اور خود اُن کی رائے کو بھی تلون ہے، اس لئے اُن سے گفتگو کرنا ہو گی مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہ تھے، کہ ہم اُن کو اپنے سے علیحدہ کر دیں گے ہم تو اُن کو ساتھ رکھنے کی از حد کوشش کریں گے، اور خدا سے امید ہے کہ کامیاب بھی ہوں گے، حضور اطمینان رکھیں، اُن کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے گی،

(۴) خدا کا شکر ہے کہ رائے بریلی کے تمام کسانوں نے بھی ترک موالات با امن کی فتح کا ثبوت دے دیا، یہ واقعہ تمام ہندوستان کے کاشتکاروں کو جگا دے گا، ہٹلر اور اُس کے ہم رائے کب تک تعلق داروں کو ہمارے راستہ میں حائل کریں گے، ہمارے کسان بھائیوں کا صبر و تحمل قابل ستائش ہے . . . .
کاغذ غائب
. . . .
کاغذ غائب

حضور کا خادم شوکت علی خادم کعبہ

حساب کتاب

(۶۴)

اللہ اکبر

بمبئی دفتر سنٹرل خلافت کمیٹی ۲۹ جنوری ۱۹۲۱ء

حضور والا، السلام علیکم

حضور کا خط مجھ کو کل بمبئی واپسی پر ملا، دو دن کے لئے احمد نگر اور مالی گاؤں و ناسک دورہ پر گیا تھا، منظم نے بھی اپنے خطوط دکھائے، سیٹھ چھوٹانی صاحب کو حضور کا تار اور خط دونوں دیدیئے تھے، آج غالباً سیٹھ صاحب بھی حضور کو علیحدہ خط لکھیں گے، مجھے یہی کہا کہ جب میں واقعات بیان کروں گا، تو حضور کو اطمینان ہو جائے گا،

جو امور کہ حضور نے اپنے خطوط میں لکھے ہیں، اُن کی نسبت کچھ مجھ کو کہنا تھا، تاکہ حضور کو تمام حالات سے واقفیت ہو جائے، برادر عزیز الطاف الرحمٰن صاحب کو بھی خط دکھا دیجئے گا۔

(۱) عزیزی سعید الرحمٰن کی نسبت حضور کو علم ہے کہ میری ذاتی رائے بہت اچھی ہے، وہ نہایت درجہ منتظم اور قابل آدمی ہیں، اور کام کئے، اگر وہ دفتر میں ہی رہتے تو آج اُن کی بڑی قدر و منزلت ہوتی اور ہمارا بہت سا کام ہوتا مگر وہ سیٹھ صاحب کے خانگی معاملات میں گئے، ظہور احمد صاحب... کا کچھ قصور نہیں ہے، وہ غریب فضول زد میں آگئے، اصل بات یہ ہے کہ کسی شریف تعلیم یافتہ شخص کی بمبئی میں بحیثیت ملازمت گذر دشوار تھی، یہاں کے لوگ ہی ان معاملات کو خوب بناتے ہیں، سعید نے بڑی غلطی یہ کی کہ جاتے کے ساتھ ہی اس محنت اور تندہی سے کام کیا کہ دفتر کی گذشتہ خرابیوں کا پردہ فاش ہو گیا، یہاں کے لوگ اُن کے دشمن ہو گئے اور طرح طرح سے اُن کے خلاف کارروائی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھوٹانی صاحب اُن کی نسبت از حد خراب خیال رکھتے ہیں، اور میری کوشش ہے کہ اُن کو اور ہوتی دیا جائے بے سود ثابت ہوا، وہ ——— مفسد اور ضرورت سے زیادہ چالاک ہیں، میں نے بے کار سمجھا کہ زیادہ اور کہوں، سعید سے بھی کہا کہ تمہاری گذر وہاں ناممکن ہے، میں دفتر میں خوشی سے اُن کو رکھنے کو تیار تھا، مگر سیٹھ صاحب اور کھتری صاحب دونوں اس کے خلاف تھے، اور میں نے مجبوراً یہ مشورہ دیا کہ تم بہتر ہے محمد علی کے پاس علی گڈھ چلے جاؤ، فوج مسلم یونیورسٹی کے لئے ایک محاسب کی سخت ضرورت تھی، محمد علی سے بھی کہہ دیا تھا سعید وہاں خوش رہیں گے اور کام کر سکیں گے۔

(۲) مجھ کو افسوس ہے کہ حضور کو مفسد لوگ خواہ مخواہ دوسروں کے خلاف لکھ کر پریشان کرتے ہیں، بفضلہ تعالیٰ ہم میں کا کوئی بد دیانت نہیں ہے اور نہ خائن، ہمارا ضمیر اس سے پاک ہے، اور خدا ہم کو اُس دن کے لئے نہ رکھے کہ ہم اس روپیہ سے اپنا گھر بھریں، حضور کے خط سے ہم کو رنج ہوا، کیونکہ شبہ پڑتا ہے کہ حضور کو بھی گمان ہے کہ ہم ایسا کر سکتے ہیں، بفضلہ تعالیٰ ہمارے احباب موجود ہیں جو ہماری کفالت کر سکتے ہیں اور آج تک میں نے پورہ حساب کر دیا ہے، جو موجود ہے، کہ میری ذات پر تمام سال بھر کے دورہ کل ۲۰۱۰۰ ——— ۱۵۵۱ر ۶ صرف ہوا اس سے دوگنا تو میں اپنا صرف کر چکا ہوں۔

(۳) دفتر کا حساب آخر دسمبر تک مکمل ہو گیا، یعقوب حسن صاحب نے اُس کو جانچا اور اب باقاعدہ کسی آڈیٹر کے سپرد جانچ کی جائے گی، دفتر میں بھی کوئی بے ایمان نہیں ہے اور جو الزام لگائیں اُن میں اتنی جرأت ہونا چاہیئے کہ وہ آکر چور کو پکڑ دیں، ہم سب ممنون ہوں گے۔

(۴) میں انشاء اللہ دہلی ۱۲ کو ہوں گا اور وہاں سے لکھنؤ حاضر ہوں گا، ہمارے صوبہ میں کام کم ہوتا ہے فضول کے اعتراضات زیادہ ہوتے ہیں مجبوراً مجھ کو محمد حسن صاحب میرٹھی سے صاف صاف گفتگو کرنا پڑی، حضور ان تمام حضرات سے کہیں کہ ایک مرتبہ پورے غور سے حساب کو آکر جانچ لیں اور پھر جو مشورہ دیں، میں ہرگز مشورہ اور اعتراض سے نہیں گھبراتا مگر صرف سنی سنائی باتوں پر سخت اخلاقی الزامات لگا

کام رکنے والا نہیں ہے، اقبال نے خوب کہا ہے،

نہیں ہے وجہ وحشت میں اوڑانا خاک زنداں کا ۔۔۔ کہ میں اس خاک سے پیدا بیاباں کرکے چھوڑوں گا

بیج ہی اس کو آنکھوں سے لگایا، صبح کو پڑھتا ہوں، خوب اطمینان ہے اور بہت آرام، اس قدر آرام
ناممکن تھا، مولوی نثار احمد صاحب سے عربی بول چال اور صرف پڑھتا ہوں، خوب آدمی ہیں، اور بہت
سلمان اور نیک. قطب میاں، مولانا سلامت اللہ صاحب بھائی شوکت علی مولوی عنایت اللہ صاحب
حکیم عبدالقوی صاحب، صبغۃ اللہ صاحب سب کو سلام مسنون، عابد صاحب کو پیار،

حضور کا خادم شوکت علی خادم کعبہ

ترک موالات

(۶۴)

ضروری
اللہ اکبر

نگینہ ضلع بجنور
۱۸ اکتوبر ۱۹۲۱ء

قبلہ و کعبہ، السلام علیکم

علی گڈھ تشریف لے جانا ضروری ہے، میں تار و خط بھیج چکا ہوں طلباء مذہبی ارشاد معلوم کرنے کے
خواہشمند ہیں اُن کو اطمینان اور امداد کے لئے تشریف لے جانا لازمی ہے، میں لاہور جا رہا ہوں جہاں تما
امرتسر تشریف لے گئے ہیں، میں بھی وہاں جاؤں گا، ۲۱ کو بمبئی روانہ ہوں گے، دہلی سے محمد علی کا قیام یوپی میں

حضور کا خادم شوکت علی خادم کعبہ

اسی کاغذ پر پنسل سے حضرت رح کا نوٹ

بھائی شوکت کی تحریر سے معلوم ہوا کہ مجھے مسئلہ ترک موالات کی تلقین علی گڈھ کالج کے طلباء کو
چاہیئے، میں خود آتا تمام جلسہ کرنے کا حکم خدا ظاہر کرتا، مگر میرا دل قابو میں نہیں رہتا ہے، اور نام نہا
مسلمانوں کی لاپرواہی اسلام کے اس بڑے وقت میں غصہ دلا دیتے ہیں اور مطلب بھی ادا کرنا ناممکن ہو
ہے، موقع و محل کی پرواہ نہیں رہتی ہے، اس واسطے میرے مخصوص احباب نے تقریر عام کرنے سے
مجھے روک دیا ہے، اُن سے وعدہ کر چکا ہوں، مگر اب عام جلسہ کی شرکت سے ہی اپنے کو معذور سمجھ
ہوں، اس ——— میں نے شرکت جلسہ لکھنؤ سے اندازہ کیا ہے کہ میری ذمہ داری خدا کی جانب سے
بہت سخت ہے جس کے لحاظ کرنے کی صورت میں خلافت کمیٹیوں کے مقاصد کا اندیشہ ہے میں کسی
و خوشامد کی پرواہ نہیں رکھتا مگر مفاد اسلام کے باعث سخت و نرم ہو جاتا ہوں، اس وجہ سے وہاں

ہوگا، کل شبیر حسین صاحب آئیں گے، اُن کا تار ہمارے تار کے جواب میں آگیا؛ حضور اطمینان رکھیں

حضور کا خادم شوکت علی خادم کعبہ

کراچی جیل سے ایک خط

کراچی جیل سرفت سپرنٹنڈنٹ جیل کراچی، ۱۵ر اکتوبر ۲۱ء (۶۳)

حضور والا، السلام علیکم

مجھ کو کچھ علم نہیں کہ میرے دو خط قطب میاں صاحب کو ملے یا نہیں، ار دو خطوط کا حال معلوم نہیں ہوتا، بہت دنوں سے خط نہیں آئے ہیں، کلکٹر کی معرفت آتے ہیں، اور خدا معلوم اُن کا وہاں کیا حشر ہوتا ہے، اب خطوں کے ذریعہ سے ہم آوارگان اسلام کو اور کوئی کیا آوارہ کرے گا، مگر شاید یہ بھی ایک سزا کا مزید طریقہ ہوگا مقدمہ اب ۲۴ر اکتوبر کو ہوگا، خدا کا شکر ہے کہ زیادہ انتظار کرنا نہیں پڑے گا، نتیجہ تو معلوم ہے، مگر ہم چاہتے ہیں کہ ایک مرتبہ صاف فیصلہ ہو جائے، تاکہ تمام دنیائے اسلام متنبہ ہو جائے، ممکن ہے روس آکسٹی الہ آباد کا بونا بیرسٹر آئے گا، میں اُن سے واقف ہوں، اُس کے ہمراہ کوئی حضرت عالم بھی آئیں گے:

حضرت ناصح گر آئیں دیدۂ و دل فرش راہ
پر کوئی ہم کو یہ سمجھاؤ کہ سمجھائیں گے کیا

لطف ہوگا، معظم صاحب نے غالباً حضور مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کو اطلاع دی ہے اور درخواست کی ہے کہ حضور تشریف لائیں، زیارت کا اشتیاق ہے، وہ نصیب ہو جائے گی، رہا کام تو یعقوب حسن صاحب سب سنبھال لیں گے، معظم صاحب کو تمام حالات سے اطلاع ہے، کام کرنے والوں میں اور اضافہ کرنا ہوگا دفتر میں آدمی کم رہ گئے ہیں، اختر علی یہاں آئے ہیں، کل واپس گئے، اُن کو میں نے شہر بمبئی کے مضافات کا کام علاوہ دفتر کے خطوط کے، جو میری طرف سے سارے ہندوستان کے کام کرنے والوں کو لکھیں گے سپرد کیا ہے، اشفاق کچھ دنوں تو والدہ صاحبہ کے ہاں رہ کر سکرٹری کی حیثیت سے کام کریں گے، عام ملک میں احباب سے درخواست کریں گے، کہ روپیہ بھیجیں اور والدہ صاحبہ کے ہمراہ دورہ پر جائیں گے، حبیب عثمان رامپور سے آجائے تو والدہ صاحبہ کے پاس رہ کر یہ کام انجام دیں گے اور اشفاق مدراس یا کسی دوسرے صوبہ میں کام کریں گے، عابد صاحب کو حضور یہ خط دکھا دیجئے گا، اور کہئے گا کہ اس کا جواب اور شکریہ خود بھی لکھ کر بمبئی کے پتہ سے بھیج دیں، ہم خوشی سے امداد قبول کریں گے، جس وقت ضرورت ہو گی، انشاء اللہ عزیزی عابد محنت سے پڑھ کر کامیاب ہوں گے، عزیزی سید الرحمٰن کے کام سے تمام لوگ یہاں خوش ہیں، نہایت محنتی اور فرائض کو پہچان کر کام کرتے ہیں، کام لینے والا چاہیئے، میں تو ایسے آدمی کو ہمیشہ اپنے پاس رکھوں جس کو خود کام کے تکملہ کی فکر ہو، گھبراہٹ بھی مفید ہے، کیونکہ اس سے محنت اور فکر کا پتہ چلتا ہے، بفضلہ تعالےٰ

فضول سمجھتا ہوں مسئلہ اکابر علماء نے ظاہر کر دیا ہے اُس کی موافقت کرتا ہوں ترک موالات یوں ہی حکم رہا تھا، اب وفاداری اسلام کے لئے ..... ایک یہ ہی ذریعہ تجویز کیا گیا ہے، جس میں تشدد و خونریزی نہیں ہوتی ہے، لہٰذا اس متعین صورت کو بجنسہ اختیار کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے، فرض وفا ہر عاقل بالغ پر ہے، لڑکے کو باپ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے، اس فرض کو انجام دینا چاہئے، کالج اگر ترک موالات نہ کریں تو اپنی تصفیہ پر عمل کرنا چاہئے، اور خدا کے گنہگار ہونے کے علاوہ دوست بندوں کے ساتھ بے وفائی اور مسلمانوں کی موت میں مدد دینا ہوگی آئندہ کالج کا کیا حشر ہوگا اسکے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے اگر ہم کامیاب ہوئے تو کالج ---- ہوگا اگر ناکامیاب ہوئے تو ہم ہی فنا ہوں گے تو کالج سے کیا ہوگا اب یہ قوم کے عام افراد کے ہاتھ ہے کہ وہ زندہ رہنے کے خواہش مند ہیں تو ترک موالات کریں، دنیا بھی پاویں اور دین بھی حاصل کریں، ورنہ ہندوستان کی موت ہے، قیامت ہے، سوچنے کا وقت گذر گیا، میں نے اور مالوی نے اول مجلس مشاورت پر ترک موالات سے حصول مقصود ہونے کی مخالفت کی تھی، مگر میں جلد متنبہ ہو گیا، اور شریعت کی ہدایت کے باعث گاندھی صاحب کے اتباع میں اس کا خاص ممد بن گیا اور مالوی نے رفتہ رفتہ مدارج ترک موالات کا موقف سمجھا یا اس سے ظاہر ہو گیا، کہ عقل دین و دنیا دونوں آخر میں ایک جگہ مجتمع ہو گئیں، مسلمانوں کا تامل خطرناک ہے؛

کراچی جیل کا زندانی

کراچی جیل معرفت سپرڈنٹ جیل ۲۶ / اکتوبر ۲۱ء (۶۵)

اللہ اکبر

گر کہا ناصح نے ہم کو قید، اچھا یوں سہی — یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

حضور والا، السلام علیکم

مولانا عنایت اللہ صاحب سے حضور کو تمام مفصل حالات معلوم ہو جائیں گے، وہ تو کل اس قدر خفا تھے کہ بمشکل تمام حکم دے کر اُن کو روکا کہ ہم کو صبر سے کام لینا ہے، ع دروغ گو بدر خانہ باید رسانید" ہم لوگ فقیر خاک نشین، ہم کو کرسیوں کی کیا ضرورت تھی، مگر سخن فہمی عالم بالا معلوم شد:-

ہم کو اُن سے وفا کی تھی امید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

حضور کے نہ ملنے کا افسوس ہے اور اس سے زیادہ حضور کی علالت سے سخت فکر ہے، حضور پورے طور سے علاج فرما کر تندرست ہو جائیں کیونکہ ابھی اسلام اور دین مقدس کو حضور کی بہت ضرورت ہے عزیزہ حضرتی سلمہ کی علالت سے بھی تشویش ہے، خدا اپنا رحم کرے، بھائی الطاف کے خطوط پڑھ لئے تھے حالات سے آگاہی ہوئی، حضور زیادہ فکر نہ فرمائیں میں نے چھوٹانی میاں کو صاف صاف خط لکھ دیا جس

پر وہ ضرور توجہ کریں گے، یہ وقت جمع کرنے کا ہے نہ کہ بہتر بن کام کرنے والوں کو علیحدہ کرنے کا، کمیٹی کے واسطے بھی میں نے اپنی تجویزیں پیش کر دی ہیں، جو دہلی میں حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری پیش کر دیں گے، مجھ کو امید ہے کہ تمام امور کا مناسب تصفیہ ہو جائے گا، میں نے صبر سے کام لیا، اور کسی کو تنگ نہیں کیا، ان باتوں سے ہمارا کچھ نقصان نہیں ہے بلکہ خود اُن حضرات کا، مگر اس کام کو آخر تک، صبر و سکون سے کرنا ہے، انشاء اللہ نصر من اللہ و فتح قریب، پریشانی نظر آتی ہے، بفضلہ تعالیٰ، ہم سب متفق طور سے کام کریں گے، اتحاد اس وقت لازمی ہے، حضور کی کوششیں انشاء اللہ بار آور ہوں گی، عزیزی عابد سے ملاقات ہوئی، وہ حضور کے سپرد ہیں اور قطب میاں صاحب سے اچھا اُن کو نگران کون ملے گا شاہد کو بھی حضور ہی پاس بھیجے دیتا ہوں، اُس کی صحت کی طرف سے پریشانی ہے، تھوڑی تھوڑی اردو فارسی نکل جائیگی اور انگریزی و حساب بھی، سعید الرحمن کو میں سب سمجھا دوں گا، عزیزی سعید اس قدر توجہ اور محنت سے کام کرتے ہیں کہ ہر شخص اُن کا مداح ہے، خدا اُن کی کوششوں کو بار آور کرے، لکھنؤ کی چا، خوب، پی او ٹکڑے تو نہایت ہی لطیف تھے، مولوی نثار احمد صاحب جو میرے قریب رہتے ہیں اُن سے بہت محظوظ ہوئے، میرے حصہ میں بھی شریک تھے، کیونکہ مجھ کو علم ہو گیا ہے کہ اُن کو میری طرح میٹھا کا بہت شوق ہے، حضور اس قدر سامان کھانے کا ہے کہ مکان حلوائی کی دوکان ہو گیا ہے، خدا بڑا غریب پرور ہے، آج تک تو اُس کے نام سے بہت کچھ ملا ہے، کل اگر تھوڑی تکلیف ملے تو شکایت کیسی، پیشگی مزدوری مل گئی تھی، میں بعد نماز صبح وظیفہ حضور کی تسبیح پر پڑھتا ہوں، اور اُس کو چوم لیتا ہوں بعد نماز دعائیں یا فرمائیں، قطب میاں صاحب اور سب چھوٹے صاحب زادوں کو پیار و دعا، خدا اُن کو عمر و ایمان اور صحت عطا فرمائے، مولوی سلامت اللہ صاحب، مفتی صاحب، عزیزی صبغۃ اللہ، الطاف بھائی، اور سب کو سلام مسنون؛

حضور کا خادم شوکت علی خادم کعبہ

جیل میں اذاں اور نماز

(۸۶)

۲۲ جنوری ۲۲ء

شوکت علی از کراچی (جیل)

اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم

حضور کو خط لکھنے کا ارادہ تھا مگر آج موقع ملا ہے، اصل غرض تو مبارکباد تھی کہ مولانا سلامت اللہ صاحب بھینٹ چڑھ گئے، اور فرنگی محل اب تیار ہے، حضور کا تار اخبارات میں حیدر آباد والا پڑھا تھا، اب عزیز

ہوجائیں گے تمام جیل کا کام بند کردے تو پریشان ہوجائیں گے ،ہمارے خیال میں اب وقت آگیا ہے کہ ہمیں
طرح باہر زور سے کام ہوتا ہے ،ہم لوگ جیل کے اندر بھی زور سے کام کریں ،مگر وہی یا امن ترک موالات
آزاد رکھتے ہیں ،تو مصیبت ،جیل بھیجتے ہیں تو بھی خرابی ! یہ لوگ تب ہی مانیں گے ،ضرور ہمت اور بہادری
کا کام ہے ،مگر بہترین نتائج نکلیں گے ،میرا سب کو حضور سلام پہنچا دیں ،خاص کر مولانا سلامت اللہ
خلیق ،شوکت علی ،اور پنڈت موتی لال جواہر لال کو ،ہم دونوں بھائی مقدمہ کے بعد سے نہیں ملے ہیں ،یہ سزا
ہی ہنسی کو آتی ہے ،مولوی نثار احمد صاحب میرے ہمراہ ہیں ،سلام کہتے ہیں اور نیک آدمی ہیں ،محمد علی
اب تنہا ہیں ،مولانا حسین احمد صاحب احمد آباد جیل کو یکایک تبدیل کر دیئے گئے ،ہمارے تبادلہ کی بھی خبر
تھی ،مگر اب تک ملتوی رہا ،اب کانفرنس کا نتیجہ معلوم ممکن ہے تبادلہ ہو پیر صاحب ،اور کچلو محمد کے قریب
ہیں ،تمام جیل ہم سے محبت کرتا ہے ،انسپکٹر جنرل آنے والا ہے ،آج صبح انگریز نے جو میرا بہت مداح
ہے ،کہا کہ آپ بھی کمرہ کے باہر کھڑے ہوجیئے گا ،اور بستر بھی باہر ،میں نے قطعی طور پر انکار کر دیا ،ہم سب
سے خلاق کریں گے ،مگر کوئی بات بے عزتی کی نہیں کریں گے ،ہم تمام بدمزگیوں کے لیئے تیار نہیں ہیں
میں جانتا ہوں کہ حضور اگرچہ مجھ پر بھی بہت شفقت فرماتے ہیں ،مگر محمد علی سے خاص الفت ہے ،مجھ کو
قدرتی رشک ہے ،اس لئے میں نے مجبور ہو کر فیصلہ کیا ہے ،کہ چھوٹے صاحبزادوں کو میں اپنا کرلوں ،محمد
میاں ،نور میاں ،اور صاحب زادی صاحب میری پارٹی میں ہوجائیں ،میں یہاں ہوں ہوں ،مگر عابد میرا کام
کرتا ہے اور وہ بہت ہوشیار ہے ،مولانا عنایت اللہ اور سعید کہتے تھے کہ صاحبزادے اس پر بہت
ہلے ہیں ،اگر پدر نتواند پسر تمام کند ،سیٹھ صاحب کو اور قطب میاں کو سلام !

حضور کا خادم شوکت علی خادم کعبہ

بخدمت جناب مولانا عبد الباری صاحب

مضمون واحد ہے ،خداوند کریم کا فضل ہے صحت اچھی ہے ،گو وزن ۱۲ سیر کم ہوگیا ہے ، حفظ کیا ہوا
سب بھول گیا تھا ،مگر اب تک دو پارہ پھر حفظ کر لئے ہیں ،اور نماز فجر میں سورہ بقر کی دوسو سے زائد آیات
تلاوت ہوجاتی ہے ،گھر سے اطلاع ملی تھی کہ لڑکی کے مردہ اولاد ہوئی ہوئی تھی ،خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ لڑکی
خود بچ گئی ،دعا فرمائیے میرے لئے دعا کی سخت ضرورت ہے کہ تزکیہ نفس ہوجائے ،نفس امارہ بہت ستاتا
ہے ،فتح کی امید قوی ہے ،

تمہارے فضل کے بھوکے یقین رکھتے ہیں — کہ عید آئے گی بے شک مہ صیام کے بعد

(محمد علی)

(۲۴ جنوری سنہ ۲۲ء)

سعید کی گرفتاری کا حال معلوم ہوا حضور ہماری طرف سے مبارکباد اُس کو اور بھائی الطاف کو دیدیں وہ نہایت بہادر اور کام والا آدمی ہے، اور مجھ کو اُس سے محبت ہے، ابھی ونسنٹ کی تقریر کونسل میں موثر ہے، جس میں حضور کا تذکرہ خاص ہے، اور برادرم حسرت کا، ان احمقوں کو نہیں معلوم ہے، کہ اگر حضور کی کوششیں نہ ہوتی اور ہم مسلمان اس پر کاربند نہ ہوتے تو ہزاروں انگریزوں کا خون ہوگیا ہوتا، مگر یہ لوگ بے ایمان اور بدنیت ہیں، ختم اللہ علی قلوبھم الخ ان سے کسی بات کی توقع رکھنا بے کار ہے، خدا ہم سب کو استقامت دے اور سارا ملک اس جنگ عظیم میں شریک ہو کر قربانی اور استقلال اور شجاعت کا ثبوت دے، آمین، حضور کی کوششیں بے کار نہیں گئیں، اور آج سارا ہندوستان مضبوط ہے، بفضلہ تعالےٰ ہم لوگ بفضلہ تعالیٰ تندرست ہیں، اور حسب دستور خوش وخرم نماز عمدگی سے ہوتی ہے، اور میں دو قرآن پاک مع ترجمہ ختم کر چکا ہوں، ان لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ ہم لوگ ان معمولی دشواریاں اور کھانے پینے کی تکلیفوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے، مگر ہاں کوئی ایسی بات نہ کریں گے، اور نہ اُس کی اجازت دیں گے جس میں احکام الٰہی کی توہین ہو، یا ملک وملت کی بے عزتی؛

(۱) ہم سے داڑھی کے بارے میں گفتگو ہوئی، ان جیلوں میں دستور ہے کہ سب بال منڈائے جاتے ہیں، ہم نے کہہ دیا کہ جب تک جان باقی رہے گی اُس وقت تک ہم کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیں گے،

(۲) اذان سے انگریز نے مجھے روکنا چاہا میں نے بہت ملائم مگر طاقت سے سخت الفاظ میں صاف صاف کہہ دیا کہ احکام الٰہی کے بارہ میں مجھ سے زیادہ مت کہنا ہرگز امید مت رکھو کہ ہم اذان کو بند کرینگے، اب بفضلہ تعالےٰ سپاہ جگہ اذان ہوتی ہے اور پہلے کے مقابلہ میں تین گنے نمازی جیل میں ہوگئے ہیں۔

(۳) میں نے زاہد کی معرفت کل مہاتما جی کو لکھا ہے، کہ وہ اب صاف صاف ہدایات عام کرنیوالوں کو اجرا کر دیں کہ وہ جیل میں تمام غریب قیدیوں اور ہندوستانی سپاہیوں سے اخلاق کا برتاؤ کریں مگر ایسا کوئی قاعدہ اور دستور نہ بنائیں جس میں اُن کو منگوئی لگا روزمرہ جھاڑ الیا جائے، یا جیل کے پریڈ اور ——— بہت سے آدمیوں کے ہمراہ پاخانہ جاتا، نہ گالیاں اور برے الفاظ سنے، مار کا تو کیا ذکر، ہم لوگ جو سربرآوردہ ہیں، اُن پر تو ہاتھ ڈالنا مشکل مگر ہمارے غریب بھائیوں اور کام کرنے والوں پر زیادتی ہوتی ہیں، اور اس لئے اب جبکہ بہت سے قیدی جیلوں میں آئیں گے، ہم کو اُن کو اول سے خوب سمجھا بجھا کر مضبوط کر دینا چاہیئے، تاکہ گربہ کشتن روز اول پر عمل کریں، ہمارے چند ہندو اور مسلمان بھائی جو قبل آئے تھے، وہ بہت مصیبت میں ہیں کھانا بند کرنا اچھا علاج نہیں ہے، اس سے تو ہم خود کمزور ہونگے بلکہ ہم کو تو خوب یہاں آرام لینا چاہیئے، تاکہ صحت اچھی ہو جاوے، کام سے ہم کو انکار نہیں کرنا چاہیئے مگر اُتنا کرنا چاہیئے جتنا آسانی سے ہو سکے، مگر برے برتاؤ کا علاج ایک ہے، مفید ہے، اور وہ یہ کام سے انکار کر دیا جائے اس میں آزمائش ضرور ہوگی، اور ابتدا میں تکلیف بھی مگر بعد کو مجبور ہو کر درست ہو

خدمت کرنے کے بعد اور بھی ہم زیادہ فخر کرسکیں گے۔ ہمارا آپ کا بھائی چارہ کوئی معمولی بناوٹ کی چیز نہ تھا۔ بلکہ دراصل ہم سب ایک تھے۔ اور دنیا چاہے کچھ کہے ہم ایک دوسرے کے غم گسار اور مونس تھے اس پر میرا کامل ایمان تھا۔ اور ان کے زور پر میرا سارا کام تھا۔ اور اسی کے زور اور بھروسہ پر میں ساری دنیا میں ہنستا کھیلتا سر کو اونچا کئے ہوئے چکر لگایا کرتا تھا۔ عزیز و اقارب ساتھ دیں یا نہ دیں، دنیا کے اور دوست رفاقت کریں یا نہ کریں۔ مگر ہمارے علی گڑھ کے دوست اور بھائی ہم سے ہرگز جدا نہیں ہیں۔ تمام کھیلوں اور تمام جلسوں اور تفریحوں کے ساتھ ساتھ یہ ہی ایک بات مستقل طور پر ہمارے اور سب کے دلوں میں تھی کم از کم میرے دل میں تو تھی۔ کہ اسلام کے بہترین کام کرنے والے علی گڑھ سے ہی نکلیں گے۔ ہم لوگ طالب العلمی کے زمانہ میں نماز سے دل چراتے ہوں۔ مسجد میں فرضی حاضریاں لگواتے ہوں۔ جرمانہ بھی اپنے حقیر جیب خرچ میں سے خوشی سے دیتے ہوں۔ دینیات کی تعلیم کے گھنٹوں کو ہنسی مذاق میں اڑاتے ہوں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ہی بار بار اور روزمرہ سنتے سنتے یہ ہمارے ضمیر میں داخل ہوگیا تھا کہ جب کبھی اسلام پر کوئی وقت آئے گا، علی گڑھ سے ہی اس کے علمبردار اٹھیں گے۔ اور مست جوانوں کی بڑی جماعت سب کاموں کو چھوڑ کر صرف دین کی حمایت کے لئے کھڑی ہو جائے گی۔ جہاں تک میں علی گڑھ اور بانیٔ علی گڑھ کی تعلیم کا مقصد سمجھا تھا۔ وہ تو یہی تھا جیسے خود سر سید مرحوم بار بار اپنی تقریروں میں دہرا چکے تھے۔ کہ فلسفہ اور سائنس ہمارے سیدھے ہاتھ میں ہو۔ ریاضی اور تاریخ ہمارے بائیں ہاتھ میں ہو اور ہمارے سر پر تاج کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کا ہو۔

آج میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہوں کہ ہمارے سیدھے ہاتھ کس قدر فلسفہ اور سائنس آیا ہے۔ ہمارے بائیں ہاتھ میں کس قدر ریاضی اور تاریخ اور دیگر علوم جمع ہوئے ہیں۔ مجھے تو کوئی چیز نہ دائیں ہاتھ میں نظر آتی ہے نہ بائیں ہاتھ میں نظر آتی ہے۔ اور اگر ہیں تو وہی معمولی سستی سے کالج چیزیں ہیں کہ جو کلکتہ، مدراس، بمبئی، الہ آباد، لاہور، لکھنؤ، ناگپور، پٹنہ وغیرہ کی یونیورسٹیوں میں ماری ماری پھرتی ہیں۔ اور چند حقیر روپیوں کی لالچ میں ہم نے اپنے سر سے تاج کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کو بھی دور پھینک دیا۔ اس کے بغیر اگر ساری دنیا کے زر و جواہر ہمارے جسم پر ہوں تو وہ ہمارے لئے لعنت اور پھٹکار کا زیور ہیں اور ان سے نہ ہماری دنیا کے سامنے عزت اور نہ خود اپنے دل میں خود اپنی وقعت۔

یہ ضرور ہے کہ مدرسۃ العلوم مسلمانان یا محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج یا ام، اے، او کالج اب مسلم یونیورسٹی ہوگیا ہے۔ بجائے پریزیڈنٹ سکرٹری اور پرنسپل کے اب چانسلر وائس چانسلر۔ پرو وائس چانسلر۔ پرووسٹ اور بہت سے گونجتے ہوئے بھاری بھرکم عہدے موجود ہیں۔ یونیورسٹی کے رجسٹر شاندار بھی ہیں۔ اور یونیورسٹی خود اپنی ڈگریاں بھی دیتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ ایک لاکھ روپے سالانہ آمدنی میں اضافہ ہوگیا۔ مجھے وہ وقت یاد ہے جب کہ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں میں اور محمد علی علی گڑھ میں گئے تھے۔ سینکڑوں کی تعداد میں طلبہ یونین کلب میں جمع تھے۔ ٹرسٹیوں یا اسٹاف سے زیادہ شکایت نہ تھی۔ انکا اختلاف کرنا زیادہ تعجب کی بات نہ تھی۔ لیکن نو عمر نوجوان بھی موجود تھے۔ جن کی رگوں میں گرم خون کی بجائے نفع اور ضرر کا سمجھانے والا کیمیاوی مادہ تھا۔ جو ان کی امنگوں پر سرد پانی کا کام کرتا تھا۔ تقریباً پچاس برس سے ایک خاص مقصد کو لے کر ہم تیاری کر رہے تھے۔ جب کام کا وقت آیا۔ اس مقصد سے ایک بڑی جماعت نے منہ چرایا۔ اور وہ مسلمان جن کی شان میں لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ہے۔ وہ ظاہری جبروت اور سطوت سے مرعوب ہو کر بیٹھ گئے۔

شکوہ و شکایت

ایک درد بھرے دل کی صدا

مولانا شوکت علی کے قلم سے

دیکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف ؎ آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

برادر عزیز سلام علیکم۔ آپ کے حکم کی تعمیل مجھ پر فرض تھی۔ میں محبت کا بندہ ہوں۔ اور جس سے محبت ہوتی ہے۔ اُس کے م کو بغیر چون و چرا مانتا ہوں۔ جو میرے تعلقات علی گڑھ سے تھے اس کا سب کو علم ہے مجھ کو دہرانے یا جتانے کی ضرورت یں۔

کتنے ہیں قدیمی جسے وہ یار ہوں تیرا ؎ زلفیں بھی نہ تھیں جب سے گرفتار ہوں تیرا

علی گڑھ پر کوئی مضمون لکھتے ہوئے مجھ کو دشواری نہ ہونی چاہئے۔ مگر آج اس وقت ایک ایک لفظ نکالنے کے لئے دل کا و صرف کرنا ہوتا ہے۔ جیسے بھینسا لدی ہوئی بھاری گاڑی کو ریتے میں ساری طاقت صرف کر کے کھینچتا ہے۔ ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد ؎ پر طبیعت ادھر نہیں آتی ہو

میری طبیعت میں دل آزاری یا دل شکنی نہیں ہے۔ تھوڑی بہت مروّت بھی آنکھ میں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی ایسی بات ضمون جس سے کسی کا دل دکھے۔

میرے سامنے بفضلہ تعالیٰ نصب العین موجود ہے مجھے فرصت بھی نہیں ہے۔ کہ فروعات میں پڑ کر غیر ضروری جھگڑے مناظر سے چھیڑوں۔

اولڈ بوائے کی پالیسی کا بھی آپ نے صاف صاف اظہار کر دیا ہے۔ اور اس سے پہلے بھی میں جانتا تھا۔ مگر میں کیا کروں مجبور ہوں۔ آپ سے اور تمام پڑھنے والوں سے معافی کا خواستگار ہوں۔ کہ میری بیوقت کی شہنائی سے بھمانہ پائیں۔ ایک مرتبہ جو کچھ میرے دل میں ہے ظاہر کر دوں۔ محمد علی کے ایام جاہلیت کا ایک پرانا شعر اس ضمن میں موزوں ہے۔ ؎

تیری خاطر بھی ہے مدِّ نظر پاس ادب بھی ہے ؎ مگر میں کیا کروں دل کی جلن کچھ اور کہتی ہے ؏

اولڈ بوائے کے پڑھنے والے سب جانتے ہیں کہ مجھ کو علی گڑھ سے کتنی محبت تھی۔ مجھ کو اس سے کیسی کیسی توقعات تھیں۔ مجھے یقین کامل تھا۔ کہ دنیا میں اسلام از سر نو علی گڑھ کے بڑھے ہوؤں کی کوشش سے چمکے گا۔ علی گڑھ کا نام دنیا میں بلند ہوگا اور ہم لوگ جس طرح اپنی کرکٹ اپنی ہاکی اپنی فٹ بال اپنے لباس اپنے مذاق پر فخر کیا کرتے تھے۔ اسی طرح اسلام و دین مقدس کی بڑی بڑی

ہندوستان کے لباس خاصکر کھدر سے ...ہوں سے وہ اور اس کے گریجویٹ گیہ گئے ہیں. اور آج وہ لباس فاخرہ پہنیں۔ ...ارت بن ہیں۔ سول سروس اور اعلیٰ فوجی عہدے پائیں. مگر مسلمانوں کی نگاہ میں ان کی کوئی وقعت نہیں اور میں رنج سے کہتا ...ل کے درد سے مجبور ہو کر کہتا ہوں۔ کہ نہ اُن کے سیدھے ہاتھ میں "فلسفہ و تاریخ" ہے نہ بائیں ہاتھ میں "ریاضی و سائنس" ...اور نہ سر پر تمغۂ امتیاز و فخر کلمۂ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا تاج ہے اور میں تو اس رائے پر مضبوطی ...سے آگیا ہوں کہ مسلمان کے لئے بغیر سر پر تاج کلمۂ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کے دائیں اور بائیں ہاتھ میں علوم ...ونیا ایک پھوٹی کوڑی بھی نظر نہیں آئے گی۔

آج دعلیگ ... ہونے پر کون فخر کرتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اسٹیشنوں پر. بازاروں میں مختلف شہروں میں اگر کوئی مسلم یونیورسٹی کے نئے تعلیم یافتہ نظر بھی آتے ہیں۔ تو باوجود عمدہ کوٹ یا شیروانی۔ ترکی ٹوپی یا ہیٹ کے مسلمانوں کے مجمع ...سے شرما کر اور کترا کر نکل جاتے ہیں۔

میں یہ طنزاً نہیں کہتا ہوں۔ بلکہ دل کے رنج کے ساتھ ایک امر واقعہ کا اظہار کرتا ہوں۔ غریب جامعہ ملیہ اور اس کے کھدر پوش اور غریب طلبہ کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ عمارتیں نہیں تھیں اسٹاف بھی بڑا نہیں تھا مالی حالت بھی خراب تھی۔ مگر جو لوگ اُس کے پیچھے کارکن تھے۔ اوّل تو میں کہتا ہوں کہ دُنیا کی نگاہ میں خود مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کی نگاہ میں ہر شخص کی ...تک کہ دشمنانِ اسلام کی نگاہ میں بھی اُن سے بغض و دشمنی ہونے کے ساتھ ان کی عزت اور وقعت تھی۔ ممکن ہے کہ ہم میں سے بعض ارکان کی کمزوریوں نے اس نام کی عزت کو دھکا لگایا ہو۔ مگر اس امر واقعہ سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ قربانی اور ایثار اگر انسان جان بوجھ کر اختیار کرے تو ناممکن ہے کہ دُنیا اس کی عزت نہ کرے اور دنیا کرے یا نہ کرے خود اس کا قلب اُس کو خوش اور مسرور رکھتا ہے ؎

طمعِ فاتحہ از خلق نداریم نیاز ؎ عشقِ من در پسِ من فاتحہ خوانم باقی است

فروری کے مہینہ میں جب میں دہلی تھا۔ تو کئی طالب العلم مسلم یونیورسٹی کے میرے اور محمد علی کے پاس آئے اور علی گڑھ کے جلسوں کی شرکت کی دعوت دی۔ اور بہت اصرار سے کہا کہ ہم سب آج بھی آپ کے ہم خیال ہیں اور آپ کے ساتھ ہیں مگر ہم کمزور ہیں اور مرعوب۔ ہماری کمزوریوں پر نظر کر کے ہم کو اور اپنے عزیز مادر کالج کو آئندہ کے آنے والے خطرہ سے بچائیے اگر آپ لوگ شرکت نہ کریں گے۔ تو مسلم یونیورسٹی بھی نہیں کہ مثل اور یونیورسٹی کے ہو جائے گی۔ بلکہ اس کے پڑھے ہوئے اور ...ان سے بدرجہا زیادہ ذلیل و خوار اور خراب ہوں گے۔ عمدہ ولایتی سوٹ، عمدہ ولایتی بوٹ ہوگا۔ اور ہم چند روپیوں اور پیسوں کی خاطر اپنے آپ کو بیچنا پسند کرلیں گے۔ اور پھر جو اس کا نقصان ہوگا۔ اس کے ذمہ دار آپ اور آپ کی غیر حاضری ...لاپرواہی ہوگی۔"

...ان میں سے ایک عزیز وہ بھی تھے جو والدین کی مجبوری یا دُنیا کی رغبت یا خود اپنی میلانِ طبع یا کارکنانِ جامعہ ملیہ کی بدانتظامی ...غرضیکہ کسی وجہ سے جامعہ ملیہ اور کھدر اور لباسِ وطنی کو چھوڑ کر سیاہ ولایتی نبات کا ٹرکش کوٹ اور سفید فلالین کی پتلون پہنے تھے۔ اور ہر چند وہ اپنے قلب پر زور ڈالتے تھے۔ مگر خود ان کا ضمیر ان کی گردن کو سینے کی طرف کھینچتا تھا۔ میں نے ...

ہمارے بہادر اور دیوانے حسرت نے خوب لکھا ہے ؎

اہل ایمان رکھتے ہیں کامل بہ فتوائے جنون ٭ شان لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ شیوۂ وَلَا يَحْزَنُونَ

یہ تھیں میری توقعات اور ان توقعات کے ہوتے ہوئے جو نتائج ظاہر ہوئے ہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں۔ اور مجھے گمان ہے
ہے سیکڑوں علی گڈھ کے اور بھائی بھی سمجھ سکتے ہوں گے۔ ان باتوں سے مجھ جیسے دیوانے کا دل کس درجہ کڑھا اور
گا۔

میں اس وقت علی گڈھ اور اولڈ بوائز لاج میں موجود نہ تھا۔ جبکہ محمد علی سے ملنے اور اوس پر زور ڈالنے کے لئے کہ وہ اپنے
و ترک سوالات کے ذریعے سے غلامی سے آزاد نہ کرائے۔ ایک جم غفیر مجبور شدہ اولڈ بوائز کا علی گڈھ میں جمع ہو گیا تھا

حضرت ناصح جو آئیں دیدہ و دل فرش راہ ٭ کوئی ہم کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا ؟

میں اسے جانتا ہوں اور کسی کے اقرار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کہ بہت سے لوگ بادل ناخواستہ مجبور ہو کر آئے
بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے واقعی کالج کا حب خدائے برتر کے علاوہ اپنے دلوں میں بٹھا رکھا تھا۔ کہ کچھ ہو۔ اسلام چاہے
تباہ و برباد ہو مگر یہ قومی تعلیم گاہ خطرے سے محفوظ رہے۔

میں اختلاف خیالات کے سننے کے لئے تیار ہوں۔ مگر اتنا بغیر کہے نہیں رہ سکتا۔ کہ ہم علی گڈھ والوں نے اپنی اس کمزوری
مسلمانوں کے قلوب پر ایک بہت بڑا دھچکہ لگایا۔ یونین کلب میں تقریر کرتے ہوئے میں نے بھرائی ہوئی آواز اور تر آنکھوں
اپنا پیام محمد علی کی تقریر کے بعد سب کو دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ "اگر تیس پینتیس ہزار گورنمنٹ کی سالانہ گرانٹ کالج نے اس
م پر آڑے وقت میں قربان کر دی۔ اور اسلام کی عزت رکھ لی تو مسلمان اوس کو ہرگز فراموش نہ کریں گے اور اگر روپیہ
ضرورت ہوئی۔ تو اس کے بدلے اگر کالج ایک کروڑ مانگے گا تو ایک کروڑ بھی دیں گے"۔

اس وقت پانیر اور انگریزی اخبارات نے میرا مذاق اڑایا تھا۔ مگر زمانے نے دکھا دیا۔ کہ باوجود ایک بڑی تعلیم یافتہ
عت کی امداد نہ ہوتے ہوئے بھی ۸۰ لاکھ روپیہ مسلمانوں نے اسلام کے نام پر قربان کر دیا۔ اور انشاء اللہ میں اور آپ
سب دنیا جلد اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گی۔ کہ باوجود آج کی سرد مہری اور سرد بازاری اور آپس کے نفاق اور کم ہمتی کے
مان ایک مرتبہ نہیں بلکہ متواتر ایک اور دو کروڑ روپے سالانہ جلد تر اسلام کی حمایت اور اسلامی تعلیم کے لئے
کر دیں گے۔

ایک وقت تھا کہ علی گڈھ کے پڑھے ہوؤں کو لوگ سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ ہر شخص اپنے آپ کو اولڈ بوائے اور
یگ) لکھتے اور کہتے ہوئے فخر کرتا تھا۔ اور جانتا تھا کہ اس کا اتنا کہنا سب کی نگاہ میں عزت حاصل کرنے کے لئے کافی
۔ آج علی گڈھ یونیورسٹی ہے۔ ڈگریاں اپنی دیتی ہے۔ بڑے بڑے نام کے عہدہ دار ہیں۔ گورنمنٹ سے بھی شاید ایک لاکھ
روپیہ سالانہ عطیہ ملتا ہے۔ سنتا ہے پانچ لاکھ روپیہ سالانہ کی آمدنی ہے۔ نئی نئی عمارتیں اور تیار بھی ہو رہی ہیں۔ اسومنگ
ٹ بھی جس کا مجھ کو ہمیشہ سے اشتیاق تھا تیار ہو گیا ہے۔ کالج کے گرداگرد بہت سے بھائیوں کے خوشنما بنگلے بھی بن
... ایمان رکھنے والوں کی

اور آپ کو لطف دوں۔ کس طرح ہنساؤں اور کیسے ہنسوں عجب نہ دل میں ہی کا ... نہیں ۔

قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی

کا مصداق بننے کا شوق نہیں۔ اولڈ بوائے کے مضامین کے لئے میرے پاس بہت سامان تھا۔ کسی قسم کی دشواری اور سوچ اور فکر کی ضرورت نہ تھی۔ ہر طرف دلچسپ واقعات ہی واقعات نظر آتے ہیں۔

تیری خاطر بھی ہے مدِّ نظر پاسِ ادب بھی ہے ۔۔ مگر میں کیا کروں دل کی جلن کچھ اور کہتی ہے

حالی مرحوم معلوم ہوتا ہے۔ میرے لئے حکیم محمود خاں کے مرثیہ کے آخری دو بند لکھ گئے تھے۔

سنتے تھے حالی سخن میں تھی بہت وسعت کبھی ۔۔ تھیں سخنور کے لئے چار عل طرف راہیں کھلی

داستاں کوئی بیان کرتا تھا حسن و عشق کی ۔۔ اور تصوّف کا سخن میں رنگ بھرتا تھا کوئی

گاہ غزلیں لکھ کے دل یاروں کے گرماتے تھے لوگ ۔۔ گہ قصیدے پڑھ کے خلعت اور صلے پاتے تھے لوگ

پر ملی ہم کو مجالِ نغمہ اس محفل میں کم ہو ۔۔ راگنی نے وقت کی لینے دیا ہم کو نہ دم ہو

نالۂ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جا کر نہ سم ۔۔ کوئی یاں رنگین ترانہ چھیڑنے پائیں نہ ہم

سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا ۔۔ ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا ہو

اتنا لکھنے اور اظہار کرنے کے بعد میرے دل کا کچھ بوجھ ہلکا ہوا۔ اور مجھ کو اُمید ہے کہ کسی کی طبع پر یہ گراں نہ ہ... نے شکست قبول کر لی۔ اور یہ میری شکست نہ تھی بلکہ وہ میرے عزیز کالج کی شکست تھی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی ... تھی۔ اور دشمنانِ اسلام کے سامنے اسلام کی شکست تھی۔ پھر بھی اس نیچر گڑھ سے یا بقول سید محمود مرحوم "قلعہ مر... (علی گڑھ) سے بہت سے دیوانے ہاتھ دھوئے مستانہ کرتے ہوئے نکل کھڑے ہوئے محفل کو گرما دیا۔ مسلمانوں ... ہوا سبق یاد دلا دیا۔ خدا کی قسم اولڈ بوائز لاج اور علی گڑھ کے جلسوں میں میں نے بہت لطف اٹھایا۔ مگر جو لطف ... لینسڈون، اور چھندواڑہ کی نظر بندی میں پایا، جو لطف بیتول اور اس کے بعد کراچی اور راجکوٹ کے جیل میں ... کے بعد اولڈ بوائز لاج کے جلسے مجھ کھلنڈرے کی نظر میں تو ہیچ ہو گئے۔ محمد علی نے بیجا پور کی سخت جیل میں جو لطف ... غالباً مجھ سے کہیں زیادہ ہو گا۔ وہ چیز کیسی پر لطف ہو گی جس نے بیجا پور کی تنگ و تاریک کوٹھری میں محمد علی جیسے ... طبیعت اور بادشاہ مزاج، شخص سے جہاں اور کلام لکھوایا ایک ایسی غزل بھی لکھوا دی جس کو میں اوّل مرتبہ راجک... جیل میں کسی طرح حاصل کر کے مست ہو کر گانے اور ناچنے لگا۔ کاش بیانے کھلنڈرے اس ناچ، اس مستی ک... کے لئے کافی ہے۔

سب پرانی باتیں بھول جاتے مطلع ہی جان قربان کرنے کے لئے کافی ہے۔

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں ۔۔ اب ہونے لگیں اُن سے خلوت کی ملاقاتیں

ہر آن تسلّی ہے ہر لحظہ تشفّی ہے ۔۔ ہر وقت ہے دلجمعی ہر دم ہیں مدارات

کوثر کے تقاضے ہیں تسنیم کے وعدے ہیں ۔۔ ہر روز یہی چرچے ہر رات یہی باتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت ۔۔ اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کرامات

اُن سے عرض کیا کہ تم کو بہت سے علی گڑھ کے جاننے والے اور لیکچر دینے والے مل جائیں گے، تم مجھے کیوں بُلاتے ہو۔ ؎

در محفلِ خود راہ مدہ ہمچو منے را ٭ افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

میں تمہاری مجلس کے سامنے کیا کہوں گا۔ کیا تم چاہتے ہو؟ کہ مجھ کو بھی نیچے گھسیٹ کر اپنے رنگ میں ملالو؟ ہم کو چھوڑ دو۔ اسلام کی قربانی کے لئے کچھ دُنبے مارے مارے پھر کر خوب فربہ اور تیار ہو جائیں۔ تم جاؤ، کھیلو اور کودو۔ اور اپنا کام کرو اور خدا سے دُعا مانگو کہ وہ یا تمہیں راہ راست پر لائے۔ یا اگر ہم غلط راہ پر ہیں تو ہم کو سیدھا راستہ دکھائے۔

یہی میری معذرت آج آپ جیسے عزیز بھائی اور تمام اپنے پرانے عزیز بھائیوں اور اولڈ بوائز سے ہے۔ میں کسی سے بحث و مناظرہ کرنا نہیں چاہتا۔ میں کسی کے کام میں روڑا اٹکانا نہیں چاہتا۔ مجھ کو آج اپنے کاموں سے اتنی فرصت نہیں کہ میں فضول جھگڑوں میں پڑوں۔ نہ خود کوئی کام کر سکوں نہ اوروں کو کرنے دوں۔ میں کالج کا ٹرسٹی تھا۔ اور اب بھی شاید مسلم یونیورسٹی کی کورٹ کا ممبر ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ہم علی گڑھ کے معاملات میں دخل دیں گے۔ تو سوائے اس کے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب سے فضول علمی مباحثے ہوا کریں۔ اور کوئی نتیجہ نہیں ہوگا۔ اس لئے وہ جانیں اور صاحبزادے آفتاب احمد خاں جانیں۔ اب اگر نیک نامی ہے تو ان کی ہے۔ بدنامی ہے تو ان کی ہے۔ ہم لوگ کیوں مناظرے و مجادلے میں وقت صرف کریں۔ غالب مرحوم صحیح فرما گئے ہیں۔ ؎

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات ٭ دے اور دل ان کو جو نہ دیں مجھ کو زباں اور ؎

اس لئے میں نے جو کچھ اوپر لکھا ہے۔ اس کی معذرت چاہتا ہوں اور اُمید ہے کہ آپ اور دوسرے پڑھنے والے میری تلخ بیانی سے درگذر کریں گے، اور اس کو ایک دیوانے مجذوب کی بڑ سمجھکر بھول جائیں گے۔ میں نے یہ مضمون خود اپنی طرف سے نہیں لکھا ہے۔ بلکہ آپ کے حکم سے اس لئے اگر اولڈ بوائے کی پالیسی کے خلاف ہو اور یقینی ہے، تو اس کو معاف فرمادیں۔

میں یہ بھی آج اعتراف کرنا چاہتا ہوں جو چاہے اس فتح پر فخر کرے اس کو اپنی کامیابی کا ثبوت یا ترقی کا آلہ بنائے کہ علی گڑھ کے بارے میں ہم لوگوں کو شکست ہوئی اور ہم اس شکست کا اعتراف کرتے ہیں۔ مجھ کو علی گڑھ پر دعویٰ تھا۔ اور اسی کے بھروسہ پر میں نے ۱۹۲۰ء کے جلسے میں دو شعر پڑھے تھے جس میں اپنے دعوے پر فخر کر کے اس کا اظہار کیا تھا۔

علی گڑھ کے بارہ میں مجھے بہت کم شک و شبہ تھا اور میں نے کہا تھا کہ ؎

بزمِ عشاق ہے کیا جانے کدھر دیکھیں گے ٭ دل تو دیتا ہے گواہی کہ ادھر دیکھیں گے

یہ مجھ جیسے عاشق کے موزوں نہ تھا۔ مجھ کو تو اپنے معشوق پر دعوے اور بھروسہ تھا۔ اس لئے میرے حسبِ حال تو یہ تھا۔ ؎

ہم اپنے جذبۂ دل کے اثر کو دیکھتے ہیں ٭ وہ دیکھیں بزم میں پہلے کدھر کو دیکھتے ہیں

آج میں قبول کرتا ہوں کہ وہ شعر بے محل تھے۔ اور میرا دعوے غلط تھا۔ اس لئے یہ جانتے ہوئے میں کہاں سے اپنے پژمردہ آپ سے شکست خوردہ دل میں وہ پرانی امنگ پیدا کروں کہ علی گڑھ کے کھلاڑیوں کی داستان کہکر خود بھی لطف اٹھاؤں۔

بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں ؎ بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں

اب ہوں گی الم نشرح ملعون کی سب گھاتیں ؎ شیطان کی چالوں سے اب ہو گئے سب واقف

مجھ سے اور محمد علی سے بڑھ کر ہمارے جیل خانوں کے کولمبس' اور اس ہندوستانی راہ آزادی کے اسکوڈی گاما" حسرت موہانی' ان کے لطف کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں۔ انیس مرحوم نے اپنے مرثیہ میں ایک شعر لکھا ہے جس میں جائز فخر کا اظہار کیا ہے۔ ؎

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

حسرت موہانی پانچویں پشت کا دعویٰ تو نہیں کر سکتے۔ ابھی ان کی عمر ہی کیا ہے۔ مگر ہاں اس کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ کہ ... سے جیلوں کی خاک چھانی ہے۔ بہت سے شاہی خوان یغماؤں سے خوشہ چینی کی ہے۔ طرح طرح کے رنگین اور ... لباس زیب تن کئے ہیں۔ طرح طرح کے دل کو بے چین کرنے والے جھنکار والے زیوروں سے اپنے آپ کو مزین ... ہے۔ اور آخر مرتبہ تو پابہ دست دگرے دست بدست دگرے کشاں کشاں کوچہ دلدار میں پہنچ گئے۔ انعاموں پر انعام ... تے رہے مگر آخر ظالم معشوق نے بھی یہ دیکھ کر کہ کتنا سخت جان ہے۔ کسی نہ کسی طرح کوچہ جاناں سے نکال کر اپنا پیچھا چھڑایا ... س کا نام لکھوں۔ کس کس کا ذکر کروں، اس گئے گذرے زمانہ میں۔ اس چودھویں صدی میں، اس قدر کمزوری کا زہر پلانے والوں ... جود گی میں، باوجود میرے شکست فاش کھانے کے پھر بھی سینکڑوں مست چھوٹے اور بڑے کھلنڈرے انا الحق' ... ہوئے کربلا میں آن کھڑے ہوئے۔ ؎

مستی کے پھر آ گئے زمانے ؎ آباد ہوئے شراب خانے

ہر پھول چمن میں سر بکف ہے ؎ بلٹتے ہیں بہار نے خزانے

سب ہنس پڑے کھلکھلا کے غنچے ؎ چھیڑا جو لطیفہ اک صبا نے

سرسبز ہوا نہال غم بھی ؎ پیدا وہ اثر کیا ہوا نے

رندوں نے پچھاڑ کر پلا دی ؎ واعظ کے نہ چل سکے بہانے

اور انشاء اللہ

کردوں گا میں ہر ولی کو مے خوار ؎ توفیق جو دی مجھے خدا نے

اب کل ہے کو آئیں گے وہ حسرت ؎ آغاز جنوں کے پھر زمانے

خیر توفیق ملے یا نہ ملے کوئی اور شریک ہو یا نہ ہو ؎

ہم نے تو نثار کر دیا دل ؎ اب جانے وہ شوخ یا نہ جانے

اب کس کس کا نام لوں۔ خدا کا شکر ہے کہ تعداد معقول ہے جہاں اس وقت بہت سے علی گڑھ کا نام روشن ... نے والے بزرگ ہیں۔ وہاں خدا کا شکر ہے۔ کہ بدنام کرنے والوں کی تعداد بھی معقول ہے۔ کس کس کا نام لکھوں۔ بڑے ... ے شوقین رنگین مزاج۔ فیشن کے دلدادہ "فرزند دلپذیر" "طرز یورپ" "قیس نژاد" "کپڑے پھاڑ" "دل پھینک" ہیں کہ

لیلیٰ کی محمل کے پیچھے ہو گئے اور سے

ما نہ می خواہیم ننگ و نام را

کا نعرہ لگا کر دُنیا و مافیہا سے بے فکر ہو گئے. نواب محبّت خاں محبّت کا ایک شعر راجکوٹ کے جیل خانہ کی لائبریری کی ایک اُردو کی پُرانی کتاب میں سے ملا تھا۔ اور اس کی سچائی کا بھی وہیں دل پر نقش ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ اب تک وہ یاد ہے۔ سے

قید ہوتے ہی ہُوا سارے جہاں سے آزاد ٭ میں تو بندہ ہوں محبّت کی گرفتاری کا

میں سب سے زیادہ بہادری کا تمغہ اُن جامعہ ملیہ کے پچاس ساٹھ نوعمروں کو دوں گا۔ جنھوں نے اس کارِ خیر میں ابتداء کی سے

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدند ٭ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

سب کے نام تو اس وقت یاد نہیں ہیں۔ مگر عبداللطیف خاں چھندواڑہ کا بچّہ غالباً سب سے اوّل سیونی کے جیل میں گیا تھا اور مشہور و معروف یوسفی یونیورسٹی کی تعلیم گاہ سے اعلٰے ڈگری حاصل کی تھی۔ اس کے بعد ہمارے بہت سے عزیز بچے محمد عالم خاں۔ فیض اللہ خاں۔ عبدالقیوم خاں اور چھ سات اور نے پشاور کے شاہی مہمان خانوں کو آباد کیا۔ سندھ میں دین محمد اور اُن کے ساتھیوں کو بھی رتبہ ملا۔ مدراس میں تو ایک بڑی تعداد اسیروں کی تھی۔ نام اس وقت یاد نہیں آتے۔ اور صوبوں میں بھی یہی حال تھا۔ میں نے ان زخم خوردہ نوجوانوں کے نام اور تعداد اب منگاتا ہوں اُن سے بہت توقعات ہیں سے

خدا ترا بُتِ نادان دراز سن تو کرے ٭ ستم کے تو بھی ہو قابل خدا وہ دن تو کرے

پرانے اولڈ بوائز بھی اس دولت سے مالا مال ہوئے۔ سیف الدین کچلو باوجود حبس دوام کی سزا پا جانے اور پنجاب کے مارشل گردی کا لطف چکھ لینے کے بجائے مرعوب ہونے کے پھر دو برس کراچی اور دھولیا میں گذار آئے۔ ظفر علی خاں بھی بڑے سخت جان تھے۔ نظر بندی اور زمینداری کی تباہی اور تمام مالی اور بڑے بڑے نقصانات اُن کے لئے کافی نہ تھے۔ تھوڑی میعاد نہیں بلکہ پانچ برس قید سخت کے منٹگمری پہنچ گئے۔ علی گڈھ کے تصدق احمد خاں شیروانی بیرسٹری کا روپیہ کمانے سے تھک کر بیرسٹری ہی کو نہیں چھوڑ گئے۔ بلکہ ایک سال کے لئے سب سے منہ موڑ کے نینی تال نہیں نینی جیل کی ہوا کھا آئے۔ خوبصورت نثار شروانی پوسٹ آفس کی سپرنٹنڈنٹی کو لات مار کر اکبرآباد کو آباد کرنے گئے اور کہتے ہوئے شرماتا ہوں۔ کہ اُن کے خوبصورت چہرے پر تو ڈاڑھی اچھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ مگر اب اگر خدا نخواستہ منڈوائیں گے تو میں صورت دیکھنا گوارا نہ کروں گا۔ ان دونوں بھائیوں نے اپنے آپ کو ہی مالی حیثیت سے تباہ نہیں کیا۔ بلکہ باپ اور ماں کی جائداد کو بھی کھو دیا۔ اور افسوس کہ بعض عزیز و اقارب کی حرص و بغض نے بڑھاپے میں ان کو گھر سے بے گھر بھی بنایا۔ عبدالمجید خواجہ بھی اللہ کا نام لے کر وکالت چھوڑ کر جیل کو چلے گئے اور مانا کہ آج وہ اڈریس پڑھنے کے لئے سابق علی گڈھ کے کلکٹر کے سامنے کھڑے ہوں۔ مگر ان کی قربانی سے کون انکار کر سکتا ہے خدا استقامت

ہے ہے

پھر یہی کمرہ ہو اور بہوٹان ہو

خدا کرے ہماری مجلس جلد مضبوط ہو کہ آباد ہو اور پھر سب ایسے ملیں کہ آپس میں علیحدگی کی گنجائش باقی نہ

رہے۔ ع

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی ٭ تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری ع

آپ کے اولڈ بوائے کو جس سے مجھ کو بھی کچھ تھوڑا تعلق رہا ہے۔ اوّل دن سے پڑھتا ہوں، اس میں سب بھائیوں

کا سچا رنج اور افسردگی دیکھ کر رنج ہوتا ہے۔ وہ بھی اولڈ بوائز لاج کو یاد کرتے ہیں۔ اور افسوس کرتے ہیں کہ اتنی عالیشان

عمارت پر مع اس کے خوبصورت فرنیچر قالینوں وغیرہ کے کالج نے قبضہ کر لیا۔ یہ خیال ان کو ضرور تکلیف دہ ہوتا

میں بھی جب علی گڑھ جاتا ہوں تو اپنے پرانے کالج میں بھی جاتا ہوں۔ چپہ چپہ زمین میرے لئے دلچسپی رکھتی ہے ہزار

پرانے واقعات جبکہ میں مست کھلنڈرا تھا یاد آتے ہیں۔ پی پارک کے ۱۳ نمبر کے کمرے میں بھی ضرور جاتا ہوں اور باوجود

میری بھیانک صورت اور بھیانک ڈاڑھی۔ لحیم شحیم جسم اور ڈھیلے ڈھالے موٹے کھدر کے کپڑے۔ کھدر کی خلافت

کی فقیری کی جھولی کے مثل اور ہندوستان کے دہاں کے نئے رہنے والے بھی پہچان کر سلام کرتے ہیں اور بہت سے

خاطر بھی کرتے ہیں۔ اور لوگ کہتے ہیں کہ اب تو کالج میں دو ہزار لڑکے پڑھتے ہیں۔ پہلے سے زیادہ ہیٹ اور پڑھنے او

انگریزی لباس پہننے میں غلو کرتے ہیں اور بے شرم اور ڈھیٹ ہو گئے ہیں۔ کوئی زندگی کا مقصد سامنے نہیں ہے ۔

صحیح ہو۔ میں نے تو اکثروں کو شرمندہ پایا۔ اور اکثروں کو اپنی کمزوری کا اعتراف کرتے ہوئے دیکھا۔ اور ہم لوگ اور ہما

تحریک ہر جگہ ناکامیاب رہی ہو۔ مگر اس انگریزی لباس کی بے توقیری پوری ہو گئی۔ بڑے بڑے سورماؤں کو دیکھنا ہو

جب ہم کھدر پوش تاج محل ہوٹل میں پہنچ جاتے ہیں۔ تو ان لوگوں کا دل چاہتا ہے کہ اپنی ہیٹ کو کمر کے پیچھے چھپا لیں

انگریز بن کر اپنے بھائی بندوں کو مرعوب کرنے کے دن گئے۔ اسی علی گڑھ کی سیاحت میں حال میں اولڈ بوائز لاج کے

بھی گیا چور چوری کرنے سے جاتا ہے مگر ہیرا پھیری نہیں چھوڑتا۔

تیرے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنی ٭ کبھی اس سے بات کرنی کبھی اُس سے بات کرنی

اولڈ بوائز لاج میں ایک تماشا دیکھا جس سے رنج بھی ہوا صدمہ بھی ہوا۔ آنکھوں میں بھی تھوڑی سی نمی پیدا ہو

مگر پھر بھی ہونٹھوں پر تبسم تھا۔ ہم سخت جانوں کو اس تبسّم کی بھی عادت ہو گئی ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ کمرہ جو اولڈ بو

سکرٹری ہونے کی حیثیت سے میرا مسکن تھا۔ اس کے سامنے کی پختہ سیڑھیوں پہ بائیسکل کی آسانی سے آمدورفت کے

مٹی بھر دی گئی تھی۔ کمرے کے دروازے کے سامنے اس صاف ستھرا برآمدہ میں جس میں نہایت عمدہ سبز میٹنگ بچھ

تھی۔ بہت سے خوبصورت گملے رکھے ہوتے تھے۔ ۲۵-۳۰ نہایت عمدہ علی گڑھ کے بنے ہوئے مونڈھے بچھے ہو

جس میں بیٹھ کر ہم کرکٹ کی میچوں کی سیر کرتے تھے۔ وہاں دیکھا کہ یہ کوئی سامان نہیں ہے۔ ایک میلا کچیلا کرتا پائجامہ

باورچی مسالہ کی سل سامنے رکھے ہوئے ہلدی دھنیا۔ پیاز مرچیں پیس رہا ہے لباس کی رنگت ایسی ہو گئی تھی کہ جس کا

دے۔ خلیق الزمان۔ عبدالوالی (لکھنوی)، شیخ شوکت علی۔ غلام محی الدین (جو اب موپلاؤں کی خدمت کرتے ہیں)، ملک رفیع۔ ملک علی افضل۔ نواب علی صاحب۔ رفیع احمد قدوائی۔ شیخ احمد قدوائی، مصطفٰے علی خاں۔ چوہدری اطہر علی رستک۔ ہاکی ٹیم اٹھیر اودھ سے گئے۔ روہیلکھنڈ بھی پیچھے نہیں رہا۔ ظہورالدین وکیل بریلی ظفر حسن مرادآبادی وغیرہ وغیرہ معہ دو بدنام دلچسپ بدمعاشوں کے اور ایک فاروقی علی بھاگلپور کے جیل میں شریک ہوئے۔ اب صوبہ وار کہاں تک نام گناؤں۔ ڈاکٹر محمود بھی اپنی بڑھتی ہوئی پریکٹس کو چھوڑ کر کچھ دنوں بھاگل پور اور بکسر کی سیر کر آئے۔ آغا صفدر۔ شفیع داؤدی (بہاری)، سیٹھ یعقوب حسن۔ عزیز انصاری۔ قطب الدین (چریاکوٹی)، اور مرحوم کمال الدین جعفری۔ اطہر۔ عزیز احمد زبیری۔ یوسف امام مرزاپوری: بہت سے نام کے زندہ رکھنے والے شریک حال ہوئے۔

پرانے کھنڈروں کے جلسے مجھے ضرور یاد ہیں۔ مگر نئے تجربوں اور جلسوں کی آب و تاب نے ان کے رنگوں کو پھیکا کر دیا ہے۔ محمد علی کا شعر ہے ؎

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے ❊ میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

رنگت جاسوں کی پُر لطف خوبصورت اور سُرخ تھی مگر حنا کی سرخی اور خون کی سرخی کا فرق تھا۔ خدا کرے اب کے دھاوے میں ہر طرف سچی سرخی ہو اور ہم حسرت کے خواب کو سچا کر دیں گے۔

ہر سو عیاں ہے صبغت اللہ کی بہار ❊ رونق پہ ہے خزاں میں بھی بستانِ اولیا
صبر و صلوٰۃ عشق سے ہیں سب کے دل قوی ❊ ثابت قدم ہیں سارے مریدانِ اولیا
جانیں ہوئی ہیں جن کی رہِ شوق میں فدا ❊ حاشا کہ ہوں فنا وہ محبانِ اولیا
آئی ہوئی رضائے الٰہی کی ہے برات ❊ سب کربلا میں جمع ہیں مہمانِ اولیا
گلگوں لباس خونِ شہادت پہن کے آج ❊ دولہ بنے گا وہ شہ خوبانِ اولیا
زنجیر و طوقِ ظلم کا عابد کو غم نہیں ❊ ہم رنگِ بزمِ عیش ہے زندانِ اولیا
حضرت حسین ابنِ علی کا ہوں میں غلام ❊ حاصل ہے مجھ کو فضلِ نمایانِ اولیا

بہت سے پرانے کھنڈروں کو پرانے جلسے ضرور یاد آتے ہیں مجھے بھی یاد آتے ہیں۔ اور دل چاہتا ہے کہ خدا وہ دن کرے کہ سب بھائی مضبوط ہو کر از سرِ نو پختہ بھائی چارہ قائم کر دیں جو کسی کے توڑے ٹوٹ نہ سکے۔ مجھے بھی اولڈ بوائز لاج اور بھائیوں کی طرح یاد آنا چاہیے۔ اس سے کچھ تھوڑا بہت تعلق میری ذات کو بھی تھا۔ اس کے اولڈ بوائز کے گروپ تصویریں فرش و فروش کرسی میز یاد آتے ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر ملاقات کے کمرے میں اور کھانے کے کمرے میں اور برآمدے میں چھوٹی چھوٹی پتھر کی تختیاں لگی ہیں۔ ان میں لکھے ہوئے دوست احباب کے نام یاد آتے ہیں۔ اُن سے زیادہ کچھ مرے ہوئے عزیزوں اور بھائیوں کے نام کے کتبے یاد آتے ہیں۔ اور اُن کے دیکھنے کو دل بھی چاہتا ہے۔ یہ بھی دل چاہتا ہے کہ مثل داؤد مرحوم کے جو میرے کالج کے زمانہ کے ملک الشعراء تھے۔ اور جنھوں نے عبدالحکیم مرحوم سہارنپوری عرف بھوٹان کے نام پر اُن کے خالی کمرے کو دیکھ کر ایک قطعہ لکھا تھا جس کا یہ ایک مصرعہ یاد

کرنا۔ کہ وہ کبھی سفید ہو سکتا تھا ناممکن تھا۔ سچ کہا ہے ؎

اگدی کا ہے گماں شک ہے ملاگیری کا ؛ رنگ لایا ہے دوپٹہ تیرا میلا ہو کر

ہی برآمدہ میں پاس ہی ایک مٹکا رکھا ہوا تھا قطعی غدر کے قبل کی پیدائش کا تھا۔ رنگت اصلی اڑ گئی تھی۔ پنرکیٹ کافی جمی ہوئی تھی۔ اس کو دیکھ کر اس کے پانی کو کوئی انسان جانور تک کو پلانا نہیں چاہے گا۔ پاس کے چھوٹے سے گول کمرے میں جس میں ہم لوگوں کا ارادہ تھا۔ کہ اس میں سگار یا سگریٹ سے بیٹھ کر شغل کرتے۔ اس میں کوئلے لکڑی اور اسی طرح کا اور انبار تھا۔ خوبصورت کھڑکیوں کے کیواڑ موجود تھے۔ مگر شیشے سب ٹوٹ گئے تھے معلوم ہوا۔ کہ اس میں کیمبرج کے تعلیم یافتہ انگلستان کے واپس شدہ پروفیسر صاحب مقیم تھے۔ جن کو ہندوستان کی قومی اور اسلامی تحریکوں سے بہت تنفر ہے اور خاص کر ہم لوگوں کی تحریک سے۔ خیر یہ کوئی شکایت کی بات نہ تھی۔ اولڈ بوائز لاج کا اولڈ بوائے کے قبضہ سے نکل کر کالج کے قبضہ میں جانا کوئی بہت تکلیف کی بات نہ تھی۔ جس چیز کو دیکھ کر رنج ہوا وہ یہ تھا کہ معمولی سی عمارت کو صاف اور ستھرا نہ رکھا جا سکا۔ مجھ پر "سخن فہمی" عالم بالا معلوم شد روشن ہو گیا۔ اور میں سمجھ سکتا ہوں کہ بہت سے اولڈ بوائز پر بھی ایسا ہی اثر ہوا ہو گا۔ دو چار روپے کا پلستر پر کہیں احاطہ میں چھپر ڈال دیتے اور یہ باورچی خانہ اور بھنگڑ خانہ کہیں اور آباد ہو جاتا۔ اولڈ بوائز لاج کی عمارت، فرنیچر اور سامان پر تقریباً ۲۵ ہزار روپیہ خرچ ہوا تھا۔ ابھی وہ ناتمام تھا۔ دوسری منزل بننے کو باقی تھی۔ اس کی ظاہری آرائش کا بھی کوئی سامان نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے میں تو اپنے مستانہ خیالی کی وجہ سے زیادہ متاثر نہ ہوا۔ انشاءاللہ میرا وقت آئے گا اور جلد آئے گا۔ سارا ملک میرا ہو گا۔ اُس وقت یونیورسٹی میری ہو گی۔ اور یقینی معنوں میں مسلم یونیورسٹی ہو گی۔ اولڈ بوائز لاج نئی آن بان سے تیار ہو گا۔ اوپر کی منزل بھی تیار ہو گی۔ کریکٹ کا میدان بھی آباد ہو گا۔ ہم بڑھے اور چھوٹے بڈھے اور جوان اور نوعمر اور بچے سب ایک خاندان کے وہاں سے بیٹھ کر اپنے چمن کی سیر و تماشہ دیکھیں گے۔ اور غیر کا اثر تو اثر صورت بھی کہیں نظر نہ آئے گی۔ ؎

شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری ؛ غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری

جو شخص اس طرح کے بیٹھ کر خواب دیکھ سکتا ہو۔ وہ کیوں خدا کی رحمت سے مایوس ہو۔

برادرِ عزیز اور علی گڑھ کے کھلنڈرو! مجھ کو آج بھی چھوٹے چھوٹے پیمانہ پر وہ صحبتیں میسر آجاتی ہیں۔ جیسے تم کہتے ہو کہ تم محروم ہو۔ ہر جگہ جب دوروں میں نکلتا ہوں۔ تو علی گڑھ کے اولڈ بوائے میرے ہم خیال میری تحریک کے ساتھی مل جاتے ہیں۔ اُن سے خوب پُرانی باتیں ہوتی ہیں۔ بہت سے پرانے دوست اور اولڈ بوائے بھی غریب ڈرتے ڈرتے آجاتے ہیں اور آنے کے بعد روپیہ بھی دے جاتے ہیں محبت کا اظہار بھی کر جاتے ہیں۔ گلے میں ہاتھ ڈال کے منہ بھی چوم جاتے ہیں اور آئندہ کے بارہ میں ہمت بھی بڑھا دیتے ہیں میرے لئے یہ جلسہ موجود ہے ؎

خدا آباد رکھے لکھنؤ کو بس غنیمت ہے ؛ نظر کوئی نہ کوئی اچھی صورت آ ہی جاتی ہے ؏

بجائے لکھنؤ کے آپ بمبئی کو بدل دیجئے۔ سنٹرل خلافت کمیٹی کا دفتر سلطان مینشن میں ہے۔ اس گئے گذرے زمانہ میں بھی ملک آباد ہے۔ میں تو اپنے کو پیر مغاں ابھی نہیں کہوں گا۔ مگر پھر بھی میخوار چھوٹے بڑے جمع ہیں شعیب قریشی مع اپنی

خوبصورت آنکھوں سہر وقد اور مسکراتے ہوئے چہرے سے پیار کرنے اور پیار کرانے کو موجود ہیں۔ خوبصورت ہونے
سے حضرت یوسف علیہ السلام سے کچھ نسبت تھی۔ اس لئے سنت یوسفی کو پورا کرنے کے لئے آکسفورڈ سے آئے۔ سابرمتی ا
تھانہ جیلوں کی یونیورسٹی میں پڑھ کر تعلیم کی تکمیل کی۔ آغا صفدر (وہ) اب دبلے ہو گئے ہیں۔ کچھ ذیابیطس کا اثر کچھ ۲۶ مہینہ میانو
جیل کی مہمانی کا اثر۔ آدھ گھنٹہ ہر صبح ٹہل کرتے ہیں۔ تاکہ پھر پہلے (وہ) ہو جائیں۔ سنا ہے مسعود بھی ان کے لڑکپن کے
بھاری بھر کم پن کو دیکھ کر (وہ) کے لقب سے ممتاز کرنے کے لئے مجبور ہوا تھا۔ "وہ آرہے ہیں، وہ جا رہے ہیں، وہ کھا
ہیں۔ وہ بولے۔ خود انھوں نے اپنے اس زمانہ کی زندگی اور اس نام کی وجہ تسمیہ خوبصورتی کے ساتھ بیان کردی ہے ا
قابلِ ملاحظہ ہے۔

"وہ موجود ہیں۔ قمر احمد صاحب بی اے ایل ایل بی۔ متخلص بہ لاری ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۵ء کے لا کلاس اور خفیہ مشاع
کے ملک الشعراء ہر وقت دفتر خلافت میں موجود۔ خوب اپنے "رنگین قلم" سے ہم سب کو زندہ دل رکھتے ہیں۔ کچھ اور لطف
دیکھنا چاہتا ہوں۔ تو ان کو پان کی ممانعت اور کمرے کی صفائی پہ تاکید کر کے چھیڑ کر عجیب و غریب منطق اور دلائل س
ہوں۔ کبھی خفگی ہوتی ہے۔ اور کبھی ہنسی۔ روز صبح ایک گھنٹہ بیٹھ کر اخبار خلافت کے لئے مجھ سے کاہل آدمی سے مضمون لکھ
ہیں۔ اور آج یہ ایک غمزدہ کھلنڈرے کی کہانی بھی انہیں کے طفیل سے مکمل ہو رہی ہے۔ میں بولتا ہوں اور وہ لکھتے ہیں ا
اکثر جگہ اصلاح بھی کر دیتے ہیں۔ محمود (قوم) بھی اکثر میرے ہم پیالہ و ہم نوالہ ہوتے ہیں۔ سیف الدین کچلو سے جو پہلے میر
رابطہ کے سکرٹری تھے۔ کل میرے ماتحت تھے۔ اور آج میرے سردار ہیں۔ اُن سے ہر وقت کی صحبت اور محبت ہے جا
علی بہادر خاں میری غیر حاضری میں اخبار خلافت کے ایڈیٹر کی حیثیت سے آ گئے ہیں۔ عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، ا
غرضیکہ ہفت زبان ہیں۔ اُن سے بھی جلسے کی رونق ہے۔ سیٹھ یعقوب حسن بھی مجھ سے پہلے کے کالج کے اولڈ بوائے ہ
برابر رونق محفل کا باعث ہوتے ہیں۔ داڑھی سفید تھی۔ جیل کی برکت سے اچھے خاصے عالم اور مفسر ہو گئے ہیں۔ قرآن پاک
ایسی تفسیر تیار کی ہے کہ عالم و فاضل اور انگریزی داں اور معمولی تعلیم والے سب اس کی مدد سے خدا کے پُر طاقت کلام کو
کر اپنے دین دنیا کو سنبھالتے ہیں۔ چھوٹوں میں اور کرکٹ کھیلنے والوں میں اشفاق میرے سکرٹری موجود تھے۔ وہ تو ہمی
کے کھلنڈرے تھے۔ اور دفتر خلافت میں بھی کھلنڈرے رہے۔ اکثر میرے کچھ کہنے پر خفا ہو کر مجھ پر رعب جماتے تھ
میں ان کا بڑا اتھا۔ ہنس کے کہہ دیا کرتا تھا کہ:-

"بازی بازی بارلیش بابا ہم بازی"

یہ سنکر وہ شرما کر ہنس دیتے تھے۔ اور مجھ پر رعب جمانے سے باز آتے تھے۔ میں ان کی قربانی اور بہادری کا قدردان
اور وہ بھی اس مستوں کے دائرہ کے لئے لطف کا سامان ہوتے ہیں۔ سعید الرحمٰن قدوائی جمناز ہاؤس کے ممتاز دشور
کرنے والے دو برس کی سخت قید کاٹنے کے بعد میرے پاس علی گڑھ ۹ ؍ مارچ کو آ گئے اور خدا کو میری زندگی منظور تھ
ان کو ایسے موقع پر بھیج دیا۔ ۹ ؍ سے ہی میں مبتلائے "ٹائیفائڈ" ہو گیا تھا۔ خدا انصاری اور ڈاکٹر رحمان کا بھلا کرے
وہ فوراً دہلی لے گئے اور اپنے گھر میں رکھ کر مجھے موت کے منہ سے چھڑا لیا۔ خدا کو بچانا منظور تھا۔ ڈاکٹر انصاری درڈا

خواہیں دیکھتا ہوں۔ آج کہنے کو تباہ و برباد و خانہ خراب ہوں پھر بھی انشاء اللہ خاں کی طرح ؎

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر ؏ ؞ غرض کچھ اور دھن میں اِن دنوں ہے خوار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لگ اپنی ؏ ؞ تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں، ہم بیزار بیٹھے ہیں ؏

بس اور کیا کہوں۔ ایک علی گڑھ کا سچا عاشق ہوں۔ مگر محرومِ وصال۔ وصال و ہجر ہر حال میں مست ہوں۔ مگر دل میں در[د] والا۔ کاش یہ درد اور ایسے ہی تکلیف و کرب کے ساتھ سب کھلنڈر علی کے دل میں پیدا ہو جائے تو میری نجات [...] [د]اغ مرحوم کی غزل کے تین شعر ہیں جیل میں پڑھ کر بہت خوش ہوا کرتا تھا۔ دشمن سخت اور قوی ہے اور ہم حقیر اور ضعیف و نااہل ہیں، پھر بھی دل کی طاقت کے واسطے یہ خیال موجود ہے۔ کہ ہمارا مالک اور آقا دشمن سے بھی قوی [ہے] ہمیں سنبھال لے گا۔ ؎

ہر دل میں نئے رنگ سے ہے یاد کسی کی ؞ ملتی نہیں فریاد سے فریاد کسی کی ؏
تھامے ہوئے دل پھرتا ہے ہر گبر و مسلمان ؞ کیا یاد کیا یاد ہے کیا یاد کسی کی

اور میرے لئے لکھ گیا ہے ؎

کم بخت وہی داغ نہ ہو دیکھیو کوئی ؏ ؞ بے چین کئے دیتی ہے فریاد کسی کی [...]

شوکت علی۔ خادم کعـ[ـبہ]
(سنہ ۱۹۲۵ء)

کی اعلیٰ طبی قابلیت کو بہانہ بنادیا اور عزیزی سعید کی خدمت کو زاہد علی اور عزیز بھی موجود تھے ۔ اور اکثر محمد علی اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے بخار کی سختی کی حالت میں یوڈی کولون اور برف کے پانی سے سر کو منہ کو دھو کر مجھ کو آرام پہونچاتے تھے۔ مگر پھر بھی یکسا سعید الرحمان کی رات کی جگائی تھی جس نے میری جان بچائی۔ ناممکن تھا کہ کسی وقت میں نے بے چینی میں "ہوں" کیا ہو اور سعید موجود نہ ہوگئے ہوں۔ وہ میرے اب سکرٹری ہیں۔ داڑھی لمبی ہے۔ دیکھنے میں خشک ہیں 'حنفی' اور 'وہابی' کی بحث میں شرکت کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔ مگر پھر بھی دل میں علی گڑھ کے سچے کھلنڈرے ہیں

راجکوٹ کی جیل میں داغ کا دیوان مل گیا تھا۔ اس میں ایک غزل کے دو شعر۔ اے عزیزو! اے کھلنڈرو! تمھارے اور میرے دونوں کے حسب حال ہے۔ پڑھو اور میری طرح لطف اٹھاؤ کاش آج بھی ہوشیار ہو جاؤ۔ سچے بھائی چارے کو پہچانو۔ اور ہجر کے دنوں کو بھی شب وصل سے مبدّل کر دو۔ یہ تمھارے ہاتھ میں ہے سنو تمھارے اور تمھارے جیسے سر د امنگوں والوں کے لئے یہ شعر ہے ؎

دن گذار اب دل مہجور صد آفات کے ساتھ ✤ وہ مزے رات کے نادان گئے رات کے ساتھ

اور آؤ میرے ساتھ شریک ہو اور میرا کہا مانو تو تمھارے لئے یہ شعر ہے ؎

چار مل بیٹھے جہاں پھر وہی رنگ اور ترنگ ✤ کچھ عجب لطف ہے رندانِ خرابات کے ساتھ

بس میں بہت کہہ چکا قمر احمد صاحب کا ہاتھ تھک گیا۔ اور مجھ کو ۱۵ منٹ کے اندر نہانا۔ کپڑے پہننا اور بمبئی کے ایک بڑے بزرگ کے پاس خلافت کا بھکاری بن کر جانا ہے۔ اس لئے ختم کرتا ہوں۔ معظم علی جو غریب اب مراد آباد میں ترک کی ہوئی بیرسٹری کے لئے مجبوراً دوبارہ گیا ہے، وہ مجھے دیکھ کر میرا ہی بتایا ہوا امتزاد کا ایک شعر جیل میں مجھے سنایا کرتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ میری غیر حاضری میں ہم سنٹرل خلافت کمیٹی کے کام کرنے والوں نے ایک ماٹو اپنے سامنے رکھنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اوّل مرتبہ میں نے اس کو ناگپور کے خلافت والنٹر کے کپتان کی اچھی آواز سے سنا تھا ؎

وہ رند ہوں، کہ میں بعد فنا پیر مغاں نے از بہر ترک

رکھ چھوڑا ہے میخانہ میں کاسہ میرے سر کا پیمانہ بنا کر

خدا کرے یہ سچ ہو جائے اور شہادت کے جام کے بعد یہ تمغہ امتیاز علی گڑھ کے ایک حقیر کھلنڈرے کو مل جائے۔ میری کیا۔ انشاء اللہ سارے علی گڑھ کی نجات ہو جائے گی۔ اخیر میں معافی کا خواستگار ہوں اور آغاز کا شعر پھر معافی کے طور پر آخر میں لکھتا ہوں ؎

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف ✤ آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

میں علی گڑھ کا دشمن نہیں ہوں، میں مسلم یونیورسٹی کا دشمن نہیں ہوں۔ شاید میں نے اور میری ہم خیال جماعت نے بھی کچھ خدمت اس کی کی ہے۔ میں اولڈ بوائز کا بد خواہ کیسے ہو سکتا ہوں۔ مسلمانوں کی سچی تعلیم کا بھی دشمن ہونا میرے لئے ناممکن ہے۔ میں جس شے کا دشمن ہوں وہ اور ہی شے ہے۔ اور اس کو سب جانتے ہیں۔ اور غالباً کروڑوں اللہ کے بندے ظاہر میں اور باطن میں میرے ہم خیال ہوں گے۔ میں خیال میں مست ہوں اور دن دہاڑے بڑی بڑی

روزنامہ ہمدرد دہلی (دور ثانی) کے مکمل فائل مطلوب ہیں۔ اگر کسی صاحب کے پاس ہوں اور وہ قیمتاً دینا چاہیں۔ تو مطلع فرمائیں۔ اگر قیمت مناسب ہوئی تو فوراً پیش کر دی جائے گی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ فائل بالکل مکمل ہوں۔ کوئی پرچہ کم نہ ہو،

اس پتہ سے خط و کتابت کی جائے۔

محمد علی اکیڈمی
لاہور

خطوط و مقالاتِ محمد علی

نظربندی کے زمانے میں، قید کے زمانے میں، رہائی کے زمانے میں محمد علی نے اپنے دوستوں اور عزیزوں اور پیر و مرشد مولانا عبدالباری رحمۃ اللہ کو جو خطوط لکھے ان سے نہ صرف محمد علی کے کردار اور شخصیت پر روشنی پڑتی ہے اور بعض دلچسپ اور سبق آموز اسرار و رموز اور واقعات و احوال کا انکشاف ہوتا ہے، بلکہ آنے والے مؤرخ کے لیے جو مسلمانانِ غیر منقسم ہندوستان کی تاریخ حریت و استقلال لکھے گا، بہترین ماخذ بھی ہیں

خطوط کا بڑا حصہ غیر مطبوعہ اور کچھ مطبوعہ ہے لیکن نصف صدی سے پہلے کا!

یہی صورت مقالات کی بھی ہے جو ہمدرد (دورِ ثانی) سے تعلق رکھتے اور مسلمانوں کے خلفشار و انتشار کا آئینہ ہیں!۔

علی برادران کی اسیری

پانچ سال کی نظر بندی کے بعد علی برادران جب رہا ہو کر جیل سے سیدھے امرتسر پہنچے جہاں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ تو اقبال محمد علی کے استقبال کیلئے بطور خاص امرتسر گئے - اور یہ نظم مسلم لیگ کے اجلاس میں حسب روایت سید نذیر نیازی صاحب ترنم کے ساتھ سنائی جس نے حاضرین پر سکتہ کا عالم طاری کر دیا۔ یہ نظم بانگ درا میں "اسیری" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔

◎

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

مشک اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

"شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند"

بی اماں کے نام

(۱)

جیل خانہ کراچی
وقت ۸ ½ بجے صبح

۱۱ محرم الحرام
مطابق ۳۰ ستمبر ۱۹۲۱ء

لاغالب الا اللّٰہ

پیاری بوا! خداوند کریم آپ کو زندہ و سلامت رکھے اور تمام دلی مراد بر لائے آمین۔ ۱۷ ستمبر کی صبح کو ۴ بجے جیلر آئے اور کہا آپ تیار ہو جائیے آپ کو کسی دوسری جگہ لے جائیں گے۔ میں پہلے ہی یہ سمجھ رہا تھا۔ کوٹھری کا دروازہ کھلوا کر وضو وغیرہ کیا۔ اور نماز فجر ادا کی پھر بستر پر لیٹا۔ کوئی سوا پانچ بجے جیل کے دروازے پر جیلر کے دفتر میں لایا گیا۔ وہاں ضلع کا مجسٹریٹ گھنسن نامی ڈپٹی انسپکٹر جنرل ریلوے و خفیہ پولیس کھنگم نامی اور سپرنٹنڈنٹ جیل میجر ہال گیٹ نامی موجود تھے۔ مجسٹریٹ نے مجھ سے کہا کہ اب تم پر ایک مستقل جرم کا الزام لگایا گیا ہے اس لئے میں ضمانت طلبی کی کاروائی بند کئے دیتا ہوں میں نے کہا کہ یہ طریقہ تو غالباً صحیح نہیں ہے، قانون میں صاف درج ہے کہ ملزم کی حاضری کے بعد تفتیش شروع کر دی جائے۔ بند کرنے کا اختیار آپ کو نہیں ہے اگر ہو تو قانون کا حوالہ دیجئے۔ حوالہ تو نہ دے سکا مگر کہا کہ میں اپنے اختیار سے اب یہ تمام کاروائی بند کرتا ہوں۔ اس پر میں نے کہا کہ میں آپ کے ضلع میں نہ پہلے کبھی تھا نہ اب رہنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مدراس جا رہا تھا، راستے میں سے آپ نے روک لیا اور وجہ یہ بتائی کہ تم یہاں فتنہ و فساد برپا کرو گے۔ حالانکہ میں چند منٹ ہی بعد اپنی گاڑی میں سوار ہو کر مدراس جانے کو تھا۔ اس الزام کی بناء پر بھی مجھ پر سمن نکالا جانا چاہئے تھا۔ مگر آپ نے اس بہانے سے وارنٹ جاری کیا کہ اگر میں گرفتار نہ کیا جاتا تو مجھے فتنہ و فساد سے باز رکھنے کی کوئی اور تدبیر نہ تھی۔ اور اب آپ یہ تمام کاروائی کالعدم کئے دیتے ہیں مچلکے مانگتے ہیں نہ جیل بھیجتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ جانتے تھے کہ نہ میں آپ کے ضلع میں رہنا چاہتا تھا نہ فساد برپا کرنے کی نیت رکھتا تھا نہ اس سے پہلے کبھی اور فساد برپا کر چکا تھا نہ اس کی اس وقت فرصت ہی تھی۔ لیکن آپ کی گورنمنٹ چاہتی تھی کہ میں گرفتار کر لیا جاؤں کیوں کہ میرے لئے کراچی سے وارنٹ نکل چکا تھا۔ مگر اب تک وہ لٹیرنہ پہنچا تھا۔ بلا اس وارنٹ کے میں گرفتار نہیں کیا جا سکتا اس لئے اس کے آنے تک یہ بہانہ ڈھونڈا گیا کہ میں فساد برپا کرنے والا تھا اور اس کا روک تھام بلا میری گرفتاری کے ناممکن تھی اس لئے گرفتاری کا وارنٹ آپ نے نکالا اور بلا مچلکے لینے کی نیت کے مچلکے طلب کئے ہیں۔ ایک حرف بھی تلخ و ترش کہنا نہیں چاہتا تھا مگر آپ خود غور کیجئے کہ آپ ضلع کے مجسٹریٹ ہیں نہایت اہم اور فوری ضرورتوں کے لئے جن کا صاف صاف اظہار و تعین اسی قانون نے کر دیا ہے آپ کو گرفتار کر لینے کا اختیار دیا گیا ہے مگر اس اہم اور فوری ضرورت کے اور بالکل ایک دوسری غرض سے آپ نے مجھے گرفتار کر لیا۔ آپ کو دعوٰے ہے کہ آپ

اس قانون کے محافظ ہیں اور لوگوں کو قانون شکنی کی سزا دینا آپ کا منصب ہے اور پھر آپ خود ہی اس قانون کو توڑتے ہیں۔ میں نے اپنے مشیر قانونی مسٹر سندرراؤ سیکرٹری کانگریس سے ملنا چاہا۔ مگر اول تو کہا کہ وہ کیسے مشیر قانونی ہو سکتے ہیں انہوں نے تو وکالت کانگریس کے حکم سے چھوڑ دی۔ میں نے کہا کہ آپ سے تو ۱۴ ستمبر ہی کو کہہ چکا ہوں کہ آپ کی عدالت میں مقدمے کی پیروی کرنا ہمارا شیوہ اور چلن نہیں ہے لیکن قانونی مشورے میں جس شخص سے لینا چاہوں اس سے لینے کا مجاز ہوں اور وکالت کرنے والے وکیل کی ضرورت نہیں۔ میں نے خود تو کبھی بھی وکالت نہیں کی لیکن کچھ نہ کچھ صلاحیت تو قانونی مشورہ دینے کی میں بھی رکھتا ہوں اور بارہا میں نے لوگوں کو قانونی مشورہ دیا ہے۔ اس پر جواب دیا کہ وقت نہیں ہے تمہاری گاڑیاں یہاں سے ۶ بجے روانہ ہو جائیگی۔ محمد حسین سے بھی ملنے کی اور اس کو کراچی آنے کی ہدایت دینے کی اجازت نہیں دی۔ یہ سب تو اتمام حجت تھا ورنہ میرا وکیل خدا اور میری خدمت کے لئے اس کے دئے ہوئے ہاتھ پاؤں کافی ہیں۔

میرے کاغذات جو کپڑوں کے صندوق میں تھے ہمراہ بھیج دئے گئے ہیں یہاں آکر میں نے کہہ دیا کہ وہ امجدی کے نام لنگرخانہ کے پتہ سے رام پور بھیج دیئے جائیں چونکہ معمولی کاغذات متفرق محمد حسین کے بھرے ہوئے ہیں یا خلافت وسوراج فنڈ کی رسیدیں اور ان کا حساب وکتاب ہے اس لئے خیال تو نہیں ہے کہ کسی کو ان کے واپس کرنے کا حکم نہیں ہے دوسرے ان کے روکنے کا کوئی قاعدہ بھی نہیں ہے تاہم میں نے کہہ دیا ہے کہ اگر دیکھ لئے جائیں تو مجھے عذر نہیں۔ فہرست بھی بنوا دی ہے۔ کوئی پچاس کاغذات ہیں وہ ابھی نور کھوا لیجئے گا۔ امجدی یا معظم کو دلوا دیجئے گا موٹر میں سوار ہو کر میں کوئی ۶ بجے اسٹیشن پر آیا چند لوگ جن کو کچھ بھنک پہنچ گئی تھی دو رویہ کھڑے تھے۔ ان میں جامعہ ملیہ علیگڑھ کے بھی میرے دو شاگرد عبدالحکیم و عبدالقیوم دو پنجابی بھائی تھے۔ فی امان اللہ کہتا ہوا رخصت ہوا۔ انہوں نے نصر من اللہ و فتح قریب کا نعرہ بلند کیا۔ اسپیشل میں دو کمرے فرسٹ کلاس کے تھے اور گاڑی تیسرے درجے کی تھی ایک فرسٹ میں میں اور انگریز انسپکٹر مسلح پولیس اور اس کا سارجنٹ اور ایک مسلح کانسٹبل اور دوسری میں ایک اور مسلح کانسٹبل اور پونہ کا انسپکٹر آرکٹکر جو کراچی کا وارنٹ لایا تھا اور ریلوے کے اسسٹنٹ ٹریفک سپرنٹنڈنٹ کپتان گریشن تھے۔ آخرالذکر شوکت کے رائے بریلی۔ کیسے شناسا نکلے، راستے بھر باتیں ہوتی رہیں۔ بے حد شریف اور لائق انسان تھے، میرے پیر میں ایک چھالے کا ذرا سا زخم ہو کر اچھا ہو گیا تھا مگر جیل میں دوا نہ لگنے سے پھر ہرا ہو چلا تھا۔ آخر دن وہاں کے ڈاکٹر نے صاف کر کے پٹی باندھ دی تھی۔ خود ہی اس کو دیکھ کر کھروا اسٹیشن روڈ کو تار دیا جہاں اس کا صدر مقام تھا اور ڈاکٹر کو بلا کر زخم کو صاف کرا کے پٹی بندھوا دی اور کئی پٹیاں وغیرہ ساتھ کرا دیں۔ اللہ کے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں۔ کھروا روڈ پر کپتان گرشن اُتر گئے وہاں سے گوموہ تک بہار کے ریلوے پولیس کے سپرنٹنڈنٹ کا ساتھ ہوا۔ بیچارہ گھبرایا ہوا تھا۔ کھرکپور اسٹیشن پر ریلوے ہی کے ملازموں کا کچھ ہجوم تھا۔ اور وہ اللہ اکبر کے بندے ماترم اور گاندھی اور ہم دونوں کی جے پکار رہے تھے۔ گھبرا کر پولیس والوں کو جو ساتھ کے تیسرے درجے کی گاڑی میں تھے ادھر اسٹیشن پر اُتر کر پہرہ دینے تھے، سنگین چڑھانے کا حکم دیا۔ گاڑی کے پٹ بھی بند کرا دئے اور اس طرح بوکھلا کر گاڑی کو چلوا دیا کہ دو کانسٹبل اور ایک ہیڈ کانسٹبل بیچارے اسٹیشن پر ہی چھوٹ گئے۔ ساتھ جو انگریز پولیس والے تھے اول تو وہ سمجھے کہ گاڑی شنٹ کر رہی ہے لیکن جب ایک، دو میل سے زیادہ چلی گئی تو گھبرا کر انہوں نے زنجیر کھینچ کر گاڑی روکی جب سپرنٹنڈنٹ آیا تو ان پر الٹا بھلا یا کہ

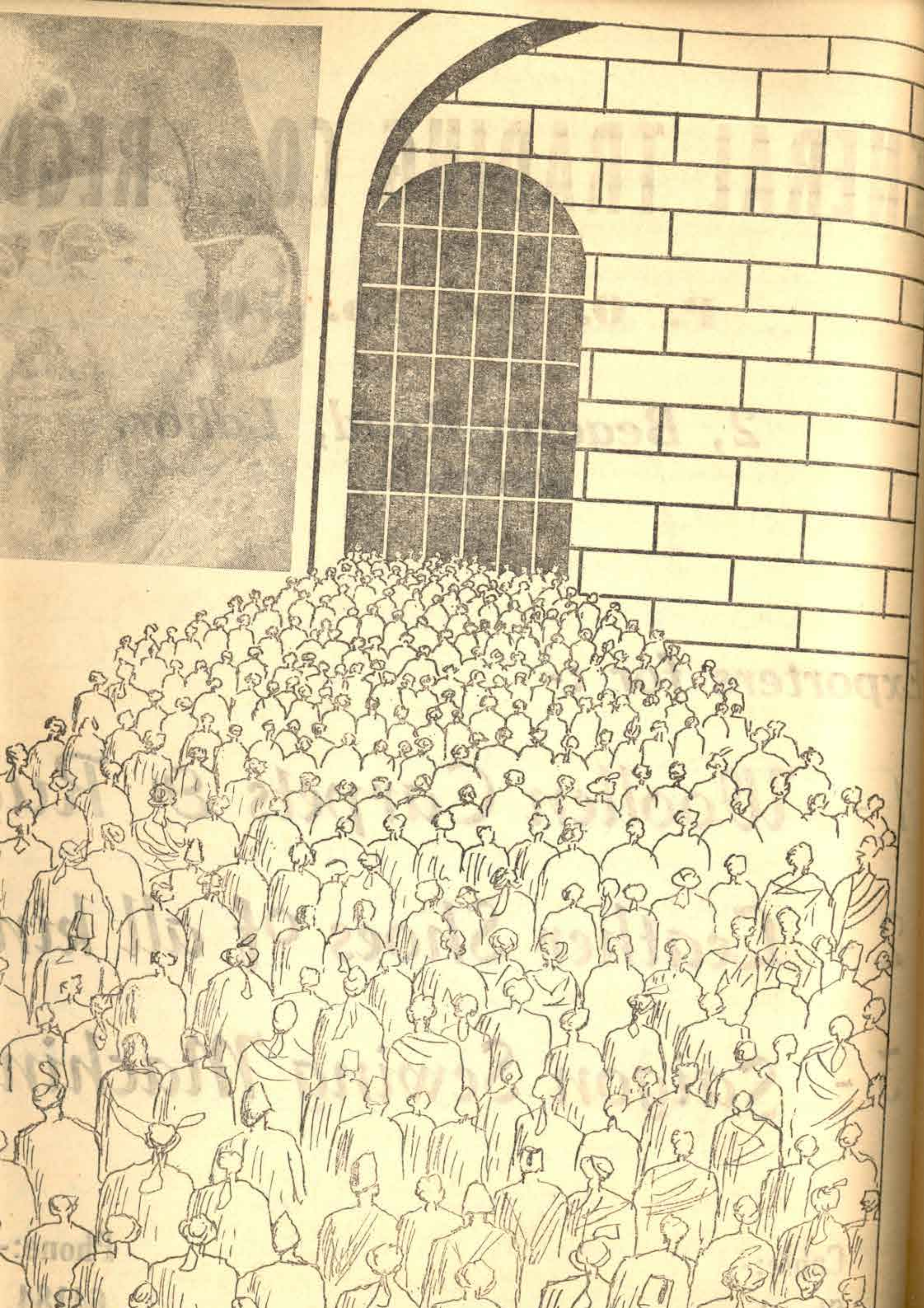

میری بلا اجازت گاڑی کیوں روکی - بیچارے اجازت کس طرح لیتے سپرنٹنڈنٹ صاحب تو علیحدہ گاڑی میں تشریف رکھتے
پھر کہا کہ تم نے بڑا غضب کیا اگر اس جگہ روک لیا یہاں تو ریلوے فیکٹری ہے تیس ہزار مسلمان رہتے ہیں لیکن تیس ہزار مسلمان اطمینان
فیکٹری ہی میں رہے تین چار جو باہر آئے السلام علیکم کر کے چپ چاپ بیٹھ گئے اور جب وہ سپاہی جو چھوٹ گئے تھے ہانپتے
بلکہ گرتے پڑتے اور پریشان حال واپس آئے تو فی امان اللہ کہہ کر ان غریب مسلمانوں نے مجھے رخصت کیا - گوموہ علے الصـ
پہنچے - وہاں سے دوسرے شخص کا ساتھ ہوا - گیا، سہسرام وغیرہ سے ہوتے ہوئے مغل سرائے آئے وہاں بہار کا د
سپرنٹنڈنٹ بھی رہ گیا اور آگے جاگر یا شاید وہیں ممالک متحدہ کا پولس سپرنٹنڈنٹ ساتھ ہوا - ریل کے بڑے افسر کی گاڑی سا
تھی ایسٹ انڈین ریلوے کا افسر گوموہ سے دہلی تک آیا - ہر جگہ کھانے کا تار ریفریشمنٹ روم کو پہلے سے دے دیا جاتا
اور اس کی تاکید ہوتی تھی کہ چربی کا پکا ہوا نہ ہو بلکہ گھی یا مکھن کا ہو تاکہ سور کی چربی سے محفوظ رہ سکوں - ہر وقت کی نماز کـ
کسی اسٹیشن پر اُتر کر پڑھی مگر ممالک متحدہ سے یہ طریقہ شروع ہوا کہ گاڑی کسی بڑے اسٹیشن پر نہ ٹھیری - چنانچہ الہ آباد - کـ
علیگڑھ دہلی اور اسی طرح سندھ میں حیدر آباد وغیرہ مقامات سے یا تو ایک اسٹیشن ادھر انجن پانی لے لیتا تھا یا ایک اسٹـ
ادھر بقول شاعر - ع

"وطن سے بچتے ہوئے دور دور ہم آئے"

اسپیشل کی اطلاع کسی کو نہ تھی تاہم ریلوے والے چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر واقف ہو گئے - یوں تو خدا کے کرم
اور ہندوستانی بھائیوں کی محبت کے باعث ہم پر منوں پھول برسائے جا چکے ہیں، مگر ممالک متحدہ کے ایک چھوٹے سے اسٹـ
پر جہاں گاڑی رُکی بھی نہیں اسٹیشن ماسٹر اور کلرک ہرے جھنڈے دکھانے کھڑے تھے - جب میری گاڑی سامنے آ
ایک نے جھنڈی کے نیچے سے پھول نکال کر اچھالے - عمر بھر یہ پھول یاد رہیں گے جہاں کہیں بھی گاڑی پہنچتی تھی مجھے د
تھوڑے بہت آدمی جمع ہو جاتے تھے گرم جوشی کے ساتھ رخصت کرتے تھے - پنجاب کے ایک اسٹیشن پر تو ایک ہندو بھائی
جو ریل کے ملازم تھے اصرار سے دودھ پلایا - دودھ پی کر میں اپنا کٹورا دھو رہا تھا کہ ایک مسلمان بھائی نے جو وہیں کھڑے
کٹورا ہاتھ سے لے لیا میں سمجھا کہ وہ خود یہ خدمت کرنا چاہتے ہیں مگر وہ اولش بنا کر پی گئے - اکثر جگہ ریفریشمنٹ کے خانساما
نے بڑی محبت سے کھانا کھلایا - ایک جگہ تو میرے چاول کھانے سے عذر کرنے پر خانساماں گھر سے جلد جلد چپاتیاں پکوا
غازی آباد پر مدراس کی پولیس کے لوگ اتر گئے اور چلتے وقت بڑی محبت سے سب نے رخصت کیا - انگریز انسپکٹر اور سـ
بھی بھلے لوگ تھے - غازی آباد پر دہلی پولیس کا ایک انگریز انسپکٹر اور ایک سارجنٹ اور مسلح سپاہی ساتھ ہوئے اور وہ
تک آئے - ان کے ساتھ بھی اچھی کٹی اور رخصت کے وقت سب نے بڑی محبت سے رخصت کیا - ذلک فضل اللہ یوتیہ
واللہ واسع علیم - تمام راستہ اچھی طرح کٹا - دہلی سے بھٹنڈا اور بھٹنڈے سے سماسٹہ اور وہاں سے کراچی یہ راسـ
اکثر حصہ اُجڑا اور غیر آباد ہے - سماسٹہ سے نکل کر سارے راستے میں پہلے اور آخری شناسا کی صورت ایک اسٹیشن پر نظر
بھی ہمارے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ایک شاگرد تھا جو مبلغ کا کام کر رہا تھا - نصر من اللہ و فتح قریب کہہ کر اس غریب نے بھی رخصـ
کیا - بے شک الا ان نصر اللہ قریب - راستے میں خوب فرصت تھی اور جیل میں بھی سورۂ اعراف تک تلاوت ہو گئی ہے - اب

(۲)

. . . .

اور مجھے یقین[1] ہوگیا ہے کہ نیا حکم نہ یہاں کے افسران جیل کے ایمار سے جاری کیا گیا ہے نہ خود محکمہ کے افسر اعلیٰ کے ایمار سے
لئے جب تک میرے ساتھ یہ افسر خلاف اخلاق شریفانہ سلوک نہ کریں گے میں بھی حسب معمول ان افسروں کے آنے پر
جایا کروں گا۔ لیکن کراچی کی طرح اگر اسے عملاً تلاشی دینے کے مترادف سمجھا جاوے گا تو بغایت مجبوری اس قسم کے اخ
مجھے یہاں بھی ترک ہی کرنا پڑے گا۔ اس پر مجھے یقین دلایا گیا کہ یہاں کے افسران جیل نے اس امر کی یادداشت باقاعد
ہے اور گورنمنٹ کو اطلاع بھی دی جا چکی ہے کہ ہر بار تلاشی دینے میں مجھے عذر ہوتا ہے اور تلاشی طوعاً نہیں دی جاتی
دی جاتی ہے گو نہ کوئی اور سختی استعمال کی جاتی ہے نہ میری جانب تشدد کے احتراز کے باعث کسی سختی کی ضرورت ہ
آتی ہے۔

میرے انکار کے باعث اگرچہ مجھے کوئی سزا نہیں دی گئی۔ البتہ جو قید تنہائی صرف ایک مہینے کے لئے بہ طور سزا
میں دی گئی تھی اور بعد میں منسوخ کر دی گئی تھی وہ تلاشی دینے سے دوبارہ انکار کے جرم سے پہلے ہی یہاں دی جار
اب تک برابر جاری ہے بلکہ بہ نسبت پہلے کے روز بروز زیادہ سخت ہوتی جاتی ہے۔ اب صرف دیکھنا یہ ہے کہ یہ
افسر جب تک میرے ساتھ خلاف اخلاق شریفانہ برتاؤ نہ کریں گے میں اپنے موجودہ رویہ پر انشاء اللہ قائم رہوں گا۔ جو
شوکت کو پیش آئے ہیں ان سے میں واقف نہیں مگر مجھے یقین کامل ہے کہ جو رویہ انہوں نے اختیار کیا ہے وہ ضرور ان
حالات کے مناسب ہو گا اور یہ تو کوئی احمق ہی خیال کرے گا کہ قید ہونے کے اتنے عرصے بعد ان جیسے شہ زور
کرنا جسمانی تکلیف اور زحمت سے بچنے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ ہم دونوں کے حالات ممکن ہے کہ اور طرح یکساں نہ
ایک امر میں تو ضرور یکساں ہو سکتے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ یکساں رہیں گے یعنی جب تک شوکت کو ملاقات اور خط وکتا
اجازت نہ ہوگی میں خود اپنی خوشی سے ملاقات اور اپنے ذاتی حالات کے متعلق خط وکتابت دونوں کو اپنے لئے ناج
ممنوع سمجھوں گا۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے سب سے زیادہ آپ کے دیکھنے کا انتظار رہا کرتا تھا اور آپ ہی کی خیر و عا
کرنے کا سب سے زیادہ متمنی ہوا کرتا تھا اور ہوں اور آئندہ بھی رہا کروں گا۔ اگر امجدی اور چھوٹے بچوں سے محض
سے یہاں آتے وقت فروری میں سورت کے اسٹیشن پر ملاقات نہ ہوگئی ہوتی تو سزایاب ہونے کے بعد سے کل کی ملاقا
بھر میں پہلی ملاقات ہوتی۔ مگر یار زندہ صحبت باقی۔ ہاں آپ کی عمر کے خیال سے اس سے کہیں زیادہ آپ کی نقا
کہ مجھے خوف وہراس ہو تو یہ امر فطری ہے مگر بہ خدائے لایزال میرا دل گواہی دیتا ہے کہ خدا آپ کو اس وقت تک

[1] اصل خط میں سے شروع کا کچھ حصہ غائب ہے (مرتب)

کا پھر موقعہ ملا ہے ۔ سارے راستے درود شریف کی تسبیحیں پڑھتا ۔ اور یہ شعر دہراتا ہوا آیا ہوں ؎

صبا تو جا کے یہ کہیو مرے سلام کے بعد، تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

اس پیامبر، الٰہی (بانی امت والا) کی یاد میں مست ہوں جس کے لئے قرآن میں آیا ہے عزیزٌ علیہ ماعنتم حریصٌ علیکم بالمومنین رؤف الرحیم ط (وشوار گزرتا ہے اس پر جو تم کو تکلیف وہ ہو تمہاری بھتری کی اس کو حرص ہے اور مومنوں پر مہربانی اور رحم کرنے والا ہے) بس خدا کے نام کے بعد اس نام کی رٹ ہے اور ع

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

اللہ سے دعا ہے کہ اس کے نام پر اگر اس گنہ گار کو نام عطا ہوا ہے تو اس نام کی لاج رکھ لے اور صبر و استقلال عطا فرمائے ۔

اب میں رخصت ہوتا ہوں ۔ آج صرف یہی خط لکھا ہے نہ معلوم فرصت بھی ملتی ہے یا نہیں اس لئے امجدی کو مولانا عبد الباری صاحب کو اور سب عزیزوں اور دوستوں کے دیکھنے کے لئے بھجوا دیجئے گا یا اس کی نقلیں کرا کے بھجوا دیجئے گا ۔ قمر صاحب کو پیار ۔ منی اور بانی بی کو پیار اور سب بچوں کو پیار ۔ سب کو سلام دعا ۔ شوکت ۔ کچلو وغیرہ سے نہ معلوم کب ملاقات ہو ۔ والدیر سے ۲۲۵۲ میل کا سفر پورے تین دن رات میں ختم کر کے یہاں پہنچا ہوں ۔

(۲)

. . . .

اور مجھے یقین ہوگیا ہے کہ نیا حکم نہ یہاں کے افسران جیل کے ایما ر سے جاری کیا گیا ہے نہ خود محکمہ کے افسر اعلیٰ کے ایما ر سے
لئے جب تک میرے ساتھ یہ افسر خلاف اخلاق شریفانہ سلوک نہ کریں گے میں بھی حسب معمول ان افسروں کے آنے پر کھ
جایا کروں گا۔ لیکن کراچی کی طرح اگر اسے عملاً تلاشی دینے کے مترادف سمجھا جاوے گا تو بغایت مجبوری اس قسم کے اخ
مجھے یہاں بھی ترک ہی کرنا پڑے گا۔ اس پر مجھے یقین دلایا گیا کہ یہاں کے افسران جیل نے اس امر کی یادداشت باقاعدہ
ہے اور گورنمنٹ کو اطلاع بھی دی جاچکی ہے کہ ہر بار تلاشی دینے میں مجھے عذر ہوتا ہے اور تلاشی طوعاً نہیں دی جاتی بلک
دی جاتی ہے گو نہ کوئی اور سختی استعمال کی جاتی ہے نہ میری جانب تشدد کے احتراز کے باعث کسی سختی کی ضرورت ہی
آتی ہے۔

میرے انکار کے باعث اگرچہ مجھے کوئی سزا نہیں دی گئی۔ البتہ جو قید تنہائی صرف ایک مہینے کے لئے بہ طور سزا کے
میں دی گئی تھی اور بعد میں منسوخ کر دی گئی تھی وہ تلاشی دینے سے دوبارہ انکار کے جرم سے پہلے ہی یہاں دی جارہی تھ
اب تک برابر جاری ہے بلکہ بہ نسبت پہلے کے روز بروز زیادہ سخت ہوتی جاتی ہے۔ اب صرف دیکھنا یہ ہے کہ یہاں
افسر جب تک میرے ساتھ خلاف اخلاق شریفانہ برتاؤ نہ کریں گے میں اپنے موجودہ رویہ پر انشاء اللہ قائم رہوں گا۔ جو حا
شوکت کو پیش آئے ہیں ان سے میں واقف نہیں مگر مجھے یقین کامل ہے کہ جو رویہ انہوں نے اختیار کیا ہے وہ ضرور ان کے
حالات کے مناسب ہوگا اور یہ تو کوئی احمق ہی خیال کرے گا کہ قید ہونے کے اتنے عرصے بعد ان جیسے شہ زور ۔
کرنا جسمانی تکلیف اور زحمت سے بچنے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ ہم دونوں کے حالات ممکن ہے کہ اور طرح یکساں نہ ہو
ایک امر میں تو ضرور یکساں ہو سکتے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ یکساں رہیں گے یعنی جب تک شوکت کو ملاقات اور خط و کتابت
اجازت نہ ہوگی میں خود اپنی خوشی سے ملاقات اور اپنے ذاتی حالات کے متعلق خط و کتابت دونوں کو اپنے لئے ناجـ
ممنوع سمجھوں گا۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے سب سے زیادہ آپ کے دیکھنے کا انتظار رہا کرتا تھا اور آپ ہی کی خیر و عافیت
کرنے کا سب سے زیادہ متمنی ہوا کرتا تھا اور ہوں اور آئندہ بھی رہا کروں گا۔ اگر امجدی اور چھوٹے بچوں سے محض حسن
سے یہاں آتے وقت فروری میں سورت کے اسٹیشن پر ملاقات نہ ہوگئی ہوتی تو سزایاب ہونے کے بعد سے کل کی ملاقات
بھر میں پہلی ملاقات ہوتی۔ مگر یار زندہ صحبت باقی۔ ہاں آپ کی عمر کے خیال سے اس سے کہیں زیادہ آپ کی لقا ہے
کہ مجھے خوف و ہراس ہو تو یہ امر فطری ہے مگر بہ خدائے لایزال میرا دل گواہی دیتا ہے کہ خدا آپ کو اس وقت تک تو

لہ اصل خط میں سے شروع کا کچھ حصہ غائب ہے (مرتب)

پھر موقعہ ملا ہے۔ سارے راستے درود شریف کی تسبیحیں پڑھتا۔ اور یہ شعر دھراتا ہوا آیا ہوں ؎

صبا تو جا کے یہ کہیو مرے سلام کے بعد، تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

اس پیامبرِ الٰہی (بانی امت والا) کی یاد میں مست ہوں جس کے لئے قرآن میں آیا ہے عزیزٌ علیہ ما عنتم حریصٌ علیکم بالمومنین رؤف الرحیم ط (دشوار گزرتا ہے اس پر جو تم کو تکلیف وہ ہو تمہاری بہتری کی اس کو حرص ہے اور مومنوں پر مہربانی اور رحم کرنے والا ہے) بس خدا کے نام کے بعد اس نام کی رٹ ہے اور ع

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

اللہ سے دعا ہے کہ اس کے نام پر اگر اس گنہ گار کو نام عطا ہوا ہے تو اس نام کی لاج رکھ لے اور صبر و استقلال عطا فرمائے۔

اب میں رخصت ہوتا ہوں۔ آج صرف یہی خط لکھا ہے نہ معلوم فرصت بھی ملتی ہے یا نہیں اس لئے الحمدی کو مولانا عبد الباری صاحب کو اور سب عزیزوں اور دوستوں کے دیکھنے کے لئے بھجوا دیجئے گا یا اس کی نقلیں کرا کے بھجوا دیجئے گا۔ قمر صاحب کو پیار۔ منی اور ربانی بی کو پیار اور سب بچوں کو پیار۔ سب کو سلام دعا۔ شوکت۔ کچلو وغیرہ سے نہ معلوم کب ملاقات ہو۔ والدہ سے ۲۲۵۲ میل کا سفر پورے تین دن رات میں ختم کر کے یہاں پہنچا ہوں۔

آیا کرتا ہوں۔

پہلے بیتول کی قید، پھر رہائی ہوتے ہی اس قید سے زیادہ لمبا دیس نکالا اور علی گڑھ اور بمبئی اور ہم سفری سب کو ملا چھ سات مہینے کو چھوڑ دیا جائے۔ کہا جا سکتا ہے کہ جون ۱۹۱۹ء سے آج تک کا زمانہ علیحدگی ہی میں بسر ہوا اور ہم ار ستمبر ۱۹۲۱ء کو والٹیر کے اسٹیشن پر قید کی ابتدا کا خیال کیا جائے۔ تو تاہم یہی غنیمت ہے کہ امجدی زندہ ہے اور اس دنیا میں بھی ملاقات کی امید کا دروازہ ہنوز بند نہیں ہوا ہے ورنہ آپ منی غریب کس کس بچوں کو پالتیں۔

آپ میرا یہ خط امجدی کو بھی دکھا دیں اور میرے کل کے رخصتی الفاظ اُسے یاد دلا دیں کہ خدا پر بھروسہ رکھو اور دیکھو والٹیر کے اسٹیشن کا بیباہیانہ رویہ جواب تک قائم رکھا ہے قائم رکھو جس نے مجھے مطمئن کر دیا تھا کہ خدا کی مدد شامل حال ہے یہ عورت اپنے مسلمانوں اور ہندوستانی بھائی بہنوں کے سامنے کسی تھڑدلی کے اظہار سے نہ خود شرمندہ ہوگی نہ مجھے اور نہ اپنے بہادر بھائی اور اپنے شیر دل ہزاروں مرنے والوں کو شرمندہ کرے گی۔ قمر (بھابی کا لڑکا) کو نہ دیکھنے کا افسوس رہا مگر ہر نماز میں اپنے مرحوم بھائی اس اکیلے مددگار اور خورشید اور بانو کے لئے دعا کیا کرتا ہوں۔ خدا اس کو پروان چڑھائے اور منی اور بائی وچچی کے دلوں کو ٹھنڈا کرتا رہے۔ آمین ثم آمین۔ سب عزیز و اقارب، دوست احباب کو سلام و دعا۔ سرکار میں میرا آداب کہلوا دیجئے گا۔ نہ معلوم اب کے سال گرہ تک خود حاضر خدمت ہوتا ہوں یا مبارکباد کے تار سے بھی شرکت کی طرح محروم رہتا ہوں۔

اب آپ کا پہلا خط اس وقت آئے جب شوکت کو بھی آپ خط لکھوا سکیں اور ملاقات یا چھوٹنے پر ہوگی یا دونوں کو یکساں ملاقات کی اجازت ملے گی اور ویسے جو خدا کی مرضی۔ میرے یہ شعر اس وقت ہی کیا ہمیشہ حسب حال ہیں۔

ہم معنی ہوس نہیں اے دل ہوائے دوست
راضی ہو بس اُسی میں ہو جس میں رضائے دوست
طغرائے امتیاز ہے خود ابتلائے دوست
اُس کے بڑے نصیب جسے آزمائے دوست
یاں جنبش مژہ بھی گناہ عظیم ہے!
چپ چاپ دیکھتے رہو جو کچھ دکھائے دوست
کیا صبر وہ عطا نہ کرے گا اگر ہمیں
ہے اعتبار وعدۂ صبر آزمائے دوست
جائز ہے وصل و ہجر کا کب امتیاز یاں
جوہر جفائے غیر کو سمجھو وفائے دوست

ایک دروازہ ہے جس سے کوئی سائل بے مراد پائے واپس نہیں آتا بشرطیکہ سو دروازوں کا بھکاری نہ ہو اُسی پر بھروسہ کئے رہے اور اُس سے کسی حالت میں مایوس نہ ہو اور ہر کس و ناکس کی اس چوکھٹ تک رسائی ہے۔

سلامت رکھے گا کہ ہم سب ان مُرادوں کو پہنچیں اور اسلام اور ہندوستان کے دوبارہ عروج سے ہماری آنکھوں کو سُکھ اور دل کو چین ہو۔ لیکن میں ہر حال میں اپنے رب کی مرضی پر راضی ہوں ۔ میری جنت یا تلواروں کی چھاؤں میں (ہے) یا آپ کے قدموں کے نیچے ہے، تاہم مجھے یہ قبول ہے کہ آپ کو دیکھے بغیر آپ سے ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں مگر یہ ہرگز قبول نہیں کہ میں آپ کے دیدار سے سعادت اندوز ہوا کروں اور شوکت کی آنکھیں اس نظارہ کو ترسا کریں ۔ وہ ہر حالت میں مجھ سے کہیں زیادہ آپ کی محبت اور اس انعام کے مستحق ہیں اور خدائے بزرگ کے احکام اور اس کے رسول اکرم کی سنت کی پابندی نہ کرنے کی ایک حسرت کو چھوڑ کر اگر میرے دل میں بڑی سے بڑی حسرت ہے تو یہی ہے کہ شوکت کی برابر میں آپ کی خدمت نہ کر سکا اور خدا سے دعا ہے کہ آئندہ اس کی توفیق دے ۔ آمین ثم آمین ۔

مشہور محدث و خدمت گزار رسول اللہؐ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بھائی کا انتقال ہو گیا تو وہ نہایت درجہ غمگین و ملول تھے ۔ سوائے دربار نبوی کے تمام دنیا ان کی آنکھوں میں تیرہ و تار تھی، جس طرح مائیں اپنی اولاد کو رویا کرتی ہیں اُسی طرح ہمیشہ بھائی کا سوگ کیا کرتے تھے ۔ مگر سب سے زیادہ اُن کو جس چیز کا غم تھا وہ یہ تھا کہ

اے دریغا اں سبق خوان نیاز ۔۔۔ یار من اندوہ و بستان نیاز

اہ آں سرو سہی بالائے من ۔۔۔ در رہ عشق نبیؐ ہم پائے من !

حیف او محروم دربار نبی

چشم من روشن ز دیدار نبی

میں اور میرا برادر دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے بہرہ اندوز ہوا کرتے تھے اور دونوں اُسی درسگاہ قدسیاں میں ہم سبق تھے ۔ افسوس کہ آج میں تو رسولؐ کے دیدار سے مشرف ہوں اور میرے بھائی اس دربار کی حاضری سے محروم رہے ۔

آپ قیاس کر سکتی ہیں کہ مجھ سے کس طرح گوارا ہو گا کہ میں آپ کو دیکھوں اور شوکت اس نعمت سے لذت یاب نہ ہو۔ رہے بچے زہرہ اور حمیدہ کی طرف سے میں بے فکر ہوں گو زہرہ کے لئے ایک مشکل وقت قریب آ رہا ہے ۔ آمنہ بی پر جو کچھ گزر چکا تھا وہی کیا کم تھا کہ اب اس کی صحت کی خرابی نے اور پریشان کر دیا اور گلنار کا سوکھا ہوا بدن اور چہرہ دیکھ کر میں ڈر سا گیا۔ دن کیسے کاٹے گا یہ بچی دس برس کی ہے بالخصوص جب اس کی عمر میں اس کی سب بہنیں ماشاء اللہ ہٹی کٹی لحیم شحیم تھیں مگر اول تو خدا مالک ہے پھر جس طرح زاہد صبر کر سکتا ہے اُسی طرح زہرہ صبر کر سکتی ہے اور جس طرح شاہد کو دیکھے بغیر شوکت صابر و شاکر ہیں ماشاء اللہ اُسی طرح آمنہ کو دیکھے بغیر میں بھی صابر و شاکر رہ سکوں گا، جس طرح سلطانہ عذرا اور عابد نے اب تک گزاری ہے اُسی طرح حمیدہ اور گلنار بھی باقی دن گزار سکتی ہیں ۔ رہی غریب بیوی تو شوکت صاحب تو ہمیشہ کے لئے اس رشتے کو ۲۴ سال کی عمر سے پیشتر ہی خیر باد کہہ چکے تھے مجھے تو خدا کا اور شکر کرنا چاہئے کہ جس بیماری میں بسم اللہ آپا مرحومہ امجدی کی تیماردار تھی اس سے امجدی صحت یاب ہو گئیں حالانکہ ان کی تیماردار ان اچھی خاصی ہنستی بولتی خود بیکا یک ایک ہی چند گھنٹوں کی علالت میں شوکت کو ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئیں ۔ میں بھی چالیس اکتالیس کی عمر سے مہمان داخل گھر پر

مہاتما گاندھی کے نام

(۳)

۱۸ اکتوبر ۱۹۲۱ء کراچی جیل

پیارے باپو۔ ایک عرصے سے قدرتاً طبیعت کا تقاضا تھا کہ اب آپ کو کچھ لکھوں، لیکن بہ وجوہ چند در چند تاخیر ہوتی رہی لیکن جب اخبارات میں آپ کے قلم سے نکلی ہوئی بعض تحریریں میری اہلیہ کی تعریف میں اُن کارروائیوں کے متعلق جو وہ والٹیر سے میری گرفتاری کے بعد کرتی رہی ہے پڑھیں، اب تو مجھے مجبوراً آپ کو عریضہ لکھنا پڑا، میرے لئے ایک سطر کا لکھنا بھی دقّت طلب کام ہے جس کا آپ نے بھی خود علانیہ اعتراف کیا ہے۔ مجھے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ آپ نے مجھ پر کس قدر گہرا اثر ڈالا ہے، غالباً میں نے ایک مرتبہ آپ سے کہا بھی تھا کہ ہم میاں بیوی میں شادی سے قبل ہی عشق و محبت کی تڑپ پیدا ہوگئی تھی اور یہ ہندوستان میں ایک غیر معمولی بات ہے لیکن ہماری متاہل زندگی کے بعد ہم ایک دوسرے سے ہر سال جدا رہے، اس جدائی نے میری اہلیہ کو پہلے سے بھی زیادہ میرے لئے محبوب اور عزیز تر شریک زندگی بنا دیا اور گزشتہ عرصے میں جب میں نظر بند تھا اس وقت جو راہ اس نے اختیار کی تھی اُس وقت سے ۱۹۱۹ء تک پُرخطر زندگی میں تھی، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ والٹیر کے پولیس اسٹیشن پر وہ میری نظروں میں جس قدر عزیز اور محبوب تھی اس سے پہلے وہ میری نظروں میں نصف بھی نہ تھی، وہ ریلوے پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئی اور نہایت فراخ دلی سے مجھ سے کہا کہ ہراساں نہ ہونا میری اور بچیوں کی فکر نہ کرنا، مجھے الوداع کہہ کر رخصت ہوگئی، اور نہایت استقلال کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوکر چلی گئی، میں نے کئی مرتبہ .... کے متعلق پڑھی ہیں ان سب تحریروں میں تعریف و توصیف ہے جس کے متعلق میں قدرتاً انکار کرتا ہوں اگرچہ یہ مسرّت بخش بیانات مجھ میں ایک سنسنی پیدا کرتی ہیں میں نے کئی مرتبہ وہ تحریریں پڑھی ہیں جن میں آپ نے ہماری بیرد کاری یا وکالت کر کے نکتہ چینیوں کو ہماری طرف سے جواب دیا ہے، لیکن آپ نے جو کچھ ہماری وکالت یا تعریف کے متعلق تحریر فرمایا ہے ان سب سے زیادہ مسرت بخش میرے لئے یہ بات تھی کہ آپ نے میری عزیز اور جاں باز اہلیہ کی تعریف کی ہے، حقیقتہً میں اس قدر متاثر ہوا ہوں کہ اس رشک انگیز تعریف کا بھی میں خیال نہیں کرتا، مجھے توقع ہے کہ یہ آزمائشی امتحان جلد ختم ہو جائے گا اور وہ جلد سے جلد اپنا کام آزادی کے ساتھ جاری رکھ سکے گی اور آپ سے ایسی ہی رشک انگیز داد لیتی رہے گی تذکرۃً میں یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ شاید آپ نے میرا خط ٹائمز کے نام دیکھا ہوگا جس میں ان تمام واقعات کی حقیقت کھولی ہے جو مجسٹریٹ کے تفتیش کے دوران میں چوتھے روز ظہور پذیر ہوئے، آپ کو خود علم ہے کہ کرانیکل جیسے اخبارات تک نے بھی میری تقریروں کی اطلاعات کس بے ترتیبی کے ساتھ شائع کی ہیں، غالباً آپ بھی

سکتے ہیں کسی شخص کے لئے اُن حالات اور واقعات کے متعلق رائے قائم کرنا جن کی اطلاعات ایسے بادہوائی طریقے سے اخبار
شائع ہو کس قدر خطرناک ہے، یہ لوگ مختصر نویسی کے علم سے بے بہرہ اور معصوم ہوتے ہیں، لیکن واقعات کے سننے اور د
ہیں اس قدر محو ہوتے ہیں کہ وہ غیر معمولی طور پر زندہ دل بن کر اپنے فرائض کو بھی نظر انداز کر جاتے ہیں جس کے لئے وہ اخبارات
نمائندے بن کر آتے ہیں اور جب میں جیل میں نہ تھا تو نہ میرے پاس اس قدر وقت ہی تھا اور نہ خیال ہی ہوتا تھا کہ میری تقریر و
کی غلط رپورٹ جو روزانہ اخبارات میں شائع ہوا کرتی ہے اس کی تردید کرتا رہوں، لیکن اب میری قید خانہ کی زندگی نے مجھے مہلت بخ
ہے وہ ایک ملزم کی زندگی کے لئے ضرورت ہے کہ وہ صبر و تحمل کا عادی ہو اب میں پہلے کی طرح اس قدر آزاد نہیں ہوں کہ غل
بیانیوں کو بغیر تصحیح شدہ چھوڑ دیا جائے لیکن یقینی طور پر کوئی وجہ نہیں ہے جو لفظ چھپ جائے لوگ اس پر اعتبار کریں۔ عا
کارروائی کے چوتھے روز کی غلط اور گمراہ کن رپورٹ جب میں پڑھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کم از کم بعض لوگ ہمارے متن
غلط فیصلہ کریں گے، میں نے ٹائمز کے ہی خط میں حوالہ دیا ہے کہ کرانیکل نے کس طرح خطرناک الٹ پلٹ کی ہیں، درجنوں جم
میرے بیان کے متعلق غلط شائع کر دئے ہیں میں اُن چند واقعات کا بھی اس موقع پر تذکرہ کر دینا چاہتا ہوں جس کی وجہ سے ہم
عدالت کی توہین کرنی پڑی ہمارا حقیقی مقصد شرارت نہ تھا، عدالت میں تین روز تک کارروائی عمدگی سے ہوتی رہی جس طرح کہ وکی
استغاثہ صفائی کا الزام دے سکتا ہے، اس سے زیادہ عدالت اس توہین کا ملزم قرار نہیں دے سکتی، مولانا حسین احمد ص
کے بیان سے یہ قصہ شروع ہوتا ہے، عدالت نے انکار کیا کہ وہ کسی قابل مترجم کو بلائے، یہی وجہ تھی کہ کچلو نے بھی اصرار کے
ساتھ اردو ہی میں بیان دیا کیوں کہ مجسٹریٹ نے اپنے ملزم کا بیان قلمبند کرنا چاہا جس کو مترجم کی ضرورت نہ ہو، اس کے بعد تو زمین
آسمان بالکل بدل گیا، اگرچہ ہمیں خود علم نہیں کہ یہ تبدیلی رات میں کیوں ہو گئی خود عدالت ہی نے توہین کی، کچلو کا بیان جو بالکل میر
بیان کی ہی طرح تھا اس کے پہلے جملے پر اعتراض کیا گیا اور مجسٹریٹ نے اُسے قلم بند نہ کیا اس کے بعد شنکر اچاریہ سے اصرار کیا گیا
وہ بیان دینا چاہتے ہیں تو کھڑے ہوں۔ شنکر اچاریہ نے کہا کہ مذہب کی وجہ سے میں ایسا نہیں کر سکتا۔ ان وجوہ سے میرے اور
مجسٹریٹ کے درمیان بات نے طول پکڑا۔ اس ردو قدح میں کوئی جذبہ نہ تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ آیا کہ وہ ایسے مقدس
مذہبی شنکر اچاریہ ایسی حیثیت والے شخص سے اصرار کرتا ہی رہے گا کہ وہ قانونی عدالت کے اصول کا احترام کریں حالانکہ
خود اب جس چیز کو وہ مقدس سمجھتا رہا ہے تذلیل کر رہا ہوں، جب کہ وہ قانونی عدالت کا اس قدر احترام کرتا ہے تو کیا خدا پر اُس
کا ایمان نہیں ہے؟ جو کچھ اخبارات میں شائع ہوا ہے وہ صرف استفہام کا حصہ ہے کیا خدا پر تمہارا ایمان نہیں ہے؟ میرے
اس اپیل کا جو اُس نے جواب دیا ایک نہایت ہی خراب لہجے میں حکم تھا کہ میں بیٹھ جاؤں لیکن جب میں نے اس حکم کی تعمیل سے انکار کیا
تو میں نے ہرگز بھی نہیں کہا تھا کہ مجھے دیکھنا ہے کہ تم کیا کر لوگے؟ میں نے تو یہ کہا تھا کہ تم طاقت استعمال کر سکتے ہو لیکن ایسا کو
قانون نہیں ہے جس کے تحت میں کوئی ملزم بیٹھ جانے کے لئے مجبور کیا جا سکے، بیچارے شوکت نے تو مجسٹریٹ کو ملائم کرنے
انتہائی کوشش کی اور یہ درخواست بھی کی کہ میرے دوران بیان میں مداخلت نہ کی جائے لیکن مجسٹریٹ نے صاف طور سے
ارادہ کر لیا تھا کہ گزشتہ روز جو میں نے بیان دیا تھا اس کی طرح اب کوئی ایسی بات نہ ہو گی حامیان موالات مع دیگر حاضرین کے
ہو سنیں گے بھی نہیں، جب مولانا حسین احمد صاحب نے اپنا بیان دینا شروع کیا تو نہ عدالت کے مترجم نے اس کا ترجمہ کی

(کیوں کہ وہ اپنی ناقابلیت کا اعتراف کر چکا تھا کہ وہ قانون اسلام کی تفسیر کا ترجمہ نہیں کر سکتا) اور نہ اس امر کی کوشش کی گئی کہ جو کچھ مولانا صاحب فرما رہے ہیں اس کو سمجھا جائے، کچھ نہ لکھا گیا۔ یہ بھی کافی نہ سمجھا گیا۔ اس کی لاپرواہی کافی گستاخی تھی لیکن اس پر بھی اس نے ایک یا دو مرتبہ براہ راست توہین کی، مثلاً یہ کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام قرآن یہاں پڑھ دیا جائے مولانا نثار احمد صاحب کے بے حد مختصر بیان کا بھی اچھا حشر نہ ہوا، قانونی کارروائی اور ضروریات کے پورا کرنے کے متعلق بھی مجسٹریٹ اس قدر بے پرواہ تھا کہ میرے باقی ماندہ بیان کے ملنے سے ہی قبل اس نے ہم کو سشن سپرد کر دیا اس بیان کے متعلق خود اس کی ہی خواہش پر میں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ مختصر نویس، ٹائپ کرنے والا بھیج دے گا تو میں تحریری بیان دے دوں گا لیکن اس سب کا مطلب خرافات تھا کیوں کہ دوسرے ہی دن جب کہ ثبوت استغاثہ آدھا بھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ اس نے وکیل سرکار کی درخواست پر جو دو گواہوں کی طلبی کے لئے سمن جاری کرانے کے متعلق تھی، حکم دے دیا کہ کارروائی کو بلا ضرورت طول دینا لاحاصل ہے اور سشن کی کارروائی میں یہ گواہ طلب کئے جائیں تو کافی ہوگا، یہ کیسا تعجب خیز امر ہے کہ ایک مجسٹریٹ کارروائی سے قبل ہی نتیجہ نکال لے اور قبل اس کے کہ تفتیش ختم ہو خود جوڈیشل کمشنر کمرہ دیکھنے کے لئے سشن کی کارروائی کے واسطے دیکھنے کے لئے تشریف لاتے ہیں اور وکیل استغاثہ سے اس امر میں گفت و شنید کرتے ہیں۔ میں نے عدالت سے کہا کہ آپ نے بڑھئیوں کو بھی اسی طرح تختے تیار کرنے کے لئے حکم دے دیا ہوگا، جب کبھی اسلامی قانون کا حوالہ دیا جاتا تھا تو یہ بات مجسٹریٹ کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتی تھی اور وہ کہہ دیتا تھا کہ یہاں ہمیں فتووں سے بحث نہیں ہے شوکت نے اس سے کہا کہ تم جو یہ مجھ سے حقیر سی باتیں دریافت کرتے ہو اس سے فائدہ کیا ہے، مجھ سے تو یہ پوچھو کہ ایسے واقعات کے متعلق اسلامی قانون کیا کہتا ہے، لیکن سب بیکار رہا تھی کہ خود شوکت بھی زیادہ عرصے تک مقابلہ نہ کر سکا۔ او . . . . . و . . . . وہ تمام متبرک نمائش (کیسی عجیب تھی) لیکن آپ یقین جانیے کہ جب یہ تفتیش ختم ہو چکی اور مجسٹریٹ نے کچھ عرصے کے لئے علیحدگی اختیار کی تو وہ ایک مرتبہ اور نئے آدمی کے روپ میں دکھائی دیا، دوسرے مقدمے میں جو شوکت کے اور میرے خلاف تھا وہ پھر ویسا ہی انسان نظر آتا تھا جس طرح کہ وہ تیسرے روز تھا، میں نہیں کہہ سکتا کہ اس نے پھر یہ روپ کس طرح اختیار کیا، لیکن آپ آخر روز کے اس واقعہ سے عدالت کی اصلی حالت کا (جس میں ملزمین بھی شامل ہیں) خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وکیل استغاثہ گھبراہٹ ہی میں دوڑا ہوا میرے پاس آیا اور دریافت کرنے لگا دیکھا آپ عدالت میں پھر تشریف لے جائیں گے ایک گواہ نے غلط اظہار دئیے ہیں اور میں اسے پھر طلب کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس پر راضی ہو گیا اور میں نے کہا کہ جس طرح آپ کی مرضی ہو، جب سی آئی ڈی رپورٹر نے پھر حلف ادا کیا کہ وہ جو کچھ اظہار دے رہا ہے میری تقریر ہے تو میں نے بہ خندہ پیشانی مجسٹریٹ سے کہہ دیا کہ میں اپنے اس حق سے دست بردار ہوتا ہوں کہ گواہ پر دروغ حلفی کی بنا پر استغاثہ دائر کروں، حالانکہ اس نے اپنے پہلے بیان میں ایک غیر دستاویز کو میری تقریر کا ہونا بیان کیا تھا اس پر مجسٹریٹ نے خوش ہو کر میرا شکریہ ادا کیا حقیقت تو یہ ہے کہ ہم نے مجسٹریٹ کو ہمیشہ اضطراری حرکتیں کرنے والا انسان پایا اور جس روز چیلنج ہوتی ہے اس روز اس سے کہا تھا کہ میرا ہم وطن ایک ایسے غلیظ کام کے لئے مصروف ہو لیکن جس روز بیان دیا ہے اس کے بعد وہ سنجیدہ اور غیور بن گیا، میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت جن لوگوں سے اس کو اطاعت شعاری کی داد ملنے کی توقع تھی انہوں نے اپنے غصے کا اظہار کیا کہ وہ

تاریخی شاہی مقدمے کو ضائع کر رہا ہے جس کے متعلق ارادہ تھا کہ "انصاف" کا مظاہرہ "جدید اصلاحات" کے تحت میں ہو، حالانکہ وہ قانون اور دیگر کارروائیوں کی توہین کر چکا تھا، یہی وجہ ہے کہ الہ آباد سے راس السٹن اور ایک عالم اس حالت کو ترقی دینے کے لئے آرہے ہیں اور ایک قابل مترجم لاہور سے آرہا ہے لیکن یہ پوری کارروائی ایک تماشہ تھا اور کوئی بات اسے ترقی نہیں دے سکتی۔ ہم اپنے متعلق یہ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ہمارا مقصد نہ تو عدالت سے مقابلہ کرنا تھا اور نہ شرارت ہے ساتھ ہی اس کے ہم حیوانوں کی طرح گونگے بھی بننا نہیں چاہتے ہیں اور عدم تشدد کا مفہوم جہالت کبھی نہیں تھی تشدد ذمہ دار ہے اور ہر مسلمان فیصلے کے دن آنکھیں کھول لے گا جب کہ تشدد کے صحیح حدود خود اس کے اپنے ذاتی مقدمے میں قائم ہوں گے لیکن عدم تشدد کی ذمہ داری اس سے بھی زیادہ ہے اور وہ میں دیکھتا ہوں کہ اس کے مرید اس کے اطاعت شعار غلاموں کو دھوکے میں ڈالے ہوئے ہیں، جو بزدلی کی حدود میں آتا ہے، اچھا اب رخصت! دیوی داس اور دوسرے عزیزوں کو پیار! اور ... کی خدمت میں سلام نیاز، وہ چک ڈنر خلافت کمیٹی میں بھیج دینا چاہئے، میری والدہ اور اہلیہ کو مالی امداد کی ضرورت نہیں، ہم تو ایسے خطرناک فقیر ہیں کہ اپنے مقصد کے لئے ہر چیز ہضم کر سکتے ہیں۔ آپ کی محبوب اور زبردست شخصیت کو ہمارا اسلام۔ (خط کی عبارت صاف نہ تھی بجنسہ نقل کردی گئی) مرتب۔

شیطان کی چالوں سے اب ہو گئے سب واقف

اب ہوں گی الم نشرح ملعون کی سب گھاتیں

بیٹھا ہوا توبہ کی تو خیر منایا کر

ٹلتیں نہیں یوں جو ہر اس دیس کی برساتیں!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۱ اپریل ۱۹۳۰ء

دار الخلافت۔ لولین۔ نزد بائیکا برج
مزگاؤں بمبئی

برادرم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

آپ کے تین کارڈ اور آج ہی جب کہ آپ کو عریضہ لکھنے والا تھا، ایک لفافہ، یہ سب مجھے موصول ہو گئے۔ چوں کہ لکھنے پڑھنے کی اجازت نہیں ہے، اس لئے ارادہ کیا تھا کہ جب گلنار کی شادی کی تاریخ مقرر ہو جائے گی تو آپ کو بلالوں گا اور بلا لکھے پڑھے گفتگو میں سب کچھ کہہ دیا جائے گا، مگر گلنار کی شادی کی تاریخ شعیب کے اور ہم سب کے رفیق شفیق عبدالرحمن صدیقی (یا اسد بھی) کی ولایت سے آمد پر موقوف ہے اور متعدد تاروں کے تبادلے کے بعد وہ یورپ سے ۷ را پریل کو توچل پڑے مگر زیارت روضہ پاک اور حج بیت اللہ کے بعد ہندوستان پہنچیں گے، اور ہم سب اسی امید پر جی رہے ہیں کہ وہ ذوالحجہ ہی کی کسی تاریخ کو دہلی پہنچ جائیں گے کیونکہ محرم میں شادی نہ ہو سکے گی اور صفر میں حمیدہ مرحومہ کا انتقال ہوا تھا، وہ زمانہ بھی ناموزوں ہوگا یوں تو کون عبدالرحمن کے حج سے خوش نہ ہوگا بالخصوص جب کہ ان کی صحت بالکل غارت ہو گئی ہے، اور وہ متعدد امراض میں گرفتار ہو گئے ہیں اور سخت تکالیف اور دردوں میں مبتلا ہیں۔ لیکن ہم سب چاہتے ہیں کہ گلنار کی شادی جلد سے جلد ہو جائے اور صرف عبدالرحمن ہی کی وجہ سے دیر لگ رہی ہے، ورنہ مارچ ہی میں عقد کر دینے کا خیال تھا۔ خط اب تک نہ لکھنے کی وجہ اب میں نے بیان کر دی، مگر اب خط لکھ رہا ہوں تو باوجود آنکھوں کی بصارت اس درجہ تک کھو بیٹھنے کے جی نہیں مانتا کہ مفصل خط نہ لکھوں اور سب باتوں کا جواب نہ دوں اور کچھ شکایت بھی نہ کروں جو ایام سرما میں دل کو جلا رہی ہے۔

پہلے اسراف کے متعلق سن لیجئے (مولانا کو کسی قسم کا الزام دینا ہرگز ہرگز مکتوب الیہ کا مقصد نہ تھا۔ وہ اس کی جرأت کر سکتا تھا، مولانا کی مالی ابتری اور اولوالعزمی کو دیکھ کر محض مخلصانہ نیاز مندی کی بنا پر چند کلمات ادب کے ساتھ عرض کر دیے گئے تھے یہ سب اُس کا جواب ہے) اب میرے پاس ہے ہی کیا جو گلنار کی شادی میں اسراف کروں گا۔ برادرم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے پہلے بھی ان رسوم میں اسراف سے کام نہیں لیا تھا۔ زہرہ اور آمنہ مرحومہ کی، نہ ان دو بچیوں کی کبھی کوئی رسم ادا کی جو اس اسراف کا الزام مجھ پر لگ سکتا۔ چونکہ نہ عقیقہ میں، نہ بسم اللہ میں، نہ نشرح میں نہ منگنی میں کوئی رسم ادا کی تھی اور درحقیقت اس زمانے

کا اکثر حصہ قید و بند میں گزرا تھا، رسم ادا بھی کس طرح کرتا۔ شرکت ...
طرح کرنا چ رونگ۔ ہوا ہو یا سب گشت ہوئی ہو، یا کسی اور طریقہ پر برات نکلی ہو۔ جب سے پہلی دو بچیاں پیدا ہوئی تھیں، ان
ماں عورتوں کے طریقہ پر ان کے لئے کچھ نہ کچھ میری نہایت ہی محدود تنخواہ میں سے بنائی یا خریدتی ہی رہتی تھی، اور وہ بھی ن
نہ تھا بلکہ معمولی روزمرہ کے استعمال کے کپڑے اور برتن بھانڈے، جب میں اکتوبر ۱۹۲۰ء میں یورپ سے واپس آ
ایک لڑکی ۸ ا کی تھی دوسری ۱۷ سے کچھ ہی کم ہوگی میں تو ایک ہی کا نکاح کرنا چاہتا تھا اور اُس کا بھی اس وقت نہیں۔ لیکن م
بیوی نے سب انتظام میرے ولایت سے آنے سے قبل ہی کر لیا تھا، اور انہوں نے کہا کہ تمہارے قید و بند کا اب ت
پھر آگیا ہے میں تنہا دو جوان لڑکیوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اپنے سر لینا نہیں چاہتی، دو مسلمان نوجوانوں کو اس ذمہ د
میں شریک کرتی ہوں، آمنہ کی عمر ابھی اٹھارہ کی نہیں ہے جس سے قبل تمہارا ارادہ کسی لڑکی کے نکاح کا نہ تھا، لیکن اس
ہسٹریا کا مرض ہوگیا ہے، اور حکیم اجمل خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ نکاح کرنا ہی بہترین علاج ہے۔ د
اتنا روپیہ کس کے پاس ہے کہ ہر سال ایک نکاح کیا جائے میں ان دلائل سے قائل ہوگیا اور نکاحوں کی اجازت د
مجھ کو جامعہ ملیہ کے آغاز کے باعث ایک منٹ کی فرصت نہ تھی اس لئے نکاح سے دو تین روز پیشتر جہاں داخل آکر مرا
میں معظم صاحب اور عبدالسلام اور مسعود کے مکانوں میں بیٹھ رہا۔ سوائے مولانا عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ کے کسی کو بھی مدعو
انصاری وغیرہ دہلی سے بلا دعوت کے آگئے اور کچھ دے ہی گئے۔ مہمانوں کو معمولی کھانا کھلایا گیا۔ صرف رامپور سے
آنے پر وہی رسم کا پلاؤ زردہ، قلیہ و قورمہ کھلا دیا گیا جو بظاہر نکاح کے کھانے کے لئے اسی طرح ضروری ہے جس
عیدالفطر کے لئے سویاں اور شب برات کے لئے حلوے۔ میں نے اس شادی میں کوئی حصہ بجز شرکت کے لئے نہیں
اس لئے مجھے حق بھی نہ تھا کہ بیگم صاحبہ سے جن کے حسن انتظام کے ہم سب قائل ہیں، کچھ کہتا۔ یہ تھی میرے گھر کی پہلی رسم
مرحومہ اور والدہ ماجدہ مرحومہ کی موتیں دوسری اور تیسری رسم تھیں، اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اسراف سے اکرام لیا درح
کوئی رسم ادا نہیں کی گئی اور جو کچھ کی بھی گئی تو خیرات نقد کی گئی اور جمعیۃ خلافت وغیرہ کی نذر کر دی گئی، یا محلہ کی مسجد میں برت
کا انتظام کر دیا گیا جو الحمدللہ اس وقت تک جاری ہے۔ آمنہ کا سارا زیور خلافت کو دے دیا گیا، یہی بڑی خیرات تھی چوتھی
مرحومہ کی شادی کی تھی جو بڑی دو بہنوں کی تقریباً آٹھ برس بعد ہوئی۔ اس کے لئے بھی باوجود ہماری قید و بند کے میری بیوی
کچھ نہ کچھ کر ہی لیا تھا، مگر وہ انہیں کافی معلوم نہ ہوا، اور نہ معلوم مرحومہ کو اپنی آنے والی موت کا پہلے ہی سے کچھ اندیشہ
(اور ہو بھی تو کیا عجب ہے کہ تین سال سے حرارت اور درد گردہ میں مبتلا تھی، اور ۱۹۲۷ء میں تو اسے دوبارہ پہاڑ پر
جانا پڑا تھا، اور وہاں بھی بخار آگیا تھا، اور حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور انصاری دونوں کا اصرار تھا کہ شادی کے
نسوانی علاج ہو سکے گا۔ کیونکہ اس نے گھر میں آئی ہوئی لیڈی ڈاکٹر کو فیس دے کر امتحان اور معائنہ کے بغیر رخ
دیا تھا) خود مرحومہ نے کسی نہ کسی طریقہ پر اپنی ماں پر ظاہر کر دیا تھا کہ وہ دھوم دھام چاہتی ہے۔ میرے پاس کچھ
ایک صاحب نے دسمبر میں تین سو روپے دئے، مدراس کانگریس میں اُسی کی عمدہ کھدر خرید لی تھی اور ایک دوس
دوکان سے چینی کے برتن اور گلاس وغیرہ قرض لے لئے تھے اور بس۔ مگر اس کی ماں نے اپنے بھائی معظم کو لکھا ک

ے کر نہیں کے ۲۲ ہزار میں یہاں تک ایک بار کوئی دو ہزار کو پیہ اشاعہ کر کے نکال کے لئے زمین خریدنے کے لئے
ہے (جواب تک یوں ہی پڑی ہے اور ایک بار ۲۶ء میں اپنے اور میرے حج کے لئے دو ہزار لئے تھے - اب انہوں نے
ن ہزار معظم کو لکھ کر منگوائے اور ساری خرید و فروخت خود کی اس بار چونکہ ماجد (ماجد علی خاں) جن کے ساتھ یہ شادی ہوئی تھی)
ی مشکلات میں گھرے ہوئے تھے، اس لئے رامپور سے بھی سب عزیزوں کو نہ بلایا گیا۔ معظم کی بیبیاں اور میری بہن اور
وکت صاحب کی بچیاں ہی شریک ہوئیں، باہر سے بھی کسی کو مدعو نہیں کیا گیا، البتہ ایک شب کو دہلی سے کوئی سو پچاس احباب
کھانے پر مدعو کر لیا گیا، یہی اسراف ہوا تھا۔ یا مرحومہ کے لئے کچھ کپڑا لیا گیا تھا۔ پہلے اسراف کا کفارہ یہ کیا گیا کہ جامعہ ملیہ کو
سو اجمعیۃ خلافت اور جمعیۃ العلماء وغیرہ کو چند سو نقد دے دئے گئے۔ دوسرے اسراف کا کفارہ یہ کیا جا رہا ہے کہ مرحومہ کے
رے اور برتن بھانڈے غریب لڑکیوں کو اُن کے عقد نکاح کے موقعوں پر دئے جا رہے ہیں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ گلنار کی
ادی کی مجھے سب سے زیادہ خوشی ہے، کہ شعیب جیسے صالح مسلمان کے ساتھ، خاندان کی رسم کو توڑ کر رشتہ جوڑا جا رہا ہے اور
ا اس کی عمر دراز کرے، توکل تو خدا ہی پر ہے، لیکن اب اپنی محنت کا خیال کر کے کسی قدر مطمئن ہوں، کہ اُس رزاق حقیقی
ے جو مسبب الاسباب ہے میری بیوی اور بچیوں کے لئے ایک یار و مددگار بھی پیدا کر دیا۔ مگر اب خوشیاں منانے کی ہمت
نہیں۔ دو جوان لڑکیوں کے نکاحوں کے اتنے جلد بعد ان کا انتقال ہو گیا، کہ شادی و خانہ آبادی کے نام سے ڈر لگتا
ہے۔ میں نے جو کچھ اسراف کیا ہے وہ والدۂ مرحومہ اور آمنہ مرحومہ کی قبروں کے بنوانے میں کیا ہے۔ کوئی قبہ نہیں بنوایا،
سینے پر سوائے خاک اور گھاس کے کچھ نہیں، مگر ایک جگہ سنگ سبز کا فریم سا بنوا دیا ہے اور ایک جگہ سپید سنگ مرمر کا اور
ح مزار کو خود DISGN کیا ہے۔ آمنہ کی قبر پر "پیام محبس اور دعائے اسیری" کا ایک شعر کندہ کرا دیا ہے ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب تھی، لیکن اس کو
نہیں منظور، تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

ندہ کی قبر بھی سپید سنگ مرمر کی اسی طرح تیار کرائی جا رہی ہے اور اُس پر اسی زمانے کے کہے ہوئے یہ دو شعر انشاء اللہ
ندہ ہوں گے ؎

ہوا محسوس جب سے ہے خوشی تیری خوشی اپنی — نہ اپنی موت موت اپنی نہ اپنی زندگی اپنی
کبھی چھوڑا نہ دامن کو ترے پھر تو ہی بتلا دے — اسے بیچارگی تیری کہوں یا بے کسی اپنی

ر کے سوا اب بھی چارہ نہیں، مگر اب یارائے ضبط کم ہے تو کیا کروں ؎

تو نا گفتہ دانی، گفتن چہ سود

ح پڑھانے کا مسئلہ میرے اختیار کا نہیں ہے (مکتوب الیہ نے لکھا تھا، کہ نکاح حضرت مولانا حسین احمد صاحب سے
ھوایا جائے، تو بہت ہی مناسب ہے۔ آگے اس کا جواب ہے) شعیب کی جو مرضی ہوگی کیا جائے گا، گو میرا جی تو یہی چاہتا
ے کہ میرے صاحب السجن اور آپ کے پیر و مرشد ہی نکاح پڑھائیں، بہر حال انشاء اللہ مولانا کفایت اللہ صاحب
در جمعیۃ علمائے ہند نکاح نہ پڑھائیں گے۔

محمد علی۔

سارد ابل اسمبلی میں منظور ہو رہا تھا، جس سے ایک خاص عمر کے قبل لڑکیوں اور لڑکوں کی شادی جرم قرار پارہی تھی۔ مکتوب ال
نے لکھا تھا کہ اتنے زبردست فتنہ کا مقابلہ آپ ہی کی قیادت میں کیا جا سکتا ہے، آگے اس کا جواب ہے اور اس کے ضمن میں
جمعیتہ العلماء سے اختلاف کا ذکر بھی کافی تفصیل سے آجاتا ہے۔ بعض محترم کارکنان جمعیتہ کا تذکرہ جس لب ولہجہ میں ہے۔ عا
حالات میں اس کی اشاعت مناسب نہ تھی۔ لیکن ان معرکتہ الآرا جلسوں سے متعلق کم از کم ایک بیان خود مولانا کا لکھا ہوا
پبلک کے سامنے آجانا ضروری تھا۔ لہجہ کی تلخی اور خشونت ایسے موقع پر نظر انداز کر دینے کے قابل ہے۔ (مولانا عبدالماجد ص

بھائی، تم اگر نہ بھی لکھتے تب بھی میں شریعت حقہ کے احترام کو قائم رکھنے کی خاطر ان مفسدوں کا مقابلہ ضرور کرتا، جو اسمبلی میں
جا کر اپنے تئیں مصلحین کہتے ہیں انہیں پر سورۂ بقرہ کی وہ آیات صادق ہیں کہ واذا قیل لہم لاتفسدوا فی الارض . . . . فما ربحت
تجارتہم وما کانوا مہتدین۔ میں نے پربھنی (علاقہ نظام) ہی میں ایک لمبا چوڑا برقی پیام تیار کرنا شروع کر دیا تھا، مگر ٹائپسٹ
نہ ملنے سے، اور خود علیل ہونے کے باعث اُسے ٹائپ کر کے بھجوانے نہ پایا تھا کہ اندور میں معلوم ہوا کہ کونسل آف
اسٹیٹ نے بھی شاردا ابل کو پاس کر دیا۔ تب تو خود ہی بیٹھ کر ٹائپ رائٹر ہی پر وائسرائے کو ایک طول طویل اور سخت خط لکھ
گروہ بدبخت منظوری دے ہی چکا تھا۔ اور عازم یورپ ہو گیا۔ میں بھوپال میں تھا کہ دہلی کے جلسے کی اطلاع ملی اور میر
پاس جمیل میاں کا تار آیا کہ داعیوں میں مفتی صاحب کا، ان کا اور میرا نام ہوگا، اجازت درکار ہے، ہفتہ کو تار ملا۔ ارجنٹ تا
کے دام کہاں سے لاتا، ارادہ کیا کہ پیر کو معمولی تار دے دوں گا، مگر بھول گیا حالانکہ اُس دن کا خط بھی پیر تک پہنچ جاتا۔ لیکن
کو بمبئی سے گھومتا گھامتا احمد سعید کا خط آیا، کہ آپ کا پتہ معلوم نہ تھا اس لئے خلافت کی معرفت لکھا جا رہا ہے۔ بہر حال
میں جواب دینا بھول گیا۔ مگر جلسے کی شرکت کے لئے دو دن پہلے ہی دہلی پہنچا۔ احمد سعید تعیین عمر کی کمیٹی کے سامنے شہا
کر چکنے کے بعد خود ہی میری جگہ داعی بن بیٹھے تھے، میں آتے ہی دو بار ان کے اور مفتی صاحب کے گھر گیا اور ایک بار دفتر جمعیتہ
مگر نہ ملے۔ دوسرے دن جمعیتہ کا جلسہ تھا جس میں سیاست (سطحی) بہت کچھ تھی، مگر مذہب کا قطعی فقدان تھا۔ شام کو دوسر
جلسے کے متعلق جمیل میاں کے ہاں مشورہ تھا، مگر مفتی صاحب اور احمد سعید دیر میں آئے اور لوگ مشورہ کرتے رہے۔ ا
سب کی رائے یہ تھی کہ میں اُس جلسے کا صدر بنوں، وائسرائے کو ایک وفد کے ذریعے سے الٹیمیٹم دیا جائے، مسلما
اس ایکٹ سے مستثنے نہ کئے جائیں تو کانپور میں کانفرنس منعقد کی جائے اور تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم پر عمل کر
ہر کلمہ گو کو جو اس مداخلت فی الدین سے بیزار ہو دعوت دی جائے اور اس مصیبت پر خدا کا شکر ادا کر کے انتشار و
افتراق کو دور کیا جائے۔ اس لئے باوجود میرے صدر جمعیتہ خلافت ہونے کے میں نے صرف خلافت کمیٹی کا جلسہ طلب
نہ کیا کیونکہ وہ "معتدلین" نہ آتے، نہ شیعہ اور قادیانی شریک ہوتے، اتنے میں مفتی صاحب اور احمد سعید آ گئے پ

...ت کے متعلق پوچھا گیا کہ آپ کے نزدیک کس کا صدر ہونا مناسب ہوگا۔ مفتی صاحب کا جواب بے حد عجیب
خود ہی داعیوں میں بھی شامل ہیں اور خود ہی فرماتے ہیں کہ "میں اس وقت تک اس کے متعلق بالکل خالی الذہن ہوں۔
سعید نے اس خلائے محض کے پر ہونے کا بھی ثبوت دے دیا اور کہا کہ "مگر یہ جلسہ تو جمعیۃ العلماء کا بلایا ہوا ہے،
مستقل اور دوامی صدر اس کا بھی صدر ہوگا"۔ تب جا کر چند دہلی والوں نے جو اس وقت موجود تھے کہا کہ جلسہ تو اہل دہلی
کا کردہ ہے۔ جمیل میاں بھی داعی ہیں، اہل دہلی نے مہمانوں کے لئے خود ہی چندہ کیا ہے، آپ کو اس لئے دے دیا
جمعیۃ علماء کی کمیٹی منتظمہ کا بھی جلسہ ہونے والا تھا، اپنے مہمانوں کے ساتھ ساتھ ہمارے مہمانوں کا بھی انتظام کر دیجئے گا
دعوت نامے منگا کر دیکھے گئے تو صاف درج تھا کہ یہ جلسہ جمعیۃ کے جلسے سے بالکل الگ تھا، یہ دعوت نامہ خود مفتی صاحب
کردہ تھا۔ مگر احمد سعید صاحب کا تحریر کردہ دعوت نامہ جو جمعیت والوں کو بھیجا گیا تھا اس میں اسے جمعیت ہی کا جلسہ بتایا
۔ اس تفساد و تباین کا اقبال انہوں نے بھی کیا۔ بہر حال میرا نام صدارت کے لئے پیش کیا گیا اور بلا عذر تسلیم کیا گیا،
ں سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ دونوں علمائے کرام اسے کرہاً قبول کر رہے ہیں۔ آپ کو نہ معلوم وہ گندہ قصہ یاد ہے یا
ر ایک ہیجڑا بنیئے کی دوکان پر سے اس کی غیر حاضری میں چنے ٹونگ رہا تھا۔ وہ پیشاب کر رہا تھا۔ پیٹھ پھیر کر دیکھا تو
وہ نظر آیا۔ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ مرد ہے یا عورت، گھبرا کر چیخ اٹھا کہ سارے چنے ٹونگ گیا، سارے چنے ٹونگ
. . . . مفتی صاحب نہ پورے دیندار نکلے نہ پورے دنیادار۔ جب ان سے کہا گیا کہ آپ محمد علی کا نام
ت کے لئے بہ حیثیت داعی جلسہ پیش فرمائیں اور جمیل میاں بہ حیثیت داعی دوئم اس کی تائید کر دیں گے تو فرمایا کہ
اں پیش فرمائیں میں تائید کر دوں گا باوجود سب کے اصرار کے انہوں نے تحریک کرنے سے انکار کیا، مگر تائید کرنے کا
۔ نواب اسمٰعیل خاں نے اس حیرت انگیز انکار و اقرار پر ایک سیدھا سوال کیا کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے، تو کچھ نہ فرما سکے
دیا تو یہ کہ تحریک پر اصرار کیوں ہے۔ اس کا جواب دیا گیا کہ جو سلوک مولانا محمد علی کے ساتھ جمعیۃ العلماء کے جلسے میں حبیب الرحمٰن
نوی نے کیا، اور باوجود ان کے رکن جمعیت اور اس کی انتظامیہ اور اعلیٰ دونوں مجالس کے ________ رکن ہونے
ی تقریر میں کہا کہ میں محمد علی کو تو جمعیت کا رکن ہی نہیں تسلیم کرتا، اور جس طرح مسلم لیگ کے جلسے میں جو گزشتہ اواخر مارچ
انہوں نے لیمیز اللہ الخبیث من الطیب کی آیۂ کریمہ پڑھ کر نہرو رپورٹ کے مخالفین کو "خبیث" کا لقب عطا فرمایا تھا
انیوں کو "طیب" کا، اور جس طرح مقدم الذکر جماعت کے چلے جانے کے بعد ڈاکٹر محمد عالم کو صدر تجویز کر کے بلا رائے
ئے کرسی صدارت پر بٹھا دیا تھا، اور اسی طرح ایک تجویز نہرو رپورٹ کے متعلق پاس کر لی تھی، اس سے خطرہ ہے
کے لئے لوگوں کے آتے ہی حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور ان کے بھائی نعیم خود آپ کا نام صدارت کے لئے پیش کر
ے، اس لئے ضرورت ہے کہ آپ خود ہی بہ حیثیت داعی جلسہ محمد علی کا نام پیش فرمائیں تاکہ وہی بے لطفی پیدا نہ ہو جو
دمیں جمعیۃ العلماء کی صدارت کے لئے ان کا نام پیش کئے جانے کے باعث کانپور کے سالانہ جلسہ جمعیۃ العلماء کی مجلس
یہ کو آج تک نصیب ہو رہی ہے . . . . اس کے بعد انہیں کی طرف سے یہ مسئلہ پیش ہوا کہ صدر کا انتخاب تو
ں جلسے کے ہاتھ میں ہے، تو ان سے عرض کیا گیا کہ یہ کلیہ نہیں ہے، خود جمعیۃ کے سالانہ جلسے کے لئے خلافت کانفرنس،

کانگریس، مسلم لیگ وغیرہ کے لئے پہلے ہی سے انتخاب کر لیا جاتا ہے تاکہ اس قسم کی ناگوار حالت نہ پیدا ہو جو کانگریس کو سورت
میں ۱۹۰۷ء میں پیش آئی تھی دہلی میں جو آل انڈیا مسلم کانفرنس آپ نے منعقد کرائی تھی اس کے لئے آغا خاں کا انتخاب اُن
کے ولایت سے چلنے سے بھی پیشتر کر کے ان کو مدعو کیا گیا تھا۔ آپ لوگ بہ حیثیت داعیان کے انتخاب کر لیجئے، اور
اسی حیثیت سے جلسہ کا آغاز کل صبح فرما کر محمد علی سے صدارت کرائیے یہ معاملہ صرف فتوے دینے کا نہیں ہے، فتوے تو
جمعیتہ العلماء دے ہی چکی ہے، اب مسلمانوں کو اس قانون سے مستثنیٰ کرانے کی تدابیر پر غور کرنے اور ہر عقیدے اور ہر سیاسی روش
کے مسلمان کو متحد و کر کے شریعت کے احترام کرانے کا ہے۔ اس پر مفتی صاحب نے کہا کہ اچھا ہم تینوں داعی اس کا فیصلہ کر
لیں گے کہ محمد علی کا نام میں پیش کروں یا جمیل میاں پیش کریں اور میں تائید کروں۔ چونکہ ہم نے اعلان کر دیا تھا کہ میں اسی شب
کو مسجد جامع میں فلسطین، افغانستان، ساردا بل وغیرہ کے متعلق بالتفصیل تقریر کرنا شروع کروں گا اور دو تین روز تک اس
سلسلہ کو جاری رکھوں گا تاکہ ایک عرصے سے میری دہلی کی غیر حاضری کے باعث اظہار خیالات کا جو موقعہ نہیں مل سکا ہے
وہ مل جائے اور بیاں خلاف توقع صرف صدارت ہی کے مسئلہ پر دیر تک بحث چھڑ جانے کے باعث ہمیں مولانا نثار احمد
وغیرہ کو مسجد جامع کا جلسہ شروع کر دینے کے لئے بھیجنا پڑا۔ اس لئے اب ہم لوگ اٹھ کر مسجد جامع کو چلے گئے، جہاں دہلی کے
مسلم رضا کاروں کی ایک جمعیت نے تین راتوں کے لئے جلسوں کا پوسٹر وغیرہ کے ذریعے سے اعلان اور روشنی وغیرہ کا انتظام
کر دیا تھا اور مفتی صاحب وغیرہ کو جمیل میاں کے پاس چھوڑ گئے وہاں پہنچے تو دیکھا کہ مولانا عبدالحلیم صدیقی ناخواندہ مہمان کی
حیثیت سے بیچ میں کود پڑے تھے اور جمعیتہ العلماء اور مفتی کفایت اللہ صاحب کی فضیلت میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے سے وعظ دے
رہے تھے اور مولانا نثار احمد صاحب کو لب کشائی کا بھی موقعہ نہ دیا تھا۔ دوسرے دن بجائے مفتی صاحب کے جلسے کا بہ حیثیت
داعی کے آغاز کرنے کے احمد سعید نے آغاز کر دیا اور یعقوب کی اور مولانا عبدالحلیم کی تقریریں ہونے لگیں، جس کے باعث
یوں ہی فضا مکدر ہو گئی۔ اب حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے مفتی صاحب کا نام پیش کر دیا۔ نعیم نے بھی اسی طرح کی تقریر کی (میں اب نہیں
کہہ سکتا کہ کس کس نے تقریر کی، مگر جہاں تک ایک مریض کا حافظہ کام دے رہا ہے لکھ رہا ہوں) بالآخر خواجہ غلام السبطین نے جو
انتظامات جلسہ اور دعوت ناموں کے اجراء میں احمد سعید کے ساتھ شریک مقرر کئے گئے تھے رات کا فیصلہ مفتی صاحب کو یاد
دلایا اور مفتی صاحب نے مبہم طریقہ پر اس کی ایک حد تک تصدیق کی مگر یہ نہ کہا کہ یہ ہم طے کر چکے ہیں کہ بہ حیثیت داعی ہم خود ہی
صدر کو منتخب کریں گے۔ کہا تو یہ کہ مجھے اس وقت تک فرصت نہیں ملی کہ جمیل میاں سے طے کرتا کہ وہ محمد علی کا نام پیش کریں
اور میں تائید کروں، یا میں خود تحریک کروں اور وہ تائید کریں۔ اب بحث اور بھی چھڑ گئی اور گلابی وہابیوں کی تائید ایک پکے وہابی
مولانا ابراہیم سیالکوٹی نے اس طرح فرمائی کہ خود مجھ سے اپیل کیا کہ میں اپنا نام واپس لے لوں۔ میں نے مجبور ہو کر ایک تقریر کی اور
اُس کے آخر میں یہ کہہ کر اپنا نام واپس لے لیا کہ مجھ پر اس اپیل کے خلوص کا تو مطلق اثر نہیں ہوا، مگر جو حالات پیش آئے ہیں اس
کے بعد اس جلسے کی صدارت کرنا میں اپنی توہین سمجھوں گا۔

(۶)

برادرم۔ جو ذہنیت ان دینداروں کی اور جو ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے لفظ لفظ سے ظاہر ہو رہی تھی، اسے اس طرح ایک ایسے معاملے میں بھی دیکھ کر جس میں ہمیں اپنی شریعت کی حرمت برقرار رکھنے کے لئے غیروں کو بھی حاملین شریعت کی افکار اور اُن کے اعمال سے متاثر کرنا تھا، اور ہر عقیدے اور طبقے کے مسلمانوں کے اس امر میں اتحاد و اتفاق کو عالم آشکارا کرنا تھا، میرا دل رو رہا تھا، میں نے جمعیۃ العلماء کی صدارت کا کبھی بھی خیال نہ کیا تھا، مگر جب مجھے معلوم ہوا کہ ایک خاص جماعت کو اس پر اصرار ہے اور بلا مجھ سے استمزاج کئے ہوئے انہوں نے چند ماہ پیشتر ہی میرا نام مجلس استقبالیہ کی طرف سے بھجوا دیا تھا، اور اُس کے بعد سے علمائے کرام میں عجیب عجیب ریشہ دوانیاں ہو رہی ہیں، تو میں نے کانپور سے خط آنے پر اور مجلس استقبالیہ کے اصرار پر صرف اس کا وعدہ کیا تھا کہ خود انکار نہ کروں گا اور نہ خود کوئی کوشش کروں گا، اگر منتخب ہو گیا تو مسلمانوں کی مذہبی اصلاح اور جمعیۃ کی از سر نو ترتیب کے متعلق جو عرصہ دراز سے میرے خیالات ہیں انہیں بصد عجز و ادب جمعیت کے سامنے پیش کروں گا مگر جو کارروائی کہ مراد آباد میں ہوئی اور اس سے پیشتر جو مضامین اور خطوط الجمعیۃ میں شفیع داودی اور شوکت صاحب کے خلاف صوبۂ بمبئی کی جمعیۃ العلماء کے جلسہ کی صدارت کے بارے میں بطور پیش بندی کے شائع کئے گئے، اور جس طرح کانپور والوں کے ساتھ صریح اور مسلسل بے ایمانی کی گئی اور اب جس طرح بلا حصول رائے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب خود دھکس کر مسندِ صدارت پر جلوہ افروز ہو گئے، اس کے بعد میرے لئے ناممکن ہو گیا کہ ان حضرات سے کوئی توقع اصلاح کی رکھوں جب جلسہ شروع ہو گیا تو میرے پاس متعدد درخواستیں آئیں کہ جلسہ سے ہم سب اٹھ کر چل دیں۔ مگر میں نے انکار کیا اور سب کو روکا تاکہ حکومت کو اور ہنود کو اس نفاق و شقاق کا نظارہ نہ دکھایا جائے۔ سب بیٹھے رہے، البتہ یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ شام کے جلسے میں نہ آئیں گے۔ ہم نے کوئی احتجاج نہ کیا، اور جو بیان اُن تمام واقعات کے متعلق تیار کیا گیا اُس کے حرف حرف کو صحیح اور درست کرنے کے بعد بھی خود میں نے اس کی اشاعت کو روک دیا۔ جن لوگوں نے جمعیۃ العلماء سے استعفے دئے اُن کے استعفوں کو بھی اُس وقت نہ بھجوانے دیا۔ ہماری جماعت نے وائسرے کے پاس جو وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا اُس میں بھی علاوہ مولانا حسین احمد صاحب اور دیوبند کے اکابر کے خود مفتی صاحب کو بھی شامل کیا۔ میں شام کے جلسے میں یوں بھی نہ آسکتا تھا، کیوں کہ علیل ہو گیا تھا۔ مفتی صاحب ان تمام بے ہودگیوں کے بعد اشک شوئی کے لئے میری عیادت کے نام سے تشریف لائے، اور میں نے انہیں ناشتہ کرایا اور وفد میں جانے کے لئے نواب اسمٰعیل خان نے اُن سے کہا اور اُنہوں نے اقرار کیا، مگر دوسرے دن یہ لکھ کر علیحدہ ہو گئے کہ شام کو میر "جماعت"، "جمعیت" نہیں، اس لئے کہ اس نے اس کے خلاف کوئی قرارداد

نہیں کی) نے کہا کہ تم نہ جانا۔ تاہم میں نے ان سے احکام شریعت دربارۂ نکاح حاصل کئے، اور گو مولانا حسین احمد صاحب
اور مولانا عنایت اللہ صاحب کے بیانات نے جو بے حد مفصل اور مرتب تھے، مجھے اس سے مستغنی کر دیا تھا، تاہم میں نے
بار بار مفتی صاحب سے ان کے بیان کا تقاضا کیا اور ان سے باوجود اپنی علالت کے ملنے گیا۔ مولانا حسین احمد صاحب
شاہجہاں پور جا رہے تھے، اور وہاں کئی روز وعظوں میں مصروف تھے، تاہم میرے اصرار پر تشریف لائے اور اسٹیشن سے
سیدھے گورنمنٹ ہاؤس چلے گئے۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب مرحوم نے آنے کا وعدہ فرمایا تھا، مگر مرض الموت نے نہ آنے
دیا تو طیب کو اپنی جگہ بھجوایا۔ لیکن مفتی صاحب اور ان کے حواریوں کا رویہ دیکھئے کہ مولانا عبدالحلیم صدیقی نے ایک تقریر
جس میں ارشاد فرمایا کہ خدارا ہمیں گورنمنٹ کے آستانہ پر سر جھکانے کے لئے نہ لے جائیے، ہم پر رحم کیجئے (حالانکہ احمد سعید
Age of Concent Committee کے سامنے غلط سلط شہادت دینے کے لئے بلا تامل چلے گئے تھے)
گئے سجاد نے ہم پر وائسرائے کی دست بوسی کی تہمت لگائی اور احمد سعید نے بھی الجمعیۃ میں دروغ بافیوں کا عرصہ تک
سلسلہ جاری رکھا (جو حقیقۃً آج تک جاری ہے) آپ کو معلوم ہے کہ مسلمان ہم دونوں بھائیوں کو بے کار سمجھ کر سارا کام ہمیں
چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ مگر یہ سن کر آپ کو بھی حیرت ہوگی کہ مفتی کفایت اللہ صاحب کو اسی جاہل مطلق نے جا کر سوتے سے جگا
تھا اور ہمدرد میں میرا ہی مضمون اواخر مارچ ۲۸ء میں اس بل کے خلاف شائع ہوا تھا اور اسی کو لے کر میں صدر جمعیۃ
کی خدمت میں خود حاضر ہوا تھا، اور اس پر بھی ان کی غفلت کا وہ عالم رہا کہ نہرو رپورٹ کے معاملے میں تو یہ اس کی تائید
در پردہ کوشش کر رہے ہیں مگر شریعت کی حرمت برقرار رکھنے کے لئے انہوں نے سارد ابل کے منظور ہو جانے تک
قدر کم کام کیا کہ نہیں کرنے کے برابر ہے۔ بہر حال اب باوجود بصارت اور اعصاب کی اس حالت کے اور بخار جاڑے
دو تین دن میں میں نے Age of Consent کمیٹی کی رپورٹ پڑھی اور ۲۵ ٹائپ کے صفحات کا تحریری بیان
اور ساری رات اور سارے دن خود ہی جاگ کر اور آرام لئے یا کھانا کھائے بغیر اسے ٹائپ کر کے ایک دن پہلے
کے سکرٹری کو دے آیا۔ مسلمانوں کی قوم میں ایک ٹائپسٹ بھی نہ ملا کہ اس کام کو کرتا۔ تین بجے شام کے یہ بیان وائسرائے
کو ملا۔ بے چارے کو گھنٹہ بھر بھی اس کے دیکھنے کو نہ ملا ہوگا۔ دوسرے دن گیارہ بجے وفد پہنچا۔ جو جواب دیا اس کا
ہمارے تحریری بیان میں پہلے سے موجود تھا، جب اس نے کہا کہ آپ کے بیان پر میں اس وقت تک صرف ایک
نظر ڈال چکا ہوں تو میں نے اس اقبال سے فائدہ اٹھایا اور کہا کہ آج ہم آپ سے جواب لینا نہیں چاہتے، جب
اسے دوبارہ اچھی طرح پڑھ لیں گے تو آخری جواب اس وقت لیں گے۔ چنانچہ ۱۵ نومبر کو باوجودیکہ وہ اسی دن دکن کے
پر جا رہا تھا، ڈیڑھ گھنٹہ اس سے مفصل اور صاف گفتگو رہی، اور وہ قائل ہو گیا کہ ہم اپنے عقائد اسلامی پر قائم
ہوئے اس قانون کو قبول نہیں کر سکتے، گو ہنود کے باعث اپنی مجبوری کا بھی اظہار کیا۔ (اس کو راز ہی میں رکھئے)
ہی دن نواب صاحب بھوپال سے ملا اور کہا کہ اگر محمد علی نے Test case اس بنا پر جیت لیا کہ میں نے جس بل
ہونے سے پیشتر اس کے پیش ہونے کی اجازت دی تھی (جس کے بغیر کسی کے مذہب یا مذہبی رسوم و رواج کے متعلق
مسودہ پیش ہی نہیں ہو سکتا) وہ صرف ہنود کے لئے تھی، تو میرے ہاتھ مضبوط ہو جائیں گے اور مسلمانوں پر اسی کا

ہیں مگر بیچ کے دائرے میں جسے Macula کہتے ہیں ایک چھٹک بھی موجود نہیں ہے اور جو کچھ ہے وہ اسی آنکھ کی بیا
ہے اگر آپ نے لکھنے پڑھنے کا کام جاری رکھا یا تقریر کی تو نہیں کہہ سکتا کہ چند سکنڈوں یا چند منٹوں میں یا چند گھنٹو
آپ بالکل اندھے ہو جائیں۔ آپ کی آنکھ کے لئے کوئی دوا نہیں ہے جو مفید ثابت ہو سوائے اصل مرض کے علاج کے
ذیابیطس ہے اور سال، دو سال کے مسلسل آرام کئے ہیں تو کہوں گا کہ آپ نوکر کو بھی کمرے میں سے نہ پکارا کریں بلکہ ا
کمرے ہی میں بیٹھے رہنے دیں تاکہ اشارے سے بلا سکیں۔ اس لئے کہ اس کو پکار کر بلانے سے بھی آنکھ کے کسی
Blood vessels کے پھٹنے کا اندیشہ ہے اگر Hemorrhage ہو گیا اور خون کی پھٹک آنکھ کے سامنے آ
آپ بالکل اندھے ہو جائیں گے۔ کامل ایک گھنٹے کے امتحان کے بعد ہندوستان کے سب سے بڑے
Specialists کی یہ رائے ہے۔ مجبور ہو کر سب کام چھوڑنا پڑا ہے۔ مگر ڈاکٹر نے جو مزید شرط لگائی ہے کہ تفکرات
دور رکھو اس کا کیا انتظام کر سکتا ہوں۔ بالخصوص اس زمانے میں جب کہ بظاہر ہندوستان اور بالخصوص مسلما
ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے، وہ مسلمان جو ہماری قید و بند سے بھی متاثر ہو کر ہماری منت و سماج
پرہم سے متفق نہیں ہوتے تھے اور انگریزوں کی غلامی ترک کر کے ہندوؤں سے مصالحت کی طرف مائل نہیں ہو
تھے ان میں سے بعض باوجود ہماری آج کل کی منت و سماجت کے ہندوؤں کی غلامی کی طرف جھپٹے چلے جا رہے
اور صرف اس لئے کہ وہ آج ہندوؤں کے پروپیگنڈا سے مرعوب ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ اگر ہندو اس جنگ میں جیت
ہمارا کیا حشر ہوگا۔ اور ان شیاگرہی سورماؤں کو اپنی حفاظت کا سوائے اس کے کوئی طریقہ نظر نہیں آتا کہ علی برادران
کریں ان بزدآزماؤں کو اس کا بھی خیال نہیں کہ وہ ایک مریض پر بھی جوان کا جواب نہیں دے سکتا متواتر حملے کر رہے ہیں
اس کے خلاف گندے سے گندہ اور جھوٹے سے جھوٹا پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ اور لطف تو یہ ہے کہ جاہلین شر
حقہ یعنی علمائے کرام ان بزدآزماؤں کے قائد اور رہنما ہیں اور "الجمعیۃ" کے کالم اس کے لئے وقف ہو گئے
ان جملہ ہائے معترضہ کو میں یہیں ختم کرتا ہوں اور اپنے عریضے کا سلسلہ دوبارہ شروع کرتا ہوں میری بتا
ہوئی تدبیر پر خوب جرح و قدح کی گئی اور جو تدبیریں اور بتائی جا رہی تھیں یعنی شراب کی دوکانوں پر picketing
وغیرہ اس پر بھی غور کیا گیا اور آخر کو یہی طے پایا کہ دہلی میں ہم سب مل کر متفقہ طور پر متذکرہ بالا قسم کا ایک نکار
کرشاردا ایکٹ کی خلاف ورزی کریں اور جب ہم پر مقدمہ چلایا جائے تو عذر پیش کریں۔ اس قانون
مسلمانوں کے خلاف نہیں کیا سکتا۔ اس لئے یہ ہماری شریعت کے خلاف ہے اور ایسے قانون کو مجالس مقننہ
میں پیش کرنے سے پہلے گورنر جنرل سے

(مکتوب اسی مقام پر ناتمام، اچانک ختم ہو گیا ہے۔ اس کے آگے کے فقرے پھر مولانا کے ہاتھ ہیں۔)[77]
برادرم ایک اپاہج بھائی سے جس قدر لکھا یا لکھوایا جا سکا، کیا گیا۔ مگر اتنے دن کے انتظار کے بعد مجھ
کو اس عریضے کو اسی طرح ناتمام بھیج رہا ہوں میری آخری تحریر یہ ہے۔ آخری تحریر بی اماں کے مولد امرد ہے ہیں ۳،
۵ رکوکروں گا۔ براہِ کرم وہاں تشریف لے آیئے۔ کانپور آنے کا وعدہ فرمانے کے باوجود انتظار ہی دکھایا۔

دوسرے بل کے ذریعے سے نہیں ہونے دوں گا۔ میں وائسرائے سے ملنے سے پیشتر مفتی صاحب اور احمد سعید کے سامنے مسجد جامع میں مسلمانوں کو بتا کر گیا تھا کہ کیا کہنے جاتا ہوں اور واپس آکر مسجد جامع میں نماز مغرب سے قبل جو گفتگو ہوئی تھی سب دوہرا دی اور دونوں کو گھر سے بلوا کر انہیں کے سامنے سب کچھ کہا۔ تاہم اُن کی حرکات ملاحظہ ہوں کہ ایک مجلس نامہ بسم تحفظ شریعت بناتے ہیں جس میں نہرو انی جماعت کے حبیب الرحمن لدھیانوی، نعیم اور ظفر علی خاں تک ہیں، لیکن میرا نام تک نہیں۔ ان کی بے سود ہڑتال کی میں نے مخالفت نہیں کی، گو اسے بے سود اور غیر موثر سمجھا، تاہم مجھے بدنام کیا گیا پھر جب اس سے بھی کام نہ نکلا تو جلوس نکالا۔ مجھ سے آکر ملے اور امداد چاہی تو میں نے اس جلسہ میں بھی ان کی صدارت میں تحریک پیش کی۔ گو انہوں نے میری رائے پر عمل نہ کیا اور جلوس کو چیف کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کی کچہری تک نہ لے گئے۔ اس کے بعد ان حضرات کے پاس کچھ نہ تھا۔ میرے گھر آئے۔ میں نہ تھا۔ دوسرے دن میں اسمٰعیل خاں اور شفیع کو لے کر ان کے گھر گیا تو انہوں نے کہا کہ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں؟ تب میں نے وہی تدبیر بتائی جو میں اندر رہی کے قیام میں طے کر چکا تھا کہ اس قانون کی خلاف ورزی کی جائے مگر اس طریقے پر نہیں جس سے شریعت بدنام ہو، یعنی محض خلاف ورزی کی خاطر بلا ضرورت گڈے گڑیا کا بیاہ کرنا، بلکہ جس لڑکے کو جس کی عمر ۱۶ یا ۱۷ سال کی ہو" تونان"، کے باعث نکاح کی ضرورت ہو، اور وہ اس حالت میں فرض یا کم سے کم واجب ہی ہوتا ہو ایک ۱۵ یا ۱۶ برس کی تندرست اور بالغ لڑکی سے اس کا نکاح کرا دینا، یا نابالغہ کا نکاح اس کے ولی کے حکم سے کرانا جب کہ اسے اپنی عمر یا سفر کے باعث اندیشہ ہو کہ اگر وہ مر گیا تو لڑکی یا اُس کا ومتاع خراب لوگوں کے ہاتھ میں پڑ جائے گا، اور اس لئے وہ اس کے سسر وغیرہ کے سپرد کرنا چاہتا ہے، یا ایسی حالت میں جب کہ لڑکی کی ماں زندہ نہیں ہے یا بڑی بہن کی شادی ہونے کے بعد وہ رخصت کر دی جائے گی اور اس کی تربیت کے لئے ساس کے سوا کوئی عورت میسر نہیں ہے، یا ولی اس قدر غریب ہے کہ بچی کی پرورش نہیں کر سکتا، اور سسر کے حوالے کرنے کے سوا چارہ نہیں۔ صرف انہیں حالتوں میں نکاح پڑھوا کر اور رخصت کرا کے سارداایکٹ کی خلاف ورزی کی جائے۔

(یہاں تک مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے آگے خود لکھنا ممکن نہ ہوا، آگے کسی اور سے لکھوایا ہوا ہے۔)

یہاں تک ۱۱ اپریل کو لکھا جا چکا تھا، مگر اتنا لکھنے کے بعد اس قدر تھک گیا کہ دوسرے دن کے لئے مجبوراً ملتوی کرنا پڑا۔ لیکن دوسرے دن آنکھوں کے Eye Specialist کے پاس گیا اور اس نے بہت محنت کے ساتھ آنکھوں کا معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ بائیں آنکھ تو بالکل جا ہی چکی ہے اس سے بالکل مایوس ہو جانا چاہئے۔ لیکن سیدھی آنکھ کی حالت بھی نہایت خطرناک ہے۔ معلوم ہوتا ہے آپ نے حال ہی میں نگاہ پر زیادہ زور ڈالا ہے یا جوش کی حالت میں کسی سے باتیں کی ہیں اس لئے کہ خون کی ایک دو پھٹکیں تازہ نظر آ رہی ہیں۔ غالباً یہ اسی عریضے کے متعلق ڈاکٹر کا خیال تھا ایک اور خط کے متعلق جس کی نقل آپ کو بھیج رہا ہوں جو میں نے سپرد کو خود ہی بیٹھ کر مسلسل چھ گھنٹے میں ٹائپ کیا تھا۔ بہرحال ڈاکٹر کا بیان ہے کہ آنکھ کی Blood vessels دیواریں پھٹنے کے بعد اب اتنی کمزور ہو گئی ہیں کہ اب ہر وقت دوبارہ پھٹنے کا اندیشہ ہے اس وقت تک خدا کا بڑا فضل ہوا ہے کہ گو ہر طرف خون کی چند "پھٹکیں" موجود ہیں جو بصارت کو دھندلا کر رہی

۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۲۰ ستمبر ۱۹۳۰ء　　　　　　　　　　　　　　　　　　گیسٹ ہاؤس۔ بھوپال

برادرم محترم۔ السلام علیکم و برکاتہ[1]

آپ کا محبت نامہ ۲ راگست مجھے کوئی ۷۔۸ راگست تک غالباً مل گیا تھا۔ لیکن چونکہ محض عیادت نامہ نہ تھا، بلکہ سیاست نامہ[2] بھی تھا، اس لئے جواب کی ہمت اس وقت نہ کر سکا اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن کے حکم سے اس وقت تک انتظار کیا جبکہ خود گھنٹہ آدھ گھنٹہ بیٹھ کر خط لکھنے کے قابل ہو جانے کی امید تھی جوں ہی حالت اس قابل ہوئی سیدھی آنکھ نے بھی تقریباً جواب دے دیا اور جس بیمار کو نئے نواب صاحب رامپور اور شوکت صاحب کی طلبی پر رام پور جانے سے ڈاکٹر صاحب نے روک دیا تھا، اور نواب صاحب بھوپال نے معذرت کا تار بھیج کر اس کی وجہ بیان کر دی تھی، اس کو دوسرے ہی دن بمبئی بھاگنا پڑا کہ ڈاکٹر چشم کو پھر آنکھ دکھلائے، اور بالکل اندھا بننے سے بچ سکے۔ اُسی دن سے آج تک آنکھ اس قابل نہیں ہے کہ کچھ بھی لکھ پڑھ سکوں، دوسروں کا محتاج۔

آپ نے میری صحت کے متعلق ۲ راگست کو لکھا تھا کہ "میری دعاؤں سے خدا خدا کر کے آپ کے افاقہ کی خبر سنائی دی، یقیناً میری بیماری میں افاقہ ہوا تھا، مگر نہ اس قدر کہ جتنا عام طور پر سمجھ لیا گیا۔ اور حقیقتہً زمانہ کا زیادہ حصہ خود شملے کی بلندی سے نزول تھا۔ سولن پہنچتے ہی جب کہ ہوا اس قدر رقیق نہ رہی، اُس سے زائد افاقہ ہو گیا، اور پہلی بار اتنی بھوک لگی کہ میں نے دوسروں کو چائے پیتے دیکھ کر خود بھی ایک پیالی چائے مانگی۔ باقی افاقہ پلنگ پر پڑے رہنے سے ہوا، شاید کسی قدر دواؤں سے بھی ہوا ہو گا۔ رہا دعاؤں کا معاملہ، میں کب آپ کی دعا کی تاثیر کا قائل نہ تھا، البتہ اگر اب بھی صاحب فراش ہوں، تو ممکن ہے کہ ......[3] تو نہیں، مگر شاید ......[4] کی مقدس ہستیوں کی آپ کی دعاؤں میں شرکت کا اثر ہو۔

اگر آپ کو افاقے کے متعلق غلط فہمی نہ ہوئی ہوتی، تو آپ ہرگز مجھ سے نہ پوچھتے، کہ میں ۱۵ راگست کو لکھنؤ آرہا ہوں یا نہیں[5] "شاد رحال" اب تو میرے مذہب میں گول میز کانفرنس ہی کی شرکت کے لئے جائز رہ گیا ہے، جس کے متعلق

---

[1] یہ پورا مکتوب، مولانا کے ہاتھ کا نہیں، کسی سے لکھوایا ہوا ہے۔ صرف آخر میں دستخط مولانا کے قلم کے ہیں اور افسوس کہ یہی مکتوب مولانا کا آخری مکتوب، مکتوب الیہ کے نام ہے۔ [2] یہ وہ زمانہ ہے، جب مولانا شدت سے علیل ہیں اور ساتھ ہی خود اسلامی پریس بھی ہر طرح کے مطاعن اور اتہامات کے ہدف [3] ایک مقام کا نام [4] ایک اور مقام کا نام [5] غالباً مرکزی خلافت کمیٹی کا جلسہ تھا۔

ابھی عرض کروں گا۔ میں آج ہی مع اپنی اہلیہ کے دہلی جانا چاہتا تھا تاکہ رخت سفر باندھ سکیں، لیکن گزشتہ دو ہفتوں میں خوا
دباؤ کسی قدر بڑھا رہا، اور ضیق النفس بھی کسی قدر رہا۔ اس کے باعث ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب نے پھر حکم امتناعی جاری کر دی
اب صرف میری اہلیہ دو ایک دن میں چلی جائیں گی۔ ارادہ تھا کہ رام پور جاتے وقت آپ کو تار دے کر کم از کم وہیں بلا لو
اور نہ معلوم واپسی ہو[1] یا نہ ہو، چلتے وقت آپ سے مل لوں لیکن آپ سے اتنا قرب بھی اسی طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ آپ بھی
تشریف لائیں اور خلافت کمیٹی کے جلسے میں جو ۲۰ اور ۳۰ اکتوبر کو ہونے والا ہے، بمبئی جا کر شریک ہوں۔ میں انشاء اللہ ۲۹
تک بمبئی چلا جاؤں گا۔ بشرطیکہ گول میز کانفرنس کے التوا کا حکم نہ آیا۔ براہ کرم ضرور آ کر مل لیجئے اگر اب میں بزدل اور غدا
اور آپ کے ۔۔۔[2]۔ کی طرح ایسا ہندو پرست نہیں رہا جیسا کہ وہ دو تین سال پہلے مجھ کو کہتے تھے تاہم چونکہ آپ
نہ صرف ۔۔۔[3]۔۔ سے بلکہ ۔۔[4]۔۔ سے بھی عقیدت ہے۔ اس لئے بزدلوں اور غداروں سے ملنا بھی آپ۔۔
مذہب میں ناجائز نہ ہوگا۔۔۔۔۔۔۔ پائنیر[5] میں جو مضمون نکلا تھا وہ خود لغو تھا، اور اس کا لکھنے والا بھی لغو۔ یہ ایک منت
ہندو کا لکھا ہوا ہے جو ان بزرگوں کی طرح سے خوب جانتا ہے کہ جینا اور سر محمد شفیع بھی خریدے جا سکتے ہیں، مگر محمد ع
المول ہے۔

آپ جس طرح مذہب کے بارے میں اب تک صراط مستقیم پر نہ پڑ سکے اور آپ کی زندگی میں اس کے پہلے
کی فلسفیت کے خلاف ابھی تک ردعمل جاری ہے اور آپ سائنس کو حرام سمجھتے ہیں[6]۔ اسی طرح آپ اب تک س
میں بھی صراط مستقیم پر نہ پڑ سکے۔ تہذیب مغربی کی بے ہودگیوں اور مغربی استعمار کے خلاف ابھی ردعمل جاری ہے اور
ہندو کی تنگ دلی اور تعصب کو ایک بڑی حد تک آپ کی آنکھوں سے چھپائے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نہ پا
مضمون نگار کی شیطنت[7] کو پہچان سکے اور نہ ستیہ گرہیوں کی روزانہ دروغ بافی کو۔

میرے اسمبلی کے انتخاب کے متعلق آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے[8] اس سے مجھے اندیشہ ہوا کہ آپ نہ صرف
وغیرہ پر اعتراض کر رہے ہیں، بلکہ مجھ سے بھی استفسار کر رہے ہیں کہ کیا واقعی تم اسمبلی میں شریک ہو گے۔ حقیقتہً میرے
کی حالت نہ اس وقت ایسی تھی کہ میں سکون کے ساتھ ان چیزوں کے متعلق لکھ سکا، نہ اب پوری طرح اس قابل ہوا
کہ سکون کے ساتھ ان کے متعلق کچھ لکھوا سکوں، آپ کو شاید یہ سن کر حیرت اور افسوس دونوں ہوں، کہ میں نے اب
دوستوں کو اس کی اجازت رین ہسپتال ہی میں دے دی تھی، جہاں کہ بستر مرض ذرا سی دیر میں بستر مرگ ہو سکتا تھا، کہ
چاہیں، تو مجھے اسمبلی کا ممبر منتخب کر سکتے ہیں۔ واقعہ یہ تھا کہ میں اب اس رائے پر پہنچا تھا، کہ اگر نیا دستور اساسی ایسا بن
کہ اس میں اسمبلی کو حقیقی آزادی مل گئی تو میں بھی اس میں شریک ہو جاؤں گا، گو اس وقت تک میں مولانا ۔۔۔۔ صاحب کی طرح

---

۱ اپنی موت کے قریب کا احساس، ۲ ایک مشہور بزرگ قوم کا نام، ۳ ایک مقام کا نام، ۴ ایک اور مقام کا نام، ۵ ۱۲ جولائی
میں مولانا پر ایک مفصل مضمون کسی کا نکلا تھا جس میں مولانا کو بہترین مگر ناکام ترین لیڈر دکھایا گیا تھا، مکتوب الیہ نے اپنے خط میں اسی مضمون کی فی الجملہ
۶ یہ صرف مولانا کا خیال تھا واقعہ یہ نہیں، ۷ یہ لفظ مکتوب الیہ نے رکھ دیا ہے، مولانا کا لفظ اس سے زاید کریہہ تھا، ۸ لیڈر ٹریبیون وغیرہ ہندوؤں
اردو کے دو روزناموں نے بھی یہ خبر پھیلانی شروع کر دی تھی کہ مولانا اسمبلی کی ممبری کے امیدوار ہیں، اور اس کے بعد صدارت کے،

یں سمجھتا۔ ایک زمانے میں مولانا حسین احمد صاحب میرے ہم خیال تھے اور جمعیۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ میں میرے۔ کہنے
ں سے چھوٹتے ہی انھوں نے ایک تحریک سوراجیوں کے نقطہ نظر کے خلاف پیش کرنا چاہی تھی، جس سے کفایت اللہ نے
...[1] اور ...[2] ... کی دروغ بافیوں پر تو معترض ہیں ...... کفایت اللہ صاحب اور الجمعیۃ کی افترا پردازیوں کے متعلق
نے کبھی کچھ لکھا اور نہ مولانا حسین احمد صاحب نے ٹال دینا چاہا تھا۔ دو سال بعد ...... صاحب[3] اور ان کے .....
یار نے مولانا حسین احمد ہی سے ایک رزولیوشن تیار کرا کے جمعیۃ العلماء کے جلسۂ انتظامیہ میں پاس کرا کے چھوڑا جس میں
گرد ہاتھ گھما کر ناک پکڑی گئی تھی، اور اسمبلی اور کونسلوں میں شرکت کے جواز کا فتویٰ دار الافتاء سے شائع کیا گیا تھا، خیر یہ
منش ہے۔ میں مسلمان ممبران اسمبلی کی بے اصولیوں اور نفس پروریوں سے اتنا تنگ آگیا تھا کہ نواب اسمٰعیل خاں اور
زادی صاحب کے اصرار سے اور چند اور خلافت والوں کے کہنے سے میں نے اسے قبول کر لیا تھا کہ اگر دستور اساسی
حقیقی آزادی قرار پائی تو میں شریک ہو کر اُن کے دوش بدوش تحفظ اسلامی اور اتحاد ملل ہند کے لئے جد و جہد کروں گا،
و وائسرائے کو رائے دے چکا تھا کہ انتخاب گول میز کانفرنس کے بعد کیا جائے۔ لیکن شملے میں جب کہ میری حالت بہت خراب
جھے اطلاع ملی کہ انتخاب ابھی ہو گا۔ اس پر میں نے فیصلہ کیا کہ اگر میرے دوست ضرورت سمجھیں تو میرا انتخاب کرا دیں، لیکن
پہلا اجلاس گول میز کانفرنس کے بعد ہو گا، میری شرکت اس پر منحصر ہو گی کہ دستور اساسی آزادی پر مبنی ہو۔ یہ تھی کل حقیقت،
آپ کے ستیہ گرہیوں نے اس پر اسپیکری وغیرہ کا قصہ تیار کر دیا۔

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ حقیقت کو دیکھتے ہوئے بھی یہ مفتری افترا پردازی سے باز نہیں آتے، اور افسانہ گوئی کے بغیر
ہیں سکتے۔

انقلاب میں جو مکتوب شائع ہوا تھا، وہ میری درخواست کے ایک ماہ سے زائد کے بعد شائع ہوا۔ میں تو ہمدرد کو بند
ے مہر سکوت اپنے ہونٹوں پر لگا چکا تھا، لیکن اس ملت مرحومہ کی مردم شناسی کو کیا کہا جائے، الجمعیۃ اور زمیندار وغیرہ کی افترا
زیوں کے بعد مجبور ہو کر یہ خط سالک صاحب کو لکھنا پڑا اور اُن سے درخواست کی گئی کہ وہ اس میں فراہم کردہ مواد کو اپنے دو
ضمون میں شائع کر دیں، جو انہوں نے نہیں کیا[4]۔

اب شرکت (گول میز) کانفرنس کے متعلق کچھ مواد آپ کو بھیج رہا ہوں کہ آپ اسے اپنے کسی مضمون میں شائع کرا دیں۔ میں
ں چاہتا کہ میرا اصلی خط وائسرائے کے نام کا شائع کیا جائے، تا آنکہ اشد ضرورت نہ ہو، مگر اس کا سارا مواد آپ حرف
ت شائع کر سکتے ہیں اور یہ بھی لکھ سکتے ہیں کہ ان خیالات کا اظہار میں نے اُن حلقوں میں کر دیا ہے، جہاں سے دعوت
ی تھی۔

---

[1] و [2] دو روزناموں کے نام ہیں۔ [3] مفتی صاحب کا ذکر ہے، [4] مکتوب الیہ نے لکھا تھا کہ لوگ طرح طرح کے اتہامات لگا رہے ہیں آپ
خاموش رہنا چاہتے ہیں تو مضائقہ نہیں، لیکن اپنے متعلق صحیح معلومات اپنے ان نیازمند کے پاس کبھی کبھی بھیج دیا،

پاؤں میں پہلے ہی حس نہ تھا، اب حالت کچھ بدتر ہی ہے اور سردی میں ہر وقت گنگرین اور پاؤں کی قطع و برید اور اسی طرح موت کا اندیشہ رہے گا جس سے ڈاکٹر انصاری کے مرحوم و مغفور منجھلے بھائی صاحب کو دوچار ہونا پڑا۔

اب تک صاحب فراموش ہوں۔ کانفرنس کے روزانہ اجلاس میں نہ صرف ہندوؤں اور انگریزوں بلکہ سب سے زیادہ خود مسلمان بھائیوں سے ایک ایک نقطہ پر جنگ کرنی پڑے گی۔

ان تین محاذوں پر .... جنگ کرنے میں ہر وقت دل کی حرکت یکایک بند ہو جانے کا اندیشہ ہے سب سے زائد یہ کہ اب لکھ پڑھ نہیں سکتا۔ کامل نابینائی کا ماہر علاج چشم نے پورا یقین دلایا ہے، کہ اگر میں سب کام چھوڑ کر نیپال جیسے ملک کو نہ چلا جاؤں، جہاں دنیا کی کوئی خبر نہ ملے لیکن اس پر بھی میں سمجھتا ہوں کہ میرا مذہبی فرض ہے کہ اس کانفرنس میں شریک ہوں اور وہاں سلطان جابر اور رعایائے جابر دونوں کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر سب سے افضل جہاد کروں[1] تاآنکہ اس کام میں مر جاؤں۔ اس لئے قرض دام لے کر، بھیک مانگ کر، اور جس طرح بھی ہو سکے گا تین چار ہزار روپیہ فراہم کر کے اپنی اہلیہ کو بھی ساتھ لے چلوں گا۔ اس لئے کہ وہ زندگی کی ساری منازل و مراحل میں میری رفیق سفر رہی، جب منزل مقصود کے لئے احرام سفر باندھوں، تو چاہتا ہوں کہ وہ موجود ہو[2]۔ ورنہ لندن کا بدترین موسم ہے، اور ہر متمول انگریز اور میم انگلستان تک کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں کو بھاگ جاتے ہیں۔ بہرحال وائسرائے کا دعوت نامہ اور میرا جواب ملفوف ہے۔ میرے خط بنام وائسرائے کو بہ طور خط کے نہ چھاپئے۔ اپنے مضمون میں آپ اُس کے خیالات میرے ہی الفاظ میں شائع کر سکتے ہیں ..... اس کے لئے بہتر اخبار ہو گا۔

جب آپ یہاں آئیں گے، تو آپ کو وہ خطوط دکھاؤں گا، جو مسلمانوں کی نمائندگی کے متعلق میں نے بستر پر سے بھی وائسرائے کو لکھے تھے۔ اب رخصت ہوتا ہوں۔ میری گستاخیوں کو معاف کیجئے اور میری کامیابی کے لئے دعا کیجئے اور جلد آ کر مجھ سے مل جائیے۔ میری اہلیہ کا بھی سلام قبول کیجئے اور اپنے گھر میں ہمارا سلام شوق کہیئے۔ اور بچیوں کو خوب پیار کیجئے

آپ کا گستاخ بھائی

محمد علی

---

[1] اشارہ ہے اُس حدیث نبوی کی طرف جس میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ سلطان جابر کے سامنے کلمۂ حق کہا جائے۔

[2] اللہ اللہ یہ دردناک پیشین گوئی کیسی صحیح اُتری۔

کانگرس سے علیحدگی

جون ۱۹۲۸ء میں مولانا علاج کی غرض سے یورپ تشریف لے گئے۔ ان کی غیر حاضری میں نہرو رپورٹ مرتب ہوئی اور آل انڈیا پارٹیز نے اسے منظور کر لیا۔ مولانا مدراس کانگرس کے فرقہ وارانہ فیصلوں کو برقرار رکھنے کے حامی اور نہرو رپورٹ کے خلاف تھے ہندوستان میں واپس آتے ہی انہوں نے نہرو رپورٹ کی مخالفت کی اور دسمبر ۱۹۲۸ء میں جب کانگرس نے کلکتہ کے مقام پر نہرو رپورٹ کو قبول کر لیا تو مولانا کانگرس سے علیحدہ ہو گئے۔

یہ صدارتی خطبہ جو خلافت کانفرنس منعقدہ کلکتہ میں انہی دنوں میں مولانا نے زبانی دیا تھا۔ کانگرس سے علیحدگی کا اعلان ہے۔

برادرانِ ملت! آپ مجھے معاف کریں گے۔ اگر میں بہت ہی اختصار کے ساتھ چند واقعات اپنی پبلک زندگی کے یک خاص غرض سے عرض کروں۔

بیس برس سے زیادہ کا عرصہ ہوا کہ مجھے آپ نے ملک کے سامنے آتے ہوئے دیکھا ہو گا۔ خواہ علی گڑھ کالج کے پرانے الب علم کی حیثیت سے، یا لیگ کے صدر کی حیثیت سے، اور آخر میں کانگرس کے ایک رکن اور پھر ایک صدر کی حیثیت سے، س کے بعد خلافت یا کسی اور وفد کے ممبر کی حیثیت سے۔ اور آج خلافت کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے آپ کے سامنے آیا ول۔ لیکن میرے عزیز ترین دوستوں اور عزیزوں کو اس کا علم نہ ہو گا اور بڑے بھائی کو جو میری پرائیویٹ زندگی کے حال سے بھی اقفیت رکھتے ہیں، ابھی اس کا علم نہ ہو گا کہ میں نے کسی جلسہ کی خواہ وہ پرائیویٹ ہو یا سیاسی یا ملکی، چھوٹا بڑا کیسا ہی جلسہ ہو بھی صدارت نہیں کی اور کسی جماعت کا کوئی منصب یا عہدہ قبول نہیں کیا۔ پھر اپنے نوعمر ساتھیوں میں عہدے اور منصب کی خواہش دیکھا کرتا تھا جو جوانوں سے بہت سی رقابت کا باعث ہوتی ہے اور کام خراب کرتی ہے۔ میں نے جو کچھ تعلیم حاصل کی تھی اس سے سبق مل گیا تھا کہ اگر دنیا میں کوئی نام و نمود چاہتا ہے تو وہ صرف کام ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اور کام کے لئے عہدہ کی ضرورت نہیں، جس جمعیت میں کام کرتا ہوں تو وہاں رکن کی حیثیت سے کام میں حصہ لینے سے عہدے داروں سے زیادہ کام رنا پڑتا ہے۔ اس لیے جب کسی دوست نے مجھ سے کہا۔ کہ فلاں عہدہ آپ کے لئے تجویز کرتے ہیں تو میں نے انکار کر دیا۔ مگر میں

"ہمدرد"۔۔۔ ۱۵- جنوری ۱۹۲۹ء

نے سوچ لیا تھا کہ چالیس برس سے پہلے جب کہ رسول کریم پہلا خدائی فرمان اور رب کا پیغام غار حرا سے لے کر نکلے تھے۔
نوجوان کو یہ حق نہیں کہ وہ کوئی منصب لے۔ لیکن یہ بھی اتفاقی امر تھا کہ میں نے جس منصب کے لیے کبھی کوشش نہیں کی اور
تھا۔ کیوں کہ چھندواڑے کی نظر بندی کے زمانے میں کوئی سیاسی کام نہیں کر سکتا تھا۔ مجھ کو ایک منصب عطا کیا گیا تھا اور ۱۵ء
میں مسلم لیگ کی صدارت تھی۔ جس کا سنگ بنیاد ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ کے اندر رکھا گیا تھا۔ اسی سال ۱۹۱۱ء میں مسز بسنٹ کو کانگر
صدارت عطا ہوئی اور گورنمنٹ نے انہیں کم خطرناک سمجھ کر آزاد کر دیا تھا۔ کیونکہ گورنمنٹ خوب سمجھتی تھی کہ جو لوگ ڈومینین اسٹیٹ
قانع ہوتے ہیں۔ بہ نسبت ان کے کم خطرناک ہیں جو آزادیٔ کامل کے خواہاں ہیں۔ پیشتر اس کے کہ حکم افتتاحی کی خبر مجھے ملے جو
حق میں صادر ہو چکا تھا۔ میں نے بلا خواہش اور اطلاع کے ایک غزل لکھی تھی۔ اس غزل میں ایک مقطع عرض کیا تھا۔ میں چاہتا ہوں
تقریر سے پہلے اس مقطع کو پڑھ دوں۔ تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ جو توقعات آپ کو مجھ سے ہیں ان کو میں پوری کر سکتا ہوں
میں حقیقت میں آپ کی توقعات پوری کرنے نہیں آیا ہوں۔ اور غلط توقع کو تو کبھی پوری کر ہی نہیں سکتا۔ جس وقت مسٹر مانٹیگو
آئے ہوئے تھے تو میری آزادی اور رہائی کی تحریک جاری تھی تو مسٹر مانٹیگو کا دفتر ہندوستان کے دولاکھ تاروں سے
تھا۔ اس وقت میں یہ غزل تحریر کر رہا تھا۔

یوں قید سے چھٹنے کی خوشی کس کو نہ ہو گی
یہ صدر نشینی ہو مبارک تمہیں جوہر

پر تیرے اسیروں کی دعا اور ہی کچھ ہے
لیکن صلہ روزِ جزا اور ہی کچھ ہے

میں دنیا کے آزادوں کی طرح حریت کا دعوے دار بن کر آپ کے سامنے نہیں آ رہا ہوں۔ میں عبدیت کا طوقِ
گلے میں ڈال کر خدا کا بندہ محمد رسول اللہ کی خاکِ پا بلکہ اس سے بھی کم تر ذرہ بن کر آپ کے سامنے آ رہا ہوں اور آپ کو
اسی رشتے میں منسلک کرنے آیا ہوں چاہے وہ آپ کو پسند ہو یا نہ ہو ؎

رشتہ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

میں اگر آپ سے یہ عرض کروں کہ میں آپ سے وہ باتیں کہنے والا ہوں جو آپ کی اکثریت کی پسند ہوں یا نہ ہوں۔ میں آ
کو غلط توقع نہ دلاؤں گا۔ جب میں کانگرس میں شریک ہوا تو میں نے اس کے خوش کرنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ آپ اگر مجھ
یہ توقع رکھتے ہوں کہ میں وہی کہوں، جو آپ کی اکثریت کی پسند ہو۔ تو یہ صحیح نہیں ہو گا میرا بھروسہ نہ مسلم اکثریت پر ہے۔
ہندوستان کی اکثریت پر ہے۔ میں مسلم اکثریت سے خائف ہوں نہ ہندو اکثریت سے۔ میرا بھروسہ اگر کسی پر ہے تو وہ تو جب
میں اللہ کا غلام ہوں۔ میں جو کچھ بھی عرض کروں گا اسی کی خوشنودی کے لیے ہو گا۔ خداوند کریم کی رضا جوئی کے لیے حاضر ہوا ہوں
آپ ماریں گے، دھتکاریں گے، گالی دیں گے، لیکن آپ کی خوشنودی کے لئے خدا کی رضامندی نہیں چھوڑ سکتا۔ ابھی چند روز

تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے چھینکتے میں کچھ جو ہا بادینٹ نکل پڑتی ہو۔ اور وہ لٹکی رہ گئی ہو۔ شکایت کرتے ہیں کہ تم نے ہم پر حملہ آور
کردیا ہے وہ یہ جماعت ہے جو بَغْیًا بَیْنَھُمْ کی پوری تفسیر ہے۔ یہ حضرات مجھے کہتے ہیں کہ تم نے علماء کو ہمارے پیچھے لگا دیا۔ تم انہیں
مسلم لیگ میں لے جاتے ہو۔ جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑتے ہیں۔ ہمارے بنیادی اختلافات کا باعث ہمارے مذہبی اختلافات
ہیں۔ علمائے کرام سن لیں جو مجھے سننا پڑتا ہے۔ لیکن میں ان بھائیوں سے کیا کہوں جو نہ سر پہ عمامہ رکھتے ہیں اور نہ ٹخنوں سے اونچا پاجامہ
پہنتے ہیں اور نہ چہرے پہ داڑھی رکھتے ہیں۔ جس طرح یہ علما تہجد کے وقت آنکھیں ملتے ہوئے اٹھتے ہیں اور وضو کے لئے گرم پانی
تلاش کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ دوسری قسم کے شب زندہ دار لوگ یا اکل و شرب میں مشغول یا کسی اور محفل رقص و سرود میں تھک
یا لہو و لعب میں محو یا تاش و شطرنج میں شب زندہ دار۔ جب علی الصبح اٹھتے ہیں تو بجائے وضو کے داڑھی مونڈھنے کے لیے گرم پانی
تلاش کرتے ہیں اور اہتمام یہ ہوتا ہے کہ کھونٹی بھی نہ چمکنے پائے۔ شاید علماء کرام اتنی سختی نہ کرتے جس قدر یہ کرتے ہیں کہ ٹائی کی گرہ
آپ ا ہو یا اگر سوٹ کا رنگ ایسا ہو تو ٹائی کا رنگ کیسا ہو۔ رومال کس قدر جیب سے نکلا ہوا ہو۔ تھوڑا نکلا ہو یا زیادہ۔ یا نیم دروں یا
نیم بیروں۔ میں ان حضرات سے دریافت کرتا ہوں کہ علماء نے تعصب سے کام لیا ہے۔ لیکن ہندوستانیوں کو ان کے اختلافات نے برباد
کردیا ہے یا تمہارے اختلافات نے۔ تم ہندوستان کو متحد کرنا چاہتے ہو اور اتحاد کے لئے اس پر راضی ہو کہ سر علی امام اور مہاتما گاندھی
ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہوں جس پہ تین تین صلیبی نشان بنے ہوئے ہوں؟ ہرگز نہیں کی آوازیں۔ لیکن نہرو رپورٹ کے منوانے
کے جو طریقے آج اختیار کئے جا رہے ہیں، وہ ہرگز صحیح نہیں ہیں۔ پہلی بسم اللہ ہی غلط ہے۔ طوقِ غلامی کو گردن میں ڈالنا قبول
کرلیا گیا ہے کہ سر علی امام اور سر تیج بہادر سپرو و مسٹر چنتامنی و دیگر امراء اکابر متحد و متفق ہو جائیں گے۔ لیکن میں یقین دلاتا ہوں
کہ ہندوستان میں اتنی نا اتفاقی کبھی نہیں پھیلی تھی جتنی کہ آج نہرو رپورٹ کے منوانے میں پھیلی ہے۔ میں ظاہر کرنا چاہتا
ہوں کہ پہلے اجلاس میں سب سے بہتر تقریر پنڈت موتی لال نہرو کی تھی۔ جس میں انہوں نے کہہ دیا تھا۔ کہ یہ کتاب الہ
نہیں۔ صحف سماوی میں سے کوئی صحیفہ نہیں کہ آپ اس کے ایک ایک حرف سے متفق ہوں۔ ہم سے جو کچھ ہو سکا
بہتر ہے بہتر سمجھ کر آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ ہمارا کام نہیں ہے کہ فیصلہ کریں یا آپ کو مجبور کریں۔ یہ آپ کے ہاتھ میں
ہے جو آپ کریں گے وہ ہم قبول کریں گے۔ ایک ایسی کمیٹی کے لئے حقیقتاً یہی طریقہ بہتر تھا۔ لیکن جناب ہم کو قرآن کر
سمجھا دیا ہے کہ ایک مرض ایسا ہے جس میں علماء اور عامی دونوں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ یعنی اقرار باللسان اور ہے ا
اقرار بالقلب اور ہے۔

علماء کو ریاکار بتایا جاتا ہے کہ "چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند" میں سیاست دانوں سے پوچھتا ہوں
کیا نہرو رپورٹ کے ارکان جوڑ توڑ نہیں کر رہے ہیں۔ کبھی مفاہمت کے نام سے اور کبھی مسلمانوں کی اکثریت کے نام سے
کبھی پنجاب کے نام سے اور کبھی یہ کہہ کر کہ اکثریت کے لیے یہ بھی مناسب ہے۔ کمیٹیوں کو بنانے کے لیے کبھی مر
کو کفن سے لا کر ارکان بناتے ہیں۔ بلکہ ان کا بس چلتا تو گنگا جی سے راکھ لا کر گنتے کہ ایک جسدِ بے روح یہ بھی ہے۔
کمیٹیاں بنتی ہیں اور مسلمانوں کو مرعوب کیا جا رہا ہے بلکہ ہندوستان کی سب سے بڑی جماعت کانگرس کو بھی فر
جائے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کی کارروائی باطل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ دیکھیں پنڈت موتی لال جیتے

میں ذاتی حیثیت سے آل پارٹیز کنونشن میں شریک ہوا اور میں نے وہ تقریر کی جو ہندوستان کے ایک طبقے کے موافق نہ تھی
لیکن آپ کو معلوم ہے کہ میں کس کس طرح سے روکا گیا۔ اور میری تقریر میں کس کس طرح سے روڑے اٹکائے گئے ، شرم شرم
کے نعرے) میں نہیں کہنا چاہتا کہ آپ شرم شرم کے نعرے لگائیں۔ وہ بھی ہماری ہی شرم ہے۔ کیوں کہ وہ ہمارے بھائی ہیں
لیکن میں کہنا چاہتا ہوں کہ میں کلمۂ حق سنانے کے لیے گیا تھا کسی کی پرواہ نہیں کی۔ جس چیز کو میں ہندوستانیوں کے لیے
ہندوؤں ، پارسیوں ، سکھوں ، مسلمانوں اور انگریزوں کے لیے بندگانِ خدا کے لیے بُرا سمجھتا ہوں میں وہ آپ کی خدمت میں
عرض نہ کروں گا۔ خدا کرے کہ ہم سب کلمۂ حق پر مجتمع ہو جائیں۔ میں غلطی پر ہوں۔ تو آپ میری رہنمائی فرمائیں اور اگر آپ غلطی پر
ہوں گے تو میں درست مشورہ دوں گا۔ میں ایک رسی تو آپ کے گلے میں ڈالنا پسند کروں گا۔ باوجود مکمل آزادی کے دعوے
کے میں آپ کو آزاد بنانا نہیں چاہتا۔ میں آپ کو بندگی کی طرف لانا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنی نظر بندی کے زمانے میں اپنے
بڑے بھائی کے جواب میں غزل لکھی تھی۔ وہ شاید حکومت پرستی کی وجہ سے ہم سے چھندواڑے میں ملنے تک نہ آسکے۔ میرے
بھائی نے جو ہندوستان کے بے مثل شاعر ہیں۔ ایک مطلع میں سب کا جواب دے دیا ؎

جورِ اعدا کے گلے تیری جدائی کے گلے
اس دلِ تنگ میں ہیں ساری خدائی کے گلے

میں نے ردیف بدل کر اس قافیے میں غزل لکھی تھی جس کا مطلع یہ تھا ؎

کبھی چکھے ہی نہیں آبلہ پائی کے مزے
خضر کیا جانے بھلا رہ نمائی کے مزے

پانچ سال کی مسلسل قید کو مدِنظر رکھ کر بیتول جیل میں لکھا تھا ؎

کثرتِ شوق سے ہے ہجر بھی ہم رنگِ وصال
ہم نے لوٹے ہیں بہت تیری جدائی کے مزے
کثرتِ شوق تھی اور لذتِ بُعدِ منزل
ہر طرف خار تھے اور رہ نمائی کے مزے
طبع آزاد اسیری میں بھی پابند نہ تھی
قید میں ہم نے اٹھائے ہیں رہائی کے مزے

اور جس شعر کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا تھا جس کے سبب سے بیتول جیل مجلس مشاعرہ بنا دی گئی تھی وہ یہ ہے ؎

میری مرضی ہوتی جب سے تیری مرضی میں گم
بندگی ہی میں ملے ہم کو خدائی کے مزے

میں آپ کو اسی بندگی کی طرف لے جانا چاہتا ہوں جس میں آپ کو ساری خدائی کے مزے مل جائیں۔ علمائے کرام مجھے معاف
کریں گے۔ میں ان گستاخوں میں ہوں جو سب سے زیادہ گستاخی ان کی شان میں کرتا ہوں۔ لیکن نہایت ادب سے میں ان بھائیوں
سے عرض کرتا ہوں جو نہ تو عمامہ باندھتے ہیں نہ ٹخنوں سے اوپر ازار پہنتے ہیں۔ یا تو وہ بڑی بڑی مونچھیں رکھتے ہیں یا اعتدال پر آتے ہیں

---

[1] ذوالفقار علی گوہر

یا پنڈت جواہر لال بازی آذر کے ہاتھ میں رہتی ہے یا ابراہیم کے ہاتھ۔ بُت پرست جیتا ہے یا بُت شکن

مجھے اندیشہ ہے کہ جس طرح یہی چنتامنی، یہی راجہ محمود آباد اور یہی رنگا سوامی آئر نے پنڈت موتی لال نہرو کو جیل میں بھیجا تھا محمد علی کے اخبار سے وہ ضمانت لی تھی جو کسی چور سے بھی طلب نہیں کی جا سکتی۔ محمد علی کا پریس بند کیا گیا۔ محمد علی اور اس کے بھائی نظر بند کئے گئے ان کو جیل میں ڈالا گیا اور ان کو قیدیوں کی ٹوپی پہنا کر کام لیا گیا۔ یہ تمام کام کس نے کیا تھا؟ کیا حکومت نے؟ انہی لوگوں نے جو آج درجہ نو آبادیات پر قانع ہیں۔ حکومت نے انہی مہاراجہ صاحب محمود آباد کے ذریعے موتی لال کو قید کر لیا تھا۔ انہی سر علی امام کی حکومت نے ہمارا اخبار بند کیا اور ہم نظر بند ہوئے۔ تجربے کے متعلق ایک انگریز کا قول ہے کہ تجربہ ان اسلحہ جات سے بنا ہوا ایک جنگی نشان ہے۔ جنہوں نے ہمیں زخمی کیا ہے۔ آج موتی لال نہرو وہی جامہ پہن رہے ہیں جو کل مہاراجہ محمود آباد صاحب اور سر تیج بہادر سپرو نے پہنا تھا۔ کل تم جواہر لال نہرو کو پھانسی کے تختے پر دیکھو تو سمجھ لو کہ اس کا قاتل اس کا باپ موتی لال نہرو ہے جواہر لال جب آزادی مانگنے جائے گا تو حکومت کا دفتری اقتدار کہے گا، تم جو آزادی مانگتے ہو وہ بغاوت ہے۔ اور باغی کی سزا پھانسی کا تختہ ہے جس طرح راجہ صاحب محمود آباد نے میرے بھائی شیروانی کو قید کرنے کا سنکشن (منظوری) دیا تھا۔ اگر جواہر لال بھی پھانسی پر لٹکا یا جائے گا تو موتی لال کا نام اس کے قاتل کی حیثیت سے لیا جائے گا۔ اس وقت یہ کہا جائے گا کہ یہ باغی ہیں، نوجوان ہیں، باپ سے بھی بڑا بننا چاہتے ہیں۔ موتی لال کو سیاست جواہر لال نے سکھلائی میں پہلا شخص ہوں جس نے جواہر لال کو سیکرٹری بنایا مگر شاید اب تو چنتامنی سیکرٹری ہیں۔ آج درجہ نو آبادیات مہاتما گاندھی جی نے بھی قبول کر لیا ہے اور ڈاکٹر انصاری نے بھی۔

جب مسٹر سین گپتا ایک تقریر کر رہے تھے، میں نے ایک جملہ کہا تو موتی لال صاحب بگڑ گئے اور صدر جلسہ ڈاکٹر انصاری ان کے آلۂ کار ہیں۔ کٹھ پتلی ہیں جن کو وہ نچاتے ہیں میں نے کہا کہ آج آپ صدر ہیں۔ لیکن میں نے بھی پالٹیکس سیکھی ہے کوئی پارلیمنٹ ایسی نہیں جس میں دو ایک جملے انٹرپٹ کے نہ کہے جاتے ہوں۔ لیکن جب میں خود تقریر کرنے کھڑا ہوا تو مجھے بار بار روکا جاتا تھا۔ اور موتی لال کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا اور اس وقت ڈاکٹر انصاری کو کسی نے مشورہ نہیں دیا کہ مداخلت کرنے والوں کو روک دیا جائے۔

بھائیو! میں ان کی خدمت میں عرض کر رہا تھا کہ یہ غلامی کا طوق جیسے ابن سین گپتا نے بنایا ہے کہ اس سے رنجشیں دور ہوں گی لیکن جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس کے برعکس ہے حکومت جب جواہر لال کو پھانسی پر لٹکائے گی۔ تو ان کے قاتل موتی لال ہوں گے جس طرح موتی لال کو قید کروانے والے مسٹر چنتامنی، مہاراجہ محمود آباد اور سر سپرو تھے۔ کسی کو شبہ ہے کہ گاندھی کو کس نے قید کرایا؟ ہندوؤں کو ہندوؤں نے، مسلمانوں کو مسلمانوں نے۔ اس وقت سوراج مانگا تھا۔ انڈی پنڈینٹ کا لفظ زبان سے نکالا تھا۔ تو گاندھی چھ برس کے لیے قید کیا گیا تھا تو کیا جواہر لال کو آزادی طلب کرنے میں پھانسی پر نہ لٹکایا جائے گا۔ مسٹر بپن چندر گپتا برطانوی تعلق کی کڑی نہیں توڑنا چاہتے اور کہتے ہیں یہی آزادی کا حل ہے۔ اس کا جواب ایک ہے کہ جب ڈاروِن نے کہا کہ انسان بندر کی اولاد ہے۔ سب ثبوت مل گئے مگر دم دار انسان نہیں ملا۔ جو ثابت کر سکتے کہ یہ بندر ابھی تک اپنی دم تک نہیں چھوڑنے پایا ہے۔ اسے سائنس میں (MISSING LINK) کہتے ہیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ اس دُم کو بپن چندر پال نہیں ہلانے پائیں گے

بلکہ و اسرائیلے توڑتا مروڑتا رہے گا۔ برادرانِ ملت! آج آپ کو آپ کے ذریعے سے سارے ہندوستان کو بلکہ ساری دنیا [illegible]
جو میرا خیال تھا کہ دنیا تیرہ سو برس سے جان چکی تھی

میں ایسی بدیہی بات بتانا چاہتا ہوں جو میرا خیال تھا کہ دنیا تیرہ سو برس سے جان چکی تھی۔ تیرہ سو برس پہلے ساری دنیا کو بتا چکی تھی [illegible]
مگر افسوس! باوجودیکہ ایک ذاتِ گرامی جس کے نام نامی پر میرا نام رکھا گیا ہے۔ تیرہ سو برس پہلے ساری دنیا کو بتا چکی [illegible]
افسوس اس نام نامی پر ایک نام رکھنے والے محمد عالم صاحب کو اور افسوس اسی کے نواسے سرعلی امام کی وہ بات سمجھ میں نہیں [illegible]
کہ نسل اور مرز بوم وہی لفظ ہے جس کو بھومی اور جاتی کہتے ہیں۔ یہ دو چیزیں جانوروں کی پہچان کی ہیں۔ انسان کی پہچان کے لئے [illegible]
انگورہ کی بلی، رام پور کا باؤنڈ، جمنا پار کی بھینس۔ اسلام نے تیرہ سو برس ہوئے کہ رسول اللہ کی معرفت تمام دنیا کو بتا دیا تھا کہ [illegible]
کے دو ٹکڑے ہیں۔ ایک وہ جو دنیا کو اس طرح برتنا چاہتا ہے۔ جس طرح بتانے والے نے برتنا چاہا جو اپنی مرضی کو دخل نہیں [illegible]
بتانے والے کی مرضی پر چلتا ہے اور دوسری جماعت بتانے والے کی مرضی پر نہیں چلتی، اپنی مرضی پر چلتی ہے اور حقیقت کا [illegible]
کرتی ہے اور ہر بات میں اللہ کو جھٹلاتی ہے۔ اور کفر کی مرتکب ہوتی ہے دنیا کے دو ٹکڑے ہیں ایک اسلام اور دوسرا کفر [illegible]
نے فرمایا ہے کہ اَلۡکُفۡرُ مِلَّةٌ وَاحِدَةٌ میں مہاتما گاندھی سے کیوں کہوں یا مالوی جی کو کیوں سمجھاؤں کہ کفر ایک ملت ہے اور [illegible]
ایک ملت ہے اور وہ کیوں کہتے ہیں کہ دنیا کی تقسیم یوں کی گئی ہے۔ کہ انگلش، جرمن، فرنچ، برہمن اور شودر۔ آپ سے [illegible]
عرض کر رہا تھا کہ یہ تخصیص کہ فلاں ترک ہے۔ فلاں افغانی ہے، فلاں ہندوستانی ہے، نیز ہندی کو کیا واسطہ ایرانی سے ایرانی کو [illegible]
سے عجمی کو عرب سے، فرنچ کو انگلش سے اور انگلش کو جرمن سے کیا واسطہ، یہ وہ غلط اصول ہے جو زندگی کو نہ ماننے سے پیدا [illegible]
ہے۔ انبیائے کرام نے اس کو دور کرنا چاہا۔ شکایت مالوی جی سے نہیں کہ وہ نہیں سمجھتے کہ یہ تقسیم تمہاری ترکی و افغانی کی اور عرب [illegible]
اسلامی تفریق نہیں، بلکہ صحیح تفریق کفر اور اسلام کی ہے۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ ان کو رسول اللہ کے نواسے سر علی امام بھی نہیں [illegible]
اور آل پارٹیز کنونشن میں کہتے ہیں کہ مجھ کو جمعیت العلماء اور خلافت کمیٹی کی آزادی پسندی پر بھروسہ نہیں کہ یہ ہندوستان کی آزادی [illegible]
چاہتے ہیں۔ یہ تو چاہیں گے۔ کہ انگریزوں کے نکل جانے کے بعد افغان بادشاہ راج کرے۔ اور سنا ہے کہ مالوی جی نے [illegible]
کی پیٹھ ٹھونکی تھی۔

کی قیادت میں مسلمانوں نے نہرو رپورٹ کے قبول کرنے سے انکار کر دیا، مسٹر جناح شروع میں خاموش تھے، بعد میں وہ بھی نہرو رپورٹ
مخالفین کی صف میں شامل ہو گئے۔

علی برادران نے مجلس خلافت کی طرف سے نہرو رپورٹ میں ضروری ترمیمیں پیش کیں، وہ مسترد کر دی گئیں، مرحوم راجہ صاحب مح
مسٹر محمد علی جناح، مسٹر (اب جسٹس) چاگلا نے بڑی امید و آرزو کے ساتھ چند ترمیمیں خلافت کی ترمیموں سے بھی زیادہ نرم اور معتدل "آل
کنونشن" میں پیش کیں، وہ بھی نامنظور کر دی گئیں، اب مسلمانوں نے من حیث القوم نہرو رپورٹ کی مخالفت شروع کر دی۔

نہرو رپورٹ کا صلہ موتی لال کو یہ ملا کہ وہ کانگرس کے صدر بنا دیئے گئے۔ گاندھی جی ان کے نقیب بن گئے، انہوں نے حکو
کو ایک سال کی مہلت دی کہ اگر اس اثنا میں نہرو رپورٹ ہندوستان میں نافذ کر دی گئی تو خیر ورنہ ہم درجۂ مستعمرات (جو نہرو رپورٹ
نصب العین تھا) کے خیال سے دست بردار ہو کر منزل آزادیٔ کامل کی طرف کوچ کریں گے، یہ واقعہ دسمبر ۱۹۲۸ء کا ہے۔

ایک سال کی مدت گزر گئی کانگرس کی صدارت باپ سے بیٹے کو ملی، جواہر لال نہرو نے صدر کانگرس کی حیثیت سے لا
(دسمبر ۱۹۲۹ء) میں آزادیٔ کامل کا پرچم لہرایا، نہرو رپورٹ زائد المیعاد قرار دی گئی، اور اعلان کر دیا گیا کہ اب ہم آزادیٔ کامل حاصل کر
رہیں گے۔

علی برادران نے مجلس خلافت کی طرف سے گاندھی جی سے کہا کہ وہ مسلمانوں کے مطالبات منظور فرمالیں، تاکہ اس جنگ
میں مسلمان ان کا ساتھ خلوص قلب سے دیں، لیکن انہوں نے کہا پہلے آزادی پھر بات چیت، مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ غیر مشروط طور پر ا
جنگ میں ہمارا ساتھ دیں، اگر انہوں نے ہمارا ساتھ نہ دیا تو وہ نقصان میں رہیں گے، کیونکہ آزادی ہم تنہا حاصل کر لیں گے، ہمارا
مسلمانوں کے اشتراک و تعاون کے بغیر بھی جاری رہے گا۔

لیجئے صاحب، وہ گھڑی بھی آگئی، گاندھی جی نے وائسرائے سے اتمام حجت کر لیا، وہ نہ سمجھے، اور "نمکین" سول نافرمانی شرو
گئی، لوگ خلاف قانون نمک بناتے تھے، اور گرفتار ہوتے تھے۔

ایثار و قربانی کا جب سوال ہوا، مسلمان کسی سے پیچھے نہیں رہتے، وہ سب سے آگے بڑھ جاتے ہیں، یہ جنگ شروع ہو
ان کا دل بھی شرکت کے لئے مچلنے لگا، لیکن اس وقت کی مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت مجلس خلافت، اور اس وقت کے مسل
کے قائد اعظم محمد علی اور شوکت علی کے حکم کی تعمیل میں انہوں نے اپنا جذبہ دبایا، اور شرکت سے باز رہے۔

"ترک تعلق کا اعلان" کے عنوان سے اگلے صفحات میں آپ جو زبردست اور معرکہ آرا مضمون ملاحظہ فرمائیں گے، وہ خلافت کمیٹی
مجلس عاملہ کی طرف سے (جس کے صدر نواب اسمٰعیل خاں تھے) شائع ہوا تھا، یہ بیان مجلس خلافت کی پالیسی کا آئینہ ہے، یہ تح
محمد علی کا لکھا ہوا ہے۔ میں نے اس کا ترجمہ کیا ہے جو درج ذیل ہے

رئیس احمد جعفری

کاروانِ آزادی کا کوچ

کانگرس کی طرف سے مسلمانوں کے غیر مشروط اور فیاضانہ تعاون کا صلہ کیا دیا گیا؟

نہرو رپورٹ!

یہ ہندوستان کا وہ آئین تھا، جسے کانگرس کی سرپرستی میں پنڈت موتی لال نہرو نے اپنے رفقائے کار کے اشتراک
ون سے تیار کیا تھا، اس وقت کے وزیر ہند برکن ہیڈ نے ایک چیلنج دیا تھا کہ ہندوستانیوں میں اتنی پھوٹ ہے کہ وہ اپنا
متحدہ اور متفقہ دستور بھی نہیں بنا سکتے، کانگرس نے یہ چیلنج قبول کر لیا، اور دستور سازی کا کام شروع کر دیا۔

پنڈت موتی لال نہرو، بہت بڑے ماہر آئین و قانون تھے، انہی کی صدارت میں دستور ساز مجلس مرتب کی گئی، مجلس
ت کی طرف سے مسٹر شعیب قریشی اس کے رکن تھے۔

اب تک مسلمان غیر مشروط تعاون کر رہے تھے، اب تک وہ بغیر کسی مزد اور صلہ کے جہاد حریت میں شرکت کر رہے تھے،
تک بغیر کسی مطالبہ کے ہندوستان کو برطانوی سامراج کے پنجہ سے چھڑانا چاہتے تھے، وہ پوری نیک نیتی کے ساتھ یہ سمجھ
تھے کہ مقدم کام یہ ہے کہ ہندوستان آزاد ہو، پھر باہم مسائل طے ہوتے رہیں گے، حصوں کی تعیین، اور تقسیم ہوتی رہے
گھریلو مسائل کا تصفیہ ہوتا رہے گا۔

لیکن اب ہندوستان کا دستور حکومت بن رہا تھا، برطانوی وزارت کی منظوری اور ہندوستان میں نفاذ کے لئے ایک
تیار ہو رہا تھا جس میں بتایا گیا تھا، کہ اکثریت کی حیثیت کیا ہوگی، اور اقلیت کی پوزیشن کیا ہوگی؟ اب ناممکن تھا کہ مسلمان
ش رہتے، کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ سکوت سے کام لیتے جب تک حق اور حصہ کا سوال نہیں اٹھا تھا وہ چپ تھے لیکن جب
تعیین ہونے لگی اور حصہ تقسیم ہونے لگا تو وہ کیوں خاموش رہتے؟ آج اگر خاموش رہتے تو کل انہیں بولنے کا حق کیوں

نہرو رپورٹ کے واضعین نے اگر بطور خود مسلمانوں کے حقوق اور مطالبات تسلیم کر لئے ہوتے تو کوئی بات نہیں تھی لیکن
نہیں ہوا، شعیب قریشی کے پیہم اور مسلسل اصرار کے باوجود نہیں ہوا، آخر وہ الگ ہو گئے، موتی لال نے خلیق الزماں وغیرہ سے
لا لیا، اور نہرو رپورٹ کو ہندوستان کا متفقہ دستور بنا کر پیش کر دیا۔

سب سے پہلے اس روش کے خلاف شوکت علی نے صدائے اختلاف بلند کی، پھر محمد علی کا نعرہ گونجا، ان دونوں بھائیوں

ترکِ تعلق کا اعلان

"مجلس عاملہ ضروری سمجھتی ہے کہ مہاتما گاندھی کی سول نافرمانی شروع کر دینے کے ارادہ سے ملک میں جو صورت حال پیدا ہو گئی ہے، اُس پر کافی غور و فکر کر لینے کے بعد اپنے خیالات مسلمانان ہند کے سامنے پیش کر دے، مجلس کو یقین ہے کہ مسلمانان ہند مجلس عاملہ کی اس سعی صادقہ کو جو ہندوستان کی کامل آزادی، اور آزاد ہندوستان کے نظم و نسق میں مسلمانوں کو معقول و مؤثر حصہ ملنے کے سلسلہ میں کی گئی ہے، ذہن میں محفوظ رکھ کر اس تجویز پر غور کریں گے۔

خلافت اور ترکِ موالات کی تحریک کا آغاز

تمہید میں یہ حقیقت ایک بار اور واضح کر دینی چاہیئے کہ تحریک ترک موالات کی محرک، جو منتظمین تحریک خلافت کے دماغوں کی پیداوار ہے، اور جسے انہوں نے دس سال ہوئے مہاتما گاندھی کو ساتھ لے کر پورے ملک میں جاری کیا تھا، دراصل برطانیہ کی وہ وعدہ خلافیاں ہیں جو اس نے مسئلہ خلافت اور مظالم پنجاب کی تلافی کے سلسلہ میں کی تھیں، تحریک ترک موالات کے رہنماؤں کو بہت جلد محسوس ہو گیا کہ باشندگان ہند کی شکایات کا ازالہ صرف "سوراج" لینے سے ہی ہو سکتا ہے، گو تحریک خلافت کا مقصد ابتداء میں خلافت عثمانیہ کا تحفظ اور جزیرۃ العرب پر مسلمانوں کا قبضہ تھا، لیکن کارکنان خلافت نے فوراً بعد ہی اپنے مقاصد میں "حصول سوراج" بھی داخل کر لیا، جو مذکورہ دو مقاصد کے حصول کا ذریعہ بھی تھا، اور بجائے خود ایک مقصد عظیم بھی، دنیا گواہ ہے کہ تحریک ترک موالات کے علمبردار اور روح رواں کارکنان خلافت ہی تھے، اور اقلیت میں ہونے کے باوجود "تارک موالات" کی حیثیت سے جانی قربانیاں دینے والوں اور جیل جانے والوں میں، مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ غالب رہی۔

کانگرس کا اصولی تضاد

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ کانگرس تجویز ترک تعاون، جو آخر میں سب سول نافرمانی اور بندش محاصل پر منتج ہوئی، منظور کرنے میں بہت زیادہ پس و پیش کرتی رہی، لیکن کارکنان خلافت نے ایک لمحہ کے لئے بھی تامل نہیں کیا، اور خدا کا نام لے کر ترکِ موالات کے بحر طوفان خیز میں کود پڑے، یہی نہیں، کانگرس نے ترک تعاون کی تجویز منظور کر لینے کے بعد، اُسے جلد ہی ترک بھی کر دیا، لیکن کارکنان خلافت نے اسے کبھی ترک نہیں کیا، اور گو انہوں نے مجالس قانون ساز کی ممبری چاہنے والوں کو جبراً نہیں روکا، پھر بھی یہ پابندی لگا دی کہ کوئی امیدوار خلافت کے نام پر انتخابات نہ لڑے، لیکن کانگرس نے تو اپنے امیدواروں کو باقاعدہ کانگرس کا "ٹکٹ" دے دیا۔

۱۹۲۷ء میں جمعیت خلافت اور کانگرس دونوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ حکومت برطانیہ ہندوستان کو حکومت خود اختیار
اقوام عالم میں ایک مساوی درجہ نہیں دینا چاہتی، اپنا اپنا نصب العین "کامل آزادی" قرار دیا، ان دونوں انجمنوں نے اپنا سابقہ
(منتہائے نظر) اس وجہ سے تبدیل نہیں کیا، کہ جو ہندوستانی، برطانیہ سے قطع تعلق کر لینا مناسب نہیں سمجھتے، وہ بھی کا
یا جمعیت خلافت میں شامل رہ سکیں، یاد رہے، کہ مہاتما گاندھی "کامل آزادی" کے حق میں نہیں تھے، وہ تو ہندوستان
لئے "آزادی کامل" کا نصب العین بھی مناسب نہیں سمجھتے تھے، مدراس کانگرس کے بعد وہ جو کچھ اپنے اخبار میں لکھ رہے
اس سے ان کی رائے کا تضاد سمجھ میں آسکتا ہے۔

آزادی کے بجائے نوآبادی؟

ایک سال بعد یعنی ۱۹۲۸ء میں مہاتما گاندھی کے پیہم اصرار پر کانگرس نے "تجویز مدراس" سے روگردانی کر کے وہ دستو
قبول کر لیا، جو نہرو کمیٹی نے مرتب کیا تھا، جس کی پہلی ہی دفعہ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ پوری عمارت کی بنیاد "درجۂ مستعمرات"، قر
دے دی گئی ہے، لیکن جمعیت خلافت نے اس رپورٹ کو یکسر نامنظور کر دیا، مرکزی خلافت کمیٹی کو، چند ماہ قبل، لکھنؤ کے اجلاس
یہ امید دلا کر نہرو کمیٹی کی تائید میں کر لیا گیا کہ آل پارٹیز کانفرس میں ہندو مسلم تعلقات استوار ہو جائیں گے اور اسی مطلب
ترمیمات اس دستور میں داخل کر دی جائیں گی، لیکن جب کلکتہ کانفرنس میں تجویز آزادی کو پیش نظر رکھ کر نہرو رپورٹ میں
اور ردوبدل کی کوشش کی گئی اور جب تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں تب جمعیت خلافت نے "مکمل آزادی" اپنا نصب
العین معین کرتے ہوئے آزاد اور خود مختار ہندوستان میں مسلمانوں کو کافی اور مؤثر حصہ ملنے اور انہی امور سے متعلق مطالبات
مشتمل تجویز منظور کر لینے کے بعد نہرو رپورٹ کو ناقابل قبول قرار دے دیا۔

خلافت کانفرنس ختم ہونے کے بعد ہی دہلی میں ایک آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقد کی گئی، جس طرح کلکتہ میں (کانگرس کی
سرپرستی میں) ایک کنونشن منعقد کیا گیا تھا، اسی طرح دہلی میں مسلمانان ہند کی تمام سیاسی پارٹیوں کی ایک کانفرنس منعقد کی
لیکن اس کانفرس میں اس امر کا بھی خیال رکھا گیا کہ جو پارٹیاں شریک ہو رہی ہیں، ان کو کسی ایسے عمل پر مجبور نہ کیا جائے جو ا
اپنے معینہ "مقاصد" سے ٹکراتا ہو، کلکتہ کنونشن کا بھی فرض تھا کہ اسی اصول پر کاربند رہتا لیکن اس نے اس کے بالکل برعکس
عمل اختیار کیا، اس کنونشن میں جو کانگرسی نمائندے شریک تھے، انہوں نے تو دوسری سیاسی پارٹیوں کے نمائندو
خاطر اپنا نصب العین ہی تبدیل کر دیا، اور "آزادی کامل" کے بجائے درجۂ مستعمرات پر ہی راضی ہو گئے، لیکن دہلی کا
میں جو خلافتی نمائندے شریک تھے، وہ جمعیت خلافت کے معینہ نصب العین میں کسی قسم کی تبدیلی پر راضی نہیں ہوئے
انہوں نے مسلمانوں کے مطالبات کو دوسری سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں کی امداد سے ایسے اسلوب اور الفاظ میں
کیا جسے بنیاد قرار دے کر "آزاد ہند" کے لئے بھی ایک دستور مرتب کیا جا سکتا تھا، اور "مستعمراتی ہند" کے لئے
اس کانفرنس نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا "کوئی دستور اساسی، خواہ وہ کسی کا وضع کردہ ہو یا کسی کے دماغ
پیداوار ہو، مسلمانان ہند کے لئے اس وقت تک قابل قبول نہ ہوگا، جب تک وہ کانفرنس کے منظور کردہ ا
کے مطابق نہ ہو۔

کا مطالبہ پیش کرتے رہتے ہیں، گویا ان کی رائے میں "مجالس مباحثہ" سے دستور مرتب ہوا کرتا ہے، اور جس چیز کی ان کو سب سے زیادہ ضرورت ہوا کرتی ہے، وہ "ووٹوں کی کثرت" ہے وہ ایک عرصہ ہوا "تاریخ بنانے" کی اہلیت سے محروم ہو چکے ہیں اور اب تو تاریخ بنانے کا خیال بھی ان کے دماغ میں نہیں پیدا ہوتا، ان کی سمجھ میں یہ بات آتی ہی نہیں کہ دوسری اقوام کس طرح ہزاروں قیمتی جانوں کی قربانیاں دے کر دستور اساسی میں ایک معمولی سی دفعہ کے اضافہ یا استرداد کا حق حاصل کیا کرتی ہیں وہ بھول گئے کہ انہیں کس قسم کے دشمن سے سابقہ پڑا ہے، وہ اپنے دوستوں کے ساتھ اتنے عرصہ تک، اور اتنی صد حقہ پردازی بلکہ عناد اور کینہ توزی کے ساتھ اُلجھتے رہتے ہیں کہ اکثر حالتوں میں وہ دوستوں کو اپنا دشمن بنا لیتے ہیں، انہی افسوسناک حقائق کی بنا پر منتظمین تحریک خلافت دستور سازی کا خیال ترک کر کے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گئے کہ پہلے ہندوستان کی داخلی طاقتوں کو نشوونما دی جائے تاکہ وقت آنے پر ملک اپنی ہستی منوا سکے اور دنیا سے بھی تسلیم کرائے، اور پھر بعد میں ہندوستان کے تمام مفاد، تمام جماعتوں اور تمام فرقوں کی عام منظوری سے آزاد اور خود مختار ہندوستان کا دستور اساسی تیار کیا جائے۔

لیکن مہاتما گاندھی نے ایک عجیب بات یہ کی کہ اب سے ۵ سال قبل جبکہ وہ کانگریس کے صدر تھے، اپنے خطبۂ صدارت میں کہہ ڈالا کہ "میں ایک عرصہ تک غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں اور پبلک کا ہم خیال ہو گیا ہوں کہ اُسے مبہم نہیں بلکہ قطعی طور پر جاننا چاہئے کہ وہ کس چیز کے حصول کی خاطر جنگ کر رہی ہے، پبلک کو لازمی طور پر "سوراجیہ" کی مکمل تعریف جاننا چاہئے یعنی وہ اسکیم جسے سارا ہندوستان پسند کرتا ہے اور جس کے لئے اُسے جنگ کرنی ہوگی"

مہاتما گاندھی نے اُس کمیٹی کے تقرر پر اظہار مسرت کیا تھا جسے پہلی آل پارٹیز کانفرنس نے ۱۹۲۴ء میں اسی مقصد کے لئے مقرر کیا تھا، اور امید ظاہر کی تھی کہ "یہ کمیٹی ایک ایسی اسکیم تیار کرنے کے قابل ہو جائے گی جو تمام پارٹیوں کے لئے قابل قبول ہو"

لیکن سوء اتفاق کہا جائے یا کچھ اور کہ مہاتما گاندھی کی یہ امید بر نہیں آئی اور مذکورہ کمیٹی نے اس قسم کا کوئی کام انجام نہیں دیا، اس کا اجلاس مہاتما جی کی صدارت میں دہلی میں چند دن تک ہوا مگر صرف بحث و مباحثہ ہی ہوا کیا، اس بحث کا نتیجہ کو افسوسناک کہا جائے گا، مگر اس شکل میں نمودار ہوا کہ ہندو مسلم کشیدگی اور بڑھ گئی، بلکہ گاندھی جی کے ۲۱ روزہ فاقہ کے بعد، جو چند مہینے کیا گیا تھا اور جس کا مقصد نیم مذہبی تنازعات کا خاطر خواہ فیصلہ بتایا گیا تھا، اس کے دوران میں اتحاد کانفرنس نے دہلی میں جو طے کیا تھا، اس جدید کمیٹی نے اُن فیصلوں پر بھی سیاہی پھیر دی!

فرقہ وارانہ فسادات اور گاندھی جی کی خاموشی

مہاتما گاندھی کی ذات کے متعلق اتنا کہنا کافی ہوگا کہ انہوں نے اپنی صدارت کے زمانہ میں یہی نہیں کہ ملک کی فرقہ وارانہ فضا درست نہیں کی، بلکہ خود اپنی قوم کے اُن افراد پر لعنت ملامت کرنے سے بھی قاصر رہے، جو فرقہ وارانہ فسادات کے ذمہ دار تھے، ان کے برعکس کارکنان خلافت نے اپنی قوم یعنی مسلمانوں کو سمجھانے بجھانے بلکہ زجر و توبیخ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، اس معاملہ میں بھی جمعیتہ خلافت اور کانگریس کے اعمال و کردار کس قدر ایک دوسرے سے مختلف ہیں! جمعیتہ خلافت نے تو ا

ان کو بھی چھوڑ دیا

کانگریس کا اصولی "تضاد" اور جمعیت خلافت کی اصولی "یکسانیت" کا قصہ یہیں ختم نہیں ہوتا، کانگریس نے کلکتہ میں ان لوگوں کو چھوڑ دیا جنہوں نے مدراس کے اجلاس میں تجویز آزادی منظور کی تھی، اور لاہور کے اجلاس میں اُن کو چھوڑ دیا جنہوں نے کلکتہ میں درجۂ مستعمرات پر قناعت کر لی تھی، اس کے برعکس جمعیت خلافت آج بھی وہیں قائم ہے جہاں پہلے تھی، اس نے مدراس میں جو نصب العین منظور کیا تھا اُس میں کلکتہ کے اجلاس میں کوئی کمی نہیں ہونے دی، اور جو فیصلہ کلکتہ میں کیا تھا اس میں لاہور کے اجلاس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا، اس نے مدراس میں جو "آزادی کامل" کی تجویز منظور کی تھی، اُسے کلکتہ میں درجۂ مستعمرات سے تبدیل نہیں کیا، اور نہ لاہور میں اُن لوگوں کو چھوڑ دیا، جو درجۂ مستعمرات سے آگے جانا نہیں چاہتے تھے، جمعیت خلافت ہر شخص کو اپنے ساتھ شامل کر لیتی ہے خواہ وہ اس کے منتہائے مقصود سے متفق ہو یا اس کا عقیدہ اپنے عقیدہ سے کمتر درجہ کا سمجھتی ہو، جمعیت خلافت اپنی رفتار میں سستی کر سکتی ہے، لیکن جب ایک مرتبہ اس کا قدم آگے بڑھ جاتا ہے تو وہ پیچھے نہیں ہٹاتی، وہ اُس درجہ میں "موم" نہیں بنی ہے، جیسا مہاتما گاندھی نے کانگریس کو بنا رکھا ہے، جمعیت خلافت اپنے مقاصد و نظریات کو پورے عزم اور سرگرمی کے ساتھ آگے بڑھاتی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ دوسروں سے گفتگوئے مصالحت کرنے کے لئے اپنا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھتی ہے۔

کانگریس کا "تضاد عمل" ابھی اور بھی باقی ہے! وہ یکے بعد دیگرے ایسے عمل کرتی رہتی ہے جن میں تضاد و تخالف پایا جاتا ہے، ان تمام اعمال میں سب سے زیادہ "رجعت پسندانہ اقدام" وہ ہے جو مہاتما گاندھی اب اختیار کر رہے ہیں، انہوں نے تحریک ترک موالات کے ابتدائی دور میں بار بار کہا تھا، کہ "سوراج" کا اصل مفہوم "حکومت خود اختیاری" ہے، نہ اس سے کم نہ اس سے زیادہ، سوراج یہ کسی خاص دستور اساسی کا نام نہیں ہے، بلکہ اس اختیار و قوت کا نام ہے جسے حاصل کر کے جب ہم پسند کریں، اور جس طرح کا پسند کریں دستور اساسی مرتب کر لیں۔

اکثریت کی حکومت

کارکنان خلافت اس بات پر راضی ہو گئے تھے، کہ پہلے سوراج حاصل کر لیا جائے اور حصول سوراج کے بعد قوم پر چھوڑ دیا جائے کہ سب کی پسند کے مطابق کوئی دستور تیار کرے، یہ بالکل قدرتی بات تھی کہ اس زمانہ میں جب کہ نمائندہ اور جمہوری طرز حکومت کا زور ہے، ہندوستان میں بھی نمائندہ حکومت ہی قائم ہوتی اور تاریخ ہند میں پہلی مرتبہ اکثریت کی حکومت قائم ہوگی، اور مسلمان چونکہ اقلیت میں ہیں، اس لئے اُن کو تحفظات کی ضرورت ہوگی، تاکہ وہ اپنے حقوق و مفاد کی حفاظت کر سکیں، پھر بھی کارکنان خلافت نے اعتماد کر لیا کہ جنگ آزادی میں فرقہ پروری خود بخود اپنی "واصل باقی" وصول کر لے گی، اس خیال کے ماتحت انہوں نے مسلم اقلیت کے لئے "تحفظات" کا مطالبہ کئے بغیر جنگ آزادی میں اپنی شرکت جاری رکھی، لیکن دوسرے مسلمان تو اس "اعتماد" پر قناعت نہیں کر رہے تھے، ان کا خیال یہ تھا کہ ابھی سے بتا دیا جائے کہ جنگ آزادی فتح کر لینے کے بعد مسلمانوں کو کیا ملے گا؟

ہندوستان کے باشندے "تخیلات" پر اعتماد کرنے کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ بات بات پر "دستور سازی"

صدر ڈاکٹر کچلو کو اس قصور پر صدارت سے علیحدہ کر دیا کہ وہ مہا سبھا کی نقالی کے مرتکب ہوئے تھے، لیکن کانگرس کے صدر مہاتما گاندھی اپنے ہم قوموں کی بیہودگیوں پر اس طرح چپ سادھ گئے کہ گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا، کانگرس کے اجلاس کانپور میں مہاتما گاندھی کے رفقاء کار حتیٰ کہ ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، اور ڈاکٹر محمود تک نے بڑی منت سماجت کی کہ اپنی خاموشی ترک کر کے فرقہ وارانہ فسادات کے ذمہ دار افراد کے بارے میں کچھ فرمائیں، لیکن وہ خاموش ہی رہے، بلکہ آئندہ سال تک خاموش رہنے کا فیصلہ کر بیٹھے، کلکتہ کے فسادات کے بعد بھی جب دوسرے اصحاب کی طرح حکیم اجمل خاں مرحوم مغفور نے مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو اور مسز سروجنی نائیڈو کو دہلی آنے کی دعوت دی تاکہ کارکنان خلافت سے مشورہ اور گفتگو ہو جائے تو مہاتما گاندھی تو دہلی آئے ہی نہیں، اور پنڈت موتی لال نہرو نے صفائی سے کہہ دیا کہ چونکہ انتخابات ہونے والے ہیں اور مہا سبھا ان کے جال میں نہیں پھنسی، اس لئے فرقہ وارانہ فسادات کے معاملہ میں وہ کچھ نہیں کر سکتے۔

اب تو فرقہ وارانہ فساد، روزمرہ کا ایک واقعہ بن گیا ہے، حالات بد سے بدتر ہو چکے ہیں، اور دو سال کے اندر تو بدترین شکل اختیار کر چکے ہیں۔

ہندو مسلم مفاہمت اور کارکنان خلافت

امید کی پہلی شعاع اس وقت نظر آئی تھی جب کہ ۳ سال ہوئے سربرآوردہ مسلمانوں کی ایک کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی تھی، اور جس کے فیصلوں کو "تجاویز دہلی" کے نام سے موسوم کیا گیا تھا، جس کا خیر مقدم کانگرس کی مجلس عاملہ نے کیا تھا، اور جس کی تصدیق آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ بمبئی بماہ مئی ۱۹۲۷ء میں پنڈت موتی لال نہرو کی تحریک پر کر دی تھی جس کی تائید ڈاکٹر مونجے، مسٹر کیلکر اور مسٹر جیکر جیسے مہا سبھائیوں نے بھی کی تھی، مگر مہا سبھا نے پرزور مخالفت کی تھی۔ چونکہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی اور مسلم لیڈروں میں ایک مفاہمت ہو گئی تھی اس لئے امید کی جا رہی تھی کہ ملک کے دو فرقوں کے سیاسی اختلافات اب افسانۂ ماضی بن کر ختم ہو جائیں گے، لیکن نیم مذہبی اختلافات اب بھی موجود تھے، اور وہی دیناپور اور بیتیا میں نقض امن کا سبب بنے، ان فسادات سے یہ بات ظاہر ہو گئی، کہ شاہ آباد اور گیا کے اضلاع میں دس سال قبل جو اندوہ ناک واقعات رونما ہوئے تھے، اسی قسم کا فرقہ وارانہ جذبہ پوری قوت اور اتحاد عمل کے ساتھ کارفرمائی کر رہا ہے، ایک مرتبہ پھر کارکنان خلافت سمجھوتہ کے لئے آگے بڑھے اور کانگرس، اور ہندو مہا سبھا کے لیڈروں کو شملہ میں مدعو کیا، لیکن مہا سبھا والوں نے اس کانفرنس کو بھی اسی طرح ناکام بنا دیا جس طرح ۱۹۲۱ء کی اتحاد کانفرنس اور ۱۹۲۵ء کی اول، آل پارٹیز کانفرنس کو ناکام کر دیا تھا، تب مسٹر سری نواس اینگر صدر کانگرس نے، مخصوص رہنمایان خلافت کے مشورہ پر، کلکتہ میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس مدعو کیا، یہ اجلاس مذہبی تنازعات کا تصفیہ کرنے میں اسی طرح کامیاب ہوا، جس طرح بمبئی میں سیاسی اختلافات طے کرنے میں ہوا تھا، اس کے چند مہینے بعد مدراس میں کانگرس اور خلافت کمیٹی دونوں نے، دونوں سمجھوتوں (سیاسی اور مذہبی) پر مہر تصدیق ثبت کر دی، اس ضمن میں بھی مہاتما گاندھی نے کچھ نہیں کیا، بلکہ ایک مرتبہ تو ان کے مذبذب طرز عمل سے لوگوں کو شبہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ان فرقہ وارانہ فیصلوں کے حامی و مؤید بھی ہیں یا نہیں، یہ تو رہنمایان خلافت ہی کا دل گردہ تھا جو انہوں نے مہاتما جی کی ایک مرتبہ اور مدد کی اور گاؤ کشی کا سوال ایسی شکل میں طے کر دیا کہ ایک طرف شریعت اسلامیہ کا اصول بھی قائم رہا اور دوسری طرف گاندھی جی کا ضمیر بھی مطمئن ہو گیا،

یہ تصفیہ پنڈت مدن موہن مالوی کو بھی ماننا پڑا، جو مجلس مضامین میں قدم قدم پر مخالفت کرتے رہے تھے، لیکن آخر میں انہی زائندوں نے رائے شماری کے وقت ان کو زبردست شکست دے دی، مجلس مضامین کے فیصلہ کی حمایت میں مالوی جب کھلے اجلاس میں تقریر کی تو رہنمایان خلافت نے خوب خوب داد دی، اور یہ خلافتی اصحاب مدراس سے فوراً ہی ہو گئے تاکہ وہاں مسلم لیگ کا جو اجلاس ہو رہا تھا اس میں مدراس تصفیہ کی تصدیق کرالیں۔

یہ تمام واقعات صرف اس غرض سے دُہرائے گئے ہیں کہ لوگوں کو اُن کوششوں اور سعی وجہد کا صحیح علم ہو ج کارکنان خلافت نے ایک باعزت اور قابل قبول ہندو مسلم سمجھوتہ کے لئے کانگریس کے توسل سے انجام تک پہنچایا ک اس مفاہمت کا اثر حیرت انگیز طریقہ پر ظاہر ہوا، اور فرقہ دارانہ فسادات کلیتہً بند ہو گئے۔

سائمن کمیشن کا مؤثر طریقہ سے بائیکاٹ کیا گیا، اور ہندوستان میں تحریک ترک موالات کے شباب سے کہیں بہتر اور اعلیٰ قسم کا اتحاد نظر آنے لگا جس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو لوگ لبر اعتدال پسند خیالات کے تھے، وہ بھی تارکین موالات کے ساتھ اشتراک عمل کرنے لگے تھے،

سب کئے دھرے پر پانی پھیر دیا!

لیکن چند ہی مہینے بعد حالات پھر خراب ہو گئے، کیونکہ دہلی میں جو آل پارٹیز کانفرنس منعقد ہوئی اُس میں "تصفیہ مدراس دیا گیا، اس اجلاس میں بھی مہا سبھائیوں نے معاندانہ طرز عمل اختیار کیا، لیکن سب سے زیادہ افسوسناک رویہ پنڈت موتی لال وہی پنڈت نہرو جنہوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس منعقدہ بمبئی میں "تجاویز دہلی" قبول کر لینے کی تحریک پیش کی وہی دوبارہ ہندو مہا سبھا کے لیڈروں کو بیوقوف بنانے کی کوشش کر رہے تھے، پہلی مرتبہ پنڈت جی نے ۲ سال قبل کو اس طرح بیوقوف بنا کر خوش کرنا چاہا تھا کہ صوبہ سرحد کو اُس وقت تک اصلاحات نہیں ملنی چاہئیں، جب تک اس صوبہ کی مسلم آبادی پنجاب سے ملحق ہو کر اپنی اکثریت ختم کرنے پر آمادہ نہ ہو جائے۔

مسلم اقلیت کے لئے تحفظات

اب جبکہ ایک مفصل و مشرح دستور اساسی وضع کیا جا رہا ہے، مسلمانوں نے قدرتی طور پر ایسے تحفظات کا مطالبہ پیش سے ان کے حقوق و مفاد کی حفاظت ہو سکے، یہی مسلمان تھے جنہوں نے تحریک ترک موالات کے زمانہ میں اس بات پر قناع کر کوئی دستور اساسی وضع کرنے سے قبل ان کو ہندوستان کے لئے دستور اساسی وضع کرنے کا حق حاصل کرنا چاہیئے، لیکن تلخ تجربہ نے ان کو اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔

ہندوستان میں پہلی مرتبہ "اکثریت کی حکومت" قائم کی جا رہی تھی، اور بدقسمتی سے اس وقت فرقہ پرستی اپنی پوری ملک کی فضا خراب کر رہی تھی، اور ملک میں مسلمانوں کی نہیں، ہندوؤں کی بھاری اکثریت ہے، اس لئے مسلمان "اکثریت تو قبول کر لینے پر آمادہ تھے لیکن وہ قدرتاً مسلم اقلیت کے لئے تحفظات مانگنے لگے تھے، وہ آئینی ذرائع اختیار کرکے والی قوم کی فرقہ پرستی کی بیخ کنی کرنے پر بھی تیار ہو گئے تھے، خواہ وہ ہندو اکثریت میں نمودار ہو یا مسلم اکثریت میں، اخلاقیا سنہرا اصول ہے کہ "دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کرو، جو تم چاہتے ہو کہ دوسرے تمہارے ساتھ کریں"، اسی قسم کا ایک

قانون سیاسیات میں بھی ہے "ایسی پوزیشن میں آجاؤ کہ دوسروں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کر سکو جس کا تمہیں خوف ہو کہ دوسرے تمہارے ساتھ کریں گے"، اگر کھیل میں دو کھلاڑی کو دو پڑیں تو دونوں میں سے ایک بھی نہ کھیل سکے گا، مسلمان چند صوبوں اور چند ماتحت صوبوں میں اکثریت میں تھے، یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کی حکومت "وفاقی" قسم کی ہو نہ کہ "وحدانی" اور یہ کہ صوبوں کو کامل اندرونی آزادی ملنی چاہیئے تاکہ ان کو اطمینان رہے کہ جن صوبوں میں وہ اقلیت میں ہیں وہاں اس لئے محفوظ رہ سکیں گے کہ چند صوبوں میں ان کی اکثریت ہوگی، اور وہاں ان کو پوری آزادی حاصل ہوگی، بد قسمتی سے صوبۂ مغربی شمالی (سرحد) میں جہاں مسلمانوں کو وہی بھاری اکثریت حاصل ہے جو ہندوؤں کو صوبۂ مدراس میں ہے، انتخاب کا طریقہ رائج نہیں ہوا ہے، اور سندھ، جہاں مسلمانوں کی ۷۵ فی صدی آبادی ہے، گجرات، مہاراشٹر اور کرناٹک میں، جو صوبۂ بمبئی کے ماتحت حلقے میں مدغم کر دیا گیا ہے، مسلمانوں کی خواہش ہے کہ صوبۂ مغربی و شمالی کو وہی طرز حکومت ملے جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کو حاصل ہے اور سندھ کو، چونکہ اس کی کوئی چیز اس کے ملحقہ علاقوں سے مماثل نہیں ہے، اس لئے ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے، نیز پنجاب اور بنگال میں چونکہ مسلمانوں کو برائے نام اکثریت حاصل ہے، اس لئے ان صوبوں میں اُن کو اُس وقت تک کے لئے چند تحفظات دیئے جائیں جب تک کہ وہ اپنے کو پوری طرح منظم نہ کر لیں۔

لیکن پنڈت موتی لال نہرو جو باوجودیکہ ان تمام تحفظات کی تائید آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس منعقدہ بمبئی میں کر چکے تھے، ایک مرتبہ پھر ہندو مہاسبھا کی خوشامد میں مصروف ہو گئے، اور پنجاب اور بنگال کی برائے نام اکثریت کو عارضی تحفظات ملنے کی مخالفت کرنے لگے، خواہ وہ خفیف سی اکثریت بھی اقلیت میں کیوں نہ تبدیل ہو جائے، اور سندھ کی علیحدگی کی مخالفت میں دور از کار اور غیر منطقی خطرات و دلائل پیش کرنے لگے۔

اس طرح گویا مسلمان کہیں کے نہ رہتے، اور جب اکثریت کی حکومت پورے ملک میں قائم کی جاتی تو مسلم اکثریت جہاں کہیں بھی ہوتی، اس "بنیادی حق" سے محروم ہو جاتی، یہی نہیں، اگر کسی صوبہ میں مسلم اکثریت قائم ہو جاتی، جب بھی اُس صوبہ کے نظام حکومت اور انتظام کے سر پر مرکزی حکومت کے "ویٹو" کی تلوار لٹکتی رہتی، کیونکہ مرکز میں مسلمانوں کو موجودہ تناسب کے مطابق بھی حق نمائندگی نہیں مل رہا ہے چھوٹی چھوٹی اقلیتوں کو باہمی منظوری سے "ویٹیج" (پاسنگ) کا معیار طے کر لینے کے حق سے محروم کیا جا رہا ہے، اور "ویٹو" کے اُس حق سے بھی جو کانگرس نے ہمیشہ مسلمانوں کو دے رکھا تھا، جس کا مقصد یہ تھا کہ جب مسلمان ممبروں کی ۲ ثلث اکثریت کسی بات کی یہ کہہ کر مخالفت کرے کہ اس سے مسلم مفاد کو صدمہ پہنچ جائے گا تو اس موقع پر یہ حقیقت ...ٹ کر لینی چاہیئے کہ مسلمان اپنے لئے کوئی رعایت نہیں طلب کر رہے تھے، اور نہ اپنے ہی لئے خصوصیت سے کوئی تحفظات مانگ رہے تھے، بلکہ وہ اسی قسم کی مراعات اُن ہندو اقلیتوں کو بھی دینے پر تیار تھے، جو مسلم اکثریت والے صوبوں میں ہوتیں، دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ ایک ہی قسم کے تحفظات ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو دینا چاہتے تھے اور ان تحفظات کی اصل غرض تھی کہ کوئی اکثریت، خواہ وہ مسلمانوں کی ہو یا ہندوؤں کی، کسی اقلیت کے ساتھ، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، فرقہ پرستی کے جذبات کے ماتحت کوئی تعدی یا زیادتی نہ کر سکے، یعنی ہر فرقہ کی اقلیت دوسرے فرقہ کی اکثریت کے "فرقہ وارانہ اسلحہ" کی زد سے محفوظ ہو جائے۔

مہاتما گاندھی نے مسلمانوں کو چھوڑ دیا

پنڈت موتی لال کی چالبازیوں کے خلاف جب جب مسلمانوں نے آواز اٹھائی اُسے ہر بار نظرانداز کر دیا گیا، اور ا
مہاتما گاندھی نے، جنہوں نے نہرو رپورٹ کی تخلیق کی تھی، کلیتہً مسلمانوں کو چھوڑ دیا اور نہرو رپورٹ کو اپنا "نعرہ جنگ" بنا لیا
۵ ہی سال گزرے ہیں جبکہ انہی مہاتما جی نے بلگام کانگریس کے خطبۂ صدارت میں ارشاد فرمایا تھا:-

"ہندو مسلم اتحاد ہماری زندگی کی سانس ہے، مسلمانوں کی بھاری اکثریت رکھنے والے صوبہ میں ہندو اُس صورت میں زندگی بسر کر سکتے ہیں جبکہ مسلمان اُن کا خیر مقدم کرنے اور اُن کے ساتھ مثل دوست کے مساویانہ سلوک کرنے پر راضی ہوں، اسی طرح جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، وہاں ان کو ہندو اکثریت کی دوستی پرعزت کی زندگی بسر کرنی ہو گی"۔ . . . . جب باہمی جھگڑے روزمرہ کی چیز بن جائیں تو اُن کو "سول وار" کہا جاتا ہے، اور پھر متخاصم فریقین ہی کو وہ جنگ "لڑنی" اور ختم کرنی پڑتی ہے . . . . . . کوئی سوراجی حکومت، چاہے وہ کتنا ہی "عوام کی حکومت" کہلانے کا دعوےٰ کرے، جنگ و جدل کی بنیاد پر نہ تو قائم کی جا سکتی ہے اور نہ اپنا نظام حکومت چلا سکتی ہے۔ . . . . سوراج گورنمنٹ سے مراد ہے ایسی حکومت جو ہندوؤں، مسلمانوں، اور دوسرے فرقوں کی مشترکہ و آزاد رضامندی سے قائم کی جائے، اگر ہندو مسلمان سوراج کے خواہش مند ہیں تو ان کو اپنے اختلافات باہمی رواداری کے ساتھ دور کرنے ہی ہوں گے، ہمارا مقصد لازمًا یہ ہونا چاہیئے کہ پہلی فرصت میں فرقہ وارانہ نمائندگی ختم کر دی جائے، ایک مشترکہ ادارہ انتخابات ہو، اور وہ غیر جانبداری کے ساتھ صرف قابلیت و استحقاق کی بنا پر نمائندوں کا انتخاب کر دے، سوراجی ملازمتوں میں بھی بہترین قابلیت کے مرد اور عورتیں لی جائیں، لیکن جب تک وہ وقت نہیں آتا، اور جب تک فرقہ وارانہ رقابتیں یا ترجیحی حق کا مطالبہ، قصۂ ماضی نہیں بن جاتے، اُن اقلیتوں کو ان کی خواہش کے مطابق راستہ دیدینا چاہیئے، جو اکثریتوں کے ارادوں اور نیتوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں، اکثریتوں کا فرض ہے کہ ایثار و قربانی کا نمونہ پیش کریں"۔

گاندھی جی کے یہ خیالات اُس وقت کے ہیں جبکہ دستور سازی کا کام شروع ہونے والا تھا، لیکن آج؟ ان خیالات کی بازگشت، جو ان کے اخبار ینگ انڈیا کے ذریعہ سنی جا رہی ہے، کتنی عجیب اور دلچسپ ہے! وہ لکھتے ہیں:-

"آزاد ہندوستان میں فرقہ وارانہ نمائندگی کی گنجائش نہیں نکل سکتی ملک اس کا متحمل ہو ہی نہیں سکتا . . . . . . اور کانگرس کو وقتی گنجائش نکالنے سے قطعًا انکار کر دینا ہو گا"۔

کیا اس صاف گوئی کے بعد بھی، بالخصوص جبکہ "اکثریت کی حکومت" قائم کی جا رہی ہو، اور فرقہ پرستی کا دور دو "عارضی گنجائش" کا نکالنے سے انکار کر دینا، گاندھی جی پر "فریب دہی اور بیوقوف سازی" کا الزام لگانا مشکل ہو گا؟ یہ حر کتنی حیرت انگیز ہے کہ وہ خود ہی تو ایک اصول وضع کرتے ہیں کہ "جب باہمی جھگڑے روزمرہ کی زندگی کا جزو بن جائیں تو سول جنگ" کہا جاتا ہے اور جب دو پارٹیوں میں سول جنگ چھڑ جائے تو اسے متخاصم فریقین ہی مرکٹ کے ختم کر سکتے

پھر اُن میں عقل سلیم پیدا ہو جائے کہ ٹھنڈے دل سے سوچ بچار کر کے باہمی تصفیہ کر لیں" اور جب کوئی دوسرا کلہاڑے کو کلہاڑا کہتا ہے تو گاندھی جی "حیرت زدہ" ہو کر اس کا منہ تکتے ہیں، اور انہی کے پیش کردہ اصول کے مطابق جب ایک ایسا فارمولا نکالا جاتا ہے جس سے فرقہ وارانہ تنازعات کا تصفیہ ہو جائے تو وہ اس کوشش کو "بیوقوف سازی" سے تعبیر کر کے "عارضی گنجائش" نکالنے سے بھی انکار کر بیٹھتے ہیں! ایک عرصہ سے مہاتما گاندھی اپنے کو "ایک چلتا ہوا کارتوس" کہہ رہے تھے، لیکن اب تو وہ نہرو رپورٹ کے کارتوس ہیں" اڑا دینے والا"، مسالہ بن گئے ہیں! اس الٹیمیٹم کا نتیجہ کیا ہوا؟ ایک مرتبہ پھر فرقہ وارانہ فسادات کا سارے ملک میں دور دورہ ہو گیا، اور اب کی خود گاندھی جی کے صوبہ میں ان کا سب سے زیادہ زور رہا، دستور سازی کے اس خبط نے ہندوستان کو داخلی طور پر طاقت ور بنانے کی بجائے اس کی کمزوریوں میں اضافہ کر دیا۔

آزادئ ہند کی آرزو غیر مشتبہ ہے!

ان باتوں کے باوجود ہندوستانیوں کے دلوں میں آزادئ وطن کا جذبہ غیر مشتبہ صورت میں موجزن ہے، ایک قدامت پسند وائسرائے نے بھی اقرار کر لیا، کہ جہاں تک رائی اور رعایا کا تعلق ہے، موجودہ صورت حال اب جاری نہیں رہ سکتی، باہمی فرقہ وارانہ اختلافات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ محکوم ملک برطانوی اقتدار سے باہر ہے، ان اختلافات سے تو صرف اتنی سی بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ مسلم اقلیت، آقاؤں کی تبدیلی پر راضی نہیں ہے، بلکہ وہ ایک آزاد اور خود مختار ہندوستان کے نظام حکومت میں اپنا معقول اور اثر انداز حصہ طلب کر رہی ہے۔

گول میز کانفرنس اور گاندھی جی کا انکار

اس لئے وائسرائے نے برطانیہ کی نئی حکومت (وزارت) کو ہندوستان کا مطالبہ "گول میز کانفرنس" منظور کرنے پر آمادہ کر لیا، ہندوستانیوں کا کہنا یہ تھا کہ برطانیہ دنیا کی پوری آبادی کے پانچویں حصہ کی قسمت کا فیصلہ نہ کرے ہندوستان کے ۳۲ کروڑ باشندے کوئی مجرم تو نہیں جن کی زندگی، موت اور آئندہ کی جدوجہد کا فیصلہ ایک اجنبی جج کرے، جس کے ساتھ اجنبیوں ہی کی ایک جماعت جوری بن کے بیٹھے، یہاں اس سے بحث نہیں کہ ہندوستانیوں کا یہ مطالبہ بر بنائے استحقاق تسلیم کر لیا گیا یا برطانیہ کو عقل سلیم آگئی بہرحال اس سے اتنا تو ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے دل میں تبدیلی پیدا ہو گئی تھی، ہندوستان کو ایک موقع مل گیا، جو اس سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا، کہ اپنی ہستی منوا سکے، اور دنیا اس کی قومی انفرادیت تسلیم کر لے، اب وہ دنیا سے تسلیم کرا سکتا ہے کہ آزادی اس کا پیدائشی حق ہے، اور یہ بھی کہ ہندوستان میں حق موروثی حاصل کر لینے کی صلاحیت پیدا ہوئی ہے یا نہیں، اس سوال کا فیصلہ کرنے کا اختیار غصب کر رکھا ہے، وہ کمیشن نہیں بھیج سکتے، ہندوستانی گول میز کانفرنس کا مطالبہ اس لئے بھی کر رہے تھے کہ ڈیڑھ سو برس کے "غلبۂ اغیار" نے ان کو جو عبرت ناک سبق سکھایا تھا کہ وہ ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ سب کے لئے آزادی حاصل کریں، سب کو برابر کے مواقع دیں، اور برادرانہ تعلقات اس طرح قائم کریں جو درجۂ مساوات سے بھی بلند ہو، تاکہ "قوی" کمزوروں کو دبانے کے عوض ان کی امداد کرے، اور ایک عالم و فاضل صرف درس دے نہ کہ جہلا پر ہمیشہ فائق رہنے کی کوشش کرے، یہ وقت تھا کہ برطانوی ہند اور ریاستی ہند میں آخری فیصلہ ہو جاتا، اسی طرح ہندوؤں، اور مسلمانوں میں، پھر خود ہندو ہندو میں یعنی اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور پست اقوام میں، اچھوتوں اور چھوت چھات ماننے والوں میں بھی۔

Ahmed's
MANGO
SQUASH
NAURUS
SYRUP
Ahmed's
MANGO
احمد
فوڈ انڈسٹریز لمیٹیڈ کراچی ۱۶

لیکن افسوس کہ ایسا ہونا مقدر نہ تھا! اور مہاتما گاندھی نے مسلمانوں کی وہ تمام درخواستیں نامنظور کردیں جو وہ ایک اور سی مفا
کے لئے کر رہے تھے، اب گاندھی جی، فرقہ واریت کو "نظرانداز" کرکے ختم کرنا چاہتے ہیں، جس کا ایک مطلب یہ بھی ہوتا ہے
اکثریت کی فرقہ پرستی جاری ہے، اور ایک "مکمل آزاد" ملک میں "قومی" حکومت کا نام لے کر، اکثریت ہی اپنا حکم چلاتی رہے
اس کی پرواہ نہ ہونی چاہئے، کہ اقلیت کو کیا ملا اور کیا نہیں ملا، اس طریقہ سے فرقہ پرستی ختم نہیں ہو سکتی، بلکہ اقلیت لئے ا
کے مطیع و منقاد بن جائیں گے، کیا تماشہ ہے کہ اصلی فرقہ واریت کو "قومیت" کا نام دے دیا گیا ہے، اور جن تحفظات کو فر
واریت کے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے، انہی کو "فرقہ پرستی" کا نام دے دیا جاتا ہے!

کیا نہرو رپورٹ واقعی مسترد کردی گئی؟

کہا جاتا ہے کہ اب نہرو رپورٹ ختم ہو چکی ہے، اور کانگریس بالکل صاف سلیٹ پر کلیتہً آزاد ہندوستان کا ایک
اساسی لکھنے والی ہے۔ کاش یہ سچ ہوتا! اگر نہرو رپورٹ "ختم شدہ" بھی سمجھ لی جائے تو اس کے خاتمہ کا واحد سبب ی
وائسرائے نے سائمن کمیشن کی رپورٹ پیش ہونے سے پہلے برطانوی اور ہندوستانی حکومتوں کو جلد سے جلد "د
نوآبادیات" دے دینے کا وعدہ کرنے پر مجبور نہیں کیا، اور وہ بظاہر ایسا کر سکتے بھی نہیں تھے۔ اور نہرو دستور کی اسا
نوآبادیات" رکھی گئی ہیں، پس چونکہ گول میز کانفرس سے قبل درجۂ نوآبادیات کا اعلان نہیں ہو سکا اور چونکہ پنڈت جوا
نہرو، صدر کانگریس نے اپنے والد اور مہاتما گاندھی سے اس وعدہ کے ایفا پر اصرار شروع کیا جو انہوں نے ایک سال
میں کیا تھا، نہرو رپورٹ اپنی قدرتی موت مرگئی اور ایک دوسرا دستور وضع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا جانے لگا جو کامل آ
کی بنیاد پر مرتب کیا جاتا۔

لیکن جو چیز کہ حقیقتاً ختم نہیں ہوئی اور بظاہر کبھی ختم ہونے والی بھی نہیں ہے وہ "پست ذہنیت" اور "تنگ نظری"
اسی چیز نے تو نہرو کمیٹی سے مدراس کے سارے کئے دھرے پر پانی پھیر دیا! لاہور کانگریس کی تمام کارروائیوں میں"
کی مجلس عاملہ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاسوں میں جو وقتاً فوقتاً منعقد ہوتے رہے، اور اس سارے لٹریچر
گاندھی جی کے اخبار میں شائع ہوتا رہا، یا ان خطوط و مراسلات میں جو مہاتما جی نے اپنے احباب اور آزمودہ کار رفقا
جن کو انہوں نے اب چھوڑ دیا ہے، کیا کہیں بھی یہ بتایا گیا ہے کہ نہرو رپورٹ اس لئے اور اس وجہ سے مسترد کردی گئی
کے مرتبین اور مہاتما گاندھی کو پوری طرح احساس و یقین ہو گیا کہ اس میں جس نام نہاد "ہندو مسلم مفاہمت" کی اسکیم پیش
ہے وہ مسلمانوں کے لئے "غیر تسلی بخش" ہے یا کم سے کم یہی کہا گیا ہے کہ مسلمان اس اسکیم کو "غیر تشفی بخش" اور ناقابل
سمجھتے ہیں، اس لئے ایک اور کوشش کی جائے گی کہ معاملہ اس طرح سلجھایا جائے کہ اس مفاہمت کو مسلمان قبول کر لیں او
کی حیثیت سے ہندوستان کی جنگ آزادی میں شریک ہو سکیں؟

جب مہاتما گاندھی اور نہرو رپورٹ کے دوسرے مؤیدین دہلی میں اس غرض سے جمع ہوئے تھے کہ گول میز کانفرنس
کے مینفسٹو پر دستخط کردیں، تو صرف ایک یا دو مسلمانوں کو دہلی آنے کی دعوت دی گئی تھی، اور ان کو بھی "صاد کرنے"
گیا تھا، لیکن ۲۳ دسمبر کو جب آخری فیصلہ ہوا تو ان ایک یا دو مسلمانوں کو پوچھا بھی نہیں گیا، اور چونکہ وائسرائے

پورٹ تمام وکمال منوائی نہیں جاسکتی تھی، اس لئے بلاکسی قسم کے پس وپیش کے گفت وشنید کا دروازہ بند کر دیا گیا لاہور میں نگریس کا عقیدہ فوراً تبدیل کر دیا گیا، اور مسلمانوں سے مشورہ کرنے کی کوشش کئے بغیر ہی سول نافرمانی کی مہم شروع کر دی گئی ئی شبہ نہیں، ایک یا دو پرانے اور آزمودہ کار رفقار کو مدعو کیا گیا، لیکن ان کی حیثیت "متبعین" کی سی رکھی گئی، جو اس جنگ زادی میں پیچھے پیچھے چلنے والے سپاہیوں کی طرح ہوتے، یہ جنگ آزادی کیسی تھی؟ اگر وہ کامیاب ہو جاتی تو مسلمان "محکوم و تاج" کی پوزیشن میں آجاتے! یہ ہیں وہ اسباب جن کی بنا پر نہرو رپورٹ ختم ہوتی تھی اس کے خاتمہ سے مسلمانوں کو کیونکر اطمینان سکتا تھا جب کہ اس کے پس پشت وہی تنگ نظری اور پست ذہنیت صاف طور پر نظر آرہی تھی؟

کانگریس کی تجویز کا دراصل مقصد یہ ہے کہ نہرو رپورٹ میں مسلمان اقلیت کے لئے جو تھوڑے بہت تحفظات رکھے گئے بھی اب "ختم ہو گئے" اور آزاد ہندوستان کا جو دستور اساسی مرتب کیا جائے گا، اس میں کوئی ایسی چیز نہیں رکھی جائیگی، س سے فرقہ واریت کی بو آتی ہو! قدرت کی انگلی نے جو نشانات بنا دئے بنا دئے، اور تقدیر کے قلم نے جو کچھ ھ دیا لکھ دیا، اب اس میں ایک حرف کی بھی تبدیلی نہیں کی جائے گی! مسلمان اقلیت میں ہیں، اور بقول شخصے "پست قبائل کی پیشانی پر غلامی لکھی ہوئی ہے!"

آزادی کے عوض جبر

فروری ۱۹۲۸ء میں مہاتما گاندھی نے اپنے اخبار ینگ انڈیا میں لکھا تھا کہ تمام لوگوں کو اپنی پوری توجہ نہرو رپورٹ منظور کرانے پر مرکوز کر دینی چاہئیے خواہ مسلمان اور سکھ اس سے کتنی ہی بے اطمینانی کا اظہار نہ کریں، اس مضمون میں انہوں نے رٹ میں کسی قسم کی ترمیم کے امکان سے انکار نہیں کیا تھا، البتہ "بزور شمشیر ترمیم کرانے کو ناممکن" لکھا تھا، ان کے الفاظ تھے:-

"تبدیلیاں کی جائیں گی" اور کی جانی ہی چاہئیں لیکن وہاں جہاں از روئے انصاف مناسب سمجھیں جائیں، البتہ یہ ترمیمات وقت نہیں کی جانی چاہئیں، بلکہ اس وقت جبکہ رپورٹ اتنی طاقت حاصل کرے کہ اپنے کو زبردستی منوا سکے، اور جب اس منزل پر پہنچ جائے گی تو "قبول عامہ" کے لئے پیش کی جائے گی، اور تب اس میں ایسی ترمیمات کی جاسکیں، جو بالکل زیر سمجھی جائیں، اور جن پر باہمی اتفاق آرا ہو گیا ہو"

یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ کس نے تلوار کھینچ کر اس نامراد اور نامسعود رپورٹ میں ترمیم کرانے پر زور دیا تھا؟ اور اگر حق و صاف کی بنا پر اس میں ترمیم کی جاسکتی ہے، تو وہ کون سی "مختار کل" شخصیت ہو گی جو فرمان جاری کر دے گی کہ ترمیمات نہیں کی جاسکتیں، بلکہ "اس وقت جبکہ رپورٹ اپنے کو زبردستی منوانے کی طاقت حاصل کرلے" کیا آزادی عمل اسی کا نام ہے امن یونہی قائم رکھا جاتا ہے؟ کیا یہ صریحی جبر اور جنگ نہیں ہے! حقیقت یہ ہے کہ نہرو رپورٹ کو، ۷ کروڑ مسلمانوں کے سے بزور شمشیر، جیسے ٹیبل کا کانٹا چبایا جارہا ہے، اُتار دینے کے لئے پہلے ہی سے تہیہ کر لیا گیا تھا، مہاتما گاندھی لکھتے ہیں۔ س اس میں ترمیمات کر دینے کے امکانات سے انکار نہیں کرتا "لیکن ابھی نہیں"، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ترمیمات اُس ت داخل کی جاسکیں گی جبکہ ترمیم چاہنے والے، واضعین رپورٹ کے رحم وکرم کے خواستگار ہوں، اور حامیان رپورٹ

اتنی قوت حاصل کرلیں کہ جس شکل میں وہ خود پسند کریں، رپورٹ کو زبردستی تسلیم کراسکیں، بدقسمتی سے رپورٹ اتنی طاقت نہیں کرسکی، اور جمعیت خلافت نے اُسے طاقت حاصل کرنے میں کوئی امداد نہیں دی۔

دوسروں کے سہارے بہشت میں جانا

جو کچھ مہاتما نے ایک سال قبل کیا تھا، وہی کانگرس نے ایک سال بعد تجویز لاہور میں کہہ دیا، لیکن مہاتما گاندھی آ بالکل وہی باتیں کہے جا رہے ہیں، کانگرس کی تجویز کا جو مفہوم انہوں نے ینگ انڈیا میں لکھا ہے، اور جو مضمون انہوں نے شوکت علی کے خط کے جواب میں لکھا ہے، وہ ان کے ایک سال قبل والے "نعرہ جنگ" کی تشریح ہے، جسے وہ نہرو رپور نام سے موسوم کر رہے تھے، اگر مسلمان اُسے قبول نہیں کرتے، تو ان کو الگ ہو جانے دو، ان کی ضرورت بھی نہیں ہے کی آزادی اُن کی مدد کے بغیر بھی حاصل کی جا سکتی ہے، زمانہ کا یہ انقلاب بھی کتنا حیرت انگیز ہے کہ کل کا "چھٹا ہوا کارتو اتنی قوت حاصل کرے یا جلد حاصل کرسکے، جسے مہاتما جی مولانا شوکت علی کا جواب دیتے ہوئے، اپنے اخبار میں "ناقا طاقت" سے تعبیر کرتے ہیں! اگر آج مسلمان اپنی مرضی سے ساتھ نہ ہو جائیں گے تو کل وہ کہیں کے بھی نہ رہیں گے! کی پیش گوئی ہے، مسلمانوں میں خود اپنی کوئی قوت نہیں ہے، وہ اپنے پیروں پر خود نہیں کھڑے رہ سکتے، ان کو مہاتما متبعین کا سہارا لینا ہو گا! اس کے سوا اُن کے لئے کوئی چارۂ کار ہی نہیں ہے!

یہ تو حسن اتفاق ہے کہ مذکورہ خیالات صحیح نہیں ہیں، لیکن اگر وہ صحیح ہوتے بھی تو مسلمانوں کو غیروں کا سہارا لینے بہتر ہوتا کہ وہ خودکشی کرکے فنا ہو جاتے، جیسا کہ ایک فارسی کے ایک شاعر نے کہا ہے ؎

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن بپائے مردئے ہمسایہ در بہشت

اتحاد کی ایک اور کوشش

خوش قسمتی سے صورت حال وہ نہیں ہے جس کا ابھی ذکر کیا گیا ہے، جن لوگوں میں حقائق کے سمجھنے کی صلاحیت ہے لوگ اس موقع کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں جو حسن اتفاق سے ہندوستان کو گول میز کانفرنس کی پیش کش سے حاصل ہو گیا نے تہیہ کر لیا ہے کہ دنیا کے سامنے ایک متحدہ محاذ پیش کریں گے، والیان ملک نے بھی حال ہی میں اسی جذبہ کا اظہا چیمبر میں ایک اہم تجویز کے ذریعہ کیا ہے جس میں تمام مفادات کے لئے، اور مسلم قوم کے لئے تحفظات کی ضرورت تسلیم کی اسی طرح لبرل خیال کے ہندوستانی رہنما بھی فرقہ وارانہ سوالات کو نظر انداز کرنے کے بجائے اس کے حل کی تلاش میں مص گئے ہیں، جب سر تیج بہادر سپرو نے کارکنان خلافت کو ایک کانفرنس میں شریک ہونے کی دعوت دی تو ان کے دلوں پیدا ہو گیا تھا، کہ کہیں لبرل اصحاب بھی مسلمانوں کے مطالبات کے ساتھ وہی سلوک نہ کریں جو مہاسبھا کر رہی تھی یا جس دیکھی کانگرس کر رہی تھی، اس خوف کے باوجود کارکنان خلافت نے گفت و شنید کا دروازہ بند نہیں کیا بلکہ دعوت شرکت بڑی فراخ دلی کے ساتھ قبول کر لی، مسلمانوں کے مطالبات پوری سنجیدگی کے ساتھ پیش کر دئے گئے، اور ان کی معقولیت لوگوں نے تسلیم کر لی جن کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی نہیں بندھی ہوئی تھی، اس سے فرقہ پرست حلقوں میں ایک بے چینی سی پھ

قوم پروری" کا نام لے کر شروع ہی سے اس کوشش میں مصروف تھے کہ سپرو کانفرنس ملتوی ہو جائے ہمیں یقین رکھنا چاہئے کہ کانگرس کی طرح لبرل لیڈران، فرقہ پروری کا شکار نہیں ہو جائیں گے، اور سائمن کمیشن کی رپورٹ شائع ہونے سے پہلے ایک ایسی قابل قبول مفاہمت مکمل کر لیں گے جس میں سب کے مفاد محفوظ ہوں گے، اگر یہ ہو گیا تو گول میز کانفرنس میں ہندوستان کے نمائندے ایک متحدہ محاذ پیش کرنے کے قابل ہو جائیں گے اور کامیابی کے ساتھ اپنے اس مطالبہ پر اصرار کر سکیں گے کہ ہندوستان کا پیدائشی حق تسلیم کر لیا جائے اور وہ حق سوائے مکمل آزادی کے اور کیا ہو سکتا ہے! اور اگر ہندوستان کا یہ مطالبہ متحدہ طور پر پیش کر دینے کے بعد بھی تسلیم نہ کیا جائے تو اس کے بعد موقع ہو گا کہ کانفرنس سے واک آؤٹ کریں، اور ہندوستان کی ہستی اور کامل آزادی تسلیم کرائیں۔ اس حالت میں کسی کو بھی برطانیہ سے قطع تعلق کر لینے اور جنگ آزادی لڑنے میں کوئی عذر نہ ہو گا، بلکہ پھر تو ساری دنیا ہندوستان کے اس رویہ کو حق بجانب ٹھہرائے گی اور سارے ہندوستان میں ایک نئی زندگی اور تازہ دم پیدا ہو جائے گی۔

مہاتما گاندھی اور آزادی

۵ سال ہوئے خود مہاتما گاندھی نے اپنے خطبۂ صدارت بلگام میں ارشاد فرمایا تھا:۔

"میں علیحدگی کی ذمہ داری برطانوی قوم کے سر ڈالنا چاہتا ہوں، یہ برطانیہ ہی کا کام ہونا چاہئے کہ صاف صاف کہہ دے، کہ اُسے ہندوستان سے کوئی حقیقی اتحاد نہیں قائم رکھنا ہے مری خواہش یہ ہے کہ آزادی قائم کرنے سے قبل ہم میں خود بخود آزاد ہو جانے کی پوری صلاحیت پیدا ہو جائے، جب برطانیہ یہ اعلان کر دے کہ اس کا اصل مقصد ہندوستان کو اپنی مملکت میں مساوی درجہ دینے کا ہے، تب میں جو اسکیم بھی تیار کروں گا اس میں برطانیہ سے اتحاد قائم رکھنا ضرور شامل ہو گا، . . . . میں ہر کانگرسی سے درخواست کروں گا کہ وہ ہر حالت اور ہر صورت میں "آزادی" مل جانے پر اصرار نہ کریں کیونکہ جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ برطانیہ ہندوستان کو غلام بنانے ہی کے ارادہ سے تو بار بار انکار کرتا ہے مگر وہ درحقیقت چاہتا ہی ہے، اس وقت تک کامل آزادی پر اصرار کرنا بالکل غیر ضروری ہو گا"

یہ تھے مہاتما گاندھی کے ذاتی خیالات اُس وقت جب کہ لارڈ برکنہڈ اور لارڈ ریڈنگ برسر کار تھے اور جبکہ حکومت کے ایک رکن نے علانیہ فرمادیا تھا کہ اگست ۱۹۱۷ء میں حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے لئے درجۂ نوآبادیات کا ہرگز تسلیم نہیں کیا تھا، مہاتما گاندھی اب علیحدگی کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے رہے ہیں، اور "آزاد ہو جانے کی پوری حیثیت حاصل کئے بغیر" جو آزادی قائم کر رہے ہیں کہیں اس کا سبب یہ تو نہیں ہے کہ اب مسٹر بن اور لارڈ اروِن برسر عہدہ ہیں؟

کوئی شبہ نہیں، جو شخص تحریک ترک موالات کو ۱۹۲۲ء میں باردولی میں یک بیک بند کر سکتا ہے، وہ اسی حیرت انگیز تیزی کے ساتھ ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی کی مہم شروع بھی کر سکتا ہے، لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ ایک مرتبہ پھر "ٹھہرو" کا درس دے بیٹھے گا، جیسا کہ اس نے ۸ سال پہلے وائسرائے کو الٹیمیٹم دینے کے تھوڑے ہی دن بعد صادر فرمادیا تھا؟

پنڈت جواہر لال میں انقلاب؟

سمجھ میں نہیں آتا کہ جبکہ ہندوستانی والیان ریاست، لبرل اصحاب، ہندو مہا سبھا، مسلمان، اور خود آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے نصف ممبران یہ کہہ رہے تھے کہ تقاضائے عقل و مصلحت یہی ہے کہ گول میز کانفرنس کے نتیجہ کا انتظار کیا جائے اور دیکھ لیا جائے کہ وہ ہندوستان کے لئے کیا کرتی ہے، عین اس وقت پنڈت جواہر لال نہرو میں ایک دم سے "انقلاب" کیوں حلول کر گیا اور انہوں نے اچانک اور بے چینی کے ساتھ اس کی ضرورت کیوں محسوس کر لی، کہ گاندھی جی پر دباؤ ڈال کر وہ چیز منوالیں جو وہ دو برس سے ماننے سے گریز کر رہے تھے۔ یعنی یہ کہ کانگریس کا عقیدہ تبدیل کر کے "مکمل آزادی" کو قرار دے دیا جائے، یہی پنڈت جواہر لال نہرو تو تھے جنہوں نے اپنی صدارت کے زمانہ میں کانگریس کو، اپنا "مقصد" آزادی قرار دینے پر آمادہ کر لیا تھا، اور یہی گاندھی جی تھے جنہوں نے اس وقت آزادی کو "مقصد" قرار دینے کا بھی مذاق اڑایا تھا! ایک وقت وہ بھی تھا جب کہ اپنے انتساب کے بعد مہاتما گاندھی نے کانگریس کی رہنمائی کی ذمہ داری پنڈت جواہر لال نہرو کے کندھوں پر ڈال دی تھی اور جنہیں گاندھی جی نے ان کی خواہش کے خلاف، دہلی مینفسٹو پر دستخط کر دینے کے لئے آمادہ کر لیا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے خیالات میں یک بیک انقلاب پیدا ہو جانا، تعجب خیز نہیں تو اور کیا ہے!

مہاتما جی کا عصا

اب ذرا ہم اس صورت حال پر ایک نظر ڈالیں جن کی موجودگی میں آج سول نافرمانی اور عدم ادائیگی محاصل کی مہم شروع جا رہی ہے، ہمیں خود مہاتما جی کے عصا سے موقع کی موزونیت اور مہم کی معقولیت کی پیمائش کرنی چاہئے، ۵ سال ہوئے انہوں نے اپنے کانگریس کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا:-

دسمبر ۱۹۲۱ء میں ہم نے تشدد کا جواب سول نافرمانی سے دیا تھا اور حکومت کو دعوت دی تھی کہ جور و استبداد میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے، لیکن آج ہم اپنی کمزوری کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں، ہم سول نافرمانی کے لئے تیار نہیں ہیں، البتہ ہم اس کی تیاریاں شروع کر سکتے ہیں، سول نافرمانی کی تیاری کے معنے ہیں ڈسپلن ضبط نفس، عدم تشدد، پر امن مقابلہ، قلبی اتحاد، اور اول و آخر خدا کے ان احکام کی بلا کسی قسم کے پس و پیش کی تعمیل جو ہمارے علم میں آچکے ہوں، نیز انسانوں کے وضع کردہ ان قوانین کی تعمیل جو احکام خداوندی سے مطابقت کھاتے ہوں، بدقسمتی سے ہمارے اندر وہ ڈسپلن یا ضبط نفس نہیں ملتا جو ہمارے حصول مقصد کے لئے ضروری ہے، ہم یا تو تشدد پر اتر آتے ہیں یا برائی کا مقابلہ کرنے وقت نفسانیت سے کام لینے لگتے ہیں، ہم میں کافی اتحاد و ارتباط بھی نہیں ہے، اور جن قوانین پر ہم عمل کرتے ہیں، خواہ وہ خدا کے بنائے ہوئے ہوں یا انسان کے، ان کی بدرجۂ مجبوری پابندی کرتے ہیں نہ کہ برضا و رغبت ـــ موجودہ فضا سول نافرمانی کے لئے مناسب نہیں ہے اور سول نافرمانی ہی ایک غیر مرئی اور عدیم النظیر اسلحہ ہے جسے ایک مظلوم قوم استعمال کر سکتی ہے۔ اس اسلحہ کا بدل سوائے "تشدد" کے اور کوئی چیز نہیں ہے اور مجھے اندیشہ ہے، کہ موجودہ فضا میں تشدد سرایت کرتا جاتا ہے، ہندو مسلم فسادات کے ذریعہ ہم اسی کی ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں، جن

لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ہندوستان کی نجات تشدد ہی میں مضمر ہے، ان کو حق ہے کہ ہماری باہمی جنگ پر خوشیاں منائیں، کانگرس اپنے حاصل کردہ اعتماد کو قائم رکھنے کے لئے ایسے شرائط رکھے گی، جو اس کے مطالبات کو تقویت پہنچا سکیں، ان پابندیوں کے نفاذ سے پہلے، ہم ہندوؤں، مسلمانوں، عیسائیوں، سکھوں، اور پارسیوں وغیرہ کو متحد ہو جانا چاہئے، اسی طرح سوراجیوں، غیر تبدیلی پسندوں، لبرلوں، ہوم رولروں، مسلم لیگیوں .... اور دوسروں کو بھی متحد ہو جانا چاہئے، اگر ہم ایک آواز ہوکر اور اپنا مقصد سمجھ کر آگے بڑھیں تو کامیابی ہوگی .... ایک کانگرسی کی حیثیت سے کانگریس کا اتحاد قائم رکھنے کی خاطر، میں تحریک ترک موالات کو ملتوی کر دینے کا مشورہ دیتا ہوں، کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ قوم اس کے لئے تیار نہیں ہے"

اگر یہ حالات اب سے ۵ سال قبل کے تھے، جب کہ کانگرس نے خود مہاتما جی کے اعلان پر کہ "اگر میں کانگرس میں شامل رہوں گا اور اس کی رہنمائی کرنا چاہوں گا تو مجھے واقعات وحقائق کو ان کی اصلی شکل میں تسلیم کرنا ہوگا، اور کانگرس کو میرا مشورہ بھی ماننا ہوگا" کانگرس نے تحریک ترک موالات ہی کو ملتوی کر دیا تھا، تو کیا واقعات کو اُن کی اصلی شکل میں تسلیم کرتے ہوئے اگر ہم یہ کہیں کہ آج کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ اتحاد واشتراک تمام قوتوں کو مجتمع کر سکیں، تو کیا غلط ہوگا؟ کیا سول نافرمانی کے لئے آج ملک پہلے سے زیادہ تیار ہے؟ کیا اس وقت "ڈسپلن، ضبط نفس، غیر تشدد آمیز قوت مقابلہ، قلبی اتحاد، اور اول وآخر اُن احکام خداوندی کی بلا کسی قسم کے پس وپیش کے تعمیل جو ہمارے علم میں آ چکے ہیں، نیز انسانوں کے اُن قوانین کی تعمیل جو احکام خداوندی سے مطابقت رکھتے ہوں" پہلے سے زیادہ موجود نظر آتے ہیں؟ اس کا اقرار تو خود مہاتما جی نے بھی کیا ہے کہ آج کی فضا میں بمقابلہ گزشتہ ۵ سال کے، تشدد کا زیادہ زور دکھائی دیتا ہے، کانگرس نے اپنے مطالبات منوانے کے لئے آج کون سے نئے نئے امدادی ذریعہ پیدا کر لئے ہیں؟ ہندو اور مسلمان اب بھی متحد نہیں ہیں اور نہ سوراجیوں، غیر تبدیلی پسندوں میں، یا لبرلوں میں، ہوم رولروں، اور مسلم لیگیوں میں کوئی اتحاد ہوا ہے، ان حقائق کے ہوتے ہوئے بھی، غالباً کانگرس کے اثر کو برقرار رکھنے کی خاطر، مہاتما گاندھی نے، تحریک ترک موالات کو ملتوی کر دینے کے بجائے، جیسا کہ انہوں نے ۵ سال قبل پنڈت موتی لال نہرو کے بے محل مشورہ پر عمل کرتے ہوئے کیا تھا، آج پنڈت جواہر لال نہرو کے بے موقع مشورہ پر عمل کرتے ہوئے عدم ادائگی محاصل کی مہم شروع کر دینے کا فیصلہ صادر فرمایا!

گاندھی جی کے اُس خطبۂ صدارت سے، جس سے اوپر چند حوالے دئے گئے ہیں، ایک جملہ اور نقل کیا جاتا ہے، انہوں نے کہا تھا:۔

"اب ہمارے متعلق کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملنا چاہیئے، جیسا کہ ایک مرتبہ لارڈ ولنگڈن نے بجا طور پر کہا تھا کہ ہم میں "نہیں" کہنے کی نہ ہمت ہے نہ قوت اگر آپ میری تجویز کو نامنظور کر دیں گے، اور وہ بھی اس بناء پر کہ آپ کو وہ مطمئن نہیں کر سکتی، تو بلاشبہ میں اُسے سوراجیہ کی طرف ایک ترقی کن قدم سمجھوں گا"

مہاتما جی کے اس کلیہ کے مطابق تو مسلمانوں کو، جو اقلیت والے فرقوں میں سب سے زیادہ اکثریت اور بھاری غلبہ رکھتے ہیں،

داد دینی چاہیئے، کہ وہ سوراجیہ کی طرف "ترقی پسندانہ قدم اٹھا رہے ہیں" اور "نہیں" کہہ کر ثابت کر رہے ہیں کہ ان میں ا انکار کی "ہمت" بھی ہے اور "قوت" بھی! مسلمان اب دعا کریں گے کہ اللہ تعالیٰ مہاتما جی کو اتنی "ہمت اور قوت عطا فرمائے "کہ وہ اپنا قدم پیچھے ہٹا لیں، اور ملک کی تقدیر "بازی" پر نہ لگائیں! اگر وہ ایسا کریں گے، تو ان کی اور ہندوستان کی موجودہ سیاسی زندگی میں یہ کوئی پہلا واقعہ نہ ہوگا، انہوں نے تو پہلے بھی کئی بار اپنی مہلک غلطیوں کا اقرار کیا ہے، یاد رکھنا چاہیئے کہ مہاتما گاندھی ہندوستان کا مقصود اصلی "کامل آزادی" معین کرنے کے ہی حق میں نہیں تھے، اور مدراس کانگر کے بعد انہوں نے اپنے اخبارات میں جس قسم کے خیالات ظاہر کیئے ہیں، اُن کا اگر آج کے خیالات سے مقابلہ کیا جا تو مطالعہ کرنے والے کا دماغ ایک مرتبہ تو ضرور چکر کھائے گا!

پورے ہندوستان کو متحدہ طور پر دعا کرنی چاہیئے کہ مہاتما جی ایک مرتبہ اور اپنی غلطی کا اقرار کر لیں اور یہ اقرار ا مہلک شکل اختیار کرنے ... پورے ملک کو قعر مذلت میں گر جانے سے پہلے ہی کر لیں!

مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے؟

مسلمانوں کے لئے مناسب نہ ہوگا کہ ایک جواری کی طرح تقدیر آزمائی کے طور پر اپنا پانسہ پھینک دیں، یہ بڑی خ قسمتی ہے کہ اس وقت کوئی مسلمان لیڈر بھی ایسا کرنا نہیں چاہتا، جو معدودے چند مسلمان ایسا کر رہے ہیں، وہ در حقیقت نام و نمود کی خاطر کر رہے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کی "قوم پروری" کے مدوجزر کا پہلے ہی سے ایک عجیب و غریب "چ تیار ہو چکا ہے، وہ یکساں عمل کرنے اور صبر آزما تعمیری کام انجام دینے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے، مسلمان قوم کی دینی دنیاوی فلاح و بہبود کے لئے تعمیری ہی قسم کا کام ہونا چاہیئے، آج کل کے مسلمان، جن کے قائدین نے مجلسی اتحاد کے بہ سوچ نکالے تھے، ایک بے معنی رسمیات کے پابند ہو کر، اسلام کی اصل روح کھو بیٹھے ہیں۔

یہ اکثر سوال کیا جاتا ہے کہ اس وقت جمعیت خلافت کا پروگرام کیا ہے؟ اس کا سب سے زیادہ صحیح جواب ہے "س اس سوال کے جواب میں یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ "آج کل مسلمان کون سا ایسا بہتر کام کر رہے ہیں جس میں اصلاح و تر ضرورت ہی باقی نہیں رہتی؟ "جمعیت خلافت کے ذمہ یہ کام ہے کہ ہر شعبۂ زندگی میں اصلاح کرے، مسلمانوں کی از سر نو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان میں اتحاد اور خود اعتمادی پیدا کرے، جمعیت چاہتی ہے، کہ مسلمان اپنے پیروں آپ کھڑے اور اسلام اور ہندوستان کی آزادی کے لئے سب سے لڑیں اور سب سے اتحاد کر لیں، تمام بالغ مسلمانوں کو جو جمعیت بن سکتے ہیں، چاہیئے کہ اپنا پروگرام خود بنا لیں، اور اپنی رہنمائی کے لئے جس کو پسند کریں رہنما بنا لیں، جمعیت خلافت کا استخلاص وطن ہے نہ کہ غلامی، اور جس طرح وہ مسلمان قوم کو برطانیہ کی غلامی میں رہنے سے منع کرتی ہے ٹھیک اُسی طرح وہ اپنی فرقہ کا غلام بن جانے سے بھی روکتی ہے، وہ آزادی کی بھوکی ہے، وہ آقاؤں کی تبدیلی ہرگز پسند نہیں کرتی مسلمانوں کو چ آنکھیں کھلی رکھیں اور صورت حال پر نظر غائر ڈالتے رہیں وہ اُن لوگوں کے ساتھ اپنی قسمتیں وابستہ رکھ سکتے ہیں جو آ کو ہندوستان کا پیدائشی حق تسلیم کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کا یہ حق بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ملک کے نظام میں ا اور برابر کے حصہ دار کی طرح شریک ہونا چاہیئے۔

لیکن یہ ساری باتیں بیکار ہیں اگر مسلمان تعمیری کام کی طرف رجوع نہ ہوں بلکہ ہنگامہ آرائی کو پسند کرتے ہوں، اُن کو "آتشبازی
ماشہ" دیکھنے والا نہیں بلنا چاہئے، جمعیت خلافت کی مجلس عاملہ نے اپنے صدر کو اختیار دے رکھا ہے کہ جب کبھی ان کی
ئے میں صورت حال ایسی نمودار ہو جائے کہ اس پر غور و فیصلہ کے لئے اجلاس خصوصی کا انعقاد ضروری ہو تو وہ خاص اجلاس
وکر سکتے ہیں جمعیتہ خلافت اس وقت مسلمانان ہند سے اپیل کرتی ہے کہ اراکین جمعیت کی موجودہ تعداد میں کم سے کم ۵ لاکھ
دوں کا اور ۵۰ ہزار رضاکاروں کا اضافہ کردیں، اس طرح جب وہ اپنی زندگی کا عملی ثبوت پیش کردیں گے، تو وہ دوسروں کو بھی
ر کردیں گے، کہ ان کی انفرادیت تسلیم کرلیں، اور ان کے حقوق کا احترام کریں، اس کے بغیر ان کی حالت صرف
بیان "کی سی رہ جائے گی، خواہ حکومت اجنبی ہو یا ہندوستانی، یہ تو خود مسلمانوں ہی کا فرض ہوگا کہ اپنے متعلق کوئی فیصلہ
ں، اور الفاظ کے بدلے عمل سے ثابت کریں کہ اُن کو "آزادی" عزیز ہے یا غلامی ؎

همت بلند دار که نزدِ خدا و خلق
باشد بقدرِ همتِ تو، اقتدارِ تو

بیانِ واقعہ

گاندھی جی دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے تھے، پہلی گول میز کانفرنس ان کی شرکت کے شرف سے محروم رہی تھی، اس اجتماع میں نمائندگان کانگرس کے علاوہ ہر سیاسی جماعت کے مندوب موجود تھے، لارڈ اروِن (اب لارڈ ہالی فیکس) وائسرائے تھے، ان کے اصرار سے متاثر ہو کر، شخصی حیثیت سے محمد علی نے پہلی گول میز کانفرنس (سنہ ۱۹۳۰ء) میں شرکت منظور کر لی۔

بڑا نازک وقت تھا، ہندوستان کا ذرّہ ذرّہ محمد علی کا مخالف ہو رہا تھا، ہندو تو خفا تھے ہی، خود مسلمانوں کا نیشنلسٹ طبقہ شورِ اختلاف سے زمین و آسمان میں تزلزل پیدا کئے دے رہا تھا، اس وقت کے نیشنلسٹ مسلمان آج کے سے "معتکف بیت حزن" نہیں تھے، اس وقت ان کی چڑھی بارگاہ تھی، اور وہ اپنے حلق کی پوری طاقت اور اپنے قلم کا سارا زور محمد علی کے خلاف صرف کر رہے تھے۔

محمد علی کی زندگی اس وقت ابتلا کے سخت ترین دور سے گزر رہی تھی، مالی مشکلات کے سبب "ہمدرد" بند ہو چکا تھا، مسلم پریس کا بڑا حصہ ان کا مخالف تھا، اس لئے ان کے خلاف تو دفاتر طلسم ہوشربا تیار ہو رہے تھے، اور ان کے توضیحی، اور تشریحی، اور صفائی کے بیانات کے لئے، مخالف اخبارات میں کوئی گنجائش نہیں تھی، وہ محمد علی کا مذاق اڑا سکتے تھے، اس کی شخصیت پر ناروا، اور نازیبا حملے کر سکتے تھے، اس کے خلاف غلط بیانیوں، اور تہمت تراشیوں کا انبار تیار کر سکتے تھے، لیکن محمد علی کا جواب دعویٰ شائع کرنا کسی کو بھی گوارا نہیں تھا۔

صرف یہی نہیں، محمد علی کی جان ناتوان امراض و آلام کا مجموعہ بھی تھی، اس کی ایک آنکھ ناکارہ ہو چکی تھی، دوسری آنکھ کی بینائی جواب دے رہی تھی، گٹھیا کے اثرات بھی طاری تھے، ذیابیطس کے حملے بڑی شدت کے ساتھ ہو رہے تھے، دوستوں کا ——— اب دوست ہی کتنے رہ گئے تھے! ——— تقاضا تھا، کہ محمد علی آرام کریں، حکیموں، اور ڈاکٹروں کا حکم تھا کہ وہ کسی قسم کا ذہنی اور دماغی کام نہ کریں، عزیزوں کا اصرار تھا کہ وہ اتنے طویل سفر کا ارادہ ترک کر دیں، لیکن یہ کمزوریاں ایک مجاہد سے سرزد نہیں ہو سکتی تھیں، محمد علی ایک مجاہد تھا وہ دم توڑ رہا تھا، لیکن میدانِ جنگ میں جانے پر مچلا ہوا تھا!

ہندوستان کے مسلمان اس وقت تک پاکستان کے تخیل سے ناآشنا تھے، وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ ہندو اکثریت کے دورِ حکومت میں ان کے حقوق محفوظ ہوں، تحفظ حقوق کے سلسلہ میں، وہ نئی نئی تجویزیں اور تدبیریں سوچا کرتے تھے۔

اس وقت کی سیاسیات میں سب سے بڑا اور لاینحل مسئلہ، انتخاب کا تھا، مجالس آئین ساز اور بلدیات کا انتخاب مخلوط ہو یا جداگانہ؟ مشترک حلقہ ہائے انتخاب سے ہندو اور مسلمان کھڑے ہوں یا ہندو اپنے حلقہ سے، اور مسلمان اپنے حلقہ سے جو قوم پرست تھے وہ کہتے تھے، مخلوط انتخاب رائج ہونا چاہیئے جو فرقہ پرست تھے وہ جداگانہ انتخاب پر اڑے تھے، محمد علی نہ قوم پرست تھا نہ فرقہ پرست تھا، وہ صرف حق پرست تھا، وہ چاہتا تھا ہندو مسلمانوں کے حق پر ڈاکہ نہ ڈالیں، اور مسلمان ہندوؤں کا حق نہ غصب کر سکیں، اس لئے اس نے علالت اور بیماری کے باوجود، ذہنی اور دماغی اُلجھنوں کے باوجود، بستر علالت پر، پڑے پڑے، ایک اسکیم تیار کی، جو انتخاب کے معاملہ میں "حرف آخر" کہا جا سکتا تھا، اور آہ کہ یہی اس کی زندگی کا حرف آخر ثابت ہوا۔

کمزور دماغ اس بوجھ کو برداشت نہ کر سکا، وہ بستر علالت پر لیٹے لیٹے یہ اسکیم ڈکٹیٹ کراتا رہا، اور یہ کام ختم ہوا تو اس کی زندگی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی گل ہوگیا، دماغ کی رگیں پھٹ گئیں، اور تدبر و تفکر کا وہ سرچشمہ ہمیشہ کے لئے خشک ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ؁

محمد علی کی اسکیم سے پہلے ان کے برادر بزرگ ضیغم اسلام مولانا شوکت علی کا تمہیدی نوٹ بھی درج کیا جاتا ہے، اس سے اس اسکیم کے ماحول کو سمجھنے میں اور زیادہ امداد ملے گی۔

رئیس احمد جعفری

ہوں بے ہراس یہ مجھے رکھیں کسی جگہ
ڈر ہو وہاں کہ تیری حکومت جہاں نہ ہو
قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

عرضِ حال

اس حقیقت سے ہر شخص واقف ہے کہ میرا بھائی اسلام اور ہندوستان کے مفاد کی خاطر نڈر اور انتھک کوش
ساتھ ہمیشہ کام کرتا اور لڑتا رہا آخر میں اس کی بیماری نے تشویشناک صورت اختیار کر لی تھی، صحت جسمانی بد سے بد
اور اس کے تمام دوست و اطباء اس کو متنبہ کر رہے تھے کہ وہ ہندوستان کو ایسی حالت میں نہ چھوڑے، جبکہ اس
میں ہو مگر اس نے کسی کی نہ سُنی اور انگلستان کو روانہ ہو گیا تاکہ وہ اس گول میز کانفرنس کی کاروائی میں شریک ہو جو ہند
انگلستان اور اس کے ملحقین کے درمیان ایک صحیح اور باعزت سمجھوتہ کے لئے منعقد کی گئی تھی، محمد علی نے اپنے
طبی مشیر کاروں کی تنبیہ کا صرف یہ جواب دیا کہ ایک سپاہی کا فرض ہے کہ جب اس کا مذہب و ملک خطرہ میں ہو
جوکھوں میں ڈال کر اپنے فرض منصبی کو پورا کرے خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ اس کے چند ساتھی اس سے برگشت
اور ان کا ایک اہم گروہ اس کے مشورے سے انکار کر دے، اور اس لائحہ عمل کو قبول نہ کرے جس کو تمام مختلف
ایک زبردست اکثریت نے بالاتفاق منظور کر لیا ہو، محمد علی نے کہا کہ میں اپنی ساری زندگی کام کے لئے زندہ رہا،
اپنے آرام و صحت کی خاطر کام سے منہ موڑ لینا ایسا فعل مجرمانہ ہو گا، جو صرف نامردوں اور بز
لئے موزوں ہے۔

وائسرے ہند لارڈ ارون کے خلوص اور نیک نیتی پر اس کا یقین تھا اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ہن
شہزادگان، لبرل جماعت، اچھوت جماعت، اور مسلم پبلک کی کثیر جماعت کے مطالبات کی تائید میں اپنی آواز
برطانوی پارلیمنٹ اور برطانوی لوگوں کی طرف سے اتحاد عمل کی اس کو کچھ زیادہ امید نہ تھی پھر بھی اس نے فیصلہ کر لی
آخری مرتبہ ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کو برطانیہ کے سامنے پُرزور الفاظ میں صفائی کے ساتھ بیان کر دیا جا
ہندوستان جنت نشان کی تبدیل شدہ حالت کا صحیح طور سے اندازہ کر لیں، اس کے بعد بھی اگر وہ اپنی پرانی غلط پال
اور ہندوستانیوں کے ساتھ بے اعتمادی کا برتاؤ کرتے رہیں تو ان کو اختیار ہے۔

بدقسمتی سے انڈین نیشنل کانگرس نے مہاتما گاندھی اور اُن کے ساتھیوں کی قیادت میں پرانے رفقار کا
مشوروں کو نظر انداز کرتے ہوئے تحریک سول نافرمانی پورے زور شور کے ساتھ جاری کر دی جو حکومت برطانیہ
جنگ سے کسی طرح کم نہ تھی، اور جس نے اپنے اُن ہم وطنوں کو بھی محفوظ نہ چھوڑا، جو اس سے اختلاف رائے رکھ

تھا اور اس کو اپنے یقین کامل پر پورا بھروسہ تھا، صداقت وحق گوئی کی راہ سے کوئی زبردست سے زبردست طاقت اس کا
منہ نہیں موڑ سکتی تھی، ذاتی خطرات کی وہ ذرہ برابر پرواہ نہ کرتا تھا، اور اس نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ وہ صلح وآشتی کے حصول میں
اپنی جان تک کی پرواہ نہ کرے گا، اخبارات کا ایک فرقہ اور جماعتی پروپیگنڈا کرنے والوں کا ایک گروہ محمد علی پر لعن طعن کرنے
میں برابر مشغول رہا، اس مسلسل مخالفت نے محمد علی کو مضبوط سے مضبوط تر بنا دیا، خدا کے فضل وکرم سے مسلم جماعت اس کے
ساتھ تھی، اور وہ باوجود اپنے بہت سے کمزور اور نرم دل ساتھیوں کی مخالفت کے بہادری کے ساتھ تن تنہا لڑتا رہا، اور
اپنی پالیسی کی جرأت، خوش مزاجی، اور عقلمندی کے ساتھ حمایت وتائید کرتا رہا، کام کی سختی نے اس کو ہلکان کردیا، اور اس نے
خوشی خوشی آخری وقت تک لڑتے ہوئے اپنی جان عزیز قربان کردی، میرے خیال میں وہ اپنی موت سے ایسا کام کرگیا
ہے جو اگر آج وہ زندہ ہوتا اور پر مغز لیکچر وخطبات دیتا ہوتا یا اخبارات میں بہترین مضامین لکھتا ہوتا تو تب بھی
نہ کرسکتا۔

تمام حضرات سے میری گزارش ہے کہ وہ ان پیش کردہ چند صفحات کو جس میں محمد علی نے اپنے دلی مقاصد کا اظہار
کیا ہے، صفائی قلب، احتیاط اور توجہ کے ساتھ پڑھیں، محمد علی اپنے خدا کو منہ دکھانے جا رہا تھا، اور اس کی جیسی طبیعت والا
کوئی مرتے وقت جھوٹ نہیں بول سکتا، محمد علی بڑا زبردست انشاپرداز تھا، اور اس کا طرز تحریر پر مغز وپر مذاق، ہونے کے
ساتھ ساتھ ہمیشہ نہایت زوردار، اور دلچسپ بھی ہوتا تھا، مگر ان پیش کردہ صفحات میں بہت سے دوست محسوس
کریں گے کہ اس کا طرز تحریر غیر معمولی طریقہ سے سادہ اور دل سوز ہے اور تمام لوگوں کو موجودہ صورت حال کی سنجیدگی کو اچھی
طرح محسوس کرنے کے لئے آخری مرتبہ متنبہ کررہا ہے، برطانیہ اور برطانوی لوگوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی ہندوستان
کے ۳۵ کروڑ نفوس کی آئندہ بہتری وخوش حالی موجودہ صورت حال کی پیچیدگیوں کو رفع کرنے پر موقوف ہے۔
محمد علی نے مخلوط انتخاب کی موافقت کی تھی، اور ۱۹۲۷ء و ۱۹۲۸ء میں مسلمانوں کی اکثریت کو مشترکہ انتخاب کے
(جو ان کے لئے محفوظ رکھا گیا تھا) ترک کرنے پر راضی کرلیا تھا، اس وقت بدقسمتی سے مہاسبھائی ہندوؤں کی طرف سے
ہی نہیں بلکہ کچھ نام نہاد قوم پرست رفقائے کار کی طرف سے بھی غیض وغضب اور غیر رواداری کا اظہار کیا گیا، مگر محمد علی نے
اس کی پرواہ نہ کی، اس نے اچھی طرح مسلمانوں کی اکثریت کے مشترکہ انتخاب کے مطالبہ کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا مسلم جماعت
ہندوؤں کی (جو ہندوستان میں ۷۵ فی صدی ہیں) ایمانداری، راست بازی، اور انصاف پسندی پر اعتماد نہیں کرسکی،
مسلمانوں کو ہندوؤں کی جماعت کے متعلق یہ شبہ ہوا کہ وہ فیاض طبیعت نہیں ہے، کیونکہ خود اپنے لاکھوں ہم مذہبوں کے ساتھ
جماعت ایسا برتاؤ کررہی تھی اور ان کو ایسے حقوق کے دینے سے بھی انکار کررہی تھی، جو کتوں، گھوڑوں، بکریوں اور بھینسوں
جیسے حیوانوں کو دئے جاتے ہیں، ان حیوانوں میں گائے کو شامل کرنا تو محض بے کار ہے، کیونکہ وہ تو مقدس سمجھی جاتی ہے،
متعصب لوگ اس کی پوجا کرتے ہیں۔
محمد علی یہ چاہتا تھا کہ وہ تعصب سے بھری فرقہ وارانہ ذہنیت کا خاتمہ کردے، اس لئے اس نے صورت حالات کی
نزاکت کا اندازہ کرتے ہوئے مشروط مخلوط انتخاب کی ایک ایسی صورت پیش کی جو ہر ہندو اور مسلمان کو مجبور کرے گی کہ

وہ اپنے انتخاب کے لئے دونوں مذاہب کے پیرؤں کے پاس جائے اور اس طرح پر آپس کی اخوت کو بڑھانے کے ساتھ
ایسے آدمی کو منتخب نہ ہونے دے جو کٹر متعصب اور فرقہ پرست ہو، اس طرح پر ایسے لوگ منتخب ہو سکیں گے جو ہند
مسلمان دونوں کے پسندیدہ ہوں گے، اس طریقہ سے اکثریت اور اقلیت دونوں مطمئن ہو سکیں گی، اور تنگ دلی و فرقہ
تعصب کا جو آجکل اکثر قوم پرستی اور حب وطن کے جامہ میں نظر آتا ہے، سدباب ہو جائے گا، میں مہاتما گاندھی، انڈین
کانگرس، اور تمام ہندوؤں سے التجا کرتا ہوں، کہ وہ مادر وطن کے ایک بڑے بہادر اور قابل سپوت کی وصیت کو
سنیں، اور اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں، جس نے میدان جنگ میں آخر وقت تک لڑتے ہوئے خوش
جان قربان کی ہے۔

بدقسمتی سے انگلستان میں اس کی صحت اس درجہ خراب ہو گئی تھی کہ وہ چلنے پھرنے سے بھی معذور تھا، پھر بھی میں۔
اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ آخر وقت تک اپنے جسمانی درد و تکلیف کے باوجود اپنے فرض منصبی کی انجام دہی میں چاروں ط
مارا پھرتا رہا، اگر اس نے احتیاط کے ساتھ ٹھنڈے دل سے کام کیا ہوتا تو ممکن ہے فائدہ زیادہ اور نقصان کم ہوتا مگر
بے چینی و غلط فہمی کے دور میں آرام و سکون اس کے لئے ناممکن الحصول تھے، بہرحال جو کچھ اس سے ہو سکا وہ اس
اور آخر میں ایک بہادر سپاہی کی طرح ہنستا ہوا اس دنیا سے رخصت ہو گیا، اس کے آخری الفاظ میری گویائی سے
زیادہ ہیں، اور میں پوری امید رکھتا ہوں کہ انگریز، سکھ، اور ہندو، ان کو غور سے پڑھیں گے میری دعا ہے کہ خدا محمد
آخری پیغام سے ان تمام لوگوں کے دل نرم کردے اور ان کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ صحیح صلح کے لئے تیار ہو جائیں، مجھ
معلوم ہے، کہ وہ تمام محمد علی کی عزت کرتے تھے، اور اب اس کے مرنے کے بعد اور بھی زیادہ عزت کرتے ہیں، جہ
مسلمانان ہند یا مسلمانان عالم کا تعلق ہے ان کا تو وہ عزیز ترین محبوب تھا، مذہب اسلام کے ساتھ محمد علی کا شغف اور
ملتیں کی خاطر اس کی سرفروشانہ کوشش ہر مسلمان کے دل میں محمد علی کے لئے گھر بنا گئیں ہیں، مسلمانان ہند کے م
محمد علی کی اندرون ہند و بیرون ہند کوششیں ایسی تھیں جن کا انعام آج اس کو مل رہا ہے، سب لوگ اس سے محب
تھے، اور آج اس کی جدائی پر ماتم کناں ہیں مجھ کو یقین کامل ہے کہ یہ پیش کردہ صفحات جو محمد علی نے اپنے خون سے
ہر شخص پر خاطر خواہ اثر کریں گے۔

ماہرین فن اطبا نے مجھ سے کہا کہ محمد علی کی موت قلب کے رک جانے یا گردہ کی تکلیف سے نہیں ہوئی بلک
اصلی سبب یہ تھا کہ آخری یادداشت کے لکھانے میں اس کے دماغ پر اس قدر غیر معمولی زور پڑا کہ دماغ کی رگیں پھٹ گئیں، ڈ
خیال ہے کہ دماغ میں کئی دن پہلے سے خون بہہ رہا تھا اور اس غیر معمولی کام کی وجہ سے فالج کا اثر ہو گیا، جس کے سبب
بجے اٹھنے کے بعد سے وہ کچھ بات چیت نہ کر سکے، اور بالآخر ۴ جنوری کی صبح کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے، آخ
بے ہوش ہونے سے قبل محمد علی دو گھنٹہ تک نواب سر عبدالقیوم صاحب سے صوبۂ سرحد کی اصلاحات کے متعلق بات
رہے، اور مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ کسی مفاہمت کو اس وقت تک تسلیم نہ کریں، جب تک کہ اس میں ہندوست
بہادر ترین فرزندان توحید یعنی صوبۂ سرحد کے بھائیوں کے مطالبات پورے نہ ہوں، اس کے علاوہ دو گھنٹہ تک

بھٹو سے صوبہ سندھ کے متعلق باتیں کرتے رہے، اس صوبہ سے ان کو سب سے زیادہ محبت اس لئے تھی کہ ہندوستان میں اسلام یہیں سے داخل ہوا تھا، باقی گھنٹہ لاہور کی ایک بہن بیگم عزیز کے ساتھ گفتگو کرتے رہے، غرض اس طرح پر وہ مرتے دم تک بہادر مجاہد کی طرح کام کرتے ہوئے رحلت کر گئے، خدا مرحوم کی روح کو جوار رحمت نصیب کرے، اور اس کے رفقاء کار کو اس بات کی توفیق دے کہ وہ اس کے آخری مشورہ کو قبول کریں۔

آج محمد علی بیت المقدس میں حرم شریف کی ارض پاک میں آرام سے سو رہا ہے، لکھو لکھا بہادر عرب اپنے بہادر بھائی کی بہادر موت سے چوکنا ہو کر سرگرم عمل ہو گئے ہیں، مجھے اس بات کا پوری طرح یقین ہے کہ صلح کی خاطر محمد علی کے جان دینے نے انگریزی قوم کے دلوں پر بہت اچھا اثر کیا ہے، کیونکہ ان کو اچھی طرح علم تھا کہ محمد علی حکومت کا سرکش و باغی اس لئے تھا کہ وہ حکومت اسلام اور مادر وطن کے ساتھ غیر دوستانہ برتاؤ رکھتی تھی۔

اب میرے خیال میں انگریزی قوم کے افراد کے دلوں میں ایک حقیقی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے، اور اس وقت میں کھلے الفاظ میں ان کی اس ہمدردی اور مہربانی کا اعتراف کرتا ہوں جو انہوں نے میرے بھائی کی موت کے وقت بیگم محمد علی، میرے اور ہمارے خاندان کے ساتھ برتی ہے، جب اجنبی قوم کی طرف اس طرح کا برتاؤ ہوا تو مجھے اپنے ہندوستان کے ہندو، سکھ، اور مسلمان بھائیوں کی طرف سے اور بھی کچھ زیادہ کی امید ہے، محمد علی آخر وقت تک ایک باعزت صلح کے لئے لڑتا رہا، اور اب میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اس کام کو پورا کئے بغیر چین نہ لوں گا، اور اسی ذریعہ سے محمد علی کی روح پُر فتوح کو آرام و سکون نصیب ہو سکے گا، میری ہر مسلمان مرد اور عورت سے درخواست ہے کہ وہ اس مشکل کام میں میری مدد کرے، خداوند تعالیٰ سب سے مضبوط اور طاقتور ہے، اور ہم اسی کے بھروسہ پر کام کر رہے ہیں وہ انشاء اللہ ہمیں فتح یابی نصیب کریگا۔

اب وقت آگیا ہے کہ تمام مختلف الرائے بھائی یکجہتی سے آگے بڑھیں، اور اندرون ہند و بیرون ہند اسلام کے علم کو بلند کریں، اس میں شبہ نہیں کہ سامنے خطرات موجود ہیں، مگر خطرات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لئے ہی مسلمان پیدا کیا گیا ہے، کمر ہمت باندھ کر آگے بڑھیں تو خدائی امداد ہمیشہ ہمارا ساتھ دیگی اب الفاظ و تقاریر کا وقت نہیں ہے، کام اور متحدہ کام ہی میں ہماری نجات مضمر ہے، میں اپنے امیر و غریب سب بھائیوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ آگے بڑھ کر ہماری تاریخ کے اس نازک دَور میں تنظیم المسلمین کے کام میں ہماری مدد کریں، اپنے امیر بھائیوں سے میں خاص طور پر کہوں گا، کہ وہ ہمارے اور ہمارے اسلام کے خطرہ میں گھرے ہونے کے وقت مبہوت نہ ہو جائیں، بلکہ خدا پر بھروسہ کر کے دامے درمے امداد کریں، خدا سب کی مدد کرے۔ آمین

شوکت علی خادم کعبہ

دریا گنج دہلی

۳۰ مارچ ۱۹۳۱ء

آخری مشورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لندن، ہائڈ پارک ہوٹل، یکم جنوری ۱۹۳۱ء

جنابِ والا۔

جیسا کہ میں نے کانفرس کے اجلاس میں کہا تھا، میری صحت اتنی خراب ہے، کہ میں گول میز کانفرنس کی شرکت کے سفر کرنے کے کسی طرح قابل نہ تھا، خاص کر جیسا کہ میرے ڈاکٹر آپ کو بتا سکتے ہیں، اور اُن ترددات کو برداشت کرنے کے ب قابل نہ تھا، ۱۹ دسمبر کو میں بیہوش ہوگیا، اور ۴۸ گھنٹہ سے زیادہ بے ہوش رہا، میری نبض کی رفتار ۴۰ احرارت صرف ۹۷ بھی کم ہو کر ۹۵ رہ گئی تھی اور میرا تنفس ۳۰ تھا، اس حالت میں بھی جس کام کے لئے میں یہاں آیا تھا، اُس کے کرنے کی خوا میرے اندر اس قدر قوی تھی، کہ میں نے لارڈ چانسلر کو ۸ بجے شام کو ناشتہ کی دعوت دی، یعنی شام کے وقت کو وقت سمجھا! دوسرے دن انہوں نے کرم فرمایا، لیکن میرے بھائی نے اُن کو صرف دس منٹ کے لئے مجھ سے ملنے کی ا دی، اور اس مختصر وقت میں بھی نہایت دشواری کے ساتھ اپنے خیالات اُن پر ظاہر کر سکا۔

چونکہ میری یہ خواہش تھی کہ میں ہز مجسٹی کی گورنمنٹ اور پارلیمنٹ کے نمائندوں اور نیز ہندوستانی نمائندوں (جو میر خیالات سے کسی حد تک واقف بھی تھے) کو اپنے خیالات سے مطلع کرنے کے لئے اُن خیالات کو حیطہ تحریر میں لے آؤ لئے میں نے آپ سے یہ درخواست کی تھی، کہ آپ مہربانی فرما کر میرے پرانے دوست سر جوفری کاربیٹ جس سے میری چھندواڑہ میں شروع ہوئی تھی میرے پاس ہوں تاکہ اُن کی موجودگی میں اقلیتوں کے متعلق، جن کی کمیٹی کا میں ممبر ہوں، میر خیالات قلمبند کر لئے جائیں۔

سب سے پہلے میں یہ کہنا چاہتا ہوں، کہ ہندو مسلم سوال کا نام اقلیتوں کا سوال رکھنا بالکل غلط ہے، ہندوستا بلا شبہ کچھ اقلیتیں ضرور ہیں، اور یقیناً ہم کو ان کے لئے ایسا انتظام کرنا چاہئے کہ وہ یہ محسوس کریں کہ آئندہ حکومت ہند، بعض یا دو، اقوام کی حکومت نہ ہوگی، بلکہ تمام ہندوستانیوں کی حکومت ہوگی جس میں ذات اور عقائد کا امتیاز باقی نہ ہوگا، تاہم حکومت کے متعلق اہل ہند کی ذمہ داریوں کے راستے میں ایک مشکل ضرور ہے، اور وہ ان اقلیتوں کا سوال نہیں ہے ہرے اختلافات کا سوال ہے جو ہندو اور مسلمانوں کے درمیان موجود ہے، یہ حقیقت اس قدر واضح ہے کہ مجھے تاریخی ح

بے شمار اور اعداد و بیان کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن میں ایک دو باتیں خاص طور پر زور دے کر بیان کر دینا چاہتا ہوں، جس سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ ہندو مسلمان کا سوال اقلیتوں کے سوال سے بالکل مختلف ہے، سب سے اول یاد رکھنا چاہئے کہ مسلمان ہندوستان پر آٹھویں صدی کے آغاز سے ۱۹ ویں صدی کے وسط تک، کسی نہ کسی صورت میں اور ملک کے کسی نہ کسی حصہ میں حکومت کرتے رہے، اسلام اور اتنے عرصہ تک کسی دوسری قوم نے ہندوستان میں حکومت نہیں کی، سکھوں کی ایک نسل نے تنہا پنجاب کے صوبہ پر کچھ روز حکومت کی، یہ حکومت محض ایک اتفاقی واقعہ تھا، میرا یہ مطلب نہیں کہ میں سکھوں کی شجاعت پر حرف رکھوں، درانحالیکہ میں ان کے نظام کو بہت احترام کی نظر سے دیکھتا ہوں، اسی طرح مرہٹوں کی لوٹ مار، اور ان کی متحدہ در وبست ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ کے ہم پلہ نہیں ہے، اس کے بعد خواہ فوجی فتوحات یا سیاسی چالاکیوں کے ذریعہ سے اسلامی حکومت آخرکار مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر برطانیہ کے ہاتھ میں گئی، سوائے بعض ہندوستانی ریاستوں کے جو عہد قدیم سے ہندوؤں کی مخصوص ریاستیں ہیں، اور جو اپنی نسل کا سلسلہ چاند سورج سے تبلاتے ہیں، ان ہندو ریاستوں کا تعلق مسلمانوں کی حکومت کے ساتھ جو کچھ بھی رہا ہو، لیکن اس میں تو ذرا شک نہیں کہ ان ریاستوں نے ہمیشہ اسلامی حکومت کے ساتھ گہری وفاداری کے عقائد وابستہ رکھے، اور ان کو اپنے معاملات میں ایسی آزادی حاصل رہی جس سے برطانوی اقتدار کے زمانہ میں وہ محروم ہو گئیں ان کے علاوہ بعض ریاستیں وہ ہیں جو مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد پیدا ہوئیں، اور برطانوی حکومت نے اس کے وجود کو تسلیم کر لیا، بعض ریاستیں مثلاً حیدرآباد کمپنی سے ابتدائی معاہدوں کے وقت، بجائے خود کمپنی کے مقابلہ میں بہت زیادہ بڑی اور زیادہ طاقتور تھیں، لیکن وہ کمپنی کی وفادار اتحادی بن گئیں، بعض ایسی تھیں جو کمپنی سے چھوٹی تھیں، بہرحال اس بحث سے مجھے فی الحال کوئی تعلق نہیں۔

میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ صحیح یا غلط طور پر مسلمانوں نے ہندوستان پر کسی نہ کسی صورت میں اور ملک کے کسی نہ کسی حصہ پر، آٹھویں صدی سے ۱۹ ویں صدی تک اس طرح حکومت کی کہ کسی دوسری قوم نے کبھی نہیں کی، اس واقعہ کا نہایت اہم نتیجہ جس سے ہم کو بحث کرنی ہے وہ احساس ہے، جو اسلامی حکومت کے اس طویل اور وسیع دور سے پیدا ہوا، ہندوستان میں مشکل سے کوئی قوم ایسی ہوگی جو عہد قدیم کے مسلمان حکمرانوں کے خلاف صحیح یا غلط کوئی شکایت نہ رکھتی ہو، اور فطرت انسانی کا اقتضا جو ہر ملک کی تاریخ میں عیاں یہی ہے کہ بعض ہندوؤں اور بعض دوسری قوموں کے افراد کے دلوں میں مسلمانوں سے انتقام لینے کی خواہش موجود ہو، مگر مسلمانوں کے علاوہ دوسری قوموں مثلاً سکھ مرہٹہ، راجپوت وغیرہ کے خلاف اس قسم کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا، یہی احساس ہے جس سے ہم کو بحث کرنی ضروری ہے، اور جس کے متعلق ہمیں آئندہ کے لئے تحفظ کے ذرائع پیدا کرنے ہیں تاکہ ہندوستان کی آئندہ حکومت کا ایک ایسا دستور العمل بنایا جائے جس میں تمام قومیں محسوس کریں کہ وہ محفوظ، مساوی اور آزاد ہیں، دوسرا قابل غور سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمان اُس قسم کی اقلیت نہیں ہیں جس معنی میں کہ جنگ کے بعد یورپ میں یہ لفظ استعمال ہو رہا ہے، "جمعیت اقوام" یورپ کی اقلیتوں کا انتظام کرتی ہے، مگر ہمارے ہندوستانی فضلاء اور پروفیسر "جمعیت اقوام" سے اقلیتوں کے متعلق اصول کار عاریتاً لاتے ہیں، اور اسی کے طرز عمل اور طریقہ حکم برداری کی پیروی کرنا چاہتے ہیں، اور اس طرح جینوا میں بیٹھ کر ہندوستان کی رہنمائی کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ خود ہندوستان جینوا کی بہتر رہنمائی کر سکتا ہے، ایک ایسی قوم جو تنہا ہندوستان میں ۷ کروڑ سے زیادہ ہے، بآسانی اُس معنی میں اقلیت نہیں کہلائی جا سکتی جس مفہوم میں یہ لفظ

جینوا میں استعمال ہوتا ہے، جبکہ ساری دنیا میں یہ قوم ۴۰ کروڑ کے قریب ہے اور اس کا مطمح نظر یہ ہے کہ دنیا کی بقیہ
طرز خیال اور اپنے نظریہ کا مقصد بنالے اور جو ایک عدیم المثال اخوت کی مدعی ہے، ایسی قوم کو اقلیت کے
پکارنا محض لغو ہے۔

ان دو خاص نکات کو پیش نظر رکھ کر اب ہم کو چاہیئے کہ اصل بحث پر غور کریں، گول میز کانفرنس کے ایک بھائی
یہ تجویز پیش کی تھی کہ دونوں قوموں کے درمیان وزیر اعظم ثالث بن جائیں، اس تحریر میں بلاشبہ وزیر اعظم کی تعریف د تو
تھی، لیکن اُن کی پوزیشن کو اس تجویز نے بہت نازک بنا دیا اور اس لئے انہوں نے شکریہ کے ساتھ اس تجویز کو قبول
انکار کر دیا، مجھے یقین ہے کہ انہوں نے اس تجویز کے اندرونی منشا کو خوب سمجھ لیا ہوگا، اسی طرح ہم نے یہ تجاویز
نہیں کہ اس معاملہ کو "جمیعت اقوام" کے سپرد کر دیا جائے، اس کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ ہندوستان کے
کو ساری دنیا کی نظروں کے سامنے دھویا جائے، بحالت موجودہ ہم کو تو اس واقعہ نے کافی بددل کر دیا ہے کہ گو
کو ہندوستانی فرقہ بندیوں کا "دھوبی تلاؤ" بنا لیا گیا یہ سوال تو درحقیقت ہندوستان ہی میں طے ہونا چاہئے
دس برس تک ہر قسم کے گرم و سرد میں گاندھی جی کے ساتھ کام کیا اور یہ چیز ہم نے بار بار اُن کے سامنے پیش کی،
میں اپنی اور پنڈت موتی لال نہرو کی ہر دلعزیزی قائم رکھنے کے خیال نے کبھی سمجھوتہ نہ ہونے دیا، جب ۱۹۲۸ء
ہماری پرزور درخواست کے کانگرس نے ہندو مسلم سمجھوتہ نہ کرایا تو سر تیج بہادر سپرو نے انتہائی کوشش کی کہ
کا سمجھوتہ ہو جائے اور سر پیٹر دھی اس کے بہت خواہشمند تھے، لیکن ہندو مہا سبھا نے گو کہ شروع میں یہ ظاہر کیا کہ
پسندوں اور مسلمانوں کی اس خواہش میں شریک ہے، لیکن بہت سے جلسوں کو ملتوی کراتے کراتے آخر کار بمبئی کی
میں حصہ لینے سے بالکل ہی انکار کر دیا، اور ڈاکٹر مونجے نے تو صاف طور پر اپنا یہ خیال ظاہر کر دیا کہ گول میز
سے پہلے سمجھوتہ کی کوشش کرنے کے لئے وہ تیار نہیں، کانگرس نے ہندو مہاسبھا کی متابعت کی، اور گول
میں شرکت ہی سے انکار کر دیا، حالانکہ دستور اساسی کے تیار ہونے سے پہلے یہ سمجھوتہ ضروری تھا، مہاسبھا کے
میز کانفرنس میں شریک ہوئے لیکن انہوں نے بھی باوجود ہندو مسلمان اعتدال پسندوں کی انتہائی کوششوں
سمجھوتہ نہیں ہونے دیا ہے، مجھے اس کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان لوگوں نے ہندو مسلمانوں کے درمیان
گفتگوؤں میں اور نیز وزیر اعظم سے گفت و شنید میں کتنا وقت ضائع کیا ہے، میرے خیال میں خود وزیر اعظم اس کا
سکتے ہیں، مگر اب کہ ضابطہ کی ایک کمیٹی اس غرض کے لئے بنائی گئی ہے، یہ ضروری ہے کہ سمجھوتہ کی بحث
طور پر بیان کر دیا جائے۔

سب سے پہلے نہایت سنجیدگی کے ساتھ اور دوستانہ طریقہ پر میں وزیر اعظم کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں، کہ
نص پنجاب یا بنگال کا نہیں ہے، جیسا کہ بظاہر وہ سمجھتے ہیں نہ یہ سوال ہے پنجاب میں ۱۰۱ کے بجائے سو کر دینے
قسم کے کسی تغیر کا، جیسا کہ وزیر اعظم کا خیال اُس وقت معلوم ہوتا تھا، جس وقت وہ چیکرس میں سمجھوتہ اور صلح کی کو
رہے تھے، جیسا کہ میں نے عام کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے بتایا تھا، اصل سوال یہ ہے کہ ہندوستان کی

پہلی دفعہ ہم اکثریت کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں مگر وہ لوگ جو ہزار سال سے تمام نام نہاد ہندوؤں کی قسمت کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے، اب نہیں چاہتے کہ کوئی اکثریت ہندو یا ہندوستانی ایسی ہو جس کو وہ اسی طرح اپنے زیر اقتدار نہ رکھ سکیں، جیسا کہ ہزارہا سال تک رکھ چکے ہیں، مگر ایک فرق ضرور ہے وہ میں کہہ دوں، سر جان سائمن نے سر ویلنٹائن چرول کے حوالہ سے برہمنوں کے اقتدار کا ذکر کیا ہے اور وہ ذکر کسی قدر بعد از وقت ہے، برہمنوں نے کم از کم اتنا تو کیا تھا کہ عوام کو تعلیم دی ہے اور یہ خیال، غلط ہی سہی، اُن کو ضرور تھا کہ اُن کے ذریعہ سے عاقبت میں لوگوں کو نجات حاصل ہوتی ہے، مگر اب جو فرقہ اجارہ دار ہے اور چاہتا ہے کہ تمام ہندو قوم کی قسمت کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں رکھے، جبکہ وہی قوم اکثریت رکھتی ہے، اس فرقہ سے نہ ڈاکٹر مونجے اور نہ راجہ نریندر ناتھ تعلق رکھتے ہیں، بلکہ وہ فرقہ بنیئے کا فرقہ ہے، جو نہ کسی کی نجات نہ عاقبت کو سمجھتا ہے، نہ اس دنیا میں کسی قوم کو تعلیم دینے کا خیال رکھتا ہے، میں شاید ہر ہندوستانی سے زیادہ اس کا خواہشمند ہوں کہ غیر ملکی اقتدار ختم ہو جائے، یعنی (اگر مجھے یہ کہنے کی اجازت) وہ اقتدار ختم ہو جائے جو ایک "دکانداروں کی قوم" نے ہماری قسمتوں پر حاصل کر لیا ہے، لیکن جیسا کہ میں نے گول میز کانفرنس کے دعوت نامہ کے جواب میں ہز اکیلنسی وائسرے کو لکھا تھا میں ہرگز نہیں چاہتا کہ غیر ملکی "دکانداروں" کے بجائے خود اپنے ملک میں "دکانداروں" کے ایک ملکی فرقہ کو اپنی قسمتوں پر حاوی کر دیا جائے، میرے خیال میں بہت سی سیاسی بے چینی کو مالی امداد ایک حد تک ذاتی اغراض کے لئے بمبئی اور گجرات کے بنیوں سے مل رہی ہے، اور گو کہ میں نے ہمیشہ ایک شلنگ چار پینس اور ایک شلنگ ۶ پینس کے نرخ تبادلہ کا مذاق اڑایا ہے، لیکن آج کی سیاسی جنگ، ہندوستان کی آزادی کے لئے اس قدر نہیں ہے، جس قدر کہ شرح تبادلہ کے لئے ہے، یہ جنگ بھی خواہ کتنی ہی بجا اور حق پر ہو مگر وسیع معنی میں یہ جنگ ہندوستان کی آزادی کی جنگ نہیں ہے۔

اب ہندو مسلم مسئلہ کو لیجئے، یہ کسی صوبہ کا سوال نہیں ہے، ہر صوبہ میں ہندو مسلمانوں کے محسوسات ایک دوسرے کے ساتھ تعلق کم و بیش یکساں ہیں، تین نسلیں گزر چکیں، جب مسلمانوں کا اقتدار ہندوستان میں ختم ہوا تھا، انگریزوں نے یہ اقتدار زیادہ تر مسلمانوں سے حاصل کیا، اور کسی حد تک مرہٹوں سے، جو آخری زمانہ میں دہلی کے مغلیہ دربار کے سربراہ کار تھے، اور نیز کسی حد تک پنجاب کے سکھوں سے، جن کو خود انگریزوں نے پنجاب میں حکومت کرنے کی اس لئے اجازت دی کہ انگریز افغانستان سے جنگ کر رہے تھے، اب ہندوستان اُس اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہے، اور جیسا کہ دس سال پہلے ظاہر ہو چکا ہے، مسلمان اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے قربانیاں پیش کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے، آج بھی کچھ مسلمان کانگرس میں شریک ہیں، لیکن یہ وہ لوگ ہیں جو یا تو اُس مطالبۂ آزادی کی عادت سے مجبور ہو کر جو خود ہم نے دس برس پہلے پیدا کی تھی، کام کر رہے ہیں یا محض جنبش کا اتباع کر رہے ہیں، بہت سے مسلمان نافرمانی قانون کی تحریک سے اُسی طرح الگ رہے جس طرح دس برس پہلے ترک موالات کی تحریک سے الگ رہے تھے، جبکہ ٹرکی کا معاملہ بھی اُلجھا ہوا تھا، اپنی اہمیت کو مبالغہ آمیز طور پر بیان کرنے کے بجائے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ لوگ جن کا میں نے ذکر کیا جس میں سے بہت سے گول میز کانفرنس کے نمائندے بنائے گئے ہیں (خواہ ہز مجسٹی کی گورنمنٹ یا حکومت ہند، یا صوبوں کی حکومت نے ان کو نامزد کیا ہو) وہ نہیں ہیں جنہوں نے اپنے اثر سے مسلمانوں کو کانگرس کی شرکت سے روکا ہو، جیسے کہ دس سال پہلے انہوں نے روکا تھا،

گو کہ یہ کہنا اچھا نہیں معلوم ہوتا مگر ہم کو کہنا پڑتا ہے کہ وہ ہم ہی تھے جن کو تقریباً ہر صوبہ میں لڑائیاں لڑنی پڑی تھیں، اور ہماری ہی کوششوں سے بہت سی جگہ مسلمان کانگرس کی شرکت سے باز رکھے جا سکے، ہم نے ان کو سمجھا دیا کہ گزشتہ تحریک گو کہ قومی تحریک تھی مگر موجودہ تحریک میں (مجھے افسوس ہے کہ میں اُن کی غیر موجودگی میں یہ بات کر رہا ہوں) گاندھی جی اور پنڈت موتی لال نہرو دونوں نے ہندو مہا سبھا کو خوش کرنے کے لئے اپنا سر جھکا دیا ہے، اب کہ ہم لوگ یہاں آئے ہیں، میں تنہا اپنی پارٹی کا نمائندہ ہوں، حالانکہ میں نے اس زمانہ میں جب یہاں آمد سے پہلے میں ہندوستان میں بیمار پڑا ہوا تھا، اور نمائندوں کا آخری انتخاب کیا جا رہا تھا، ہز ایکسلنسی وائسرائے سے اس باب میں بہت طویل خط و کتابت کی، تنہا میں ہی اپنی پارٹی کا نمائندہ منتخب ہو سکا، اور مسلمانوں میں سب سے زیادہ مجھ ہی سے اور بلاشبہ میرے بھائی سے لاکھوں مسلمان ہمارے واپس جانے کے بعد سوال کریں گے کہ ہم اُن کے لئے گول میز سے کیا لائے، ہم یہاں سے محض جداگانہ حق انتخاب ان کے لئے یا حرف "و پلیج" لے کر نہیں جانا چاہتے ہیں، اور اگر ہم کو یہ چیزیں نہ ملیں تو میں وزیر اعظم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان سول نافرمانی کی تحریک میں بلا تکلف شریک ہوں گے، ہم یا دوسرے مسلمان نمائندے کچھ ہی کریں اور کچھ ہی کہیں۔

ہندوستان کی آزادی "محض جداگانہ انتخاب" میں مضمر نہیں، گو کہ اس حیثیت سے کہ ۱۹۰۶ء میں میں اُن لوگوں میں سے تھا جنہوں نے "جداگانہ انتخاب" کے اصول کو پیدا کیا، میں اُس چیز کو ہاتھ سے دینے والا آخری شخص ہوں گا۔

مجھے عرض کر دینا چاہیے کہ "جداگانہ انتخاب" کا فائدہ کیا ہے، جداگانہ حلقۂ انتخاب مسلمانوں کو اس کا موقع دیتا ہے کہ وہ اپنے مقدمہ میں اپنی پسند کا وکیل مقرر کر سکیں، ہر عدالت میں فریق مقدمہ کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مقدمہ میں اپنی پسند کا وکیل مقرر کرے گو کہ کبھی کبھی گورنمنٹ کے خرچ سے بھی وکیل مقرر کیا جاتا ہے، مگر فریق مخالف کو کبھی اس کی اجازت نہیں ہوتی، کہ وہ دوسرے فریق کے لئے وکیل منتخب کرے، اگر جج آزاد اور منصف مزاج ہو تو ایک معتمد وکیل بالکل کافی ہوتا ہے، اور لارڈ مارلے اور منٹو نے ہمارے لئے اسی کا انتظام کیا تھا، اُس وقت لارڈ مارلے کے ذہن میں یہ خیال نہ تھا کہ ہندوستان میں پارلیمنٹ کے اصول پر برطانوی حکومت قائم کی جائے، اس وقت سرکاری ممبروں کا اجتماع موجود تھا حکومت ہند میں برطانوی اکثریت موجود تھی، اور وہ اسی لئے قائم رکھی گئی تھی کہ ہندوستان میں اس بات کو ظاہر کر دے کہ پارلیمنٹ کے قائم کرنے کا کوئی خیال نہیں ہے ہر قوم اپنا معاملہ جج کے سامنے پیش کرتی تھی، اور جج فیصلہ کرتا تھا، ہم جج پر کچھ اثر تو ڈال سکتے تھے، مگر نہ اس کی رہنمائی کر سکتے تھے، نہ اس کو مشورہ دے سکتے تھے، اس لئے صرف ایک معتمد وکیل کی ضرورت تھی، اور اس کا انتخاب ہم جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعہ سے کرتے تھے۔

لیکن اس حالت میں بھی، اتفاقیہ طور پر، قصداً نہ سہی، لارڈ منٹو نے نہ صرف موجودہ ضرورت کا انتظام کیا تھا، بلکہ آئندہ کے لئے بھی کچھ فکر کی تھی، جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب صرف مسلمانوں کی مزید امداد کے لئے بنائے گئے تھے، تاکہ جو کمی ہندو اکثریت کے مقابلہ میں رہ جائے اس کو پورا کریں، لارڈ مارلے نے مشترک انتخاب میں مسلمانوں کو اُن کے حصہ سے محروم

نہیں کیا تھا، یہی خطرناک غلطی تھی، جو ہمارے ہندوستانیوں کے اصرار پر ۱۹۱۶ء میں بمقام لکھنؤ کی گئی جبکہ ہم دونوں بھائی چھندواڑہ میں نظر بند تھے، اور لکھنؤ مسلم لیگ و کانگرس کی سیاسیات میں کوئی حصہ نہ لے سکتے تھے، آخر کار پہلی دفعہ "جداگانہ انتخاب" کا طریقہ مسلمانوں کی نیابت کا تنہا ذریعہ رہ گیا۔

دوسری خطرناک غلطی اُس وقت یہ کی گئی (جس کے لئے اب مسلمان ۱۴ برس سے رو رہے ہیں) کہ پنجاب اور بنگال کی مسلم اقلیت کو قلیل اکثریت سے بدل دیا گیا، اگر ہمارے دوستوں کی نظر مستقبل پر ہوتی تو وہ پنجاب کو کافی اور بنگال کو ارادی اور کمزور اقلیت نہ بنا دیتے، ان ہی غلطیوں کا ازالہ کرنے کے لئے گول میز کانفرنس منعقد ہو رہی ہے، اس نکتہ پر غلط فہمی کو راہ نہ دیجئے۔ اس نکتہ کو ہز مجسٹی کی گورنمنٹ اور وزیر اعظم پہلے سے خوب سمجھ لیں، اس نکتہ سے مجھے اپنی بحث شروع کرنی چاہیئے تھی، لیکن مجھے خوشی ہے کہ زمین کو سنگ بنیاد کے لئے صاف کر دینے کے بعد اب میں اس نکتہ پر پہنچا ہوں، اس بحث میں میں زیادہ وقت نہ لوں گا، اصل مسئلہ ہمارے سامنے یہ ہے کہ اُن صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے خواہ قلیل ہو یا کثیر ان کو پورے حقوق دیئے جائیں اور ایسے صوبوں میں جہاں ان کی اقلیت ہے ان کے حقوق کو محفوظ کیا جائے اور ہندو قوم کے ساتھ منصفانہ طرز عمل اختیار کرنے کی غرض سے ہونا چاہیئے کہ یہی عمل ہندو قوم کے ساتھ کیا جائے جس بات کی ضرورت ہے وہ تو یہ ہے کہ ہر قوم کو ہر صوبہ میں جہاں وہ تعداد میں زیادہ ہو پورے حقوق دیئے جائیں، اور جہاں وہ تعداد میں کم ہے اُس کے تحفظ کا انتظام کیا جائے، مسلمان جو کچھ چاہتے ہیں وہ یہ ہے (اور یہی ہم اپوائنٹ کا لب لباب ہے، حق انتخاب جداگانہ اصل چیز نہیں ہے) کہ ہر جگہ فیڈرل گورنمنٹ ہو، تاکہ مرکزی حکومت جہاں ہندوؤں کی مستقل اکثریت ہوگی، اُن کو ہر موقع پر دبا نہ سکے، اور ...کہ صوبوں کی فیڈرل گورنمنٹ میں مسلمانوں کو ہر جگہ ہندوستانی نائبین کی کل تعداد کم از کم ایک تہائی جگہیں دی جائیں، نیز یہ کہ ...نجاب اور بنگال میں جہاں مسلمانوں کی قلیل اکثریت ہے اور جہاں اُس اکثریت پر بنیوں، اور سکھوں اور ہندو زمینداروں کے اثرات ...ادی ہیں، جیسی کہ بنگال میں حالت ہے، یہ اکثریت محفوظ کر دی جائے (ذاتی طور پر اگر صرف آئندہ ۲۰ برس کے لئے ایسا کر دیا ...ائے تو میں مطمئن ہو جاؤں گا) علاوہ بریں سرحدی صوبہ اور بلوچستان میں جہاں مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت ہے، پوری اصلاحات ...لمانوں کو دی جائیں جو اب تک برطانوی فوجی اور سول اور نیز ہندوؤں کی قدرتی تنگ نظری کے باعث نہیں دی گئی ہیں) اور سندھ ...آسام کی طرح ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے اور ان صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت اسی طرح محفوظ ہو جائے جس طرح ہندوؤں کی ...ثریت دیگر صوبوں میں ہوگی، اگر نئے دستور کے ماتحت ان چند صوبوں میں مسلم اکثریت قائم نہ کر دی گئی، میں عرض کرتا ہوں، دھمکی ...ں دیتا، مگر نہایت ادب سے اور دوستانہ طور پر متنبہ کرتا ہوں کہ ہندوستان میں خانہ جنگی ہو جائے گی، اس حقیقت کے ...مجھنے میں غلطی نہ کیجئے، یہ چار پانچ صوبے ہیں، جہاں مسلمانوں کو وہی قوت حاصل ہو جو ہندوؤں کو تمام دوسرے صوبوں میں ...صل ہوگی، اور ہندوؤں کا وہی تحفظ کیا جائے جو مسلمان اپنی اقلیت کے لئے مانگتے ہیں۔

پنجاب اور بنگال میں جہاں مسلم اکثریت صرف بقدر ۶ اور ۵ کے ہے یہ بالکل ناممکن ہے، سکھوں یا یورپین لوگوں کو اُن ...عداد سے زیادہ کچھ حقوق دیئے جا سکیں، اور نہ ان کو اس کی ضرورت ہے جیسا کہ میں ابھی واضح کر دوں گا "ویٹیج" دینے کا ...منصوبہ اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ صرف دو صوبوں میں مسلمانوں کی قلیل اکثریت سے اُن کو محروم کر دیا جائے، ان دونوں

صوبوں میں رائے دینے کا حق چاہیے دونوں صوبوں کے لئے مساوی ہو یا نہ ہو، مگر مسلمانوں کی آبادی کے تناسب کے
چاہیئے، رائے دینے کے حق کا سوال کوئی مذہبی یا شرعی مسئلہ تو ہے نہیں جس میں انتہائی سختی برتی جائے (خود کونسل
کے موجودہ حق رائے دہندگی کو دیکھ لیجئے) ہر حال میں مسلمانوں کی جگہیں ۲۰ سال کے لئے اُسی آبادی کی نسبت
دی جائیں، اس لئے کہ وہ ہندو ساہوکاروں کے مقروض ہیں، اور نو دولت سکھوں کے بہت زیادہ زیر اثر ہیں، نہر
میں عام طور پر ہر بالغ کو حق رائے دہندگی دینے کی تجویز محض مسلمانوں کو بیوقوف بنانے کے لئے پیش کی گئی تھی، ایک
سے زیادہ بالغوں کے اس حق کا حامی کوئی نہیں ہو سکتا مگر خوش قسمتی یا بد قسمتی سے بالغ مرد بھی ہوتے ہیں اور عورتیں
آئندہ بیس برس تک کم از کم مسلمان عورتیں بالغہ ہو کر بھی دوٹ دینے گھر سے باہر نہ جائیں گی، خواہ کتنے اچھے پردہ
کیوں نہ کئے جائیں اور خواہ صرف پردہ نشین افسران ہی ان کی پرچہ اندازی کی نگرانی کیوں نہ کریں اس لئے ظاہر ہے
اور پنجاب کے ہنود اور سکھوں کے مقابلہ میں مسلمان عورتیں نقصان میں رہیں گی، لہذا بالغوں کا عام حق رائے دہندگی
بالکل ناقابل توجہ ہے، پنجاب اور بنگال کے ان دو صوبوں میں مسلمانوں کے اس مطالبہ کے خلاف کہ کونسلوں میں ان
۵۲ اور ۵۵ فی صدی ہو، کوئی امر قابل توجہ نہیں ہو سکتا۔

سکھوں نے اپنی حکومت کے قلیل زمانہ میں پنجاب میں اس قدر زمین پر قبضہ کر لیا ہے، اور آج تک دیہا
لوگوں پہ اُس کا اتنا زیادہ دباؤ ہے کہ اُن کو ہرگز کسی مزید تحفظ کی ضرورت نہیں ہے، بار ہا انہوں نے خود لکھا ہے
"فرقہ بندی" کو "قوم پرستی" کے مقابلہ میں ترک کر دیں گے تو وہ "فرقہ بندی" کو چھوڑ کر عام انتخاب کے نتائج
رہیں گے، اُن کے اس بیان کو اگر گمراہ کن جذبات سے پاک کر کے دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی
کو مسلمانوں کی طرح تحفظ کی ضرورت ہی نہیں ہے، اور اس لئے اُن کے حقوق سے زیادہ اُن کو کچھ دینے کا سوال غیر
محض مہا سبھا کی من گھڑت ہے۔

یہی بات بنگال کے اینگلو انڈین اور یورپین لوگوں کے متعلق کہی جا سکتی ہے، محض بنگال کی کونسل میں چند جگہ
کم حاصل کر کے وہ تجارت پر اپنے اُس اثر کو قائم نہیں رکھ سکتے جو انہوں نے جان کمپنی کے زمانہ سے حاصل کر لیا
کسی اور طریقہ پر اُن کے تحفظ کا انتظام کرنا چاہیئے، اور میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ گورنر صوبہ کے لئے جو مستقل ہدایات مر
ان میں یہ لکھ دیا جائے کہ ہندوستان میں کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جس کا مقصد یورپین لوگوں سے انتقام لینے
ہندوستانیوں کے محسوسات اُن کے خلاف کچھ ہی ہوں، ۵ یا ۶ فیصدی کی زیادتی سے ان کا کوئی فائدہ نہ ہوگا بلکہ
رہیگی البتہ دونوں میں سے ایک میں مسلمانوں کی اکثریت باقی نہ رہے گی۔

صوبہ سرحد کے متعلق میں کچھ نہیں کہتا، اس لئے سرحدی کمیٹی اس سوال پر غور کر رہی ہے، مگر میری تجویز یہ
کو چاہیئے کہ وہ ہندوؤں اور سکھوں کو اُن دونوں کی آبادی سے دگنا بلکہ تگنا حق نیابت دے دیں تاکہ ہندو اور سکھ
کریں کہ وہ صوبہ ان ہی کا اپنا صوبہ ہے جس طرح مسلمانوں کا ہے، اور یہ کہ حکومت میں ان کو معقول حصہ ملتا ہے،
مسلمانوں کے اندر ڈاکٹر مونجے کے صوبہ میں پیدا کرانے کی ضرورت ہے جہاں مسلم آبادی صرف ۴ فیصدی ہے،

میں جہاں وہ صرف ۷ فیصدی ہیں ، یا اڑیسہ میں جہاں علیحدہ صوبہ بننے کے بعد مسلمان تعداد میں بہت کم رہیں گے ، یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مسلمانوں کے خلاف یا موافق تمام صوبوں میں یکساں جذبات ہیں ، اور جب کہ پنجاب میں جہاں اس کی قلیل اکثریت ہے مسلمانوں کے جذبات اس قدر تلخ ہیں تو ڈاکٹر مونجے کے صوبے میں کیا حال ہوگا جہاں اسلامی آبادی بہت قلیل ہے ، اور جہاں ہندو حکومت مسلمانوں پر قائم ہوگی ، خطرہ یہ ہے ، کہ انتقام کا خیال ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں بہت زیادہ ہے ، جن کو ہندوستان کی غلط تاریخ اکثر سیاسی اغراض کے لئے پڑھائی گئی ہے ۔

البتہ ہندوستانی ریاستوں میں جہاں تاریخ نہیں پڑھائی جاتی ہے مگر جہاں والیان ریاست کی انسانیت باوجود اپنی کمزوریوں کے بہتر تاریخ بنانے میں مسلمانوں کے حقوق کا زیادہ تحفظ کیا جاتا ہے ، اور باوجود جمہوریت پسند ہونے کے میں اس حقیقت کا ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہوں ۔

بر سبیل تذکرہ مجھے اس حقیقت کا ذکر کر دینا چاہیئے کہ اقلیتوں میں مسلمانوں کی ہر دلعزیزی ۱۲½ سو برس کی ملک گیری کے بعد کیونکر زیادہ ہو سکتی ہے کچھ مسلمانوں سے اس لئے ناراض ہیں کہ کسی زمانہ میں انہوں نے ایران کو فتح کر لیا تھا ، کچھ اس سے ناخوش ہیں کہ انہوں نے یروشلم ، شام ، اور مصر کو تسخیر کیا تھا اور جنگ صلیبی میں فلسطین کو اپنے قبضہ سے نکلنے نہ دیا یا بہر حال جس کسی نے بھی ہندوستان پر حکومت کی ، وہ خواہ مسلمان ہو یا انگریز اس کو اپنی پرانی رعایا کے اصل یا فرضی شکایتوں کا سامنا کرنا ہی پڑیگا ، اور یہ امر تعجب انگیز ہے کہ مسلمان اب بھی کم اپنی رعایا کے محبوب ہیں ، انگریز خود اپنے خلاف اس جذبۂ انتقام کا اندازہ کر سکتے ہیں اور جدید دستور کے بنانے کے لئے انہیں کم از کم ایک عرصہ کے لئے اس جذبۂ انتقام کا لحاظ رکھنا چاہیئے ۔

اب میں اقلیتوں کے تحفظ کے سوال سے بحث کروں گا ، ہم شرطوں میں اکثر شرطیں اقلیتوں کے تحفظ کے لئے ہیں ، مثلاً یہ شرط کہ کونسلوں میں کوئی ایسا قانون جس کے خلاف ہندو یا مسلم اقلیت کے ۲/۳ نائبین اور جس کو یہ ۲/۳ اقلیت اپنے مفاد کے خلاف سمجھے پیش اور منظور نہ ہو سکے گا ، یہ ایک تاریخی شرط ہے جو کانگریس نے اس وقت لگائی تھی جب ۱۸۸۷ء میں مسٹر بدر الدین طیب جی نے جو کانگریس میں شریک ہونے والے دوسرے نامور مسلمان تھے ، سر سید احمد خاں کو شرکت کی دعوت دی تھی ، ایک ایسی شرط جس کو ہندوستان کی اس پارلیمنٹ (کانگریس) نے جس کے پاس کوئی طاقت نہ تھی اور جو صرف بحث مباحثہ کر سکتی تھی خوشی سے منظور کیا تھا ، اب بھی اُس پارلیمنٹ کو منظور کرنا چاہیئے جب کہ اس کی طاقت تسلیم کی جاتی ہے ، اور اس کو اختیارات دیئے جانے والے ہیں ، میں تو مُصر ہوں کہ اس شرط کے الفاظ کانگریس ہی کے دستور العمل سے نقل کئے جائیں ۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ شرط کسی مذہب کے تحفظ کے لئے نہیں ہے بلکہ قومی مفاد کے تحفظ کے لئے پیش کی جاتی ہے ، مذہب قانون سے بالاتر ہے ، مجھے افسوس ہے کہ میں اجلاس کانفرنس سے چلا آیا تھا ، جب وزیر اعظم نے فیڈرل کمیٹی کی رپورٹ کے متعلق دریافت کیا کہ آیا ہمیں یہ نکتہ نوٹ کر لینا چاہیئے ، کہ کوئی قانون کسی مذہب یا کسی مذہب کے رسم و رواج کے متعلق پیش نہ کیا جائے گا ، جب تک گورنر منظوری نہ دے ، اب بھی اس شرط کی وجہ سے کافی خرابی پیدا ہو چکی ہے ، سارداایکٹ کے متعلق اس نے ہونے کے بعد بھی گورنر سے منظوری نہیں لی گئی بلکہ منظوری صرف مسودۂ قانون کے لئے دی گئی تھی ، جو ابتداً پیش کیا

گیا، مجھے کوئی اعتراض نہیں اگر ہندو یا کسی دوسرے " مائل بہ ترقی " مذہب کے لوگ اپنے مذہب کے متعلق قانون بنانے
مگر میرا مذہب تو ایسا " مائل بہ ترقی " نہیں ہے وہ تو خدا کے بنائے ہوئے قانون رکھتا ہے، میں نے یہ حقیقت اُس پر
واضح کردی تھی، جو ۹ر نومبر ۲۹ء کو علماء اور لیڈروں کے ایک وفد کے ساتھ میں نے ہز ایکسلنسی وائسرائے کے سا
کیا تھا اور جس کی ایک نقل میں اس تحریر کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔

اس قدر اہم معاملات جیسا کہ یہ ہے، عجلت کے ساتھ طے نہ ہونے چاہئیں اور جب پھر موقع آئے گا تو میں یہ طے
کی کوشش کروں گا، کہ کم از کم مسلمانوں کا مذہب انسانوں کی قانون سازی سے بالاتر رکھا جائے چاہے قانون ساز جماعت
پارلیمنٹ ہو یا ہندوستانی، بغیر اس کے کوئی مسلمان کسی دستور اساسی کے ساتھ وفاداری کا وعدہ نہیں کر سکتا۔

اب میں صرف ایک لفظ " ویٹیج " کے متعلق کہوں گا جو مسلمانوں کو حاصل ہے، اور وہ ہر ایسے صوبہ میں حاصل کرنا
ہیں، جہاں اُن کی اقلیت بہت کمزور ہے، کسی صوبہ میں اس " ویٹیج " سے ان کو اکثریت حاصل نہیں ہوتی جیسا کہ شکسپیر نے
کے متعلق کہا تھا کہ قوت برداشت اس فرقہ کا تمغۂ امتیاز ہے، مگر " ویٹیج "، ہر جگہ مسلمانوں کے ذہن میں کسی قدر اضافہ
اور اس اضافہ کی ضرورت کو مجھ سے زیادہ کوئی محسوس نہیں کر سکتا جبکہ میں دیکھتا ہوں کہ بیماری کی وجہ سے میری غیر حا
اقلیتوں کی کمیٹی اور دوسری جگہوں پر میری جماعت کی کوئی نمائندگی باقی نہیں رہی " ویٹیج " سے صرف اتنا ہوگا کہ یہ ا
کی نمائندگی اس قدر کم ہو یہ احساس پیدا ہو جائے گا کہ حکومت میں ہمارا بھی کچھ نہ کچھ حصہ ہے، اس کے سوا او
ہوگا، وہی " ویٹیج " جو مسلمان مانگتے ہیں وہ ہندوؤں کو بھی ہر ایسے صوبہ میں دینے کے لئے جہاں اتنی ہی کم ہندو اقلیت
یا پنجاب میں جہاں ہندو اقلیت درحقیقت بہت زیادہ منظم اور سیاسی حیثیت سے بہت زیادہ قوی ہے، اور بہ
اور بہت تعلیم یافتہ ہے، وہاں " ویٹیج " کا مطالعہ بہت لغو ہے، یہی پنجاب میں سکھوں کے متعلق کہی جا سکتی ہے، جو
دوسرے مباحث کے معاشرتی حیثیت سے ہندو ہیں اور سیاسی حیثیت سے ہندو قوم کے ساتھ مل کر کام کر
ہیں، سندھ میں بھی ہندو اقلیت زیادہ منظم، زیادہ دولت مند اور مسلمانوں سے زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ ہے، باوجو
بڑے بڑے زمیندار ہیں، پھر بھی اُن کو " ویٹیج " دینا چاہتا ہوں، اتنا کہ بڑے سے بڑے حریص کی
تشفی دے سکے!

یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ میں اس معنی میں فرقہ پرست ہوں، جو معنی فرقہ پرستی کے، یورپ میں سمجھے جاتے ہیں، با
برس پہلے میں انتخاب جداگانہ کی تجویز کے مصنفوں میں سے ایک تھا، میں نے محسوس کیا ہے، کہ اب اس کا وقت گزر گیا او
ہندوستانی قوم پرستی کے مفاد کی خاطر ہم کو مشترک حلقہ ہائے انتخاب بر بنائے رقبہ قبول کر لئے جائیں لیکن انگلستان کی
مشترک حلقہ ہائے انتخاب بر بنائے رقبہ محض لغویت ہوگی فرض کیجئے کہ نواب عبدالقیوم یا ڈاکٹر مونجے کے صوبہ میں جہاں
تعداد صرف ۴ اور ۷ فیصدی ہے ان کو اپنے صحیح نمائندوں کے انتخاب کرانے کا کوئی موقع نہیں مل سکتا چاہے ا
یہ جگہ کونسل میں محفوظ ہوں، اگر ۹۶ فی صدی اور ۹۳ فی صدی اکثریت کے ہاتھ میں اقلیتوں کے نمائندوں کا انتخاب ج
محض بیکار اور کمزور اشخاص جو صرف مذہبی مسائل سے مسلمان یا ہندو کہے جاتے ہوں سیاسی نقطۂ نظر رکھنے والے

بہترین اور تازہ ترین

ادبی اور تنقیدی کتابیں

کلیاتِ آتش :		۱۲ر۵۰ روپے
خطباتِ عبدالحق :	(مولوی عبدالحق)	۲۰ر۰۰ "
تنقید کیا ہے؟ :	(آل احمد سرور)	۳ر۵۰ "
تنقیدی اشارے :	(آل احمد سرور)	۴ر۵۰ "
تخلیق و تنقید :	(عبدالسلام)	۳ر۵۰ "
حالی اور نیا تنقیدی شعور :	(اختر انصاری)	۱ر۵۰ "
جدید ادب کے دو تنقیدی جائزے :	(ابوالخیر کشفی)	۲ر۰۰ "
تنقیدی زاویے :	(ڈاکٹر عبادت بریلوی)	۸ر۰۰ "
ماہِ درخشاں :	(بیگم احمد علی)	۷ر۵۰ "
عظمتِ رفتہ :	(ضیاء الدین برنی)	۱۰ر۰۰
انسان کی کہانی :	(خادم الدین خالد)	۴ر۵۰

اردو مرکز گنپت روڈ لاہور

اکثریت کے ووٹ سے منتخب کئے جائیں گے۔ اس لئے میں نے بہت سے دوستوں سے مشورہ اور گفتگو کرنے کے بعد ایک دوسری تجویز پیدا کی ہے، یہ تجویز یقیناً اکثریت کی اُس تجویز سے جو سائمن رپورٹ میں پیش کی گئی ہے، زیادہ قابل توجہ ہے وہ یہ ہے دونوں موقعوں کے لئے جگہیں محفوظ کر دی جائیں مگر کوئی امیدوار منتخب نہ سمجھا جائے جب تک کہ وہ

(۱) اپنی قوم کے کم ازکم ۴۰ فیصدی ووٹ حاصل نہ کرلے اور

(۲) کم ازکم دوسری قوم کے کل ڈالے ہوئے ووٹوں میں سے ۵ فیصدی حاصل نہ کرلے۔ اگر اُس کی قوم اس مقام پر دس فی صدی یا اس سے کم ہو لیکن اگر وہ قوم اس سے زیادہ ہو تو امیدوار کے لئے ۔انی صدی ووٹ، دوسری قوم کے حاصل کرنا ضروری ہوں گے، اس طرح تین مقاصد حاصل ہوں گے، اول تو ہر امیدوار کو دونوں قوموں کے پاس اپنی ٹوپی ہاتھ میں لے کر جانا ہوگا، جیسا کہ منٹو مارلے المفارم کے وقت ہوتا تھا مگر اب نہیں ہوتا تاکہ اس طرح دونوں قوموں کی وہ بے عنوانیاں باقی نہ رہیں گی، جو مانٹیگو چمسفورڈ اسکیم کے باعث پیدا ہو گئیں، جس نے ہندوستان کی سیاسیات اور معاشرتی زندگی کو بھی تباہ کر دیا، دوم یہ کہ کوئی شخص کسی قوم کا نائب منتخب نہ ہوگا جب تک کہ وہ اُس قوم کی ایک خاصی تعداد کی نیابت نہ کرتا ہو، چاہے وہ اکثریت کا نمائندہ نہ ہو جیسا کہ اب جداگانہ انتخاب میں ہوتا ہے۔

تیسرا مقصود بھی کچھ کم اہم نہیں ہے وہ یہ کہ کوئی شخص جو دوسری قوم سے کچھ نہ کچھ تعلقات نہ رکھتا ہوگا، منتخب نہ ہو سکے گا، چاہے وہ خود اپنی قوم کے سب ووٹ حاصل کرلے اس طرح پہلی دفعہ "فرقہ بندی" کا خاتمہ ہو جائے گا، اور صحیح "قوم پرستی" پیدا ہو سکے گی، یہ تجویز یقیناً دوسرے طریقوں سے بہتر ہے لیکن اگر کسی قوم کا کوئی امیدوار اس شرط کو پورا نہیں کر سکتا تو پھر وہ شخص منتخب ہوگا جس کے حق میں اُسی قوم کے ووٹ آئے ہوں جس کے لئے وہ جگہ محفوظ ہے یہ گویا موجودہ انتخاب جداگانہ کا تصفیہ ہوگا جو بدقسمتی سے ابھی تک ناگزیر ہے، میں جداگانہ انتخاب کا اس سے زیادہ حصہ جدید دستور اساسی میں جس کے بنانے کی کوشش کی جارہی ہے، نہیں چاہتا مگر بغیر ان شرائط کے مسلمان ہرگز مشترکہ انتخاب کو منظور نہ کریں گے۔ جس میں ایک بیکار آدمی یا ایسا آدمی جو خود غرضی کی وجہ سے کسی قوم کے ساتھ مل گیا ہو، اکثریت رکھنے والی قوم کے ۹۶ فیصدی ووٹ سے کامیاب ہو سکتا ہے، چاہے خود اسی کی تمام قوم اُس کے خلاف ہو، اس سے زیادہ لغویت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

میں اس تحریر کو ہز ایکسلنسی وائسرائے اور وزیر ہند دونوں کے سامنے پیش کر چکا ہوں، اور وہ اس تجویز کی معقولیت اور جدت سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے، میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اس امر کے ظاہر کرنے کا بھی حق ہے کہ سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر سرینواس شاستری بھی اگر زیادہ نہیں تو اسی قدر متاثر ہوئے ہیں۔

ان الفاظ کے ساتھ میں اس بیان کو ختم کرتا ہوں وزیر اعظم اور سر جوفری کاربٹ کی مہربانی سے میں باوجود ڈاکٹروں کی مخالفت کے لکھ چکا ہوں، میرے ڈاکٹر میری اس نافرمانی سے بہت آزردہ ہوئے ہیں لیکن اگر میں ایسا نہ کرتا تو میں شاید اُن کی مزید نافرمانی کرتا اور خود کانفرنس میں جاکر کمیٹی کے سامنے اس معاملہ کو رکھتا، چاہے میں اس کام میں مر ہی جاتا، میں ممبران کمیٹی سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اس طویل تحریر کو نظر انداز نہ فرمائیں، اور کچھ نہ کچھ توجہ ضرور کریں

بلند پایہ، فکر آفریں، اور معیاری کتابیں

جدید مطبوعات

روح اقبال

اقبال پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ لیکن اقبال کے فن، شخصیت، اور علم و فکر کا جتنا گہرا، اور سچا مطالعہ "روح اقبال" میں ملتا ہے، کہیں اور نہیں ملتا، یہ کتاب ایک مخصوص اور منفرد حیثیت کی حامل ہے، اور اہل ذوق کے لئے سرمایۂ بصیرت قیمت دس روپے۔

آندھی میں چراغ

مشہور ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین کی فکر آفریں اور معرکہ آرا کتاب، مشتمل بر سہ حصص پہلا حصہ، "ابدی قدریں"، دوسرا حصہ "صحبت اہل صفا"، تیسرا حصہ "مستقبل کی پرچھائیاں" قیمت آٹھ روپے۔

مضامین فلک پیما

میاں عبد العزیز نے "فلک پیما" کے نام سے جو زندگی سے بھرپور مقالات لکھے، وہ اردو زبان کا قابل فخر اثاثہ ہیں۔ انداز بیان کی شوخی اور شگفتگی، فلسفیانہ تعمق اور شعور حیات کی گہرائی فلک پیما کا حصہ ہے جس میں کوئی ان کا حریف نہیں، قیمت ۱۰ روپے

اردو غزل

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے غزل کی تہذیبی اور ثقافتی اہمیت پر اپنے مخصوص عالمانہ انداز میں ایسی دلچسپ، مدلل، اور سنجیدہ گفتگو کی ہے کہ "وہ کہیں اور سنا کرے کوئی" قیمت دس روپے

جمال الدین افغانی

اتحاد عالم اسلام کا وہ علمبردار جس نے مشرق کے خوابیدہ ذہن کو جگایا اور ولولۂ تازہ سے آشنا کر دیا، جس نے مغرب کو جھنجوڑا، اور اس کے استعماری عزائم کی جڑیں ہلا دیں، یہ کتاب مشتمل ہے افغانی کی سیرت و شخصیت اور سیاسی کارناموں پر جسے مرزا ادیب نے بڑی کاوش سے مرتب کیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔

آئینۂ ادب، چوک مینار، انار کلی۔ لاہور

ناول

شمع	اے۔ آر۔ خاتون	۱۳۔
تصویر	"	چھ
افشاں	"	آ
چشمہ	"	تیرہ
ہالہ	"	د
رمانہ	"	سات
عروسہ	زبیدہ خاتون	چھ
نادرہ	"	پانچ
ہما	"	چ
کرن	"	سات
سورج نہیں نکلا	اے حمید	

نظم

فروزاں	جذبی
انتخاب کلام ظفر	شاہد احمد خاں
فریاد داغ	تمکین کاظمی
آفتاب داغ	قیوم نظر
داغ فراق	شاد امرتسری

تراجم

نور محل	ہیرلڈ لیم۔ شبلی بی کام
عمر خیام	ہیرلڈ لیم۔ جمیل نقوی
نئے پود	پرل ایس بک۔ یوسف ع
بیٹے	پرل ایس بک۔ احسان
صلاح الدین	ہیرلڈ لیم۔ یوسف عباسی

مہر شہر خیال

جواں مرگ سجاد انصاری کا ولادا

قیمت چار ر

میری لائبریری

اچھی، سستی اور معیاری کتابوں کا پہلا سلسلہ

تازہ بتازہ نو بنو

میری لائبریری کی بالکل تازہ اور جدید مطبوعات جو، ابھی ابھی منظر عام پر آئی ہیں۔

۱	کلیاتِ غالب (فارسی دیوان) مرتبہ وزیر الحسن عابدی	۸ر۰۰ روپے
۲	اردو کا بہترین انشائی ادب۔ مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی	۵ر۵۰ "
۳	مرزا ادیب کے بہترین افسانے۔ مرتبہ عرش صدیقی	۲ر۵۰ "
۴	ادب کا تنقیدی مطالعہ۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی	۲ر۲۵ "
۵	زادِ راہ۔ منشی پریم چند، تنقید و سوانح۔ از پروفیسر محمد زکریا	۲ر۲۵ "
۶	ندیم کے بہترین افسانے۔ انتخاب و تنقید، مظفر علی سید	۳ر۷۵ "
۷	خوشبو کے گھاؤ۔ نوید انجم	۳ر۰۰ "
۸	فاصلے۔ عفرا بخاری	۲ر۰۰ "
۹	ننگی دھرتی۔ انقلاب چین کا آئینہ۔ آئی لن چانگ	۴ر۰۰ "
۱۰	تیسری عورت (افسانے) اکمل علیمی	۳ر۰۰ "

تاریخ و سوانح

ابوبکر صدیق اکبرؓ	محمد حسین ہیکل	۸ر۰۰ روپے
عمر فاروق اعظمؓ	"	۱۰ر۰۰ "
دس بڑے مسلمان	محمد اسماعیل پانی پتی	۴ر۰۰ "
خالد سیف اللہؓ	ابو زید شبلی	۲ر۲۵ "
المامون	شبلی نعمانی	۲ر۲۵ "
الہارون	عمر ابو النصر	۲ر۲۵ "
ابوذر غفاریؓ	عبد الحمید جودۃ السحار	۲ر۰۰ "
سلطان محمد فاتح	محمد مصطفیٰ اصفوت	۱ر۵۰ "
الحسینؓ	عمر ابو النصر	۱ر۵۰ "
رابعہ بصریؒ	دادا داسنگاکینی	۱ر۵۰ "
امیر معاویہؓ	انیس زکریا	۱ر۲۵ "
عمر بن عبد العزیزؒ	احمد زکی صفوت	۱ر۲۵ "
امام زین العابدینؒ	عبد العزیز سید الاہل	۱ر۲۵ "
الزہراؓ	عمر ابو النصر	۱ر۰۰ "
تذکرہ	ابو الکلام آزاد	۳ر۰۰ "
غبارِ خاطر	"	۳ر۰۰ "
قلوپطرہ	آدھکر و ہیگل	۳ر۰۰ "
روپ متی	سید فیاض حسین	۲ر۲۵ "
سلطانی محلوں کے راز	جمال پاشا الغزی	۳ر۷۵ "
شیخ عبد القادر جیلانیؒ	حکیم غلام حیدر سیالکوٹی	۱ر۲۵ "
۳۹ بڑے آدمی	ڈیل کارنیگی	۳ر۵۰ "

ادب

دیوانِ غالب (اردو) (ادب)	غالب	۲ر۲۵ "
انتخابِ غالب	مرتبہ سید اختر عباس	۰ر۵۰ "
لذتِ آوارگی۔ مجموعہ کلام	مرتبہ کے ڈی اظہر	۳ر۰۰ "
حلال و حرام (مذہب)	عطاء اللہ پالوی	۲ر۲۵ "
فسانۂ مبتلا	ناول نذیر احمد	۲ر۲۵ "
میرے بھی صنم خانے	" قرۃ العین حیدر	۳ر۰۰ "
پتھر کا دیس	" عادل رشید	۳ر۷۵ "
سہرے کے پھول	" "	۳ر۰۰ "
منزل منزل دل بھٹکے گا	" عنایت اللہ	۲ر۵۰ "
دل بھولتا نہیں	" جعفر علی سید	۱ر۵۰ "
چاند روشن نہیں ہے (افسانے)	عبد الحمید نظامی	۳ر۰۰ "

عملی نفسیات

...کی اہمیت : لن یوتانگ	۶ر۰۰ روپے
...بول میں جادو ہے۔ ڈیل کارنیگی	۳ر۵۰ "
...ن ہونا چھوڑیے "	۳ر۵۰ "
...گو اور تقریر کا فن "	۲ر۲۵ "
...ہ باتیں "	۲ر۵۰ "
...اور کامیابی، یوسٹس جیسپر	۲ر۲۵ "
...اور عمل، ڈاکٹر ماڈرن	۱ر۵۰ "
...عادتیں، جذبات۔ دیانند ورما	۱ر۰۰ "
...راہیں، ڈاکٹر محمد نعمان ساجد	۲ر۰۰ "
...کے موڑ پر، آپ بیتیاں	۲ر۲۵ "
...کا نفسیاتی پہلو: کینتھ، پیٹر پیچر	۳ر۰۰ "
...جسمانی پہلو: کینتھ واکر	۲ر۵۰ "
...کی نفسیات: محمد اکرم طاہر	۲ر۰۰ "
...نامہ "	۲ر۵۰ "
...اور عمل ۳۳ مضامین	۲ر۰۰ "
...کی روشنی ۲۴ مقالات	۱ر۵۰ "

طنز و مزاح

حماقتیں	شفیق الرحمٰن	۳ر۰۰ روپے
مزید حماقتیں	"	۳ر۰۰ "
لہریں	"	۱ر۵۰ "
پرواز	"	۱ر۵۰ "
سنگ و خشت	کنہیا لال کپور	۱ر۵۰ "
شیشہ و تیشہ	"	۱ر۵۰ "
چنگ و رباب	"	۱ر۵۰ "
نوکِ نشتر	"	۱ر۵۰ "
بال و پر	"	۱ر۵۰ "
نرم گرم	"	۱ر۵۰ "
گردِ کارواں	"	۱ر۵۰ "
اندیشۂ شہر	"	۱ر۵۰ "
چراغ تلے	مشتاق احمد یوسفی	۱ر۵۰ "
گل گرم (لطیفے)	اشفاق احمد	۱ر۵۰ "
ڈھول کا پول (کارٹون)	شوکت محمود	۱ر۰۰ "
معلومات کا انسائیکلوپیڈیا (علم)		۳ر۰۰ "
شیر شیر شیر (شکار)		۳ر۰۰ "
ڈوب ڈوب کر ابھری ناؤ (رپورتاژ)		۲ر۵۰ "

میری لائبریری۔ چوک مینار۔ انارکلی۔ لاہور (مغربی پاکستان)

مولانا ظفر علی خاں

اس عظیم شخصیت کی داستان جس نے

- طوفانوں کو جھنجھوڑا۔
- سامراج کو للکارا
- ہولناک صعوبتوں کا خیر مقدم کیا
- اسلام کی حرمت کو مقصدِ جان بنایا
- کفر کی طغیانیوں کو جرأتِ کردار کی زد پر رکھا

"مولانا ظفر علی خاں"

اسی مردِ مجاہد اور بطلِ جلیل کی سوانح زندگی ہے یہ ایک عظیم شخصیت کے کردار کا مرقع ہی نہیں ایک طوفان بہ کنار دور کی مکمل سیاسی اور ادبی تاریخ بھی ہے۔

جنابِ محمد اشرف خاں عطا نے کم و بیش تیس سال اس بطلِ جلیل کی صحبت میں گزارے ہیں۔ وہ دفتر زمیندار سے لے کر زندان کی چار دیواری تک مولانا کے ساتھ سرد و گرم زمانہ کا مشاہدہ کرتے رہے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے تاثرات کو اس طرح قلم بند کیا ہے کہ پورے دور کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ قیمت: پانچ روپے۔

مولانا مرحوم کی منظومات کے مندرجہ ذیل مجموعے ہمارے ہاں سے چھپ کر بازار میں آ چکے ہیں۔

حبسیات دو روپے — چمنستان: تین روپے پچاس پیسے

نگارستان تین روپے پچاس پیسے

کاروانِ ادب کی مزید مطبوعات

خیالستان — مولانا ظفر علی خاں	۲/-
بہارستان — " "	۴/-
ارمغانِ قادیاں — " "	۲/-
کلیاتِ غالب (مطبوعہ و غیر مطبوعہ اردو کلام کا مکمل مجموعہ بشمول نسخہ حمیدیہ)	۲/-
نقشِ چغتائی (دیوانِ غالب کا مصور ایڈیشن)	۲۵/-
حرف و حکایت (انتخاب) از چراغ حسن حسرت	۱۰/-
فرہنگِ کارواں (لغات برائے متعلمین) ترجمہ: مولانا فضل الٰہی عارف	۱۲/-
سیرۃ الرسول — محمد حسین ہیکل، مترجمہ: مولانا محمد وارث کامل	۱۲/-
غلامانِ محمد — از محمد احمد پانی پتی	۵/-
قائد اعظم (بچوں کے لیے) از: چراغ حسن حسرت مرحوم	۱/-
اقبال — " "	۱/-
محمد تغلق (سلسلۂ اطفال)	-/۷۵
سلطان محمود غزنوی (")	-/۷۵
ظہیر الدین بابر (")	-/۷۵
نصیر الدین ہمایوں — چراغ حسن حسرت مرحوم	-/۷۵
علاء الدین خلجی — " "	-/۷۵
لہو ترنگ (قومی اور فوجی نظمیں) کیپٹن سید ضمیر جعفری	۲/-

مکتبۂ کارواں - کچہری روڈ —— لاہور

بیگم محمد علی کے خطوط لندن سے!

کانگریس اور خلافت میں ٹھن چکی ہے!
کانگریس اب ایک خالص ہندو جماعت بنتی جا رہی ہے۔ علی برادران اس سے قطع تعلق کر چکے ہیں اور مسلمانوں کی انفرادیت قائم رکھنے کے لیے انگریز اور ہندو سے جنگ کر رہے ہیں۔ اسی زمانے میں گول میز کانفرنس حکومت برطانیہ کی طرف سے لندن میں منعقد ہوتی ہے۔ مسلم مندوبین میں ایک محمد علی بھی ہیں!

محمد علی موت و زیست کی کش مکش میں گرفتار ہیں، معالج آرام اور علاج کا مشورہ دے رہے ہیں لیکن وہ لندن کے لیے رختِ سفر باندھ رہے ہیں، تاکہ سلطانِ جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنے کا فریضہ ادا کر سکیں۔ محمد علی کی بیماری جان لیوا ثابت ہوئی۔ گول میز کانفرنس میں ایک معرکۃ الآرا تقریر کرنے کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

میں نے اپنی کتاب "سیرتِ محمد علی" میں محمد علی کے احوال و سوانح کے سلسلے میں گول میز کانفرنس اور دوسرے مسائل کا ذکر بھی کیا ہے، یہاں ان کے اعادے سے اجتناب کیا ہے صرف ایک نئی چیز پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں، یعنی اپنی بیٹی کے نام لندن سے بیگم محمد علی کے خطوط، یہ بالکل غیر مطبوعہ خطوط ہیں اور ان سے بہت سے نئے امور پر روشنی پڑتی ہے۔ درحقیقت اس کتاب کا مقصد ہی وہ مواد پیش کرنا ہے جو مستقبل کے مؤرخ کے لیے ماخذ کا کام دے سکے اور
مدت سے جسے دورِ زماں میٹ رہا ہے!

★

(۲)

ہائڈ پارک ہوٹل نائٹس برج لندن
S.W.1
۲۷ نومبر

پیاری زہرہ دعا

تمہارے صرف دو خط آئے ہیں۔ تم نے اپنے میرٹھ جانے کا لکھا تھا۔ اس کے بعد سے کوئی خط نہیں آیا
میں تم کو برابر ہر ہفتہ خط لکھ رہی ہوں۔ تمہارے ابا کی طبیعت اچھی ہے۔ لیکن پیروں پر اور رانوں پر ورم بہت
گیا ہے۔ اس وجہ سے دو روز سے پلنگ پر ہیں۔ آرام کر رہے ہیں۔ برابر سب جگہ سے بلاوے آ رہے ہیں۔
ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے نہیں جا سکتی ہوں۔ تمہارے ابا کی طبیعت درست ہوتی ہے تو کہیں چلی جاتی ہو
انگریزی جانتی ہوتی تو خود بھی جا سکتی تھی۔ حیات کی امی نادرہ ایک روز میرے پاس آئی تھی اور پھر ہم سب کو
ہیں، صاحب، شوکت صاحب اور زاہد گئے تھے کھانے پر۔ لیکن گلنار نہیں گئی تھی۔ پھر رشیدہ دہلی والی اور
دونوں کو گلنار نے چائے پر بلایا تھا۔ غلطی سے وہ یہ سمجھیں کہ میں نے بلایا ہے۔ میں نے ٹیلیفون میں کہہ دیا تھ
بھی روز وہیں ہوتی ہوں۔ ہم دونوں وہاں مل جائیں گی۔ وہیں آکر ہمارے ساتھ چائے پیو۔ لیکن وہ میرے یہاں چلی
ان سے پوری طرح بات بھی نہ کر سکی۔ کیونکہ صاحب کی طبیعت اس روز اچھی نہیں تھی۔ پھر وہ دونوں مجھے اور گلنار
آئیں تھیں۔ میں دوسری جگہ چائے پر گئی تھی۔ وہ صاحب اندور رہ چکے ہیں۔ وہاں بیگم بھوپال بھی گئی تھیں۔ پھر وہا
واپسی پر میں رشیدہ کے پاس گئی تو معلوم ہوا کہ انہوں نے کھانے اور چائے دونوں پر بلایا تھا۔ کھانا کھایا ہندو
پھر رات کو واپسی ہوئی گلنار کو وہاں چھوڑ کر صاحب کو لے کر گھر واپس ہوئی۔ اب کل سے ہم اس ہوٹل میں آ گ
کیونکہ وہ جگہ بہت دور تھی۔ ایک تو موٹر کا خرچہ زیادہ پڑتا تھا۔ دوسرے آنے جانے میں ایک گھنٹہ لگ جاتا تھ
صاحب کے دل کے لئے بھی اچھا نہیں تھا کہ اتنی دیر موٹر میں لگے۔ مجھے آرام تھا چونکہ کھانے کا پوری ترکاری
مل جاتا تھا۔ اب پھر پیرس کی طرح چائے اور ٹوس پر گزر ہو گی۔ لیکن یہاں صاحب کو آرام ملے گا۔ یہاں خر
زیادہ ہو گا۔ لیکن مجبوری ہے کیا کیا جائے۔ نواب صاحب کی جگہ سے بھی بہت دور ہے۔ اور جہاں ان کو کانفرنس میں
ہے وہ بھی دور۔ یہاں اب دونوں جگہ قریب ہیں اور سب طرح آرام ہے۔ میں تو لندن سے بیزار ہو گئی ہوں۔ خ
کرے یہ کام جلدی ہو جائے اور کامیابی ہو تو واپس اپنے گھر جاؤں۔ تم اور طارق بہت یاد ہوتے ہو۔ بیگم صاحبہ سے
قریب روز ملاقات ہو جاتی ہے۔ چونکہ گلنار اوپر کے کمرے میں رہتی ہے، صاحب جب کانفرنس میں جاتے ہیں
وہاں چھوڑ جاتے ہیں۔ گلنار کھانا، چائے بیگم صاحبہ کے ساتھ ہی کھاتی ہے۔ تو میں بھی اکثر کھانے پر چائے
ہوتی ہوں۔ قریب قریب روز، ایک روز دو روز بعد ملاقات ہو جاتی ہے۔ گلنار اچھی ہے اور شعیب بھی اچھے
آداب عرض کرتے ہیں۔ شعیب کو کام بہت ہے دن بھر دیکھنے کو بھی نہیں ملتا۔ گلنار اپنے کمرے میں بیٹھی ر
بلا میں جاتی ہوں تو ہم دونوں ہوتے ہیں۔ کبھی بیگم صاحبہ کے پاس چلی جاتی ہے بہن پیاری بیگم کا بھی خط آیا ہے۔

(۱)

۹۲ہم مرٹن روڈ لندن
S.W.18

۱۱ نومبر ۱۹۳۲ء

پیاری زہرہ دعا

تمہارا خط اس ہفتہ نہیں آیا۔ نہیں معلوم کیا بات ہے۔ ہر ہفتہ خط لکھتی رہیں۔ ناغہ نہ کرنا۔ تمہارے ابا کی طبیعت پھر دو تین روز خراب رہی کیونکہ یہاں آنے کے بعد لوگوں سے ملنا ملانا رہتا ہے۔ کمزور بہت ہو گئے ہیں۔ اس وجہ سے تھک جاتے ہیں۔ ۱۷ سے کانفرنس شروع ہے۔ وہاں جانا ہوتا ہے۔ صبح دس بجے وہ وہاں جاتے ہیں۔ اور مجھے یہاں چھوڑ جاتے ہیں۔ ایک بجے واپس آجاتے ہیں۔ میں یہاں گلنار کے پاس رہتی ہوں۔ اور اگر وہ کہیں باہر پھرنے جاتی ہے تو میں بھی چلی جاتی ہوں۔ چونکہ تمہارے ابا اچھے ہوتے تو کہیں لے جاتے اور کچھ دکھاتے۔ لیکن وہ بیمار ہیں۔ شعیب کو کام سے فرصت نہیں ملتی۔ بیگم صاحبہ سے ملاقات ہوجاتی ہے۔ اکثر دوپہر کا کھانا اور شام کی چائے ان کے ساتھ پیتی ہوں صبح کی چائے اور رات کا کھانا گھر پر کھاتے ہیں۔ دال، بھات، پوری ترکاری۔ زاہد اور شوکت صاحب بھی مل جاتے ہیں۔ تمہارے ابا تم کو اور طارق کو پیار کہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے تم کو خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ ملا ہوگا اور اس میں سب پورا حال لکھا تھا۔ آج دہلی کی لڑکی رشیدہ آرہی ہے۔ اور ان کی بہن زہرہ کلکتہ والی چائے پر گلنار کے پاس۔ میرے نام رشیدہ کا خط آیا تھا۔ تو میں نے رات کو ٹیلیفون کیا تھا کہ تم ضرور آکر ملو۔ اور میں بھی گلنار کے پاس ہوتی ہوں وہیں آکر چائے پیو۔ تو وہ آرہی ہیں۔ اور آج رات مہاراجہ بڑودہ نے کھانے پر صاحب کو بلایا ہے! اور مہارانی بڑودہ نے مجھے بلایا ہے۔ وہاں جانا ہے۔ اگر تمہیں کوئی خاص چیز منگانا ہو تو مجھے لکھو کہ میں تمہارے لئے کیا لے کر آؤں۔ میرا تو بڑا کوٹ لینے کا ارادہ ہے۔ اگر صاحب کی دوا سے روپیہ بچا تو۔ لیکن تم بھی لکھنا کہ تم کو کیا چاہیئے۔ اور طارق کے لئے کیا لوں۔ طارق کو خوب پیار۔ تمہارے ابا کی بیماری نے مجھے بھی تھکا دیا۔ چونکہ کوئی آدمی نہیں کام کرتے کرتے تھک جاتی ہوں۔ خط لکھنے کو بھی فرصت نہیں ملتی ہے۔ لیکن تھوڑا سا اس لئے لکھ دیتی ہوں کہ اگر نہیں جائے گا تو تم پریشان ہو جاؤگی اب رخصت ہوتی ہوں۔ سب کو سلام دعا کہہ دینا۔ تمہارے ابا تم کو طارق کو پیار کہتے ہیں۔ خدا حافظ۔

تمہاری والدہ امجدی

کرتی ہے۔ شعیب بھی اچھے ہیں۔ دعا کہتے ہیں۔ طارق کو ہم سب کی طرف خوب پیار۔ بہن کا خط بھی آیا تھا وہ خیریت سے
کے بھائی سے بھی ملاقات ہوئی جو یہاں پڑھتے ہیں۔ مظفر کے خط بھی آرہے ہیں اس کی رخصت دسمبر کی ۱۲ سے جن
یا ۱۲ تک ہے۔ اس کو صاحب خرچ بھیج کر بلا رہے ہیں۔ باقی سب خیریت ہے اب رخصت ہوتی ہوں سب
سلام پیار کہہ دینا۔ چمن ماموں کو بھی خیریت لکھ دینا۔ میں نے ان کو خط نہیں لکھا ہے۔ ابراہیم چچا سے بھی کہ
جب تک ہم یہاں سے واپس ہوں انا کی تنخواہ جندریاکی اور دہلی میں چمن ماموں اور خانسامہ کی تنخواہ اور کھا
مکان کا کرایہ یہ سب تم کو معلوم ہے جو جاتا ہے اس کا حساب کر کے ذاکر صاحب کے پاس بھیج دیا کرنا۔ جب
لکھ کر منگائے کوئی ڈھائی سو روپیہ کے چیک صاحب نے ان کو میرے ہاتھ بھجوا دئیے تھے وہ روپیہ اب تک
ہوگا۔ اس مہینے میں ان کو روپیہ کی ضرورت ہوگی تو میرے حساب میں یہ ان کو جب تک ہم واپس ہوں جا
ضرور خدا حافظ (تمہاری دعاگو والدہ امجدی)

میں خط پورا کر چکی تھی کہ تمہارا ۲۴ کا خط ملا۔ اس لئے اس کا بھی جواب لکھے دیتی ہوں۔ کل ایک جگہ چا
ڈاک کا وقت نکل گیا آج اس کو پورا کر رہی ہوں ہوائی جہاز سے بھیجا جائے گا۔ ایک جگہ سے ابھی آئی ہوں ا
کو جانا ہے ایک نواب کرد ای کی بہن کے یہاں اور ایک جگہ اور۔ میں نے جو علاج شروع کیا ہے تو آ
گئی ہوں۔ تم طارق کو بہت محنت نہ کرنے دو۔ زندہ رہے گا تو پڑھ لے گا۔ ابھی اس کو آرام کرنے دو بہ
رہا ہے۔ اور تمہارے پڑھانے سے میں بہت گھبراتی ہوں کیونکہ تم اس کو مارتی ہو۔ میری طرف سے
خالہ کا بھی خط آیا تمہارے ابا کی تقریر کی تعریف لکھی ہے۔ اور یہ بھی لکھا تھا کہ زہرہ کا خط آیا ہے۔ را
بھی سب معلوم ہوئے۔ اگر میں اس کے علاج سے دبلی ہوگئی تو تم کو بھی سب بتادوں گی اور ورزش کراؤں گ
ہے کہ یہ تم کو درد کی کوئی بیماری نہیں ہے صرف سوچ پڑھتا ہے اس وجہ سے درد رہتا ہے۔ فقط تمہار
منداره کی نسبت معلوم ہو کر بہت صدمہ ہوا اگر اس کو نوکری کرنا نہیں تھی تو آنے کی کیا ضرورت تھ
ہمارے پاس کیا عـــہ سے کم ہوتے اتنے انعام ملے اور کپڑے اتنے روپیہ کے بنائے۔ پھر بھی اگر و
رہنا منظور نہ تھا تو ہم سے کہہ دیتا کہ میری گزر نہیں ہوگی۔ تو اور زیادہ دیتے۔ ہم نے تو اس کو اپنے گھر ک
تھا۔ صفیہ نے کہا کہ وہ بیکار ہے اور نوکری کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے رکھ لیا تھا۔ تم پورا حال معلوم ک
وہ نوکر ہوگیا ہے تو کسی اچھے آدمی کی فکر رکھنا۔ علی حسن کو اس کا باپ لے گیا۔ کسی، لاوارث لڑکے یا
تلاش رکھنا کیونکہ یہاں سے جانے کے بعد فوراً ہی ضرورت ہوگی۔ علی حسن سے مجھے بہت محبت ہوگئی تھ
باپ نہ معلوم اس سے کیا کرے گا۔ یہاں رہتا تو آدمی ہو جاتا۔ خود بھی خراب ہو رہا ہے اس لڑکے
خیر اس کو اختیار ہے تم ضرور لڑکے یا لڑکی کا خیال رکھنا نہ بہت بڑا ہو اور نہ چھوٹا۔ تمہارے ابا دوسر
اس ہفتہ نہیں لکھ سکے میرا اماں کو چنڈیا کو سلام۔ اخلاصی کو دعا۔ بھائی جان کو صاحب خط لکھوا دیتے
میں نے نہیں لکھا ہے۔ میرا آداب عرض کر دینا۔ ماجد کو دعا۔ بچوں کو پیار۔ ننو کو بھی دعا۔ اور تمہار

خیریت سے ہیں۔ اب رخصت ہوتی ہوں۔ زاہد شوکت صاحب سب خیریت سے ہیں۔ میری طرف سے بائی دیجی کو آداب، قمر کو پیار۔ صفدر اصفدری صفیہ کو دعا۔ عثمان فاروق کو دعا۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ فاروق عثمان نوکر ہو گئے طارق کو خوب پیار۔ خدا حافظ

تمہاری دعا گو والدہ

---

(۳)

ہائیڈ پارک نائٹس برج لندن
S.W.1

۱۴ر دسمبر ۱۹۴۷ء

پیاری زہرہ خدا تم کو زندہ و سلامت رکھے۔

تمہارا خط آیا۔ خیریت معلوم ہوکر خوشی ہوئی۔ تم نے جو خط غلطی سے زاہد کا میرے خط میں رکھ دیا تھا وہ خط جب آیا ہے تو زاہد موجود تھے۔ صاحب نے کھولا تو زاہد کا نام دیکھ کر فوراً زاہد کو دے دیا اور زاہد سے کہہ دیا کہ تمہارے نام کے لفافہ میں ہمارا خط آئے گا تم مجھے بھیج دینا۔ جب زاہد چلے گئے۔ تو تھوڑی دیر بعد کوئی ایک گھنٹہ کے میرے نام کا خط مل گیا۔ تمہارے ابا کو فکر ہو رہی تھی کہ نا معلوم ہمارے نام کا کیا لکھا ہوگا۔ اور وہ اس کے ہاتھ میں جائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا اب برابر خیال رکھو کر پہلے خط رکھ کر پتہ لکھ دیا کرو۔ اس ہفتہ تمہارے ابا پلنگ پر ہی رہے۔ آرام لینے کی غرض سے۔ دوسرے ورم بھی ہیں۔ تو چلنے کو ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں۔ لیکن یہاں جب سے آئے ہیں لوگ بہت آتے رہتے ہیں اور ٹیلیفون پر بھی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ زیادہ آرام نہیں لیتے۔ جیسے کہ ان کی عادت ہے اب چار یا پانچ روز سے اس ڈاکٹر کا علاج شروع کیا ہے جس کے علاج کو مہاراجہ الور نے بھیجا تھا۔ ان سے دہی پھل کھانے کو بتائے ہیں اور سات روز تک پلنگ پر رہنے کو کہا ہے اور اُسی ڈاکٹر کا علاج آج سے میرا بھی شروع ہوا ہے۔ سب کھانا بند۔ نمک بالکل بند۔ صبح چائے کے وقت پھل اور شام کو پھل اور ایک وقت کھانا مچھلی یا مرغی کا گوشت۔ روٹی ٹوس نہیں۔ دہی بتائی ہے جو صاحب کو بتائی تھی۔ زاہد ساتھ گئے تھے اور وہی جایا کریں گے۔ اس ہفتہ بلاوے تو بہت تھے لیکن صرف تین جگہ گئے تھے ایک کسی عورت کے یہاں چائے تھی۔ ۲ دسمبر کو، کل ۳ر کو ایک بہت بڑا دفتر ہے یا مکان ہے گرل گائیڈ کا وہ دیکھنے گئی تھی۔ گلنار بھی ساتھ تھی۔ پھر ایک بجے لنچ پر وزیر اعظم کے یہاں گئے تھے۔ شوکت ماموں، زاہد تھے۔ سب عورت مرد کوئی پندرہ[۱۵] یا سولہ[۱۶] تھے۔ آج ڈاکٹر کو دکھانے گئی تھی۔ اور اب چار بجے ایک جگہ چائے پر جانا ہے۔ اس لئے بہت بڑا خط نہیں لکھ سکتی ہوں۔ اچھا کیا میلاد شریف پڑھوا دیا۔ ہر جگہ تم اور طارق بہت یاد ہوتے ہیں۔ کل وزیر اعظم کی لڑکی نے خوب خاطر کی اور چلتے وقت سب سے اپنی کتاب پر نام لکھوائے۔ میں نے بھی لکھا لیکن میرا نام دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ کوئی نہ کوئی عورت یا مرد ایسا مل جاتا ہے کہ میری ترجمانی کر دیتا ہے تم اپنے ابا کی وجہ سے پریشان نہ ہونا۔ انشاء اللہ وہ ضرور اچھے ہو جاویں گے۔ اس ڈاکٹر کے علاج سے۔ تم بھی ورزش کرو اور روٹی اور چاول کھانا چھوڑ دو تو ضرور دبلی ہو جاؤ گی۔ گلنار اچھی ہے برابر آتی رہتی ہے تم کو آداب عرض

خط صاف ہاتھ روک کے لکھا کرو۔ ہوائی جہاز سے کیا بھیجتی ہو کہ خط بھی ہوائی جہاز کر دیتی ہو۔ کل تمہارے ابا کا فاقہ تھا۔ آج پھل کا رس پیا ہے۔ سوجن ہے۔ اس کی وجہ سے پلنگ سے ڈاکٹر اٹھنے نہیں دیتے ہیں۔ ویسے طبیعت اچھی ہے۔ تم دعا کئے جاؤ اور پریشان نہ ہوا کرو کہ جس کام کے لئے آئے ہیں بیماری کی حالت میں اس میں کامیابی ہو اور ہم سب زندہ وسلامت خوشی خوشی اپنے گھر واپس جائیں آمین!

---

(۴)

۷۸۶

لندن ۱۹؍دسمبر ۱۹۳۰ء

پیاری زہرہ دعا پیار

تم زندہ سلامت رہو۔ اس ہفتہ تمہارا خط نہیں آیا نہ معلوم کیا بات ہے۔ اُس ہفتہ تو گلنار کے خط میں خط رکھ کر آیا تھا۔ اس سے خیریت معلوم ہوگئی۔ قاسم صاحب کی بابت جو تم نے لکھا تھا کہ وہ بیمار ہیں اور علاج کے لئے رخصت پر آرہے ہیں۔ اچھا کیا تم نے ان کو مکان میں رہنے کے لئے لکھ دیا۔ اگر ہم آبھی جائیں گے تو اتنی جگہ ہے کہ سب رہ سکتے ہیں۔

تمہارے ابا کا وہی حال چلا جاتا چونکہ کمزور ہو گئے اگر تھوڑا کام کرتے ہیں یا کانفرنس میں کسی روز چلے جاتے ہیں تو زور بڑھتا ہے۔ ورم ابھی تک چلا جا رہا ہے۔ پیشاب بڑھانے کی دعا بھی دی۔ ڈاکٹر یہی کہتے ہیں کہ آرام کرنا چاہئے۔ جب سے اس ہوٹل میں آئے ہیں برابر آرام کر رہے ہیں۔ کہیں آتے جاتے نہیں ہیں۔ صرف کبھی بہت ضرورت ہوتی ہے تو کام پر چلے جاتے ہیں۔ وہ بھی یہاں سے لفٹ میں گئے۔ ٹیکسی میں بیٹھے وہاں جا کر لفٹ میں اوپر چلے گئے۔ مظفر آ گئے ہیں۔ اچھی طرح ہیں۔ کمزور بہت ہو رہا ہے۔ دبلا ہو گیا ہے صحت اچھی نہیں رہتی ہے۔ امتحان سب پاس ہو گیا۔ بیگم صاحبہ بھوپال اور لڑکیاں ۲۴ کو جا رہی ہیں۔ گلنار بھی ساتھ جاتی لیکن ابھی کام شعیب کا ہے۔ اس وجہ سے وہ بھی نہیں جا سکتی ہیں۔ اگر شعیب جاتے تو وہ بھی چلی جاتی۔

نواب صاحب بھوپال ابھی نہیں جا رہے ہیں۔ وہ جب کانفرنس ختم ہو جائے گی تو جائیں گے۔ سُن رہے ہیں کہ جنوری کی شروع تاریخ میں ختم ہو جائے گی۔ خدا کرے جلد ہو جائے۔ میں تو بہت گھبرا گئی ہوں۔ صاحب کی علالت کی وجہ سے اور اگر وہ اچھے ہوتے تو کچھ نہیں تھا کہیں جاتی بھی ہوں تو دل نہیں لگتا۔ مجبوراً چلی جاتی ہوں۔ اس ہفتہ میرا وزن بہت کم ہو گیا۔ ورزش برابر کر رہی ہوں۔ زیادہ وقت ورزش کرنے کو نہیں ملتا۔ پھر بھی دو وقت کرتی ہوں۔ تھوڑا کچھ گوشت مچھلی کھا لیتی ہوں اور تھوڑے سے پھل۔ بہت اچھی طبیعت معلوم ہوتی ہے۔ تم بھی ہلکا سونے کی کوشش کرو میں اس ہفتہ کئی جگہ گئی۔ ۱۵ کو رات کو ڈنر تھا۔ پرنس آف کناٹ برٹش انڈیا یونین جو اسی ہوٹل میں تھا۔ تو میں صاحب کو بھی لے گئی تھی۔ ہر وقت پڑے پڑے ایک ہی خیال دل میں رہتا ہے۔ آج تک کہیں نہ جا سکے۔

۱۶ کو مانوں کا کلب - ۴ بجے چائے پر گئے تھے - رات کو ایک یہودی کے یہاں ڈنر تھا وہاں گئے - ہال پھر ۱ بجے
اں سے لارڈ ریڈنگ کے یہاں ریسپشن تھا گئے - وہاں پرنس آف ویلیز بھی آئے تھے - وہاں سے ۱۱ بجے واپس آ گئے -
س رات کو ۳ بجے دل کا دورہ صاحب کو ہوا - مہاراجہ الور کے دو ڈاکٹر یہاں رہتے ہیں ان کو بلا کر دکھایا انہوں نے
دوا دی پی رہے ہیں - اس سے آرام ہوا صبح کو اسی ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا اس نے کہا کہ کسی کو آنے جانے نہ دو اب کل
سے آج طبیعت بہتر ہے - تم گھبرانا نہیں - میں کل حال تم کو لکھ دیتی ہوں -
۱۷ کی رات کو مہاراجہ صاحب الور کے ہاں دعوت تھی - کوئی ۵۰۰ آدمی کی - نہ میں جا سکی اور نہ صاحب جا سکے
ور تھی -
۱۸ کو یہاں کی مسجد کی طرف سے لوگوں کی چائے تھی - آج ۱۹ کو ۴ بجے برٹش انڈیا یونین چائے ہے - وہاں جاؤں گی
۲۰ کو نواب صاحب بھوپال کے یہاں چائے - وہاں جاؤں گی - صاحب بے چارے نہیں جا سکتے ہیں باقی سب
ریت ہے - اب رخصت ہوتی ہوں - باقی چچی کو میری طرف سے اور صاحب کی طرف آداب عرض کر دینا - اور کہہ دینا
ہاراجہ صاحب اندور پیرس کے بھی باہر رہتے ہیں اور ان سے کسی کو ملنے کی اجازت بھی نہیں ہے اور نہ ان کے اختیار
ں کچھ ہے کہ وہ کسی کے لئے کچھ کر سکیں - سب کو دعا سلام بھائی جان کو میرا اور مظفر کا آداب - تم کو اور طارق کو مظفر
ار کہتا ہے - ننو کو دعا - اچھو کو آداب - خدا حافظ

تمہاری والدہ امجدی

اسی خط کی پشت پر

پیاری زہرہ بہت سی دعائیں و پیار
مجھے تو کبھی خط سے آپ نے یاد بھی نہ کیا - بہر حال شکایت نہیں - میں چند دنوں سے پانچویں نہیں بلکہ ہزار دل
وار دل میں ہوں - مگر بڑی خوشی یہ ہے کہ آپا گلنار کو مل لیا اور تم سے نہ ملنے کا افسوس بھی اسی قدر ہے - دو ابا بھائی کی
یعت خراب ہونے کے سبب طبیعت اور پریشان رہتی ہے - خدا کرے کہ وہ جلد صحت یاب ہو جائیں - بھائی جان کو
شاء اللہ آئندہ ہفتہ لکھوں گا - میری صحت تو خیر مگر اپنی خیریت سے مطلع کرنا - طارق میاں کو بہت بہت پیار -
ائی جان کی خدمت میں دست بستہ آداب - رضیہ بی - صادق بھائی و خاندان اور مجو صاحب و متعلقین کو سلام و
ت بستہ سلام کہہ بھیجیں -

زیادہ پیار
دعا گو مظفر

آ ئے تو انہوں نے کہا کہ بھابی دعا کرو اور میں بھی دعا کرتا ہوں تو میں اور گھبرا گئی اور باہر کمرے کے نکل کر آئے کر
صاحب کو ٹیلیفون کر دوں اتنے میں ڈاکٹر آ گئے اور انہوں نے رات کو رپورٹ دیکھی اور نبض دیکھی تو نبض کا
اس نے گھبرا کر شوکت صاحب کو ٹیلیفون کیا کہ تمہارے بھائی کی یہ حالت ہے جلد آؤ۔ یہ بیچاری ایک عورت
پیر وہ آئے۔ زاہد، شعیب، مظفر سب آ گئے۔ میری بری حالت ہو گئی۔ میں دوسرے کمرے میں آ کر رونے لگ
ڈاکٹر رحمٰن اور مانک سب کی رائے ہوئی کہ کیا کیا جائے۔ ڈاکٹر رحمٰن نے کہا کہ حالت نازک ہے لیکن میری را
جلاب کی دوا دی جائے۔ دوا انجکشن دی۔ ایک دل کے لئے اور ایک پیشاب کے لئے تو پیشاب آیا اور کہ
خطرے کم ہیں۔ یہ گزر جائیں

رات کو پھر ڈاکٹر آئے تو کچھ حالت بہتر بتائی۔ اس وقت وہ چلے گئے۔ رات کو شوکت صاحب اور
برابر کے کمرے میں رہے اور جا کر دیکھتے رہے۔ دوسرا کمرہ اور لیا۔ صبح ہوئی تو اجابت ہونا شروع ہوئی
میں ۱۲ اجابتیں ہوئیں تو پھر ڈاکٹر آئے تو کہا کہ نبض اب کل سے آج بہتر ہے اور کل سے ٹوس اور ابلی مچھلی
لیکن کمزور بہت ہو گئے ہیں۔ سب ڈاکٹروں کی یہ رائے ہے کہ نرسنگ ہوم میں بھیج دیا جائے۔ شاید دو چار
دیں گے۔ اب ان میں اتنی قوت نہیں ہے کہ خدا نہ کرے دل کا دورہ ہو اور اس کی برداشت کر سکیں۔ وہ
ذرا طبیعت ٹھیک ہوتی ہے تو باتیں کرتے ہیں۔ ہم نے جا کر کہہ دیا کہ آپ کی یہ حالت ہو گئی تھی۔ خدا نے
رہے تھے۔ نہ معلوم میری بیٹی زہرہ کی کیا حالت ہو گئی ہو گی۔ آج کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ میں خط اپنے ہاتھ
لکھوں گا۔ میں نے کہا کہ میں تو لکھ رہی ہوں اگلے ہفتے لکھنا۔

ہم سب وہاں زیادہ نہیں جاتے ہیں کہ یہ باتیں کریں گے۔ لیکن وہ نرس سے باتیں کرتے رہتے
وجہ سے مجھے بہت آرام ملا کہ میں اکیلی نہیں رہی اور سب تو آتے جاتے رہتے تھے لیکن وہ ہر وقت میر
رات کے دس ۱۱ بجے تک رہنا ہے۔ میں نے تو دو روز کھانا نہیں کھایا نہ اس لئے کھایا نہ وہ مجھے چھو
تھا ۲۲ کو دوپہر کو میری بری حالت ہونے لگی۔ بھوک کے مارے تو یہاں ایک مسلمان کی دوکان ہے
کھانے کی۔ وہاں ہندوستانی کھانا ملتا ہے۔ میں پہلے کبھی ہفتہ ایک مرتبہ وہاں جا کر کھانا کھ
سے ٹیلیفون کر کے دو آدمی کا کھانا منگایا اس وقت گلنار، شعیب آئے تو انہوں نے بھی کھانا نہیں کھ
زاہد تھے۔ ہم سب نے مل کر کھایا۔ اور خدا کا شکر ادا کیا۔

تمہارا وہ خط جس میں تم نے روپیہ کا لکھا تھا، تمہارے ابا کے نام تھا وہ ان کو نہیں دکھا سکے۔ صر
کا خط آیا ہے وہ خیریت سے ہے تو رونے لگے کہ ارے میری بیٹی کا نہ معلوم کیا حال ہو گا۔

صاحب نے جنوری کو بھوپال سے چچا کو خط لکھ دیا تھا اگر میرا روپیہ نہیں بھی تھا تو کیا تھا۔ میرا روپیہ
اور برسوں رہا تو تمام خاندان کے خرچ میں آتا تھا اور اب مجھے ضرورت ہے تو دو ہزار نہیں ہم ہزار نہیں صر
کا کسی کو ہمارا اعتبار نہیں تو میں نے بھی بھائی جان کو خط لکھ دیا ہے اور تم بھی ان سے کہہ کر کوشش کر کے

ہائیڈ پارک۔ نائٹس برج لندن
S.W.1

۲۶ دسمبر ۱۹۳ء

پیاری زہرہ دعا

تم زندہ سلامت تندرست رہو۔ تم پر جو اپنے باپ کی وجہ سے پریشانی گزری ہوگی اس کا بھی مجھے اندازہ ہے لیکن کیا کیا جائے اخبار والے نہیں مانتے لکھ دیتے ہیں میری رائے نہیں تھی۔ اب سنو کہ کیا ہوا میں ہر ہفتہ تم کو خط لکھ رہی ہوں اور کل حال جوان کا ہوتا ہے لکھتی رہی ہوں۔

۱۶ کو یہاں سے کانفرنس میں گئے، وہاں سے واپس آئے تو کوئی ملنے آیا تھا۔ اس سے باتیں کرتے رہے پھر سو گئے۔ رات کے تین بجے دل کا دورہ ہوا ڈاکٹر کو ٹیلیفون کیا مہاراجہ الور کے دو ڈاکٹر یہاں رہتے ہیں۔ مقبول اپنے ساتھ لے کر آئے وہ مقبول جن کے یہاں شملہ جاتے ہوئے سوسن پر کھانا کھایا تھا دوا دی۔ میں پہلے وہ دوا رومال میں دے چکی تھی جو ڈاکٹر رحمٰن نے چلتے وقت دی تھی کہ کہیں ایسا ہو تو سونگھانا۔ اس سے کچھ آرام آیا سو گئے دن کے دس بجے تک سوتے رہے۔ پھر ڈاکٹر کو ٹیلیفون کر کے بلایا ڈاکٹر مانک تہمینہ بائی کے شوہر انہوں نے کہا کہ بیگم صاحبہ میں نے ایسی حالت کسی روز صاحب کی نہیں دیکھی۔ میں اتنے روز سے علاج کر رہا ہوں کسی کو کمرے میں نہ آنے دو اور نہ کسی سے بات کرنے دو اور نہ لکھنے پڑھنے کا کام۔

۱۷ کو مہاراجہ الور کے یہاں ڈنر تھا۔ وہاں نہیں جا سکے۔ شوکت صاحب چلے گئے۔ ۱۹ کو ہندوستان کی ڈاک لکھواتے رہے۔ خود بولتے جاتے تھے اور سیکرٹری لکھ رہے تھے لیکن پھر بھی حالت یہ تھی کہ آواز پر کمزوری معلوم ہوتی تھی۔ بھائی کو خط لکھوا رہے تھے۔ بی اماں کو آداب بہن کو دعا۔ خیر وہ خط پورا ہوا۔ مجھے ایک جگہ چائے پر جانا تھا لیکن نہیں گئی۔ اور اسی روز مہاراجہ الور نے چائے پر بلایا تھا تو صاحب نے کہا کہ اسی ہوٹل بلکہ اسی منزل پر دوسری طرف ہے چلی جاؤ۔ میں وہاں گئی۔ وہاں سے واپس آئی۔ تو خط پورا کرا چکے تھے۔ لیکن اسی کا پورا کرنا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ ٹیلیفون کر کے ڈاکٹر کو بلایا تو وہ دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس نے دوسرے ڈاکٹر جو دل کا علاج کرتا ہے۔ اس کی برابر رائے لی جا رہی تھی۔ ایک مرتبہ پہلے اس کو دکھا دیا گیا تھا۔ اس کو بلایا دونوں نے دیکھا اور مجھے کہا کہ ہم نرس کو بھیجتے ہیں۔ ایک نرس دن میں اور ایک رات میں رہے گی اور ان کو پلنگ سے ہلنے نہ دو۔ غرض یہ کہ نرس آ گئی رات بڑی تکلیف رہی اور بڑی مشکل سے رات کٹی۔ صبح کو غفلت ہو گئی۔ گلنار آ گئی۔ میں اور وہ بیٹھے دیکھتے رہے اس وقت تک نہ شوکت ماموں آئے تھے نہ زاہد۔ زاہد کے پیر میں کچھ تکلیف ہو گئی تھی۔ شعیب کو تو نواب صاحب کے کام سے فرصت ہی نہیں ملتی ہے۔ کبھی رات کو تھوڑی دیر کو یا کبھی دن کو آ گئے۔ وہ رات ایسی کٹی کہ جیسے شملہ پر کٹی تھی۔ وہاں تم ہی تھیں یہاں نرس اور میں اکیلی اور جب قوت تھی اور اب کمزوری۔

میں نے گلنار سے کہا کہ میرا تو ان کی حالت دیکھ کر دل گھبرا جاتا ہے۔ تم جا کر ڈاکٹر رحمٰن کو بھیجو۔ جب ڈاکٹر رحمٰن

بھجوا دینا۔ سب حساب میں لکھتی ہوں۔ کرایہ مکان ۴۰ روپے۔ تنخواہ چمن ماموں ۱۵ روپے۔ تنخواہ خواصہ ۲ روپے۔ خوراک چمن ماموں ۲۱ روپے۔ خانسامہ ۱۲ روپے۔ مہتر بہشتی ۲ روپے۔ تیل جلانے کا ایک روپیہ۔ جیب خرچ زہرہ طارق ۱۵ روپے۔ تنخواہ آتا ۹ روپے۔ تنخواہ جھنڈیا ۳ روپے۔

یہ کل میزان ایک سو تیئس [۱۲۳] روپیہ کا ہوتا ہے تو ایک سو دو [۱۰۲] روپیہ تو ہر مہینے یعنی یکم دسمبر سے برابر دینا چاہئے۔ جب تک میں واپس ہندوستان آؤں ذاکر کے نام ایک سو دو روپیہ ہر مہینے بھیج دیا یا ایک دم تین مہینے کا حساب کر کے ان کو بھیج دینا۔ وہ جیسا بھائی جان مناسب سمجھیں۔ لیکن پہلی کو ان کو مل جانا چاہئیں۔ بھائی جان سے کہہ دینا کہ آپ کہیں سے قرضہ لے کر انتظام کر دیجئے۔ میں وہاں آ کر سب ادا کر دوں گی اور چھوٹے لال کو بلا کر میرا بھی حساب لینا کہ میرا کتنا روپیہ ہے۔ میں یہاں سے بھیج دیتی بلکہ صاحب کہہ رہے تھے میں نے بیماری کی وجہ سے نہیں بھیجا کہ ہم یہاں پردیس میں ہیں تو ہم کیا کریں گے۔

قاسم کے دو خط صاحب کے نام آئے لیکن وہ زیادہ بیمار ہو گئے۔ جواب نہ لکھ سکے۔ میں اکیلی کیا کروں۔ کیسے اتنے خط لکھوں۔ تم ان کو لکھ دینا کہ بھائی تمہاری علالت کی وجہ سے فکر ہے اور میں تو خود بیمار ہو رہا ہوں۔ تم بڑی خوشی سے مکان میں آ کر رہو اگر ہم آئیں گے تو ہم بھی رہ سکتے ہیں۔ خدا حافظ

دعا گو تمہاری والدہ امجدی

(۶)

لندن

۹ جنوری ۱۹۳۱ء

پیاری زہرہ پیار

میں زندہ ہوں لیکن مردوں سے بدتر نہ معلوم میری قسمت میں کیا لکھا ہے کہ اب تک زندہ رہی۔ جن کی دنیا کو ضرورت تھی وہ مجھ کو اور تم کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ اسی کا ہر وقت خوف رہتا تھا وہ سامنے آ کر رہا۔ میری ایک بھی دعا قبول نہ ہوئی۔ ان کا دل ہی ہندوستان جانے کو نہیں چاہتا تھا جب کبھی جانے کا نام آتا تو کہتے تھے کہ میں ابھی نہیں جاؤں گا۔ جب پورا کام ہو جائیگا اس کے بعد پیرس جاؤں گا۔ علاج کراؤں گا۔ اور ر ۲ جاؤں گا۔ میں یہ سن کر اور ان کی کمزوری اور کام دیکھ کر گھبراتی تھی میری ایک بات نہیں سنتے تھے۔ اس لئے مجبور دیکھتی رہتی تھی۔ جب ۲۰ کو زیادہ بیمار ہو گئے تھے اور ہوش آ گیا تو میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ آپ انہیں کہئے کہ ہندوستان جلد چلے جائیں اور جو ان کی حالت ہے وہ ان کو بتا دو۔

ڈاکٹر مانک نے ایک روز کہا کہ بھائی محمد علی تمہاری حالت ایک شیشہ کے گلاس کی طرح ہے کہ اگر اس کو احتیاط سے رکھا جائے تو برسوں رہ سکتا ہے لیکن اگر اس کو زمین پر مار دو تو ٹوٹ جائے گا۔ آپ کی حالت ایسی نہیں ہے کہ اس قدر سفر کر سکیں شوکت صاحب زاہد چلے جائیں گے۔ یہ اکیلی بیگم صاحبہ کیا کریں گی۔ ڈاکٹر علاج کرے گا لیکن نئے گردے کہاں سے لائیگا۔ آپ کے گردے کام نہیں کر رہے ہیں۔ صرف دل کا ہی سوال نہیں ہے اور تمہارا علاج سوائے آرام کے کچھ نہیں ہے۔ ایک

تو یہ کہ اگر آپ کام نہیں چھوڑیں گے تو آپ جلد اچھے نہیں ہو سکتے ہیں اور سوائے اس کے کہ ڈاکٹر روپیہ لے اور کچھ
ہو گا آپ کا اچھا ہونا آپ کے ہاتھ میں ہے اور آپ آرام کیجئے اور یہاں کی سردی بھی آپ کے لئے اچھی نہیں ہے۔ یہ
رائے دیتا ہوں کہ آپ ہندوستان جلد چلے جائیے اور آپ اکیلے جانے کے قابل نہیں ہیں۔ کوئی ڈاکٹر ساتھ
اس کے بعد کہا کہ اچھا ڈاکٹر اگر آپ کی یہی رائے ہے تو میں ۱۶ کو یا پھر ۲۳ کے جہاز سے چلا جاؤں گا۔ ۲۱ کے
بہت ہو گئے تھے۔ لیکن پھر برابر طاقت آ رہی تھی اور یہ خیال نہیں تھا کہ اس قدر جلدی ہو جائے گی۔

جب ایک ہفتہ گزر گیا تو کہا کہ تم اس کمرے میں آ کر کیوں نہیں رہتے ہو۔ میں نے کہا کہ نرس ہوتی ہے۔ ا
نہیں معلوم ہوتا تو کہا کہ اب مجھے رات کو نیند خوب آ جاتی ہے اور رات کی نرس کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈاکٹر
اب کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ رات کی نرس بند کر دی گئی دن کی آتی تھی۔ چہرے پر یہ معلوم ہوتا تھا ایسی
جلد تندرست ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر بھی خوش تھا۔

۲۹ کو کہا کہ میری ایک لڑکی یہاں ہے اور اس کی سالگرہ ۳۱ کو پوری ہوتی ہے۔ اور میں نے آج تک
ہے۔ یہ خوشی تو میں ضرور کروں گا اور سب کو بلا کر کھانا ہندوستانی شفیع کے ہوٹل سے منگا کر کھلا دوں گا لیکن
اور نواب بھوپال سے معلوم کر لوں کہ انہوں نے کہیں باہر جانا تو نہیں ہے۔ مہاراجہ صاحب کو خط لکھا انہوں
ان کے خط میں لکھا تھا کہ ایک مرتے ہوئے شخص کی یہ آخری آرزو ہے کہ آپ میرے ساتھ آ کر کھانا کھائیں نوا
اور لوگوں کو پہلے سے دعوت دے چکے تھے۔ وہ نہ آ سکے۔ مہاراجہ صاحب کے یہاں سے ۱۶ آدمی تھے۔ پھر ٹیلیف
کو دعوت دی۔ مہاراجہ جام صاحب چونکہ بیمار تھے نہ آ سکے۔ صاحب اسی روز باہر جا رہے تھے۔ زاہد کی
تھی وہ بھی نہیں آئے۔ مظفر دن بھر رہا۔ اور کام کرتا رہا۔ خود کھانے کے لئے ٹیلیفون سے کہا۔ بادشاہ کے
وزیر ہندان کی بیوی سندری ہاشیب غرض یہ کہ سب ۲۰ آدمی ڈنر پر تھے برابر کے کمرے میں میز لگائی گئی۔ خود
بیٹھے رہے۔ کھانے کے بعد مہاراجہ صاحب نے تقریر کی۔ ان کا شکریہ خود ادا کیا۔ خوب خوشی خوشی خود بھی
کھاتے رہے۔

جب سب لوگ چلے گئے تو پھر اپنے کمرے میں آ گئے۔ چونکہ گلنار کی کچھ طبیعت خراب ہو گئی تھی وہ
صبح ہوئی تو کہا کہ گلنار نہیں آئی۔ میں نے کہا آتی ہو گی وہ آئی تو اس سے خوب باتیں کرتے رہے اس نے
کو مرنے نہ دیں گے اور دل کے مرض والے جلدی نہیں مرتے ہیں۔ تو کہا کہ بیٹی مجھے تو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ
ہوں اب بھی اتنی قوت ہے کہ ہاتھی سے لڑ سکتا ہوں اور خدا کا شکر ہے کہ مرتے مرتے بچ گیا۔ میری بیٹی
ہو گی۔ یہ خبر میں نے سن کر گلنار سے کہا کہ بیٹی تیرے لڑکا ہو گا تو محمد علی نام رکھیں گے اور لڑکی ہو گی تو
ہنستے رہے۔

یکم کو ۸ بجے ایک جگہ جانا تھا مجھ سے کہا کہ وہاں ضرور جانا میں چلی گئی۔ نرس تھی۔ ۲ کی دوپہر کو گلنار
میں سینما دیکھنے جا رہی ہوں تم بھی چلو تو کہا کہ ضرور چلی جاؤ میں بالکل اچھا ہوں۔ میں وہاں گئی۔ وہاں سے وا

تھے دوسرے روز ڈاک کا روز تھا تو میں تم کو اور بھائی جان کو خط لکھنے لگی ۔ تمہارا ابھی کامیابی کا خط آیا تھا وہ مجھے دیا اور کہا کہ میری بیٹی زہرہ کو لکھ دو کہ ۲۰ کو تو میری بری حالت ہوگئی تھی لیکن بچ گیا اور میں آج بہت تھک گیا ہوں ورنہ خود خط لکھتا میں نے کہا کہ میں نے سب لکھ دیا ہے ۔ اسی روز جب کہ میں گئی ہوئی تھی لکھواتے رہے ۔ ڈاکٹر بیٹھے تھے ان سے کہا کہ اب میرے دل کی حالت دیکھ لو اور پھر بعد میں بھی دیکھ لینا ۔ ڈاکٹر نے بعد میں دیکھا تو حالت اچھی تھی ۔ کہا کہ اب میں خوش ہوں کہ میں نے اپنا سب کام ختم کیا اس کے بعد اس کو دیکھتے رہے اور اس کی غلطی نکالتے رہے ۔ دوسری کاپی منگائی تھی کہنے لگے کہ افسوس میں نے اس قدر محنت بھی کی اور وہ کاپی اب تک نہیں آئی کہ میں ہندوستان بھیجتا میں نے کہا کہ آپنے آج بہت کام کیا ہے اب آپ آرام کیجئے ، رات کو ۱۱ بجے سو گئے ۔ جس طرح روز اُٹھتے تھے دو تین مرتبہ ۔ اسی طرح دو تین مرتبہ اٹھ کر پیشاب کیا ۔ صبح ۸ بجے مجھے آواز دی کہ اب اٹھئے میرا منہ دھلوا دیجئے ۔ میں نے منہ دھلوا دیا خوب دانت صاف کئے ۔ منہ ہاتھ اپنے ہاتھ سے دھویا اور پھر میں نے جلاب کی دوا دی ۔ پٹیاں لگا دیا کہا کہ مجھے بھوک بہت لگی ہے ۔ خود گھنٹی دی ۔ نوکر آیا اس سے کہا کہ کافی اور ٹوس لا ۔ وہ لایا کافی پیتے رہے اور ٹوس کھاتے رہے اتنے میں ۹ بج گئے ۔ نرس آگئی میں نے کہا کہ اب نرس آگئی میں غسل خانہ ہو آؤں کہا کہ جاؤ میں آگئی تو کہا کہ ابھی تک لڑکے زاہد اور مظفر نہیں آئے ۔ ٹیلیفون کرکے بلاؤ ۔ ان سے مجھے بہت کام لینا ہے ۔ میں نے ٹیلیفون کیا ۔ زاہد نے کہا کہ میں ابھی آتا ہوں ۔ اخبار اور ڈاک آگئی اس کو دیکھتے رہے ۔ میں نے کہا کہ جس قدر لوگ ہندوستان سے آئے ہیں ۔ انہوں نے سب نے جہاز میں انتظام کر لیا ۔ آپ نے ابھی تک نہیں کرایا ہے تو کہا کہ زاہد آجائے تو ۱۶ کے جہاز سے اور ۲۳ کے جہاز سے انتظام کرتا ہوں ۔ زاہد آئے تو ان سے کہا کہ ٹیلیفون کرکے انتظام کرو ۔ چونکہ ہفتہ کا دن تھا ۔ انہوں نے کہا کہ آج نہیں ہوسکتا ہے ۔ اس لئے کہ بارہ بج گئے ۔ سب دفتر بند ہوگئے ۔ تو کہا کہ اچھا پرسوں ۔ لیکن اتنی دیر میں مظفر عزیز آگئے ۔ ان سے باتیں کرتے رہے ۔ میں نے کہا کہ پان ہے کھلا دوں تو کہا کہ ہاں ۔ خود کہنے لگے کہ مجھے بھی پان دو ۔ میں نے پان دیا ۔ کھاتے رہے ۔

جب مظفر چلے گئے تو پھر ٹیلیفون کرکے حیدرآباد کے مہدی یار جنگ کو بلایا ۔ ان سے باتیں ایک گھنٹہ کرتے رہے ۔ دن کے ۲ بج گئے ۔ ہندوستانی ہوٹل سے مونگ کی کھچڑی منگائی ۔ نرس نے کہا کہ آپ نے اپنے کھانے کو دیر کردی اب کھا لیجئے ۔ وہ کھچڑی لے کر آئے اس کو کھاتے رہے مکھن ڈال کر اس کے بعد مجھے کہا کہ یہ کھچڑی تم کھالو ۔ یہاں ہوٹل کا کھانا کھاتی نہیں ہو اور میری وجہ سے باہر کھانے کو نہیں جاتی ہو ۔ دن بھر بھوکی رہتی ہو میں نے کہا کہ میں نے تو کبھی مونگ کی کھچڑی نہیں کھائی اور خالی کاہے سے کھاؤں ۔ تو کہا کہ تمہارے پاس چٹنی اچار ہے ۔ اس سے کھاؤ ۔ اور پھر گھنٹی دے کر نوکر کو بلایا اور کہا کہ مکھن گرم کرکے لاؤ ۔ میں پلنگ کے قریب بیٹھی تھی کھاتے رہے اور باتیں کرتے رہے ۔ میں نے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی ۔ اس وقت کچھ مجھے رونا سا آگیا ۔ اور میں کہنے لگی کہ دیکھو آپ کام کرنا نہیں چھوڑتے اور ڈاکٹر خوف دلاتے ہیں ۔ اور جب آپ کی طبیعت خراب ہوتی ہے تو میری عجب حالت ہوتی ہے ۔ تو کہا کہ ہاں میں جانتا ہوں اور میں نے کہا کہ سوائے آپ کے میرا تو کوئی نہیں تو کہنے لگے کہ

مرحومہ گلنار بیگم ـــ ب قریشی

مولانا محمد علی کی چھوٹی صاحبزادی

مولانا محمد علی کا تابوت

مولانا شوکت علی گول میز کانفرس میں

دوسری گول میز کانفرنس لندن میں ڈاکٹر محمد اقبال (دائیں طرف) کی شرکت کا ایک تاریخی منظر
ان کے بائیں طرف مولانا شوکت علی (دائیں طرف دو کے نمبر پر) سر عبدالقادر اور چھٹے نمبر پر سید محمد علی بیٹھے ہیں

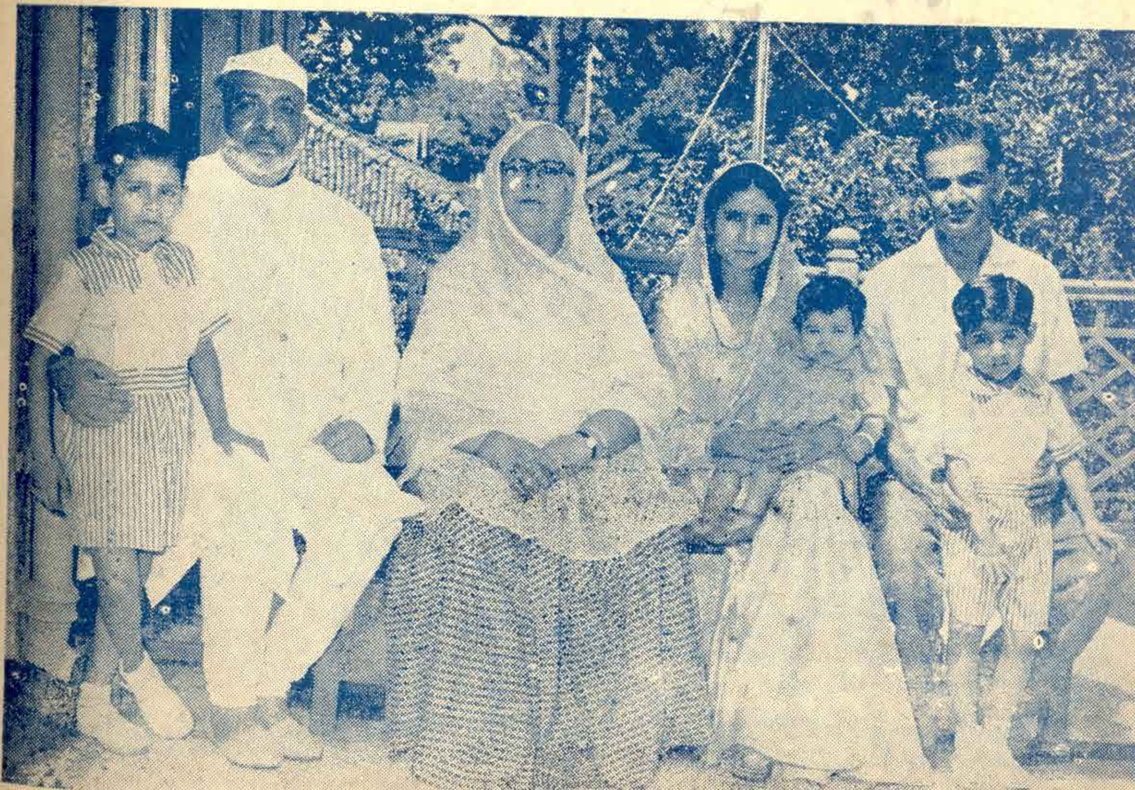

ایک تاریخی تصویر

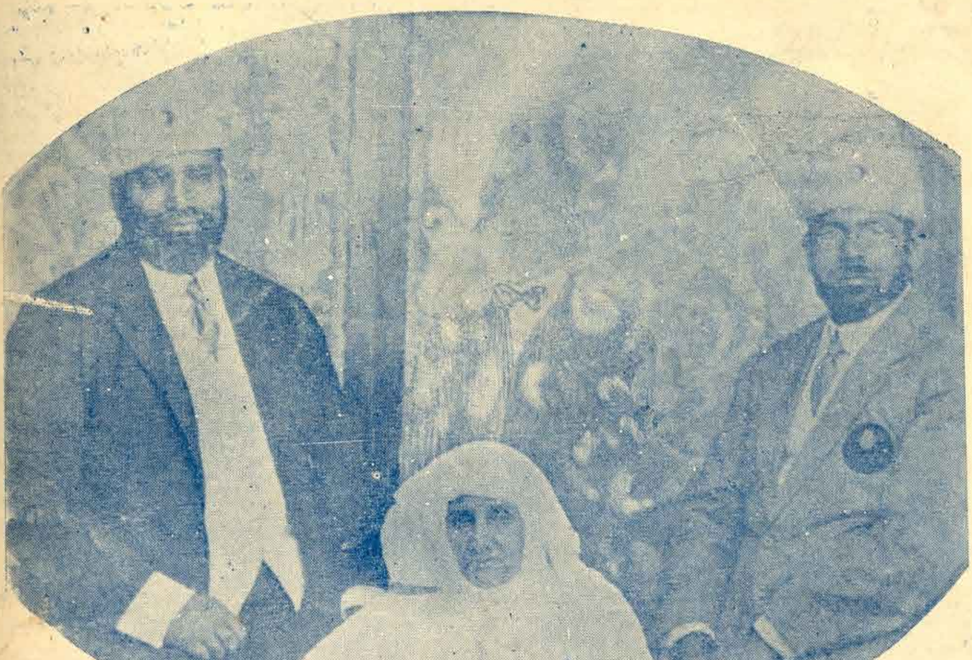

مولانا محمد علی ★ بی اماں ★ مولانا شوکت علی

مصر اور فلسطین میں
مولانا محمد علی کے جنازے کا جلوس

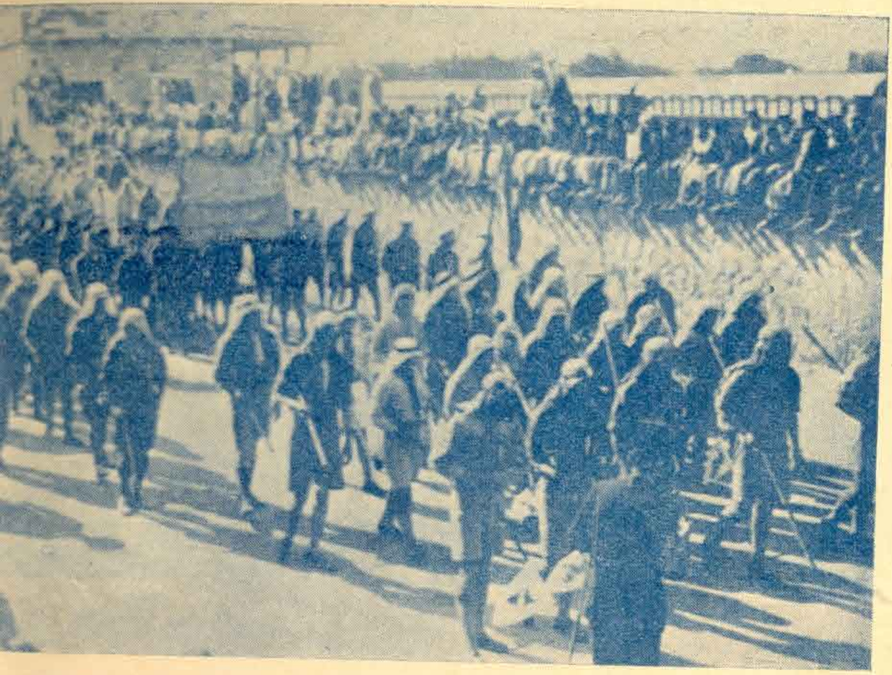

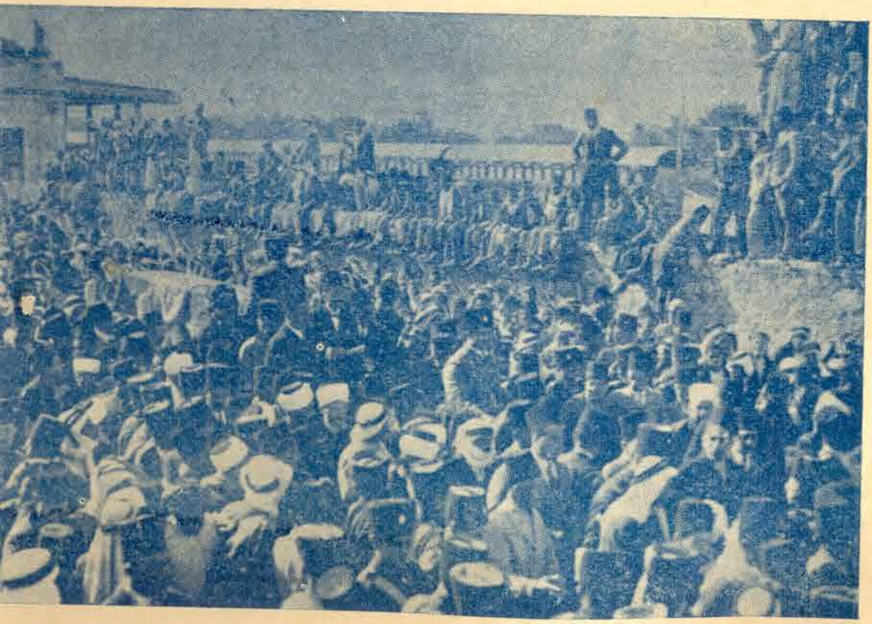

غمزدہ بھائی

یہ نہ کہو تمہارے بھائی ہیں۔ میں اٹھ کر ہاتھ دھونے چلی گئی۔ اس عرصہ میں ڈاکٹر آگئے۔ دونوں بھائی اور ایک
کے مسٹر نہرا ہیں وہ بھی آئے ہوئے تھے۔ مجھ سے کہا کہ چائے منگاؤ۔ چائے آئی سب پیتے رہے۔ ڈاکٹر
میرے لئے ایک اچھی موٹر لو اتنے لوگ ہم ہیں۔ زہرہ طارق سب آسکیں۔ مسٹر نہرا نے کہا کہ آپ نے اس
نہیں دیا کہ بیگم صاحبہ سے جھنڈا اٹھوانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بھائی ابھی ہندو مسلمان کا معاملہ تو ٹھیک
دو۔ میں ہی تھا کہ کوکنڈہ میں جھنڈا اٹھایا تھا۔ اور میں ہی ہوں گا جو ہندوستان کا جھنڈا اٹھاؤں گا۔ ا
موقع نہیں ہے۔ اتنے میں ۵ بج گئے۔ کہا کہ بھائی مجھے معاف کرنا کہ میں تھک گیا ہوں۔ اب سو جاؤں۔ ا

کہا کہ ہاں آپ آرام کیجئے۔ ڈاکٹر اور وہ سب چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد مظفر آیا۔ اس نے چائے پی۔ نرس باہر چلی گئی۔ میں کمرے میں بیٹھی رہی۔ دو گھنٹے ہوئے
گئے اس وقت نرس نبض دیکھنے لگی تو ایک دم بڑے زور کی گلے سے آواز نکلی کہ ان کی دونوں آنکھیں کھلی
اور اٹھنا چاہتے ہیں اور الٹا ہاتھ اٹھا رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر پہچانا تو ہاتھ پھیلا دیا۔ میں نے اپنے ہاتھ میں ہاتھ د
گویا یہ کہ وہ پہچانتے تھے لیکن زبان نہیں چلتی تھی۔ بہت کوشش کرتے تھے۔ میں اور نرس تھے۔ میں گھبرا
سے کہا کہ ٹیلیفون کرو۔ اس نے ٹیلیفون کیا۔ گلنار کو شعیب زاہدہ سب آگئے۔ ڈاکٹر آگیا۔ انجکشن دیا
آیا مہاراجہ الور نے اتنی دیر میں تین پھیرے کئے۔ دل کا ڈاکٹر جو تھا اس نے نو بجے آکر دیکھا تو اس نے کہا کہ آ
دھوکے میں رکھنا بیکار ہے۔ ان پر فالج ہوا ہے۔ ایک ہاتھ ایک پیر بیکار ہے۔ ہم انجکشن دیتے ہیں۔

ابھی نہیں ہے شاید صبح تک ٹھیک ہو جائے۔ سب کی طرف دیکھتے رہے۔

آخر یہ کہ دو بجے تک یہ حالت رہی اور پھر سانس تیز چلنے لگی۔ اور شعیب اور گلنار کو بھیج دیا تھا۔ ن
دو تین لڑکے اور تھے۔ رحمٰن سندھی یٰسین پڑھتے رہے۔ رات پھر آنکھ بھی بند ہو گئی۔ صبح سوا نو

اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔

شوکت صاحب اسٹیشن پر تھے وہ اس وقت تک نہ آسکے ۵ منٹ چلے گئے ہوں گے۔ کہ جب وہ
سب بیٹھے رہے۔ قرآن پڑھتے رہے۔ تمام لوگ یہاں کے آتے رہے۔ کیونکہ دن کو ہوٹل سے نہیں
رات کو بارہ بجے ان کو دوسری جگہ لے گئے جہاں غسل دیا جانے والا تھا۔ اور صندوق تیار ہو رہا تھا رات
صاحب رہے۔ صبح کو غسل مظفر، رحمٰن سندھی سب تھے۔ مل کر شام کو نماز ہوئی۔ میں اور گلنار بھی گئی تھیں
بھی تھیں۔ یہاں کے سب بڑے لوگ ہندو مسلمان انگریز آئے تھے۔ کانفرنس کے سب تھے۔

اسی روز رات کو شعیب یہاں گلنار کو ساتھ ساتھ لئے آئے تھے۔ صبح کو چلی گئی تھی۔ تین روز تک
ہوٹل چھوڑ دیا۔ اب بھی گلنار کے ساتھ رہتی ہوں۔ میں تو رو بھی نہ سکی۔ اس لئے ایک تو ہوٹل، پرایا
گلنار کی آج کل حالت ایسی ہے اس کی وجہ سے بھی نہیں روتی۔ اپنے دل پر مارتی ہوں۔ دوسرے
کا خیال پریشان کر رہا ہے۔ پہلے تو ہندوستان لانے کا خیال تھا۔

پھر تیسرے روز فلسطین سے تار آیا کہ کیا ہم کو آپ اجازت دیں گے۔ ہم سب یہ چاہتے ہیں کہ یہاں دفن کیا جائے۔ میں نے اپنی رضامندی ظاہر کی۔ کیونکہ ایسی جگہ قسمت والے کو ہی ملتی ہے۔ کل میں اور گلنار دیکھنے گئے تھے۔ پانچ دن اور رات ایک دو آدمی بیٹھے قرآن شریف پڑھتے رہتے تھے۔ بڑی قسمت والا ایسی جگہ پر ہے۔ کیونکہ جہاز والے جھگڑا کر رہے تھے۔ اسی جہاز میں ہم سب ۱۶ کو سوار ہو جائیں گے۔ اور میں شوکت صاحب زاہد پورٹ سعید پر اتر جاویں گے لیکر اور پھر جہاز یا ریل سے بیٹھ کر وہاں پہنچنے کے بعد دفن ہو جاویں گے تو پھر یہ ارادہ ہے کہ زیارتیں کرتے ہوئے واپس ہندوستان ہوں گے۔ گلنار سیدھے بھوپال جائیں گے میں دہلی آکر سامان وغیرہ کا جو کچھ سب کی رائے ہوگی وہ کر کے مکان چھوڑ دیں گے۔ اگر قاسم رکھنا چاہتے ہیں تو میں بھوپال گلنار کے پاس چلی جاؤں گی۔ وہاں رہوں گی۔ اور اگر زندہ رہی تو آکر زبانی کہانی سنا دوں گی۔

پیاری تم صبر کرنا۔ سوائے صبر کے کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس وقت نہ فاتحہ دلا چکی ہوں۔ اگر فاتحہ دلواؤں تو کس کو دوں۔ صرف کچھ روپیہ خیرات کر دیا۔ تین پونڈ ہے۔ امید ہے کہ تم فاتحہ دلوا رہی ہوگی اور دلواتی رہنا طارق کو پیار۔

تمہاری بدنصیب والدہ

امجدی

---

(۷)

لندن ۱۵ جنوری ۱۹۳۱ء

پیاری زہرہ آپا پیار

میری بہن میں نہیں جانتی ہوں کہ تم اس وقت کس قدر پریشان ہوگی مگر سوائے صبر کے انسان کیا کر سکتا ہے۔ بی تمہیں مفصل خط لکھ رہی ہیں۔ میں نے تو پہلی جنوری کو ہی ان سے بات کی تھی۔ ۳۱ دسمبر کو میری سالگرہ کی خوب خوشی کی دعوت تھی۔ تیسری تاریخ کو خوب اچھے خاصے تھے۔ شام کو ۵ بجے تک سب سے باتیں کیں اور سو گئے۔ پھر سوتے کے سوتے رہ گئے۔ بات کرنا نصیب نہ ہوئی۔ ۷ بجے دورہ ہوا، فالج گرا۔ صبح ساڑھے نو بجے ختم ہو گئے۔ یہ تو سب سمجھتے تھے کہ یہ دو تین مہینہ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ مگر کوئی بھی یقین نہ کر سکتا تھا کہ یہ ایک دم یوں میری بی کو اور ہم سب کو چھوڑ کر چلے جاویں گے۔ مگر ان کی موت موت نہیں، شہادت ہے۔ وہ شہید ہوئے۔ انہوں نے ہمیشہ خدا کی راہ میں کام کیا اور اسی میں ختم ہو گئے۔ ان کی موت یادگار رہے گی۔ خدا کے گھر اُن کا بڑا رتبہ ہے۔ یعنی مسجد اقصیٰ میں دفن ہو گئے کسے ایسی جگہ نصیب ہوتی ہے۔ ہم کو صبر کرنا چاہیے اور خوش ہونا چاہئے۔ انہوں نے ہمیشہ تکلیف اٹھائی۔ اب ہمیشہ کے لئے آرام سے سو گئے۔ خدا نے ان کی خدمت قبول کی۔ دنیا میں ہی معلوم ہو گیا۔ اب کیا لکھوں۔ ۱۶ کے جہاز سے روانہ ہو رہی ہوں۔ اپنے کو پیار۔ فقط

گلنار

ضمیمہ ا

خلافت اور کانگرس

خلافت اور کانگرس !

ایک زمانہ تھا کہ یہ دونوں ہم معنی الفاظ تھے، ہندو ذوق و شوق سے خلافت کے ممبر بنتے تھے
کانگرس سے اپنی عقیدت و الفت کا اظہار کرتے تھے۔

خلافت کمیٹی، مسلمانوں کی بنائی ہوئی تھی، اس کی تخلیق علی بھائیوں کے یگانہ اور منفرد جذبۂ کار کا نتیجہ تھ
تھی جو ہندوستان میں ایک اقلیت تھی، کانگرس مجموعۂ اقوام و ملل تھی، اس میں ساری ہندو قوم شریک تھی، ا
حاصل تھی۔ ہندوستانی عیسائی اس کی پشت پناہ تھے، سکھ اس کے نام پر ہر قربانی کے لئے آمادہ تھے، پارس
تئیں وابستہ سمجھتے تھے۔

بااین ہمہ حالت کیا تھی؟

کانگرس چند عافیت پسندوں کا Debating hall (مجلس مباحثہ) تھی، اور خلافت سرفر
مرکز تھی، وہ خلافت کے رہنما اور کارکن ہی تھے جنہوں نے خلافت فنڈ سے روپیہ لے کر گاندھی جی کو سارے
جنہوں نے آڑے وقتوں میں کانگرس کی مالی امداد کی جنہوں نے کانگرس کو سرگرم فعال، اور جاں باز لوگوں ک
کانگرس کو صحیح معنی میں "قومیت متحدہ"، کا سنگم بنا دیا، جنہوں نے کانگرس کے ہر حکم پر ہر قربانی کا مظاہرہ کیا۔

کیا اس حقیقت سے کوئی انکار کر سکتا ہے کہ خلافت کے کارکنوں نے ان مسلمانوں کو ذلیل و رسوا ک
اٹھا رکھا، جو کانگرس کے مخالف تھے، مگر کانگرس کے سب سے بڑے رہنما گاندھی جی، کانگرس کے سب سے بڑ
کے خلاف نکتہ چینی بھی نہیں برداشت کر سکتے تھے؟ کیا اس واقعہ کی تردید کی جا سکتی ہے کہ جب قربانی او
آیا۔ تو مسلمان سب سے پیش پیش تھے، انہوں نے اپنی مسلم یونیورسٹی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی مگر گاند
کو اپنا کیمپ نہ بنا سکے، کیا یہ آفتاب سے زیادہ روشن اور تابناک حقیقت نہیں ہے، کہ جب قول کی منز
شروع ہوا، تو اقلیت میں ہونے کے باوجود، وہ سب سے زیادہ مسلمان ہی تھے، جنہوں نے جیل کی تنگ
اپنے گھر کے عیش و آرام پر ترجیح دی؟ جنہوں نے صرف بیان دینے اور تقریر کرنے پر اکتفا نہ کیا، بلکہ پ
اور فوج کی گولیاں اپنے سینوں پر کھائیں جنہوں
پر............

کوئی جگہ نہیں رہ گئی، یہ سارا کرشمہ تھا مجلس خلافت کا، علی بھائیوں کا، خلافت کے مردان حق آگاہ کا!

صرف یہی نہیں، جب مالوی جی، اور دوسرے ذمہ دار ہندوؤں کی طرف سے اس شبہ کا اظہار کیا گیا کہ اسلامیہ، اور پان اسلامزم کے علمبردار ہیں، اس کا پورا اندیشہ ہے کہ حصول آزادی کے بعد، افغانستان ہندوستان پر اور مسلمان اپنے جوش مذہبی سے مجبور ہو کر اپنے دینی بھائیوں کا ساتھ دیں، اور ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے یا بالفاظ دیگر مسلمانوں کا غلام پھر بن جائے، تو اسی محمد علی نے جس کا جذبۂ دینی ہرگز کسی مقدس سے مقدس مسلما تھا، بالفاظ واضح اعلان کر دیا، کہ ہاں میں مسلمان ہوں، اور اسلام کے لئے میرے خون کا آخری قطرہ وقف ہے اسلامیہ کا قائل ہوں، اور پان اسلامزم میری زندگی کا مقصد ہے، لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ میں اس دیس کو آ ہوں، تو میرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں کسی کی غلامی میں رہنا نہیں چاہتا، خواہ وہ انگریز ہوں یا افغان! اگر افغانستان پر حملہ کیا تو میں ان سے بھی اسی طرح لڑوں گا جس طرح انگریزوں سے لڑ رہا ہوں، میرے دل میں افغانوں کی محبت انہیں اپنا آقا نہیں بنا سکتا، ان کی غلامی نہیں قبول کر سکتا، گویا دوسرے الفاظ میں، مجلس خلافت اور اس کے صرف یہی نہیں کیا کہ جنگ آزادی میں غیر مشروط طور پر شریک ہوئے ہوں، بلکہ یہ بھی کیا کہ بعض فتنہ گروں نے پیدا کر دئیے تھے، ان کی تردید بھی پوری بہادری اور سچائی کے ساتھ کر دی۔

سب جانتے ہیں، مسلمان کتنے مذہب پرست ہیں، سب کو علم ہے، تحریک خلافت تمام تر مذہبی تحریک ناواقف نہیں کہ علی برادران کی رگ رگ میں مذہب رچا اور بسا ہوا تھا، لیکن جوش رواداری میں سب اتنے آ کہ سوامی شردھانند جیسے کٹر آریہ سماجی لیڈر کا دتی کی جامع مسجد میں جانا، اور اس کے منبر پر بیٹھ کر تقریر کر گوارا کر لیا۔

محمد علی کی مذہبیت کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر معاملہ کو مذہبی رنگ میں دیکھتے تھے، مذہب کا تصور ان سے کس نہیں ہوتا تھا، وہ ایک مسلمان لیڈر تھے، اور ان کی قیادت کی بنیاد صرف مسلمان تھے، لیکن جب کبھی ملک بدمزگی ہوئی، جب بھی ہندو مسلم فساد ہوا، جب کبھی مسلمانوں اور ہندوؤں میں آویزش ہوئی، انہوں نے خود قتل پر دستخط کئے، انہوں نے خود اپنی ہر دلعزیزی کے دامن پر دھبہ لگایا، انہوں نے خود اپنے معتقدوں او دشمن بنایا، اور بے تامل مسلمانوں کو ان کی غلطی پر، غلط روی پر، ٹوکا، ملامت کی، سرزنش کی، اور اس سلسلہ میں کھائیں، دوستوں کی دشمنی مول لی، ہواخواہوں، اور جاں نثاروں کی بدگمانی کے شکار ہوئے، وہ کبھی اسے گوار زیادتی کریں اور وہ پردہ پوشی کریں، اس کے برعکس، ایسے مواقع پر ہندوؤں نے جوابی رواداری کا مظاہرہ سے بڑھ کر حق کا پرستار کون ہوگا، لیکن وہ اکثر "سکوت سخن شناس" سے کام لیتے رہے، موتی لال سے بڑھ لیکن انہوں نے کبھی اپنی زبان حق ترجمان کو جنبش نہیں دی۔

پھر وہ دور آیا، جب مہاسبھائی کانگریسیوں پر، اور تبلیغ و تنظیم کے علمبردار غلافتوں پر غالب آ گئے، اس پبلک لائف سے کنارہ کشی کر لی، لیکن شوکت علی نے اور محمد علی نے، ان مسلمانوں کا مقابلہ کیا، جو مسلمانو

کے تختہ کو لبیک کہا، پھر کیا یہ بھی ایک ناقابل تردید واقعہ نہیں ہے کہ جب ترک تعاون کا مسئلہ پیش ہوا، تو وہ کانگرس تھی جو اُسے قبول کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی، اور وہ خلافت تھی، جس نے سرفروشی کی پوری شان کے ساتھ اس تحریک کو اس شدت کے ساتھ اٹھایا کہ بالآخر کانگرس بھی اس کی ہمراہی پر مجبور ہو گئی!

پھر جب ترک خطابات کا، استرداد مناصب و اعزاز کا، بیرسٹری اور وکالت چھوڑ دینے کا، سرکاری عدالتوں کے مقاطعہ کا، بدیشی مال کے بائیکاٹ کا معاملہ سامنے آیا، تو وہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے، ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

کا سماں ایک بار پھر دنیا کو دکھا دیا، اور وہ گاندھی جی کے پیرو اور ہم قوم تھے جو ؎

عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی

کا نمونہ پیش کر رہے تھے۔

ان حقائق میں سے کسی حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا، کسی واقعہ کی تردید نہیں کی جا سکتی، کسی سچائی کو جھٹلایا نہیں جا سکتا، گاندھی جی ہوں، یا جواہر لال، کوئی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ہندوستان میں، آزادی کی تڑپ، آزادی کے لئے مرنے کا سودا، آزادی کے لئے سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ، آزادی کے لئے، ہر خطرہ کو دعوت دینے کی ہمت، آزادی کیلئے ہر مصیبت ہر آفت کے لئے خندہ جبینی کے ساتھ استقبال کرنے کا ولولہ، صرف مسلمانوں کا حصہ تھا، پھر، ہندوؤں میں لہر اٹھی، پھر وہ آگے بڑھے، اور مسلمانوں کے اس قافلے سے جا ملے، جو منزل حریت کی طرف گام فرسا تھا۔

دنیا کے ہر ملک میں، جب کبھی بھی آزادی کی تحریک اٹھی، تو سب سے پہلے اقلیتوں کا مسئلہ وہاں سنگِ گراں بن کر حائل ہوا، اور اس مسئلہ کے باعث بڑی بڑی نزاعیں اور اُلجھنیں پیدا ہو گئیں، لیکن وہ ہندوستان کے مسلمان تھے، جنہوں نے خلافت کی رہنمائی میں ہر اندیشہ اور وسوسہ سے بے نیاز ہو کر اکثریت کا ساتھ دیا، کوئی مطالبہ نہیں کیا، کسی قسم کا تحفظ نہیں چاہا کوئی پاسنگ نہیں طلب کیا، کسی قسم کی مراعات کے طالب نہیں ہوئے، حالانکہ وہ یہ کر سکتے تھے، کیونکہ ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے تک سارا ہندوستان ان کی مملکت تھا، اس وسیع دیس پر انہی کی حکومت تھی، اس زبردست براعظم پہ انہی کا پرچم لہرا رہا تھا، اس قطعۂ ارضی کا ٹکڑہ ہر صوبہ، ہر شہر، ہر قصبہ، ہر گاؤں، ہر دیہات، انہی کی ملکیت تھی، وہ حاکم تھے اور سارا ہندوستان محکوم، وہ مالک تھے، اور سارا دیس مملوک، وہ راعی تھے، اور اس ملک کا ہر فرد رعیت، لیکن انہوں نے تمکنت اور خود پسندی کا یہ خیال اپنے دل سے نکال دیا، اور غیر مشروط طور پر ہندوؤں کے ساتھ ہو گئے، یہ جانتے ہوئے ساتھ ہو گئے کہ ہندوستان میں بادشاہت نہیں قائم ہو گی جمہوری نظام کی حکومت ہو گی، اور جمہوریت میں، اکثریت سب کچھ ہوتی ہے، اور اقلیت کچھ نہیں، ہندو اکثریت میں ہیں، اور وہ اقلیت میں، گویا انہوں نے اعتراف کر لیا تھا کہ وہ ہندوستان کی حکومت ہندوؤں کو سونپنے پر تیار ہیں، اور خود ملک کی ایک، باعزت، خوددار، اور ایثار پیشہ اقلیت کی زندگی بسر کرنے پر آمادہ، انہوں نے کوئی شرط نہیں پیش کی، آزادی کا نعرہ سنا اور سب کچھ لٹا دینے، اور اپنے تئیں برباد کر دینے کے لئے، آگے بڑھنے لگے، سرسید کے دور کی احتیاط پسندیاں ختم ہو گئیں، سرکار دالاتبار کے سر دل، اور خان بہادروں کو روپوش ہو جانا پڑا، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے لئے پبلک لائف میں

منحرف کرکے، باہمی جنگ وجدال اور حرب وپیکار میں اُلجھائے رکھنا چاہیئے، یہ مقابلہ معمولی نہیں تھا، اس مقابلہ میں انہوں نے جذبات کا ساتھ نہیں دیا، اس لئے اپنی ہر دلعزیزی گنوادی، اپنا اقتدار ختم کردیا، اپنی قیادت کا جنازہ نکال دیا۔

یہ وہ واقعات ہیں جن کی بنا پر ہر عامی سے عامی اندازہ لگا سکتا ہے کہ ملک کی بیداری میں کانگرس کا کتنا حصہ ہے، اور خلافت کمیٹی کا کتنا؟

یہ بھی معلوم ہوسکتا ہے کہ نازک ترین مراحل پر کانگرس نے کیا کیا، اور خلافت نے کیا کیا؟ یہ حقیقت بھی واضح ہوسکتی ہے کہ خلافت کی فرد عمل کیا تھی اور کانگرس کے نامہ اعمال میں کہاں سیاہی تھی اور کہاں سفیدی۔

غرض ہندوستان کی تاریخ حریت اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوگی کہ ملک میں آزادی کا جذبہ خلافت نے پیدا کیا، برطانوی استعمار کا اقتدار خلافت نے ختم کیا، آزادی کے لئے غیر مشروط تعاون کانگرس سے کرنے والی صرف مجلس خلافت تھی۔

رئیس احمد جعفری

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت کی ملاقاتیں
ہر آن تسلّی ہے ہر لحظہ تشفی ہے
ہر وقت ہے دل جوئی ہر دم ہیں مداراتیں،

ضمیمہ ۲

سید حسن ریاض کے قلم سے

تحریک خلافت

ترکی جرمنی کا طرفدار کیوں ہوا؟

اٹلی اور ترکی کے درمیان نہ مخاصمت تھی نہ کوئی وجہ مخاصمت۔ طرابلس الغرب کی تمام آبادی مذہباً مسلمان تھی۔
بربر اور ترک جو تھوڑے سے اطالوی وہاں تھے۔ انہیں حکومت ترکیہ سے کوئی شکایت نہ تھی۔ وزیر خارجہ اٹلی نے
دسمبر ۱۹۱۰ء کو یہ اعلان کیا "ہم سلطنت ترکیہ کی سالمیت چاہتے ہیں۔ اور یہ کہ طرابلس ہمیشہ ترکی رہے۔" کوئی سبب
ان دونوں ملکوں کے تعلقات خراب ہوتے۔ مگر اٹلی نے ستمبر ۱۹۱۱ء میں یکایک اپنے اس ارادے کا اعلان کردیا کہ وہ طرا
گا۔ اٹلی کو ٹیونس پر فرانس کا قبضہ سخت ناگوار تھا۔ ساحل افریقہ سے قریب تر ہونے کی وجہ سے وہ اس کا حق دار اپنے کو سمجھ

فرانس نے اطالویوں کی یہ شکایت رفع کرنے کے لئے رضامندی دے دی۔ کہ اٹلی طرابلس پر قبضہ کرلے۔ اس کا کو
برطانیہ نے اطالویوں کے اس جارحانہ اقدام کو باضابطہ منظور کیا۔ مگر اس پر اس نے سکوت اختیار کیا۔ اور اس طرح اٹلی کو
کی جانب داری کا اعلان کر کے ترکوں کو براہ مصر طرابلس کے محاذ جنگ پر فوجیں بھیجنے سے روک دیا جس کا اس کو کوئی حق
ترکوں کی سیادت و سلطنت میں تھا۔ ترکوں نے مجبوراً مقامی عربوں کی تنظیم کر کے طرابلس کی مدافعت کی اور بڑی بہادر

مگر ۱۹۱۲ء کے آغاز میں یونانیوں کے مشہور فتنہ وزیر اعظم موسیو زیلوس کی کوشش اور تدبیر سے ترکوں کے خلا
اور سرویہ کا اتحاد قائم ہوا۔ اور پھر اس اتحاد میں مانٹی نیگرو بھی شریک ہوگیا۔ سلطنت ترکیہ کی مسیحی آبادی کی حفاظت
سے جو یورپ کی عیسائی سلطنتوں کا عرصہ دراز سے معمول تھا۔ ان سب نے ترکوں کو جنگ کا الٹیمیٹم دے دیا۔ ترکوں نے
دو محاذوں پر جنگ کرنا دشوار ہے۔ فوراً اٹلی سے معاہدہ صلح کرلیا۔ اور طرابلس سے اپنی فوجیں واپس بلانے پر رضامند
انہوں نے عملاً طرابلس پر اٹلی کا قبضہ تسلیم کرلیا۔ اٹلی نے اس کے جواب میں جزائر بحیرہ ایجین سے اپنی فوجیں ہٹانا منظ

یہ وعدہ ایفا نہ کیا۔

بلقان میں جنگ شروع ہوگئی۔ محض اس وجہ سے ترکوں کو مسلسل شکستیں ہوئیں۔ کہ ان کی افواج میں کثرت سے
جن کی ہمدردیاں حملہ آوروں کے ساتھ تھیں۔ دشمن کے خفیف دباؤ پر یہ بھاگنے لگتے تھے اور اپنے گھروں ہی میں جا کر دم
کہ ترکی فوج کی تنظیم اچھی نہ تھی۔ ترکوں کا دستوری انقلاب ۱۹۰۸ء میں ہوا تھا۔ نوجوان ترکوں کو دول یورپ کی دراندازیوں

شامل تھی۔ کہ فوج اور ملکی انتظامات میں وہ تمام اصلاحات نافذ کرتے جو مدنظر تھیں۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی۔ کہ بڑے بڑے ترک افسروں میں اور عمال میں ابھی بہت سے وہ تھے۔ جو دول یورپ کی سازشوں میں شریک تھے۔ ان سے رشوتیں لے کر اپنے ملک کو نقصان پہنچاتے تھے۔ جنگ بلقان میں ترکوں کا سخت نقصان ہوا۔ وہ تو آخر میں مفتوحہ علاقے کی تقسیم پر خود بلقان ریاستوں میں جھگڑا ہو گیا اور پھر جنگ اس لئے ترکوں نے دوبارہ ایڈریانوپل۔ دیموتیکا اور قرق کلیسا فتح کر لیا۔ ورنہ اسی وقت یورپ میں ان کے پاس کچھ نہ رہا تھا۔

اسی میں یورپ کی پہلی عالمگیر جنگ آگئی (۱۹۱۴ء) برطانیہ کی یہ شرارتیں کہ ترکی فوجوں کو مصر سے نہ گذرنے دیا، طرابلس پر اٹلی کے حملے کا مسرت آمیز سکوت سے خیر مقدم کیا۔ ترکی کے وہ دو کروزر ضبط کر لئے جو اس نے انگلستان سے نئے خریدے تھے۔ اور جن کی قیمت ادا کر دی تھی۔ فرانس کا یہ پاجی پن کہ اپنے تیونس کے قبضے کے خلاف اٹلی کی حاسدانہ سوزش رفع کرنے کے لئے اس نے طرابلس پر اٹلی کے حملے کی تائید کی۔ روس صدیوں کا دشمن، بازنطینی روایات، سلطنت کی وراثت کا دعویدار اور قسطنطنیہ پر قبضے کا طالب۔ ان حالات میں اس کی کوئی صورت نہ تھی۔ کہ جنگِ عظیم اول میں ترک انگلستان۔ فرانس اور روس کے حلیف بنتے۔ غیر جانبدار رہنا اس وقت ہرگز ممکن نہ تھا۔ سلطنت عثمانیہ کچھ نہ رہی تھی۔ مگر ابھی یورپ کی سیاست میں اس کا اتنا دخل تھا۔ کہ ہر فریق اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا۔ چونکہ طرابلس اور بلقان کی جنگوں میں جرمنی کا طرز عمل ترکوں کے خلاف نہ تھا۔ فتح ایڈریانوپل پر قیصر جرمنی نے سلطان محمد خامس کے نام تہنیت و تبریک کا تار بھیجا تھا۔ جنگ بلقان میں ترکی فوج کی کمزوریاں ظاہر ہونے کے بعد حکومت ترکیہ نے جب فوج کی از سر نو تنظیم کا اہتمام کیا تو حکومت جرمنی نے اس میں تعاون کیا۔ اور اس کام کے لئے جنرل فان درغولتز کو ترکی بھیجا۔ اس طرح ترک جرمنی کے حلیف بن کر جنگ عظیم میں شریک ہو گئے۔ اور اس کا انہوں نے اعلان کر دیا۔

اس کے ساتھ ہی برطانیہ نے اپنی سیادت میں مصر کی خودمختاری کا اعلان کیا۔ اور جزیرہ قبرص کا اپنی سلطنت کے ساتھ الحاق کیا۔ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے آغاز تک ترکوں کے قبضے سے جو ممالک اور علاقے گئے وہ یہ ہیں۔ مقدونیہ، اپی رس، البانیہ، تھریس کا بڑا حصہ، بحیرہ ایجین میں کریٹ قبرص اور بہت سے دوسرے جزیرے، افریقہ میں طرابلس الغرب۔ ان پر دولت عثمانیہ کی راست حکومت تھی۔ بلغاریہ، بوسینیا، ہرزیگووینا اور مصر گئے۔ ان پر اس کا شہنشاہانہ اختیار و اقتدار تھا۔ یہ اتنے عظیم نقصانات تھے۔ کہ ان کے نصف اور چوتھائی سے ایک ایک سلطنت بن سکتی تھی۔

مسلمانانِ ہند پر اس واقعے کا اثر

جس وقت ترکی جنگِ عظیم میں شریک ہوا۔ مسلمانان ہند بے قرار ہو گئے۔ اس سے پہلے ترکی کے ہر ہر ملک کا جانا ان کے دلوں پر ایک ایک زخم چھوڑ گیا تھا۔ اب نئے اندیشے پیدا ہوئے۔ جزیرۃ العرب، اماکن مقدسہ، خلافت! اگر جرمنی کو شکست ہوئی تو مسلمانوں کا دنیا میں کہیں ٹھکانہ نہ رہے گا۔

علامہ شبلی پہلے ہی اس صورتِ حال پر نوحہ کر چکے تھے :-

مراکش جا چکا، فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جان کب تک۔
یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے۔ اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک۔

ٹرکی اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی واحد آزاد خودمختار سلطنت تھی۔ اور خلافت کی وجہ سے اس کے ساتھ یہ امید قائم کہ کسی وقت مسلمانان

عالم کے لئے مرکزیت کی کوئی صورت پیدا ہو جائے گی۔
وطن کے ساتھ ویسی ہی محبت کے باوجود جو سب کو ہوتی ہے۔ مسلمانوں کا مزاج ہمیشہ آفاقی رہا۔ اس کا سبب یہ ہے ک
حصے ہیں موجود ہیں۔ اور بغیر زبان سے اعلان کئے ہر مسلمان اپنے کو اس عالمگیر قوم کا جزو سمجھتا ہے۔ اور امور عالم سے اس ک
ہے۔ برطانیہ جانتا تھا کہ مسلمانان ہند ٹرکی کے لئے فکرمند اور مضطرب ہوں گے۔ اور مسلمانان ہند سے برطانیہ کو اس جنگ میں
برطانیہ مسٹر لائیڈ جارج نے اعلان کیا "اور نہ ہم اس لئے جنگ کر رہے ہیں۔ کہ ٹرکی کو تھریس اور ایشیائے کوچک کی ز
محروم کر دیں جس کی آبادی اکثریت کے ساتھ ترکی النسل ہے۔" مسلمانوں کا دعوےٰ یہ تھا۔ کہ پورا جزیرۃ العرب جس
شام فلسطین شامل اور تمام اماکن مقدسہ واقع ہیں۔ راست خلیفۃ المسلمین کی سیادت و تحویل میں رہنا چاہئے۔
جنگ میں جرمنی کو شکست ہوئی اور اس کے تمام حلیفوں کو شکست ہوئی۔ ہنگامی معاہدہ صلح پر دستخط ہوئے۔
صلح میں ٹرکی کے لئے یہ شرائط تھیں۔ اپنی تمام افواج برخاست کرے گا۔ اس کے جنگی جہاز فاتحین ضبط کریں گے۔ ملک
اور کنٹرول کا اتحادیوں کو حق ہوگا۔ ایشیائے کوچک اور عرب میں سرحدوں کے تعین کے علاوہ اندرون ملک کا انتظام ٹرکی

مسلمانان ہند کی پریشانی

بے شک جہاں کہیں مسلمان تھے۔ وہ ٹرکی کی اس مصیبت کو عالم اسلام کی مصیبت سمجھ رہے تھے۔ اور نہایت
تھے لیکن ہندوستان کے مسلمان سب سے زیادہ۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔ وہ ڈیڑھ سو برس سے انگریزوں کی حکومت
لئے اس سے واقف تھے کہ اس کی مضرتیں اور مصائب کیا ہیں۔ برطانیہ کے وعدوں پر اعتماد کر کے انہوں نے اس جن
مدد کی تھی۔ اور احکام شریعت کے خلاف مسلمان ترکوں اور خلیفہ کے مقابلے میں وہ انگریزوں کی طرف سے لڑتے تھے
خواب پریشان ثابت ہو رہا تھا۔ کہ کبھی مسلمان باہم متحد ہو کر خلیفۃ المسلمین کی قیادت میں دنیائے اسلام کو یورپ کے
کیا کسی نے ہندوستان کے عام مسلمانوں میں اتحاد اسلامی کا پروپیگنڈا کیا تھا۔؟ کیا کسی نے ان کو یہ اونچی سیاست سم
خاتمے کے بعد اسلام کی مرکزیت ختم ہو جائے گی۔ اور مسلمان امور عالم میں کسی متحدہ اقدامی عمل کے قابل نہ رہیں گے۔ نہیں
اخبارات تھے، نہ انجمن تھی۔ نہ لیڈر تھے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم ہوئی تھی۔ اور وہ ابھی عوام تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ محمد علی اور
سامنے آئے تھے۔ اور ۱۹۱۴ء سے نظر بند تھے۔ دو دو ورق کے چند اردو اخبارات نکل رہے تھے جن پر زمانہ جنگ میں یہ پابند
پر جو جنگ سے متعلق تھے کچھ نہ لکھیں۔ یہ ان کی استطاعت سے باہر تھا۔ کہ ٹرکی اور خلافت کے ساتھ مسلمانوں میں یہ گردیدگ
جوان سے ظاہر ہوئی۔ مگر قرآن کا یہ اعلان و فرمان مسلمانوں کی روح میں پیوست ہے کُلُّ مُؤْمِنٍ اِخْوَۃٌ یہ انہیں بتا
مسلمان کو مسلمان کے ساتھ ہمدردی ہونی چاہئے۔ جس اسلامی فطرت کے اقتضے نے محمد علی، شوکت علی اور حسرت مو
کھیلنے کے لئے آمادہ کیا تھا۔ وہی ہر عام مسلمان کے دل میں کام کر رہی تھی۔
محمد علی، شوکت علی اور حسرت موہانی ابھی نظر بند ہی تھے۔ کہ ہنگامی صلح کا اعلان ہوا۔ انگریزوں نے قسطنطنیہ پر د
کیپی چولیشن کہتے ہیں جس کے تحت فاتح کو نجی سکونتی مکانات تک تصرف کا حق حاصل ہو جاتا ہے اور موصل پر انہوں ن
کر دی۔ اس پر ہندوستان میں جابجا احتجاجی جلسے ہوئے جن میں قابل ذکر یہ ہیں۔ مدراس میں بصدارت سیٹھ یعقوب

لکھنؤ میں بصدارت مولانا قیام الدین عبدالباری فرنگی محل ۲۶،۲۷ جنوری ۱۹۱۹ء لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم کانفرنس (۲۲، ستمبر ۱۹۱۹ء دہلی میں بصدارت
مسٹر فضل الحق (۲۳، نومبر ۱۹۱۹ء)۔

لکھنؤ کی آل انڈیا مسلم کانفرنس میں خلافت کمیٹی کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اور دہلی کا جلسہ خلافت کانفرنس کے نام سے منعقد ہوا۔ اس دوران میں مسٹر گاندھی اور مسلمان عمائد کے درمیان مسئلہ خلافت میں اشتراک عمل کے لئے گفتگو ہو چکی تھی۔ مسٹر فضل الحق نے اپنے خطبہ صدارت دہلی میں ہندوستان کی غیر مسلم اقوام سے تائید حاصل کرنے کی مصلحت پر زور دیا۔ کانفرنس کے رزولیوشنوں میں مشہد مقدس (ایران) اور دوسرے مقامات مقدسہ میں اتحادی افواج کی زبردستیوں اور مظالم پر احتجاج کیا گیا۔ مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ:۔

ا۔ وہ جشنِ صلح میں شریک نہ ہوں اور اس کے خلاف جلسے کریں۔

ب۔ مسٹر گاندھی کے مشورے کے مطابق مسلمان حکومت سے عدم تعاون کریں۔

ج۔ اگر صلح کانفرنس کا فیصلہ مسلمانوں کی منشاء کے مطابق نہ ہو تو ولایتی مال کا بائیکاٹ کیا جائے۔

د۔ مسٹر گاندھی اور ان دوسرے ہندو لیڈروں کا شکریہ ادا کیا گیا جنہوں نے تحریک خلافت میں مسلمانوں کے ساتھ اشتراکِ عمل منظور کیا تھا۔

مسلمانانِ ہند کے وفود

اس سال (دسمبر ۱۹۱۹ء) کانگریس کا اجلاس امرتسر میں منعقد ہوا۔ اور وہیں مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کا۔ ٹھیک انہی دنوں میں مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات برطانوی پارلیمنٹ میں منظور ہوئیں اور اس تقریب میں سیاسی نظر بند رہا کئے گئے۔ محمد علی اور شوکت علی بیتول جیل سے نکل کر سیدھے امرتسر پہنچے۔ محمد علی نے اپنی کانگریس کی تقریر میں کہا "میں جیل سے واپسی کا ٹکٹ لے کر آیا ہوں۔" اور یہ فقرہ تمام ہندوستان میں مشہور ہو گیا۔ یہاں ہندو اور مسلمان لیڈروں کے درمیان دوسرے مسائل کے ساتھ خلافت کے مسئلے پر خصوصی گفتگو ہوئی۔

خلافت کانفرنس کے جلسے میں سلطان ٹرکی کے ساتھ بحیثیت خلیفہ اظہارِ عقیدت کیا گیا۔ یہ قرار پایا کہ ۱۵ جنوری ۱۹۲۰ء تک مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب کے متعلق مسلمانوں کے مطالبات پیش کرنے کے لئے بسر کردگی مسٹر محمد علی ایک وفد انگلستان بھیجا جائے۔ خلافت فنڈ قائم کیا جائے۔ اور اس کے لئے دس لاکھ روپیہ جمع ہو۔

اس سے پہلے کہ مجوزہ وفد انگلستان روانہ ہو۔ ایک دوسرا وفد ۱۹ جنوری ۱۹۲۰ء کو وائسرائے سے ملا۔ یہ مندرجہ ذیل اشخاص پر مشتمل تھا۔ مسٹر گاندھی، سیٹھ چھوٹانی خلافت کمیٹی کے پہلے صدر، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا ابوالکلام آزاد، مفتی کفایت اللہ، مولانا حسرت موہانی، مسٹر سید حسن ایڈیٹر انڈی پنڈنٹ الہ آبادی، مولانا عبدالباری فرنگی محل، حکیم اجمل خاں۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا محمد علی، مولانا عبدالماجد بدایونی، سید ظہور احمد سیکرٹری مسلم لیگ، مولانا فاخر الہ آباد، مولانا سید سلیمان ندوی، آغا محمد اشرف قزلباش، راجہ صاحب محمود آباد، پنڈت موتی لال نہرو، مسٹر محمد علی جناح۔ میر وفد ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو اور مسٹر جناح وقت پر نہ پہنچ سکے۔ مگر دونوں نے تار کے ذریعے اتفاق رائے ظاہر کیا۔

ایڈریس جو وفد نے وائسرائے کو پیش کیا۔ مولانا محمد علی نے لکھا۔ اس میں سلطنتِ ترکیہ کی سالمیت اور خلیفہ کی حیثیت سے سلطان ٹرکی کی حاکمیت برقرار رکھنے کی ضرورت جتائی گئی۔ اور اس پر اصرار کیا گیا کہ "یہ لوازم اسلام میں سے ہے۔ کہ دینی اور دنیوی حیثیت سے خلافت کا وجود مسلسل قائم رہے۔" وفد نے یہ بھی کہا کہ اگر حکومت برطانیہ نے اپنے تمام وعدے حرف بحرف پورے نہ کئے تو اس کو ایسا سخت اخلاقی دھکا لگے گا۔ کہ بڑے سے بڑے زرخیز علاقے اور عظیم ترین سیاسی نفع سے بھی اس کی تلافی نہ ہو سکے گی۔ اور پھر اخلاقی وقار کی بربادی اس کو اس وجہ سے گراں گذرے گی۔ کہ اس اعلان شاہی کی قلعی کھل جائے

گی جو جناب والا کے پیشرو وائسرائے نے ٹرکی کے ساتھ جنگ شروع ہونے پر کیا تھا۔"

وائسرائے کا جواب مایوس کن تھا۔ اس پر مسلمان لیڈروں نے ایک بیان شائع کیا جس میں کہا۔ اگر معاہدۂ صلح کی شرائط مسلمانوں کے خلاف ہوئیں تو حکومت برطانیہ کے ساتھ مسلمانوں کی وفاداری اس کا تحمل نہ کر سکے گی۔ اس کے بعد مطالبہ کیا کہ جزیرۃ العرب ان حدود کی رو سے معین ہیں اور اسلام کے مقدس مقامات خلیفہ کے اختیار و انتظام میں رہنے چاہئیں اور وہ تمام وعدے پورے کئے جائیں جو مس نے کئے ہیں۔

خلافت کانفرنس کا تیسرا اجلاس فروری ۱۹۲۰ء میں بمقام بمبئی منعقد ہوا تاکہ مجوزہ وفد (برائے انگلستان) کو سند نیابت د کانفرنس کے متعلق مولانا محمد علی نے ایسیکس ہال لندن کی تقریر میں فرمایا۔

"میں آپ کو بتاؤں گا کہ ہم کون ہیں۔ اور کس کی نیابت کر رہے ہیں۔ ہمیں اس ملک میں آل انڈیا خلافت کانفرنس نے بھیج کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ نمائندہ انجمن ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ بڑی اور اہم سیاسی انجمنیں ہیں۔ لیکن وہ انجمن جس ان سے زیادہ بڑی اور جامعیت کے اعتبار سے افضل ہے۔ خلافت کانفرنس کے اس اجلاس میں جس نے یہ وفد بھیجا ہے۔ بیس ہزار ہوئے۔ اور اس کی کاروائی ۵ بجے شام سے شروع ہو کر دوسرے روز ۲ بجے شب تک جاری رہی۔ ہندوستان کے جلسوں کا مجھے جو تجربہ میں کہہ سکتا ہوں کہ ایسا جوش جو اس اجلاس کی کاروائیوں میں تھا۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔"

بمبئی کے اجلاس خلافت کانفرنس میں وفد پر اظہار اعتماد کا رزولیوشن منظور ہوا۔ ایک نہایت اہم اور مفصل بیان شائع کی کے مطالبات ضابطے کے ساتھ معین کئے گئے۔ اور مندرجہ ذیل الفاظ میں حکومت برطانیہ کو تنبیہ کیا گیا۔

"اس مطالبہ میں اگر کوئی کمی کی گئی تو اس سے نہ صرف مسلمانوں کے عمیق ترین مذہبی جذبات کو صدمہ پہنچے گا بلکہ ان اعلان بے حرمتی اور خلاف ورزی ہوگی جو اتحادی اور ان کی حلیف دول کے نمائندہ ماہرین سیاست نے اس وقت کئے تھے جب وہ مسلمان قوم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہ مطالبہ صرف مسلمانوں ہی کا نہیں ہے۔ بلکہ ملک کی پوری ہندو آبادی اس میں ان کے ساتھ شریک ہے۔ اگ کے نتائج اچھے نہ ہوں گے۔

* * * * * * * * *

فرانس امریکہ اور انگلستان کے اخبارات ترکوں کے خلاف بہت سخت لکھ رہے تھے۔ ان کا تقاضا تھا۔ کہ مشرق کا مسئلہ انگلستان اور امریکہ کے بااثر سیاسی حلقے اس پر مصر تھے۔ کہ ترکوں کو قسطنطنیہ سے نکالو اور ٹرکی کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کو جو تھے د بنا دو۔ مسلمانوں کا اضطراب بڑھا۔ اور فکر و تردد انتہا کو پہنچا۔ ہندوستان کی سیاست میں خلافت کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم میں خلافت کا وفد انگلستان روانہ ہوا۔ اس کے ارکان مندرجہ ذیل حضرات تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی، ابوالقاسم صاحب، سید مولانا محمد علی امیر وفد اور حسن محمد حیات سیکرٹری، محمد شعیب قریشی اور عبدالرحمن صاحب صدیقی پہلے سے انگلستان میں تھے ہو گئے۔

وزیر ہند کی طرف سے مسٹر فشر نے (۱۶ مارچ ۱۹۲۰ء) وفد سے ملاقات کی۔ اس کے بعد وفد مسٹر لائیڈ جارج سے ملا۔ مولا بے باکی سے مسلمانان ہند کے مطالبات پیش کئے۔ لیکن جب نفرت عداوت سے دل کج ہو گیا ہو۔ اور نخوت کی چربی آنکھ

اور مظلومیت سب کے لئے دل اور چہرے کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ لائڈ جارج نے نہایت بے حیائی سے کہا۔ "ترکوں کے ساتھ ان سے مختلف اصولوں پر معاملہ نہیں کیا جا سکتا جو مسیحی ملکوں کے ساتھ برتے گئے ہیں۔ ٹرکی کو ترکی سرزمین پر دنیوی اختیار برتنے کی اجازت ہو گی مگر وہ علاقے اس کے قبضے میں نہیں چھوڑے جائیں گے جو ترکی نہیں ہیں۔"

اس طرح وزیر اعظم برطانیہ نے مسلمانانِ ہند کے مطالبات منظور کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ مسلمانانِ ہند کو اس سے سخت مایوسی ہوئی ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کو ہندوستان میں لائڈ جارج کے جواب پر یوم غم منایا گیا۔ لوگوں نے روزہ رکھا۔ دعائیں کیں اور ہڑتال کی۔

معاہدۂ سیورے

وفد نے اتحادیوں کو اور تمام یورپین اقوام کو مسلمانوں کے نقطۂ نظر اور مطالبات سے اچھی طرح آگاہ کر دیا۔ اور ایسے مسکت دلائل کے ساتھ کہ اگر اس فیصلے میں انصاف کا دخل ہوتا تو مسلمانانِ ہند کا ہر دعوے اور ہر مطالبہ مانا جاتا۔ مگر ایک جنگ میدان میں ہوئی تھی۔ اور دوسری صلح کانفرنس میں ہو رہی تھی۔ دونوں جگہ زبردستی کی فتح تھی۔ اس لئے وفد کو ناکامی اور مایوسی ہوئی۔ وفد ابھی انگلستان ہی میں تھا۔ کہ اتحادیوں کے نمائندے سان ریمو (پیرس) میں جمع ہوئے اور ترکی معاہدہ صلح کی شرائط انہوں نے مرتب کیں۔ اس معاہدۂ صلح کا نام معاہدہ سیورے مشہور ہے۔ اور اس کی شرائط حسب ذیل تھیں:۔

۱۔ سلطان اتحادیوں کی حمایت کے ساتھ قسطنطنیہ میں حکومت کرے گا۔

۲۔ اتحادیوں کو یہ حق ہے کہ آبنائیوں پر قبضہ کریں اور یہ بھی کہ ایشیائی ٹرکی کے کسی حصے پر قابض ہو جائیں۔

۳۔ آرمینیہ کی ایک نئی دولت قائم کی جائے گی۔ جس میں مندرجہ ذیل صوبے داخل ہوں گے۔ مشرقی اناطولیہ، ارض روم، وان۔ نبلس۔ ترابزون اور اردنجان اس دولت کی حدود ریاستہائے متحدہ امریکہ کی مدد سے قائم کی جائیں گی۔

۴۔ ٹرکی عربستان کے متعلق اپنے تمام دعوؤں سے دست بردار ہو گا۔

۵۔ شام کی حکم برداری فرانس کو، عراق اور اردن کی برطانیہ کو دی جائے گی۔ عدلیہ اٹلی کو، سمرنا اور مغربی اناطولیہ یونان کو عنایت کیا گیا۔

اس ذلیل متعصبانہ اور متشددانہ صلح نامے کے خلاف تمام دنیا کے مسلمانوں نے نفرت اور غصے کا اظہار کیا۔ حتے کہ اس سلطان کی حکومت بھی احتجاج کئے بغیر نہ رہی جو اتحادیوں کی توپوں اور بندوقوں کے حصار میں لاچاری کے ساتھ ترکی اور اسلامی روایات کو بدنام کر رہا تھا۔ اس گورنمنٹ نے احتجاج کیا۔ مگر پھر برطانیہ اور دوسری دول کے دباؤ سے ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کو معاہدۂ سیورے پر وہ دستخط کرنے کے لئے مجبور ہوئی۔ بالآخر یہی معاہدہ سیورے ترکی تلوار کے لئے سنگ فساں ثابت ہوا۔

ہندوستان میں ایجیٹیشن

معاہدہ سیورے ہندوستان میں ۱۴ مئی کو شائع ہوا۔ اس کی شرائط ایسی بری تھیں کہ وائسرائے ہند کو بھی یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ان پر مسلمانانِ ہند سے تعزیت کریں۔ اور تلقین صبر فرمائیں۔ اس کے لئے انہوں نے مسلمانانِ ہند کے نام ایک پیغام شائع کیا۔ پیغام نے مسلمانوں کے زخموں پر نمک کا کام کیا۔ ۲۸ مئی کو بمبئی میں خلافت کانفرنس کا جلسہ ہوا۔ اس میں مسٹر گاندھی کے مجوزہ عدم تعاون کے پروگرام پر غور و بحث کے بعد قرار پایا کہ مسلمانوں کے مقاصد کی تکمیل کا واحد ذریعہ عدم تعاون ہے۔ خلافت کمیٹی نے یکم اگست ۱۹۲۰ء کو تمام ملک میں ایک عام ہڑتال کرائی۔ مسٹر گاندھی کو تحریک عدم تعاون کا لیڈر قرار دیا۔ انہوں نے اپنے تمام تمغے حکومت کو واپس لئے اور باضابطہ عدم تعاون کی تحریک شروع کر دی۔

وفد خلافت اکتوبر میں یورپ سے واپس آیا۔ اسی وقت سے مسٹر گاندھی اور علی برادران نے ملک کا دورہ شروع کیا۔ اس دورے کا مقصد یہ تھا۔ کہ

لوگوں کے بڑھتے ہوئے جوش وخروش میں ضبط وتنظیم پیدا کی جائے۔

* * * * * * * * * * * * * *

ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہا تھا جہاں خلافت کمیٹی کی شاخ نہ تھی، بڑے شہروں میں، چھوٹے شہروں میں، قصبات میں اور دیہ
چستی اور درستی کے اعتبار سے اس وقت خلافت کمیٹی ہندوستان میں بے نظیر تھی۔ کانگریس قدیم اور عظیم ضرور تھی۔ لیکن عوامی پیمانے پ
کمیٹی کے مقابلے میں اس کی کوئی حقیقت نہ تھی، سچ یہ ہے۔ کہ عوامی تنظیم میں کانگریس کو خلافت کمیٹی سے بڑی مدد ملی۔ اور ہر قسم کی
کے ذریعے مسلمانوں میں سے آدمی فوج در فوج نکلے۔ کوئی گھر نہیں رہا تھا جس کا کوئی نہ کوئی آدمی خلافت کمیٹی کا رکن نہ ہو، جوان، بوڑھ
دیہاتوں میں سب خلافتی تھے۔ خلافت کے سرمائے میں ہر جیب سے روپیہ آتا تھا۔ سرکاری نوکری، زمینداری، خطاب یافتہ کی آ
سرمایہ داری۔

بیشک مسلمانوں میں بعض وہ بھی تھے جو تحریک خلافت کے خلاف تھے۔ مگر اصول اور اعتقاد کی بنا پر شاذ، ذاتی مجبوریوں
لیکن خلافت کی تائید میں رائے عامہ اس قدر طاقتور اور پر زور تھی۔ کہ کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کہ جلسوں میں یا اخبارات میں
اس کی مثالیں بہت تھیں۔ کہ حکومت کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں، مگر چھپ کر خلافت کمیٹی کے سکرٹری کے پاس چندے بھی بھیج
ہیں۔ کہ مجبوریاں اور لاچاریاں ہیں۔ ان کی وجہ سے کھل کر سامنے نہیں آ سکتے۔ خلافت کے لیڈر، خلافت کے ورکر، خلافت کے والنٹیئ
غرض نہیں تھے۔ ذاتی مفاد اور اغراض کے بندے نہیں تھے۔ اپنے جوش کوشش، جدوجہد اور اعتقاد کے اعتبار سے بالکل مجاہ
جنگ میں لے جاتا تو یہ مسلمانوں کی قدیم مجاہدانہ روایات زندہ کر دیتے۔

* * * * * * * *

عدم تعاون کی کامیابی

دسمبر ۱۹۲۰ء میں جب کانگریس نے بھی بڑے پس وپیش کے بعد عدم تعاون کا رزولیوشن منظور کر دیا تو خلافت کمی
سے عدم تعاون کی تحریک زلزلے اور طوفان کی طرح چلی۔ الیکشن میں ووٹ نہ دو۔ اس اپیل کا ایسا اثر ہوا کہ بیلٹ بکس
بوتھ ویران رہے۔ خلافتی اور کانگریسی امیدواروں نے اپنے الیکشن کی کوششوں پر ہزاروں روپیہ خرچ کر دیا تھا۔ انہوں
عدالتوں اور کالجوں کے بائیکاٹ میں گو اتنی کامیابی نہیں ہوئی جتنی الیکشن کے بائیکاٹ میں، مگر پھر بھی بہت ہوئی۔ لوگو
کا وقار جاتا رہا۔ بہت سے وکیلوں اور بیرسٹروں نے پیشہ ترک کر دیا اور تحریک میں شریک ہو گئے۔ بہت سے طلبہ نے تعلیم
کرنے لگے بعض جامعہ ملیہ اور دوسری قومی تعلیم گاہوں میں داخل ہو گئے جو اسی زمانے میں قائم ہوئی تھیں۔ جیل جا
کا قدم ہندوؤں سے بہت آگے تھا۔ سچ یہ ہے۔ کہ تحریک عدم تعاون کی تمام قوت مسلمانوں کے طبعی جوش وجذبے
ناگپور کے رزولیوشن میں کانگریس نے خلافت کے ساتھ سوراج کو بھی عدم تعاون کے مقاصد میں داخل کر لیا۔ اور مسلمانو
اسے قبول کیا۔ لہٰذا داخلی سیاست کی حد تک کانگریس اور خلافت کمیٹی کا پروگرام بالکل ایک رہتا تھا۔ مگر ترکوں اور یونانیوں
اس میں کچھ اضافہ کرتی تھی۔ مظلومین سمرنا کی امداد کے لئے چندہ کیا جاتا تھا۔ غیر مسلم بائیکاٹ کے پروگرام کے مطابق ولایتی کپڑے
سمرنا کے مظلومین کو بھیجتے تھے۔

وہ جنگیں جو اناطولیہ اور تھریس میں ہو رہی تھیں، مسلمانوں ہند کو اپنے گھروں کے صحن میں محسوس ہوتی تھیں۔ اور ان کے اچھے برے نتائج سے وہ اتنے ہی متاثر تھے جتنے خود ترک ہوں گے۔ اگر غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہندوستانی مسلمان میدان جنگ میں ترکوں کے دوش بدوش نہیں لڑ سکتے تھے، البتہ ترکوں کی فتح کے لئے دعائیں کرتے تھے۔ ہر جمعہ کے دن سے پہلے ہندوستان کی مسجدوں اور میدانوں میں لاکھوں مسلمان اس مقصد کے لئے جمع ہوتے تھے۔ جمعہ کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے۔ اور ان عظیم اجتماعات میں پرزور رزولیوشن پاس کرکے اور پرجذبہ وجوش تقریریں کرکے اتحادیوں پر اور خصوصاً برطانیہ پر اخلاقی دباؤ ڈالتے تھے۔ کہ معاہدہ سیورے کو تبدیل کرو اور یونانیوں کی طرف داری بند۔

اسکولوں، عدالتوں اور برطانوی مال کے بائیکاٹ کے علاوہ سب سے اہم اور برطانیہ کے لئے وحشتناک پرنس آف ویلز کی آمد کے سلسلے میں تقریبات کا بائیکاٹ تھا۔ خلافت کمیٹی اپنے ناگپور کے اجلاس میں رضاکاروں کی بھرتی کا فیصلہ کر چکی تھی، وہ بھرتی ہو رہے تھے۔ اور حکومت ان کے متعلق یہ کہتی تھی۔ "وہ فوجی وضع کے ہیں۔ قواعد پریڈ کرتے ہیں۔ اجتماع و ترتیب کے ساتھ مارچ کرتے ہیں۔ اور وردیاں پہنتے ہیں۔" کانگریس کے والنٹر بھی تھے۔ مگر وہ یونہی ایک قسم کے بے ترتیبوں اور میلوں میں، گنگا اشنان پر لوگوں کی خدمت اور کانفرنسوں اور جلسوں میں انتظام کرتے تھے۔ پرنس اور ویلز کی آمد کے ساتھ رضاکاروں کی بھرتی اور تنظیم و تربیت نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ خلافت اور کانگریس کے رضاکاروں نے باہم مل کر ہڑتالیں کرائیں اور ولایتی کپڑے کے بائیکاٹ کے پروگرام کی تعمیل کے لئے سرگرمی سے کام کیا۔ ۵، نومبر ۱۹۲۱ء کو کانگریس کمیٹی نے اپنے دہلی کے اجلاس میں صوبوں کو یہ اختیار دے دیا کہ سول نافرمانی کریں اور سول نامتابعت کرنے والوں کے لئے اس نے اعتقادی اور عملی شرائط بھی مقرر کر دیں۔ خلافت کمیٹی اور کانگریس کا پروگرام بالکل ملا جلا چل رہا تھا۔ سول نامتابعت کے لئے دونوں انجمنوں کے رضاکار مل گئے۔ اور ایسے جوش و ہمت سے انہوں نے سول نامتابعت کی کہ ان سے جیل خانے بھر گئے۔ چند مہینے کے اندر اسیروں کی تعداد تیس ہزار تھی۔

✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣

مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کو کراچی کے مقدمے میں پہلے ہی سزا ہو چکی تھی۔ وہ جیل میں تھے۔ پرنس آف ویلز ۱۷، نومبر ۱۹۲۱ء کو بمبئی پہنچے، اس پر بمبئی میں ہنگامے اور فسادات شروع ہو گئے اور تین روز تک جاری رہے۔ حکومت پر پرنس آف ویلز کے خیر مقدم کی تقریبات کے بائیکاٹ کی اس قدر ہیبت تھی۔ کہ وہ پنڈت مدن موہن مالوی اور مسٹر جناح کی تحریک سے سمجھوتے کے لئے تیار ہو گئی۔ مگر مسٹر گاندھی نے ایسی شرائط پیش کیں جنہیں قبول کرنا واقعی ممکن نہ تھا۔ پرنس آف ویلز کا بائیکاٹ بڑے جوش اور قوت کے ساتھ کیا گیا۔ اور نہایت کامیاب رہا۔ مسٹر گاندھی نے اس کے بعد وائسرائے کو خط لکھا اور اس میں بعض شرائط پیش کیں۔ اور یہ دھمکی دی کہ اگر یہ پوری نہ کی گئیں تو جارحانہ سول نامتابعت شروع کی جائے گی۔

یکم فروری کو انہوں نے یہ خط لکھا اور ۵، فروری کو یہ واقعہ پیش آگیا کہ گورکھپور کے قریب موضع چوری چورا میں کانگریس کا جلوس نکلا۔ تھانے میں ۲۱ کانسٹیبل اور ایک سب انسپکٹر تھا۔ جلوس والوں نے اور اس مجمع نے جو جلوس کے ساتھ ہو گیا تھا، تھانے میں آگ لگا دی۔ تھانے کے سب آدمی جل کر مر گئے۔

اس پر بردولی میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ اس میں فیصلہ کیا کہ عدم تعاون کی تمام سرگرمیاں بند کر دی جائیں، اور وہ بند ہو گئیں۔ تمام ہندوستان کو اس پر حیرت ہوئی۔ کانگریس کے بڑے بڑے لیڈروں نے اس پر اعتراض کیا۔ پنڈت موتی لال نہرو اور لالہ لاجپت رائے نے جیل سے مسٹر گاندھی کو خطوط لکھے، کہ تم نے ایک گاؤں کے تھوڑے سے آدمیوں کے قصور پہ تمام ملک کو سزا دے دی۔

✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣

میدانِ جنگ میں ترکوں کی فتح

۲۶ اگست ۱۹۲۲ء کو ترکوں نے یونانیوں پر آخری حملہ کیا اور یونانیوں کو شکست ہوئی۔ وہ بھاگ کر سمرنا میں ٹھہرے۔ سمرنا میں و
تھریس پر ابھی ان کا قبضہ تھا برطانوی افواج قسطنطنیہ اور ابنایوں میں مقیم تھیں۔ مگر غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے بجائے جنگی اقدام کے یہ منا
جنگ اور میدان سیاست میں ان کو جو یافت ہوئی تھی اس کو مستحکم کر لیں۔

انگلستان کو جنگ میں جھونک رہا تھا۔ مگر لکان سے اس کے اعضاء شل تھے۔ لائڈ جارج کے میلان جنگ و فساد سے اہل انگلستان
لائڈ جارج کی پالیسی پر سخت نکتہ چینی ہونے لگی۔ اور ان کو مخلوط گورنمنٹ میں تزلزل پیدا ہو گیا۔ مگر اپنی عزل سے پہلے ہی لائڈ جارج کی سمجھ میں
سے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اور انہوں نے ۲۹ ستمبر ۱۹۲۲ء کو مدانیہ میں ترکوں کے ساتھ معاہدہ التوائے جنگ پر دستخط کر دیئے۔ اس معاہدے
نے یہ اپنے ذمے لے لیا کہ تھریس میں یونانیوں کو غیر مسلح کر کے ان کے وطن واپس بھیج دے۔ مگر قسطنطنیہ اور آبنایوں میں معاہدہ لوزا
افواج مقیم رہیں۔

صلح کانفرنس میں ترکوں کی فتح

بالکل لاچار ہو کر انگریزوں نے ۲۱ نومبر ۱۹۲۲ء کو لوزان میں صلح کانفرنس منعقد کی۔ اس میں برطانیہ، فرانس، اٹلی اور قوم پرور ترک
میں روس نہ تھا لیکن قسطنطنیہ اور آبنایوں کی مستقبل کی بحث میں اس کو بھی شرکت کا موقع دیا گیا۔ کئی مہینے یہ صلح کانفرنس جاری رہی عصم
وقت قوم پرور گورنمنٹ میں وزیر خارجہ تھے، ترکی مقاصد کی بڑی قوت سے حفاظت کی۔ میدان جنگ میں وہ جیسے اچھے جنرل تھے۔ ویسے
میں اچھے وکیل ثابت ہوئے۔

سلطنت عثمانیہ ختم ہو گئی۔ مسلمانانِ ہند کے اس مطالبے میں سے کچھ نہ ملا، کہ جزیرۃ العرب غیر مسلموں کی مداخلت سے محفوظ رہے۔
پاس اتنی طاقت ہو کہ وہ منصب خلافت کی حفاظت کر سکیں۔ مگر پھر بھی معاہدہ لوزان، معاہدۂ سیورے سے ہزار گنا بہتر تھا۔ کہ کچھ علاقہ
نے اپنی قومی آزاد اور خود مختار حکومت قائم کر لی۔

غازی مصطفےٰ کمال بہت بڑے مدبر اور سیاس تھے یا نہ تھے، اس پر گفتگو ہو سکتی ہے، مگر وہ بہت بڑے جنرل تھے، اس میں کوئی شبہ
ٹرکی کی آزادی و استقلال ان کی بے نظیر حربی قابلیت کا شاہکار ہے۔ اور ان کی شجاعت، ان کا انتخاب مردان کار اور تنظیمی صلاحیت ہمیشہ
میں شمار ہو گی۔ بے سر و سامانی کا یہ عالم تھا۔ کہ نہ فوج، نہ اسلحہ، نہ روپیہ، ریل کی پٹڑیاں اکھاڑ اکھاڑ کر گلائی گئیں اور ان سے اسلحہ جات بنائے گ
انتظام نہ تھا۔ ترک مرد اور عورتیں گولے اور بارود کے بورے اپنے کندھوں پر رکھ کر پہاڑوں اور میدانوں کو عبور کرتے تھے۔ اور میدان جنگ
پر مزید مصیبت یہ کہ دشمن یونانیوں کے علاوہ اپنا ہی بادشاہ اور اس کے تمام وسائل دشمنوں کی تائید میں، اور ان آزادی خواہ ترکوں کی
ہو رہے تھے۔ صد آفرین مصطفےٰ کمال پاشا اور ان کے رفقاء کو، کہ ان حالات میں انہوں نے ان سے جنگ کی جن کی مدد پر اتحادیوں کی
کامیاب ہوئے اور لوزان کی صلح کانفرنس میں فاتح کی حیثیت سے بیٹھے۔ صلح کانفرنس خود انہی کی تلوار سے پیدا ہوئی تھی، ورنہ اتحادی
سیورے ترکوں کی قسمت کا آخری فیصلہ ہے۔

خلافت اور سلطنت کا خاتمہ

معاہدہ صلح لوزان پر دستخط ہونے کے بعد ترکوں کو بیرونی دشمنوں کی دراندازیوں سے نجات مل گئی۔ اب ان کو داخلی استحکام اور ملکی تنظیمات کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا تھا۔ سب سے بڑی پیچیدگی یہ تھی۔ کہ انگورہ میں نیشنل اسمبلی قائم ہوگئی تھی۔ مصطفےٰ کمال پاشا اس کے صدر تھے۔ ایک عارضی قانون منظور ہوچکا تھا۔ جس میں تسلیم کیا گیا تھا۔ کہ اختیار حاکمیت لوگوں (عوام) کے لئے ہیں۔ اور قانون وضع کرنے کا اختیار اور اختیارات عاملہ نیشنل اسمبلی کو حاصل ہیں۔ مگر سلطان موجود تھا۔ اور وہی خلیفہ بھی۔ ایک ذات کے اندر دین اور دنیا کے تمام اختیارات مجتمع تھے۔

اس الجھن کو رفع کرنے کے لئے مصطفےٰ کمال پاشا نے قومی اسمبلی سے ایک قانون منظور کرایا جس کی رو سے سلطنت منسوخ کی گئی اور سلطان وحید الدین کو ایک جہاز پر بٹھا کر ترکی سے نکال دیا گیا۔ مگر خلافت ابھی باقی رہی۔ نیشنل اسمبلی نے عبدالمجید آفندی کو جو شاہی خاندان ہی سے تھے صرف خلافت کے لئے نامزد کیا۔ کچھ عرصے تک ترکی میں خلافت اور حکومت الگ الگ رہیں۔ عبدالمجید آفندی عہدۂ خلافت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ مگر یہ ناقابل عمل ثابت ہوا۔ اور اس میں دشواریاں پیش آگئیں۔

بالآخر ۲ مارچ ۱۹۲۴ء کو جمہوری پارٹی کا ایک اجلاس منعقد کیا گیا۔ جس میں عہدۂ خلافت منسوخ کیا گیا۔ ۳ مارچ کو یہی ریزولیوشن نیشنل اسمبلی میں پیش اور منظور ہوا۔ اس طرح ترکی میں خلافت ختم ہوئی۔ خاندان عثمان کے تمام ارکان جلاوطن کئے گئے۔ ۳ اور ۴ اپریل کی درمیانی شب میں خلیفہ عبدالمجید آفندی کو حکم ہوا۔ کہ ترکی سے چلے جائیں۔ اور صبح ہونے سے قبل ایک بیٹے، ایک بیٹی اور دو بیبیوں کے ساتھ ترکی سے نکل گئے۔

اس حادثے پر تمام دنیائے اسلام میں کہرام مچ گیا۔ کچھ عرصے تک ہندوستان کی خلافت کمیٹی نے اس کے لئے کوشش کی کہ حجاز میں خلافت قائم کی جائے۔ مگر یہ بھی نہ ہوسکا۔ اس تحریک سے خود خلافت کمیٹی کے اندر نفاق پیدا ہوگیا۔ خلافت کمیٹی کو تین کاری ضربیں لگیں۔

پہلی یہ کہ چوری چورا کے حادثے پر مسٹر گاندھی نے عدم تعاون کی تحریک بند کردی۔

دوسری یہ کہ ترکی خلافت سے دست بردار ہوگیا۔

اور تیسری یہ کہ خلافت کمیٹی میں نفاق پڑ گیا۔ خلافت کمیٹی ان کی تاب نہ لاسکی۔ اور کمزور ہوگئی۔

JINNAHABAD UNION COMMITTEE NO.
BOOK NO. 613
LIBRARY

JAF & CO.
Plot # 43/4, Q-2, Block-6,
PECHS, Near Jheel Park
Karachi.